فسانۂ آزاد

جلد سوم (حصہ دوم)

رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد

جلد سوم (حصّہ دوم)

مُصنّف

رتن ناتھ سرشار



ترقّی اُردو بیورو، نئی دہلی

FASANA-AZAD VOL. III (Part II)

By: Rattan Nath Sarshar

سنہ اشاعت: اپریل، جون 1986 شک 1907

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا اڈیشن : 1000

قیمت : =Rs. 67-50

سلسلۂ مطبوعات: ترقی اردو بیورو 519

کتابت : بشیر احمد

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر: ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، محکمہ تعلیم ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع : سپر پرنٹرز ساؤتھ انارکلی دہلی 51

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو

اب دوسرا ذکر سُنیے

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک کانسٹبل نے ثریّا بیگم کو دھمکایا تھا۔ جب ان کے پڑوسی نے کانسٹبل کو سمجھایا تو وہ ان کا دشمن جانی ہوگیا۔ نوبت باینجا رسید کہ خود توڑا کا مارا اور ان کو گرفتار کرکے لے گیا۔ تھانہ دار نے رہا سہا مقدمہ اور بھی بگاڑ دیا اور یہ بیچارہ دو برس کے لیے قید خانے بھیجا گیا۔ ثریّا بیگم پر یہ تباہی پڑی کہ ان کو ان کے بھاگنے اور گاؤں میں بود و باش کرنے کا حال معلوم ہوگیا۔ ایک روز شام کے وقت ایک عورت ان کے مکان پر بھیجی۔ جس نے ثریّا بیگم اور عباسی سے یوں گفتگو کی۔

عورت: بیگم صاحب بندگی عرض ہے۔

ثریّا بیگم: بندگی۔ کون ہو۔ کیا کچھ کام ہے یہاں۔؟

عورت: اے حضور بھلا بغیر کام کے کوئی بھی کسی کے ہاں جاتا ہے۔

عباسی: ہاں ہاں۔ بیگم صاحب نے یہی تو پوچھا۔

عورت: حضور سے تخلیہ میں کچھ کہنا ہے۔

ثریّا بیگم نے عباسی کو اشارہ کیا۔ وہ دوسرے دالان میں چلی گئی۔ ادھر عورت نے اظہار مدعا کیا۔ اور یوں کہا۔ حضور کے حسن و جمال کا دور دور تک شہرہ ہے۔ جس نے ایک باری دیکھا جان جانے لگی۔ اگر دوسری دفعہ نہ دیکھا تو تڑپ تڑپ کر ہلکان ہوا۔ اور حضور دینا میں جو کچھ ہے حسن ہی ہے۔ حضرت یوسف کا سا حسن ایوب کا سا صبر حضرت علی کا سا جیوٹ پن کسی اللہ کے بندے کو کاہے کو نصیب ہوا ہے۔ حسن عجب نعمت ہے اللہ تعالےٰ نے آپ کو یہ قسمت عطا کی ہے۔ کتنی پیاری موہنی صورت ہے لب سُرخ گردن نور کی کلائی سانچے کی ڈھلی ہوئی۔ آنکھیں مثال ہرن یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نا کردہ نشہ پیا ہے۔ کتنی رسیلی آنکھیں ہیں اور دانت تو ایسے ہم نے نہیں دیکھے۔ موتی سفید ہوتا ہے مگر یہ آب کہاں۔ دندان اس کو کہتے ہیں۔ مکھڑا پیارا۔ سینہ بیچین ساق بلورین۔ چال مستانہ جوان عمر۔ ابھی سن ہی کیا ہے۔ حضور کا۔ اٹھ پنے کے دن ہیں۔ نام خدا۔ اور ماشا اللہ سے ہنس مکھ خندہ پیشانی۔ جامہ زیب۔ عابد فریب۔ لیکن۔ کیا جانے کیا بات ہے کہ دل کا کنول بجھا ہی جاتا ہے۔ اس کا کیا سبب۔ حضور سی بانو اور اس حالت میں زندگی بسر کرے۔ ایک موئے خبطی نے مجھ کو بلا کر کہا کہ فلاں مقام پر وہ رہتی ہیں۔ ان سے جو ہم کہیں وہ کہ دو میں نے منظور کرلیا تو بلا کر یہ بیہودہ تقریر کی کہا۔ تم جا کے ان سے کہ دو ہماری طرف سے ہم چار سو مہینے پر نوکر رکھتے ہیں مجھے بڑا ملال ہوا۔ میں نے کہا سٹری ہوگئے۔ ہوش کی دوا کرو۔

عقل کے ناخن لو۔ کہا نہیں ہم اور کچھ نہیں کہتے صرف اس قدر کہتے ہیں کہ ہم سے دو سو روپیہ ماہواری لیں اور ہمارے ٹھیٹھر میں شامل ہو جائیں۔

ثریّا بیگم: کس میں۔ ٹھیٹھر کیا۔ ٹھیٹھر کیا شے ہے۔؟

عورت: حضور جہاں تماشا و ماشا ہوتا ہے۔

ثریّا بیگم: اوہ۔ سب کے سامنے جانا ہو گا۔

عورت: ہاں ہاں۔ ناچنا۔ بجانا ہو گا۔

ثریّا بیگم: افسوس ہے۔ اب ہم کیا کہیں۔

ثریّا بیگم نے اس عورت کی تقریر سے بھانپ لیا کہ کسی کا پیغام لائی ہے، اگر تھانہ دار کا خوف نہ ہوتا تو اس زنِ بدکردار کو فوراً گھر سے نکلوا دیتی۔ مگر خوف تھا کہ مبادا اِدھر اُدھر میرا حال مشہور کر دے تو کہیں کی نہ رہوں۔ نرمی کے ساتھ گفتگو کرنے لگی۔

ثریّا بیگم: بہن میں ایک مصیبت کی ماری ہوں۔

عورت: اے اوئی۔ بیگم صاحب بہن مجھے نہ کہیں۔ حضور میں لونڈی حضور شہزادی ہیں۔

ثریّا بیگم: مجھے دنیا میں اب کوئی بات پسند نہیں آتی۔

عورت: حضور کے دشمنوں کو خدانخواستہ ایسی کیا مصیبت ہے۔

ثریّا بیگم: کیا بتاؤں بہن۔ (آہ سرد کھینچ کر) میں بڑی پریشانی اور مصیبت میں ہوں۔

عورت: ہائے ہائے ایسی پیاری پیاری صورت اور پریشانی۔ حضور تو اس قابل ہیں کہ بادشاہوں کے محل میں ہوں۔

ثریّا بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) خدا دشمن کو بھی ایسی مصیبت میں گرفتار نہ کرے۔

عورت: حضور اللہ جانتا ہے، اچھوں کی آپ پر نظر پڑتی ہے۔

عبّاسی: ہاں پڑا ہی چاہے۔ مگر ہماری سرکار کو اب دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ بالکل ترک کر دیا۔

عورت: اللہ مالک ہے۔ بیوی کوشش یہ کرنی چاہیے کہ دنیا میں ساتھ عزت اور آبرو کے بسر کرے اور کسی کا ہو رہے۔

ثریّا بیگم: ہائے جب خدا کو بھی منظور ہو۔ ہم تو سب کچھ چاہتے ہیں۔ شادی کی۔ سوچے تھے کہ ساتھ آبرو کے زندگی بسر کریں گے۔ مگر (رو کر) خدا کو منظور ہی نہ تھا۔ یہ دن دیکھنا قسمت میں بدا تھا۔ سو دیکھا۔

قسمت کا لکھا کوئی مٹا نہیں سکتا۔

عورت: بیوی اللہ کا حکم ہے کہ اگر مرد رنڈوا ہو جائے تو انتظام کے لیے شادی ضرور کرے۔ یہ عرب اور عجم اور ولایت اور انگریزوں اور نئی دنیا والوں کے ہاں سب کے ہاں جائز ہے اور ہندوؤں کے ہاں بھی مگر یہاں ہندوستان میں ایسا نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک برا کرتے ہیں۔ اگر آپ کے ناگوار نہ ہو تو ہم عرض کریں کہ ضرور شادی کیجیے۔ دیکھیے اُس دن برق انداز آن کر کیا کیا سُنا گیا۔ اگر مرد گھر میں ہوتا تو ارق انداز، برق انداز ایک کی بھی مجال نہ تھی کہ آدھی بات کہتا۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ اور تلاش کرنا لونڈی کا کام ہے۔ اس میں دریغ نہ کروں گی۔

عباسی: کیا تم مشاطہ ہو۔ مکان کہاں ہے۔؟

عورت: مشک گنج* میں۔ پشتہا پشت سے یہی کام ہوتا آیا ہے۔

ثریا بیگم: ہم کو معاف کیجیے۔ ہم اب شادی نہ کرنے کے۔

عورت: حضور سے میں ابھی جواب نہیں چاہتی۔ ذرا تامل کیجیے۔ سوچ لیجیے دو دن تین دن میں جواب دیجیے گا۔

اس عورت نے بیان کیا کہ یہاں سے چار پانچ کوس پر ایک رئیس زادے رہتے ہیں۔ حسین، جوان، خوشرو، امیر، عالم، شاعر، پہلوان، خوش مزاج، عالی نسب، کوئی آرزو دل میں باقی نہیں رہی۔

ہمہ اسباب شادی حاصل اور نماندہ آرزوئے در دل او۔

تفریح طبع کے لیے حکومت کی نوکری کر لی۔

عباسی: حکومت کی نوکری کیسی ہوتی ہے؟

عورت: اوئی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی ہیں۔

ثریا بیگم: بہن یہ تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔

عورت: ایسی نوکری کہ جس میں سب پر حکومت کریں۔ سب رعایا بنے رہیں۔

ثریا بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔ عباسی نے بیوی اور بیوی نے عباسی کی طرف دیکھا کہا کچھ عہدے کا نام بھی ہے۔ عورت نے کہا کوتوال ہیں۔

ثریا بیگم: ہاں سمجھی۔ اب میں بخوبی سمجھی۔

---

* شہر لکھنؤ کے وسط میں ایک محلہ واقع ہے۔

عبّاسی : اُنھیں تھانہ دار کا پیغام لائی ہوگی۔

عورت : اے تھانہ دار کاہے کو ہیں برائے نام نوکری کرلی، ورنہ ان کو نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ایسے ویسے دس تھانہ داروں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔

عبّاسی : حضور کو تو شادی کرنا منظور ہی نہیں ہے۔

عورت : واہ۔ کیسی باتیں کرتی ہو کیوں نہیں منظور ہے۔

عبّاسی : اے اس میں بھی کچھ زبردستی ہے بھلا۔

ثریّا بیگم : تم ان کی سکھائی پڑھائی آئی ہو۔ ہم سمجھ گئے۔ ان سے کہہ دینا کہ ہم بیوہ ابیکس عورتیں ہیں ہم پر رحم کرو۔ کیوں ہماری جان کے دشمن ہوتے ہو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ جو پنجے جھاڑ کے ہمارے پیچھے پڑے۔ ہائے افسوس!

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رلایا مجھے

عورت : حضور کے قدموں کی قسم اُنھوں نے نہیں بھیجا ہے۔

عبّاسی : واہ بھلا کوئی بات ہے۔

عورت : بہن ہمارا تو پیشہ ہے۔

ثریّا بیگم : اچھا تو اس میں زبردستی کاہے کی ہے۔

عورت : خیر۔ میں تو آداب عرض کرتی ہوں۔

ثریّا بیگم : بندگی۔ پان کھاتے جاؤ۔

عبّاسی : لو گلوری لو بہن۔ کپوری پان ہیں اس وقت۔

عورت : تمہارے اور ان کے دونوں کے فن میں انکار اچھا نہیں ہے۔ ذرا سی دیر میں وہ بے آبرو کرسکتے ہیں۔ تم عورت اور بیوہ اور وہ افسر پولیس۔

عبّاسی : ہمارا بھی خدا ہے۔

ثریّا بیگم : سب کا خدا ہے جو ہونا ہوگا سو ہوگا۔

عورت : خیر۔ نہ مانو۔

عورت دو چار باتیں سنا کر چلی گئی تو عبّاسی اور ثُریّا بیگم باہم مشورہ کرنے لگیں۔ اب کون سی تدبیر کریں جس سے تھانہ دار کی سختی سے محفوظ رہیں۔

ثریّا بیگم : یہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ اب افسوس ہے۔

عبّاسی : آپ سے آپ بھاگنا پڑا۔ اور آج ہی کل ہیں۔

ثریّا بیگم : نہ بھاگیں گے تو کیا کریں گے۔

عبّاسی : کیا ستم ہے اس موے کو ایسی کد پڑ گئی کہ توبہ ہی بھلی۔

ثریّا بیگم : ہمارا حُسن ہماری جان کا دشمن نکلا۔

عبّاسی : ہائے ہائے۔ پر تو اس مشاطہ نے سچ کہا تھا کہ حضور بادشاہوں کے محل کے قابل ہیں۔ اس میں تو شک ذرا بھی نہیں۔ ایسا ہی ہے۔

ثریّا بیگم : جو کچھ ہے وہ ہے۔

عبّاسی : اب بھاگ کے جائیں گے کہاں۔

ثریّا بیگم : جدھر خدا لے جائے۔ اب کیا بتائیں۔ کہیں ٹھکانا ہے۔

عبّاسی : خدا مالک ہے بس اسی پر بھروسا ہے۔

زمین و زماں آسمان ساتھ ہے
زمانہ نہیں تو خدا ساتھ ہے

ثریّا بیگم : واہ خوب خوب شعر یاد ہیں تمہیں۔

عبّاسی : بیوی سب کچھ یاد ہے مگر اب چوکڑیاں بھول گئے۔

ثریّا بیگم : کہیں سے لالہ خوشوقت رائے کو لاؤ۔

عبّاسی : ہاں بڑا نمک حلال بڈھا ہے اس کو لانا چاہیے۔

ثریّا بیگم : کوئی تدبیر ایسی کرو کہ وہ کل صبح تک یہاں آجائے۔

عبّاسی : آٹھ آنے کا صرف ہے۔ پڑوس کے کلّو کو بھیجوں بلانے۔

ثریّا بیگم : اور جو تم چلی جاؤ۔

عبّاسی : بیوی ہم اکیلے نہ جانے کے اور نہ حضور کو تنہا جانے دیں گے۔

اب سنیے کہ کلّو قوم کا گاڑیہ لوہار تھا۔ ظاہر بیں ان سے ملا تھا باطن میں دشمن جانی۔ عبّاسی نے اس کو کہا کہ تم جا کے لالہ خوشوقت رائے کو بلا لاؤ۔ مکان کا پتا دیا اور سادگی کے سبب سے کل حالات بیان کر دیے۔ کلّو نے کہا تم ساتھ چلو تو کیا مضائقہ ہے، ورنہ اکیلا تو میں نہ جاؤں گا۔ عبّاسی نے ثُریّا بیگم سے رائے کی اور آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ عبّاسی بھی ساتھ جائے۔ شام کے وقت عبّاسی مردانے کپڑے پہن کر

کلّو کو ساتھ لے کر لالہ خوشوقت رائے کی تلاش کو گئی۔

اب کلّو کی قوم کا حال سُنیئے۔ جیسا کہ ایک وقائع نگار نے بیان کیا ہے۔ سننے کے قابل ہے۔ کیوں کہ اب اس شخص کا ذکر آئے گا۔ جن وحشی اور آوارہ گرد دار، سرکی بند ہندوستان کی قدیم قوموں کی تحقیقات میں نے کی ہے۔ اُنہیں سے گاڑیہ لوہار کی بھی ایک قوم ہے۔ اس قوم کے لوگ فی زمانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں ممالک راجپوتانہ وغیرہ کے اطراف میں بود و باش رکھتے ہیں۔ اپنے کو اصلی باشندہ چتور گڈھ کا بتاتے ہیں۔ جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ دہلی نے جب شہر مذکور کو فتح کیا، اور اس قوم کے آدمیوں کو زیر کر کے فوج کے گھوڑوں کی سائیسی کروائی۔ تب ہی سے قوم مذکور نے آپس میں یہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک از سر نو ہمارے راناجی بادشاہ کو مار کر ان چیزوں کو جو شہنشاہ چتور گڈھ سے لے گئے ہیں۔ واپس نہ لائیں تب تک ایک جگہ گھر بنا کر آباد نہ ہوں۔ غرض کہ اسی زمانے سے گاڑیہ لوہاروں کا یہ طریقہ ہے کہ ایک بستی میں آباد ہو کر نہیں ٹھہرتے۔ بلکہ آج یہاں ہیں تو کل وہاں چھوٹی چھوٹی گاڑیاں دقیانوسی بنا رکھی ہیں۔ جن کی سیاہ لکڑیوں پر پیوند کاریاں اور پہیوں کے جوڑ توڑ اور مرمت کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ یہ گاڑیاں بھی یقیناً اُسی زمانے کی ہیں۔ جبکہ جلال الدین محمد اکبر نے چتوڑ گڈھ فتح کیا تھا یہ قوم اپنے تئیں راجپوت بتاتی ہے۔ بولی میں ان کی اور چال چلن میں باوجود گزرنے عرصہ صدہا سال کے ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ بہ نسبت اور قوموں آوارہ گرد کے یہ قوم نہایت جفاکش اور محنتی ہوتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں گاؤں کے باہر بالو یا ریت میں جہاں ان کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ آگ کے روبرو بیٹھے ہوئے لوہا گڑھا کرتے ہیں کئی زمانے گذر گئے اور کاریگری نے بہت ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ لوہے کی عمدہ عمدہ چیزیں بہک اور نہایت عمدہ سے عمدہ دیسی لوہار بنانے لگے۔ مگر اس قوم کے لوہار وہی دقیانوسی پھاوڑے جن کو اپنی زبان میں یہ لوگ (کسی) کہتے ہیں بناتے ہیں۔ وقس علیٰ ہذا وہی پرانی قسم کی درپنیاں اور کسیئن اور چاقو ترکاری کاٹنے کے وغیرہ وغیرہ بنا کر راجپوتانہ کے کسانوں اور نیم وحشی باشندوں میں بعوض غلہ اور روغن وغیرہ فروخت کرتے رہتے ہیں۔ جس قدر اقوام آوارہ گرد سانسی ساٹیہ۔ کنجر۔ کوچ وغیرہ راقم کے دیکھنے میں آتے ہیں اُن سب میں یہ قوم ایماندار اور غریب اور محنت اور مشقت سے روٹی کما کر کھانے والی ہے۔ بالعکس دوسری اقوام مذکور الصدر کے کہ کوئی چوری کرتی ہے۔ جیسے سانسی، کوچنی، ساٹیہ، کوئی جنگلوں میں مسافر کو اکیلا پا کر گلا گھونٹتی ہے۔ جیسے کہ کوچنی وسانسی۔ کوئی کھوٹا روپیہ بناتے ہیں اور بچوں کی خرید فروخت کرتے ہیں۔ جیسے بنجارے۔ اقوام بنجارہ ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے ہیں۔ جو نہایت شریر اور اکثر ظاہر میں نمک کی سوداگری اپنا پیشہ قرار دیتے ہیں۔ اس قوم کے حالات عجیب و غریب

دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو قوم اودھ سے کسی قدر ملتے ہوئے ہیں، چنانچہ آئندہ کسی موقع پر علاحدہ لکھوں گا۔ گاڑیہ لوہار چونکہ چند پشتوں سے آگ کے پاس سب کے سب رہتے ہیں، لہٰذا سب کے سب سیاہ فام ہو گئے ہیں۔ بلکہ جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ بھی اپنے ماں باپ کی طرح سیاہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ ایک عیب البتہ اس قوم میں دیکھا گیا اور وہ یہ ہے کہ کبھی کبھی راستہ چلتے ہوئے کھیتوں سے جو راستہ کے کنارے بالیاں اور خربوزہ اور لکڑی چورایا کرتے ہیں۔ اس اثنا میں اگر مالک کھیت آپہنچا تو نہایت فخر سے اپنا قصور معاف کرا لیتے ہیں۔ برخلاف اور اقوام کے کہ وہ مع مستورات کھیت والے کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سانسی اور کنجر اور ساٹیہ اور اودھ وغیرہ۔ تھوڑے ہی برس پیشتر (یعنی تخمیناً یک صد سال) گاڑیہ لوہار اپنے دیوتا بھوسیہ اور کھیت پال کے آگے سال بھر میں ایک مرتبہ آدمی کی قربانی کرتے تھے۔ اور ایسا آدمی قربان یعنی بلدان چڑھانے کے واسطے یہ قوم اقوام بنجارہ سے جس کا پیشہ بچوں اور آدمیوں کی خرید فروخت کا ہے مول لیا کرتے تھے۔ غدر سے پہلے تک یہ رسم کہیں کہیں اس قوم میں پائی جاتی تھی۔ جیسا کہ ایک مرتبہ علاقہ بیکانیر میں خود راقم نے اپنی آنکھ سے آدمی کو چڑھاتے ہوئے دیکھا۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ ایام غدر سے شاید دو برس پہلے سور پور موضع میں قریب دو سو گاڑیوں کے جمع ہوئیں۔ جس میں ڈیڑھ ہزار گاڑیہ لوہار کے قریب اس قوم کے آدمی جمع تھے، اور دیوتا کھیت پال کی پرستش وہیں قرار پائی۔ مجھے یاد ہے کہ ایام کاتک تھے۔ اوّل روز سب لوہاروں نے باہم چندہ جمع کر کے میٹھی لاپسی (ایک قسم کا خشہ گندم کا دلیہ) پکاتی اور دیوتا کی منڈھی پر جو ایک گاڑی کی جڑ میں بنی تھی چڑھا کر سب نے کھائی۔ دوسرے روز تین بکرے دیوتا مذکور کے روبرو کھڑے کر کے سر اُن کے تلوار سے اُڑائے گئے۔ اور پلاؤ پکنا شروع ہوا، جب پک چکا تو چند بوڑھے لوہار جمع ہوئے، اور ایک لاغر آدمی کو بہت نشہ پلا کر دیوتا کی منڈھی کے مقابل لے آئے۔ یہ شخص اس قوم میں سے نہ تھا بلکہ صاف اور گورے رنگ کا آدمی تھا۔ جس کی عمر تیس برس کی ہوگی، مگر یا تو نشہ شراب سے یا اور کسی عارضہ سے یہ آدمی دیوانہ کی سی حرکتیں کرتا تھا۔ بڑی دیر تک لوہاروں نے مرد مذکور کی پیشانی پر سیندور اور چاول اور تیل کا تلک لگایا۔ ایک تھال میں یہ سب چیزیں رکھی تھیں جو آتا تھا کہ اس مرد مجنوں کے سر پر ٹیکا لگاتا تھا۔ چاروں طرف لوہاروں کا انتظام تھا کہ کوئی غیر شخص نہ آنے پاتے۔ جب دو گھنٹے اسی طرح کامل گذر گئے، تو اچانک ڈھول بجایا گیا، اور سنکھ پھونکا اور ایک جوان گاڑیہ نے پیچھے سے آکر اس مرد مجنوں کے سر میں تلوار اس زور سے ماری کہ فی الفور تن سے سر جدا ہو کر لاش تڑپنے لگی۔ جس قدر لوہار وہاں جمع تھے نہایت خوش ہوتے اور لاش پر پانی ڈالا۔ کچھ خون لے کر اس دیوتا کھیت پال اور بھوٹیہ کے منہ پر چھینٹے مارے، اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی پیشانی پر بہت سے لوہاروں سے اسی خون کا قشقہ کھینچا۔ بعدہ فی الفور نعش کو

مع سر کے ایک سفید گزی کے کپڑے میں لپیٹ کر جنگل کی طرف لے گئے۔ مجھ کو یاد نہیں گاڑا یا جلایا۔ شام کو سب نے شراب پی پی کر پلاؤ کھایا اور خوشیاں کیں۔ دوسرے روز تین چار شادیاں بھی آپس میں ہوئیں۔ شادی کی رسمیں کچھ انوکھی نہ تھیں بلکہ وہی ہندوؤں کی سی رسمیں تھیں۔ مگر وہاں ایک بات انوکھی دیکھی یعنی اوّل روز دولہا دلہن اوندھی چارپائی بچھا کر سوتے۔ اس کا سبب جو دریافت کیا تو یہ کہا کہ ہمارے بزرگوں نے طلاق لکھ دی ہے کہ جب تک چتوڑ گڈھ کو فتح نہ کرلیں تب تک بروز شادی سیدھی چارپائی پر نہ سوئیں۔ علاوہ بریں کپڑے کا ایک موٹا کرتا بنایا تھا۔ جس سے دُلہن نے بعد نکاح کے دولہا کو خوب مارا وہ بیچارہ آگے آگے بھاگتا پھرتا تھا، اور دُلہن پیچھے پیچھے مارتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ یہاں عقل حیران ہے کیونکہ یہ رسم کسی قدر باشندگانِ انگلستان سے ملتی ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ انگریز بعد نکاح کے دولہا کو جوتیوں سے جو نرم نرم اسی کام کے واسطے بنی ہوئی ہوتی ہیں، مارتے ہیں۔ اور یہ قوم بذریعہ دُلہن خاص کپڑے کے کوڑے سے دولہا کو پٹواتے ہیں۔

عبرت

وہ شقی القلب خبیث النفس بدباطن آدمی عبّاسی کو ساتھ لے کر جھٹ پٹے وقت لالہ خوشوقت رائے کے بُلانے کا بہانہ کرکے وہاں سے چلا۔ عبّاسی مردانہ بھیس میں تھی۔ چُست پھنسا ہوا گھٹنا۔ سفید، اور صاف شفّاف انگرکھا، اس پر ڈھیلا چغہ۔ سر پر عمامہ صندلی۔ یہی معلوم ہوتا تھا سترہ اٹھارہ برس کا خوبرو گبھرو ہے۔

بنورس گرد گل نارستہ شمشاد
زخوبی سرو او چون سرو آزاد

کلّو پہلے تو عبّاسی پر ریجھے۔ ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنے لگے۔ عبّاسی ایک کائیاں۔ گو کلّو کی صورت سے نفرت تھی مگر دل کی بات کا اظہار نامناسب سمجھی۔ اختلاط کی باتیں کرنے لگی۔

عبّاسی: سچ کہنا اس مردانہ بھیس میں ہم پر کسی قدر جوبن ہے۔

کلّو: جانِ من۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ ہائے میرے دل سے پوچھے۔

عبّاسی: اب چپکے چلے چلو۔ جھوٹی باتیں سُنی ہیں بہت۔

کلّو: (ہاتھ میں ٹہوکا دیکر) ہائے ستم۔ جھوٹی باتیں؟

عبّاسی: اے واہ پیٹ سے پاؤں نکالے۔

کلّو: جانِ من ایک کام کرو۔ خوشوقت رائے گئے ایسی تیسی ہیں تم بیگم صاحب کی جمع جتھا سب لے کے
کل آؤ۔ ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ ہم تم مزے مزے زندگی بسر کریں۔
عبّاسی: واہ۔ تم مردوں کا اعتبار کیا ہے۔ نامعتبر لوگ۔
کلّو: ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں۔

نہ ہر زن زن ست ــــ نہ ہر مرد مرد
خدا پانچوں انگلی کو یکساں نکرد

راوی: خوجی سے بھی بڑھ گئے۔ خدا پانچوں انگلی کو یکساں نکرد۔!
عبّاسی: خوشوقت رائے کا مکان معلوم ہے یا نہیں۔؟
کلّو: خوشوقت رائے کا مکان ان کے ابّا حور سندر رائے کی قبر تک سے واقف ہوں۔ وہ کون ایسا ہے جس
کو میں نہیں جانتا۔
عبّاسی: بھلا اب مکان کتنی دُور ہوگا۔
کلّو: یہی کوئی دو کوس۔
عبّاسی: اوئی، سچ؟ نہیں۔ مار ہی ڈالا۔
کلّو: سواری کرایہ کر لوں۔ گود میں لے چلوں۔
عبّاسی: (مسکرا کر) ایں! یا تو گھر بٹھاتے تھے یا گود بٹھانے لگے۔
کلّو: (ہنس کر) بہت کہی۔ ایسی کہی کہ ہمارے اسا سیف زبان بند ہو گیا اب ہارے۔
عبّاسی: اے تم ایسے گنواروں کو بند کر دینا کون بات ہے۔
کلّو: بجا ہے۔ گنوار ہیں ہم۔
عبّاسی لگاوٹ کی باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ایک گلی کے قریب کلّو نے کہا ٹھہرو ہم
ایک دوست کو ساتھ لے لیں ابھی ابھی آتے۔ عبّاسی نے کہا ہم تم کو نہ جانے دیں گے اور جو تم نہ
آئے۔ تو نہ ہم ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔
کلّو: واہ۔ بھلا تم کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ جہنم کو۔
عبّاسی: اچھا جاؤ خدا حافظ ہے۔
تھوڑی دیر کے بعد کلّو واپس آیا۔ کہا چلو مکان میں چل کر بیٹھو۔ ہمارے دوست کے پاس اندر
آئے۔ دیکھا کہ ایک کشادہ احاطہ ہے۔ صحن فراخ مکان صاف مگر نام اِدھر اُدھر کھپریل، اور ایک

دالان کلّو کے دوست شیودین نے گفتگو شروع کی۔

شیودین: آؤ یار ہے مجاز اچھے۔؟

عبّاسی: ایں۔ اے واہ ہے۔ جان نہ پہچان خالہ جی سلام۔

شیودین: واہ بڑی تیج (تیز) ہو۔

عبّاسی: یہی ہیں پہلے اپنی صورت تو دیکھو آئینے میں۔

شیودین: ہم بڑے ہی سہی۔ پھر آپ کو کیا۔

عبّاسی: شکل چڑیلوں کی ناز پریوں کا۔ ع

ایڑی چوٹی پہ مُوے دیو کو قربان کروں

شیودین: اہا ہا۔ اگر گانے میں ہرج نہ ہو تو کچھ گاؤ۔

عبّاسی: کوئی سُن تو نہ لے گا۔

کلّو: محلے بھر میں سنناٹا ہے۔ تم نشان خاطر رہو۔

عبّاسی: اچھا۔ مگر بے ٹھیکے کے ہم سے نہ گایا جائے گا۔

محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے
سارے معشوقوں کی سرتاج پری آتی ہے

بایاں منگوالو کہیں سے۔

جس کا سایہ نہ کبھی خواب میں دیکھا ہوگا
آدمی زادوں میں وہ آج پری آتی ہے

شیودین: کھو گاتی ہو۔ ماجلا (معاذ اللہ)۔

عبّاسی: اے واہ۔ یہ معاذ اللہ کا کون موقع تھا۔ بھینس نہ کودی کودی گون۔ یہ تماشا دیکھے کون۔

شیودین: مثلیں بہت یاد ہیں بھلا۔ پہیلی بجھوائیں بوجھوگی۔؟

عبّاسی: ہاں ضرور کہو فارسی نہ ہو۔

راوی: اچھی پھبتی کہی۔

شیودین نے یہ پہیلی کہی۔

سکھ کارنی بنایا مندر   یوں نچھوڑی واکے اندر
اس مندر کی ریت پُرانی   اور ہی آگ بجھادے پانی

عبّاسی: یہ حمّام ہے۔

نیچے تا میں چل بھری اور لاگی آگ
باجن لاگی تو مڑی نکسن لاگے ناگ

عبّاسی: یہ تو حقہ ہے۔

بالا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہوا تب کام نہ آیا
بتا دیا ہے واکا نانوں ارتھ کہو یا چھاڑو گاؤں

عبّاسی: اے کوئی مشکل پہیلی کہو۔ یہ دیا ہے۔

تن گورا مکھ سانورو رہیں سمندر تیر
پہلے دن میں وہ لڑیں ایک نام دو بیر

عبّاسی: ہم نہیں جانتے۔

بوجھ پرانی پھل ایک سندر پھول پان سب وا کے اندر
آگ لگی تب اوپجے روکھ پھول چکے تب جارے سوکھ

عبّاسی: یہ ہم سمجھے ہی نہیں۔ اہاہاہا۔ انار ہے۔

راجہ کے گھر آئی رانی اوگھٹ گھاٹ وہ پیوے پانی
مارے شرم کے ڈوبی جائے ناحق چوٹ پڑوسی کھائے

یہ تم نہ سمجھوگی۔ کھڑیال ہے۔ نیم کی پہیلی سنو۔

سارے جگت میں آدھا پاؤں
ارتھ کہو یا چھوڑو گاؤں

عبّاسی: یہ تو کھلی ہوئی پہیلی ہے۔ ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔

ایک نار جو اوکھٹ کھائے جس پر تھوکے وہ مر جائے
جو کوئی اس کا ساتھی ہوئے اندھا نہیں تو کانا ہوئے

عبّاسی: بندوق ہے۔

چار کان ایک سیس ہے ایک ٹانگ کی نار
شام برن نا مس بھری پنڈت کرو بچار

عبّاسی: ہم نہیں سمجھے۔

ایک تماشا دیکھو چل   سوکھی لکڑی لاگا پھل
جو کوئی اس پھل کو کھائے   کھیت چھوڑ باہر نہیں جائے

عبّاسی: یہ نیزہ ہے مگر خوب کہی ہے۔

مارو تو مرتا نہیں چھوڑو تو مر جائے
کہیں پہلی بیر بر مردہ روٹی کھائے

عبّاسی: مردنگ ہے۔ کیوں کیا بوجھے ہیں۔

ایک پور کی کتی لکھ ناری   سب مل کریں سنگار یک باری
چلے پور کھ دیکھے سنسار   تب ترین کا ہوتے سنگار

عبّاسی: (سوچ کر) خدا جانے کیا ہے۔؟

کلّو: ہم بتادیں یہ پڑاوا ہے۔ کیوں کیا بوجھی ہے۔

شیودین: اچھّا یہ تو بوجھو۔

ہاتھ چڑھے دس بیس کو کاٹے   کام پڑے پتھر کو چاٹے
کھا کھا ہارو نوں کو بھرنی   نے چیتانے باگ نہ ہرنی

عبّاسی: ناخون گیر ہے۔

ایک نار جب سبھا میں آئی   ساری سبھا بھوچک رہ جائی
چاتر چاتر وا کے یار   مورکھ دیکھیں مُنہ پسار

عبّاسی: یہ بھی ہم نہیں سمجھے۔

ناری ایک مندر میں ناچے   بن چٹھیا مندر گُن بانچے
ناچ تھکے مندر ڈھڑ جاتے   بوجھو پنڈت دھیان لگاتے

عبّاسی: نبض ہے۔

سیام برن پر ہر نہیں جٹا نہیں ایس
سدا کال جل میں رہے بھسم رماوے سیس

عبّاسی: ہم نہیں سمجھے۔

سدا او بندی نار نس باسر سووے نہیں
سووے پیا سولائے پھر سووتے جاگے نہیں

کلّو: یہ بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئے گی۔

سیام برن یک نایکا جری بری ہوں میں
گلن گلن اینٹھی لری کہی رسی لی میں

عبّاسی: یہ بھی پہیلی دشوار ہے۔ دقتوں سے خالی نہیں۔

چت ترپٹ سب ناریاں دونوں مل ہوں یار
چت رکھ پٹ سے بوجھ لے ہے کوئی بوجھن ہار

پہیلیوں کے بعد کلّو نے عبّاسی سے یوں تقریر کی۔

کلّو: سُنو عبّاسی۔ ہماری اور ہمارے دوست کی رائے ہے کہ تم کو اب یہاں سے نہ جانے دیں۔ اب اگر تم عقل مند ہو تو ثریّا بیگم کے مال اور اسباب سے ہمیں اطلاع دو۔

عبّاسی: بڑی دغادی کلّو۔ بڑی دغادی تم نے۔

کلّو: اور ہمارا کام کیا ہے۔ ہم تو برسوں راجپوتانہ کے ریگستان میں لوٹ مار کیا کیے ہیں۔

عبّاسی: مجھ بیکس بیوہ پر تو رحم کرو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے۔

کلّو: ہم رحم کرنا نہیں جانتے۔ قتل کرنا خوب جانتے ہیں۔

عبّاسی: ہائے، ہائے وہاں بیوی اکیلی ہوں گی یہاں ہم تڑپ رہے ہیں۔

شیودین: اچھا تو پھر یہاں رہنے میں کیا مجاکا (مضائقہ) ہے۔

عبّاسی: ہاں (آہ سرد کھینچ کر) کیا کہوں۔

شیودین: لالہ کو یہاں بلا لائیں۔

عبّاسی: بڑا دھوکا دیا۔ کہیں کے نہ رہے۔

اب سُنیے کہ کلّو اور شیودین، چھ اور چوروں کو لے کر ثُریّا بیگم کے ہاں چوری کرنے گئے۔ عبّاسی کو اسی مکان میں چھوڑا۔ تین مردان کے سپرد کیا۔ تینوں شراب کے نشے میں چور۔ عبّاسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر جاری تھا اور مثل ماہی بے آب تڑپتی تھی۔ ادھر کلّو اپنے ساتھی بدمعاشوں کو لے کر ثُریّا بیگم کے مکان پر پہنچے۔ چوکیدار نے ٹوکا۔

چوکیدار: کو ہے۔ کو جات ہے۔

شیودین: ہم ہیں بھائی۔ مساپھر (مسافر)۔

چوکیدار: تنک ٹھہرے رہو۔

شیودین : اچھا بھائی مٹر. جلدی جائے گا ہے۔

چوکیدار : چوری کرنے نکسے ہو (نکلے ہو) ۔

کلّو : چُپ بے ۔ !

چوکیدار : ارے گبُرے گبُرے ہو ۔ دوڑ ۔ ڈاکا پڑت ہے ۔

اتنے میں کلّو نے بڑھ کر ایک لٹھ لگایا ، اور ایک چور نے دوسرا رسید کیا ۔ چوکیدار یتور اکر گرا ہوا تیز چلتی تھی ۔ گبُرے چوکیدار نے آواز اچھی طرح نہیں سُنی ۔ پکارا کہ کو ہے ہو ۔

کلّو : (آواز بنا کر) ارے کو ہے ہو ۔

شیودین : (آگے بڑھ کر) بھیّا ڈگر (راستہ) بھُول گئیں (گئے ہیں) ۔

گبرے : تمہی پکارے راہو (جب ہی پکارا تھا) ۔

شیودین : ہاں بھیّا ۔

گبُرے نے راستہ بتا دیا ۔ کترا کر شیودین پھر ٹکڑی میں جمع ہو گئے ۔

کلّو : بہت بچے نہیں تو دھر ہی لیے گئے تھے ۔

شیودین : اُف ! جان بچ گئی ۔

کلّو : یہی مکان ہے اس میں ایک عورت ہوگی اکیلی ۔

شیودین نے دروازہ توڑا اندر گیا ۔ دیکھا ایک لمپ روشن ہے ۔ اور ایک کوٹھری میں کنول جل رہا ہے ۔ آہستہ آہستہ پلنگڑی کے قریب گیا ۔ اتنے میں کلّو اور دو چور بھی اندر آئے ۔ ثریّا بیگم بیچاری مارے خوف کے دبکی پڑی تھی ۔ آنکھ کھُل گئی ۔

ثریّا بیگم : کون ہے عبّاسی ۔ عبّاسی ۔ !

راوی : افسوس ۔ عبّاسی کجا ۔

ثریّا بیگم : یہ کون تھا ۔ اے عبّاسی بولو ۔

کلّو : عبّاسی نہیں ہے ۔ ہم ہیں عبّاسی کے میاں ۔

ثریّا بیگم : ارے ! ہائے ہائے ارے میرے اللہ ۔ اب میں کیا کروں ۔

کلّو : کیا کروں ! کرنا کیا ہے ۔ شادی کرو ۔

ثریّا بیگم : ہائے میرے اللہ غضب ہو گیا ۔

شیودین : سُنا اللہ اللہ کہو ذرا چپکے چپکے ۔

ثریا بیگم : آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ آزاد! ہائے تیری بدولت اس مصیبت میں پڑی۔
شیودین : چُپ چُپ، بولو نہیں۔
چور : بتادو روپیہ کہاں ہے۔ زیور کہاں ہے۔ مال متاع کہاں ہے۔؟
شیودین : سب بتادو۔ بتاؤ نہیں ماری جاؤ گی۔
چور : نہیں نہیں بتادیں گی۔
شیودین : بتائیں تو اچھا نہ بتائیں تو اچھا۔
کلّو : جیسے اب یہ تو ان کو معلوم ہو گیا کہ چور آئے ہیں۔ اکیلی بھی گھر میں ہیں، اور کوئی نہیں ہے تو اب اگر ہم کو بتادیں گی تو اچھا۔ نہیں تو ہم گھر بھر ڈھونڈھ ماریں گے۔
ثریا بیگم : اختیار ہے۔ مگر میری آبرو کا خیال رکھو۔
چور : اس بات کا تو ذکر ہی نہ کرو۔ ہم چور ہیں۔ بدمعاش نہیں ہیں، خاندانی چور ہیں۔
شیودین : ہاں اور کیا۔ اِجّت (عزّت) نہ جائے گی۔
کلّو : پھر زیور تو بتاؤ۔؟
شیودین : سُنا ہے کہ تمہارے پاس جواہر کے ڈھیر ہیں۔
کلّو : ہاں جی یہ بڑی امیر ہیں۔
ثریا بیگم : خاک۔ امیر جب تھے تب تھے۔
کلّو : لے یہ یوں نہ بتائیں گی۔

کلّو نے چارپائی سے اٹھایا اور کہا بتا چل کے سب ابھی بتادے جواہرات اور زیور اور روپیہ کہاں ہے۔ کئی کوٹھریاں توڑیں کئی صندوق توڑے۔ جو کچھ جمع جتھّا تھی باندھی اور چلنے کا قصد کیا۔ اتفاق بلکہ شامتِ اعمال سے اس قدر کلمہ بیگم کی زبان سے نکلا کہ اچھا لے جاؤ۔ ہم تم کو پہچانتے ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ کلّو نے اس بیچاری مصیبت زدہ کے مُنہ پر ایک تھپڑ دیا۔ تڑ۔

چور : او نابکار دت کم بخت بے بس عورت پر ہاتھ چلاتا ہے۔ پاجی۔ نالائق۔
کلّو : کیا۔ کیا بکتا ہے۔
چور : چپ نالائق۔ یہیں کھود کے دفن کردوں گا۔
شیودین : مار سسر کا۔ گرمات کا ہے ہے۔
چور : تو بھی اسی کی طرف سے بولا کیوں بے۔

شیبو دین : بیدھا آیا ہے کیا؟

اس پر شیبو دین نے چور پر وار کیا، اور دو چار زور زور سے لگائیں۔ اس چور سے سب خلاف تھے اور چور سے شیبو دین کسی قدر کرارا تھا۔ لہٰذا یہ خوب پٹے۔ ساتھی سب مُنہ دیکھا کیے۔

کلّو : چل ہمارے ساتھ (ثریا بیگم سے)۔

شیبو دین : ہاں رے چلو بکت ہے واہی تباہی۔

کلّو : چل اُٹھ سانس اٹھتی ہنہیں۔

ثریّا بیگم : (ہاتھ جوڑ کر) ارے خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو میں بے قصور، بے گناہ عورت ہوں رحم کرو۔

کلّو : رحم کہاں۔ رحم ہو تو چوری کون کرے۔

شیبو دین : چلی اُٹھ رات جاتی ہے۔

ثریا بیگم نے ہاتھ جوڑے پاؤں پڑی۔ عاجزی سے کہا کہ واسطے خدا کے میری عزّت کے خواہاں نہ ہو۔ مگر کلّو نے ایک نہ سنی۔ کہا اب ہم تم کو نہ چھوڑیں گے۔ کسی رئیس شہزادے کے ہاتھ بیچیں گے تم بھی چین کرو گی ہم بھی چین کریں گے۔ شیبو دین بھی کلّو کا معین تھا۔ ہاں جس کے ہاتھ چاہیں فروخت کرلیں۔ کیا بات ہے۔ خوبصورت جوان نازک اندام عورت لاکھوں گاہک ہوں گے۔

ثریّا بیگم : میرا مال لیا۔ زیور لیا۔ اب تو قناعت کرو۔

کلّو : قناعت کرتے تو اتنے بڑے نہ ہوتے۔

شیبو دین : اور کیا یہ تو ہی ہے۔

کلّو : چلو اچھی طرح اُٹھو۔ ورنہ ڈھکیلی جاؤ گی۔

ثریّا بیگم : یا خدا میں نے کون سا جرم کیا تھا جس کے عوض میں یہ مصیبت پڑی۔

کلّو : ہاں سوچو سوچو یاد کرو۔ کچھ یاد ہے۔ کوئی گناہ یاد آتا ہے۔ اب عمر بھر گناہ نہ کرنا سمجھیں خبردار۔

کلّو نے ثُریّا بیگم کی گردن میں ہاتھ ڈالا۔ اور چھری نکال کر کہا۔ سُنو بیگم صاحب! ابھی ایک چوکیدار کی گردن ناپی ہے۔ وہ تڑپ رہا ہے۔ تم اگر اپنی دشمن ہو تو غل نہ مچانا۔ ورنہ ہم جتائے دیتے ہیں کہ اگر آواز نکلی تو ہم نے فوراً چھری بھونک دی۔ ثریا بیگم نے کہا۔ اختیار ہے۔ جو چاہو سو کرو۔

کلّو : دیکھو خبردار ہوشیار۔ بس چلو۔

ثریّا بیگم : (رو کر) ہائے کیا چلوں اور کیا نہ چلوں جان عذاب میں ہے۔

شیبو دین : چلت ہے کہ ناہیں، رودت ہے اپنی کرمن کا۔

کلّو: کیا جانے کن اگلے پچھلوں کو روتی ہے۔

ثریّا بیگم: آزاد۔ ہائے آزاد۔ اس وقت ان سب کو نیچا دکھاتا مگر دلی دور ست۔ ہائے آزاد۔ وائے قسمت۔ وائے نصیب۔

الغرض ہزار خرابی ان بدمعاشوں کے ساتھ ثریّا بیگم کو اندھیری رات میں گھر چھوڑ کر جانا پڑا۔

نوشہ کا قتل ستم ہے

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ　　دل کو فگار کرتا ہے لختِ جگر کا داغ

آنکھوں کا نور کھوتا ہے نورِ نظر کا داغ　　مرنا جوان بیٹے کا ہے عمر بھر کا داغ

یہ حال ابنِ فاطمہ کے دل سے پوچھیے

زخمِ جگر کے درد کو گھائل سے پوچھیے

عین تیجے کے دن شہزادہ بلند ارادہ رشکِ سکندر غیرتِ سنجر مرزا ہمایوں فر بہادر خوشی خوشی محلِ معلّی میں برآمد ہوئے اور آتے ہی اس روز سے اپنی مادرِ مہربان کے گلے لپٹے کہ فرطِ طرب سے اشکِ اضطراب فروش دامن کی خبر لائے۔ شہزادی بیگم سخت حیران کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ میرا لال تو زمین کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ شہر بھر اپنے سامنے دفنا آیا۔ بہن مارے خوشی کے کھِل کھِلاتی تھی۔ مگر مردے کو زندہ دیکھ کر تھراتی تھی۔ مغلانیاں پیش خدمتیں مہریاں سب دنگ۔ چہرے زرد، رنگ فق، کسی نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی۔ کوئی جھجک کر کونے میں جا چھپی۔ کسی نے کہا سایہ ہے۔ کوئی بولی موا بہروپیا در گور روپ بھر کر حضور کے بھیس میں آیا ہے۔ اور ہمایوں فر کھڑے ہنس رہے ہیں۔ مگر سہمے ہوتے۔ اتنے میں باہر سے ان کے رشتہ دار کئی نواب زادے یہ حیرت افزا خبر سُن کر دوڑ پڑے۔ دیکھا تو،

صورت وہی رنگ و رو وہی ہے

لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

الٰہی یا بالعجب! کل تربت عنبرین میں لٹا کر آئے۔ آج یہاں دیکھتے ہیں۔ دو ضعیف الاعتقادوں کو شک کی جگہ کامل یقین ہو گیا کہ پریت ہے۔ ایک صاحب نے ڈانٹ بتائی۔ ابے تو کون ہے بول کون ہے ڈپٹتے جاتے ہیں مگر خود پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ دوسرے نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو دبے دانتوں کہا۔ ذرا فرق نہیں ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ اللہ اللہ مردہ جی اُٹھا۔ یہ نئی بات ہے دیکھنے میں نہیں آئی۔

آخر کار مرزا ہمایوں فر نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ بہن خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے ہمیں سب سے زیادہ رنج یہ ہے کہ تم ہمیں بھول گئیں۔ یہی کہتی تھیں کہ بھائی کی ہمیں سب سے بڑھ کر محبت ہے۔ جاؤ بس دیکھ لیا۔ اس پر ہمایوں فر کی بہن نے چھپٹ کر پیشانی نورانی کا بوسہ لیا اور کہا۔ واسطے خدا کے بتاؤ تو یہ اسرار کیا ہے۔ یہ ہوا کیا تمہیں کچھ خبر ہے۔

مغلانی: (چٹ چٹ بلائیں لے کر) حضور نام بدل ہو گیا اللہ جانتا ہے۔

شہزادہ: لاحول ولاقوۃ۔ آخر کہو تو یہ ماجرا کیا ہے۔ تم سب مجھے دیکھ دیکھ کر متحیر کیوں ہو۔ یہ میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔

نواب: (ہمایوں فر کے چچازاد بھائی) واللہ (متحیر ہو کر) یا خدا خیر کیجیو۔

بڑی بیگم: یہ کیا اسرار ہے لوگو۔ ارے میرے لال ہائے کوئی مجھے اس وقت دھوکا دے رہا ہے، ہے ہے! خدا کرے خواب نہ دیکھتی ہوں۔ اُف جب ہمایوں فر کو کل حالات معلوم ہوئے تو دل دھڑکنے لگا۔ اور یوں ہم کلام ہوئے۔ مگر خود بھی کانپتے جاتے تھے۔

شہزادہ: جناب باری کی قسم جو مجھے اس معاملے کی خبر بھی ہوئی ہو۔ ہمارے بجرے کے سامنے ایک بجرا الٹ گیا۔ اتنا تو ہم نے دیکھا کہ جو لوگ اس پر بیٹھے تھے وہ ڈوب گئے۔ پھر ہوا نے ایسا زور باندھا اور دریا کی اس قدر طغیانی ہوئی کہ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑے، دوسرے روز ہم اس فقیر کے ہاں رہے۔ اب ان کو لے کر آتے ہیں۔

جب اس واقعہ ہوش ربا اور حیرت افزا کی خبر ہوئی تو تمام شہر کے آدمی جوق جوق امنڈ آئے۔ اور برنا و پیر غریب و امیر سب نے یہی خواہش ظاہر کی کہ ہمایوں فر کو ایک نظر دیکھ لیں۔

اسی وقت بزم طرب آراستہ ہوئی۔ ہمایوں فر کی مادر مہربان اور پیاری بہن، اور اعزہ و اقربا جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ شہزادی بیگم بار بار بلاتی تھیں اور پیار کر کر کے روتی تھیں۔ تمام شب جلسہ رہا۔ شہر بھر کے آدمی جمع تھے اور ہر در و دیوار مسرت بار تھی کہ شہزادے نے دوبارہ زندگی پائی۔ دلی آرزو بر آئی۔

صاحب مجسٹریٹ ضلع نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جو بیچارہ مصیبت کا مارا نوجوان جو غریق لجۂ فنا ہوا وہ مرزا ہمایوں فر کا ہم شکل تھا۔ معاً قبر کھدوائی گئی۔ دیکھا تو بعینہ مشابہ۔ شہزادہ ہمایوں فر اس بیکس کی لاش دیکھ کر سخت غمگیں ہوئے۔

ایک ہفتے تک خوب جشن رہا۔ اندر بھی باہر بھی۔ وہاں ڈومنیوں نے یہاں ارباب نشاط نے خوب

دھما چوکڑی مچائی۔ اس کے بعد شہزادی بیگم نے بڑی بیگم کے ہاں پیغام بھیجا کہ اب جس قدر جلد ہو سکے شادی ہو جائے۔ مجھے اب اپنی زندگی کا بالکل بھروسا نہیں ہے۔ دلی آرزو ہے کہ میرے سامنے ہی ہمایوں فر کا نکاح ہو تا کہ بہو کو اپنی آنکھوں دیکھ لوں۔ بڑی بیگم نے منظور کر لیا۔ ایک تاریخ سعید بہتر از عید اس تقریب فرخ کے لیے مقرر ہوئی۔ شہزادہ ہمایوں فر کی برات کے اہتمام میں شہزادی بیگم نے بڑا روپیہ صرف کیا۔ جب شاہانہ کروفر سے برات چلی تو تمام شہر کے باشندے فرطِ مسرت سے جامے میں نہیں سماتے تھے۔

وہ زیب و زینِ زین کے وہ ساز کا پھبن زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دُلہن
چشمِ سیاہ دیدۂ آہو پہ طعنہ زن سرعت یہ تھی کہ بھولتے تھے چوکڑی ہرن
فوق اس کو تھا ہمارے سعادت نشان پر
سُم تھے زمین پر تو دماغ آسمان پر

جس نے اس سمندِ فلک سیر کو دیکھا پری کا جھمکڑا نظر آیا۔ جھوم جھوم کے جاتا تھا۔ ایسا ہی رفتار میں کبک و طاؤس کا چلن دکھاتا تھا۔ راکب سلیمان فر، مرکب ضرغام بہ فرس دُلہن کی طرح سجا ہوا فرس نوشہ بنا ہوا۔ نقیب دور باش و ادب کی صدا بلند کرتے تھے۔ شہزادے کے احباب بذلہ سنج ان کو دیکھ کے مُسکراتے تھے اور حضرت مارے خوشی کے جامے میں پھُولے نہیں سماتے تھے۔

جس طرف سے برات اس کرّ و فر اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ جاتی تھی تماشائی دعا مانگتے تھے یا الٰہی جوڑی برقرار رہے۔ دُولہا دُلہن عیش سے زندگی بسر کریں۔ جوانی کے لُطف اُٹھائیں۔ ایک بولا بس جوڑی ہو تو ایسی ہو، دولہا غنچہ دہن اور دلہن گُل بدن۔ دولہا صبح چہرہ۔ دلہن غیرتِ مہر۔ دوسرے نے کہا، اٹھتی جوانی ہے خوبرو ہے رشکِ یوسف روکشِ حور ہے پاکدامن ہے غیور ہے۔ اتنے میں میاں محمد عسکری بھی چوگوشیہ ٹوپی سرِ مبارک پر، جمائے شربتی کا انگرکھا پھڑکاتے ہوئے آئے۔ ان سے اور ایک جوانِ رعنا سے باتیں ہونے لگیں۔

جوان: کیوں حضرت یہ کون بزرگوار ہیں جن کی شادی ہے۔ صاحبزادہ چشمِ بد دور وجیہہ ہے۔ اَللّٰھم زِد فزد۔

محمد عسکری: حضرت یہ شہزادے ہیں۔ شہزادہ مرزا ہمایوں فر بہادر۔

جوان: کیسے تنے ہوئے بیٹھے ہیں اور کیوں نہ ہو شہزادے ہیں۔

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارہ بلندی

بھلا نسبت کہاں ہوئی ہے۔ ؟ وہ بھی کوئی شہزادی ہوں گی۔

محمد عسکری: جی ہاں۔ بڑی بیگم کا آپ نے نام سُنا ہوگا اُن کی پوتی کے ساتھ نسبت ہوئی ہے وہ بھی مالدار ہیں۔

جوان: خدا کرے دلہن بھی پریا ہو۔ ورنہ چاند کو گہن لگے گا۔

محمد عسکری: انتہائی حسین و زہرہ جبین ہے۔ شوخ طرار برق وش طناز ایک روز میں نے بالکل سادگی کی حالت میں دیکھا تھا۔ اسی وقت حمام کرکے سفید کپڑے پہن کر باہر آئی تھیں۔ واللہ بغیر زیور کے وہ جوبن تھا کہ بس دیکھیں۔ ایسی پری پیکر عورت تو دیکھنے میں نہیں آئی۔ ع

زیور ہے سادگی ترے رخسار کے لیے

خاتون خوب سیرت و پاکیزہ روی را
نقش و نگار خاتم فیروزہ گو مباش

جوان: اس وقت طبیعت کمال مسرور ہوئی۔ حسین مرد کو اگر حسین بیوی نہ ملے تو ستم ہے۔ اگر بیوی خوبصورت ہے اور میاں بد قطع تو بھی غضب ہے۔ لطف تو تب ہو کہ چاند سورج کی جوڑی ہو۔ بیوی پاکیزہ پیکر میاں رشک قمر۔ واللہ اِن دونوں کی خوب گذرے گی۔

محمد عسکری: میں نے اس محبوبِ دلفریب کو دیکھا ہے۔ ہائے ہائے اک تیر سا اس وقت کلیجے کے پار ہوگیا۔ واللہ وہ چشم کرشمہ ساز و شعبدہ باز۔ ہائے ہائے (آہ سرد بھر کر) ظالم مظلوم نما۔ بیگنہ کش فتنہ زا۔ مگر (آہ سرد کھینچ کر)

زہیچ یار مرا چشم آشنائی نیست
شکستہ جانم و امید مومیائی نیست

دل باختہ ہوں۔ حضرتِ عشق کا ساختہ و پرداختہ ہوں۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہے، جب میرے سامنے ناز و انداز برنائی سے متمکن ہوئی۔ اور نظر پڑتے ہی طرارہ بھر کے نظروں سے غائب ہوگئی۔ چوں بیامد ہوش از دماغِ ما برفت وچوں بنشست فغان از نہادِ ما برخاست۔

شمعِ دل عشاقاں بنشست چو او برخاست
افغان ز نظر بازاں برخاست چو او بنشست

جوان: حضور کا اسم شریف۔ اسی شہر میں دولتخانہ ہے۔

محمد عسکری : خاکسار کو محمد عسکری کہتے ہیں۔ غریب خانہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ مگر ننہال یہاں ہی ہے۔

جوان : (دبے دانتوں) حضور کی شادی تو ہوگئی ہوگی۔ غالباً ہے نہ۔

محمد عسکری : (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی نہیں بندہ پرور۔ اُسی مہ جبیں کے ناز کا کشتہ ہوں۔ اب تک عمداً اور قصداً شادی نہیں کی۔ مگر دردِ دل کی دوا نہ ملی۔ اور آج تو دل ٹوٹ ہی گیا۔ پارہ پارہ ہوگیا۔

ندانستم کہ چندیں خار خواہد رفت در پایم
شکستم بے سبب در خرقۂ تن سوزنِ دل را

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، اُدھر اشہب عقاب ہیبت فرطِ مستی سے جھومتا تھا اور اقبال رکاب کو بار بار چومتا تھا۔ ایک مرتبہ چرخی کی آواز سے شبدیز آہیختہ گوش کسی قدر بھڑکا تو شہزادے نے چمکار کر سنبھال لیا۔ ہر سمت نور کا عالم تھا۔ روزِ روشن پر اس شبِ نورانی کو فوق تھا۔

ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

مرزا ہمایوں فر کی مادرِ مہربان شہزادی بیگم اور اُن کی دونوں مہ پارہ بہنیں اور صدہا شہزادیاں اور بیگمیں اور مخدرات عصمت سمات جھروکوں اور دریچوں سے برات کا جلوسِ خسروانہ اور احتشام شاہانہ دیکھتی تھیں۔ وفورِ طرب سے ان بہنوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ شہزادی بیگم کے دل پر اس وقت ایک عجیب طرح کا اثر ہوتا تھا۔ جب نوشہ کا گلگوں خوشخرام سجا سجایا اٹھکھیلیاں کرتا سامنے سے نکلا اور انہوں نے دیکھا کہ ان کا لختِ جگر نورِ بصر ہونہار لڑکا شان اور آن بان کے ساتھ سمند ختلی خرام کے زرّیں لگام لیے ہوئے متمکن ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بحرِ مسرت اس درجہ جوش زن تھا۔ یہ نہ سمجھو کہ رائے کا باعث رنج و محن تھا ہمایوں فر نے سہرا دستِ چپ سے ہٹا کر اوپر کی طرف دیکھا تو بہنیں مسکرائیں اور ان کی بھاوج نے فرطِ ابتہاج سے دریچے کو کھول کر ہمایوں فر پر بے نقاب و بے تکلف نظر ڈالی۔ شہزادی بیگم نے کہا یا باری تعالیٰ میں گنہگار لونڈی کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں۔ ہائے ابھی دو دن کی بات ہے کیا سامان تھا اور اب تیری کریمی کی بدولت یہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ شہزادی تمام عمر میں کبھی اس قدر خوش نہیں ہوئی تھیں۔ سچ ہے۔

ماں باپ کی آسایش دراحت ہے پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خون جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے
آرام جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
یہ وہ ہے نگین نام ونشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہے جس سے
وہ در ہے قوی رشتہ جاں رہتا ہے جس سے
کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

برات آگے بڑھی تو ایک صندلی پوش فقیر بھیڑ کو کاٹ کر ہمایوں فر کی طرف جھپٹا اور لوگوں نے لینا لینا کی آواز بلند کی قریب تھا کہ ہمایوں فر کے گھوڑے تک پہنچے مگر شہزادے نے کہ فنِ شہسواری میں طاق تھے۔ ایسا اشارا بتایا کہ رخش خوش سلیقہ چاروں پتلیوں کو جھاڑ کر دس قدم بر ہو رہا۔ اس میں ایک آدمی کچل گیا مگر کسی کی جان نہیں گئی۔ لوگوں نے اس درویش کو گرفتار کر لیا۔ دیکھا تو اس کی کمر میں ایک خنجر پایا گیا۔ اتنے میں پولیس انسپکٹر اور برق اندازوں نے درویش کو گھیر لیا اور شہزادے کے دس جاں نثار اور جرار سپاہی گھوڑے کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ کہ مبادا کوئی اور گل کھلے۔ بڑا اہتمام بلیغ کیا گیا کہ شہزادے کو حملے سے مصئون رکھیں درویش نے باآواز بلند یہ شعر پڑھا۔

ماں باپ سے جدا کوئی گل پیرہن نہ ہو
پھولا پھلا اُجاڑ کسی کا چمن نہ ہو

انسپکٹر: سائیں یہ تمہیں اس وقت کیا سوجھی۔ تم اور ایسی نالائق حرکت۔؟

درویش: بچہ سوچ کر بات کرو درویش سے کوئی نالائق حرکت سرزد ہوئی بھلا وہ بھی تو مینے بقیر بلنوانے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔

انسپکٹر: یہ تم اس وقت نوشہ پر کیا سمجھ کے جھپٹے تھے اور تمہارے پاس یہ خنجر کیسا ہے۔ اور تمہاری کیا نیت تھی۔ چودا برس کے لیے بھیجے جاؤگے۔

درویش: بھلا کبھی خنجر نہیں بھی ہوتا ہے۔ یہ تو ہمارا پرانا دوست ہے۔ اب باقی رہی یہ بات کہ جھپٹے کیوں تھے۔ بچہ میں نے جو اس وقت یہ تزک و احتشام اور جاہ و تجمل دیکھا تو خدا جانے کیا یاد آیا۔ ایک وہ دن تھا کہ مرزا ہمایوں فر کا تابوت جاتا تھا اور آج ان کی برات جاتی ہے۔ ایک وہ دن تھا کہ قبرستان کی طرف جاتے تھے اور ایک آج کا دن ہے کہ دلہن کے گھر جاتے ہیں۔ ایک وہ دن تھا کہ ہائے ہائے کہرام مچا ہوا تھا۔

بر سینۂ و سر دست زنان میر فلند
پیش تابوت اُو چہ برتاؤ چہ پیر

اور آج مبارکباد کی آواز گونج رہی ہے۔

فیل اورنگ و ہوادار و سواری سعید — اے شہ ہند بہر راہ مبارک باشد
قوتِ روح لُطف و بدن پاک لطیف — بجہانبانی دلخواہ مبارک باشد
صد وسی سال باقبال و بدولت یارب — حشمت مرتبہ و جاہ مبارک باشد
مددِ احمد مختار ہمایوں بادا — النغاتِ اسد اللہ مبارک باشد

ہر مرادِ تو بود سیرِ ہمہ سیّارات
روزِ خورشید شود ماہ مبارک باشد

ایک روز وہ دن تھا کہ شہزادی بیگم اپنے بچے کو یاد کرکے زار زار روتی تھیں۔ ایک یہ دن ہے کہ خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ مگر آج کے حشم و جاہ کو دیکھ کر میرے دل پر خراب اثر ہوا۔

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
بھاگو بھاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
جاگو جاگو یہ خواب غفلت کب تک
دیکھو دیکھو اجل کمین گاہ میں ہے

اجل! اجل! ادھر اجل۔ اُدھر اجل! گھڑی دو میں مر لیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مر لیا باجے گی۔ ہائے۔ درویش کی اس تقریر سے سب کو سخت حیرت ہوئی۔ پرانے فشن کے ضعیف الاعتقاد آدمی کانپ اٹھے کہ خدا ہی خیر کرے۔ مگر نئی روشنی والے نوجوانوں نے درویش کو صلواتیں سنائیں۔ اس عرصے

میں باجا بجنا موقوف ہوگیا تھا۔ حکم دیا گیا کہ باجا بجے اور برات سجے انسپکٹر نے درویش کو کوتوالی بھیجا اور ادھر برات چلی۔ درویش نے بڑھ کر یہ رباعی پڑھی۔

انجام بخیر انتہا بگڑی ہے
گھر گر نہ پڑے کہیں بنا بگڑی ہے
کشتی سے انیسؔ ہم کنارے ہو جائیں
الٹا دریا بہا ہوا بگڑی ہے

شہزادہ: اس سے پوچھو تو آخر یہ کیا کہتا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے۔؟

دوست: اجی جانے بھی دو۔ کس پاگل کے منہ لگتے ہو بکنے دو۔

انسپکٹر: حضور یہ مجذوب ہے۔ دن بھر یہی بکا کرتا ہے۔ کسی کے حق میں کلمۂ خیر آج تک نہ کہا حضور اس کا خیال نہ کریں۔ سڑی ہے۔

شہزادہ: اجی نہیں۔ لاحول ولاقوۃ یہ کیا بات ہے۔ ہم اور خیال۔؟

دوست: نوشہ بنے ہو۔ باتیں نہ کرو۔ اس وقت تو ہم بزرگوں کا کہنا مانو۔ برات چکر کھاتی ہوئی چلی۔ بڑی دور تک تانتا لگا ہوا تھا۔ صدہا رؤسا و عمائد ہمراہ تھے۔ پیچھے پیچھے شہدے غل مچاتے تھے۔ ہاتھیوں سے خدمت گار روپیے اور اشرفیاں لٹاتے تھے۔

ہمایوں فر کے ایک دوست نے ان کے صبا رفتار گھوڑے کے قریب جا کر کہا واللہ اس وقت تو نوشہ ہی معلوم ہوتے ہو۔ اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ شہزادے ہو کہ ایسے ویسے۔ دوسرے نے آہستہ سے کہا چین لکھتا ہے۔ صدہا سختیاں اٹھائیں مصیبتیں جھیلیں جب جا کے یہ دن دیکھا۔ اُف خداوندا! واللہ وہ دن مجھ کو یاد ہے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک شخص نے بھیڑ کاٹ کر مرزا ہمایوں فر بہادر پر تلوار کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا تو پشتِ توسن سے شہزادہ ثریّا جاہ الا اللہ کہہ کر زمین پر آئے اور ساری برات میں کہرام مچ گیا۔ صدہا آدمی دوڑ پڑے۔ ہائے کیا غضب ہوگیا۔

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخ کہن آہ نیا دور ہوا
بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمین اور فلک اور ہوا

ماں صدقے بیٹا ذری آنکھیں تو کھولو

گودی ہے کبھی ماں کی کبھی قبر کا آغوش
گل پیرہن اکثر نظر آئے ہیں کفن پوش
سرگرم سخن ہے کبھی انسان کبھی خاموش
گہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسر دوش
اک طور پہ دیکھا نہ جوان کو نہ مسن کو
شب کو تو چھپر کھٹ میں ہیں تابوت میں دن کو

سرنگ طاؤس جلوہ کی پشت سے نوشہ کا گرنا ستم تھا۔ کچھ لوگ سمجھے کہ شدید بزی کی چھل بل کے سبب سے ران پٹری نہ جم سکی کسی کا ماتھا ٹھنکا کہ چھلاوا ہے۔ کوئی بولا ہائے کسی بیرحم موذی کافر نے جادو کردیا۔ مگر جن معدودے چند نے قاتل سفاک کے خنجر خون آشام کی چمک دیکھی تھی، وہ بے اختیار روتے تھے، قریب گئے تو دیکھا کہ اُس گل اندام کے جسم نورانی سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ گرتے ہی معاً اٹھایا تو بے ہوش۔ یار دوست احباب دوڑ پڑے، برات میں کہرام مچ گیا۔ باجے کے عوض بین تھا۔ چہچہوں اور قہقہوں کے عوض شور وشیں تھا۔ نشان کے ہاتھی کے ساتھ مرزا ہمایوں فر کا چھوٹا بھائی خوش خوش مصروفِ انتظام تھا، یہ خبر سنتے ہی دھک سے رہ گیا چند خدام دم دلا سا دیتے ہوتے لائے تو بھائی کی لاش دیکھ کر بنوراکر گرا۔

اتنے میں صاحب سول سرجن اور انسپکٹر جنرل بہادر اور کئی اسسٹنٹ سرجن اور آٹھ دس اطبا یونانی آئے۔ مگر وہاں کیا تھا۔ شہباز اجل مرغ روح کا شکار کر چکا تھا۔ نہنگ بحر آشام مرگ نے ماہی جان کو نوالہ بنایا تھا۔ روسا اور عمایدِ اِدھر اُدھر کھڑے مُنہ تکتے تھے۔ اکثر آدمی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ مگر حسرت اور حیرت کے ساتھ،

ایک: ہائے قیامت تو یہ ہے کہ عین دولہا اور نوشہ پن کی حالت میں یہ سانحہ ناشنیدنی واقع ہوا، یہ سہرا بندھا ہے اور یہ سر زمین پر پڑا ہے۔ ہائے ہائے۔ دہنے ہاتھ کی ایک پور میں مہندی رچی ہے،

جس دن کہ فراق روح وتن میں ہوگا — مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت نو پہن کر غافل — اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

دوسرا: شہزادی بیگم کے قلب پر کیسی گذرے گی۔ افوہ۔ توبہ توبہ۔

تیسرا: اور سپہر آرا سنیں گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ خداوندا، یہ بڑی بُری ہوئی۔ ہائے یہ کیا ہوا۔ ہمایوں فر بیچارے اور ایسی موت مرے۔ یا خدا آج تو محفوظ رکھا ہوتا۔ یا خدا دولہا دلہن کی صورت تو دیکھ لیتے۔ ادھر برات بادِ بہاری کی طرح جا رہی تھی۔ اور اُدھر حریف اپنی گھات میں تھا۔ ع

مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے۔ تمام شہر کے آدمی مثل طوفان امنڈ آئے۔ تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ چھنیں پھٹی پڑتی تھیں۔ جس نے سنا دوڑ پڑا۔ اور دم کے دم میں یہ خبرِ وحشت اثر شہر بھر میں مشتہر ہو گئی کہ ہمارے ملک کے شہزادے مرزا ہمایوں فر کو ایک شقاک خونخوار اور جفا کار نے قتل کر ڈالا۔ ابھی ہاتھی جھومتے ہوئے جاتے تھے۔ گنگا جمنی ہودے اور جھولیں شان و حشم کو دو بالا کرتی تھیں۔ سمند چھل بل کرتے طرارے بھرتے آتے تھے۔ شہنائی والے وہ لطف دکھاتے تھے کہ ناسمجھ تک کو وجد میں لائے تھے۔ اور اب سناٹا پڑا ہے۔ ڈنکے پر چوٹ لگتی تھی نقیب ادب کے ساتھ صدا بلند کرتے تھے۔ مگر اب بُکا و بین ہے ماتم ہو رہا ہے۔

آج مرا پیرِ مغاں کیا ہوا	کل جو بندھا تھا وہ سماں کیا ہوا
ساقی و مطراب نظر آتے نہیں	جا کے چھپے ہیں کدھر آتے نہیں
قلقلِ مینا ہے نہ چنگ و رباب	ناک میں آتی نہیں بوئے کباب
کیا ہی برستی ہے یہاں بیکسی	میکدہ اور ایک جہاں بیکسی

اب سُنیئے کہ شہزادی بیگم اور اُن کی بیٹیوں کو جو خبر ہوئی تو کلیجہ مُنہ کو آیا۔ شہزادی بیگم اپنے پیارے اور جوان لڑکے کے زخمی ہونے کا حال سُن کر رو دیں۔ جلوس اس کثرت سے تھا کہ اُن کی فنسیں بہت دور تھیں ابھی تک یہ خبر نہ تھی کہ چراغ ہستی گل ہو گیا ہے۔ صرف یہی سُنا تھا کہ زخم لگا ہے۔ تاب کجا کہ خود نہ دیکھیں۔ معاً فنس بڑھوائی۔ خواصوں کو ساتھ لیا اور روتی ہوئی چلیں۔ جب لاش کے قریب فنس پہنچی تو لوگوں کے دل بھر آئے اور اکثر رقیق القلب آدمی وہاں سے ہٹ گئے۔ کیوں کہ ان سے یہ ماتم دیکھا نہ جاتا۔

جب شہزادے کی نعش کے پاس فنس پہنچی تو شہزادی بیگم نے ہمایوں فر کہہ کر پردہ اُٹھایا۔ ہائے ستم وائے ستم۔ بس پیٹنا شروع کیا۔ ارے لوگوں یہ کیا ہوا۔ ماں صدقے بیٹا ذرا آنکھیں تو کھولو (بلائیں لیکر) بیٹا اُٹھو۔ برات سجی کھڑی ہے۔ ہائے ہائے برات کو چھوڑ کر کہیں دولہا ایسا کرتا ہے۔ (پھر بلائیں لیکر)

میرے شہزادے، میرے گلبدن، شہزادے تیری ماں رانڈ بیوہ تیرے سرہانے کھڑی ہے۔ اٹھو پیارے۔ اماں کے مرنے کی قسم۔ ہائے بیٹا لُٹ گئی۔ ارے میرا بھرا گھر لٹ گیا۔ میں واری، ذری آنکھ تو کھولو۔ میرے پاؤں تلے سے مٹی پہلے ہی نکل گئی تھی۔ جب تیرے زخمی ہونے کی خبر سُنی تھی۔

دنیا مجھے اندھیر ہے اس غم کی خبر سے
شعلوں کی طرح آہ نکلتی ہے جگر سے
دامن پہ ٹپکتا ہے لہو دیدۂ تر سے
بس آج سفر کر گئی شادی مرے گھر سے

تیرے باپ مرتے وقت مجھے تیرے سپرد کر گئے تھے۔ کچھ یاد ہے۔ ہے ہے تو بھی چھوڑ چلا۔ بس آج سے کسی جنگل میں جا کے رہوں گی۔ دن رات یہی دُعا مانگا کروں گی کہ یا میرے خدا بحق آلِ رسول میرے بچے کو جنّت میں جگہ دے۔ میرا معصوم بچّہ مجھ سے جدا ہوا ہے۔ خوب روؤں گی۔

دل اور کسی شغل میں مصروف نہ ہوگا
بس آج سے رونا مرا موقوف نہ ہوگا

افو۔ لوگو۔ ہائے۔ ارے بیٹا دغا دے چلے۔ ذری آنکھ تو کھولو۔ ہائے۔ ابھی تک ہمایوں فر کی بہنوں کو اس سانحہ جگر دوز کی اطلاع نہیں دی گئی۔ وہ دونوں پریاں جناب باری سے دعا مانگتی تھیں کہ یا اللہ شہزادہ اس قابل ہو جائے کہ برات الٹی واپس نہ آئے۔ اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ بھرا گھر لٹ گیا۔ کس کی برات کہاں کا نوشہ۔ وہاں ماتم ہو رہا ہے۔

ایک بہن کا نام مہ لقا بیگم تھا۔ دوسری کا خورشید لقا بیگم۔

مہ لقا: باجی جان۔ اللہ سے دُعا مانگو کہ بھائی اس وقت گھوڑے پر سوار ہو گئے ہوں۔

راوی: ہائے ہائے۔ اب تھوڑی دیر میں تابوت کی سواری ہوگی۔

خورشید لقا: مسجد میں آج گھی کے چراغ جلائیں۔ ہائے میرے مولا مشکلکشا مشکلکشائی کرو۔ یوں اچھے ہونے کو تو اچھے ہو ویں ہی گے مگر آج برات کا تر بتر ہونا کھلتا ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے مگر بہن باجے کی آواز نہیں آتی (پردہ اُٹھا کر) اُوف۔

راوی: ہائے ستم باجے کی آواز! باجے کی آواز کجا۔ اب ماتم کی آواز آئے گی یا باجے کی۔ اور یہ فقرہ کس قدر ستم ڈھاتا ہے۔ خورشید لقا بیگم بیچاری کو شک کی جگہ یقین تھا کہ اچھے تو ضرور ہوں گے۔ نہ اچھا ہونا کیا معنی۔ مگر دلی خواہش یہی تھی کہ آج برات منتشر نہ ہو برات ضرور جائے۔ ہائے ہائے ایک

بہن دُعا مانگتی تھی کہ اس وقت گھوڑے پر سوار ہو گئے ہوں۔ دوسری کہتی تھی کہ برات پریشان نہ ہونے پائے اور اُدھر اُن کی مصیبت زدہ ماں اپنے بچّے کی نعش کے پاس بکا کر رہی تھیں۔ اور شہزادہ خاموش سو رہا تھا۔

خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے
آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نے دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

مہ لقا: بی مغلانی۔ ذری کسی سے پوچھو تو۔ کہو اماں جان ابھی تک نہیں لوٹیں، خیر تو ہے۔ دو تین آدمی پے در پے دوڑا دو۔ مگر جلد۔

خورشید لقا: حکم دو کہ فوراً آجائیں اور فوراً آئیں اور ابھی ابھی اماں جان کو واپس لائیں۔ وہ اب وہاں کیا کرتی ہوں گی۔

راوی: بے اختیار رونا آتا ہے۔ اس بےخبری کو دیکھیے کہ فوراً آئیں واہ برات ہے کہاں۔ وہاں لاش پڑی ہے۔

خورشید لقا: یا اللہ۔ کیسی خوشی میں کیسا رنج دیا۔ کجا شادی کجا زخم۔

مہ لقا: جب شادی دیکھنے کا مُنہ بھی ہو۔ خدا کرے اب دُلہن کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں۔ اور باجا بج رہا ہو۔

راوی: ہونہہ۔ کلیجا منہ کو آتا ہے۔ قیامت بپا ہو گئی۔

مہ لقا: خواصوں سے دریافت کرو مہری کہ کوئی آدمی دوڑا دیا۔

مہری: اے حضور لونڈی تو خود کہنے گئی تھی ایک رونا گیا ہے اور دو چوبدار دوڑتے گئے ہیں اور خدا جانے کون کون گیا۔ اب ڈیوڑھی پر بس دو آدمی ہیں اور سب ملا کے کوئی دس بارہ آدمی سے زیادہ نہ ہوں گے۔

مہ لقا: اماں جان خوشی خوشی آئیں تو اسی دم گھی کے چراغ جلائیں۔

راوی: گھی کے چراغ اور یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے گھر کا چراغ ہی گل ہو گیا بازار میں دور و یہ آدمی کثرت سے منتظر کھڑے تھے کہ برات دیکھ لیں اُن سب کے دلوں پر مایوسی چھا گئی۔ کہیں ہمایوں فر کے حُسن و جمال کی تعریف ہوتی تھی۔ کہیں جاہ و جلال کی۔ ایک نے کہا بھائی اپنے وقت کا حاتم بڑا خرچنے

والا تھا۔ دوسرا بولا اس شہر میں تو اندھیرے گھر کا اجالا تھا۔ جیسی سیرت ویسی صورت،

کہئے مہ تو اُس کو تو ابرو نہیں اُس میں
مہتاب کہیں رخ کو تو گیسو نہیں اُس میں
ہے اک گل خورشید تو خوشبو نہیں اُس میں
آنکھیں نہیں پلکیں نہیں ابرو نہیں اُس میں
بو ہے گلِ تر میں یہ خط و خال کہاں ہے
قد سرو کا موزوں ہے تو وہ چال کہاں ہے

آنکھوں کو تو دیکھو کہ عجب جلوہ گری ہے
یاں دیدۂ نرگس کا بھی مضمون نظری ہے
حلقے میں سوادِ شبِ دیجور بھری ہے
یہ چشم میں پتلی ہے کہ شیشہ میں پری ہے
یہ شام و سحر حور و ملک نے نہیں دیکھی
آنکھ ایسی کبھی چشم فلک نے نہیں دیکھی

مگر رہے نام اللہ کا۔ اللہ باقی من کل فانی۔ اس اجل کمبخت سے ایک کی نہیں چلنے پاتی۔ کیسے کیسے گلبدن اس کی بدولت کفن پوش ہوتے۔ خدا جانے مرنے کے بعد کیا ہونا ہے،

کس نہ آمداز آن جہاں کہ تا پرسم ازو
کا حوال مسافران عالم چون شد

اس پر ایک انگریزی خواں نے آگے بڑھ کر کہا یہ سب بیہودہ خیالات ہیں مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر ذی روح کے جسم میں دو بڑی طاقتیں ایک کو انگریزی میں کیمیائی طاقت کہتے ہیں۔ دوسری کو وائٹل یعنی وہ جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔ کیمیائی طاقت کا میلان رہتا ہے کہ کل اجزا کو اُن کے اصلی اجزا سے ملادے۔ لیکن دوسری قوت اُس کو اس سے باز رکھتی ہے۔ جب یہ قوت عوارض اور تغیر کے سبب سے زائل ہوگئی تو دوسری قوت اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ کیمیائی قوت کُل عناصر کو اپنی اصل سے ملا دیتی ہے۔ اسی کا نام موت ہے بس اور کچھ بھی نہیں۔

مولوی: سبحان اللہ آپ نے تو اچھا فیصلہ کیا۔ جھگڑا ہی پاک کر دیا۔ بہشت دوزخ جزا سزا کسی سے

واسطہ ہی نہیں رکھا۔
شیخ: تو آپ کے نزدیک بعدِ مرگ کچھ بھی نہیں۔ سناٹا ہی سناٹا ہے۔ اور یہ روح کیا شے ہے۔ آخر بعدِ مرگ روح کہاں جاتی ہے۔
انگریزی خوان: روح بھی مثل عنقا کے ایک وہمی چیز ہے۔ ورنہ اصل میں کچھ بھی نہیں۔ بس نام ہی نام ہے۔ روح روح۔
مولوی: ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی، بودھ، سب مذہبوں میں روح کو مانتے ہیں۔ آپ کا مذہب ان سب مذہبوں سے نرالا ہے کہ روح ہی کو نہیں مانتے۔ تو پھر حضور خدا کو کاہے کو مانتے ہوں گے۔
انگریزی خوان: ہاں ہماری رای تو یہی ہے۔ روح کو نہیں مانتے۔
مولوی: خدا آپ کو راہ راست پر لائے۔ آپ بالکل گمراہ ہیں۔
جس نے سُنا کہنے لگا کہ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ بہار جوانی پر خزاں اجل نے عمل کیا خرمن عیش پر غم کی برق جہندہ گری۔

سبزہ رُخِ گلگوں پہ نکلنے نہیں پایا
نخلِ قد ابھی پھولنے پھلنے نہیں پایا
چہرے سے عیاں ہے کہ جوانی میں بھی کم ہیں
دو سال ابھی عشرۂ ثانی میں بھی کم ہیں

اٹھارہ انیس برس کا سن اور مصیبت پڑی۔ ماں ضعیف مصیبت زدہ بھائی خورد سال، خود نوعمر، اور اس درجہ صاحبِ حُسن و جمال۔

آغاز ہے سبزہ اُنھیں اٹھارواں ہے سال
کس فصل میں اس گل کو خزاں کرتی ہے پامال
اک نورِ مجسم ہے کہ ہے حشمت و اجلال
خورشید پہ نقطے ہیں کہ رخساروں پہ ہیں خال
سیارے ہوں اسپند جو سارے تو بجا ہے
تاروں کو فلک اُن پہ اُتارے تو بجا ہے

روتے نے مہری کو اندر سے بُلوایا۔ کان میں کہا کہ مہری غضب ہو گیا۔ ہائے ہمارے شہزادے گذر گئے۔ یہ ڈیوڑھی کا حال ہے۔

مہری: (ارے! ہے ہے لوگوں)۔

روّنا: چپ چپ چپ۔ بولو مت۔ حکم ہے کہ ڈیوڑھی پر اطلاع نہ دو چپکے سے مہری یا مغلانی سے کہہ دو۔ اور جعفری بیگم سے کہہ دو کہ سب کو دلاسا دیں۔ مگر اُن سے کچھ ذکر نہ کریں۔

مہری: (روکر) ہائے ہم سے تو اندر نہ جایا جائے گا۔ اُف افوہ۔

روّنا: مہری خدا کو یاد کرو۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ اُف اُف اُف!

مہری: بی مغلانی کو پکارلو ہم سے اندر نہ جایا جائے گا۔

روّنا: بی مغلانی۔ بی مغلانی۔ یہاں تک آجائیں ذرا۔

مغلانی: (پردے کے پاس سے) کہو فضلِ الٰہی ہے۔ اب کیسے ہیں۔

روّنا: ذرا آگے بڑھ آئیے۔ کچھ پوشیدہ بات کہنی ہے۔ سُن لو۔

مغلانی: (آگے بڑھ کر) کہو سرکار کہاں ہیں۔

روّنا: بی مغلانی۔ (روکر) شہزادے بہادر تو بیچارے سدھارے۔

مغلانی: (بہ آوازِ بلند) اے چل چُپ موئے درگور اللہ سمجھے تجھ سے۔

روّنا: ارے مجھ سے اب اور کیا سمجھے گا اللہ میرے مالک میرے آقا کو میرے سر سے اُٹھا لیا۔ ہوے ہوے ہوے ہوے۔ آہ آہ۔

مغلانی: (سر پیٹ کر) کیا بیگم صاحب کو معلوم ہو گیا ہے۔

روّنا: ہاں ہاں وہ تو لاش کے پاس ماتم کر رہی ہیں۔ کہرام مچا ہوا ہے بلٹ گئے۔ ہائے اس سے تو ہم مر جاتے تو اچھا تھا مگر اندر ابھی نہ کہنا منع کر دیا ہے کہ یہاں خواصوں وغیرہ کو ابھی اطلاع نہ ہونے پائے۔

مغلانی: نہیں۔ کچھ سڑن ہوں۔ مجھ کو کیا اتنی بھی عقل نہیں ہے۔

مہری: بی مغلانی اب کیا کریں ہم۔ ہائے ہائے مجھے صورت نظروں کے سامنے پھرتی ہے۔ منہ بالکل غنچہ تھا۔ ارے یہ کیا ہو گیا۔ (آہ سرد بھر کر) چلے تھے دُلہن بیاہنے۔ واہ ری قسمت۔

مغلانی: (زمین پر بیٹھ کر) کمر ٹوٹ گئی (کھڑے ہو کر) جی گھبراتا ہے یا میرے اللہ۔ یہ کیا کیا یہ ہمارے ہی لیے مصیبت تھی آج جیسے خوش تھے ویسے خوش کبھی کاہے کو ہوئے تھے۔

روّنا: پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔ ابھی گھوڑے پر سوار ہوئے اور ابھی جیسے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اس موت کا مُنہ کالا ہو۔ خدا اس سے سمجھے۔ اتنے میں اندر سے ایک خواص نے آن کر کہا۔ اے وہ مہری آئیں

وہ بیٹھ رہیں۔ مغلانی آئیں اُنھوں نے چھاونی چھائی اور حضور غل مچا رہی ہیں۔ چلو۔ ہاں۔ برات اب آگے بڑھی۔ خدانخواستہ زخم بہت تو نہیں لگا۔ مہری نے کہا بہن اللہ کو یاد کرو۔ (روکر) ستم ہوگیا۔ ہائے ستم ہوا۔

خواص : (چھاتی پیٹ کر) ہے ہے کیا ہوا۔ بولو بہن کیا ہوا۔!

مغلانی : ذرا ضبط کرو۔ اندر ابھی نہ کہنا۔ شہزادے ہمارے جنت کی طرف سدھارے۔ ہائے۔ بہن یہ کیا ہوا۔ کاش کے ہم ہی مر جاتے خواص باہر نکل آئی اور سر پیٹنے اور آہستہ آہستہ رونے لگی۔ ہے ہے لوگو ہم پر آج مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہائے ہم کسی لائق نہ رہے دین اور دُنیا دونوں سے گئے گذرے۔ خواص نے اندر جاکر کہا۔ برات رُک گئی ہے اور ڈاکٹر لوگ علاج کر رہے ہیں۔ مغلانیاں یہ خبر سنتے ہی اس قدر روئیں کہ رومال اشکوں سے تر بتر ہوگیا۔ جعفری بیگم سر کو دیوار سے پھوڑنے لگیں۔ اس وقت ان کے ہاں ساٹھ ستر عورتوں سے کم نہ تھیں۔ شہزادیاں اور نواب زادیاں اور رئیس زادیاں اور مغلانیاں خواصیں مہریاں پیش خدمتیں جو برات کے ساتھ تھیں سب صید محن تھیں۔

اتنے میں دروازے پر شہزادی بیگم کی فنس ٹھہری اور اترتے ہی انھوں نے بین کرنا شروع کیا۔

بھرا گھر لٹ گیا۔ ارے میرے گیسوؤں والے شہزادے آخری دیدار تھا۔

اُن کی فنس کے بعد مہ لقا اور خورشید لقا اور کئی بیگمات کی فینسیں آئیں۔

خورشید لقا : اماں جان بھائی کو کہاں چھوڑ آئیں۔ ہائے اماں جان بھائی کو چھوڑا کیوں کر گیا۔ ہائے ہم تو نہ چھوڑیں گے۔ ارے لوگو ہمارے بھائی کو لے آؤ۔ بھائی تیری بہن دروازے پر کھڑی بلک رہی ہے (ماں سے مل کر)۔ اماں جان میں کیا کروں۔

مغلانی : حضور اک ذرا صبر کیجیے (ہاتھ پکڑ کر) سر نہ پھوڑو سرکار۔

خورشید لقا : (ہاتھ زور سے چھوڑ کر) مجھے جی بھر کے رو لینے دو۔

مہ لقا بیگم سر پیٹتی ہوئی فنس سے باہر تک آنے میں تین بار گریں۔ ایسی تاریکی آنکھوں میں چھائی کہ باہر آن کر تمام عالم تیرہ و تار نظر آتا تھا۔ ہجوم اشک کے سبب سے ماں پر نظر بھی نہیں ڈال سکی۔

جعفری بیگم : مہ لقا۔ بہن ماں کو سمجھاؤ۔ بوڑھی ستم رسیدہ ماں کے سامنے روتی ہو۔ اُن کی کیا حالت ہوگی۔ بالکل لٹ گئے۔ ہے ہے۔ ہے ہے۔ (سر پیٹ کر) میں کس کو سمجھاؤں اندر والا تھامے نہیں تھمتا دل کا کنول بُجھ گیا۔

شہزادی بیگم: ہائے میرے لال میرے بیٹے ارے دو ہی گھنٹے میں دغا دی کوچ کر گئے۔ چل بسے۔ ہائے ہائے ہائے۔ ذرا سی مصیبت ہوتی تھی تو رو دیتی تھی کہ یا اللہ میرے لال کے دل کا کنول بجھنے نہ پائے اور آج یہ دن دیکھا۔

ہمایوں فر کا چھوٹا بھائی اپنے ماموں سے گلے مل کر روتا تھا۔ ماموں سمجھاتے تھے۔

دُلہن کی بے خبری

دُنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں
وہ گُل یہ ہے گُل بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست مروت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جس میں
بے دردوالم شام غریباں نہیں گذری
دُنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

شہزادہ بہادر کی دونوں قاقم اندام اور زیبا کلام بہنیں اور اکثر نوجوان پری چہرہ شہزادیاں جو بناؤ چناؤ کر کے برات کے ہمراہ بیش بہا فنسوں پر سمدھیانے جاتی تھیں۔ اپنے غنچہ دہن اور گلبدن عزیز کی لاش کے اردگرد صف بستہ ماتم کر رہی تھیں۔ جو تھی پری رو عنبر و سیم بدن پاکدامن کس خوشی میں جاتی تھیں اور اس سفاک کے خنجر جگر دوز نے ستم ڈھایا۔ نعش کے گرد ان اصنام شوخ و شنگ رشک گلچہرگان فرنگ کا ماتم اور بھی ستم ڈھاتا تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اندر کا اکھاڑا ہمایوں فر کے ماتم میں بین کر رہا ہے یا پرستان سے پریاں اتر اتر کر نازک نازک ہاتھوں سے گورے گورے سینے پیٹ رہی ہیں۔ شہزادہ سادہ عذار و طرحدار کو جن شہزادیوں نے تمام عمر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تک اس طرح پھوٹ پھوٹ کے روتی تھیں جیسے کوئی اپنے خاص بھائی یا بہن کو روتے۔

ایک دفعہ شہزادی بیگم نے باآواز بلند کہا۔ ارے لوگو ابھی بارات جاتی تھی۔ ابھی دُلہن کے گھر تک پہنچی نہ تھی کہ میرے لال کی سواری باغ جناں میں داخل ہو گئی۔ یہ فقرہ سُن کر مہ لقا اور خورشید لقا خوب زار زار روئیں اور دوہتھڑ پیٹنے لگیں۔ جو ہمجولیاں قریب کھڑی تھیں ان میں سے ایک نے خورشید لقا بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ جھلا کر بولی۔ ہے ہے یہ اندھیر۔ دیکھو بہن بھائی کو روتی ہے تو یہ لوگ زبردستی

کرتے ہیں ہائے مجھے جی بھر کے رو لینے دو۔

مہ لقا: ابھی ابھی مبارک سلامت کی آواز آتی تھی اب لوگ پرسا دینے آئیں گے۔ واہ کیا دُنیا کے کارخانے ہیں۔ ہے ہے۔

خورشید لقا: ہے ہے یہ مظلومی کی موت!!! ہنستے بولتے گھر سے جانا اور سارے شہر کو رلاتے ہوئے آنا واہ بھائی واہ۔!

بھو بیگم: بیٹا سدا کسی کا کسی سے ساتھ رہا ہے۔ یہ بتاؤ۔

خورشید لقا: پھوپھی اماں ہمیں رونے دو۔ ہمارا ماں جایا بھائی جنّت کو سدھارا ہے ہائے پھوپھی اماں یہ کیا ہوگیا ہے (سر پیٹ کر)۔

بھو بیگم: بیٹا میں تمہیں کیوں کر سمجھاؤں۔ لڑکیوں ذرا اس کا منہ دھلاؤ۔ پانی جلدی سے لاؤ۔ مُنہ ہاتھ دھولے بیٹا۔ شاباش۔

خورشید لقا: نہ پھوپھی اماں ابھی میں ہی بھیگتی تھیں کہ میّت کا غسل ہوا۔ ہائے۔ ہائے۔ ہائے۔ ہائے۔ اُف۔ اُوف۔

غش آگیا اور خورشید لقا بیگم تیورا کر گر پڑیں۔ ان کی پھوپھی نے سر کو گود میں رکھا۔ لخلخہ سونگھایا گیا۔ مغلانیاں پنکھیاں جھلنے لگیں۔ جب آنکھ کھلی تو کہا ذری۔ بہن کو بلاؤ۔ بہن گلے لگو (روکر)۔ ہائے سوچتے تھے کہ بھاوج آئے گی۔ خوب چہل پہل ہنسی دل لگی ہوگی مگر جب مُنہ بھی ہو۔ وہ بیچاری بھی ہمارے گناہوں میں مٹ گئی۔ اماّ جان۔ جناب امیر کی روح کا صدقہ ہمارے بھائی کو جگا دو یا ہم کو بھی سُلا دو۔ شہزادی بیگم نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔ بابا مجھے دیکھو۔ ساٹھ برس کا سن ہے اور جوان لڑکے کی لاش میرے سامنے پڑی ہے۔ محبّت کے یہ معنی ہیں کہ اُف نہ کرے۔ مردے پر عذاب ہوتا ہے۔ جتنا روگے اُتنا اس بیچارے۔

راوی: بیٹی کی تشفی کے لیے کلیجے پر پتھر رکھ کر سمجھاتی تھیں کہ رونا کم کرو ورنہ تمہارے بھائی پر عذاب ہوگا۔ مگر دو ہی کلمے کہہ کے زبان بند ہوگئی پوری بات زبان سے نہ نکلی۔

مہ لقا: اُف۔ ایں! یہ کیا ہوا۔ اُف۔ ایں! ہائے ہائے۔!

مہ لقا بیگم کی صورت سراپا حیرت تھی۔ غم نے دل میں اس درجہ جگہ کرلی تھی کہ رونا نہیں آتا مگر چہرے سے وحشت برستی تھی۔ اور وہ صورت زیبا اور وہ گورے گورے رخسارے جو عابد صد سالہ کو فریب دیتے بھیانک اور زردی مائل نظر آنے لگے۔ خورشید لقا کو غش پر غش آتے تھے۔ ہوش

آیا اور پھر زار قطار رونا شروع کیا۔ ان کے جگر دوز کلمات اور خون رلاتے تھے۔ شہزادی بیگم اور ان کے اعزہ کا جگر یہ فقرہ سن سن کر پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہاتھ سے دل مل رہا ہے۔ سارا عالم آنکھوں میں سیاہ تھا۔ ہائے افسوس مغلانی نے خورشید لقا بیگم سے کہا۔ حضور ایک گھونٹ پانی پی لیجیے۔ بڑے اصرار کے بعد خورشید لقا نے مُنہ کھولا تو ایک گھونٹ پیتے ہی پھینک دیا اور کہا۔ تجھے نیکی دے خدا یہ کس نے مانگا تھا۔

مغلانی نے پانی کے عوض انار ترش کا افشردہ دیا تاکہ خورشید لقا بیگم کو ذرا تشفی ہو۔ مگر انھوں نے افشردہ انار پینے سے انکار کیا۔ اتنے میں شہزادی بیگم کے دوسرے بھائی باہر سے آئے کہا۔ بہن لاش کو وہاں سے گھر میں کیوں لائیں یہ کس نے صلاح دی۔ امام باڑے میں کیوں نہ رہنے دیا۔ حکم دیا ہوتا کہ امام باڑے میں رہے۔ مگر خیر تم کو اس وقت ہوش کجا۔ خورشید لقا ان کی آواز سُن کر اُٹھ بیٹھی۔ کہا ماموں جان اب ہم کیا کریں۔ کہاں سے لائیں۔ اب بھائی زندہ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا بیٹی صبر کا پتھر کلیجے پر رکھو۔ یہ طلسم حقیقی ہے طلسم مجازی بہت دیکھے ہوں گے۔ اب طلسم حقیقی بھی دیکھ لو۔

جو شے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحر جہاں میں عمر مانند حباب
غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

ابھی دوسرا ہی برس تو ہے کہ تمہارا خالہ زاد بھائی مجھے داغ دیکر چل بسا۔ پھر میں نے کیا کیا۔ رو پیٹ کے بیٹھ رہا۔ اور مجھے تو رونا بھی نہیں آتا مگر ہاں حیرت سی ہوتی ہے کہ یہ کیا ہو گیا ورنہ رنج سہتے سہتے پتھر کا کلیجہ ہو گیا۔

نہیں کچھ غم گلستاں سے جو فصل گل روانا ہے
وہ بُلبُل ہوں کے گُل کھا کھا کے تازہ گُل کھلانا ہے
کہو اس بُرق وش سے آج لازم ساتھ جانا ہے
جنازے پر ہمارے ابر رحمت شامیانہ ہے
دامن میں چینٹیوں کے میری زنجیروں کا دانا ہے
جنوں مجھ زار کو تسپر بھی کہتا ہے توانا ہے
مثال نقش پا لاکھوں پڑے رہتے ہیں سر اُس جا
مگر قاتل ترا گنج شہیدان اُستانا ہے

گریبان پھاڑے دستِ جنون سے ہوگی کب فرصت
ابھی تو دامنِ صحرا کے بھی پرزے اُڑانا ہے
چلوں گا سر کے بل شوق شہادت دستگیری کر
جہاں تلوار چلتی ہے اسی کوچے میں جانا ہے

حضرت نے اسی مقام پر بلاتکلف یہ اشعار گا گا کے رونا شروع کیا۔ خواتین اور خادمہ سب دنگ کہ یا خدا یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ لاش سامنے رکھی ہے۔ اردگرد ماتمیوں کا حلقہ ہے۔ کوئی غش میں پڑا ہے۔ کسی کو سکتا ہے۔ کوئی آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ کوئی دیوار سے سر ٹکراتا ہے اور حضرت خوش الحانی کے ساتھ غزل گاتے ہیں۔ باہر تک آواز گئی تو اُن کے بھائی یعنی ہمایوں فر کے دوسرے ماموں اندر آئے کہا جناب آپ تو غضب کرتے ہیں۔ یہ گانے کا کون موقع ہو بھلا چلیے باہر۔ تشریف لے چلیے ہزار خرابی حضرت باہر آئے تو یہاں بھی واہی تباہی باتیں کرنے لگے۔ پہلے زور سے یہ شعر پڑھا۔

نے ہمیں از جوئے شمشیرت گلویم ترنشد
آب پیکانِ تو ہرگز بردلم بنشستہ است

راوی: یہ صاحب ہمایوں فر کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہمایوں فر کو انھوں نے پالا تھا۔ اس واقعہ نادیدنی اور عبرت خیز نے انھیں دیوانہ بنا دیا۔ کہتے کچھ تھے مُنہ سے کچھ نکلتا تھا۔ کبھی اندر جاتے تھے کبھی باہر آتے تھے اور کلمات بیہودہ وبے معنی زبان پر لاتے تھے دو چار نواب زادوں نے سمجھایا مگر دل قابو میں نہ تھا۔ سب کو صاف جواب دیا کہ ہمارے مُنہ نہ لگو۔

جناب مرزا صاحب۔ آپ مرد ہیں۔ آپ پر فرض ہے کہ صبر کیجیے۔ اور اپنی ضعیفہ ہمشیرہ کو سمجھائیے۔ لڑکوں کو تسلّی دیجیے نہ کہ خود اس قدر پریشان ہوتے۔ ع

صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

مرزا: صبر! الٰہی توبہ صبر کیسا۔ صبر کجا۔ اور صبر کرے کون۔

منشی: بندہ نواز آپ کے رنج میں شک نہیں خدا صبر جمیل عطا کرے عورتوں کو جا کر سمجھائیے کہ سر اپنا پھوڑ رہی ہوں گی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید
زجام دہر مے کل من علیہا فان

ہاں اس قدر خیال البتہ ہوتا ہے کہ ابھی سبزہ آغاز تھے اور سب سے زیادہ حسرت یہ ہے کہ دولہا

نے قضا کی۔ ہا۔ ہے ہے۔

مرزا: افسوس مجھے کہتے ہیں کہ صبر کرو۔ واہ قسمت۔ ہائے ہائے۔

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ

باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

قعر دریا میں تختہ بند کر دیا۔ تختہ بند اس سبب سے کہ تڑپنے پنائے۔ ہاتھ پاؤں مار سکے یہ ممکن ہے اس قدر کوہ الم ٹوٹ پڑے اور صبر ہو سکے۔ اب دوسرا حال سُنیے۔ ناظورۂ رنگین ادا عروس ماہ سیما سپہر آرا بیگم سولہ سنگار کر کے بعد شان برنائی متمکن تھیں۔ مشاطگان کامل فن و چابک دست نے اس طرح سنوارا تھا کہ دلہن کا جوبن دہ چند زیادہ ہو گیا تھا وہ حُسن خدا آفرین۔ عالم افروز۔ تجیر سوز کہ لاکھوں میں انتخاب کروڑوں میں لاجواب۔ یوں تو سپہر آرا بیگم پر یوں بھی ستم کا جوبن تھا لیکن مشاطگان عدیم السہیم نے آتشِ حُسن کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام

قیامت کرے جن کو جھک کر سلام

ہمجولیوں کی چھیڑ چھاڑ اور چہل پہل سے عجیب ہی لُطف تھا حُسن آرا بیگم کھلی جاتی تھیں کہ آج پیاری بہن کا نکاح ہے۔ ہمایوں فر سا شہزادہ قمر طلعت ہمارا بہنوئی ہوا۔ روح افزا کہتی تھیں۔ سپہر آرا اب ہمایوں باغبان سے خوب خوب گلدستے بنوانا۔ سپہر آرا جھینپ کر گردن نیچی کر لیتی تھی۔ بہار النسا نے کہا کوٹھے پر سے جو روز تاک جھانک ہوتی تھی اُس کا نتیجہ نکلا۔ آخرش نکاح ہوا ہی ہوا۔ اور ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ہمایوں فر اور سپہر آرا کی خوب جوڑی ہے۔ اللہ کرے دونوں میں نکاح ہو۔ خدا نے دعا قبول کر لی۔ جہاں آرا بیگم بولیں۔ واہ اِن کی دُعا قبول ہوئی۔ یوں نہیں کہتیں کہ ہم نے اماں جان سے ہزار باری کہا ہاتھ جوڑے پاؤں پڑے کہ ہمایوں فر کے ساتھ سپہر آرا کا نکاح ہو جائے جب جا کے کہیں انھوں نے مانا ورنہ کبھی خدا نخواستہ شادی نہ ہوتی۔

بہار النسا: اے واہ۔ ایلو اور سنو۔

جہاں آرا: ایں۔ اچھا! چلو امی جان سے پوچھیں۔ خود سپہر آرا ہی سے نہ دریافت کر لو کیوں بہن اچھی بہن بتاؤ کس نے کوشش کی تھی۔

بہار النسا: جب ہمارے وہاں گئی تھیں تب بھی ہم نے کہا تھا۔ کیوں۔

حُسن آرا: بڑی بہن ہو۔ اب کیا کہوں۔ تب تو آپ نے لڑوا ہی دیا تھا بس یاد کیجیے۔ زیادہ مُنہ نہ

کھلوائیے۔ ہاں۔

راوی: حضرات ناظرین۔ یہ فقرہ سمجھنے کے قابل ہے۔ یاد ہوگا کہ بہار النسا نے کوشش بلیغ کی تھی کہ محمد عسکری اور حسن آرا میں عقد ہو جائے۔ آزاد کی نسبت انواع و اقسام کی بد خبریں مشہور کر دی تھیں۔ اس وقت حسن آرا نے وہی طعنہ دیا۔ اور طعنہ بجا تھا۔ بہار النسا اس قدر خفیف ہوئیں کہ رنگ فق ہو گیا۔ آنکھیں نیچی کر کے کہا کیوں حسن آرا ابھی اقرار کیا تھا کہ اب یہ بات زبان پر کبھی نہ لائیں گے۔ بھلا یہ ہنسی خوشی کا وقت ہے یا خدانخواستہ لڑائی جھگڑے کا۔

نظیر بیگم: سپہر آرا بہن سچ کہنا، اس وقت دل کا کنول کیسا کھلا ہوگا، مُنہ مانگی مراد پائی ہے نہ ہیں نے مرزا ہمایوں فر کو دو بار ہی دیکھا ہے، چشم بد دور، اچھے کلّے ٹھلّے کے جوان ہیں۔ اور ابھی بالکل کم سِن ہیں۔

جانی بیگم: اوہو۔ کہیں یہ تو جی نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ہی ساتھ نکاح ہو جائے تو اب آج سے تم کو سپہر آرا کی سوت کہیں گے۔ سوتیا ڈاہ بُری ہوتی ہے۔ دیکھیں شہزادے کس محل کو زیادہ پیار کرتے ہیں۔

حُسن آرا: ہائیں ہائیں۔ جانی بیگم یہ کیسی بیہودہ تقریر کرتی ہو۔

مغلانی: اے اوئی۔ بیوی۔ نوج۔ ایسی بہو بیٹی کسی کی ہو۔

جس قدر عورتیں وہاں بیٹھی تھیں، سب کی سب دنگ ہو گئیں۔ کسی نے دانتوں کے تلے اُنگلی دبائی کوئی زیر لب مسکرائی۔ کسی نے کہا عورت کیا سوا مرد ہے۔ کوئی بولی۔ واہ ری چھوکری جُما جُما (جمعہ جمعہ) آٹھ دن کی پیدائش اور ایسی ڈھیٹ کہ بڑی بوڑھوں کے سامنے جو کچھ واہی تباہی مُنہ پر آتا ہے بک دیتی ہے۔ جانی بیگم کھل کھلا کر ہنس پڑیں مگر نظیر بیگم کو یہ لچر گفتگو ایسی بُری معلوم ہوئی کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے گیتی آرا نے سمجھایا کہ بہن اس شہدی کو بکنے دو تم اس وقت نہ بولو۔

بہار النسا: ہم نے ہمایوں فر کے ساتھ لڑکپن میں کھیلا ہے۔ دیکھو پوچھوں گی کہ یاد ہے، یا بھول گئے۔ یاد کیوں نہ ہوگا۔

جانی بیگم: بھلا کس سن تک کھیلا ہے۔ چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کے سن تک (ہنس کر) چھپو نہیں۔ سچ سچ بتاؤ۔

بہار النسا: اب تمہارے منہ کون لگے۔ اے بہن جب ذری ذری سے بچے بچے تھے کوئی آٹھ نو برس کا سن ہمارا تھا۔ اور برسیں پانچ ایک کے وہ ہوں گے یا شاید کم ہوں۔ ہمیں تو خوب یاد ہے ان کا حال نہیں معلوم۔

جانی بیگم: ہم نے بھی پڑوس کے ایک لڑکے سے کھیلا تھا۔ نان بائی کا لونڈا ہے چھ مہینے کے ہم تھے اور کوئی تین ہفتے کا وہ تھا۔

بہار النسا: جیسی روح ویسے فرشتے۔ کھیلیں بھی تو نان بائی کے لونڈے کے ساتھ۔ اے واہ۔ کیوں نہ ہو۔ ہونھ۔

بہار النسا بیگم نے کہا جانی بیگم خدا کے لیے بہن ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہاری ہنسی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اور ہم لوگ ان باتوں سے واقف نہیں ہیں۔ جانی بیگم تنک کر بولی۔ اے ہے ذری سچ کہنا ایسی تھی۔ کیا وہ بنی جاتی ہیں۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ ہونھ۔ ادھر یہ باتیں ہوتی تھیں۔ اُدھر نظیر نے سپہر آرا بیگم کے کان میں کہا۔ بہن ہو قسمت کی دھنی اللہ کرے سکھ دیکھو، چین کرو خاتون جنّت کی قسم وہ دولہا پایا ہے۔ جو لاکھوں میں ایک ہے کروڑوں میں فرد۔ نک سُک سے درست چہرے مُہرے سے درست۔ کوئی عیب نہیں۔ حسب نسب میں کوئی کیا حرف رکھے گا۔ شہزادے ہیں ایک حساب پوچھو تو ہم سب اُن کی رعایا ہیں۔

سپہر آرا: بہن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اللہ گواہ ہے مجھے شادی مرگ کا خوف ہے میرا دل اسی قدر خوش ہے کہ جامے میں پھولے نہیں سماتی ہوں اللہ اللہ ہمایوں فر کی برات آتی ہے ایک دن مجھ سے گلے بھی مل گئے تھے کہلا بھیجا کہ ہمایوں فر کی بہن خورشید لقا بیگم آتی ہیں۔ ہمیں کیا معلوم یہ آئے اور آتے ہی کہا آؤ بہن گلے تو ملیں۔ ہم خوب دل کھول کے گلے لپٹے۔ جب معلوم ہوا کہ خود ہمایوں فر تھے تو دھک سے رہ گئے۔

نظیر بیگم: اخاہ۔ جب ہی۔ میں نے بھی اڑتی سی خبر سُنی تھی۔

سپہر آرا: ہم نے کسی سے ذکر تھوڑا ہی کیا۔ اور ذکر کیا کرتے۔ کوئی کہنے کی بات تھی اور اچھی طرح دو کنواری لڑکیوں کو گلے لگایا۔ دیکھو جاتے کہاں ہیں۔ پہلے اسی بات پر آڑے ہاتھوں لوں گی کہ کیوں بندہ پرور۔ یہ ہتھکنڈے ہیں۔ اب تمہارا کیا اعتبار جہاں نوخیز جوان حسین چھوکری دیکھو گے پھسل جاؤ گے۔ پیغام بھیجو گے۔ دیکھو کیسا شرماتے ہیں۔ اتنے میں بہار النسا نے جھک کے کان میں کہا آج تم دلہن ہو سمجھیں۔ نظیر بیگم کہیں بھاگی نہیں جاتی ہیں۔ پھر دل کھول کے باتیں کر لینا۔ سپہر آرا سوچنے لگی کہ بعد مدّت آرزو بر آئی۔ ہمایوں فر کی محنت اور کوشش و کشش نے رنگ اثر جمایا۔ ہم نے چاند سا دولہا پایا۔ زندگی کے لطف حاصل ہوں گے۔ مگر کھٹکا ہے کہ کہیں شادی مرگ نہ ہو جائے۔ اتنی خوشی کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اللہ ہمارا مالک ہے۔

ہمجولیاں طرح طرح کے آوازے کستی تھیں اور جانی بیگم تو بیدھڑک کھلی کھلی کہتی تھی۔ ایک دفعہ کہا۔ ہم تو ایک بات ضرور کہیں گے سالی آدھی جورو ہوتی ہے۔ اور نظیر بیگم سپہر آرا کی منہ بولی بہن ہیں

تو اس حساب سے ہمایوں فر کی سالی ہوئیں۔ اور سالی آدھی جورو ہوتی ہے۔ ہمایوں فر ان کے بھی میاں ہوئے اکثر رئیس زادیاں زیر لب مسکراتی تھیں۔ اور رنگین طبع نوجوان خاتونیں کھل کھلاتی تھیں مگر جن کو شرم وحیا اور ادب کا زیادہ لحاظ تھا وہ خاموش ہو رہتی تھیں۔

حسن آرا: آج نظیر بیگم بیچاری کے پیچھے بے طور پڑیں ہیں یہ۔

جانی بیگم: انہوں نے تو خود ہی کہا کہ ہمایوں فر پر ریجھی ہوئی ہیں۔ ورنہ بھلا کوئی شریف زادی بھی برابر والے مرد کے حسن کی تعریف کرے گی۔ اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوگی۔ ان کا بیشک ہمایوں فر پر دل آیا ہے اس میں ذری فرق نہیں۔

نظیر بیگم: بہن ایسا نہ ہو کہ دل لگی دل لگی میں میری جان پر بن آئے۔ بات کا بتنگڑ ہو جائے۔ سسرا سن لے تو قتل ہی کر ڈالے۔ ہاں۔

حسن آرا: وہ کون ہیں۔ کیا بڑے غصہ ور ہیں۔ بھلے آدمی ہوں گے۔

جانی بیگم: اے نہیں ان کی ساس اُن کے گھر پڑ گئی ہیں۔ ہاں ہاں۔

اس فقرہ پر بڑا قہقہہ پڑا۔ اور نظیر بیگم بیچاری پھر آبدیدہ ہو گئی۔ تقریر میں جانی بیگم سی طرار عورت سے کیوں کر جیت سکتی۔ کسی شہزادی نے پوچھا ان کے سسرے کا نام کیا ہے۔ جانی بیگم تڑ سے بول اٹھی۔ ایلوچہ خوش وہ تو شیطان سے زیادہ مشہور ہیں۔ اُنھیں کون نہیں جانتا۔ بلاقی مرغ باز اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور سپہر آرا بھی بے اختیار ہنس دی۔

حسن آرا: بڑی شوخ ہیں۔ عورت کیا ہے۔ شمشیر برہنہ ہے۔ اُفوہ۔

بہار النسا: بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ زمین پر تو قدم ہی نہیں رکھتیں۔

دُلہن جان: نظیر بیگم بیچاری بھلا ان سے کیا جیت پائیں گی۔

جانی بیگم: تم آؤ تمہارے سُسر کو بھی میں جانتی ہوں۔

دولہا کے گھر میں حشر بپا ہے کہرام مچا ہوا ہے، اور دلہن کے یہاں ڈومنیاں گاتی، بجاتی ہیں۔ ہنس ہنس کے لڑتی ہیں بھرپور بیل پاتی ہیں۔ ہمجولیوں میں چہل ہو رہی ہے۔ جانی بیگم کی چھیڑ چھاڑ نوک جھوک روح افزا کی شوخی بہار النسا کا نکھار حسن آرا کا نستعلیق مذاق سپہر آرا کا جوبن قابل دید تھا بلکہ دید تھا نہ شنید تھا۔

بڑی بیگم: اس اہتمام میں تھیں کہ کوئی چھینکنے نہ پائے۔ کسی کی زبان پر نحس کلمہ نہ آئے۔ جریب لیے کمر جھکائے ادھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ جہاں آرا دُلہن کے پاس بیٹھی تھیں گیتی آرا دو چار نواب زادیوں کے ساتھ

ایک طرف بچپیسی کھیل رہی تھیں اور سپہر آرا سولہ سنگار کر کے گردن جھکائے سوچتی تھیں کہ ہمایوں فر سے یوں ملوں گی۔ اور یوں لطف کے ساتھ زندگی بسر ہوگی۔ دل میں ٹھنی تھی کہ پہلے دن خوب جی بھر کے شکایت کروں گی کہ شہزادی کے بھیس میں ہمارے ہاں کیوں آئے۔ ایک دفعہ سوچی کہ ہم کو تو خیر اب اس کا خیال نہیں، مگر باجی جان کو جب وہ چھیڑیں گے کہ کیوں صاحب آپ تو ہمایوں فر کی بہن سے مل چکی ہیں۔ تب باجی البتہ لجائیں گی۔

من درچہ خیالیم و فلک ــــ درچہ خیال

کاری کہ خدا کند فلک ــــ راچہ مجال

ہائے کوئی اس نادان سے اتنا تو کہہ دو کہ کس پھیر میں پڑی ہے۔ ہمایوں فر دل لگی دل لگی میں حُسن آرا کو چھپائیں گے؟ واہ۔ افسوس اور یہ خبر ہی نہیں کہ ہمایوں فر پر کیا گذری۔

اِتنے میں ایک مغلانی آئی کہا حضور شاہ چھڑے کی گلی کی طرف سے جو چوک میں میری ڈولی آئی تو افوہ میں کیا عرض کروں سرکار کھچا کھچ آدمی بھرے ہوئے تھے۔ ڈولی بھلا کہاں جا سکے۔ ہاتھی اور گھوڑے اور اونٹ اور سانڈنی سوار اور باجے کے ٹٹو اور تلنگے، اور گوروں کا باجا، انگریزی باجا، ہندوستانی باجا، شہنائی والے، ڈنکے والے، چوبدار، خاص بردار جھنڈی والے تامدان میانے پینسیں، چاندی سونے کے ہوادار، ایسا ٹھاٹھ تو منجھلے نواب کی برات میں بھی نہ تھا۔ بہار النسا بولی اور ساتھ بھی ہزاروں آدمی ہوں گے۔ مغلانی نے کہا۔ ہزاروں! لاکھوں نہیں کہتیں ہزاروں! اے حضور کروڑوں کی نوبت آئی ہے۔

جانی بیگم : کروڑوں نہیں سنکھوں۔ بوڑھی ہوئیں مگر وہی بنی رہیں۔

مغلانی : حضور۔ بے دیکھے بھالے فرماتی ہیں اور لونڈی دیکھے آتی ہے۔ وہ بھیڑ ہے کہ تھالی اُچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ بڑی تیاریاں ہیں۔

جانی بیگم : واہ۔ تیاریاں۔ اے برات نکلی تھی نظیر بیگم کے سُسرے کی جس کے ساتھ لاکھوں مرغ باز تھے اور ہزاروں چھری بند بھائی۔

نظیر بیگم : کہتی جاؤ۔ ہم جواب ہی نہ دیں گے۔ آپ ہی تھک جاؤں گی۔

جانی بیگم : نہیں نہیں۔ جواب دو بہن میری بہن۔ جواب ضرور دو۔ دیکھیں تو کیا کہتی ہو۔ ذری چونچ تو کھولیے مرغ باز کی بہو ہو کر باتیں۔

مغلانی : سُنا ایک مہینے تک ناچ ہوگا۔ حیدر جان کو عظیم آباد سے بلوایا ہے اور دلی کے دو طائفے آئے

ہیں۔ لاکھوں صرف ہوں گے۔

جانی بیگم: پھر کون بڑا کمال ہے۔ کروڑپتی ہیں بھی تو نظیر بیگم کے سسرے کی ہمت کو دیکھو۔ شاباس ہے اس کو مرغ لڑا لڑا کے اس دھوم سے بیاہ کیا کہ بوچڑوں بھر کی دعوت کردی۔ کیوں بہن۔

حسن آرا: نوشہ کو بھی دیکھا تھا بی مغلانی۔ ضرور دیکھا ہوگا۔؟

مغلانی: جی ہاں حضور سینہ تانے ہوتے بانکپن سے گھوڑے پر جمے تھے۔ اِدھر اُدھر چوبدار سونے چاندی کے عصا لیے ہوئے ساتھ تھے۔ سُنا کہ فقط گھوڑے کے سجنے اور اس کے ساز اور زیور میں کوئی اسّی ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اُف۔ یلغاروں روپیہ بھرا ہے بادشاہ ہیں۔

حسن آرا: اللہ اور دے۔ دونوں میاں بیوی چین سے رہیں۔

خواصیں: آمین۔ آمین۔ اللہ کرے جوڑی صد و سی سال برقرار رہے۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔

اتنے میں ایک بیگم صاحب کی سواری آئی۔ فنس سے اتریں، اندر آئیں بیٹھیں۔ حسن آرا اور روح افزا نے بندگی کی روح افزا کی طرف مخاطب ہوکر کہا تم نے کچھ اور بھی سُنا۔ چوک کی دکانیں لوگوں نے آج دس دس بارہ بارہ روپیہ پر لی ہیں۔ سُنا برات کے ساتھ شہر بھر کے امیرزادے اور رئیس اور کئی انگریز بھی آئے ہیں۔ میں نے اپنے کوٹھے سے دیکھا تو اونٹ اور خاص بردار اور ہاتھی نظر آئے باقی سب جلوس آڑ میں تھا خدا جانے کہاں کہاں کے ہاتھی آئے ہیں۔ دو ہودے خود ہمایوں فر کے ہاں کے ہیں۔ ایک گنگا جمنی شیر وہاں۔ دوسرا بالکل سونے کا۔ دس ہزار کو ایک جھول آج ہی صبح کو خریدی ہے۔ اور جس فنس پر سپہر آرا جائیں گی اُس کی لاگت سے سب کے ہوش اُڑتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے عقل گم ہوئی ہے۔

اس کے بعد ایک بوڑھی خادمہ آئی۔

حسن آرا: اے دلاری آج لنگڑاتی ہوئی کیوں آتی ہو۔

دلاری: بیوی اُف۔ بیٹھو تو بتاؤں۔ مر گئی تھی آج۔

بہار النسا: کیوں کیوں۔ خدا خیر کرے کیا ہوا کیا۔ ہیضہ ہوا تھا کیا۔

بڑی بیگم: کیا منحوس باتیں مُنہ سے نکالتی ہو۔ اور کوئی ذکر نہیں ہے۔

حسن آرا: ہاں امّا جان۔ دیکھتی ہو۔ ان کی یہی عادتیں ہیں امّا جان۔

بہار النسا: (دانتوں کے تلے اُنگلی دبا کر) ارے یہ کہاں سے بولیں۔

دلاری : بڑی حضور کو لونڈی کا آداب۔ سرکار آج بہت بچی، میں کیا عرض کروں کہ کس قدر بھیڑ ہے، اور میں برات میں جا کے پھنس گئی ادھر گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ اُدھر ہاتھی جھوم رہے ہیں۔ کہیں اونٹ کہیں گھوڑے میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ ایک طرف کو بھاگی مگر اونٹ کی ٹانگ کے نیچے آ گئی وہ تو کہو بچہ تھا اونٹ کا نہیں تو کیا جانے کیا کا کیا ہو جاتا۔ ایک گھنٹے تک اُٹھا نہیں گیا۔ اب لنگڑاتے لنگڑاتے یہاں تک آئی ہوں۔ مارے بھیڑ کے چلنے کی جگہ نہیں ملتی۔ اس قدر کا جماؤ ہے۔ انگریزی باجا۔ میں کیا عرض کروں بیوی جس نے نہیں سنا دُنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اب کوٹھے پر سے دیکھ لیجیے گا۔

مغلانی : اور تمہارے سوا کسی اور نے کا ہے کو سُنا ہو گا بھلا۔

دلاری : کیا۔ یہ انگریزی باجا جو بھنگی بجاتے ہیں۔ وہ جو انگریز گورے لوگ بجاتے ہیں۔ سُنو تو آنکھیں کھل جائیں۔

محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے
سارے معشوقوں کی سرتاج پری آتی ہے

جانی بیگم : اے واہ رے تیرے بے تکے پن۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کہاں برات اور انگریزی باجے کا حال کہتی تھیں کہاں اب پکھراج پری یاد آئی۔ واہ وا وا۔

روح افزا : دلاری بوا۔ تم بادشاہ کی اندر سبھا میں تھیں۔ برات کی تیاری اور جلوس کی کثرت کا حال سُن سُن کر سپہر آرا اور حسن آرا اور اُن کی بہنیں دل ہی دل میں خوش ہوتی تھیں۔ جو آتا تھا برات کا ایک نیا ہی کردفر بتاتا تھا۔ دلاری اپنی سرگذشت ختم نہ کر چکی تھی کہ ایک خواجہ سرا آیا۔

الماس خواجہ سرا۔

الماس : (بڑی بیگم سے) آداب عرض۔ نواب جعفر علی خاں بہادر نے بھیجا ہے کہ جا کے دیکھو جہیز کا سامان سب دُرست ہے یا نہیں۔ خورشید دولہا نے سب سامان مجھے دکھا دیا۔ دو تین چیزوں کی کسر ہے۔ آپ کے دوسرے داماد کہتے ہیں کہ اب کسی شے کی فکر نہ کرو۔ جہاں آرا بیگم کے میاں اُن سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ اور خورشید دولہا تو ہر دل عزیز ہیں۔

بڑی بیگم : مجھے دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ جیسے جہاں آرا کے میاں ویسے بہار النسا کے ویسی ہی روح افزا کے۔ مگر اُن کو بھیج دو کہو وہاں رہتے حکومتیں کرتے ہو۔ یہاں تک آتے ہوئے مہندی گھستی ہے۔ کہہ دینا چھوٹے مرزا سے اور اگر کسر ہو تو اب اس وقت پوری تھوڑا ہی ہو سکتی ہے۔ برات دروازے پر آن پہنچی، اور اب وہ جہیز کی فکر میں ہیں۔

الماس : اے حضور ایک چشم زدن میں تو ہم دو شادیوں کا سامان بہم پہنچائیں۔ ع

زر بر سر فولاد نہ ہی نرم شود

کیا ہم روپیہ کا مینہ نہیں برسا سکتے۔ اور برات اب آئے تو چار گھنٹے ہیں۔ کوئی ایسی ویسی برات ہے چوک میں دو رویہ دوکانوں پر آدمی ڈٹے ہوئے ہیں۔ کہ برات آتی ہوگی۔ چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔ اُف رے سامان اور اللہ رے جلوس۔ ہاتھیوں کی صف دیکھیے تو اور ہی لطف ہے۔ جھولیں اس شان کی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بادشاہ زادے ہیں کہ ہائیں ان کے ہاں کیا نہیں ہے۔ ادھر وہ کون شے ہے جو وہ بہم نہیں پہنچا سکتے۔ ایک ذرا سے اشارے میں خدائی کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔

بڑی بیگم : تم جاکے چھوٹے مرزا سے کہو کہ میاں آؤ۔ اور یہاں آن کے سب سامان دیکھو۔ یہ نہیں کہ وہاں سے بیٹھے بیٹھے باتیں بناتے ہو۔

الماس : بہت خوب۔ ابھی جاتا ہوں اور نواب صاحب تو خود تیار بیٹھے تھے۔ فقط اس بات کے منتظر تھے کہ برات دیکھ لیں تو پھر اس طرف روانہ ہوں۔ میں آداب عرض کرتا ہوں۔ حضور اطمینان رکھیں چٹکیوں میں سب سامان ہوا جاتا ہے۔

بڑی بیگم : اور تو سب باتوں کا انتظام ہو چکا ہے۔ بس یہی باقی تھا ادھر بڑی بیگم مصروف اہتمام تھیں۔ ڈومنیوں کی خوش الحانی نواب زادیوں کی جادو بیانی۔ برابر والیوں کی چُہل نے رنگ جمایا تھا اُدھر ایک نیا گل کھلا۔ جن کمروں اور کوٹھوں میں جہیز رکھا تھا اُن میں آگ لگ گئی۔ ہائے ستم بڑی بیگم نے کہا ارے لوگو یہ کیا ہوا۔ اُف اُف۔ ارے یہ شعلے کیسے بلند ہیں کم سن خاتونیں ڈر گئیں۔ کلیجے دھڑ دھڑ کرنے لگے۔ کوئی شوخی کے ساتھ اِدھر بھاگی۔ کوئی بد حواسی کے مارے اُدھر جھپٹی۔ اتنے میں نواب خورشید علی خاں بہادر اور مرزا اسد الدولہ بہادر اور نواب محمد حیدر بیگ اندر دوڑ آئے۔ کہا واسطے خدا کے گھبراؤ نہیں۔ آگ گل ہوئی جاتی ہے۔ بمبا آ گیا۔ آدھی آگ بجھ گئی۔ ابھی تک کچھ ایسا نقصان نہیں ہوا ہے۔

بڑی بیگم : ہے ہے۔ نقصان ہوگا تو کیا ہوگا۔ مجھ نصیبوں جلی کو خیال ہے تو یہ ہے کہ بد شگونی ہوئی۔ آگ لگی۔ اس سے زیادہ بد شگونی اور کیا ہوگی۔ اندر باہر قہقہے پڑ رہے تھے۔ گھر بھر میں خوشی ہی خوشی کا سماں تھا۔ آگ کمبخت کو بھی اسی وقت ستانا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد آگ لگتی۔ اگر گھر بھر پھُنک جاتا تو کیا بات تھی۔

خورشید لقا : اب آپ ان سب کی تشفی کیجیے۔ دیکھیے۔ کیسی بد حواس بھاگ رہی ہیں۔ اس وحشت

کو دیکھیے، سمجھایے جا کے۔

مغلانی: حضور آپ سب صاحب جو تشریف لائے جن کو سامنے نہیں آنا ہے وہ اِدھر اُدھر چلی گئیں حضور آدمی تو باہر کثرت سے ہیں مگر شعلے تیز ہی ہوتے جاتے ہیں۔

بڑی: اے بیٹا اب تم باہر ہی جاؤ۔ میں یہاں سب کو سمجھا لوں گی۔ سب صاحب باہر گئے دیکھا کہ پانی کے گھڑے! اور مشکیں اور مشکیزے برابر پڑ رہے ہیں مگر آگ بھڑکتی ہی جاتی ہے۔ شعلے کم نہیں ہوتے۔ اتفاق سے ہوا نے اور زور باندھا کہ الامان اور شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔ اس وقت بڑی بیگم بالکل مایوس ہو گئیں، اور ایک کونے میں جاکر آہستہ آہستہ خوب روئیں۔ الغرض آدھ گھنٹے میں خدا خدا کر کے وہ کافر آگ کل ہوئی۔ آگ گل ہوئی تو معلوم ہوا کہ جہیز کا نصف سامان جل گیا۔ اب سُنیے کہ ایک گھوڑا کھڑے کھڑے مر گیا۔ بس دیکھتے دیکھتے لوٹ گیا اور دم کے دم میں دم غائب۔

عبّاسی: حضور وہ سمند گھوڑا جو اس مہینے میں لیا گیا تھا وہ مر گیا۔

بڑی بیگم: ارے! سچ؟ لا رے ذری خورشید دُولہا کو تو بلاؤ۔

عبّاسی: (ڈیوڑھی پر جاکر) ذری چھوٹے میاں کو بلاؤ تو۔

دربان: کس کو۔ چھوٹے میاں کون۔ ہاں۔ اچھا۔ اچھا۔ نواب خورشید علی خاں بہادر اندر آئے۔

بڑی بیگم: صاحبزادے۔ یہ کیا سُنا۔ کیا سمند گھوڑا گر پڑا۔

خورشید دُولہا: کچھ عقل نہیں کام کرتی۔ لاحول وَلاقوۃ۔ توبہ۔

بڑی بیگم: آخر ہوا کیا۔ کیا اندھا تھا۔ سائیس سے اچھی طرح پوچھو۔

خورشید دُولہا: جی نہیں۔ کل تو میری سواری میں تھا۔ کوس بھر گیا۔

: بہار النسا: کیا ہوا۔ کہا گھوڑا سچ مچ مر گیا۔ ہمارے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ توبہ توبہ۔ اور ابھی خریدا تھا۔ ایک ہزار پر پانی پھر گیا۔ یہ کیا بُری باتیں ہوئی ہیں۔

خورشید دُولہا: اچھا تم جاؤ اپنا کام کرو تم کو اس سے کیا واسطہ۔

بڑی بیگم کو شک کے عوض یقین ہو گیا کہ نتیجہ اچھا نہ نکلے گا۔ یہ انتہا کی ضعیفُ الاعتقاد تھیں۔ اور ایک ان پر کیا فرض ہے۔ ہندوستان میں فیصدی چار پانچ شاید ایسے مقام پر مغموم نہ ہوں، ورنہ چھیانوے فیصدی کو حق الیقین کا درجہ ہو گا کہ اِنھیں واقعات ہولناک سے ہمایوں فر قتل کیے گئے۔ حالانکہ اس کی کچھ بھی اصلیت نہیں۔

اب سُنیے کہ حُسنِ اتفاق سے ایک ڈولی ان کی ڈیوڑھی پر ٹھہری اور سواری اُتری۔ دروازے پر

مغلانی نے جھک کر سلام کیا کہا حضور آپ کہاں تھیں۔ آنکھیں آپ کو ڈھونڈتی ہیں۔ بڑی سرکار حضور کو یاد کرتی تھیں۔ مگر آپ نے کوئی خط تک نہ بھیجا۔ آگے بڑھیں اندر گئیں تو بڑی بیگم نے خوش ہو کر کہا۔ اخاہ۔ بڑی بات بڑے وقت کام آئیں۔ مجھے اس وقت خاص کر تمہاری ہی ضرورت تھی خوب آئیں بہن اُس عورت نے کہا شادی مبارک ہو میں سن کے بہت خوش ہوئی کل ہی آنے کا قصد تھا مگر مینہ برسنے لگا۔

بڑی بیگم نے کہا آج ہنسنے بولنے کا دن ہے۔ مگر یہاں ایک سے ایک بڑھ کر بات ہوتی ہے۔ پوچھا کیوں خیر باشد۔ یہ اس طرف دھواں سا کیسا ہے۔ ایں! کیا آگ لگی تھی خدانخواستہ۔

بڑی بیگم: ابھی ابھی آگ لگی تھی۔ جہیز کا سامان آدھا جل گیا۔

عورت: (مُنہ بنا کر) ہوں۔ افسوس۔ بُرا ہوا مگر خدا ہے۔

مرد باید کہ ہراساں نشود

مشکلے نیست کہ آساں نشود

مرد سے مطلب مردوے ہی سے نہیں ہے۔ یہ ڈومنیاں کہاں ہیں گانا کیوں موقوف کیا۔

بڑی بیگم: اور سنیے گھوڑا کھڑے کھڑے اسی دم مر گیا۔ ابھی ابھی۔

عورت: آہ۔ آہ۔ توبہ توبہ۔ یہ ہے کیا ماجرا۔ ہُونہہ۔

حسن آرا: اُستانی جی بندگی عرض ہے بہت جلدی آئیں آپ۔

راوی: یہ عورت اُستانی جی تھیں بڑی بیگم کو ان کے آنے سے تقویت ہوئی۔

اُستانی جی: ہیں ایک ایسے ہی کام میں تھی ورنہ ضرور آتی۔

بڑی بیگم: پھر اب کیا کہتی ہو۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آگ اور موت۔

اُستانی جی: صبر و تحمل۔ راضی برضا۔ آنچہ مرضی اوست ہمہ نیکوست۔

ماییم کہ از ہر دو جہاں موجودیم۔ اے اہل نگاہ

از ارض و سما ظہور ہر مقصودیم۔ لولاک گواہ

باآنکہ بنودیم و بناشیم و نئیم صنعت بنگر

شور عدم ما چہ قدر موجود است۔ اللہ اللہ

کنہ صنعت بیچوں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ خدا ہی جانے کہ یہ دُنیا کیا ہے، اور زندگانی کیا ہے، اور نیکی اور بدی کیا ہے۔ کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من
ایں حرف معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوی من و تو
چوں پردہ برافتد نہ تو دانی و نہ من

حسن آرا: امّاں جان۔ اب گانا شروع ہو۔ آگ لگی تو کیا ہوا۔ بچوں نے الماس خواجہ سرا کو بھیجا ہی تھا۔ ابھی کل چاہیے نہ، پھر چٹکیوں میں بندوبست ہو جائے گا۔

اُستانی جی: یہ گانا کیوں موقوف کیا گانا بجانا تو آج ثواب ہے۔

حسن آرا: بلالو۔ بہار النسا بہن عباسی ڈومنی۔ اور منی اور فرخندہ کو بلالو۔ اُستانی جی نے اجازت دے دی۔ بس اب کیا ہے۔

بڑی بیگم: (مسکرا کر) وہاں! اور ہم کوئی ہوئے ہی نہیں خیر۔

حسن آرا: واہ آپ پہلے سے گرانی خاموشی نیم رضا۔ ہے کہ نہیں۔

اُستانی جی: ہاں تم ڈومنیوں کو بلواؤ۔ ہم تو کہتے ہیں۔ کہو گائیں۔ اُستانی جی نے ڈومنیوں کو بلوا کر گانا شروع کرا دیا۔ پھر وہی چہل پہل، وہی دل لگی تھی۔ وہی قہقہے وہی چہچہے۔ جب دیکھا کہ لڑکیاں خوش و خرم ہیں تو بڑی بیگم کو علاحدہ لے جا کر نصیحت آمیز باتیں کرنے لگیں۔

اُستانی جی: سنو بہن! ہر حالت میں انسان کو خوش رہنا چاہیے۔

بڑی بیگم: اور خوش نہ رہے تو کیا کرے۔ اور آج کا دن تو ہنسنے بولنے کا ہے ہی۔ مگر یہ دو باتیں ایسی ہوئیں کہ ان سے لطف آدھا ہو گیا۔

اُستانی جی: چلو جو ہوا وہ ہوا۔ اسی پر ٹل گئی۔ اتنا تو سوچیے۔

چوں میگذرد عمر چہ شیریں وچہ تلخ	پیمانہ چو پر شود چہ بغداد چہ بلخ
می خور کہ بسے ماہ بریں چرخ کہن	از سلخ بہ غرّہ آید از غرّہ بہ سلخ

بس انسان کو لازم ہے کہ افعال بد کا مرتکب نہ ہو۔ بس۔

آنم کہ پدید گشتم از قدرتِ تو	پروردہ شدم بناز در نعمتِ تو
صد سال بامتحان گنہ خواہم کرد	تا جرم من است بیش یا رحمتِ تو

جانی بیگم اپنی دل لگی اور مذاق کی باتوں سے سب کو ہنساتی تھیں اور نظیر بیگم بیچاری تو جانی بیگم کی زیر مشق تھیں۔ عباسی سے جانی بیگم نے پانی مانگا پیا کہا اس پانی میں ایک طرح کی خوشبو آتی ہے۔

عباسی بولی حضور پانی میں خوشبو نہیں آتی ہے رومال کی خوشبو تھی، یہ انگریزی عطر ہے۔ بالوں کے عوض کپڑوں میں ملا جاتا ہے۔ بالوں میں نہیں ڈالتے ہیں۔ رومال کو تر کر دیا اور دماغ معطر ہو گیا یہ انگریزی عطرِ گلاب تھا مرزا ہمایوں فر بہادر تے یہ عطر بڑے اہتمام بلیغ سے منگوایا تھا۔ نہایت تکلف کے ساتھ سپہر آرا کے پاس بھیجا تھا۔ وہ عطر عباسی نے رومال پر چھڑک لیا۔

سپہر آرا: (اونچی نظر کر کے مُسکراتی ہوئی) ہوں ہوں۔ سمجھی۔

بہار النسا: اوئی۔ اے تم دلہن ہو یا بڑی بیگم کی جگہ تم ہی ہو۔؟

عباسی: نہیں سنو ایک بات کہی۔ ہم سمجھ گئے۔ تھی ایک بات۔

جہاں آرا: کیا بات تھی ہم تو سُنیں۔ کہدو۔ آج سب معاف ہے۔

بہار النسا: ہم دولہا سے پہلے ہی دن کہیں گے کہ ان کو سلیقہ ضرور سکھانا۔

حُسن آرا: واہ، وہ کہیں گے کہ بڑی بہن ہوے تم نے تو کچھ سکھایا ہی نہیں، پھر تو شرماؤ گی یا پھر بھی نہ شرماؤ گی۔

تحقیقات

صاحب انسپکٹر جنرل پولیس ڈپٹی انسپکٹر جنرل، سیٹی مجسٹریٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سیٹی سپرنٹنڈنٹ۔ کئی انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر معاً موقع واردات پر آئے۔ ادھر صاحب مجسٹریٹ ضلع اور ان کے اسسٹنٹ چار تحصیلدار خبر پاتے ہی پہنچے اور قاتل کا پتا ہی نہیں مقتول کی لاش موجود۔ بات منتشر، قاتل ندارد۔ خلق خدا کا اژدحام، تحقیقات ہونے لگی۔ صاحب مجسٹریٹ ضلع نے بیڑا اٹھا لیا تھا کہ قاتل کو ڈھونڈھ نکالیں گے اتنے میں صاحب کمشنر بھی آئے۔ کمال افسوس کیا۔ شہزادے کی لاش دیکھ کر بہت روئے۔ دیکھا کہ ان کی ماں شہزادی بیگم اپنے پیارے بچے کی نعش کے پاس ماتم کرتی ہیں۔ فوراً ادب کے ساتھ ٹوپی اُتاری اور کہا بیگم صاحب ہم آپ کا بہت مطیع غلام کمشنر ہے۔ افسوس ہے کہ شہزادہ جو ہمارا بڑا دوست تھا اس کو ہم ایسی حالت میں دیکھتے ہیں۔ شہزادی بیگم نے اس کا کچھ بھی جواب نہ دیا یا صرف ماتھے کو ٹھونک کر رونا شروع کیا۔

کمشنر: (صاحب مجسٹریٹ ضلع سے) ول قاتل کا پتا ہی نہیں ہے۔

مجسٹریٹ: یہ آپ کے پولیس کی کارروائی ہے۔ افسوس کا مقام ہے۔

کمشنر: (سپرنٹنڈنٹ پولیس سے) بڑے الزام کی بات ہے بہت برا ہوا۔
سپرنٹنڈنٹ: بیشک۔ کمال افسوس ہے اتنے بڑے شہزادے کو قتل کیا اور عین برات میں قتل کیا پولیس کے اس قدر آدمی ساتھ تھے۔ انسپکٹر انتظام کے لیے ہمراہ اور قاتل قتل کر کے صاف نکل بھاگا۔ ہم کو خود شرم آتی ہے ہم ہمہ تن مصروف ہوں گے۔
کمشنر: ایک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔ چار انسپکٹر اور آپ خاص اس کام کے لیے مقرر کیے گئے۔ سیٹی سپرنٹنڈنٹ آپ کا کام بھی کریں۔ بڑے اہتمام سے تحقیقات شروع ہوئی۔ پہلے مرزا ہمایوں فر کے مصاحب خاص شیخ عطا اللہ سے دریافت کیا گیا جو قتل کے وقت گھوڑے کے ساتھ تھے۔ انھوں نے یوں اظہار دیے میں نوشہ کے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر ہمراہ رکاب جاتا تھا۔ جس شخص نے قتل کیا اس کو میں نے بیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر برات کے سات ایک مقام پر کسی نواب زادے سے باتیں کر رہا تھا۔ جس وقت یہ شخص جھپٹا میری نظر گھوڑے کی طرف تھی۔ میں سمجھا یہ بھی برات کے انتظام میں مصروف ہے۔ ہائے اگر میں یہ جانتا تو اُسی دم ٹٹوے پر چڑھ بیٹھتا۔ جب اس شخص نے شہزادے پر ہاتھ چھوڑا اور وہ گرے تو میں گھبرا اُٹھا اور لاش کی طرف لپکا۔ واللہ اعلم قاتل کس طرف چلا گیا۔
سوال: تم اُس نواب کو پہچانتے ہو جس سے وہ باتیں کرتا تھا۔؟
جواب: نہیں میں اُن سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن اگر میرے سامنے آئیں تو پہچان لوں۔ دہرا بدن ہے۔ چوگوشیہ ٹوپی دیے تھے اور رومال اوڑھے تھے شبنم اور جامہ زیب آدمی ہے۔
سوال: قاتل نے شہزادے کو تلوار سے مارا یا بندوق سے۔؟
جواب: بندوق سے تو نہیں قتل کیا۔ کیونکہ بندوق کی آواز ہوتی مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ تلوار سے مارا یا کھانڈے سے یا خنجر یا قرابنیچہ یا شیر بچہ کیا تھا۔ زخم تو کٹار کا سا ہے۔
سوال: بھلا یہ شخص کبھی شہزادہ ہمایوں فر کے پاس آتا جاتا تھا۔؟
جواب: میں نے اس کو ان تین برسوں میں کبھی نہیں دیکھا۔

کئی نواب زادے ان کے روبرو لائے گئے۔ جن میں انھوں نے ایک شخص کو پہچانا اور کہا انہیں سے وہ شخص باتیں کر رہا تھا۔ صاحب مجسٹریٹ نے ان سے نام دریافت کیا۔ انھوں نے کہا خاکسار کو محمد عسکری کہتے ہیں۔
کمشنر: وَل۔ برات آپ کس کس سے بات کرتا تھا آج۔ کون تھا۔
محمد عسکری: جی حضور میں سمجھا نہیں۔ برات آج نکلی تھی۔ کیا۔؟

کمشنر: برات جو آج کا ہے اس میں آپ کس سے بات کیا تھا۔
محمد عسکری: حضور اکثر آدمیوں سے گفتگو ہوئی نواب زادوں رئیسوں دوستوں اور سب سے بات چیت ہوئی تھی اب کس کا نام عرض کروں۔
کمشنر: دل کسی اجنبی سے بھی ہوا تھا بات چیت وہ کون تھا۔
محمد عسکری: ہاں خداوند۔ ایک اور شخص سے بھی گفتگو ہوئی تھی اس نے آہ سرد بھر کر کہا کہ افسوس یہ پری ہمارے ہتّے نہ چڑھی مگر میں اس کو پہچانتا نہیں ہوں دیکھوں تو پہچان لوں۔ میں نے اچھی طرح اس کو دیکھا نہیں۔
صاحب کمشنر بہادر نے قلم دوات کاغذ دے کر کہا کہ اس کا حلیہ لکھ دیجیے۔ محمد عسکری نے حلیہ لکھا۔ حکم ہوا کہ آپ کہیں چلے نہ جایئے گا تا اختتام تحقیقات یہیں رہیے۔ اس کے بعد ہمایوں فر کے ایک چچازاد بھائی کے اظہارات لیے گئے۔ جس کا نام آغا شمس الدین خاں بہادر تھا۔
آغا: حضور میں بھی اپنے بھائی کے گھوڑے کے قریب جاتا تھا۔
مجسٹریٹ: ول نواب صاحب آپ نے کیا بات دیکھا قتل کا۔
آغا: (آبدیدہ ہوکر) جناب جناب میں۔
مجسٹریٹ: افسوس ہے مگر آپ پوری پوری بات بتایئے جس میں ہم کو قاتل کا پتا ملے۔ آپ آنسو پوچھ ڈالیے۔ اور کہیے۔
آغا: اُوف۔ ہائے بھائی۔ ہائے بھائی اس قدر جلد داغ دے گئے۔ ہائے ہم سب خوش تھے اور دل میں سمجھے تھے کہ:

اب وقت سرور و فرحت اندوزی ہے
ہر دل مصروفِ جشن نوروزی ہے

مگر۔ ع
خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

علی کا نام لے کر جان دی۔

گر دوستی علی میں مر جائیں گے
بگڑے ہوئے کام سب سنور جائیں گے
جس وقت کہیں گے مُنہ سے یا شیر خدا
جوں برق صراط سے گذر جائیں گے

کمشنر: نواب صاحب۔ آپ دل کو مضبوط کر کے حال بتائیں۔
آغا: میں ہنستا بولتا خوشی خوشی چلا آتا تھا کہ ایک شخص نے بھائی کے جسم میں خنجر بھونکا۔ اور وہ معاً گرے میرے ہوش اُڑ گئے۔ جس شخص نے قتل کیا وہ محمد عسکری سے عرصے تک ـــــ باتیں کرتا رہا۔ میں سُنتا تھا۔ محمد عسکری نے کہا کہ افسوس ہے سپہر آرا کے ساتھ ہمارا نکاح نہ ہوا اور اس شخص نے بھی ایسی باتیں کیں۔
کمشنر: گفتگو جو محمد عسکری اور اس میں ہوا اُس سے دونوں کا دوستی پایا جاتا تھا۔ یا جان پہچان نہیں پایا جاتا تھا۔

صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو محمد عسکری پر بھی شک گذرا دونوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی سازش ضرور تھی۔ پولیس سے کہا گیا کہ ان کی نگرانی کرتے رہنا۔ محمد عسکری کے ہوش پرّان کہ خدا ہی خیر کرے۔ ان کے احباب نے کہا بھائی صاحب جو کچھ حال ہو ہم سے صاف صاف کہہ دیجیے تاکہ ابھی سے دفع دخل کریں ورنہ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔

محمد عسکری: بھئی جرم ہے تو صرف اس قدر کہ ایک اجنبی سے باتیں کیں۔
دوست: وہ اجنبی کون تھا۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ جوان بوڑھا کبھی اور بھی اُن کو دکھا تھا۔ اور بات کیا ہوئی تھی۔
محمد عسکری: کسی صورت آشنا نہ تھا جان نہ پہچان۔ مجھ سے صرف اس قدر پوچھا کہ برات کس کی ہے۔ میں نے کہا ایک بیگم ہیں۔ بس۔
دوست: صاحب مجسٹریٹ تمہاری طرف سے مشکوک ہو گئے ہیں کہ نہیں۔
محمد عسکری: وجہ۔ وہ تو میری بہنیں ہیں۔ میں ہمایوں فر کا دشمن نہیں تھا۔ کوئی وجہ خاص نہیں کہ ہمایوں فر کے قتل میں میں معین ہوں مگر صاحب کی گفتگو سے یہی پایا جاتا تھا۔

اس کے بعد ایک مہاجن کے اظہار لیے گئے اُس نے یوں روایت بیان کی۔

مہاجن: میں اپنی دکان پر بیٹھا تھا اور میری دکان پر کئی آدمی اور بھی تھے سب برات کی تعریف کرتے تھے۔ بس جب دولہا کا گھوڑا آیا تو ایک آدمی نے گھٹنا ٹیک کر چھری بھونک دی اور ہم سب دوڑ پڑے۔ ہاتھ پاؤں اس وقت ایسے پھول گئے کہ اُس کو کسی نے گرفتار نہ کیا۔
کمشنر: کبھی اور بھی اُس کو دیکھا تھا یا آج ہی دیکھا۔
مہاجن: چھاؤنی میں دیکھا تھا یہ فوج میں پہلے نوکر تھا۔

کمشنر: کس چھاؤنی میں دیکھا تھا اور اس کو کس قدر عرصہ ہوا۔

مہاجن: مرار کی چھاؤنی میں دیکھا تھا۔ کوئی چھ برس ہوئے۔

کمشنر: تم ان کو پہچانتے ہو (محمد عسکری کی طرف اشارہ کرکے)۔

مہاجن: جی ہاں حضور۔ بخوبی یہ ایک نواب زادے ہیں یہاں کے۔

کمشنر: ان کے ساتھ کبھی اس آدمی کو دیکھا تھا یا کبھی نہیں۔

مہاجن: جی نہیں۔ کبھی نہیں ان کا اس کا کون ساتھ ہے بھلا۔

کمشنر: ول افسوس ہے کہ تم لوگ نے اس کو گرفتار نہ کر لیا۔ اچھا خیر محمد عسکری کے ہوش پرّان کہ خدا ہی خیر کرے آج تیرا سامنا ہے۔ صاحب کمشنر بہادر خود ابتدائی تحقیقات کر رہے ہیں پولیس سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ صاحب کمشنر قسمت اور خود تحقیقات کریں۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ہزار آدمیوں میں عزّت لی۔

اس کے بعد حُسنا طوائف کے اظہار لیے گئے۔ حُسنا نے بیان کیا کہ میں اپنے کمرے کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور دوسری کرسی پر ایک تحصیلدار صاحب جن سے مجھ سے ملاقات ہے بیٹھے تھے۔ مگر اسی خیال سے کہ طوائف کے یہاں ان کو کوئی نہ دیکھے انھوں نے اپنا مُنہ کپڑے سے لپیٹ لیا تھا۔ صرف آنکھیں کھلی تھیں۔ جس وقت نوشہ کا گھوڑا طرارے بھرتا سامنے آیا میں نے تحصیلدار صاحب سے کہا کیوں سچ کہنا کیسا خوش رو شہزادہ ہے۔ دُلہن قسمت کی دھنی ہے کہ ایسا دولہا پایا۔ اس پر تحصیلدار چہل کرنے لگے۔ اے بس اتنے میں کسی موئے درگورنے اللہ اس سے سمجھے اور اس کے تن بدن میں کیڑے بلبلائیں، میں نے کسی کو آتے دیکھا نہ جاتے نہ چھری بھونکتے نہ تلوار مارتے (کفِ افسوس ملکر) ہے ہے بس اتنا دیکھا کہ وہ شہزادہ گھوڑے پر سے گر پڑا۔

کمشنر: ول وہ تحصیلدار کون ہے۔ اس کا نام کیوں نہ بتایا تم نے۔

حُسنا: اے سبحان اللہ۔ واہ حضور واہ۔ اچھی کہی۔ ہونہہ۔

کمشنر: ہم اس کا اظہار لے گا۔ اس سے کل بات پوچھے گا۔

حُسنا: وہ موئے قاتل کو کچھ کچھ پہچانتے بھی ہیں۔ کہتے تھے اللہ جانے۔

کمشنر: او تب تو ہم پھر نہ مانے گا۔ ہم ضرور پوچھے گا نام۔

مجسٹریٹ: اچھا ایک کام کرو۔ وہ جس طرح مُنہ لپیٹ کر بیٹھے تھے اسی طرح مُنہ لپیٹ کر آئیں اور اظہار دیں تم دریافت کرکے ہمیں اطلاع دو۔

حُسنا نے تحصیلدار صاحب کو اطلاع دی۔ مجبور ہو کر عورتوں کی طرح برقع اوڑھ کر تشریف لائے۔

کمشنر: ول تحصیلدار صاحب۔ ٹھیک ٹھیک اس مقدمہ کا حال بول دو۔

تحصیلدار: (اشارے سے) قلم دوات کاغذ منگوائیے تو لکھ دوں۔ قلم دوات کاغذ آیا۔ کمشنر صاحب نے سوال کرنا شروع کیا۔

کمشنر: آپ تحصیلدار ہیں شرم کیا ہے۔ صاف صاف بتاؤ ہم کو۔

تحصیلدار صاحب نے یہ فقرہ لکھا (جی ہاں حضور مگر خدا کے لیے نام نہ پوچھیے۔ چاہے خون ہو جائے غلام نہ بتائے گا)۔

کمشنر: آپ نے کیا دیکھا۔ شہزادے کو کس نے قتل کیا اور کس طرح پر۔

تحصیلدار: (لکھ کر)

غریب پرور سلامت　　　　　　بعد عرض میرساند

از آنجا کہ فدوی ناہنجار و مستمند بوجوہ چند در چند اس زنِ حسینہ موسومہ بہ حُسنا سے واقف کمال ہے اور اُس کی شفقت کی تعریف میں زبان ناطقہ لال ہے۔ جو کہ آج کے روز جگر سوز خاکسار اس کمرے میں بیٹھا مصروف کھیلنے (چوپڑ) کا تھا برات دیکھنے کے اشتیاق میں (چوپڑ) کو چھوڑ کر برات دیکھی مگر افسوس صد افسوس کہ عین اسی حالت میں کہ عروس کا مرانی در پیش تھی ایک ملعون نے اس بے گناہ شہزادے کو ضرب دی خنجر ہاتھ میں تھا اُس خنجر سے قتل کر ڈالا۔ واجب بود بعرض رسانید۔

الٰہی آفتاب دولت ہمیشہ تابان ہو جیو۔

فدوی تحصیلدار پرگنہ دار

صاحب کمشنر نے عرضی پڑھوائی۔ کیا قاتل کو کبھی اور بھی دیکھا تھا اُس کو۔ بخوبی پہچانتے ہو، اچھی طرح سے جانتے ہو یا نہیں۔

تحصیلدار: (لکھ کر) وانم دے نگویم۔

کمشنر: ہم نہیں جانتا کہ اس کو کس نے تحصیلداری کا عہدہ دیا۔

تحصیلدار: اقبال سرکار کے زور سے کام کرتا ہوں حضور عالم۔

کمشنر: قاتل کا نام مقام سکونت پیشہ عمر قد و قامت سب بتاؤ۔
تحصیلدار: اگر اُس کو پھانسی ہوئی تو ذمہ دار کون ہوگا۔ ہاں!
کمشنر: اس کو پولیس کی حراست میں رکھو بس اسی دم چلو اس پر ایک صاحب نے کہا ٹھہریے ہم بھی کوشش کرلیں پھر اختیار ہے جہاں چاہیے بھیج دینا۔ قریب جاکر کان میں کچھ کہا۔
صاحب: وَل تم خود مجسٹریٹ ہے اور تم حوالات میں رہے گا۔ کیوں نہیں بول دیتا صاف صاف۔ بالکل صاف صاف کہہ دو کہ کون تھا اور اس وقت مُنہ پر پردہ کیوں ڈالا ہے۔
تحصیلدار: (کان میں) پیر و مرشد میں ایک مولوی آدمی مشہور ہوں۔ اگر لوگ اس وقت دیکھ لیں گے تو کیا کہیں گے۔ اس پر صاحب نے جھلاکر برقع چاک کر ڈالا اور تحصیلدار صاف کا چہرۂ انور صاف نظر آیا۔
کمشنر: ہیلو۔ لالہ گوری مل تحصیلدار۔ وَل گوری صاف صاف بتاؤ۔
تحصیلدار: خداوند یہ شخص میرے ساتھ مرار کی چھاؤنی میں تھا۔ وہاں بھی دو آدمی اس نے قتل کیے تھے۔ ایک ہی موذی ہے۔
کمشنر: مکان اس کا کہاں ہے۔ مرار ہی کا باشندہ ہے۔؟
تحصیلدار: مکان کا حال مجھے نہیں معلوم مگر ہے بڑا بد ذات اس کے بعد سائیس کے اظہار لیے گئے اُس نے یوں بیان کیا۔ جس وقت سرکار قتل ہوئے دو آدمی جھکے تھے۔ ایک وہ جس نے قتل کیا دوسرے وہ جو سامنے کھڑے ہیں (محمد عسکری کی طرف اشارہ کرکے) وہ تو قتل کرکے بھاگا یہ مدد دے کر کھڑے رہے۔
کمشنر: او۔ وَل مسٹر! کیا اس کے بارے میں تم کہہ سکتے ہو۔
محمد عسکری: خداوند یہ جو کہیں وہ صحیح ہے۔
کمشنر: وَل سچ بولو تم نے قتل میں مدد دی
محمد عسکری: حضور آسمان پھٹ پڑے
کمشنر: تم سے اور ہمایوں فر سے ملاقات تھا یا دشمنی یا دوستی۔
محمد عسکری: حضور میں ان سے واقف تھا مگر وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔
کمشنر: کبھی کسی بات میں جھگڑا ہوا تھا یا کبھی نہیں۔؟
محمد عسکری: صاحب سلامت تک تو تھی نہیں۔ علیک سلیک تک ندارد۔ اور کیا عرض کروں۔
کمشنر: جہاں شادی ہوتا ہے وہاں کچھ عداوت تھا۔

محمد عسکری : وہ تو میری بہنیں ہیں۔ بچا کی لڑکی اور عیال و اطفال۔
کمشنر : پولیس کے ذریعے سے ابھی تحقیقات ہو اور صاحب خود جا کے ان کے ہاں تحقیقات کریں جن کے ہاں شادی ہوگی۔
صاحب : ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس۔ ایک انسپکٹر اور ایک جمعدار اور دس جوان لے کر بڑی بیگم کے ہاں چلے کہ دیکھیں تحقیقات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ادھر کمشنر صاحب کو وہ فقیر یاد آیا۔ جس نے یہ رباعی پڑھی تھی۔

او بار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
بھاگو بھاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
جاگو جاگو کہ خواب غفلت کیسا
دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

ان سب کے بعد درویش کا اظہار لیا گیا۔
کمشنر : تم اس بارے میں کیا جانتے ہو۔؟
درویش : وہی جو پہلے کہا تھا۔

او بار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
بھاگو بھاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
جاگو جاگو کہ خواب غفلت کیسا
دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

کمشنر : اگر تم صاف صاف نہ بتاؤ گے تو سخت سزا پاؤ گے۔
درویش : (مسکرا کر)

روی مقصود کہ شاہان بدعا می طلبند
سببش بندگی حضرتِ درویشان است

اگر قید کرو گے تو فکر نہیں، اور اگر رہائی دو گے تو درویش خالی از ذکر نہیں۔ اپنا تو یہ قول ہے۔

مستم زغمِ عشق تو مستم مستم ، دل در طلب وصل تو بستم بستم
گویند مرا عاشق بد نام توئی منکر نہ توان بود کہ ہستم ہستم

غضب خدا کا اس جاہ و تجمل کا جلوس اور خدا کے نام پر کچھ بھی نہیں الصدقہ ترد البلاء و تزید فی العمر۔

صاحب انسپکٹر نے جو اس فقیر کو عارف باشد و ولی حق آگاہ تصور کر کے ایک گوشہ میں لے جاکر بصد خشوع و خضوع سمجھایا، کہ سائیں اس گورک دھندے میں نہ پڑنا جو کچھ معلوم ہو صاف صاف بتا دیجیے۔

آخر کار بعد خرابی بصرہ صاحب کمشنر سے یوں بیان کیا کہ ایک شخص جو اسی شہر میں تازہ وارد تھا، اس نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نامی ہمایوں کے قتل کے لیے آیا ہوں۔ میں گورنمنٹ میں اس کی اطلاع کر دیتا مگر چونکہ اس شخص نے کسی زمانہ میں میری جان بچائی تھی، میں نے اس امر کی کسی سے اطلاع نہیں کی ایک بار ہمایوں فر کے پاس جاکر باتوں باتوں میں ذکر کر دیا تھا۔ اگر وہ نہ سمجھیں تو میرا کیا قصور۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

ہمایوں فر کے مرنے کا افسوس ہے مگر قاتل کو پانی میں پاؤ گے اندرون آب۔ اندرون آب۔

قاتل گرفتار ہوا

درویش سے صاف صاف دریافت کیا گیا تو اس نے کہا، بچہ قاعدے کی بات ہے کہ انسان قتل کرنے کے بعد گھبرا جاتا ہے۔ خون سر پر سوار ہوتا ہے۔ اکثر آدمیوں نے انسان کا قتل کر کے بازار میں دھبے دھوتے ہیں، معاً گرفتار ہو گئے۔ ایک شخص اپنے رقیب کو شمشیر بُرّان سے قتل کر کے تھانے پر گیا اور تلوار رکھ کر ایک کانسٹبل کی چارپائی پر سو یا۔ جب تھانہ پر خبر ہوئی کہ خون ہو گیا اور سپاہی دوڑے تو عند التحقیقات معلوم ہوا کہ فلاں شخص قاتل ہے۔ سپاہیوں نے کہا وہ کبھی قاتل نہیں ہے۔ سپاہیوں نے کہا وہ کبھی قاتل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو تھانے پر بہ آرام نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ لیٹا ہوا ہے اگر قتل کرتا تو اس آزادی سے پولیس کے پنجے میں اپنے کو نہ پھنساتا آخر کار گرفتار ہو گیا۔

صاحب سیٹی مجسٹریٹ اس طول و طویل تقریر پر بہت جھلائے۔ کہا اس شخص کو ہم اس قدر سخت سزا دیں گے نہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔ درویش نے کہا صاف صاف تو بتا دیا کہ قاتل

---

* خیرات کرنے سے مصیبتیں دُور ہوتی ہیں اور زندگی بڑھتی ہے۔

دریا کی طرف گیا ہوگا یا کسی کنوئیں پر نہار ہا ہوگا۔ صاحب کمشنر خود بنفس نفیس مع صاحب مجسٹریٹ گھوڑوں پر سوار ہو کر دریا کی سمت چلے اور ہر گھاٹ پر دو دو چار چار سوار بھیجے کہ جس پر ذرا بھی شک ہو فوراً گرفتار کر لاؤ۔

اب سنیئے کہ جو گھاٹ سب سے قریب تھا اس پر صاحبان ممدوح داخل ہوئے اور پہنچتے ہی کہا کہ خبردار جو جس مقام پر نہاتا ہے وہ وہاں ہی رہے بس۔ اگر ذرا جنبش ہوئی تو ہم بندوق سر کر دیں گے۔ گھاٹ پر اکثر آدمی نہار ہے تھے۔ ہندوؤں کا کوئی چھوٹا سا تہوار تھا۔ لوگ دنگ کہ یا الٰہی سرکار نے یہ کیسا حکم نافذ فرمایا۔ اتنے میں محمد عسکری اور شیخ عطاءاللہ اور حُسنا طوائف اور تحصیلدار ریاست جن کے اظہار لیے گئے تھے گھاٹ پر آئے۔ صاحب کمشنر نے کہا یہ لوگ جو یہاں نہار ہے ہیں ان میں پہچانو تو کہیں قاتل کا پتا ہے۔

حُسنا: جی۔ نہیں حضور ہمیں تو نہیں نظر آتا۔ شاید کہیں۔

محمد عسکری: حضور سب کو الگ الگ دیکھوں تو شاید پہچان سکوں۔

عطاءاللہ: ان میں کوئی نہیں ہے وہ خدا جانے کہاں چھپ رہا ہوگا۔ مگر تحصیلدار صاحب نے غور کر کے سب کو دیکھا اور غل مچا کر کہا (وہ ہے۔ وہ ہے۔ قاتل وہ ہے۔ قاتل وہ ہے)۔

کمشنر: سب اس طرح دریا میں رہو، ورنہ ہم بندوق مارے گا۔

مجسٹریٹ: خبردار۔ خبردار۔ ابھی گولی پڑی جو ذرا کوئی ہلا۔ ہم بلا تامل مار ڈالے گا۔ بس یوں ہی رہو۔ یوں ہی رہو۔

اب سب پوچھتے ہیں کہ قاتل کہاں ہے۔ تحصیلدار نے کہا ابھی یہاں نہار ہا تھا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ اس پر ایک سپاہی نے جو نہار ہا تھا کہا خداوند کس کی تلاش ہے۔ ایک آدمی میرے قریب نہاتا تھا۔ جب انہوں نے غل مچایا تو اس نے غوطہ لگایا۔ دو اور آدمیوں نے بھی شہادت دی۔ تحصیلدار شہر کو حکم دیا گیا کہ کسی پیراک سے کہو غوطہ لگائے۔ اور اس کو پکڑ لائے۔ ایک پیراک جو برج پر کھڑا تھا سنتے ہی کود پڑا۔ پورے آدھ گھنٹے تک غوطہ لگایا مگر در مقصود ہاتھ نہ آیا اب دریا پر اژدھام عام ہے تمام شہر اُمنڈ آیا کہ کہیں قاتل ملتا ہے یا نہیں آدھ گھنٹے کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ابھرا اور ابھرتے ہی ساحل کی طرف چلا اس زور سے آتا تھا۔ جیسے بہاؤ پر ہلکی پھلکی ڈونگی جائے۔ تحصیلدار سے پوچھا یہی ہے۔ انھوں نے کہا نہیں یہ نہیں ہے۔ کنارے پر پہنچتے ہی اُس نے ایک سائیس کو جو کسی رئیس کے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا اس زور سے تھپڑ دیا کہ وہ تیورا کے گرا۔ ادھر وہ گرا اُدھر اُچک کر گھوڑے کی

پیٹھ پر ہو رہا، اور گھوڑے کو خیز کیا، اور للکار کر کہا آئے جس کا جی چاہے، قاتل ہم ہی ہیں، ہمیں نے قتل کیا۔ ننگی پیٹھ گھوڑے پر سوار ہو کر اس پھرتی اور سرعت سے جانا اسی شخص کا کام تھا،

چالیس گھوڑے اُس کے تعاقب میں جاتے تھے۔ مگر اس کی گرد کو نہیں پاتے تھے۔ حاضرین تعریف کے نعرے بلند کرتے تھے،

ایک: سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ واہ واواہ۔ سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ،

دوسرا: دیکھنا کیا کمال کر رہا ہے۔ واللہ کمال حاصل ہے، واہ۔

تیسرا: زین کاٹھی اور موڑ توڑ دوڑنے جمنے کو تو دیکھیے،

چوتھا: قسم خدا کی لاکھ دو لاکھ شہسواروں میں فرد ہے۔ سُبحان اللہ،

صاحب سپرنٹنڈنٹ صاحب مجسٹریٹ اور اُن کے اسسٹنٹ اور کُل حاضرین اور تماشائی دنگ تھے۔ قاتل کا گھوڑا اطرارے بھرتا جاتا تھا مگر کچھ دور جا کر اس پر مصیبت پڑی کہ ایک گھوڑا جو مطلق العنانی کے طرف دوڑا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو گھوڑے فوراً لڑ جاتے مگر شہسوار نے اس خوبصورتی سے بچایا کہ سُبحان اللہ۔ لیکن اس عرصے میں ایک اونٹ گھوڑے کی نظر سے گذرا جو درخت نیب کے تلے بندھا ہوا لمبی گردن اٹھا کر پتّیاں کھاتا تھا۔ گھوڑا اسی عجیب الخلقت جانور کو دیکھ کر بھڑکا اور رکا۔ ٹھہرتے ہی دوسرا گھوڑا آن پہنچا اور ہنہنا ہنہنا کر دونوں لڑنے لگے مگر شہسوار بدستور ران پٹری جمائے بیٹھا رہا، اتنے میں صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کے گھوڑے بھی آن پہنچے، شہسوار نے اپنے کو گرفتار پنجۂ اجل دیکھ کر گھوڑے کو کمال لیاقت سے پھیرا۔ اور شہسواری کے دو چار ایسے ہنر دکھائے کہ کل حکام پھڑک گئے۔ ایک انسپکٹر اور دو برق اندازوں نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ گھوڑے سے اُتارا۔ مشکیں کسی گئیں پچاس سپاہی چوطرفہ سے گھیرے رہے،

کمشنر: او۔ تم ہی ہمارے شہزادے کا قاتل ہے وَل،

شہسوار: پھانسی ہی دو گے نہ۔ یا کچھ اور کرو گے۔ بس ؟

کمشنر: ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتے۔ تم انسان نہیں ہے،

شہسوار: ہائے پیاری سپہر آرا۔ تیرے عشق نے دو کی جان لی۔ ایک نوجوان شہزادہ تو قتل ہوا۔ اور دوسرا نوجوان اب پھانسی پائے گا۔ تیرے حُسن تحیر سوز نے دو خون کیے۔ اور بیگنہ کش یہ کیا ستم ڈھایا، ہائے ہمایوں فر۔ وائے ہمایوں فر۔ تیری موت میرے ہاتھ سے بدی تھی اور میری موت تیرے سبب سے۔ ہمایوں فر مجھے وہ وقت خوب یاد ہے، جب تم اپنے عشرت منزل محل میں بہ آرام تمام سوتے تھے۔

میں باہر گھوڑے پر منتظر تھا اور جب تم خواب ناز سے بیدار ہوئے تو میں جھک کر آداب بجالایا۔ اور سپہر آرا کا ذکر چھیڑا۔

مجسٹریٹ: تم سے اور ہمایوں فر سے کیا عداوت تھا۔ کس بات کا۔

شہسوار: اب میں کیا بیان کروں۔ مگر میں نے بُرا کیا۔ خیر اب تو جو ہونا تھا وہ ہوا۔ ہمایوں فر سا نوجوان خوشرو شہزادہ اور اس حالت میں مقتول ہوا۔ افسوس صد افسوس۔ ع

ایں ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

انسپکٹر: اس وقت اگر غصّے کو ضبط کرتے تو کس قدر فائدہ ہوتا۔

شہسوار: اجی بیٹھو بھی۔ یہ کرتے وہ کرتے جو ہوا وہ ہوا۔

انسپکٹر: افسوس کا مقام ہے۔ اپنی جوانی بھی گنوائی اور اُس بیچارے کی بھی جان لی اور اُن کی بوڑھی ماں کو کہیں کا نہ رکھا۔

شہسوار: بھائی جان میرا قصور نہیں ہے۔ ہائے میں بے قصور ہوں۔ اس عشق اور حُسن کے جھگڑے نے میری جان لی۔ پہلے آزاد رقیب ہوئے، پھر ہمایوں فر رقیب ہوئے۔ میں نے تو قصد کیا تھا کہ اُس کو مار ڈالوں مگر وہ بڑا چالاک آدمی ہے۔ اور شہسواری کے علاوہ وہ مجھ سے کسی بات میں کم نہیں۔ بلکہ سب میں بڑھا ہوا ہے۔ ہمیشہ یہی خیال رہا کہ ہمارے مقابل میں کوئی بڑھ نہ نکلے۔

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں

جس سرزمین کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

اللہ اللہ سپہر آرا کے حسنِ گلوسوز نے یہ رنگ دکھایا ایک کو قتل کیا دوسرے کو سولی پر چڑھایا۔ خداوندا۔ سپہر آرا تمام عمر خوش و خرم رہے۔

انسپکٹر: بجا ہے۔ کیا بڑی خوشی ہے اور تم ہی اس کے رنج کے باعث ہوئے تم نے اُس کو ایسا رنج دیا کہ تمام عمر حسرت کے ساتھ زندگی بسر کرے گی۔ زندگی تلخ کردی اور اب دعا مانگتے ہو، کہ یا خداوہ خوش و خرم رہے۔ اے بھٹکار۔ کیا ہم کسی کے کشتہ نہیں ہیں۔ مگر اس کا اظہار عیب سمجھتے ہیں۔ جو بات دل میں ہے وہ ہے یہ کیا کہ کسی بندۂ خدا کی جان لیں۔

دل میں پوشیدہ تپِ عشق بتاں رکھتے ہیں

آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں

تمہارا نام بودوں، بزدلوں قاتلوں میں ہوگا۔ عاشقوں کے زمرے سے بالکل خارج ہو۔

شہسوار نے آہ سرد کھینچ کر اس بات کا جواب دیا۔ بھائی جو کچھ کہتے ہو سچ کہتے ہو۔ مجھے اس وقت اپنے پھانسی پانے کا رنج نہیں ہے مگر یہ البتہ رنج ہے کہ سپہر آرا اس وقت بین کر رہی ہوگی۔ اگر اجازت پاؤں تو اس کی تشفی کر آؤں۔

لوگوں نے کہا کچھ دیوانے ہوتے ہو۔ میاں عقل کے ناخن لو تم اور سپہر آرا کی تشفی کرو۔ ضرور بالضرور تمہاری صورت دیکھ کر اس کی آتش غم کے شعلے آسمان کی خبر لائیں اور کباب دل کی بو بلند ہو تم وہ شقی ہو۔ شہسوار آبدیدہ ہو کر۔

مریخ کا ہے ظلم و ستم کس شمار میں
پیر فلک کو رتبہ ہے تیرے مرید کا

بڑی بیگم کے ہاں کے بین کا حال زار آگے نذر ناظرین ہوگا۔ بالفعل مقدمے کا حال سنیے! دوسرے روز جب مقدمہ دائر ہوا تو شہسوار نے عدالت کے روبرو بالکل انکار کیا۔ قطعی انکار۔ محض انکار۔ کون ہمایوں فر کس کی برات۔ کیسا قتل۔ کس کی عداوت۔ مجھ سے کیا واسطہ۔ میں کیا جانوں۔

عدالت: تم نے مرزا ہمایوں فر کو نہیں قتل کیا۔

شہسوار: ہمایوں فر کون۔ میں نے نام بھی نہیں سنا خدا جانے۔

عدالت: ہاں۔ ہم سمجھے تھے کہ اقبالی مجرم ہے۔ وِل گواہ پیش ہوں۔ پہلے حسنا طوائف کو بلوایا اور اظہار کے بعد سوالات ہونے لگے۔

سوال: تم قاتل کو پہچانتا ہے۔

جواب: نہیں حضور میں نہیں پہچانتی۔

سوال: وِل۔ وِل۔ ڈرنے کی بات نہیں مگر تم قاتل کو پہچانتا ہے یا نہیں پہچانتا ہے۔

سررشتہ دار: صاف صاف کہہ دو کہ میں نہیں پہچانتی۔ نہیں پہچانتی ہے خداوند۔

حسنا: حضور میں نے تو آدمی کی جھپک سی دیکھی تھی۔ پہچانتی نہیں کسی کو۔

تحصیلدار صاحب ریاست بلوائے گئے۔ انھوں نے کہا حضور ہزار میں کہوں لاکھ میں کہوں کروڑ میں کہوں کہ یہی قاتل ہے۔ شہسوار نے آہ سرد بھر کر کہا۔ کیوں بھائی تم اور ہمارے خلاف رائے دو۔ مرار کی چھاؤنی بھول گئے۔ اس پر وکیل سرکار نے کہا کہ عدالت اس فقرے کو لکھ لے: تحصیلدار صاحب نے وقت اظہار اس روز بھی کہا تھا کہ مرار کی چھاؤنی میں ہم اور وہ نوکر تھے۔ شہسوار نے پھر کہا کہ کیوں

لالہ جی وہ دن بھول گئے جب تم چھوٹی سی ریاست کے تحصیلدار تھے۔ تمہاری سفارشیں کی ہیں۔ نوکریاں دلوائی ہیں۔ اور آج تو ہماری جان کا گاہک ہے۔ تحصیلدار صاحب نے اس کا جواب نہ دیا۔ عدالت کی طرف مخاطب ہوکر بیان کیاکہ اس شخص نے میرے علم میں دو آدمی قتل کیے ہیں۔ اور بھاگ گیا ہے، اور اس مرتبہ بھی مجھے یقین نہیں کہ سزا پا سکے۔

عدالت: تم نے تحصیلدار صاحب کو کہیں دیکھا تھا پہلے یا نہیں۔؟

شہسوار: کبھی نہیں۔ صورت آشنا تک نہیں ہوں۔ جانتا ہی نہیں ہوں۔

عدالت: پھر مرار کی چھاونی کا ذکر کیوں کیا۔

شہسوار: دو باتوں سے خالی نہیں یا تو آپ سنتے اونچا ہیں۔ اور یا میں دیوانہ ہوں۔ اب اس کا فیصلہ پنچوں کی رائے پر چھوڑ دیجیے ورنہ آپ کو اختیار ہے جو چاہیے سزا دیجیے۔

محمد عسکری بلوائے گئے۔ حواس غائب غلہ۔ ہوش پَران رنگ رو باختہ کانپتے ہوئے اجلاس پر آئے۔ کڑھا ہوا پاجامہ ڈھیلے پائنچوں کا۔ جامدانی کا کُرتہ۔ شربتی کا انگرکھا۔ چوگوشیہ ٹوپی رومال اوڑھے ہوئے۔ آن کر آداب عرض کیا۔ صاحب نے ازسرتاپا دیکھا اور آہستہ سے کہا (کرسی دو) چپراسی نے کُرسی دی۔ صاحب نے کہا حلف کے بعد حال بیان کیجیے۔ محمد عسکری نے نہایت سہولت کے ساتھ یوں اظہار دیے۔ حضور برات کے کرّوفر کا حال سُن کر میں بھی آیا تھا دُولہن میری بہنوں میں بھی ہے۔ بڑی بیگم صاحب میری بزرگ ہیں۔ میں برات کی دھوم دھام اور جلوس کا ٹھاٹھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر کبھی اس سے باتیں کیں کبھی اُس سے باتیں کیں۔ اتفاق سے یہ صاحب آئے۔ میرے قریب کھڑے ہوکر پوچھا کیوں حضرت یہ کس کی برات ہے۔ میں نے کہا یہ ایک شہزادے ہیں۔ مرزا ہمایوں فر بہادر نے پوچھا برات جاتی کس کے ہاں ہے۔ میں نے کہا یہاں ایک رئیسہ ہیں۔ بڑی بیگم صاحب اُن کی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ نکاح ہے۔ پھر پوچھا کچھ خوبصورت ہیں۔ میں نے ازسرتاپا اس شخص پر نظر ڈالی۔ کہا کہ آپ کو اُن کے خوبصورت یا بدقطع ہونے سے کیا واسطہ۔ کہا میں صرف اس خیال سے پوچھتا ہوں کہ نوشہ کمال حسین ہے۔ اگر دُولہن خوبصورت نہ ہوئی تو ستم کا سامنا ہوگا۔ اس پر میرے مُنہ سے یہ کلمہ نکلا کہ ہاں دُولہن بھی چاند سی ہے۔ بس مجھ سے یہی باتیں ہوئیں۔ ہائے اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ مردک میرے عزیز کا قاتل ہوگا تو خدا جانے کیا کر گذرا ہوتا۔

عدالت: جس کے ساتھ جس بیگم کے ساتھ ہمایوں فر کی شادی ہونے کو تھی اُس سے آپ کا کبھی شادی کا ذکر تھا۔ کوئی پیغام تھا۔؟

محمد عسکری : حضور میرے علم و یقین سے خارج ہے میں نے کبھی پیغام نہیں بھیجا۔ اور نہ کبھی میری نیت تھی۔

عدالت : تم اس کا ثبوت دے سکتے ہو۔

محمد عسکری : حضور ان کے گھر میں دریافت کرلیں۔ کبھی یہ خیال ہی نہیں گذرا۔ افسوس ہے کہ مجھ پر ایک اتنا بڑا الزام لگایا جاتا ہے۔ جس سے میری کمال بے عزّتی ہوتی ہے مگر مجبوری ہے۔

عدالت : وَل. شادی کا پیغام بھیجنا کوئی الزام نہیں ہے۔ ہم آپ کا دل دُکھانا نہیں چاہتے۔ آپ بھی ایک رئیس ہیں۔

محمد عسکری : نہیں حضور میرا یہ منشا نہیں ہے۔ مطلب ؟ کہ خاکسار پر یہ شک کرنا کہ مرزا ہمایوں فر بہادر کے قتل کا معین ہوا، ستم ہے افسوس صد افسوس. گناہ ہوا تو اس قدر کہ اس اجنبی سے باتیں کیں۔

عدالت : آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو شک ہوا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہم صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ سے اور اس شخص سے کبھی کی جان پہچان تو نہ تھی۔

یہ اظہار لیے جاتے تھے کہ دفعۃً ایک کانسٹبل نے بڑھ کر کہا حضور یہ اشتہاری مجرم تھے۔ حلیہ ملا لیجیے. شہسوار کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہوگئے۔ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

حلیہ ملایا گیا تو رنگ فق۔ مرزا ہمایوں فر کے ایک خدمت گار نے کہا حضور ! آتش زنی کا جرم انھیں پر قائم ہوا تھا۔ تب تو کل حاضرین نے ان کو نظر غور سے دیکھا اور انواع و اقسام کی باتیں ان حضرت کی نسبت ہونے لگیں۔

ایک : اخّاہ حضور ہی ہیں۔ یہ کہیے۔ تو یہ سب گُن پورے ہیں۔ انھیں کون کہے لنڈورے۔

دوسرا : دیکھیے کیا اتفاق ہے۔ ہمایوں فر نے کتنی کوشش بلیغ کی کہ اس کمبخت کو ڈھونڈھ نکالتے مگر نہ ملا۔ اب وہی اُن کا قاتل ہے۔ اَلامان اَلامان۔

تیسرا : واللہ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی بوٹیاں نوچوں مردک کی۔

چوتھا : اجی حضرت۔ چاہے بوٹیاں نوچیے چاہے چورنگ کیجیے۔ چاہے زندہ دفن کر دیجیے۔ جو ہونا تھا وہ ہوا۔

پانچواں : ارے یارو۔ سب کے سب نے مل کر مار ڈالا۔ کہا کیے کہ یارو ہاتھی پر نوشہ سوار ہو دیے

مگر نہ مانا نہ مانا۔ اور اس بیچارے کو تو مرنا تھا ہی۔ ان سے بھی لوگوں نے کہا کہ حضور ہاتھی پر سوار ہوں، گھوڑے پر نہ سوار ہوں۔ مگر ایک کی بھی نہ مانی۔ کہا نہ ہم گھوڑے پر سوار ہوں گے۔ بانک پن اسی میں ہے۔ وہ بانکپن سب رکھا ہی رہا۔

مریض وہ ہوں جو درماں سے بے نصیب آیا
اجل ہنسی مری بالیں پہ جب طبیب آیا

عدالت کو شک کی جگہ یقین ہو گیا کہ محمد عسکری بالکل بے گناہ ہے، تشفی دی اور دلجوئی کی باتیں کیں۔ محمد عسکری آبدیدہ ہو کر بولے۔ حضور میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور کافی طور پر تحقیقات کریں۔ اگر ذرا بھی لغزش پائی جائے تو پھانسی کی سزا دیجیے۔ مجھ پر تو انگلیاں اٹھیں گی۔ کہ یہ ملعون جاتا ہے۔ قاتل۔

عدالت: نہ نہ نہ۔ ہرگز نہیں کہتا۔ تم قاتل نہیں ہے۔

محمد عسکری: بجا ارشاد ہوا لیکن صرف اس الزام ہی سے مجھے بری نہ کیجیے بلکہ اگر کسی شخص نے میری طرف سے مشکوک کر دیا ہو تو اس کو بھی سزا دیجیے۔ آئندہ اختیار بدست مختار۔

عدالت: آپ بالکل بری۔ صرف اس واسطے بلایا تھا کہ آپ اس آدمی کا حلیہ بتائیں۔ بس آپ جائیے۔

ہمایوں فر کے خدمت گار نے کہا۔ خداوند اس شخص نے ایک مرتبہ مجھ کو رشوت دی تھی کہ مرزا ہمایوں فر جب کبھی بڑی بیگم کے ہاں پیغام بھیجیں تو ہم کو معاً اطلاع دو۔

اتنے میں نواب خورشید علی خاں نے کہا۔ اخاہ آپ نے اس شخص کو خوب پہچانا۔ یہ میرے پاس بھی ایک روز آیا تھا۔ جب میں اپنی سسرال میں تھا۔ مجھ سے کہا کہ یہ گھوڑا بکاؤ ہے۔ اگر حضور خریدیں تو فہو المراد۔ اور ایک دن مجھے معلوم ہوا تھا، کہ سسرال میں انھیں ذات شریف کے سبب سے چوری ہوئی تھی۔

عدالت: دو جرم۔

تحصیلدار: حضور دو ہزار جرم یہ بڑا سفاک خونخوار آدمی ہے۔

عدالت: مسل مقدمہ طلب ہو۔ آتش زنی والے مقدمہ کی مسل آئی۔

بڑی بیگم کی ڈیوڑھی پر ماتم ہو رہا ہے

مہندی کے عوض ہاتھ میں دولہا کے لگے زخم
آلودۂ خون پنجۂ مرجان نظر آیا

آج قیامت کا سامنا ہے۔ دولہا کی لاش پر دلہن کی آمد ہے۔ اُف میرا خدا دمِ تحریر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہمایوں فر ہیں جو ابھی ہنستے بولتے سجے سجائے سمند فلک سیر پر سوار دولہا بنے جاتے تھے۔ دوست احباب اعزّہ اقربا خوشی کے شادیانے بجاتے تھے۔ لیکن خدا جانے کسی نے کیا کر دیا کہ خاموش ہو گئے۔ خلق خدا ماتم کر رہی ہے۔ ابھی ابھی باجے بجتے تھے، اب چھاتیاں پٹ رہی ہیں۔ ہائے دنیا تے دوں کے بھی عجب کارخانے ہیں۔ یہ وہی شہزادہ ہے جو فرشِ گل پر سوتا تھا۔ اب فرشِ گل پر اس لطف سے آرام کرتا ہے کہ عمر بھر شاید ایسا لطف نہ حاصل ہوا ہو گا۔ یا الٰہی دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا۔

نہ جن کو بستر مخمل پہ نیند آتی تھی
سو اُن کے واسطے اب خاک کا بچھونا ہے

ہائے وہ نرگسی آنکھ اب بند ہے۔ وہ جادو بھری آنکھ دم کے دم میں پیوند زمین ہو گئی۔ وہ برگِ گل سے لب اب مرجھا گئے۔ چہرۂ نورانی کی رعنائی کا پتا ہی نہیں۔ کچھ عجب صورت ہو گئی۔ ہائے وہ پیارے رُخسار جو ملائک فریب تھے اب بھیانک نظر آتے ہیں۔ وہ گلاب سا مکھڑا اب خزاں کے ہاتھوں کمھلا گیا۔ ہائے اس اجل سے خدا سمجھے جس نے شہزادی بیگم کے پھلے پھولے باغ کو سنسان کر دیا۔ جس نے مجنوں کو لیلیٰ، فرہاد کو شیریں، وامق کو عذرا سے جدا کیا۔ جس نے کروروں گل بدنوں کو خاک میں ملایا۔ جس کی بدولت لاکھوں نوجوانانِ سیم بدن کفن پوش ہوئے۔

رہے نہ حضرت یوسف نہ حُسنِ پاک اُن کا — رہی نہ اب وہ زلیخا نہ عشق اُس کا ہے
نہ اب ہے لیلیٰ و شیریں نہ قیس نہ فرہاد — نہ اب جہاں میں وامق ہے اور نہ عذرا ہے
سرِ عزیز پہ تھا جن کے تاجِ سلطانی — ہر اک فقیر کی ٹھوکر سر اُن کا کھاتا ہے

نہ اب ہے سنجر و خاقان نہ سلطنت نہ حشم
نہ ہیں سکندر و جمشید اور نہ دارا ہے

ہر سمت سے یہی صدا بلند تھی کہ یارو یہ کیا غضب ہے۔ ابھی ابھی ایک جہاں خوش و خنداں تھا۔ اب چشم عالم خونفشاں ہے۔ چرخ زبرجدی سیاہ پوش ہے رع

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

فلک — زبار مصیبت خمید واویلا

ملک — چو صبح گریباں درید واویلا

اب سنیئے کہ اُدھر تو شہزادۂ گیتی پناہ فریدون فر کی لاش پڑی تھی۔ حاضرین و ناظرین کی یہ کیفیت تھی کہ دل میں غم آنکھیں پرنم جگر میں درد، لب پر آہ سرد، زبان پر واحسرتا وا مصیبتا۔

اگر ہے آنکھوں میں آنسو تو دل ہے غم سے بھرا

جگر میں درد ہے تو ہے زبان پہ واویلا

شہزادی بیگم زبان حال و قال سے بصد حسرت و یاس کہتی ہیں کہ

فلک نے مجھ کو دیا داغ نوجوان افسوس — مہ دو ہفتہ ہوا خاک میں نہاں افسوس

ملایا خاک میں اس رشک ماہ تاباں کو — زمیں پہ گر نہ پڑا کیوں یہ آسمان افسوس

بگریہ ایم اگر گل بباغ می خندد

بگریہ ایم چو بلبل بباغ می خندد

خورشید لقا اور مہ لقا دونوں گل پیرہن اور نسرین بدن نوخیز شہزادیاں چھاتی پر دوہتڑ مار کر روتی ہیں کہ ہائے ماں جائے بھائی کدھر چلے۔ اُدھر سپہر آرا بیگم کے دل میں وہی ٹھنی ہے کہ شہزادے سے یوں ملیں گے اور یوں زندگی بسر کریں گے۔ جس طرح خورشید دولہا اور بہار النسا بہن میں ہنسی دل لگی چہل مذاق ہوتا ہے، اسی طرح ہم دونوں بھی ہنسیں بولیں گے۔ ہائے کیا بے خبری ہے۔ تمام عمر میں سپہر آرا اس قدر خوش نہیں ہوئی تھی۔ ہاں جس روز حسن آرا بیگم کو غش آگیا تھا اور گھر میں کہرام مچ گیا تھا اور اُس کے بعد حسن آرا نے آنکھیں کھول دی تھیں اس روز البتہ سپہر آرا جامے میں پھولی نہیں سماتی تھی۔ باغ باغ ہوئی جاتی تھی اس چودہ پندرہ برس کے سن میں انھیں دو بار انتہا سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ مگر ان کی اس خوشی نے خون رلایا۔ ہنسی کا یہ ثمرہ پایا کہ عمر بھر روئیں گی۔ افسوس صد افسوس۔

آتش زنی کی تشویش ساعت دو ساعت رہی۔ سمند گھوڑے کے مرنے کا افسوس دو چار منٹ رہا۔

پھر وہی دھما چوکڑی مچنے لگی، وہی ناچ رنگ۔ وہی چہل پہل۔ وہی گانا بجانا۔ وہی ہنسی دل لگی۔ وہی قہقہے وہی چہچہے۔

بہار النسا: کوئی اچھی سی ٹھمری گاؤ بی منّی۔ ذرا شوخ ہو۔

منّی: اب شوخ تو آپ تینوں میں (جانی بیگم کی طرف اشارہ کرکے) حضور ہیں۔ بے ادبی معاف۔ آپ کئی بار کہہ چکی ہیں۔

جانی بیگم: خدا کی شان۔ اونہہ۔ اونہہ۔ اب تم لوگوں کے بھی یہ دماغ ہوئے کہ رئیس زادیوں اور بہو بیٹیوں کی برو بری کرو۔ ہاں!

منّی: ہنسنے بولنے میں راجہ پرجا امیر غریب سب یکساں ہیں۔

نظیر بیگم: کوئی غزل یاد ہو تو کہو، مگر سمجھ میں آئے۔ فارسی نہ ہو۔

جانی بیگم: ایلو مرغ بازی بہو بھی بولیں۔ اب آج کل کتنے مرغ ہیں۔ نظیر بیگم تم بھی تو گاتی ہو۔ ذری کچھ کہو تو تمہیں اپنی آنکھوں کی قسم!

نظیر بیگم: ہم نے تو کہہ دیا کہ تم لاکھ بکو ہم جواب ہی نہ دیں گے۔ ایک چُپ ہزار بلا ٹالتی ہے۔ بس چھٹی ہوئی۔ اب تم جانو تمہارا کام جانے۔ ہم سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہم کسی بات کا جواب نہ دیں گے۔

جانی بیگم: خوشی سے؟ (مسکرا کر) نہیں آپ جواب دیں تو ذری کبھی تو کچھ بولو بہن۔ موئی گنواروں کی طرح بات سن لی اور چپکی ہو رہیں۔ اے واہ۔

اب سُنیے کہ ایک مشاطہ کسی رئیسہ کی بھیجی ہوئی آئی۔ آداب بجا لائی۔ دُلہن کو دیکھا۔ کہا اور تو سب ٹھیک ہے۔ مگر چوٹی کے سنورنے میں اک ذری کسر رہ گئی۔ میں چٹکیوں میں درست کروں گی۔

خورشید علی خاں بہادر تے باہر اس مشاطہ کو ہنسی ہنسی میں چھیڑا تھا۔ کہا کہو بی مشاطہ تم تو اس سن میں بھی ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہو۔ مشاطہ تنک کر بولی۔ حضور کی باتیں سُنیے۔ اس سن کی ایک ہی کہی۔ ابھی ہمارا سن ہی کیا ہے۔ مردوں کا قاعدہ ہے کہ اپنے کو تو جوان سمجھتے ہیں۔ دوسروں کو بوڑھا بناتے ہیں۔ چلیے آپ کی سالی کو دیکھ آئیں۔ مشاطہ کی تو ان کو حاجت ہی نہیں ہے۔ چاند سا مکھڑا پایا ہے۔ مگر ہاں ہم اُن کے حُسن کو دس گنا جوبن دے سکتے ہیں۔ حضور لاکھ جوبن کا ایک جوبن تو جوانی ہے۔ اس سے بڑھ کر جوبن ہی نہیں۔ ہم نے ایک چھوکری پرسوں دیکھی۔ سرکار بس دیدہ ہے نہ شنیدہ ہے۔ میں کیا عرض کروں۔ پھول سے رخسارے بس بعینہ گلاب کا پھول بدن اس قدر کا نازک کہ بس دیکھنے سے

تعلق رکھتا ہے۔ چاند میں بھی میل ہے۔ اس کے چہرے میں نہیں ہے۔ حضور کلائی تو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سانچے کی ڈھلی ہے۔ آنکھ سے جادو ٹپکتا ہے۔ بدن گول گات کی صفائی کا حال نہ پوچھیے۔ اور بوٹا سا قد اور ایسی شوخ اور چلبلی ہے کہ توبہ توبہ اور سن کا حال پوچھیے تو چودھواں سال بس چودھویں کا چاند ہے۔ اور تو کیا کہوں۔ کیا صورت پائی ہے۔

خورشید دولہا بھلا اس تقریر سے مطلب۔ چودھویں کا چاند ہے۔ باشد ہم کو کیا۔ حور ہے۔ پری ہے پھر ہم کو اُس سے کیا واسطہ۔

مشاطہ: حضور مطلب میرا یہ ہے کہ اتنی تو قبول صورت اور پھٹے حالوں میلے دوپٹے میں وہ جوبن نظر آتا ہے کہ دیکھیے تو لوٹ پوٹ ہو جائیے۔ بادشاہ وزیر دیکھیں تو نکاح کر لیں۔ پری ہے پری اور چالاک، بے باک چُست طرّار۔ سوار کو گھوڑے سے اُتار لے۔

خورشید دولہا: اور قوم کون ہے۔ کوئی بھنگن یا چمارن تو نہیں ہے کہیں۔

مشاطہ: اے توبہ توبہ۔ منہارن ہے۔ چوڑی والی۔ چودھواں سال ہے۔ پھر حضور یہ سن و سال اور حُسن کے سبب سے جو جوڑا پہنتی ہے۔ چاہے میلا ہو چاہے پھٹا پھٹا ہو نور برستا ہے۔

خورشید دولہا: ذرا ہم کو ہو تو دکھا دو۔ اک دو منٹ کے لیے کیوں۔؟

مشاطہ: واہ۔ اور سُنیے اچھے آئے۔ حضور بھلا نواب زادوں کے سامنے کہیں آ سکتی ہے۔ غریب آدمی کے سامنے کیسے چلی جائے۔ باتیں کرے مگر امیروں کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ مبادا دنیا میں دس طرح کے آدمی سو طرح کی باتیں ہیں۔ کوئی عیب لگائے کوئی برا بھلا کہے۔ غریب آدمی کی دھڑی کی عزت دس لاکھ کی عزت کے برابر ہے۔ امیر چاہے کوئی عیب کیوں نہ کرے کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ روپیہ وہ شے ہے۔ لے اب میں اندر جاتی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی خیال ہے کہ کوئی حضور سے باتیں کرتے دیکھ لے تو عیب لگائے۔

خورشید دولہا: واہ۔ ایسی تو شکل صورت بھی آپ نے نہیں پائی ہے۔ اور پھر ہم رئیس زادے اور کسی پر نظر ڈالیں۔ کیا مجال ہے کبھی نہیں۔

مشاطہ: (چمک کر ہاتھ کا اشارہ کرکے) امیر زادے تو وہ کرتے ہیں جو کوئی نہیں کرتا۔ امیر زادے! امیر زادے! ہونہہ۔

یہ گفتگو کرکے مشاطہ چمکتی ہوئی اندر گئی۔ تھوڑی دیر بات چیت کرکے بہار النسا بیگم سے کہا (آپ نے کچھ سُنا) اس وقت منجھلے میاں (خورشید علی خاں) باہر کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے

کہ تمہارے محلّے میں جو منہارن رہتی ہے۔ اُس کو گھر میں بلایا ہے۔ کیا حضور نے یاد فرمایا تھا۔ کل بھیجدوں
ڈیوڑھی پر بہار النسا متحیّر ہو کر بولی۔ کیسی منہارن۔ ہم نے تو نہ منہارن کو بلایا نہ کسگرن کو نہ کسی کو۔
ان کو بھی بیٹھے ایک شگوفہ چھوڑنا آتا ہے۔ منہارن؟ اے واہ۔ پیاری ذری باہر سے جا کے بُلا تو لا۔ پیاری
نے باہر جاکر کہا۔ حضور کو بہار النسا بیگم نے ذری بُلایا ہے۔ کہا ہے کھڑے کھڑے دو باتیں سُن جائیں۔ نواب
صاحب اندر تشریف لائے۔ بہار النسا ایک کمرے میں گئیں۔

بہار النسا: کہو وہ منہارن آئی۔ کیا چوڑیاں پہنو گے۔ منگوادیں؟

خورشید دولہا: (متحیّر ہو کر) منہارن! منہارن کون؟ کہا اور ہوتا تو میں سمجھتا کچھ پی گیا ہے۔
(ہنس کر) خدا ہی خیر کرے اب رنگ لائی گلہری۔

بہار النسا: اور اوپر سے ہنستے ہو۔ اے واہ۔ منہارن بلوائی جاتی ہے۔

خورشید دولہا: کچھ خبر ہے۔ ہوش کی دوا کرو۔ اس وقت ہو کہاں۔

بہار النسا: اچھا ہمارے سر پر ہاتھ تو رکھو کہ اس وقت منہارن کی باتیں کسی سے نہیں ہوئی تھیں۔
اُوپر سے ہنس ہنس کے جلاتے ہو۔

خورشید دولہا: اس بدگمانی کا تو علاج ہی نہیں ہے معقول (مُسکرا کر)۔

ہر دم آزردگی غیر سبب راچہ علاج
ماگذشتیم زلطف تو غضب راچہ علاج

اِدھر بہار النسا اور ان کے دولہا میں نونک جھونک ہوتی تھی اُدھر روح افزا بیگم کے دولہا کے
آنے کی خبر ہوئی۔ مہری نے آن کر کہا روح افزا بیگم کے میاں بھی آگئے۔ بڑی بیگم بہت خوش ہوئیں کہا
دولہا آئے بلاؤ۔ کہو ہمیں صورت دکھا جائیں پہلے نواب والا قدر صاحب تشریف لائے۔ انگریزی وضع
کوٹ پتلون شرٹ کالر ویسٹ کوٹ پچاس روپیہ کا ولایتی بوٹ زیب پا۔ دو ہزار کی طلائی گھڑی کشیدہ
قامت زیبا طلعت آدمی، اندر آئے۔ کورنش بجالائے۔ بڑی بیگم نے دعا دی۔ خیر و عافیت کا حال پوچھا۔
کہا برسوں سے آنکھیں تھک گئیں، راستہ دیکھتے دیکھتے۔ تم نہ آئے۔ برسوں کے بعد تم کو دیکھا۔ اور
دیکھیں کیوں کر۔ تم کو سسرال کی محبت نہیں۔ ہم جانے سے رہے۔ اتنے دن تمہارے شہر میں رہے
تم باہر تھے۔

اتنے میں چوبدار نے ڈیوڑھی سے مہری کو آواز دی۔ مہری سے کہا جا کے اندر خبر دو کہ نواب رونق
الدولہ بہادر آتے ہیں۔ مہری نے آن کر بہ آواز بلند کہا۔ حضور رونق الدولہ بہادر آتے ہیں۔ رونق الدولہ

بہادر کے آنے کی آواز سن کر بڑی بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔

بڑی بیگم: کون رونق الدولہ! ارے کون رونق الدّولہ یا خدا وہی ہو۔

جعفر علی خاں کو بلاؤ۔ مہری باہر سے جعفر علی خاں بہادر کو بُلالائی۔ کہا جعفر علی، دیکھو تو باہر کون آیا ہے۔ جعفر علی خاں نے کہا۔ خالہ جان۔ بھائی آتے ہیں۔ بڑی بیگم رونے لگیں۔ فرط طرب سے آنسو آنکھوں سے نکل پڑے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رونق الدّولہ بہادر خورشید مرزا کے ساتھ تشریف لائے۔ بڑی بیگم نے بڑھ کر گلے لگایا۔

بڑی بیگم: (روکر) واہ بیٹا واہ۔ واہ وا واہ۔ اچھا خون رُلایا واہ۔

رونق الدّولہ: نانی جان! کیا عرض کروں کہ کہاں تھا۔

زیور ہیں نہ دستار کے نے زیب ہیں سر کے
مثل گل بازی نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے

نانی جان اللہ جانتا ہے۔ بس اک بات ایسی ہوئی کہ مجبور ہو گیا۔ گھر بار چھوڑنا کسی کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اِدھر یہ باتیں ہوتی تھیں اُدھر کسی شخص نے یہ شعر پڑھا۔

یہ غم سے پیٹے کہ بس نیلا کر دیا مُنہ کو
لہو یہ روئے کہ گل رنگ سب کیا مُنہ کو

بڑی بیگم کا ماتھا ٹھنکا کہ خدا ہی خیر کرے۔ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ کوئی ہنسی مذاق کا شعر پڑھا ہوتا تو جی خوش ہو جاتا۔ عبّاسی تاڑ گئی کہ یہ شعر پڑھنا ان کو ناگوارا ہوا۔ مگر راہ چلتوں کا مُنہ کون بند کرے۔ بڑی بیگم تو ایک ہی شعر کو روتی تھیں یہاں اس نے ایسے ہی اشعار کا تار باندھ دیا۔

یہ کیا الم ہے جو ہے چاک چاک جیب سحر — یہ کیا الم ہے جو خورشید ہے برہنہ سر
ہے چاندنی میں دِلا سیل اشک کا عالم — وفور گریہ سے ہے اب سفید چشم قمر
سیاہ پوش ہوا ہے الم سے چرخ کبود — برنگِ داغ دل ماہ ہے ہر اک اختر

وفورِ غم سے تعجب نہیں اگر مریخ
اب اپنے قتل کو مانگے ہلال سے خنجر

قتل اور غم اور داغ کے الفاظ سُن کر بڑی بیگم نے کہا۔ ارے خدا کے لیے کوئی جا کے اس مرے

در گور کا مُنہ جُھلسو یہ کیا بک رہا ہے۔ اس فقرے پر دُلہن کو ہنسی آئی۔ روح افزا اور حُسن آرا بھی کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

حُسن آرا: امّاں جان۔ آپ تو ناحق اِدھر اُدھر خیال کرتی ہیں۔

روح افزا: یہی کہنے ہی کو تھی۔ اب سڑک پر کوئی بولے بھی نہیں۔

بہار النسا: سُنا امّی جان! صاحبزادی کی باتیں سنیں۔ کیا کہتی ہیں۔

بڑی بیگم: جب بوڑھی ہوں گی اور بال بچّے ہوں گے۔ اللہ کی عنایت سے تب ہماری باتیں یاد کریں گی۔ ابھی کیا ہے۔

حُسن آرا: امّاں جان۔ ہم اگر دو سو برس کے بھی ہوں تو یہ خیال نہ ہو۔

بڑی بیگم: جب میں بھی تمہارے سِنوں تھی تو ایسی ہی باتیں کرتی تھی۔ رونق الدولہ بڑی بیگم کا نواسہ دس برس کے بعد وطن میں آیا تھا۔ کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ کہاں چلے گئے۔ نہ ابھی تک معلوم ہوا۔ اس وقت شادی میں چہل پہل اور بھی دوبالا ہوئی۔ سپہر آرا اور حُسن آرا۔ روح افزا اور بہار النسا۔ جہاں آرا اور گیتی آرا بدرجۂ غایت محظوظ و مسرور تھیں۔ اِدھر روح افزا کے دولہا کی آمد سے بھی خوشی حاصل ہوئی کہ بعد مُدّت ساس نے داماد اور سالیوں نے بہنوئی کو دیکھا۔ بڑی بیگم بار بار کہتی تھیں کہ آج ہماری بائیں آنکھ پھڑکتی تھی۔ ہم سوچتے تھے کہ یا خدا کون بھولا بچھڑا آنے والا ہے۔ رونق الدولہ کی طرف خیال بھی نہ کیا۔ پرسوں شب کو میں نے اس بیچارے کو خواب میں دیکھا تھا۔ لڑکپن میں جو شعر اس کو اس کی ماں نے سکھایا تھا وہ پڑھنے لگا۔

کبھو نہ اُس رُخِ روشن پہ چھائیاں دیکھیں
گھٹائیں چاند پہ سو بار آئیاں دیکھیں

یا میرے اللہ جیسی خوشی کا دن تو نے مجھے آج دکھایا۔ ویسی ہی خوشی سارے جہاں کو ہو۔

راوی: غضب، غضب یوں کہو کہ جس مصیبت میں تم اب مبتلا ہونے والی ہو۔ وہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔ اس خوشی اور مسرت کے وقت ایک نواب زادے نے خورشید علی خاں کے کان میں ایک فقرہ جگر خراش کہا جس سے خورشید علی خاں کو معاً غش آگیا۔ یہ بیچارے جہیز کی تیاری میں مصروف تھے۔ انھوں نے کان میں کہا۔ بھائی خورشید علی خاں۔ کس منصوبے میں ہو۔ بھائی (رو کر) مرزا ہمایوں فر نوشہ کی لاش پھڑک رہی ہے۔

خورشید دولہا: (چونک کر) کیا! (سر پیٹ کر) ارے میاں کیا کہتے ہو۔ ارے غضب۔ ہے ہے۔

ہے ہے۔ ارے یار بتاؤ تو۔ (بہ آواز بلند) کیا کہتے ہو۔

نواب: بھائی۔ ہمایوں فر کی لاش پھڑک رہی ہے۔ اب اور کیا کہوں۔ ماتم کرو اور دُلہن کو لاش پر لے چلو۔ ہائے ہائے، ہائے ہائے۔

خورشید علی خاں بہادر کو غش آگیا۔ گر پڑے۔ دو چار نواب زادے دوڑے۔ ہائیں! ہائیں! خیر باشد خیر باشد۔ کیا کہہ دیا بھئی ان کے کان میں۔ اتنے میں پیر مرد یعنی ملاح ملیح دوہتھڑ پیٹتا ہوا باہر سے آیا اور سب میں ہلڑ مچ گیا۔ ارے یہ کیا غضب ہوا۔ چوبداروں نے کہا۔ برات لٹ گئی۔ نوشہ کے کسی نے چھری بھونک دی۔

ایک: چھری؟ چھری بھونک دی، کس نے؟ ہیں کیسے خیریت تو ہے۔

دوسرا: زخم کاری تو نہیں لگا ہے۔ یا خدا! ارے ستم!

نواب: یارو مجھ سے تو ایک معتبر آدمی نے کہا ہے کہ برات لُٹ گئی۔ نوشہ زخمی ہوا، اور جان نکل گئی۔ سب نے مل کر کمال افسوس کیا۔ اکثر آدمی گر پڑے۔ صدہا آدمی ماتم کرنے لگے۔ ہائے ستم وائے ستم۔

گر پیر نود سالہ بمیرد عجبے نیست
ایں ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

میرے نازوں کے پالے، میرے نرگسی آنکھوں والے
بیٹا دُلہن لاش پر کھڑی ہے، آخری دیدار تو دو

غافل تجھے کیوں خواہش دنیائے دنی ہے
پیوند زمین ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہ خاک گلے میں کفنی ہے

محل سرا میں جانی بیگم انگلیاں مٹکا مٹکا کر اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر نظیر بیگم کو بنا رہی تھیں۔ ہمجولیاں نوعمر نوخیز شہزادیاں، نواب زادیاں وفور طرب سے کھِل کھِلا رہی تھیں۔ حُسن آرا بیگم نے اپنی ایک ہم سن رئیس زادی خورشید بیگم کی طرف مخاطب ہو کر کہا، ہم نے مرزا ہمایوں فر کی ایک تاریخ کہی ہے۔ جب ہمایوں فرزندہ واپس آئے اور ہم نے یہ مژدہ سُنا تو اُسی دن تاریخ موزوں کی۔ مشہور ہوا تھا کہ نصیب

اعدا غرقِ دریا ہوگئے۔ خورشید بیگم بھی موزوں طبع اور خوش فکر تھیں۔ اصرار کیا کہ اپنی تاریخ ہمیں ضرور سنائیے!

حسن آرا: ہنسیے گا نہیں۔ سہو اور خطا ترکیب انسانی ہے۔ اور نہ ہمیں کچھ دعویٰ زباندانی ہے۔ شادی کی تاریخ بھی کہی ہے سنیے۔

چوں برآمد از تہ دریائے ژرف
پس ہمایوں فر بسوئے خانہ تافت
مصرعِ سالِ مسیحی ایں بگو
شاہِ دریا دل حیات تازہ یافت

خورشید: بہن اللہ جانتا ہے خوب تاریخ کہی۔ ع
شاہ دریا دل حیات تازہ یافت

دریا کا ذکر بھی تھا اور شاہ دریا دل کی خوب کہی۔ واہ واہ۔ ع
شاہ دریا دل حیات تازہ یافت

حسن آرا: تین چار شعر اور سن لیجیے۔ مبارکباد ہے۔ کل ہی کہی تھی۔

نوشہا بانوئے گل چہرہ مبارک ہوئے — صحبت شاہدِ خوش لہجہ مبارک ہوئے
بزم عشرت میں ہو ناہید ترانہ پرواز — نغمۂ مطرب خوش لہجہ مبارک ہوئے
رہے آراستگی انجمن عیش مدام — وصلِ معشوق پری چہرہ مبارک ہوئے
ہو مزیّب رخِ گلنار پہ سہرا زرتار — سر پہ زیبندہ کوئی جیغہ مبارک ہوئے

اس طرح مصرع تاریخ سنا ہاتف سے
شادی و عیش و طرب جملہ مبارک ہوئے

خورشید بیگم پھڑک گئیں۔ گلے لگا کر کہا بہن خوب تاریخ ہوئی ہے۔ وہ ناہید والا شعر پھر پڑھیے گا۔ ہمیں نہایت ہی پسند ہے۔

بزمِ عشرت میں ہو ناہید ترانہ پرواز
نغمۂ مطرب خوش لہجہ مبارک ہوئے

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ یکایک باہر سے رونے کی آواز آئی۔ غل اٹھا، بیگمات اور مخدّرات عصمت سمات پیشِ خدمتیں گھبرا گئیں۔ بڑی بیگم چونک پڑیں۔ حسن آرا اور روح افزا گھبرا کر کھڑی ہوگئیں۔

بہارالنسا اور جہاں آرا مثل پیکر تصویر خاموش. گیتی آرا نے آواز بلند سے کہا، ارے عباسی یہ کیا ہوا. دُلہن نے حیرت کے ساتھ ڈیوڑھی کی طرف نظر کی مگر اچھی طرح گردن نہیں اُٹھائی کہ مبادا لوگ ہنسیں کہ دُلہن کیسی شوخ ہے، دم بھر سر جھکا کے نہیں بیٹھا جاتا۔

اتنے میں نواب جعفر علی خاں روتے ہوئے باہر سے محل سرا میں آئے. بہن لٹ گئے. ارے غضب ہو گیا. ہائے کیا بتاؤں کہ کیا ہوا. اُفوہ. بڑی بیگم سر پیٹنے لگیں. ارے لوگو یہ کیا از غیبی تباہی آئی. کیا ہوا گیا. ہائے ہائے کوئی نہیں بتاتا. ارے یہ کہرام کیسا مچا ہے. یہ کہہ کر بڑی بیگم کو تیور آیا اور دھڑ سے گر پڑیں. عباسی نے سر پیٹتے ہوئے کہا. حضور میں نے تو بڑی ستم کی خبر سنی ہے. ہے ہے میرے شہزادے، میرے آقا، میرے سرتاج، میرے شہنشاہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا. ہر فرد بشر مصروف بکا ؤ بین تھا. اَلامان!

حسن آرا: چہرے کا رنگ فق. بے حس و حرکت سکتے کا عالم. خاموش۔

جہاں آرا: ہجومِ اشک. ایک منٹ میں دو رومال تر کر ڈالے اور آنسو جاری.

گیتی آرا: مثل ماہی بے آب تڑپتی تھی. زمین پر لوٹنے لگی۔

روح افزا: اینٹ سر پر ماری. اور سر سے خون جاری ہو گیا۔

بہارالنسا: بہ آواز بلند روئی. ہائے ہمایوں فر یہ کیا کیا. اُو دشمن یہ کیا دوست بن کے دشمنی کی. ہماری بہن کو کہیں کا نہ رکھا. ہائے ہمایوں فر. ابھی بیچارے نے دیکھا کیا تھا. ہے ہے، ہے ہے (ہچکی بندھ گئی) ارے میرے شہزادے. دولہا بن کے آتے تھے. ارے یہ کیا ہوا لوگو۔

سپہر آرا سنتے ہی گر پڑی تو بے ہوش. نظیر بیگم جانی بیگم خورشید بیگم اور دو تین عورتوں نے سنبھالا مگر بیکار. کوئی پنکھیا جھلتی تھی. کوئی لخلخہ سنگھاتی تھی. کسی نے کیوڑا چھڑکا. کوئی پانی لایا. بڑی بیگم دوہتڑ مارتی تھیں کئی عورتیں اور پیش خدمتیں ہاتھ پکڑے تھیں. مگر وہ ضعیفہ ایک جھٹکے میں ہاتھ چھڑاتی تھی. جو نواب زادے سب کے پہلے خبر لائے تھے اُنھوں نے باصرار کہا کہ دُلہن کو لاش کے پاس ضرور لے چلو. مگر اکثر لوگوں نے اس تجویز کے خلاف رائے ظاہر کی۔

ایک: جی نہیں. بیکار ہے. کیا ہوگا. زندہ ہو جائیں گے ہمایوں فر؟

دوسرا: اے توبہ. بلکہ لاش کو دیکھنا اور بھی قیامت بپا کرے گا۔

تیسرا: اس میں کیا شک ہے جناب ابھی کم سن ہے. بیچاری. کہیں ڈر جائے تو اور بھی ستم ہو جائے. بھلا کوئی عقل کی بات ہے. اے لاحول۔

چوتھا: اب اِس سے بڑھ کر اور ستم کیا ہوگا۔ ستم جو ہونا تھا وہ ہوا۔

پانچواں: یہ سچ مگر کیا فرض ہے کہ دولہن کو خواہ مخواہ دولہا کی لاش دکھائیے۔ ہم اس کے بالکل خلاف ہیں۔ واہیات۔

نواب: (وہی جو خبر لائے تھے) ہمایوں فر کی ماں شہزادی بیگم کہتی تھیں کہ دُلہن کو ضرور لاؤ۔ اس میں چاہے جو ہو۔ میرے بیٹے کی روح تازہ ہو جائے گی سمجھے؟ آپ لوگ۔ آئندہ اختیار ہے۔

پیرمرد: (روکر) چلیں گے، چلیں گے حضور۔ شاید زندہ ہو جائیں۔

جانانِ مرا بمن بیارید دین مردہ تنم باو سپارید

گر بوسہ زند براین لبانم نازندہ شوم عجب مدارید

بڑی بیگم یکایک اُٹھ کھڑی ہوئیں اور دوڑ کر کنوئیں کی طرف چلیں۔ اُستانی جی نے فوراً روکا۔ پیش خدمتیں دوڑ پڑیں۔ گیتی آرا جھپٹیں۔ امّی جان ہمارا مُردہ دیکھیے جو رُک نہ رہے۔ ہے ہے۔ یہ غضب نہ کرنا۔ بڑی بیگم کی دلی آرزو تھی کہ کنوئیں میں ڈوب مریں۔ مگر جب اس سے باز رکھی گئیں تو سخت افسوس کیا اور کہا اگر اس وقت نہیں پھر سہی۔ ہائے مجھ نصیبوں کی جلی کی قسمتوں میں کیا کیا بدا تھا۔ ارے لوگو اُف اُف۔ ہے ہے۔ خورشید دولہا ذری یہاں آن کے میرے پاس بیٹھو بیٹا۔ حال تو کہو۔ ہوا کیا۔ ہائے مجھ پر بجلی کیوں کر گری، یہ کیا ہوا۔ خورشید علی خاں بیان کرنے ہی کو تھے کہ طوفانِ اشک اُمنڈ آیا۔ اور بڑی بیگم سر و سینہ پیٹنے لگیں۔ پیش خدمتیں مغلانیاں محلدار خواصیں سب روتی تھیں۔ اندر سے باہر تک رونے اور ماتم ہی کی آواز بلند تھی۔

اگر ہے آنکھ میں آنسو تو دل ہے غم سے بھرا

جگر میں درد ہے تو ہے زبان پر واویلا

حُسن آرا ابھی تک سکتے ہی کے عالم میں تھیں۔ گیتی آرا بڑی بیگم کے پاس بیٹھی تھیں۔ روح افزا کے سر میں خواصوں نے ریشم بھرا تھا۔ خون نکلنے سے اس قدر ضعف ہوا کہ پلنگ پر لیٹ رہیں۔ اور معاً نیند آگئی مگر بہار النسا برابر بین ہی کرتی گئیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی۔ پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا تھا، اور انتہا سے زیادہ بے قرار تھیں۔

کسی طرح سے سمجھتا نہیں دلِ ناشاد وہی بکا ہے وہی زاری اور وہی فریاد

دفورِ غم سے ہے ہر چند خود فراموشی ولے یہ دخل نہیں بھول جاؤں تیری یاد

بیا بیا کہ دگر طاقت و قرارم نیست

بیا بیا کہ دگر تابِ انتظارم نیست

طرح طرح کی آوازیں آتی تھیں۔ کسی نے کہا۔ ہائے میرا پھلا پھولا باغ لوٹ لیا۔ کسی طرف سے آواز آئی۔ ہائے دُلہن بنی تھیں۔ یہ خبر ہی نہ تھی کہ اسی دم ماتم کر رہی ہوں گی۔ عباسی بولی۔ ارے اس ظالم نگوڑے پر آسمان کیوں نہیں پھٹ پڑتا ہے۔ یا اللہ کیڑے بدن میں بلبلائیں اور ایسی جگہ قتل ہو جہاں پانی نہ ملے۔ زندہ چُنوا دیا جائے۔ پچاس ساٹھ بیگمیں اور سو خواصیں کھڑی ماتم کرتی تھیں۔ باہر تو یہ کیفیت تھی کہ ہزاروں آدمی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ سب مصروف گریہ و زاری۔ جب سپہر آرا کو ہوش آیا تو آہستہ سے یہ گفتگو کی۔

سپہر آرا: اماں جان۔ ذری اماں جان کو کوئی بلاؤ۔

عباسی: آئیں حضور آئیں۔ (بڑی بیگم سے) ہوش آیا۔ حضور کو بُلاتی ہیں۔ سرکار ذری قدم بڑھاتے چلیں۔ ہائے ہائے۔

بڑی بیگم: معاً سپہر آرا کے پاس گئیں۔

سپہر آرا: اماں جان۔ ہمیں ہمارے پیارے شہزادے کی لاش دکھا دو۔

راوی: ہائے ستم۔ وائے ستم۔ اُف۔ حضرات ناظرین کیا جگر دوز فقرہ ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

بڑی بیگم: (ضبط گریہ کرکے) بیٹا میں تمہیں سمجھاؤں کہ اس دس برس کے سن میں تم پر یہ مصیبت پڑی اور تم مجھے سمجھاؤ کہ اس بڑھوتی وقت میری مٹی تباہ نہ ہو (آہ سرد بھر کر) ہائے۔!

سپہر آرا: نہیں اماں جان۔ خالی تابوت دیکھنے سے ہماری تشفی نہ ہوگی۔ ہم کو لاش دکھا دو۔ دیکھیں دولہا بن کے ہمایوں فر کیسے معلوم ہوتے تھے۔ یہ فقرہ کہہ کر سپہر آرا کے چہرے سے مردنی کے آثار نظر آئے۔ ان کے اعزہ سخت گھبرائے۔ فوراً ڈاکٹر بلوائے۔ جس وقت ایک ڈاکٹر سرہانے اور ایک ڈاکٹر سامنے کرسی بچھا کر بیٹھا۔ سپہر آرا مسکرائی۔ کہا واہ۔ ہونہہ! اس مرض کا علاج کرنے آئے ہو۔ پہلے اپنا علاج تو کرو۔ ارے نادانوں کہیں موت کا بھی علاج ہوا ہے۔

ڈاکٹر: آپ اپنے دل کو مضبوط رکھیں۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔

سپہر آرا: بجا ارشاد ہوا۔ مگر دل کہاں ہے۔ دل کا کہیں پتا ہے۔ ارے نادان روح تک تحلیل ہو گئی۔ اور تو میرے دل کی تشفی کرتا ہے۔

ڈاکٹروں نے خورشید علی خاں اور جعفر علی خاں اور رونق الدولہ وغیرہ سے کہا کہ شاید اس

صدمے سے یہ جانبر نہ ہوں۔ ایک ڈاکٹر نے کہا مجھے سخت استعجاب ہوا کہ یہ مسکرا رہی ہیں، نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معاً سمجھ گیا کہ اس قدر رنج ہے کہ آنسو نہیں آتے۔ تپ دروں نے اشک سوخت کر دیے۔ یہ ضبط اچھا نہیں۔ ان سے کہیے کہ دل کھول کے روئیں۔

خورشید علی خاں بہادر نے بڑی بیگم سے کہا کہ ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے ان سے کہو کہ خوب روئیں۔ ورنہ اگر دو چار گھنٹے تک ضبط کی یہی کیفیت رہی تو خدا جانے کیا ہوگا۔

بڑی بیگم: بیٹی خوب کھل کے رو لو۔ خوب کھل کے رو لو سمجھی۔

سپہر آرا: اماں جان۔ روؤں کیوں۔ رونا نہیں آتا مگر میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اس سے میں اپنا رنج بھول گئی کہ اب تھوڑی دیر میں میں بھی ہمایوں فر کے پاس جاؤں گی۔ وہاں تو شادی ہوگی کہ وہاں بھی نہ ہوگی۔ اب میرے بدن سے طاقت بالکل زائل ہوتی جاتی ہے۔ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، مگر میری اماں مجھے لاش ضرور دکھا دو۔ باجی جان کہاں ہیں۔ باجی کو بلاؤ۔ روح افزا بہن کو بلاؤ۔

حسن آرا آئیں مگر خاموش۔ رنج نہ غم۔ ماتم کیا نہ روئیں۔ سر پیٹا۔ ان کے بہن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ مگر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔ روح افزا کو دیکھا تو سر میں پٹی بندھی ہوئی۔ بہار النسا آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکی۔ تار بندھا ہوا تھا۔

سپہر آرا: باجی جان۔ چپ کیوں ہو۔ ہماری تشفی تک نہیں کرتیں۔ واہ۔

حسن آرا: ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم۔ بالکل سکوت۔ لب تک نہ ہلائے، مگر سر اُٹھا کر سپہر آرا پر نظر ڈالی۔

سپہر آرا: باجی جان۔ بولیے۔ آخر ش۔ چپ کب تک ہائے۔!

راوی: یہ اوّل مرتبہ تھا کہ واقعۂ ناشنیدنی کی خبر سن کر سپہر آرا نے اُف کی۔ غم کے دریا میں اس طرح ڈوبی تھیں کہ قعرِ دریا میں پہنچ گئیں۔ پھر اُبھر نہ سکیں۔ یہ وہ درجہ رنج کا تھا۔ جس میں انسان اُف تک نہیں کرتا، مگر غم اندر ہی اندر بدن کو گھلاتا جاتا ہے روح افزا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ روح افزا بہن یہ پٹی کیسی بندھی ہے۔؟

روح افزا: (آبدیدہ ہو کر) یوں ہی۔

سپہر آرا: کہیں سرور تو نہیں پھوڑا۔ بھئی یہ کیا۔

اماں جان خدا کے لیے ہمیں لاش دکھا دو۔ ہم ہمایوں فر کی روح کے پاس پرسے کے لیے جائیں گے۔

کیوں اماں جان۔ شہزادی بیگم کی کیا حالت ہوگی وہ بیچاری زندہ ہوگی یا نہیں اب تک۔

بڑی بیگم: بیٹا۔ کیا بتاؤں (آہ سرد بھر کر) جوان بیٹا۔ ہے ہے۔

اولاد کسی کی نہ جُدا ہووے کسی سے
بیٹی کوئی اس داغ کو پوچھے مرے جی سے

حُسن آرا: (چونک کر) اماں جان۔ ہمیں کسی کے رونے کی آواز کان میں آتی ہے۔ ذرا کان دھر کے سُنیئے۔ ہے کہ نہیں جیسے کوئی بین کر رہا ہے۔

قربان برادر مجھے بتلاؤ کہاں ہو
کس غول میں کس فوج میں کس صف میں نہاں ہو

لوگو۔ ذری دیکھو تو ہمارے بھائی جان کہاں ہیں۔

بڑی بیگم: (ہائے کہہ کر) حُسن آرا کس کی تلاش ہے۔ کس کو ڈھونڈھتی ہو۔

حُسن آرا: بھائی کو۔ کیا آپ بھول گئیں۔

بڑی بیگم: اُف (رو کر) ہائے (سر پیٹ کر) ارے غضب ہائے ہائے۔

اتنے میں خورشید علی خاں بہادر نے آن کر چپکے سے کہا کہ شہزادی بیگم رو رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ خدارا دُلہن کو لاش کے قریب لاؤ۔ ہمایوں فر کی روح تازہ ہوگی۔ بڑی بیگم نے کہا سوچ لو۔ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ میری معصوم بیٹی ڈر جائے۔ اس کا تو اور دل بہلانا چاہیئے کہ لاش دکھانا۔ جعفر علی سے پوچھو۔ بھائی سے دریافت کرو۔ دیکھو اور لوگوں کی کیا رائے ہے۔ میرے تو اس وقت ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ (رو کر) ہائے یہ کیا ہوا۔ اُف سپہر آرا بیچاری پر بجلی گری۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ دلہن کو لے چلیں۔ سب نے یہی صلاح دی کہ دُلہن لاشے پر ضرور جائے۔ شہزادی بیگم کی بھی رائے ہے اور دُلہن خود بھی اقرار کرتی ہے۔

بڑی بیگم: بیٹا اب میں کیا کہوں۔ تمہاری کیا مرضی ہے۔

سپہر آرا: اماں جان۔ ہمیں لاش دکھا دو چل کے۔ بس پھر ہم کوئی تکلیف نہ دیں گے۔

بڑی بیگم: اچھا مگر اس قدر یاد رکھنا کہ جو مر گیا وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ ہائے۔

سپہر آرا اُٹھ بیٹھیں۔ کہا اماں جان اب جان میں جان آئی۔ ہائے ہمایوں فر یہ کیا ہو گیا۔ دوسرے بار پھر اُف کی، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ عباسی کو حکم دیا کہ جاکے صندوقچہ لے آؤ۔ صندوقچہ آیا۔ کھولا ایک کاغذ نکالا۔ اور پڑھ کر کئی بار بوسے لیے۔ الغرض پالکی گاڑی تیار ہوئی اور سپہر آرا اور بہار النسا اور بڑی بیگم

اور اُستانی جی بیٹھیں۔

شہر میں دھوم مچ گئی کہ دُلہن دُولہا کی لاش پر جاتی ہے۔ خلق خدا کا اژدحام عام تھا۔ شہزادی بیگم کو اطلاع دی گئی کہ دُلہن آتی ہیں۔ گاڑی رُکی۔ سپہر آرا اُتریں۔ اب سُنیئے کہ عروسی لباس اور عطر سُہاگ کی بُو باس تارکشی کا بیش بہا دوپٹا اوڑھے ہوئے۔ سُنہرے پلّے دو دو بالشت کے لٹکتے ہوئے۔ اور گرد موتیوں کی بیل۔ پایجامہ فوق البھڑک تمامی پر زردوزی کام کیا ہوا۔ مقیشی مرصع ازار بند پڑا ہوا۔ پانچ ہزار کی ہوگی۔ جواہرات کے گھونگرو۔ ہیرا۔ نگینے جڑے ہوئے مقیش کی جھالر۔ سر پر جڑاؤ چھپکا۔ جبیں مبیں پر افشاں چنی ہوئی جڑاؤ ٹیکا۔ کارچوبی موباف اس پر جواہرات جڑے اور کرن ٹکی ہوئی۔ چوٹی میں سیس پھول ناک میں طلائی نتھ جس کے موتیوں کی قیمت اچھے اچھے جوہری نہ لگا سکیں۔ گوش صفا کوش میں مرصع پتّے بالی۔ بجلیاں کرن پھول۔ جھالے اُدراج مروارید کے مالے۔ گلوے مصفّا میں طوق ہیکل۔ چندن ہار۔ دولڑا۔ چمپا کلی ڈھولنا، تعویذ، بازو پر نورتن، جوشن بھج بند۔ مٹھیاں گورے گورے ہاتھوں میں کنگن، چوڑیاں، کڑے، پچھیاں، بیڑیاں، پور پور چھلے۔ آرسی، پانوں میں چھڑے، پازیب، چھاگل، اتریں تو چھم کی آواز آئی، اور ادھر حاضرین نے سینہ کوبی شروع کردی۔ سپہر آرا نے گاڑی سے اُترتے ہی لاش کو چھاتی سے لگایا اور سر بالیں بیٹھ کر بہ آواز بلند کہا شہزادے بہادر آخری دیدار کو نہ ترساؤ۔ ذری آنکھ کھول کے مُسکرا دو۔ بس دو دن ہنسا کے عمر بھر رولاؤ گے۔ (چھاتی پر دو ہتھڑ مار کر) شہزادے بہادر ذری اس وقت اپنی دُلہن کو تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔ بدن عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔ چوٹی میں سیس پھول ہیں۔ مشّاطہ نے چوٹی ایسی سنواری ہے کہ خاص تمہارے دیکھنے کے قابل ہے۔ (شانہ ہلاکر) کیوں جی یہی محبت تھی۔ اسی دن کے لیے ملایا تھا۔ ارے لوگو۔ اس مٹّی کو کھودے چلو۔ اس کو گُل بکاولی پر شرف ہے۔ سرمۂ سلیمانی اس کے مقابل میں گرد ہے۔ (کلیجے کو سنبھال کر) میرے پیارے شہزادے بہادر رہے ہے لوگو۔ میرا لکھا بڑا دشمن تھا۔ ارے لوگو میں لُٹ گئی۔ سُہاگ دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ سوگ نصیب ہوا۔

اس وقت کل حاضرین کی نظروں میں عالم تیرہ و تار تھا۔ ہوا ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھی گل گریبان چاک، غنچوں کی چٹک سے صدائے وحسرتا بلند ہوتی تھی۔ شاخیں ماتم کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھیں۔ قمریوں کی آواز کو کو سے عبرت ہوتی تھی۔ عنادل مصروف مرثیہ خوانی تھیں۔

کلی جو چٹکی تو آواز آئی ماتم کی
چمن تمام یہ لبریز شور و افغان ہے

ابھی ابھی ہر در و دیوار سے مسرت برستی تھی اور اب ساری خدائی ماتم کر رہی ہے۔

نہیں وہ گل نہ وہ سبزہ نہ وہ بہار چمن
نہ نغمہ سنج ہے بلبل نہ گل ہی خندان ہے

کئی آدمیوں کو غش آگیا۔ گر گر پڑے۔ کئی آدمی روتے روتے دیوانے سے ہو گئے۔

شہزادی بیگم نے رو کر کہا۔ میرے نازوں کے پالے۔ میرے نرگسی آنکھوں والے بیٹا دُلہن لاش پر کھڑی ہے۔ آخری دیدار تو دو۔

اس فقرے پر پٹس پڑ گئی۔

شہزادہ فریدوں کمر، مرزا ہمایوں فر، بہادر کی حالت زار نے آٹھ آٹھ آنسو رولایا۔ کن کن کوششوں کے بعد بیچارے نے یہ دن دیکھا تھا، دولہا بنے ہوتے سمند صرصر تگ پر سوار اٹھکھیلیاں کرتے جاتے تھے۔ مستیاں ابل رہی تھیں۔ وفور طرب سے دماغ آسمان پر تھا کہ دلی آرزو بر آئی۔ چاند سی دُلہن پائی۔ سپہر آرا کا گلاب سا مکھڑا ہر دم پیش نظر رہتا تھا۔ مگر عین کریال میں غلہ لگا۔

دُلہن لباس عروسی زیب تن کیے ہوئے چھم چھم کرتی لاش پر آئی۔ ادھر دوپٹے کے سنہرے پلّے عجب لطف سے لٹکتے تھے۔ اُدھر جیغہ اور سرپیچ خاک پر پڑا تھا۔ ادھر پنجہ حنائی میں مہندی جھلکتی تھی۔ اُدھر جسم نازک سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ وہ بےخبری کے ساتھ ہمیشہ کے لیے فرش خواب پر آرام کرتے تھے۔ یہ دولہا کی لاش دیکھ کر جناب باری سے دعا مانگتی تھیں کہ بار خدایا جس طرح دولہا کو سلایا اُسی طرح دُلہن کو بھی سلادے کہ دونوں اُس دُنیا میں مل جل کے زندگی بسر کریں۔ ایک دفعہ سپہر آرا نے باواز بلند و دردناک لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا (یہ ستم کے ناز ہم سے نہ سہے جائیں گے) ہم وہی ہیں جنھیں خط میں ہمیشہ جانِ ہمایوں فر لکھتے تھے۔ پھر اب جان آنے پر بھی زبان نہیں کھولتے۔ شہزادی بیگم نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگا کر کہا (اللہ کو یاد کرو) ہمایوں فر تمہارے بُرے دشمن نکلے۔ اگر مشعل لیکر بھی ڈھونڈھوگی تو اتنا بڑا دشمن نہ ملے گا۔ ہائے یہ اندھیر بھی کہیں ہوتا ہے۔ دُلہن لاش پر آئے۔ نکاح کے دن دولہا کی لاش زمین پر ہے۔ نکاح کے وقت وکیل اور گواہ تو رہے بالائے طاق دوسرا مقدمہ چھڑ گیا۔ سپہر آرا کو پھر غش آیا۔ بڑی بیگم اور شہزادی بیگم نے لخلخہ سنگوایا۔ کوشش موفور کی گئی کہ غشی دور ہو۔ جب آنکھ کھلی تو ماں کی طرف دیکھ کر کہا (اماں جان آپ نے اس وقت ہمارے ساتھ دشمنی کی۔ اللہ جانتا ہے بڑی دشمنی کی۔ اس ہوش سے وہ بےخبری اچھی۔ بیہوشی میں ہمیں

کوئی ملال نہ تھا۔ اب ہوش آیا تو غم نے مجسم صورت دکھائی۔ خدا جانے کس بندۂ خدا کی لاش نظر آئی) اس کس کی لفظ نے ستم ڈھایا۔ ناظرین وسامعین کو خون رُلایا۔ اس وقت لاش کے اردگرد ہجوم عام اور بڑا اژدحام تھا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے۔ رقیق القلب آدمی یہ حال دیکھ دیکھ کر زار زار روتے تھے۔ نواب زادے اور عمائد و رؤسا ماتم کرتے تھے کہ جو دردانگیز اور حسرت خیز بات آج تک نہیں سُنی تھی وہ آج دیکھنے میں آئی۔ مصوّر اس لیے جمع ہوئے تھے کہ دُلہن اور دُولہا کی تصویر کھینچ کر بیچیں۔ فائدہ اُٹھائیں۔ ایسی تصویروں کے لوگ بڑے شائق ہوتے ہیں۔ عبرت کے ساتھ اُن پر نظر ڈالتے ہیں۔ ناولسٹ یعنی ناولوں کے مصنف اس غرض سے جوق جوق جمع تھے کہ ناول کے لیے مصالح ملے۔ دُلہن کی طرز تقریر اور انداز بین کا خاکہ اُتاریں اور ناول میں ان کل اُمور کی تصویر کھینچ دیں۔

اتنے میں صاحب مجسٹریٹ ضلع نے حُکم دیا کہ بھیڑ چھانٹی جائے۔ برق اندازوں اور انسپکٹروں نے انتظام کیا۔ لاش کے اردگرد سے بھیڑ چھانٹی گئی۔ تو حکام یوں ہم کلام ہوئے۔

صاحب کمشنر: (صاحب مجسٹریٹ سے) اس وقت یہاں کھڑا نہیں رہا جاتا۔ ہم نے آنسو بہت ضبط کیے۔ بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔

مجسٹریٹ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا ستم ہوگیا۔ کیسا ہنس مکھ آدمی تھا۔ جو بات شہزادوں میں ہونی چاہیے وہ سب حاصل تھی۔

کمشنر: اُف۔ یہ تو ٹیرہ بجڈی سے بھی بڑھ گئی۔ کوئی ناول میں درج کرے تو خوب ہو۔ بڑا جگر خراش مضمون ہو۔ پٹس پڑ جائے اور دل پر بڑا ہی اثر ہو۔ جو پڑھے زار زار رونے لگے۔ ممکن کیا کہ ضبط گریہ ہو سکے۔ آج ساتواں روز ہے کہ ہم پرنس ہمایوں فر کی کوٹھی پر گئے تھے۔ ایک کوٹھی جو نئی بنوائی ہے، ہمیں دکھائی اور کہا یہ بیگم صاحب کے واسطے ہے۔ بڑی دیر تک شادی کے رسوم کی نسبت گفتگو رہی۔ اس شہر کے شہزادوں میں ہم نے کسی کو ایسا لائق نہیں پایا تھا۔ مگر افسوس صد افسوس۔

مجسٹریٹ: مجھ سے پوچھتے تھے کہ اگر ہم لیڈیوں کی دعوت کریں تو محل سرا میں جانے میں عذر تو ان کو نہ ہو۔ میں نے ہنسی ہنسی میں کہا کہ آپ کے ایسے اچھے خیالات ہیں، اور پھر بھی آپ پردے کے طرز کو اچھا سمجھتے ہیں۔

ضعیف الاعتقاد آدمی اپنے اپنے طرز پر اس سانحے کی نسبت رائے ظاہر کرتے تھے۔ سب کو ہمایوں فر اور شہزادی بیگم اور بڑی بیگم اور دُلہن کے ساتھ ہمدردی تھی۔ ان سست اعتقاد آدمیوں کی گفتگو سننے کے قابل ہے۔ ان کے خلاف بھی لوگ رائے ظاہر کرتے تھے۔

پنساری: ارے بھائی ہم تو اُسی دم سمجھے تھے جب چھینک پڑی تھی۔

مرغ باز: جب گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ چھینک تو نہیں پڑی تھی۔

انّا: واہ کون کہتا ہے نہیں پڑی تھی۔ اِدھر رکاب میں پاؤں گیا۔ اور اُدھر پٹ سے چھینک پڑی۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔

تماشائی: اجی بیوی نہ کچھ چھینک سے ہوتا ہے نہ کسی سے کرم کا لیکھ نا مٹے کرو کوئی لاکھن چترائی قسمت کے لکھے کو میاں صاحب (مُرغ باز کی طرف مخاطب ہو کر) کوئی بھی آج تک مٹا سکا ہے۔ اب دیکھیے کروڑوں روپیے گھر میں بھرے ہیں۔ کسی بات کی کمی نہیں۔ دس ہزار آدمی ساتھ شہر بھر کے امیر اور شہزادے اور نواب برات میں تھے۔ مگر کسی کی بنائے کچھ ہوا۔ تو وہ تو لکھا ہی تھا کہ فلاں آدمی کے ہاتھ سے موت بدی ہے۔ وہی ہوا۔

مولوی: اِذا جاء القضا، عُمی البصر۔ موت سے چارہ ہی نہیں۔ غریب و امیر دونوں اس میں یکساں ہیں۔ انجام سب کا وہی ہے۔ بس!

افسوس کہ سرمایہ زکف بیرون شد

در دستِ اجل بسے جگر ہا خون شد

کس نامداراں جہاں کہ تا پُرسم ازو

کا حوالِ مسافرانِ عالم چوں شد

اور مقبول بندۂ خدا وہ ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔ ہاں۔

از مرگ میندیش و غم رزق مخور

کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

انّا: میاں یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ایسا کوئی نہیں جو موت سے نہ ڈرے اور جوان لالہ نے بات کہی کہ قسمت کا لکھا نہیں مٹتا، مانا مگر کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ چھینک پڑتے ہی پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔

درویش: بابا اور تو کچھ نہیں، رنج بس اتنا ہے کہ دونوں لیلیٰ مجنوں تھے یہ اُن کو پیار کرتی تھیں وہ ان کو پیار کرتے تھے۔ ایک کی دوسرے پر جان جاتی تھی۔ اس سفّاک نے بڑا ہی بُرا کیا۔

رہرو: کیسا خوبصورت جوان تھا۔ ہائے ہائے۔ مگر سنا برات کے تین دن قبل سے بائیں آنکھ پھڑکتی

تھی۔ بس اس کا اثر کہاں جائے۔

تماشائی: واہ۔ بائیں آنکھ اور داہنی آنکھ۔ اجی سنا کرو۔

مولوی: میاں دنیا کے یہی کارخانے ہیں۔ ایسے ہی رہیں گے۔ انسان کو چاہیے کہ کسی سے جھگڑے نہ کسی سے فساد کرے یادِ خدا میں مصروف رہے۔ کھانے بھر کے لیے پیدا کرے گوشۂ عافیت میں بیٹھے۔

ہر کس کہ بدہر نیم نانے دارد
وز بہر نشست آشیانے دارد
نی خادمِ کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

انسان میں سب موجود ہے۔ صرف غور اور خوض کی ضرورت ہے۔

خویشتن را بخویشتن دریاب | خوش صدا نیست ماؤمن دریاب
آشکار است ہر طرف بنگر | عنقریب است ہاں سخن دریاب

چہ دوی ہمچو آہوئے مشکین
مشک در تست خویشتن دریاب

ضعیفہ: (بھیک بیچنے والی) سنتے ہیں کہ دو تین دن سے رات کو بُرے بُرے خواب دیکھتے تھے۔ کسی سے خواب کی تعبیر پوچھی اس نے نکاح ابھی دو ہفتے تک ٹال دو۔ مگر شہزادے تو انگریزی جوان تھے۔ اُنھوں نے ہنس کر بات ٹال دی۔ خواب سے جتنا ہم ڈرتے ہیں کوئی اور نہیں ڈرتا۔ روح فنا ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ تعبیر سچ نکلتی تھی۔

مولوی: ہم اس کے قائل نہیں۔ خواب کیا شے ہے۔ کچھ نہیں!

ضعیفہ: ہاں۔ اور آپ مولوی صاحب ہیں۔ بھلا حضرت یوسف کے والد نے خواب دیکھا تھا۔ اس کے قائل ہیں۔ آپ یا اس کے بھی قائل نہیں ہو۔

مولوی: تم جاہل کیا جانوں۔ ان پڑھ۔ ناواقف۔ یہ دور کی بات ہے۔

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من
وین حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوی من و تو
چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

اسرار سا اسرار ہے۔ اللہ اکبر۔ ابھی اسی خوشی میں جاتے تھے کہ دُلہن کو بیاہ کے لائیں گے اور لو اب گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ شان ہے خدا کی۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

اناّ: کیوں مولوی صاحب مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ یہ ہو کیا جاتا ہے۔

مولوی: جسم خاک میں مل جاتا ہے مٹی ہو جاتا ہے۔ روح کو فنا نہیں ہے۔ روح کو سزا یا جزا ملتی ہے۔ اگر افعال حسنہ سرزد ہوئے تو جزا ہے۔ ورنہ سزا۔ نار جہنم۔ اور قعر جہنم۔ یا تو حوریں ملیں گی۔ طوبیٰ کے سائے میں آرام کریں گے۔ سلسبیل و کوثر اور تسنیم کی لہریں دیکھیں گے یا دوزخ کی آگ ہم کو جلائے گی۔ جو مرضی خدا ہو۔

اناّ: ہائے ہائے۔ مگر شہزادے بہادر تو بہشت میں جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔

مولوی: داخل ہو گئے۔ بہشت خاص ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔ ہاں!

چوں حباب از قید خود وا می شود
راست میگویم کہ دریا می شود

سپہر آرا کو اس وقت وہ دن یاد آیا جب شہزادہ ہمایوں فر فنس پر سوار ہو کر ان کے ہاں آئے، اور خورشید لقا بیگم کے بھیس میں ان سے گلے مل گئے۔ سوچیں کہ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے۔ ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر خیال کرنے لگیں کہ ہائے اُس روز ہم نے ہمایوں فر کو بُرا بھلا کیوں کہا تھا۔ ہائے دس پانچ بار اُسی طرح سے کیوں نہ گلے ملے۔ ہائے اب گلے ملنا عمر بھر نصیب نہ ہوگا۔ اس دن کیا جوبن تھا خورشید لقا بیگم بن کر آتے تھے۔ اُوف اِس کے بعد اُن کو وہ روز اور وہ وقت یاد آیا۔ جب ہمایوں فر نے پتنگ ان کے کوٹھے پر ڈھایا تھا سپہر آرا نے جھپٹ کر لُوٹا تھا جو شعر اس پر لکھا تھا وہ سپہر آرا نے ہمایوں فر کے کان کے پاس بڑے زور سے پڑھا۔

از عاشقان صادقت اے دلستان منم
اول کسے کہ بر تو فدا شد بجان منم

شہزادی بیگم اور بڑی بیگم کو کیا معلوم تھا کہ یہ شعر کس موقع پر سپہر آرا کی نظر سے گذرا تھا مگر سپہر آرا نے اس حسرت سے ادا کیا کہ ان دونوں کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دُلہن نے اُٹھ کر اس گلگوں طوطی

پر کو چوم لیا جس پر سوار ہو کر دولہا جاتا تھا. گھوڑا لگام چبانے لگا. کبھی مرکب برق دم و خوشخرام پر نظر ڈالتی تھی. کبھی راکب والامقام پر. فرس ؎

جرات میں رشکِ شیر تو ہیکل میں پیل تن
پوئی کے وقت کبک دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آتے جاتے ہیں طاؤس کے چلن
سیماب تھا زمین پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

گل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبدِ دوار پھیر لو
نقطے کے گرد صورت پرکار پھیر لو
دوڑے بروے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

اور فارس

سکندر طلعتی عالی مزاج آئینہ زانوئی
زلیلی خوشتری شیریں زبانی عنبریں موئی
برنگ گل خوش اندازی بسان خار بد خوئی
بُت رنگین ادائی سرو قدی یاسمن بوئی
چو لالہ آتشین روئی چو سنبل مو پریشانی

سپہر آرا نے دولہا کے رخسار کو کئی بار چوما اس قدر بیتاب ہوئی کہ بڑی بیگم سے گلے مل کر تو رو دی. بڑی بیگم نے کہا. بیٹی خوب رو لو. جی بھر کے رو لو. دل کھول کے رو لو. اب رونا تو تمام عمر ہے. سپہر آرا نے چوڑیاں تڑا تڑ توڑ ڈالیں. اُٹھ کر لاش کے ارد گرد صدقے ہونے لگی. یہ اشعار حسرت بار ورد زبان تھے ؎

سبزۂ دامنِ نسرین ترا بندہ شوم
ابتدائے خطِ مشکین ترا بندہ شوم
چین بر ابروزون و کین ترا بندہ شوم
گرہ ابروِ پر چین ترا بندہ شوم
حرفِ ناگفتن و تمکین ترا بندہ شوم
طرزِ محبوبی و آئین ترا بندہ شوم
اللہ اللہ ز کہ ایں قاعدہ آموختہ
کیست اُستاد تو ایںہا ز کہ آموختہ

سامعین سینے اپر دو ہتھڑ مارتے تھے. ہائے (ابتدائے خط مشکین) ابھی سبزہ آغاز ہے (حرف ناگفتن

نے اور بھی ستم ڈھایا، دُلہن لاش کے گرد چمان چمان صدقے ہوتی تھی۔ دوپٹے کے پلے خوشنمائی سے لٹکتے تھے۔ عطر کی بوباس دماغ کو طبلۂ عطار بناتی تھی۔ صدقے ہونے کے وقت چھما چھم کی آواز اور بھی رُلاتی تھی۔ دُلہن نے یہ اشعار بھی حسب حال پڑھے۔

مکن آن نوع کہ آزردہ روم از کویت — دست بر دل نہم و پا بکشم از کویت

گوشۂ گیرم و من بعد نیایم سُویت — نکنم بارہ گر یاد قد دلجویت

دیدہ پوشم ز تماشائے رخ نیکویت — سخنے گویم و شرمندہ سوم از رویت

بشنو ایں پند مکن قصد دل آزردۂ خویش

ورنہ بسیار پشیمان شوی از کردۂ خویش

ہائے ستم۔ (مکن آن نوع کہ آزردہ روم از کویت) افسوس۔ اب وہ بیچارہ اس قابل ہے کہ آزردہ کرے یا خوش کرے یہ مصرع اور بھی افسوس ناک اور درد انگیز ہے (گوشہ گیرم و من بعد نیایم سویت) اب تھوڑی دیر میں لاش تہ خاک ہوگی۔ اس کو کسی کے آنے جانے سے کیا فائدہ (نکنم بار دگر یاد قد دلجویت) واہ۔ ان کا قد دلجو تو ہر دم یاد آئے گا۔ (دیدہ پوشم ز تماشائے رُخِ نیکویت) تم آنکھ چھپاؤ یا نہ چھپاؤ۔ وہ تو آنکھ بند کر چکے۔ ہائے!

بڑی بیگم: (استادہ ہوکر) بیٹی اب ذری بیٹھ جاؤ۔ دم لے لو بس۔

مغلانی: حضور اک ذری بیٹھ جائیے۔ اس مرض کا تو علاج ہی نہیں ہے۔ کوئی دوا اس میں کام ہی نہیں آتی ہے۔ کیا خرابی ہے۔ ہے ہے۔

دلہن: کیوں دوائی کیوں نہیں ہے۔ دوا ہر درد کی ہے۔

زخم دلِ مجروح جگر سوختگان را

سازندہ تر از صبر دوائے دگرے نیست

بس اس کے لیے صرف صبر ہی دوا ہے۔ اور صبر ہی نے ہمیں اس قابل کیا کہ ہمایوں فر کی لاش اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں عین اس ماتم کی حالت میں جبکہ۔

سکان سموات میں برپا تھا اُدھر غل — رہ رہ کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل

معشوق کو تھا صبر نہ عاشق کو تحمل — گلشن پہ اُداسی تھی جدا تھے گُل و بُلبُل

تاریک تھا دل تاب کسی دل کو نہیں تھی

پروانہ کہیں جلتا تھا اور شمع کہیں تھی

ایک درویش صندلی پوش بھیڑ کو کاٹ کر لاش کی طرف بڑھا اور مردے کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار رو دیا۔ صاحب کمشنر کو کسی قدر شک گذرا۔ کہا اس کو روک لو اور جانے نہ دو۔ برق اندازوں نے چاہا کہ ان کو گرفتار کرلیں۔ مگر اس کے رعب میں آگئے۔ ہیبت اس قدر طاری ہوئی کہ خاموش کھڑے رہے۔ اتنے میں انسپکٹر صاحب نے قریب جاکر کہا آپ کو کمشنر صاحب بہادر یاد کرتے ہیں۔ درویش اچھا کہہ کر صاحب کی طرف چلا۔ اور قریب پہنچ کر یوں ہمکلام ہوا۔

درویش: اگر بحیثیت حاکم کسی سرکاری کام کے لیے بلایا ہے تو حاضر ہوں ورنہ مجھے جانے دیجیے۔ میرا کام کیا ہے۔

درویش رواں رہے تو بہتر
آبِ دریا بہے تو بہتر

کمشنر: آپ کون اور یہاں کس لیے آیا۔

درویش: میں درویش بے توشہ اور بلیسواڑے میں مکان ہے۔

کمشنر: ہمایوں فر بہادر سے کوئی واسطہ تھا۔

درویش: میرے شاگرد تھے۔ عربی اور صرف و نحو اور فارسی میں نے ہی پڑھائی ہے۔ اس کے بعد پھر انگریزی شروع کی تھی۔ میں نے ایک گاؤں میں جو یہاں سے سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ خبر پائی تھی کہ ہمایوں فر کی برات آج سجے گی اور یہ بھی سُنا تھا کہ کوئی شہسوار ہمایوں فر کو آج ہی قتل کرے گا۔ میں نے ڈاک بٹھادی اور مارا مار آیا۔ مگر یہاں آیا تو سُنا کہ ہمایوں فر کے زخم کاری لگا ہے۔ دیکھا تو روح پرواز کرگئی ہے۔ ہمایوں فر کے اعزہ و اقربا جُھک جُھک کر آداب بجالاتے۔ اور کہا مولانا صاحب آپ کا شاگرد ہم کو داغ دے گیا۔ ہمارے عیش و آرام پر بجلی گرائی۔ ہم سب راحت کے خوگر ہیں یہ کوہ الم ہم پر ہمایوں فر نے توڑا کہ اب ہم کسی مصرف کے نہ رہے۔ ساری خدائی ہماری آنکھوں میں تیرہ و تار نظر آتی ہے۔ دُلہن کی کلی دیکھ کر اور بھی رونا آتا ہے۔

دریں محفل سراپا حیرتم امشب چہ حالست ایں
کہ شمع از جان و دل می سوزد و پروانہ می گرید

مولانا صاحب گو بڑے صابر اور ضابط تھے مگر اُن کی آنکھیں بھی پرنم ہوگئیں۔ جس وقت اُنھوں نے دیکھا کہ دُلہن بہر ہفت آرایش سے مزین ہو کر دولہا کی لاش کے نثار ہو رہی ہے۔ تو اور بھی رنج ہوا۔ اتنے میں دُلہن نے صاحب کمشنر کی طرف مخاطب ہو کر کہا (اب آپ قاتل کا پتا لگائیں گے یا نہیں)

اس وقت صاحب ممدوح آبدیدہ ہوگئے۔ کہا بیگم صاحب بڑی کوشش کرکے اس بدبخت کو ڈھونڈھ نکالیں گے۔ حضور آپ دل کو ذرا تسکین دیں۔ خلق خدا اس زور سے سینہ پیٹنے لگی کہ یہ نازو نعم پروردہ جس نے کبھی کسی نامحرم سے بات نہ کی ہوگی۔ کس بے تکلفی کے ساتھ ایک جلیل حاکم یوروپین سے مخاطب ہوئی سچ ہے۔ اہل العرض مجنوں۔

صاحب موصوف نے حکم دیا کہ اور زیادہ کوشش قاتل کی گرفتاری میں کی جائے۔ اور کہا کہ ہم خود سعی بلیغ کریں گے۔

شہزادی بیگم کی آنکھوں سے اشکِ اضطراب فروش کا تار بندھ گیا تھا۔ رومال پر رومال تر بتر ہوتا تھا۔ زبان سے صرف یہی کلمہ نکلتا تھا (ہائے میرے نازوں کے پالے میرے نرگسی آنکھوں والے۔ بیٹا دلہن لاش پر کھڑی ہے۔ آخری دیدار تو دو) کبھی دولہا کی کلغی دیکھ کر سر پیٹتی تھیں۔ کبھی دلہن کی کلغی کو چومتی تھیں۔

سپہر آرا نے کہا اماں جان۔ اس وقت ہماری وہ کیفیت ہے۔ جیسے کسی کو نشہ چڑھتا ہے۔ افوہ۔ مگر میرا دل مجھے تسکین دیتا ہے کہ پیارا شہزادہ مرقدِ منوّر سے ہنستا ہوا نکل کر باغِ جناں کی راہ لے گا۔ پل صراط سے یوں گذرے گا جیسے بادِ شرطہ سے جہاز سمندر میں جاتا ہے۔ رضوان پیشوائی کے لیے آئیں گے۔ حورانِ بہشتی استقبال کریں گی۔ تمام باغِ ارم میں دھوم مچ جائے گی کہ شہزادہ ہمایوں فر بہادر آتے ہیں۔ غلمان قدم لیں گے۔ طوبیٰ نہال ہو جائے گا۔ تسنیم و کوثر کا آبِ رواں آبِ گہر کو خجل کرے گا۔ سلسبیل کے کنارے فرشِ زمردی پر بیٹھے ہوں گے۔ ادھر ادھر حورانِ عنبر مو رشکِ شمشاد بیچ میں شہزادہ فرخ نہاد۔ شراب طہور کے جام حوریں بھر بھر کے اپنے ہاتھ سے دیں گی۔

کردہ ام توبہ بدست صنمِ بادہ فروش
کہ دگر مے نخورم بی رُخ بزم آرائی

یہ کہہ کر پھر لاش کے اردگرد صدقے ہوئی۔ مغلانیاں خواصیں جو برات کے ساتھ تھیں پائینچے اٹھاتی جاتی تھیں۔ تاکہ ٹھوکر نہ کھائیں۔ ابھی الڑھ پن کے دن ہیں۔ کہیں ڈر نہ جائیں۔ سپہر آرا سرہانے کی طرف متمکن ہو کر بصد حسرت و زاری لاش سے یوں کہنے لگی۔ ہائے ستم! او جانے والے! کیا اب منہ نہ دکھائے گا۔ ہائے میرے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے کون کون مصیبتیں جھیلیں۔ خورشید لقا بیگم کا بھیس بدلا۔ باغبان بنے۔ اپنے پیارے ہاتھوں سے گلدستے بنائے۔ (لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر) جب ہر روز ایک گلدستہ اپنے ان ہاتھوں سے (ہاتھوں کو چوم کر) بنا کے بھیجنے لگے تو میں نے ایک دفعہ زیب النسا کا یہ شعر لکھا۔

بگو اے عاشق صادق چرا گلدستہ آوردی
دل بلبل شکستی غنچہ را سر بستہ آوردی

تو اس کے جواب میں ایک شعر لکھا تھا۔ جو مجھے اس وقت رنج دیتا ہے۔

زبہر زیب دستت ماہ من گلدستہ آوردم
بشوخی لاف می زد گل بہ بیشیت بستہ آوردم

(آبدیدہ ہوکر) ہاتھی پر سوار ہو کر گھنٹوں دیوار کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ اور صبح و شام دو پہر سہ پہر رات کو جب دیکھو کوٹھے پر ڈٹے ہوتے۔ ہائے ہائے۔ دو چار باری گھر پر بھی ہو گئے۔ دولہا بھائی سے یارانہ پیدا کیا۔ شطرنج کے نقشے باجی جان کے پاس بھیجے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہائے کس کس بات کو روؤں۔ ایک موت نے کروڑوں ارمانوں کا خون کیا۔ جس دن ڈاکوؤں نے گھیرا تھا، کس بانکپن کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ جہاں زبان کھولی اچھے اچھوں کو بند کر دیا۔ جو آتا تھا یہی کہتا تھا کہ شہزادے بہادر خوشرو بھی ہیں اور خوش تقریر بھی۔

گلشن میں سن کے زمزمہ پردازیاں مری
دم بند ہو گیا ہے مرے ہم صفیر کا

کمال اضطرار اور غایت اضطراب سے سپہر آرا بیگم پچھلی باتوں کو یاد کر کر کے روتی تھیں۔ کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرنا۔ کبھی ماتم کرنا۔ کبھی لاش کی طرف مخاطب ہو کر کچھ کہنا۔ کبھی حاضرین کے سامنے گریہ وزاری کرنا۔

ایک مرتبہ بڑے زور سے دوہتڑ مار کر کہا (لوگو یہ کیا اندھیر ہے) ہے ہے یہ میرا رونے کا دن تھا۔ یا وہ دن تھا کہ میں جامے میں پھولے نہ سماتی۔ خلق خدا مجھ کو دیکھ دیکھ کر کہتی کہ خدا کرے ہر شریف کی بیٹی ایسی خوش قسمت ہو۔ جتنی صفتیں انسان میں ہونی چاہییں سب دولہا میں موجود ہیں۔ پریزاد چاند سا مکھڑا، قد دلجو رخسارے گل تر۔ نرگسی آنکھ شانے بھرے ہوئے بدن گول، ہاتھ پاؤں خوبصورت، شہ زور، شیر نر کی سی کلائی، خوش وضع، جامہ زیب، عالی حسب، والا نسب، شریف الطرفین، نجیب الجانبین، امیر کبیر شہزادہ والا پائگاہ۔ ثریا جاہ، کم سن، نوعمر، اٹھتی جوانی ذی استعداد۔ صاحب تصنیف، شاعر غرا۔ نثار بے ہمتا، بانکے گل چھلے، شہسوار، فنون سپہ گری سے واقف، خوش گلو، ذی مروت، خوش اخلاق مگر قسمت کو کیا کروں۔ ہائے یہ وہ سر ہے۔ جو میرا سرتاج تھا۔ ہائے یہ وہ پیشانی ہے جس کے چومنے کی پریاں آرزو رکھتیں۔

سپہر آرا یہ بین کر ہی رہی تھیں کہ دفعتہً پورب کی سمت ایک محل سے کسی شخص نے ایک سلام

بصد سوز وگداز پڑھا۔

مجرئی جبکہ عصیاں ماہِ عزا ہوتا ہے — چرخ پر ماتم شاہِ شہدا ہوتا ہے
رونے والوں کا بھی کیا رتبہ ہے سبحان اللہ — جن کے اشکوں کا خریدار خدا ہوتا ہے
کیوں خجل ہوتے ہو پانی نہ ملا تو نہ ملا — وہ کیا تم نے جو کچھ حقِ وفا ہوتا ہے

کہتی تھی خلق خدا دیکھ کے عابد کو اسیر
کہیں بیمار بھی رسّی میں بندھا ہوتا ہے

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کونسا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کونسے گُل کھلے جو مرجھا نہ گئے

لوگوں نے اس شخص پر نظر ڈالی تو کہا۔ ارے! یہ تو نواب ضیار الدولہ ہیں۔ ہمایوں فر کے بہنوئی بلہ لقا بیگم کے میاں۔ ان کو ہمایوں فر سے دلی محبت تھی۔ ایک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ ایک ہی جگہ کھیلے تھے بڑا یارانہ تھا مگر ایک روز آپس میں کسی بات پر چل گئی تو ہمایوں فر نے کہا اب تم مر بھی جاؤ۔ تو ہماری صورت نہ دیکھ سکو گے۔ جواب دیا جس دن مرد گے اُسی روز دیکھیں گے۔ اس وقت ضیار الدولہ کو لڑکپن کی یہ تقریر یاد آئی۔ تو جنون کی سی کیفیت ہوئی۔ صاحب کمشنر نے کہا نواب صاحب کو ذرا یہاں تک لاؤ۔ نواب ضیار الدولہ بہادر آئے۔

کمشنر: آپ کا مزاج کیسا ہے۔ اس وقت چہرہ کچھ سرخ بہت ہے۔

نواب: مطلب یہ ہے کہ جو لڑکپن میں کہا وہ کچھ کا کچھ تھا۔ ہائے۔

تھا شور تند باد سے دریا کو اضطراب
چکر جو تھا بھنور کو تو موجوں کو پیچ و تاب

سول سرجن: (ایک شہزادے سے) یہ شعر جو پڑھا۔ اس کے کچھ معنی ہیں۔ ان کے کلام سے کچھ مطلب مل جاتا ہے یا اکھڑ جاتا ہے۔

شہزادہ: بالکل مطلب نہیں ملتا ہے۔ شعر اس مقام پر بے جوڑ تھا۔

کمشنر: وَل نواب ضیار الدولہ خان بہادر۔ کیا بات ہے۔ وَل۔

نواب: اُف۔ حضور جیسے ایک گرمی سی معلوم ہوتی ہے۔ سینہ پھنک رہا ہے۔ میرا یار اب مجھے کہاں ملے گا۔ ہائے بس اب مل چکا۔

عنقا گو گرد سرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتا ہے دوست کم ملتا ہے

دوست نہیں ملتا۔ اور ساری خدائی کی نعمت چاہے مل جائے۔ ہائے افسوس۔ ع
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

اتنے میں خبر آئی کہ اس سانحہ ہوش رُبا کا حال سُن کر ایک عورت گر پڑی۔ بیہوش ہوگئی۔ اطبائے یونانی نے دوا دی مگر ہوش نہ آیا۔ نبض ساقط نہیں ہوئی ہے مگر ہوش وحواس بر جا نہیں ہیں۔ صاحب کمشنر بہادر سے ایک رئیس نے کہا کہ اس حادثے کے وقوع کے قبل نواب مہ پارہ بیگم کے ہاں آگ لگی تھی۔ (مہ پارہ بیگم بڑی بیگم کا نام ہے) اور تھوڑی دیر کے بعد ایک گھوڑا مر گیا۔ صاحب ممدوح نے کہا۔ ان باتوں سے ہمارے ملک میں بھی لوگ گھبراتے ہیں۔ مگر بہت کم۔ تربیت یافتہ آدمی ان باتوں کو نہیں مانتے۔

جب دیکھا کہ دلہن کی حالت غیر ہے تو لاش کے پاس سے ہٹالے گئے۔ گاڑی پر سوار کیا اور کہا بیٹی اب اپنے گھر چلو۔ آخری دیدار ہوگیا۔

رہائی کی تدبیر

مرزا ہمایوں فر بیچارے کا حال تو یہاں چھوڑا۔ اب ذرا خوجی واہ لاحول ولاقوۃ۔ خواجہ بدیع الزمان صاحب کا حال سُنیئے۔ یہ لڑھکتے آزاد کے قید خانے تک پہنچے۔ کوشش بلیغ کر کے دروازہ کھولا اندر گئے پہلے میاں آزاد سمجھے کہ پولنڈ کی شہزادی نے کسی کو بھیجا ہے کہ ایک بار پھر ہم کو سمجھائے اور راہ راست پر لائے۔ مگر دل میں ٹھنی تھی کہ شادی پر ہرگز راضی نہ ہوگا چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ خوجی قریب پہنچے مگر تاریکی کے سبب سے آزاد نظر نہ آئے۔ تو جھلا کر کہا۔ او گیدی بھونک دوں قرولی آزاد نے یہ آواز سُنتے ہی اٹھ کر خوجی کو گود میں اٹھا لیا۔

خوجی: آزاد۔ آزاد۔ آزاد۔ ہونہہ۔ ایں! الٰہی خیر کسی دل لگی باز نے دل لگی تو نہیں کی۔ ارے میاں تم کون ہو۔؟

آزاد: (خوجی کو گود میں لیکر کودنے لگے) ہو ہو!

خوجی: بھائی جان تم بھوت ہو یا پریت ہو۔ ہم کو چھوڑ دو۔ میرا بھائی ارے یار میں اپنے آزاد کی کمک کو جاتا ہوں۔ مجھے چاہے چکھ لو۔ مگر کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ بچ جائے۔

اس فقرے پر آزاد کا دل بھر آیا۔ بھائی خواجہ صاحب میں بھوت — خوجی کو تاب کجا کہ پورا فقرہ سنیں۔ ایسے خوش ہوئے کہ جامے میں پھولے نہ سمائے۔ آزاد نے کہا یار آہستہ آہستہ گفتگو کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آجائے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں تک کیوں کر پہنچے۔

خوجی: ہم تو سب بتائیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ قید خانہ کیوں نصیب ہوا۔ چور نہیں ہو۔ ڈاکو نہیں ہو۔ جال ساز نہیں ہو۔ پھر یہ کیا ہوا۔ تم اور قید خانہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فوجی قیدی نہیں ہو۔ پھر کیا؟

آزاد: کیا بتائیں بھائی۔ یہاں ایک پری رہتی ہے۔ دیکھو تو غش آجائے۔ بیہوش ہو جاؤ۔ بس روز سے بڑھ کر اور جوانی پھٹی پڑتی۔ اسی کے ہاتھوں ہم اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔

خوجی: کیا کچھ بے ادبی کر بیٹھے تھے۔ صاف صاف بیان کرو۔

آزاد: اجی خدا جانے کیا ہوا تھا۔ مگر خیر جو ہوا وہ ہوا۔ اب یہ بتاؤ بھاگنے کی بھی راہ ہے۔ کوئی تدبیر ایسی بھی ہے جس سے بچ نکلیں۔

خوجی: ہاں ہے ایسی بھی ایک تدبیر ہے۔ مگر مانوگے یا نہیں۔

آزاد: ہائے ہم نہ مانیں۔ ہم تو خدا سے دعا مانگتے ہیں۔

خوجی: کمبخت اتنی عقل نہیں کہ ستر ستر پہروں میں سے کس طرح بھاگوگے۔

آزاد: (آہ سرد بھر کر) تو اب حسن آرا کو نہ دیکھ سکیں گے۔ اللہ رکھی۔ بیچاری کڑھتی ہی رہیگی۔ بس میڈا کے دل پر بجلیاں گریں گی۔ سپہر آرا یاد کر کے زار زار روئیں گی۔ افسوس! خوجی پھر خود کردہ را چہ علاج۔ ایسی پری زاد پر چھم ملے اور تم انکار کرو۔ سوئی طالع۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ افسوس خدا کی قسم تم کو تو لازم تھا کہ فوراً نکاح کر لیتے۔ اور خوب لطف اٹھاتے۔ اگر دل بستگی ہوتی تو سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ ورنہ اس حالت میں بھاگنا بھی آسان ہوتا۔ آج صبح کو جس وقت میں سلام کے لیے گیا دیکھا کہ مسکرا رہی ہے۔

تا قیامت نیشکر روید از ان خاکے کہ تو
اے بت شیریں ادا آنجا تبسم کردہ

ہائے وہ مسکرانا عمر بھر نہ بھولے گا۔ کیا ادا تھی۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

آب گہر بچشم صدف رشک حیرت است

آنجا کہ لعل او بشکر خندہ واشود

اور ساعد سیمین پر جو نظر پڑی تو کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

صفائے ساعدش با صبح صادق میزند پہلو

سہی بالائے من در آستین دارد قیامت را

ایسی پری زاد نوخیز پاکر انکار کرنا۔ عقل کے خلاف ہے یا نہیں۔ فوراً منظور کر لو۔ ایسی پریاں آدم زاد کو قسمتوں سے ملتی ہیں۔

آزاد: یار حسن و جمال میں تو شک نہیں۔ واللہ وہ حسن خداداد ہے کہ باید و شاید آنکھ ناک کان گلا قد و قامت جو ہے۔ مناسب موزوں سانچے کا ڈھلا ہوا۔ مگر حسن آرا سے قول ہارے۔ مس میڈا سے وعدہ کیا ہے اس کا خیال ہے۔

خوجی: واللہ نرے گاؤدی ہو۔ ارے میاں اب تو جان کے لالے پڑے ہیں اب تو اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ جس طرح ممکن ہو اُس پری زاد کو خوش کرو۔ تم کو تو اس پر ثابت کرنا چاہیئے کہ تم کسی طور پر اُس کو چھوڑ کے جاؤ ہی گے نہیں۔ کہو کہ میری جان جاتی ہے۔ جب کہیں تمہارا اعتبار ہو گا۔ اپنی نا تجربہ کاری کی بدولت تم نے یہ دن دیکھا۔ اب نہ حسن آرا کے کام آسکتے ہو نہ میڈا کا وعدہ وفا کر سکتے ہو۔ کسی مصرف کے نہیں ہو۔ ع

بیکارم و باکارم چوں مد بحساب اندر

آزاد: ہو سڑی تو کیا ہوا۔ بات ٹھکانے کی کہتے ہو۔ مگر اب تقریر کون کرے۔ یہ تو بتاؤ۔

خوجی: آخر لونڈے ہی ہو نہ۔ ہم آتے کیا کرنے ہیں۔ ہم کو بھیجا کیوں ہے۔

آزاد: (خوش ہو کر) کیا شہزادی تک تمہاری رسائی ہو گئی۔ شاباش پھر اب کیا پوچھنا ہے۔ کسی مار لیا ہے۔

خوجی: میں بیڑا اُٹھا کے آیا ہوں کہ آزاد کو لاؤں گا۔

خوجی نے آزاد کو خوب سمجھایا۔ بڑی دیر تک گفتگو کر کے کہا کہ اب آپ ٹھہریئے۔ بندہ جاتا ہے۔ جا کر عرض کروں گا کہ خدا خدا کر کے اس بدکیش کو راہ پر لایا ہوں۔ اب ذرا آپ چلی چلیں تو وہ منظور کر لیں۔

آزاد: اللہ اللہ. یہ دعویٰ. اب آپ اپنے نزدیک ان کو یہاں لے بھی آئیں گے. واہ وہ شہزادی. حسن پر مغرور. زر و زیور کی کمی نہیں نازک مزاج عالی دماغ. بھلا ممکن ہے کہ یہاں آتے. یہاں آنا کیسا اگر اُس کے دل میں آئے تو اسی دم پکڑوا بلائے.

خوجی: اجی کہتے ہیں نہ کہ لونڈے ہو. عشق بری چیز ہے. عقل کو عشق سے کیا واسطہ. وہ تمہاری ایک ایک ادا پر جان دیتی ہے. جہاں کہو جائے اور جہاں بلاؤ آئے.

عشق در آمد ز در گفت — سلام علیک
عقل بروں شد ز سر گفت — سلام علیک

عشق آیا اور بس قیامت آئی. عشق کجا اور عقل کجا. توبہ!

عشق آیا قیامت — آئی ہے
پارسائی پر آفت — آئی ہے

یہ عشق وہ بلائے بے درمان ہے کہ اس کا چارہ نہیں. انسان کو مجبور کر دیتا ہے. عشق ہونا ہنسی ٹھٹھا ہے کچھ. مگر سخت حیرت ہے کہ تم اس پر عاشق نہ ہوتے. میں تو صرف گوری گوری کلائی دیکھ کر مفتون ہو گیا.

ساعد خویش نمودی و من از کار شدم
آخر اے شوخ بدست تو گرفتار شدم

آزاد: جس روز میں نے اس زیبا اندام کو سب سے پہلے دیکھا سن سے جان نکل گئی. آنے وارد حسن جمال اور کم سنی ہی قتل کے لیے کیا کم تھی. کہ اِس آن نے اور بھی ستم ڈھایا. واللہ آنے وارد.

شاہد آن نیست کہ موی و میانی دارد
بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنی دارد

جس وقت گوری گوری گردن پھیر کر چمن کی طرف نظر ڈالی تھی، میری یہ کیفیت تھی کہ دور ہی سے کھرا مزے لوٹتا تھا. برگِ گل سے بھی نازک ہے. اور زلف تو ایسی تمام عمر نہیں دیکھی. قابل دید ہے. نہ شنید ہے. گیسوئے عنبر بو نے پریشان کر دیا.

ہر خم و پیچے کہ شد از تارِ زلف — یار شد
دام شد زنجیر شد تسبیح شد زنار شد

دو تین بار گُلِ رخسار کا بوسۂ دلفریب بھی لے چکا ہوں اور دو بار وہ بھی ان رخساروں کو چوم چکی ہیں۔ اس لُطف کا حال نہ پوچھو ستم کا سامنا تھا۔ اب میں واقعی خود سوچتا ہوں کہ میں نے اب تک وقت کیوں ضائع کیا۔ ایسی پری چہرہ بیوی ہے۔ شہزادی اور انتہا کی حسینہ اور جمیلہ۔ ایسی گل عذار، ایسی باغ و بہار، ایسی خوش سلیقہ، ایسی ہنس مُکھ اور ایسی مغرور۔

خواجہ بدیع الزمّاں اس درجہ محظوظ ہوئے کہ پھڑکنے لگے۔ ماشا اللہ۔ سن شریف پہ چہل وشش نازم بایں ریش وفش۔ آزاد نے باصرار کہا کہ اپنا حال تو بیان کیجیے۔ حضرت نے یوں بیان کیا۔

ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را
ثریا دہ طارم تاک را

ایّہا السّامعین! یعنے سنو تم اے سامعین۔ سُننے والوں۔

آزاد: کیا در و دیوار بھی سنتے ہیں۔ یہاں تو بس ایک میں ہوں۔

خوجی: کیوں کیا دیوار سُن نہیں سکتی۔ پھر کیوں کہا ہے۔ ع

دیوار گوش دارد فہمیدہ لب بجنباں

آزاد: خیر مطلب شروع کیجیے۔ حال بیان فرمائیے۔ تمہید ہو چکی۔

خوجی: قسم ہے آزاد کے سر کی وہ وہ کارستانیاں کی ہیں کہ سُننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ تین لڑائیاں سر کیں۔ تینوں میں کامیابی حاصل ہوئی جس طرف فوج عدو تھی اُدھر پھٹکار برستی تھی اور اُدھر تقدّس پاشا کی فوج اور دو ملّا اور ایک آخوندا ان کے ساتھ تھے اس زمین کا کیا کہنا۔

مثل زمین خلد مصفّا تھی وہ زمین
ساتوں فلک سے اوج میں بالا تھی وہ زمین
روئے زمین پہ عرش معلّےٰ تھی وہ زمین
فردوس کا کھنچا ہوا نقشا تھی وہ زمین

بس قبلۂ عالم چھڑ گئی اور ہماری فوج کسی قدر تربتر ہونے لگی کہ یکایک ایک آواز میرے کان میں آئی۔ (یا جلورو فتت ونست بی ہے) یہ زبان جِناتی آدمیوں ہی کی سمجھ میں آتی ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا ہیں اس کے یہ معنی کہ اے خواجہ بدیع میموں ساعت ہے۔

آزاد: (مسکرا کر) خواجہ بدیع میموں کی اچھی پھبتی کسی نے کہی۔

خوجی: بات سنو صاحب دل لگی کا بہلا یہ کون موقع ہے۔ واہیات بس اس آواز کے بعد ایک اور آواز آئی کہ (پل تیار کرو۔ دو سو قدم کے فاصلے پر) فوراً سپہ سالار سے اس بشارت کو بیان کیا۔ اور اُنھوں نے معاً پل تیار کر دیا۔ لڑائی بڑی گرما گرمی سے ہو رہی تھی کہ ایک شکل نورانی نظر آئی۔ جس نے ہدایت دی کہ اے بندۂ خدا فوراً چڑھ دوڑو۔ پھر تو میں شمشیر بکف چلا تو۔ ع

کشتوں کو اپنے فوج عدو روندنے لگی

باقی حال پھر کہوں گا بالفعل جا کے اس پری کو بُلا لاتا ہوں۔

آزاد: فی امان اللہ جائیے۔ مگر اُس بدکیش کا آنا معلوم کیا جاں۔

شادی کا پیام

ایک چھوٹا موٹا بونا امیروں کا کھلونا ایک گلبدن غنچہ دہن شہزادی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے۔ شہزادی اس بونے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہے۔ میاں خوجی نے جو اُس مہ طلعت پری پیکر کو مسکراتے دیکھا تو سمجھے کہ حسبِ معمول یہ بھی ہم پر ریجھیں۔ اتنا سمجھنا تھا کہ شیطان نے دور سے اُنگلی دکھائی۔ حضرت خواجہ بدیع الزّمان صاحب اکڑ گئے۔ ان کے اکڑنے پر اس رشکِ قمر کو اور بھی ہنسی آئی۔ کھل کھلاتے ہوتے دیکھا تو یقین کامل ہو گیا کہ ہزار جان سے عاشق زار ہے۔ شہزادی کی طرف دیکھ کر کہا کیوں لڑوا ؤ گی۔ آزاد سنے گا تو بگڑ اُٹھے گا کہ وہاں مس روز کو اپنی طرف مخاطب کر لیا یہاں اس معشوقۂ زرین قمر کو جما لیا اور مس روز کو رقابت ہو گی۔ ایک مس روز پر کیا فرض ہے جس جس ملک میں پریاں ہم پر فریفتہ ہوئی ہیں۔ وہ تمہاری رقیب ہو جائیں گی۔ مگر واہ رے میں اور واہ ری مری کاٹھی۔ بس میں ہی میں تو ہوں جس نوعمر معشوق نے دیکھا۔ بس دل آ گیا۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ مخاطب ہی نہیں ہوتے۔ ایک ہو تو مخاطب ہوں۔ دو ہوں تو پیار کریں۔ تین چار ہوں تو نکاح کا سامان بہم پہنچائیں۔ جب اندر کا اکھاڑا اور پریوں کا دنگل ریجھے تو پھر کس کس سے التفات کروں۔ اور بوا زعفران یاد ہی نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ تو وہی ریجھیں تھیں۔ بے نکاح کے میاں کہہ اٹھیں۔ کھوپڑی کو بھی ایسا آرام دیا کہ خواجہ بدیع الزمان صاحب عمر بھر نہ بھولیں گے

شہزادی نے ایک خوبرو خادمہ کو اشارہ کیا کہ ان کو یہاں حاضر کرو۔ خواجہ اینڈتے ہوتے چلے کنڈے تولتے ہوتے کرسی زرّین کے قریب پہنچے۔ جس پر وہ پری زاد بصد شانِ برنائی متمکن تھی خواجہ صاحب جُھک کر سات بار سلام بجالائے۔ پھر تن گئے۔ اب جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ جس طرف نظر ڈالتے ہیں۔ عجب و غرور کے ساتھ سوچے کہ اب اس مقام دلکش و مینو سواد کے مالک بن بیٹھیں گے۔ ہمارے مقابل میں آزاد کی دال نہ گلنے پائے گی۔ شہزادی نے ایک زیبا اندام پیش خدمت کو حکم دیا کہ اس بونے کو کرسی پر بٹھا دو۔

خوجی: نا ہم کُرسی پر یوں نہیں بیٹھتے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ جہیز کیا دو گی۔

راوی: ایں! اچھے مزے میں آئے۔ بسم اللہ جہیز ہی سے شروع کی۔

ع۔ بن: آپ کُرسی پر ٹکیے تو۔ اس گھبراہٹ کے قربان۔ بیٹھو۔

خوجی: ہونہہ! ہم پر تمام زمانے کی عورتیں ریجھ جاتی ہیں۔ مگر یہاں تو اپنا منظور ہے کہ اپنا دل دیکھیں کس پر آتا ہے۔

گر تم نہیں تو اور بتِ مہ جبیں سہی
ہم کو دل لگی سے غرض ہے کہیں سہی

راوی: اس وحشت کے صدقے۔ سوال دیگر جواب دیگر۔ لاحول ولاقوۃ۔

ع۔ بن: اور یہ بیاہ کرتے کس بوتے پر ہو۔ سوکھی ہڈیوں پر یہ غرور۔

خوجی: (بگڑ کر) بس بس۔ تم پہلوانوں کی باتیں کیا جانوں۔ یہ چور بدن کہلاتے ہیں۔ ابھی اکھاڑے میں اُتروں اور ذرا سی مٹّی مل لوں تو پھر کیفیت دیکھو۔ شیدی لندھور بھی سہم جائیں تو سہی۔

ع۔ بن: ٹینی مرغ کے برابر تو حضور کا قد ہے۔ دعویٰ یہ لمبا چوڑا۔

خوجی: بس تم ناقص العقل ہو نہ۔ تم تو قد کو دیکھا چاہو اور یہاں لمبے آدمی کو لوگ بے وقوف سمجھتے ہیں۔ شیر کو دیکھو اور اونٹ کو دیکھو۔ سچ کہتا ہوں یہ چور کہلاتے ہیں۔ مصر میں ایک بڑے گراں ڈیل جوان کو پٹخنی بتائی۔ مارا چاروں شانے چت۔ اُٹھ کے پانی بھی نہ مانگا۔ جی جناب دل لگی نیست۔ مقابلہ کردن از منِ بدیع صاحب دل لگی بازی نیست۔ اگر دل لگی بازی باشد ہر آئینہ امتحان بکنید و بس۔

خدا خدا کر کے خواجہ بدیع الزمان صاحب کُرسی پر بیٹھے تو دونوں ٹانگیں کُرسی پر۔ اس

طرزِ نشست کو ملاحظہ فرمائیے۔ خاص جانگلوؤں کے بیٹھنے کا طریقہ ہے۔ بیٹھ کر شہزادی پر از سرتا پا نظر ڈالی اور اکڑ کر فرمایا کہ اب جہیز کا حال بتاؤ۔ لیکن میں ایک شرط سے شادی کرتا ہوں کہ یہ جتنی لونڈیاں اور پیش خدمتیں ہیں۔ ان سب کو محل بناؤں گا۔ ان کے نادر نادر نام رکھوں گا۔ دل فریب محل، طاؤس زیب محل، مہ پارہ محل، چاند تارا محل، گلاب محل، شاداب محل، نئے نام دُنیا سے نرالے۔ ساری خدائی سے انوکھے۔ اس فقرے پر شہزادی متحیر ہوئی اور عربن مسکرانے لگی۔ پیش خدمتیں مُنہ چھپا اور گردن پھیر کر مسکرائیں۔

شہزادی: اخاہ! تو یہ اپنی شادی کے پھیر میں ہیں یہ کہیے۔

عربن: حضور ان کے خوبصورت اور وجیہ جوان ہونے میں تو شک نہیں۔

راوی: ظاہر ہے۔ ہاتھ پاؤں خوبصورت۔ ڈنڈ پیل خوش رو جوان ہیں۔ اور سن شریف بھی ابھی چہل وشش سے زیادہ نہیں ہے۔

خوجی: ہنستی آپ کیا ہیں۔ کھاؤ تو قسم کہ ہم پر تمہارا دل نہیں آیا ہے۔ مگر ان عربن نے اس وقت بھانجی ماری کہ دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں ہیں۔ ہائے اس چور بدن نے دھروا دیا۔ لے اسی بات پر کسی پہلوان کو بلائیے۔ اگر ہم کشتی نکالیں تو شادی منظور۔ ورنہ خیر مگر جہیز کا فیصلہ پہلے ہی ہو جائے۔

شہزادی: (مسکرا کر) تو آپ اپنی شادی کے لیے آتے ہیں یا آزادی کی۔

خوجی: ہونہہ لڑواؤ۔ لڑواؤ۔ بھلا کالے کے آگے کہیں چراغ جلا ہے۔

آگے مرے فروغ پانا
سورج کو چراغ ہے دکھانا

شہزادی نے ایک ادائے دلربا سے پیشِ خدمتوں کو قریب لایا اور آہستہ سے کان میں کہا کہ اُس موٹی تازی حبشن کو بُلا لاؤ۔ خوجی سمجھے کہ ہمارے واسطے کچھ تحفے منگواتے ہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دیونی ڈنڈ پیل عورت کالی کلوٹی بد قطع حبشن اکڑتی ہوئی چلی آتی ہے۔ سر پر کسی جانور کے دُم کی ٹوپی کمر سے ٹخنوں تک ایک قسم کا جانگھیا۔ اور ڈھیلا ڈھالا کُرتا تا بہ کمر برہنہ پا۔ ہاتھ میں ایک موٹا سونٹا۔ دیکھتے ہی ان کے ہوش اُڑ گئے۔ بوا زعفران یاد آئیں۔ افوہ۔ یہ تو بوا زعفران کی بھی نانی جان نکلیں۔ یا الہٰی میں دُبلا پتلا آدمی اگر من بدیع پر گر پڑے تو چکنا چور ہی ہو جاؤں۔ نا بھائی جان۔ ایسے مقام پر اگر حور کے ساتھ بھی شادی ہو تو ایجاب قبول منظور نہیں۔ بس بیچ ہی ہزار نعمت پائی۔ اب سے آئے گھر سے آئے۔ بندہ در گذرا۔ وہ عورت سکھائی پڑھائی تھی ہی۔ آتے ہی خوجی کی کرسی کے قریب

کھڑی ہوگئی۔ خواجہ صاحب کو کمال ناگوار گذرا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ تو روح فنا ہوگئی۔ شانے کو جنبش دی تاکہ اُس کا ہاتھ ہٹ جائے۔ مگر وہ ہاتھ ہٹنے والا کب تھا۔ اُس زور سے ہاتھ جمایا کہ میخ گاڑ دی۔

شہزادی نے کہا یہ روم میں برسوں رہی ہیں۔ تمہاری طرح ٹوٹی پھوٹی ترکی زبان بول لیتی ہے۔ اس سے کچھ گفتگو کرو۔ خوجی سے یوں مکالمہ ہوا۔

خوجی: میں مرد تم عورت۔ بڑی شوخ اور بےحیا ہو۔ ہٹاؤ ہاتھ۔

جلبشن: تم مرد ہو۔ سچ کہو۔ مرد تو ایسے نہیں ہوا کرتے۔ تم تو عورت ہو۔

خوجی: دیکھ میرے مُنہ نہ لگنا۔ خبردار۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں۔

جلبشن: کیا بُرے آدمی ہو۔ اگر مرد ہو تو ہماری تمہاری شادی ہو جائے۔

شادی کا لفظ سنتے ہی خوجی کے ہوش اُڑ گئے۔ سمجھے کہ بُرے پھنسے۔ اس عرصے میں اس دیوئی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مروڑنا شروع کیا۔

جھلّا جھلّا کر کہتے تھے کہ ہائیں! ہائیں! ہاہئیں۔ ہاتھ چھوڑ دے۔ دیکھو ٹوٹ جائے گا۔ میں جتائے دیتا ہوں، اگر ہاتھ میں ضرب آئی تو بے طور پیش آؤں گا۔ مجھ سے بڑھ کر بُرا کوئی نہیں ہے۔ جی ہاں۔

راوی: بجا ارشاد ہوا اور وہ چور بدن اب کہاں گیا۔ اس بانکپن کے صدقے ہاتھ چھوڑاتے نہیں چھوٹتا۔ ہیکڑی کی لے رہے ہیں۔ ہاتھ چھوڑ کر اس نے دونوں ان کے کان پکڑے اور کان پکڑ کر اُٹھایا تو زمین سے چھ انگل اُونچے۔ اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔ شہزادی اس قدر ہنسیں اس قدر ہنسیں کہ گورے گورے گال اور بھی سرخ ہوگئے۔ پیش خدمتیں کھل کھلاتی جاتی تھیں۔ عربن نے خوب تالیاں بجائیں۔ شہزادی کرسی پر سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور شوخی کے ساتھ کمر لچکاتی ہوئی خوجی کی طرف چلیں۔ یہ بیچارے تین منٹ تک ٹنگے رہے۔ خوجی کی یہ کیفیت کہ بوٹیاں نوچ کھانے کو جی چاہتا تھا۔ یہ تو سوچے تھے کہ چاند سی دُلہن پائی۔ شہزادی ملتی۔ زر وزیور و جواہر کی کمی نہیں ہے۔ اور اُسی دُلہن کے سامنے یہ دُرگت ہوئی۔

جلبشن: (خوجی کو چھوڑ کے) کہو شادی پر راضی ہو یا نہیں بولو!

خوجی: عورت سمجھ کے چھوڑ دیا ورنہ کوئی اور ہوتا اتنی چھُریاں بھونکتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ چور بدن ہے ہمارا مگر عورت کے مُنہ کون لگے۔

شہزادی : اے نواب شادی کی نسبت تو صاف صاف جواب دو کچھ۔

خوجی : ہم کو تمہارے ساتھ شادی منظور ہے، مگر جہیز کیا دوگی۔؟

شہزادی : ہمارے ساتھ بیاہ کرنے کا شوق چرایا ہے اور یہ کیا کہتی ہیں پہلے ان سے نپٹ لو۔ پھر سمجھا جائے گا۔

خوجی : اِن سے خدا سمجھے (اُردو میں) اس کمبخت نے بنا بنایا گھر بگاڑ دیا اس کی صورت سے نفرت ہے۔ عورت کیا ڈیڑھ مرد ہے۔ کس آسانی سے مجھ ایسے پہلوان اور گراں ڈیل جوان کو کان پکڑ کے اُٹھا لیا۔

بُوا زعفران کے بھی اس نے کان کاٹے۔ مگر یہ پری غضب کی چھل بل دکھا رہی ہے۔

خدا ترا بتِ نادان دراز سن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

ابھی تو نام خدا چودھواں پندرھواں ہی سال ہے۔ اور اللہ کی عنایت ہے یہ حُسن گلوسوز اور یہ جمال ہے اس کا مسکرانا دل پر بجلیاں گراتا ہے اور مردہ زندہ ہو جاتا ہے۔

می برد دل زلف وجان بعوض می بخشد
سخنے کز لبِ جانانہ بروں می آید

جو مکالمہ ہے جان پرور۔ انسان صورت دیکھے تو غش آجائے۔ اور گفتگو سے تو مردہ قبر سے اُٹھ بیٹھے۔ از سرِ نو کالبد میں جان آئے۔

لبریز شگفتن می شود چوں از نسیم
آں تکلم ہائے رنگین بادمی آید مرا

شہزادی اُٹھکھیلیاں کرتی ہوئی مصروف گلگشت چمن ہوئی۔ پیش خدمتیں جلو میں تھیں۔ خوجی بھی مو پریشان اور غزل خواں عشاق زار کی طرح ساتھ تھے۔ قدم قدم پر اشعار عاشقانہ پڑھتے جاتے تھے۔

خوجی سے شہزادی نے کہا کہ ہم دو تین شرطوں سے شادی کرتے ہیں۔ اگر یہ تینوں شرطیں پوری کر دو تو آج کے دسویں روز شادی ہو جائے۔ خوجی نے خوش ہو کر وہ شرطیں دریافت کیں۔

شرط اوّل : اِس جشن کو اُٹھا کے دے مارو۔ اور تین بار کشتی نکالو۔

دوم: افیم کھانا چھوڑ دو۔ چھ روز تک ہم تمہیں قید رکھیں گے اور چھ روز تک ذراسی افیم بھی نہ پاؤ گے۔

سوم: دن کو مویشی چرانے کی خدمت تمہارے سپرد ہوگی۔ صبح سے شام تک مویشی چرانا۔ اور رات کو کھیت رکھانا۔

خواجہ صاحب مسکرائے۔ فرمایا تینوں شرطیں سخت ہیں ان میں ایک شرط ممکن ہے۔ مگر باعث تذلیل۔ تمہاری اور میری دونوں کی ذلت متصور ہے۔ جو کوئی دیکھے گا کیا کہے گا۔ یہی کہے گا نہ کہ شہزادی کے میاں سور چرا رہے ہیں۔ ہمارے لیے کوئی عمدہ کام تجویز و۔ جو ہماری شان کے شایاں ہو۔ میں شاہی میں کمیدان تھا۔ ہزار آدمی میرے ساتھ چلتا تھا۔ ہزار جوان میری ماتحتی میں تھے۔ پورے ایک ہزار جوان اور جس مقام پر گیا وہ ترکیب کی کہ ایک بندہ خدا کی جان بھی نہ گئی۔ جنگ تو کبھی کی ہی نہیں غنیم کی فوج پر چڑھ دوڑے اور جب دیکھا کہ وہ بھی آمادہ پیکار ہے۔ تو گھوڑے کی باگ پھیر دی۔ اور بھاگے تو پتا ہی نہیں۔

راوی: سبحان اللہ۔ واہ بھئی بھگو کمیدان واہ۔ کیوں نہ ہو۔

عربن: کمیدانی کر کے ایک عورت سے پچکنے لگے۔ اے واہ۔ واہ دا واہ کمیدان اور عورت بلکہ سے چپتیایا جاتے۔ کان پکڑ کے اٹھالیا اور پھر بٹھادیا اے لعنت خدا۔ تم مردوے ہو۔ عورتوں سے بھی بدتر۔

خوجی: جرأت اور بانکپن تو موروثی ہے۔ اور شاعر ہم خود ہوتے۔ جناب والد مرحوم شاعر نہ تھے۔ مگر سپاہی تھے۔ میں البتہ شعر پڑھتا ہوں اور شعر کہتا بھی ہوں۔

کانپا نہ جگر نہ دل نہ چہرہ اُترا
کس بحر میں بے خوف و خطر جا اُترا

ساحل پہ نہ جس کے ٹھہرے یاروں کے قدم
دو ہاتھ لگا کے میں وہ دریا اُترا

کس دن مضمون نو کا نقشہ اُترا
پر دُرد معانی کا نہ چہرہ اُترا

ممبر سے ہم اُترے نئے مضمون پڑھ کر
اُن کے لیے گویا من وسلویٰ اُترا

اس حبشن نے پھر خواجہ صاحب کا ہاتھ پکڑا تو اُن کی رُوح لرزنے لگی۔ زور سے ایک جھٹکا دیا کہ ہاتھ چھوڑا لیں مگر ہاتھ کہیں چھوڑائے چھوٹتا تھا۔ سخت خفیف ہوئے اور قہقہہ ایسا فرمائشی پڑا کہ خوجی آبدیدہ ہوگئے کا نکھ کر ایک دفعہ اور کوشش کی زور سے حبشن کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے۔ اس شوخ دیونی نے ہاتھ چھوڑ دیا تو تڑسے گر پڑے، اور ایک لڑھکنی کھائی۔ پھر قہقہہ پڑا۔

خوجی: مجھ بدنصیب کی جان کا ایک نہ ایک دُشمن نکل ہی آتا ہے۔

کبواز عفران نے کان گوشی کی۔ پٹیا کسان نے کانجی ہوس دِکھایا۔ جہاں گئے وہاں جان عذاب میں گرفتار ہوئی۔

بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیدا

عربن: تمہاری سکت کا تو یہ حال ہے کہ لُڑھکنی پر لڑھکنی کھاتے ہو۔ اور پٹخنی پر پٹخنی ذرا چھیڑا اور تم گر پڑے۔ پھر تم شادی کس کے برتے پر کرتے ہو۔ شادی کی خواہش ہے تو اس حبشن کے ساتھ بیاہ کر لو ہاں خوب یاد آیا، وہ تینوں شرطیں منظور ہیں یا نہیں۔

خوجی: شہزادی سچ کہتا ہوں۔ چور بدن ہے پہلوان کی اصل وحقیقت کیا ہے یہ ڈنڈ، یہ ہاتھ پاؤں یہ گس بل۔

عربن: تو اب ان کے ساتھ شادی کروگے یا حبشن کے ساتھ۔

خوجی: ہم پر تو دونوں ریجھی ہیں دونوں عاشق زار ہیں۔ بس یہ اس کے حسب حال ہے۔

مشرب رندانہ می داریم و میجوشیم ما
یا شمیم تند می چون خم ہم آغوشیم ما
طاعت و تقویٰ چہ باشد زاہدی باشد چہ چیز
عاشق آوارہ ایم و مست دمدہوشیم ما
واہ چہ خوش باشد اگر آن مست صہبائے غرور
خود بگوید دیگر امشب بادہ می نوشیم ما

راوی: یہ اشعار واقعی بعینہ خوجی کے حسبِ حال ہیں شعر تو کبھی خلاف پڑھتے ہی نہیں حضور۔

اِدھر خوجی اُول جلُول باتیں کرتے تھے اُدھر آزاد گھڑیاں گِنتے تھے، کہ خوجی اب آتے ہوں گے اور اُس مہ وش سراپا ناز کو ہمراہ لاتے ہوں گے۔ یہ خبر ہی نہیں کہ وہ اپنی شادی کی فکر میں ہیں شہزادی نے کہا کہ تم تو آزاد پاشا کو لانے گئے تھے بیڑا اُٹھایا تھا کہ اس کو راضی کروں گا۔ وہاں سے آن کر خود اپنی شادی کی باتیں کرنے لگے اگر خود ہی شوق چرایا تھا تو اس بیچارے کا نام کیوں رکھا۔ خوجی بولے بات ساری یہ ہے کہ وہ آقا ہیں۔ ہمارے مخدوم و مکرم اور محسن۔ ہم اس بارے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر حُسن اور طاقت اور جرائت، اور خوش تقریری، اور عالیخاندانی میں وہ ہمارے مدِ مقابل نہیں ہیں۔ ہم ولایتی ہیں۔ ہندی نہیں ہیں۔ خاص ولایت زاد۔ ماں کابلی باپ مغل۔ خاص سیستانی اور وہ ہندی ہیں جس مقام پر ہم اور وہ کھڑے ہوتے ہیں پہلے پریوں کی نظر ہم پر پڑتی ہے پھر ان پر پڑتی ہے۔

عزبن: اور اس حبشن کی بھی پہلے تم ہی پر نظر پڑی تھی۔

خوجی: اس سے خدا سمجھے۔ ایسی بد قطع عورتوں کو خدا غارت کرے۔

عزبن: سُنتی ہو کیا کہتے ہیں۔ ایسی بد قطع عورتوں کو خدا غارت کرے۔ سُنا تعجب ہے کہ تمہارے مُنہ پر تم کو بُرا کہیں۔

حبشن نے خواجہ بدیع الزماں صاحب کو گود میں اُٹھا اور لے چلی خواجہ صاحب نے سینکڑوں بے نقط سُنائیں۔ اور بدبخت عورت او کمبخت عورت خدا تیرا گھر خراب کرے۔ خدا کرے تجھ پر آسمان ٹوٹ پڑے۔

شہزادی: تم بھی تو اس کی گود میں ہو۔ تم پر بھی آسمان ٹوٹے گا۔

خوجی: دیکھو مَیں نے غپّا دیا ہے پھر نہ کہنا۔ میں ایک نہ مانوں گا۔ میرا بدن چور ہے۔ دیکھو مَیں پھر کہے دیتا ہوں۔ ایک ڈھیکلی لوں گا۔ دوسری ڈھیکلی لگاؤں گا تو جان اس کی نکل جائے گی۔

اس عورت نے ان کو اور بھی زور سے دبایا اور کہا پیس ڈالوں۔ سُرمہ کر دوں۔ قبولو کہ شادی کروں گا۔ ورنہ آج مار ہی ڈالوں گی۔

خوجی: شہزادی کی دُہائی۔ مجھے مارے ڈالتی ہے مَیں صرف اس سبب سے نہیں بولتا کہ عورت ذات سے مرد ہو کے کیا بولوں۔ شہزادی چھوڑ دو۔ اب دق نہ کرو۔ تم کیوں نہیں بولتے۔

خوجی: عورت سے کیا بولوں۔ مَیں بولوں تو ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دوں۔

عزبن: جانے دو۔ جانے دو اب آپ اپنی ڈاڑھی کی طرف دیکھیے۔

خوجی: ہاں یہ مانا۔ مَیں اب نہ بولوں گا۔ جو ہوا وہ ہوا (اکڑ کر) کوئی پہلوان ہوتا تو مَیں بھی سمجھ لیتا اور سمجھتا کیا معنی۔ مارتا چاروں شانے چت خدا مہربان ہے اس کی مدد سے ہم جس کو چاہیں اس کو

دے ماریں۔

بے مدد حق کے اگر ہیں کیا مردم دنیا مدد
کب تلک بالا مدد اے عالم بالا مدد

آزاد: بیچارے ایسے پھنسے کہ الاماں۔ حسن بھی بلائے جان ہے۔

پھنس گئی عندلیب ہو میکیں
ہائے تنہائی اور کنج قفس

مگر اس میں کسی سے شکوہ سنجی کی گنجایش نہیں ہے۔ ہائے۔

گل و گل چیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اگر آزاد کے ساتھ شادی کرنا منظور ہے تو ایک بات مانو۔ قید خانے تک چلی چلو۔ اگر پتھر بھی ہو تو پسیج جائے۔ شہزادی نے کہا اچھا پہلے عربن کو لے جاؤ۔ اگر وہ کہہ دیں کہ شادی منظور ہے۔ تو فہو المراد عربن خوجی کے ساتھ گئیں، اور یوں ہم کلام ہوئی۔

عربن: حضور نے بھیجا ہے کہ اب تو راہِ راست پر آؤ۔ کیوں مُفت میں مُصیبت جھیلتے ہو۔ ایسی پری دلہن ملتی ہے اور شادی قبول نہیں کرتے۔

آزاد: وہ پری سے بھی بڑھ کے ہو تو کیا۔ یہاں کسی اور ہی کی یاد ہے۔

ہو جائے اگر جہاں فراموش
کب دِل سے ہو دلستاں فراموش
تو بھولے یہ دخل کیا ہے ہم تو
کر بیٹھے ہیں خود کو یاں فراموش

جس وقت رُخصت ہوئے تھے زیب النساء بیچاری نے رو رو کر مجھ سے کہا تھا!

جاتے ہو تو یاد رکھیو مجھ کو
مت کیجیو مہرباں فراموش

اب اگر ہم شادی کرلیں تو ان کو شکوہ سنجی کی گنجایش ہوگی۔ یا نہ ہوگی وہ ضرور کہیں گی کہ:

ساقی بنیار بادہ کہ ہر قلہ ہائے کوہ
ابر بہار ہمچو پریزاد میرود۔

اللہ اللہ! آج تو بادۂ گلگون جس طرح رُوح کیمیائے فتوح کا ذکر خیر زبان قلم پر آیا ہے بادہ نوشوں کی چاندی ہے۔ میگساروں کے لیے عید ہے۔ شہزادۂ خاقان کلاہ ثریا جاہ، ہمایوں فر بہادر (برّد اللہ مضجعہ) کی وفات اور اس سفاک شقی القلب سواد الوجہ فی الدنیا و سواد القلب فی العقبٰی کا ذکر دُلہن کے لاشہ پر جانے کا حال عبرت مآل حاضرین کے قلب کی کیفیت حُسن آرا کے سکتے اور بہار النساء کے شور و شین شہزادی بیگم کے بکا و بین، ان امور سے ناظرین فسانہ تنگ آ گئے تھے۔ اب مذاق اور لُطف کی باتوں سے شاید ان کے آنسو پنچھیں۔ گو شہزادۂ فریدوں مرتبت، دارا صولت کی وفات کا سانحۂ ناشنیدنی ایسا واقعہ نہیں ہے کہ ناظرین اس کو ایک دن میں بھول جائیں مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ ہائے بقول سپہر آرا کروڑوں آرزوؤں کا خون ہوا حسرت تو یہ ہے کہ دل کی دل ہی میں رہی۔ اگر یہ ہونہار شہزادہ کسی جنگ یا میدانِ حرب میں مقتول ہوتا تو اور بات تھی۔ شہزادوں کے لیے تلوار کے مُنہ مرنا معراج ہے مگر حسرت تو یہ ہے کہ جس وقت دُولھا بنے ہوئے ہمارے ثریا جاہ اور کج کلاہ شہزادہ سنجر صولت ختلی ضیغم شکار پر سوار دُلہن بیاہنے جاتے تھے عین اسی وقت میں ایک شقی لعین نے ان کا کام تمام کیا۔ مانا کہ وہ بیچارہ مصروف گل گشتِ ارم ہے مگر دُلہن کے قلب کی تشفی کیوں کر ممکن ہے۔ شہزادۂ مبرور کی مادر ضعیفہ اب تک یہی کہتی ہیں کہ وائے میرے نازوں کے پالے، میرے نرگسی آنکھوں والے بیٹا دُلہن لاش پر آئی ہے۔ آخری دیدار (تو دو) ہے ہے۔ کیسا سنگ دل کیوں نہ ہو۔ ممکن نہیں کہ پانی پانی نہ ہو جائے۔ ہائے دُلہن اپنے دل میں کیا کیا سوچی تھی۔ دُولھا کے دل میں کیا کیا باتیں تھیں۔ مگر ؏

آرزوئیں ہوئیں سب خاک پڑا رن کیسا

ہائے یہ کیا ہوا۔ دُلہن زبان حال سے کہتی ہے۔

ہاں زخمیٔ نگاہ کے جینے پہ حرف ہے	ہے دلبرا اپنے زخم کہ جینے پہ حرف ہے
طوفانِ اشک نوح علیہ السلام سے	بولوں کہ اب تو اپنے سفینے پہ حرف ہے
ناچیز آپ جانتے ہیں اس قدر مجھے	اُلفت تو جاوے بھاڑ میں کینے پہ حرف ہے

ناصح جگر کے زخم کو جرّاح کیا سیئے
یاں سُوزنِ مسیح کے سینے پہ حرف ہے

جس وقت سپہر آرا بیچاری اپنے پیارے شہزادے کی لاش سے جُدا کی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پالکی گاڑی میں بیٹھ کر زار زار روئی۔ اپنی ماں کی طرف خطاب کر کے کہا۔ اماں جان۔ اب ہمیں کہاں لیے چلتی ہو۔ اب میں کس سے کہوں۔ لوگو جو کوہ الم مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ کبھی کسی نے ایسا واقعہ دیکھا ہو تو مجھ سے

کہے۔ ایسے جگر دوز سانحے کا حال سُنا ہو تو بیان کرے۔

مہندی کے عوض ہاتھوں میں دُولہا کے لگے زخم

آلودہ خونِ پنجۂ مرجاں نظر آیا

ارے لوگو۔ مَیں ابھی ابھی دُلہن تھی۔ میرے دوست جانی اس کے گواہ ہیں۔ میری کلغی شاہد ہے کہ مَیں دُلہن تھی۔ ہائے مَیں یہ کیا جانتی تھی، کہ میرا دُولہا میرے جسم کے عطرِ فتنہ کے عوض کافور سُونگھے گا۔

بڑی بیگم: بیٹی۔ ہائے میری پیاری سپہر آرا۔ ہائے مَیں کیا کروں۔ اُوف۔

سپہر آرا: امّاجان۔ (آہ سرد بھر کر) کروگی کیا۔ مَیں نے کیا کر لیا۔

مغلانی: (روکر) حضور صبر، صبر، صبر ہائے اب ہو گا کیا۔ ہے ہے۔

پیش خدمت: ہماری قسمت پھوٹ گئی۔ شادی کا دن دیکھنا نصیب میں لکھا ہی نہ تھا۔ آج کے دن اولا ماتم کریں۔ ہائے ہائے۔ ہے ہے۔ لوگو ہمارا سرتاج ہمارا آقا اس جہاں سے گزر گیا۔

ولا خونناب کن آہ و فغاں را — بزن برہم بنائے آسماں را

نمی خیزد صدائے آسمانی — چہ شد یارب درآئے کارواں را

بجوید ہر کہ آبی اندریں دشت — الٰہی تشنہ گرداں ساربان را

بہ ہجرت وضع دیگر مے نماید

چہ بر سر آمد اطوارِ جہاں را

سپہر آرا: امّاجاں۔ اس وقت بیچارہ کہاں ہو گا۔ پل صراط !!! ہے ہے۔

بڑی بیگم: بیٹی۔ پیاری بیٹی۔ خدا کے کارخانے میں کس کو دخل ہے۔ میری بقیہ زندگی تلخ ہو گی۔ ہائے ہائے۔ غم کم سہے تھے۔ کہ اب نیا غم اور تازہ الم سہنا پڑا۔ مگر مرضی خدا مشیئت ایزدی۔

اُدھر ہمایوں فر کی بہنیں ماتم کرتی تھیں۔ ایک بولی، امّاجان ہماری بھاوج کو جانے کیوں دیا۔ ہائے کس کے ساتھ گئیں۔ دُلہن کا کیا حال ہے۔

اکنوں صلاح چیست برائے خدا بگو

اے عشق آشنا و رفیق قدیم ما

یہ شعر دُلہن کے حسبِ حال تھا۔ دُولہا اور دُلہن ایک دوسرے پر ہزار جان سے عاشق تھے۔ دُولہا کہتا تھا

ہزار غمزہ بقرباں ہر نگہِ مستش

چہ آفت است مدامیم چشم بد مستش

دُلہن کی کیفیت ناگفتہ بہ۔ چونک چونک پڑتی تھی۔ ہائے ستم۔

روز خونم ز چشمہا جاریست
موسم عشق و نوگرفتاریست

خلجانے است توی سینۂ ما | زان نگہ برزخم برجگر کاریست
نوجوانی بلائے جان شدہ است | چہ بگوئیم امر نا چاری است
اے فدائے تغافلت گردم | این چہ آئین و رسم دلداری است
چشم بد دور در مزاج شریف | چہ قدر ہا کہ سہل انکاری است
شعلۂ می آیدم بجای نفس | عیسیٰ مریم اینچہ می خواریست

سید انشا تراچہ شد آغا
از برائے چہ این قدر زاریست

خیر یہ تو دُنیا کے کارخانے ہی ہیں جس میں کسی کو دخل نہیں۔

بقیہ حال آزاد پاشا

اب آزاد پاشا کا حال سُنیے۔ خوجی کی لجاجت اور منت و سماجت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ پریزاد و رشک شمشاد، چمان چمان قید خانہ کی طرف چلی۔ ہو پریشان، مست و غزلخواں۔ خنداں و فرحاں۔ مستیاں اُبل رہی تھیں۔ سینہ تانے ہوئے جوانی کی اُمنگ اور مستی کی ترنگ میں جھومتی جاتی تھی۔

عربن: حضور کا جانا اچھا نہیں۔ ہمیں بھیج دیجیے یا کسی اور کو۔

خوجی: ہے ہے چُغل خوروں سے تو اور بھی ناک میں دم آگیا ہے۔

خدا کے غضب سے ذرا دل میں کانپ
چُغل خور کے مُنہ میں ڈستے ہیں سانپ

پیش خدمت: حضور ہم میں سے دس پانچ کو بھیجیے۔ ہم جا کے سمجھا کے لے آئیں۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ حضور خود تشریف لے جائیں۔ آئندہ اختیار ہے۔ آخر وہ بھی تو کوئی ایسے ویسے آدمی نہیں ہیں۔

خوجی: (جھلا کر) ان عورتوں کے مُنہ کون لگے۔ جھوٹے پر شیطان کی پھٹکار آزاد اور اس قابل نہیں کہ یہ قید خانے میں اس کے پاس جائیں۔ آزاد وہ جوان رعنا اور سپاہی ہے جس کی بسالت کے جھنڈے گڑے ہیں حُسن آرا بیگم ایک زیب النساء دو۔ اختر النساء تین، وینشا چار، مس منیڈا پانچ اور اللہ رکھی چھ۔ اتنی نوعمر اور جمیلہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہیں اور کہتی ہیں کہ۔

بصورتے تو بنے کمتر آفرید خُدا
ترا کشیدہ و دستے از قلم کشید خُدا

شانِ خدا یہ چُغل خور عورتیں اور اس قدر گستاخ۔ افسوس!

شہزادی: اب تو ہم نے قصد کر لیا کہ چلیں گے آزاد کے نام پر جان دیتی ہوں۔ مگر اس کم عقل نوجوان کو خُدا جانے کیا سوجھی۔ کہ مجھ سی پری سے ملتفت نہ ہوا۔ وہ کون کافر عورتیں ہیں جنھوں نے ایسے جوان سہی قامت کو فریفتہ کر لیا۔ مَیں کیوں کر ان کو دیکھوں۔

کیستی اے کہ دِل تنگ کسے جائے تو شد
سَرو من فاختہ سروِ دلآرائے تو شد

عزبن نے چُپکے سے کہا کہ حضور چلتے چلتے ذرا رُک جائیں۔ اور فرمائیں کہ اچھا ہم خود نہ جائیں گے۔ پھر دیکھیے اس بونے کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

شہزادی ایک مقام پر ٹھہر گئی کہا۔ اب کون بھی جائے۔ کجا ہم کجا وہ، ہم آزاد، وہ اسیر، وہ فقیر، ہم امیر۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔ ہزار بار غرض ہو، تو وہ خود حاضر ہو، اور سجدہ کرے ورنہ وہ نہیں اور کوئی سہی۔ خوجی دانت پیس کر بولے خداوند مجھ پر بجلی گر پڑے۔ بس میں جل بُھن کے خاکستر ہو جاؤں۔ بالکل خاک سیاہ جب تک حضور نہ جائیں گی وہ حشر تک نہ آنے کے۔ (اپنے دِل میں، ابھی حُسن آرا یا پاس وینشیا یا بمبیڈا ہوتیں۔ تو دوڑی جاتیں) اور حضور ان خوشامد خوروں کے سبب سے جانے نہ پائیں گی۔ یہ کہہ کر خوجی اپنا مُنہ پیٹنے لگے اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر ادھر اُدھر تھپڑ لگائے یہاں تک کہ مُنہ لال کر لیا۔ شہزادی اور عزبن اور پیش خدمتیں بہ زور زور سے قہقہے لگاتی تھیں۔ بڑی دیر تک دل لگی رہی۔ آخر کار خوجی سے کہا کہ اگر اس حبشن سے کُشتی لڑو تو ہم تمہارے ساتھ آزاد کے پاس چلے چلیں۔

خوجی: چاہے وہ دے مارے چاہے ہم کُشتی لگا لیں۔ اس سے کچھ مطلب نہیں۔ فرض کرو۔ اتفاق سے ہمارا پانوں پھسل گیا، اور ہم گرے تو بھی چلنا ہو گا۔

عزبن: اور یہ چور بدن پھر کس روز کام آئے گا جی۔ کیوں۔

خوجی: آپ نہ بیچ میں بولیے۔ تم کون بولنے والی ہو۔

اللہ ری رنگت تیری اللہ ری نزاکت
بوسے کے تو نام سے ہوئے ہونٹھ بھی نیلے

ابھی سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ واہ کیا شرافت ہے۔

کیا ملا ہم کو تیری یاری میں ۔۔۔ رہے اب تک امیدواری میں

ہاتھ گہرا لگا کوئی قاتل ۔۔۔ زور لذت ہے زخم کاری میں

دل جو بیخود ہوا صبا لائی ۔۔۔ کس کی بو نکہت بہاری میں

کب تلک میں رہوں بھلا شب وروز ۔۔۔ تیری ایسی مزاج داری میں

اب ادھر دیکھ تو ذرا ای چشم

فائدہ ایسی اشک باری میں

یہ اشعار آزاد کے وردِ زبان تھے، اک قید خانے کے زینے پر اس حور بہشتی نے قدم رکھا، اور وہ اشعار کیا سمجھتی مگر طرزِ غزل خوانی پسند آیا۔ بدن از سرتاپا عطر میں ڈوبا ہوا تھا۔ آزاد اس رائحہ رُوح پرور سے تاڑ گئے کہ وہی معشوقۂ زہرہ تمثال مہ وش یوسف جمال ہے۔ بے اختیار کہہ اُٹھے۔

از کجا می آئی اے سرمست خوبی محو ناز

عطر آگئیں تا بدامن عنبر افشان تا کمر

خوجی: شعر سن کر پھڑک گئے۔ وہیں سے آواز دی کہ آمدم آمدم من بدیع آوردم ہمراہ خویش زوجہ مستقبل شمار انیز ہم آوردم۔ یہ کہہ کر بہ آواز بلند بولے کہ نیز ہم دونوں لفظ ہمنے عمداً استعمال کیے ہیں۔ خبردار اعتراض نہ جڑنا برابر شعرا کے کلام میں آیا ہے۔ چنانچہ خواجہ حافظ شیراز لسان الغیب نے باندھا ہے آزاد کو ان فقروں نے بہت ہنسایا۔ خوجی نے شہزادی سے کہا بس اب چلیے۔ یہاں تک آن کر پھر جانا یعنی چہ آئیے آئیے۔ بسم اللہ۔

شہزادی: (غرور کے ساتھ) ہزار دفعہ غرض ہو تو آئیں۔ اب ہم ایسے گئے گزرے ہوئے کہ یہاں تک استقبال کو بھی نہ آئیں۔

خوجی: جانِ من، جانِ من۔

شہزادی: (چپت لگا کر) موا درگور اور سُنیے انھیں بھی شوق چرّایا۔ یہ ٹھیٹ محاورہ خوجی کی سمجھ میں نہ آیا۔ زبان کی اجنبیت کے سبب سے کچھ کچھ سمجھتے تھے۔ مگر خاص خاص محاورے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر کہا سر حاضر ہے۔ دس پانچ اور لگالو۔ اتنے میں آزاد نے عمداً آواز دی (کون ہے) دروازے پر کون غل مچاتا ہے۔ جانتا نہیں۔ کہ ایک عالی دماغ سپاہی اس قیدخانے میں رہتا ہے۔ شہزادی مسکرانے لگی پھر آواز آئی۔

آہستہ برگ گل بر فشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشہ دل در کنارِ ما

عربن نے اس شعر کو سن کر وجد کیا اور شہزادی کو اس کا ترجمہ سنایا۔ شہزادی نے ناز و ادا کے ساتھ قدم اُٹھایا اور تہ خانے میں پہنچ کر کہا۔ پیارے آزاد۔ آزاد کا دل اس وقت ہاتھ سے جاتا رہا۔ فوراً جھپٹ کر گلے لگایا اور کہا۔

گلے لپٹے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

شہزادی: آزاد تم نے میرے خرمن عیش پر بجلی گرائی۔ میں نے جواہرات صرف کر کے تم کو عین خواب کی حالت میں فوج سے اٹھوا منگوایا تھا۔ اور مجھے پورا پورا یقین تھا کہ تم انکار نہ کرو گے۔ میں نے جس وقت تمہاری صورتِ زیبا دیکھی، ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔

لعلِ جانان یارب از جان ساختند
یا کہ جان از لعلِ جانان ساختند
مردہ را جان میدہد جانش مگر
لعلِ جاناں ز آبِ حیوان ساختند

دلی آرزو تھی کہ تمہارے لب لعل شکر خا کا بوسہ لوں۔ آج وہ تمنا بر آئی یہ کہہ کر شہزادی نے آزاد پاشا سے معافی مانگی اور کہا کہ میں نے کمال حسرت اور افسوس کے ساتھ تم کو کیا تھا۔ شکر ہے کہ اس بونے کے سبب سے رنجش دور ہو گئی۔ بونے کی لفظ پر خوجی بہت جھلائے اور پیشانی پر ہاتھ ٹھونک کر کہا کہ افسوس ہائے غضب۔ کہتا جاتا ہوں۔ قسمیں کھاتا جاتا ہوں کہ میرا بدن چور ہے مگر ان کو یقین ہی نہیں آتا تو اس کو میں کیا کروں۔ مگر خیر۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

حسین ہو مہ جبیں ہو، طناز ہو، سراپا ناز ہو، جو چاہے کہہ لو ہم بونے سہی مگر جو برابر والے سے مقابلہ ہو تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔

راوی: درین چہ شک اسکندریہ میں ایک پھٹے جوان کی کشتی نکالی نہ تھی۔ وہ ہوٹل والا پہلوان مگر حبشن نے قافیہ تنگ کر دیا۔

شہزادی نے آزاد کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ اب ایسا نہ ہو کہ پھر نکل جاؤ۔ قولِ مرداں جان وارد۔ آہ سرد بھر کر جواب دیا کہ جانِ آزاد۔ قول جان کے ساتھ ہے۔ تمہاری محبت کا نقش ہمارے لوحۂ دل پر اس طرح منقوش ہوا ہے کہ اس کا مٹنا ہمارے دل کی فنا پر موقوف ہے۔

خوجی: کیوں یہ کس کی کارگزاری ہے۔ یہ اسی بونے کی کارروائی ہے۔

آزاد: واہ رے بونے کیوں نہ ہو۔ تم نہ ہوتے تو اسی قید خانے میں ہم پڑے رہتے اپنا نہ بیگانہ۔ خویش نہ یگانہ۔ کوئی بات بھی نہ پوچھتا۔ مگر خدا کو اچھا ہی کرنا منظور تھا۔

صدقے اس بندہ نوازی کے ترے میں جاؤں

باپ ماں ہوتے ہیں کب ایسے شفیق و اشفق

خوجی مارے خوشی کے کودنے لگے۔ سفید داڑھی اور ٹھگنے قد پر کودنا اور تھرکنا کیا لطف دیتا ہوگا۔ کبھی مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا (واہ رے خوجی۔ وہ کار نمایاں کیا کہ جھنڈے گڑ گئے) اُچک کر۔

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا

وہ کام ہوا ہم سے جو رستم سے نہ ہوگا

شہزادی: یہ بڈھا تو بڑا مسخرا ہوتا ہے۔ پہلے ہم پر حضرت ہی ڈورے ڈالتے تھے۔

آزاد: کیوں بچہ۔ اب یہاں بھی ذلیل ہو گئے کیا کہہ دوں کہ جھنڈی بردار کا لونڈا ہے۔ ساری شیخی خاک میں مل جائے۔

خوجی: افسوس اُنھوں نے کہا اور تم کو یقین آگیا اور بچہ ہم اگر ڈورے ڈالتے تو پھر حضور تک آنے بھی نہ پاتیں۔ یاد ہے کہ مس میڈا ہمیں پر ریجھی تھیں۔ کیوں استاد۔ ارے یہاں تو وہ صورت پائی ہے کہ آزاد اور آزاد سے دس ہزار آدمی ہوں تو عورت کی ہمیں پر نظر پڑے۔

تو مشکلاتِ جہاں حل کنی چنانکہ بہ عدل

شہے نہ عقدہ کشا شد نکردہ ہر دلِ شاد

آزاد: اوہو۔ بعد مدت آج حسبِ حال اور موزوں شعر سنا۔ یار اگر تم قید خانے میں ہوتے تو واللہ غم غلط ہو جاتا۔

شہزادی: (آبدیدہ ہو کر) اب قید خانے کا نام ہمارے سامنے نہ لو۔

آزاد نے کہا کہ مجھے دو تین امور کا تذکرہ کرنا ہے۔ شادی تو منظور ہے مگر اتنا سوچ لیجیے کہ میں

ہندوستان کی ایک حورِ بہشتی سے وعدہ کر آیا ہوں کہ جب روم سے واپس آؤں گا تو شادی ہوگی۔ اسی زیبا اندام عروس چاردہ سالہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ہائے اس وقت یاد آگئی۔ وہ چشم نرگسی وہ عارضِ سُرخ وہ ابرو شمشیر بران تیغ اصفہان۔

زابروان تو بے اختیار می ترسم
بہ مرتضیٰؑ کہ ازاں ذوالفقار می ترسم

اور ایک کوہِ قاف کی پری ہے مس میڈا۔

شہزادی: اخاہ۔ وہ میڈا جس پر ایک فرانسیسی عاشق تھا کیسے۔

آزاد: میں کیا کہوں۔ از سرتاپا عالم نور ہے۔ پرستان کی پری ہے حور ہے۔

بفرقش گل کند گرے سایہ بانی
قدش خم گردہ از بارِ گرانی

سراپا تصویر ہے میرے پاس ان کی تصویر تھی۔ ہائے ہائے۔

عجب ہے کھینچی مصوّر نے کس طرح تصویر
کہ شوخیوں سے تو ایک رنگ پر رہی کیونکر

میڈا پر یچھم ہے حُسن آرا برق دم ہے۔

شہزادی: کون کیا کوئی تیسری اور بھی ہے۔ ایک تو ہندوستان میں ہے۔ ایک قسطنطنیہ میں۔ ایک حُسن آرا کوئی اور ہے۔

آزاد نے کہا وہی ہندوستان میں ہے۔ یہ کہہ کر آزاد پاشا کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ خوب دل کھول کر روئے۔ شہزادی نے رومال سے اشک پونچھے، اور بوسہ لے کر کہا۔ بس اب وہ باتیں یاد نہ کرو۔

خوجی: اجی یہ تو سودائی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی پری پیکر دُلہن کو چھوڑ کے یاد کسے کرتے ہیں۔ اس بد قطع عورت میڈا کو اور حسن آرا میں کیا بات ہے۔ نک سک سے دُرست نہیں ہے۔

شہزادی: تم نے دیکھی ہے۔ ہاں ہاں حال تو صاف صاف بیان کرو۔

خوجی: ماشاء اللہ میں نے دیکھی نہیں۔

اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔ شہزادی نے کہا تم بالکل خبط الحواس آدمی ہو۔ جب تم نے دیکھی ہی نہیں تو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ ہم سے بُری ہے یا ہم سے اچھی ہے۔

خوجی: وہ دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایسی صورت کسی نے دیکھی ہو تو بتلائے۔ مگر ہم آج

تک کبھی نہ پھنسے۔ سینکڑوں نے جھانسے دیے۔ جب نکلے دامن بچا کر۔

آزاد پاشا کو پھر حُسن آرا بیگم یاد آئیں۔ کہا اس وقت مجھے معاف فرمائیے۔ میرا دل بھر آیا ہے۔ مَیں ہرگز شادی نہ کروں گا بس اب دِل قابو میں نہیں ہے، ہاتھ سے جاتا رہا اور مَیں مجبور ہوں۔

دِل می رود ز دستم صاحبدلان خدارا
درد کہ رازِ پنہان خواہد شد آشکارا

شہزادی نے کمال غیظ و غضب میں کہا کہ آزاد اب مَیں مجبور ہوں۔ حکم دیا کہ پھر قید خانے لے جاؤ اور خوجی کو بھی اس باغ میں قید کرو۔

منشی بدیع محقق فارسی

اس عروس سیم اندام، زیبا کلام نے جھلا کر حکم دیا کہ اس جوان بدبخت کو یہاں سے لے جاؤ اور آج سے ہمارے سامنے اس کا ذکر نہ آنے پائے۔

آزاد بادل ناشاد یہاں سے دو آدمیوں کے ساتھ پھر قید خانے گئے۔ دونوں طاقتور اور شہ زور آدمی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شمشیر محرابی عریاں دوسرے کے ہاتھ میں تپنچہ۔ اور تپنچہ آزاد کی طرف دیکھتے جاتے تھے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے تھے۔ آزاد نے کہا بھائی ہم سے امید نہ رکھو۔ بھاگ جائیں گے۔ قید خانے گئے اور بدستور پھر اسی زندان میں بند کیے گئے۔

اب سنیے کہ خواجہ بدیع الزّماں صاحب بہادر اس مقام سے دو کوس پر بھیجے گئے۔ حکم دیا گیا کہ پہرا رہے، مگر زیادہ سختی اس بڈھے پر نہ کی جائے۔ وہاں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی۔

خوجی: آغاجی وطن جناب شہر الزّماں بودہ یا توران یا کدام مقام بودہ میں بدیع و ملاک ہندوستان کہ جناب شاید شنیدہ از مقام دارم۔

ایرانی: ہندوستان عجب مقام دِلکشی است۔ خصوصاً خطہ کشمیر انتخاب ہفت اقلیم۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کو بابال در آید

خوجی: آغاجی قرولی کہ او زار است ہمراہ آں جناب ہست کہ نیست؟

آغا: نا بابا۔ قرولی ندارم۔ بندہ تپنچہ و تیغ صفاہاں دارم۔ قرولی پیش شما ہشت؟

خوجی: نہیں آغاجی صاحب مارا ما ـــــ ما ـــــ لاحول ولا قوۃ۔ اجی اسے کیا کہتے ہیں۔ دیکھیے

منہ پر تھپڑ لگا کر) لاحول ولاقوۃ۔ من میگفتم کہ سپاہی زادہ من ہستم با توپ و تفنگ شوق بدرجہ ——— بدرجہ۔ مطلب یہ کہ بسیار شوقین ام۔ پدرم سپاہی و پدر پدرم سپاہی زادہ۔ جھلا کر خواجہ صاحب نے توپ و تفنگ کا نام لیا۔ ایرانی ان کی گفتگو پر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ مگر پاس تہذیب مانع تھا کہ ان کو بتائے ایرانی کے بھائی آغا محمد نے خوجی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا (ایں چہ کارہ است) ایرانی نے کہا از ہندوستان آمدہ است خوجی چہ کارہ است کا محاورہ تو خاک نہ سمجھے۔ سمجھے کہ اس نے ہمیں ہرکارہ بتایا۔ بگڑ کر کہا نہ، نہ آغا، آغا۔ نہ، نہ بن کمیدان صاحب ہستم در زمان لعبدۂ کمیدانی مارا بادشاہ سلامت کہ او راہمہ ہا ظل سبحانی و خلیفۃ الرحمانی میگویند مقرر گردانیدہ بود۔ پس من ہرکارہ راچہ شوم ایرانی کے بھائی آغا محمد نے کہا۔ برادر دیلشب نزد آن کاشت رفتہ بودم۔ بدیدہ آدم است عرصۂ دو سال سپری است کہ دو درم بردہ درم نمیدہد و آمادۂ فساد میشود اگر خدا خواست زنجیر خانہ میرود۔

خوجی: شما ہر دو برادران ہستید یا پدر و پسر؟ یا داماد و خسر؟

راوی: سبحان اللہ۔ کیا اچھے سوال ہیں۔ چاہے وہ باپ بیٹے ہی کیوں نہ ہوں تم نے تو ان کو خسر اور داماد بنا دیا۔ اور۔

ایرانی: خسر گرامی گویند؟ خسر گفتی یا خسر۔ خُسر گرامی گویند۔

خوجی: (اکڑ کر) بر زبان فارسی مارا دعوی است۔ تو کہ ایرانی خویشتن را ایرانی گفت و با من گفتگوی نمی تواں کردن۔ ہو از من معنی الفاظ پڑھو۔ حالا بشنو۔ اے برادر کہ خسر بزبان فارسی پدر زوجہ خویش را گویند۔

ایرانی: در ولایت ما پدر زن می گویند۔ بے انصافت فہیدی۔

خوجی: (مسکرا کر) ہونہہ! فہمیدی۔ بسیار زود فہم ہستم من۔ بر ہمہ اشیا می فہمیدم و می فہمم۔

راوی: درین چہ شک اور اپنے منہ میاں مٹھو کیا جلد بن گئے۔ اس من نے کیا لطف دیا ہے واہ ع

برین فہم و دانش بباید گریست

خوجی: اجی آغاجی، از کلام سعدی ہیچے بگو شنیدم و داد او دہم۔

راوی: اجی آغاجی، کی ایک ہی کہی اور ہیچے نیا محاورہ معلوم ہوا۔

ایرانی: گلستان و بوستان خواندہ۔ از غنیمت و فیضی چہ داری؟

تل گفت کہ اے طبیب نادان | رنجم مفزا اے بادِ دان
معشوقۂ نازنین طلب کن | عناب لبش کا رتب کن
آگاہ نہ تپ در دن را | نشتر چہ زنی رگِ جنون را

خوجی : لب ولہجہ شما خوب است۔ شنیدہ ام کہ ابوالفضل، فیضی فیاضی، مثنوی خود بہ ایران نپا بر مشورہ نزد علمایان ایرانی ارسال کردہ بودند۔ کہ اگر یک غلطی ہم یافتم تو اسی وقت ایک دم سے یک اشرفی دہم برائے یک غلطی یک اشرفی۔ ایران کے علما دیدند ویک ہم غلطی چون نیافتند۔

راوی : اے سبحان اللہ۔ دیدند ویک ہم غلطی چون نیافتند ہاں آگے۔

خوجی : بازکسی قدر شرمندہ شدہ، ودر دل شعر گفتند کہ این غلط وآن غلط۔ باقی در دگر اشعار ہیچ نہ ہیچ گفتند ہی نہ۔

راوی : ہیچ گفتند ہی نہ (کچھ کہا ہی نہیں) کا فارسی ترجمہ ہے۔ سبحان اللہ۔

خوجی : وآن یک اشعار ہمیں است، کہ بر زبان ایں مرغکہ می آید۔

اے در تنگ وپوے توز آغاز
طاؤس نظر بلند پرواز

ایران والا گفت طاؤس را پرواز مگو۔ عنقائے نظر گفتن لازم است۔

راوی : (یک اشعار) نے پھڑکا دیا۔ اور اس انکسار کو ملاحظہ فرمایئے، کہ فرطِ عجز سے اپنے کو مرغکہ کہنے لگے۔ واہ واہ واہ۔ اس انکسار کے صدقے۔

خوجی : کیوں جناب آغا صاحب، شعر ونظم ہم میگوئی۔ شاعر ہستی یا نہ؟ اگر ہستی باز بگو چند اشعارِ آبدار از زبان خود، و کلام خود۔

ایرانی : بندہ کم کم می گوید، نہ قابل سماعت جناب۔

خوجی : منِ بدیع اگرچہ ہندی۔ الا بسیار بسیار می گوید و خوب می گوید۔

یارانِ بہ فکر بخیہ و مرہم فتادہ اند
دیں جامہ ام ہنوز بصد جا درید نیست

ایرانی : این حال شماست۔

خوجی : بلے آغا۔ من شاعر ایں اشعار ہستم۔ من خواجہ بدیع۔

راوی جھوٹے کی ایسی تیسی، مگر ایرانی پر آپ کی قلعی کھل جائے گی۔

ایرانی : (خدمتگار سے) محمود۔ محمود۔ محمود۔ کلاہ ما بیار شنیدی۔

خدمتگار : (زرد رنگ کی ٹوپی لاکر) حاضر کردم ہمیں است۔

ایرانی : خیر تاریخ است روی از تاجر قسطنطیہ خریدہ بودم۔

خوجی کی سمجھ میں خیر کا لفظ نہ آیا۔ پوچھا آغا صاحب ابن لفظ خیر در چہ معنی است ۔ ایرانی نے سمجھا دیا کہ خیر کے معنی یہاں یہ کہ ہم نے یہ ٹوپی نہیں مانگی تھی ۔ نارنجی ٹوپی مانگی تھی۔ خواجہ صاحب مسکرا کر بولے کہ ہاں! ہم نے سُنا تھا۔ فارسی کا کوئی محاورہ ایسا نہیں، جس سے ہم واقف نہ ہوں۔ ہر ہمہ میدانم من بدیع۔

ایرانی : خاک ہندوستان جنت نشان دامنگیر است، الا تابستانش بدتر از دوزخ است ۔ عرفی شیرازی خوش گفتاست۔

اربسکہ کند جذب رطوبت خطرش نیست
گر کاسۂ چینی زہوا بر حجر آید

خوجی : این اشعار در شان کشمیر جنت نظیر عرفی مرحومی گفتہ بود۔

این سبزہ و این چشمہ و این لالہ و این گُل
آن شرح ندارد کہ بگفتار در آید

ایرانی کے پاس ایک رُوسی آیا۔ تو ایرانی نے کہا خوش آمدید و صفا آوردید اُس نے جواب میں کہا۔ خوش یافتم۔ خوجی متحیر کہ یہ یوروپین، اور ایسی صاف بولتا ہے۔ ایرانی نے کہا۔ رُوسیوں کو اس بارے میں ملکہ حاصل ہے۔ بھیس خوب بدلتے ہیں۔ اور ہر ملک کی زبان صفائی کے ساتھ بول لیتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ بالکل ہمارا سا ہے۔ آپ ان سے گفتگو کیجیے۔

خوجی : اگر شما وعدہ دادن اصلاح فرمائید۔ اشعار بگویم و اصلاح گیرم۔

ایرانی : بچشم فردا۔ علی الصباح بیا۔

خوجی : مارا حکم کو کہ بیرون زنجیر خانہ روم ۔ اگر شما از راہ مہربانی آبند بخدا کہ بسیار بسیار شکر گذار شما شوم۔ ضرور تشریف آورید جناب۔

ایرانی : دیدہ خواہد شد ۔ از لب و لہجہ شما دریافتہ بودم کہ اصلِ شما از ہندوستان است۔

خوجی نے دیکھا کہ آغا صاحب، کا خدمتگار نوعمر آدمی ہے اور آقا کے مزاج میں دخیل ہے۔ از سرتاپا اس پر نظر ڈالی اور مُسکرائے ۔ ایرانی نے جو کہا اُس نے اس کے خلاف ہی کہا۔ چھوکرا ابھی خوب فارسی بولتا تھا اور کیوں کر نہ بولتا۔ خاص شیرازی تھا۔ خوجی نے اس سے کہا کوئی شعر تو پڑھو اُس نے مسکرا کر جواب دیا کہ فارسی شعر تم کیا سمجھو گے۔ یہ بہت ہی بگڑے۔ فرمایا آقائے شما از من لفظِ خسر پرسید شما می گوئی کہ تو فارسی چہ دانند ان کے خوش کرنے کے لیے اس چھوکرے نے یہ شعر پڑھا۔

نسرین بہ چمن بر نزند گر بدن این است ۔۔۔ با غنچہ صبا دم نزند گر دہن این است

خوجی: خوب مرا این اشعار بسیار پسند آمد۔ خوب گفت است۔
چھوکرا: این اشعار (ہنس کر) اگر مضائقہ نباشد چیزے بگو۔
ایرانی: محمود۔ قلیاں پیش جناب خواجہ صاحب بگزار میل تفرمایند۔
محمود: یک سر قلیاں بشکست۔
ایرانی: جانب آسمان نظر کن۔ ابرِ سیاہ از جانب قبلہ برخاستہ برق ہم مے تابد۔
خوجی: ہمیں وقت ست کہ در ہندوستان مردماں میخواری میخورند۔ وکسانیکہ دریا وِ آلہی مصروف اندا وہمیں وقت یاد خدا می نمانید۔ و آن اشخاص کہ سبق خود یاد می کنند، او ہم اندریں وقت بسیار جنبیدہ یاد می کنند۔

راوی: یہ بسیار جنبیدہ والا فقرہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا خواجہ صاحب کا۔ مطلب یہ ہے کہ بہت ہل ہل کے یاد کرتے ہیں۔ لڑکوں کا قاعدہ ہے کہ جب سبق یاد کرتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو ہلتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے کہا ایک روایت سُنیے تو ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جائیے۔ بادشہزادہ یک روز یک فلسفی را طلب کرد۔ وگفت کہ می خواہم کہ ترا قاضی این شہر بنمایم۔ فلسفی گفت کہ من خود را قابل ادائے این کار ہم نمی دانم بادشاہ زادہ گفت کہ تو غلط می گوئی دروغ گو ہستی۔ قاضی گفت کہ اگر راست گفتم و قابل این کار ہستم مرا معذور کن واگرا حیاناً من غلط گفتم باز دروغ گو را قاضی شہر بچہ طور شما بادشاہزادہ می توانی کرد۔ محمود اور ایرانی بہت ہنسے۔ خوجی نے اپنی سرگذشت یوں بیان کی۔ ان فقروں کی داد دیجیے گا۔

خوجی: جناب آغا من می گویم کہ چہ شد و من کیستم من در۔ در قلم دان و سخند دانی نیم لائق فائق ہست و در امور سیست نیز ہم۔ یعنی صاحب السیف والقلم۔ مارا مردمان دہری می گویند من در عہد شاہی عیدا نے بود و کہزار سپاہیاں زیرِ ما تحت۔ مگر اکنوں پیر فرتوت شدم۔ الا جسم مادز داست۔

ایرانی دنگ محمود متحیرّ۔ ایرانی کا بھائی خاموش جسم مادز داست یہ کون فقرہ ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ جسم مادز داست۔ محمود نے پوچھا کہ جسم مادز داست کے کیا معنی۔ خوجی اکڑ گئے۔ کہا کیوں دیدی۔ فارسی مادیدی۔ این!! لیاقت مردمان گویند شما ایرانی آدم ملیح شما ایرانی و فارسی زبان نمی فہمی جسم مادز داست۔ بمعنی آنکہ بدن میرا چور ہے۔

راوی: اے سبحان اللہ۔ یہ کیسے ان سے بھی جواں مردی کا حال بتا دیا۔
خوجی: در ہندوستان اشعار بسیار می گویند۔ ہندیان خوب می گویند۔

بمکتب می رود طفل پریزاد مبارک بادمرگ تو ماُ ستاد

اور اس سے بڑھ بڑھ کر بھی کلام ہے۔

شہنشاہِ جہانرا در وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر را شک حسرت ریخت کا فلاطون وعالم شد

خوجی نے کہا ایک مرتبہ کوئی ایرانی لکھنؤ میں فروکش تھے ایک لالہ سے کہا کہ ہمیں خط لکھ دو۔ ایرانی پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ لالہ صاحب سے کہا کہ ہمارے آدمی بدر الدّین سے ایک خطا سرزد ہوئی تھی، اس سے ہم نے اس کو نکال دیا۔ لالہ صاحب عینک لگا کر لکھنے بیٹھے، تو خط کو شیطان کی آنت بنا دیا۔

جناب برادر صاحب قبلہ وکعبہ دو جہاں فیض بخش فیض رساں ملاذ بیکساں برادر آغا شمس الدّین علی خاں صاحب مدظلہ العمالی بعد ادائے مراسم تسلیم ولوازم تعظیم کہ ہر آئینہ ذریعہ سعادت خاکساران است معروض رائے بیضا ضیائے گرداینده می آید۔ احوالِ ایں نواحی بفضل ایزد برحق قرین صحت است ومژدہ صحتوری جناب از بارگاہِ جناب باری نیکو خواست گار برادرم حالِ ایں مقام ایں است۔ کہ بندہ بصحت می ماند وروز و شب دُعائے خیر برائے چگونگی عافیت شما می کند۔ خدمتگار بدر الدّین خطائے سرزدہ شد۔ خطا کردہ خیر بران کہ مزاج برادرِ شما درہم برہم ہمچو زلف مہوشان ایران شد۔ لہٰذا آن آدم را فوراً موقوف نمودم کہ باز باعث تکلیف دادن می شود امید کہ ہموارہ از طمانیت خاطر خطیر ایں ہیچ کارہ ودرافتادہ را بادشاہ فرما بند۔ بندہ خاکسار۔

ایرانی کو خط پڑھ کر سُنایا تو اُس نے فوراً چاک کر ڈالا اور کہا جو ہم بتائیں وہ لکھو۔ جناب برادر صاحب قبلہ سلامت بدر الدّین کار بد کرد از خانہ بدر کروم۔

ایرانی: مختصر وموزوں۔

خوجی: مگر او از خدا نہ ترسیدہ بود۔ وقائل خدا نیز ہم نبود بالکل دہریہ۔

ایرانی: ہر کہ از خدا نترسد، از و بباید ترسید۔ ع

خُدا ترس را بر رعیت گہار

خوجی: مارا چند مثل فارسی بنویساں، کہ وقتِ گفتگو بکار آید فہمیدی؟

ایرانی: بلے۔ ہر جا کہ پری وشی ست دیوے با اوست ہر چہ از غیب می رسد نیکوست۔ ہر کجا دیدیم، آب از جو بدریا میرود۔ گربہ در بغل داشتن گریہ در زندان کردن۔ طفل بر در مسجد افگندن۔

طفلِ اشکے کز غم دُنیا بہ طبیعت زادہ است
شرم باشد گر ز چشم آنرا بہ مسجد افگنی

سراز خاک برزدن سراز شیشہ تہی

کردن سراز نشہ سبک ساختن

تا از سر نشۂ تجرید سبک ساختہ ام

خرقۂ ما راست بدوشم ہمہ گر یکتا رست

دِل بر چیزے سوختن۔ دل بصد جا رفتن مرزا صائب می گوید۔

جائے تمیز دے کہ دِل بدگمان من

نا بازگشتن تو بصد جانمی رود

دلاسا میشوم محاورہ فرس است یعنی تسلی میشوم۔ اب ہم کو تسلی ہے۔

از کنار و بوسم اکنون دل نمی گردد قرار

من کہ از شوقش بہ بیگانے دلاسا میشوم

ایرانی نے کہا اب میں جاتا ہوں۔ انشاء اللہ کل کسی وقت ملوں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ محمود جو آگے بڑھ گیا تھا اس کو پکارا۔ محمود کجا باش باش ہم میرسم۔ محمود اور آقا باتیں سُنا کیے۔

ایرانی نے اپنی راہ لی، تو خوجی بیچارے اکیلے رہ گئے۔ ٹڑوں ٹوں سوچنے لگے کہ آزاد کی جہالت نے ہم کو بھی کہیں کا نہ رکھا۔ اگر آزاد جہالت نہ کرتے تو آج ہم اس سرو قد دُلہن کو بیاہ چکے ہوتے۔ سوچے کہ آزاد کے نام خط بھیجیں، اور قید خانے کے کسی آدمی کو گانٹھ لیں۔ مگر بالفعل خط تو تیار رہے۔ قصد ہوا کہ منظوم خط ہو، تو فہو المراد۔ آدمی موزوں طبع تو تھے ہی۔ خط لکھنا شروع کیا۔

اے برادر بجا برابرِ من ۔۔۔ بلکہ از جان و رُوح بہتر من

مبفرستم خطے بنامِ شما ۔۔۔ تلخ شد زندگی بکامِ شما

ہائے افسوس ایں چہ ناکامی ست ۔۔۔ وائے افسوس ایں چہ بدنامی ست

مہ وشی سرو قد و گل رخسار ۔۔۔ چشم نرگس عروسِ شیریں کار

رشک افیون زلفِ اسودِ اُو ۔۔۔ چشمۂ خیر ساعد و ید اُو

بارک اللہ ایں چہ معشوق است ۔۔۔ کہ بہ عذرا و لیلیش فوق است

چون نکردی بجا مراسمِ عقل ۔۔۔ شد خطا از تو بر لوازم عقل

وائے ناچار آن سہی بالا ۔۔۔ خشم گیں گشت و شد نہ و بالا

وا دریغا کہ خادمان ادیب ۔۔۔ خوبرو خوش گلو ظریف و لبیب

ہمہ شان بردہ نزد خانہ جیل   داد آزاد را در وش ڈھکیل

نصیحت کنمت بشنو و بہانہ مگیر

ہر آنچہ ناصح مشفق بگویدت بپذیر۔

ان اشعار آبدار کو حضرت خواجہ بدیع الزماں صاحب نے کاغذ پر لکھ لیا، اور لفافہ یوں لکھا۔ اس شاعری کے قربان۔

یارب۔ یہ خط ہذا۔

راوی: واہ وا۔ یہ بھی اور ہذا بھی۔ اور تو خیر یہ ٹیپ کا شعر کس قدر موزوں ہے۔ درخاص الخاص ایسے ہی مقام کے لیے ہے۔

لفافہ ــــ یارب ــــ یہ خط ہذا ــــ (بسم اللہ)۔

مقام واللہ اعلم رسیدہ، از آنجا در مقام قید خانہ رسیدہ۔ باز آنجا نزدیک دوست من و مشفق میرے میاں آزاد پاشا صاحب سلامت نثار بے مثل و ناظم بعدل و غضنفر شکوہ۔ حق پڑدہ۔ فریدوں کمر بلکہ خاقان کلاہ رشک سکندر۔ ثریا جاہ۔

جہاں داور اشاہ گیتی پناہ

فریدوں کمر بلکہ خاقان کلاہ

خوجی: یہ خط لکھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

اب ادھر کا حال سنیے۔ پولینڈ کی زہرہ بناگوش اور سدرہ قد شہزادی مصروف گلگشت چمن تھیں۔ آزاد کی خودرائی اور خوجی کی ہرزہ درآبی کا کمال افسوس تھا۔ سوچی آزاد کو قید خانے سے پھر بلوایئے مگر جھجکی اتنے میں شہزادی کی ایک خادمہ جو باہر کسی اور شہر میں برائے چندے گئی تھی داخل ہوئی۔

شہزادی: خوب آئیں تمہاری ہی ضرورت تھی تم ہی کو میں ڈھونڈ ھتی تھی۔

خادمہ: اس وقت حضور کا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے۔ خیریت تو ہے۔

شہزادی: (آبدیدہ ہو کر) خیریت کجا عجب مصیبت میں ہوں۔

نگذاشت ــــ آب در جگرم آہ آستین

در برگ گل ز تندی آتش گلاب سوخت

ایک جوانِ رعنا یہاں آیا تھا۔ میرا اس پر دل آگیا۔ ایسا خوش رو جوان آنکھوں دیکھا نہ کانوں سنا۔ میں نے شادی کا پیغام کیا۔ ادھر سے صاف انکار ٹکا سا جواب قید خانے بھیج دیا۔

خادمہ: ہے ہے۔ ہم ہوتے تو یہ بات نہ ہونے پاتی۔ یہ کیا غضب ہو گیا۔ جس کو پیار کرے اُس کو جیل خانہ دکھائے۔ یہ کون سا انصاف ہے بھلا۔

شہزادی: بصد حسرت۔

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
ہائے چُپ بھی رہا نہیں جاتا

عین کلیجے پر برچھی کھائی ہے۔ دل چھلنی ہو گیا۔ جوانی اور زندگانی دونوں تلخ ہیں۔ افسوس صد افسوس۔ روتے روتے بُرا حال ہوا، مگر اب کوئی چارہ نہیں ہے۔

خادمہ: واہ۔ مَیں ابھی ٹھیک ٹھاک کیے لاتی ہوں۔ یہ کون بڑی بات ہے۔

شہزادی: تھوڑے دن ہوئے انھیں کے ملک کا ایک آدمی یہاں آیا ہے۔ جو سمجھا کر جیل خانہ سے لایا۔ پہلے تو کہہ دیا کہ شادی کروں گا مگر پھر صاف انکار کیا۔ اب مَیں نے پھر قید کر دیا۔ حکم دیا تھا کہ آزاد کو سخت قید دی جائے، اور خوجی یہاں سے دو کوس پر بھیجے جائیں۔ دونوں الگ — یہ اِدھر وہ اُدھر ایک کی دوسرے کو خبر نہ ہوئے۔

خادمہ: بس یہی تو بُرا کیا۔ حضور نے۔ خیر ہم سمجھ لیں گے حضور۔

شہزادی: جو تمھاری رائے ہو۔ مگر عُمدہ بات سوچو۔

خادمہ نے پوچھا آخر شادی سے انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی بتائی یا اسے بے وجہ اور بلا سبب انکار کیا۔ اگر کوئی وجہ خاص ہے تو اس کا حال مفصّل معلوم ہونا چاہیے، اور اگر بے وجہ انکار کیا تو دو شقوں سے خالی نہیں یا تو مرد نہیں ہے یا دیوانہ ہے کہ ایسی چاند سی دُلہن پا کر انکار کیا۔ اگر مرد نہیں ہے تو انکار مناسب ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں اور اگر دیوانہ ہے تو مجبوری ہے۔ اور اگر کوئی وجہ خاص مانع ہے تو آپ زبردستی کرنے والی کون ہیں۔

شہزادی: یہ تو سب سچ ہے۔ مگر دل نہیں مانتا۔ اس کو کوئی کیا کرے۔

خادمہ: تو وجہ کچھ نہیں بتائی۔ یہی کہا کہ ہم شادی نہ کریں گے۔

شہزادی: ہاں۔ ہاں۔ وجہ بیان کی۔ کہا کہ ہم ہندوستان میں ایک عورت سے اقرار کر آئے ہیں اور اسی نے ہم کو بھیجا ہے اور تم نے مس میڈا کا نام سُنا ہو گا اس سے بھی شادی کا اقرار ہے۔ یہی سبب خاص بتایا۔

خادمہ: ہاں دیکھا نہ۔ کوئی سبب ہے۔ اچھا پھر قید کرنے سے کیا حاصل ہوا۔ آپ کو زبردستی شادی کر لینی تھی۔ مراسم شادی اپنے مذہب کے طور پر ادا کر لیتیں۔ اور اسی مکان میں رکھتیں۔ پہرا مقرر

ہو جاتا۔

تھوڑی دیر کے بعد خادمہ خوجی کے پاس گئی اور اُسی ایرانی کو ساتھ لیتی گئی۔ خوجی نہایت خوش ہوئے۔ ہاتھ ملایا۔ خادمہ کو از سر تا پا دیکھا۔ دِل میں سوچے کہ فال اچھی ہے انشاء اللہ اسی کے ساتھ شادی ہوگی۔ خوجی کو دیکھ کر خادمہ کو بے اختیار ہنسی آئی مگر مصلحت وقت اسی کی متقضی تھی کہ خوجی سے سازش کر کے مطلب برآری کرے۔ جھک کر سلام کیا تو خوجی اکڑ گئے۔ سمجھے کہ اس ملک کی عورتیں ہمارے حُسن و جمال کی توصیف سُن کر ہمیں گھورنے آئی ہیں۔ خادمہ نے کہا اگر اجازت دیجیے تو قریب آؤں۔ خواجہ صاحب دل میں کمال خوش ہوئے مگر ظاہر ہیں فرمایا ہم کس کس کو اجازت دیں۔ جان عذاب میں ہے۔ کم سے کم پچاس عورتیں آ چکیں۔ خیر صاحب آپ بھی آیئے مگر کل تک نہ جم جایئے گا۔ خادمہ ان کے قریب بیٹھی۔ خواجہ صاحب نے اُردو میں کہا واہ رے من بدیع کیا آنکھ تُونے پائی ہے، کیا ناک تُونے پائی ہے۔ خدا نے تجھے کیا ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ ایسے گلّے ٹھلّے کا جوان تو دیکھا نہ سُنا۔ قدوقامت کچھ ایسا بُرا نہیں۔ سُرخ و سفید تو ہوں۔ مگر اور لوگ بھی سُرخ و سفید ہیں۔ خوش رو ہم سے بڑھ بڑھ کر ہیں۔ مگر کل باتیں ملا کر۔ جو بات ہم میں ہے ایک میں نہیں۔ از سر تا پا، ہر عضو بدن سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ چشم بدور، اُدھر خوجی تو اپنے حسن و جمال اور جوانی رعنائی پر اتراتے تھے۔ اُدھر خادمہ ان کو بغور و تعمق دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ اس پاگل بونے ٹھے سے کیا کہوں۔ مگر اہلِ الغرض مجنوں بدرجہ مجبوری کہا کہ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ اگر خلاف طبیعت اور ناگوار نہ ہو تو کہوں ورنہ خاموش رہوں۔ خوجی نے اکڑتے ہوئے کہا کہ مَیں تو ایک عالی دماغ آزاد منش آدمی ہوں۔ شاہوں کا اور میرا ایک مزاج ہے۔ گہے بسلامی برنجید و گہے بدشنامی خلعت دہند۔ اگر مزاج برہم نہ ہوا تو مالا مال کر دوں گا ورنہ خواب ہی نہ دوں گا۔ یہاں سے ڈیڑھ کوس، یا کوس کے فاصلے پر ایک شاہزادی رہتی ہیں۔ عورت کیا پری ہے وہ مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ مگر مجھے پسند نہ آئی۔ پری تک پر تو نظر نہیں ڈالتا۔ ہاں اگر ایک حُور عورت ہو تو خیر جس کافر پر میں عاشق ہوں اس کو دیکھو تو بھوک پیاس بند ہو جائے۔

حُور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

خادمہ: تو حضور ایک کام کریں۔ وہ جو آزاد نامے ایک صاحب آپ کے دوست آئے ہیں۔ ان کو حضور آمادہ کریں کہ اس شہزادی کو بیاہ لیں کل جائداد پر قابض ہو جائیں۔

خوجی: ہو نہہ۔ تم کو کسی نے بہکا دیا۔ وہ دوست نہیں لڑکے ہیں۔

خادمہ: ہاں! پھر کیا ہے آپ کو ایسی بہو پسند ہے یا نہیں؟ فرمایئے۔

خوجی: مَیں نے ایک خط صاحبزادے کے نام لکھا ہے وہ تم اس کے پاس لے جاؤ اور اس کا جواب لاؤ۔ دیکھوں اب کیا لکھتا ہے۔

خادمہ: لائیے آپ بڑے فہمیدہ آدمی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ آپ کے صاحبزادے آپ سے خوبصورت اور خوش قطع نہیں ہیں۔ گو حسین تو ضرور ہیں۔ مگر جو بات آپ میں ہے، وہ ان میں نہیں پائی جاتی۔

اس فقرے پر خواجہ صاحب اُچھل پڑے، اور دیوار کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے، کہ ہائے اس وقت آزاد نہ ہوئے۔ ایسا جھینپتے اور شرماتے کہ پھر چار آنکھیں نہ کر سکتے۔ چڑھ گئی کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ یہ خبر ہی نہیں کہ ہم پر آنکھ پڑتی ہے۔ جو عورت ہماری شہرت سُن لیتی ہے دوڑی آتی ہے بلائیں لیتی ہے دُعائیں دیتی ہے اور فوراً شادی کا پیغام کرتی ہے۔ یا الٰہی کس ساعتِ نیک میں خواجہ بدیع پیدا ہوئے تھے کہ ساری خدائی کی حسین عورتیں پکار پکار کر کہتی ہیں واہ کیا جوان رعنا ہے۔ مصر میں کروڑوں حُوریں ساتھ ساتھ پھرتی تھیں۔ اسکندریہ میں جس بازار سے نکل گئے۔ ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے۔ بمبئی میں اُنگلیاں اُٹھتی تھیں جنزیرے میں چہل پہل رہی۔ قسطنطنیہ میں میڈا نے آزاد سے قطع محبت کر دی۔ مس روز نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہماری شادی ہو گی تو اس رسیلی آنکھوں والے کے ساتھ۔ اب یہاں لیجیے اتنی مالدار اور حسین شہزادی ریجھ گئی۔ اور اب یہ آئی ہیں۔ جیسے قید خانے میں آیا۔ کم سے کم ستر عورتیں تو ہمارے شمع رُخسار سے آنکھیں سیکھنے آئی ہوں گی۔

خادمہ: پھر خط دیجیے تو ان کے پاس لے جاؤں اور جواب لاؤں۔

خوجی: ہاں۔ اچھا، تو یہ خط ہے پڑھیں گے تو چُوم لیں گے۔

خادمہ: مگر واہ واہ۔ آپ کو خدا نے ایسی صورت دی ہے اگر آپ کی شادی ہو جائے تو بیوی زار زار روئیں اور سر پیٹیں وہ حُسن خداداد ہے۔

خوجی: بیشک روئیں اسی سبب سے کہ میاں ایسے مہ جبیں اور ہم ایسے کہ ان کے تلووں تک کے مقابلے کے لائق نہیں ہیں۔

راوی: یہ حُسن خدا کی دین ہے حسین آدمی مقبول بندہ خدا ہے۔

بیجا نہیں حسینوں کی ہیں لن ترانیاں
اے غافلوں یہ حُسن امانت خُدا کی ہے

خواجہ بدیع الزّماں صاحب جامے میں پھُولے نہیں سمائے تھے جھوم جھُوم کر باتیں بناتے تھے اور بربڑے جاتے تھے۔ خادمہ نے عرض کی اب لونڈی رُخصت ہوتی ہے اگر خواستۂ خدا ہے تو ہماری شہزادی آپ کی بہو بنے گی۔ ورنہ یا قسمت یا نصیب یا بخت لیکن اگر مضائقہ نہ ہو تو اس ہاتھ کو بوسہ دوں۔ خواجہ بدیع صاحب

نے مسکرا کر کہا۔ ہاں ہو تو جوان اور نوعمر اور شکل صورت بھی اچھی ہے اور لباس بھی صاف ستھرا پہنے ہو۔ خیر کیا یاد کروگی۔ لاؤ ہاتھ (بوسہ دے کر) پانی منگواؤ ہم منہ دھوئیں گے۔

اللہ ری تیری عالی دماغی۔ ایک حسین اور نوعمر خوش پوش عورت کے ہاتھ کا بوسہ لیا تو منہ دھونے کی ضرورت واقع ہوئی۔ اللہ اللہ! اگر خوجی اس درجہ حسین اور زہرہ جبیں نہ ہوتے تو یہ پریاں کاہے کو ریجھتیں۔ خط لے کر خادمہ روانی ہوئی۔ پہلے شہزادی کے پاس آئی۔ مسکرا کر کہا حضور وہ تو سڑی سودائی ہے مگر ایک خط اس نے آزاد کے نام لکھا تھا وہ مجھ کو دیا ہے کہ آزاد کے پاس بھیج دو وہی ایرانی بلوائے گئے۔ شہزادی نے کہا اس خط کا ترجمہ سناؤ۔

ایرانی: (پڑھ کر) یہ تو کسی خبطی کا لکھا ہے۔ اشعار خبط مطلب خبط۔ بے معنی مہمل بے تکے الفاظ بھرے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہے۔ لفظی ترجمہ سنایا تو شہزادی مطلب سمجھ گئی۔ کہا یہ خط لے کر تم خود جاؤ۔

خادمہ دو آدمی کو ساتھ لے کر گئی۔ آداب بجالائی خط دیا آزاد نے پڑھا تو مسکرائے۔

نصیحتے کنمت بشنود بہانہ مگیر
ہر آنچہ ناصح مشفق بگویدت بپذیر

اچھی نصیحت ہے اور ہم تو اس مصیبت میں ہیں۔ اس مردود کو شاعری کی سوجھی ہے۔ کیا بے فکری ہے۔ خادمہ نے کہا حضور آپ کے والد نے اس کا جواب مانگا ہے۔

آزاد: (سرخ ہو گئے) کیا! کس نے مانگا ہے۔ تم نے یہ کون لفظ کہا۔

خادمہ: حضور کے والد ماجد نے وہ جو ٹھگنے سے آدمی ہیں۔

آزاد: وہ سور میرے گھر کا غلام ہے۔ خانہ زاد مسخرہ بدمعاش۔

خادمہ: (متحیر ہو کر) جی مجھ سے تو انھوں نے ایسا ہی کہا تھا۔

آزاد: وہ مسخرا ہے اور جھک مارتا ہے۔ اس کے کہنے کا کیا۔

خادمہ: (دست بستہ) حضور مجھے معاف فرمائیں۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا۔

آزاد نے کہا ہم جواب کیوں کر لکھیں، یہاں قلم دوات نہ کاغذ۔ خادمہ نے عرض کی کہ سب حاضر ہے۔ قلم دوات کاغذ آیا تو آزاد نے یوں جواب لکھا۔ میاں تم تو خاصے مسخرے ہو۔ یہاں بھی مسخرے پن سے نہیں چوکتے۔ آپ کہاں کے بڑے شاعر ہیں کہ نظم لکھنے کا شوق چرایا۔ املا تک درست نہیں۔ چلے شاعری کا دم بھرنے۔ آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔ خرافات باتیں ہمیں نہیں بھاتیں۔ یہاں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ جان عذاب میں ہے۔ اور تمہیں دل لگیاں سوجھتی ہیں۔ سخت بیحیا ہو۔ تم اس قابل ہو کہ

بورے میں بند کرکے دریا میں غرق کردے۔ تو منحوس میرے ساتھ ناحق ہی آیا۔ شاعری کی سوجھی ہے۔ آج سے کبھی خط نہ بھیجنا۔ خبردار ورنہ تو جانے گا۔

راقم آزاد اسیر

خادمہ کو یہ خط دیا اور کہا کل تم آجاؤ تو ایک پیغام شہزادی کے نام بھیجوں۔ خادمہ نے خط لیا اور شہزادی کے پاس لے گئی۔ ایرانی نے خط کا ترجمہ سُنایا۔ فوراً خادمہ کو حکم ہوا۔ کہ خوجی کے پاس لے جاؤ۔ پڑھتے ہی خوجی آگ ہو گئے۔

"میاں تم تو خاصے مسخرے ہو" اور سُنیئے ہم مسخرے ہیں۔ مسخرے ہیں ہم۔ انھیں لچھنوں تو قید خانہ جھیلا۔ اے لاحول ولا قوۃ !!۔

"آپ کہاں کے بڑے شاعر ہیں"۔ اور سُنیئے ہم شاعر ہی نہیں چر گئی ہے اس شخص کو۔ اب ہم ایسے شاعر ہیں کہ ایرانی کو سبق دیا۔ برابر برابر بھی کیا۔ فصیح محاورہ ہے، اس کو شرمایا۔ کبھی نہ چوکے خسر کے معنی بتائے اور ہر بات میں ٹوک دیا۔

"املا تک دُرست نہیں"۔ بجا۔ بس اس وقت جی چاہتا ہے کہ اپنی بوٹیاں نوچ لوں۔ ارے نامعقول ہم محقق فارسی ہیں۔ جی "آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔ بہت خوب یہ تو یہی سہی جاؤ۔ اب ہم خود شاہزادی کے ساتھ شادی کیے لیتے ہیں"۔ بس" جان عذاب میں ہے"۔ پھر خود کردہ را چہ علاج۔ اپنی کرتوتوں" سخت بے حیا ہو" جی چاہتا ہے کہ اپنی بوٹیاں نوچ لوں۔ "منحوس میرے ساتھ ناحق آیا۔ رودے رودے گالیاں دے۔

کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سُنے گا جو کہے گا ہم کو

"ورنہ تو جانے گا" تو تکار کو تو دیکھیے۔ شریف نہیں پاجی ہے۔

خوجی اس قدر جھلائے کہ واقعی بوٹیاں ہی نوچنے لگے اور جس وقت یہ فقرہ پڑھا کہ (تم اس قابل ہو کہ بورے میں بند کرکے گھڑے سے باندھ کر دریا میں غرق کردے) کئی بار دانت کٹکٹا کٹکٹا کر رہ گئے۔ کہا اب تو پانی پی پی کر کوسنے لگے۔ اے لاحول

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت بخورد نیشتر لا دنعم را

اے سبحان اللہ۔ کیا برجستہ شعر پڑھا۔ اور می گزد بضم کاف فارسی کتنی اچھی اصلاح ہے برقی نے (ہمت

نخورد غلط کہا تھا) خوجی نے اصلاح دی اور (نخورد) کو (بخورد) بتایا۔ افسوس ہے کہ بااین ہمہ لیاقت سخندانی، آزاد کی نظروں میں نہیں بچتے۔ ہم جانتے ہیں آزاد کو ان سے تعصب ہے۔

خادمہ: آپ کا خط پڑھ کر آپ کے صاحبزادے بہت ہی خفا ہوئے۔

خوجی: ناخلف ہے۔ نالائق ہے۔ باپ محقق فارسی اور بیٹا جاہل، ان پڑھ آدمی، سر پیٹنے کا مقام ہے ہائے افسوس۔ ہائے افسوس!

خادمہ: اس خط کا جواب کچھ دیجیے گا۔ دیجیے تو اسی دم لے جاؤں۔

خوجی: اس خط کا جواب اس مردک کا سر ہم نے عاق کر دیا۔

دوسرے روز خادمہ حسب الطلب آزاد کے پاس گئی۔ دو پریاں اس کے ساتھ تھیں۔ ایک گلابی پوش، دوسری آہو چشم۔ آزاد نے ان دونوں پر نظر ڈالی۔ گلابی پوش سے جو چار آنکھیں ہوئیں تو آزاد پاشا کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور انھوں نے بے اختیار کہا۔

شکریں لعلِ تو کانِ نمک است
گرچہ شکر نہ مکان نمک است
نمک افزو درختِ زارِ لبت
گرچہ از آب ربان نمک است

گلابی پوش ان کی چتوں دیکھ کر شرمائی اور آہو چشم کی طرف دیکھ کر نظر نیچی کر لی۔ آہو چشم نے شوخی سے ساتھ آزاد پاشا کو دیکھا۔ مسکرا کر گردن نیوھڑائی۔ اس پری نے وہ آنکھ پائی تھی کہ لاکھوں میں انتخاب کروڑوں میں لاجواب۔ آزاد نے کہا کہ ایسی آنکھ کسی معشوق نے نہیں پائی ہے۔ ہیلن اور زینت النسا اور اختر النسا اور اللہ رکھی اور وینشیا ایک کی آنکھ ایسی نکیلی رسیلی نہیں جیسی یہ ظالم مظلوم نما ہے۔

بہ نرگس تا کنم تحریر وصف چشم میگونش
برائے رقعہ برگے از گل بادام میخواہم

ہائے کیا خونخوار آنکھ ہے۔ آنکھ ہے یا مردم بیمار۔ کیا مستی ہے۔

دو چشم یار کہ مستند و ناتوان ہر دو
شدند آفت عقل و بلائے جان ہر دو

آزاد نے خادمہ سے کہا کہ اگر یہ اجازت دیں تو ان کی چشم میگوں کا ایک بوسہ لوں۔

خادمہ: واہ حضور پر، ہماری شہزادی کا دل آیا ہے۔ بھلا ہماری مجال ہے۔ کہ جس کو وہ چاہیں۔ اس کو ہم اس قسم کی بات کی اجازت دیں۔

آزاد: (جھینپ کر) ہونہہ! تو فقط آزمانا تھا سچ کہتا ہوں۔

خادمہ: ہماری شہزادی نے ان دونوں کو صرف اسی لیے بھیجا تھا۔ کہ ہمارے ہاں کی پیش خدمتیں ایسی ہیں کہ آپ کی نیت ڈاواں ڈول ہو جائے، نہ کہ حضور خود۔ چنانچہ وہ بات حاصل ہو گئی۔ اب اپنے دل میں سوچیے بس۔

آزاد سخت خفیف ہوئے۔ سوچے کہ اگر شہزادی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ان کی نظروں سے گر جائیں گے۔ اب تک تو ہم ٹن کی لیتے رہے۔ کہ شادی نہ کریں گے۔ ایک حور عین سے اقرار کیا ہے۔ ایں و آں اور چنیں و چناں اور پھر وہ سنیں گی کہ ان کی پیش خدمتوں میں سے ایک پر اس قدر فریفتہ ہوئے کہ اس سے بوسہ مانگا۔ گلابی پوش نے مسکرا کر آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آزاد نے کہا اب مرغ دل دام میں پھنس گیا۔ جب ایسی مہ جبیں پیش خدمتیں دل پر ستم ڈھاتی ہیں، تو شہزادی کا کیا کہنا۔ مگر اب تک شیطان نے آنکھوں پر پٹی باندھی تھی کچھ نہ سوجھا۔ اب آنکھ کھلی۔ گلابی پوش کی جبیں کیا سورۂ نور ہے۔

بسکہ آئینہ صفا دید دران پیشانی
دست در زیر زنخدان زدہ از حیرانی

اور عشوۂ دل ربا تو بلائے جان ناتواں ہے۔ ہائے ہائے۔

غمزہ آموزد بچشمش شیوۂ بیداد را
طرفہ شاگردے کہ می گوید سبق استاد را

یہ چھل بل۔ یہ مستی و شوخی۔ یہ رعنائی و برنائی۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ آہو چشم نے کہا۔ یہ ٹھنڈی سانسیں کیوں بھرتے ہو۔ شہزادی کا کہنا کیوں نہیں مان لیتے ہم سب خدمت کو حاضر رہیں گے۔

آزاد: (مسکرا کر) اچھا مگر اب ہماری طرف سے پیغام کون کرے گا۔

خادمہ: واہ۔ اور ہم سب آئے کس لیے ہیں۔

آزاد: اچھا جاؤ کہہ دو کہ بسر و چشم منظور ہے۔ اب ہم بھی مجبور ہیں۔ کیا کریں ہم اس مصیبت میں گرفتار ہوئے کہ خدا دشمن کو بھی نصیبت نہ کرے۔

خادمہ: یہ سب مصیبتیں اپنی عقل کی بدولت جھیلیں۔ اب تو آدمیت سیکھو۔ چاہے برا مانیے چاہے بھلا مانیے۔ ابھی ہمیں تسلی نہیں ہے آپ کے مزاج میں وحشت زیادہ ہے۔ اس وحشت سے ہمیں خوف معلوم ہوتا ہے۔

کہ ایسا نہ ہو پھر کایا پلٹ ہو اب کی خوب سوچ سمجھ کے کام کرنا۔ اگر منظور ہو تو خیر، ورنہ صاف انکار کرو مطلب یہ کہ نکلوں بری بات ہے۔

گلابی پوش دُلہن بنی ہوئی تھی سکھائی پڑھائی تو تھی ہی۔ ہر ادائے دلرُبا سے آزاد کی جان نا تواں پر ستم ڈھاتی تھی۔ مُسکرا مُسکرا کر بجلیاں گراتی تھی آہو چشم کی چشم نرگسی وہ ظلم ڈھاتی تھی۔ کہ اَلاماں اَلاماں۔ ؎

ایں ظالم مظلوم نما طرفہ بلائے ست

آہو چشم نے انگڑائی لے کر کہا۔ اب اگر آپ کی بات ہو تو ہم اسی دم ان کو بُلا لائیں۔ کُل امور ابھی ابھی طے ہو جائیں۔ آزاد نے کہا۔ بسر و چشم منظور، اب وہ آئیں یا نہ آئیں اگر ان کے خلاف نہ گزرے تو ہم ابھی ابھی چلے چلیں۔

معشوقہ نسرین بناگوش یعنی پولینڈ کی شہزادی بناؤ چناؤ کرکے آزاد کے پاس آئی۔ آزاد نے اس سرو صنوبر خرام کی مستانہ چال اور اس کی صورتِ زیبا دیکھتے ہی کہا کہ (یا خدا مجھے اس قدر عقل عطا کر کہ میں اس غنچہ دہن کو عقد نکاح میں لاؤں) گلابی پوش اور آہو چشم دونوں ہمراہ تھیں۔

شہزادی : چلو، اگر ہزار بار بلواؤ۔ تو بسر و چشم حاضر ہوں۔

آزاد : امتحانِ جذبِ دل تھا۔ ورنہ تم کو پا کے شادی سے انکار کرنا یعنی چہ کیا مجال۔ انکار غیر ممکن ہے۔

یہ عذر امتحان جذب۔ دل کیسا نکل آیا
ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

گلابی پوش : حضور یہ آپ ہی کے ناز کے کشتہ ہیں۔ ہندوستان سے حضور ہی کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر آئے تھے۔ مگر یہاں رعب حسن میں آ گئے۔

شہزادی : واہ اور یہاں اتنی دُور آن کر یہ سہل انکاری!

چشم بد دُور در مزاجِ شریف
چہ قدر ہا کہ سہل انکاری است

آزاد : چلیے بندہ حاضر ہے۔ جہاں چاہیے چلیے۔ فقیروں کو عذر کیا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

شہزادی : جہاں کیا معنی۔ محلِ مُعلّٰی۔ اور ایوانِ سپہر تو امان میں چلیں گے یا واہی تباہی، اِدھر اُدھر پھریں گے۔ وہاں چلیے حمام کیجیے کپڑے بدلیے۔

آزاد پولینڈ کی شہزادی کے ساتھ چلے۔ تو کوہِ رفیع کو عین جوبن پر پایا۔ دامن کوہ میں لالہ زار اور قلّہ کوہ پر مرغزار، و سبزہ نو دمیدہ عجیب لطف دکھاتا تھا۔ نظر کی چوٹی پر آزاد عشعش کرتے تھے۔

شہزادی : جائیے سب باتوں کے پہلے حمام کرو عطر ملواور لباس بدلو۔ پھر ہم تم اس سبزے میں گل گشت کریں گے۔

آزاد نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ عطر ملا۔ کوٹھی کے باہر آئے تو جنگی پوشاک دیکھ کر پولینڈ کی شہزادی ہزار جان سے عاشق ہوگئی۔ آزاد کے چہرے سے اس وقت آگ برستی تھی، اور جلال نمودار تھا۔ شہزادی ہاتھ میں ہاتھ دے کر چمنوں اور روشوں میں ٹہلنے لگی، گلابی پوش، اور آہو چشم اور خادمہ اور عربن سب پر آزاد پاشا کا رعب چھا گیا۔

جنگی پوشاک ان پر کمال زیب دیتی تھی۔

شہزادی : جام لاؤ۔ بادۂ گلفام لاؤ۔ آزاد ہمارے ساتھ شراب پینا پڑے گی۔

آزاد : ہم نے توبہ کرلی ہے کہ شراب نہ پئیں گے۔ اب مجبوری ہے۔

شہزادی : واہ ہوش کی دوا کرو عقل کے ناخن لو۔ توبہ کیسی۔

آزاد : (ہنس کے) کیا مصیبت ہے۔ اگر نہ پئیں۔

شہزادی : (تنک کر) مصیبت ہے۔ کیوں حضور۔ خیر ہمارے پیارے پیارے ہاتھوں سے شراب پینا مصیبت ہے۔ واہ۔

آزاد : خیر پھر اب جو ہو، سو ہو۔

گر یار مئے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

گلابی پوش : (ایک پیش خدمت سے) اگر اب زیادہ انکار کیا تو پھر قید خانے بھیجے گئے۔

پیش خدمت : اس میں کیا شک ہے۔ اور ہونا کچھ ایسا ہی ہے۔

آزاد پاشا نے یہ تقریر سن لی۔ سوچے کہ اگر رہائی پائی تو کفارہ کرلیں گے۔ دعائے توبہ پڑھ لیں گے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ ہم بدرجہ مجبوری شراب پیتے ہیں۔ خیر۔ گو توبہ بخوبی ہے مگر آج مجبوری ہے۔

مئے خوردن و خوش زیستن و توبہ شکستن
ایں باہمہ در مذہب رندانہ ضرور است

شہزادی : بولیے۔ اگر پینے کی مرضی ہو تو خیر۔ ورنہ اب ہم زبردستی پلائیں گے۔ وجہ کیا کہ آپ نہیں پیتے۔

آخر سبب۔

آزاد: واہ وا واہ۔ اب یہ باتیں ہی ہوا کریں گی یا منگواؤ گی بھی۔

طاعت و تقویٰ چہ باشد زاہدی زاہد چہ چیز
عاشق آوارہ ایم و مست و مدہوشیم ما

شہزادی: (پیش خدمت سے) افوہ۔ اس قدر دیر۔ لاؤ۔

پیش خدمت: حضور حاضر ہے۔ ابھی آئی۔ وہ آگئی۔

آزاد پاشا نے کہا کہ ہم ایک شرط سے شراب نوش کریں گے۔ ہم اور آپ دونوں گائیں گو علم موسیقی میں ان کو چنداں دخل نہ تھا۔ مگر اس وقت سبزے کی لہک نے مجبور کیا۔ اونچے سُروں میں میاں آزاد یہ غزل گانے لگے۔

ذرا اے نسیم سنبھال لے کہ بہار مستِ شراب ہے
وہ جو حسن عالم نشہ ہے اُسے اب کی عین شباب ہے

یہ دو روزہ نشو و نما کو تو نہ سمجھ کہ نقش بر آب ہے
یہ سراب ہے یہ حباب ہے فقط ایک عالم خواب ہے

یہ گھٹائیں چھائیں جو کالیاں ہیں ہری بھری ہوئی ڈالیاں
اُبھر آئیں پھولوں کی لالیاں تو بجائے آب شہاب ہے

عرق بہار شراب ہے وہی آج چھڑکیں گے آپ پر
نہ تو بید مشک ہے اس گھڑی نہ تو کیوڑا ہے نہ گلاب ہے

انھیں کہنے سُننے سے بیر ہے جو خود آئیں سو تو بخیر ہے
یہ غرض کہ زور ہے سیر ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

میں گھر آؤں جاؤں کروں میں کیا مزاجی ہے ناک میں آگیا
نہ تو عرض حال کی تاب ہے نہ تو صبر خانہ خراب ہے

مجھے وحش و طیر سے رشک ہے کہ کبھی بھی ان کو کسی نمط
نہ سوال ہے نہ جواب ہے نہ عذاب ہے نہ عقاب ہے

مری بات مان، سنا دلا نہ تو عرض و فرض پرے چلا
کوئی ان کو ٹوکے سو کیا بھلا کہ وہ عالی ان کی جناب ہے

ارے انشا اب جو یہ دور ہے تری وضع اندنوں اور ہے
یہ بھی کوئی زیست کا طور ہے نہ شراب ہے نہ کباب ہے

شہزادی: لو بوتلیں آگئیں۔ اب کس کا انتظار ہے۔ دور چلے۔

آزاد: ضرور۔ ہم بھی تلے ہیں۔

دور چلے دور چلے ساقیا
اور چلے اور چلے ساقیا

شہزادی: (جام شراب دے کر) شغل کیجیے۔ دیکھو تو کیا شراب ہے۔

آزاد: (مُنھ بنا کر) برسوں سے شغل چھوڑ دیا ہے۔ آپ کسی جام میں پانی بھر کر اُس میں دس پانچ قطرے ملا دیجئے۔

راوی: کیا خوب۔ اشک بلبل۔

شہزادی: کچھ خیر ہے۔ بیں بے پوری بوتل پلائے نہ مانوں گی۔

نشے کے پینگ خوب بڑھیں گے بہار میں

بوتل بغل میں ہوگی تو ہم سبزہ زار میں

آزاد نے بڑی کوشش کی کہ بدرجۂ مجبوری کسی قدر شراب پئیں گے۔ مگر جام ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ کہا خدا کے لیے مجھے معاف کیجیے۔ مجھ سے نہ پی جائے گی۔ ورنہ میں ہرگز انکار نہیں کرتا۔

شہزادی: یہ بھرکے کسی اور کو دیجیے۔ خود تو ہاتھ سے گرادیا۔ اور باتیں بناتے ہیں۔ کیا یہی ایک گلاس تھا۔ (دوسرا گلاس بھر کر) لو۔

آزاد: (ہاتھ بڑھا کر) مگر— اگر۔

راوی: اچھی اگر مگر ہے۔ وہ بے شراب پلائے نہ چھوڑیں گی۔

خداوندا تو خوب واقف ہے کہ مجھ کو اس دخترِ رز حرام زادی مردار سے کلی نفرت ہے۔ جب سے میں نے توبہ کی، کبھی نہیں پی۔ جزیرہ پیرم اور رجمیکا رم کی اور بات تھی۔ یاخدا تو اس کافر بدکیش کو اسی کی آرزو سے باز رکھ۔ اس کو اس کوشش میں کامیاب نہ ہونے دے کہ میری توبہ شکنی کرے۔

شہزادی: اب کب تک لیے رہوں۔ لو۔ ایں! یا الٰہی!

آزاد: اچھا لاؤ۔ خاطر ہے۔ مگر جی نہیں چاہتا۔ افسوس۔

شہزادی: کیا تم نے کبھی نہیں پی۔ بالکل کورے ہو۔ ہائے جب ہی یہ جھجک ہے۔

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد

ہائے کمبخت— تو نے پی ہی نہیں

آزاد: اچھا اس وقت معاف کر دو۔ پھر سمجھا جائے گا۔ خدا کے لیے۔

شہزادی: (جام میز پر پٹک کر) اچھا نہ لو۔ ہم اب نہ کہیں گے۔

گلابی پوش: اے نہیں حضور یہ کیا بات ہے۔ اب کی پھر دیجیے۔

آزاد نے جام شراب اُٹھا کر چوم لیا، اور کہا کہ مجھے پاشا کوئی عذر نہیں ہے مگر دل نہیں قبول کرتا۔ ہونٹھ تک لے جاتا ہوں تو پیا نہیں جاتا۔

گلابی پوش چمکتی ہوئی آئی اور آزاد کے کان میں کہا کہ انکار نہ کیجیے، ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ آزاد نے کہا تمہاری گلابی پوشش اس بدلی میں ستم ڈھاتی ہے۔ یہ کہہ کر پیش خدمتوں اور شہزادی پر غور سے

نظر ڈالی۔ تو شہزادی کو گا لبدرِ فی النجوم پایا۔ مگر ایک شنجرفی پوش پر بھی غضب کا جوبن تھا۔ اس کی طرف مخاطب ہو کر آزاد نے یہ اُردو شعر پڑھا۔

شنجرفی اس دوپٹہ کے اوصاف کہیے کیا
لے کر دوات و خامۂ شنجرف توڑیے

شہزادی کو کمال رنج ہوا کہ مَیں نے اپنے ہاتھ سے جامِ شراب دیا۔ اور اُس نے انکار کیا۔ وہ تو فرطِ غرور سے سمجھتی تھی کہ

کیا شے ہے بھلا قصرِ فریدوں مرے آگے — کانپے ہے بڑا گنبدِ گردوں مرے آگے
مرغانِ اولی اُجنحہ مانند کبوتر — کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

وہ مار فلک کا کہکشاں نام ہے جس کا
کیا دخل جو بل کھا کے کرے چوں مرے آگے

اور آزاد نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ انکار کیا۔

آزاد : اور جو حکم ہو بجالاؤں۔ مگر خوفِ خدا کے سبب سے شراب نہیں پی سکتا۔

شہزادی : مُنہ پھیر کر اختیار ہے۔

گوری گوری گردن پھیر کر بھولے پن اور کسی قدر تیکھی چتوں سے (اختیار ہے) کہنا سِتم تھا۔ آزاد نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں۔ اور اب ہرگز انکار نہ کروں گا۔

آزاد پاشا نے خوجی کو یاد کیا۔ اور شہزادی سے کہا کہ ہم کو اس وقت خوجی کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی رائے کے خلاف نہ ہو تو بلوا دیجیے۔

شہزادی : خوجی کون۔ ہاں وہ بونا۔ وہ پاگل کیا کرے گا اور ہم نے سُنا کہ وہ حضور کے والد ہیں۔ واہ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔

آزاد : لاحولَ ولاقوۃ۔ باپ کسی اور کا ہو گا۔ ہمارا غلام ہے۔

شہزادی : (مسکرا کر) خیر کوئی ہے۔ ان صاحب کے ابّا جان کو ذری بلالاؤ۔

آزاد : آپ ابّا جان ہی سمجھیں۔ مگر اُن کو بُلوا دیجیے۔

ایک خدمتگار بھیج دیا گیا۔ خدمتگار نے جا کر خواجہ صاحب کو سلام کیا۔ کہا حضور کو آزاد پاشا نے بُلایا ہے سواری بھیجی ہے۔

خوجی : (متحیّر ہو کر) کیا معنی۔ آزاد کجا۔ قید خانے کے اندر ہے۔

خدمتگار: قید خانہ کیسا۔ ان کے دُشمن قید خانہ میں جائیں۔ وہ شہزادی کے ساتھ ہوا کھا رہے ہیں۔

خوجی: اوہو۔ یہ کہیے۔ آ گئے راہ پر۔

خدمتگار: آپ کو بُلایا ہے۔

خوجی ان کے ساتھ چلے۔ آزاد کو دیکھتے ہی جُھک کر سلام کیا۔ کہا خوش آمدید و صفا آورد دید بگو۔ بابائے مَن بدیع چہ کارہ است۔ شما چہ می گفتی۔ برائے کہ وجہ مارا طلب داشتی۔ من کہ از برائے شما آزاد در زنجیر خانہ رفتم۔

آزاد: اب فارسی بولنا رہنے دیجیے۔ مطلب سُنیے۔ مطلب یہ کہ۔

خوجی: در زبان پاژند گفتگوئے کن۔ بابائے مَن بدیع خواجہ صاحب۔

نسرین بچمن بر نزند گر بدن این است

با غنچہ صبا دم نزند گر دہن این است

انچہ من گفتہ اند درون شان این پری است۔ کہ محاذی است۔

آزاد: یا خدا معلوم ہے کہ آپ بڑے فارسی کے محقق ہیں۔

خوجی: محقق و حقق نمی دانم۔ من ہیچ ندانستم زبانِ فرس را بگویند۔ کہ جائے شما سبز است جائے شما خال ست۔

یک دیدہ جلا یافتہ از نکہت یوسف

صد دیدہ جلا یا بد گر پیرہن انیست

یہ رودکی اور سلمان کا اشعار ہے۔

آزاد: اشعار! ہاں بجا ارشاد ہوا۔

خوجی: گربہ در بغل اپنا شتن میدانی کرامی گویند، بابائے من۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب نے ایک ٹیکرے پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔

کبھی کہتے تھے کہ بیٹا تری غربت پہ فدا ‏ ‏ کبھی گردن سے لپٹ گھوڑے سے کرتے تھے مُکا

اے مرے راحتِ جان اے مری آنکھوں کی ضیا ‏ ‏ اے میرے قوتِ دل اے میرے پیری کے عصا

ہائے جی بھر کے نہ تجھ کو مرے جانی دیکھا

اس ضعیفی میں ترا داغ جوانی دیکھا

یہ پڑھ کر خوجی رونے لگے۔ آزاد بھی آبدیدہ ہو گئے۔

شہزادی: کیوں کیوں خیریت تو ہے۔ یہ رونا اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا کیا معنی؟

آزاد: یہ بند انھوں نے ایسا پڑھا کہ بے اختیار رونا آتا ہے۔

مَن بدیع الزّماں کہ بر فارسی محاورات بسیار مہارت دارد۔ بر جی گوید کہ مرا در بین و نبیں دور اُفت انچہ محاورات و فقرات یاد اند، ہر ہمہ را یاد نیستند۔ مَن بدیع الزّماں از فارسیاں گفتگوی کردہ ام۔

قبلہ آپ کو مَیں نے فارسی (گفتگو کے) سکھانے کے لیے نہیں بُلایا ہے۔ اب اس وقت بحث یہ آن پڑی ہے کہ یہ اصرار کرتی ہیں۔ شراب پیوں اور ہم انکار کرتے ہیں۔

اے لاحول۔ اجی بس جاؤ بھی۔

ہائیں۔ تو سُن تو لو۔ بات سُنی ہی نہیں اور رائے دی۔

ہائیں۔ ہاں۔ رائے دے دی۔ کہاں کے بڑے پارسا آپ ہیں۔ ہونہہ یار۔

ہم دُعائے توبہ پڑھ چکے ہیں۔ بھائی اب کیوں کر پئیں۔

اجی جاؤ بھی۔ ایسی پری کے ہاتھ سے شراب نہ پیے۔ تو دوزخ میں جائے۔ ہوٹل میں جا کے مٹن چاپ اور کٹلٹ اُڑاتے ہو۔ پھر شراب نے کیا بگاڑا ہے۔

کردہ ام توبہ بدستِ صنمِ بادہ فروش

کہ دِگر مَئے نخورم بے رخِ بزم آرائی

جُھوم جُھوم کر ابر اُٹھا ہے۔ مزے مزے سے پیو، اور جشن کرو۔ آزاد نے کہا یہ تو سب کچھ کریں مگر حسن آرا یاد آتی ہیں۔

بہار بے تو برنگِ بریدہ می ماند — گُل شگفتہ بجیبِ دریدہ می ماند

بروں کہ رفتہ زمحفل کہ قلقلِ مینا — بدن کشیدن حلق بریدہ می ماند

بہ پیش رنگ حنائی تو اے گلِ رعنا — چمن بہ بسمل درخوں طپیدہ می ماند

زآب تا کہ بروں رفتہ بچشم صَدَف — گہر بقطرۂ اشک چکیدہ می ماند

سوادِ دشتِ غزالانِ دشتِ مجنوں — سیاہ خیمۂ لیلیٰ بدبدہ می ماند

چناں شدست سلیماں شکوہ ظل اللہ

کہ دولتش بغلام خریدہ می ماند

خوجی نے آزاد کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ کہا قسم کھاؤ کہ دُعائے توبہ پڑھنے کے بعد، پھر کبھی نہیں پی۔

آزاد نے کہا ایک بار بدرجہ مجبوری چیکارم میں پینے کا اتفاق ہوا تھا۔ اگر اس وقت رم نہ پیتا تو مر جاتا سمندر

کا پھرنا دل لگی نہیں، اور جہاز سے سینکڑوں آدمیوں کا بچانا آسان امر نہ تھا۔
خوجی : اجی بس بیٹھو۔ خدا کی قسم اگر ہماری معشوقہ ہم کو شراب پلائے تو ہم ہرگز انکار نہ کریں۔ مگر تم عجب قطع کے آدمی ہو۔

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

آزاد : ایک شرط سے شراب پیتا ہوں۔ خوجی بھی پئیں اور ہم بھی۔ شہزادی نے کہا ان کے پلانے کی سہل تدبیر۔ کوئی جا کے اس حبشن کو بلا لاؤ۔ اتنا سننا تھا کہ خوجی کے آئے حواس غائب ہو گئے اور جھلّانے لگے۔ خدارا کہیں اس بھتنی کو نہ بلانا۔ میری روح ہی اس سے فنا ہوتی ہے۔ دیونی ہے۔ دیونی بوا زعفران کی بھی چچی نکلی۔ میرے کان کاٹے تو اس نے۔ مگر میں اس سے بولا نہیں، کہ عورت کے منہ کون لگے۔ ورنہ وہ پٹخنی بتاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ دل لگی نہیں ہے۔ نامعقول نے کان پکڑ کے اٹھا لیا۔ اور میں مارے لحاظ کے بول نہ سکوں، کہ اس کے منہ کون چڑھے، ورنہ کجا مرد کجا عورت۔
راوی : اور مرد بھی آپ کا سا گران ڈیل اور قوی ہیکل اور شہ زور۔

آزاد نے جب سب روایت سنی تو بہت ہنسے۔ کہا واقعی بوا زعفران ہی نکلی اُس نے بھی حضور کو ٹھیک بنایا تھا۔ اس نے بھی ٹھیک بنایا۔ حبشن آئی۔ آتے ہی خوجی کو پٹخنی بتائی۔ خوجی گرے تو اب اُٹھتے ہی نہیں۔ اے صاحب اُٹھیے۔ واہ اُٹھ چکے۔ گرے سو گرے۔ اب اُٹھنا کیا معنی۔ اب تو جب تک خوجی کو آزاد نہ اُٹھائیں۔ تب تک اُٹھنا معلوم۔ آزاد نے سہارا دیا تو اُٹھے۔ فرمایا دیکھیے، انھوں نے پھر چھیڑا اور میں طرح دیتا جاتا ہوں۔ اب کی چھیڑے گی تو تماشا بھی دکھاؤں گا اس دیونی کو کسی طرح اس قدر پلاؤ کہ بدمست ہو جائے۔ پھر البتہ این جانب لکڑیاں لگائیں۔ پیٹتے پیٹتے بدن نیلا کر دوں۔ آزاد نے کہا بس بس جانے دیجیے۔ جانے دیجیے۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ حضور اپنی طرف دیکھیں۔ گو وہ لاکھ موٹی تازی ہے۔ مگر حضور پھر حضور ہی ہیں۔ اب ہمارا جھگڑا چکیے گا، یا نہیں۔ آپ اور ہم دونوں شریک حال ہوں۔

ثریّا بیگم کی پریشانی

شہزادہ فریدوں کُر، مرزا ہمایوں فر کے وصال حسرت مآل کا حال ناظرین نے افسوس کے ساتھ ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ مگر اکثر اصحاب اس خبر سے خوش ہوئے ہوں گے کہ ہمارے ناول کے ہیرو آزاد پاشا بہت جلد پولینڈ کی پری چہرہ شہزادی کو عقد میں لانے والے ہیں۔ شاید اس شادی کے ذریعے سے رہائی

کی صورت نکلے۔ اور قید سے چھٹکارا ملے۔ خیراب بعد مدت۔ مہ وشِ زریں کمر، پری پیکر، ثریا بیگم کا حال سنیئے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ بیچاری چوروں کے ساتھ شب کے وقت طوعاً وکرہاً کھیتوں کھیتوں جاتی تھی۔ آدھہ کوس زمین طے کرکے، ان چوروں نے ثریا کو دو اور چوروں کے سپرد کیا اور چلتے وقت کہا کہ یہ نو خیز جوان، اور حسین عورت اس قابل ہے کہ کسی شہزادے یا رنگیلے امیر کے ہاتھ اس کو کوڑے کرے۔ دو چوروں میں ایک نام بُدھ سنگھ تھا۔ دوسرے کا ہلاس۔ یہ دونوں ڈاکو دُور دور تک مشہور تھے اور اچھے اچھے ڈکیت ان کے نام سُن کر اپنے کان پکڑتے تھے۔ بُدھ سنگھ کی ڈکیتی کے جھنڈے گڑے تھے۔ حیدرآباد اور بمبئی اور مدراس اور کلکتہ اور پنجاب اور سندھ تک انھوں نے ڈاکے مارے تھے، وسطِ ہند کے ڈاکوؤں سے اکثر اوقات خراج لیا تھا۔ تمام ہندوستان میں ان کی دھاک تھی۔ ہلاس بڑا جیوٹ دار آدمی تھا۔ قوم کا راجپوت اس شقی نے اپنی تین لڑکیاں قتل کر ڈالی تھیں۔ ایک لڑکی کو جس کی عمر سات دن کی تھی اسے دریا میں جیتے جی پھینک دیا۔ دوسری لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا تیسری لڑکی کو ولادت کے دوسرے دن قتل کیا۔ اور صحن میں دفنا دیا۔ انسان کی جان لینا ان کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ ایک روز بندیلکھنڈ کے کسی میدان میں میاں ہلاس اپنے چیلوں کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ یہ سب سانڈنیوں پر سوار تھے۔ اثنائے راہ میں ایک پٹھان ملا۔ ہلاس نے للکار کر کہا۔ (رکھ دے اسباب) پٹھان بولا ہٹ۔ کسی ایسے ویسے کو دھمکانا۔ ہم پٹھان ہیں اس پر بات بڑھی۔ پٹھان اکیلا تھا، اور یہ جماعت کی جماعت۔ اسباب رکھوالیا تھا۔ اور چلتے چلاتے ایک شقی نے گولی سر کردی تو پٹھان دھم سے گرا اور مر گیا۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ گویا دل لگی تھی چلتے چلتے کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک رتھ آرہا ہے۔ مشعل روشن ہے۔ ادھر ادھر ایک سپاہی۔ دو چوکیدار ساتھ پیچھے میانہ۔ آٹھ کہار ایک مشعلچی۔

ہلاس نے اپنے چیلوں کو حکم دیا کہ لوٹ لو۔ ان کے شاگرد رشید ننکو نے سانڈنی بڑھا کر کہا یہ کس کی سواری جاتی ہے روک لو۔

سپاہی: کیا روک لو؟ وجہ۔ لالہ پنا مل کے ہاں کی سواری ہے۔

ننکو: پنا مل کون؟ لالہ پنا مل کون۔ اخاہ۔ سیٹھ پنا مل ہوں؟

سپاہی: جی ہاں سیٹھ پنا مل۔ فقط عورتیں ہیں اور لالہ جی بھی ہیں۔ سیٹھ صاحب زیور ویور ساتھ نہیں ہے۔ آپ لوگ تکلیف نہ فرمائیں۔

ننکو: ارے ہم کو بہکاتا ہے۔ دائی سے پیٹ چھپاتا ہے۔ اچھا رتھ روک لے۔ کہا مان۔ روک لے نہیں ہم تم کو ٹھیک بنائیں گے۔

رتھ کے رکنے میں ذرا دیر ہوئی تو ننکو نے فوراً بندوق سرکی۔ جس سے وہ سپاہی اور ایک کہار اسی وقت مر گیا، اور دو آدمی زخمی ہوئے۔ لالہ بیچارے مہاجن آدمی گولی اور بندوق سے کیا واسطہ کانپتے ہوئے سے نکلے اور کہا کہ ہمارے پاس جو کچھ ہو وہ ہم سے لے لو۔ مگر ہماری جان بچاؤ۔ ننکو اور چار پانچ ڈاکوؤں نے عورتوں کا کل زیور اتار لیا۔ اور ننکو نے نہایت خندہ پیشانی، اور شگفتگی کے ساتھ لالہ پر تلوار کا تلا ہوا ہاتھ دیا۔ چار منٹ کے عرصے میں سیٹھ جی کا کام تمام کیا۔ ماحصل اس تحریر کا یہ ہے کہ ہُلاس جان لینے کو بائیں ہاتھ کا کرتب سمجھتا تھا۔ ہلاس اور بدھ سنگھ میں ثریا بیگم کی نسبت باتیں ہونے لگیں۔ یہ بیچاری بھی سنتی جاتی تھی۔

ہلاس: کہو سنگھ جی۔ اب کیا فکریں رہیں۔ گہرے ہیں استاد کیوں؟

بُدھ سنگھ: اپنی تو یہ مرجی۔ (مرضی) ہے کہ اس لُگائی کو جورو بناؤ۔ کِھدمت (خدمت) میں رکھو۔ اور جو کوئی سو گھر من چلا مل جائے تو اُسی دم بیچ ڈالو۔ پٹیل ڈالو۔ کوڑے کرو۔ اور جب لگ نہ ملے تب لگ نہ سہی۔ پھر اور کیا ہووے گا۔

ہلاس: کچھ نہیں۔ اس سے کہو کہ یہ بھی ٹھگائی کرے۔ جس طرح ہم کہیں اس طرح۔

بُدھ سنگ: اچھا۔ پھر اب یہ تو ہماری تمہاری مرجی (مرضی) کی بات ہے۔ ثریا بیگم کانپ رہی تھیں۔ اندھیری رات، سنسان میدان، اجنبیوں کا ساتھ، پاک دامن، اپنا نہ بیگانہ، بالکل یکہ و تنہا، بیک بینی دو گوش، قدم قدم پر کانپتی تھی۔ کہ ہائے اب کیا کروں۔ اب تک خدا نے شیشہ ناموس و عفّت کو سنگ بے حیائی سے مصئون رکھا۔ اب خدا ہی حافظ ہے۔ سوچی کہ ان دونوں شقی نابکاروں کی خوشامد کروں، یا اس فکر میں رہوں کہ کسی طرف بھاگ جاؤں یا کیا کروں۔

ہلاس نے ثریا بیگم کا دستِ سیمیں اپنے ہاتھ میں لے کر کہا، سنو بیگم تم بُرا نہ مانو۔ اور اپنے دِل کو ڈھارس دو۔ سمجھاتی جاؤ۔ ہم لوگ تمہیں ایسے خوشرو جوان کے ہاتھ بیچیں گے، جو تمہیں امیرزادی جان کے رکھے۔ چلتے چلتے یہ تینوں ایک دِلکش مقام پر پہنچے۔ جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، دل کو سرور بخشتے تھے۔ ہلاس نے کہا آؤ یہاں ذرا دم لے لیں۔ بُدھ سنگھ بولے اچھا دم لینے کو لو، مگر اس قدر خیال رہے، کہ تھوڑی دیر میں شکار کھیلنا ہو گا۔ ہلاس مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ مگر شکار کے لفظ پر ثریا بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ یا خدا شکار کیسا۔ شاید یہیں کسی کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ یا شاید قتل کی فکر ہو۔ یا خدا قتل کی جاؤں تو اچھا ہے۔ ہائے اب یہ زندگی اور یہ مصیبت نہیں سہی جاتی۔ بہت غم سے پتھر کا کلیجہ ہو گیا۔ خدا جانے کس کے ہاتھ بیچیں کیا کریں۔

یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ دو آدمیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ ایک نے کہا مرزا جی، واللہ آج ہماری زندگی تلخ ہے۔ وہ رنج ہوا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ خدا کی قسم اس وقت نہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے نہ بولنے کو، نہ کھانے کو، نہ پینے کو۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو کپڑے پھاڑ کے جنگل میں جا بیٹھوں۔ ہا۔ ارے یار بڑا سانحہ ہوا۔ مرزا جی افیم کی پینک میں تھے۔ سنتا کون انھوں نے کہا کہ اسی دم خبر آئی کہ ہمارے شہزادے بہادر کو کسی کمبخت نے قتل کر ڈالا۔ ہائے مرزا ہمایوں فر، بیچارے چل بسے۔ اب ان کا کہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ ہمایوں فر کا نام سن کر ثریا بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ ایں! ہمایوں فر۔ ان کی تو شادی تھی۔ اب پوچھیے تو کس سے، اُدھر جب مرزا جی نے کچھ بھی جواب نہ دیا تو ان کے دوست خاں صاحب نے کہا ارے میاں کیا اُونگھتے ہو۔ مرزا جی چونک کر بولے، یاراں ذری سونے تو دو۔ ابھی نیند کا ماہی مراتب آیا تھا اور تم نے جگا دیا۔

ہُلاس: نیند کا ماہی مراتب کیسا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب ہم سمجھے نہیں۔

مرزا: آپ کا اسم مبارک اس وقت تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا۔

ہُلاس: ہمارا نام ہلاس ڈاکو۔ اب سمجھے یا اب بھی نہ سمجھے۔

مرزا: خوب سمجھے۔ خدا تم سے بچائے۔ ہر بھلے مانس کو تم سے بچائے۔

ہُلاس: یہ کیا کہا۔ ہم ہوّا ہیں۔ یا شیطان ہیں یا پریت۔

مرزا: ہاں تو آپ نے کیا پوچھا تھا۔ نیند کا ماہی مراتب؟ نیند کا ماہی مراتب پینک، اب تو سمجھے، ہاں۔

ثریا بیگم نے ہلاس سے کہا ذری ان سے پوچھنا ہمایوں فر کا کیا ذکر کیا تھا۔ ہلاس بہت ہی خوش ہوئے کہ ان سے بے جھجک گفتگو کی۔ ان دونوں آدمیوں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔ کیوں صاحب آپ نے کیا کہا تھا۔ ہمایوں فر کا ذکر کیا تھا۔ مرزا جی تو پینک میں تھے۔ انھوں نے خاک نہیں سنا۔ خاں صاحب نے بیان کیا تھا۔ کہا ہمایوں فر کا ہم لوگوں نے نام بھی نہیں لیا تھا۔ مگر خاں صاحب نے کہا۔ جی میں نے عرض کیا تھا کیا کہوں بڑا حادثہ ہے۔

عجب دردیست جانم را اگر گویم زبان سوزد
دگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

کہتا ہوں تو کہا نہیں جاتا، اور خاموش رہتا ہوں تو چپ بھی نہیں رہا جاتا۔ ہمایوں فر شہزادے کی برات نکلی، تو بڑی دُھوم دھام سے، لاکھوں آدمی جمع تھا۔ بازار میں تل رکھنے کی جگہ نہ نہیں۔ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ ہم بھی ایک کونے میں کھڑے جلوس کا سامان دیکھ رہے تھے۔ بس حضرت ایک دفعہ برات رُک

گئی۔ ہیں۔ برات کا رُکنا چہ معنی دارد۔ سُنا ہمایوں فر زخمی ہوئے۔ ارے! زخمی! کیا ہوا کیا۔ ہوش اُڑ گئے۔ کُل حاضرین دوڑ پڑے۔ دیکھا تو گھوڑا موجود مگر سوار ندارد۔

ہُلاس: کیا نوشہ گھوڑے پر سوار تھے، ہاتھی پر نہیں سوار تھے۔

خاں صاحب: جی نہیں حضرت بس کوئی کمبخت آن کر پیچھے سے زخمی کر گیا بھاگ کھڑا ہوا۔ ستم ہو گیا۔ ہائے ہائے غضب۔

ثریا بیگم: اب زندہ ہیں۔ ہائے انجام کیا ہوا یہ بتاؤ کہ ہوا کیا۔ اُف۔

خاں صاحب: فوراً مرغِ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
زجامِ دہر مئے کُلّ مَن علیہا فان

اللہ بس باقی ہوس۔ دُنیا کے عجب کارخانے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ کیسا خوبصورت شہزادہ غیور فہمیدہ لائق فائق فیاض مگر رہے نام اللہ کا۔

ہُلاس: ارے یار تم نے ہمیں مار ڈالا۔ اب کیا ہو گا بھئی۔

بدھ سنگھ: کیوں تم سے کیا واسطہ۔ کیا تم ان کا دِیا کھاتے تھے۔ تم سے کیا واسطہ۔

ہُلاس: ان سے ایک شخص سے لاگ ڈانٹ تھی۔ ایک شہسوار تھے۔ رئیس زادہ وہ بھی ہے۔ اس سے اور شہزادے سے جانی دشمنی تھی۔ ہمایوں فر نے ہمیں مقرر کیا تھا کہ اس کو ڈھونڈ نکالیں۔ ہم نے پتہ لگاتے لگاتے خبر پائی کہ ایک ٹھاکر کے ہاں ہیں۔ مگر پھر تب سے جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہمیں پچاس روپیہ ماہواری دیتے تھے یہ تھوڑی رقم نہیں ہے۔ پچاس روپیہ بہت ہوا۔

خاں صاحب: قاتل کا بھی پتہ لگا۔ بڑا سفاک آدمی ہے۔ دریا میں پیر رہا تھا۔ پکڑا گیا، مگر دریا سے نکلتے ہی ایک سائیس کو تھپڑ دیا۔ وہ مہاجن کے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔ تھپڑ دیتے ہی وہ تو لڑھکنی کھا کر گرا۔ ادھر یہ معاً گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اور چلے، تو دم کے دم میں ہوا ہو گئے۔ یہ جا وہ جا، پتہ بھی نہ معلوم ہوا۔ اس کے پیچھے صاحب لوگوں اور ہندوستانی رئیسوں کے چالیس بیالیس گھوڑے بگٹٹ جاتے تھے، مگر گرد نک نپاتے تھے۔ آخر کار گرفتار ہوا۔ شہسوار شہسوار مشہور ہے۔

ثریا بیگم: کون شہسوار۔ کوئی ستائیس اٹھائیس برس کا سن ہے کیوں؟ اور کشیدہ قامت ہے یا پستہ قد۔

خاں صاحب: سن تو بس اتنا ہی ہے۔ مگر آدمی کشیدہ قامت ہے۔ اور خوبرو رخسار چپ پر ایک خال

ہے۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی، کتری ہوئی مونچھیں۔ گھوڑے پر ایسا سوار ہوتا ہے، کہ لاکھوں کروڑوں میں انتخاب، ایسا آسن جمتا ہے، جیسے میخ گاڑ دی۔ ہلنا اور جنبش کرنا کیا معنی۔

ثریا بیگم: بھلا بال گھونگر والے یا سیدھے، کچھ خیال ہے۔

خاں صاحب: ہاں ہاں۔ بالکل گھونگر والے بال ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے۔

ثریا بیگم تاڑ گئی کہ وہی حضرت ہے، یقین ہو گیا کہ اب پھانسی پائیں گے چونکہ اتنے دن تک ان کا ساتھ رہا تھا۔ یہ خبر سن کر افسوس ہوا۔ اور ہمایوں فر کی رقابت کی خبر نے اس کو اس درجہ مغموم کیا کہ اپنا رنج بھول گئی۔ سوچی کہ خدایا سپہر آرا کا کیا حال ہوگا۔ اس بیچاری پر کیسی مصیبت پڑی۔ کہیں کی نہ رہی۔ اتنے میں مرزا جی نے ہلاس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کیوں بھئی جوان ایک بات پوچھیں بتاؤ گے۔ اگر تم وہی ہلاس ہو جس نے نواب ولایتی بیگم کے ہاں ڈاکہ مارا تھا تو خدا کے لیے یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تمہارے نام وارنٹ جاری ہے کہ بڑے ڈاکو مشہور ہو اللہ اللہ۔

ہلاس نے کہا مرزا صاحب۔ آپ بھی بس وہی رہے۔ مردوں کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہی ہوا کرتے ہیں، ہم سے اور پولیس سے تو جانی دشمنی ہے۔ قسم کھا کے کہتا ہوں اگر پچاس آدمی بھی گرفتار کرنے آئیں تو گرد تک نہ پائیں۔ کیا دل لگی بازی ہے، ہم اور بدھ سنگھ یہ دو آدمی پلٹن کی پلٹن کے لیے کافی ہیں۔ جی، اَرنٹ وانٹ ہوا ہی کرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد، ہلاس اور بدھ سنگھ اٹھے اور ثریا بیگم کو بھی ساتھ لیا، انھوں نے بصد الحاح کہا کہ مجھے معاف فرمائیے میں مجبور ہوں، اب چل نہیں سکتی۔ یا تو کسی سواری کی فکر کیجیے، یا یہیں ٹھہر جائیے۔ ہلاس نے کہا ہم گود میں لے چلیں گے مگر ثریا بیگم نے منظور نہ کیا۔ بدھ سنگھ نے کہا ہم سواری کا بندوبست اسی دم کیے دیتے ہیں۔ سامنے سے ایک سوار آتا تھا۔ میانہ قد سبزے پر سوار ایک سائیس آگے اور پیچھے خدمتگار (پھر) بدھ سنگھ سائیس پر لٹھ دھم سے گرا۔ خدمتگار پر جمایا وہ بھی تیوراہی میں پڑا رہا۔ سوار سے کہا اگر آبرو کے ساتھ گھوڑا نذر کرو۔ تو فہو المراد ورنہ تم بھی زمین پر لوٹتے رہے ہو گے۔ سوار بیچارہ اتر پڑا۔ ہلاس نے ثریا بیگم کو گھوڑے پر سوار کیا اور لگام لے کر چلنے لگے۔ آگے ہلاس پیچھے بدھ سنگھ سوار وہاں سے بھاگا۔ گاؤں میں جا کر چوکیداروں کو اطلاع دی۔ چار چوکیدار ان کے ساتھ آئے۔ خدمتگار اور سائیس کو اٹھایا۔ گاؤں میں بھجوایا۔

ثریا بیگم دل میں سوچتی تھیں۔ کہ اسی سن میں ہم نے کیا کیا دیکھا۔ شادی ہوئی تو بوڑھے کھوسٹ۔ ساٹھ بھویں تک سفید تھیں۔ صورت دیکھنے سے نفرت ہوتی تھی۔ کچھ دن وہ مصیبت جھیلی۔ اس کے بعد وہ موا مر گیا، تو رنڈاپے میں بسر کی۔ پھر سرا میں جا کر رہی۔ کسی نے بھٹیاری کہا کسی نے کہا کہ یہ بڑی خ عورت ہے۔ وہاں سے جوگن ہوئی اور نئے طور پر زندگی بسر کرنے لگی۔ پھر شہسوار کے ساتھ رہی۔ وہاں۔

اُستانی جی کے ہاں آئی۔ پھر شبّو جان بنی۔ اس سڑی خبطی سے سابقہ پڑا۔ سلاور کی باتیں سنیں۔ وہاں سے اللہ نے نکالا، تو لکھ پتی کر دیا۔ تیجیے بیگم ہوگئی داروغہ، مغلانی خواصیں پیش خدمتیں خدمت کے لیے مقرر ہوئیں وہاں چوری ہوئی، بیگانوں میں بھاگ کے رہی۔ وہاں سے یہ نوبت پہنچی۔ اور اب اس لق و دق میدان میں آن پھنسی۔

ہُلاس: بی بی کیا سوچتی جاتی ہو۔ مُنہ سے بولو۔ سر سے کھیلو۔ اور کیا۔ کچھ گانا جانتی ہو۔ گاؤ۔ اس جنگل میں منگل ہو۔ اور کیا۔

پیتم جو مَیں جانتی کہ پیت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈھوزا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

اگر یاد ہو تو فارسی شعر کہہ دو۔ لطف ہو جائے۔ اور کیا۔

اگر دانسم از روز ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

بُدھ سنگھ: واہ، واواہ۔ کیوں نہ ہو مگر جب تلک ان کو نا گواؤ گے تب تلک کوئی بات ہم کو نہ بھائے گی۔ ان سے بولو کہ کچھ یہ بھی گائیں۔ کوئی بھجن۔

ہُلاس: ان کو غزلیں یاد ہوں گی۔ یا ٹھُمری پٹا۔ یہ بھجن کیا جانیں۔

ثریا بیگم: نہیں میاں ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ہم بہو بیٹیاں گانا بجانا کیا جانیں۔

اب سُنیے کہ ایک مقام پر پہنچے، جہاں گھانس بڑی لمبی چوڑی تھی۔ رات اس قدر تیرہ و تار کہ اُلامان اُلامان۔ صلاح ہوئی۔ کہ اسی مقام پر ٹِک جائیں، ثریا بیگم بھی گھوڑے سے اُتریں۔ کہا اُف بالکل شل ہوگئے کبھی گھوڑے کی سواری کی عادت تو تھی ہی نہیں۔ ٹانگیں درد کرنے لگیں۔ اتنے میں کسی کی آواز آئی۔ ہُلاس نے بدھ سنگھ سے پوچھا یہ کون بولا۔ کِس کی آواز آئی۔ بدھ سنگھ نے کہا ہاں آواز تو آئی مگر کوئی بہت آہستہ سے بولتا ہے۔

ہُلاس: کون بولا تھا جی۔ ارے یہ کِس کی آواز آئی تھی اس وقت؟

بُدھ سنگھ: کون بولے تھا۔ ارے کون سا آدمی بولے تھا۔ اس وقت بتاؤ؟

آواز: بدھ سنگھ ذرا اِدھر تک آجاؤ۔ مَیں مرتا ہوں۔ جان دیتا ہوں، سانس نکلتی ہے۔ اب کوئی دم کے دم میں جان نہ ہوگی۔ ذرا سُن لو۔ فوراً ہُلاس اور بدھ سنگھ دونوں آواز کے رُخ چلے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کوئی نہ ملا۔ ثریا بیگم کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ یہ سمجھیں کہ کوئی بھوت پریت ہے۔ اندھیری رات ہیبتناک ہر سمت

سے تاریکی، اور ہیبت ہی نظر آتی تھی۔ ہلاس اور بدھ سنگھ جو اس بیچاری کو چھوڑ کر آواز سے رُخ ہو گئے۔ تو یہ اور بھی سہمنے لگی۔ آنکھیں بند کر لیں، اور آہستہ آہستہ ان دونوں کو پکارا۔ ہائے مصیبت میں خدا کسی کو نہ ڈالے۔ یہ دونوں ڈاکو شقی القلب آدمی۔ اس کے بیچنے کی فکر میں تھے۔ مگر اس مصیبت کے وقت انھیں دونوں کو یاد کیا۔ اور مارے ڈر کے انھیں کو پکارا۔ ہلاس نے جو اس کی آواز سنی تو کہا اخاہ لو آواز تو ادھر سے چلی آتی ہے، اور ہم اُدھر تلاش کرتے ہیں۔ بدھ سنگھ اور یہ اس سمت آئے، تو معلوم ہوا کہ ثریا بیگم کی آواز تھی۔ ثریا بیگم نے رو کر کہا کہ اس وقت ہر برگ و بار سے مجھے بُری بُری صورتیں نظر آتی ہیں۔

ہلاس: اچھا اب ہم تم کو اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں گے۔

بدھ سنگھ: مگر وہ کیوں پکارتا تھا۔ اس کا پتہ لگاؤ گے یا نہیں۔ یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ پھر ایک آواز آئی (یارو ذرا ادھر آؤ)۔

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو ایسے اذیت کوش ہوئے

جاں پڑی جب بارِ شکم تھے مرے وبالِ دوش ہوئے

بدھ سنگھ: ارے تو کس طرف بولتا ہے آواز آنے پر تو نہیں نظر آتا۔

آواز: بائیں ہاتھ چلے آؤ۔ دیر نہ ہو۔ اب میں مرا اور اب مرا۔

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد

مرغِ تنم از قفس شب آہنگی کرد

آن سینہ کہ عالمے درو میگنجد

تا نیم نفس بر آدرم تنگی کرد

ہلاس نے کہا بدھ سنگھ تم ان کے پاس بیٹھے رہو، ہم جا کے اس بیچارے جان بلب کو دیکھیں کہ اس کا کیا حال ہے اور وہ کون ہے۔ یہ کہہ کر ہلاس اس طرف گیا، تو دیکھا کہ ایک پیر مرد گھانس پر پڑا سسک رہا ہے۔ ہلاس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ بابا مجھ درویش کو ذرا سا پانی پلاؤ۔ بس پانی پی کر میں اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا۔ کسی کو اپنا منہ نہ دکھاؤں گا۔ ہلاس نے پانی پلایا۔ اس مرد جان بلب نے پانی پی کر کہا۔ بابا خدا تمھیں اجر دے اور مدارجِ اعلیٰ پر پہنچائے۔ اس کے عوض تمھیں کچھ دوں۔ خیر اگر دو گھنٹے تک حیات باقی ہے تو اپنا کل حال تم سے بیان کر دوں گا۔ اور انشاء اللہ تمھیں کچھ دوں گا بھی۔

ہلاس: آپ کے پاس کچھ جمع جتھا ہو تو ہم کو بتا دیجیے۔

راوی: سُوجھی خوب۔ بڈھے کو راہ پر لانے لگے۔

پیر مرد: کہا نہ کہ دو گھنٹے تک بھی اگر حیات باقی ہے تو سب باتیں بتا دوں گا۔ مَیں سپاہی آدمی ہوں۔ لڑکپن سے سپہ گری میرا پیشہ ہے۔ بارہ برس کے سن سے فنِ سپہ گری میں طاق ہوں۔

ہُلاس: آپ نے تو ایک قصّہ کا حصّہ چھیڑ دیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ مبادا جان نکل جائے تو پھر وہ روپیہ وہیں کا وہیں رہے۔

ثُریّا بیگم: اُفّوہ۔ خدا خدا کر مرد آدمی۔ ایک شخص کی جان جاتی ہے۔ اور تو اس طرح بے جھجک باتیں کرتا ہے۔ توبہ توبہ، یہ کیا ڈھٹائی ہے۔

پیر مرد: (آہ سرد بھر کر)۔

سمارہ و قلندر سردار بمن نُمائی	کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی
بہ سکندر و سلیمان بہ براے صبا پیامی	بشماست ملک و دولت من و ملک بینوائی
بہ طوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند	کہ برون درچہ کردی کہ درون خانہ آئی
بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد	کہ مرا خراب کردی تو ز سجدہ ریائی
بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم	چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم دغائی

در دیر چوں زدم من ز درون ندا برآمد
کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگانِ مائی

بُدھ سنگھ اور آدمی چپ چاپ سُنا کیے۔ مگر ہلاس کو اس غزل میں کسی قدر لطف آیا۔ یہ فارسی سے کسی قدر واقف تھے۔ پیر مرد نے پھر ٹھنڈی سانس لے کر۔

از داغِ مہجوری تو بر دل نشانی ماندہ بود
ہمچوں مہِ نو دمیدم از مہر افزوں کردمش

ہُلاس: ابا جان۔ تم کو گانے کی سوجھتی ہے، اور ہمارا دم نکلتا ہے۔

ثُریّا بیگم: ہائے افسوس خدا سے دُور جائے مُردہ دوزخ میں جائے۔ چاہے بہشت میں ان کو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہے۔

ہُلاس: بڑے میاں بڑے دھوم دھام سے تمہارا تیجہ کریں گے۔ روپیہ بتا دو۔

بُدھ سنگھ: پانی اور پلوا دو اس کو تو پھر کھوب (خوب) ٹھنڈک ہو کر بتائے گا۔

پیر مرد: میرا ایک لڑکا ہے۔ دُنیا میں اور کوئی عزیز نہیں۔ بس صرف ایک لڑکا جوان خوبصورت

تربیت یافتہ ۔گھوڑے پر ایسا سوار ہوتا تھا کہ باید و شاید۔
ثریا بیگم : پھر اب کہاں ہیں وہ ۔کیا کہیں بھاگ کے چلے گئے تھے
پیر مرد : فوج میں نوکر تھا۔ بس کسی بیگم پر عاشق ہوا جیسے پتہ ہی نہیں۔

از داغِ مہجوری تو بر دل نشانی مانده بود
ہمچون مہِ تو دمیدم از مہرا فزون کردمش

ہائے اگر اتنا معلوم ہو جائے کہ اس کی جان نکل گئی ہے تو قبر بنوا دوں ۔ اس مقبرۂ انور پر یہ شعر کندہ کر دوں۔

اے خاکِ تیرہ خاطرِ مہمان نگاہ دار
کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتۂ

ثریا بیگم : کشیدہ قامت آدمی یا ٹھنگنے۔
پیر مرد : کشیدہ قامت، دراز گردن کشادہ پیشانی۔ تیکھی چتون سپاہی آدمی ہے۔
ثریا بیگم : ہائے ہائے کیا بتاؤں، بڑے میاں کہ وہ کہاں ہیں برسوں ساتھ رہا ہے۔
پیر مرد : کیا! کس کا ساتھ رہا ہے۔ تمہارا کچھ حال تو بتاؤ۔
ہُلّاس : شہسوار بھی ہیں۔ بس اب میں سمجھ گیا۔ (ثریا بیگم سے چٹکی لے کر) کچھ معلوم نہیں کہ اب کہاں ہیں۔ مگر پرسوں تک ملاقات ہوئی تھی۔
ثریا بیگم : ہنس مکھ آدمی ہیں۔ میرے ساتھ نکاح ہونے کو تھا۔
پیر مرد : بیٹا ذری ہمارے پاس آجاؤ۔ اِدھر آن کے بیٹھو۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

ثریا بیگم : مجھے اس وقت خدا کی خدائی یاد آئی۔
پیر مرد : اور مجھے مجسم نظر آئی ہے۔

اے بر تراز خیال و قیاس و گمان و وہم

ثریا بیگم نے پیر مرد سے یہ نہیں کہا کہ ان کے لڑکے نے شہزادے کو مار ڈالا تھا، اور اب پھانسی پانے والے ہیں۔ لیکن اس بوڑھے کو دیکھ کر کمال رنج ہوا۔
ثریا بیگم : اب دل کو کسی قدر ڈھارس ہوتی ہے۔
پیر مرد : میرے دِل کا حال نہ پوچھو۔

دارم دلے آیا چہ دل صد گونہ حرمان در بغل
چشمے و خون در آستیں اشکے طوفاں در بغل

ثریا بیگم: اس میں کیا شک ہے۔ جوان بیٹا اور بوڑھے باپ کو چھوڑ کر چل بسے۔ ع
دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ

جوان بیٹے سے جدائی ہونا ستم ہے مگر
منیش برس تو از گردشِ ایّام کہ صبر
گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

پیر مرد: مجھے فقط اس قدر معلوم ہو جائے کہ زندہ تو ہے۔

ثریا بیگم: ہاں اس قدر تو میں کہہ سکتی ہوں کہ زندہ ہیں۔

پیر مرد: عین جوانی کا عالم ہے۔ شباب پھٹا پڑتا ہے۔ اب میرا دل مجھ سے بیزار ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں تک میرے دشمن ہو گئے۔

از پنجہ من چاکِ گریباں گلہ دارد — وز گریۂ من گوشہ داماں گلہ دارد
دامانِ نگہ تنگ و گُلِ حُسن تو بسیار — گلچیں بہارِ توز داماں گلہ دارد
لب خشک فتادیم دریں بادیہ کانجا — از خشک لبی چشمہ حیواں گلہ دارد
گُل در چمن و نافہ بچین مشک بہ تاتار — از نکہت آں زلفِ پریشاں گلہ دارد
از بسکہ بزندانِ غمت دیر بماندیم — زنجیر بہ تنگ آمد و زنداں گلہ دارد
گہ بت شکنم گاہ بہ مسجد زنم آتش — از مذہب من گیر و مسلماں گلہ دارد

گہ خندہ و گہ گریہ و گہ آہِ جگر سوز
اے معربی از وضع تو جاناں گلہ دادر

تم سے نکاح کا اقرار ہوا تھا۔ پھر شادی ہوئی تھی۔

ثریا بیگم: نہیں۔ پھر کچھ اور باتیں ایسی ہو گئیں، کہ شادی نہ ہونے پائی۔

پیر مرد: اب وہ ہے کہاں۔ ہائے ذرا دیکھ لیتا، یا خدا مجھے اس قدر زندگی دے کہ میں اپنے پیارے لڑکے کو دیکھ لوں۔

اے خدا قربان احسانت شوم
ایں چہ احسان است قربانت شوم

اللہ بس باقی ہوس۔

ہلاس: آپ کا سر دبادوں۔ تلوے ملوں۔ جو خدمت کہیے بجالاؤں۔

پیر مرد: (مسکرا کر) نہیں۔ سر دبانے سے موت کا علاج نہیں ہو سکتا۔

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب

درد مندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

ہمارا علاج اب خدا کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس ہے۔

مریض وہ ہوں جو درماں سے بے نصیب آیا

اجل ہنسی مری بالیں پہ جب طبیب آیا

اب میری کشتی جمعیتِ دل غرق لجۂ فنا ہوتی ہے اگر باد شرطہ چلی تو سبحان اللہ۔ کیا پوچھنا ہے ورنہ خیر مجبوری تو ہے ہی خدا کی مدد درکار ہے۔

ناخدا در کشتی من گر نباشد گو مباش

ناخدا داریم مارا ناخدا درکار نیست

اس وقت ثریا بیگم نے خیال کیا کہ یہ لاکھ سر پٹکے ممکن نہیں کہ اپنے پیارے بیٹے سے مل سکے۔ اب دیدار نصیب ہونا محال ہے۔ دو چار دس پانچ روز میں قتل کیا جائے گا۔

شاد باش اے دل کہ فردا بر سر بازار حشر

مژدۂ قتل است گرچہ وعدۂ دیدار نیست

۱۔ پیر مرد کو ناظرین یاد رکھیں۔ کیونکہ اس سے ایک ایسا کام سر ہو گا جو آخری حصہ ناول میں ناظرین پر اثر ڈالے گا۔

پیر مرد نے بکمال حسرت کہا کہ یا خدا میں اپنے بیٹے کے کام آؤں۔ آخر جان تو جانی ہے اگر ذرا بھی قوت ہو تو اس کے دشمن کو قتل کر ڈالوں بلا سے پھانسی پا جاؤں گا اور کیا ہو گا۔ اس عمر میں آج تک کسی سے عداوت یا فساد یا عناد یا دشمنی نہیں ہوئی۔

ما در دو جہاں غیر خدا یار نداریم — جز یادِ خدا باد گراں کار نداریم

با صاحب ولائیم بکس کار نداریم — ہر خلق بما دشمن و ما خار نداریم

ما شاخ درختیم پر از میوۂ توحید — ہر رہگذرے سنگِ زند عار نداریم

ما مست الستیم ز میخانۂ محبوب — پروائے سر و جبہ و دستار نداریم

مامستِ شرابیم وکبابیم و رُبابیم   پروائے مَے وخانہ، خمّار نداریم

ماطوطیِ فقریم چشیدیم شکر را

چون زاغ سیہ میل بمردار نداریم

اللہ بس باقی ہوس۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔

پیر مرد نے کہا، مَیں نے اپنے لڑکے کو جنگ کے فن خوب سکھائے تھے۔ ایک مرتبہ جھیلم کے کنارے پر لشکر کا پڑاؤ تھا۔ انور علی خاں نے کہا، ابا گھوڑا دریا میں ڈال دو۔ یا مجھ کو جانے دو۔ اسی دن مَیں سمجھا کہ یہ لڑکا بڑا جری ہوگا۔ خیر جب صبح ہوئی، دریا پار گئے تو دونوں فوجیں صف باندھ کر مقابلے میں کھڑی ہوئیں۔ اور جنگ شروع ہوئی۔

ہُلاس: لڑائی کے وقت سپاہیوں کے دِلوں پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ ہم تو جب ڈاکہ مارنے جاتے ہیں، اور کوئی مقابلہ کرتا ہے۔ ہم کو ذرا خوف نہیں آتا۔

پیر مرد: سپاہی کو جنگ کے میدان میں خوف کیسا۔ خوف سے واسطہ کیا ہے۔

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشت من

آن منم کاندر میان خاک و خون بینی سری

یہ کہتا ہوا سپاہی آگے بڑھتا ہے۔ انور علی خاں جہاں رہے گا کسی سے دب کے نہیں رہے گا اور جو دب کے رہے وہ پٹھان نہیں۔

ثریّا بیگم: انور علی خاں نام ہے۔ یہاں سب شہسوار کہتے ہیں۔

پیر مرد: یہ نام اس کی ماں نے بڑی چاہ سے رکھا ہے۔ یا خدا کیوں کر دیکھوں۔

ثریّا بیگم: (اپنے دل میں) اور یہ خبر ہی نہیں، کہ دیکھنا نہ دیکھنا مساوی ہے۔

پیر مرد: اگر حیات مستعار باقی ہے تو خیر ورنہ جہاں رہے اچھا رہے۔ یا خدا اگر اس کا دیدار نصیب میں ہو تو زندگی دے، ورنہ اس کے بغیر زندگی فضول ہے۔

بے یار دِلاور قفسِ سینہ چرائی

یلبایداز یں غم کدہ آہے شدو برخاست

اے تیر غمت در دل عشاق نشانہ   خلقے بتو مشغول وتو غائب نمیانہ

ہر کس بزبانے صفت حمد تو گوید   عاشق بسرود غم و مطرب بترانہ

حاجی برہ کعبۂ و من طالب دیدار — او خانہ ہمی جو یدو من صاحب خانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد — یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ
چوں در ہمہ جا عکس رخ یار توان دید
ویرانہ نیم من کہ روم خانہ بخانہ

ایک لڑائی میں انور علی خاں نے بڑا کارنمایاں کیا تھا۔ بارہ سواروں سے اس اکیلے نے یکہ و تنہا مقابلہ کیا کہ سات زخمی ہوئے۔ ایک کو جان سے مارا۔ آخر کار ایک گولی پڑی جو ہڈی کو توڑ کر باہر نکل گئی۔

ثریا بیگم: ہاں۔ ہاں اس کا نشان ابھی تک ہے۔

پیر مرد: تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ اب ہے کہاں۔ اور خوش تو ہے۔

ثریا بیگم: اب تم کو ذرا تسکین ہو تو کل حال صاف صاف بتاؤں۔

پیر مرد: اتنا بتاؤ کہ زندہ ہے یا مر گیا۔

ثریا بیگم: زندہ ہیں' اور خوش ہیں۔ یہاں سے دور نہیں ہیں۔ پاس ہیں۔

ہلاس: بڑے میاں ہم تم کو کل ہی ان کے پاس لے چلیں گے مگر ہمیں اتنا بتا دو کہ تمہارا مال اور اسباب کہاں رکھا ہے۔

پیر مرد: ہر ایک کے ساتھ خلق اور مروت سے پیش آتا تھا۔

مخلص می باشِ حق گزاری ایں است
نیکی می در خیر جاری ایں است
جز حق مپرست و بر کسے بد مپسند
تفسیرِ کلامِ رستگاری ایں است

ثریا بیگم: اب کچھ کچھ تسکین ہے' یا خدانخواستہ وہی حال بھی ہے۔

پیر مرد: اس وقت انور علی خاں کی صحت کا حال سن کر میں اپنے کرب اور تکلیف کو بالکل بھول گیا۔ خیال بھی نہیں کہ تکلیف ہوئی تھی یا نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اپنے بچنے کی ذرا بھی امید نہ تھی۔ مگر خدا نے بچا لیا۔ وہی سبب الاسباب ہے۔ مگر تمنائے زیست ہے' تو اس امید پر کہ اپنے لختِ جگر کو ایک بار نظر بھر کے دیکھ لوں۔ ورنہ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ آنکھیں بند کر لیں۔

درموسم پیری کہ سفر در وطن است — ہر روز خواب کاہش جان و تن است
زیں پیش بصد رنگ سخن میگفتم — اکنوں اے درد در خموشی سخن است

بس اب تو وہ زمانہ ہے کہ خاموش ہو جاؤں اور زبان سے کچھ بھی نہ نکالوں۔

دیدہ ام، در علم صحبت ہائے رنگیں صد کتاب
کردہ ام یک نکتہ تنہا نشینی انتخاب

اُف ہائے ستم۔ وائے ستم۔ خدا جانے اس وقت کیا کیا یاد آیا۔

یاراں موافق زکجا جمع شوند
ویں عمر گزشتہ از کجا باز آید

ثُریّا بیگم نے کہا، اب اپنے لڑکے کا حال ہم سے سُنیئے۔ اس شہر کے ایک شہزادے ہیں، ہمایوں فر، پیر مرد ہمایوں فر سے واقف تھے۔ کہا ہاں میں خوب جانتا ہوں۔ مجھ سے ملاقات بھی ہے۔ مرزا ہمایوں فر بہادر سے کون واقف نہیں۔

ثُریّا بیگم: اس کو آپ کے صاحبزادے نے چُھری بھونک دی۔

پیر مرد: ارے۔ آہ آہ۔ ہے ہے!

ثُریّا بیگم: اور کس حالت میں یہ تو سُنو۔ ہمایوں فر کی برات جاتی تھی۔ عین اسی حالت میں چھپٹ کر چُھری بھونک دی۔

پیر مرد کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ کہا ہائے ستم۔ بعد مدت خبر بھی معلوم ہوئی تو ایسی یہ کیا سوجھی۔ مراد کی چھاؤنی میں بھی ایسی ہی غلطی اور حماقت کی تھی مگر وہاں میں تھا۔ بات دَب گئی۔ اس کو کتنے روز ہوئے ہوں گے۔ ثُریّا بیگم نے لاعلمی ظاہر کی اور صاف صاف بیان کر دیا۔ کہ ایک مسافر کی زبانی میں نے سُنا تھا۔

پیر مرد: شاید غلط ہو۔ مگر کسی سے اس قدر دریافت کر دو کہ پھانسی کا حکم تو نہیں ہوا۔ ابھی مقدمہ ہوتا ہے، یا حکم ہو گیا ہے۔

ثُریّا بیگم: یہ حال تو نہیں معلوم۔

بُدھ سنگھ نے کہا ہم سے سُنو۔ چُھری مار کر بھاگ گیا۔ کہیں پتہ نہ ملا۔ ڈھونڈھا، اِدھر ڈھونڈا اُدھر۔ مِلا کہیں نہیں تھا۔ جب اس بیراگی سے کہا کہ بول بتا۔ تب اس نے کہا پانی کے اندر جا، سب لوگ مِل کے دریا گئے۔ وہاں ایک آدمی نے پہچانا۔ اُس نے گوتا (غوطہ) مارا۔ جب نکسا (نکلا) تو کنارے کے نگیچ (نزدیک) ایک سپئیں کو تھپڑ مارا۔ اور اسی کے گھوڑے پر جو ننگی پیٹھ تھا سوار ہو کر دوڑایا۔

پیر مرد: شاباش۔ شاباش۔ انور علی خاں شاباش بیٹا۔

ثُریا بیگم: خوش ہوگئے کہ شہسواری میں لڑکا طاق نکلا۔

پیر مرد: برسوں فقط شہسواری کی کثرت سکھائی ہے۔ اب وہ چوکنے والا تھوڑا ہی ہے۔ مگر گرفتار کیوں کر ہوا۔ یہ کیا ہوا۔

بُدھ سنگھ: بس ننگی پیٹھ گھوڑے پر سوار ہو کر دوڑایا تو کوئی کو پتہ نہ ملا اور گھوڑا ہوا بنا ہوا گیا یہ جا وہ جا۔

پیر مرد: آفریں۔ بڑا زبردست شہسوار ہوگا۔

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا
پہنچے کب اس کو ہاتھ ہمارے غبار کا

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی شخص نے ہُلاس کی مشکیں کس ہیں۔ اور بدھ سنگھ بھی بندھ گئے۔ پچاس آدمیوں نے چو طرفہ سے گھیر لیا تھا۔

ہُلاس: آخر بھئی یہ کیا اندھیر ہے۔ ارے یارو تم کون ہو۔

انسپکٹر: ہم۔ ہم چوروں کے بیخ کن۔ ڈاکوؤں کے دشمن۔

ہُلاس: تم کو کسی کا دھوکا ہوا ہے۔ ہم تو ذاکرِ حسین ہیں۔ مرثیہ خوان۔

انسپکٹر: چُپ سور۔ اچھا اگر مسلمان ہو تو پانی پیو۔ لے پی پانی۔

سُن اے اے کافر بدکیش ذرا دھیان کی بات
جھوٹ کہتے نہیں ہم کہتے ہیں ایمان کی بات

اگر ذرا کھسکے تو ہم نے قتل کر ڈالا۔

ہُلاس: واہ رے نصیب والے قسمت۔ یارو سچ کہتا ہوں دھوکا ہوا۔

پیری سے بدن زار ہوا زاری کر دُنیا سے انیس اب تو بیزاری کر
کہتے ہیں زبانِ حال سے موئے سفید
ہے صبح اجل کوچ کی تیاری کر

اُس ملک سے دُنیا کی ہوس میں آئے اب جائیں کہاں اجل کے بس میں آئے
مر کر نکلے تو کنج مرقد پایا
جب دام سے چھوٹے تو قفس میں آئے

انسپکٹر: کہتے تو ہیں کہ پانی ہمارے ہاتھ کا پی لو۔

اتنے میں بُدھ سنگھ نے رَسی توڑ کر ایک برق انداز کو چھری ماری اور تین اور سپاہیوں کو

زخمی کرکے بھاگا۔ اور بھاگتے ہی جھیل میں دھم سے کودا۔

اِنسپکٹر: کود پڑو۔ کود پڑو تم بھی کود پڑو۔

برق انداز: جائے گا کہاں۔ بھاگ کے جائے گا کہاں، بھاگنے دو، بھاگنے دو۔

ہُلاس: ہم کو تو مرثیہ خوانی سے مطلب ہے۔

آہو ہے حرم ہے چشم مست حیدر
کعبہ ہے دلِ خدا پرست حیدر
سینہ ہے تو مخزن علام نبوی
ابر کرم خدائے دست حیدر

شہزادی کی آرزو بر آئی اور آزاد نے چاند سی دُلہن پائی

معشوقہ خورشید لقا ماہ سیما یعنی شہزادی آتشیں لب، رنگین ادا کبھی آئینہ بے زنگار و گوہر نگار میں اپنے گلِ رخسار کا نظارہ کرکے اتراتی تھی۔ کبھی آزاد فرخ نہاد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر خوش صفیرانِ چمن کو جوبن دکھاتی تھی حُسنِ گلوسوز و نُورِ رُخِ عالم افروز سے آنکھ جھپکی جاتی تھی۔ ہر در و دیوار، اور ہر برگ و بار، بے طلسمات کی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ سعدی شیرازی کی روح اس طلسم کے سماں کو ایک نظر دیکھ پاتی تو بے اختیار یہی شعر زبان پر لاتی۔

بدیں کمال ندارند حُسن لور کشمیر
چنیں بلیغ ندارند سحر در بابل

ابر سیہ قبلہ کی طرف سے جھومتا ہوا اُٹھا گھٹا نے اور بھی عشرت بڑھائی۔ رندوں میں دھوم مچ گئی کہ وہ کالی کالی بدلی جھپکتی ہوئی نظر آئی۔ بادہ کشوں کی چاندی ہے۔

امسال خوش، بہار لیست اے باغباں مُبارک
ابر سیاہ پستاں بر بوستاں مُبارک

وہ دختِ آئینہ رُخسار، وخوش کنار، دلکشا اور فرحت انتمار وشوں میں نازِ معشوقانہ اور اندازِ دلربایانہ

کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی۔ جھوم جھوم کر طاؤس رنگین پر و بال کی طرح قدم دھرتی تھی۔ ادھر ابر مشکیں پرند، گوہر افشاں ہوا۔ اُدھر آزاد کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر وردِ زبان ہوا۔

لگی ہے مینھ کی جھڑی باغ میں چلو جھولیں
کہ جھولنے کا مزہ بھی اسی بہار میں ہے

اس وقت کا لطف قابلِ دید تھا۔ بلکہ دید تھا نہ شنید تھا۔ دامن کوہ، فلک شکوہ میں آہوانِ مینا سم باد رفتار۔ کمرِ کوہ میں سبزہ زار و رودبار اور قلّہ کوہ پر ناظورۂ یوسف جمال، گل زار، شوخ و عیار، طرحدار چاروں طرف اشجار رفیع و پر بہار اور ان کی ہری بھری شاخوں میں نشیمنِ مرغانِ چمن زار۔ کہیں مُوریلوں کی جھنکار ہے۔ کہیں پپیہوں کی پکار ہے۔ آلہی یہ چشمہ سار میں رخِ انور کے عکس کا ظہور ہے۔ یا ورقِ آفتاب پر سورۂ نور ہے۔ جامِ شرابِ ناب ہاتھ سے چھپکے دیتے تھے، اب دیکھیں ان کی پارسائی۔ قلقلِ مینا کی آواز کان میں آئی۔ زُہد و تقویٰ سلام و علیک کہہ کر سدھارے اور رندی نے صدا بلند کی کہ وہ ہارے۔

چھلکتے جام رہیں میکدہ رہے آباد
قسم غدیر کی دے ساقیا شراب مجھے

شہزادی نے مسکرا کر کہا۔ کہو پارسائی کی اب بھی لوگے۔ یا ان گورے گورے ہاتھوں سے ہمیں بادہ احمر راحِ رُوح کیمیائے فتوح کا ایک جام دوگے۔ آزاد نے ہاتھ چُوم کر کہا ذرا غور کر لوں۔ دوں یا نہ دوں۔ خود بھی آبِ آتش لباس پیوں یا نہ پیوں۔

شرکتِ زمرۂ میخوار کنم یا نکنم
نو بہار است من ایں کار کنم یا نکنم
لذتِ لغزشِ مستانہ زجا می بُردم
رغبتِ خانۂ خمار کنم یا نکنم
ساقی بزم کنوں ساغرِ مے میدہدم
مصلحت چیست من انکار کنم یا نکنم

آزاد اس فکر میں تھے کہ شراب رُوح افزا سے انکار کریں، یا نہ کریں۔ خوجی نے بڑھ کر کہا۔ یار چے واللہ نرے مولوی آدمی ہو۔ ارے دُشمنِ عقل اس آتش دم معشوق کے ہاتھ سے شراب پینا بھی حرام ہے۔ سُبحان سُبحان اللہ۔ آئینہ طلعت ہے۔ جادو جمال ہو۔ آخر بہشت میں حُور اور جام و سرور کے سوا اور کیا ہے۔

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

آزاد نے اُس پری چہرہ، خوش مژہ کے دوشِ صفا کوش پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

ساقی قدحے حوالتم کن
بے تاب فتادہ در خمارم
باز ہدو ورع چہ کار ساقی
رندم مستم شراب خوارم

شہزادی نے اپنے دستِ حنائی سے سونے کے جام میں بادہ لنڈھا کر کہا۔ نوش جان۔ آزاد نے۔

مئ خوردن وخوش زیستن و توبہ شکستن
ایں تنہا ہمہ در مذہب رندانہ ضرور است

کہہ کر نوش جان کیا، اور مسکرا کر کہا۔ ع

اِک جام دے کے بے خبر دوجہاں کیا

اب ہر سمت سے نغمہ و سرود کی صدا بلند ہوئی۔ اور عیش و عشرت دوچند ہوئی۔

قُلقُلِ شیشہ بلبل کی صدا سے پیدا
نشہ ہوتا ہے گلستاں کی ہوا سے پیدا

اس کے بعد آزاد نے اس مہ لقا کو اپنے ہاتھ سے شراب رُوح پرور پلائی تو ایک سمت سے رونے کی آواز آئی۔ حیرت تھی کہ یا للعجب یہ کیا اسرار ہے۔ یہ وقتِ طرب، ہنگامہ عشرت انبساط ہے۔ گریہ و بکا کی صدا کدھر سے آئی۔ کس دل جلے نے چوٹ کھائی کہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ تمام کہسار میں آواز گونج گئی۔ خدا جانے کون چوٹ کھایا ہوا ہے۔

یہ کون پھوٹ کے رویا کہ درد کی آواز
رچی ہوئی جو بہاروں کی آبشار میں ہے

ایک پیش خدمت قمر طلعت نے آن کر کہا۔ حضور وہ جوانِ رعنا ہے جو صبح کو حاضر ہو کر، حد خدمت بجا لاتا ہے۔ آزاد پاشا کو معلوم ہوا کہ ان کا رقیب ہے۔ ان کو اس بے تکلفی سے معشوقہ زہرہ تمثال کے ساتھ مے کشی کرتے ہوئے دیکھا۔ تو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ آزاد نے کہا۔ اب تک اتنی سختیاں جھیلیں مگر اب اس قدر برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

سختی عشق جھیل لی اے دل
واہ اے بُرد بار کیا کہنا
جوشِ اُلفت ہیں اور ضبط اے دل
جبر پر اختیار کیا کہنا

اب سُنیئے کہ اُس رغید ملائک نظر فریب، طاؤس زیب، نے خدام بادب کو حکم دیا کہ معاً اعلیٰ سے اعلیٰ سامان بہم پہنچاؤ۔ اور ایوانِ ہما آشیان کو نمونۂ باغِ نعیم بناؤ۔ ہوشیار خادموں، اور سلیقہ شعار پیش خدمتوں اور خواصوں نے اہتمام بلیغ کیا۔ اشارے کی دیر تھی۔ کل سامان شادی موجود ہو گیا۔ روشوں میں گلاب کا چھڑکاؤ۔ کیاریاں کیوڑے سے سینچی ہوئی، دوب گویا دودھ کی دھوئی تھی۔ درختوں کی پرمیوہ شاخیں جھکی پڑتی تھیں۔ ہری بھری ڈالیں بُردبار آدمیوں کی طرح فرطِ حلم سے زمین دوز ہو کر، عروسِ بہار کو مجرا عرض کرتی تھیں۔ زمردی پتے خلعہ پوشانِ بہشت کی یاد دلاتے تھے۔ سامنے دو سو فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اور ہر فوارے سے نغمہ کی صدا آتی تھی۔ وسطِ کمرے میں ہر سمت طوطی نما اور خوش جلا آئینے لگے تھے۔ صدر میں چتر آسمان پایہ آفتاب سایہ اور اُس کے نیچے تختِ مرصع فلک قدر و گرانمایہ۔

خوجی: سُنیئے حضور۔ آپ اس ملک کی شہزادی ہیں۔ شادی ہو تو ہمارے ملک کی رسوم کے بموجب۔ تزک اور احتشام اور جاہ و تجمل کے ساتھ برات ہو۔ روشن چوکی ہو۔ خیزران دم گھوڑے ہوں۔ مست ہاتھی ہوں۔ انگریزی باجا بجے اور برات ٹھاٹ سے سجے۔ ورنہ بندہ شریکِ صحبت نہ ہو گا۔

شہزادی: مسکرا کر۔ برات کیسی۔ ہمارے ہاں تو ہاتھی واتھی کا شادی میں کوئی کام نہیں، ہاتھی یہاں آئے کہاں سے یہ تو بڑا جھگڑا لو ہے۔ کوئی بات بکھیڑے سے خالی نہیں۔ ہاتھی ہوں اور گھوڑے ہوں۔ بہت جلد پاگل خانے جائے گا۔

خوجی: یہاں انگریزی باجا کس حساب سے آتا ہے تاشے والوں کی برادری کو کیا دینا پڑتا ہے۔ بھلا غوثی شہنائی نواز کے پوتوں میں سے کوئی ہے۔ اُس کو ضرور بلوائیں گے۔ برات ہم سجائیں گے۔ مگر آرائش والے کو تو بلواؤ۔ چند و بازوں کا تخت ضرور ہو۔ دس بارہ دُبلے پتلے آدمی۔ تخت واڑگوں کی طرح اوندھے پڑے چانڈ واڑا رہے ہوں۔ کوئی ٹھک لیے ہو۔ کوئی چھنٹیا بنا رہا ہو۔ واللہ لطف ہندوستان یاد آ جائے۔

آزاد: کچھ خبط ہے۔ یہ بک کیا رہے ہو۔ واہی تباہی جس کا سر نہ پیر۔

خوجی: اجی وہ تخت ہو کہ باید و شاید اور چنڈو باز ایسے بنے ہوں کہ بالکل انجھی پیتے پیتے جوگا ہو گئے لانا ہاتھ۔

آزاد: اور نشان کا ہاتھی ضرور ہو۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

خوجی: ہاں ہاں ہاتھی گھوڑے سانڈنیاں سب ہی کچھ ہو گا صاحب۔ اور اینجانب اہتمام کر رہے ہوں گے۔ پنشاخے چڑھاؤ۔ نشان کا ہاتھی بڑھاؤ۔ کبھی کسی نوعمر پنشاخے والی سے صرف از راہ مذاق دو گال ہنس لیے۔ کبھی ادھر اُدھر چوک کے کمرے تکتے ہوتے چلے۔ کسی پر پھبتی کہی۔ کسی پر آوازہ کسا۔ مگر اُستاد ایک بڑی خرابی ہے۔ لیکن کچھ پروا نہیں۔ نیلا کنڈا پہن لیں گے یا اسپندہ جلائیں گے۔

آزاد: کیا کیا۔ آدھی بات کہتے ہو آدھی چبا جاتے ہو۔ وہ خرابی کیا ہے۔ ہم بھی تو سنیں اور کالے گنڈے کی کیوں ضرورت ہوئی۔

خوجی: ارے یار ہمارا حسن دشمن جان بلائے جان ہے۔ برات کے ساتھ جائیں گے تو خواہ مخواہ بن ٹھن کے جائیں ہی گے۔ اچھا اب بازار میں انگلیاں اُٹھیں گی کہ وہ جوان جاتا ہے۔ عورتیں آہ سرد بھریں گی کہ ہائے اس کے ساتھ ہماری شادی کیوں نہ ہوئی۔ مگر اسپند کافی ہے۔ ہائے حسن بھی کیا شے ہے حسین کا کیا کہنا۔

آزاد: بھائی جان برات کے دن تم ذرا اپنا مُنہ کالا کر لینا۔

خوجی: دیکھا جائے گا۔ ارے یار وہ مُنہ کالا بھی کر لیں تو کیا۔ یہ جھلک تو قبلہ مرتے وقت تک بھی نہ جائے گی یہ نور کہیں چھپائے چھپتا ہے۔

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

حضرت آج دُلہن پر وہ نکھار ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے مگر یار سیس پھول اور چھپکا نہیں ہے۔ چاہے اور کوئی زیور ہو چاہے نہ ہو۔ ہاتھوں میں کڑے اور پچھیاں اور کانوں میں جوش ضرور ہوں۔

آزاد: اس بے تکے پن کے صدقے۔ کانوں میں جوش! معقول اور پاؤں میں کرن پھول ہوں کیوں حضرت پھر ناک کیوں خالی رہے۔ ناک میں چھڑے پہنا دیجیے۔ اور کمر میں ہیکل۔

خوجی: (مسکرا کر) ارے میاں ہاں خوب یاد آیا۔ یار طائفے نہیں آئے۔ دور دور سے طائفے منگواؤ۔

یہ تمہارا کام ہے۔ یہ اُن کے تعلق نہیں ہے۔ لڑکی والوں کو اس جھگڑے سے کیا واسطہ۔ بلواؤ کوئی پرپھیم۔ برق دم بھیرویں کا لطف آئے ہم کو تو حیدر کا گانا بہت پسند ہے۔ بلواؤ۔ قسم خدا کی بلواؤ۔ اگر ہمت کرو تو پٹنہ یہاں سے دور نہیں ہے۔ کسی کو لکھنؤ میں لکھ بھیجو۔ بندھی چلی آئیں واللہ۔

شہزادی نے آزاد کی زبانی ہندوستان کی براتوں کی دھوم دھام اور کروفر و احتشام کا حال سُنا تو دل میں ٹھن گئی۔ کہ اسی دھوم سے آزاد کی برات نکلے۔ سامان تو کہاں مہیا ہوتا۔ شہنائی والے کہاں سے آتے آرائش کے تخت کہاں۔ ہوادار اور تامدان کجا۔ ہاتھی کا پتا کہاں۔ مگر آتش بازی اور بھیڑ اور باجے کا خوب انتظام ہوا۔ دو گھڑی دن رہے برات سجی گئی۔ دس ہزار روپیہ کے سمندِ فلک سیر پر آزاد سوار ہوئے۔ نقیبوں نے آواز دی۔ شہزادی پریزاد بچاس ہزار کی ایک فٹن پر سوار ہوئیں۔ سر پر چترِ زرفشاں اور خوبصورت خوبصورت خواصیں مروحہ جنباں۔ آزاد پر غضب کا جوبن تھا۔ بلا کا پھبن تھا۔ خوجی نے شہزادی سے کہا۔ حضور کو برات کے ساتھ ساتھ چلنا زیبا نہیں ہے۔ اگر برات دیکھنے کا شوق ہے تو جھروکے سے دیکھیے۔ غضب خدا کا ابھی تک نکاح ہی نہیں ہوا اور دُلہن بن ٹھن کے دولہا کے ساتھ ہوئی۔ جب کل تڑکا ہوگا تو فنس میں سوار ہو جیے گا۔ چھٹکا پڑا ہوگا۔ اِدھر اُدھر بانکی ترچھی نکیلی مہریاں فنس کا کونا دبائے ساتھ ساتھ جاتی ہوں گی اور اندر حضور جھمکڑے کے ساتھ ہوں گی۔ شہزادی نے فٹن روک لی اور کہا جب چکر کھا کے برات آئے گی تو ہم دیکھ لیں گے۔ دس دس بارہ بارہ کوس سے لوگ دوڑ کر آئے کہ برات کے رنگ ڈھنگ دیکھیں۔ کلُ جدید لذیذ۔ برات کے نام سے کبھی وہ لوگ کا ہے کو واقف تھے۔ ہر سمت خوشی کے شادیانے بجتے تھے۔

ایک: کیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ رسم تو یہاں بھی جاری ہونی چاہیئے۔

دوسرا: ضرور ہم بھی اپنی شادی میں ایسا ہی جلوس سجائیں گے۔

تیسرا: دو چار روز تک یہی چہل پہل رہے تو بہت خوب بات ہے۔

راوی: خدا ہی خیر کرے۔ اس رسم سے ہندیوں نے پناہ مانگی ہے۔

الغرض برات چکر کھاتی ہوئی اس مقام پر آئی جہاں شہزادی فٹن پر سوار جلوس کی کیفیت مشاہدہ کر رہی تھی۔ دیکھا کہ آزاد ختلی ضیغم شکار چمکاتے اور پچاس ساٹھ سوار افراس عقاب طلعت اُڑاتے چلے آتے ہیں۔ ہمراہی نشان کھولے ہوئے۔ تلواریں تولے ہوئے جاتے ہیں۔ گھوڑوں کی سبک روی سے بادِ بہاری خجل تھی۔ آزاد پر اُس پری کی نظر پڑی تو ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔

رخسار ہیں وہ گل جنہیں خوفِ خزاں نہیں

ٹکڑے ہیں لعل کے لب شیریں بیاں نہیں

ہے ماہیِ محیطِ فصاحت زباں نہیں

یہ فرط ناز کی ہے کہ گویا دہاں نہیں

باتوں میں بند ہیں فصحا کائنات کے

صدقے ہیں بات بات پہ کوزے نبات کے

شہزادی اپنے ایوانِ فلک توامان کے جھروکے سے برات دیکھنے لگی۔ برات پھر چکّر کھا کر محل کے قریب آئی۔ خوجی نے غل مچا کر کہا۔ باجا زور زور بجاؤ۔ کمانیں کڑکتی ہوں۔ نیزے لچکتے ہوں۔ پینچوں کو کل پر چڑھاؤ۔ تیر چلّے میں رکھ کر قدم بڑھاؤ۔ شیرانِ شیر اور دلیرانِ دلیر کی سواری مثل بادِ بہاری آن پہنچی۔ بندوقیں سر کرو۔ دائیں۔ دائیں۔ پچاس بندوقیں دناد ن سر کی گئیں۔ آزاد کا اشہب جو شخرام اس وقت نوجوانوں کے مزاج کی طرح بل کر رہا تھا۔

جرأت میں رشکِ شیر تو ہیکل میں پیل تن

پھرتی کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابرِ قطرہ زن

بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمین پہ فلک پر سحاب تھا

دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

شہزادی یوں ہی مدھ میں بھری تھی۔ بادۂ گلگوں کے نشے نے اور بھی مستی کو دوبالا کر دیا۔

خوجی: ارے یارو ایک چوک گئے۔ دس روپے کی اٹھنی چونی دوانی اور ایک دس روپے کے پیسے بھنا کر خیرات کر دو۔ شہدوں کو بانٹ دو۔

آزاد: کچھ خبطی ہو۔ یہاں شہدے کیسے۔ عقل کے ناخن لو۔ عجب پاگل ہے۔

خوجی: واہ واللہ ہم ضرور تقسیم کریں گے۔ اب اس وقت تو ہمیں اپنا باپ بنایا۔ قسم خدا کی سب سے کہہ آیا کہ میرے صاحبزادے کی شادی ہے۔ ہات تیرے کی۔

اتنے میں ایک فقیر نے کہا۔ خدا کرے حضور کا لڑکا قیامت تک زندہ رہے، اور بہو چین کرے۔

کھیتی ہری بھری رہے۔ گود پھولوں سے بھرے۔ اچھا اچھا ملے گا۔ ٹھہرو تاشے والے کہاں ہیں۔ آزاد نے ڈانٹ بتائی کیا خرافات بکتے ہو۔ تاشے والے کیسے۔ خوجی تیکھے ہوکر بولے۔ بس بس۔ بازی بازی برریش بابا ہم بازی۔

آزاد: اب واہیات نہ بکو۔ تم بڑے بدبخت ہو۔ بیکار۔ دلّو کا دسہرا بنایا یہاں برات نکالنے کا رواج ہے نہ تھا۔ ع

اے بادِ صبا اینہمہ آوردہ تست

خوجی: اجی قبلہ۔ مطلب سعدی دیگرست۔ قبلہ کچھ سمجھے بھی۔

آزاد: سر سمجھے تمہارا۔ خدا تم الّوؤں سے سمجھے۔ اے لعنت خدا۔

خوجی: بھیا مطلب یہ تھا کہ یہاں سب عورتوں کو دیکھ لیں، یہاں برات نکالی۔ چلیے سب کو دیکھ لیا۔ کیوں اُستاد۔ ہاں۔

محل عشرت منزل میں آزاد پاشا دولہا بن کے تختِ مرصع پر چترِ زرفشاں کے سایہ میں بیٹھے۔ بائیں جانب شہزادی بناؤ چناؤ کرکے متمکن ہوئیں۔

خوجی: جوڑی برقرار چاند سورج کی جوڑی برقرار۔

آزاد: معقول! کیا بھیک مانگتے ہو۔ اس وقت ہاتھ خالی نہیں ہے۔

خوجی: تم سے کون مانگتا ہے۔ ہم تو اُن سے مانگتے ہیں۔ ع

زکوۃ حسن دے بوسہ لب لعل شکر خا کا

اُس وقت پرستان کی پریاں اس مہ لقا کی خواصوں میں نوکری کرنا ہزار جان سے پسند کریں۔

آزاد نے کہا جناب خواجہ صاحب اس وقت تو میں طرح دیتا ہوں لیکن آئندہ اگر یہ کلمہ فرمایا تو آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ع

زکوۃ حسن دے بوسہ لب لعل شکر خا کا

اس مصرع کو اگر حضور دُہرائیں تو اسی دم تماشا دکھا دوں۔ آزاد نے کسی قدر غیظ و غضب کے ساتھ کلام کیا تو خوجی نے بات ٹالی۔ بھیا ہم تو تمہارے غلام ہیں۔ برات کے دن دل لگی مذاق کی باتیں ہوتی ہی ہیں۔ کل سے ایسا کلمہ زبان پر آیا تو خدا کی مار شیطان کی پھٹکار۔ آج ایں جانب شل بھی ہوگئے۔ بڑی دوڑ پڑی نہ۔ دوڑتے دوڑتے ہانپ گئے۔ دم پھول گیا مگر شکر خدا کہ محنت ٹھکانے لگی۔

شکرِ خدا کہ از مددِ بختِ کارساز
برحسبِ مدعاست ہمہ کاروبارِ دوست

بیس خواصوں نے شہزادی کے روبرو ناچنا شروع کیا۔ آزاد اُن سب کی ادا اور دلربا چتونوں پر شیدا ہوگئے ان کا بے تکلفی سے تھرکنا اور بھی ستم ڈھاتا تھا۔ خصوصاً گلابی پوش نے تو خرمنِ صبر و قرار پر بجلی گرائی۔ آہو چشم نے آفت ڈھائی۔ چھ کمروں سے باجے چھیڑے گئے۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہیں، اور سروں سے تمام کہسار بس گیا ہے گو خواصیں ایک سے ایک مہ جبین و نازنین اور نوخیز تھیں۔ مگر شہزادی کے مقابل میں کسی کو فروغ نہیں۔ چندے آفتاب چندے مہتاب زنخدان سیبِ سیمیں یا کوئی بلورین۔ اتنے میں وہی ایرانی مع اپنے بھائی اور خدمتگار کے آئے۔ خوجی سے علیک سلیک ہوکر فارسی زبان میں باتیں ہونے لگیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ مرحبا ایرانی نے کہا خوش یافتم۔ حالا بکدام محلہ می نشینی۔ خوجی سمجھے نہیں کہ بکدام محلہ می نشینی کے کیا معنی۔ سمجھے کہ ہمیں بساطی مقرر کیا۔ پوچھتا ہے کہ کرکری خانہ پھیلا کر کس محلے میں بیٹھتے ہو۔ بگڑ کر جواب دیا۔ آغاجی من مردم خراب، ہستم اس وقت طرح ملید ہم مگر وقتِ دیگر ہرگز ندہم آغا۔ آزاد سمجھ گئے کہ خوجی بیہودہ بک رہے ہیں۔ پوچھا کہ حضور کا مزاج اس وقت! بُوا زعفران کی زلفِ مشکین کی طرح درہم و برہم کیوں ہے۔ کہا اس شخص نے ہم سے پوچھا کہ حالا بکدام محلہ می نشینی تو ہم کو کوئی بساطی سمجھا ہے۔ کہ کرکری خانہ پھیلا کے ہم ادھر اُدھر دیا سلائی، سوئی، کنگھی، آئینہ، مسّی، سُرمہ، بیچتے پھریں گے۔ آزاد اس فقرے پر بہت ہنسے۔

خوجی: شما صند ما میکنند و من آتش شدہ ام باللہ العظیم۔

راوی: آتش شدہ ام کے یہ معنی کہ میں آگ ہوگیا ہوں۔

آزاد: ارے بھائی اس کے یہ معنی نہیں کہ تم بیلا چنبیلی مسّی پھلیل یا سرمہ اور دیا سلائی کہاں بیچتے ہو۔ یہ فارسیوں کا خاص محاورہ ہے۔ اس کے یہ معنی کہ یہاں آپ کا دولت خانہ کس مقام پر ہے۔ کس محلے میں آپ فروکش ہیں۔

رقابت

خوجی کو سخت تعجب ہوا کہ یہ عجب قطع کی دُلہن ہے۔ منہ کھولے ہوتے بے حجاب میاں سے

باتیں کر رہی ہے۔ آزاد سے فارسی میں کہا برادر، بجان برابرم بلکہ از جان بہترم من ایں میگویم کہ ایں دُلہن عجب قاعدہ دارد کہ دہان روشن خود کشودہ بے نقاب برنامحرم واغیار نظر غلط انداز میدہد ایں قاعدۂ دُلہن نیست میر انیسؔ صاحب گفتہ است وخوب بسیار خوب گفتہ اند کہ۔

زیبا تھا دمِ جنگ پری وش اسے کہنا معشوق نبی سرخ لباس اُس نے جو پہنا
اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا جوہر تھے کہ پہنے تھی دُلہن پھولوں کا گہنا
سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شمشیر سے دُولہا کی بغل میں

فہمیدی؟ ایں میگویند کہ در عین اوج دُلہن سرِ خود خمیدہ یعنی بر زمین نظر کردہ بود نہ مثل زوجہ شما کہ وسرکش وسر بلند است۔

آزاد نے کہا واسطے خدا کے اردو میں گفتگو کیجیے۔ آپ اپنے ملک کی دُلہن اور اس ملک کا مقابلہ نہ کیجیے۔ ہر ملکے وہر رسمے۔ یہ حسن آرا بیگم نہیں ہیں۔ حالانکہ اپنے ملک کی رسوم کے مطابق وہ بھی کسی قدر آزاد ہیں۔ مس میڈا کو دیکھیے۔ کس بانکپن کے ساتھ گلگوں خوش رفتار اُڑاتی بازاروں میں سیر کرتی پھرتی تھی۔ دیکھتے ہی انسان کے ہوش اُڑ جاتے تھے۔ کہ اللہ اللہ کنواری لڑکی اور یہ مطلق العنانی۔ مگر ہر ملکے وہر رسمے۔ اگر کوئی آپ ایسے کو اس گھوڑے پر سوار کر دے تو دم کے دم میں۔ مُنہ کے بھل گر پڑے۔ اس کو بھی جانے دیجیے۔ ہرمزجی کی کوٹھی میں آپ نے اُن دونوں فرانسیسوں کو ناچتے دیکھا تھا یا نہیں؟ لمبی لمبی ڈاڑھی۔ مچھاڑا بیگ اور قطع شریف ملاحظہ فرمایئے۔ کھڑے تھرک رہے ہیں۔ تو وجہ کیا! وہی ہر ملکے وہر رسمے۔ آپ تو تھرکیے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ ناچو تو ناچیے ہرگز نہیں۔ وجہ، وجہ یہ کہ کبھی اس کی عادت نہ تھی۔ اور اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اس شہزادی کو آپ پردہ نشین بنانا چاہیں تو یہ محال ہے قبلہ یہ کیا جانیں کہ پردہ نشین کسے کہتے ہیں۔ خوجی نے تھوڑی دیر تک آزاد کے کلام پر غور کیا تھوڑی دیر کے بعد بولے کہ حضرت ہمیں کمال افسوس ہوا واللہ کمال افسوس ہوا آپ مردوے ہیں۔ یا یہ آپ میاں ہیں یا بیوی۔ اگر تم شوہر ہو تو اپنے طرز پر لاؤ۔ اور اگر وہ شوہر ہیں تو آپ خود پردہ نشینی اختیار کریں۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد
یا قطعِ نظر زیار می باید کرد

دونوں کاموں میں سے ایک کام کرنا چاہیئے یا شوہر بنو یا بیوی ہی بن کے رہو۔ یا قطع نظر ز یار باید کردن یا برضائے دوست تن باید دادن۔ فہمیدی۔ باباتے من بدیع۔ آزاد نے مسکرا کر کہا حضرت دیکھیے آپ پھر فارسی بولے۔ یہ بات اچھی نہیں۔ اردو میں گفتگو کیجیے ورنہ ہماری کرکری ہوگی۔ آپ کو کیا۔

ادھر گفتگو ہوتی تھی اُدھر ایک خواص نے آن کر تخت کو چوما۔ اور دست بستہ عرض کیا کہ حضور دو سوار آئے ہیں۔ اور کمال گستاخی کے ساتھ کہتے ہیں کہ شہزادی کو بلاؤ ہم نے کئی بار کہا کہ ہماری شہزادی نازک مزاج اور عالی دماغ نہیں۔ تم دونوں یہاں حاضر رہو ہم اطلاع کرتے ہیں۔ اگر حکم ہوگا تو ہم بُلوالیں گے مگر وہ نہیں سُنتے۔ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ شہزادی نے کمال استقلال کے ساتھ جواب دیا کہ وہ سوار نہ ہوں گے۔ کسی ملک کے شاہزادگان والاتبار ہوں گے۔ سواروں کی یہ جرأت نہیں کہ اس گستاخی اور بے ادبی سے اس آستان ہما آشیاں پر تقریر کریں اور امارت کا دم بھریں۔ بیشک کسی سلطنت کے شہزادگان جم اقتدار ہیں۔ نشۂ بادۂ خسروی میں مخمور و سرشار ہیں۔ مگر مغرور اور سرکش۔ ورنہ کسی خاتون پاکدامن کو دروازے تک بُلوانا نشان بالغ خردی نہیں ہے۔

خوجی کو حکم دیا گیا کہ باہر جا کر ان سواروں کو دیکھیں۔ اور بغیر گفتگو کے ہمیں بتادیں کہ کون ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ کوئی پیش قبض یا نیمچہ یا قرابینچہ ملے تو ابھی جاؤں اور کورا چٹھا کہہ سناؤں خوجی کو ایک شمشیر الماس بار ملی۔ پتیرے بدلتے ہوئے تلوار تولتے ہوئے باہر گئے۔ تو دیکھا کہ دو برق رفتار گھوڑوں پر دو خوبصورت جوان سوار ہیں۔ دس بارہ منٹ تک غور سے دیکھا اور آن کر تخت کو ادب کے ساتھ بوسہ دے کر کہا۔ حضور غلام نے نہایت غور سے اُن دونوں پر نظر ڈالی۔ ابھی نام خدا گبھرو جوان ہیں۔ اور سبزہ آغاز تک نہیں۔ لیکن دونوں کے حسن و جمال کی وہ کیفیت ہے کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔

ہنوزش گرد گل نارستہ شمشاد
زخوبی سرو او چوں سرو آزاد

شہزادی: کوئی رئیس زادے معلوم ہوتے ہیں یا ایسے ہی ویسے ہیں کوئی ؟ کُل امور کا جواب دو ہمیں۔

خوجی: ہم کو تو اولاد شاہ، خاص شہزادے نظر آتے ہیں۔ دیکھنے کے قابل۔

گلابی پوش: حضور بھائی بھائی ہیں۔ ابھی بالکل کم سن ہیں۔ حسن گلوسوز کی یہ کیفیت ہے کہ ہر عضو

بدن سے نور برستا ہے۔ نازک اندام گلفام، پری رو، آئینہ زانو، خوش قطع خوش وضع۔

آہو چشم: حضور اگر مضائقہ نہ ہو تو ذرا جھروکے سے نظر ڈالیے۔ جان عالم ہیں۔ ایسے حسین مرد تو نہیں دیکھے۔ دیکھیے تو ہزار جان سے عاشق ہو جائیے۔ جادو ہے جادو۔ بس نگاہ میں چھب ہیں ادا ہیں جادو ہی جادو بھرا ہے۔ ذرا دیکھ لیجیے۔ لونڈی کی تو بھوک پیاس بند ہو گئی۔

شہزادی نے ایرانی کو رخصت کیا اور آزاد سے اجازت چاہی کہ ان دونوں جوانان مہمان کو دیکھیں آزاد ان کے حسن و جمال کی توصیف سن کر خود بھی مشتاق دیدار تھے شہزادی کے ہمراہ گئے۔ دریچے سے شہزادی نے اُن نیم بدن جوانوں پر نظر ڈالی تو۔

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

آزاد نے دیکھا تو سخت خفیف ہوئے۔ سوچے کہ بار الٰہا اب بڑی مصیبت میں پڑے۔ ممکن نہیں کہ ان غنچہ دہن شہزادوں پر اس گل بدن پری کا دل نہ آئے۔ ہمیں اب نہ پوچھیں گی اور ہماری بڑی بدنامی ہوگی۔ اس خوجی سے خدا سمجھے۔ جس نے برات نکال کر تمام شہر میں ہمیں ہنڈوایا۔ اتنے میں خواجہ صاحب بھی آئے۔ دیکھا تو آزاد کا رنگ فق چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی۔ شہزادی ذرا ادھر اُدھر گردن نہیں پھیرتی۔ ٹکٹکی باندھے ان گلعذار قمر طلعت شہزادوں کو گھور رہی ہے۔

خوجی: سمندِ گھوڑے کے سوار رعنا کا خالِ عارض دیکھا؟

آن خال کہ بندہ بر رخت می بیند
زاغیست کہ جز بر گلِ تر ننشیند
نے نے غلطم کہ در گلستانِ رُخت
زنگی بچہ برہنہ گل می چیند

کیوں آزاد سچ کہنا خالِ مشکین اُس عارض رنگین پر کیا زیب دیتا ہے۔

خال راچوں دید زاہد سبحہ از دستش فتاد
از برائے دانہ صد دانہ را برباد داد

آزاد تو جلے ہوئے تھے جھڑک کر کہا کیا بکتے ہو۔ خال۔ خال بد قطع سے آدمی ہیں۔ اَمرد۔ کیا بات کیا ہے ان میں خال کی تعریف کرنے بیٹھے ہیں۔

خوجی: ہاں! یہ تو صحیح ہے میں تو ہجو ملیح کرتا تھا۔ ہونٹ تو دیکھیے، کیسے بھدّے بھدّے موٹے موٹے

ہیں۔ نک سک سے درست نہیں۔ ہمیں تو مکارم نگر* کے ہجڑے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے صرف دل لگی دل لگی میں کہہ دیا تھا کہ حسین ہیں۔

شہزادی : (خواص سے) ایمان سے کہنا آج تک کبھی کوئی جوان ایسا خوبصورت دیکھا تھا، جیسے یہ دونوں ہیں۔ بڑی خوش نصیب وہ عورت ہے جوان کی بیوی کہلائے۔ دونوں پری زاد اور رشک شمشاد ہیں۔ ایک کی چشم نرگسی نے مجھے قتل کر ڈالا۔

در ساغرِ چشم تو ندانم چہ شراب است
بر ہر کہ نظر میفگنی مست و خراب است

ہائے کیا آنکھ ہے۔ دیکھو دیکھو۔ مار ڈالا، مار ڈالا ظالم نے اور دوسرے پری رو کی ابرو بس اس لائق ہے کہ برسوں گھورے۔

خوش دسمہ کشیدی خم ابروے دوتارا
کردی چہ سیہ تاب دمِ تیغِ قضارا

خوجی : میرے دل کی بات کہی۔ کیا ابرو ہے واللہ کیا ابرو ہے۔

ماہ چوں جلوہ گری کرد تو ابرو بنما
میتواں داد بشمشیر جوابِ شمشیر

شہزادی کے عشق کا حال ناگفتہ بہ۔ بس یہی چاہتی تھی کہ جھروکے سے کود پڑے۔

عربن : حضور اب چل کے تخت پر جلوہ گر ہوں۔ ایسے ایسے آیا ہی کرتے ہیں۔ جو کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ ملامتِ خلق سے بچنا چاہیئے۔

شہزادی : واہ۔ ایسی صورت تو کوئی ہم کو دکھا دے۔ کیا مکھڑا ہے۔

خلقے ملامتم کند و من بریں کہ آہ
از دل چگونہ مہر تو بیروں کند کسے

خوجی : ہائیں۔ حضور شہزادی ہو کر اور یہ باتیں زبان پر لائیں۔ توبہ!

شہزادی : ہم سے کچھ نہ کہو۔ کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوگی۔ کیا مجال۔

منعم مکن کہ ہیچ بجائی نمی رسد   سعی کہ در نصیحت مجنوں کند کسی

---

* مکارم نگر۔

اتنے میں اُن دونوں نے گھوڑے چمکائے تو شہزادی نے فوراً خواصوں کو حکم دیا کہ ان کو دوسرے محل میں جگہ دو۔ کہو ہم آتے ہیں۔ مہمان نوازی کے خلاف کوئی بات نہ ہونے پاتے۔ آزاد مثلِ مارِ خونخوار اس وقت پیچ و تاب کھاتے تھے۔ مارے غصّے کے جامے سے باہر ہوتے جاتے تھے۔ شہزادی نازداداے اُٹھی تو اُنھوں نے آہستہ سے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا،

اوّل تو مرا بدامِ خویش آوردی۔ چوں بلبلِ زار
صد گونہ وفا و مہر پیش آوردی۔ ہر لیل و نہار
چوں دانستی کہ دل گرفتار تو شد۔ اے عہد شکن
بیگانگی تمام پیش آوردی۔ در آخر کار

شہزادی: چھوڑو۔ بانہیں۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ وہ لوگ خدا جانے دل میں کیا سمجھیں گے اُن کی خاطر ہمیں دل و جان سے منظور ہے۔ مرد بدگمان ہوتے ہیں۔

باسایہ ترانمی پسندم
عشق ست و ہزار بدگمانی

آزاد کے دل پر اس تقریر نے وہ کام کیا جو برقِ جہندہ خرمن اور شمشیر دو پیکر گردن کے ساتھ کرتی ہے۔ خوجی نے بہت افسوس کیا۔ اور جان پر کھیل کر کہا۔ آزاد پاشا جوانِ رعنا ہیں۔ وہ دونوں ابھی لونڈے ہیں۔ حضور کی عقل کو اس وقت کیا ہوا۔ شہزادی نے کہا اب تو ہم نے ان دونوں کو دل دیا۔

اے چشمِ خوشت بلائے مردم
در دیدہ توئی بجائے مردم

خواصوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا۔ خوجی نے نشیب و فراز دکھایا۔ مگر شہزادی نے ایک نہ مانی۔ عشق نے عقل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

از خیالِ آن دو لعلِ آبدار　　بوسہ بر لب می طپد بی اختیار
مرغِ جان از سحرِ چشمش در قفس　　می دود با دل نگاہش در نفس
پشتِ دستش نور بخش سینہ ہا　　آب از دور چشمۂ آئینہ ہا
از نگاہِ آن درِ چشمِ نیم خواب
آب دریا قوت بگردد شراب

آزاد بیٹھے کے بیٹھے ہی رہے، اور وہ پری بل کرتی ہوئی نظر سے اوجھل ہوگئی۔ خوجی نے کہا ہائے اس عشق سے خدا سمجھے۔ عشق آیا اور عقل رفوچکر ہوئی۔ ان دونوں لونڈوں نے جادو کر دیا سحر کر دیا۔ ٹوناڈال دیا۔

عشق دارد با جنون ربطِ دگر   از خرد باشد جنون گستاخ تر
مصلحت آموز ہر فرزانہ ایست   طُرفہ سرمستی عجب دیوانہ ایست
گر کلید چارہ اش ناید بدست   میتواند قفل را در ہم شکست

از جنون گر آب طوفان راشود
بحر چوں ابر آسمان پیماشود

آزاد: خوجی اس وقت جی چاہتا ہے کہ تم کو قتل کر ڈالوں۔ اُف۔

خوجی: ہاں میں تو گردن زدنی، کشتنی، سوختنی ہوں ہی۔ مگر

اے خرابی خانہ زادِ کشورت
دشت وصحرائے جنون صحن درت

یہ عشق بلائے بے درمان ہے۔ اس سے کسی کو چارہ نہیں۔ عشق عشق افوہ۔ ہم خوب بھگت چکے ہیں۔ روح عشق کے نام سے کانپتی ہے۔ لڑکپن میں ہم بھی ایک مہ پارہ پر عاشق ہوئے تھے۔ اُفوہ۔ خدا گواہ ہے ایسی ایسی مصیبتیں جھیلی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بس کچھ نہ پوچھیے۔ دس دس دن تک برابر قرولی باندھ کر گیا ہوں۔ کبھی اس بازار میں اور کبھی اُس بازار میں کہ رقیب ملے بھونک دوں، گیدی کو۔ چوندھیا دیا تھا۔ عشق نے۔ ہائے ہائے۔ کیا بلائے بد ہے مگر۔

عاشقی کو عشق راشناختہ است
خویش رامحتاج ہر درساختہ است

آزاد: (گلابی پوش سے) اچھے کانٹے بوئے خوب شرورہ سنایا اُن کر خسیر سمجھا جاتے گا مگر تم کو ایسا لازم نہ تھا۔

گلابی: ایلو اور سنو ہم نے کیا کیا۔ فقط اتنا اُن کے کہا کہ دو سوار حضور کو باہر بلاتے ہیں بے ادب سے معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں اس نے البتہ بڑی تعریف کی کہ قابل دید ہیں۔ بلکہ دیدہیں نہ شنیدہیں۔

بقامت آن قیامت مژدہ دادہ
ببالا از بلا حرفی زیادہ

خوجی : پھر اب یہاں بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ. کچھ فکر بھی ہے یا نہیں ہے حضرت۔
آزاد : اس وقت عرقِ انفعال کے سیکڑوں گھڑے پڑے ہیں. واللہ عرق عرق ہوں. ایسا منفعل ہوں کہ جان سے بیزار ہوں. ہر مقام پر پریاں دل و جان سے عاشق ہوئیں. مگر کبھی کسی سے دب کے نہ رہا. یہاں یہ بے وقعتی ہوئی کہ الامان۔
خوجی : افسوس صد افسوس. ارے بدبخت بیوقوف گدھے. یہ موقع رونے کا ہے یا بھاگنے کا. اس وقت قید سے بھاگ چلو. روز روتے تھے کہ ہائے اس قید سے کیوں کر چھٹکارا ملے گا. روز گریہ وزاری کرتے تھے اور اب جو موقع ملا تو یوں بھینچ لی اور زار زار روتے ہیں کہ بے وقعتی ہوئی۔

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ پاکان برد

راوی : بعد مدت اس وقت برمحل شعر سننے میں آیا. خوجی ہیں کہ باتیں۔
آزاد : خوجی اس وقت دفن کر دیتا مگر مجبوری ہے. گدھا اور بے وقوف یہ الفاظ اور ہماری شان ہیں. خیر ہم اب بھاگ کے بھی جائیں گے. کیا مجال مگر یہاں سے ضرور ٹل جائیں گے. اب یہاں نہ رہیں گے۔

نالہ خواہم کہ بہ طرزِ دگر ایجاد کنم
دست دل گیرم و در کوے تو فریاد کنم

یہ کہہ کر آزاد اٹھے اور بسم اللہ کہہ کر شمشیر خارا شگاف ہاتھ میں لی. نیچے آئے اور لبِ چشمہ سار پر بیٹھ کر خوجی سے باتیں کرنے لگے۔
آزاد : کیوں جی. یہاں کوئی ہم کو پہچانتا بھی ہے یا نہیں. یہ بتاؤ.
خوجی : ہات تیرے کی. بھائی جان برات کے سبب سے تم سب میں مشہور ہو گئے مگر استاد صاحبزادے ہمارے ہی بیٹھے ہو. ہاں اتنا یاد رہے۔
آزاد : اب کیا کرنا چاہیے. بڑی خفت ہوئی. مر جانے کا مقام ہے. ڈوب مرنے کی بات ہے. بڑی شرم آتی ہے۔
خوجی : بس انھیں باتوں پر رنج ہوتا ہے. ڈوب مرو. دیکھتے کیا ہو. ایسی غیرت ہوتی تو اتنے بڑے ہوتے اور اگر مرنے کی خواہش ہے. تو زہر کھا لو. واہیات. اجی اب بھاگ چلو۔
گلابی پوش نے سمجھایا کہ آپ نے اتنے دن تک اس بیچارے کو قید کیا اور اب جو وہ راستی پر آئے تو آپ نے انکار کیا۔

شہزادی: تم ہماری نوکر ہو یا ہم تمہارے نوکر ہیں۔ بس اب کچھ نہ کہنا۔
گلابی پوش: حضور ہم تابعدار ہیں مگر کوئی بات وضع کے خلاف نہ ہونی چاہیئے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے جو مرضی ہو۔
شہزادی: وہ دونوں ہیں کہاں۔ ہائے ذرا صورت تو دکھادو اُن دونوں کو جام شراب پلادو۔

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
ما در پیالہ عکس رُخ مار دیدہ ام
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

عربن: (ہاتھ ملکر) افسوس۔ گئی گذریں۔ افسوس صد افسوس۔
شہزادی: (فرط مستی سے) اُفوہ کچھ پروا نہیں۔

گرچہ بد نامی ست نزدِ عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ ــــــ و نام را

ادھر آزاد اور خوجی حسرت اور حیرت کے ساتھ باہم گفتگو کرتے تھے۔ سوچتے تھے کہ اب کیا تدبیر کریں۔ آزاد نے دل میں ٹھان لی کہ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے، ان دونوں لونڈوں سے ضرور سمجھ لیں گے۔ خوجی سمجھاتے تھے کہ خدا کے لیے اس خیالِ خام سے درگذرو۔ بہتر یہی ہے کہ اب یہاں سے بھاگ چلو۔ ورنہ اب اگر قید ہوئے تو پھر ستم کا سامنا ہے۔ پھر مفر نہیں ہے۔ ممکن نہیں کہ جب وہ دونوں لونڈے سُنیں، کہ آزاد پر عاشق ہو گئی تھیں تو تمہارے قتل کی فکر نہ کریں۔

رزق ہر چند بیگمان برسد
شرطِ عقل است جستن اژدرہا
گرچہ کس بے اجل نخواہد مُرد
تو مُرد در دہاں اژدرہا

اب یہاں آپ کو ملے گا کیا خاک۔
آزاد: اچھا چلو بھاگ چلیں۔ یا قسمت یا نصیب یا بخت۔ ع
ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب اندا ختیم

خوجی: دیکھو. سمجھ بوجھ کے. بھاگو بھی تو اس طرح کہ کوئی کانوں کان خبر نہ ہو. کسی کو معلوم بھی نہ ہو کہ بھاگے تو کدھر گئے۔

آزاد نے خوجی کی بات پسند کی. دونوں آدمی وہاں سے چلے۔

رسل و رسائل

دمیکہ لشکرِ غم صف کشد بخونخواری ۔۔۔ دلم بنالہ و ہر منصب علم علمداری

خراب نرگسِ مستانہ توام کہ نہد ۔۔۔ ہزار شیوہ مستی بہ طبع ہشیاری

مریضِ عشق ترا اشتہا ازاں بیش است ۔۔۔ کہ بعد مرگ بیا سایداز جگر خواری

ہزار چشمہ خون سر زند ز ہر ذرّہ ۔۔۔ چو بعد مرگ بخاکم قدم بیفشاری

منم خراب عمارت بکشوری کہ درو ۔۔۔ بود بدست خرابی عنان معماری

سزد کہ حسرتِ دیدار بر دلِ عشاق

بگاہ نزع شود مایۂ سبکساری

یہ اشعار حسرت بار آزاد غم زدہ و ستم رسیدہ کے حسب حال تھے. مگر خوجی آیت لاتقنطوا من رحمۃ اللہ پڑھ پڑھ کر دل کو تسلی دیتے تھے. آزاد سوچنے لگے کہ جس طرح ہمارے مقابل میں شہسوار حسن آرا کے ہاں سے نکالا گیا تھا. اسی طرح ہم اس شہزادی کے ہاں سے ان دونوں امردوں کے مقابل میں خارج کیے گئے. ونیشیا کس لطف سے پیش آتی تھی. مس میڈا نے فرانسیس کے جنرل کو ہمارے سامنے للکار دیا. ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دے کر گلگشت چمن کرنے لگی. اللہ رکھی نے تمام عالم کے مردوں میں ہمیں منتخب کیا. زینت النسا ہزار جان سے عاشق ہے. اختر النسا کو ایک دم کی جدائی بھی شاق گذرتی تھی۔ بمبئی کی بیگم وقتِ رخصت زار زار روتی تھیں. ایک وہی ہم ہیں کہ ان دو زنان بیرونی نے ہماری کسار بازاری کر دی. ہمیں کہیں کا نہ رکھا. اگر وہ دونوں مل جائیں تو بھی ہماری ضربت شمشیر کا جواب نہ دیں گے. لیکن عشق خانہ خراب سے خدا سمجھے۔

زخوش متاعی بازار عشق می ترسم

کہ دست حسن بہ بند دکساد بازاری

آزاد نے خوجی سے صلاح لی کہ اگر ان دونوں سے (ڈیول) کے طالب ہوں تو کیسا. وہ

دونوں ایک طرف ہوں اور ہم ایک طرف پھر دیکھیں کہ کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ خوجی نے سمجھایا کہ برادر، ایں جنگاہ نیست اگر جنگاہ بودے من بدیع سابق کمیدان شاہی سلمہ اللہ تعالیٰ تا ابدوں ایں ہر ہمہ ہارا بزیر خاک انداختی مگر شما ایں قدر گران ڈیل ہستی و مستی و آں ہر ہمہ کودگان اندر۔

حقوقِ خدمتِ صد سالہ لعب اطفال است
بہ کشوری کہ درد کو دکان خداوندانند

آزاد نے مسکرا کر کہا۔ یار تم تو بیکار۔ ہنسواتے ہو۔ واہی تباہی باتیں کہتے ہو۔ بھلا شعر خوانی کا یہ کون موقع ہے۔ خوجی ریشہ خطمی ہو گئے۔ فرمایا میاں صاحب موقع پر جب شعر یاد آتا ہے تو پھر جی نہیں چاہتا کہ خاموشیدن کا صیغہ گردانیں۔ بلکہ خروشیدن کا صیغہ فوراً ہی گردانتے ہیں۔ خروشیدن بخروش۔ میخروشد خروش۔ خروشیدہ بود۔

آزاد آہِ سرد بھرتے کمالِ ملال کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم دھرتے راہ طے کرتے تھے۔ اور حسرتنا باراشعار ہر قدم پر وردِ زبان تھے۔

اے برزدہ دامن بلارا — سردرپے خویش دادہ مارا
چوں وررہ مردمی نہی پالے — از کوچہ ما طلب وفارا
یادم نکنی و ہیچگہ من — بے مژدہ ندیدہ ام صبارا
جان و دلِ من پر از غمِ قسمت — بہر تو ہی کنم چہ جارا
نالے فلکم بہ عشوہ گوید — کای وہم تو کردہ پی صبارا

از عشق فلاں بیاد دادی
سرمایۂ دانش و ذکارا

خوجی نے ایک چشمہ سار سے پانی پیکر مشورہ دیا کہ اس مقام دلکش پر تھوڑی دیر تک دم لینا چاہیئے۔ ورنہ قضا کا سامنا تو ہے ہی۔ کوئی نہ کوئی قتل کر ڈالے گا۔ مُنہ تاک کے رہ جاؤ گے خیر یا قسمت یا نصیب یا بخت۔ ع

ہر چہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم

مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ — زند بفرق مگوید کہ ہاں سرے میخار
زمانہ مرد مصاف است و من نہ مادہ دلی — کنم بجوشن تدبیر وہم دفع مضار

زمنجنیقِ فلک سنگ فتنہ می بارد   من اطہا نہ گریزم در آبگینہ حصار

گلِ حیاتِ من از بسکہ ہست پژمردہ

اجل تمیز نداز ننگ بر سرِ دستار

اس چشمہ سار لطافت بار کے کنارے آزاد اور خوجی بیٹھے کہ دو گھڑی غم غلط کریں۔ موجوں کی روانی سے طبیعت خوش ہو۔ خوجی ایک بوتل پوشیدہ طور پر ساتھ لائے تھے۔ بوتل چھلکا کر دکھائی اور کہا یوں اُستاد سچ کہنا کیا کارستانی کی ہے۔ آزاد بادہ مصفّا قوتِ روح دیکھ کر زبس محظوظ ہوئے اور یہ شعر زبان پر لائے۔

بہت سہے غمِ گیتی شراب کم کیا ہے

غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

خوجی: پھر لیجیے لنڈھائیے۔ غم غلط کرنے والی چیز ہے۔ لو میاں ہندوستان میں چل کے توبہ کر لینا۔ یہاں نہ پیوگے تو مر جاؤ گے۔ دیکھتے ہو آج کس قدر سردی ہے۔ ہر عضو بدن ٹھٹھرا جاتا ہے پیو اور ضرور پیو۔ اور اگر ایک مرتبہ بھی انکار کیا تو ہم بوتل کو دریا میں بہا دیں گے اور ہرگز نہ پینے دیں گے۔ آزاد نے کہا۔

مے دے کہ نہ دے بادہ اطہر تو نہیں ہے

کچھ پیر مغان ساقی کوثر تو نہیں ہے

خوجی: اچھا۔ ہم بھی حسب حال شعر پڑھتے ہیں۔

یا الٰہی حلال ہوں واعظ

دخت رز کو حرام کرتے ہیں

آزاد: اگر پھول تڑوالو تو بڑا ثواب ہو۔ ہم بادہ نوشی سے بچیں۔ اور تمہارے نامۂ اعمال میں فرشتے یہ نہ لکھیں کہ انھوں نے شراب پلائی۔

خوجی: ہم اگر خود پئیں تو سزا دار قابل دار، کیا مجال ہے۔

آزاد: ارے یار جی تو چاہتا ہے مگر خوفِ خدا ہے۔ واللہ خدا سے ڈرتے ہیں۔

زطول معصیت استغفراللہ اندیشم   کہ گرد فقر نشیند بذیل عفوِ غفور۔

ہمیں بس است کہ گر ناجیم و گر مغضوب   کہ بادلاے تو فردا ہمی شوم محشور

بعون نعمت عشق تو فارغ از نعیم   نہ جوی شیر شناسم نہ طارمِ انگور

محبت تو ندارد بسینہ ام داغی

کہ ہست سوزش الماس و معنی ناسور—

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ شہزادی کے محل معلّی کی طرف سے ایک گرد اٹھی خوجی نے کہا کچھ سوار نظر آتے ہیں۔ آزاد کے غور سے دیکھتے ہی دیکھتے دس سوار ان کے قریب آن پہنچے۔ ان کو چوطرفہ سے گھیر کر یوں ہم کلام ہوئے۔

سوار: بس خبردار جنبش کی اور بندوق معاً سر ہوئی۔ خبردار۔

خوجی: ادرمر غلکہ آزاد پاشا جنڈیل دریں جاست کہ شما ہردہ را بیک ضربتِ شمشیر خار اشگاف بشکنند و جواب ترکی بہ ترکی دادہ شمارا پشیمان کنند۔

سوار: مت بک۔ (آزاد کی طرف مخاطب ہوکر) اس پاگل کو منع کردو کہ بے تکی بات زبان سے نہ نکالے اور جو زبان ہماری سمجھ میں نہیں آتی اُس میں گفتگو نہ کرے۔

آزاد: سُنو جی۔ تم تو صرف سوار ہو مگر ہم جنرل ہیں سپہ سالار پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہم کو کس حُکم سے روکتے ہو۔ پھر یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا حُکم ہے۔ خبردار ہماری آبرو اور ہماری وضع کے خلاف کوئی بات نہ ہونے پائے۔

سوار: پولینڈ کی شہزادی کے حکم سے آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ حکم ہے کہ جانے نہ دو۔ مگر حضور کے خلاف کوئی بات نہ ہوگی کیا مجال۔

آزاد: اچھا قلم دوات کاغذ لاؤ۔ ہم ایک خط لکھتے ہیں۔ یہ شہزادی کو دے دینا اور جواب لینا۔ اگر تم کو یہ شک ہو کہ ہم بھاگ جائیں گے تو نو آدمی یہیں رہو اور ایک سوار ہمارا رقعہ لے کر جائے۔ سواروں نے فوراً قلم دوات کاغذ منگوایا۔ آزاد کے روبرو رکھ دیا۔ اُنھوں نے شہزادی کے نام یہ رقعہ لکھا۔

تُرا مشکل کشا دانستہ بودم — ترا حاجت روا دانستہ بودم
تُرا مہر آشنا دانستہ بودم — ترا من باوفا دانستہ بودم
غلط کردم خطا دانستہ بودم

چو دیدم از تو نازو دل ربودن — بحرف مہربانی لب کشودن
نہانی لطف بر عالم نمودن — گمان ہردم کہ خواہی دوست بودن
چنیں دشمن کجا دانستہ بودم

شہزادی بیگم کی خدمت میں ہمایوں میں آزاد پاشا دست بستہ تسلیم عرض کرتا ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

اگر امرد پرستی کا شوق تھا تو مجھ بدبخت کو کیوں ستیاناس کیا میری مٹّی ناحق خراب کی۔ مگر شکر ہے کہ تمہارے تلوّن کی کیفیت جلد معلوم ہوئی۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ۔ ع
آن قدح بشکست وآن ساقی نماند

نشاید ہوس باختن باگلی
کہ ہر بامدادش شود بلبلی

یک در گیر محکم گیر۔ ہر جائی کو دل دینا وضعداری کے خلاف ہے۔ بابائن شوراشوری دیا بایں بے نمکی۔ یا وہ تپاک اور گرماگرمی تھی۔ یا اب یہ سردمہری۔ اب ہم ہیں اور ناکامی،
نی ہم نفسے نہ ہم زبانی نی ہم سفری نہ کاروانی
تنہا من در آہ بیکرانی مانند فلک بہر زمانی
از خود سو خویشتن روانم

اب میری گرفتاری کا کیا باعث ہے۔ پہلے تو اپنے حُسن اور اپنی جوانی کی بدولت قید ہوا۔ زنداں کی سختیاں جھیلیں۔ خیر ہم بھی سوچے کہ،
گل و گلچیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

لاکھوں مردوں میں ہم کو انتخاب کیا، مگر تلوّن کے صدقے دو کل کے لونڈوں نے حضور کی طبیعت کے ساتھ وہ کام کیا۔ جو جنون انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ اب مجھے تو رہائی دیجیے اور اگر ان دونوں امردوں کے سامنے ذلیل کرنا ہے تو خوب یاد رکھیے کہ وہ دونوں نہ ہوں گے۔ پھر ہر چہ باداباد ہیں کچھار میں شیر نر ہوں تو آسمان پر عقاب سبک پر موج دریا میں تو پرند ہوا میں ابھی ڈکاروں تو اُن دونوں بزدلوں کا زہرہ آب آب ہو جائے۔ شیر کچھار چھوڑ کر بھاگے۔ یہ لونڈے حلوائے بے درد بھلا ہم جوانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ تو ابھی خود بوسہ لینے کے لائق ہیں۔ کسی سے دب کر

چلیں یہ ہماری سپہ گری کے خلاف ہے مگر مردم آزاری سے بھی طبیعت نفور ہے۔ ان دونوں سے کہہ دو کہ ہمارے مقابلہ کو آئیں وہ ہمیں قتل کریں یا ہم ان کو نیچا دکھائیں۔

افسوس ہے کہ تم نے میرا ایمان بھی لے لیا۔ معشوقہ سمجھ کر تمہارے ہاتھ سے شراب پی۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ دغا دو گی۔ خیر۔

ما ز یاران چشم یاری داشتیم
خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم

ہنگام وغا میہاں رزم میں اچھے اچھے سرکشوں کو نیچا دکھایا۔ روس کی خاتون عفت قباب و شیریں ادا مس کلیر سیاہ لب۔ لعلِ شکر خا کے میں نے بوسے لیے۔ یلانِ تہمتن کو میں نے خاک میں ملایا جو مقابلے کو آیا اس نے زک پائی۔ منہ چڑھا اور منہ کی کھائی۔ ایک ایک رونگٹے میں سپہ گری کا فن کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ جس وقت معرکۂ نبرد میں گیا اور شمشیرِ خوش غلاف چمکائی۔ پرے کے پرے صاف ہو گئے۔

خونریزی شمشیر کا لکھوں جو کوئی حرف ہو صاف سیاہی سے عیاں شوخی شنجرف
ہوتے تھے سیہ کاروں کے تن مثل قلم حرف روکیں کوئی وار اس کا یہ ڈھالوں کا نہ تھا ظرف

ایک ایک کی مانند اجل دشمن جاں تھی
چار آئینے میں امن نہ جوشن میں اماں تھی

میرے حسن گلوسوز پر اُن پریوں کا دل آیا ہے جن کی صورت دیکھو تو عش عش کرتے لگو۔ مس ملینڈا میں اور تم میں فرق زمین و آسمان کا ہے۔ کبھی فرس خوشخرام کو کاوے پر ڈالا اور چمکاتی ہوئی لے گئی تو کبھی چکارے کی طرح طرارہ بھرا، اور دم کے دم میں ہوا ہو گئی۔ جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ خلق خدا ہزار جان سے عاشق ہے۔ مگر نظر پڑی تو ہم پر کروڑوں میں ہمیں کو انتخاب کیا۔ حسن آرا بیگم وہ مہ جبین و نازنین پری ہے کہ خدا کی خدائی میں کوئی اس صورت کی نہیں۔ نازک بدنی غنچہ دہنی گل پیرہنی سب ان پر ختم ہے۔

بُرد بوئے تاز اندامش صبا سوئے چمن
گل ندامت ہا کشید واز خجالت شد گلاب

وقتِ خرامِ ناز کمر ہزاروں بل کھاتی تھی۔ ہائے ہائے یہ نازک کمری۔

خرامان چوں شوی گردو تنت سرتا قدم لرزان
بسانِ گلبنے کز تازگی گلہا بران لرزد

اس وقت چھڑوں اور پازیب کی چھما چھم کی آواز کان میں آتی ہے۔

بزندان بستہ باشد جلوۂ حیرت فزائش را

مدان از حلقہ فتراک خلخال پایش را

اللہ رکھی کے ناز و انداز اور عشوہ و کرشمہ کو دیکھو تو اپنے حسن و جمال پر ہرگز نہ اتراؤ۔ وہ عشوۂ لاجوردی سکھانے سے نہیں آتا۔

غمزہ آموزد ز چشمش شیوۂ بیداد را

طرفہ شاگردی کہ میگوید سبق استاد را

اگر ہمارے وطن میں کوئی دلہن ایسی بے شرم ہو تو لوگ نام رکھیں۔ اس پر انگلیاں اٹھیں۔ مگر حضور کے وطن کی عجب چال ہے۔

اب التماس خاص یہ ہے کہ غلام کو آزاد کیجیے۔ یا ان دونوں سے کہیے کہ بر سر مقابلہ آئیں۔ اگر تلوار بھی ان کے ہاتھ میں دے دیجیے تو کیا مضائقہ ہے۔ ہم نہتے ہی لڑیں گے۔ بس اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔ (مرد میدان آزاد پاشا)

یہ خط ایک سوار نے لیا اور رخش آہو شکار کو کڑکڑاتا ہوا شہزادی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آداب بجالایا۔ خط دیا۔ شہزادی نے کھولا پڑھا۔ ان دونوں شہزادوں کو سنایا اور ان کے مشورے سے جواب خط یوں لکھا۔

جواب نامۂ آزاد

اپنی جگہ تو سب کو ہے دعوائے مردمی

میدان کارزار میں ٹھہرے تو مرد ہے

تمہارا اول جلول خط پایا۔ میں سمجھتی تھی کہ تم فہمیدہ آدمی ہو۔ مگر اس خط نے جو ترجمان دل ہے ثابت کر دیا کہ دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ ارے نادان افسان کو یہ دعویٰ کب زیبا ہے پہلے آئینے میں اپنی صورت دیکھو دل میں سوچو تو کہ تم ہو کیا۔ آپ اور مردمی کا دعویٰ۔ ارے تیری قدرت۔

بت بھی لینے لگے خدائی کی　　　شان ہے تیری کبریائی کی

نمرود نے بھی دعویٰ کیا تھا، مگر ایک پشے نے ناک میں دم کر دیا۔

دماغ جھڑ گیا آخر ترا نہ اے نمرود
چلا نہ پشے سے کچھ بس تری خدائی کا

مس کلیرسا کا اور آپ بوسہ لیں۔ میاں وہاں پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ فرشتے تک بار نہیں پاتے۔ تم کس شمار و قطار میں ہو، مس ملبنڈا اگر تم ایسے آدمی پر ریجھیں تو ہم سمجھیں کہ خبط ہو گیا ہے۔ تمہارا یہ فقرہ پڑھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ (ہم ہنستے ہی لڑیں گے)

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

پھر تم نے لکھا ہے کہ (وقت خرام ناز کمر ہزاروں بل کھاتی تھی) ہزاروں ہزاروں یا کروڑوں۔ افسوس ہے کہ یورپ میں رہ کر بھی ایشیائی مبالغہ نہ چھوڑا۔ اور ہندوستان سے چھڑوں کی چھما چھم کی آواز حضور کے کان میں آتی ہے۔ کیا کوئی تار کان میں لگا دیا۔ یا آلۂ تلیفوں آپ کے گوش صفا کوش میں کسی حکیم نے بزورِ حکمت لگا دیا ہے۔ رجھوٹوں کے سرداروں کے بھی آپ نے کان کترے۔ آپ کی جرأت کا کیا کہنا۔ ذرا سی چھوکری کلیرسا کشاں کشاں لے گئی، اور ایک نہ چل سکی۔ آپ بھی وہ پدّے ہیں جو آسمان کی طرف ٹانگیں اُٹھا کر سوتا ہے۔ کہ مبادا آسمان گر پڑے تو روک لے۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا۔ آپ کو عورتوں نے کروڑوں میں انتخاب کیا ہے۔ واقعی آپ ایسے ہی حسین ہیں۔ خدا چشمِ زخم حوادث سے بچائے۔ اللّٰہم زد فزد۔

اور خیر سے آپ کو اس کا بھی یقین آ گیا کہ میں آپ پر عاشق ہوئی تھی۔ شان خدا میں تو صرف تم کو بناتی تھی۔ خیر اب بہتری اسی میں ہے کہ سواروں کے ساتھ چلے آؤ۔ اور خبردار آج سے یہ نہ کہنا کہ ان دونوں سے مقابلہ کروں گا۔ اگر ایسا کلمہ پھر کبھی مُنہ سے نکالا تو تم جانو گے۔ ان کے تلووں کو تمہارا چہرہ نہیں پہنچتا۔

کانٹوں میں نہ ہو اگر اُلجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

جس وقت آزاد نے یہ خط پڑھا۔ آگ ہو گئے اور شیرِ ژیان کی طرح ڈکارنے لگے۔ خوجی ان کے چہرے سے تاڑ گئے کہ خط میں شہزادی نے کچھ کلمات سخت و ناملائم لکھے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے آزاد سے اس آزردگی کا سبب دریافت کیا۔ مگر جواب نہ پایا۔ تب خوجی اُس سوار کی طرف گئے۔ جو خط

کا جواب لایا تھا۔

خوجی: کیوں میاں۔ یہ کیا لکھوا لائے ہو۔ ہمارے شہنشاہ کا مزاج درہم برہم کر دیا۔ یہ بھی کچھ کسی سے کم نہیں ہیں۔ جی!

سوار: ہم سے کیا واسطہ۔ ہم کیا جانیں۔ ایلچی را چہ زوال۔

خوجی: یہی بات ہے بھائی۔ یہی بات ہے۔ مگر وہ دونوں بھی پرکالۂ آتش ہیں۔ عجب حُسن خداداد پایا ہے۔

کیا خداداد حُسن پایا ہے
آپ اللہ نے بنایا ہے

سوار: دریں چہ شک اُن میں معشوق پن ہے۔ گبھرو جوان ہیں۔ کلّے ٹھلّے کے جوان ہیں۔ وہ ابھی سترہ سترہ سولہ سولہ برس کے لڑکے ہیں۔ یہ ماشاء اللہ جوان ہیں۔ حُسن میں یہ بھی کم نہیں۔

خوجی: اجی اتنا بڑا تلوریا اور گل چلا اور بنوٹیا، اور بنکیت کا ہے کو کسی نے دیکھا ہوگا۔ اے توبہ قادر انداز شہسوار فنون جنگ سے واقف ہیں۔ یہ باتیں ہو کر آزاد ایک اسپ جھرجھرنگ پر سوار ہوتے اور خوجی کو لے کر شہزادی کے پاس چلے۔

آزاد پاشا نے خط کو مکرر سہ کرر پڑھا۔ اور ہر بار چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ جب خوجی نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو دست بستہ سامنے جا کھڑے ہوتے۔ کہا حضور من بدیع در ینجا استادہ ام شما جناب مرا بفرمایند کہ در خط او شہزادی چہ مطلب غصہ انگیز پیچیدہ بود۔ آزاد گو کمال رنج اور غصے میں تھے۔ مگر بے تکی بات پر مسکرا دیے کہا تم بڑے مسخرے ہو۔ چلو سامنے سے ہٹو۔ خوجی کبھی ادھر جاتے تھے کبھی اُدھر جاتے تھے، ایک پہلو پر چین نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں آزاد اسی محل کے نیچے سواروں کے ساتھ پہنچے۔ شہزادی محل سے آئی تو ناز و ادا کے ساتھ کمر لچکاتی کبھی زیر لب مُسکراتی ہوئی۔

نام خدا وہ ناز سے اترائے جاتے ہیں
چوٹی کا بوجھ پڑنے سے بل کھائے جاتے ہیں

شہزادی نے کہا کہو اب کیا سزا دی جائے۔ آزاد کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ غصے میں آن کر جواب دیا کہ بس اس سے زیادہ سزا اور کیا دوگی۔ آئندہ اختیار ہے۔ خوجی نے آگے بڑھ کے کہا سُنو صاحبان اس کے بعد کچھ کہنے کو تھے کہ آزاد نے ڈپٹ دیا۔

خوجی: سنو میاں آزاد۔ ڈپٹیدن لازمۂ انسانی بنودہ است۔ باباے من۔ انچہ گفتنی ست گفتن کن وَالالار

آزاد: باباتے من کا بچہ۔ جب دیکھو دل لگی بازی۔ یہاں اس وقت خدا جانے کس مصیبت میں پڑے ہیں۔ اس کو دل لگی سوجھتی ہے۔

شہزادی: (خوجی سے) تمہارا آزاد خوبصورت ہے یا ہمارے وہ دونوں شہزادے۔

خوجی: اُہو ہو۔ واہ ری میری شہزادی ولایتی بیگم۔ (آزاد کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں باباتے من کیا نام رکھا ہے۔ ولایتی بیگم یہ نہیں کہ ممیٹڈا، بھیڑیا، کلیرسا، ونیشا، واہ اچھا صاحب حضور نے سوال کیا کہ آزاد خوبصورت ہیں یا یہ دونوں شہزادے شہزادوں کو یہاں نہ بلوایئے گا ورنہ خون ہو جائے گا ہاں صاحب تو اب حُسن کو تو بالائے طاق رکھیے۔ حسن کا ذکر ہی کیا ہے۔ دل آجانا شرط ہے۔ بس ایک بیگم نے لونڈی کو حکم دیا کہ باہر جاکر یہ گلوری کسی ایسے مرد کو دے آجو تجھ کو سب سے حسین معلوم ہوتا ہو۔ یوسف کا سا حُسن ہو۔ لونڈی نے گلوری لی اور باہر جاکر اپنے کانے شوہر کو دے آئی۔ جھروکے سے بیگم نے دیکھا تو جھلا کر کہا کہ اُو بد بخت تو تو اُس کالے کلوٹے کانے کو جاکے دے آئی۔ وہ بولی صدقے جاؤں بیوی! مجھے تو یہ کانا ہی یوسف جمال نظر آتا ہے۔ سنو بی صاحب بات ساری یہ ہے کہ دل آجانے کی بات ہے۔ ہے کہ نہیں؟

شد فیض رس نظر فرشتہ	بالید چو نخل تر فرشتہ
ابرست بابر دوش بر دوش	یا بافتہ پر بہ پر فرشتہ
غُفران سحاب تازہ رحمت	نازل قطرات تر فرشتہ
بر سیہ و سفید باہم	دیوست یکے دگر فرشتہ

در جلوہ گہش ہجوم گردید
افتادہ فرشتہ بر فرشتہ

شہزادی: تم قابل دار ہو۔ ان دونوں کی نسبت یہ کلمہ زبان پر لائے۔

آزاد: بھلا ان اشعار کی یہاں کیا ضرورت تھی۔ ان کا کون موقع تھا؟

خوجی: تو ہم قابل دار ہیں۔ ہاں اچھا۔ بسم اللہ حکم صادر ہو۔

آن محرم رازِ لامکانی	موصوفِ صفاتِ جاودانی
افلاک بزیرِ پاے کردہ	در عالم عشق جاے کردہ

جاروفتہ ازضیائی توحید　　پاکوفتہ در مقام تفرید

آن پاک گزیدۂ مشائخ　　وان مردم دیدۂ مشائخ

سلطانِ سریر ملک تمکین

یعنی کہ بہائی ملک والدّین

شہزادی : ان کو یہاں سے لے جاؤ۔ اور پاگل خانہ میں رکھو۔ یہ سڑی ہے۔ جاؤ بس تمہارا وہیں گذارا ہے۔ اور تم کسی مصرف کے نہیں ہو۔

خوجی پاگل خانے میں

خوجی : میں ایک ایسے کی بیعت لایا ہوں جو حضرت شیخ بہاءالدین قدس سرہ العزیز کے مریدوں میں سے ہیں۔ ہم اس قدر کرامات دکھا سکتے ہیں کہ اگر پاگل خانے میں بند کردو تو کچھ مضائقہ نہیں کوئی بات نہیں۔ ہم کشف و کراماتِ وَلی اللہ والے لوگ ہیں۔

ہر چیز کہ دل بدان گراید

گر جہد کنی بدست آید

کوشش بلیغ کرو کہ نفس کو پاک رکھو۔ اور اپنے سے کم کو نہ ستاؤ۔

اے زبردست زیردست آزار

گرم تا کے بماند ایں بازار

بچہ کار آیدت جہانداری

مُردنت بہ کہ مردم آزاری

خوجی تو پاگل خانے بھیجے گئے۔ وہاں دو پاگل تھے۔ ایک نے کہا کیا تم بھی پاگل ہے۔ تم ہم دونوں پاگل ہے۔ ہم پاگل یا تم پاگل ہے۔ تم پاگل ہے۔ یا ہم پاگل ہے۔

خوجی : حضور پاگل نہیں ہیں، پاگل میں کمبخت ہوں۔ اور بہت بڑا پاگل ہوں۔ حضور کو جو پاگل کہے وہ خود پاگل۔

پاگل : وَل نہیں۔ تم پاگل نہیں ہم خود پاگل ہی پاگل ہے۔

خوجی کی ناک میں دم آگیا۔ پاگل نے ان کو اس قدر دق کیا کہ پناہ مانگنے لگے۔ کوشش بلیغ

کی کہ اس پاگل سے چھٹکارا ملے۔ مگر امر محال تھا۔

پاگل : تم سُور ہے یا سُور کا بچہ۔ یا دونوں یا ایک۔

خوجی : (ہاتھ جوڑ کر)۔ حضور کا مطلب میں نہیں سمجھا۔

پاگل : شاہ جہاں نے جو کیا وہ عالمگیر نے نہیں کیا۔ کیوں۔

خوجی : بجا ارشاد ہوا۔ میں آپ کی رائے سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

پاگل : چُپ۔ خوشامد کرنے والا۔ تو بالکل غلط کہتا ہے۔

خوجی : حضور جو حکم ہو۔ بجالاؤں۔ فوراً کیا مجال ہے۔

پاگل : کیا مجال ہے! ہمارا۔ ہمارا مجال۔ اچھا۔ اِدھر آ۔

خوجی : او گیدی۔ ہائے نہ ہوئی قرولی۔ خبردار قریب نہ آنا۔

پاگل : (جھپٹ کر) تم پاگل ہے۔ ہم پاگل نہیں ہے۔

خوجی : میں پاگل۔ میرا باپ پاگل۔ تمام خاندان پاگل۔

راوی : سچ ہے کہ آہن باآہن تواں کرد نرم۔

پاگل : ہم تمہارا باپ۔ تمہارا دادا۔ تم سور کا آدمی۔

خوجی : حضور میرے باپ میرے باپ کے باپ۔ بس!

پاگل : لاؤ جوتا۔ یہ ہم سے بولتا ہے کہ بس۔ بس کیا معنی۔

خوجی : یا خدا مجھے بچا۔ ہائے افسوس ہے کہ یہ بد بخت ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ اس کو باپ بنایا۔ دادا بنایا۔ مگر یہ ٹیڑھی ترچھی ہی بات کہتا ہے۔

یارب تو چناں کن کہ پریشاں نشوم
محتاج برادران و خویشاں نشوم
بے منّت مخلوق مرا روزی دہ
تا از درِ شاں بردرِ ایشاں نروم

اللہ حق باقی، سچ۔ سچ سچ۔

پاگل : اِدھر آؤ۔ اس طرف آؤ۔ بس کہہ دیا۔ اِدھر آیا تو پاگل۔

خوجی : (آہ سرد بھر کر) خدا خدا بچائیو۔ ہائے ہائے۔

پاگل : او۔ او۔ تم پاگل ہے۔ سڑی۔ سودائی۔ پاگل۔

خوجی : حضور تو ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ ہاتے نہ ہوتی قرولی ہے ہے۔

پاگل : ادھر آ۔ ادھر آ۔ ورنہ سر توڑ کر دھر دوں گا۔

خوجی : ارے یارو بچاؤ۔ سن بے (پیچھے ہٹ کر) ہم کمیدان بہادر ہے۔

ہیچ چیزم بغیر درد نماند	جز لب خشک و روے زرد نماند
حیف ماندہ افیم فاقہ شد	اثرے از نشان گرد نماند
ہادی و خضر رہ دریں وادی	کہ تواں پیروی کرد نماند
باکہ سازیم عزم ہم سفری	کاندریں راہ رہ نورد نماند
آنچناں کرد چرخ کج رفتار	کہ نشانے زنام مرد نماند

تا بہ کے عشق و میکشی انشا

در جگر ہم کہ آہ سرد نماند

جیلر : تم دونوں پاگل اس طریق ہو کہ تمہارا علاج نہ کرے۔

خوجی : علاج سبحان اللہ۔ میرا علاج۔

بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج

کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

جیلر : اب یہ تو تمہیں جانو۔ ہم کیا جانیں۔

خوجی : واللہ تم تو اس قابل ہو کہ تم کو خود پاگل خانے بھیج دے۔ آپ جیلر بنے ہیں۔ ہم فارسی بولتا ہے۔ برادر۔ بابائے من۔ ایں کہ خواجہ بدیع شمارند مرد یست کہ وردگلے والی پلٹن بود۔

از مدد شیر خدائے ودود	صورت عنقائے طرب پر کشود
ذہن و ذکا رقص چو طاؤس کرد	مست شدہ آہوے صحرا نورد
طائر اقبال بہ نشو و نما	سایہ فگن گشت بسان ہما

خیز و لا صبح سعادت دمید

فصل گل و باد بہاری وزید

پاگل : کھاتے ہیں درد جو ہو تو سیبیریا کا میدان اور پانچ۔

خوجی : یا خدا۔ کن بدبختوں کا ساتھ ہوا ہے۔

قسمت تو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اللہ باقی من کل فانی۔ ہائے ہائے۔

شب نیم گذشت و صبح سرزد
اے مرد خدا بخواب تا کے

سونا محال ہے۔ تم پاگل نہیں۔ ہم تو ہیں۔

پاگل: چپ سُور۔ ہم دو پاگل۔ تم ایک۔

خوجی: حضور پاگل اور حضور کا باپ و دادا پاگل۔ غلام تو غلام ہی ہے۔ ایک بیوقوف آدمی نے کہا کہ ہم شاعر اور ہمارے باپ شاعر اور ہمارے دادا جان شاعر اور ان کے جداجد۔

شاعر: تو ہم شاعر اوے کے باپ ہوئے۔ اس وقت ایک حاضر جواب آدمی وہاں بیٹھے تھے۔ کہا حضور نے بہت صحیح فرمایا۔ گو میں بھی کچھ کہتا ہوں مگر حضور کا مقابلہ محال ہے۔ ایک دن میں نخاس گیا۔ چڑیمار سے پوچھا کیوں بھئی اس بچہ بوم کی کیا قیمت ہے۔ اُس نے کہا بچّے کی قیمت پانچ روپیہ۔ پوچھا الّو کی قیمت۔ کہا ایک روپیہ۔ تب تو مجھے تعجب ہوا۔ کہا کیوں میاں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اُس نے کہا حضور یہ تو خالی خالی اُلّو ہے۔ مگر یہ بچّہ اُلّو کا پٹھا ہے۔

جیلر: اچھی کہی۔ تم پاگل نہیں ہو۔ غلط ہے۔

کلرک: یہ تو بیفائدہ یہاں آئے۔ تم پاگل ہو جی؟

خوجی: بلانے والے اور بھیجنے والے سب پاگل۔ میں شاعر ہوں اور شاعر پاگل نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔ کیا مجال ہے میں تو شاعر ہوں۔ میرے اشعار سُنیے اور داد دیجیے۔

پلا ساقیا مالوے کی افیم — کہ کر آؤں گلگشت باغ نعیم
پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا — جھلک آب اسود کی جھٹ پٹ دکھا
نرالا[2] ہے محفل کا کچھ آج رنگ — نہ کیوں زندگی سے طبیعت ہو تنگ
نہ مطرب[3] نہ ساغر نہ مینا نہ چنگ — نہ چانڈو نہ افیون نہ گانجا نہ بھنگ
کرم[4] کر فقیروں پہ مائی ڈیر — میں قربان جاؤں ذرا کم ہیر
ادائیں[5] تری یاد کرتا ہوں میں — دم نزع ہے سانس بھرتا ہوں میں
جلائے[6] دم واپسیں اے کریم — سرہانے پہ کہہ قم باذن اللافیم

خراب[7] وسیہ مست و تر دامنم
بدہ اوپیم - اوپیم - اوپیم

یہاں[8] خوفِ دوزخ ہے نی خوف ہل
بنادے مجھے اوپیم کانسٹل

نہ تاخیر کر ساقی مشک رنگ
پلا جام افیوں ابھی بیدرنگ

دم پینک و عیش بے رنج و غم
پڑھوں یہ کلام فصیحِ عجم

کریما ترحم بحال سقیم
کہ ہستم اسیرِ کمند افیم

نگہدار مار از راہ خطا
خطا در گذار و افیم نما

نداریم غیر از تو فریاد رس
بدہ جام افیون و باقی ہوس

زبان تا بود در دہاں جاگزیں
سرائیم توصیف افیونِ چیں

نوئی[9] کافریدی زیکشاخ پوست
ہزاران چو من مردِ افیون دوست

سُن اے ساقی لاؤ بالی ذری
نکل جائے گی سن ہے اب جاں مری

جو آدے مرے مُنہ میں افیون ناب
کہ کم ہو ذرا جوششِ اضطراب

نکل[10] جاؤں پینک میں اک آدھ میل
غضب ہے یہ حوض اور ستم ہے سبیل

پھروں خوب بازار میں بیدھڑک
وہ ٹھنڈی ہوائیں وہ ٹھنڈی سڑک

چکاؤں کہیں جا کے قند و شکر
کسی[11] جا پہ کھا جاؤں حلوائے تر

کہے مجھ سے کنجڑن خدا کی قسم
کنارا نہ دینے کی ڈبل سے کم

کسی جا پہ چھلکے کہیں پیالیاں
کسی[13] جا پہ پونڈا کہیں پھاندیاں

کشوں[14] یشنو اے ساقی مہ لقا
نہیں آدمیت ہے تجھ میں ذرا

آدمی را آدمیت لازم است
عود را اگر بو نہ باشد ہیزم است

تواضع مروّت محبت وفا
نہیں چھو گئی تجھ میں گیدی ذرا

له
یہ سچ سچ ہے قولِ فصیح مجسم

تواضع کند ہر کہ ہست آدمی
نہ زیبد ز مردم بجز مردمی

سخاوت مس عیب را کیمیاست
سخاوت ہمہ دردہا را دواست

سخیاں زافیون بر میخورند
سخیاں نبات و شکر میخورند

له پہلا مصرع خوجی کو یاد نہ تھا۔

خدا کی قسم شکر کر شکر کر | قرولی سے خالی ہے میری کمر
قرابینچہ اک پاس ہوتا اگر | تو کج کرکے میں بھونک دیتا تیر
خدا کے لیے لامری جانِ جاں | افیم سیہ رُوکشِ زعفراں[19]
کدھر ہے تو آزاد فرخ نہاد | پدر بر پدر پاک و عالی نژاد
گرا گر مجھے حوض[20] میں چل دیا | وہ گبدی وہ مردود بہروپیا
جو پینک میں ہوتا نہ میں بے خبر | تو بھٹے کی صورت اُڑا دیتا سر
اسی میں ہے بس خیر اے بدسگال | مجھے حوض[21] سے آن کرلے نکال
بدلیا بس اب روک اپنی زبان | دمِ صبح[22] ہوتا ہے پینک کا دھیان

راوی: ۱. ساقی نامہ کا رنگ ہی نرالا ہے۔ ابتدا ہی سے مالوے کی افیم کا بول بالا ہے۔

2. دیکھ کر عین فصاحت ہے۔ انگریزی میں اس صنعت کا نام نابرنش ہے۔ خوجی کا شاعری میں بھی چشمِ بد دور نرالا فشن ہے۔

3. بھنگ بھری نہ ہوئی نہ سہی ست بھنگ تو ہے۔

4. پشتو میں بھیک مانگنے لگے۔

5. اِس (قم باذنِ الافیم) نے بھڑ کا دیا۔ واہ اُستاد۔

6. اُو بیم کی تکرار عین کمالِ شاعری ہے۔ اللّٰہم زِد فزد۔

7. اوچھا جی۔ یہ نیا ہوٹل ایجاد کیا۔

8. شاباش اچھا حاشیہ چڑھایا۔

9. نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کو بھی لگے۔ ہاتھوں اِصلاح دے ہی دی۔

10. افوہ بڑا دھاوا کیا بھتی۔ آدھ میل! اچھ ٹھکانا ہے۔ ہاں رینگتے رینگتے پہنچ جاؤ گے۔

11. اس شیرین بیانی کے صدقے۔ حلوائے تر کے لیے کھاجا بھی کس موقع پر لائے۔ عذوبتِ بیان ظاہر ہے۔

12. لانا ہاتھ۔ تصویر کھینچ دی۔ ایسے موقع پر میرا شیر چوکتا ہی نہیں۔

13. بمبئی کے پونڈے دُور دُور تک مشہور ہیں۔

14. ایں! ابھی تک تو ساقی کی خوشامدیں ہوتی تھیں۔ اب تو لگے گالیاں دینے۔

15. کیا خوب۔ بحر بھی ایک ہی ہے۔ واللہ مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن گئے۔

16۔ یہ بات وہ بات لا میرے ہاتھ، قند اور نبات۔ بس دوسری بات نہیں۔

17۔ یاد آئی یاد آئی۔ میاں خوجی کو قرولی یاد آئی۔

18۔ اس بے تکے پن کے قربان۔ قرابینچہ پاس ہوتا تو تیر بھونک دیتا! اور جو اس کے پاس پھاوڑا ہوتا تو وہ کدال نہ بھونک دیتا۔

19۔ بھلا اس شعر کا مطلب تو کوئی صاحب سمجھائیں۔ کیا مجال۔ زعفران بوا زعفران حبشن سے عبارت ہے۔ جس نے میاں کے دھوکے میں خوجی کا سر سہلایا تھا، اور خوب دل کھول کر چپتیایا تھا، چونکہ وہ حبشن کالی کوئیلا تھی لہٰذا فرماتے ہیں کہ ایسی افیم دے جو اس سے بھی کالی ہو۔

20۔ ہاں اب اپنی اصلیت پر آئے۔ کرے کوئی دھرا مشغلچی والا ہی جائے گا۔ ابھی تک حضرت یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ بہروپیے ہی کے ہتھکنڈے ہیں۔

21۔ جی منہ دھو رکھیے اور اسی حوض کے پانی سے۔

22۔ دم صبح! اچھا اندھیر مچایا صبح کیسی۔ اجی خواجہ صاحب ابھی تو رات بھی نہیں بھیگی ہے۔

جیلر: واللہ بڑا دھوکا ہوا۔ سچ ہے۔

توان شناخت بیک روز از شمائل مرد
کہ تا کجاش رسیدہ است پائگاہ علوم
ولے ز باطنش ایمن مباش وغرہ مشو
کہ خبث نفس نگردد بسالہا معلوم

خوجی: ہائے افسوس۔ او گیدی اشعار سن کے بھی تو ہمارا معتقد نہ ہوا۔

جیلر: جتنے پاگل یہاں آتے ہیں سب کا معتقد ہو چکا۔

خوجی: اور ہمارے۔

جیلر: سب سے زیادہ معتقد ہوا۔

اتنے میں پاگل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دانتوں سے چبا لیا۔

خوجی: اُف۔ ارے چھوڑ او گیدی۔ لاؤ قرابینچہ۔

جیلر اور اُن کے ماتحت آدمیوں نے ہاتھ چھڑایا۔ ڈاکٹر بلوایا خواجہ صاحب مجروح و مطروح ایک چھپر کھٹ پر لیٹے غل مچا کر کہا۔ اُو گیدی نہ ہوئی قرولی۔ مگر واہ رے ہیں۔ آدھا ہاتھ چبا لیا، اور اُف بھی نہ کی۔ واہ رے خواجہ بدیعار

راوی: بدبعا کا کیا کہنا۔ مرد میدان ہے سینکڑوں جوتے پڑیں۔ اور بال تک بیکا نہ ہو شاعری کے تو ہم بھی قائل ہیں۔

دم بپینک و عیش بے رنج و غم | پڑھوں یہ کلام فصیح عجم
کریما ترحم بحالِ یتیم | کہ ہستم اسیرِ کمند افیم

اتنے میں دوسرے پاگل نے اُٹھ کر خوجی کی گردن ناپی، اور اس زور سے پٹخنی بتائی کہ خواجہ صاحب زمین پر آرہے۔ مگر اس وضع داری کے صدقے کہ اب اٹھتے نہیں۔

جیلر: اجی حضرت۔ اُٹھیے اب سوتے ہی رہیے گا۔

خوجی: وضع کے خلاف ہے۔

جیلر: اب اُٹھیے۔ واسطے خدا کے اُٹھیے!

خوجی: اچھا، مگر واللہ اس گیدی سے سمجھوں گا۔ کل انشا اللہ ضرور۔

ثریا بیگم کی پریشانی

غریق لجۂ غم والم زمین گیر کوے حزن و ماتم یعنی ثریا بیگم حیران و ششدر کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ خدا جانے یہ دونوں آدمی کیوں گرفتار ہوتے، میں بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئی۔ پوچھا ارے لوگوں خیر تو ہے۔ یہ سرکاری پیادوں کی دوڑ کیسی آئی۔ مجھے تو جانے دو کہ اپنی راہ لگوں۔ مگر برق اندازوں نے قہقہے لگائے۔ ایک بولا اب عدالت میں چل کے بیسواپن سب نکل جائے گا۔ کیا ننھی بنی جاتی ہیں۔ ارے لوگوں یہ سرکاری پیادے کیوں آئے۔ معلوم ہو جائے گا۔ دوسرے نے کہا یہاں اس میدان میں کیسا مشورہ ہو رہا تھا۔ کس کے گھائل کرنے کی فکر تھی۔ کوئی منصوبہ کیا۔ کیوں نہ ہو۔ چوکتے ہی نہیں۔ شہر بھر کو کچا کر دیا۔ تیسرے نے ہنس کر کہا۔ ارے یار ذرا روشنی میں دیکھو تو یہ تو ہم کو وہی ساقن معلوم ہوتی ہے جس نے اُس پنجابی کو زہر دلوا دیا تھا۔ اخاہ خوب ملیں۔ کہو اب کہاں دکان ہے۔ دموں کی خیر۔ چوتھا بولا۔ نا میاں وہ نہیں ہے۔ یہ بیڑن ہے۔ نا کے کے پاس بیڑن رہتی نہیں ہے۔ وہی ہے۔ تمہارا نام امامن ہے نہ۔ ثریا بیگم بیچاری خاموش۔ نام بتائے تو کیا بتائے۔ کبھی ان لوگوں نے ساقن بنایا۔ دکان کا پتا پوچھا، کبھی بیڑن کہلائی، کبھی بیسوا بنی۔ مگر بیکس اور بے بس تھی جس نے جو کہا چپ چاپ سُن لیا۔ چلتے چلتے ثریا بیگم کو خیال آیا کہ

یہ دونوں آدمی وہی چور ہوں گے، جنھوں نے اس شب کو ایک برق انداز کو قتل کیا تھا، اور یہ ان کے ساتھ تھیں۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ جب جوگن تھانہ دار کے خوف سے ایک ماما کو لے کر اُستانی جی کے مکان سے بھاگی تھی، تو راہ میں انواع واقسام کی مصیبتیں سہیں اور ایک مقام پر نوبت بایں جا رسید کہ دو چوروں نے ایک کانسٹبل کو قتل کیا۔ اس وقت یہ بیچاری بھی اُن موزیوں کے پنجے میں پھنسی تھی۔ میاں سلارو کے آقا کے ہاں اس کے بعد جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا کہ وہی جُرم ہے۔ یہ دونوں آدمی ڈاکو ہیں اور میں تو اس وقت ان کے ہمراہ ہی تھی۔ کسی پکے مخبر نے رپورٹ کر دی ہے۔ اب پھانسی پائی یا دائم الحبس بعبور دریائے شور کی سزائے سخت تجویز ہوئی۔ اپنے مرنے کا اس ستم زدہ کو مطلق افسوس نہ تھا۔ مگر یہ البتّہ خیال تھا کہ آزاد پاشا ترکی سے واپس آن کر ہمیں دغاباز اور بے ایمان سمجھیں گے۔ شک کے عوض یقین ہو جاتے گا کہ اللہ رکھی کسی پر بجھ گئی ہم سے جھوٹا سا اقرار کیا تھا کہ اب حشر تک شادی نہ کروں گی اس خیال نے اُنھیں آٹھ آٹھ آنسو رُلایا۔ بارِ الٰہا میں چاہے قتل ہی کی جاؤں۔ مگر آزاد کو ضرور اس معاملہ کی خبر ہو جائے۔

تو گفتی ہر آنکس کہ در رنج وتاب
دعائے کند من کنم مستجاب

اب یہ لونڈی عاجزی کے ساتھ اس رنج والم کی حالت میں دست بدعا ہے یا میرے خدا بحق نبی فاطمہ میری سن لے تاکہ آزاد مجھے بد وضع نہ سمجھے جب چند کوس نکل گئے۔ تو برق اندازوں نے صلاح کی کہ اب ذرا دم لینا چاہیئے۔ ایک باغ میں کنوئیں کے قریب سب نے دم لیا اور بیچاری ثریّا بیگم پر آوازے کسنے لگے۔

ایک: فرہاد کو جس بڑھیا نے مارا تھا اسی کی دادی یہ ہے۔
دوسرا: کون؟ اجی اُس بڑھیا کے بھی کان کاٹنے والی ہے۔
تیسرا: کیا بڑھیا۔ یہ بڑھیا ہے۔ ذرا پاس جا کر دیکھو تو۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

دو چار برق اندازوں نے ثریّا بیگم کو قریب سے دیکھا۔ ایک بولا واہ وا۔ یہ تو کوئی پری ہے۔ بھائی دوسرے نے کہا یار رات کے دیکھنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ تیسرے نے کہا ہمیں اس وقت

نہ سِن کا حال معلوم ہوا نہ صورت مگر ایک کانسٹبل اصرار کرتا تھا کہ اگر پندرہ سولہ برس سے زیادہ عمر ہو تو دو مہینے کی تنخواہ ہارتے ہیں۔ اور صورت تو ایسی دیکھی نہ سُنی۔

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حور کی سوجھی۔ لاہاتھ اِدھر دے کہ بہت دور کی سوجھی۔

اتنے میں بادل گھر کے آئے اور رام سنگھ حوالدار نے کہا بیٹرن کچھ گانا وانا جانتی ہو تو گاؤ۔ آخر تو بڑا گھر دیکھنا بدا ہی ہے۔ بادل جھوم جھوم کے آتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور گاؤ۔

ساقیا آتے ہیں بادل یہ بڑے پانی کے
جلد بھر مے سے جو خالی ہیں گھڑے پانی کے

ہاں اب تم بھی گاؤ۔ ایسی دھن میں کہے سے نہ گائے گی اور نہیں۔

ہُلاس: سنتے ہو جی۔ خبردار جواب ایسی تقریر کی ہو۔ تم لوگوں کو ہم سے مطلب ہے یا اُس سے۔ وہ عورت ذات کیا جانے۔ اِدھر آن کے ہم سے مقابلہ کرو۔ آؤ بڑے بہادر ہو تو لڑلو کشتی۔

حولدار: ہونہہ! اب اس کا جواب یہ ہے کہ اُٹھ کے اِک بیس لگائے اور بھول جائے، پھر سرے سے گنے۔ ہم پچاس اور تم ایک اگر ایک ایک چپت لگائیں تو بھی پتہ نہ لگے۔ کھوپڑی کے پرخچے اڑ جائیں۔ چلا ہے بحث کرنے آنکھیں نیچی کر۔ نہیں کھود کے دفن کر دوں گا۔

برق انداز: بڑے سرہنگ۔ بڑے تیکھے اور تو سب نرے ہیں۔ اب یہ بڑے کڑے خاں ہیں۔ جب دیکھو ہوا وہی گادوی پن کے دوسری بات نہیں۔ اب کی بولا تو پٹے گا۔ سُنا؟

ہُلاس آگ ہو گیا اور معاً حولدار کی طرف جھپٹا تو ایک گھونسا اس زور سے دیا کہ حولدار تیورا کر گرا۔ برق اندازوں کو سخت تعجب ہوا کہ اس حالت میں بھی اس شخص نے اس قدر جرأت ظاہر کی۔

صبح کے وقت شہر میں داخل ہوئے۔ ثریا بیگم نے دوپٹے سے اپنا مُنہ چھپا لیا۔ اس پر ایک برق انداز نے کہا۔ ہونہہ! استر چوہے کھائے کے بلّی حج کو چلی۔ اوڑھنی مُنہ پر ڈھانپت ہے۔ ایسی بڑی وہ بن کے آئی ہیں۔ ہٹاؤ اڑھنیا۔ حضرات ناظرین کیا نازک مقام ہے۔ افسوس صد افسوس۔ یہ وہی ثریا بیگم ہیں جو ٹھسے کے ساتھ فنس پر سوار ہو کر نکلتی تھیں۔ بانی مہری فنس کا کونا دباتے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ کہاروں کی مچھلیاں چمکتی تھیں۔ وردیاں پھڑکاتے ہوتے جاتے تھے۔ اور آج یہ روز بد دیکھا کہ اِدھر اُدھر برق انداز اور حوالدار اور تھانہ دار اور بیچ میں ڈاکوؤں کے ساتھ جا رہی ہیں۔ حیف صد حیف زمانے کا بھی عجب انقلاب ہے۔ برق انداز ڈانٹ کر کہتا ہے کہ

ہنستا اُڑھنیا۔ ہائے اس وقت اس غمزدہ مصیبت زدہ خاتون کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ اشک پریشان روزگار آنکھوں سے جاری تھے اور ہجوم گریہ سے راستہ مطلق نہیں سوجھتا تھا برق انداز جاہل اُجڈ گنوار پولیس کے ملازم چھیڑتے جاتے تھے۔ اہاہ اب رونے لاگیں۔ کاہے ناہیں ان کے گھرے ماں ست جگ بیاپک ہے۔ دوسرا بولا اس بیچاری کو ناحق بن ناحق یار لوگ پھانس لاتے ہیں۔ یہ بڑی پاک دامن ہے۔ دیکھو کس لطف کے ساتھ ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کو ساتھ لے کر میدان میں بیٹھی تھی ناحق ہی پکڑ لاتے۔ اتنے آدمیوں میں صرف ایک کانسٹبل خدا ترس آدمی تھا۔ وہ ثریا بیگم کی صورت وضع قطع چال ڈھال سے پہچان گیا کہ یہ شریف زادی ہے۔ صرف اس شخص کو ثریا بیگم کی حالت زار پر افسوس آتا تھا۔ باقی سب مل کے قہقہے لگاتے تھے۔ اور چٹکیوں پر اُڑاتے تھے۔ راہ میں طرح طرح کی گفتگو ہوتی تھی۔

رنگریز: بھئی کتنا اچھا رنگا ہوا ہے، یہ دوپٹا کہ واہ واہ، واہ۔

نان بائی: کہاں سے آتے ہو بھئی جوانوں۔ کیا کہیں ڈاکا پڑا تھا۔

سپاہی: ہلاس کا نام سنا ہے۔ وہ کل گرفتار ہوا۔ چلے جاتے ہیں۔ ہلاس ڈاکو اور یہ سنگھ جی ہیں۔ دو مگرمچھ ایک جال میں۔

ہلاس: نوالہ کروں گا۔ مگرمچھ تو ہیں ہی۔ ٹھہرو دیکھو کیسا نوالہ کرتے ہیں۔ رہنا دریا میں اور مگرمچھ سے بیر۔

سنگھ جی: آو میاں یادش بخیر جئیں گے پھر ملیں گے۔

شیخ: (اپنے دوست سے) ارے یار یہ کون ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا حسن گلوسوز ہے۔ کیا مکھڑا ہے۔ قسم خدا کی وہ خدا آفرین حسن ہے کہ باید و شاید۔ گل چہرہ اش در گلشن رعنائی بوجھے نیکوست کہ خون صد ہزار بہار بہ گردن او ست شادابی یا گل چہرہ اش از مغز زہد خشک بدست چین۔ باستعارۂ نازکی خویش خار خش بر گل از کبدن طعنہ زن۔ و تاثیر طراوت گل خندہ اش پژمردگی خزان روکش شگفتہ روئی گلشن۔ بر پشت گرمی آفتاب چہرہ اش ذرہ بیتاب راصد فلک خورشید در بغل و بے گلاب افشانی گل عارض بہار آفریں طراوت قرینش دماغ از خشک مغزی مختل۔ ان صاحب کے نوکر نے ان کی طرف مخاطب ہو کر یوں کہا۔

نوکر: اب حضور تو لغات بھر پڑھ جائیں گے مگر اس کی صورت نہ دیکھیں گے۔ یہ اس فاتبل (قابل) ہے کہ اس کو گھر ڈالے اور نکاح پڑھواتے۔

آقا : ہاں، دیکھوں۔ واہ واہ۔ یہ تو شبو جان سے بھی بڑھ کر ہے۔
نوکر : کیا خوب ان آنکھوں کے صدقے۔ میاں آنکھوں کے صدقے۔ میاں تیز نظر تو بہت دیکھے، مگر آپ کے سے گاودید نہیں دیکھے۔
آقا : (بگڑ کر) کیوں بے مردک۔ پھر تو نے گستاخی کی۔ خبردار۔
نوکر : جب کہیں گے کھری کہیں گے۔ دو ٹوک۔ صاف صاف۔

یاران چوری نہ ہم پیران دگا بازی
کنّو کو بُرا کہیں نہ ہم کسی کو پاجی

پُرانا مسئلہ ہے، اور آپ تو بس تھالی کے بینگن ہیں۔
آقا : اور تم۔ تم ترئی سہی۔ ہم بینگن۔ تم ترئی۔ کیوں۔
نوکر : کیا بے تکی اُڑاتے ہو۔ تریا و کدو نالت (لعنت) بھر دو۔ ہم تو یہ جانتے ہیں اور کیا کھری کہے سو بُرا۔
اس پر آقا جھلا کر دوڑے کہ نوکر کو سزا دیں نوکر بھاگا اور آقا اپنے زعم میں اپنے آپ آ رہے۔ گرے تو مُنہ کے بھل برق اندازوں نے قہقہہ لگایا۔ ثریا بیگم سے چار آنکھیں ہوئیں تو دل میں سوچنے لگیں کہ اس شخص کو میں نے کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور ہے۔
آقا تو مُنہ کے بھل گرے اور نوکر دور سے مُنہ چڑھا رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ میاں ذری یہ شعر سُنو دیکھو کیا کہا ہے۔

مکھڑے پہ اُس کے صرف نہ بُلبل نے غش کیا
چٹ چٹ بلائیں غنچوں نے لیں گل نے غش کیا
گیسو کے کس کی لٹ نظر آئی جو باغ میں
مارِ سیاہ طرۂ سنبل نے غش کیا
موجِ نسیم سر پہ اُڑاتی ہے خاک آج
شاید کسی اسیرِ سلاسل نے غش کیا
آیا جو میرے گھر تو بناوٹ کو سوچیو
رکھ دل پہ ہاتھ اُس بتِ قاتل نے غش کیا
صدقے میں اُس جگر کے کہ کشتے کے نعش سے
خون بہ چلا تو دیکھ کے قاتل نے غش کیا

آقا : اچھا سمجھوں گا. تو ذرا گھر تو چل۔ ابھی ابھی سمجھ لوں گا۔

نوکر : کیا سمجھو گے کیا. لو بیٹ لو. آقا ہو مالک ہو ماں باپ ہو۔

آقا : بس. ہم کوئی نہیں ہیں. بے ادب گستاخ. ہم کو مالک بناتا ہے مالک تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ واہ۔

نوکر : اچھا اب قتل کر ڈالیے بس. اب کچھ اور بھی تمنّا ہے۔

آقا : جا قصور معاف کیا. اب یہاں آ کے سُن کان میں. کسی سے کہو نہ سُنو اس پری وش حور کو کسی طرح شادی پر راضی کر دو۔

نوکر : اوہ. کون بڑی بات ہے. ابھی اسی دم. اسی وقت۔

آقا : شاباش. شاباش. خوب آدمی ہے تو. ایک شبو جان کو دل دیا تھا وہ قتل کر گئیں. اب ان کی باری ہے۔

ہے ظلم اُس کو یار کیا ہم نے کیا کیا — کیا جبر اختیار کیا ہم نے کیا کیا
داغوں سے اپنے سینۂ سوزاں کو اے نسیم — یاں رشک نوبہار کیا ہم نے کیا کیا
اُس رشکِ گل کی خواہش بوس و کنار کو — اپنے گلے کا ہار کیا ہم نے کیا کیا
دستِ جنوں سے اپنے گریبانِ صبر کو — اے عشق تار تار کیا ہم نے کیا کیا

وحشت یہ دیکھ ناصحِ مشفق نے جو کہا
ہرگز نہ اختیار کیا ہم نے کیا کیا

ایک چھوٹی سی لڑکی نے اپنے مکان کے کمرے کی چق سے ان سب کو دیکھ کر اپنی ماں سے کہا. اماں یہ دیکھو کوئی بندھوا جاتا ہے. بہت سے سپاہی ساتھ ہیں. اے اماں دیکھو تو ذری ایک عورت بھی ساتھ ہے. چچی سے کتنی صورت ملتی ہے. کیوں نا

ماں : نا بیٹی. کیوں ایسی مثال دی ہے. کیا جانے کون بیسوا ہے۔

بیٹی : اماں جان بے دیکھے جو چاہے کہ لو. ہم تو یہی کہیں گے کہ —

ماں : دیکھوں. یہ تو کوئی بیگم سی معلوم ہوتی ہے. اللہ جانے کون آفت زدی ہے. عمدہ خانم اے عمدہ خانم. ذری دریافت تو کرنا۔

عمدہ خانم نے خدمت گاروں سے کہا ارے پوچھو تو یہ سپاہی کس کو لیے جاتے ہیں. اور یہ عورت ان کے ساتھ کون ہے. خدمت گار نے جاکر ایک سپاہی سے دریافت کیا. اُس نے کہا

ہلاس اور سنگھ جی دو چور گرفتار ہوتے ہیں، اور یہ عورت بیڑن ہے۔ اس کے ہاں سب جماؤ کرتے ہیں، اور بیٹھک اُس میں ہوتی ہے یہ بڑی ٹھگن ہے۔ خدمت گار نے کہا۔ واہ شکل صورت ایسی اور کام یہ۔ واہ رے زمانے۔ افسوس ہے بھائی جوان افسوس ہے۔ آن کر عمدہ خانم کو بلایا اور کہا کہ یہ دونوں چور ہیں اور یہ عورت ایک بیڑن ہے۔ انھیں کے ساتھ کی ر

عمدہ خانم: اوئی۔ یہ بیڑن ہے۔ ناصاحب کبھی نہیں واہ وار

خدمت گار: کہتے ہیں کہ بیڑن ہے۔ کہا مانو۔ کانسٹبل کہہ چکا ہے۔

عمدہ خانم: اے ہوش کی دوا کر مردوے۔ اور سنو ہم سے زیادہ وہ موا گنوار کا لٹھ کیا جانے یہ کوئی بیگم ہے۔ بیڑن موتی چمکتی ہوتی۔ سینہ تانے ہوتی یہ بیچاری گری جاتی ہے۔ بیڑن کی ایک ہی کہی۔

خدمت گار: اچھا آئیے شرط بدیے۔ دوسو روپیہ۔ آئیے۔

عمدہ خانم: بدے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔ اور تو کیا بدے گار

اس غول بیابانی کو جو دیکھتا تھا متحیر ہوتا تھا۔ شہر میں طرح طرح کی روایتیں مشہور تھیں ایک محلے میں یاران سرپل نے مشہور کر دیا کہ شہر سے تین کوس کے فاصلے پر ایک بیڑن کے مکان میں لاش نکلی۔ دوڑ گئی تو چونتیس آدمیوں نے پولیس کا مقابلہ کیا جب شہر میں خبر ہوئی تو پلٹن بھیجی گئی۔ پلٹن کے آدمیوں نے ڈاکوؤں کو زیر کیا۔ مگر طرفین کے کئی آدمی کام آئے۔ اور وہ بیڑن اور دس ڈاکو پکڑ آئے ہیں۔ اور لاش چار پائی پر لدی ہوئی ساتھ ساتھ ہے۔

حضرات ناظرین۔ دیکھیے بات کا بتنگڑ یوں ہی بنتا ہے۔ لاش اس پیر مرد کو بنایا۔ جو علیل تھا، اور جس کو چار پائی پر لاد کر لاتے تھے۔ بیڑن اس بیچاری مصیبت زدہ سے مراد ہے۔ دوسرے محلے میں یہ خبر اُڑی کہ دریا میں خزانہ دفن تھا اس کو ڈاکوؤں نے رات کو کھودا۔ سرکار کو خبر ہوئی تو فوراً دوسو جوان مسلح ہو کر موقع واردات پر پہنچے وہاں ڈاکو توڑے کے توڑے گدھوں اور خچروں پر لاد چکے تھے، بس سرکاری سپاہیوں نے پہنچ کر باڑھ ماری۔ ڈاکو گھبرا اُٹھے اور ادھر اُدھر بھاگنے لگے مگر ایک نامی ڈاکو نے تلوار ہاتھ میں لے کر تیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اب وہ سب تو بھاگ گئے لیکن دس آدمی گرفتار ہو گئے۔ ان میں ایک نٹنی بھی ہے۔ اور گھوڑ موا آدمی بھی ڈاکوؤں کے ساتھ گرفتار ہوا ہے۔

اس خبر نے پھڑکا دیا کہ گھوڑ موا آدمی گرفتار ہوا ہے۔ اور لطف یہ کہ جس نے سنا اُس کو

یقین آگیا کہ بیشک خبر صحیح ہے۔

دو تین محلّوں میں یہ افواہ اُڑی کہ ایک عورت اپنے گھر سے زیور اور جواہرات لے کر بھاگ گئی تھی۔ اب پکڑی گئی۔ پولیس والوں نے اس کے ساتھی ایک چور کا قتل کیا اور تین چار آدمیوں کو گرفتار کر کے لے آئے۔

پیر مرد کی کھٹیا جو پچھاتی نکلی تو تماشائیوں نے اُن کو مردہ قرار دیا۔ حالانکہ وہ ابھی مرنے والے نہیں ہیں۔ الغرض جتنے منہ اُتنی افواہیں۔ ثریا بیگم اور ڈاکو اور پیر مرد حوالات بھیجے گئے۔ وہاں دو چار سپاہیوں کی تقریر کی طرف ثریا بیگم کو مخاطب ہونا پڑا۔ وہ باتیں کرتے تھے یہ چُپ چاپ سنتی تھی۔

گیان سنگھ : بھیّا ہمایوں فر کو جس نے مار ڈالا اس کو ہم نے گھوڑے پر سوار دیکھا۔ ایسا سوار ہوتا ہے کہ اس ملک میں شاید کوئی مقابلہ کر سکے۔

چاند سنگھ : اور دریا سے نکلتے ہی تھپڑ مارا تو سائیس نے بیس لڑھکنیاں کھائیں، بیہوش ہو گیا۔ آدمی زور آور ہے۔

طالب علی : اجی ہم جانتے ہیں اور جس عورت کے ساتھ رہتے تھے اُس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ وہ گوری گوری سی جوگن۔ یک رنگ جوڑا پہنتی تھی۔ کبھی دھانی، کبھی زعفرانی۔ اُس نے یہاں خوب جعل پھیلایا تھا۔ ایک ہی بدمعاش ہے۔ خدا اُس سے بچائے۔ اُن دونوں کی خوب میزان پٹی تھی۔

چاند سنگھ : آہا۔ ارے جی وہ جوگن۔ وہ چنکو۔ بستی کے باہر رہتی تھی جس کے ہاں بڑے بڑے امیر اور حاکم اور مہاجن جاتے تھے۔

طالب علی اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ثریا بیگم سے چار آنکھیں ہوئیں تو گھورنے لگے مگر اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

طالب علی : کس علت میں پھنسی ہو جی صاحب کیوں حضور۔

ہم سے لڑی نگاہ تو چشمک اِدھر اُدھر

پیدا یہ چشم شوخ نے کیا بانکپن کیا

ہم برق انداز نہیں ہیں۔ حوالدار صاحب ہیں اور اب نمبر ترقی کا ہے۔

چاند سنگھ : اب انسپکٹر ہوتے دو سو کے ہمارے حوالدار صاحب ایسے ویسے نہیں ہیں،

اور یہ مُنہ بنائے کب تک بیٹھی رہیں گی۔ ہلاس کے پکڑے جانے کا غم ہے۔ کیوں، بی بی۔ کچھ سر سے کھیلو مُنہ بھر بولو۔

ہُلاس: (ڈکار کر) خبردار۔ اس نیک بخت سے نہ بولنا نہیں جس دن رہائی پاؤں گا فوراً گھر میں گھس کر ماروں گا۔

چاند سنگھ: کس کو ایسے ویسے کو دھمکانا۔ ہم سپاہی لوگ ہیں تلوار کے دھنی۔ ہاں۔

شہزادہ سنجر سطوت اور شادی کا پیام

جوگن یعنی ثریّا بیگم کا حال تو یہاں چھوڑا۔ اب شہزادہ سنجر سطوت کا بیان ہے۔ یہ شہزادۂ رفیع الشان سمو المکان فریدوں جاہ خاقان کلاہ اسی شہر میں رہتے تھے جہاں حُسن آرا بیگم کا دولت خانہ فیض کاشانہ تھا۔ مگر یہ ایک ناکے پر رہتے تھے۔ وہ دوسرے ناکے پر ان سے اور ہمایوں فر سے بڑا تپاک تھا۔ دونوں ہم سن تھے۔ اور ایک ہی اُستاد سے دونوں نے نبوٹ سیکھی تھی۔ یہ اُن کو بھائی کہتے تھے اور وہ ان کو بھائی کہتے تھے۔ کچھ دن سے آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ مگر محبت ویسی ہی تھی۔

شہزادہ سنجر سطوت مع ارکان دولت کے جلوس فرما تھے کہ ایک مرزا صاحب جو قدیم مجرائیوں سے تھے حاضر ہوئے۔

مرزا صاحب: آداب عرض کرتا ہوں حضور والا۔ کیوں آج خدانا کردہ دشمنوں کا چہرہ کیوں اترا ہے۔

شہزادہ: تم تھے کہاں بعد مدت کے دیکھا۔ میں فضل خدا سے اچھا ہوں۔

مرزا: کیا عرض کروں حضور میں باہر چلا گیا تھا۔ مگر وہاں ایسا پھنسا کہ حضور کی زیارت کو ترس گیا۔ آنکھیں حضور کو ڈھونڈھتی تھیں۔ مگر الحمد اللہ کہ یہاں آن کر مژدۂ واجب السجدہ سُن کر باغ باغ ہو گیا۔

مژدہ آمد بگوشم دردلم گلزار شد
غنچہ شد گل شد چمن شد نافہ شد تاتار شد

حق تعالیٰ مبارک کرے۔ آمین۔

شہزادہ: بھئی وہ کیا مژدہ ہے جس سے تم ایسے مسرور ہوئے کہیں خواب تو نہیں دیکھا۔

مرزا : اے لیجیے حضور اور مجھ سے پوچھتے ہیں خدا حضور کو سلامت رکھے۔ سُنا کہ ستارۂ ہند کا خطاب ملا۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ جامے میں پھولے نہیں سماتا۔

شہزادہ : (گردن نیچی کرکے) پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے ادنیٰ ادنیٰ سے آدمی پا جاتے ہیں۔

مصاحبوں نے مرزا صاحب کا رنگ پھیکا کرنے کے لیے ان کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا۔

کلن صاحب : (ان پڑھ آدمی) میں کہتا ہوں آپ کبھی ہوش میں بھی آتے ہیں۔ مرزا صاحب۔ نہیں واللہ مجھے شک ہے۔ میرے علم و یقین میں حضور کا مجاز ہر دم بیترا بدلتا رہتا ہے۔

مرزا : واہ ری فصاحت مجاز کی ایک ہی کہی۔ واہ صاحب واہ۔

نور : کیا خوب بات فرمائی ہے۔ کلن صاحب۔ مرزا صاحب کو بڑی خوشی ہوئی کہ حضور عالم نے ستارۂ ہند کا خطاب پایا۔ گویا حضور کے لیے معراج ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس خطاب کو اعزاز ہوا ہے، اور حضور پر نور پر حکام کی ہمیشہ سے عنایت ہے۔ جب دربار میں لاٹ صاحب نے ہاتھ ملایا پہلے حضور سے پھر کسی اور سے۔ شہزادہ سنجر سطوت بہادر ہزبر جنگ کو کون نہیں جانتا۔ قسم خدا کی دور سے دیکھے تو جاہل تک کہہ دے کہ یہ اولاد بادشاہ ہیں۔ بادشاہ زادے کہیں چھپے رہتے ہیں۔

شہزادہ : ہاں مجھے خود ان کی بات کھٹکی تھی۔ مگر میں نے کہا بکھیڑا بڑھانے سے کیا فائدہ یہ کون بڑی خوشی کی بات تھی مگر۔ خیر!

مرزا : (دست بستہ) پیرو مرشد مجھے یہ کیا معلوم تھا۔ ایک نئی بات سُنی تو دل میں خوش ہوا کہ حضور کے نام کے ساتھ ایک خطاب اعزاز بھی شامل ہوگیا۔ حضور پر نور فیضگنجور امیر ابن امیر حضرت شہزادہ سنجر صولت ہزبر جنگ بہادر نجم الہند۔

نور : اجی وہ خالی سنجر صولت کیا کم ہے۔ سنجر صولت ہی سے شہزادگی برستی ہے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ یہ کیا کم اعزاز ہے کہ شہزادے ہیں۔

کلن صاحب : بعض حضرات کا قاعدہ ہے کہ سوئی کو بہرام گھاٹ کا لٹھا اور تنکے کو بالے میاں کا جھنڈا بنا دیتے ہیں۔ واہ ری دُنیا۔

شہزادہ : اب بھی خدا کی عنایت سے کوٹھے بھرے ہوئے۔ صرف زیر انداز نکالوں تو یہاں سے پکّے پل تک سڑک ڈھک جائے کارچوبی مخملی زیر انداز۔ جواہرات ٹکے ہوئے۔ اور جواہرات بھی انمول بھلا کوئی جوہری کیا کھا کے دام لگائے گا۔

مُصاحب : کیا مجال حضور۔ فقط آب و تاب اور جھلک کے دام اُٹھنے مشکل ہیں۔ جواہرات کے

دام کوئی کیا لگاتے گا۔ اے توبہ۔

نور: حق ہے۔ واللہ یوں ہی ہے۔ جگت سیٹھ ہوتا تو آب گوہر دیکھ کر پانی ہو جاتا۔ اور مجھ سے کوئی شے مخفی تھوڑا ہی ہے۔

کلن صاحب: جب پشمینے کو دھوپ دیے گئی تو اس احاطہ میں جگہ باقی نہ تھی چوبیس دن تک دھوپ دی مگر طاقے کے طاقے کھلنا باقی رہ گئے۔ خدا کی قسم کھل نہ سکے۔ ایک ایک دو شالہ دس دس لاکھ کا جی! اور وہ باریک کام کہ انسان دیکھے تو برسوں عش عش کرے پشمینہ پوشوں سے کوئی اس کی قدر پوچھے۔

مرزا: واہ رے لکھنؤ۔ اب ان کو کون کہے گا کہ یہ جاہل ہیں کس قرأت کے ساتھ الفاظ ادا کرتے ہیں۔ جاہل مطلق ہے جاہل مطلق۔ مگر گفتگو ایسی۔ تقریر سلیس اور مسلسل۔ واہ رے لکھنؤ۔

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے

اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

کلن صاحب: جاہل تو ہم ایسے ہیں کہ باہر والوں کو برسوں سبق دیں۔ ایک دیہاتی سے جو تقریر کی تو سمجھے کہ یہ بھی کوئی مولوی صاحب ہیں پوچھا جناب مولوی صاحب آپ کا دولت خانہ کہاں ہے میں نے کہا، فقیر کا کفش خانہ ایک اُجڑے ہوئے دیار میں ہے، جسے لکھنؤ کہتے ہیں۔ فرمایا وہاں کون سے محلے میں مکان ہے۔ اس (کون سے) اور مکان (مشدد) نے پھڑکا دیا۔ ہنسی کو ضبط کر کے کہا۔ بندہ فرنگی محل میں رہتا ہے۔ تب تو کان کھڑے کیے سمجھے کہ کوئی بڑے زبردست مولوی صاحب ہیں۔ مگر مرزا صاحب جہاں جائیں گنوار ہی سمجھے جائیں حالانکہ شدید پڑھے ہیں مگر وہی۔

زمحقق بود نہ دانشمند

چار پائے بر و کتابے چند

شہزادہ: (مسکرا کر) واللہ لکھنؤ، عجب مردم خیز طبقہ ہے۔ میرا خدا اور میں کہ اگر ان سے واقف نہ ہوتا تو میں بھی ان کو مولانا ہی سمجھتا واللہ۔

نور: حضور ستارۂ ہند ولایت میں بھی خطاب ملتا ہے یا نہیں۔

شہزادہ: معقول۔ یہ لندن ہی سے تو خطاب بٹتے ہیں۔ پھر کیا وہاں ستارۂ ہند کا خطاب نہ ملتا ہوگا۔ صاحب لوگوں کے نام کے ساتھ بھی ہم نے اکثر سنا ہے۔

نور: خدا حضور کو شمس الہند قمر الہند بلکہ کرسی الہند بنائے۔ آمین۔

کلن صاحب: یہ کُرسی الہند کیا معنی۔ چوکی الہند اور کرسی الہند۔ واہ۔
نور: کیوں۔ کُرسی ایک آسمان کا نام ہے کہ نہیں ہے، آپ کُرسی کے رہنے والے تو نہیں ہیں۔ شمس الہند یعنی ہندوستان کے آفتابِ تاباں۔
مصاحب: کیوں خداوند۔ یہ ہندوستان بہت بڑا ملک ہوگا۔ اس میں کوئی کروڑوں ہی آدمی رہتے ہوں گے۔
نور: کم سے کم دو چار کرور بھی کیا نہ ہوں گے۔ بڑا ملک ہے صاحب۔
شہزادہ: دو چار کرور! اٹڑی ہو کون۔ دو سو کرور نہیں کہتے۔
راوی: اس افراط و تفریط کو ملاحظہ فرمائیے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔
اتنے میں ایک رفیق نے آن کر کہا خداوند نعمت بڑا غضب ہو گیا ہائے ستم۔ حضور آسمان ٹوٹ پڑا۔ بالکل سناٹا ہو گیا۔ تمام شہر میں ہل چل مچ گئی ہے۔
شہزادہ: کیوں کیوں۔ خیریت تو ہے۔ کیا کوئی واردات ہو گئی۔
رفیق: واردات۔ حضور واردات سی واردات ہو گئی کچھ عرض نہیں کیا جاتا (روکر) پیر و مرشد حضور سُنیں گے تو رو دیں گے مگر۔

عرفی اگر بگر یہ میسّر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

شہزادہ: کیا کوئی مر گیا۔ عجب قطع کے آدمی ہو آخر اب صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کیا ہوا۔ کس لطف کی باتیں ہوتی تھیں کہ آپ برآمد ہوئے۔
رفیق: قسم خدا کی یہ بانگڑو امرا کی صحبت کے لائق نہیں ہے۔
مصاحب: واللہ ثم باللہ جو کسی اور سرکار میں ہوتا تو اب تک نکال دیا جاتا۔ تمیز سے بہرہ ہی نہیں۔ سُبحان اللہ۔
رفیق: حضور آج مرزا ہمایوں فر کی برات جاتی تھی۔ کس ٹھسّے کی برات تھی کہ غلام کیا عرض کرے۔ بس، ایک دفعہ ہی ایک شخص نے نوشہ کے چھُری بھونک دی۔ اور شہزادے گھوڑے سے گرے، دھڑ سے رفیق اور مصاحبین اور شہزادے نے متحیر ہو کر کہا۔ ایں! اب کیسے ہیں رفیق نے کہا خداوند وہ تو گذر گئے۔
شہزادہ: ارے! ہمایوں فر چل بسے، ہائے ہائے۔ بھئی ستم ہو گیا۔ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

میاں تم کو تحقیق ہے کہ گذر گئے۔

رفیق: حضور ایسا یقین ہے جیسا اس امر کا کہ غلام اس وقت زندہ ہے۔

شہزادہ: (جھلا کر) جھوٹے ہو جھک مارتے ہو۔ ہرگز نہیں مرے۔

رفیق: بجا ارشاد ہوا خداوند۔ یہ جھک مارتے ہیں۔ ہمایوں فر زندہ ہیں۔

کلن: دریں چہ شک۔

زندہ است نام فرخ نوشیروان بعدل
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیروان نماند

راوی: اچھی بے تکی ہانک لگائی۔ مگر ہم تو سنجر صولت کے قائل ہیں جھلا کے کیا جلد کہہ دیا کہ ہرگز نہیں مرے جھک مارتے ہو سبحان اللہ اور رفیقوں نے اچھی ہاں میں ہاں ملائی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک اور رفیق آئے ضیغم الدین خاں ان کے والد ماجد شاہی میں چکلہ دار تھے انھوں نے منہ بنا کر کہا۔ حضور نے تو سُنا ہی ہوگا۔ دیکھیے کیا اندھیر ہوا۔ اندھیر کیا غضب ہوگیا۔ سنجر سطوت کو اب یقین واثق ہوگیا کہ مرزا ہمایوں فر بیشک مقتول ہوئے۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور غم والم کے اشعار اور رباعیاں زبان پر لائے۔

شہزادہ: ہمارے بہت بڑے دوست تھے افسوس صد افسوس یہ کیا ہوا یارو۔ اب ہمارا دوست ہمیں کہاں سے ملے گا۔ ہے ہے یہ کیا ہوا

مال وزر و زیور و حشم ملتا ہے
ممکن ہے نگین طبل و علم ملتا ہے
عنقا گو گرد سرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتا ہے دوست کم ملتا ہے

اُف واللہ یقین نہیں آتا اور نظروں کے سامنے صورت پھر رہی ہے۔ آخر کچھ معلوم بھی ہوا کہ اس شقی سے کب کی عداوت تھی۔ اور اُس نے قتل کیوں کیا۔

خان: حضور ابھی کوئی گرفتار نہیں ہوا۔ تلاش ہو رہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کون تھا اتنا بڑا بھرتیلا آدمی ہے کہ برات کے ساتھ کوئی پچاس ہزار آدمی ہو گا۔ مگر اُس نے زخمی کیا اور اس طرح بھاگا۔ ایک بھی اس کو گرفتار نہ کرسکا اور نہ کچھ سوجھا۔

رفیق: خداوند غلام سمجھ گیا اُس کی تہ کو غلام ہی پہنچا۔ سرمہ سلیمانی اُس کے پاس ہو گا۔

خداوند اگر کوئی بدے تو ناک ناک بدتا ہوں۔

نور: حضور یہ ہے سڑی تو کیا ہوا بات پتے کی بات کہی۔

شہزادہ: بیشک۔ ورنہ بھلا ممکن تھا کہ لاکھ آدمی جمع ہو اور ایک آدمی تلوار چلائے اور نوشہ کو زخمی کرے نلوہ نکل بھاگے۔ سرمۂ سلیمانی اُس کے پاس ضرور تھا۔ اللہ اللہ کیا تاثیر خدا نے بخشی ہے۔ اور یا تو کوئی جن قابو میں ہے۔ دو ہی باتیں ہیں۔

رفقا: اعجاز۔ اعجاز۔ حضور کیا بات فرمائی ہے۔ واہ واہ وار

لالہ: حضور کوئی اگھوری بس میں کر لیا ہوگا۔

شہزادہ: کیا بکتا ہے واہی تباہی۔ اگھوری بگھوری۔

رفیق: حضور یہ ہندو کیا پاگل ہے بولے بھی تو کیا بولے۔ واہ میاں واہ۔ دیکھی تیری کالپی اور باون پُرے اُجاڑ۔ کہنے لگے اگھوری بس میں ہوگا۔ نکلوا دے ان باتوں سے پیر و مرشد۔ یہ شہزادوں اور بادشاہوں کے دربار کے لائق نہیں ہے۔

ضیغم الدین خاں نے کہا حضور بڑی تمنا تھی کہ سپہر آرا کے ساتھ نکاح ہو۔ اُن پر عاشق تھا۔ اور سُنا کہ لڑکی بھی بلا کی حسین ہے۔ قسم خدا کی اگر ہمارا بس چلے تو اُس شقی کو اس بے رحمی سے قتل کریں کہ وہ بھی جانے کہ ہاں کسی سے سابقہ پڑا تھا۔ کس کرّوفر کے ساتھ برات جاتی تھی اور اُس ٹھاٹھ سے شہزادہ ہمایوں فر سجے سجائے گھوڑے پر بیٹھے تھے۔ ان کی ماں کا حال زار دیکھ کر قلب اُلٹا جاتا تھا اس طرح زار زار روتی تھیں کہ ہائے ہائے۔

لٹ جاتی ہے اک آن میں برسوں کی کمائی
کب جاتی ہے بے جان لیے جب اجل آئی

میری نظروں کے سامنے اُن کی اور ان کے ختلی ضیغم شکار کی صورت پھرتی ہے۔

ضیغم کی جو تھی جست تو آہوئے طرارے ــ آنکھوں کو چُراتے تھے خجالت سے چکارے
ہر نعل سے خم تھا مہ نو شرم کے مارے ــ اُٹھتے تھے قدم جب تو چمکتے تھے ستارے

ہو رشک نہ کیونکر فلک ماہ جبیں کو
نقش سُم توسن سے لگے چاند زمیں کو

اور حضور خدا گواہ ہے کہ ایسی دلہن تھی کہ کسی نے کم دیکھی ہوگی۔ ہائے ہائے وہ صورت زیبا کو بھوک پیاس انسان کی جاتی رہے ہوش و حواس قائم نہ رہیں۔

نازک کہیں ہیں برگِ گل ترسے لعلِ لب
اور آب و تاب گوہرِ دنداں میں ہے غضب

شہزادہ: اُس بیچاری کا کیا حال ہو گا۔ واللہ مجھے اس ستم زدہ دُلہن کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میرے امکان میں جو کچھ ہو گا اُس سے میں دریغ نہ کروں گا اور ابھی تو نہیں کوئی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد شادی کا پیام بھیجوں گا۔

رفقا: سبحان اللہ۔ حضور قسم خدا کی حضور ولی ہیں۔ واللہ یہ ہمدردی اللہ اللہ۔ حضور ضرور پیغام بھیجیں، اور ہمایوں فر سے بھی حضور سے یارانہ تھا اُن کی روح بھی دعائیں دے گی۔ یارانہ اسی دن کام آتا ہے۔

ضیغم الدین خاں: اس میں کچھ عیب تو ہے نہیں۔ کیا معنی کہ اُن کی شادی تو ہوئی تھی ہی نہیں۔ صرف برات جاتی تھی۔ شرع کی رُو سے حضور نکاح کر سکتے ہیں۔

نور: اس لڑکی پر بڑا احسان ہو گا۔ وہ جی جائے گی بیچاری۔

کلن صاحب: ہم تو جانتے ہیں کہ دس ہی پانچ روز میں پیغام بھیجا جائے ہمارے محلے میں ایک مشاطہ رہتی ہے۔ ادھیڑ سی ہے مگر چالاک۔ اُس کو بھیجیں گے۔

مرزا: ہاں حضور۔ بہتر یہی ہے کہ عین غم اور رنج کے دنوں میں اظہارِ مطلب کیا جائے کہ اُس کا غم غلط ہو، ہمایوں فر گو حسین تھے مگر حضور سے بڑھ کر نہ تھے۔ ایک مصاحب نے صلاح دی کہ حضور کسی اخبار میں اپنا حال چھپوا دیں دو آنے فی سطر اخبار والے لیں گے کسی زبردست منشی کو بلوائیں حضور۔

کلن: اجی ہم عبارت بناتے جائیں اور لکھنے وہ جائیں۔ شاعر کو بلوائیے خدمت گار کو حکم دیا کہ داروغہ کو بلاؤ۔ داروغہ صاحب نے زمین دوز ہو کر تسلیمات عرض کی۔ حکم ہوا کہ کسی منشی کو حاضر کرو جو رنگین عبارت لکھتا ہو۔ اُنھوں نے دست بستہ عرض کی خداوند لالہ مول چند سامنے بیٹھے ہیں ان سے حضور لکھوائیں چمن تخلص کرتے ہیں۔

نور: خداوند، اُردو مسلمان ہی کی زبان ہے۔ ہندو لاکھ فاضل ہو جائے پھر ہندو زبان داں نہیں ہو سکتا کسی مسلمان کو بلوائیے۔

کلن: اجی توبہ ہندو چہ داند لسخ ہندو بھی اچھے اچھے شاعر ہوئے مگر آتش اور ناسخ اور مومن اور ذوق اور انیس اور دبیر کا مقابل کون تھا۔ کوئی نہیں۔ شیخ صاحب کے کلام کو ملاحظہ فرمائیے۔

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

شہزادہ: اور خواجہ صاحب کا کلام۔ سبحان اللہ سبحان اللہ زبان ایسی پیاری پائی ہے کہ مصرعے قند و نبات کے ریزے ہیں۔ واہ وا واہ۔

یہ کس نے باغ جہاں میں شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں
زمانہ عاشق و معشوق سے نہیں خالی
گلوں کا قحط نہیں بلبلوں کا کال نہیں

صیاد نے تسلّی بلبل کے واسطے ۔۔۔ کنج قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

رفقا: اہاہا۔ بارک اللہ بارک اللہ۔ مگر حضور نے بھی تمام دیوان کا لب لباب یاد کر لیا ہے۔ یہ تینوں شعر ایسے چیدہ پڑھے کہ پھڑکا دیا۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ۔۔۔ نہ تال کی نہ سم کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی ۔۔۔ حویلی ہے علی نقی خاں بہادر کی

شہزادے نے میر انیس صاحب کی رباعی پڑھی۔

ہر آن تغیّر ہے زمانے کے لیے
انسان کا دل ہے داغ اٹھانے کے لیے
بوڑھا ہو کہ نوجوان غنی ہو کہ فقیر
سب آئے ہیں اس خاک میں جانے کے لیے

رفقا: اعجاز اعجاز نہ کرامت۔ واہ حضور کیا رباعی پڑھ دی۔

شہزادہ: اس وقت کمال رنج ہوا کہ ہمارے دوست نے ہم کو داغ جدائی دیا۔ ہائے افسوس وائے افسوس مگر اُس کی دُلہن کے ساتھ ہمدردی ہے۔

اب سنیئے کہ نہایت غور اور فکر سے بڑی دیر تک شہزادہ سنجر سطوت سوچتے رہے کہ سپہر آرا کی شادی کا پیغام کیونکر بھیجیں۔ خدمت گار سے کہا کہ جو کتاب سب سے پہلے تیرے ہاتھ آئے اُٹھا لا۔ خدمت گار سکندر نامہ لایا۔ حضور نے اسی میں فال دیکھی۔ تو یہ اشعار نکلے۔

علم برکش اے آفتاب بلند
خراماں شو اے ابر شکین پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ
بخند اے دم برق چون صبحگاہ

اس کے بعد مرزا صاحب سے کہا کہ آپ آج کل کسی کی عروس میں شریک ہوتے تھے یا نہیں۔

مرزا صاحب: حضور شہر میں تو نہیں۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ باہر ایک قصبہ میں شریک ہوا تھا۔ آج تک کس مردود نے اپنے حساب ایسی شادی دیکھی بھی ہو۔

شہزادہ سنجر سطوت: کہاں۔ بھئی شہر کی شادیاں اور براتیں تو عمر بھر دیکھا کیے۔ مگر دیہات اور قصبات کی شادیاں دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ آپ نے کیا دیکھا۔

مرزا صاحب: حضور کیا عرض کروں مولوی احسان الحق صاحب ایک میرے کرم فرما ہیں۔ اتفاق سے ان کے وطن میں وارد ہوا۔ یہ گمان تو تھا ہی نہیں کہ مولوی صاحب ہوں گے۔ مگر خیال یہ ہوا کہ ان کا دولت خانہ ہی دیکھ لوں۔ صاحب زادوں میں سے کوئی گھر پر ہوں تو ان سے ملوں۔ خیر اس قصد سے ان کے در دولت پر حاضر ہوا۔ تو ان کے خدمت گار سے سنا کہ ابھی ابھی چھٹو میاں کے یہاں بالا قطع کرانے کی تقریب میں تشریف فرما ہوئے ہیں۔ بالا کا نام سن کر میں متحیر ہوا پوچھا بالا کی تقریب کیا [illegible]؟

خدمت گار: حضور میں خود نہیں جانتا۔ میں پردیسی ہوں۔ میاں خیرو تم بتاؤ بالا کیا کہلاتا ہے۔

خیرو: بیاہ کے پہلے یہ رسی تقریب ہے اور لوگ اس کو بالا بیونتانا کہتے ہیں۔

میں: بالا بیونتانا کہتے کس کو ہیں۔ اچھی طرح مطلب سمجھاؤ بھئی۔

خیرو: صاحب درزی آتا ہے برادری بٹورتے ہیں اور کپڑا رکھا جاتا ہے پھر دولہا کا کپڑا درزی بیونت لیتا ہے۔ یہی کا بالا کہت ہیں۔

میں: ہاں۔ مگر میاں خیرو کسی صاحب انگریز نے ایک پنڈت سے پوچھا کہ لکھنا کے کیا معنی۔ پنڈت جی نے جواب دیا کہ لکھنا مانو لکھنا صاحب سمجھے کیا خاک پھر پوچھا کہ دل لکھنا کے معنی بتاؤ مگر پنڈت جی تو سوائے لکھنا کے دیکھنا جانتے ہی نہ تھے یہی رٹا کیے لکھنا مانو لکھنا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ ہم بھی وہاں تک جا سکتے ہیں۔

خیرو: ہاں ہاں جاتے لس نہیں سکتے ہو، ہمرے ساتھی چلو صاحب آؤ۔

میں: میاں خدمت گار پھر مکان ہم کو بتا دو کچھ ہرج تو نہیں ہے۔

خدمت گار: میاں خیرو گھڑار کھدو اور ذری حضور کے ساتھ چھٹو میاں کے گھر تک چلے جاؤ۔ اور جہاں سرکار ہیں وہاں تک آپ کے ہمراہ رہو۔ سنو کہ ناہیں۔

خیرو: چلو میاں چلو ہم چھٹو میاں کی چوپار میں پہنچاتے دیتے۔

میری جو شامت آئی تو مولوی صاحب کے ملنے کے اشتیاق میں چلا اور دیکھا کہ ایک مکان کے روبرو کسی مکان منہدمہ کا ڈھیر تھا۔ اس کا نشیب و فراز برابر کیا گیا تھا۔ اس پر ایک پھٹا پرانا شامیانہ نصب تھا۔ اس میں محفل منعقد تھی۔ غرض کہ بدشواری کبھی پھسلا اور کبھی سنبھلا۔ آخر اُس بلندی پر بدقت تمام پہنچا تو وہاں انواع و اقسام کے حضرات جمع تھے۔ مولوی صاحب اس میں مثل آفتاب شمس النہار کے متمیز تھے۔ مجھے مولوی صاحب نے پہچان لیا۔ نہایت جوش الفت سے ملے۔ اپنے قریب جگہ دی۔ مگر شاید وہ تقریب ختم ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب اُٹھنے ہی کو تھے۔ وہ رخصت ہوئے۔ مجھے اپنے دولت خانے پر لائے۔ مہمان کیا میرے قیام پر مُصر ہوئے۔ قصہ مختصر اُن کے ساتھ گیا۔ اُن کے نوکر چاکر کارخانہ ماشا اللہ سب اُجلا تھا۔ گو گرمی کے دن تھے مگر مکان پختہ تھا چین سے بسر ہوئی۔ بعد نماز مغرب ایک گلی کے قریب فرش بچھا اور مولوی صاحب بھی رونق افروز ہوئے۔ اور یکے بعد دیگرے وہاں کے رؤسا جمع ہونے لگے۔ مولوی صاحب ہر ایک کی تعظیم فرماتے تھے اور ان کو بٹھاتے تھے۔ مگر اُن صاحبوں کے اوصاف میں اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ ماشا اللہ سب کے سب جاہل اور جو کچھ لکھے پڑھے تھے۔ وہ جاہلوں سے بھی افضل تھے دمبدم حقہ کی پُکار تھی جو اُس صحبت میں باتیں ہوئیں اُس کے لیے اس قدر عرض کرنا بس ہے کہ میرے کانوں نے وہ تقریر بے سرو پا کبھی نہیں سُنی تھی بات بات پر گالی مگر مشتے نمونہ از خروارے۔

ایک صاحب بولے کہ خیر التعلیخان کی چکلہ داری میں ہمارے کھیت میں للوا پاسی سوریاں لے آیا۔ اور مجھ سے نبخوانے آکر کہا۔ سنتے ہی میں آگ بھبھوکا ہوگیا۔ جس طرح بیٹھا تھا اُٹھا گجراتی میرے ہاتھ میں تھی۔ شبیر بچہ بھی تھا جیسے ہی بڑے کنویں پر پہنچا تو دیکھا کہ بھائی حسین بخش اور اللہ بخش، چچا فیض الحق (مولوی صاحب کے دادا) اور امیر الدین اور آثار احمد بیٹھے تھے۔ چچا فیض اللہ نے پوچھا کہ خیر تو ہے۔ میں نے غصہ کی آواز میں کہا کہ للوا دیکھا کہ للوا اور اس کا لڑکا آگے اور بیچ میں شیودنوا سوریاں چرا رہے ہیں۔ میں تو غصے میں تھا ہی ایک لٹھ مارا تو للوا کا بھنڈارا

کھل گیا اور باقی کو بھاگنا ہی پڑا۔

شہزادہ سنجر سطوت: ایں! یہ قساوت ۔۔۔ معاذاللہ۔ معاذاللہ بڑے شقی تھے واللہ۔ انتہائی جہالت۔

مرزا صاحب: اے حضور یہ تو ادنیٰ بات ہے یہ تو بائیں ہاتھ کا کرتب تھا عہد گذشتہ میں چلتا دھندا تھا۔

شہزادہ: بھئی تم نے جو شادی کی ترکیب دیکھی تو وہ بیان کرو۔ نئی بات سنی۔

مرزا: بہت خوب مجھ کو چار روز وہاں بسر ہوتے چوتھے روز سنا کہ برات ہے اور سنا یوں کہ ایک آدمی نہ معلوم وہ بھاٹ تھا یا نائی تھا دروازے دروازے پکار رہا تھا کہ صدیق میاں کے پوتے کی برات ہے صاحبو کپڑے دھلا رکھو جمعرات کو برات جائے گی صاحبو کہے جایت ہے۔!

قصہ مختصر مولوی صاحب نے اپنے غیر حاضر ہونے کی اجازت چاہی؟ اور معذرت کی۔ میں نے عرض کیا کہ میں اکیلا یہاں کیا کروں گا چلیے آپ کے ساتھ چلوں۔ مولوی صاحب نے براہِ عنایت منع فرمایا۔ مگر میں نے کہا کہ صاحب میں آپ کی بدولت یہاں کے مراسم پر مطلع بھی ہو جاؤں گا اور جہاں برات جاتی ہے کچھ فاصلہ بھی ایسا نہیں ہے۔ غرض کہ حضور میں باصرار ہمراہ ہوا۔ مغرب کے قریب نوشہ کے دروازے پر لوگ جمع ہوئے۔ اور جب اندھیرا ہوا تو مکان کے اندر سے نائی پکارا کہ صاحبو آؤ تو نوشہ نہلایا جائے۔ چنانچہ ہر ایک اپنے اپنے مقام سے اٹھا اور اندر محل سرا کے جمع ہوئے، تلے اوپر آدمی گرے پڑتے تھے۔ عورتیں کوٹھے پر تھیں۔ ایک گھڑا جس میں آم کے پتے گھرسے ہوئے تھے اور اس پر سیندور چاول لگا ہوا تھا اور چراغ اس پر جلتا تھا آیا۔ اور چوکی جو گیرو سے رنگی ہوئی تھی اور اس پر ناڑا بھی لپٹا تھا۔ صحن خانہ میں رکھی تھی اس پر نوشہ کو بٹھایا اور نائی نے کپڑے اتارے۔ کہاروتے کی لنگی پنھائی اور سرد پانی اوپر سے سر پر ڈالا۔ ادھر عورتوں نے بم مچایا۔ گھاٹو بندھائیے تال کھدائیے۔ مجھ کو وحشت ہوئی کہ یہ کیا ہونے لگا۔ آخر کو معلوم ہوا کہ گانا ہوتا ہے۔ اے سبحان اللہ۔

شہزادہ: میں تو خاک نہیں سمجھا۔ الفاظ ہی سمجھ میں نہیں آئے واہ واہ۔

مرزا: حضور میں نے جب تحقیق کیا تو میں بھی سمجھا۔ گھاٹو بندھائیے یعنی نوشہ خیر سے خدا نے چاہا تو گھاٹ بھی بندھوائے گا۔ اور تال کھدائے یعنی خدا نے چاہا تو تالاب بھی کھدوائے گا غرض کہ فال نیک نوشہ کے حق میں تھی اور دعائیہ گیت بھی۔ سبحان اللہ۔

شہزادہ : سبحان اللہ پھر برات تو بڑے ٹھاٹھ سے گئی ہوگی۔ ماشا اللہ کیوں۔

مرزا : پیرو مرشد سبحان اللہ۔ جب نائی نہلا چکا تو حضور وہ ہی جو بالا قطع ہوا تھا۔ وہ خلعت دولہا صاحب کے لیے حاضر ہوا اور کپڑے پنہاتے گئے۔ جامہ پائجامہ دستار مقنع سرپیچ کبھی نائی نے چوٹی باندھتے وقت اپنا انعام مانگا۔ کبھی نائی نے اپنا حق مانگا۔ آخر کو اب پگڑی باندھنے کا وقت آیا۔ جو صاحب دستار بند مخصوص تھے۔ پکڑ آئے غرض اُن کی خوشامد ہوئی۔ قصہ مختصر دولہا کو بنا چنا کر ایک اسی قسم کے گھوڑے پر جس کی تعریف مرزا سودا نے کی ہے۔ سوار کرایا۔ دھم دھم بم بم کچھ باجے بجنے لگے۔ روشنی کا بھی اول جلول سامان ہوا۔ برات روانہ ہوئی۔ نوشہ کے سر پر ایک چھتر بھی تھا جو نائی لیے تھا جیسے ہی آبادی سے باہر ہوئے براتی متفرق ہوئے۔

صرف نوشہ اور نائی اور سائیس باجے والے بھی کوئی اِدھر کوئی اُدھر۔

شہزادہ : ایں! یہ کیسی برات تھی۔

مرزا : حضور کیا عرض کروں۔ کوئی ڈیڑھ میل اسی پریشانی سے ہم لوگ چلے۔ آگے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ آدمی بیٹھے ہیں۔ وہاں برات ٹھہر گئی۔ کملی یا پھٹی پُرانی جاجم دری جو نوشہ کے ساتھ تھیں وہاں بچھائی گئی۔ برات کا ٹھاٹھ وہاں جمع ہوا۔

شہزادہ : یہ راستے میں ٹھہرنا اور ٹھاٹھ بنانا کیا معنی۔؟

مرزا : حضور، مجمع برات کو مجتمع کرنے کی سوا اس کے کیا تدبیر تھی جو آگے چلے آئے تھے وہ تو وہاں موجود تھے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے وہ بھی آن ملے۔ غرض کہ خوب دس سیرے تمباکو کے بتے اڑے اور اکٹھا ہوکر تنتے ہوتے چلے۔ ایک اور مقام پر پھر ٹھہرے جو بیبیاں برات کے ساتھ گئیں تھیں وہ ایک جُدا مکان میں جا ٹھہریں۔ غل ہوا ریشم ریشم لے چلو۔

شہزادہ : ایں! ریشم یعنی چہ۔؟

مرزا : خداوند میں بھی حیران تھا مگر معلوم ہوا کہ ساچق کی خرابی ہے۔ کوئی ریشم کہتا تھا کوئی بری کہتا تھا۔ غرض کہ جہاں بیبیاں فروکش تھیں وہاں سے ساچق کا سامان آیا۔ بینیوں میں وہ رکھا ہوا تھا کسی میں کپڑے کسی میں زیور اور پیچھے سب کے موٹی لکڑیوں کی کھانچیوں میں خدا جانے کیا تھا۔ ان کو وہاں کے بزرگ بھرے بھرے پکار رہے تھے۔ واللہ اعلم ان میں کیا تھا۔ مگر قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ پستہ کشمش سر میں ڈالنے کا مصالحہ رہا ہوگا۔ غرض کہ نوشہ کو اسی مکان میں چھوڑ کر براتی ساچق لے کر گئے اور عروس کے یہاں پہونچا کر پھر

اُسی کلبۂ احزان میں پلٹ آئے۔ جہاں نوشہ صاحب ٹڑون ٹون بیٹھے ہوتے تھے۔

شہزادہ: بس برات ہو چکی۔

مرزا: نہیں حضور ابھی۔ حضور سماعت فرمائیں کہ آگے ہوتا کیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چند مُسن صاحب اور دو ایک نوجوان نوشہ کے واسطے خلعت لائے۔ ماشا اللہ۔ چشم بد دور کپڑے نوراً علیٰ نور۔ غرض کہ وہ کپڑے پنہاتے گئے۔ سہرا باندھا گیا۔ نوشہ جو اپنے گھر سے جامہ اور پگ باندھ کے گئے تھے۔ وہ نوشہ کے نائی نے اُٹھا لیا۔ اور اپنے زیب سر کیا۔ وہ دوسرے نوشہ بن گئے۔ اب تکرار شروع ہوئی۔

عروس کا نائی: بھری ہوئی مجھے عنایت ہو۔

مہتمم جامہ پوش: ایں ایسی شادی میں دس ٹکے ملتے ہیں۔

مالی: پندرہ ٹکے مجھے دیجیے۔

بھاٹ: آٹھ ٹکے مجھے دیجیے۔

غرض کہ ہر مانگنے والا مانگ رہا تھا اور نوشہ کی طرف سے جو مہتمم تھے وہ ہر بار یہ فرماتے تھے کہ یہ بڑھیا بیاہ کا دستور ہے عروس کے جانب دار اپنے نائی مالی بھاٹ کے طرف دار تھے چھٹومیاں فرماتے تھے کہ بھائی دے بھی دو مگر مہتمم ناخوش ہوتے تھے۔ کہ دستور کیوں بگاڑتے ہو۔ آخر کار تصفیہ ہوا۔ ہر ایک کو پیسے دیے گئے۔ جب ان امور سے انفراغ ہوا پھر برات سجی گئی۔ دھم دھم ہوتا ہوا اور فٹ فیر آتشبازی چھوٹتی ہوتی آگے آگے بھاٹ بولتا ہوا برات بڑھی۔ عروس کے دروازے پر نوشہ صاحب پہنچے تو کئی گنوار عورتیں نکلیں اور اُنھوں نے خوب اپنی زبان میں براتیوں کو صلواتیں سُنائیں پھر میاں نوشہ کے گھوڑے کے سموں کے نیچے پانی ڈالا اور چھڑیوں سے اُن کو ٹھونکا۔ اس طرح جب براتی گالی کھا چکے اور نوشہ پٹ چکے تو پھر اُس مقام پر جو برات کے اُترنے کے لیے مخصوص تھا، وہاں پلٹ گئے۔

شہزادہ: آپ نے بھی گالیاں کھائیں۔

مرزا: حضور کیوں نہیں کرگا چھوڑ تماشے جائے ناحق چوٹ جولاہا کھائے پھر اتنا تو گناہ تھا کہ شریک جرم عروس کے لانے کا ہوا تھا۔

شہزادہ: بھلا پھر کیا ہوا۔

مرزا: حضور جس مقام پر نوشہ بٹھایا گیا اُس کا نقشہ بھی حضور سُن لیں۔ چھاتی بھر کرسی اور ایک زینہ

جب تک کوئی اُوپر سے ہاتھ نہ دے کُرسی پر چڑھ نہ سکے۔ تین طرف اُس کے دالان اور ایک سمت کُھلا ہوا۔ ہر دالان سربسجود۔ ہر ایک اینٹ جداگانہ۔ استرکاری نکمی۔ صحن خانہ کیا گویا کھتا ہے۔ اس پر شامیانہ بھی چھینٹ کا چھپا ہوا۔ مگر واقعی چھاپنے والے نے کام کیا تھا۔ نہایت خوشخط بوٹوں کے درمیان میں کہیں لاالہ الااللہ آدم صفی اللہ۔ تو کہیں لاالہ الااللہ نوح نجی اللہ لکھا تھا۔

شہزادہ: بھئی اور کہیں محمد الرسول اللہ نہ تھا۔

مرزا: نہ حضور وہ تو قبل بعثت جناب رسول خدا کے بنا تھا۔ اُس واسطے حضرت خاتم النبیین کا نام ہی چھاپنے والے کو معلوم نہ تھا۔ وہ کہاں سے لکھتا۔ غرض کہ خداوند ایک سینی میں خشکہ اور گھی اور شکر آیا۔ اُس کو وہاں کے بزرگوار تھال کہتے تھے۔ وہ نوشہ کے روبرو رکھا گیا۔ جو لونڈے اُس کی تاک میں آنکھیں پھاڑے بیٹھے تھے۔ جمائیاں لے رہے تھے۔ گرد ہوئے۔ نوشہ نے نام چار تو کھالیا۔ باقی اُن چھوکڑوں نے ہاتھ صاف کیے۔ پھر نائی کو کچھ دیا گیا۔ میں دور تھا۔ نہیں دیکھا۔ مگر غالباً پانچ ٹکے دیے ہوں گے۔ اس لیے کہ نائی کی لیاقت بھی اس سے زیادہ بار اُٹھانے کی نہ تھی۔ اِدھر تو یہ ہو رہا تھا۔ اُدھر عُروس کے دروازے پر غل ہوا۔ الغرض میں وہاں خراماں خراماں جا پہنچا۔ دیکھا کہ عجب تماشا ہے۔ براتی ایک ایک فرعون بے سامان ہے۔ سواری میں گدھے کے برابر ٹٹو۔ اور اُس کے لیے دو سیری دانا۔ اور ٹٹوؤں کو گھاس کی مانگ۔ کوئی کہتا ہے لکڑی چاہیے کوئی بیال مانگتا ہے۔ کوئی یہی کہہ رہا ہے کہ حقّہ لاؤ حقّہ لاؤ۔ کوئی تمباکو غرض کہ عروس کی جانب سے جس قدر مہتمم تھے اُن کو بوکھلا ڈالا۔ میں نے تو ایسے نادہندے عمر بھر نہیں دیکھے۔ خداوند مدار یے حقّے دھیلے والے اُن کے نزدیک چاندی کے حقّوں سے بڑھ کر تھے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ دو چار۔ جمع کر لوں۔ کہ سال بھر اُن کو گھر میں پیوں نعوذ باللہ۔

شہزادہ: پھر وہ سارے براتی اُسی مکان میں ٹھہرے رہے اور کب تک مقیم رہے۔

مرزا: عرض کروں کہ وہاں۔ بجز نوشہ اور اُس کے عزیزوں کے کوئی بھی نہ تھا۔ جہاں جس کے سینگ سماتے چل دیے۔ جس طرح مرد متفرق تھے عورتیں بھی متفرق تھیں۔ مگر میرا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ اس لیے وہیں نوشہ کے ساتھ مجھے رہنا پڑا۔ مولوی صاحب نے بھی بہت تکلیف اُٹھائی۔ اس واسطے کہ وہ بھی عادی ایسی تقاریب کی مشارکت کے نہ تھے۔ میں نے ساری رات جاگتے کاٹی اُن صاحبوں کی جو عروس کے گھر کھانا پکوا رہے تھے بے چینی میں رات بسر ہوئی۔ میں حیران تھا کہ وہ کیوں اس قدر پکوا رہے ہیں۔ اس واسطے کہ براتی تو شاید ستر آدمی سے زائد نہ تھے۔ لیکن صبح کو عقدہ کھلا جیسے ہی صبح کی نماز سے میں فارغ ہوا تو دیکھتا ہوں دھنے جولاہے حلال خور آلم غلم لڑکے لڑکیاں دباتے چلے آتے ہیں۔ وہ سب اُسی

مقام پر جہاں نوشہ فروکش تھا دھوپ میں آ آ کر ٹھہرے۔ کچھ دن چڑھے عروس کی جانب سے تقاضا ہوا کہ صاحبو کھانا حاضر ہے۔ اب براتی ڈھونڈھے جانے لگے تو کوئی مہدی میاں کے کھلیان میں کوئی گھسیٹے میاں کی چوپال میں کوئی موسیٰ میاں کے امام باڑہ میں۔ نائی پر نائی اور آدمی پر آدمی جاتا ہے۔ کوئی آتا ہے کوئی نہیں آتا ہے۔ کوئی طعنے دیتا ہے کہ ہمارے گھوڑے کو رات گھاس نہیں ملی۔ ہم آویں گے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہم کو حقہ نہیں ملا کسی کا عذر ہے کہ ہمارے یہاں تمباکو نہیں پہنچا۔ کوئی طعنہ دیتا ہے کہ ہم کو بینگیں نہیں دیں، اب ایک طرف عروس کے جانب دار معذرت کرتے مناتے پڑے پھرتے ہیں۔ دوسری جانب نوشہ کے اعزا۔ آخر بہزار خرابی کسی نہ کسی طرح وہ منائے گئے۔

شہزادہ: کسی نہ کسی طرح کیا معنی۔

مرزا: خداوند گالی گفتہ بھی ہوا۔ کشاکشی بھی ہوئی۔ جوتی پیزار بھی ہوئی۔ توبہ! توبہ خدا کی پناہ سب تھکا فضیحتی بھی ہوئی اور خوشامد بھی ہوئی۔ آخرش اب سب بھائی بند اُسی مکان میں جمع ہوئے اور چھوٹے بڑے مکان میں بیٹھے۔

اس گفتگو کے بعد شہزادہ سنجر سطوت نے ایک مصاحب خاص کو حکم دیا کہ کل کسی مشاطہ کو ضرور لاؤ۔ اس کو ہم اپنے طور پر سمجھائیں گے۔ ابھی تو دس بارہ روز تک نہ چھیڑنا چاہیئے۔ کیا معنی کہ تازہ زخم ہے۔ اس پر مرزا صاحب نے کہا حضور وہ کبھی منظور نہ کریں گی بڑی بیگم زہر کھالیں گی اگر سپہر آرا کی اب شادی ہوئی۔ اور شرفا میں اب یہ بات جائز کہاں ہے حضور!

شہزادہ: ہم شرفا کی بات نہیں مانتے۔ بس!

راوی: بجا چلیے جھگڑا گیا۔

شہزادے کے دربار میں ایک شخص نے کہا کہ حضور آج ایک کب راج کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ شاعری کے علاوہ اشراق میں بھی دخل رکھتے ہیں۔ اس پر مرزا صاحب نے فرمایا۔ حضور بھی کسی شاعر کو حکم دیں۔ شہزادہ بہادر نے ایک شاعر سے کہا کہ آپ ہمارے نکاح کی تاریخ موزوں فرمائیے مگر بحر اور وزن اور توضیع اس غزل کے مطابق ہو۔ اور کلام فارسی ہو۔

شادیٔ جلوۂ گلفام مبارک باشد
عیش و عشرت کا سرانجام مبارک باشد

اتنے میں مرزا صاحب نے کہا خداوند دیہات ــــ کی شادی کا حال پورا پورا حضور سن لیں۔

مرزا صاحب: پہلے جولاہوں کے یہاں سے تھان اُٹھ آئے۔ اور وہ ہر صف کے آگے، پھاتے گئے۔ اُس پر کھانا آنا شروع ہوا۔ خداوند چار روٹیاں اور دو پیالے گوشت کے اور دو رکابی پلاؤ کی۔ یہ دوہرے حصے تھے۔ ایک رات کا کھانا تھا۔ دوسرا دن کا میں کھانے کی نسبت تو سوا اس کے اور کچھ نہ کہوں گا کہ وہ اُنھیں حضرات کے لائق تھا۔ وہ حضرات اس کے لائق مگر جان دیتے تھے کوئی بیٹے کا حصہ مانگتا تھا کوئی بھائی کا بھتیجے کا بڑا اُبلڑ اور غل تھا۔ غرض کہ جن کو وہاں اشراف کہتے ہیں اُس سے لے کر جن کو وہاں پاجی سمجھتے ہیں۔ ان بیچاروں تک اسی طرح کھانا بٹ گیا اور رفتہ رفتہ وہ روٹیاں اور پیالے اور رکابی رومالوں میں باندھ باندھ اور جوتیاں بغل میں دبا کر رفوچکر ہوتے۔ بجز نوشہ اور اس کے عزیزوں کے کوئی بھی نہ رہ گیا۔ اُنھوں نے کچھ زہر مار کیا۔ مولوی صاحب نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ ایک دوست کے یہاں جا کر مجھ کو کھانا کھلوایا۔ خود بھی نوش فرمایا۔ عورتیں بیچاری جو متفرق جگہ اور مقاموں میں اُتری تھیں اُن کا حال معلوم نہیں۔

شہزادہ: بھلا وہ رسوم شادی تو بیان کیجیے۔

مرزا: پیر و مرشد پھر شام ہم لوگ نوشہ کے ساتھ بیٹھے رہے۔ بعد نماز عصر کے سواریاں نوشہ کی ہمراہی بیبیوں کی عروس کے یہاں جانے لگیں۔ غل تھا کہ بہتری روبن اور جلوہ ہو۔

شہزادہ: معقول اور تو اور یہ بہتری اور جلوہ یعنی چہ۔

مرزا: خداوند یہ دونوں لغت ہیں۔ قاموس اور منتخب میں تو ان الفاظ کا پتا ہی نہیں۔ الاکتاب الواح القصبات میں مرقوم ہے کہ جو بیبیاں عروس کے لینے کو جاتی ہیں اُن کو بہترین کہتے ہیں۔ یا شاید یوں ہو کہ قصبے کی بیبیوں میں جو بہتر ہوتی ہیں۔ وہ عروس کے لینے کو جاتی ہیں۔ جلوہ اُس رسم کو کہتے ہیں کہ دُلہن اُن کے مجمع میں آکر بیٹھتی ہے۔ اُس پر دھان کی کھیلیں پھینکی جاتی ہیں۔

شہزادہ: خیر شادی کیا سوانگ ہوتا ہے۔

مرزا: خداوند ایک سوانگ شہر و قصبات ہر جگہ شادیوں میں طرح طرح کے سوانگ ہوتے ہیں۔ یورپین گو بڑے مہذب ہوتے ہیں۔ مگر اُن میں بھی سُنا ہے کہ شادی میں جب عروس کو نوشہ لے کر رخصت ہوتا ہے تو اپنی رسم ادا کرتے ہیں۔

شہزادہ: (متحیر ہو کر) ہاں! ہم نے اس کا حال نہیں سُنا۔

مرزا: حضور گھوڑوں سے ٹوٹے اور پھٹے پرانے کپڑے اُٹھا کر رکھتے ہیں۔ اُن کو سی کر دولہا پر پھینکتے ہیں۔ جس وقت دُلہن کو دولہا لے کر چلا تو جس قدر اہل مجلس ہوتے ہیں وہی کپڑا اُولے کی طرح برساتے ہیں۔

شہزادہ: تو یہ کہیے کہ رسوم شادی کے مہذب اور غیر مہذب سب میں یکساں ہیں۔

مرزا: خداوند ہے تو یہی پھر میں نے سُنا کہ عروس کے یہاں بیٹا کے رخصت کرنے کی تقریب ہے۔ یہ سُن کر میرا شوق چرّایا کہ ذرا دُلہن کے یہاں جاکر دیکھوں کہ وہاں کیا ہورہا ہے۔ مولوی صاحب نے تو اس مجمع میں شرکت سے بوجہ اس کے کہ وہ نوشہ کے طرف دار تھے۔ جانے سے انکار کیا۔ بندہ تو صرف تماشائی تھا۔ اس لیے میں چلا گیا۔ تو وہاں کا عجیب سماں تھا۔ ایک کھنڈل میں قریب کھیری کے جو اُس سے جاری تھی ایک ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ اُس پر ایک نہایت بوسیدہ اور میلی چاندنی تھی۔ اور اُس پر پچاس ساٹھ جوان بوڑھے بیٹھے ہوئے مٹی کے بھدے بسل حقّے اور سولہ سیرے مہوے کا خمیرہ اُڑا رہے تھے۔

شہزادہ: ایں مہوہ کا خمیرہ کیسا۔

مرزا: جی حضور مہوہ ایک درخت ہوتا ہے۔ اُس کے پھولوں سے شراب بنتی ہے۔ چونکہ وہ شیریں ہوتا ہے۔ بجائے گڑ کے اسی مہوہ کو وہاں کے بزرگوار تمباکو میں ڈالتے ہیں۔

شہزادہ: تو وہ تمباکو منشی ہوتی ہے۔

مرزا: نہ خداوند نشہ وشہ تو کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اس کی بھبھک اور بدبو ایسی ہوتی ہے کہ ہم لوگوں میں سے تو کوئی اس کو پی نہیں سکتا۔ عرض کروں قصہ مختصر اسی فرش پر ایک صاحب جن کے چہرے سے آثار امارت اور لباس سے فرتمکنت برس رہی تھی جلوس آرا تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو ان صاحب نے فرمایا کہ آپ چکلہ دار تھے۔

خیر اور کئی سربراہ کار بھی تھے۔ وہ لوگ بھی تھے کہ جو اس قسم کے تعلقہ داروں کا جو خود انتظام اپنے دیہات کا نہیں کرسکتے اور سرکار سے ان دیہات کے منتظم ہوتے ہیں، آئے تھے مدرسوں کے دیکھنے والے جو ڈپٹی کہلاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ چکلہ دار کون ہیں تو ان صاحب نے فرمایا کہ خیر سے دوسو روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ فوج داری اور مال کے حاکم ہیں تو میں سمجھا کہ شاہی کے ہیں۔ یہ میں پوچھ ہی رہا تھا کہ ایک شخص نہایت میلے کچیلے پھٹے کپڑے ٹوٹا جوتا پہنے ہوتے تشریف لائے۔ یکبارگی للکارے۔ السلام علیکم لوگوں نے اُن کی تعظیم دی۔ اور وہ جھپ سے ایک صاحب کا پہلو دبا کر زانو

بزانو ہو بیٹھے، تب تو مجھ کو بہت حیرت ہوئی۔ مگر دل میں سمجھا کہ ان میں کوئی بڑا وصف ہو گا۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر

تو چہ دانی کہ درین گرد سوارے باشد

اور انس فضیلت کے اعتبار سے یہ اعزاز ہے کہ اُن صاحب کا پہلو دبا کر تشریف فرما ہیں لیکن جب اُن کی گفتگو سُنی تو معاذ اللہ۔

شہزادہ: کچھ تو فرمایئے کہ ان کی تقریر کیا تھی۔

مرزا: کیا عرض کروں اور کہاں تک حضور کو ہنساؤں۔ مگر اس قدر کافی ہے (جیل خانے میں جو کچھ تکلیف ہوئی اُدھر بیان اور بلھاں تو کہاں نوکری پر افیم نہ ملیکا بڑا اعجاب آہے) یہ سن کر میں چونکا کہ ماشا اللہ اس دھج پر آپ چلنا بیگم پر بھی عاشق ہیں۔ اور خیر سے جیل خانہ بھی دیکھ آئے ہیں۔ باوصف ان اوصاف کے پھر چکلہ دار صاحب کے پہلو میں خداوندا اب چکلہ دار صاحب پر شک ہوا کہ غالباً کوئی نائی دھوبی ہوں گے۔ مگر میں نے وہاں تحقیق اور تفتیش کو ملتوی کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اور دیکھا کہ نوشہ گھوڑے پر سوار اور براتی دُلہن کے دروازے پر آئے۔ اور عروس محافے میں سوار ہوئی۔ میں نے سولہ کہار محافے کے گرد دیکھے جو محافہ اُٹھانے کو تیار تھے۔ میری عقل جاتی رہی دولہن کوئی دیونی ہے یا کیا اسرار ہے جو سولہ کہار اُٹھانے کو مجتمع ہوتے ہیں۔ غرض کہ جوں ہی محافہ اُٹھانے کو کاندھا کہاروں نے لگایا۔ ہر ایک کانکھنے لگا۔ بمشکل آٹھ کہاروں نے اس محافے کو اُٹھایا اور وہ محافہ آگے، دس بارہ براتی آگے پیچھے ہوتے، نوشہ گھوڑے پر پیچھے پیچھے ہمراہ ہوا۔ بندہ مولوی صاحب کے ساتھ آکر اس ڈولے کے ساتھ چلتا ہوا۔ مگر ایک میل پر جاکر میرا وہ شک رفع ہوا کہ دیونی کے ساتھ نہیں ہوں۔ انسان کے ساتھ ہوں۔

شہزادہ: (قہقہہ لگاکر) یہ تو فرمایئے آپ کا رفع شک کیوں کر ہوا۔

مرزا: حضور محافے کا بانس تڑسے دو ٹکڑے ہوگیا۔ محافہ دھم سے زمین بوس ہوا۔ اُس وقت سارے ہمراہی گھبرائے۔ کوئی پردہ ہٹاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ بانس دوسرا منگواؤ کوئی کہتا تھا کہ اور ڈولیاں لاؤ۔ آخر کو پانچ ڈولیوں میں اُس محافے کی سواریاں منقسم ہوئیں۔ پھر دوسرا بانس لائے اور محافے میں لگایا لیا۔ تب وہاں سے چلتا ہوا۔ اس عمل تقسیم سے ثابت ہوا کہ خیر سے مع دُلہن اس میں سات بیبیاں سوار تھیں۔ اس وجہ سے وہ محافہ سنگین تھا۔ سولہ کہاروں کے اُٹھائے اُٹھ نہیں سکتا تھا۔

شہزادہ : نسوان اور مرد وہاں کے سارے ندیدے ہی تھے۔

مرزا: خداوند کسی وقت میں چاہے اُن کے پاس کچھ رہا ہو، اب تو مفلس قلاش ہیں۔ مشہور ہے کہ مفلسی سب بہار کھوتی ہے۔ قصہ مختصر دُلہن کو نوشہ کے گھر پہنچایا۔ بسلامت مولوی صاحب کے یہاں آئے۔ پھر معلوم نہیں کہ اور کیا کیا رسوم ہوتے۔ اور میں نے تو کان پکڑے کہ اب کوئی باندھ کے بھی لے جائے تو اس تقریب میں نہ جاؤں۔

شہزادہ : بھلا یہ تو بتلایئے کہ چکلہ دار صاحب کی بابت آپ نے کچھ تحقیق کی۔

مرزا: خداوند ہاں ماشا اللہ متشیّن چوکھے۔ سیّد شریف اور نہایت ___ قابل ومشہور وممتاز صاحب تھے۔

شہزادہ : پھر ایسے نامعقول کی صحبت میں اُن کو جانا اور ایسے جُہلا میں بیٹھنا اور سزا یافتہ کے ہم پہلو ہونا کیونکر جائز تھا۔

مرزا: خداوند وجہ یہ ہے کہ ان سزا یافتہ کے فرزند سے ان صاحب کی لڑکی منسوب تھی۔ بیاہ ہونے والا تھا۔

شہزادہ : معقول یہ اور بھی بڑھ کے ہوئی۔ بھلا ایسے نااہل کا لڑکا اور چکلہ دار کی لڑکی۔

مرزا: اُن نااہل کے فرزند باپ سے بھی بڑھ کر کہیں نااہل ہیں۔ اور علم وتہذیب کو پاس پڑوس میں نہیں رکھتے ہیں۔ مگر خداوند رسم اور دستور۔

شہزادہ : یہ کیسا دستور۔؟

مرزا: خداوند وہ نااہل متشیّن تو تھے اور خاندان کے اچھے مشہور تھے۔ پھر اُس سے افضل کہاں ملتا۔ ان کے سوا چکلہ دار صاحب کی دختر کس کو بیاہی جاتی۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ چاہے مفلس ہوں، چاہے اجہل اُجڈ اور غیر مہذب جاہل مگر شادی بیاہ آپس ہی میں ہوتا ہے۔ اس سے الگ ہوا اور نسل بگڑی اور کمینہ پاجی بن گیا۔

شہزادہ : جاہل کو اشراف بھی کہہ سکتے ہیں۔

مرزا: آپ چاہے نہ کہیں وہ تو اپنے کو کہتے ہیں۔

شہزادہ : بھلا اُن کو کوئی اور بھی اشراف سمجھے گا۔

مرزا: حضور ہاں جو اُن کو پہچانتا ہے وہی شریف کہہ سکتا ہے اور نہ کہے تو مار نہ کھائے۔

شہزادہ : بھلا جو نہیں پہچانتا وہ بھی شریف کہتا ہے۔
مرزا : تو یہ جو نہیں جانتا اُس کی نگاہ میں تو قصاب اور کنجڑے سے بھی وہ بد تر ہیں۔
شہزادہ : پھر آپ وہاں سے چلے آئے۔
مرزا : حضور! دوسرے روز اور مولوی صاحب کے یہاں میں رہا۔ اس روز شام کو ایک مولانا صاحب بھی مولوی صاحب کی ملاقات کو آئے۔ واقعی وہ بھی بہت لائق اور باکمال تھے۔ قصباتی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ مگر وہیں کے رئیس اور سادات میں سے تھے۔ حقیقت میں میں ان کی امارت سے نہایت ہی خوش ہوا۔ میں نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ مولانا یہ کیا وجہ ہے کہ چکلہ دار صاحب کی صاحبزادی جاہل کے لڑکے کے ساتھ بیاہی جاوے گی۔
مولانا : ہمارے یہاں شادی بیاہ کے واسطے محدود طبقہ ہے۔ معدودے چند آدمی ہیں۔ انھیں میں بیاہ شادی ہونا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے قبیلہ اور طائفہ مقرر فرمایا ہے۔ سورۂ حمد میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو پہچان کے لیے نسبوں اور قبائل میں تقسیم کیا۔ لہٰذا ضرور ہوا کہ جس قبیلہ اور طائفہ میں جو مخلوق ہوا۔ اُسی میں وہ رہے۔ حکمت بالغہ حق تعالیٰ میں یہ امر اس لیے ضرور ہوا کہ اب اس طائفہ میں اہل ہو یا نا اہل ہم لوگ رہیں۔ اہل اور نا اہل ایک عارضی شئے ہے۔ نا اہل اہل ہو جاتا ہے۔ اور اہل نا اہل۔
میں : حق ہے حق ہے۔ بجا ارشاد ہوا مگر یہ تو مولانا آپ نے سُنا ہو گا کہ حضرت نوح کا صاحبزادہ کہلاتا تھا۔ حق تعالیٰ نے اُس کو نا اہل فرمایا۔ پھر وہ کیوں اہل نہ ہوا۔ حق تعالیٰ نے قبائل اور طائفے اس لیے مقرر فرمائے کہ شناخت آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ ممکن ہے کہ ایک نام کے چار آدمی ہوں۔ اُن کے باپ کے بھی وہی نام ہوں۔ مثلاً چار عبداللہ ابن عمر ہوں تو اُن کی شناخت کے لیے طائفہ کا نام لیا جائے۔ تا معلوم ہو سکے کہ کون عبداللہ ابن عمر۔
مولانا : بجا ہے۔ مطلب قبائل اور نسبوں سے یہی تھا۔ اسی کی پیروی تو ہم کرتے ہیں۔ اپنے قبائل کو قائم رکھتے ہیں۔ اگر ایک برادری سے نکل جائے تو پھر حاجت اس کی نہ ہو سکے۔
میں : جنابِ من! یہ بھی تو اسی آیت میں ارشاد ہے کہ بزرگ وہ ہے تم میں سے جو پرہیز گار ہو۔
مولانا : ہاں یہ تو صحیح ہے مگر عرض کیا نہ کہ پرہیز گار غیر پرہیز گار بھی ہو سکتا ہے۔ ہر مسلمان پر گمان پرہیز گاری کا کرنا چاہیے۔
میں : بجا ارشاد ہوا مگر کیا آپ کے قبیلہ کا ایک مرد دوسرے قبیلہ سے جورو بہم پہنچائے تو مرد کا قبیلہ

ضائع ہو جائے گا۔

مولانا: نہیں ضائع تو نہیں ہو گا۔ بے شبہ باپ کے نام سے جو قبیلہ مشہور تھا، وہ قائم رہے گا۔ مگر اُس کے باپ اہل قبیلہ اس کے اس فرزند کو جو غیر قبیلہ کی زوجہ سے ہو گا حقیر سمجھیں گے۔

میں: آخر اس کی وجہ۔؟

مولانا: سید صاحب! ہمارے یہاں منجملہ اور اوصاف عدل کے مروت بھی ہے۔ مروت اُس کو کہتے ہیں کہ جو رواج جہاں ہو اس کو معمول رکھے۔ جس سے خلاف رواج کوئی حرکت صادر ہو۔ وہ منافی مروت کے ہوگی۔ جو مروت سے مخالف ہو گا۔ وہ عدالت کو ساقط کرے گا۔ پس انگشت نما ہونا بڑی فضیحتی ہے۔

میں: ارشاد ہو کہ یہ سہرا باندھنا۔ کنگنا باندھنا۔ اور جس ترکیب سے مراسم شادی آپ کے قصبہ میں ہوتے ہیں یہ جائز ہیں۔

مولانا: سنیئے اصل ہر شے کی مُباح ہے۔ جب تک نہی نہ ہو پس شرع میں کوئی فعل جو آپ نے فرمایا ممنوع نہیں ہے۔

میں: اور جو امور رسولؐ خدا نے خود نہیں کیے۔

مولانا: ان کے کرنے میں کوئی عیب نہیں۔ تاوقتیکہ رسول خدا نے منع نہ فرمایا ہو۔

میں: جو امور رسولؐ خدا نے کیے ہوں ان کو نہ کرنا کیسا ہے۔

مولانا: اگر جناب رسولؐ خدا نے کوئی امر خود کیا اور اس کے کرنے کا ہم کو حکم نہیں دیا تو ترک کرنا جائز ہے۔

میں: آیا ہو سکتا ہے کہ جو فعل رسولؐ خدا نے کیا ہو، وہ مروت کے منافی ہو۔

مولانا: استغفر اللہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

میں: ارشاد ہو کہ سُود لینا ایک نواح میں رائج ہے، اور ایک نواح میں نہیں۔ فرمائیے کہ نہ لینے والا وہاں انگشت نما ہو گا۔

مولانا: ہوا کرے سود لینا خلاف حکم خدا و رسول ہے۔

میں: بیوہ کا نکاح کرنا کپڑوں میں پیوند لگانا باعث بدنامی اور رسوائی ہے۔ بازاری اشیا خرید کر کے خود اُٹھالانا دستور اجداد کے منافی ہے۔ اگر کوئی باورچی کو اپنے سامنے آٹا دلاتے گھی نمک

مصالحہ دیکھ کر دیوے تو کنجوس اور مکھی چوس کہلائے۔ فرمائیے یہ سب خلاف مروت ہے۔
اب تو مولانا صاحب اور کچھ کہنے کو تھے مگر رات زیادہ آگئی تھی جمع برخاست ہوا۔

شہزادہ: تم نے بیوہ کے نکاح ثانی کا مذکور کیوں کیا۔ تم بیوہ کا نکاح ہونا پسند کرتے ہو۔

مرزا: اے خداوند رنڈوے کا نکاح ثانی اگر آپ پسند فرماتے ہیں۔ تو رانڈ کا میں پسند کرتا ہوں۔ جس دلیل سے آپ رنڈوے کا بیاہ کرنا روا رکھتے ہوں، وہی ہمیشہ رانڈ کے واسطے بھی ہے۔

شہزادہ: مرد کے لیے تو چار جورو کرنا روا ہے۔ پھر عورت کے لیے کیوں نہیں ہے۔

مرزا: پیرومرشد! مرد کے لیے بھی چار جورو ضرورت مشروط بعدالت جائز ہیں، نہ عیاشی کے لیے۔ مرد کی چار جورو مختلف ہونے سے اولاد کی شناخت میں کہ کس کا فرزند ہے کوئی شبہہ پیدا نہیں ہوتا۔ خلاف اس کے ملاحظہ فرمائیے۔

شہزادہ: یہ تم نے کیا مولانا سے کہا کہ باورچی کو کوئی نون تیل تول دے تو عیب نہ سمجھا جائے۔

مرزا: حضور بڑے آدمی ہیں۔ فضل الٰہی سے نوکر چاکر کارباری آپ کی جان و مال کے بہت سے محافظ ہیں۔ آپ اگر نون تیل نہ دیکھیں تو اور ہے۔ مگر آپ پر بھی ضرور ہے کہ کسی معتمد کو اس کام پر مقرر فرمائیں کہ وہ خود دیکھے۔ اور کسی طرح غفلت نہ کرے مگر ہم لوگ تو آپ کی برابری نہیں کر سکتے۔ ضرور ہے کہ جو چیزیں ہم کھاتے ہیں، اُن کو بخوبی دیکھ لیں کہ وہ خالص ہیں۔ فرمائیے کہ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو اُس کو جو دوائیں کھلائی یا پلائی جاتی ہیں۔ اُن میں کس قدر احتیاط ہوتی ہے مگر تعجب ہے کہ حالت صحت میں غفلت کی جاتی ہے۔ جو اشیا کہ کھائی جاتی ہیں اس کی بابت کچھ خبرداری نہیں ہوتی۔ آخر وہی بے احتیاطی بیمار ڈالتی ہے۔ کیا مضائقہ ہے کہ خالص گھی باورچی کو دیا جائے اور وہ ناقص گھی جس میں کوئی مضر شے آمیز ہو ڈال دے۔

شہزادہ: بھئی مجھ کو چکلہ دار صاحب کی لیاقت سے بہت بعید معلوم ہوا ان کی صاحبزادی جاہل سے بیاہی گئی۔

مرزا: حضور زیادہ تر تعجب کریں گے۔ خداوند میں نے سنا کہ وہ صاحبزادی ذی علم ہے۔

سواری

شہزادہ قمر طلعت مرزا سنجر سطوت گو پڑھے لکھے امیرزادے تھے مگر ہفتہ میں دو تین بار عقل سے

پرنخ چل جاتی تھی۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے یہ سوجھی کہ عروسِ ماہ سیما اور اُس کے ایوان دلکشا کو چل کے دیکھیں۔ مشاطہ کامل فن کو حکم دیا کہ سپہر آرا بیگم کو جاکر ہماری طرف سے کہو کہ اگر مضائقہ نہ ہو تو ذرا جھروکے پر ٹھہریں۔ ہماری سواری اُدھر سے نکلے گی۔ چار آنکھیں تو ہو جائیں۔ ہم اُن کے رخِ رنگین پر نظر ڈالیں۔ وہ ہماری سواری کے ٹھاٹھ دیکھیں۔ طرفین سے جوش ہو۔ جوانی کی امنگیں تقاضائے شدید کریں کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو۔ مشاطہ اپنے دل میں سمجھ گئی کہ میاں کو شیطان نے دور سے اُنگلی دکھائی۔ عقل الوداع کہہ کر رفو چکر ہو گئی۔ لیکن شہزادے تھے، مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ کل باتیں سن کر عرض کی۔ خداوند نعمت لونڈی کو اصلا عذر نہیں مگر اس طرح پر عرض کرنا اُن کے خلاف گذرے گا۔ میں بات بنا کر کسی عمدہ پیرائے میں عرض کروں گی۔ حضور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ حضور کو صورت دکھائیں۔ دُلہن کہیں ایسی بے شرم ہو سکتی ہے۔ ہاں جب میں کہوں گی تو حضور کی سواری دیکھنے ضرور جھروکے پر آئیں گی۔

یہ کہہ کر مشاطہ روانہ ہوئی۔ اپنی مُنہ بولی بہن سے جا کے صلاح لی۔

مشاطہ: آج سنجر سطوت نے بلوایا تھا۔ ہمیں تو کچھ ہولے خبطے سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ وہ بے تکی باتیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اور ہم سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے اور کہیں تو کیا کہیں۔ مجھے ایک دوپٹا دیا۔ خاصہ بھاری دوپٹا۔ اور پانچ روپیہ ملے۔ اور کہا کہ تم بڑی بیگم کے گھر جاؤ سپہر آرا سے ملو اور کہو حضور کی سواری اِدھر سے نکلے گی جھروکے سے ہم کو دیکھیں۔

نواب جان: اے ہے۔ کہیں سڑن نہ بننا بہن۔ بھلا کوئی بات بھی ہے واہ۔ مُنہ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔ گدّی میں عقل ہے کیا۔

مشاطہ: بہن میں چپ چاپ سُنتی رہی۔ کاٹو تو لہو بدن میں نہیں۔

نواب جان: اُوئی۔ واہ رے مردوے۔ پھر شہزادے کہاتے ہیں۔ یہ عقل کی مار اُن سے تو ایسے ویسے مردوے ہی بھلے۔ ابھی تازہ زخم ہے۔ پورا اٹھوارا ابھی نہیں ہوا۔ اور پیغام بھیجنے کا شوق ہوا۔ اچھا عشق چرّایا۔

مشاطہ: بہن دوپٹا ہضم نہ ہونے کا۔ جا کے شام کو آئیں بائیں شائیں بتا دیں گے۔ اُن کی سواری اُدھر سے نکلے گی۔ بس کسی خدمت گار سے کہہ دوں گی۔ وہ اُنگلی اُٹھا دے گا۔ بس دیکھیں یا نہ دیکھیں ہم کو اس سے کیا۔

نواب جان: اے تم جا کے خوب بناؤ، دل کھول کے روپیہ لوٹو۔ ان کے سر پر تو جنون سوار

ہے. کیا دور کی سوجھی. سودائی پن کی باتیں.

مشاطہ: اور جب تک میں بیٹھی رہی، تب تک برابر اپنی بڑائی کی لی. اور پاکیت ہی جتائی. سنتے سنتے عاجز ہوگئی. اُف توبہ.

نواب جان: نہیں بہن. یہ نہ کہو. بڑائی میں کچھ شک بھی ہے. اولاد شاہ ہیں کہ نہیں. کیا کچھ ایسے ویسے ہیں. شہزادے ہیں کہ باتیں.

شام کو کوئی پانچ بجے کے وقت مشاطہ نے جاکر آداب عرض کیا. اور کہا حضور کل باتیں پکی پوڑھی کر آئی ہوں. بس حضور کے سوار ہونے کی دیر ہے. سب معاملہ لیس ہے.

سنجر سطوت: جس وقت تم نے بیان کیا کچھ مسکرائی بھی تھیں. سچ کہنا بی جان لب پر ہنسی آئی تھی یا نہیں.

مشاطہ: حضور مسکرائیں تو ضرور، مگر شرمائیں اور لجا گئیں. گورے گورے رخسارے اُس وقت وہ جوبن پر تھے کہ میں کیا عرض کروں.

سنجر سطوت: بھلا کسی ڈھب سے تصویر تو لادو، رات دن اپنے ہی پاس رکھوں. مگر مانی و بہزاد کہاں ہیں جو کھینچیں.

> عجب ہے کھینچی مصوّر نے کس طرح تصویر
> کہ شوخیوں سے تو اک رنگ پر رہی کیوں کر

مگر نازیوں کر کھینچے گا ناز کی تصویر کھینچنا محال ہے. خاص خدائے تعالیٰ نے بنایا ہے کیا چہرۂ زیبا ہے. کیا نورانی صورت ہے.

> بصورت تو بتی کمتر آفرید خدا
> تراکشیدہ ودست از قلم کشید خدا

مشاطہ: حضور اب لونڈی کسی روز جائے تو تصویر مانگ لائے. اب حضور سوار ہوں وقت جاتا ہے پانچ بج گئے اور جانا دور ہے. ناکے باہر مکان ہے. پھر جھٹپٹے وقت کیا خاک سوجھے گا.

سنجر سطوت: کیا کہا ہے اس وقت تم نے کیا کہا. خاک کا لفظ میں نے سُنا تھا.

مشاطہ: حضور خطا ہوئی. معاف فرمائیے. اور ہم لوگ تو ہمیشہ کے خطا کار ہیں. حضور مالک ہیں. رئیس ہیں. بیساختہ میری زبان سے یہ بات نکل گئی.

سنجر سطوت: مالک ہم کو کبھی نہ کہنا. مالک دوزخ کے داروغہ کا نام ہے. اگر تم نے کوئی بات

بے سمجھے بوجھے کہی تو خیر مضائقہ ندارد اور اگر دانستہ کہی تو بیشک تم شہزادوں کی صحبت کے قابل نہیں ہو۔

لائق محفل نباشد ہر کہ خندد بے محل
کفش چوں دندان برآرد دورش از پا میکنند

یہ بار بار کی ہنسی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ہم تمہارے برابر والے نہیں ہیں۔ خبردار جب کمرے میں آؤ۔ سات بار سلام کرو جھک کے۔

مشاطہ: بہت جھک کے حضور ہم تو اگر اپنے بادشاہوں کی اطاعت کریں تو آسمان پر تھگلی لگائیں۔ ایسے نصیب کہاں ہمارے۔

سنجر سطوت: اچھا کوئی ہے۔ حکم دو ہاتھی تیار ہو۔ وہ جھول ڈالو جو عید کے دن خریدی تھی چینی اطلس کی۔ اور گنگا جمنی ہودا۔ دس سوار ساتھ چلیں۔

خدمت گار: بہت خوب حضور۔ حسین خاں (چوبدار) کہو سواری جائے گی حضور کی۔ دس سوار تیار ہوں۔ ہاتھی پر جائیں گے۔ گنگا جمنی ہودا نکالا جائے۔ چینی اطلس کی جھول نکالو اک ـــــ دنتا جھومتا آئے۔

سنجر سطوت: اچھا بی جان سلام۔ کل ضرور حاضر ہونا۔ مگر دوپہر کے بعد۔

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ عہد شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

سواری تیار ہوئی۔ حضور برآمد ہوئے۔ خدام باادب اور چوبداروں اور سپاہیوں نے جھک جھک کے سلام کیا۔ شہزادے نے کسی کو جواب نہ دیا ہاتھی پر سوار ہوئے۔ سواری مثل باد بہاری چلی۔ ایک بازار میں کسی شخص نے کوٹھے سے کہا۔

گردوں پہ جب بیاض سحر کا ورق کھلا — یعنے کتاب ذکر خدا کا سبق کھلا
بزم جہاں میں دفتر نظم و نسق کھلا — ظلمت نہاں ہوئی در باغ شفق کھلا

پہنچا فلک ـــــ پہ ماہ کو حکم انقلاب کا
موج ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

شہزادے نے ایک مصاحب سے، جو خواصی میں بیٹھا تھا کہا۔ اس شخص کو انعام دینا چاہیئے مستحق انعام ہے اس نے نیک فال اور مبارکباد کے اشعار پڑھ دیے۔ خصوصاً یہ مصرع۔

موج ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

مصاحب: خداوند. غلام نے اِس شخص کو خوب جانچ لیا ہے. حضور خاطر جمع رکھیں. آج شام ہی کو حاضر کروں گا۔

شہزادہ بہادر کمال مسرور ہوئے. تھوڑی دور بڑھے تو دیکھا کہ دس عورتیں سامنے سے چلی آئیں ہیں. مصاحب کی طرف گردن پھیر کر پوچھا. یہ عورتیں تو بے ڈھب ملیں. یہ فال بد ہے خواص نے کہا پیرو مرشد نہایت مبارک فال ہے. یہ سب مچھلی والیاں ہیں. مچھلی ایسے وقت حضور کسی کو نصیب کہاں ہوتی ہے. سنجر سطوت یہ فقرہ سن کر بہت خوش ہوئے. ہاتھی پر سے چلّا اُٹھے کہ او مچھلی والی عورتوں آج سے ہماری سواری کے سامنے ضرور آیا کرو. اور آج شام کو انعام لینے بھی آنا. مچھلی والیاں مُسکرا مُسکرا کر آداب بجا لائیں. کوئی سمجھی کہ یہ فیل نشین مجھ پر ریجھا ہے. کسی کو شیطان نے پٹی پڑھائی کہ مستانہ چال پر عاشق ہو گئے. ایک کو خبط سوجھا کہ میری جوانی نے شہزادہ کو فریفتہ کر لیا۔

شہزادہ: کیوں بھئی میرا نور یہ تو اس وقت خوب ملیں واللہ فال نیک عورت کا سامنے سے آنا بُرا مگر واللہ کیا شان خدا ہے. ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

وہی مثل ہوئی. اور اگر دھوبن آتی تو کیسی فال تھی. حضرت؟

مصاحب: حضور خدا کے لیے اس کا ذکر نہ کیجیے. نام ہی زبان پر نہ لائیے. خدا نہ کرے کہ واحد العین یا دھوبن سامنے سے آئے. اور چھینک سے روح لرزتی ہے. میں تو اِن باتوں کو بہت مانتا ہوں. جس وقت اُن کا محل معلّے دور سے نظر آئے گا. غلام کچھ پڑھنا شروع کرے گا. اگر تہ خانے میں ہوں تو دوڑی آئیں. بس ایک رباعی ہے۔

سکندر آیا جہاں ناپتا جو تا لب گور
صدا یہ کان میں پہنچی دہان تربت سے
کہ اب نہ کیجیے گام و رسن سے پیمائش
یہاں کی ہوگی مساحت جریب قامت سے

اب سُنیئے کہ شہزادہ سنجر سطوت کی سواری بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بڑی بیگم کے ایوانِ فلک توامان کے قریب پہنچی. خواصی کے مصاحب نے آہستہ سے کہا. خداوند سنبھل بیٹھیے بقعہ نور

نظر آیا۔ اِس چشمہ سار کے سامنے جو بارگاہ فلک جاہ نظر آتی ہے، اسی میں وہ پری جلوہ گر ہے۔ حضور ایک انا بیان کرتی تھی کہ رشکِ قمر ہے۔ انسان دیکھے تو ہوش پرّان اور حواس غائب ہو جائیں۔ وہ بیان کرتی تھی کہ یہ شہزادی کسی حسین اور خوبرو جوان کے لائق ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ حضور کو دیکھتے ہی وہ ریجھ جائیں گی۔

شہزادے نے آمین کی صدا بلند کی۔ اور جنون نے اس قدر زور کیا کہ بالکل بے تکی ہانکیں لگانے لگے۔

شہزادہ: (فیلبان سے) دیکھو جی۔ بری کہو پھر وہت بولو۔ اور خاصبرداروں سے کہو کہ بھنبھناتے چلیں۔ مطلب یہ کہ منہ سے نہ بولیں اور ہوں ہوں کرتے خاص جس میں معلوم ہو کہ لاکھوں سوار اور پیادے ہمراہ جھول ہیں۔

سُبحانہ اللہ سواری کے ساتھ بھنبھناتے چلنا اچھا حکم دیا۔ اور ہمراہ رکاب کہتے تو یوں کر کہتے حضور گھوڑے پر تو سوار تھے نہیں۔ پھر رکاب کجا فیل نشین تھے لہٰذا ہمراہ رکاب کے عوض ہمراہ جھول کہا۔ اور سُوجھی کتنی دور کی ہوں ہوں کرنے سے لاکھوں سوار معلوم ہوں گے۔ سوار بھی سمجھ گئے کہ کچے گھڑے کی چڑھی ہے۔ حکم ہوا کہ سواری روک لو۔

شہزادہ: دیکھو کل سوار اور فیلبان اور ہمراہی جب اُس محل کے محاذی پہنچو تو اُتر جاؤ اور سب کے سب ٹوپیاں اُتار لو۔ ٹوپی اُتار کے ہاتھ میں لو۔ ادب سے سلام کرو۔ اور نقیب گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارے۔ آمد ہے سواری بادِ بہاری شیران شیر کی۔ اس کے بعد سوار کہیں۔

آمد ہمارے گھر میں کسی مہ لقا کی ہے
یہ شان کردگار یہ قدرت خدا کی ہے

جب تک ہمارا حکم نہ ہو سواری آگے نہ بڑھے۔

مصاحب: خداوند آج پھلا دن ہے۔ آج حضور چُپ چاپ نکل چلیں۔

شہزادہ: بہتر مگر ہم تمہیں ہاتھی پر سے ڈھکیل دیں گے۔ گستاخ آدمی ایاز قدر خود بشناس جوتیوں کے صدقے میں یہ درجہ پایا کہ ایسے فلک شکوہ ہاتھی کی سواری نصیب ہوتی۔ اور ہمیں کو عقل سکھاتا ہے۔

ہر کہ آموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

مصاحب : پیرومرشد حضور ہی کی بہتری کے لیے عرض کرتا ہوں۔ غلام ہمیشہ فائدہ کی کوشش کرے گا نہ کہ نقصان کی۔ آج حضور کی سواری نکلے۔ کل کچھ اور چھیڑ ہو۔ یُوں ہی رفتہ رفتہ رنگ جمے گا۔ کاتا اور لے دوڑی بھلا کوئی بات ہے۔

شہزادہ : اس وقت بخیال رحم قصور معاف کیا۔ آئندہ اگر ایسی صلاح دی تو تم جانوگے۔ ہم بادشاہ زادے ہیں۔ گاہے بسلامی برنجند و گاہی بدشنامی خلعت دہند۔ علم میں شاعری میں فصاحت میں کسی میں تجھ سے بند نہیں۔

بُلبُل یہاں آکے خوش بیانی سیکھے
اندازِ فغاں مجھ سے فغانی سیکھے
رونا مری آنکھوں سے کرے حاصل ابر
دریا مرے اشکوں سے روانی سیکھے

مصاحب : عالی جاہ خاقان کلاہ حق تعالیٰ نے حضور ہی کو پیدا کیا ہے۔

ہمہ اسبابِ شادی حاصلِ اُو — نماندہ آرزوی در دلِ اُو
فلک در خیلت از جوزا کمر بند — ظفر با بند تنعیت سخت پیوند

جو بات حضور کے ذہن میں آئے گی اوہ غلام تھوڑا ہی سمجھ سکتا ہے۔ حضور کی رائے بہت صائب تھی۔ کل حضور اُس مشاطہ کو پھر بھیجیں۔ وہ بڑی کارگزار عورت ہے۔ دم کے دم میں پورا بند و بست کردے گی۔ ہے یا نہیں۔؟

شہزادہ : سواری بڑھاؤ۔ اور نقیب سے کہو کہ آواز دیتا چلے۔

الغرض نقیب نے یہیں سے ہانک لگائی (سواری بادِ بہاری شیران شہر) اور سواروں اور مصاحبوں نے باآواز بلند وہی شعر پڑھا۔

آمد ہمارے گھر میں کسی مہ لقا کی ہے
یہ شان کردگار یہ قدرت خدا کی ہے

شہزادہ : شاباش ایک بار پھر کہو۔ مگر آواز بلند ہو۔

مصاحب : خداوند ابھی آواز وہاں تک نہ پہنچے گی۔

سوار : حضور ابھی گلا بھی پھاڑ ڈالیں تو آواز نہ جائے۔ بہت دور ہے۔ آگے جو مرضی حضور کی ہو۔

شہزادہ : بس بڑھے ہوتے چلے چلو۔ بڑھے چلو اور آواز دیتے جاؤ۔ ع
آمد ہمارے گھر میں کسی مہ لقا کی ہے

مصاحب : خداوند ہاتھی روک لیا جائے۔ غلام درگذرا کان کے پردے پھٹے پڑتے ہیں۔ حضور تو کہا ہی نہیں مانتے۔ لاحول ولاقوۃ۔

شہزادہ نے حکم دیا کہ ہاتھی روک لیا جائے۔ رات کو سواری آگے بڑھے۔ اور ادھر مرزا صاحب نے پھر ذکر چھیڑا۔

شہزادہ : تربیت یافتہ عورت احمق شوہر کی صحبت کیوں کر پسند کرے گی۔

مرزا : خداوند بس قسمت کا لکھا کہہ کر خاموش ہو رہے گی۔

شہزادہ : کیا ہم لوگوں کی شریعت ــــ کا یہی مقتضا ہے کہ جاہل اجڈ سے ماں باپ لڑکی کا بیاہ کر دیں۔

مرزا : نہیں خداوند مسلمانوں کی شریعت کی بنا مصالح پر ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا چاہیے کہ ماں باپ نہایت ہی اہتمام سے اپنی دختر کی شادی کریں، اور جبکہ صاحب علم و فضل و ادب پائیں اور اس کی استعداد ذاتی اور صفاتی ایسی جو کہ وہ معاش پیدا کر سکے گا اور جورو کو خوش رکھے گا۔ تب اپنی لڑکی کو اطلاع دیں۔ اس کو صورت شکل بھی اس مرد کی دکھا دیں۔ وہ پسند کر لے تب شادی کریں۔

شہزادہ : بھلا اگر یہ اوصاف کمینے میں جمع ہوں۔ تو تم کیا کہو گے۔

مرزا : حضور جس میں یہ اوصاف ہوں گے وہ کمینہ کہلائے گا ہمارے سچے پیغمبر نے فرمایا کہ کسی کو کسی پر کچھ بزرگی نہیں مگر پرہیز گاری اور دینداری۔ اور حضرت مسیح نے فرمایا کہ غلام اور آزاد میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اگر دونوں دیندار ہوں۔ اور جب سارے انسان ایک ــــ ہی ماں اور باپ سے پیدا ہوں تو ایک کو دوسرے پر بروتے نسب کیا فضیلت ہے۔ زندگی فضل اور ادب سے ہے نہ اصل و نسب سے۔

نسب ــ چہ سود ہر چوں تو بے ہنر باشی
زآب جو چہ برش تیغہای جوشن را

شہزادہ : سچ کہتے ہو اگر کسی کا باپ دادا قابل فاضل ہوا اور بیٹا اجڈ اور جاہل ہے تو باپ دادا کی عزت سے وہ کچھ حصہ میں نہیں پا سکتا۔

آں ناکساں کہ فخر باجداد میکنند
چوں سگ باستخواں دل خود شاد میکنند

شہزادہ: کہو تو مرزا اگر اپنے خاندان کے خلاف دوسرے خاندان میں کوئی شادی کرے، اور اُس سے جو اولاد پیدا ہو، اس کو لوگ کیا سمجھیں گے۔

مرزا: حضور قصباتی اور دیہاتی جو پیروی شیطان کی کرتے ہیں وہ تو اُس اولاد کو حقیر ضرور جانیں گے۔

شہزادہ: یہ پیروی شیطان کیسی۔

مرزا: حضور شیطان کو حکم ہوا تھا کہ حضرت آدم کو سجدہ کر۔ شیطان نے کہا کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم خاک سے آگ خاک سے افضل ہے۔ پھر میں کیوں کر سجدہ کروں۔ اسی پر وہ نکالا گیا۔ جو لوگ کہ دعوی دار حسب و نسب کے ہیں وہ پیروی شیطان کی نہیں کرتے۔ پھر کس کی کرتے ہیں۔ اگر پیروی حکم خدا کرتے تو جو آگ سے پیدا ہوا اور جو خاک سے وہ سب مساوی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ جو فرشتے نور سے پیدا ہوتے تھے اُنھوں نے خاک کے پتلے کو سجدہ کیا یا نہیں۔

شہزادہ: تم کیا اُس اولاد کو افضل سمجھو گے جو غیر کُفُو سے پیدا ہو۔

مرزا: خداوند اگر اس میں فضل و ادب ہو گا تو ہم ضرور ہے کہ اُس کو افضل سمجھیں۔ مگر حضور اگر وہ فضل و ادب سے معرا ہو گی تو تو ضرور حقیر جانیں گے۔

شہزادہ: پھر اس کا کیا مطلب ہو گا کہ اگر کسی نیک مرد کی لڑکی ہو اور اشعار سُنے۔

زناں محرماں دور دارد جہاں — کہ حوران علیین بباغ جنان
چواز بادہ عشق لب ترکند — ہمون عاقبت کار باور کند

دیگر

اگر سالہا مردم بد سرشت — شود ہمدم حوریاں در بہشت
دراں محفل پر صفا روز و شب — زجبریل خواندہ فنون ادب
بدان اعتقادم کہ ہنگام کار
نہ گردد از و جز بدی آشکار

مرزا: خداوند نیکی اور بدی نفس کے متعلق ہے شریف سے کسی حال میں بدی نہیں ہو سکتی؛

وہی حال بدسرشت کا ہے۔ پس چاہے مرد ہو یا عورت جو خراب ہوگا اُس کا یکساں حال ہوگا۔ جو کچھ حضور نے اشعار فرمائے آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ اور بالکل صحیح ہیں۔

مصاحب: حضور خدا کے لیے فیلبان کو حکم ہو کہ ہاتھی روک لے۔ ساری خدائی یہ تماشا دیکھنے آئے گی۔ دُنیا بھر اُلّو بنائے گی۔ میں اُن مصاحبوں میں نہیں ہوں جو خوشامد کی روٹیاں کھاتے ہیں اور ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

اُن لوگوں میں بندۂ درگاہ نہیں۔ یہاں سعدی شیرازی کے ایک شعر پر عمل ہے اور اُسی ایک شعر پر عمل رہے گا اس میں چاہے جو کچھ ہو۔

راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

حضور اتنا نہیں سوچتے کہ غلام حضور ہی کے فائدے کے لیے عرض کرتا ہے۔ قسم کھا کے کہتا ہوں واللہ ہے کہ میں کو ہی بڑوں گا۔ اتنا تو سوچیے کہ وہ بیچاری کس حالت میں ہے۔ ابھی ایسے کتنے دن ہوتے اور آپ سواروں سے فرماتے ہیں کہ غل مچاتے چلو۔ بھلا یہ کون دانش مندی ہے۔ عقل سے بحث ہی نہیں۔ اس حرکت بیجا سے کیا ہوگا۔ بجز اس کے کہ دیوانوں میں نام درج ہو، اور رفقا گالیاں کھائیں۔

شہزادہ: آپ جائیے بس اب اپنی نصیحت رہنے دیجیے۔ بسم اللہ آپ جائیں۔ روک لو ہاتھی۔ تشریف لے جائیے ورنہ میں ڈھکیل دوں گا۔

مصاحب: آداب عرض ہے (ہاتھی سے اُتر کر) جاتیے وہاں لڈو رکھے ہیں۔ وہ جھروکے سے جھانک رہی ہیں۔ خیر میں جاتا ہوں۔

شہزادہ: جائیے خس کم وجہاں پاک۔

مصاحب: ذلیل ہونا حضور کی قسمتوں میں لکھا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں آپ جانیں آپ کا کام جانے۔

دوست آنست کو معائب دوست — ہمچو آئینہ رُوبرو گوید
نہ کہ چوں شانہ با ہزارا زبان — پسِ رُو رفتہ مو بمو گوید

والسلام. خدا حافظ و ناصر۔

مصاحب ایک درخت کے سایہ میں دم لے کر دل لگی دیکھنے لگا۔ اور حضرت نے سواری آگے بڑھائی مرزا صاحب نے کہا خداوند دیکھیے وہ جھانک رہی ہیں۔ کیا نور عام افروز ہے۔

با حُسن و جمال تو پری را — دعوی نرسد برابری را
زیباست پری ولے نہ دارد — ایں عشوہ و ناز و دلبری را
چشمِ تو بیک نگاہِ جادو — آموختہ سحر ساحری را
برخاک فگندہ از طراوت — گلبرگ ترت گل تری را

سودائی رُخت زاوجِ گردون
آوردہ فرود مشتری را

شہزادہ بہادر نے غور سے دیکھا۔ جھروکا تو خاک نظر نہ آیا اور نظر کہاں آتا مگر مارے شیخت کے کہنے لگے ہاں ہاں بیشک جھانک رہی ہے۔ کیا جھمکڑا ہے۔ ہمارے کانوں میں اُن اشعار کی آواز آتی ہے۔ جو سپہر آرا ہماری طرف مخاطب ہو کر ادا کرتی ہیں۔ سنیے گا۔ ہائے تمہارے کان ایسے کہاں ہم سنائیں۔

میاں چشمِ جادو پہ اتنا گھمنڈ — خط و خال و گیسو پہ اتنا گھمنڈ
اجی سر اُٹھا کر ادھر دیکھنا — اسی چشم و ابرو پہ اتنا گھمنڈ

نسیمِ گل اس زلف میں ہو تو ہو
نہ کر اپنی خوشبو پہ اتنا گھمند

مرزا جی نے بڑی کوشش بلیغ سے ہنسی ضبط کی، مگر حضور شہزادہ نامدار گردوں مدار کے خوش کرنے کے لیے کہا خداوند حضور یہ اشعارِ آبدار خوب سُن لیے واللہ کان ہوں تو ایسے اور حضور ایسے کان شہزادوں کے سوا اور کس کو نصیب ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کی صفتیں کہیں ہم رعایا میں آسکتی ہیں۔

کند ہمجنس با ہمجنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

اگر کوئی شہزادہ ہوتا تو ضرور سمجھ جاتا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ شہزادے اور بھی دل میں خوش ہوتے۔ اکڑ کر بولے کہ وہ مصاحب مردود جو خواصی میں بیٹھا تھا، اپنا سا مُنہ لے کر رہ جائے گا

تم اُس کو خوب ذلیل کرنا۔ کیوں بے نامعقول۔ ہم کیا کہتے تھے۔ سواری ابھی کوس ہی بھر بڑھی کہ آوازے کسے گئے۔ شعر خوانی ہونے لگی۔ عشق نے رنگ جمایا۔ چشم جادو اور خال وگیسو اور خط وابرو اور زلفِ خوشبو کی تعریفیں ہونے لگیں۔ جی قبلہ دلگی نہیں۔

سُوئیت کہ پیام مارساند
ایں قصہ مگر صبا رساند

اب کس کے ذریعے سے اس وقت پیغام بھیجیں۔ مشاطہ تو ہے ہی نہیں

بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

نخچیر تیر رنج والم زہین گیر کوے حزن و ماتم یعنی ثریا بیگم اُن دونوں زندان خراباتی نامی گرامی ڈاکوؤں کے پھیر میں ایسی صید محن ہوئیں کہ الامان الامان۔ سوچتی ہیں تو ساری خدائی میں اپنا نہ بیگانہ خویش نہ بیگانہ۔ ایسی مصیبت کی حالت میں کون مدد کو آتا۔ ایک آزاد۔ اُن کا پتا ہی نہیں۔ جب سے گئے خبر بھی نہ لی۔ دوسری اُستانی جی۔ اُنھوں نے صورت ہی نہ دکھائی۔ ثریا بیگم کو یقین کامل ہوگیا کہ اُستانی جی سوتیا ڈاہ کے سبب سے روپوش ہیں۔ ماں باپ سے تو کبھی بنتی ہی نہ تھی۔ اعزہ واقربا کو کس مُنہ سے صورت دکھائیں۔ اَیرے غیرے پچکلیاں سے امید وفا کجا۔ طوعاً وکرہاً اُس زندان بلا میں شب بسر کی رات کو انواع اقسام کے خواب پریشان دیکھے۔ پہلے دیکھا کہ اُس کا بوڑھا شوہر قبر سے گردن نکال کر کہتا ہے کہ ثریا بیگم تیرے سبب سے میرے شیشۂ ناموس پر ایسا سنگِ گران گرا کہ بالکل چکنا چور کردیا۔ ہائے وہ کیسی بُری گھڑی تھی جب تیرے ساتھ نکاح کیا۔ اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملائی۔ مگر از ماست کہ بر ماست۔ خود کردہ راچہ علاج۔ میں ابھی کچھ سال اور زندہ رہتا مگر اِس غم نے میرے جسم زار کو ایسا ناتوان کر دیا کہ بالکل گھلا دیا۔ لہٰذا میں سوچا کہ اِس دنیا تے دوں سے رختِ اِقامت اُٹھاؤں اور سب سے الگ تھلگ کسی کونے میں بستر جماؤں۔ جناب باری عزاسمہ نے میرے حال پر رحم کیا اور مجھ کو بلا لیا۔

چو خلاف عقل دیدم رہ ورسم کار خودرا
بخدائی خود سپردم ہمہ اختیار خودرا

میں اپنی عقل پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اپنے فہم ناقص پر نفرین کرتا ہوں۔ عشق بازی نے کہیں کا نہ رکھا۔

صد ہزاران عقدہ ہا بکشودہ است
عشق بازی طرفہ چیزی بودہ است
بسکہ در دست تمنا کشتہ ام
پایم از طی مراحل سودہ است

آنکھ کھل گئی تو خواب کو یاد کر کے بہت روئی۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ تو دوسرا خواب دیکھا کہ آزاد پاشا ایک درخت کے سائے میں لیٹے اور غافل سو گئے۔ ایک مار خونخوار اُن کے سرہانے آ بیٹھا۔ اور قریب تھا کہ آنکھ پر کاٹے کہ ثریا بیگم نے دور سے لکڑی دکھائی۔ سانپ ان کی طرف دوڑا۔ تو مارے ڈر کے آنکھ کھل گئی۔ اس خواب نے اور بھی زیادہ پریشان کیا۔ سوچی کہ اے کاش خواب ہی میں باتیں ہوتیں تو دل کو ذرا ڈھارس ہوتی۔ خواب میں بھی دیکھا تو آنکھیں بند پائیں۔ گفتگو کو ترس گئی مکالمہ رُوح افزا نہ سُنا نہ سُنا۔ ہائے جھوٹا ہی وعدہ ہوتا۔

نہ شہد لطف کز و کام جان شود شیرین
نہ وعدہ کہ گلوی گمان شود شیرین

تڑکا ہوا تو خواب کو یاد کیا اور زار زار رونے لگیں۔

اتنے میں ایک کانسٹبل نے کہا کہ تمہارے بھائی جان تم سے ملنے کو آتے ہیں۔ اگر اجازت دو تو ملیں ورنہ ان سے کہہ دیں کہ چلے جائیں۔ ثریا بیگم سوچی کہ بار خدا میرا بھائی تو کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا یہ کون ذات شریف بھائی بن بیٹھے۔ خیال آیا کہ شاید چچازاد یا خالہ زاد بھائی ہوں۔ کہا بلالو۔ اجازت ہے۔ دل میں کسی قدر خوش بھی ہوئی کہ کسی نے پوچھا تو۔ ایسے گاڑھے وقت آڑے تو آیا۔

کانسٹبل نے اُس شخص کو بُلالیا۔ ثریا بیگم نے دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ اُس نے آتے ہی کہا ہائیں! بہن خیر تو ہے۔ یہاں کہاں یہ کیا ہوا کیا ہم سے بیان تو کرو۔ ثریا بیگم دنگ کہ یا الٰہی یہ کمبخت کہاں سے آیا اور اس نے اپنی منحوس صورت کیوں دکھائی۔ ع

این از کجا رسید دگر بار النعیاث

اس نے بکمال لطف و کرم پھر وہی سوال کیا۔ بہن تم یہاں کس جرم میں آئیں۔ ہمیں اطلاع

دو۔ کچھ چارہ جوئی کریں۔ حکام سے کہیں کوئی سبیل نکالیں۔ اس وقت یہاں دیکھ کر کمال رنج ہوا۔ ثریّا بیگم نے سہولت سے یوں جواب دیا۔ میاں میرے نامۂ اعمال میں یہی لکھا تھا کہ ایسا روز بد مجھے دیکھنا پڑے گا۔ اس میں تم کیا کر سکتے ہو اور کوئی کیا کر سکتا ہے۔

اس اجنبی نے اُس کی تردید کی۔ کہا بیگم صاحب یہ تو ہم نہ مانیں گے نامہ اعمال یعنی چہ۔

بروز حشر الہٰی جو نامۂ عملم
کنند باز کہ آن روز دادِ خواہِ من است
بکن مقابلہ آن راز سر نوشت ازل
اگر زیادہ و کمی باشد آن گناہِ من است

اگر ازل سے کچھ لکھا ہوتا کہ فلاں شخص سے یہ افعال قبیحہ سرزد ہوں گے تو بندہ مجبور ہے۔ اس سے مقابلہ کرو۔ اگر اس میں زیادتی یا کمی ہو تو بندہ سزاوار اور قابلِ دار ہے۔ ورنہ سمجھ لو کہ اس سر نوشت ازل کے مطابق کارروائی ہوئی چلیے اللہ اللہ خیر صلاح۔ خیر یہ تو اور بحث چھڑ گئی۔ اب آمدم بر سرِ مطلب خدا گواہ کر کے کہتا ہوں، شبو جان کہ جان تک حاضر ہے۔

جان و ایمان جو نثارِ رہِ یاری کردم
شادم از زندگی خویش کہ کاری کردم

مگر افسوس ہے کہ تم ہمیشہ ہمارے خلاف ہی رہیں۔ غریب خانے سے اس طرح نکل بھاگیں کہ گویا میری روح جسم سے نکل گئی، اب تم گھبراؤ نہیں۔ ہم روبکاری کر لیں گے۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہم کیسے مشہور وکیل ہیں۔ کیسے کیسے مقدمے چشم زدن میں جیت لیے۔ اور اس کے علاوہ امیر صاحب جائداد منقولہ و غیر منقولہ باوضع خوش پوش اور حسین کیسے کہ جس طرف نکل جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں کہ وہ گبھرو جوان جا رہا ہے جس کا ثانی روئے زمین پر کوئی نہیں ہے۔ اور معشوق یوں مخاطب کرتے ہیں۔

اے حُسنِ تو برتر از چہ و چون	سبحان اللہ ز حُسنِ بیچون
لعل تو فریبِ اہل افلاک	قدِ تو بلائے طبعِ موزوں
شمشاد قدانِ فتنہ انگیز	بر فتنۂ قامتِ تو مفتوں
سرو از قد تو فتادہ برخاک	گل از رخِ تو نشستہ برخوں

بر حسن تو فتنہ صد چو فرہاد دیوانۂ تو ہزار مجنوں
از زلف تو کار ما پریشان
از خال تو حال ما دگر گوں

اور اب تم حاطب ہی نہیں ہوتی ہو۔

اتنے میں آواز آئی کہ شیخ سالار بخش بھی شبو جان کے سلام کو حاضر ہیں۔ ثریا بیگم مسکرائیں کہا آئیے۔ میاں سلارو اچھے رہے۔ سلارو نے آتے ہی کہا کہ اچھے تو سب کچھ رہے۔ مگر جس شیطان کے پالے پڑے ہیں۔ اُس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ وکیل مصنوعی نے اپنے خدمت گار پر قہر آلود نظر ڈالی، تو میاں سلارو نے بات ٹال دی۔ کہا ہمارے حضور ہم پر بڑی عنایت رکھتے ہیں۔ نہیں تو ہم کہیں کے نہ رہتے۔ جو کوئی پوچھتا ہے کہ تم کس کے نوکر ہو تو ہم کہتے ہیں کہ ایک رئیس اعظم مرزا صاحب وکیل کے خاص ملازم۔

مرزا : (مصنوعی وکیل یعنی رونیو ایجنٹ) اور شیطان کس کو بنایا۔

سلارو : حضور پڑوس میں ایک بدذات آدمی رہتا ہے بڑا بد ہے۔

مرزا : ہاں پہلے ہم کچھ اور سمجھے تھے۔ پٹنے ہی کو تھا اس وقت۔

سلارو : یہاں مار پیٹ کا نام لوگے تو دھر لیے جاؤ گے۔ دل لگی نہیں۔ پولیس کے منہ میں بیٹھے ہو۔ کیا خالہ جی کا گھر ہے۔ کہیں پٹیا نہ ہو۔

مرزا : سلارو۔ اس وقت دوسرا لفظ زبان سے نکلے۔ بس بس۔

سلارو : (قدموں پر ٹوپی رکھ کر) لے اب قصور معاف کر دیں

مرزا : شاباش جا معاف کیا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا معاف کیا۔

سلارو : اور معاف نہ کرتے تو کیا کرتے ہم بھی ڈنڈ پیل جوان ہیں۔

شبو جان : (مسکرا کر) تم دونوں میں کبھی نہ بنے گی۔ اب مجھے کیا صلاح دیتے ہو۔ پہلے میرا حال سن لو۔ تمہارے ہاں سے میرے اوبار نے مجھے نکالا پہلے تو سخت مصیبت میں گرفتار ہوئی۔ بارے خدا خدا کرکے اُس سے نجات پائی۔ کسی قدر دولت بھی ہاتھ آئی۔ تو تمہارے ہی محلہ میں مکان لیا۔ امیروں کی طرح رہنے لگی۔

مرزا : ارے وہ ثریا بیگم آپ ہی تھیں جو تھوڑے دن بعد چل دیں۔

شبو جان : جی میں ہی تھی کئی بار تم کو اُدھر سے جاتے دیکھا۔ جب تم گاتے تھے تو تمہاری آواز

برابر آتی تھی۔ ایک دفعہ سرکس کے تماشے میں تم کو اور سالار بخش کو دیکھا تھا۔ دونوں میں نوک جھوک ہو رہی تھی۔

مرزا: ہائے افسوس اتنے قریب رہ کر بھی نہ بلایا۔ وائے ستم!

آن پائے تا بہ سر ہمہ زخم و جراحتم
کورانجواب عاقبت الماس نشتر است

خدا جانے ہمارا بخت برگشتہ کب تک سویا کرے گا۔ کوئی ہزار ہی مرتبہ ادھر سے آیا گیا ہوں گا مگر بے سود جو کہیں یہ معلوم ہو کہ بی شبّو جان اس کاشانے میں فروکش ہیں تو واللہ ضرور بالضرور حاضر ہوں۔ اور وہ داروغہ صاحب کہاں گئے۔ لالہ خوشوقت رائے ان سے روز ملاقات ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ روہیلکھنڈ کی بیگم ہیں۔ بھئی بڑا چکما ہوا۔ کمال افسوس کا مقام ہے۔ پھر وہ ثروت ہی کیا ہوئی یہاں حوالات میں کیوں کر آئیں۔ کچھ بتاؤ تو یہ ہوا کیا۔ ہائے کیا انقلاب زمانہ ہے۔

شبّو جان: ہوا یہ کہ دو بار چوری ہو گئی بہت سا اسباب گیا۔

مرزا: وہ تو ہم کو معلوم ہے۔ آزاد کے نام سے کوئی شخص دھوکا دے گیا۔ یہ تو ہم نے بھی سنا تھا۔ پھر تم بھاگیں کیوں یہاں سے۔

شبّو جان: تھانہ دار دشمن ہو گیا۔ اور کسی نہ کسی جرم میں ماخوذ کر کے ذلیل کرنے ہی کو تھا کہ ہم اپنی مہری عبّاسی کو لے کر چل دیے۔

مرزا: خوب کیا۔ پھر کیا جمع جتھا چھوڑ کے چلدی تھیں۔ ہائے ہائے۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و سامان نکلا
قیس تصویر کے پردے سے بھی عریان نکلا

جو کام ہوا پورا ہی ہوا۔ وائے ناکامی۔

شبّو جان: زیورات اور اشرفیاں ساتھ لے گئی وہاں ایک کانسٹبل نے چوری کرادی ڈاکو اپنے ساتھ میدان میں لے گئے وہاں پولیس والوں نے ڈاکوؤں کو گرفتار کیا اور اب یہ سب مجھے بیڑن کہتے ہیں۔ اور ماخوذ کر لاتے ہیں۔

مرزا: ہاں! خیر ڈاکوؤں کو تم پہچانتی تو ضرور ہوگی۔ اس میں اصلاً شک نہیں۔ دو ر چار روز ان کے پاس ضرور رہی ہوگی۔

شبّو جان: بالکل نہیں۔ صورت آشنا تک نہیں ہوں۔ رات کو ساتھ تھی۔ رات بھی کیسی کہ اندھیری

میں سب باتوں کا ثبوت دوں گی۔

مرزا: خدا نے چاہا تو نلوہ بَری ہو جاؤ۔ بی شبو جان سمجھیں۔ خدا کو یاد کرو، بارِ خدا سے نجات پاؤ گی، اس مصیبت سے بچوگی۔

زبان تازہ کرون باقرار تو
برانگیختن علّت ـــــ از کار تو

اب سُنیئے کہ ایک کانسٹبل نے صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے پاس جا کے جڑدی کہ انسپکٹر صاحب نے ایک وکیل کو اُس بیڑن کے پاس بھیجا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس عورت کو رہا کرادوں گا۔ صاحب ممدوح سنتے ہی آگ ہو گئے۔ انسپکٹر کو فوراً خط لکھا کہ۔ یہ دو ڈاکو عرصہ دراز سے مفقود الخبر تھے۔ اب خدا خدا کرکے ان کا پتا ملا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تم ان کی رہائی کے ساعی ہو۔ میں نے اِس وقت خبر پائی ہے کہ تم اُن کو رہا کرنے کی بڑی کوشش کر رہے ہو۔ چنانچہ اُس خوب صورت بیڑن کی طرف سے کوئی وکیل بھی مقرر کرنے والے ہو لہٰذا تم کو لکھا جاتا ہے کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو منفعل ہو کر ایسی کاروائی سے باز آؤ ورنہ ہم حکام بالادست کو تمہاری نسبت لکھیں گے۔

انسپکٹر نے جو یہ خط پایا تو فوراً حکم دیا کہ وکیل سے کہو کہ بس اب ملاقات ہو چکی تشریف لے جایئے صاحب کے نام اس خط کا جواب بھیجا اور اپنی بریّت کا ثبوت کامل دیا۔ ادھر مرزا صاحب کو بدرجۂ مجبوری شبو جان سے مفارقت کرنا پڑی۔ میاں سلارو بھی لمبے ہوتے، چلتے وقت مرزا صاحب وکیل، مصنوعی نے شبو جان کے ہاتھ جوڑے اور کہا کل پھر ملیں گے۔ انسپکٹر کے حکم سے ایک نوجوان شریف زادہ جو حال میں تھانہ داری پر مقرر ہوا تھا، شبو جان کے کمرے میں بھیجا گیا۔ تاکہ اُن کی خود نگرانی کرے۔ کسی پرندے کو بھی پر نہ مارنے دے۔

ثریا بیگم نے اُس جوان پر نظر ڈالی اور اُس نے ان پر تو دونوں رو دیے۔ اشک اضطراب فروکش ترجمانِ دل تھے۔ مگر دونوں نے بڑی دیر تک لب نہ ہلائے رویا ہی کیے۔

ثریا بیگم نے اس محبت سے ان پر نظر ڈالی، انھوں نے اس پیار سے عروس زیبا کو دیکھا کہ کانسٹبل متحیر ہو گیا۔ یہ تھانہ دار وہ کانسٹبل اور کانسٹبل بھی ان کا اور وہ خاموش رہا۔ اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

ثریا بیگم: پہچانا کیوں بندہ پرور کسی کو پہچانا۔ (روکر) ہائے۔

تھانہ دار: ثریا بیگم خدا کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ اس وقت فرطِ طرب سے رونا آتا ہے۔ اللہ اللہ ہم اور

تمہاری صورت کا نظارہ کریں، زہے نصیب۔ ع

انچہ مے بنیم بہ بیداریست یارب بخواب

ہائے دن کو گریہ وزاری کرتا تھا۔ رات کو اختر شماری کرتا تھا۔ اب بالکل مایوسی ہوگئی تھی۔ مگر ہردم تم ہی یاد آتی تھیں۔ شکر ہے کہ بچھڑے ہوئے ملے۔

تری جو یاد اے دلخواہ بھولا　　باللہ بھولا واللہ بھولا
فرقت کی شب میں خود دل نے　　اُف اُف کیا جو آہ بھولا
حور نے گرایا اُس کو نظر سے　　خود وہ تیری درگاہ بھولا

ثریا بیگم وہ تمہاری اُٹھتی جوانی وہ شباب نہیں، وہ آب وتاب نہیں، مگر اب بھی مجھے تمہاری ویسی ہی محبت ہے جیسے پہلے تھی۔ اگر تم بدقطع اور بدصورت اور چیچک رُو بھی ہو جاتیں، تو میرا خدا اور میں کہ ایسی ہی محبت برقرار رہتی۔ حور پر کبھی نظر نہ ڈالوں۔ برسوں کے بعد بچھڑے ہوئے ملے۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

رہائی

دوسرے روز جبکہ لیلی شب کی زلف مشکبار تا بہ کمر پہنچی۔ تھانہ دار پولیس کی وردی ڈانٹ کر حوالات میں آیا۔ عروس یوسف لقا نا طورۂ شیریں ادا ثریا بیگم کو خواب ناز سے جگایا کان میں آہستہ سے کہا۔ (جانِ من یہی موقع ہے۔ چلو بھاگ چلیں)۔

ثریا بیگم بولیں دیکھو غور کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ بے سمجھے بوجھے چل کھڑے ہوں، اور پیچھے جگت ہنسائی ہو۔ لوگ تالیاں بجائیں۔ اپرے غیرے قہقہے لگائیں۔ خلق خدا کو شگوفہ ہاتھ آئے۔ ہر کہہ و مہ بنائے کہ جوان اور حسین بیٹرن کو دیکھ کر پھسل گئے۔ تھانہ داری کرنے چلے تھے ایک ادنا عورت کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

تھانہ دار نے اصرار کیا کہ اب غور وفکر بیکار ہے۔ میری خاطر سے چلی چلو۔ سب معاملہ لیس ہے۔

ثریا بیگم : بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر تھانہ دار کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر حوالات کے باہر آئیں۔ جب آہستہ آہستہ دونوں عاشق و معشوق پچاس قدم کے فاصلے پر پہنچے تو ایک سپاہی نے عرض کی خداوند یہی مکان ہے۔

تھانہ دار اُس عروسِ زیبا شمائل کو وہاں لے گئے۔ مردانے کپڑے پہنائے۔ عباسی رنگا ہوا ململ کا دوپٹا زیب سر کیا۔ بوٹ پہنا گاڑی پر سوار ہوئے۔ خدا کا نام لے کر اُس زندان بلا سے چلے۔

اب سنیئے کہ ایک بج گیا۔ ثریا بیگم کا دل دھڑکتا تھا۔ قدم قدم پر کانپتی تھیں۔ روح لرزی جاتی تھی کہ یا خدا اب کیا ہوگا۔ اگر گرفتار ہوں گے تو صید ادبار ہوں گے۔ بازار میں ایک عورت نے بہاگ کی دھن میں (اس نگری کے دس دروازے نکس گوا کوئی دورہ سپاہیا جاگت رہیو) اس حقانی چیز کو نہایت عمدہ طرز پر ادا کیا۔ یعنے اس شہر کے دس پھاٹک ہیں۔ چور خدا جانے کس دروازے کی راہ سے نکل جائے۔ اے پہرے والے سپاہی جاگتا رہنا۔ ایسا نہ ہو تیری غفلت میں چور نکل بھاگے۔ ثریا بیگم نے تھانہ دار سے اس کے معنی پوچھے۔ کہا اس وقت جی چاہتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے۔ سب اس کو دے دوں۔ مگر چور کا تو کہیں ذکر بھی نہیں کیا۔ تم نے یہ معنی کیوں کر پہنا لیے۔ اتنے میں اُس خوش گلو عورت نے اس کا حصہ اوّلین گانا شروع کیا۔ (نگری میں آیو ہے چور) ثریا بیگم وجد کرتی تھیں ادھر آگے بڑھے تو برق انداز نے ٹوکا۔ کون تھانہ دار بولے رعیت۔ ثریا بیگم اس قدر خائف ہوئیں کہ کلیجہ دھڑکنے اور بانسوں اُچھلنے لگا۔ سمجھیں کہ اگر گفتگو کروں تو مبادا برق انداز کو شک گذرے۔ تھانہ دار کا ہاتھ لے کر کلیجے پر رکھا۔ اُنھوں نے اشارے سے سمجھایا کہ خوف کا مقام نہیں ہے۔ یہ بات تو صبح کو پھوٹے گی۔ تب تک ہم تم منزلوں کے فاصلے پر ہوں گے۔ اور برق انداز کی یہ مجال نہیں کہ ہم سے برسر مقابلہ ہو۔ چلتے چلتے گاڑی ایک مقام پر ٹھہر گئی۔ تھانہ دار نے باآواز بلند کہا۔ چودھری گاڑی کیوں رُکی۔ اُس نے جواب دیا۔ صاحب تنک تما کو پی لیوں تو چلوں تھانہ دار اپنے دل میں سوچے کہ اس کو حقے کی پڑی ہے اور یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔ گاڑی کو چودھری نے ایک پکے کنوئیں کے قریب روکا تھا اور اس کنوئیں کے اِرد گرد چند مسافر ٹکے تھے۔ اُن میں باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ ایک نے کہا۔ ہم نے سُنا ہے کہ حسن آرا بیگم نے شادی سے انکار کیا۔ اور کہا جب تک آزاد نہ آئیں گے ہم شادی نہ کریں گے۔ مگر اُس نے روم میں بڑا نام پیدا کیا۔ کل کے اخبار میں لکھا تھا کہ آزاد پاشا نے روسیوں کی بہت بڑی فوج کے مقابل چند یلانِ روم سے فتح کامل حاصل کی۔ وزیر جنگ نے اُن کو

خطاب کے علاوہ تمغہ بھی دیا۔ دوسرے نے کہا ہم نے قسطنطنیہ کے اخبار الجوائب میں اُن کی سوانح عمری پڑھی۔ بڑا جری اور بہادر آدمی ہے۔ جان کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں مگر عشق کے ہاتھ بک گیا ہے۔ اس نوخیز بیگم زادی نے جس کے حُسن زاہد فریب کی چار دانگ ہند میں دھوم ہے۔ خدا جانے کیسی چھب دکھا دی کہ ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ یہ حُسن اور جوانی عجب نعمت ہے۔ دل کا آنا بس قیامت ہے۔ اس پر ایک سوار بولا کس کا ذکر تھا میاں کون آزاد۔ وہ تو نہیں خوبصورت سے آدمی ہیں۔ کشیدہ قیامت چھریرا مگر کسیلا بدن۔ بنوٹ کے اُستاد ہیں۔ روم بھی گئے ہیں۔ مگر وہ تو آوارہ مزاج آدمی ہے۔ سرا میں ایک بھٹیارن کے ہاں پڑا تھا۔ ہم کار سرکار کو وہاں گئے تھے تو سرا ہی میں ٹکے۔ اللہ رکھی نامی ایک بھٹیارن اُس کو چپتیں لگایا کرتی تھی۔ لیکن خوش رو جوان ہے۔ اور بڑا شہ زور۔ بنوٹ، بانک لکڑی، پٹا بانا، کشتی سب میں اُستاد۔ کامل فن روم میں اس نے ضرور فتح حاصل کی ہوگی۔ اب جنگ کی کیا کیفیت ہے۔ مسافر نے کہا آج کل اخبار پڑھنے میں نہیں آیا۔ صرف اتنا البتہ سنا کہ آزاد نے جو ہندوستان کے رہنے والے ہیں، روم میں وہ اپنے ملک کا نام کیا اور لڑتے وقت اکثر یہی کہا کہ میں ہندی مسلمان ہوں۔ رومیوں پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ بودا یا بزدل نہیں ہوں۔ سچ ہے اور مصداق اس کے ہے۔

حبّ الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بملکِ مصر شاہی می کرد
میگفت گدا بودن کنعان خوشتر

جو مسافر جاگتے تھے وہ سب آزاد پاشا کے مدّاح ہوتے۔ ایک بولا واہ رے آزاد۔ کیوں نہ ہو شاباش میرے شیر۔ خدا تم کو اِس کا اجر دے گا۔

حماک اللہ عن شر النوائب
جزاک اللہ فی الدّارین خیرا

دوسرے نے کہا۔ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ شیروں کے شیر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ آزاد کسی بڑے سپاہی، بہت بڑے سپہ سالار اور شیر دل شیر مرد کا لڑکا ہے۔ تیسرے نے کہا اب کل سے ہم بھی اخبار دیکھا کریں گے۔ دیکھیں آزاد وہاں کیا نام کرتے ہیں۔ ہم ہندوستان کے نام پر فدا ہیں۔ اسی ملک میں پیدا ہوئے پڑھے تعلیم پائی۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ ہند کا نام ہو۔

ثریا بیگم نے جو آزاد کی اس قدر تعریف و توصیف اجنبیوں کی زبان سے سنی اور اتنے مسافروں کو اُن کی مدح میں رُطب اللسان پایا تو جامے میں پھولے نہ سمائی۔ رنج وغم سب بھول گئی۔ برسوں سے یہ بھی خبر نہ تھی کہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ دل کو بڑی تسکین ہوئی۔ جناب باری کا شکریہ ادا کیا۔ جب گاڑی بان نے چلم پی کر فراغت پائی تو گاڑی پر سوار ہوا۔ چلتے چلتے دو کوس نکل گئے۔ اب تھانہ دار شیر ہوئے فوراً گاڑی سے اُترے۔ اور ڈانٹ ڈپٹ بتانے لگے۔ شہر سے دور میدان میں تھانہ دار کا کون مقابلہ کرتا۔ ایک مقام پر گاڑی کا ایک بیل بیٹھ گیا۔ گاڑی بان نے لاکھ لاکھ تدبیریں کیں مگر بیکار۔ تھانہ دار صاحب کو مجبور ہو کر گاؤں میں جانا پڑا۔ چوکیداروں کو حکم دیا کہ کسی زمیندار کا بیل کھول لاؤ۔ واپس آن کر دیکھتے کیا ہیں کہ پانچ آدمی گاڑی کو گانسے کھڑے ہیں۔ ہوش اُڑ گئے سمجھے کہ دوڑ آئی ہے۔ اتنے میں ایک چوکیدار نے کہا۔ چور، چور۔ چور کا نام سُن کر تھانہ دار کی جان میں جان آئی۔ خبردار کہہ کر لپکے تو چور بگٹٹ بھاگے۔ تھانہ دار نے گاڑی سے دری نکالی اور سڑک پر بچھائی۔ اپنے دوست زنِ مرد نما کو بٹھایا۔ حقہ بھروایا اور تاکید کی کہ بیل ابھی آئے۔ سامنے سے ایک مسافر سوار آتا تھا۔

سوار: کیوں بھئی مسافر ہندو ہو یا مسلمان۔ بُرا نہ ماننا یوں ہی پوچھا۔

تھانہ دار: ہم کو اس سے کیا مطلب۔ تم اپنا مطلب بیان کرو۔

سوار: حقہ پئیں گے۔ مسلمان ہو تو حقہ پلاؤ۔ ورنہ خیر۔

تھانہ دار: ہم تو ہندو ہیں۔ ذات کے کھتری۔ چلم پیو گے تو لو۔

سوار: چلم پینا وضع کے خلاف ہے۔ حقہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔

تھانہ دار: اسمِ مبارک۔ آپ کہیں نوکر ہیں یا بیکار۔ یا زمیندار ہیں۔

سوار: جی مجھے فرزند علی کہتے ہیں۔ نیوتنی میں میرا مکان ہے۔ میں پیشتر ضلع بلند شہر میں سررشتہ دار بندوبست تھا۔ چھوٹے صاحب کے اجلاس میں پچاس روپیہ ماہواری پاتا تھا۔ اب میں نائب تحصیلدار ہوں۔

تھانہ دار نے حقہ دیا۔ بٹھایا۔ تعظیم کی باہم گفتگو ہونے لگی۔ اُنھوں نے کہا آپ تھانہ داری ہی جانتے ہیں یا شعر و سخن کا بھی کچھ شوق ہے۔ تھانہ دار مسکرا کر بولے۔ بندہ نواز خاکسار بھی شعرائے گرانمایہ کے ساتھ دمساز ہے۔ ایک شعر اس وقت یاد آیا اگر مضائقہ نہ ہو تو سُنیے۔

یاران بفکر بخیۂ و مرہم فتادہ اند
ویں جامہ ام ہنوز زصد جادرید نیست

سوار : سُبحان اللہ بہت ہی خوب واللہ یہ حضور ہی کا کلام ہے۔

تھانہ دار : (مسکراکر) جی واللہ اعلم کس کا کلام ہے۔ مگر کسی دل جلے کا کلام ہے۔ ع
ویں جامہ ام ہنوز زصد جادرید نیست

کیا کہا ہے۔

سوار : اصنافِ سخن پر قادر ہونا محال ہے۔ خاقانی اور عرفی قصیدے کے بادشاہ تھے۔ سعدی شیرازی کا حصہ فصاحت تھا۔ نظامی گنجوی نے مناجات میں قلم توڑ دیئے۔ فردوسی نے رزم کے بیان میں کوسِ لمن الملک بجایا۔ محقق طوسی نے علمِ اخلاق کی وہ چھان بین کی کہ سُبحان۔ سُبحان حافظ شیرازی بادہ عرفان کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔

ساقیا برخیز و دردہ جام را
خاک بر سرکُن غمِ ایّام را
گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلان
مانمی خواہیم ننگ و نام را

مولوی معنوی کی مثنوی ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے نرالا ہی رنگ ہے۔

بشنو از نی چون حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستان تا مرابہ بریدہ اند
از نفیرم مردوزن نالیدہ اند

الغرض سب کا رنگ جداگانہ ہے۔ مگر اُردو والوں کا رنگ ایسا پھیکا پایا کہ الامان الامان۔ ہاں اُردو کے سخندانوں میں میر انیس صاحب مبرور اور مرزا دبیر صاحب مغفور کو ہم نے منتخب کیا ہے۔ ہم اُن کے کلام کے عاشق زار ہیں۔ ایک بند پڑھتا ہوں۔ نہ تشبیہ ہے نہ رعایت ہے۔ نہ استعارہ ہے۔ مگر ایسا کہا ہے کہ جو سمجھتے ہیں وہ داد دیں گے۔ اور نافہموں کا تو ذکر ہی نہیں۔

ہاں اے زبان خموش ادب کا ہے یہ مقام کوثر سے مُنہ کو دھوئے تو لے شاہِ دین کا نام

اے کلک سر جھکا دے قدم پر پئے سلام　　　ہے طبع پاک شستہ و رفتہ ہو سب کلام
پیچھے زبان سے وصف شہ نیک خو کرے
اشکوں سے پہلے مردم دیدہ وضو کرے

تھانہ دار نے اِس بند کی تعریف کی. کہا سُبحان اللہ فصاحت اِسس کو کہتے ہیں. زبان یہ ہے کیا روزمرہ ہے کیا بات پیدا کی ہے. سُبحان اللہ سُبحان اللہ تھانہ دار نے بھی ایک بند میر انیس صاحب کے طرز پر پڑھا:

لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رُو　　　پیدا تنوں سے پیرہن یُوسفی کی بُو
غلمان کے دل میں جن کی غلامی کی آرزُو　　　پرہیز گار زاہد و ابرار و نیک خُو
پتھر ہیں ایسے لعل صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا یہ مَلک ہیں بشر نہیں

تھانہ دار نے مسافر پر غور سے نظر ڈالی تو دل میں کچھ شک پیدا ہوا. پھر بغور دیکھا. کہا حضرت میرے دل میں اس وقت آپ کی طرف سے ایک شک پیدا ہوا ہے. کہیے عرض کروں، کہیے خاموش رہوں. یہ فقرہ سنتے ہی نائب تحصیلدار صاحب کے ہوش فِفرو ہوتے. گھبرا کر فرمایا. شک کیسا. میری طرف سے کس قسم کا شک حضور کے دل میں پیدا ہوا ہے. مگر آواز سے پایا جاتا تھا کہ دل میں چور ہے. تھانہ دار مُسکراتے. حضرت سُنیے دایہ سے کوئی پیٹ چھپاتے تو اُس کی غلطی ہے. ہم تھانہ دار ہیں. بس اور کچھ نہ عرض کروں گا. العاقل تکفیتہ الاشارۃ. ع
عاقلان را اشارتے کافیست

آپ نائب تحصیلدار نہیں اور نہ آپ ضلع بلند شہر میں سر رشتہ دار بندوبست تھے. آپ اشتہاری مجرم ہیں. حُلیہ ملتا ہے.

سوار: ذرا زبان سنبھال کر بولیے گا سمجھے؟ حضرت سلامت. ہاں.

تھانہ دار: کیوں کیا مار بیٹھے گا. اللہ اللہ یہ خم و دم. اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے. بس خیر اسی میں ہے کہ تلوار ہاتھ سے ڈال دو ورنہ دھر لیے جاؤ گے.

سوار: آخر آپ کو کس کا شک گذرتا ہے. اُس کا نام تو لیجیے.

تھانہ دار: آپ جبل پور میں ایک سوداگر کے ہاں کلرک تھے وہاں آپ نے دو ہزار روپیہ کا غبن کیا اور آپ پر مقدمہ دائر ہوا. ثبوت کامل دیا. صاحب مجسٹریٹ نے آپ کو ایک سال قید کی سزا

دی۔ دس روز قید رہے۔ گیارھویں روز آپ بھاگ گئے۔ ایک سپاہی اور ایک کنجی بردار کو آپ نے زخمی کیا۔ آپ کا حلیہ چوطرفہ بھیجا گیا۔ سوداگر نے پانچ سو روپیہ کے انعام کا وعدہ کیا ہے۔ حضرت سلامت دلگی نہیں ہے ہم نے تھانہ داری کی ہے۔ بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ آپ اشتہاری مجرم ہیں حضرت۔

سوار: جی بھلا اگر ہم پھنس جائیں تو آپ کو کیا ملے۔ پانچ سو۔

تھانہ دار: پانچ سو روپیہ نقد۔ ترقی عہدہ، نام نیک شہرت۔

سوار: بس ہم سے ایک ہزار لیجیے۔ ہمارے ساتھ ہمارے مکان چلیے۔

تھانہ دار: ہزار روپیہ گن دیجیے مکان کہاں ہے۔ اگر قریب ہے تو بسم اللہ۔ ع

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

سوار: ایک ہزار روپیہ تو ہم ابھی ابھی دیں گے۔ گنوا لیجیے، مگر مکان کا حال یہ ہے کہ ہم اصل باشندے قنوج کے ہیں۔ مگر عمر بھر آگرہ میں رہے۔ اب دو برس سے جبل پور میں تھے۔ اب نہ کہیں مکان ہے نہ کوئی عزیز ہے۔ نہ رشتہ دار ہے۔ دوست نہ یار ہے۔ ہم ہی ہم ہیں۔ ہر کہ ہیچ ندارد زہیچ غم ندارد۔ اگر ہم کو گرفتار کرو گے تو گجراتی ہمارے پاس بھی ہے۔ بے لڑے بھڑے ہم ہتھیار نہ رکھیں گے تم کئی آدمی ہو ہم یکہ و تنہا۔

ادھر تھانہ دار اور سوار میں یہ باتیں ہوتی تھیں اُدھر ثریا بیگم دل میں سُوچتی تھیں کہ یہ ناحق لڑائی مول لیتے ہیں۔ تم خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہو۔ تمہیں پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے سے کیا واسطہ۔ اور جو تلوار چلی تو پھر کیا ہو گا۔ کان میں کہا کہ تم اس وقت اجڈ پن کرتے ہو۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اب تم تھانہ دار نہیں ہو۔ تم خود مجرم ہو۔ مگر پولیس میں رہ کر اجڈ پن کہاں تک نہ آئے۔ مولوی کے لڑکے خود مولوی مگر افسوس کہ پولیس کی نوکری کی بدولت اکھڑ بن گئے جو اُس کی تلوا پڑ گئی تو پھر کیا ہو گا۔ تمہاری جان الگ جائے اور میں الگ اس جنگل میں تلملاؤں۔

تھانہ دار: کہیے حضرت پھر اب کیا فکر کی جائے۔ یار جی نہیں چاہتا۔

سوار: بھائی جان یہ ہزار روپیہ کا سُونا حاضر ہے اس کو قبول کیجیے۔

از دستِ گدائی بینوا ناید ہیچ
جز آنکہ بصدق دل دعائی بکند

تھانہ دار: حضرت یہ تو بالکل خفیف رقم ہے ہمیں جنچتی ہی نہیں۔

اتنا سننا تھا کہ سوار نے فوراً گجراتی سٹر سے نکالی اور چمکا کے کھڑا ہو گیا۔ اگر یہ رقم نہیں پہنچتی تو لے، روک۔ ہم سپاہی ہیں نہتے پر ہاتھ نہ پڑے گا۔ لے تلوار۔ تھانہ دار بھی معاً تلوار اگل کر کھڑا ہو گیا۔

ثریا بیگم: واسطے خدا کے جانے دو۔ ارے لوگو دوڑو۔ تم دونوں کو خاتون جنت کا واسطہ۔ ہے ہے ارے اس جنگل میدان میں تلواریں نہ چمکاؤ۔ کفن کو کپڑا ایک کو نہ ملے گا ہائے میرے اللہ۔

تھانہ دار: (پینترا بدل کر) کیسا کفن۔ آگے بڑھ کر۔ روک۔

سوار: (ٹھاٹھ کر کے) روکا۔ اب تو ہمارا وار روک۔ بسم اللہ۔ ع

ہمیں میدان ہمیں چوگان ہمیں گوئی

ثریا بیگم: اے میں کس کس کو سمجھاؤں۔ دونوں جھلی ہیں۔

چوکیدار: تھانہ دار صاحب آپ نہ بولیں۔ او سسر ادھر ہم سے لڑ۔

سوار: (آگ بھبوکا ہو کر) گالی۔ گالی۔ چپ پاجی سور ہے۔

یہ کہہ کر سوار نے بڑھ کر وہ تلا ہاتھ دیا کہ چوکیدار کی ایک انگلی کٹ کے گر پڑی۔ تھانہ دار سوچے کہ لڑائی بڑھ گئی۔ ہم خود بھی دھر لیے جائیں گے۔ فوراً اپنی تلوار پھینک کر کہا۔ بس جانے دو۔ جان نہ لو سوار پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔ اور یوں گفتگو کی۔

سوار: ہم شریف۔ آپ شریف۔ یہ پاجی گالی دینے والا کون۔

تھانہ دار: اسی سبب سے ہم خاموش رہے، ورنہ تم رہو کیا بیچارے۔

سوار: اچھا اب بیٹھو ہم بھی بیٹھیں تم بھی بیٹھو۔ بسم اللہ۔

تھانہ دار نے کل امور پر غور کیا تو مناسب معلوم ہوا کہ شر سے اجتناب کرے۔ اور ادھر ثریا بیگم نے گورے گورے ہاتھ گلے میں ڈال کر بھولے پن کے ساتھ کہا۔ جانی خدا کے لیے اس وقت نہ لڑو۔ ایسا نہ ہو کہ پھر غصہ آجائے جس طرح تلوار ہاتھ سے ڈال دی اسی طرح اب صبر کرو۔ نہیں تو میں کڑھ کڑھ کے مروں گی اور اس جنگل میں خدا جانے میری کیا گت ہو گی۔

سوار سپاہی آدمی تھا۔ رقیق القلب اس جوان اور اس سیمیں عذار عورت کی گریہ وزاری دیکھ کر دل بھر آیا۔ قسم کھائی کہ جب تک زندہ رہوں گا تم دونوں سے نہ جھگڑوں گا۔ چاہے تم وار بھی کرو مگر میں نہ بولوں گا۔ تھانہ دار نے کہا بھائی تم کو ہمارا حال ذرا بھی نہیں معلوم۔ ہم بھی مظلوم اور مفرور اور مجرم ہیں۔ اور کل ہماری نسبت بھی اشتہار دیا جائے گا۔ ہمارا حلیہ بھی درج گزٹ ہو گا۔ خیر۔ ع

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

سوار نے کہا واہ جب. تم مفرور تو نہیں معلوم ہوتے. سرکاری وردی ڈانٹے کرچ لگائے ہو تلوار پاس ہے. ایک دوست ساتھ ہے. مگر اُستاد ہم سمجھ گئے بس ہم نے تاڑ لیا یہ مرد نہیں ہیں. گو کپڑے مردانے سہی مگر کوئی عروسِ مہ طلعت ہے. اس کو تم کہیں سے بھگا لائے ہو. ثریا بیگم مسکرا کر بولیں. اے واہ اور سُنیئے گا دلہن کوئی ہوگی. ہم تو خود دُلہن کی تلاش میں ہیں. یہ کاہے سے آپ نے ہمیں دُلہن قرار دیا. خیر سے نجوم میں بھی دخل ہے. چشمِ بد دور.

تھانہ دار: یہ بڑے ڈنڈ پیل جوان ہیں. ورزش میں تمام عمر انھوں نے صرف کی ہے. نبوٹ اور بانک میں اُستاد بے بدل ہیں.

سوار: خیر نبوٹ اور بانک میں چاہے اُستاد بے بدل نہ ہوں مگر لگاوٹ میں تو واقعی اپنی آپ ہی نظیر ہیں. اس میں ذرا شک نہیں.

ثریا بیگم: ایں معقول. ذری ٹھہرے ہوئے. گرمی تو نہیں چڑھ گئی. دشمنوں کے دماغ پر آدمی میں بس حواس ہی حواس تو ہیں اور ہے کیا.

الغرض تھانہ دار نے اپنے نئے دوست سے کچا چٹھا بیان کر دیا. ان کو جو ہمدرد پایا تو سوار کمال مسرور ہوا کہا بس اب. ع

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

تھوڑی دیر کے بعد ثریا بیگم اور تھانہ دار اور سوار وہاں سے روانہ ہوئے.

ناز سے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
اور تصویر یہ بول اُٹھی کہ اللہ رے میں

شاہد مشتری پیکر معشوقِ پاک بر کی خاطر داری اور دلجوئی کرتے اور آہستہ آہستہ قدم دھرتے تھانہ دار اُس دشتِ بلاخیز و کوردہِ وحشت انگیز میں جاتے تھے. آگے ناظورۂ گل عذار اور تھانہ دار پیچھے سوار اور ختلی ضیغم شکار پو پھٹنے کے وقت تھانہ دار ایک پہاڑی کے قریب پہنچے. جس کی چوٹی پر گاؤں آباد تھا. اس کہسار میں تھانہ دار نے ایک صاف ستھرا مکان اپنے لئے تجویز ا اور زمیندار سے کہا کہ اگر کوئی شخص ہمارا حال پوچھے تو کہنا ہمیں نہیں معلوم یہ بندوبست کرکے ثریا بیگم کو لے کر مکان کے اندر گئے. فرش بچھوایا سوار کو باہر جگہ دی. ثریا بیگم کئی دن کی تھکی ماندی تھی. آسائش

کامقام پاکر باغ باغ ہوگئی۔ صبح عارفون کے دل کی طرح نورانی تھی۔ چھت پر جاکر دونوں عاشق و معشوق قدرت حق کا مشاہدہ کرنے لگے۔ ابھی آفتاب عالمتاب کا شرقستان میں پتا بھی نہ تھا۔ ہر سمت سے ہوائے سرد و خنک کے جھونکے روح کو سردی اور جگر کو تازگی بخشتے تھے۔ جلاجل اوراقِ درختان کی نغمہ انگیزی مرغانِ خوش نوا کی ترانہ ریزی ہرن اور چکارے چوکڑیاں بھرتے تھے۔ انواع اقسام کے جانور کلیلیں کرتے تھے۔ گل بوٹوں کا جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ ایک ایک نونہال چمن حسن یوسف سے ٹکر لڑتا تھا۔ موسم بہار فصلِ خورداد۔ بغل میں عروسِ بہشتی سرشت حور نژاد۔

پری پیکری چون گل آراستہ	پری و بت از ہندوان خواستہ
بشیرینی از گل شکر نوش تر	بنرمی ز گل نازک آغوش تر
نہ گیسو کہ زنجیر از مشکِ ناب	فروہشتہ چوں ابرے از آفتاب

گرہ برگرہ چین زنقش چو دام

ہمہ چینیاں چین اورا غلام

ثریا بیگم کو اس کیفیت نے مست کردیا۔ نسیم عنبر بار بہشت کی لپٹیں لاتی تھی۔ روح تک وجد میں آتی تھی۔ سامنے کے کہسار دور سے عجب لطف بہار دکھاتے تھے۔ معشوق و عاشق کے دل غنچۂ گل کی طرح کھلے جاتے تھے۔ سبزے کی لہک اور چشمہ سار نوشین گلاب کے آبِ رواں کی جھلک مرغانِ خوش الحان کی رامشگری طاؤس رنگین پر و بال کی جلوہ گستری گل زمین روکش بہشت بریں شبنم گلِ عطرآگیں۔ بادِ صبا سبکبار بہار آلود عشرت بار فرحت آمود پنجشنبہ۔ سعد اکبر۔ مشتری کا روز نشاط عنوان روزِ آویند پر تقدم بالزمان۔ الغرض باغ و بہار اور گل و گلزار اور مشاہدۂ قدرت کردگار اور کہسار ورود بار نے ثریا بیگم کے دل سے گردِ کلفت دھوئی۔ اتنے میں سپیدہ صبح نمودار ہوا۔

چو روزِ سفید از شبِ زاغ زنگ	برآمد چو کافور از اقصائے زنگ
ہوا صاف از دورِ گیتی زگرد	فلک روی خود شست از لاجورد
فروزندہ روزی چو فردوس پاک	برآورد سر گنجِ قاروں ز خاک
بغربت کمر بستہ بادِ خزان	نسیم بہاری زہر سو دزان
ہمہ کوہ و گلشن ہمہ دشت و باغ	جہاں چشم روشن بزرین چراغ
در و دشت چون باغِ افروختہ	از و چشم بد دیدہ بردوختہ

زمانہ بکردارِ باغِ بہشت
زمین از گل و سبزہ مینو سرشت

ثریا بیگم نے کہا اب آفتاب نکل آیا ہے۔ چھت پر کھڑا رہنا مناسب نہیں مبادا کسی کی نظر پڑ جائے۔ کسی سے میری یا تمہاری آنکھ لڑ جائے تو پھر لینے کے دینے پڑیں۔ تھانہ دار نے مُسکرا کر جواب دیا کہ اگر میری آنکھ کسی بتِ جادو جمال کافر بدکیش سے لڑے تو خیر۔ مضائقہ ندارد۔ مگر حضور کا کسی نامحرم پر ریجھنا ستم ہے۔ کہیں یہ مصرع نہ صادق آئے۔ ع

رُخ میری طرف نظر کہیں اور

ثریا بیگم نے ہاتھ میں آہستہ سے چٹکی لے کر کہا۔ بجا آپ اوروں پر ریجھیں تو مضائقہ ندارد اور ہم کسی پر آنکھ ڈالیں تو سزاوار، گنہگار۔ اے کیوں نہیں میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو۔ تھانہ دار نے دستِ حنائی کا بوسہ لے کر قہقہہ لگایا۔ تھوڑی دیر تک دونوں نے نظارۂ بہار کیا۔ اس کے بعد کوٹھے سے اُترے۔ اتنے میں سوار نے باہر سے دریافت کیا کہ کھانے پینے کی کچھ فکر کی ہے یا نہیں۔ اگر فکر نہ کی ہو تو میں بند و بست کروں۔ تھانہ دار باہر گئے تو سوار نے یہ دو شعر جھومتے ہوئے پڑھے۔

بیا ساقی آن بادۂ چوں گلاب　　　برافشاں بمن تا در آیم ز خواب
گلابی کہ آبِ جگر ہا در وست
دوائے ہمہ دردِ سر ہا در وست

تھانہ دار نے تاڑ لیا کہ یہ حضرت بادہ گسار ہیں۔ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ مگر سوار نے پھر اسی قسم کے اشعار پڑھے اور اس مرتبہ اور بھی زیادہ جھومے۔

بیا ساقی آن مے کہ جان پرور است　　　بمن دہ کہ چوں جان مرا در خور ست
مگر نو کند عمرِ پژمردہ را
بجوش آرد آن خونِ افسردہ را

تھانہ دار: کیا اس شغل میں بھی ہیں آپ۔ کبھی جام دیکھا ہے۔ کچھ شوق ضرور رہے۔ میں ایک نہ مانوں گا۔ اگر آپ کو شراب ناب کا شوق ہے تو کیا مضائقہ مگر میں آپ کے ساتھ کھانا نہ کھاؤں گا۔ مجھے اس مردار سے احتراز ہے۔ ع

دوزخ میں جلیں گے مے کے پینے والے

سوار: اے لاحول کیسے روکھے پھیکے آدمی ہو۔ ارے میاں راح رُوح پرور سے احتراز۔ واہ ری عقل۔

ارے ناداں موت تک کی دوا ہے۔ از مالو نہ ۔ ؎ ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پُر زمی ۔ حافظ کا قول سُنا ہے۔

اب سُنیئے کہ اِدھر تو سوار آبِ آتش خواص کی فکر میں تھے۔ اُدھر زمیندار نے اشارے سے تھانہ دار کو علاحدہ بلایا۔ تھانہ دار سمجھ گئے کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ پوچھا پہلے یہ بتاؤ کہ خیریت تو ہے۔ کہا خیریت کجا۔ اب میں کہیں کا نہ رہا۔ آپ کے ساتھ کوئی گاڑی بان تھا۔ تھانہ دار نے کہا ہاں بیشک تھا۔ کیا اُسی نے کچّا چٹھا بیان کر دیا۔ زمیندار نے بیٹھ کر کُل حال کہا۔ میں کھیت میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آن کر اشارے سے بلایا۔ میرے دل میں چور تھا ماتھا ٹھنکا۔ پاس گیا تو پوچھا کہ تمہارے گاؤں میں کل شام سے جو اجنبی آئے ہوں اُن کو فوراً بلواؤ اور اگر کسی کو تم نے نکال دیا ہو تو حاضر کرو۔ میں نے کہا اجنبی یہاں پہاڑ پر کون آنے والا ہے۔ ایک ذرا سا گاؤں۔ یہاں تو مہینوں آدمی کی صورت نہیں نظر آتی۔ پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔ کبھی کبھی شکاری البتّہ ادھر نکل آتے ہیں۔ ہرن، پاڑھے، خرگوش، نیل گائے کی اس طرف کثرت ہے۔ اور پہاڑ کے نیچے جنوب کی جانب ہریلوں کا بن ہے۔ باقی اور تو کوئی نہیں آتا۔ سواب تو شکاری بھی نہیں آئے ہیں۔ دو گورے البتّہ شکار کھیلتے ہیں۔ بس باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ اس پر وہ بہت بگڑا اور دو آدمی اور آئے ایک کو میں پہچانتا ہوں پولیس میں نوکر ہے۔ مگر وردی کوئی نہیں پہنے تھا۔ اُن دونوں نے بڑی ڈانٹ بتائی اور دھمکایا۔ تب تو میں بھی کسی قدر کڑا پڑا۔ میں نے کہا آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہیے۔ ظاہرا مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خونی یا ڈاکو یا قیدی بھاگ گیا ہے اس کو ڈھونڈھنے نکلے ہو۔ ہم سے قسم لو جو ہمارے علم و یقین میں ہو۔ ابھی وہ لوگ گئے نہیں ہیں۔ اب آپ ایک کام کیجیے کہ اندر ہی بیٹھیے اور باہر سے میں قفل بند کر دوں گا۔ اور دو آدمی ادھر اُدھر دُور کھڑے رہیں گے۔ بڑے بُرے پھنسے۔ اگر کہیں بات پھوٹی تو زمینداری فوراً تشریف لے جائے گی۔ آج دن کو تو آپ یہاں رہیں اس میں ہر چہ بادا باد۔ مگر شب کو کہیں اور اپنا ٹھکانا کیجیے۔ اس پہاڑ کو از راہِ عنایت خالی کر دیجیے۔ ورنہ بندہ گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس جائے گا۔

تھانہ دار : اجی تم خاطر جمع رکھو۔ کوئی کیا کرے گا۔ دو کیا دو لاکھ ہوں چاہے۔

لاکھ آئیں کہ دو لاکھ کبھی ہم نہیں ڈرتے
روباہوں کے دھمکانے سے ضیغم نہیں ڈرتے

زمیندار : بندہ نواز حضور نڈر ہیں۔ بندہ تو جان و مال کو ڈرتا ہے۔

تھانہ دار: اچھا صاحب شب کو ہم چل دیں گے۔ بس اب اس وقت آپ جائیے ہم نے جھک مارا جو یہاں آئے تو بری کی۔

زمیندار: حضور اگر آپ تھانہ داری کی حالت میں آتے تو سر آنکھوں پر بیٹھاتا۔ مگر اب تو آپ مجرم ہیں۔ جان جوکھم۔ اگر کھل جائے تو قید ہوں۔ بید پڑیں۔ تعلقہ جائے۔ ریاست خاک میں ملے۔ ذلت ہو۔ ہم چشم اُلّو بنائیں۔ غور تو کیجیے۔ جہالت کو دخل نہ دیجیے حضور۔

تھانہ دار: اگر تھانہ داری کی حالت میں ہم آتے تو آپ سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ تم آنکھوں پر بٹھاتے یا ہم خود تمہارا سر سہلاتے اور بھیجا کھاتے۔ تھانہ داری بادشاہی سے کم نہیں۔

زمیندار مسکرا کر چلا گیا۔ اور اِدھر ثریا بیگم نے دو ہتڑ پیٹنا شروع کیا۔ ہے ہے تمہارے اس اجڈپن کو میں کیا کروں۔ پولیس میں نوکری کر کے تم عقل کو کھو بیٹھے۔ وہ تو اس گاڑھے وقت آڑے آیا، اور تم گالیاں دیتے ہو، اگر ابھی جا کے کہہ دے تو کیا ہو۔

سوار: میں اس وقت کانپ رہا ہوں۔ یہ شخص بالکل مدعی خرد ہے۔

زنانِ باردار ای مردِ ہشیار اگر وقت وِلادت مار زایند
ازان بہتر بہ نزدیک خرد مند کہ فرزندان ناہموار زایند

ثریا بیگم کی روح تک لرزتی تھی کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اونٹ کس پہلو بیٹھتا ہے۔ مارے خوف اور وحشت کے بال بکھرے تھے۔ دوپٹا کھسکا جاتا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ کبھی بیٹھ گئی اور ہاتھ جوڑ کے سمجھایا کہ واسطے خدا کے اب۔ جہل سے کام نہ لو۔ ارے اب تم تھانہ دار نہیں ہو۔ اب تم رعایا سے بدتر ہو۔ مجرم ہو قیدی کو بھگا لاتے ہو۔ اللہ جانے تم اپنی جہل سے کیا کرو گے۔ یا میرے اللہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوگئی۔

ایک آفت سے تو مر مرکے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

کہاں کہاں خدا نے بچایا۔ مگر اب ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اللہ مالک ہے۔ تھانہ دار نے کہا بیگم صاحب خدا حافظ و ناصر ہے۔ تمہیں ہماری قدر نہیں۔ سچ کہتا ہوں میں جرأت اور شجاعت میں فرد ہوں۔ جس قدر جری ہوں اُس قدر مجھ کو بھی نہیں معلوم اپنا عیب اور اپنا ہنر کسی پر ظاہر نہیں ہوتا۔

کس طرح قدر تجھے اپنے سخن کی ہو انیسؔ
مرتبہ مُشک کا آہوئے ختن کیا جانے

سوار : اب چُپ چاپ بیٹھے رہیے۔ ذرا غل نہ مچاؤ حضرت۔

تھانہ دار : ہاں ہاں کیا میں نہیں جانتا مگر چنداں اندیشہ نہیں ہے۔

ثریّا بیگم : اب سوچو کہ رات کو کہاں بھاگیں اِس کی فکر کر رکھو۔

تھانہ دار : یہاں سے دو کوس پر ایک دوست رہتا ہے اُس کے ہاں۔

ثریّا بیگم : خدا جانے ابھی کیا کیا مصیبت دیکھنا بدا ہے خدا مالک ہے۔

الغرض۔ ع

جب زُلف کو کھولے ہوتے لیلائے شب آئی

تو زمیندار نے تشفی دی اور کہا کہ وہ تینوں برق انداز چوطرفہ تلاش کر کے چلے گئے۔ مگر اب آپ سوچ کے کوئی ٹھکانا تجویز یں۔ رات اِس قدر تیرہ و تار تھی کہ الامان الامان ثریا بیگم اور تھانہ دار مکان سے نکل کر میدان میں ٹھنڈی ہوائیں کھانے لگے۔ مگر یہ معشوق پری چہرہ شب کی تاریکی سے کسی قدر خائف تھی۔ اور ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی مُہیب اور ہائل درتیں جو نظر آئی تھیں۔ تو کانپ اُٹھتی تھی۔ ایک روش میں ثریا بیگم نے کرمکِ شب تاب کی کثرت دیکھ کر کہا آؤ جگنو جمع کریں یہ کہہ کر پھرتی کے ساتھ طرارے بھرتی ہوئی جگنو پکڑنے لگی۔ دس پانچ تھانہ دار کو دیے کہ اپنی ٹوپی میں رکھیے۔ اور چند جگنو اپنے دوپٹے میں باندھے۔ اور اس ناز کے ساتھ چمکتی ہوئی چلی کہ تھانہ دار درود پڑھنے لگے۔

کفر و دین ہر دو بر رہش پُویاں
وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

تھانہ دار : اب اِس وقت تو لب بوسہ زیب کا ایک بُوسہ شکر آمیز دو۔

ثریّا بیگم : ایں! اے واہ میاں۔ زعفران زار دیکھتے ہی خوش طبعی کرنے لگے۔

تھانہ دار : اللہ جانتا ہے ایک ہی بُوسہ لیں گے مُنہ سے کہہ دو کہ ہاں بُوسہ لو۔

ثریّا بیگم : پہلے مُنہ بنواؤ۔ حلوا خوردن را روئے باید چہ خوش۔

تھانہ دار : ہائے بے رحمی۔ اُف ری بے رحمی۔ اس بے وفائی سے خدا سمجھے۔

تحصیلِ علم جور و جفا خوب کردۂ
ظالم وفا و مہر نیا موختی چرا

اس ظالم کا نام تو بتاؤ جس نے تمہیں جور و جفا کی تعلیم دی ہے۔

کاش یک حرفِ وفا نیز بگوشت می کرد
آنکہ چندیں بتو تعلیم ستمگاری داد

ثریا بیگم : اللہ جانتا ہے۔ ہمیں چھیڑنا ویڑنا نہیں ہم سب قصہ بیان کرلیں، پھر سمجھا جائے گا۔ ابھی دور دور سے باتیں ہوں اور اللہ کرے عزّت آبرو کے ساتھ یہاں سے بچ جائیں۔ بڑی بات ہے مگر سخت مشکل ہے۔

تھانہ دار : سخت مشکل میں تو اس وقت ہماری جان ہے مگر آپ کو کیا۔

نہ جام از محتسب دیدایں ستم نے توبہ اے ساقی
شکستی سخت بے رحمانہ امشب عہدِ دیرین را

لڑکپن سے نکاح کا وعدہ ہے مگر بوسہ لینے میں نکاح کی شرط نہیں ہے۔ ہاں یہ کہو کہ ظالم ہو۔ ستمگر ہو سفّاک ہو، بے رحم ہو۔ جلاّد ہو۔

ثریّا بیگم : (مسکراکر) ایں ایں۔ دو چار اور لفظ کہے ہوتے۔ بس۔

تھانہ دار : خدا وہ دن جلد دکھاتے کہ تم ہمارے میاں کہلاؤ اور ہم بیوی کہلائیں۔ آمین آمین ثم آمین۔

ثریّا بیگم : (کھلکھلاکر) ایں! اے لو! اچھی الٹی گنگا بہائی۔ آدمی میں حواس ہی حواس ہے۔ بس اور ہے کیا۔ بھنگیاتے ہوتے سے معلوم ہوتے ہو کچھ۔

تھانہ دار : اب ہم اِس پہاڑ پر سے کود پڑیں گے۔ اسی دم کودتا ہوں۔

ثریّا بیگم : کیا زندگی سے بیزار ہو گئے۔ غیرت دار کے لیے ایک چلو کافی ہے اور تم ایسے بے حیا سمندر تک سے نلوہ نکل آؤ۔ بدن تک تر نہ ہو۔

تھانہ دار : خیر صاحب اور تم ستم ڈھاؤ اختیار ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ افسوس۔

جنگجو کجکلہاں صلح و صفا نیز کنند
غنچہ سازند دل و کار صبا نیز کنند

مگر ہمارا کجکلاہ و جادو نگاہ معشوق وفا کے نام پر لاحول پڑھتا ہے۔

آن روز کہ تعلیم تو می گفت معلم
برلوح تو ننوشت مگر حرفِ وفا را

اَلصّبر مفتاح الفرج۔ اِنّ اللہ مع الصّابرین وَالشّاکرین۔ شب کو آرام کیا پچھلے سے کوچ کی

تیاریاں ہوئیں۔ سحرِ کاذب کے وقت سب جاگے اور کوچ کے لیے تیار ہونے لگے۔

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا | مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا | وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا

اک دم میں بہار اور ہوئی باغ جہاں کی
تلوار چلی گلشنِ انجم پہ خزاں کی

سُرخی وہ شفق کی اُفقِ چرخ پہ کم کم | وہ گل کے کٹوروں پہ درافشانیٔ شبنم

مہتاب ہوا گم فلکِ نیلوفری سے
پھولا گلِ خورشید نسیمِ سحری سے

زمیندار بھی آن پہنچا۔ کہا اب جا ہے نہ جاؤ۔ ہمارے کارندے نے لکھا ہے کہ یہاں کے حاکموں کو تھانہ دار کی طرف شک گذرا کہ وہ بمبئی بھاگ گیا۔ بمبئی کی طرف زیادہ تر تحقیقات ہو رہی ہے۔ آپ نہ خوف کریں۔

تھانہ دار سوچا کہ اگر بے سمجھے بوجھے اس عمدہ مقام کو چھوڑ دیں تو خدا جانے کس تباہی میں پڑیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بالفعل یہیں بستر جمائیں۔ شہر سے خبر منگوائیں کہ وہاں کیا نقشے ہیں۔ تھانہ پر کیا ہو رہا ہے۔ ہماری نسبت کیا حکم ہوا ہے۔ ثریا بیگم سے اپنی رائے بیان کی۔ انھوں نے کہا تجویز تو اچھی ہے۔ بشرطیکہ تم یہاں رہ کر اپنے کو تھانہ دار اور برسرِ حکومت نہ سمجھو۔ اور اجڈپن کی نہ لو۔ ورنہ تم بھی پکڑے جاؤ گے اور میں بھی۔ دونوں کے دونوں گرفتار ہوں گے۔

الغرض دو دن تک یہ سب وہیں رہے۔ معلوم ہوا کہ صبح کو تھانہ دار کی بڑی تلاش ہوئی۔ اس گاڑی بان کا پتا لگایا گیا۔ جو اُن کو لایا تھا۔ مکان پر تلاشی لی گئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اہلِ محلہ سے پوچھا تھانہ دار کے احباب سے دریافت کیا گیا۔ مگر کسی سے بھید نہ کھلا۔ ثریا بیگم کی نسبت اس قدر معلوم ہو گیا کہ بیڑن نہیں ہیں۔ بس مقدمہ کی پیشیاں ہو رہی ہیں۔

اب سُنیے کہ تیسرے دن ادھر۔

سحر گہہ کہ زورق کشِ آفتاب
زساحل برافگند کشتی در آب

اِدھر چشمہ سار میں ایک کشتی نظر آئی جس پر منجملہ اور آدمیوں کے ایک رئیس باوقار بھی تھا۔ ایک رہوارِ صبا رفتار۔ ثریا بیگم نے اُس جوان یوسف طلعت پر غور سے نظر ڈالی، اور تھانہ دار سے کہا دیکھو کہ کیسا خوشرو جوان ہے۔ زلف فتنہ گر، قد فتنہ خیز، چشم فتنہ زا، گردن سیمیں صبح جبیں۔

صباحت از دُور خارشش نہ پیداست
دو صبح از طرف یک مشرق ہویداست

اور گلگون برق شتاب کو تو دیکھو۔ گھوڑا کیا دُلہن ہے۔

آنکھیں وہ جن کو دیکھ کے حیران ہوں غزال
گردن وہ جس کے شرم سے ہے سرنگوں ہلال
آہو کی جست شیر کی چتون پری کی چال
دل اُس کے دست و پائے حنائی سے پائمال
ہر نعل پا کا حُسن یہ تھا اِس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

زیبا ہے گر کہیں شعرابا دپا اُسے / آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اُسے
طائر جہاں کے جانتے ہیں سب ہما اُسے / مہمیز و تازنے کی حاجت ہے کیا اُسے
فتراک اگر ہوا سے کبھی اک ذری اُڑی
یوں اُڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پری اُڑی

کشتی سے اُتر کر وہ جوانِ رعنا اسپِ طاؤس رفتار پر سوار ہو کر پہاڑ کے اُسی مقام پر آیا، جہاں تھانہ دار ٹکے تھے۔ ایک درخت کے سایہ میں خیمہ زن ہوا۔ سوار نے آداب عرض کر کے پوچھا کہ حضور یہاں شکار کھیلنے آئے ہیں۔ کہاں نہیں ہم نے ایک تصویر پائی ہے۔ اُس شخص کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ سوار نے تصویر لے کر پوچھا کہ میں ذرا اپنی بیگم صاحب کو دکھا دوں۔ کہا بہتر ہے۔ اندر آن کر وہ تصویر تھانہ دار کو دی اُس پر یہ شعر لکھا تھا۔

ناز سے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
اور تصویر پکار اُٹھی کہ اللہ رے میں

ثریا بیگم کو تصویر پر تنویر دکھائی تو معاً غش آگیا۔

اب چین نہیں سینے میں دل کو کسی پہلو
دزدیدہ نگہ لے گئی آرام ہمارا

الٰہی یہ کس جوان رعنا شمائل مشتری خصائل کی تصویر پر تنویر اس عروس سمن عذار کی نظر سے گذری کہ ایک ہی نظارے میں غش آگیا۔ تصویر کسی مصوّر چابکدست غیرت مانی و بہزاد نے کھینچی تھی۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ گویا بولا چاہتی ہے۔ ایک جوانِ شیر دل سمندِ وغا پسند پر سوار تھا کہ گھوڑا اب اُڑا اور اب اُڑا۔

تصویر لکھے اُس کی مصوّر تو پڑے دھوم
سُرعت قدم توسنِ تصویر کو لے چوم
کوڑا پے تغزیر جو چاہے کرے مرقوم
اک آن میں تصویر کا سب رنگ ہو معدوم
نقاش کا دل نقش پہ آمادہ ہی رہ جائے
بس ہاتھ میں اُس کے ورق سادہ ہی رہ جائے

سوار گھبرا کر باہر نکل آیا۔ تو رئیس نے پوچھا کیوں کیوں خیر باشد۔ کچھ گھبرائے ہوئے ہو۔ اس وحشت کے ساتھ کیوں نکلے۔ کہا اس تصویر پر جو بیگم صاحب کی نظر پڑی تو غش آگیا۔ سُبحان اللہ سُبحان اللہ کیوں صاحب یہ واقعی کسی شخص کی تصویر ہے یا یوں ہی فرضی بنوائی ہے۔ رئیس نے جواب دیا واللہ اعلم مگر ہم جانتے ہیں کسی ترک کی تصویر ہے اور یہ کوئی جلیل القدر افسر فوجی معلوم ہوتا ہے۔ مگر واہ وردی کس قدر زیب دیتی ہے۔ جامہ زیب آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ تو کیا واقعی غش ہی آگیا۔ تعجب کا مقام ہے۔ یہ غش کیوں کر آیا اور یہ کیا ہو گیا۔ سوار نے کہا بجا ارشاد ہوا۔ ایسے جوان رعنا کی تصویر آپ نے دکھائی کہ ہوش و حواس سب غائب کر دیے۔ آدمی کیا شے ہے اور الٹی آپ ہی پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہوا۔ ع اے بادِ صبا اینہمہ آوردۂ تست۔

آپ ہی بسمل کیا تیغ نگاہ ناز سے
آپ ہی کہتا ہے وہ یہ کیا ہوا کیوں کر ہوا

ادھر تھانہ دار نے بیگم صاحب کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ شانہ پکڑ کر کئی بار ہلایا۔ اور آواز دی مگر غشی کی حالت بدستور رہی۔ جب اس کیفیت کو کسی قدر عرصہ دراز ہوا تو تھانہ دار نے زمیندار کو بلایا اس نے لخلخہ اور کیوڑا منگوایا۔ مگر لاکھ لاکھ سنگھایا فائدہ نہ ہوا۔ آخر کار

مجبور ہوکر زمیندار نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ بستی سے جاکر طبیب کو لاؤ. بغیر طبیب کے اب کام نہ بنے گا. ہم نے بہت کوشش کی مگر بے سود۔

نہ ہوا کچھ مرضِ عشق کا جب اُس سے علاج
تنگ آکر مری بالیں سے مسیحا اُٹھا

سپاہی روانہ ہونے ہی کو تھا کہ ثریا بیگم نے آنکھیں کھول دیں اور آہستہ سے پانی مانگا. کیوڑا ملا کر پانی دیا گیا. تو ذرا دل کو تشفی اور قلب کو تقویت ہوئی.

تھانہ دار : اب مزاج کیسا ہے. بیگم صاحب اس وقت تو ہاتھ پاؤں پھول گے.

زمیندار : یہ فرطِ نزاکت ہے. ذرا ہی سے میں غش آگیا. اللہ اللہ.

می رنجد از تصوّر نظارہ خاطرت
گل ہم برنگ و بوئے تو نازک مزاج نیست

ثریا بیگم : اُس کو نزاکت نہیں کہتے. اس کو ضعف و نقاہت کہتے ہیں سمجھے.

تھانہ دار : یہ کس کی تصویر ہے کوئی رقیب ہے. ہمارا مگر جوان خوشرو ضرور ہے. ایسا جوان ہم نے آج تک نہیں دیکھا یہ پنجہ اور کلائی شیر کی سی اور آنکھیں تو بس اس قابل ہیں کہ ہر وقت نظارہ کرتے رہیے.

بہ آہو نسبت چشمش چو دادم چیں برابر و شد
کہ چشم شیر گیر من ندارد ہیچ آہوی

نگاہ پر نگاہ ڈالو واللہ جادو نگاہ ہی ہے. واہ واہ.

نگاہش باسر مژگان بجنگ است
خدا فضلے کند جوشِ فرنگ است

ثریا بیگم : تھوڑا سا پانی اور پییں گے. مگر ٹھنڈا ہو اور صاف.

تھانہ دار : حاضر ہے لیجیے. اب خدا کے لیے یہ بتادو کہ یہ کس کی تصویر ہے. اور یہ شخص کہاں ہے. تم سے کب کی ملاقات ہے. نام کیا ہے.؟

ثریا بیگم : نام خدا جانے اور واللہ اعلم اس وقت دل پر کیا گذری.

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سُن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں تمہیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

زمیندار : مگر اس قدر تو ظاہر ہو گیا کہ ان کے جان پہچان ضرور ہیں ورنہ جیب تنگ دل کو تعلق نہ ہو یہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ عشق سے زیادہ غالب دشمن دُنیا میں اور کون ہے۔

اے نوائے ساز محفلہاز تو — دے ہوائے خانۂ دلہاز تو

اے ز تو در ہر سرے پیمانۂ — اے ز تو در ہر درے میخانۂ

اے تسلی بخشِ ہر آشفتہ حال — از تو قربر پہلو صیدِ جمال

اے فروغِ روزن دلہائے تنگ — سینۂ خواہش تنداز تو رنگ رنگ

از تو جانہا مبتلائے رنگ و بو

وز تو دلہا در طلسم آرزو

ثریا بیگم : ذری اک نظر بھر دکھا دو۔ میں دل کھول کے بوسے تو لے لوں۔ ایک نظارہ دل شکستے لیے مومیائی ہے۔ دردِ دل کا یہی تو علاج ہے۔

ز پارۂ دل ما ہیچ گوشہ خالی نیست

کدام سنگدل ایں شیشہ بر زمیں زدہ است

ثریا بیگم نے آہ سرد بھر کر کہا ہم نے اپنی نوکری ناحق ہی کھوئی۔ ہم کو پایا تو عہدہ کھو یا بلکہ ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ اب کوچ کے دن قریب آ گئے۔ اب چل چلاؤ ہے۔ یہ تصویر اس وقت ملک الموت کا کام کر گئی۔ اندر والا قابو ہی میں نہیں۔ شہید ناز کہلاؤں گی۔ ہائے میرا باوفا دلِ اب رخصت ہوتا ہے۔

رخصت ہے دل کی روتی ہیں مل مل کے حسرتیں

جاتا ہے آشنا کسی ناآشنا کے ساتھ

ہمیں اب زندگی دوبھر ہے۔ ہاں اگر زندگی ہو تو کوئی اور بھی ہو۔ اگر جان باقی رہی تو۔ ع

الٰہی وہ بھی آ جائیں جنہیں ہم یاد کرتے ہیں

بس ہم کو غرض ہے تو اُن سے باقی ساری خدائی سے واسطہ نہیں۔

غرض طوبیٰ و کوثر سے نہ پروا حورِ جنت کی

وہ مینا ہو، وہ ساغر ہو، وہ ساقی ہو، وہ میخانہ

تصویر لے کر کہا۔

ہوتا ہے بے قرار حسینوں کو دیکھ کر
ایسا دیا تھا کیوں مجھے پروردگار دل

(بوسہ لے کر) آزاد۔ خدا تجھے حشر تک زندہ اور جوان رکھے۔ تیرا نام لے کر لاکھوں حسینہ اور جمیلہ عورتیں جیتی ہیں۔ تیرا خیال زندگی بخش ہے۔ مگر ہمیں ایسا بھولے کہ خط بھی نہ بھیجا۔ اے لو ہیں اول جلول بک رہی ہوں۔ کبھی جوگن بنی بن بن پھری۔ دُنیا سے الگ تھلگ بستر جمایا۔ کبھی شبو جان ہوئی۔ کبھی اُستانی جی کے ہاں رہی۔ اور اللہ رکھی تو اُس کے سامنے ہی تھی۔ مگر ہمیں بھول گئے ہوں گے یا شاید شرم آتی ہو کہ اب اللہ رکھی ذلیل عورت سے کون بولے۔

یا بھول گیا وہ بتِ خود کام ہمارا
یا خوف سے لیتا نہیں اب نام ہمارا

تھانہ دار کی طرف مخاطب ہو کر بولیں کہ اب خدا حافظ ہے۔ دم بدم میری ناطاقتی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ایک ساعت چین نہیں آتا۔ آزاد ہمارے قاتل ہوئے۔

قاتل جو کہا میں نے تو شرما کے وہ بولے
للہ نہ بدنام کرو نام ہمارا

ثریا بیگم تڑپ تڑپ کر اظہار رنج و ملال کرتی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھیں۔ اِدھر باہر سے سوار نے یہ اشعار باآواز بلند پڑھے۔

ہاتفی از گوشۂ میخانہ دوش — گفت بہ بخشند گنہ می بنوش
عفو الٰہی بکند کارِ خویش — مژدۂ رحمت برساند سروش
لُطفِ خدا بیشتر از جرم ماست — نکتہ سربستہ چگوئی خموش
ایں خردِ خام بہ میخانہ برد — تا می لعل آوردش خون بجوش

رندی حافظ نہ گناہیست صعب
باکرمِ بادشہ عیب پوش

تھانہ دار نے جا کر دیکھا تو حضرت کے دستِ مبارک میں جام اور جام میں بادۂ گلفام۔ مُسکرا کر کہا آئیے آئیے۔ حاضر ہے۔ تھانہ دار بولے۔ نوش جان۔ سوار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ دبے دانتوں کہا جنّت کو دور ہی سے سلام ہے۔ ایسی جنت پڑے جہنم میں۔

سوار: جنّت کا خیال ہی نہیں۔ ہم کوشش بلیغ کریں گے کہ جہنم نہیں جائیں۔ ہرگز جنّت کی طرف

رُخ نہ کریں گے۔ یہی کوشش رہے گی کہ دوزخ ملے۔

تھانہ دار: (مُسکرا کر) اِس کوشش کی کیا ضرورت ہے۔ بلا کوشش جہنم ملے گی۔ نجات کا غم کیسا۔ پیے جاؤ۔ حشر کے دن بھی صراحی ہاتھ میں ہوگی۔ اور رند پی رہے ہوں گے۔

سوار: انشا اللہ ضرور ورنہ جوابدہی کس سے کی جائے گی۔

حشر میں جب حساب مانگیں گے　　الامان شیخ و شاب مانگیں گے
اپنے ساقی لاؤ بالی سے　　رندواں بھی شراب مانگیں گے

تھانہ دار: تلخ تو ضرور ہوتی ہوگی۔ تم لوگوں کو اس مردار سے لُطف کیا حاصل ہوتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ توبہ۔ توبہ دائم الخمر تو نہیں ہو۔ یہ بتاؤ۔؟

سوار: تلخ تلخ نہ ہو تو چھوئیں نہیں۔ شراب تلخ نہ ہو تو شربت کیا برا ہے۔ اور دوسرا سوال کہ دائم الخمر ہیں یا نہیں اِس کا جواب ایک رباعی میں ہے۔

ساقی کو پڑا ہے تم سے اچھا پالا
میخانے میں جب گئے تو جیتا پالا
جب دیکھیے ہاتھ میں ہے مے کی بوتل
اے قدر یہ تم نے خوب طوطا پالا

آہ سرد با دل پر درد کھینچ کر سوار کسی قدر آبدیدہ یہ شعر زبان پر لایا۔

دو دو قدم وہ رقص میں چلنا کسی کا ہائے
دامن پکڑ کے پاؤں بڑھا کر اُٹھا کے ہاتھ

تھانہ دار اُن کے طرزِ شعر خوانی سے سمجھ گیا کہ دل چوٹ کھایا ہوا ہے۔ اتنے میں سوار نے کئی جام شراب لنڈھائے اور مست ہو گیا۔

دوستان وقت گل آن بہ کہ بعشرت کوشم
سخن پیر مغان ست بجان می نوشم

اتنے میں ثریا بیگم نے تھانہ دار کو آواز دی اور وہ اندر گئے۔ تو سخت متحیر ہو کر بولے۔ ایں! یہ کیا ماجرا ہے۔ روتی کیوں ہو خیر باشد ثریا بیگم اور بھی زار قطار رونے لگیں۔ تھانہ دار آنسو پوچھتے جاتے تھے مگر اشکِ جگر خوار چشم خدنگ افگن و مردم آزار سے برابر جاری تھے۔ تھانہ دار نے سمجھانا شروع کیا کہ انسان کو صبر کرنا لازم ہے رونے سے سوائے پریشانی کے اور کیا حاصل ہوتا ہے۔

مگر ثریا بیگم کے دل کو اس نصیحت سے تسکین نہ ہوئی۔ بلکہ بیقراری اور بھی بڑھتی گئی۔

وصالِ یار سے دونا ہوا عشق
مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

نوبت با ینجا رسید کہ آنکھیں لہو کی بوٹیاں بن گئیں۔ ہچکی بندھ گئی۔ تھانہ دار نے اصرار کیا کہ دو گھونٹ پانی پی لو تو ذرا تسلی ہو۔ ثریا بیگم نے بہزار خرابی ایک کٹورا پانی پیا۔ مُنہ دھویا۔ آنکھوں پر خوب چھینٹے دیے اور کہا اب ذرا آرام کیجیے۔ آپ بہت ہلکان ہو گئی ہیں۔ ثریا بیگم تھکی تو تھی ہیں۔ لیٹ رہیں۔ تھانہ دار منہ چھپانے کے لیے ڈھانٹا باندھ کر باہر جا کے سوار کے پاس بیٹھے۔ دیکھا تو وہ اب تک اُسی شغل میں تھے اِن کو دیکھا تو اشعار پڑھنے لگے۔

ما سر خوشیم بادہ ما در پیالہ کن	بد مست را بہ غمزۂ ساقی حوالہ کن
در جام ماہ بادۂ چوں آفتاب ریز	بر روی روز سنبل شب را کلالہ کن
اے پسر خانقا بخرابات شو ہمی	غسلے برآر و توبۂ ہفتاد سالہ کن

تھانہ دار: اب شام تک یہی شغل رہے گا شاید بڑے پینے والے ہو بھئی۔

سوار: دھاوت۔ بانی کار۔ دائم الخمر رند خراباتی۔ چھٹے ہوئے۔

صبح است ساقیا قدح پر شراب کن	دور فلک درنگ ندارد شتاب کن
خورشیدِ مے زمشرق ساغر طلوع کرد	گر برگِ عیش می طلبی ترک خواب کن
زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب	ما را ز جام بادۂ گلگوں خراب کن

اتنے میں دو آدمی ایک درخت کے سایہ میں آن کر بیٹھے۔ تھانہ دار نے کہا ان سے یہاں کا کچھ حال پوچھنا چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ یہ پہاڑی کیوں کر رہتے سہتے ہیں۔ اُن کو اشارے سے بلایا۔ بٹھایا پوچھا تمہارا نام؟ ایک نے کہا آنند۔ دوسرا بولا نندی۔

تھانہ دار: یہاں مسلمان زیادہ رہتے ہیں یا ہندو۔

ان میں سے ایک آدمی نے یوں بیان کیا۔

مکانات جانوروں کے گھونسلے کے مثل ہوتے ہیں۔ چاروں طرف سے بند ایک در چھوٹا سا جیسا کہ کبوتروں کے ڈربے کا دروازہ ہوتا ہے۔ ایسی کھڑکی لگا کر رہتے ہیں۔ اندر ہی کھاتے ہیں اور اندر ہی پکاتے ہیں۔ اندر ہی سوتے ہیں۔ شام سے دروازہ بند کر کے سو رہتے ہیں۔ بعض بعض گاؤں میں راجہ کی طرف سے چوپار بنی ہوتی ہے۔ عورتیں مثل مردوں کے کام کرتی ہیں۔ یہاں سلیٹ کے

پتھر کی کان ہے۔ جس کی تختی اکثر مدرسوں میں ہوتی ہے۔ تین آنے میں ساٹھ تختی کتری ہوئی پہاڑی بیچتے ہیں۔ جس کی فی تختی شاہجہاں آباد میں ایک روپیہ کو بکتی ہے۔ یہاں سے دو کوس آگے ایک گاؤں پتھوڑا* ہے اُس کے نیچے ایک بڑی ندی بہتی ہے۔ اُس کو اکلاہاڑ کہتے ہیں۔ پانی صاف موتی کا رنگ شیریں و ہاضم۔ مچھلی اُس میں بہت ہیں۔ یہاں کی عورتیں ایسی پری زاد ہوتی ہیں کہ حوریں اُن کے دامن پر نماز پڑھیں۔ اس گاؤں میں کوئی بید یا طبیب نہیں۔ یہاں کے باشندوں کو نٹ بلاچٹ کہتے ہیں۔

تھانہ دار حیران ہوا کہ نٹ تو بیشک ایک قوم ہے۔ جو ریسماں وغیرہ پر چڑھ کے تماشا کرتے ہیں۔ یہ بلاچٹ کیا معنی۔ مضطر و پریشان ہو کر اُس سے پوچھا کہ بلاچٹ تم لوگوں کو کیوں کہتے ہیں۔ اُس نے کہا غریب پرور حال یہ ہے کہ یہ ٹیلا جو سامنے نظر آتا ہے اُس کو ٹیلا مار مار کہتے ہیں۔ اور اُس کے مقابل پر یہ ٹیلا جو واقع ہے اُس کو فیتوڑا کہتے ہیں ان دونوں ٹیلوں میں قریب دو ہزار جریب کے فرق ہے۔ ہر سال ایک رسّی اس ٹیلے سے دوسرے تک باندھ کر ایک لنگوٹا موںج کا پہن کر اُس پر چڑھتا ہوں۔ تمام اطراف و نواح کے پہاڑی تماشے کے لیے آتے ہیں۔ جیسا کہ اس گاؤں سے اس ٹیلے پر سے پھسلتا ہوں، دوسرے ٹیلے پر پہنچتا ہوں اُس وقت راجہ مجھے چاندی کے کڑے دیتا ہے۔

پہاڑیوں کا عقیدہ ہندوؤں سے بالکل مخالف اور سب سے علاحدہ۔ مگر گنگا اور جمنا کی تعظیم کرتے ہیں۔ ناگ دیوتا کو جس کا مندر ناگ ٹیلے پر واقع ہے مانتے ہیں۔ اکثر قوم راجپوت سے ہیں۔ اور قومیں بھی یہاں موجود ہیں۔ تیلی کو کسی گاؤں میں گھسنے نہیں دیتے۔ حلال خور سے زیادہ تیلی کو بُرا جانتے ہیں۔ ڈوم کو برا جانتے ہیں مگر تیلی سے کم۔ اُن کے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور کپڑا کم میسر آتا ہے۔ اگر بہت کسی نے زیادتی کی گاڑھا دھوتر کہیں سے منگوا لیا۔ وہ امیر سمجھا جاتا ہے۔ جس کے پاس گاڑھا دھوتر ہو۔

سوار نے تھانہ دار سے کہا کہ آپ بڑی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ اندر کی بھی کچھ فکر ہے یا نہیں تھانہ دار کو پہاڑیوں کا حال نہایت دلچسپ معلوم ہوا اور بہت غور سے سنتے تھے۔ کہا اُن عروس مہ پارہ در خواب نازاست۔ سوار بولا بر دو ہمیں کہ اکنوں می چہ کنند۔

---

* پتھوڑا گڑھ اتر پردیش میں واقع پہاڑی ضلع ہے۔

تھانہ دار صاحب نے اندر جاکر دیکھا تو ثریا بیگم کو آرام میں پایا۔ سینۂ صافی پر ہاتھ رکھ کر سوتی تھیں یہ سُن چکے تھے کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سونے سے انسان خواب پریشان دیکھتا ہے۔ آہستہ سے ہاتھ ہٹایا باہر آکر یہ شعر پڑھا۔

یار آرام میں ہے وصل کی شب جاتی ہے
متحیّر ہوں کہ بیدار کروں یا نہ کروں

سوار : بڑی سونے والی ہیں بھئی۔ اب تک آرام ہی میں ہیں۔ اللہ اللہ جوانی کی نیند ہے۔ متوالے پن کے دن ہیں نہ جبھی۔

تھانہ دار : نہیں یہ وجہ نہیں ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب سے تصویر دیکھی از خود رفتہ ہوگئیں۔ کئی بار روئیں اور مثل ماہی بے آب تڑپنے لگیں۔ خدا جانے کس کی تصویر ہے۔ مگر واقعی کیسا جوانِ رعنا ہے۔ کلّے ٹھلّے کا جوان حسن ایک ایک رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ رگوں میں لہو کی جگہ نور ہی نور معلوم ہوتا ہے۔ اعضا متناسب و موزوں انسان کیا فرشتہ ہے۔ ہم جانتے ہیں آپ نے بھی ایسا جوان نہ دیکھا ہوگا۔

سوار : بے شک قد و قامت۔ رخسار ہاتھ پاؤں شانے بازو جس عضوِ بدن پر نظر ڈالو نور کا عالم ہے۔ سُبحان اللہ۔ تیغِ شعلہ زا ہاتھ میں لیے کس شان و دبدبے سے فرسِ صبا شتاب پر سوار ہے گویا شیر نر کچھار سے شکار کے لیے چلا آتا ہے۔ سینہ کس قدر چوڑا ہے۔ اور میں ان آنکھوں پر فدا ہوں چشم بدور۔

چشم بد دور زردی تو کہ ہست
حور در صورتِ انسان پیدا

دو ہی گھڑی میں ثریا بیگم کی کیفیت دگرگوں ہوگئی۔ تصویر کو بار بار چومتی تھی۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی، کبھی سر پر رکھتی کبھی مسکرا کر کہا۔ آزاد اس تیکھی چتون کے قریب شیر تک کا زہرہ آب آب ہو جائے۔ کبھی ہاتھ کا بوسہ لے کر کہا، ہائے ان پیارے پیارے ہاتھوں سے کبھی خط بھی نہ بھیجا۔ کبھی لعلِ لب دیکھ کر کہا۔

یک بوسہ ہر گرم لب سیمیں برے نداد
گویا نہالِ عاشقی ما برے نداد

کبھی تصویر کو چھاتی سے لگا کر بولی۔ آزاد۔ ایمان کی قسم کھا کے کہتی ہوں کہ اس وقت بس

یہی خواہش ہے کہ یا تم آؤ یا قضا آئے۔ بس اور کوئی خواہش نہیں۔ ہائے پہلے نہیں معلوم تھا کہ ہماری یہ کیفیت ہوگی۔

نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حالِ عشقبازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے

چہ دلاور ست وزدے کہ بکف چراغ دارد

اس روز ثریا بیگم کا مزاج روبہ اصلاح نہ لایا۔ کئی بار چکر آئے تیورا کے گر گر پڑتی تھی۔ دوم تبہ پھر غش پر غش آیا۔ شب کو ذرا آنکھ لگی۔ تڑکے کے وقت پیاس کی اس قدر شدت تھی کہ الامان۔ تھانہ دار نے لیموں کا افشردہ پلایا اس سے ذرا تسکین ہوئی۔ کوئی سات بجے کے وقت ان کا دوست زمیندار آیا۔ علاحدہ بلا کر کہا۔ حضرت آج ایک اجنبی آدمی یہاں آیا ہے۔ آپ کی نسبت درپردہ کئی سوال کیے۔ ادھر اُدھر کی بات کر کے آپ ہی کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔ میں لاکھ ٹالتا ہوں مگر وہ اس کے سوا اور کوئی ذکر ہی نہیں کرتا پہلے تو آدھ گھنٹے تک میں کچھ نہ سمجھا مگر یقین ہوگیا کہ آپ کی تلاش میں آیا ہے۔ تھانہ دار نے کہا اگر ہم ہوتے تو پہلے ہی بات سے تاڑ جاتے۔ بھلا وردی پہنے ہے یا نہیں زمیندار نے کہا جی نہیں اُردی وردی کچھ بھی نہیں ہے۔ عمامہ البتہ باندھے ہے۔ وضع سے پنجابی معلوم ہوتا ہے۔

تھانہ دار: آپ کے مکان میں ٹکا ہے یا کہیں سرا میں اور وہ مقام جہاں وہ فروکش ہے یہاں سے کس قدر فاصلے پر ہے یہ بتائیے؟

زمیندار: سرا یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے، وہ خود ہے۔ ایک سائیس ہے۔ اور ایک سفید پوش اور ہے۔ تین آدمی ہیں۔ ایک گھوڑا کمیت پورا۔

تھانہ دار: ہم سمجھ گئے وہ ڈکیتوں کے پولیس کا انسپکٹر ہے۔ سفید پوش آدمی برق انداز ہوگا، اور سائیس تو سائیس ہے ہی۔

زمیندار: مجھ سے بڑی احتیاط سے ملے۔ ہاتھ ملایا۔ اشعار پڑھے۔ عربی خوان آدمی ہے۔ اور شعر بہت اچھے یاد ہیں۔

تھانہ دار: کسی بہانے سے ہم کو اپنے مکان پر لے چلو اور ایسے مقام پر جگہ دو جہاں سے ہم سن سکیں کہ کیا گفتگو کرتا ہے۔

زمیندار : چلیے مگر آپ کا چلنا اچھا نہیں۔ شاید حلیہ ملاتے تو پھر بڑی مصیبت پڑے۔ جانے بھی دو۔ اگر کوئی اندیشے کی بات ہوگی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ فوراً جنگل کا راستہ لیں۔

تھانہ دار : بندہ نواز میں نے پولیس میں نوکری کی ہے۔ چلنے کا ڈر آپ کو ہوگا۔ میں ابھی ڈاڑھی کو حجام کے نذر کرتا ہوں اور موچھیں کترواتا ہوں۔ چلیے چھٹی ہوتی۔ وضع بالکل بدل دوں گا کپڑوں کی گٹھری میرے ساتھ ہی ہے۔

زمیندار : اچھا تو میں جا کے ایک ڈولی آپ کے پاس بھیجوں۔ آپ ڈولی پر سوار ہوں۔ اور زنانے مکان کی ڈیوڑھی پر ڈولی اُترے۔ وہاں پردہ کرا کے آپ کو باہر کے کمرے میں لائیں۔ وہاں سے آپ گفتگو سنیے۔ مگر سب باتیں خوبصورتی کے ساتھ ہوں۔

تھانہ دار : اجی ہم یوں ہی آتے ہیں پہلے آپ اُن کا حلیہ تو بتائیے۔

زمیندار : کشیدہ قامت، دُھرا بدن، سینہ چوڑا، بازو بھرے ہوئے، خوشرو، وجیہ آدمی ہیں۔ اور خندہ پیشانی۔ گفتگو سے بھی پنجابی پن برستا ہے۔ وضع قطع چال ڈھال سے بھی۔

تھانہ دار : اور وہ جو آدمی ساتھ ہے اُس کی کیا قطع ہے۔؟

زمیندار : وہ تو سکھ ہے۔ اُردو یوں ہی سی بول سکتا ہے۔

تھانہ دار : آپ چلیں۔ بندہ حاضر ہوتا ہے۔ بیشک ڈکیتوں کے پولیس کا انسپکٹر ہے۔ ہماری تلاش میں آیا ہے۔ کچھ پروا نہیں۔ آپ جائیں۔

زمیندار روانہ ہوا تو ثریا بیگم نے دریافت کیا کہ آہستہ آہستہ کیا بات چیت کر رہے تھے۔ تھانہ دار نے کہا ایک انسپکٹر ہماری تلاش میں آیا ہے۔ ہمارا قصد ہے کہ اُس کو دھوکا دیں تو اب ہم ڈاڑھی منڈواتے ہیں۔ اور جا کے جھانسا دیتے ہیں۔ ثریا بیگم اس جہالت پر ہنس پڑی۔ مسکراتے ہوئے کہا کہ تم بالکل اُجڈ ہو گئے۔ اس تھانہ داری نے تم کو کہیں کا نہ رکھا۔ کوئی ایسا اُجڈ پن کرتا ہے۔ جھانسا دینے سے کیا ملے گا۔ اور جو گرفتار ہو گئے تو پھر کیسی ٹھہرے گی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ بے موت کوئی نہ مرے گا مگر کوئی خود جان بوجھ کے مرنے کی کوشش تو نہیں کرتا۔

رزق ہر چند بے گمان برسد
شرط عقل است جستن اژدر ہا
گرچہ کس بے اجل نخواہد مُرد
تو مُرو در دہان اژدر ہا

اور فرض کرو کہ اُس سے تم سے کبھی کی جان پہچان ملاقات ہو وہ پہچان لے تو پھر تم کیا کرو گے۔ تم بھی جہنم میں جاؤ اور میری بھی مٹی خراب کرو، تم یہ بتاؤ کہ وہاں جانے سے تم کو ملے گا کیا۔
تھانہ دار نے اجڈپن کے ساتھ جواب دیا جا ملے گا کیا۔ یہ کتنی بڑی بات ہوگی کہ ہم اس مردک کو جھانسا دے آئیں گے۔ موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنے گھر آئیں گے۔ کہ مار لیا انسپکٹری کرنے چلے تھے۔ ہم سے سیانا سو دیوانہ عقل کے پتلے ہیں ہم۔ جب مشہور ہوگا کہ اشتہاری مجرم خود جا کے انسپکٹر سے ملا تو بڑے قہقہے پڑیں گے۔ ثریا بیگم نے مسکرا کر کہا اور جب یہ مشہور ہوگا کہ اشتہاری مجرم خود کنویں میں کود پڑا تب اور بھی دل لگی ہوگی۔

اِن تھانہ دار صاحب میں۔ بڑا وصف تھا کہ کسی کی مانتے نہ تھے جو بات دماغ میں سمائی وہ سمائی۔ ممکن کیا کہ پھر وہ نکل سکے دل میں ٹھن گئی کہ انسپکٹر سے ملیں۔ ثریا بیگم لاکھ اصرار کریں، مگر وہ بے ملے نہ رہیں گے۔ فوراً نائی کو بلایا۔ ڈاڑھی منڈوائی۔ خط گھٹوایا، کپڑے بدلے، سیاہ کنارے کی دھوتی پہنی۔ کرتہ اور انگرکھا پہنا۔ کالی مندیل سر پر رکھی۔ اور چلے بیم ٹر۔ آدھے ہندو آدھے مسلمان بنے ہوتے جاتے ہی زمیندار سے علیک سلیک کی۔

زمیندار : (استادہ ہو کر) آداب عرض۔ آئیے مزاج شریف۔

تھانہ دار : شکر ہے۔ آپ کا مزاج۔ محمد رونق علی صاحب آپ ہی کا نام ہے۔ یہاں کے تعلقہ دار آپ ہی ہیں۔

زمیندار : حضور خاکسار تو کسان ہے۔ پیٹ بھر کے کھانا اراضی کی بدولت مل جاتا ہے۔ تعلقہ داری کیسی مگر رونق علی میرا ہی نام ہے۔ آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔ اسم مبارک جناب کا۔

تھانہ دار : ہمارا نام شیخ بدھوا اور مکان بنگال میں ہے۔ بیر بھوم کے پاس۔ ہم بنگالی مسلمان ہیں۔ آپ لوگ دیس کے نہیں۔

زمیندار : وہ تو ہم پہلے ہی پہچان گئے تھے۔ وضع ہی سے۔ تھانہ دار نے دیکھا کہ زمیندار کے

پاس بنملہ اور آدمیوں کے ایک سفید پوش پنجابی بھی بیٹھا ہے۔ سمجھ گئے کہ یہی حضرت ہمارے ملک الموت ہیں۔ اُن کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا آپ کا اِسم شریف کہا شیر سنگھ۔

تھانہ دار: آپ کا دولت خانہ تو پنجاب میں ہوگا۔

شیر سنگھ: جی ہاں۔ ہم خاص عنبر سر (امرتسر) میں رہتے ہیں۔

تھانہ دار: سکھ ہیں آپ یا کسی اور مذہب کے پابند ہیں۔

شیر سنگھ: ہم کھتری ہیں۔ آپ بنگال سے کب آتے۔

تھانہ دار: کوئی پچیس برس ہوتے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ لکھنؤ میں بہت رہا۔

شیر سنگھ: کس محلّے میں۔ آپ تو ڈاکٹر خانے میں رہتے ہوں گے۔

تھانہ دار: کل لکھنؤ سے واقف ہوں۔ کوئی محلّہ ایسا نہیں جہاں میں نہ پہنچا ہوں۔ اب [illegible] لکھنؤ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

شیر سنگھ: ہاں میں وہاں پو۔

راوی: (پو) کہہ کر شیر سنگھ خاموش ہو گئے۔ تھانہ دار تو پہلے ہی سے سمجھ گیا تھا کہ پولیس افسر ہیں (پو) کے لفظ پر ہنسی آئی مگر ضبط کی شیر سنگھ پولیس کہنے ہی کو تھے مگر (پو) کہہ کر خیال آیا فوراً سکوت کیا۔

تھانہ دار: آپ کہیں نوکر ہیں یا ریاست ہے آپ کی۔

شیر سنگھ: ہم زمیندار ہیں۔ عنبر سر کے پاس ہمارا اٹھائی ہزار روپیہ سالانہ کا علاقہ ہے۔ اُس کو ہمارا بھائی دیکھتا بھالتا ہے۔ ہم سیاحی کرتے ہیں۔

تھانہ دار: اٹھائی ہزار کیا اٹھائیس ہزار سے مراد ہے۔

شیر سنگھ: ہاں ہم لوگ ستائی اٹھائی بولتے ہیں۔

تھانہ دار اُن کے لب و لہجہ سے سمجھ گیا کہ پنجابی نہیں۔ بنے ہوتے ہیں۔ ستائی اُٹھائی کہہ کر پنجابی بننے کا دم بھرتے ہیں۔ شیر سنگھ نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کچھ شعر شاعری کا بھی شوق ہے۔ کہا عمر بھر گیا کیا کیے۔

شیر سنگھ: اچھا زلف کی توصیف میں تو کوئی شعر پڑھیے۔

تھانہ دار: شاہ طہماسب کا شعر سُنیے کیا کہا ہے۔

زلف سر بردہ بگوش تو سخن می گوید

مو بمو حال پریشانی من می گوید

شمشیر سنگھ: مشہور تو یوں ہے کہ شیخ سعدی شیرازی کسی شہزادے پر عاشق تھے۔ اُس کی سائیسی انھوں نے قبول کی۔ ایک روز وہ کہیں جنگل کی طرف سوار جاتا تھا۔ سعدی ہمراہ رکاب تھے۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ بال اُڑنے لگے۔ تو شہزادے نے یہ مصرع موزوں کیا۔ ع

زلف من خم شدہ در گوش سخن می گوید

شیخ مبارک نہاد نے برجستہ فرمایا۔ ع

مو بمو حالِ پریشانی من می گوید

تھانہ دار: بھلا آپ کو یقین ہے کہ شیخ سعدی نے سائیسی کی یہ سب بٹی ہوئی ہے۔ اوّل تو وہ مشہور آدمی سارا زمانہ اُن سے واقف تھا۔

شمشیر سنگھ: بھلا اس شعر کو آپ کیسا سمجھتے ہیں۔

نہ زلف است آنکہ ہر دم بر قدِ دلدار می پیچد
ز مستی ہر نفس بر شاخ صندل مار می پیچد

تھانہ دار: سُبحان اللہ۔ ع

ز مستی ہر نفس بر شاخ صندل مار می پیچد
زلف امروز در جورِ کمانکشودہ است
مار از روزِ ازل دشمنِ آدم بودہ است

یہ شعر کیسا ہے آپ کے نزدیک۔؟

شمشیر سنگھ: خوب کہا ہے۔ بہت خوب کہا ہے۔ واقعی سانپ روز ازل سے آدم کا دشمن ہے جنّت کہ نکلوا دیا۔ اردو کے اشعار سنائیے۔ خاص اہلِ لکھنؤ کے آپ تو وہاں برسوں رہے ہیں۔ ہاں جناب کچھ ارشاد فرمائیے کان مشتاق ہیں۔

تھانہ دار: بہت خوب زبان اور لکھنؤ۔ اُردو سیکھنے کا شوق ہو تو لکھنؤ والوں سے سیکھے۔ اُن کا طرزِ غزل خوانی بس جادو ہے جادو اور مرثیے کا لکھنؤ بادشاہ ہے۔ مرثیہ تصنیف کرنے اور پڑھنے دونوں میں لکھنؤ والے معجزہ دکھاتے ہیں۔

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا — معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمر کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا اُس کو گوارا
واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اُس دم ہوس ملک عدم ہو

کس کا اسد اللہ سا ہوا والدِ مرحوم حلالِ مہم مالک کل طاہر و معصوم
صدرِ دوسرا ہمدل و سرورِ مہموم آسودہ ہو ہر سالک گمراہ وہ محروم
معصوم کا سردار ہو سالار اُمم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کو الم ہو

آپ ملاحظہ فرمائیے کہ بے نقط اور یہ لطف یہ خدا داد بات ہے۔

گہہ شرق میں خورشید کے مانند عیاں تھی
گہہ غرب میں شکل مہ نو جلوہ کناں تھی
گہہ چرخ پہ روشن صفت کاہکشاں تھی

فرمائیے یہ کس کی تعریف کی ہے۔؟
شیر سنگھ : جی. تلوار کی تعریف ہے۔
تھانہ دار : (زمیندار سے) آپ فرمائیے یہ تین مصرعے کس کی توصیف میں کہے ہیں۔؟
زمیندار : صاف ظاہر ہے شمشیر کی تعریف کی ہے۔
تھانہ دار : ہائے ہائے اس گریز کو تو ملاحظہ فرمائیے۔

گہہ شرق میں خورشید کے مانند عیاں تھی
گہہ غرب میں شکل مہِ نو جلوہ کناں تھی
گہہ چرخ پہ روشن صفتِ کاہکشاں تھی
یہ تیغ کے پرتو تھے فقط خود وہ کہاں تھی

زمیندار اور شیر سنگھ دونوں پھڑک گئے. کہا واہ واہ وا اور واقعی یہ اہل لکھنو ہی کا حصّہ ہے.

کیا گریز ہے. سب کچھ کہہ گئے اور پھر. ع

یہ تیغ کے پرتو تھے فقط خود وہ کہاں تھی

سبحان اللہ سبحان اللہ۔

تھانہ دار : اجی جناب واللہ میں وجد کرتا ہوں. خدا کی قسم اِن دونوں کے کلام میں جادو تھا اور سحر حلال۔

تھانہ دار ایک دفعہ طیش کھا کے بولے کہ ابھی اگر اشعار اور میں پڑھنے شروع کروں تو دو دن تک صرف ایک ہی مذاق کے شعر پڑھتا جاؤں۔

کھولا جو پھریرے کو علمدارِ جری نے
لوٹے گُلِ فردوس نسیم سحری نے
تاروں کو اُتارا فلک نیلو فری نے
پرچم جو کھلا کھول دیے بال پری نے
عیسیٰ نے پکارا کہ نثار اس کے حشم کے
خورشید نے مُنہ رکھ دیا پنجے پہ علم کے

شیر سنگھ نے رُباعی پڑھنے کی فرمائش کی۔ تھانہ دار نے پڑھ دی۔

ہر برگ سے قدرتِ احد پیدا ہے
ہر پھول سے صنعتِ صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیطِ زخسار
ہر ایک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

انسان ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں ہے
سچ ہے کوئی آسودہ و خوشحال نہیں ہے
اندیشۂ آشیاں و خوفِ صیاد
مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں ہے

تھانہ دار نے شیر سنگھ کو چلتے یار بنایا۔ لکھنؤ کا کلام سُنایا۔ شیر سنگھ نے کہا خوب واللہ آپ خوب ملے۔ ع

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

جب تخلیے کی صحبت ہوئی تو تھانہ دار نے اس نرمی اور اخلاق سے گفتگو کی کہ شیر سنگھ ان کو اپنا بڑا سچّا دوست سمجھے۔ اور کان میں کہا کہ ایک بات آپ سے بیان کریں بشرطیکہ آپ کسی سے ذکر نہ کریں۔

تھانہ دار: استغفراللہ یہ پاجیوں کا کام ہے کہ دوست کی بات کسی سے بیان کردیں۔ کیا مجال جان جاتی رہے مگر بات زبان سے نہ نکلے کیا طاقت۔

راوی: کیا مجال۔ اور اس کی تو ہم بھی گواہی دیں گے کہ سوائے ثریا بیگم کے اور کسی سے ذکر نہ کریں گے۔ تھانہ دار پہلے ہی سمجھ گئے کہ انھیں کا ذکر خیر ہو گا۔

شیر سنگھ: آپ جانتے ہیں کہ میں یہاں کس کام کے لیے آیا ہوں۔

تھانہ دار : (دل میں) خدا تم کو غارت کرے (شیر سنگھ سے) شاید شکار کھیلنے آتے ہوں گے۔ یہاں تو شکار ہی شکار ہے۔ بس اور ہے کیا۔

شیر سنگھ : ہم ایک مجرم کی تلاش کو نکلے ہیں۔ ایک تھانہ دار بھاگ آیا ہے، اور اپنے ساتھ ایک بیڑن کو بھگا لایا ہے۔ اُسی کی تلاش اور گرفتاری کے لیے ہم آتے ہیں۔

تھانہ دار دل میں بہت ہنسا۔ کہا پھر آپ اُس کو ڈھونڈھیے ہم سے مدد لیجیے۔ جو کچھ میرے امکان میں ہے، اُس سے دریغ نہ کروں گا۔ اب آپ یہ فرمایئے کہ یہاں کب تک قیام ہے۔ کہا ہفتے دو ہفتے تک دورہ روز کریں گے مگر رہیں گے یہاں ہی۔ صدر مقام یہی رہے گا۔ آپ بھی اِدھر اُدھر کوشش کیجیے اور ہم بھی کوشش کریں۔

تھانہ دار : بہت خوب میں بڑی کوشش کروں گا۔ خاطر جمع رکھیے۔

شیر سنگھ : آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں اور ٹکے آپ کہاں ہیں۔

تھانہ دار : جی میں تھوڑی دور فروکش ہوں۔

شیر سنگھ : اچھا ہم آیا کریں گے مگر بالکل تخلیے کی صحبت رہے۔

تھانہ دار : اگر مضائقہ نہ ہو تو ہمارے ساتھ غریب خانے تک چلیے۔

شیر سنگھ : بسم اللہ چلیے (زمیندار سے) میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

تھانہ دار : آپ کی شان کے قابل فرش ہے۔ نہ مکان ہے مگر۔

شیر سنگھ : اجی حضرت آپ تو ستم ڈھاتے ہیں۔

الغرض تھانہ دار اِن کو لے کر قیام گاہ پر آیا۔ ثریا بیگم دوڑ کے چھپنے کو تھیں مگر تھانہ دار نے منع کیا اور کہا کہ یہ ہمارے بھائی ہیں۔ اِن سے پردہ کرنا فضول ہے۔ ثریا بیگم دوپٹا سنبھال کر بیٹھیں۔ شیر سنگھ دنگ تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے:

شیر سنگھ : اِن نیک بخت کا نام تو بتایئے۔

تھانہ دار : شمس النسا۔ ان کی بہن چھوٹی مہر النسا۔

شیر سنگھ : آپ سے کیا تعلق ہے۔

تھانہ دار : جی میرے گھر پڑ گئی ہیں۔

ثریا بیگم : اے ہٹو بھی۔ کیا واہیات باتیں کرتے ہو۔ حضرت یہ میرے بھائی ہیں۔ اس پر شیر سنگھ اور ثریا بیگم دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اور تھانہ دار جھینپے۔ شیر سنگھ نے کہا۔ حضرت یہ تو بڑی

سخت کہی۔ تھانہ دار بولے آپ نے سنا نہیں۔

کس نیا موخت ــــ علم تیر از من
کہ مرا عاقبت ــــ نشانہ نکرد

ہمیں فقرے سکھائیں اور ہمیں پر فقرے چست ہوں۔

بت بھی لینے لگے خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

اچھا اب ہم سے کل حال بیان فرمائیے۔ وہ تھانہ دار کون ہے۔؟

شبیر سنگھ : ایک مسلمان تھانہ دار کسی بیڑن کو حوالات سے لے کے بھاگے۔ بڑی تحقیقات ہو رہی ہے۔ مگر پتا ملے تو کیونکر ملے۔ جب انسپکٹر پولیس خود بھگا لے جائے تو برق انداز کیا کریں۔ اُن کا کیا قصور ہے۔

یہ تقریر سن کر ثریا بیگم کانپنے لگی۔ رنگ فق ہو گیا۔ اور جب شبیر سنگھ نے کہا کہ (آپ بھی اُن کی تلاش کریں) تو اور بھی لرزنے لگی۔

ثریا بیگم کو تھانہ دار کی جرأت اور استقلال دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ انسپکٹر کو اپنے ساتھ لائے۔ گویا کوئی جرم سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ اور انسپکٹر کی سادگی پر ہنسی آتی تھی کہ کس لطف کے ساتھ تھانہ دار سے مدد مانگتے تھے۔ اقرار کیا کہ کل تک ہم اس شخص کو ڈھونڈھ نکالیں گے اور مع بیڑن کے لائیں گے اِس فقرے پر ثریا بیگم کو بڑی ہنسی آئی۔ پوچھا یہ بیڑن کون ہے۔ انسپکٹر نے کہا وہ بستی کے باہر جنگل میں رہتی تھی ڈاکو اُس کے ہاں بیٹھے ڈاکے کا مال تقسیم کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے سپاہی اُن کے کلّے پر پہنچ گئے اور گھیر لیا۔ بیڑن بھی گرفتار ہو کر آئی۔ سُنا بیڑن بڑی حسینہ ہے۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایسی خوبصورت عورت کبھی پیشتر نظر سے نہیں گذری۔ نہایت خوشرو اور زیبا اندام جس نے دیکھا ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ تھانہ دار بھی فریفتہ ہو گئے۔ اور ٹاپ لے گئے۔

تھانہ دار نے انسپکٹر سے بیان کیا کہ پرسوں شب کو ہم اور یہ عروس گلفام ایک آدمی کو ہمراہ لے کر راہ چلے آتے تھے۔ رات تیرہ و تار تھی کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ ایک مقام پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گاڑی پر کوئی فوجی آدمی سوار ہے اور کسی عورت سے باتیں کرتا جاتا ہے۔ عورت کا نام ثریا بیگم تھا اور مرد کا نام ہمیں یاد نہیں پکّے کنوئیں کے پاس مرد گاڑی سے اُترا تو میں نے

پہچانا کہ تھانہ دار صاحب ہیں۔ ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ مجھ پر جو نظر پڑی تو للکار کر پوچھا۔ کون میں خاموش رہا۔ پھر ڈپٹ کر بولے۔ کون کھڑا ہے؟ میں نے کہا تھانہ دار صاحب بندگی ہے۔ اس وقت کہاں چلے۔ قریب آن کر بولے ہم تھانہ دار نہیں ہیں۔ ہم تو زمیندار ہیں۔ بھنگا میں ہمارا مکان ہے۔ جو مجھے یہ معلوم ہو کہ یہ ایک عورت کو بھگائے لیے جاتے ہیں، تو کچھ لے مروں۔ بیڑن کو میں نے دیکھا۔ عورت خوبصورت ہے۔ آنکھ ایسی پائی ہے کہ شاید لاکھ دو لاکھ میں انتخاب ہے۔ زلف خدا کی قسم کمر سے کہیں نیچی ہے۔ میں ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ ململ کا پیازی رنگا ہوا دوپٹا اور گل بدن کا پاجامہ پہنے تھی۔ زیور بھی تھا۔ ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں کانوں میں بالی پتے۔ سر پر چھپکا۔ ناک میں سونے کی کیل پور پور چھلّے۔

ثریّا بیگم جو لباس اور زیور پہنے تھیں۔ وہی سب بتا دیا۔ بیچاری تھراتی تھی کہ ایسا نہ ہو انسپکٹر سمجھ جائے۔ کہ یہی ہے۔ مگر تھانہ دار مسکرا مسکرا کر کُل حال بیان کرنے لگا۔ انسپکٹر نے بڑے غور سے یہ روایت سُنی اور بیڑن کے حُسنِ گلوسوز کی توصیف سُن کر کہا کہ اگر مل جائے تو بیڑن کے ساتھ ہم شادی کرلیں۔

تھانہ دار بولا واہ۔ کیا دل لگی ہے۔ جس شخص نے اُس کے پیچھے عہدہ گنوایا عزّت دی۔ آبرو ریزی کی جان پر کھیل گیا۔ تمام عُمر کے لیے روپوشی اختیار کی۔ اعزا اقربا کو چھوڑا۔ وطن سے مُنہ موڑا۔ وہ آپ کو اتنی آزادی دے گا کہ آپ اُس عورت کو عقد نکاح میں لائیں۔ ہاں۔ اگر ہم کو اُس وقت یہ معلوم ہوتا کہ بیڑن ہے اور تھانہ دار اُس کو حوالات سے بھگائے لاتا ہے۔ تو ہم چھین لیتے شیر سنگھ نے ہنس کر جواب دیا۔ واہ آپ کے مزاج میں قناعت نہیں ہے۔ یہ کیا بُری ہیں۔ خدا کے فضل سے کروڑوں میں لاجواب ہیں از سر تا پا ہر عضو بدن سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ ہاتھ پیارے پیارے، کلائیاں نازک نازک گردن فوارۂ نور رخسارے گورے گورے، آنکھیں بچشم بد دور نشیلی، رسیلی۔ قد بوٹا سا۔ نازک بدن، غنچہ دہن، لب سُرخ اور پتلے۔ ابرو شمشیر بُران۔ زلف چلیپا تا بہ کمر عورت کیا پرستان کی پری ہے۔ بلکہ پری سے بھی زیادہ پھبن اور شانِ دلبری ہے۔

زبس داغ اند گلہائے چمن از آب و رنگِ اُو
گلستانِ لالہ زارے گشتہ از حسن فرنگ اُو

ایسی عروسِ حور نژاد پا کر بھی اگر بیڑن کے بیاہنے کی ہوس ہے۔ تو خدا حافظ و ناصر ہے۔ لاحول ولا قوۃ جیسی روح ویسے فرشتے تھانہ دار نے کہا حضور والا یہ لاکھ حسین ہوں، مگر اُس کے تلوے اور اِن کا منہ برابر ہے اس پر ثریّا بیگم بہت چیں بچیں اور تیکھی ہو کر بولیں۔ اے واہ۔ صدقے کردوں اپنے اُوپر سے اُس موئی بیڑن کو۔ ایڑی چوٹی پر قربان کروں۔ کجا بھلے مانس کی بہو بیٹی۔ گھر گرہست کجا نگوڑی بیڑن ہرجائی۔ اچھا

مقابلہ کیا۔ ہونہہ چہ خوش۔ تھانہ دار نے کہا بیگم صاحب چٹخنے کی بات اور ہے۔ اور سچی بات اور۔ اچھا انسپکٹر صاحب سے پوچھو کہ تم حسینوں میں ہو۔ ہاں دس پانچ میں اچھی ہوتیں تو کیا۔ انسپکٹر نے ان کے کلام کی تردید کی۔ واہ دس پانچ میں نہیں لاکھ دو لاکھ میں اچھی ہیں۔ آپ قدردان نہیں ہیں۔ میں تو ان پر شیدا ہو گیا۔ اچھا ایک کام کیجیے آپ بیڑن کو ڈھونڈھیے اور اُن کو ہمارے حوالے کیجیے۔ تو جو کبھی پری پر بھی نظر ڈالیں۔

حور پہ آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

ثریّا بیگم تنک کر بولیں۔ یہ منہ کھائے چولائی۔ اونہہ اونہہ۔ آپ ہم پر فریفیہ ہو گئے منہ بنواؤ۔ میاں ہم پر فریفتہ ہونے چلے ہیں۔ اے تیری قدرت۔ کسی بیڑن وِیڑن سے سابقہ رہا ہے۔ بس ذری چپ چاپ بیٹھے رہیے گا۔ انسپکٹر نے اپنے دونوں کان پکڑے۔ مسکرا کر کہا قصور ہوا اب کوئی اور ذکر چھیڑیے۔ ہاں ڈاکٹر صاحب کوئی رباعی سنائیے۔ تھانہ دار نے یہ رباعی پڑھی۔

دنیا طلبا چہ گوئیمت رنجوری
عقبےٰ طلبا چہ گوئیمت مزدوری
مولا طلبا کہ داغِ مولاداری
در ہر دو جہاں مظفر و منصوری

انسپکٹر نے اس کی تعریف کر کے فرمایش کی کہ کوئی اور رُباعی فرمائیے۔

ناکام بھی کامیاب ہو جاتا ہے
بیقدر فلک جناب ہو جاتا ہے
گر اک نظر مہر سے دیکھیں حیدر
ذرہ ابھی آفتاب ہو جاتا ہے

انسپکٹر: اب تو حضور نے قصور معاف کیا۔ واسطے خدا کے معاف کیجیے۔

ثریّا بیگم: پھوہڑ پنا ہمیں نہیں اچھا معلوم ہوتا۔ بیہودہ کہیں کے۔

انسپکٹر: یا خدا بچانا۔ عجب قہر کی نظر سے دیکھا ہے۔ اُف فوہ۔

ثریّا بیگم: عمداً اور قصداً چھیڑتی تھی کہ انسپکٹر سے بے تکلفی ہو جاتے اگر کھل بھی جائے کہ بیڑن انھیں سے مراد ہے، اور تھانہ دار بھی ہیں تو شاید مروت کریں۔

انسپکٹر : تو آپ وعدہ کرتے ہیں کہ ایک ہفتے میں مل جائیں گے۔
ثریا بیگم : گھر کی ٹٹی اور باسی ساگ۔ ایک ہفتے میں مل جائیں گے۔
تھانہ دار : اجی کل۔ قسم قرآن کی کل تک مع بیٹرن کے ملے جی۔
ثریا بیگم : واہ ایسے ہی ہوتے تو گھر بھر گیا ہوتا۔ چلئے وہاں سے۔
انسپکٹر : تم دونوں میں خوب نوک جھوک ہوتی ہے۔
ثریا بیگم : یہ زبان کے بہت پھوہڑ ہیں اور اُجڈ۔ بالکل اُجڈ پڑھے لکھے۔ آدمی کو ایسا اُجڈ نہ پاؤ گے۔ بالکل گنوار کا لٹھ ہے۔
انسپکٹر : اب تم ان کو چھوڑ دو۔ اور ہمارے ساتھ نکاح ہو جائے۔
ثریا بیگم : اے لعنت خدا ہم کو ہندوؤں کی صورت سے نفرت ہے۔
انسپکٹر : ہم تو پنجاب کے ہندو ہیں۔ سپاہی آدمی تلوار کے دھنی لڑنے بھڑنے والے ہم کو اس ملک سے کیا واسطہ۔ اچھے آئے۔ واہ۔
ثریا بیگم : بس چلو بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔
تھانہ دار : اور کیوں حضرت یہ ہمارے سامنے آپ ان کو پھسلاتے ہیں۔
انسپکٹر : پھر پیٹھ پیچھے تو نہیں پھسلاتے۔ اب بولو آگے کہو۔ ہونہہ۔
تھانہ دار : یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک شخص سے کسی نے کہا کہ میاں تم کو تمہارا دوست کل سیکڑوں گالیاں دیتا تھا دوسرے روز انھوں نے اپنے دوست سے کہا کہ بعض نالائق گدھے پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے جاتے ہیں۔ برجستہ جواب دیا کہ اُن بدمعاشوں سے تو اچھے ہیں جو منہ پر گالیاں دیتے ہیں بس حضرت آپ بھی ویسے ہی آدمی ہیں جو مُنہ پر گالیاں دیتے ہیں۔ مگر ہم اب بھی خاموش ہیں۔
ثریا بیگم : اے ہے کیا بیچارے ننھے ہیں۔ کچھ جانتے ہی نہیں۔
تھانہ دار : خدا خیر کرے میں دیکھتا ہوں کہ ان کا تم پر دل آیا ہے اور تم ان پر بے طور ریجھی ہو۔ لے حضرت بس اب آپ یہاں سے جائیے۔
انسپکٹر : کیوں ذلیل کرتی ہو بی صاحب۔ شمس النسا بیگم اسم شریف ہے نہ۔ اُس دن تو باہم دل لگی اور چہل کی باتیں رہیں۔ شب کو انسپکٹر شیر سنگھ رخصت ہوئے۔ کہا کل صبح سے ہم یہاں ہی ڈٹیں گے۔ دوسرے روز تڑکے انسپکٹر صاحب نازل ہوئے۔ تھانہ دار نے کہا۔ حضرت سنیئے آپ ہندو ہم مسلمان۔ آپ کی گنگا اور ہمارا قرآن۔ آپ گنگا کی قسم ہم قرآن کی قسم کھائیں ہم اور آپ تادم

مرگ دوست رہیں۔ اور ہر حالت میں دوستی کا دم بھریں۔ یہ نہ ہو کہ پیچھے نکل جاؤ۔ قسم کھاؤ اور شرعی قسم کھاؤ تو کیا مضائقہ۔ انسپکٹر نے کہا ہم اپنے ایمان کی قسم کھاتے ہیں کہ تا دمِ مرگ تمہاری دوستی کا دم بھریں گے

تھانہ دار : چند شرطیں ہیں۔ اُن کو سن لیجیے اور قبول کر لیجیے۔

1. راز مخفی رہے اگر ہم کسی کو قتل بھی کریں تو آپ نہ کہیے۔ چاہے نوکری جائے، چاہے آبرو جائے چاہے جان جائے۔

2. ہماری عورت پر آپ اور آپ کی عورت پر ہم نظر بد نہ ڈالیں۔

3. کسی بات کا آپس میں پردہ نہ باقی رہے۔ ہم اپنا حال آپ سے کہیں آپ اپنا ہم سے بیان کر دیں چاہے کیسا ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو۔

4. کائیاں پن اور شرارت کی باتیں نہ ہوں بلکہ بالکل صاف رہیں۔ ایک جان دو قالب۔ اس میں ذرا فرق نہ ہو۔ اس قدر صاف دل ہو جائیں۔ کہ یہ شعر ٹھیک صادق آئے۔

با صاف دل مجادلہ با خویش دشمنی است
ہر کو کشد بر آئینہ خنجر بخود کشد

انسپکٹر نے سب شرطیں منظور کر لیں۔ دوسری شرط سُن کر قسم کھائی کہ شمس النسا کی نسبت جو کچھ کہا تھا وہ صرف ازراہِ مذاق تھا۔ اس میں ذرا بھی نفسانیت یا حسد کو دخل نہ تھا۔

تھانہ دار : ہاتھ پر ہاتھ ماریے اور ٹوپی بدلیے اور منہ بولے بھائی بنو۔ بس اب ہم بھائی۔ اور یہ بھاوج ہے کہ نہیں۔؟

انسپکٹر : بے شک۔ بھائی صاحب نظر عنایت رہے غریبوں پر۔

ثریا بیگم : اے تھوڑی دیر میں ہم آپ کو جھک کے سلام کریں گے۔ جی ہاں۔

انسپکٹر : کیوں تھوڑی دیر میں کیا ہو گا صاحب بتائیے۔

ثریا بیگم : (زور سے ہنس کر) گھڑی دو میں مورلیا باجے گی۔

تھانہ دار : (جھڑک کر) لاحول ولاقوۃ۔

زنِ نیک خوش سیرت و پارسا
کند مردِ درویش را بادشا

اور اگر اِس کے برعکس بات ہو تو قیامت کا سامنا ہے۔ تم سے کس نے کہا کہ بیچ

میں بول اُٹھو۔

تکیہ بر جائے بزرگان نتوان زد بگذاف
مگر اسبابِ بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ثریّا بیگم : (مُسکراکر) اے لو اور سُنو۔ تو آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ آئیے قبلہ وکعبہ مزاج شریف ابّا جان۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ثریّا بیگم نازو ادا کے ساتھ دوسرے دالان میں گیئں اور وہاں جاکر اشارے سے تھانہ دار کو بلایا۔ کان میں کہا۔ ابھی سے اظہار راز کرنا خلاف عقل ہے۔ اس اجنبی کا کون اعتبار۔ خدا خانے کسی سے کہہ دے۔ اوّل تو ہم کو یہی یقین ہے کہ سنتے ہی دونوں کو گرفتار کرلے گا اِدھر تم نے بیان کیا اور اُدھر ہتھکڑی پڑگئی۔ آج اس کو باتوں ہی باتوں میں ٹالو۔ مسافر پردیسی سے یارانہ کیا۔

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت
مثل ہے کہ جوگی ہوتے کس کے میت

تھانہ دار : اجی تم دیکھتی تو جاؤ میری زبان میں جادو ہے۔

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

یہ شعر میرے حسب حال ہے۔ آپ ہیں کس خیال میں۔ جی بیگم صاحب۔

ثریّا بیگم : اب تم کو اختیار ہے۔ ہم کہہ چکے۔

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار
اب مان نہ مان تو ہے مختار

تھانہ دار : اچھا ایک بوسۂ لب لعل دیدو تو مان لوں۔ ابھی۔

ثریّا بیگم : پڑو جہنم میں تم۔ اللہ کرے اسی دم گرفتار ہو جاتے۔

تھانہ دار : سُبحان اللہ۔ ع

آپ ڈوبیں گے مگر یار کو لے ڈوبیں گے

اس تقریر کے بعد تھانہ دار اُس دالان میں جاکر بیٹھے اور انسپکٹر سے کہا کہ ہم خونی ہیں۔ اب آپ چاہیے بحیثیت انسپکٹر ہمیں قید کیجیے چاہیے بحیثیت دوست معاف کردیجیے۔

انسپکٹر : (دنگ ہوکر) کیا! خونی! واللہ!

تھانہ دار : جی حضور میں بنگالی مسلمان نہیں ہوں لکھنوی ہوں۔

انسپکٹر : خونی! کس کا خون کیا اور کتنے دن ہوتے۔

تھانہ دار : چند ہی روز تو ہوتے۔ ایک شہزادے تھے مرزا ہمایوں اُن کو قتل کیا اور قتل کرکے بھاگ آیا۔ اب فرمایئے۔

انسپکٹر : (چہرے کا رنگ فق) خدا تجھے غارت کرے کمبخت۔

تھانہ دار : اگر شریف زادے ہو تو اپنی بات کی پچ کروگے۔

ثریا بیگم : اللہ جانتا ہے جو ہمیں یہ حال کچھ بھی معلوم ہو۔

انسپکٹر : او شقی تو اس قابل ہے کہ تجھ کو کھود کے دفن کردے اے لعنت خدا تیرے اوپر شیطان کی پھٹکار۔ بد بخت۔

تھانہ دار : مضیٰ ما مضیٰ۔ اب شد آنچہ شدنی بود بابا۔

انسپکٹر : اب ایرانی بن گئے۔ ہائے ستم ہمایوں فر کا قاتل تو ہی ہے۔ افوہ۔ تو تو سنگسار کرنے کے لائق ہے۔ زندہ چنوا دے تجھے تو وہ شقی ہے اظلم ستم گر۔ لائق دار۔

ثریا بیگم : ہمایوں فر کون تھے جس کو اس نے قتل کیا۔ کوئی رئیس تھے۔

انسپکٹر : شہزادے تھے بڑے خوب صورت جوان رعنا کہ میں کیا کہوں تجھ سے قتل کیوں کر کیا گیا۔ او شقی انقلب سواد الوجہ فی الدنیا۔

تھانہ دار : اچھا اب ہماری سزا کیا تجویز ہوئی صاف بتادو۔

انسپکٹر : موٹے پر سو درے اور گدھے کی سواری۔ شقی نابکار۔

ثریا بیگم : یہ قتل کیوں ہوا؟ ہوا کیا۔ عداوت کیوں ہوگئی تھی۔

انسپکٹر : خبطِ جنون قطرب مالیخولیا۔ یہ ایسے ہی لوگوں میں ہیں۔

بے سبب نیست اگر دوستی اظہار کند

بخصومت چو در آیند بخو یند بسبب

ثریا بیگم : اب آخر ان کی نسبت کیا فتویٰ لگاتے ہو۔ خونی تو ہیں۔

انسپکٹر : اب میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا اور تمام عمر اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہ رہوں گا۔ قاتل شفاک ہے خدا اس سے سمجھے۔

تھانہ دار: سُنو بھائی جان۔ یہ فقط چکما تھا۔ ہم بری ہیں۔

تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گاذران بر سنگ

ہم فقط آزماتے تھے کہ دیکھیں تم قول کے کہاں تک سچّے ہو تو تم کو واقعی صادق الا قرار پایا۔

مردان خدا خدا بناشند
لیکن ز خدا جدا بناشند

تم مرد خدا اور راستباز آدمی ہو۔ شاباش۔ اب ہم صاف کہتے ہیں کہ ہم قاتل نہیں ہیں لیکن مجرم ہیں۔ اب فرمائیے۔

انسپکٹر: اجی جب اتنے بڑے جرم کی سزا نہ دی تو اب کیا خوف ہے۔ کیا کہیں سے مال مار لائے ہو۔

تھانہ دار: معاف کرو تو بتائیں واللہ بتا دیں سُنیے ہم وہ تھانہ دار ہیں جس کی تلاش میں تم نکلے ہو اور یہ وہ بیڑن ہیں سمجھے اب چاہے باندھ لے چلو۔ چاہے حق دوستی ادا کرو۔ ع

یک کار ازیں دو کارمے باید کرد

انسپکٹر: اُف۔ واللہ بڑا چکما ہوا۔ افوہ اچھا جھانسا دیا یار۔

تھانہ دار: لے اب شعر خوانی ہوتے سُنیے۔

مسجد نہ میکدہ نہ صنم خانہ دیکھنا — ہے دل کسی کی نرگس مستانہ دیکھنا
دیکھا تھا اک نظر تو قیامت گذر گئی — اب دیکھیں کیا دکھاتے تمہارا نہ دیکھنا
کوے پریر خان پر جو رہتا ہے شاد شاد — برباد ہوگا یہ دل دیوانہ دیکھنا
یوں دیکھ بار بار نہ اس چشم مست کو — ساقی گرے نہ ہاتھ سے پیمانہ دیکھنا
آنکھیں ہیں میری لائق دیدارِ حُسن یار — کیا جانے آئینہ رخِ جانانہ دیکھنا

چمکی ہزار بار مرے سر پہ تیغ ظلم
جھپکی نہ آنکھ ہمتِ مردانہ دیکھنا

انسپکٹر: قسم لو جو ایک شعر بھی سُنا ہو۔ مجھے تو حیرت ہے کہ یہ تم سے میرے پاس آیا کیونکر گیا۔ اللہ ری جرأت کچھ ٹھکانا ہے۔

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

تھانہ دار: کیا کہی ہے۔ ع

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

انسپکٹر: میں پنجاب سے خاص اسی کام کے لیے بلوایا گیا تھا کہ تھانہ دار اور بیڑن کا پتا لگاؤں۔ یہاں دو دن سے تھانہ دار زانو بزانو بیٹھا ہے اور بیڑن سے نوک جھوک رہتی ہے۔ اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔

ثریا بیگم: حضور ذرا منہ سنبھال کے بات کیجیے۔ بیڑن کوئی اور ہو گی بیڑن کی صورت نہیں دیکھی۔ اور سنیے چہ خوش۔

تھانہ دار: یہ بیگم ہیں۔ خدا کی قسم۔ ثریا بیگم نام ہے۔

انسپکٹر: وہ تو بات چیت لب و لہجہ سے ظاہر ہے۔ دریں چہ شک۔ انسپکٹر شیر سنگھ نے ثریا بیگم کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ہمیں تو خوف ہے نہیں۔ اگر خوف ہے تو تھانہ دار کو یا تم کو اب اگر اپنی اور ان کی رہائی چاہتی ہو تو ہماری بات مان لو۔ ان کو تو استعفا دو اور ہم سے وعدہ کرو بس اب مفر اسی میں ہے آخر اگر ہم اس وقت دشمن بن جائیں تو آپ کی کیا کیا کیفیت ہو۔ ہم کوئی ایسے ویسے تو ہیں نہیں کہ دب نکلیں گے۔ ہم پنجابی آدمی سپاہی۔ لڑنے بھڑنے والے جنگ آزما۔ ثریا بیگم نے قہقہہ لگایا۔ اے واہ کیا دور کی سوجھی ہے۔ ہزار بار کہہ دیا کہ تم ایسے ہندوؤں سے ہم بات کرنے کے عادی نہیں اور یہ یارانہ کیا تھا کہ پہلے یہی فرمائش کی۔ آپ شوق سے ان کو گرفتار کرلیں۔ جائیے حضرت۔

تھانہ دار: اے لاحول۔ یہ اور ہمیں گرفتار کرلیں کیا تاب۔

ثریا بیگم: ایسا نہ ہو کہ تم اسی بھروسے رہو اور دھر لیے جاؤ۔

تھانہ دار: کتنی سادی ہو سچ ہے عورتیں بڑی ناقص العقل ہوتی ہیں اتنا نہیں سمجھتیں کہ قتل کا حال سن کر تو خاموش ہو رہے اس ادنا سی بات پر ہمیں گرفتار کریں۔ مگر۔ انسپکٹر نے کہا بڑا چکما ہوا۔ آپ کا بایاں قدم لے۔

ع

چہ دلاور ست دزدی کہ بکف چراغ دارد

شیر سنگھ کو پھانسا دیا

انسپکٹر شیر سنگھ نے کئی بار از راہ مذاق کہا کہ اگر تم دونوں کو اپنی جان عزیز ہے تو اس بات پر راضی ہو جاؤ کہ اس پری کے ساتھ ہمارا نکاح ہو ورنہ ماںخیر و شما بسلامت۔ اسی دم تم دونوں مجرم گرفتار ہو جاؤ گے۔ ثریا بیگم تنک تنک کر انسپکٹر کو دبے دانتوں برا بھلا کہتی تھیں مگر تھانہ دار مسکرا مسکرا کر دلشاد ہو رہے تھے۔

تھانہ دار : ان کو راضی کیجیے ہم سے کیا واسطہ۔ ہم کو تو اپنی جان عزیز ہے۔

ثریا بیگم : اے واہ ہے اچھے ملے اور سنیئے یہ تھانہ داری کرتے تھے۔

انسپکٹر : آدمی فہمیدہ ہے۔ تم بالکل دشمن عقل ہو ہائے افسوس۔

ثریا بیگم : چلیے ہم بیوقوف ہی سہی۔ یہ بیشک فہمیدہ آدمی ہیں۔

اس مذاق اور چہل کے بعد ثریا بیگم نے کہا کہ یہ دل لگی بازی تو ہوا کرے گی اب مطلب کی بات کہو۔ ہم دونوں بھاگیں تو بھاگ کے جائیں کہاں۔ اور نہ بھاگیں تو کہاں رہیں۔ یہاں رہنا تو مصلحت کے خلاف ہے۔ کیوں کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں تب سے دو تھانہ دار آ چکے۔ ایک دفعہ دو برق انداز آئے۔ پھر تم آئے اور اب کوئی تیسرا تھانہ دار آئے گا۔ کیا جانے کیا ہوتا ہے۔ عورت کو تین دن گور کے بھی بھاری ہیں۔ میں نے خدا جانے کیا کیا ہے۔ اب بیڑن بنا باقی تھا سو بیڑن بھی بن چکی۔ انسپکٹر نے کہا۔ اب ایک کام کرو ہم کو واپس جانے دو۔ ہم وہاں جا کے آئیں۔ بائیں شائیں اڑا دیں گے۔ ہمارا کہنا سننا بہت چلے گا۔ اس کے بعد ہم ایک مہینے کی رخصت لے کر آئیں گے اور تم کو پنجاب لے جائیں گے۔

ثریا بیگم : اے واہ چہ خوش چرا نباشد۔ اور سنیئے۔

تھانہ دار : کیوں اس میں کیا ہرج ہے۔ پنجاب چلیں گے ہم سب مل کے۔

ثریا بیگم : تم جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ ہم تو نہ جائیں گے اور سنیئے واہ۔

انسپکٹر : عورت کی عقل ناقص ہوتی ہے۔

رحم کر میرے گناہوں پہ نہ جا
اے صنم اپنی طرف تو دھیان کر

ثریا بیگم : یہ شعر یں ہم نے بہت سنی ہیں۔ اس وقت یہ چہل اور دل لگی بازی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

تم سے کہے کون. جو کہے وہ ناقص العقل بنے،

دیکھے انجام کو آشفتہ مژگان کیوں کر — جا تے اِس صید کو یہ شیر نیستان کیوں کر

اے جنون توڑیے قفلِ درِ زندان کیوں کر — دیکھیے چل کے تماشائے بیابان کیوں کر

رحم عاشق پہ کرے وہ بت نادان کیوں کر — جان دینے کو جو کہیے تو کہے ہاں کیوں کر

قدِ قیامت کا ملا چال بلا کی پائی — آفتیں ڈھائے نہ وہ فتنۂ دوران کیوں کر

رہنے دو گھات میں میری جو فلک رہتا ہے — دیکھنا ٹوک کے مارا ہر میدان کیوں کر

ہم کو تھل کے حسینوں سے بڑے رنج ہوتے

خوش رہا کرتے تھے پریوں میں سلیمان کیوں کر

انسپکٹر نے تھانہ دار سے کہا اب واقعی دل لگی کا موقع نہیں ہے. اگر ہماری رائے صاحب کو سمجھو تو ہمیں اجازت دو ہم جا کے کہہ دیں کہ وہ دونوں خاندیس کی طرف بھاگ گئے. وہاں تحقیقات کی جائے گی کہیں پتا نہ لگے گا. اتنے میں ہم رخصت لیں گے. پھر ہم تم مل کے جہاں چاہیں گے چلیں گے.

تھانہ دار: پہلے حضرت آپ کا یہاں سے واپس جانا اور پھر آٹھ دس دن کے بعد یہاں آنا اور پھر رخصت لینا یہ کچھ ٹھیک بات نہیں ہے.

انسپکٹر: اچھا پھر آپ صلاح دیجیے. ع

صلاح ما ہمہ آنست کان صلاح شما است

تھانہ دار: ہمارے نزدیک آپ یہاں گھر گھر تحقیقات کیجیے اور دو دن تک ٹکے رہیے. اس کے بعد واپس جائیے. اور کہیے کہ میں نے خوب تحقیقات کی. اگر دو روز قبل پہنچ گیا ہوتا تو گرفتار کر لیتا. معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ دار مع اُس بیڑن کے نیپال کی ترائی کی طرف اُتر گیا.

انسپکٹر: واللہ خوب سوجھی. بھئی خوب ہی سوجھی. تو اب ہم جا کے حسبِ ضابطہ تحقیقات شروع کر دیں. وردی ڈانٹ کے.

تھانہ دار: جی ہاں برابر. آپ کہیے گا کہ چند روز خفیہ تحقیقات کی پھر حسبِ ضابطہ تحقیقات شروع کر دی.

انسپکٹر: بہتر ہے. تو آپ یہاں رہیں. بندہ جاتا ہے.

ثریا بیگم : اب ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی دل لگی کی بات سوجھے، پھر جاکے ادھر اُدھر بیٹھ رہو۔ پہلے یہ معاملہ طے کردو، پھر رخصت لے کے آؤ۔ تو ہنسی دل لگی ہی میں بسر ہو۔

انسپکٹر : ہاں ہاں جی۔ یہ تو ہے ہی۔ اس میں کیا شک ہے۔

یہ کہہ کر انسپکٹر رخصت ہوا۔ زمیندار کے مکان پر جاکر انسپکٹری وردی پہنی۔ کرچ لگائی۔ کانسٹبل نے خاکی وردی ڈانٹی۔ انسپکٹر صاحب گھوڑے پر سوار ہوئے۔ کانسٹبل ساتھ ہو لیا۔ جس طرف نکل گئے رعایا کانپنے لگی۔

بستی میں داخل ہوکر انسپکٹر صاحب نے حکم دیا کہ یہاں کے جتنے زمیندار ہیں سب کو طلب کرو اور منادی کرادو کہ اتنی باتوں کا رعایا کو لحاظ رہے۔

1. جو شخص جس مقام پر بیٹھا ہو وہ اُسی مقام پر شام تک بیٹھا رہے۔
2. کوئی آدمی کسی کے کان میں بات نہ کرے ورنہ سخت سزا پائے گا۔
3. سب دروازے بند کر دیے جائیں۔ شام تک نہ کھلیں۔
4. جو کوئی اجنبی کہیں ٹکا ہو فوراً حاضر ہو۔ ورنہ چالان کیا جائے گا۔
5. بازار میں کوئی آدمی نظر نہ آئے۔ سب کے سب دُکانوں پر بیٹھے رہیں۔

پہاڑ والے سخت متحیر ہوئے کہ یہ نادری حکم کیسا۔ کوئی گھر کے باہر نہ جائے۔ کوئی کسی سے بات نہ کرے۔ سب گھر میں قید رہیں۔ دروازے بند کر دیں۔ اجنبی آدمی فوراً حاضر ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں سب دکانیں بند ہو گئیں۔ بازار بھر میں سناٹا۔ سب شہر خموشاں۔ دروازے بند۔ بوڑھا نہ فرزند۔

دیکھیے جس در کو الگ بند ہے
کوئی نہ بوڑھا ہے نہ فرزند ہے

انسپکٹر صاحب تشریف لائے تو سناٹا دیکھ کر سخت متحیر ہوئے۔

انسپکٹر : ایں یہ کیا ماجرا ہے۔ بازار کہاں ہے۔

زمیندار : حضور یہاں کا یہی بازار ہے۔ یہ تو پہاڑ ہے۔ بازار کہاں۔ آٹھویں دن یہاں شہد اور سلاجیت اور جڑی بوٹی بکتی ہے۔ دو چار دکانیں بنی ہیں۔ وہ اس وقت بند ہو گئیں۔

انسپکٹر : لاحول ولاقوۃ۔

کانسٹبل : حضور کا تو حکم یہی تھا نہ کہ سب مکان بند رہیں۔ اور بازار میں کوئی نہ ہو۔

انسپکٹر : وَل ایک حکم تو سب نے مانا دوسرا حکم کسی نے نہ مانا۔ کوئی باہری آدمی حاضر نہ ہوا۔

فوراً سب مکانوں کی تلاشی لو۔

زمیندار: حضور یہاں کوئی نہیں آیا۔ چاہے جہاں تلاشی لیجیے۔

انسپکٹر: تمہارا نام ہم جانتے ہیں۔ کہ تم مخفی سازش رکھتے ہو۔

ادھر یہ باتیں ہوتی تھیں ادھر تھانہ دار صاحب نشے کی ترنگ میں شبنم کا حال یوں بتا رہے تھے۔

شبنم کیا ہے

زمین کے ابخرے رفتہ رفتہ اُس مقام تک صعود کرتے ہیں، جہاں ہوا بدرجہ غایت سرد ہے۔ پس سطح زمین بھی ابخرہ کے متصاعد ہونے سے سرد ہو جاتی ہے۔ مگر آفتاب کے طلوع ہوتے ہی پھر بدستور گرم ہو جاتی ہے۔ پر ظاہر ہے کہ دن کی نسبت شب کو سردی زیادہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ آفتاب زمین کے محاذات میں نہیں ہوتا۔ جب گرم ہوا پہاڑوں کی سرد چوٹیوں سے ٹکراتی ہے تو وہ بھی سرد ہو جاتی ہے۔ اور رقیق ہونے کے باعث سے بخارات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ پس بخارات مائی سے کسی قدر ابخرۂ مائیہ بحر و بر پر نازل ہوتے ہیں، جن کو شبنم کہتے ہیں۔

دی ایڈووکیٹ فار انڈیا نزولِ شبنم کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے، کہ زمین کے میدان پر جو اجسام گرم شعاعیں باہر نکالتے ہیں، اُن شعاعوں کا یہ حال ہے کہ وہ گرم اجسام سے نکل کر اجسام سرد کی طرف جاتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ کرۂ زمین کی گرم شعاعیں صاف ہوا میں سے ہو کر طبقۂ زمہریر تک صعود کرتی ہیں کیوں کہ سطح آراضی پر تمام اجسام اعتدال میں ایک دوسرے سے برابر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ میدان زمین بتدریج خوب سرد ہو جاتا ہے۔ مگر جب آفتاب کسی مقام پر طلوع ہوتا ہے تو یہ سردی اس قطعہ میں واقع نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہاں کی سطح زمین گرمی کو جذب کر لیتی ہے۔ جب آفتاب وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔ تب اگر آسمان صاف ہو جاتے تو پھر بھی اُس کے باعث سے کسی قدر گرمی رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رات کے وقت بعد غروبِ آفتاب اگر بادل نہ ہوں تو زمین زیادہ سرد ہوتی ہے۔ اگر بادل ہوں تو کم سرد ہوتی ہے۔ آسمان پر جن حصوں میں ابر نہیں ہوتا وہ بارد زیادہ ہوتے ہیں۔ جو بخارات ہوا میں موجود رہتے ہیں۔ ان کی مقدار ضرورتِ اعتدال پر موقوف ہے یعنی جہاں گرم ملکوں میں اعتدال کے واسطے زیادہ بخارات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں ہوا میں بخارات مائی کم

ہوتے ہیں۔ موسم اعتدال میں بھی ہوا۔ جملہ نجارات کا یہی حال ہوتا ہے۔ جب ایک گرم ہوا پہاڑ کی سرد چوٹی کے قریب ہوتی ہے تو وہ ہوا بوجہ سرد ہونے کے تمام نجارات کو نہیں اُٹھا سکتی۔ اس لیے اُس آبی سرمایہ سے ایک حصّہ بشکلِ بادل پہاڑ کی بلند چوٹی پر چھوڑ دیتی ہے۔ اور وہ آبی سرمایہ جو بادل میں ہوتا ہے، خشک زمین پر نزول کرکے اُس کو سیراب کرتا ہے۔ اُس سے بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ پس مطالب مندرجہ صدر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب سطح زمین پر سردی زیادہ ہوتی ہے تو ہوا بھی اُس کے اتصال سے سرد ہو جاتی ہے۔ اسی قیاس پر جب گرم ہوا پہاڑ کے سرد پہلو سے ٹکر کھاتی ہے تو وہاں بھی بباعث اتصال سطحِ مبرودہ کے ایک حصّہ اپنے آبی سرمایہ کا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ مثل کہرے کے باریک باریک بوندوں کی صورت بن کر زمین پر گرتا ہے۔ درختوں کے پتوں پر جمع ہوکر ان کے اطراف میں موتیوں کی طرح لٹکتا اور ٹپکتا ہے اسی کو شبنم کہتے ہیں۔

داروغہ وانسپکٹر کا باقی حال

انسپکٹر صاحب نے کل زمینداروں سے سوال کیے۔ پانچ زمیندار ان کے ہمراہ تھے۔ چار تھر تھر کانپتے تھے۔ مگر پانچویں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ یہ وہ حضرت تھے جن کے یہاں انسپکٹر شیر سنگھ ٹکے تھے۔

انسپکٹر: زمیندار ہاشم علی خاں کون ہے۔ اس کو سامنے بلالو۔

ہاشم : بندگی عرض۔ حکم سرکار کا۔

انسپکٹر: دل تمہارے گاؤں میں کوئی اجنبی آدمی ایک عورت کو ہمراہ لے کر ٹکا ہے یا نہیں۔ اگر ٹکا ہے تو فوراً حاضر کرو۔

ہاشم : اب لے صاحب ہم کو کیا معلوم۔ مگر چوکیداروں کو بھیج کر دریافت کیے لیتا ہوں۔ جاؤ فوراً دریافت کرو کہ کوئی اجنبی تو نہیں ٹکا ہے۔ جو ٹکا ہو تو پکڑ لاؤ۔

انسپکٹر صاحب نے دوسرے زمیندار کو بلوا کر ڈانٹا۔ اُس نے بھی یہی عذر پیش کیا۔ اِسی طرح کل زمینداروں نے اپنے اپنے گاؤں میں چوکیدار دوڑا دیے۔ انسپکٹر صاحب دن بھر دوڑ دھوپ کے تھانہ دار کے پاس آئے تو اپنی چارپائی پر گر پڑے۔ اُف بھئی آج شل ہوگئے۔ اس پہاڑ کی ایسی تیسی۔ واللہ مار ڈالا۔

تھانہ دار: سبحان اللہ پولیس کی نوکری اور مرزا پھوہا بنے جاتے ہو۔
انسپکٹر: بجا ہے۔ آپ تو گھر میں ماما پختیاں اوڑا آئیں۔ اب اس وقت یہاں آتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ۔ اب حواس بجا نہیں۔

دستر خوان بچھا۔ تو شیر سنگھ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ کچھ واہی ہو۔ میں مسلمان ہوں میرا کھانا روپ سنگھ زمیندار کے ہاں سے آیا۔ ادھر ثریا بیگم اور تھانہ دار نے انناس پلاؤ۔ اور براٹھے اور مرغ اور ماہی کباب اور د۔ پیازہ اور قورمے پر ہتے لگاتے۔ ادھر شیر سنگھ نے پوری اور کچوری اور ترکاری اور اچار اُڑایا۔ پہاڑوں کے چشموں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا۔ آرام کرنے لگے۔ تھانہ دار نے کہا یہ خط (ایک خط دے کر) میں نے لکھا ہے۔ ڈاک پر بھیجیے۔ یہ تمہارا نام ہے۔ عبارت سن لیجیے۔ انسپکٹر صاحب سلامت۔

تھانہ دار مولوی محمد ابراہیم عرض رسا ہے کہ ایک دختِ پری جمالی کے حسنِ عالم آشوب نے کہیں کا نہ رکھا۔ حوالات سے لے کر بھاگ آیا۔ سنا ہے کہ آپ کے اُس کہسار پر گھاس ہے نہیں اجی حضرت ہم سرکاری نوکر ہیں۔ ٹھہریے ٹھہریے بدلا لے یعنی چہ بہتر یہی ہے کہ اس خیال سے درگذرو۔ ہم اسی شہر میں زندناتے ہیں۔ میں کپتان صاحب کی خدمت میں بھی ایک عرضی بھیجنے والا ہوں کہ اگر وہ مجھے معاف کر دیں اور مجھ سے مواخذہ نہ کریں تو آج کے دسویں دن حاضر ہوں۔ چنانچہ اُن کے نام جو عرضی بھیجی اُس کا مسودہ یہ ہے۔

بخدمت حضور صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ بہادر،

غریب پرور سلامت!

عرض حال یہ ہے کہ فدوی ایک ساعت کے قطرب میں جو جنون کی ایک قسم ہے۔ مبتلا ہو کر مرتکب ایک امر لغو کا ہوا یعنی ایک زنِ حسینہ کو جو حوالات میں تھی اتفاق سے لے بھاگا۔ اب محجوب ہوا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ حاضر حضور سرکار دولت مدار ذوالاقتدار ہوں۔ اگر حضور غلام کو مانع روزگار کر دیں تو مضائقہ نہیں، مگر غلام کو قید کی سزا نہ دیں۔ اور فدوی اُس عورت کا پتا لگائے گا۔

انسپکٹر نے کہا خوب سوجھی۔ فوراً اپنے دوست زمیندار کے ذریعے سے چوکیدار کو بلوایا۔ حکم دیا کہ یہ خط فلاں ڈاک خانے میں چھوڑ آؤ۔ تھانہ دار نے کہا اب آپ کا یہاں ٹکنا مناسب نہیں ہے۔ آپ وہیں جا کے قیام کریں۔ بلکہ مصلحت وقت یہی ہے کہ فوراً واپس جائیے اور کپتان صاحب کو یہ خط دکھائیے۔ انسپکٹر صاحب سیدھے آدمی تو تھے ہی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ثریا بیگم تو سکھائی

بڑھاتی تھیں ہی فوراً نازو ادا کے ساتھ اٹھیں اور مسکرا کر بولیں کہ تھانہ دار صاحب ــــ آپ ذری الگ ہٹ جائیے۔ ہم ان سے کچھ کہیں گے۔ انسپکٹر کا دماغ عرش بریں پر تھا کہ یہ عروس طاؤس زیب فریفتہ ہو گئی۔ واہ رے نادان۔ دو دو باتیں کر کے ان کو رخصت کیا۔ ادھر تھانہ دار اور وہ دونوں خوش ہوئے کہ پالا جیت لیا۔ سوار سے تھانہ دار نے کہا کہ کوئی علمی بیان چھیڑیئے۔ اس نے کہا۔

کوہ آتش فشاں کیا ہے

کوہ ہائے آتش فشاں اور شرر بار اُن پہاڑوں کا نام ہے جن میں سے متعدد منفذوں کی راہ سے دھواں اور شعلے اور گرم راکھ اور پگھلے ہوئے پتھر اور معدنیات اور مرکبات کیمیاوی اخراج پاتے ہیں۔ ان کی شکل عام پہاڑوں کی صورت ظاہری سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی یہ اکثر گاؤ دم شکل کے ہوتے ہیں اور نشیب و فراز بہت کم ہوتا ہے۔

جبال النّار کی نسبت صاحب ایڈورڈ کیشنل راوی ہیں کہ اُن کا وجود قعر دریا اور سطح زمین دونوں میں برابر ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بلند پہاڑ کی سطح بیرون میں حرارت اندرونی کے باعث متعدد منفذ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور مادۂ آتشین کا اخراج شروع ہوتا ہے رفتہ رفتہ وہ مادہ نو برآمدہ ایک جگہ مجتمع اور منجمد ہو کر بجائے خود ایک چھوٹا سا پہاڑ ہو جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس اس قعر دریا میں بھی یہ صورت ظہور میں آسکتی ہے۔ یعنی سمندر کی تہہ میں بسبب حرارت اندرونی متعدد منفذ اور سوراخ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اُن میں سے رقیق مادہ آتشین اخراج پاتا ہے۔ اب اگر یہ مادۂ خارج شدہ نہایت رقیق اور قلیل المقدار ہے تو امواج اُس کو منتشر اور پریشان کر دیتی ہیں۔ اور کسی مقام خاص پر مجتمع اور منجمد نہیں ہونے دیتیں۔ برخلاف اس کے اگر مادۂ خارج شدہ کثیف و ثقیل و کثیر المقدار ہے۔ تو وہ امواج سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور ایک ــــ جگہ تہ نشین ہوتا ہے۔ اور مجتمع و منجمد ہو کر سخت ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ سمندر کی سطح بیرونی سے بہ ہیئت جزیرہ پدید ہوتا ہے۔ اس جزیرہ میں سے براہ منافذ موجودہ مادۂ آتشین خارج ہوتا ہے سنہ 1831ء میں بحر روم کے ایک جزیرہ میں حرارت اندرونی سے سطح زمین میں سوراخ اور منفذ ہوئے۔ اور مادۂ آتشین نکلنا شروع ہوا۔ لیکن چونکہ قلیل المقدار اور بغایت رقیق تھا امواج بحر نے اُس کو

منتشر کردیا۔ اور اُس کا کوئی وجود ظاہری باقی نہ رہا۔ لیکن بحر الکاہل میں 1839ء میں۔ گرم دھواں نکلنا شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ مادہ آتشین جو کہ قعر سمندر میں خارج ہو رہا تھا اور بسبب کثافت اور ثقل اور کثرت مقدار امواج اُس کو پراگندہ نہ کر سکتی تھیں۔ مجتمع اور منجمد ہوتا ہوا سطح آب پر بشکل جزیرہ نمانمودار ہُوا۔ اُس نو برآمدہ جزیرے میں متعدد منفذ اور سوراخ تھے۔ جن کی راہ سے شعلے نکلنے شروع ہوئے۔ اُن شعلوں کی روشنی اور چمک دس میل کے فاصلے تک پہنچتی تھی۔ چھ برس کے بعد جب سیاح اِس جزیرے پر گئے تو وہاں کی زمین کو اس قدر گرم پایا کہ قدم رکھنے کی مجال نہ تھی۔ وقتاً فوقتاً اس میں مادہ آتشین کا اخراج ہوتا رہا۔ اور جزیرے کی وسعت اور بلندی زیادہ ہوتی گئی یہاں تک کہ اب وہ جزیرہ سطح آب سے کئی ہزار فٹ بلند اور دو تین میل مُدّور ہے۔ اکثر جبال النّار کے وسط میں ایک منفذ ہوتا ہے۔ اُس کو الوسط کہتے ہیں۔ اس کی راہ جو مادہ رقیق آتشین خارج ہوتا ہے وہ پہاڑ کے چاروں طرف بہتا ہے۔ اِس سبب سے جبال النّار کی شکل ظاہری گاؤ دم اور ہموار ہوتی ہے۔ اور جو نشیب و فراز عام پہاڑوں میں پایا جاتا ہے وہ ان میں نہیں ہوتا۔ البتہ اِس قسم کے پہاڑوں کے پہلو میں چاروں طرف بہت گہری درزیں ہوتی ہیں۔ اُس کا باعث یہ ہے کہ جب مادہ آتشین خارج ہوتا ہے تو اُس کی گرمی سے برف پگھل کر یا آب بارش گرم ہو کر چاروں طرف اِس زور سے بہتا ہے کہ پہاڑ کی سطح میں جو اس وقت نہایت نرم و گرم ہوتی ہے، درزیں ڈال دیتا ہے۔ گرم راکھ کے باعث جو قعر زمین سے خارج ہوتی ہے۔ اِن پہاڑوں کا رنگ بیشتر بھُورا ہوتا ہے۔

بھاگ نکلے

شیر سنگھ کو اِن دونوں نے چیتا یار بنا کر روانہ کیا۔ اِدھر پچھلے سے زمیندار نے ایک سواری بھیجی۔ دونوں عاشق و معشوق سوار ہو کر وہاں سے چلے۔ سوار جو ساتھ تھا اُس کو شب کے وقت تھانہ دار نے کہ انتہا کا چالاک اور خوش فکر آدمی تھا مقدار سے کہیں زیادہ برانڈی پلا دی۔ وہ غین پڑے تھے۔ جب دو کوس زمین نکل گئے تو تھانہ دار کو دور کی سُوجھنے لگی۔ کیوں نہ سُوجھتی۔

تھانہ دار : دُنیا میں رہ کر اگر چالاکی نہ کرے اور کاٹ پھانس نہ جانے تو دم بھر گذارہ نہ ہو۔ دُنیا میں آٹھوں گانٹھ کمیت ہو تب کہیں کام چلے۔ ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح۔

ثریا بیگم : واہ جتنے نیک آدمی ہیں سب کے لیے دنیا میں اعلا درجہ ہے۔ اور عقبیٰ میں اِس

سے اعلا درجہ ہے۔ یہ کیا بات آپ نے کہی۔ اِس رباعی پر غور کیجیے۔

انسان کو خلق فائدہ دیتا ہے
آئینۂ عقل کو جلا دیتا ہے
دُنیا میں جو عزّت ہے تو عقبیٰ میں بہشت
یہ دونوں جہاں میں مرتبہ دیتا ہے

تھانہ دار: اخلاق سے کچھ نہیں ہوتا۔ چالاکی بڑی چیز ہے۔

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم

ثریّا بیگم: خائن ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔ خائن کے قول و فعل کا کسی کو اعتبار نہیں۔

تھانہ دار: اچھا اگر ہم شیر سنگھ سے چالاکی نہ کرتے تو جھانسا کیوں کر دیتے۔

ثریّا بیگم: اسی طرح چور بھی پوچھ سکتا ہے کہ اگر میں چوری نہ کرتا تو ہزاروں روپیے کہاں سے پاتا۔

تھانہ دار: کیا خوب۔ تو چوری آپ کے نزدیک کوئی عیب ہے۔

ثریّا بیگم: ایں واہ۔ تو تم چوری کو عیب ہی نہیں سمجھتے۔ عیب نہیں گناہ ہے۔ چغل خوری اور قمار بازی اور شراب خوری سب سے بڑھ کر گناہ تو چوری ہی ہے۔

تھانہ دار: لاحول ولاقوۃ۔ جانِ من گناہ کچھ بھی نہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ثریّا بیگم: پھر اس شعر سے کیا ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی تو ہے۔ کہ۔

دِل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاران کعبہ یک دل بہتر است

پھر اب کوئی کعبہ شریف بن جائے کوئی حج نہ کرے۔

تھانہ دار: کیا خوب ستّر چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ آپ اور حج کا نام لیں۔ ایسی ہی تو بڑی عفیفہ ہو نہ۔

ثریّا بیگم: خیر اس سے کیا مطلب۔ ہم بد ہی سہی۔ (آبدیدہ ہو کر) وائے قسمت۔

تھانہ دار: میں تو لڑکپن سے تم کو جانتا ہوں۔ جب چودہ پندرہ برس کا سن تھا۔ تب ہی سے تاک جھانک کرتی تھیں۔ مجھ سے اُڑتی ہو۔ دائی سے پیٹ چھپانا۔ وہ شعر مجھے خوب یاد ہیں جو لکھ لکھ کر پتنگ گراتی تھیں۔

محبت کا تری بندہ ہر اک کو اے صنم پایا
برابر گردنِ شاہ و گدا دونوں کو خم پایا
مر گئے تیرے غم میں ہم کچھ بھی ہوا نہ تم کو غم
ہے یہ وہ غم کہ اے صنم کعبہ سیاہ پوش ہے

اور اس وقت آپ پارسائی کی لینے لگیں۔ آپ کی پارسائی تو بی صاحب بس اِسی سے ظاہر ہے کہ آپ بیڑن مشہور ہوئیں اور ڈاکوؤں کے ساتھ رہیں اور پھنس کے حوالات میں آئیں۔

ثریا بیگم کے کلیجے پر اس تقریر نے تیر کا کام کیا۔ دل ہی دل میں سوچی کہ میری پارسائی کا حال کوئی شہسوار سے پوچھے۔ کوئی سلارو اور اُس کے آقا رونیوا ایجنٹ سے پوچھے۔ کوئی اُستانی جی سے دریافت کرے۔ کوئی اس تھانہ دار کی رائے لے۔ مگر افسوس ہے اُس نے مجھے اتنا بڑا طعنہ دیا۔

تھانہ دار: اب تو ذرا خاموش ہوئیں۔ پتے پتے کی کہی نہ۔

ثریا بیگم: بے شک۔ بالکل پتے پتے کی کہی۔

پو پھٹنے کے وقت رتھ روک لیا۔ گاڑیبان سے پوچھا۔ یہاں سے سیرڈیھ کتنے فاصلے پر ہے۔ اُس نے کہا حضور یہ سیرڈیھ ہی ہے۔ مجھے میرے مالک کا حکم تھا کہ اس طرح جاؤ کہ کوّے سیرڈیھ ہی میں بولیں۔

تھانہ دار: بھلا یہاں ہم کس مکان میں ٹکیں گے۔ یہ تم کو معلوم ہے۔؟

گاڑیبان: حضور آدمی بھیج دیا گیا ہے۔ ارے نندا نندا ہو (پھر غل مچا کر) نندا نندا ہو۔

نندا نندا کے بعد (ہو) کے لفظ کو خوب بڑھاتا تھا۔ تیسری آواز میں نندا نے جواب دیا (ارے آیت ہے رے)۔

ثریا بیگم: اوئی۔ ٹپکی پڑے ان گواروں پر۔ کان کھا لیے۔ نندا آئے۔ کہار رتھ اِدھر پھیر دے۔ ایک ٹیلے کی طرف لے چلا۔ اِدھر سے مُڑا۔ بائیں ہاتھ گیا۔ وہاں رتھ والے کو ہٹا دیا۔ کہا اُتریے۔ تھانہ دار اور ثریا بیگم کو ایک مکان میں لے گیا۔ پھر اُس مکان کے تہ خانہ میں لے گیا تب تو تھانہ دار صاحب چکرائے۔

تھانہ دار : کیا کچھ منصوبہ کیا ہے بھئی۔
ثریّا بیگم : ہم تو اس میں نہ جانے کے۔ اُف فوہ۔ اللہ رے اندھیرے۔
نندا : اب جلدی چلیے۔ آپ چلیں تو سہی۔

تھانہ دار صاحب نے تلوار فوراً میاں سے لی اور شمشیر برہنہ لے کر بسم اللہ کہہ کر چلے۔ ثریا بیگم کو ساتھ لیا۔ پیچھے پیچھے نندا آتا تھا۔

ثریّا بیگم : (دو زینے اُتر کر) اوئی اللہ۔ کس قدر کی تاریکی ہے۔
تھانہ دار : تم میرے ساتھ چلی آؤ۔
ثریّا بیگم : واسطے خدا کے تم تلوار کو میاں میں کرو۔
تھانہ دار : واہ۔ اگر مقابلے کو آئے تو ہضم ہی کر جاتے۔ اور یوں تو دیو کا باپ بھی آئے تو کیا پروا۔

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندر میانِ خاک وخون بینی سرے

ثریا بیگم : اے ہے۔ یہ کہاں آئے۔ یا اللہ بچائیو۔
تھانہ دار : ارے میاں نندا روشندان تو کھول دو جا کے۔
نندا : جی کیا جانے کس بکت (وقت) کے بند پڑے ہیں۔
ثریّا بیگم : (کانپ کر) ہے ہے خدا جانے کتنے برسوں سے یہاں چراغ نہیں روشن ہوا۔
تھانہ دار : یا خدا ارے میاں نندا۔ یہ تو زینے ختم ہی ہوتے نظر نہیں آتے۔
نندا : جی کوئی ایک سو دس زینے ہیں۔
ثریا بیگم : ارے! اُف بس اب میں مرگئی۔
تھانہ دار : عجب بدتمیز آدمی ہے بے تو۔ نالائق۔
ثریّا بیگم : یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دلّی ہنوز دور است۔
تھانہ دار : گنوار آدمی سے خدا نہ کرے کسی بھلے مانس کو پالا پڑے۔ بڑی خرابی ہوتی ہے۔
نندا : تو اب تو نگچائے آئے۔ اب کوئی پچیس ٹھون اور ہیں۔ بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے وہ کافر زینے طے ہوئے۔ تہ خانے میں پہنچے تو نمونۂ بہشت پایا۔ اس طرح کی سردی کہ گلابی جاڑے کا لطف

آیا. نندا نے کہا اس مقام پر دو پلنگ بچھے ہیں. ذرا سستا لیجیے. آرام کیجیے ایک پر تھانہ دار دراز ہوئے. دوسرے پر ثریا بیگم نے آرام کیا.

تھانہ دار: اب بتاؤ یار اب کی منزل کہاں کی ہے اُستاد.

نندا: اب جس مکان میں رہنے کو ہے وہاں چلو گے.

ثریا بیگم: وہ مکان (مسکرا کر) کہاں ہے. وہ مکان بڑی دور ہے. یا یہیں پر.

تھانہ دار: (قہقہہ لگا کر) تم تو بیکار ہنساتی ہو.

نندا: اب وہاں سب سامان لیس ہے. کھانا پکا ہوا رکھا ہے.

ثریا بیگم: واہ پھر کیا پوچھنا ہے چیڑی اور دو دو.

پلنگ پر لیٹ کر ثریا بیگم بولیں. ابھی تک ہمیں کچھ نظر نہیں آتا. اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے. اور کچھ سُوجھتا ہی نہیں.

تھانہ دار: اب ایک کام کرو. ذرا آنکھیں بند کر لو.

ثریا بیگم: واہ. (مسکرا کر) بلکہ آنکھیں پھوڑ ڈالوں.

نندا: ہاں تو تو پھر سب سوجھنے لگے.

ثریا بیگم: ٹھنڈک بھی ہے اور تھکے ہوئے بھی ہیں. مگر نیند نہیں آتی.

تھانہ دار: ہماری بھی یہی کیفیت ہے. دِل اُچاٹ ہے نہ.

ثریا بیگم: اچھا کوئی کہانی چھیڑو. ایسی کہ کل تک ختم ہو.

تھانہ دار: اچھا سُنو.

چند احباب موافق متفق ہو کر اپنے گھر سے بقصدِ سیاحت نادرات و عجائبات روزگار چلے. ہر روز نیا شہر ہر شب نیا مقام کرتے چلے جاتے تھے کبھی جنگل کبھی دریائی سیر، کبھی شہر کی آبادی کبھی میدان کی ہوا. اتفاقاً ایک جنگل زخار میں پہنچے. وہ جنگل نہایت لق و دق تھا. کوسوں تک سوا جنگل اور درندوں کے آدمی اور آبادی کا پتا نہ تھا. یہ لوگ نہایت ہی گھبراہٹ اور خوف سے دو منزلہ سہ منزلہ کرتے تھے. قدم قدم پر خوف جان دل میں دھڑکن لب پر آہ و فغاں کبھی دست بدعا کہ یا خدا کہیں شیر سے دو چار نہ ہو جاویں یا اللہ ہر آفت سے بچا. غرض اسی فکر و اندیشہ میں رات دن کٹتے تھے. ایک روز ایک مقام پر جا پہنچے وہاں کچھ درخت سایہ دار تھے. اور میدان بھی تھا. تھوڑی دیر آرام کیا. تھکے ماندے تو تھے ہی سو لیے. اُٹھے تو بالکل شام. دو گھڑی

دن ہو گا کہ آنکھ کھلی۔ بہت ہی گھبراتے کہ اب کیا کریں۔ آخر سب کی یہی رائے ٹھہری کہ آج رات یہیں بسر کریں۔

اب سنیئے یہاں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے سے ایک گرد نمودار ہوئی۔ گرد کے دیکھتے ہی رہے سہے حواس جاتے رہے۔ یا الٰہی یہ کیا معاملہ ہے، دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ ایک نے کہا کہ کوئی قافلہ ہو گا۔ اللہ نے ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ دوسرے نے کہا خدا ایسا ہی کرے۔ تیسرے نے کہا یار ایسی تقدیر نہیں ہے۔ ایسا نہ ہوں ٹھگ ہوں تو سب کپڑے اور اسباب کے گاہک ہو جائیں۔ ایک بولا اگر کوئی قافلہ ہے تو فہو المراد اور اگر چور ہیں تو ہتھیار بند تو ہیں ہی۔ برسر مقابلہ آئیں گے۔ جب تک جان میں جان ہے اسباب نہ دیں گے جب ہم نہ ہوں گے تو چاہے جو لے جائے۔ غرض سب صاحب اسی امر پر قائم ہوتے مسلح ہو کر آمادۂ پیکار ہوئے کہ سامنے سے پچاس سوار نمودار ہوئے۔ آتے ہی انھوں نے للکارا کہ ہتھیار رکھ دو۔ ورنہ مفت جانیں جائیں گی۔ انھوں نے بندوق سے جواب دیا غرض تھوڑی دیر دونوں میں لڑائی رہی۔ دس پانچ آدمی چوروں کے کام آئے تب ایک سوار ان میں سے آگے آیا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں اور تیر کمان پر چڑھا ہوا اور ترکش کاندھے سے لگا آواز بلند پکارا کہ تم لوگ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ یہ خوب سمجھ لو کہ ہمارا یہ حربہ ہے اور تمہارا یہ پیشہ نہیں۔ آخر کار تمہاری شکست ہے۔ بہت ہو گا دس پانچ آدمی ہمارے اور مارے جائیں گے۔ زیادہ بریں کیا ہو گا۔ ان لوگوں کے دماغ میں جوش بہادری اور دلاوری بھرا تھا۔ انھوں نے ایک نہ سنی اس نے بہت کچھ سمجھایا۔ سچ ہے شامت کیا کہہ کے آتی ہے۔ جب انھوں نے نہ مانا۔ تو اس نے بندوق سنبھالی اور دم کے دم میں دس بیس کو گرا دیا جو باقی رہے ان کو باندھ لیا۔ ان میں ایک جوان خوشرو قوس ابرو بھی تھا۔ اس کو اس جوان رعنا نے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔ اور اپنے مقام سکونت کا راستہ لیا۔ وہاں سے ان کا مکان سکونت چالیس کوس پر تھا۔ گھوڑوں کی باگ اٹھائی اور بگٹٹ چلے۔ چشم زدن میں اپنی قیام گاہ میں پہنچے۔ شب کو آرام کیا۔ اور سب قیدیوں کو ایک مکان میں بند کر دیا۔ دوسرے روز وہ جوان رعنا خراماں خراماں قیدیوں کے پاس آیا۔ سب قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔ الا اس نوجوان کو اپنے ہمراہ لے گیا جب دسترخوان چنا گیا اپنے ہمراہ اس کو بھی کھانا کھلوایا۔ اور مذاق کی باتیں کرنا شروع کیں۔

یہ بے سرو پا قصہ اس قدر کہہ چکے تھے کہ نند اکی آنکھ کھل گئی۔ کہا بس اب اٹھیے اور چلیے۔ اتنی دیر میں تھکاوٹ مٹ گئی ہوگی۔ تھانہ دار نے ثریا بیگم کو جگایا۔ وہ بھی خراٹے لے رہی تھیں۔

نندا : چلیے جتنی سیڑھیاں اُترے اُتنی ہی چڑھنی ہیں ۔
تھانہ دار : اِس کے کیا معنی ۔ اب پھر تہ خانے کے باہر چلو گے ۔
ثریّا بیگم : بس اب ہم سے زینے نہ چڑھے جائیں گے ۔
نندا : اب دوسرے مکان میں چلنا ہے ۔

چلے تو تہ خانے کے گوشے میں ایک کوٹھری ملی ۔ اس میں داخل ہوئے ۔ وہاں نندا نے دروازے کا قفل کھولا اور کہا چلیے:

ثریّا بیگم : اُف ۔ اب یہ دوسرا مرحلہ طے کرنا ہے ۔
تھانہ دار : یار بتاؤ تو لیے کہاں چلتے ہو آخر ۔ بھئی ہم ہرگز نہ جانے کے ۔

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

نندا نے کہا اچھا پہلے میں چلتا ہوں ۔ میں تو یہاں اکیلا آتا جاتا ہوں ۔
ثریّا بیگم بہزار خرابی ناک بھوں چڑھا کر چلیں ۔

نندا : لیجیے آن پہنچے ۔ اب انعام دلوائیے ۔ لائیے بائیں ہاتھ سے ۔
ثریّا بیگم : شکر ہے خدا کا کہ مصیبت دور ہوئی ۔
تھانہ دار : روشنی ۔ اب صحن میں آئیے ۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ زینے ختم ہوئے تو تھانہ دار اور ثریّا بیگم دونوں دنگ ہو گئے ۔
دیکھا کہ ایک نہایت فراخ صحن ہے جس کے ایک سمت دوہرے عالی شان دالان ہیں ۔ چوطرفہ پہاڑ اور جنگل اور آبشار ۔ جب دالان کے قریب پہنچے تو ایک آدمی سامنے آگیا ۔ نندا نے کہا یہی باورچی ہے ۔ کہو کھانا تیار ہے ۔

باورچی : ہاں کچھ سٹر پٹر پکا ہے ۔
نندا : سٹر پٹر کیا معنی ۔ حضور کا حکم تھا کہ عمدہ کھانا پکوانا ۔
باورچی : بھئی ہم تو وہ کھانا پکاتے تھے جو بادشاہوں کے مقبول تھا ۔ سلطانی خاصہ پڑ ہیں کہ بائیں مگر چھ دن سے بخار آتا ہے ۔ زکام نے ناک میں دم کر دیا ۔ ریزش سے خدا کی پناہ ۔ جان عذاب میں ہے ۔ اس سبب سے کچھ کچا پکا پکا دیا مگر یہ ذائقہ نہ ہو گا ۔
ثریّا بیگم : جو کچھ ہو لاؤ ۔ دال دلیا ہی سہی ۔
تھانہ دار : گھاس نہ کھاؤ ۔ منگوا دوں پہاڑوں کی ہری ہری دُوب ۔

ثریّا بیگم : جی وہ حضور ہی کی غذا ہے۔ اور آپ ہی کو مبارک رہے۔ باورچی نے کھانا نکالا جنگلی مرغ مسلّم کے کباب۔ ہرن کے کباب پہاڑ کی تین طرح کی ترکاری۔ قند کے چاول اور دو طرح کا اچار یہ دونوں حیران۔ بھلے تو تھے ہی اس غذا کو غنیمت سمجھ کر نوش جان کیا۔ کھانا کھانے کے بعد خاصہ برزکی بڑی تعریف کی۔

تھانہ دار : بھئی یہ ترکاری پلاؤ کے باپ کو مات کرتی ہے۔

باورچی : حضور یہ میرے پکانے کی تعریف نہیں یہ ترکاری ہی ایسی لذیذ ہوتی ہے کہ گوشت کی کوئی اصل و حقیقت ہی نہیں۔

اس کے بعد ثریّا بیگم اور تھانہ دار نے چھت پر جاکر سیر کی۔ عجب لطف حاصل ہوا۔ آب رواں اور چشمہ ساروں کی روانی نے، وہ سرور آنکھوں کو عطا کیا کہ باید و شاید۔ ایک مرد نے مفصل بیان کیا کہ جس طرح دریا موجیں مارتا ہوا، اور مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا۔ آخر کار سمندر میں گرتا ہے۔ اسی طرح انسان کا بھی حال ہے۔ جب وہ طفولیت اور شباب اور پیری کے دن پورے کر چکتا ہے تو اس کی زندگی کی کشتی گویا عدم کے لجہ ناپیدا کنار اور بحر زخار میں غرق ہو جاتی ہے۔ کسی دریا کا طول چار ہزار میل ہے۔ کسی کا صرف ایک ہی ہزار میل۔ قس علیٰ ہذا انسان بھی بعض کثیر العمر اور بعض قلیل العمر۔ ہوتے ہیں۔ کوئی ایک سو بیس برس کا ہو کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوتا ہے۔ کوئی عین عنفوانِ شباب میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کوئی پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے۔ دریا سب ایک ہی سے نہیں ہوتے۔ کسی کی دھارا بڑی سُرعت و تیزی سے بہتی ہے۔ کسی میں مطلق تیزی نہیں ہوتی۔ کوئی۔ کوئی جنگلوں میں بہتا ہے کوئی اپنی سالانہ طغیانی سے قرب وجوار کے مزارع کو سرسبز و شاداب کرتا ہے۔ کسی کا پانی شیریں اور کسی کا متعفن اور مضر صحت ہے۔ اس طرح انسان بھی کوئی تیز طبیعت ہوتا ہے۔ کوئی غبی اور سست کوئی ترش رو کوئی خجستہ خو کسی کے افعال شائستہ سے خلق اللہ کو انواع و اقسام کا فائدہ پہنچتا ہے۔ کوئی اپنی حرکات ناشائستہ سے بندگان خدا کو نقصان پہنچاتا ہے۔ دریا کے کنارے پر جو لوگ دوامی بود و باش کرتے ہیں وہ اُس سے بدرجہ اتم مالوف و مانوس ہو جاتے ہیں۔ اُس کی تعریف و توصیف میں رُطب اللسان رہتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے باشندے گنگا اور جمنا ندی اور بھاگیرتی کو ایسا مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں کہ آج تک شعراء طلیق اللسان نے ان کی توصیف میں سیکڑوں اشلوک سنسکرت اور اُردو اور ہندی میں تصنیف کیے۔ مصر کے لوگ دریائے نیل سے ایسی محبت رکھتے ہیں۔ جیسے کوئی اپنے اعزہ و اقربا سے محبت رکھتا ہے۔ اس دریا کی توصیف

میں جو اشعار شعرائے گرانمایہ نے موزوں کیے وہ آج تک مصر میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کل ملک میں ضرب المثل اور ورڈزورتھ انگلستان کے شعرائے فرزانہ ٹامس گرے وغیرہ نے ٹیمس کی بہت کچھ تعریف کی ہے۔ گو یوروپ دنیا کے ہر ایک براعظم سے چھوٹا ہے مگر بے شمار دریاؤں کے سبب سے بہت تر و تازہ رہتا ہے۔

شہزادی قوس ابرو یاسمن بو

اور

شہزادگانِ سکندر طلعت ــــ آئینہ زانو

بیا ساقی آن می کہ فرخ پے است | بمن دِہ کہ داروے حردان حی است
می گوشت حلوای ہر خم کشی | ندیدہ بجز آفتاب آتشی
بیا ساقی آن جامِ آئینہ فام | بمن دہ کہ بر دست بر جامی جام
بیا ساقی آن لعلِ پالودہ را | بیاور بشوایں غم آلودہ را
بیا ساقی آن راوق روح بخش | بکامِ دلم برفشان چون درفش
بدہ ساقی آن جام جمشید را | شبِ تیرہ رخشندہ خورشید را

خرابم کن از بادۂ جام خاص
مگر زیں خرابات یابم خلاص

آج خامۂ زرفشان کا ختلی قمر سُم غزغاؤ دُم تو جوانوں کے مزاج کی طرح اٹکھیلیوں پر ہے۔ اور ایک ایک قدم پر بل کھا رہا ہے۔

خرامندہ ختلی فش وُدُم سیاہ
تگاور تر از بادِ در صبح گاہ
چو وہم از ہمہ سوی مُطلق خرام
چو اندیشہ در تیز رفتن تمام

ناطورۂ فتنہ تمثال معشوقۂ زلیخا جمال افشان جبینِ رعنائی منطقۂ بروج دل ربائی ۔ سکندر بخت آئینہ زانو یعنی پولینڈ کی نوخیز شہزادی گل اندام یاسمن بو نے ایوانِ کیوان فشان

گورشکِ بہشت بریں، وردلکش خلدِ علیین بنایا۔ دو گھڑی دن رہے اُس کہسار پُر بہار کی کیفیت قابلِ دید تھی، بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ دو کوس سے اس محلِ معلّیٰ تک دورویہ کوہِ رفیع آراستہ و پیراستہ تھا۔ شہزادی نے کہ از بس نفیس طبع و نازک مزاج تھی حکم دیا تھا کہ کیوڑے سے سڑک پر چھڑکاؤ ہو۔ اِس پھول پر قلبِ عاشق ہے، اور اُسی کی بوئے خوش سے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ بیل بوٹے اِس جوبن پر تھے کہ باید و شاید۔

نونہالانِ چمن کو ماشطۂ قدرت نے ایسا سنوارا تھا کہ ایک ایک رگِ گل سے جوبن پھٹا پڑتا تھا جس طرف پہلکِ نظر جاتا تھا وجنّاتِ تجری من تحتہا الانہار کا مضمون آشکار تھا۔ ہر روش سے باغِ ارم کا لطف نمودار تھا۔ سامنے ایک میدان ولربا دلکشا میں ایک خیمہ آسمان پایہ نصب ہوا۔ خیمہ کیا زیرِ آسمان ایک اور آسمان ہو گیا ہوا۔ فلکِ فتنہ پرور کا بھی رقیب پیدا ہوا۔ اس خیمۂ زرّین کے گرداگرد انہارِ آبدار کی روانی وہ لطف و تماشا دکھاتی تھی کہ سلسبیل و تسنیم کی روح تازہ ہو ہو جاتی تھی۔ انہار کے بعد سبزانِ چمن کی قطار تھی۔ نوجوانانِ چمن اکڑتے تھے۔ گلوں پر بہار تھی۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے پودوں کی ہری ہری شاخوں پر انواع و اقسام کے طیورِ ذی شعور کے پنجرے صفائی سے رکھے تھے۔ کچھ مُرغانِ خوش الحان و رنگین ادا آزادی و مطلق العنانی سے چمنستان بہجت افزا میں نیرنگیِ قدرتِ حق کا تماشا دکھاتے تھے کہیں طاؤس رنگین تمثال عشاق زار کے سینۂ ریش کی طرح داغ داغ شبِ طرب کا چراغ کہیں نوری قرمزی جس کی توصیف میں زبانِ ناطقہ لال کہیں طوطی شکریں مقال۔ حُلّہ پوشانِ بہشت کی طرح سبز پوش نکتہ پرداز ستم کوش کہیں فاختہ دشنگ زنان کہیں قمری کو کوکنان دور تک سبز کاشانی مخملِ بیش بہا کا فرش مکلّف بچھا ہوا تھا۔ صدر میں ایک تختِ خسروی پر تین کرسیاں رکھی تھیں۔ تینوں میں جواہرات ٹکے ہوئے۔ دیکھنے سے نظر جھپکتی تھی۔ آفتاب نصف النہار کے سمت چاہے انسان ایک نظر دیکھ بھی لے، مگر اس لمعہ نور کو بے خیرگی نگاہ دیکھنا محال تھا۔ اللہ ری ضو اور اُف ری چمک۔

اِن تینوں کرسیوں پر پولینڈ کی بلقیس مرتبت شہزادی اور وہ دونوں شہزادگانِ ثریا جاہ و خاقان کلاہ بصد شان و دبدبہ شاہی متمکن تھے۔ اِدھر اُدھر شہزادگانِ فریدوں کمر بیچ میں عروسِ نازنین رشکِ قمر۔

چہ فرخ کسی کو بہنگام دے | ہم آتش نہد پیش ہم مرغ دے
بتے نارپستان بدست آورد | کہ در نار بستان شکست آورد
ازان ناروں تا بوقتِ بہار | گہے نار خواہد گہے آبِ نار

بگیر دسرِ زلفِ آں دلستان زخانہ خرآمد سوِ گلستان
گل آگیں کنند چشمۂ قندرا
بشادی گذار دو می چندرا

لطفِ زندگی ہے تو یہ ہے ۔ اب سنیے کہ موسم ناؤ نوش فصل بہار ۔ اغل بغل دو شہزادگانِ جم اقتدار و گردوں مدار بیچ میں بانوئے گل عذار، نسرین نیاگوش، شوخ و جفا کار سامنے گلِ عذار سراپا بہار اور چشمہ سار لطافت بار اور شکر ریزی مرغانِ چمن زار ورامشگری طاؤسانِ مینا بال وروانی آب جوئبار اور عاشق و معشوق بادۂ مستی کے نشے میں سرشار شہزادی فرطِ مستی سے جھومتی ہوئی نشیلی رسیلی انکھڑیاں لڑاتی تھی ۔ کبھی زیرِ لب مسکرا کر ان دونوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی تھی ۔

قہر ہے آفت ہے یہ آنکھیں لڑانے کی ادا
خوب آتی ہے تمہیں فتنے جگانے کی ادا

اس عروسِ سراپا ناز نے اپنے دستِ سیمیں سے ایک خادمۂ با ادب کی طرف اشارہ کیا دم کے دم میں منتخب مرصع پری ناب کی گلابیاں چن گئیں ۔ شرابِ ناب کے آتے ہی ، وہ رنگ جما کہ سُبحان اللہ ۔

بادہ نوشانِ کہ بہم انجمنی ساختہ اند
شیشہ را یوسفِ گل پیرہنی ساختہ اند
مئ فروشانِ بدر میکدۂ مہر و وفاق
جرم خورشید شکستند و دلے ساختہ اند

بادہ نوشو چلو صلائے عام ہے ۔ اب محفل طرب آراستہ ہو گئی ۔ ہر سمت بادۂ سرخوش اور صراحی و جام ہے جدھر دیکھو چھوتی دو آتشہ شراب ہے ۔ جس رُخ نظر ڈالو می ناب ہے ۔ دور چلے اور رنگ جمے ۔

دلقِ تقویٰ اگر بادۂ جام است اینجا
سخنے بے می و معشوق حرام است اینجا

انواع و اقسام کی شراب جو ہمہ شما نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو ۔ خاص شہنشاہوں کے پینے کی محفل میں بوتلیں آتے ہی محفل مست ہو جائے ۔

ایں چہ بزم است کہ لب بر لب جام است اینجا
بادہ خورشید و قدح ماہِ تمام است اینجا

اب سُنیئے کہ ایک عاشقِ مظلوم وخستہ جان کی حاضری کا حکم ہوا۔ اور ان کے ساتھ ان کے پھٹو بھی بلوائے گئے۔ عاشقِ حزیں نے جو طلبی کا مژدہ پایا تو جامے میں پھولے نہ سمایا۔ سر کے بھل کوے جاناں کی طرف چلا۔ خنداں وفرحاں مست وغزل خواں۔

کوی پری رخاں میں تو جاتا ہے شاد شاد
برباد ہوگا یہ دلِ دیوانہ دیکھنا

اثنائے راہ میں ان دونوں نے باہم یُوں گفتگو کی۔

آزاد : آخر صبر تلخ کے نخل نے برِ شیریں کھلایا۔ شکر خدا۔

خوجی : ہم کو تو اس صبر نے بھی جوتیاں کھلوائیں۔ واہ ری قسمت۔

آزاد : معلوم ہوتا ہے اُن امردوں سے جی ہٹ گیا۔ آزاد پھر آزاد ہے۔ وہ حلوائے بے دود۔ کل کے لونڈے۔ مگر شکر خدا کہ پالا ہمارے ہاتھ رہا۔ ع

ہزار شکرِ خدا صد ہزار شکرِ خدا

پالا ہمارے ہاتھ رہا۔

خوجی : جب وہاں چلوگے تو تب معلوم ہوگا۔ خدمت گاری کرنا پڑے گی۔ خوجی اور آزاد پاشا میں نوک جھونک ہوتی آتی تھی۔

آزاد : یار اگر آج شراب کی تواضع کی نہ تو انکار کرنے والے کی بھی ایسی تیسی۔

من و انکار زمی ایں چہ حکایت باشد
غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

خوجی : منہ دھو رکھیے۔ حضرت شراب کی تواضع شیخ چلی ہو گئے۔ اپنے وقت کے۔ ارے میاں اپنے قدح کی خیر مناؤ بھیا۔

آزاد : تم تو ہو گدھے۔ آپ پٹوگے میرے ہاتھوں سے بیکار بیکار۔ آؤ بدتے ہو کچھ کچھ دیکھتے ہی اگر شراب نہ دے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں کیا دل لگی ہے۔ بدلو نہ کچھ۔ شراب پلا کے مست کر دے گی۔

خوجی : اچھا نہ بھائی تھوڑی سی ہمارے واسطے بھی چھوڑ دینا۔

آزاد : تم تو ہو مسخرے۔ تمہاری بات کا ہم بُرا نہیں مانتے۔

خوجی : میاں صاحبزادے عقل کے ناخن لُو ورنہ چھینکے میں ڈال کے دریا میں غرق کرا دوں گا۔ لاکھ پڑھ جاؤ اور لاکھ پڑھ جاؤ تجربہ کہاں سے لاؤ گے۔ ع

اک ذرا ہوش سنبھالو ابھی دنیا دیکھو

بیٹا جان. عقل بڑی کہ بھینس. جواب دیا کہ ابا گھوس سب سے بڑی جو بھینس کی بھی پرورش کرتی ہے. دوسرے آپ ہی کے سے ہونہار بولے. نہیں نہیں ابا سب سے بڑا بھیڑیا جس میں بھینس اور عقل دونوں رہیں. باپ نے سر پیٹ لیا کہ دونوں بیل ہی رہے.

آزاد: جو تمہاری بات کا جواب دے وہ سڑی. پاگل کے مُنہ کون لگے. واہی تباہی جو مُنہ میں آیا بکتا چلا جاتا ہے. تھوڑی دیر کے لیے ہم بھی ضعیف الاعتقاد بن کے فال نیک کے لیے جشن نوشابہ کی داستان پڑھتے ہیں. فال نیک کی فال نیک اور راستہ کا راستہ کٹے گا. ع

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

بجشنِ فریدوں و نوروز جم	کہ شادی ستر داز جہاں نام غم
جہاندار بہ نشست بر تخت خویش	نشستند شاہان سرافگندہ پیش
نوازندگان می دزدد و جام	برآراستہ دستِ مجلس تمام
مَی نوش و نوشابہ چوں شکر	عُروسان بگردش کمر تا کمر
برآن فحل اسکندر فیلقوس	نہ کرد التفاتے بہ بندیں عروس
یکے آنکہ خود بود پرہیزگار	دگر در حرم کردنتوان شکار
ہوا سرد و خرگاہ خورشید گرم	زمین خشک و بالین جمشید نرم

کباب تراز رانِ آہوی نر
نمک ریختہ آب را در جگر

یہ اشعار پڑھ کر اور اشعار پڑھنے ہی کو تھے کہ یکایک خیمہ فلک شکوہ نظر آیا. پہلے سخت متحیّر ہوئے، پھر خوش ہو کر یوں بولے.

آزاد: کوئی اندھا دیکھے کہ یہ خیمہ کس واسطے نصب ہوا ہے.

خوجی: کوئی بیوقوف سمجھے کہ ان دونوں حسین شہزادوں میں سے ایک کے ساتھ اس میں اُس عروس پری چہرہ کا نکاح ہوگا.

آزاد: اُس وقت جشنِ نوشابہ کے اشعار نے سرخرو کیا. انشا اللہ.

جہاں بلبلان را دریدہ دُہل   زنا محرمان روی پوشیدہ گُل

شدہ بُلبُلہ بلبلِ انجمن چو کبک دری قہقہہ در دہن
زبار یدنِ ابرِ کافور بار
سمن رُستہ از دستہائے چنار

خوجی: گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ سیّاں گھڑی دو میں مرلیا باجے گی (چٹکی بجاکر) باجے گی۔ اوہو!

آزاد: (دانت پیس کر) جی چاہتا ہے قتل کر ڈالوں۔ بھلا بے ٹھہر تو جا ذرا شادی ہو لینے دے پھر سمجھوں گا۔

خوجی: آپ کا کچھ اجارہ ہے۔ ہم اپنے گاتے ہیں۔ آپ سے کیا مطلب ہے۔ پولینڈ کی شہزادی پھنسی جائے لونڈوں سے۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ ایک لونڈا بہت سُندر دو جاتا پو کنہیا جی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ او میاں گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مگر سپاہی ساتھ تھے، قہرِ درویش بر جانِ درویش خاموش ہو رہے۔ خوجی کو شک کی جگہ یقین تھا کہ پولینڈ کی کسی شہزادی کے ساتھ آج نکاح ہے۔

آزاد: (سپاہیوں سے) کیوں بھئی یہ خیمہ تو بڑے ٹھسے سے آج یہاں نصب ہوا ہے۔ کیا ماجرا ہے۔ کیا کسی امیرزادے کی دعوت ہے۔ یا سامانِ شادی ہے۔

سپاہی: ہمیں حضور آپ سے باتیں کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہمیں معاف کیجیے۔ مگر حضور ہمارا قصور اس میں نہیں۔

خوجی: (مسکراکر) گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ وہ تو پسے تھے سو پس جاتے۔ پس گئے گھن کی طرح کبھی۔ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ از منِ بدریع چہ واسطہ صاحب من۔

خوش کرتی ہے دل دخترِ رز آ کے ہمیشہ
رہتی ہے دُلہن پاس یہ دولہا کے ہمیشہ
لب نے جو جلایا تو تیری آنکھ نے مارا
قاتل بھی رہا ساتھ مسیحا کے ہمیشہ

اُو گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ ع
ارے سفاک بے پڑ، ارے ظالم یہ کیا سُوجھی

بہت بُری سُوجھی خدا ہی خیر کرے۔

آزاد پاشا اور خوجی خیمہ کے اندر داخل ہوئے تو دونوں کا رنگ فق اور کلیجہ شق ہو گیا۔ آزاد نے جو اس پری زاد بہشتی نژاد کو اُن شہزادوں کی بغل میں اس جاہ وتجمل کے ساتھ دیکھا معاً شک کی جگہ یقین ہوا کہ اگر خوجی (گھڑی دو میں مُر لیا باجے گی) نہ گاتے تو یہ روز بد دیکھنے میں نہ آتا۔ ان کو یہ بھی یقین تھا کہ جشن نوشابہ کے اشعار ان کو فائز بمرام کرتے۔

آزاد ستم زدہ مصیبت رسیدہ نے بصد حسرت وارماں یہ اشعار پڑھے۔

نہانی در آن قصرِ زیبندہ دید بہشتی سرائے فریبندہ دید
پُراز حور آراستہ چوں بہشت بساطِ زمین گشت عنبر سرشت
زبس گوہریں گوش گردن کشاں شدہ بچشم بے نندہ گوہر فشاں
زتابندہ یاقوت رخشندہ لعل خرامندہ را آتشیں گشت نعل

مگر کان و دریا بہم تافتند
ہمہ جوہر اینجا دراند اختند

کیا دیکھتے ہیں کہ صدہا یوسف طلعت پریوں کا جمگھٹا ہے۔ جو ہے کم سن طرار و تیز ہے۔ جو ہے نوعمر و نوخیز ہے۔ دو رویہ جھمکڑا نظر آیا۔ نگاہ پھیلی جاتی تھی اور تمام محفل پر وہ رُعب چھایا ہوا تھا کہ خود آزاد کے جسم پر لرزہ سا تھا۔

کیا دبدبہ و رعب ہے العظمۃ للہ
شیر آنکھ چراتا ہے یہاں صورت رُوباہ

آزاد ابھی تک خیمے کی پہلی منزل میں تھے۔ اِن کو حکم دیا گیا کہ تا صدور حکم ثانی آگے نہ بڑھیں ابھی تک اُس رشک بتان چینی سرمایہ نازنینی کو ذرا بھی خبر نہ تھی کہ آزاد اور اُن کی دُم یہاں موجود ہیں۔ مگر۔

پرستند گان چوں خبر یافتند
بر بانوِ خویش بشتافتند

وہاں جا کر سات بار تخت کو بوسہ دیا اور دست بستہ عرض کیا کہ۔

رسولے رسید است بارائے ہوش پیام آوری چون فرشتہ خموش
زسر تا قدم صورتِ بخردی پدیدار از و فرۂ ایزدی

پرستندگانِ خرد آگاہ نے اِس خوف سے آزاد کا نام نہ لیا کہ مبادا ان دونوں سے مخفی رکھنا منظور ہو۔ لہٰذا ایلچی کے نام سے مشہور کرے۔

اب خوجی کا حال سُنیے۔ مسخر الدولہ بہادر تو تھے ہی آزاد اب چُہل اور دل لگی شروع کر دی۔

خوجی: (دبے دانتوں) ہر مُلک و ہر رسمے۔ اس ملک کی بھی رسم ہے کہ نوشہ جوتیوں پر کھڑے رہیں۔ آزاد بیچارے کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، اور نہ آزاد کے باپ بھگوے کی کسی کو فکر ہے۔ مجھ بد بخت نے عمر بھر میں آج ایک لڑکا بیاہا۔ اس میں بھی ذلّت ہی نصیب ہوئی۔ وائے ناکامی۔

آزاد: (جھلّا کر آہستہ سے) تمہارے باپ نامعقول کے ہاں بھی کبھی لڑکا پیدا ہوا تھا۔ خدا کے لیے اب دِق نہ کرو۔

خوجی: (بہ آواز بلند) گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

اِس آواز سے کل محفل ان حضرت کی طرف مخاطب ہوئی۔ اور آپ کی قطع مبارک دیکھ کر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اِن دونوں شہزادوں میں ایک کا نام کلیروفر تھا اور دوسرے نے اپنا نام میڈ پیکر بنایا۔ اور مشہور کیا کہ ہم دونوں بھائی ایران کے ایک صوبۂ داغستان کے شہزادے ہیں۔ مگر عرصہ دراز تک روم میں رہے اور وہاں رومی اور رُوسی اور فرانسیسی زبان حاصل کی۔

کلیروفر: یہ بونا کون ہے۔ واہ کس بے تکلفی سے گانا شروع کیا۔

میڈ پیکر: (شہزادی کو ایک جام دے کر)۔

بنوش بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

شہزادی: (جام لنڈھا کر) اِس بونے کو بلواؤں۔ بشرطیکہ اجازت ہو۔ کوئی اُس بونے کو بلالو۔ کہو سیدھا ہمارے تخت کے پاس آئے۔ خادمہ گئی۔ میاں چلو میاں ٹھگے بونے حضور یاد کرتی ہیں۔ خوجی اکڑ گئے فرمایا سُنیے ہم آزاد منش آدمی ہیں۔ سامنے جا کے جھکیں گے نہیں نہ سلام کریں گے۔ اگر منظور ہو تو چلیں ورنہ خیر صلاح۔ اجازت دی گئی کہ آئیں۔ خواجہ صاحب خوب تنتے ہوئے تشریف لائے۔ ایک کرسی پر میڈ پیکر کے قریب جا بیٹھے۔ شہزادی گردن پھیر کر مسکرائی۔ دونوں شہزادے کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔ آزاد کی یہ کیفیت تھی کہ مارے ہنسی کے لوٹ رہے تھے۔ اب خواجہ صاحب گردن اُٹھا اُٹھا کر چوطرفہ نظر ڈالتے ہیں۔ کبھی استادہ ہو کر کل محفل کو دیکھا کیے۔ اور زور سے کھنکھارا کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

کلیروفر : ماشاء اللہ! قطع شریف دیکھیے۔
میڈپیکر : آدمی کیا جانگلو ہے۔
خوجی : ہمارے خدمت گار کو بلاؤ۔ آزاد نام ہے۔
شہزادی : چُپ خبردار۔

مس میڈا اور مس کلبرسا

خواجہ صاحب نے دونوں ٹانگیں کرسی پر رکھ لیں۔ اکڑوں ہو بیٹھے۔ اس پر پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور خواجہ صاحب نے ہانک لگائی۔ ہمارے غلام کو جو اکڑا ہوا سامنے کھڑا ہے، بلاؤ۔ شہزادی نے دانتوں کے تلے اُنگلی دبائی اور کہا خبردار دو بار تو کہا اب نہ کہنا۔ ورنہ اس وقت دو ایک کا خون کر ڈالے گا۔ یہ کہہ کر دو گران ڈیل جوانوں کو جو مسلح تھے بلایا اور آہستہ سے حکم دیا کہ اس مرد خونخوار کو دیکھتے رہنا اس کے تیور بُرے کڑے پڑ رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو دو چار کا خون کر ڈالے۔ دونوں سپاہی ٹکٹکی باندھے اُسی سمت دیکھا کیے۔ خواجہ صاحب نے اشارے سے بتایا کہ میں پیاسا ہوں۔ خدام خوش سلیقہ فوراً جام بلور میں پانی لائے۔

خواجہ : اُونچے ہوکے پلاؤ ورنہ انکار بحث ہے۔ بس اب سمجھو یا نہ سمجھو۔
خادم : حضور پانی حاضر ہے۔ حضور کی بات چیت کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ پانی ہی مانگا تھا نہ۔ پانی حاضر ہے۔
خواجہ : پانی کو لے کر کیا کریں ہم چاٹیں۔ حُسن بے نمک یعنی چہ۔ کچھ نہیں۔

حُسنِ نمکین کو لے کے چاٹیں
جب زیست ہی اپنی بے مزہ ہو

خادم : اب تک تو خیر ہماری زبان ٹوٹی پھوٹی بولتے تھے اب خدا جانے کس زبان میں گالیاں دینے لگے۔
خواجہ : ایک میز سامنے لاؤ۔
خدام : ایک میز لے آئے۔ کہا میز حاضر ہے۔ خداوند لیجیے۔
خواجہ : اس کے اوپر ایک کرسی رکھو۔ اس پر ایک مونڈھا

کُل احکام کی تعمیل کی گئی تو حضرت نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ مونڈھے پر جا کر کھڑا ہو۔ یا الٰہی وہ بیچارہ تخت سے میز پر اُچکا اور میز سے کُرسی پر کُرسی سے مونڈھے پر۔ اس کے ہاتھ میں صراحی زرین تھی اور کہا ایک ایک قطرہ آب سرد کا ہمارے دہان پاک میں چواتا جا۔ ایک ایک قطرۂ آب آہستہ آہستہ میاں خواجہ بدیعا صاحب کے دہان پاک میں چوایا جاتا تھا۔ خلقِ خدا بے اختیار ہنستی تھی اور چوطرفہ سے آوازے کسے جاتے تھے۔

ایک : بھئی واللہ یہ نئی گڑ ہٹ کی پلائی ہے۔ ماشا اللہ۔ واہ واواہ۔

دوسرا : یہ خدا جانے کس ملک کے آدمی ہیں۔ عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہیں۔

تیسرا : آدمی! آدمی اسے کون کہتا ہے۔ اجی جنگلی کہو۔

چوتھا : کیوں صاحب یہ کسی بڑے مہذب ملک کا چنڈول ہے۔ بعینہ آدمی کی سی حرکتیں ہیں مگر پانی عجب قطع سے پیتا ہے۔

پانچواں : ہم بتائیں۔ واللہ پرکھ گئے یہ کسی پہاڑ کا جنور ہے۔

چھٹا : خوب سوجھی مگر پہاڑ کے دامن میں رہتا ہے۔

اور جو پانی آبشاروں سے گرتا ہے۔ منہ کھول کر پیتا ہے۔ جب ہی دور سے پانی پینے کا عادی ہے۔

شہزادی : (ہنس کر) اب یہ آخر کب تک پانی بییا جائے گا۔

کلیروفر : اس قطع سے تو شاید کل تک بھی پانی نہ پی چکیں۔

ہیڈ بیچر : ہم تو اس گردن کے قائل نہیں جو ٹھکتی ہیں۔

خادمہ : حضور یہ کوئی بڑا مسخرہ ہے۔ قطع تو دیکھیے۔

شہزادی : اے یہ وہی موا مسخرہ ہے۔ جو ہمارے ساتھ شادی کرنے کی فکر میں تھا۔ لڑ پڑتا۔ اُزاد کے ساتھ تھا نہ۔

خادمہ : حضور میں۔ اخاہ یہ تو ہمارے ساتھ بھی شادی کرتے تھے مگر میں تو جانتی ہوں کہ آج شاید ہی پانی پی چکیں۔ کل حاضرین کی نظر خواجہ بدیع الزمان صاحب کی طرف تھی مگر یہ میرا شیر گردن اُٹھائے ایک ایک قطرہ پی رہا تھا۔ دنیا بھر ہنستی تھی۔ لیکن کیا مجال کہ ان کے لب پر ذرا ہنسی آئے۔

ایک : اجی پانی پی چکے حضرت (ہلاکر) پانی پی چکے صدائے برنخاست۔

دوسرا : ارے میاں دُنیا میں کوئی اور کام بھی ہے یا نہیں۔

تیسرا : اجی حضرت یہ پانی کب تک پیا کیجیے گا۔ کچھ حد بھی ہے۔

چوتھا : اب ان کی یہ سزا ہے کہ میز اور کرسی سب ان پر پھینک دے۔

جو خدمت گار پانی پلاتا تھا اس نے کہا حضور طبیری بدلی ہو جاتے۔ یہ صراحی برسوں تک خالی نہ ہوگی ایک ایک قطرہ کر کے کہیں دو دن میں اتنی بڑی صراحی خالی ہو گی۔ الامان الامان۔ ہاتھ تھک گئے۔

کلیروفر : تمہارے ہاتھ تھک گئے مگر ان کی گردن نہ تھکی۔

شہزادی : اگر ان کی گردن تھک جاتے تو تم کو کچھ انعام دیں۔

کلیروفر : واہ تھک چکی۔

خدمتگار : حضور ان کی گردن میں تو کھٹکا لگا ہے۔ وہ کیا تھکے گی مگر مجھ کمبخت کا ہاتھ جڑ سے ٹوٹ کے گر پڑے گا۔

کلیروفر نے کہا اس کے ساتھ کوئی اور آیا تھا وہ سامنے کھڑا ہے اس کو بلا کر اس کا حال دریافت کیجیے۔

شہزادی : اس کو کرسی دینی ہوگی۔ اور یہاں اب کرسی کی گنجائش نہیں۔

کلیروفر : کچھ پروا نہیں سامنے ایک کرسی بچھا دینا۔ اللہ اللہ اب تک گردن کا کھٹکا بدستور ہے۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ کیا کھٹکا ہے۔

شہزادی : اچھا ہم جا کے اس آدمی سے بطور خود دریافت کرلیں۔ یہ کہہ کر شہزادی چمکتی ہوئی اٹھی۔ اور اٹھکھیلیاں کرتی، ناز و ادا سے قدم دھرتی ہوئی خیمے کے باہر گئی۔ اُدھر کلیروفر اور میڈ پیکر میں باہم گفتگو ہونے لگی۔

کلیروفر : بہن اللہ جانتا ہے ہمارے آزاد بہت بُرے پھنسے۔

میڈپیکر : اُفوہ کچھ ٹھکانا ہے۔ ہمارے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ یہاں آ کے پھنسے ہوں گے۔ اللہ اللہ۔

کلیروفر : مگر بونا اپنے مسخرے پن سے خوب ہنساتا ہے۔

میڈپیکر : ذری ہماری خاطر سے ایک باری آزاد پر نظر تو ڈالو۔

اب سُنیے کہ باہر جا کر شہزادی نے سبز پوش خادمہ کو بھیج کر آزاد کو بلوایا تو کلیروفر اور میڈپیکر دونوں کا ماتھا ٹھنکا (اغلب ہے کہ ان دونوں نوجوان اور حسین و مہ جبین شہزادوں سے ناظرین واقف

ہوگئے ہوں) اور سمجھ گئے ہوں کہ یہ دونوں اصل میں کون ہیں اور بھیس بدل کر کیوں آئے ہیں۔ اور کلیروفر نے (بہن) کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ خیر آزاد پاشا باہر گئے تو خادمہ ان کو کوٹھی میں لے گئی۔ مگر وہ دونوں گرانڈیل جوان برہنہ تلواریں لیے ان کے اغل بغل تھے۔ محلِ معلّیٰ کے اندر پہنچ کر آزاد نے دیکھا کہ وہ پری بصد شانِ دلبری ایک تخت جواہر نگار پر متمکن ہے۔

آزاد: (سلام کرکے) یہ شعر بے اختیار زبان پر لاتے۔

کوچے سے تیرے اُو بتِ ناآشنا چلے
آئے تھے رنج و درد اُٹھانے اُٹھا چلے

شہزادی: پھر کس کے کرتوتوں۔ خود کردہ را چہ علاج۔

آپ ہی ظلم کرو آپ ہی شکوہ اُلٹا
خیر صاحب سمجھ اُلٹی ہے زمانہ اُلٹا

آزاد: اللہ اللہ یوں آنکھیں پھیر لیں۔ یہ طوطا چشمی۔ اے لاحول ذرا دو دو باتیں نہ ہوئی تھیں تو بگڑ گئیں۔ اے واہ۔

سنتے ہی نام وصل وہ پہلو سے اُٹھ گئے
جھنجھلا کے طیش کھا کے بگڑ کے چھڑا کے ہاتھ

اتنے دن تک یہاں رہے اور اب تک ہمیں بیگانہ ہی سمجھا کیں۔

جوانانِ چمن اپنا نہ سمجھے آج تک مجھ کو
رہا باغِ جہاں میں مثل سبزہ سب سے بیگانہ

شہزادی: جب تم کو معلوم ہوا کہ ہم ان دونوں پر عاشق ہیں تو تم نے ان کو بُرا بھلا کیوں کہا۔ ہمارے پیارے کو جو بُرا کہے اُس کو ہم کیا سمجھیں۔

آزاد: خیر۔ مگر ان سے عشق کرکے پچھتاؤ گی بھی۔

ہزار ہوں گے اگر تم پہ جان جاں عاشق — ملے گا ایک نہ مجھ سا مزاج داں عاشق
تمہارے ظلم وستم سے خیال آتا ہے — کہ تم پہ کیوں نہ ہوئے بعد امتحاں عاشق
قدم جنون میں نکلتا نہیں جو زنداں سے — ہمارے پاؤں کی شاید ہیں بیڑیاں عاشق

تمہارے سائے سے بھی اب تو تنگ گذرتا ہے
نہ دیکھے ہوں گے کبھی ہم سے بدگمان عاشق

اللہ اللہ یہ دونوں لونڈے اور ہمارا رنگ پھیکا کردیں۔

راوی : ان دونوں امردوں کو پہچان تو لو۔ یہ ہیں کون۔

آزاد : یا خدا یہ کمبخت کہاں سے آئے۔

راوی : واسطے خدا کے کوسیے نہیں ورنہ پچھتاؤ گے یہی دونوں کام آئیں گے۔ گھبرایئے نہیں۔

شہزادی : اگر تم یہ اقرار کرو آدمیت سے رہو گے تو ہم تم کو معاف کردیں۔ مگر صدق دل سے کہو۔

آزاد : اب ہم رہائی کے طالب ہیں۔ ان دونوں پر جس وقت نظر پڑتی ہے۔ خون آنکھوں میں اُتر آتا ہے۔

وصل ہوتا نہیں سوائے فراق — دیکھیے کب ہو انتہائے فراق
بے قراری یہ اے دل بے صبر — ابھی نادان ہے ابتدائے فراق
ہم کو اللہ سے ہے خواہش وصل — وہ کیا کرتے ہیں دعائے فراق
جس نے لکھا مرا خط تقدیر — وصل لکھا نہ کیوں بجائے فراق

لکھ چکا لاکھ داستان صفدرؔ
ابھی باقی ہے ماجرائے فراق

شہزادی : کوئی جاکے دیکھو تو کہ وہ بونا کیا کر رہا ہے۔ پانی پی چکا۔؟

آزاد : وہ بڑا بکا مسخرہ ہے۔ ابھی پی چکے گا۔

خادمہ : حضور ابھی تک پی رہا ہے اور پانی کیا معنی۔ ایک ایک قطرہ ایک ایک بوند پیتا ہے۔ مگر گردن ذرا ہلی تک نہیں۔ افوہ حضور آدمی کیا عجیب الخلقت ہے۔

شہزادی : اے آخر یہ کس بلا کا آدمی ہے۔

شہزادی کا اصل منشا آزاد کے بلانے اور سمجھانے سے یہ تھا کہ ان کا دل ٹٹولیں اور دیکھیں کہ ان کا دلی منشا کیا ہے۔ شہزادی کو خوف تھا کہ مبادا آزاد پاشا کسی روز جھلا کر ان دونوں شہزادوں کو قتل کر ڈالیں ان کی خواہش ہوئی کہ چلیتے یار بنائیں۔ ادھر کلیرو فرا اور میڈ ہیکر میں یوں گفتگو ہونے لگی۔

میڈ ہیکر : خواجہ صاحب ہم کو پہچانا۔ ہم کون ہیں۔

راوی : خواجہ صاحب پانی ہی پی رہے ہیں۔

میڈ ہیکر : او پانی پینے والے متوالے۔ ذرا مطلب کی تو سُن لو۔

راوی : سُنئ اس کی بلا۔ اس پر جھلا کر ہیڈ پیکر نے خوجی کو کرسی پر بٹھا کر کہا۔

ہیڈ پیکر : مس روز نے بھیجا ہے کہ جا کے ہمارے میاں کو لاؤ۔

خوجی : (آنکھیں کپڑے سے صاف کر کے) کیا مس روز۔

ہیڈ پیکر : پہچانا۔ ادھوڑی استر کی عینک لگاؤ۔

خوجی : مس میڈا۔ ہیلو۔ مس میڈا۔ خوب ملیں۔ خوب ملیں۔

میڈا : چُپ چُپ خبردار اس شہزادی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ہم دونوں اسی غرض سے آئی ہیں کہ آزاد کو اس قیدِ فرنگ سے بچائیں اور چھٹکارا دلوائیں۔

خوجی : واللہ ازیں چہ بہتر۔ کیا یہ بھی عورت ہیں۔

میڈا : یہ وہی عورت ہیں جو آزاد کو گرفتار کر لے گئی تھیں۔

خوجی : اخاہ! مس کلیرسا۔ ان کا بایاں قدم کدھر ہے۔ یہ تو اس قابل ہیں کہ ان کا بایاں قدم لیں۔ مگر چُپ چاپ۔ خاموش۔ الخاموشی نیم رضا۔ ع

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

دو چیز طیرۂ عقل است لب فرو بستن
بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

اب آپ ایک کام کیجیے یہ شہزادی بڑی پینے والی ہے۔ جس قدر پلائی جائے پلاؤ اور بیہوش کر کے لے اڑو۔ ورنہ اس کے مقابلے میں دال نہ گلے گی۔

ہیڈ پیکر : اچھا اب تم کوئی مسخرہ پن چھیڑو۔

خوجی : یہ تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ یاروں کے نزدیک یہ کون مشکل بات ہے۔ اب ہم علم موسیقی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ہمہ تن گوش۔

مرد وارستہ کہیں قید مکان رکھتا نہیں
طائر نکہت خیالِ آشیاں رکھتا نہیں
روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا بہر خلق
صبحِ پیری شامِ غم گو آسماں رکھتا نہیں

رشک ہے جن کا خدا کو بھی یہ وہ ہیں زاہدا
کچھ تو دیکھا ہے جو ہیں ترکِ بتاں رکھتا نہیں
ہوں میں دیوانہ ہو اگر چپ تو چپ ہی رہ گیا
اس لیے میں ایک دم ضبطِ فغاں رکھتا نہیں
رحم کر عشاق پر گر چاہیے عُمر دراز
پیرِ گردوں طفلِ ظالم کو جواں رکھتا نہیں
کیا خرابات جہاں ہے اپنی توبہ سے خراب
کوئی بھی اب مے فروشی کی دُکاں رکھتا نہیں
عیب اپنے آپ کر دیتے ہیں ہم بدمست فاش
شیشۂ مے جس طرح مے کو نہاں رکھتا نہیں

اتنے میں ایک خادمہ آئی۔

خادمہ : حضور زور زور سے نہ گائیں۔

خوجی : وجہ۔ اس کا کیا سبب۔ ہم ضرور گائیں گے۔

خادمہ : شہزادی آکے خفا ہوں گی۔

یہ سُنا تھا کہ خوجی اور بھی غل مچانے لگے۔

ہائے یہ کہنا ترا رکھ کر مری چھاتی پہ ہاتھ
اب تو اس دم نالۂ آتش فشاں رکھتا نہیں
جامِ مے میں دیکھتا ہوں میں جہاں کو مثلِ جم
گوشہ طرح سیرِ جہاں رکھتا نہیں
ہے میاں یار ممکن جسم ناسخ ممتنع
عشق ایسا بھی کسی کو ناتواں رکھتا نہیں

کلیرسا : یہ اس وقت آزاد کو اپنے ساتھ کیوں لے گئی۔

متیڈا : ہاں خدا جانے کیا سبب ہے۔

کلیرسا : ایسا نہ ہو کہ تمہاری چشمک زنی یا اشارہ بازی سے سمجھ گئی ہو۔

متیڈا : میں نے تو آزاد کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا تک نہیں۔

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سُن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں تمہیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

یہ باتیں ہوتی ہیں کہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ بہشت کی لپٹیں آئیں۔ اور پیچھے پھر کر دیکھا تو شہزادی۔

از کجا مے آئی اے سرمستِ خوبی محوِ ناز
عطر آگیں تا بدامن عنبر افشاں تا کمر

کلیرسا : اِن کے ساتھی کو یہاں چھوڑا۔ یہ بے قرار ہیں۔
شہزادی : اے یہ اب تک پانی ہی پی رہے ہیں۔
راوی : غزل گا کر پھر بدستور پانی پینا شروع کیا۔

اتنے میں آزاد پاشا بھی محفل میں داخل ہوئے تو زبان پر یہ شعر تھا۔

غیر کا دل نہ دُکھایا ہم نے
رنجِ دشمن بھی گوارا نہ ہوا

خوجی : (شہزادی سے) ؎

گر فروتر نشست خاقانی
نہ مرا عار نے ترا ادب است

کا نقشہ ہے مگر۔ ع

قل ہو اللہ کہ وصفِ خالقِ ماست

حضرت سلامت ہم اُوپر یا نیچے بیٹھنے کو خاک نہیں مانتے۔ مگر ہمارا غلام بمنزلہ جدّ امجد کے ہے۔ لہٰذا آزاد کو بھی ہمارے قریب جگہ دی جائے۔
مس میڈا : اچھا کیا ہرج بُلالو۔ فرمائیے کون شکل صورت سے شریف زادہ معلوم ہوتا ہے۔ آئندہ آپ جانیں۔
شہزادی : اچھا بُلالو۔ کہو بونے کے قریب جاکے کھڑا رہے۔

آزاد پاشا خوجی کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہوتے تو خوجی اکڑ گئے آہستہ سے بولے۔ (یاد رکھنا) کیوں بیٹے۔ بوڑھے اور تجربہ کار آدمی کس طرح گھس بیٹھ کر انتظام کر لیتے اور رنگ جما لیتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہمیں اس وقت مس میڈا یاد آئی ہے۔ اُس بیچاری نے جی بھر کے تم سے بات بھی نہ سُنی۔

جی بھر کے نہ دیکھیں کبھی ساقی تری آنکھیں
اس مے سے نہ لبریز ہوا جام ہمارا

لطف تو جب تھا کہ تم بوسے لیے جاتے اور وہ جھلا جھلا کر کاٹ کاٹ کھاتیں. جس طرح مس کلیرسا نے کیا.

ہم بوسے لیے جائیں گے تم وار لگاؤ
یہ کام تمہارا ہے تو وہ کام ہمارا

آزاد نے کسی قدر شرم اور کسی قدر غصّے کے ساتھ، کنکھیوں سے ان دونوں رقیبوں پر نظر ڈالی تو خوجی نے کہا۔ ؏

اے گل بتو خرسندم تو بوی کسی داری

خوجی : اِدھر والے کی صورت کسی سے ملتی ہے.

جلوہ گر آئینہ میں پرتو ترا کیوں کر ہوا
تو تو یکتا تھا یہ پیدا دوسرا کیوں کر ہوا

اِدھر مس میڈا ازن طفل بمانے مے کی گلابیوں کی طرف نظر ڈالی اور شہزادی نے ان دونوں سے اختلاط شروع کیا.

شہزادی : یہ جو سامنے کھڑے ہیں، یہ بھی ہمارے عاشقوں میں ہیں. شانِ خدا. حلوا خوردن را روئے باید. ؏

ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسی

ایک دن ہنسی ہنسی میں میں نے کہہ دیا تھا کہ تم خوبرو جوان ہو. بس تب سے سمجھنے لگے کہ ہم پر مرتی ہیں.

میڈا : ہے تو جوان خوبرو. ہاتھ پاؤں کیسے خوبصورت ہیں.

کلیرسا : سینہ شیر کا سا ایسا چھتیت بھی نہیں دیکھا.

شہزادی : ارے! اور سُنیئے. یہ تو خود تعریف کرنے لگے.

میڈا : بھلا اتنے یہاں کھڑے ہیں. کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا ہے.

لاکھوں میں انتخاب کروڑوں میں لاجواب

کلیرسا : آپ نے اس شخص کو اپنی محفل میں طلب کیوں کیا. اگر معتوب ہے تو یہاں بلانے

کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر صُلح منظور ہے تو اس سے بہتر اور کون وقت ہوگا۔

ہر چند چاہتا ہوں نہ بولوں میں یار سے
قابو میں اپنے دل کو نہ پاؤں تو کیا کروں

مٹیڈا: (مُسکرا کر) لگی بُری ہوتی ہے۔

کلیرسا: یہی تو سارا بکھیڑا ہے۔ دل تو قابو سے باہر ہوگیا ہے۔ مگر ظاہر میں غصہ اور خفگی ہے۔ پھر۔ ع

معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

شہزادی: نہیں نہیں۔ کہیں یہ سمجھ نہ لینا۔ تم دونوں پر میری جان جاتی ہے۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو ستم ہو جائے گا۔ میں اپنی جان دوں گی۔ آزاد چاہے رہیں چاہے جائیں۔

پھوٹ

تھانہ دار اور ثریّا بیگم نے اُس کہسار میں بڑا لطف اُٹھایا۔ یہ مکان چوطرفہ پہاڑوں سے ڈھکا تھا۔ چھت پر سے وہ آسمان نظر آتا تھا کہ سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ چوطرفہ پہاڑوں کی کالی کالی چوٹیاں اور اُن پر ہرا ہرا سبزہ، ہرن کلیلیں بھرتے تھے۔ انواع و اقسام کے جانور آزادی اور مطلق العنانی سے ہوا پر اٹھکھیلیاں کرتے تھے۔ تھانہ دار اور ثریّا بیگم پہاڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔

ثریّا بیگم: اللہ جانتا ہے برسوں سے سیّاحی کی ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں پھرے اور کیا کیا دیکھا۔ مگر یہ سماں آج تک کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ مگر۔ ع

بہار بے تو برنگ پریدہ می ماند

سب ہیں مگر جسے ہم چاہتے ہیں وہی نہیں۔

صراحی بھی ہے مُل بھی لالہ و گل بھی ہے مطرب بھی
الٰہی وہ بھی آجائیں جنہیں ہم یاد کرتے ہیں

تھانہ دار: بس یہی مقام ہے جہاں نکاح ہونا چاہیے۔ مولوی صاحب بھی موجود ہیں۔ کل دریا اور سمندر کا حال بتاتے تھے۔ دیکھو ثریّا بیگم لڑکپن سے تم پر ہم جان دیتے ہیں اور تم بھی ہم پر عاشق زار

تھیں۔ آپ کی ہنسی دل لگی، چھل، مذاق، سب وہی ہے۔ لیکن وہ لگاوٹ بازی نہیں۔ کیا کسی سے نکاح ہو گیا ہے۔ تم اپنا حال تو بیان کرو۔ اب تک تم رہیں کہاں اور کیا کیا کیں۔ اور کس طرح بسر کی۔

ثریا بیگم : اب مفصل حال سنو جب وہ بوڑھا کھوسٹ موا تو ہم نے مسجد میں گھی کے چراغ جلائے کہ اب کسی نوجوان کے ساتھ بیاہ ہوگا۔ ادھر ادھر تاک جھانک کرنے لگے۔ کئی مشاطہ آئیں۔ ان سے باتیں ہوئیں۔ ایک نوجوان مشاطہ نے آن کے کہا کہ یہاں سے چار کوس پر ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک سید رہتے ہیں۔ بیس برس کا سن ہے۔ اور خوبصورت جوان ہیں۔ مسجد میں رہتے ہیں۔ اور قرآن خوانی کرتے ہیں۔ رات دن عبادت خدا میں مصروف رہتے ہیں۔

تھانہ دار : اے سبحان اللہ وہی آپ کے قابل تھے۔

ثریا بیگم : میں نے کہا کسی رئیس زادے کا نام لیجیے۔ کیا ایسے ویسے ٹکلچیوں کا ذکر کرتی ہو۔

تھانہ دار : جی کسی شہزادے کا نام لیا ہوگا۔ پھر منظور نہ کیا آپ نے۔

ثریا بیگم : یا سنو یا دل لگی کرو۔ بس اس نے مجھ سے کہا کہ اچھا ہم ایک اور تجویز یں گے۔ دوسرے روز ایک رئیس کا نام لیا۔ کہا ستر روپیہ ماہواری وثیقہ ہے۔ عالی خاندان ہیں۔ نواب تفقد الدولہ بہادر کے خاندان سے ہیں بیس اکیس برس کا سن اور قبول صورت ہیں۔ پھسل گئی۔ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔

تھانہ دار : اے ہے۔ اب تو پھسل جایا ہی چاہیں۔

ثریا بیگم : ہم نے ان کو دیکھا۔ انھوں نے ہم کو دیکھا۔ ادھر ہم ادھر وہ۔ شادی پر آمادہ ہوئے مگر شادی نہ ہونے پائی۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس کے باپ نے کہا کہ اگر تم ثریا بیگم بیوہ کو بیاہو گے تو ہم گھر سے نکال دیں گے۔ اور پھر کبھی تیرا منہ نہ دیکھوں گا۔

(ثریا بیگم نے بیان کیا) کہ محلے کی عورتوں نے ہمارے ہاں آنا جانا شروع کیا۔ محلے بھر کی جتنی چھٹی ہوئی شہدی عورتیں تھیں ان سے ہم سے محبت ہوگئی۔ ایک منہارن آتی تھی۔ مالی منہارن زمانے بھر کی شہدی۔ خوشجان کنجڑن چھوکری رجبی شہر بھر کی آوارہ ہردیا سنارن۔ شیبو چرنا کی بہن جو دن بھر کوٹھے ہی پر ٹنگی رہتی تھی۔ کندیا مچھلی والی جس نے تین شادیاں کیں اور تینوں شوہروں کو نکال باہر کیا۔ راستے میں جب چلتی تھی ٹھنتی ہوئی۔ چھم چھم چھم چھم۔ اور سنیے! وہ تمام زمانے کی گھومنے والی عورت کیا وہ بھی آتے لگی۔ اب صبح و شام ہم ہیں اور محلے کی عورتیں۔ شغل کیا

ڈھول بج رہا ہے۔ گانے ہو رہے ہیں۔

تھانہ دار: یہ کہیے۔ یہ ہمارے جانے کے بعد کُھل کھیلیں اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔

ثریّا بیگم: تم خدا جانے اس زمانے میں کہاں تھے، اتنا سُنا تھا کہ باہر ہیں۔ پھر سُنا نوکر ہو گئے، پھر سُنا کسی میم صاحب کو پڑھاتے ہیں۔

تھانہ دار: ہاں یہ سب صحیح ہے ایک پادری صاحب کی میم کو پڑھاتا تھا۔

ثریّا بیگم: پھر اس کے بعد کہاں جہنم میں چلے گئے تھے کہ آئے نہیں۔

تھانہ دار: لو اور سُنو تمہارے میاں کی وفات کے بعد ہم آئے تھے۔ تم کو یاد ہی نہیں۔

ثریّا بیگم: ہاں ہاں اے لو خوب یاد آیا۔ جب تم آئے تو ابّا جان نے کہا کہ لوگ طعنے دیں گے کہ دوسری شادی کی۔ کل داماد مرا آج بیٹی پھر بیاہی۔

تھانہ دار: جو ہم کو معلوم ہوتا تو ہم اُس بُوڑھے کو زہر دے دیتے۔

ثریّا بیگم: یہی تو ہم کو چاہیے تھا ہم نے اُس کو تو زہر دیا نہیں مگر خود زہر کھا لیا۔

تھانہ دار: اور بچ بھی گئیں۔ ارے غضب۔

ثریّا بیگم: اے تو کچھ زہر تھوڑا ہی کھایا تھا۔ مطلب یہ کہ جو باتیں شریفوں کی بہو بیٹیوں کو لازم نہیں۔ وہ کرنا شروع کیا۔ مگر عزت آبرو کے ساتھ۔

تھانہ دار: واللہ تمہاری تقریر ہماری سمجھ میں نہ آنے کی۔

ثریّا بیگم: مطلب یہ کہ گھر سے بھاگ گئے۔ منہارن کی چھوکری ہم کو بھرّا دے کے بھگا لے گئی۔ زیور وغیرہ جو لائی تھی وہ بھی گھوم گیا۔ اور اُلّو الگ بنے۔

تھانہ دار: اُفوہ تو یہ کہو بڑی مصیبت میں پڑی ہو۔ ہائے افسوس۔

ثریّا بیگم: وہاں سے ہم سرا میں جا کے رہے۔ یہاں بڑے لُطف اُٹھاتے۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

کوئی تو یہ گا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔

غزالِ دشت بُولے دیکھ کر مجنوں کی میّت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ایک مولوی صاحب جو شعر بھی کہتے تھے وہ ہمارے پاس آنے لگے۔ انھوں نے ہم کو اشعار سکھائے۔

ایک سے ایک بڑھ کے۔

کیوں نام کفن سُن کے لرزتا ہے انیسؔ
اِک دن یہ قبا زیبِ بدن ہوتی ہے

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ وہ مولانا صاحب جو دریا اور بخار اور چشمہ سار کی ماہیت بتاتے تھے۔ سامنے آن موجود ہوئے۔

تھانہ دار: السلام علیکم جناب مولانا بالعلم والفضل اولٰنا۔

مولوی: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج مقدس۔

تھانہ دار: کیوں جناب مولوی صاحب ایک مسئلہ کی نسبت کیا راتے ہے۔

مولوی: فرمائیے تو میں جواب عرض کروں۔

تھانہ دار: ایک عورت نے جس کا شوہر بوڑھا اور اس کے سن سے کہیں زیادہ بلکہ اُس کے ابّا جان کا ہم سن تھا۔ ایک پڑوسی سے جو جوان صالح اور پابند صوم وصلوٰۃ ہے۔ اقرار کیا کہ شوہر پیر کی وفات کے بعد میں تمہارے ساتھ شادی کروں گی اور جبکہ وہ شوہر پیر مر جائے اور عورت شادی نہ کرے تو کیسا۔

مولوی: سوال یہ ہے کہ آیا وقتِ وفات شوہر پیر وہ مرد وہاں تھا یا نہیں۔

ثریّا بیگم: آپ اِن کی باتوں میں نہ جائیے۔

تھانہ دار: تو پھر اب نکاح ہو جائے۔ اب عرصہ نہ ہو۔

ثریّا بیگم: یہ تو ہونے سے رہا۔

تھانہ دار: سُنو بیگم صاحب ہم بے شادی کیے نہ رہیں گے۔ اس میں چاہے ہر چہ بادا باد۔ لیکن وجہ نہیں معلوم کہ اغماض کیوں کرتی ہو۔

ثریّا بیگم: صاف صاف وجہ بیان کرتے تھے وہ تم نے سنا ہی نہیں۔ سرا میں ایک شخص آن کے ٹکے میاں آزاد۔ گرانڈیل۔ قوی ہیکل خوش پوش۔ کشیدہ قامت۔ باوضع۔ تربیت یافتہ۔ لائق فائق عالم فاضل شاعرِ غرّا۔ سخندان بے ہمتا، نثار گرانمایہ۔ علمِ موسیقی کے اُستاد مسلّم الثبوت۔ اصنافِ سخن، اصنافِ فن پر قادر پھکیت ایسے کہ گتکہ ہاتھ میں آیا اور پرے کے پرے صاف بہ آیا وہ آیا۔ تڑ اور ہانک میں وہ دخل کہ اچھے اچھے پھکیت اس کے مقابل میں گرد ہو جائیں۔ اور بنوٹ کے تو بادشاہ تھے۔ کشتی میں آج تک کسی سے دب کے رہے ہی نہیں۔ لاکھوں میں انتخاب تھا۔ نک سُک سے دُرست

چھرے مہرے سے درست. کسی فن میں کم نہیں. ایک ... بڑے مہاجن ساہوکار بیرومل کی سوگھی نکلی. لاکھوں آدمی جمع تھے. دو چار ہمجولیوں نے کہا دیکھو اتنے آدمیوں میں کوئی آزاد کا ساجوان بھی ہے نہ ملا نہ ملار

تھانہ دار : کیا بات ہے اُن میں.

ثریّا بیگم : دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے. دیکھو تو معلوم ہو.

تھانہ دار : وہ ہیں کہاں.

ثریّا بیگم : روم گئے ہیں. لڑنے جنگ پر گئے ہیں.

تھانہ دار : اے ہے کسی تلنگے سے آنکھ لڑی تھی.

ثریّا بیگم : آپ کی بھی کیا باتیں ہیں.

راوی : یہ مکالمہ یاد رکھنے کے قابل ہے.

ثریّا بیگم : میاں آزاد تمام دُنیا میں مشہور ہیں جی.

تھانہ دار : ایسے مشہور ہیں کہ ہم نے کبھی سُنا ہی نہیں کہ کون تھے.

ثریّا بیگم : آپ اور آزاد. شانِ خدا. کجا تم. کجا وہ.

راوی : حق تو یہ ہے.

گفتۂ اشرف کجا و شعر فردوسی کہ نیست
باکمر بندِ مرصّع قدرِ شالِ طوس را

تھانہ دار : عقل کے ناخن لو. ہم عالی خاندان سادات شریف زادے. خدا جانے کس اُٹھاؤ چولہے کا نام لیا.

اتنے میں مولوی صاحب نے تھانہ دار کو مخاطب کرکے کہا. اجی حضرت کچھ اشعار سنائیے. ہم تو اُس دفعہ آپ کے شعر سن کر پھڑک گئے. لکھنؤ کے اشعار سنائیے مگر اعلا درجہ کے اشعار. تھانہ دار صاحب نے کہا کل تک پڑھتا جاؤں اس قدر شعر یاد ہیں سُنیئے!

یہ کہہ کے ابرِ شام میں ڈوبا وہ رشکِ ماہ | یوں چمکی پھر وہ تیغ کہ اللہ کی پناہ
آیا جو بیچ میں تو سمٹ آئی سب سپاہ | حربوں سے بند ہوگئی چاروں طرف کی راہ

پرکیا وہ ران پاک تھی کیا شہسوار تھا
دابا جہاں سمند کو فوجوں کے پار تھا

چھائی تھی ابر شام میں گھنگھور اُدھر گھٹا
یہ شیر جب اِدھر سے بڑھا زور اُدھر گھٹا
دریا کے اِس طرف سے اُٹھا شور اُدھر گھٹا
ڈھالوں کی تھی لہو میں شرابور اُدھر گھٹا
جان تھی تو اُس کے قبضے میں سر تھا تو نذر تھا
یہ آب شور تیغ کا مد تھا وہ جذر تھا

مولوی : کیا کلام دلکش ہے۔ جی خوش ہوگیا۔

تھانہ دار : لکھنؤ کے کلام کا کیا کہنا۔ اور سُنیئے۔

نکلی جو رن میں تیغِ حسینی غلاف سے
اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

لرزہ تھا تحت و فوق و جنوب و شمال میں
سکّان غرب و شرق تھے بیم و زوال میں
مضطر تھے شش جہت کے مکیں ایک حال میں
غل تھا کہ گھر گئے غضبِ ذوالجلال میں
شہ کا غضب نمونۂ قہر آلہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن وانس و ملک کے خلل پڑے
قلزم میں ڈر کے مردم آبی اُچھل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے ابل پڑے
بیرالعلم سے غول جنوں کے نکل پڑے
اُلٹی زمین سبھوں کے دلوں پر یہ ٹھن گئی
پریوں کے ہوش اُڑ گئے جانوں پہ بن گئی

اُٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور
مردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور
چلاتے گرگ و شیر و غزالان و مار و مور
ہے بازوِ حسین میں دستِ خدا کا زور
اُلٹے ہیں مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اے کردگار عرش بچالے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغِ شرر فشان
تھرّائے آسمان میں چھپتا تھا آسمان
غار اژدروں سے چھٹ گئے شیروں سے نیستان
برپا تھا برّ و بحر میں اک شورِ الامان
مانندِ موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر اک نہنگ کا پانی میں آب تھا

تاریک تھا چکاروں کی آنکھوں میں سب جہان
مضطر تھے شیر و گرگ نکالے ہوئے زبان
بن سے سیاہ گوش بھی بھاگے دبا کے کان
غل تھا یہ دام و دد میں کہ کیونکر بچے گی جان
تیغِ علی علم تھی جو دشت قتال میں
چیتوں نے منہ چھپاتے تھے گینڈوں کی کھال میں

مولوی صاحب کو ثریا بیگم نے اپنا پورا پورا حال کہہ سنایا تو ان کو سخت بیدلی ہوئی۔ اور یوں نصیحت کرنے لگے۔

مولوی صاحب: سنو بیٹی۔ دنیا عجب مقام ہے۔ یہاں انسان کو دم بھر آسایش نہیں۔ اگر اس وقت ہنس رہے ہیں تو تھوڑی دیر میں روتے ہوں گے اور اس وقت روتے ہیں۔ تو تھوڑی دیر میں ہنستے ہوں گے۔ جس نے کہا کہ (میں) (من) بس۔ (میں من) کے کہتے ہی ملک الموت نے صورت دکھائی۔ من کیا معنی۔ بس موت نے فوراً دبوچا۔

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
زجام دہر مے کلّ من علیہا فان

لیکن انساں کو لازم ہے کہ افعالِ نیک سے کنارہ کش نہ ہو۔

انسان وہی مقبول خدا ہوتا ہے
جو مسلکِ خیر میں فنا ہوتا ہے
قسّام ازل کا اِک اِشارہ بس ہے
دم بھر میں شہنشاہ گدا ہوتا ہے

تم شریف زادی ہوکے سرا میں رہیں۔

ثریّا بیگم : ہاں حضور اور وہاں اللہ رکھی نام ہوا۔

مولوی : واہ کیا فخر کی بات ہے اور کیا شرافت ہے۔

ثریّا بیگم : مولوی صاحب عمر بھر مصیبت سہی۔ سرا میں اُٹھ گئی کہ آزادی سے شاید دل بہلے تفریح ہو، مگر جو بات گھر گرہست کی ہے۔ وہ مال زادیوں میں کہاں۔

مولوی : ہائے افسوس اب سوچیں۔ دو لاکھ روپے کی بات تم نے کہی مگر اے کاش یہ بات اُس وقت سوچتیں جب گھر سے نکلی نہ تھیں تو خوب ہوتا۔ اب مشتی کہ بعد از جنگ یاد آید برکلّہ خود باید زد۔ لیکن اب تم یادِ خدا کرو اور کسی شریف زادے کے ساتھ نکاح پڑھوا لو۔

ثریّا بیگم : (آبدیدہ ہوکر) کیا عرض کروں۔ جان عذاب میں ہے۔ ہائے میں نے یہ کیا کیا۔ یہ مجھے کیا سُوجھی۔ اب اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتی ہوں۔ مٹی خراب ہے۔

مولوی : گو میں نہ مانوں گا کہ تمہارے شیشۂ ناموس میں بال نہیں پڑا ہے۔ اِس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اب تم نے توبہ کی ہے، اور یہ بھی غنیمت ہے۔ ہزار غنیمت ہے۔

اتنے میں تھانہ دار صاحب تشریف لائے۔ کہا اور کچھ سُنایئے۔ مولوی صاحب نے بدلائل قاطع وہ وہ باتیں کیں کہ ثریّا بیگم آبدیدہ ہوگئیں۔ کہا مولوی صاحب بس کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ کہ دل پر کیسی گذرتی ہے۔ کون کون باتیں یاد آتی ہیں۔ ہائے ہائے ہم اور اِس پہاڑ میں۔ ہم اور اِس میدان میں ہم اور بیڑن کہلائیں۔ ہم اور شبّو جان بنیں۔ ہم اور اللہ رکھی بھٹیاری مشہور ہوں۔

مولوی : اب تم پر فرض ہے کہ نکاح کر لو۔

ثریا بیگم : حضور اس میں ایک امر مانع ہے۔ جو میں عرض نہیں کر سکتی۔

مولوی : اب جو کہا تو پھر سب بیان کرو۔ یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کیا معنی۔

ثریا بیگم : حضور ایک شخص ہیں آزاد نامی۔

مولوی : میں اُن کے نام سے واقف ہوں۔

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بُوسے مری زبان کے لیے

ثریا بیگم : حضور کچھ اُن کا حال بھی معلوم ہے۔

مولوی : ہاں ایک انگریزی اخبار میں ہم نے اُن کی تصویر دیکھی۔ سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ دس ہزار کے بادِ پا سمندِ صرصر تگ پر سوار۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیر ہے یہ کلائی۔ یہ چوڑا سینہ ہے خاصہ شیر بنا ہوا۔

ثریا بیگم : (رو کر) پھر اب میں کیونکر شادی کروں بھلا یہ کوئی شادی کا موقع تھا۔ میں تو اُس کے نام پر اُدھار کھائے بیٹھی ہوں۔ اور ایک باری جوگن ہو چکی ہوں۔

مولوی : کیا عقد ہو گیا ہے یا آزادی کی حالت میں۔ برا نہ ماننا۔ ایک بات پوچھی ہے۔

ثریا بیگم : جی نہیں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ مگر اللہ کی قسم کھاتی ہوں کہ آج تک میں کسی مرد سے واقف نہیں ہوں۔ اب چاہے یقین آئے چاہے یقین نہ آئے۔ مگر آزاد کے بغیر کسی کے ساتھ نکاح ہو یہ محال ہے یہ نہ ہو سکے گا۔

مولوی : شاباش۔ ہم اس بات سے بہت خوش ہوئے۔

اب سُنیے کہ تھانہ دار صاحب چپکے چپکے سب باتیں سن رہے تھے۔ ان کو نکاح میں شک نہ تھا۔ یقین تھا کہ آج نہیں کل نہیں پرسوں نہیں نرسوں۔ ایک نہ ایک دن اس پری کے ساتھ شادی ضرور ہوگی۔ جب آزاد کا حال سنا اور معلوم ہوا کہ اُس جوانِ رعنا پر عاشق ہے۔ تو مایوسی ہو گئی۔ آہ سرد بھر کر دل ہی دل میں سوچے کہ یہ کیا ستم ہو گیا۔ ہائے یہ کیا غضب ہو گیا۔ ثریا بیگم کو کیا معلوم تھا کہ حضرت سُن رہے ہیں۔ جو اصل بات تھی سب صاف صاف کہہ دی۔ اتنے میں تھانہ دار نے کہا آداب عرض ہے مزاج شریف ——۔ ہم بھی سُن رہے تھے۔ پھر اگر یہ بات تھی تو مجھ بد بخت کی نوکری کیوں لی۔ مجھے کیوں مصیبت میں گرفتار کیا پہلے ہی سوچی ہوتیں۔

شراب کہنہ کہ روشنگر روانِ من ست
مصاحب من و پیر من و جوانِ من ست

اس وقت قلم رنگین رقم سرخوش و تر دماغ ہے۔ اور فرطِ طرب سے سینہ باغ باغ ہے۔ کیوں نہ ہو محفل عشرت منزل کا ذکر خامۂ ندرت ختامہ کی زبان پر آیا۔ بزم طرب میں تر دامنوں نے زہد خشک پر قہقہہ لگایا۔ صراحی زیرِ لب مسکرا کر رکوع کرتی ہے۔ مے خوشگوار شراب طہور سے ٹکر لڑتی ہے۔ حورِ جنت تک اس مینا بازار کے صنم گلگوں قبا کی شاگردی کا دم بھرتی ہے۔ جام سلسبیل و کوثر پر خندہ زن ہیں۔ تو موج مے سر جوشِ نسیم پر طعنہ زن ۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہری
حسن را پردہ گاری عشق را پیغمبری

بیش بہا میزوں پر خوبصورت خوبصورت بوتلوں میں پیارے پیارے رنگوں کی شرابیں انواع اقسام کی پیالیاں اور جامِ نقرئی طلائی بلوریں طرح طرح کے کباب، اچار چٹنیاں موجود ہیں۔ میڈ، بیکر اور کلیر فر اور شہزادی کرسیوں پر متمکن سامنے آزاد پاشا اور ایک کرسی پر خواجہ بدیعا ر

خوجی : (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) اب مزے کا وقت آتا ہے ۔

ساقی دمید صبح قدح پر شراب کن
از روے گرم خود بط مے را کباب کن

آزاد : (آہستہ سے) اب وہ دن گئے خیر خدا مسبب الاسباب ہے۔

زاں میخورم شراب کو بیہوشی آورد
دزانچہ غیر اوست فراموشی آورد

خوجی : آپ کو مل چکی یہ ہم رئیسوں ہی کا حصہ ہے۔ حضرت سلامت۔

آزاد : اجی ہم کو ہمارا معشوق شراب پلائے گا۔ یہ کون ہیں۔

مے طہور مجھے واعظو خدا دے گا
وہ جانتا ہے کہ رندِ شراب خور ہوں میں

اتنے میں حکم ہوا کہ اغیار سے محفل صاف کی جاوے۔ ع
دریں بزم رہ نیست بیگانہ را

کوئی نہ رہے۔ پرندہ تک پر نہ مارے خس کم و جہاں پاک۔

شہزادی: آج بادۂ گلگوں کے جام اس قدر لنڈھاؤ کہ ہوش و حواس باقی نہ رہیں جام پر جام اور چسکی پر چسکی اور جرعہ پر جرعہ۔

دور چلے دور چلے ساقیا
اور چلے اور چلے ساقیا

میڈ پیکر: اچھا شرط ہو جائے۔ جب تک ہمارے ہاتھ سے جام نہ چھوٹے تب تک تم بھی نہ چھوڑو جو پہلے چھوڑ دے وہ ہارا آیئے شرط۔

کلیروفر: ہم سے بھی مگر کچھ کچھ شرط بھی تو بدلو۔ پھر لطف ہو۔

یہ کہہ کر میڈ پیکر نے جام لنڈھائے اور دور چلنے لگا۔

کلیروفر: اودی اودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ سامنے دلآرام گلفام ہاتھ میں جام آنکھوں میں نور آگیا، دل میں سرور۔ بس اب دور چلنا ہی جائے۔

بھر دیا مجھ فقیر مست کا جام
ساقیا تو ہو اور دنیا ہو

اتنے میں میڈ پیکر نے اعلا سے اعلا شراب کا جام بھر کر آزاد کو دیا۔ شہزادی نے مسکرا کر کہا۔ نوش جان لو تمہارے رقیب خوبرو نے اپنے گورے گورے ہاتھوں سے نہیں۔ پیالہ دیا ہو قسمت کے دھنی۔ اب چوکو تو بد بخت۔ آزاد سوچے کہ یا خدا! کس مصیبت میں پھنسا۔ ایک دفعہ بدرجۂ مجبوری پی لی۔ توبہ کی۔ اب اللہ میاں کو کب تک سمجھاؤں کب تک پھسلاؤں خیر ہرچہ باداباد کہہ کر پی لی۔ کہا بار الٰہا مجھے مغفرت عطا کرتا۔ مستی و رندی کے لیے شراب نہیں پی ہے۔ اس وقت ایسا پھنسا کہ مجبور ہو گیا۔ یہ شہزادی جو چاہے سو کرے۔

قاتل کی ہر طرح مجھے منظور ہے خوشی
سر پیشکش ہے جاں ہے فدا اور نثار دل

کلیروفر: (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) تم کون ہو میاں بولو صاف۔

آزاد: میں آدمی نہیں ہوں۔ دیوزاد کی قسم ہوں۔ پریاں مجھے خوب جانتی ہیں کہ میں کون ہوں۔ ع

جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کلیروفر: انسان نہیں ہو پری ہو۔ صحیح۔ بجا۔ پری زاد بن گئے۔

اڑتا ہے مجھ سے او ستم ایجاد کس لیے
بنتا ہے آدمی سے پری زاد کس لیے

آزاد: جو کام ہوا پورا ہی ہوا۔ واہ ری ناکامی ہائے ہائے۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے سے بھی عریاں نکلا

ہم نے جو کیا پورا نہ ہوا۔ لیکن آج تک ہمارے مقابل کسی غیر کی دال نہیں گلی۔

زہر گلے کہ ہوائی دلم نقاب کشاد — فلک بگلشنِ حسرت نوشت و داد بباد
ہرآں گرہ کہ درو نقد مُدعا بستند — بدامنِ طلب مدعی نہاد کشاد
زمانہ غیر الم نامہ نیست تصنیفش — دلم ز صفحۂ فہرست او گرفتہ سواد
چراغ مہر نمی میرد اے فلک یک صبح — بروئیم ار بکشائی دریچۂ بیداد

کدام نالہ سرشتم بداغِ دل کورا
زمانہ در کرۂ زمہریر غوطہ نہ داد

خوجی: اب اس وقت مولانا صاحب بن جاؤ، اور قیل و قال کرنے لگو۔

آزاد: اس وقت! بجا۔ اس وقت تو طبع موزوں زمین پر قدم ہی نہیں رکھتی۔ آسمان ہی آسمان جاتی ہے۔ قیل و قال یعنی چہ۔

شرابیوں کو بھلا عمر و زید سے مطلب
ہماری بزم میں ہو حق ہے قیل و قال نہیں

اب شراب کا ذکر کرو۔ ہر چہ غیر او ست پوچ است بس سمجھے۔

ہوتا ہے بے قرار حسینوں کو دیکھ کر
ایسا دیا ہے کیوں مجھے پروردگار دل

شہزادی نے ایک قاب کباب خوجی کی طرف کھسکائی اور انھوں نے میاں آزاد کی جانب بڑھائی۔ آزاد کباب کھاتے جاتے تھے اور مرزا خلیل کا کلام زبان پر لاتے تھے۔

چہ عرض دارد از خوبی ہائے کباب کہ نمک ملاحتش شورِ عجیبے در مطبخ روزگار انداختہ۔ ولہارا چوں نمک از رشکِ خود در آب گداختہ کبابے آسمان تیز طائر را پاک کردہ سیخ کباب از خطِ کہکشاں

آوردہ بسرخی شفق آتش افروختہ و اخگرِ اختر در مجمر پروین سوختہ، ماہتاب نمک بردہ۔ آفتاب ترنج آوردہ ہلالی قلم دار چینی و قرصِ ماہ نان تنکی، بر طبق نہادہ نسیم تا توے ازیں کباب بطرفِ چمن رسانیدہ باغبانِ سرخوش شرابِ نظر برصید تدرو انداختہ بامداد باوزن صیا ازار غوان آتش افروختہ لالہ از داغ در مجمر شفق گون خود انگشت میگذارد۔ گل از خارِ سیخ کباب می آرد۔ شبنم تر نمک فشاندہ عباسی از دانہ ہائے خود فلفل رساندہ۔ مشک دانہ الائچی می آرد زعفران بہوشِ آمیزش بپیازچی کار دیخ زنبق زنجبیل برمی آرد و درج آب لیموں افشردہ در صحن انجمن مستانِ بے سروسامان بطِ مے راسر بُریدہ اند و نمکے از پستہ شور برو دکشیدہ اند سبوئے شکستہ گلبن و قدحِ سفالیں بکرو نبردہ اند واز دُکان کبابیان بازار انگشت چند بستہ آوردہ، تا بہ سینۂ سوزان راہ بادۂ گرم نگاہ میدارند د بجائے سیخ نالۂ مستانہ از جگر برمے آرند و بباد نفسِ سرد آتشے برمیفروزند و بصد خامی از ہمد یگر کباب پختن می آموزند از بے استطاعتی کہ دسترسے مصالح ندارند۔ اشکِ حسرتی از دیدہ میریزند و سختِ جگر بہزار خون دل می آمیزند بذوقِ آب و روغن۔ بگرفتنِ روغن از بادام و طلبِ آب از شراب شناختہ اند۔

کلیروفر: اب مطلب کی تو کہو شہزادی۔ ہم پسند ہیں یا نہ۔

ہیڈ پیجر: دونوں قمر طلعت جوانوں پر نظر ڈال کر دیکھو جو سب سے زیادہ خوبرو اور خندہ پیشانی اور پاکیزہ مشرب اور عالی گوہر ہو اُس کو پسند کرلو۔

شہزادی: (مسکرا کر) ہم کو دونوں پسند ہیں۔ دونوں مہ لقا دونوں رنگین ادا دونوں فرخندہ اختر۔ دونوں پاک گوہر دونوں خندہ پیشانی دونوں گل سر سبز گلشن سحر بیانی دونوں نوخیز اور حسین، دونوں عنبر مو اور مہ جبیں دونوں اگر ہمیں عقد نکاح میں لائیں تو سبحان اللہ ازیں چہ بہتر۔

خوجی: گھڑی دو میں مُر لیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مُر لیا۔

آزاد: او ستمگر۔ جفا پیشہ۔ منحوس۔ پھر وہی نحس ہانک لگائی۔

خوجی: گھڑی دو میں مُر لیا باجے گی۔ پی پی کے وارد ہوئی دُلہن۔ مست آجاؤ کا چھوڑ سین ہاں مال مست۔ گھڑی دو میں مُر لیا باجے گی۔

اتنے میں کلیروفر نے شہزادی کو اِس قدر جام پلائے کہ لال لال ڈوروں نے رنگ جمایا اور شہزادی بدمست ہو گئی اور جھومنے لگی۔

کلیروفر: نشہ چڑھ گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ اب مطلب کا وقت ہے۔

ملیڈ پیکر : آزاد کو بھی تو اور پلاؤ. تب تو لطف ہو ورنہ کیا.

خوجی : آزاد کو جام. تو میاں بڑھ کے پیو. تو نڈی ٹنک کا پتا تو ہے نہیں یہاں. بجز تمہارے ہمارے اور ان دو پریوں کے اور کون ہے. ایک شہزادی وہ اِس وقت یہاں کہاں. خدا جانے کہاں پہنچی ہے.

آزاد : پریاں کون. ان دونوں شہزادوں کو پری کہتے ہو.

خوجی : جی حضور ذرا آنکھیں کھولیے. اور تھوڑی سی اور پیجیے.

آزاد نے بھی ایک بوتل صاف کی. اب سُنیے کہ خیمۂ زرنگار پر بہار کے اندر صرف خوجی اور آزاد اور وہ دونوں پری زاد. شہزادی کرسی پر سر رکھ کر آرام میں تھیں ملیڈ پیکر نے کہا آزاد پہچانا.

آزاد : کس کو کس کو پہچانا. میرے تو اس وقت ہوش اُڑ گئے.

ملیڈ پیکر : کسی کی صورت شکل. قطع، قد، آواز، ادا پہچانتے ہو یا نہیں.

آزاد : ؏

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

ہے تو کسی معشوق کی سی ادا مگر عورت اور مرد کا فرق ہے. بس صرف اِس قدر.

خوجی : واہ پٹھے خوب پہچانا. دو جام اور لنڈھالو. تو تینوں تلوک نظر آئیں. آنکھیں کیا جام جہاں میں ہیں.

گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

ملیڈا : (آبدیدہ ہوکر) پیارے آزاد اِس قدر جلد ہمیں بھول گئے جانی. اُف. جن جن پر تم عاشق ہو اُن کے نام بتادو دیکھیں کس کس کو بھول گئے ہو اور کون کون یاد ہے. واہ. اِس قدر جلد.

آزاد : ہم سب کے پہلے تو ایک بیسوا پر عاشق ہوئے. پتلی کمر بل کھائے ری نندیا. ہزار جگہ سے کمر بل کھاتی تھی اور ایسی خوشرو کہ میں کیا عرض کروں. قابل دید بلکہ دید نہ شنید. اِس کے بعد ایک بیگم نے دل چھین لیا.

در تماشائی جمال او سراپا دیدہ ام
یک سر مو بر تنم بے لذت دیدار نیست

اس پری کا ذکر ہمارے دل پر عجب اثر پیدا کرتا ہے. ہائے کیا صورت زیبا ہے. بس اس لائق ہے کہ بیشمار بوسے لے اور گھورا کرے :

تو بایں جمال و خوبی برطور اگر خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ بگفت لن ترانی

مئیڈا نے پوچھا اور بھی کسی پر عاشق ہوتے تھے یا بس انھیں دو پر. کہا روم میں ایک حور بہشتی نے گھائل کر دیا مس مئیڈا ہائے مس مئیڈا. دو بار مئیڈا کا نام لیا، مارے رنج کے غش آگیا، اور گر پڑے بس مئیڈا نے فوراً گلاب اور لخلخہ منگوایا. عاشق زار کو سنگھایا:

گلاب باغ جناں لے کے آئی ہیں حوریں
غش آگیا ہے جمال پری رخاں سے ہمیں

آزاد نے آنکھیں کھولیں تو مئیڈا گلے لپٹ کر رونے لگی.

آزاد : کون ہے. شہزادے. شہزادے. ایں!

خوجی : بے نامعقول شہزادہ نہیں ہے، شہزادی ہے. ارے آنکھ کھول کے دیکھ تو کون ہے. ابھی سے بھول گئے. میاں واہ.

آزاد : مئیڈا مس مئیڈا.

ہم کو تو مل کے حسینوں سے بڑے رنج ملے
خوش رہا کرتے تھے پریوں سے سلیمان کیونکر

تم یہاں کہاں جانی تم نے مار ہی ڈالا:

دل چو عاشق گشت از آسیب رُست	شیشہ چوں بگداخت کے بیند شکست
چوں شنیدم سر بسر احوالِ عشق	شد روانم در بدن تمثالِ عشق
ہر نفس بستم رہِ خوش و خروش	خود دلم با عشق گویاں شعلہ پوش
روی دل از غیر چون بر تافتم	مرہم ناسورِ ہجران یافتم
بہر درد عشق درمان ساز شد	جذبہ اش ہر سو کمند انداز شد
چون مہ تاباں من آمد بہ بام	ناگہان صید مراد آمد بدام
گفت با دل نکہت بادِ شمال	ایہا المہجور قد جار الوصال
از نوید وصل شد دل پر خروش	زد سفالم از زلالِ خضر پوش

بستم آئین زاشک گلناری لباس　　ازدرِ دل تا بہ دربار حواس
از ہجوم خوش دلی رفتم زخویش　　در نور دیدم بساطِ نوش و نیش
جان نوائی دل طپیدن ساز کرد　　رشک شد پروانۂ و پرواز کرد
دیدمش دامن کشان لب پُر ز نوش
آمدم از شوق وصلش چوں بہوش

ممیڈا : (بوسہ لے کر) آزاد، کن کن جنگلوں میں تمہارے واسطے رہ نوردی کی اور تم نے پوچھا بھی نہیں کہ :

چرا صحرائی در صحرا نوردی　　چنیں چوں سر بسر اندوہ و دردی
چو پیش آمد ترا و حال چوں ست　　مگر صحرا نوردی از جنوں ست
جُدا چوں گشتی از یاران غم خوار　　چرائی ہمچوں مجنوں سر بکہسار

آزاد : جانِ من ہماری مصیبت خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔

کیستم دل شکستہ غم زدہ　　آفتِ جانِ خود الم زدہ
از شرارِ نفس بہ تاب نبے　　در بیابان پاس تشنہ لبی
نا امیدی جگر گداختہ　　وزغمِ دہر زہر یافتہ
حُسنِ طوفانیٔ محیطِ بلا
دمیدم گرد کاروانِ بلا

خوجی : واہ ری شراب :

صوفی از پرتوِ می رازِ نہانی دانست
گوہر ہر کس ازیں لعل توانی دانست

ایک جام سے حال کُھل جاتا ہے۔ شراب کسوٹی ہے۔

ممیڈا : خواجہ صاحب سچ کہنا ہمارا عشق صادق ہے یا نہیں۔؟

خوجی : دریں چہ شک۔ اس میں کیا شک۔

آزاد : (بے قرار ہو کر اور رو کر) اب میں یہاں کیا کروں۔ کچھ بس نہیں ہے۔ عالم مجبوری ہے۔

خوجی : صبر، صبر، ہماری نصیحت پر عمل کرو۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جان دوست تر دارند
جوانانِ سعادتمند پندِ پیر دانا را

آزاد : پند بے سُود موعظت بیکار ہے. دل بیقرار ہے :

ناصحا پند مجھ سے وحشی کو
اُس کو سمجھا جو کچھ سمجھتا ہو

پند اُس کے لیے ہے جو کچھ سمجھتا ہو یہاں تو پند کا کام ہی نہیں.

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
پر کوئی اتنا تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

اور کیا پند کیسی.

ہُس کلیر سا ناز کے ساتھ بولی بہن تم سچ کہتی تھیں کہ تم پر آزاد کی جان جاتی ہے. مگر اس میں شک نہیں کہ ہزاروں میں لاجواب کروڑوں میں انتخاب ہے. ایسا حُسنِ خدا آفریں دید کی آنکھوں نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا. اور شنید کے کانوں نے خواب میں نہ سُنا ہوگا.

در مصحف جمالش چندان نظر کہ کردم
جز نقطۂ دہانت حرفِ شکب ندارد

ابھی ماشا اللہ سبزہ آغاز ہے. اُٹھتی جوانی ہے :

خط بیں کہ فلک بر رُخِ دلخواہ نوشت
بر گل رقمِ بنفشہ ناگاہ نوشت
خورشید بہ بندگیش میداد خطے
کاغذ مگرش بنود بر ماہ نوشت

اب یہاں سے چھٹکارا کیونکر ملے، کچھ راتے دیجیے.

خوجی : اور جو شہزادی سب سُن رہی ہو تو کیا.

آزاد : واہ. ہوش تو فقرو ہو گئے ہیں. سُن رہی ہو.

خوجی : شہزادی. اجی شہزادی صاحب یہ سب بھاگے جاتے ہیں. ذرا ان کی فکر کیجیے اب آپ کے پھندے میں نہ پھنسیں گے.

آزاد : ابے چپ رہ نالائق. ہاں ہس مسیڈا. (بوسہ لے کر) بتاؤ کہ اب کس تدبیر سے بھاگوگی. مگر

تم نے تو وہ روپ بدلا کہ الامان الامان میں یہی دل میں سوچتا تھا کہ خداوندا ایسے حسین زہرہ جبیں شہزادے یہاں کہاں سے آ گئے۔ جنھوں نے ہمارا رنگ بھی پھیکا کر دیا۔ اور واللہ جو ذرا بھی پہچانا ہو کہ یہ دونوں کون ہیں مگر خدا المسبب الاسباب ہے۔

جس طرح ہمیں بہم ملایا
بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

مکیڈا: اب کل باتیں ہماری رائے پر چھوڑ دو۔ یہ تو اس قدر غین ہیں کہ کل تک ان کی آنکھ نہ کھلے گی۔ پرسوں ہوش میں آئیں گی۔

آزاد: اس وقت وہ سرور ہے کہ۔ ع

دل من داند و من دانم و داند دلِ من

بیان نہیں ہو سکتا ہے۔

شد مدتی کہ خشت سر خم کتاب ماست
موجِ شراب سرخیِ سرہائے باب ماست

اب کچھ تدبیر بتاؤ۔

خوجی: ابھی تم خاموش رہو سب فکر ہو جائے گی۔

مکیڈا: جانِ من ہم سب بند و بست کر لیں گے۔

تکرار

ثریا بیگم اور تھانہ دار میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ رہتے تو دونوں ایک مقام پر تھے، مگر بول چال ترک۔ تھانہ دار صاحب چاہتے تھے کہ فوراً شادی ہو جائے اور ثریا بیگم آزاد کے نام پر دین و دُنیا کو ترک کیے بیٹھی تھیں۔ انھوں نے صاف صاف بیان کر دیا کہ میں ثریا بیگم تب تک تھی جب تک اپنے مکان کی چار دیواری میں رہتی تھی۔ اس کے بعد اللہ رکھی بھٹیاری ہوئی سرا میں رہی، پھر کچھ دن تک آزاد کے ساتھ گل چھرے اُڑے۔ پھر جوگن بنی۔ شہسوار کے ساتھ رہی۔ اس کے بعد شبّو جان کہلائی، پھر ثریا بیگم ہوئی۔ اب بیڑن مشہور ہوئی۔ یہ سب پاپڑ آزاد ہی کے لیے بیلے۔ اب خدا خدا کر کے آزاد کی واپسی کے دن قریب آئے تو مضور نے دق کرنا شروع کیا۔ یہاں دل میں ٹھنی ہے کہ چاہے اِدھر کی دُنیا

اُدھر ہو جاتے ہم شادی نہ کریں گے۔ اب شادی قبر کے ساتھ ہوگی اور بس۔ اور تم اُدھار کھائے بیٹھے ہو کر اور چاہے جو ہو مگر نکاح آج ہی ہو جاتے۔ پھر بات کیوں کر بنے۔ یہ پھیر ایسا پڑا کہ پھوٹ ہو گئی۔

تھانہ دار : اچھا تو ہماری تمہاری یکجائی اچھی نہیں۔ الگ الگ رہو۔

ثریا بیگم : چشمِ ماروشن دل ماشاد۔ خانۂ احسان آباد، چلیے سستے چھوٹے۔

تھانہ دار : ازیں چہ بہتر۔ تم نہ ہوگی تو کیا زندگی نہ ہوگی۔

ثریا بیگم : اور تم نہ ہوگے تو سویرا نہ ہوگا۔ تم الگ رہو اور ہم الگ رہیں جب تم ہمارا کہا ہی نہیں مانتے تو پھر بہانے سے کیا واسطہ۔ اور کیا سروکار۔

تھانہ دار : بسم اللہ نوکری کی نوکری گئی، اور مطلب کا مطلب نہ نکلا۔

غیر آنکھیں سیکیں اُس بت سے دلِ مضطر جلے
وائے بیدردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے

ثریا بیگم : بجا آنکھیں سکوانے والیاں اور ہوتی ہیں۔

تھانہ دار : اب اتنے برس سے خدائی بھر میں آوارہ پھرتی ہو۔ اور کہتی ہو کہ ہم نیک ہیں۔ واہ ری نیکی۔

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

ثریا بیگم : تو نیکوں کو طعنہ کون دیتا ہے۔ تم ہی دیتے ہو۔

تھانہ دار : اب اِس وقت تمہاری صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا ہے ما بخیر و شما بسلامت :

بلبل برداشت آشیاں را
گل گفت کہ خس کم و جہاں پاک

ثریا بیگم : اچھا آپ الگ رہیں ہماری صورت نہ دیکھیے۔ بس چھٹی ہوئی۔

از فروغِ عشق جان تابندہ است
جسمِ عالم زیں حرارت زندہ است

عشق فردوسی حصارش خارزار طاہرش دے باطنش باشد بہار
صورتش زہر ست و معنی صاف مُل شعلہ آبستن صد رنگِ گل

عشق بارانی سحابش جملہ دل — عشق طوفانی حباتش جملہ دل
در بسر ایمان و کفر این و آن — شعلہ دودِ چراغِ عشق دان
از فروغ عشق جان یابد کمال — عشق خورشید ست و جانہا چوں ہلال
گر کسی از عشق اُفتد زیان — از خصوصیات آن گمراہ دان
کجروی آب رواں راہست کیش — آسیا سرگشتہ است از وضعِ خویش
از چراغِ عشق گیر دبی. گمان — ہفت فانوسِ خیالِ آسمان
عشق معراجِ کمالِ آدم ست — عشق را تاثیر اسمِ اعظم است
می کند حسن آفرین اندیشہ را — خامۂ نقاش سازد تیشہ را
گہہ یدِ بیضا و گاہی اژدر ست — گاہ آبِ ذوالفقارِ حیدر ست
عشق برگل خواندہ از افسانۂ — زاہد از شبنمے پروانۂ
کشورِ عشق ست ایمن از خطر — کز خرابی می شود آباد تر

دل چو عاشق گشت از آسیب رست
شیشہ چوں بگداخت کے بیند شکست

تھانہ دار : ہم کو خیال یہ ہے کہ نوکری مفت گئی۔
ثریا بیگم : مجبوری ہے۔
تھانہ دار : از ماست کہ بر ماست۔
ثریا بیگم : مجبوری میں کیا کروں۔

زلزلہ کیا ہے؟

جن لوگوں کے مزاج میں فلسفیت ذرا بھی نہیں چھوگئی۔ ان کا قول ہے کہ جب کسی ملک میں انسان گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور منہیات و معصیات سے بالکل محترز نہیں رہتے تو قہرِ ربانی ان پر اس طرح نازل ہوتا ہے کہ زمین ہل جاتی ہے۔ جس کو عوام الناس زلزلہ کہتے ہیں۔ اگر ان سے زلزلہ کے اسباب کی کیفیت پوچھیے تو آپ کو زندیق اور مرتد و ملحد بنائیں اور کہیں کہ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا خیر۔ یہ تو ناواقف آدمیوں کا مقولہ ہے۔ اب علما کا قولِ فیصل

سُنیے کہ وہ کیا فرماتے ہیں علمائے ہیئت نے زلزلے کے کئی اسباب لکھے ہیں۔

اولاً کسی قسم کے اجزائے ارضیہ کبریتیہ وغیرہ جوش کھاتے ہیں اور ان سے انجرے پیدا ہوتے ہیں اور وہ انجرات بجنسہ باہر نکلنے کے واسطے متحرک ہوتے ہیں۔ جبکہ زمین کی کثافت کے باعث سے اُس کے مجازی ومنافذ مسدود ہو جاتے ہیں، اور انجرہ مزبور نکل نہیں سکتے۔ تو ناچار اُن کی حرکت سے زمین میں زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حکمائے فرنگ کے تجربے میں آیا ہے۔ کہ اگر آٹھ سیر لوہچوں اور آٹھ ہی سیر گندھک میں پانی مخلوط کر کے اُس کو ایسا سڑائیں کہ اُس میں خمیر اُٹھ آئے بعدہ اُس خمیر کو زمین میں مدفون کر دیں تو دس گھنٹے کے عرصے میں وہ اِس قدر جوش میں آتے گا کہ زمین شق ہو جائے گی اور ہلنے لگے گی۔ اور اُس مقام سے شعلہ نکل پڑے گا اسی طرح زمین میں گندھک اور شورے کے بخارات بھی باعث اشتعال وجنبشِ ارض ہو جاتے ہیں۔ شاید بعض لوگوں کو استعجاب ہو گا کہ زمین کے اندر آگ کہاں سے آئی۔ مگر یہ اصلاً مقام حیرت نہیں۔ علمائے یگانہ اور علمائے فرزانہ نے بدلائل عقلیہ اس کو ثابت کر دیا ہے کیوں کہ درمیان زمین کے حضرت خالق اشیائے ایسی چیزیں بکثرت مخلوق کی ہیں جو بوجہ من الوجوہ مشتعل ہو جائیں اور اشتعال کا سبب وہ حرکت شدیدہ ہے جو بخارات میں طلبِ خروج کے لیے حادث ہوتی ہے۔ جس قدر سبب اشتعال خفیف ہوتا ہے۔ اُسی قدر انسان کو حرکتِ زلزلہ خفیف محسوس ہوتی ہے۔ اُس کی جنبش قریب قریب ویسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی جہاز یا اگن بُوٹ کے بیٹھنے والوں کو جہاز اور اگن بوٹ کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔ اکثر اوقات زلزلہ ایک طرفۃ العین میں موقوف ہو جاتا ہے۔ کبھی علی الاتصال کئی دن تک رہتا ہے۔ اِس کے صدمے سے مکانات شق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر جڑ سے گر پڑتے ہیں۔ اور اشیائے مرتبہ تہہ و بالا ہو جاتی ہیں۔ غرض کہ جب کبھی زلزلہ آتا ہے تو زمین تھوڑی بہت تڑق جاتی ہے۔ وہاں سے اشیائے مکتنزہ یعنی غیر مجوف نکل پڑتی ہیں۔

ثانیاً۔ پہاڑ اور بڑے بڑے پتھر خود بخود زمین کے غار میں گر پڑتے ہیں، اور اس زور سے باہم ٹکر کھاتے ہیں کہ زمین ہل جاتی ہے جب شورہ اور گندھک وغیرہ کے اجزا کو کسی وجہ سے زمین کے اندر غلیان پیدا ہوتا ہے تو شعلے ہر چار طرف سے مستعد بخروج ہوتے ہیں۔ اگر اس کے زور سے زمین شق ہو گئی یا اُس کے کسی اور منفذ سے شعلہ نکل گیا تو فبہا ورنہ زمین کسی قدر مرتفع ہو جائے گی۔ اور شعلہ کوہ آتش فشاں کے دہانہ سے نکل جائے گا۔ اگر مقدار اجزا بکثرت نہ ہوئی تو فقط زمین ہی متحرک ہو گی۔ کوہِ آتش فشاں کے ذریعے سے شعلہ نہ نکلے گا۔ بلکہ حرارت کی وجہ سے

انجرے رقیق ہوکر کسی منفذ سے خارج ہو جائیں گے۔

مسٹر ہوائٹ ہرسٹ اور لارڈ ڈالامیو کا مقبولہ ہے کہ اسباب زلزلہ میں آگ اور پانی جزو اعظم ہیں۔ یعنی ان کے بغیر حدوث زلزلہ غیر ممکن ہے۔ کیوں کہ رطوبت میں جب تک حرارت نہ اثر کرے گی تب تک تولید بخارات نہ ہوگی۔ جب زمین میں بخارات جوش کھاتے ہیں۔ تو کئی ہزار میل تک اندر ہی اندر اُس کے اُبلنے کی آواز جاتی ہے۔ یہ آواز بعینہٖ ویسی ہی ہوتی ہے جیسے ناہموار کھرنجے پر بگھی کی گھڑگھڑاہٹ سے آواز نکلتی ہے۔

1855ء میں شہر لزبن دارالسلطنت پرتگال میں ایسا سخت اور مہلک زلزلہ آیا تھا کہ اس کے صدمے سے زمین کا کلیجہ پھٹ گیا۔ شور حشر و ہنگامۂ قیامت قائم ہوگیا تھا جس کے سننے سے آج تک انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس کی کیفیت بالتفصیل و توضیح معرض بیان میں لاتے ہیں۔ ناظرین باتمکین کو معلوم ہو کہ پہلے لزبن کے باشندوں کو قبل از آمدِ زلزلہ معلوم ہوا کہ بگھی کی گھڑگھڑاہٹ کی سی آواز زمین کے اندر سے آرہی ہے۔ حیرت میں تھے کہ یاللعجب یہ کیا بلا ہے۔ جو زمین کے اندر عجب طرح سے غنغنا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز بڑے زور سے آنے لگی۔ لوگوں کے دل پر دہشت و ہیبت چھانے لگی۔ یکایک معلوم ہوا کہ سیکڑوں اتواپ اژدر وہاں دغ رہی ہیں اور دھرتی دھمک پڑتی پڑ رہی ہے۔

دفعتاً زلزلہ آگیا۔ لوگ بد حواس ہو گئے کہ یہ کیا آفتِ ناگہانی و حیرت خیز ہے۔ اور کیسا واقعہ نادیدنی و عبرت انگیز ہے۔ سب بگریہ و زاری دست بدعا تھے کہ بارِ خدایا رحم کی جیو اور شرِ آفات سے بچائیو۔ مگر یہ یک دُعا بمنزل اجابت قرین و نقش مُراد کرسی نشین نہ ہوا۔ زلزلہ آتے ہی بڑے بڑے محل جو آسمان سے باتیں کرتے تھے اراراکر زمین پر ناصیبہ سا ہوتے ایوان خسروی جو صناعان کامل فن اور معماران اعجاز پیشہ کی دستکاری سے بصرف زر خطیر تیار ہوتے تھے۔ بچشم زدن مٹی میں مل گئے۔ قس علی ہذا امرار ذوی الاحترام وید سیا عالی مقام کی عمارتِ عالی شان اور غریبوں کے جھونپڑے اور مکان تہ و بالا ہو گئے۔
جس دن یہ زلزلہ آیا اُس دن اتفاق سے گرجاؤں اور معبدوں میں آدمیوں کا ایسا اژدھامِ عام تھا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ جس وقت یہ معبد بحکم معبود سر بسجود ہوئے، ہزارہا بندگان خدا عدیم الوجود اور فائز بمنزلِ مقصود ہوئے۔ گرجا گھر گر جانے سے اس وقت روشِ گورستان بن گئے تھے۔ شہر میں کوئی بیچارہ سسکتا تھا کوئی تنۂ درخت کے تلے دبا ہوا بلکتا تھا۔ عورتیں اپنے پیارے بچوں کو چھاتی سے چمٹائے کلیجے سے لگائے دیوانہ وار اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی تھیں۔ سراسیمگی میں قدم قدم پر گرتی تھیں۔ بزبن

کی پری رویڈیاں نفیس پوشاک سے باز یب وزینت آفت سے خاک میں لت پت بدحواس گھومتی تھیں۔ ذکور واناث جوان واطفال اور پیر کہن سال سب تباہ وخستہ حال جان بچاتے پھرتے تھے۔ زندگی کے لالے پڑے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ کافر زلزلہ چند منٹ بعد موقوف ہوا۔ جو لوگ جیتے بچے تھے، وہ ہنوز سسک ہی رہے تھے اور خدا کے شکر میں گرم گفتار تھے کہ اس بلائے بے درمان سے ان کو محفوظ و مصئون رکھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد:

ہردم زمانہ داغ غمم بر جگر نہد
یک داغ نیک ناشدہ داغِ دگر نہد

کا معاملہ ہوا۔ یعنی سمندر لہریں مارتا ہوا شہر میں داخل ہوا جو محلے کسی قدر پستی میں واقع تھے وہ فوراً غرقِ آب ہو گئے۔ یہ حال عبرت مآل مشاہدہ کر کے تین ہزار آدمیوں نے ایک بڑی عالی شان عمارت میں جا کر پناہ لی (جو اُس وقت باعتبار استحکام متحمل صدمات امواج آب سمجھی گئی تھی) اور سمجھ بیٹھے کہ جس طرح طوفانِ نوح میں صرف وہی لوگ بچے تھے جو کشتی نوح پر سوار تھے اُسی طرح اس پختہ مکان میں صرف ہم ہی لوگ محفوظ رہیں گے۔ باقی تمام شہر غرق ہو جائے گا۔ لیکن پختہ مکان کا خیال خام تھا اور اس عمارت کا استحکام برائے نام تھا۔ قصہ اس کے بالعکس پایا گیا۔ طوفان نے یہ ستم ڈھایا کہ اس قصر بلند کو دم کے دم میں ڈھایا۔ زلزلہ نے اُس پختہ مکان کی بنیاد کو ہلا کر ایسا کمزور کر دیا تھا کہ پانی نے آناً فاناً میں گرا دیا۔ اُن تین ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی جاں بر نہ ہوا۔ یہ سانحہ ہوش ربا اور واقعہ حیرت افزا تو دن میں گذرا اب رات کا اندھیر سنیئے!

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چر کا دیا جلّاد نے جاتے جاتے

ادھر آفتاب غروب ہوا اُدھر دوسرا گل کھلا۔ ایک اور شعلہ نمودار ہوا۔ جس قدر مکان گر گئے تھے اُن سب میں از خود آگ لگ گئی۔ زلزلہ اور طوفان سے جو بچا تھا اُس کو آگ نے جلا دیا۔ انچہ از دزد باقی ماند رمال بُرد۔ طوفان سے جو بچا تھا وہ آگ کی نذر ہوا۔ ؏

پارۂ را سوخت آتش پارہ را آب برد

مولوی صاحب نے ثریا بیگم کو مختلف اُمور کی ہدایت کی اور صاف صاف سمجھا دیا کہ جب تک کسی کے ساتھ نکاح نہ ہوگا تب تک شریف زادی نہ کہلاؤ گی۔

ثریا بیگم: نکاح تو محال ہے یہ نہ ہونے کا۔

مولوی : برائے نام ہی سہی۔

ثریا بیگم : برائے نام کیا معنی نکاح میں برائے نام کیسا۔

مولوی : خیر پھر تم کو اختیار ہے مگر ہم یہی صلاح دیں گے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو نکاح پڑھوالو۔

ثریا بیگم : کس کے ساتھ۔؟

مولوی : جو پسند ہو مگر پولیس کا آدمی نہ ہو۔ بوڑھا نہ ہو جاہل نہ ہو۔

ثریا بیگم : یہاں پسند کرنے کا کوئی موقع ہے۔

مولوی : یہاں تین آدمی۔ ایک تھانہ دار۔ دوسرے باورچی۔ تیسرے ہم تھانہ دار پولیس کا آدمی۔ باورچی جاہل اور بوڑھا باقی رہا بندہ۔ اس کا تم کو اختیار ہے۔

راوی : ؎

چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

ثریا بیگم : یہ کہیے آپ کو شوق چرایا ہے۔ ماشا اللہ جب ہی صلاح دیتے تھے شادی ہو جاتے۔

مولوی : ہم کیا کچھ بُرے ہیں۔؟

شادی جلوۂ گلفام مبارک ہووے
عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے

ثریا بیگم : بجا ارشاد ہوا۔ بندی ابھی سے رخصت ہوتی ہے۔

مولوی : نہیں نہیں۔ رخصت ہونا کیا معنی۔ میں کچھ زبردستی کرتا ہوں یہ خوشی اور رضامندی کا معاملہ ہے۔

ثریا بیگم : آسمان سے گری کھجور میں اٹکی۔

مولوی : اگر زبردستی کروں تو بُرا بھلا کہو۔ ہم خدا کے نام لیا کرتے ہیں۔ بدی کے قریب نہیں جاتے :

بنام جہاں دار جان آفرین — حکیم سخن بر زبان آفرین
ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را — ثریا دہ تارم تاک را
کہ خورشید اصورت جام ازوست — شراب شفق در خم شام ازوست
پناہ بلندی و پستی توئی — ہمہ نیستند انچہ ہستی توئی

توئی کافریدی زیک قطرہ آب
گہر ہائے روشن تراز آفتاب
توئی کاسماں رابر افراختی
زمین راگذر گاہِ او ساختی

ثریّا بیگم : آپ کسی مسجد میں جاکر بیٹھیے۔
مولوی : تو بھی بُرا نہیں۔ اس میں کیا ہرج ہے، بی صاحب۔

مولوی صاحب اِس قدر ریجھے کہ جان جانے لگی۔ اب ہر روز گریۂ وزاری دن کو آہِ سرد باد لِ پُر درد۔ شب کو اختر شماری :

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

ثریّا بیگم : تو تم نے جان بوجھ کے ہمیں دھوکا دیا۔ اگر ہم یہ جانتے تو اس سے کیوں بگاڑتے۔ اب ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔
مولوی : اچھا۔ اگر ٹکے ٹکے کو محتاج نہ ہو تو جب ہی کہنا۔
ثریّا بیگم : خیر خدا حافظ ہے۔ آپ تو مولوی صاحب ہیں۔
مولوی : ہم میں کون بات نہیں ہے۔ ناک آنکھ کان ٹانگ مُنہ سر ہاتھ پاؤں چہرہ کوئی عضو بدن ایسا نہیں جو سانچے کا ڈھلا نہ ہو۔
ثریّا بیگم : آپ حسین خوبصورت ماہ لقا خورشید طلعت آپ میں کون سی بات نہیں ہے۔
مولوی : خیر اچھا یوں ہی سہی :

مرا ہمچنیں چہرہ گلفام بود
بلوریں تنم از شوخی اندام بود

ثریّا بیگم : ہم کو ایک جھونپڑا چاہیئے اور چار روٹیاں اور بس :

ہر کس کہ بہ دہر نیم نانے دارد
وز بہر نشست آشیانے دارد
نی خادم کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

مولوی : سبحان اللہ۔ مگر۔

انسان وہی مقبولِ خدا ہوتا ہے
جو مسلکِ خیر میں فنا ہوتا ہے
قسامِ ازل کا اک اشارہ بس ہے
دم بھر میں شہنشاہ گدا ہوتا ہے

ثریا بیگم : آپ تو مولوی ہیں اور بندی ایک جاہل عورت۔

اتنے میں تھانہ دار صاحب آئے اور للکار کر کہا۔ او مولوی۔ آج یا تو ہی نہیں یا ہم ہی نہیں۔ دونوں سے ایک نہیں۔ دونوں کی زندگی ہو یہ محال امر ہے:

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
زجامِ دہر مے کل من علیہا فان

مرنا برحق ہے۔

مولوی : ابے لونڈے کیوں واہی ہوا ہے۔ ارے لاحول۔

ثریا بیگم : خدا کے لیے۔ واسطے خدا کے جانے دو۔

تھانہ دار : واہ یہ خوب کہی۔ ؎

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندر میانِ خاک و خون بینی سری

آج خون ہوگا۔ آج خون کے دریا بہیں گے۔

بھاگ نکلے

بیا ساقی آن آبِ آتش خواص — بمن دہ کہ تایابم از غم خلاص
بیا ساقی آن ارغوانی قدح — کہ یابد ز فیضش دل و جان فرح
بمن دہ کہ از غم خلاصم دہد — نشان رہ بزم خاصم دہد
بیا ساقی آن آب اندیشہ سوز — کہ گر شہد نوشد شود بیشہ سوز
بیا ساقی آن می کہ حورِ بہشت — عبیر ملایک دران می سرشت۔

بیا ساقی از می ندارم گزیر   بیک جام باقی مراد ستگیر
بمن دہ کہ در کیشِ رندانِ مست
چہ دنیا پرست و چہ آتش پرست

بادۂ گلگوں راحِ روح کیمیائے فتوح کے جام یاقوت وش نے وہ رنگ جمایا کہ معشوقہ سراپا ناز رشکِ مہوشانِ طناز یعنی پولینڈ کی سیمنبر شہزادی کو دم کے دم میں تردماغ سے مست بنایا۔ اس ساقی لاابالی کے صدقے جس نے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے پیالہ پلایا۔ شہزادی نے اسی حالت مستی و عشق پرستی میں فرمایش کی کہ کوئی باربد نژاد خوش گلو قوال علمِ موسیقی کے جوہر دکھائے اور اعلا اعلا چیزیں گاکر وجد میں لائے:

مغنی دف و چنگ را ساز دہ   بیارانِ خوش نغمہ آواز دہ
رہے زن کہ صوفی بحالت رود   بمستی وصلش حوالت رود
مغنی بیا بامنت جنگ نیست   کفے بر دفے زن گرت چنگ نیست
مغنی کجائی کہ وقتِ گل ست   ز بلبل چمنہا پر از غلغل ست
مغنی بیا عود را ساز کن
نوآئین نوائے نو آغاز کن

خیمہ زرنگار و اسپکِ پر بہار کے باہر سے دو سرو صنوبر خرام ماہرویانِ گلفام و نازک اندام نے رقص شروع کیا۔ عجب انداز سے پاؤں پڑتا تھا:

دور رقص نو کم از دور قیامت نبود
بنشیں یک نفس اے فتنۂ دوران بنشیں

اتنے میں ناظورۂ خورشید لقا مس کلیرسا نے ایک جام بادہ ممزوج اور شہزادی کو پلایا۔ بس لے اڑا۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیب چڑھا۔ یوں ہی شہزادی نشے میں چور۔ بست و مخمور تھی۔ اس جام نے آتش نشہ کو اور بھی بھڑکایا۔ عقل کو رو بیٹھیں۔ ہوش و حواس کھو بیٹھیں:

بیا تا خرد را قلم در کشیم   ز مستی بعالم علم در کشیم
ز جام دمادم دمے دم زنیم   ز مے آب بر آتشِ غم زنیم
دریغا جوانی کہ بر باد شد
خنک آنکہ از عالم آزاد شد

آزاد: خواجہ صاحب واللہ اگر اس بادۂ تیز و مشک بیز سے محروم رہے تو عمر بھر پچھتاؤ گے۔ میاں درِ توبہ باز ست۔ حال آجائے وہ شراب ناب ہے:

خذ الجام لا تخش فیہ الجناح　　کہ در باغ جنت بود مے مباح

بیا ایں نصیحت ز من گوش کن
جہاں جملہ ہیچ ست می نوش کن

خوجی: جام کسی کج بہندیے کو دیجیے۔ یہاں پکے مومن پاک ہیں۔

آزاد: بھائی ہر ملکے و ہر رسمے۔ اب یہاں نہ پیتے تو لینے کے دینے پڑتے۔ اس وقت یہ مردار جان پرور ہے۔ آب اندیشہ سوز حافظ شیرازی نے اس کو صحیح لکھا ہے۔ اندیشے کے خرمن کو تو بالکل جھلسا دیتی ہے،

قدح پُر کن از می کہ می خوش بود　　خصوصاً کہ صافی و بے غش بود
بیا ساقی آں روحِ ریحان نسیم　　بمن دہ کہ نے زر بماند نہ سیم

بیا ساقی از بادہ ہائے کہن
ز جام پیاپے مرا مست کن

خوجی: کسی بے گناہ کا خون کرنا ہمارے مذہب میں روا نہیں۔ شرابِ خون انگور ہے۔ خون آشام بننا ہمیں پسند نہیں۔ آپ مزے مزے لنڈھائیں خاکسار کو معاف ہی رکھیے۔

آزاد: ہم تو تم پر احسان کرتے ہیں۔ یاد کرو گے۔ بچہ جی۔

خوجی: بلی بخشے چوہا بیچارہ لنڈورا ہی ہو کے جیے گا۔ بس!

آزاد: بس مَیڈا خدا کرے تمہارے اوپر سے جان تصدق ہو جائے:

اے خو بہائی نافۂ چین خاک راہِ تو　　خورشید سایہ پرورِ طرفِ کلاہِ تو
نرگس کرشمہ میبرد از حد برون خرام　　اے جان فدائے شیوۂ چشمِ سیاہِ تو
خونم بخور کہ ہیچ ملک با چنیں جمال　　از دل نیایدش کہ نویسد گناہِ تو
با ہر ستارہ سرو کار ست ہر شبم　　از حسرتِ فروغ رخ ہمچو ماہِ تو
یارانِ ہم نشین ہمہ از ہم جدا شدند　　مائیم و آستانۂ دولت پناہِ تو

فردائے روزِ حشر کہ عرضِ خلائق است
باشد در آں میاں بمن افتد نگاہِ تو

خوجی : حسن کو بھی خدا نے کیا درجہ عطا کیا ہے۔ واہ رے حسن و جمال آستانہ دولت پناہ کہو چاہے جان فدائے شیوۂ چشم سیاہ کہو۔ رخ کو رشکِ مہر چہرے کو غیرتِ ماہ سمجھو۔ اس باشد کی لفظ نے آخری شعر میں جان ڈال دی۔ ع

باشد در آں میاں بمن اُفتد نگاہ تو

خدا لسان الغیب حافظ شیرازی کو غریق رحمت کرے۔ بڑا عارف باللہ ر[illegible]ہ تھا۔

آزاد : خیر اس کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہو گا۔ مگر عذوبت کلام اور رندانہ اشعار کا بادشاہ تھا۔ ایک ایک مصرع وجد کرنے کے قابل ہے۔ تصوف کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔

خوجی : بجا اور لسان الغیب نہ تھا۔ فال کوئی شے نہیں ہے۔

آزاد : ہاں بندہ تو اس کا قائل نہیں ہے۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔

خوجی : معقول۔ کیا کفر کے کلمے زبان سے نکالتے ہو۔ ارے لاحول مشہور ہے کہ یکہ تازِ میدان نکتہ پردازی۔ فارس مضمار جادو طرازی حضرت لسان الغیب حافظ شیرازی جعل اللہ الجنۃ مثواہ کی میت پر کوئی نماز جنازہ نہیں پڑھتا تھا کہ حافظ بادہ گسار اور بڑے میخوار تھے۔ آخر کار علما نے رائے دی کہ حافظ کے پرزے ایک گھڑے میں جمع کیے جائیں، اور کسی جاہل سے کہا جائے کہ گھڑے میں ہاتھ ڈال کر ایک پرزہ نکال لے۔ اُسی کے مطلب کے موافق کارروائی عمل میں آتے تو یہ شعر نکلا :

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ

کہ گرچہ غرق گناہ است می رود بہ بہشت

بس فوراً نمازِ جنازہ پڑھی گئی اُس کے لسان الغیب ہونے میں بھلا کسی کو شک ہے :

صوفی از پرتوے راز نہانی دانست

گوہر ہر کس ازیں لعل توانی دانست

یعنے صوفی نے شراب پی اور راز بستہ اس پر کھل گیا اور اسی لعل یعنے شراب ناب سے ہر شخص کی قابلیت دریافت ہو سکتی ہے۔ اگر ناکس ہے تو ناکس کی طرف میل کرے گا اور اگر ناکس نہیں ہے تو راز پوشیدہ اُس پر کھل جاتے گا یہ اس کے معنے ہوتے :

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس

کہ نہ ہر کو ورقے خواند و معانی دانست

شرح مجموعۂ گل بُلبُل کے سوا اور کسے معلوم ہے۔ کسی کو نہیں:

عرضہ کردم دو جہاں بر دل کار اُفتادہ
بجز از عشق تو باقی ہمہ دانی دانست۔

باقی اور فانی کی رعایت ملاحظہ ہو۔ سُبحان اللہ سُبحان اللہ:

دلبر آسائش ما مصلحت وقت نہ دید
ورنہ از جانب ما دل نگرانی دانست

یعنی معشوق نے میرے آرام کو مصلحت وقت کے خلاف تصور کیا ورنہ اُس کو یہ خوب معلوم تھا کہ میں مارے اشتیاق کے مر رہا ہوں۔ روایت معتبرہ ہے کہ حافظِ شیرازی شاخ نبات ایک مہ پیکر شہزادی پر عاشق تھے۔ وہ اُن کو سودائی اور مجذوب سمجھ کر چُہل کیا کرتی تھی۔ ایک کنیز نے کہا کہ اگر لاکھ دینار دو تو مراد حاصل ہو۔ انھوں نے ہر روز پیسہ ٹکا جو کچھ ملا اُس کے محل میں پھینکنا شروع کیا۔ ایک روز قبرستان میں حافظ شیرازی آرام کرتے تھے کسی نے اُن کو جگایا۔ کہا کہ مزدوری کرو تو موجود ہے۔ حافظ نے حقارت کے ساتھ اِس پر نظر ڈالی اور کہا کہ ہم درویش آدمی ہم کو مزدوری سے کیا سروکار۔ اس نے کہا شراب کا ہنڈا تھوڑی دور لے چلنا ہے۔ تب تو حضرت خوش ہوئے۔ منظور کیا۔ جب مزدوری لینے کا وقت آیا تو اِن لوگوں نے تلچھٹ دے دی پیتے ہی بہرہ کھل گیا۔ وہ شراب طہور تھی۔ بادۂ اطہر کے اثر سے شاخ نبات ریجھی۔ مگر انھوں نے انکار کیا کہ ایسے لغویات کے لیے میں کیوں بدنامی لوں۔ یہ غزل اس روایت کی تصدیق کرتی ہے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
واندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند
بیخود از شعشعہ پر نور تو ذاتم دادند
بادہ از نورِ تجلی بصفاتم دادند
چہ مبارک سحری بود چہ فرخندہ شبی
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
چوں من از عشق رخش بیخود و حیران گشتم
خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند

من اگر کار رواگشتم و خوشدل چہ عجب
مستحق بودم و اینہا بز کاتم دادند

بعد ازین روئے من آئینۂ حُسن نگار
کہ در آنجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند

ہاتف آن روز بمن مژدۂ ایں دولت داد
کہ ببازار غمت صبر و ثباتم دادند

اب جو شعر پڑھوں گا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح ہے سُنیئے:

ایں ہمہ قند و شکر چوں سخنم می ریزد
اجرِ صبر یست کزان شاخ نباتم دادند

ہے کہ نہیں. صاف ظاہر ہے. اجر صبر. اور شاخ نبات ہے صاف:

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغان
خاک او گشتم و چندیں در جاتم دادند

شکرِ شکر بشکرانہ بیفشاں اے دل
کہ نگارِ خوش و شیریں حرکاتم دادند

اور مقطع میں قلم توڑ دیے. بالکل کھُلی کھُلی کیفیت بیان کی ہے واللہ.

ہمتِ حافظ و انفاس سحر خیزان بود
کہ ز بند غمِ ایام نجاتم دادند

آزاد : بس ممیڈا. اب تو وقت آگیا. بالکل عین ہے. بھاگ چلو. بھاگ چلو.
ممیڈا : ہوش کی دوا کرو. ستر ستر پہرے والے ہیں. بھاگو گے کہاں.
آزاد : پھر چھٹکارے کی بھلا صورت کیا ہے. بس معلوم ہوا کہ یہاں مقبرہ بنے گا. ع

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

مضی ما مضی. گذشتہ را صلواۃ آئندہ را احتیاط.

ممیڈا : تم یہ کُل باتیں ہماری رائے پر چھوڑ دو. پھر سمجھ لیں گے.
آزاد : اچھا اس وقت بوسہ لینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے. ع

ایک بوسہ لبِ نوشیں کا دیدو

بوسہ خیرات کر بڑا دن ہے
اے صنم تو بت کر بچن ہے

ملیڈا: یہ بوس و کنار کا کون وقت ہے۔ زندگی ہے تو کروڑوں بوسے لینا۔ ہم کو دیکھو کہ کیسی کیسی سختیاں جھیلیں۔ جب جاکے تم کو ڈھونڈھ نکالا۔ فرصت کے وقت سب حال بیان کیا جائے گا۔

ہم عفی اللہ بہ صبا کز تو پیامی میداد
ورنہ در کس نرسیدیم کہ در کوی تو بود

آزاد: یہ ناوکِ نگاہ غیرت ماہ کون ساتھ ہے۔ اس نے بھی کروڑوں کو گھائل کیا ہوگا۔ مگر کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ میں اس پر ریجھا ہوں کیا مجال میں تمہارے خنجر ناز کا کشتہ ہوں۔

حسن تو ہمیشہ در فزون باد — رویت ہمہ سال لالہ گون باد
اندر سر من ہوائے عشقت — ہر روز کہ ہست در فزون باد
قدِ ہمہ دلبرانِ عالم — در خدمتِ قامتت نگون باد
ہر سرو کہ در چمن بر آید — پیش الف قدرت چو نون باد
چشمے کہ نہ فتنۂ تو باشد — از گوہر اشک غرق خون باد
ہر جا کہ دلے ست در غم تو — بے صبر و قرار و بے سکون باد
چشمِ تو ز بہر دلربائی — در گردن سحر ذو فنون باد

ہر کس کہ بہ ہجر تو نسازد
از حلقۂ وصل تو برون باد

ملیڈا: یہ ہماری منہ بولی بہن ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ تم نے انھیں نہیں پہچانا۔
آزاد: میں نے ان کو دیکھا کہاں تھا۔ پہچانتا کیوں کر بھلا۔ مگر:

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

کلیرسا: مجھے نہیں پہچانا۔ روس کی ایک چھوکری نے تم کو قید کر لیا۔ ہم وہ ہیں۔
آزاد: او ہو، یہ مس کلیرسا ہیں۔ پناہ آپ سے الٰہی تیری پناہ۔
کلیرسا: یاد تو کروگے عمر بھر نہ بھولوگے۔ چلے تھے مقابلہ کرنے۔

آزاد : واہ. کیا خوب. اتنے بوسے لیے کہ تمہارا ہی دل جانتا ہوگا:

قند آمیختہ با گل نہ علاج دل ماست
بوسہ چند بیامیز بدشنامی چند

ہم تو بوس و کنار پر جان دیتے ہیں ایک بوسہ دے جان لے لے. مگر ایسا حسین ہو بھی تو. یوں تو سب کو دعویٰ ہے کہ ہم معشوق ہیں. مگر:

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئین سروری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

کلیرسا: ابھی تک لن ترانی ہی کی لیے جاتے ہو. پھر بوسے لیے تو کیا ہوا ہم سپاہی آدمی ہیں ہمیں کوئی بوسوں سے کیا دھمکائے گا بھلا. بوسے لیے پھر؟

آزاد : اوہ کس غصے اور عتاب سے تم پیش آئیں کہ الامان الامان:

ہردم آزردگی غیر سبب راچہ علاج
ماگذشتیم ز لطفِ تو غضب راچہ علاج

آخر اس قدر خفگی کا سبب کیا تھا.

کلیرسا: اگر سبب خاص بیان کروں گی تو تم کو بُرا معلوم ہوگا.

آزاد : قسم لو جو ذرا بھی بُرا معلوم ہو. آپ بے تکلف فرمائیے.

ھیڈا : اچھا تو اس سے فائدہ کیا کوئی سبب ہوگا، بیتاب کیوں ہوئے جاتے ہو.

آزاد : ہم تو سمجھے تھے کہ اب اسی قید خانے میں عمر بھر رہے. یہیں بوڑھے ہوں گے اور یہیں مریں گے یہیں قبر بنے گی. کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوگی. کہ آزاد کا حشر کیا ہوا. ادھر تم اُدھر حسن آرا بیگم. کڑھیں گی مگر یہ کیا معلوم تھا کہ:

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد — عالم پیر دگر بار جوان خواہد شد
ارغواں جام عقیقے بہ سمن خواہد داد — چشم نرگس بشقائق نگران خواہد شد

گل عزیز است غنیمت شمریدش صحبت — کہ بباغ آمد ازیں راہ وازاں خواہد شد
زیں قطادل کہ کشید از غم ہجران بلبل — ناسرا پردۂ گل نعرہ زناں خواہد شد
ایدل از عشرت امروز بفسر دا فگنی — مایۂ نقد بقارا کہ ضماں خواہد شد
مطربا مجلس انس ست غزلخواں وسرود — چند گوئی کہ چنیں مست وچناں خواہد شد

گرز مسجد بخرابات شدم عیب مکن
مجلس وعظ دراز ست وزماں خواہد شد

یہ کل دیوان حافظ نشے کی ترنگ میں پڑھ جاتے کہ مِس میڈا نے کہا آپ گلگشتِ چمن کے حیلے سے چلیں۔ شاید موقع ہاتھ آئے۔ دو کوس زمین کا طے کرنا مشکل ہے۔ اس کے بعد پھر ان سب کا کوئی خوف نہیں۔ اور آزاد اور خوجی اور مس میڈا اور مس کلیرسا اٹھنے کو سب اُٹھے مگر لرزتے اور کانپتے ہوئے۔

آزاد کے سر پر وحشت سوار ہوئی تو چلتے چلاتے اِس فتنۂ خوابیدہ کے بیدار کرنے کی فکر کی۔ قریب جاکر عارض رنگین کا بوسہ لیا اور بہ آواز بلند یہ اشعار زبان پر لائے:

اے در چمن خوبی رویت چو گلِ خودرو — چینِ شکن زلفت چوں نافہ چین خوشبو
لعلت بُدرِ دندان بشکست لب پستہ — زلفت نجم چوگان بر بود دلم چون گو
آن رانکہ زلف ست یا لخلخۂ عنبر — یا غالیہ می ساید در باغچۂ حسن او

ماہ است زنخت یاروز مشک ست کہ زلف تو
سیمست برت یا عاج سنگ ست دلے یارو

میڈا: ہائیں ہائیں۔ اِس وحشت کے صدقے۔ خدارا کہیں اب نہ یہ حرکت کرنا۔
کلیرسا: یہ دھروا دیں گے۔ اب ان کو بھی اور نہ دینا۔ یہ بہت چل نکلے ہیں۔
میڈا: چلو۔ چلو۔ اِس طرف چلو۔ خدا خیر کرے۔ ابھی اگر جاگ اُٹھے تو سب مصیبت میں پڑیں۔
خوجی: بھائی جان غنیمت سمجھو۔ چپ چپاتے یہاں سے بھاگو جی:

بولا وہ یہ زلف ہاتھ لیتی
ہے سانپ کے مُنہ میں اُنگلی دیتی

گلزارِ نسیم پلاؤ نہیں۔ ایک بوسے کے عوض تمام عمر بھگتو گے۔

الغرض خدا خدا کرکے باہر گئے تو دیکھا کہ پہرے والے خود سو رہے ہیں۔ روشوں میں جا بجا

عورتیں ہیں. مگر ان سے کسی نے مواخذہ نہ کیا یہ پہاڑ کی سیر کر کے بائیں جانب سے اُترے وہاں ان کے گھوڑے تیار کھڑے تھے.

اب سُنیے کہ مس کلیرسا اور مس میڈا اور آزاد اور خوجی چار آدمی اور تین گھوڑے خوجی چکراتے اور وقت کجا کہ ان کے لیے فکر کی جاتے.

خوجی : مرے تو ہم. ارے یار اب ہم کیا کریں بھائی.

آزاد : خدا حافظ ہے. اب تو زیادہ بک بک نہیں کر سکتے. خوجی تم کو اس سرزمین کے سپرد کیا. اب اس وقت کیا ہو سکتا ہے. اگر زندگی ہے تو لڑھکتے ہوئے ہرمزجی تک آجانا. ورنہ خیر تمہیں اختیار ہے.

خوجی : فی امان اللہ. خدا تم کو صد وسی سال کی عمر عطا کرے آمین.

میڈا : دیکھو خواجہ ہم مجبور ہیں. آزاد کو چھوڑ نہیں سکتے. ہم میں سے کوئی یہاں رہ نہیں سکتا.

خوجی : اجی جناب آج کے آٹھویں دن بندہ قسطنطنیہ میں ہوگا.

راوی : کیا کہنے ہیں اس اولوالعزمی کے چشم بد دور. خواجہ صاحب کا دم غنیمت ہے مگر اب دیکھیے کیا گت ہوتی ہے. یقین تو ہے کہ شہزادی سب کا بدلہ انھیں سے لے. خوب درست ہوں گے.

آزاد : خواجہ صاحب اگر مجھ سے شاکی ہو تو کہہ دو واللہ فوراً اُتر پڑوں.

خوجی : کچھ خیر ہے. بس آج مواکل دوسرا دن. تم جوان آدمی ہو. بسم اللہ کرو. ع

در کار خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست

آزاد نے سلام کر کے گھوڑے کی باگ اُٹھائی تو خوجی آبدیدہ ہو گئے. جب تک گھوڑے نظر آئے ٹکٹکی باندھے دیکھا کیے اور جب نظر سے اوجھل ہوئے تو جناب باری کی درگاہ میں دعا مانگی. کہ بار الٰہا آزاد کو سرخرو اور فائز بمرام کر.

آزاد : میڈا گھوڑے بہت تیز نہ دوڑاؤ ٹاپوں کی آواز نہ آئے.

میڈا : (شوخی کے ساتھ) واہ. کیا مجال ہے جو کوئی گردِ توسن کو بھی پاتے.

آزاد : اللہ ری شوخی اور اُف ری تیزی:

در شوخی و دلبری بتِ من طاق است

بیچارہ دلم بوصلِ او مشتاق است

پستہ دہن و لالہ رُخ و سیمیں تن

شیریں سخن و ظریف و سیمیں ساق است

کلیرسا: اس وقت ہم سب کلبلون پر ہیں۔ (گھوڑے کو تیز کرکے) ہپ ہپ۔

متیڈا: (مُسکراکر) اور تیز۔ اور تیز۔ ایک جام تو دو آزاد:

می نوش کہ عمر جاودانی ایں ست

خاصیتِ روزگار فانی ایں ست

ہنگام گل ولالہ و یاران سرمست

خوش باش و می کہ زندگانی ایں ست

خواجہ بدیع صاحب لڑھکتے پڑھکتے اُنھیں ایرانیوں کے پاس پہنچے جن سے پیشتر گفتگو ہوئی تھی۔ محمد اطہر ایرانی نہایت تپاک سے پیش آئے۔ خواجہ صاحب حسب معمول فارسی میں گفتگو کرنے لگے۔ فرمایا کہ بابائے من این وقت مارا گرسنگی بسیار زدہ است۔ (یعنی بھوک بہت لگی ہے) اگر یک پارچہ نان (روٹی کا ٹکڑا) وآب زلال در کٹورہ بدہندے چہ شود کہ۔ ع

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دوکار

شمار ثواب دنیاوی واخروی حاصل ومن بدیع را گرسنگی زائل شود۔ (اے سُبحان اللہ۔ حاصل اور زائل کا قافیہ کتنا خوب آیا ہے۔ پھڑکا دیا) ایرانی نے مسکرا کر خدمت گار کو آواز دی اور کہا ان کو کھانا کھلوا دو۔ خدمت گار گوشت اور روٹی لے آیا۔ خواجہ صاحب بسم اللہ کہہ کر دستر خوان بچھا کے ہتّے لگانے لگے۔ مگر مٹھاس کے بغیر کھانا اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ خدمت گار سے کہا۔ غلام بابا من بدیع ایں سخن بشنو۔ کہ در گوشت میگویم کہ من بدیع عادی آشامیدن افیون ہستم۔ بغیر از شکر لقمہ از دہاں نمی دھسد (یعنے شکر کے بغیر منہ سے لقمہ نہیں دھستا۔ کیا خوب ماشاء اللہ) اس نے دودھ اور شکر لادی۔ جب کھانا کھانے سے فراغت پائی تو ایرانی کے پاس جاکر گفتگو کرنے لگے۔ ایرانی سے فرمائش کی کہ کوئی حکایت بیان کیجیے انھوں نے کہا لڑکپن میں جو پڑھا تھا وہ یاد ہے۔ ایک نقل سُنیئے یہ کہہ کر نقل یوں بیان کی۔

نقل ست کہ ابلہے درراہ میرفت، و مادر او نیز ہمراہ بود۔ ناگاہ درراہ تشنہ شدہ ایک چاہ پیش آمد آں ابلہ رسن درچاہ انداخت صورت خود را در چاہ دید فریاد کرد کہ اے مادر کسی در چاہ نشستہ است۔ مادر پیش آمد۔ درچاہ نگریست صورت خود را و پسر را در چاہ یکجا دید۔ گفت اے سرمردے ہست و قحبہ تیز با دست پس بدانکہ احمقان خود را غیر می بینند۔ وازینجاست کہ گفتہ اند:

ہمچو آن ابلہ کہ تاب آفتاب	دید بر دیوار و حیران شد شتاب
عاشق دیوار شد کان باضیاست	بیخبر کان عکس خورشید شماست

چوں باصلِ خویش پیوست آں ضیا | دید دیوار سیہ ماندہ بجا
ہمچو صیادے کہ گیرد سایۂ | سایہ کے گردد ورا سرمایۂ
سایۂ مرغے گرفتہ مرد سخت | مرغ حیران گشتہ بر شاخِ درخت
کیں مرقع ہر کہ بینند عجب | نیست بالکل ہست پوشیدہ عجب

گرتو گوئی جزو پیوستہ گل ست
خار ہنجور خار پیوستہ گل ست

خوجی نے کہا اس روایت سے کیا مطلب سمجھ ہی میں نہیں آیا۔ ایرانی نے یوں جواب دیا مقصو
ازیں تمثیلات آنکہ بذاتے کہ غیر حق موجود نیست ہر چہ ہست ہمہ حق ہست ۔

کثرت چو نیک در نگری عین وحدت ست
مارا شکے نماند ترا گر دریں شک ست

خوجی: ایں اشعار اصلاح طلب ہستند۔ باز بگو تا من بدیع طرفہ شاعر ہندی نژاد و بدخشانی
الاصل اصلاح دہم بنیوا و توجروا ۔
راوی: بارک اللہ اس بنیوا و توجروا کا کس موزوں مقام پر استعمال کیا ہے۔ شاباش واہ خواجہ
بدیعا کیوں نہ ہو۔ فارسی کے محقق کامل ہو۔
ایرانی نے دو شعر پھر پڑھے اور مسکرا کر کہا کہ اصلاح دے دیجیے۔ تو کمال احسان ہوگا:

ہمچوآں ابلہ کہ تابِ آفتاب | دید بر دیوار و حیران شد شتاب

عاشق دیوار شد کاں بر ضیاست
بیخبر کاں عکس خورشید شماست

خوجی نے کہا۔ الغلط۔ ع

خود غلط انشا غلط اِملا غلط

یوں کہو۔

ہم چو آں ابلہ کہ شد حیران شتاب
دید بر دیوارِ چوں دھوپِ آفتاب

ایرانی نے دھوپ کے معنے پوچھے تو آپ نے فرمایا۔ تابِ آفتاب را در ملکِ من کہ عبارت
از ہندوستانست دھوپ میگونید و ایں در فارسی اشعار ہا غلط نیست چرا کہ ملا طغرا در شعرے

گفت وآن اشعار بخوانم ۔ ع

موسمِ آن باشد کہ مینا رنگ ہندی سر کند

مینا لفظ ہندی باز شمارا چہ مجال ست کہ اعتراض میکردی ۔

از مرد ملک دیدہ بباید آموخت

دیدن ہمہ کس راہ نہ دیدن خود را

المومن مرآۃ المومنین در حدیث آمدہ است وصحیح ہم ست ۔

راوی : حضور کو عربی اور فقہ میں بھی دخل ہے ۔ اللّٰہم زدفزد ۔

خوجی : واشعار من بدیع بشنو کہ وجد کنی بابا من بشنو ۔

کنم تا بندگی در خانۂ حق — دلم گردد مقید بہر مطلق

یکے مسجد بود در طرف ایں باغ — کہ گردیدہ فلک از فعتش داغ

چو کعبہ سر بسر از سنگ تیرہ — ولی از نور فیضش چشم خیرہ

تعالی اللہ ازیں دریا چہ نور

کہ موجش میزند گلبانگ منصور

ایرانی : ایں حال شماست ۔ گل گفتی ، چشمِ بد دور ۔

خوجی : پدرم خار میگفت من گل گفتم و فرزندِ من آزاد گلدستہ میگوید ۔ و فرزند زادہ باغ و راغ خواہد گفت فہمیدی بابا من بدیع :

گشت چوں بلبل زخمی متوفی در باغ

شد باندوہ بدل شادی گلہا در باغ

سنبل آورد بکف از پرِ مرغان مقراض

کہ زبانم بر بروز لفِ مطرّا در باغ

اکنون مرا بگو کہ بچہ طور بملک خویشتن رفتن خواہم نمود ۔ چہ کہ من در فاصلہ فرسنگ بر فرسنگ داد ملک بسیار راہِ دراز ۔

حبّ الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر

خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

خوجی باتیں تو ادھر کرتے تھے مگر دل اور طرف تھا ۔ کانپ رہے تھے کہ دیکھیے کہ اُس حرکت

جنونانہ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان کو شک کی جگہ یقین تھا کہ آزاد ضرور گرفتار ہو جائیں گے۔ پولینڈ کی شہزادی کا نشہ اُترا اور اُس نے آدمی دوڑائے اِن کو اپنے جلا وطن ہونے کا مطلق رنج نہ تھا۔ مگر آزاد کی بے کسی اور حالتِ زار آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی تھی۔

ایرانی سے آزاد کے بھاگنے کا حال بالکل مخفی رکھا۔ محمد اطہر نے خوجی کو چند اشعار تصوف سُناتے:

چوں ندیدم خویش را در ابتدا من بودہ ام
درمیان ہم نیست جز من انتہا من بودہ ام

رفتم اندر فکر کیں مردم چرا غیرِ من اند
فکر چوں حل گشت دیدم جملہ از من بودہ ام

در حقیقت چوں نگہ کردم وجودِ جملہ را
عرش و کرسی و ثریّا تا ثری من بودہ ام

در درون و در برون و در نہان و آشکار
برّ و بحر و جملہ بازار و سرا من بودہ ام

جہل و علم و رنج و راحت فقر و گنج و کیمیا
علت و معلول و دارو و شفا من بودہ ام

خوجی: ہاں اشعار خوب است ہمہ شے من بودہ ام۔ ہم دریں زمین چیزے خواہم گفت ہمیں دم فکر تازہ خواہم نمود۔ بگویم بشنو۔ کہ چہ و بچہ طور میگویم قابل سماعت است ہمہ شے:

ابتدا من بودہ ام ہم انتہا من بودہ ام
انتہا من بودہ ام ہم ابتدا من بودہ ام

راوی: ان کل اشعار سے یہ شعر بڑھ گیا۔ کیا نادر مطلع ہے۔

خوجی: شعر ثانی ازیں مطلع من بدیع عمدہ تر بود۔ انشا اللہ۔

مرغکے بودم خرک بودم ہما من بودہ ام
انچہ بودم از ازل خواجہ بدیعا بودہ ام

راوی: دریں چہ شک مگر مرغ اور خرک اور ہما کی گرہ اچھی لگائی۔

خوجی: ومصرع ثالث ازیں ہر دو رامات کردہ دہر کہ اعلیٰ است۔

کل شیٔ ہالک ــــ الّا خدائے من بودہ ام
یک شوم لیکن دریں سُو چوں خدا من بودہ ام

شائقِ افیوں و چانڈو چرس من بودہ ام
قابلِ پابوسِ جاناں ہم حنا من بودہ ام
بر چپیتنگا ہم زدہ یک مشت ضربت زعفران
اے سرت گردم بسوی من بیا من بودہ ام

راوی: سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ من بودہ ام کو کیا خوب بناہتے آتے ہیں۔ زعفران بواز عفران جاشن سے مراد ہے جس نے ان کو چپتیا یا تھا۔

اس سلاست پر ہمیں ایک نقل یاد آئی۔ لکھنؤ میں بعہد حضور کجکلاہ واجد علی شاہ رائے دلارام صاحب کی عالی شان بارہ دری میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ پنڈت بشمبر ناتھ صاحب ہجرؔ لکھنوی (خدا بخش بیامرزد) میر مشاعرہ تھے۔ توڑا سانپ کا اور جوڑا سانپ کا اور کوڑا سانپ کا اس قسم کی طرح تھی۔ اکثر شعرائے گرانمایہ اپنی غزلیں پڑھ چکے تھے کہ ایک صاحب نے جن کا سن شریف اسّی سے تجاوز کر گیا تھا اور جن کی بھویں تک سفید ہوگئیں تھیں۔ میر صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا جو شعرا کے سامنے اکّا رکھتے تھے کیا کہوں صاحب اب شاعری خواجہ صاحب اور شیخ صاحب کے شاگردوں پر ختم ہے اِدھر اکّا لائیے۔ میر صاحب نے کہا حضرت اکّا حاضر ہے۔ معاف فرمائیے میں سمجھتا تھا کہ آپ مولوی آدمی ہیں۔ شعر نہ کہتے ہوں گے۔ بسم اللہ فرمائیے۔ حضرت نے بہت ڈپٹ کر مطلع پڑھا جس کا مصرع ادلیٰ وجد کرنے کے قابل ہے۔ ع

ہی سپستان فارسی ہندی مسوڑا سانپ کا

تمام مشاعرہ پھڑک گیا۔ کیا خوب فرمایا ہے ماشا اللہ سانپ کا ثبوت کیا خوب دیا ہے۔ سُبحان اللہ سُبحان اللہ۔

ایرانی اِن کے اشعار آبدار سن کر بہت ہنسا کہا آپ واقعی بڑے شاعر غرّا ہیں کیا نادر کلام ہے اور محاورات وروزمرہ پر تو آپ ایسے حاوی ہوگئے ہیں کہ آپ ہی کی مادری زبان ہے۔ خواجہ صاحب اکڑ کر بولے اجی میں نے مصر کے کانسل کو چکرا دیا۔ وہ وہ فقرے لکھے کہ میاں صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ جی حضرت دل لگی نہیں ہے۔ ع

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

مگر اب یہاں تو قیدی ہیں۔

در قفس بسیار ناشادیم ما　　از فراموشان صیادیم ما

ملک باشد کو کہ در سر دشت غم　　وارث مجنوں و فرہادیم ما

ایں زمان محتاج قاصد گشتہ ام

پیش ازیں دل می فرستادیم ما

ایں ہم من بدیعاست کہ اکنوں بگفتم۔ شنیدہ بودی یا نہ۔

محمد اطہر نے ان سے دریافت کیا کہ اب آپ قید سے رہا ہوئے تو اپنے وطن کیوں نہیں گئے۔ خوجی آہ سرد بھر کر یہ اشعار پڑھنے لگے۔

سبز کردم بہ گریہ ہاموں را　　ساختم شاد روح مجنوں را

گردش چشم یار را نازم　　کرد معزول دور گردوں را

سادہ بودست نام ام واقف

گریہ رنگیں نمود مضموں را

ایرانی نے فرمائش کی کہ آپ اپنا کچھ کلام سنائیے۔

زما بلبلان نغمہ رنگین نخیزد

نجوں تا نویسیم منقار خود را

اتنے میں ایک آدمی نے آن کر علیک سلیک کے بعد ایرانی سے کہا کہ آج آپ شہزادی کے ہاں مدعو نہیں ہوئے وہاں تو بڑا جشن ہے۔ جلسہ ہو رہا ہے۔ ہزاروں کی شراب لنڈھائی جاتی ہے۔ کئی حسین اور نوجوان شہزادے آئے ہیں۔ اُن میں سے ایک پری پیکر اور نوخیز کے ساتھ شادی قرار پائی ہے۔ مگر وہ قسمت کا دھنی معلوم ہوتا ہے۔ جس نے ایسی خوبصورت اور زیبا اندام بیوی پائی۔

شکر شکر بشکرانہ بے فشاں حافظ

کہ نگار خوش و شیرین حرکاتم دادند

ایرانی : جام ہو اور ہو حق کی صحبت کے لیے۔ رندان می آشام موزوں ہیں۔ ہم زاہد خشک ہم کو جام سے واسطہ نہ دلارام سے۔

خوجی : واہ۔ واہ شراب تو آئینہ عقل کو جلا دیتی ہے۔ سنا نہیں :

می خور می خور اگر خدا می خواہی
ناکردہ گناہ پیش قاضی نبرند

ایرانی : بجا ارشاد ہوا، درست تو پھر آپ بسم اللہ کیجیے۔

جوجی : خم کے خم خالی کر دیے۔ ساقی کے صدقے برسوں پی :

گویند بہشت و حور و کوثر باشد
وانجا مئے ناب و شہد و شکر باشد
پر کن قدحِ بادہ کہ در دستم نہ
نقدے ز ہزار نسیہ بہتر باشد

روسی : سُنا سب کے سب بیہوش ہو گئے ہیں۔ کسی کو ہوش ہی نہیں :

اس قدر بادۂ عشرت نے کیا ہے مدہوش
مجھ کو اپنے سر و پا کی بھی خبر کچھ بھی نہیں

خیمہ میں نشست ہے۔ اور کسی کو اندر جانے کا حکم نہیں ہے۔

ایرانی : اور وہاں کون کون ہے۔ دس پانچ آدمی تو ضرور ہوں گے۔ کیا شادی آج ہی ہوگی۔ اور ہم کو دعوت ہی نہیں دی۔

روسی : وہاں آزاد ہیں۔ جنرل ترکی اور ایک مسخرہ۔

خوجی : (تیکھی چتون کرکے)

تمہاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ
کبھی نہ آپ سے ہم دب کے بانکپن میں رہے

ایرانی : ایسا نہ ہو کہ آزاد دو ایک آدمیوں کو قتل کر ڈالے۔

روسی : لوگ تو کہتے ہیں کہ آزاد کی مشکیں کسی گئی ہیں۔

خوجی : اجی کہاں کا جھگڑا نکالا۔ کچھ حقانی باتیں کرو۔

این نقش ہا کہ ہست ہمہ در نمایش است — اندر نظر چو صورتِ بسیار آمدہ
این یک حقیقت ست دلے در صفات خویش — راعیانِ ممکنات باطوار آمدہ

این موج ہاز بحرِ محیط حقیقی ست
این وحدت ست لیک بتکرار آمدہ

ایرانی: حق ہے حق ہے۔ بے شک۔ ع

ایں وحدت ست ــــــ لیک بتکرار آمدہ

خوجی: اجی ایسی ایسی ہزاروں ابیات سُناؤں۔ کیوں صاحب ولی اللہ حق کو پہچانتے ہیں یا نہیں اس کا جواب مختصر دیجیے۔

ایرانی: جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے حق کو پہچانا وہ ثابت کرتے ہیں کہ غیر حق ہیں۔ ورنہ حق کو پہچاننا کیا معنی وہ تو خود حق ہیں۔ کوئی شے عین خود نہیں دیکھ سکتی:

باشارت سخن توان گفتن — کہ نہ فہمد کسے بگفت ایں راز

ایں سخن راز بان نمی داند — جانست آگہ ولیکن از ایں راز

ایں سخن را تو گر شوی محرم — ہر کجا بشنوی ہمیں آواز

کہ ہمہ چیز ہست کیست ببین

کیست را بحجاب اوست ببین

خوجی: واہ یہ عجب بات ہے، بلا بحث نہ بتائیں گے ہم کو تشفی کر دو تو سبحان اللہ۔

ایرانی نے کہا برادر نادیدن درمیان ست ہنوز شرکت ست واز ہمیں وجہ تعنیات را غیر وجود گویند و وجود وحدت را منشا کثرت خوانند۔

معشوق عیاں بود نمی دانستم — تا من بمیان بود نمی دانستم

شب با تو غنودیم و نمی دانستم — روزت بہ تو بودیم و نمی دانستم

گفتم مطلب مگر بجای برسم — خود تفرقہ آں بود نمی دانستم

دانستہ بدم بخود کہ من من بُودم

من جملہ تو بودیم نمی دانستم

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک شخص نے آن کر کہا (کچھ اور بھی سُنا۔ آج شہزادی نے اپنی شادی کی تقریب میں بڑا جشن منعقد کیا تھا۔ کسی شہزادے کے ساتھ شادی ہونے کو تھی۔ مگر اِس قدر پی گئے کہ ہوش وحواس رفو چکر ہو گئے۔ اور آزاد اور اُن شہزادوں کا پتا نہیں۔ سُنا کہ آزاد نے اُن کو قتل کر ڈالا۔ اور لاشیں کہیں پھینک دیں۔ پچاس سوار آزاد کی تلاش میں گئے ہیں۔ اِس خبر بد نے خوجی کو خون رولایا۔ دیوانہ وار اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اور (خبر بد خبر بد) یہی کلمہ زبان پر آتا تھا:

دل می رود ز دستم صاحبدلان خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

پھر مصیبت پڑی

اُدھر وہ دونوں پری زاد اِدھر آزاد فرخ نہاد افراسِ خوش خرام و تیز گام کو کڑکڑاتے اور چمکاتے جاتے تھے۔ اور سمندِ باد رفتار برقِ جہندہ کی طرح اٹکھیلیاں کرتے ہوتے دریا کی سمت آتے تھے۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے تھے۔ طرارے بھرتے تھے۔ آزاد نے بادلِ شاد اپنی معشوقہ پری زاد سے کہا خدارا کہیں اس وقت کسی سے لڑوا نہ دینا کہ مفت میں جھگڑا ہو، اور دھر لیے جائیں۔ فرانسیس کا کپتان تو کیا مال ہے۔ اگر جنرل آئے بھی تو کیا پروا ہے۔ گھٹنا ٹیک کے وہ تلا ہوا ہاتھ دوں کہ یاد کرے، چھٹی کا دودھ یاد آجائے:

ساقیا برخیز و دردہ جام را
خاک برسر کن غمِ ایام را

میڈا نے مسکرا کر مس کلیرسا سے کہا کہ بہن کچھ سمجھیں۔ ان کی بہکی بہکی باتیں سنیں یہ مس کلیرسا مسکرائیں بہن ہمیں ایسی بہت صحبت رہی ہے۔ اس وقت انھوں نے پی بھی بہت ہے۔ اور اس وقت ہوا بھی خنک ہے۔ بس لے اُڑی اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہ بادہ خواری کے عادی نہیں۔ زبردستی پلائی گئی۔ مجبور ہو کے پینے لگے۔ اتنے میں آزاد پاشا نے پھر بہکی ہوئی باتیں شروع کیں۔ اس مرتبہ مس کلیرسا کی طرف مخاطب ہوتے۔ اگر وہ پرکالہ آتش پولینڈ کی شہزادی بیدار ہو جاتی تو معاذ اللہ ستم ڈھاتی۔ ع

گفتمش فتنہ است خوابش بردہ بہ

فتنہ خوابدہ کا بیدار ہونا اچھا نہیں چاہا تھا کہ رخِ انور کے ہزاروں بوسے لوں۔ مگر سوچا کہ سانپ کے منہ میں انگلی دینا جہالت ہے:

گرچہ کس بے اجل نخواہد مُرد
تو مرو در دہانِ اژدرہا

اب سوال یہ ہے کہ یہاں سے دریائے ڈینیوب کیوں کر عبور کریں گے۔ مس کلیرسا نے اُن کی

تشفی کی اور کہا کہ ہم لے چلیں گے۔ شب کے وقت ہم اور مس میڈا ہوں گے اور تم لباس بدل کے چلنا۔ فرانسیسی خوب بولتے ہو کوئی نہ کہے گا کہ یہ ترکی ہیں۔ مس میڈا بولیں یہ ترک نہیں ہندی ہیں۔ مگر جس طرح ترک حسین اور خوبرو اور طاقت ور اور گران ڈیل اور قوی الجثہ ہوتے ہیں۔ اُسی طرح یہ بھی سُرخ و سفید اور کرارے جوان ہیں۔ ترکوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ آزاد نے خواہش ظاہر کی کہ اب کسی مقام پر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرنا چاہیئے۔ ورنہ گھوڑے شل ہو جائیں گے۔ ابھی کنارۂ دریا دُور ہے۔ خدا نے چاہا تو بیڑا پار ہے۔ ورنہ خدا حافظ و ناصر ہے۔

کشتی شکستگانیم ای باد شرط برخیز
باشد کہ باز بینیم آن یارِ آشنا را

مس کلیرسا کی رائے تھی کہ ابھی قیام کرنا خلاف مصلحت ہے۔ مگر میڈا پریشان ہوگئی تھیں آزاد کی آنکھیں جھکی پڑتی تھیں۔ لہٰذا گھوڑے روک لیے اور آزاد سب کے پہلے پشت توسن سے اُترے ان کے بعد مس میڈا ان کے بعد کلیرسا۔ پشت توسن سے اُتر کر میڈا ایک ٹیلے پر بیٹھیں۔ ہری ہری دُوب آنکھوں کو خضارت اور نور ہموفور بخشتی تھی۔ میاں آزاد نے مس کلیرسا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ٹہلنا شروع کیا۔

کلیرسا: اس وقت کلیجہ دھڑک رہا ہے۔ کہیں جلدی سے نکل چلیں۔

آزاد: عاشق و معشوقی دل لگی نہیں ہے۔ سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اوّل ولے اُفتاد مشکلہا

کلیرسا: ہم تو جانتے ہیں کہ کل تک اُس کافر بدکیش کی آنکھ نہ کھلے گی۔

مرے تو نشۂ اُلفت اُتر گیا عاشق
وہ کیا شراب تھی جس کا خمار تک نہ رہا

آزاد: تا بلکے۔ ہم تو اُس دن سمجھیں کہ بچ نکلے جب دریائے ڈینیوب کے اُس کنارے پر ہوں ورنہ ابھی تو بچنا نہ بچنا سب یکساں ہے۔

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

کلیرسا: اگر اُس کی آنکھ کھلی تو دھر لیے گئے۔ ورنہ بچ نکلے۔

آزاد : خیراب اس وقت ہنسی مذاق کی باتیں کرو۔
مَلیڈا : ہنسی مذاق تو ہوا ہی کرے گا مگر اب ہم کو لڑنا پڑا۔
آزاد : کیا لڑائی کیسی۔
مَلیڈا : ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیرسا سے رقابت ہو جائے گی۔
آزاد : ارے! اچھا۔ ایں گلِ دیگر شگفت :

شگفتہ شد گلِ حُمرا و گشت ـــ بلبل مست
صلائے سرخوش ایں صوفیان بادہ پرست

مَلیڈا : یہ جوان عورت کا ہاتھ پکڑ کر علاحدہ لے جانا چہ معنی دارد۔
کلیرسا : چہ خوش پھر تم جل مرو۔ آزاد تم ہمارے ساتھ شادی کرو۔
آزاد : میں بھی اسی فکر میں ہوں مگر :

من درچہ خیالیم و فلک ـــ درچہ خیال
کاریکہ خدا کرد فلک ـــ درچہ مجال

کلیرسا : بس خدا کی یہی خواہش ہے کہ ہم تمہاری بیوی ہوں۔
آزاد : آمین آمین ثم آمین۔ ع

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مَلیڈا : اچھا جلاؤ۔ میں بھی اسی طرح قید کر دوں گی۔
آزاد : چشم بد دور۔ کیا خوب اے کیوں نہیں۔

ایک مقام پر آزاد پاشا اور کلیرسا بیٹھے تو اور بھی چہل ہونے لگی آزاد شعر خوانی میں مصروف ہوئے اور یہ شعر زبان سے ارشاد کیا :

ایں سبزہ و ایں چشمہ و ایں لالہ و ایں گُل
آں شرح ندارد کہ بہ گفتار درآید

آزاد پاشا اس وقت نشے میں چور سرمست و مخمور تھے۔ آسمان کی طرف نظر کر کے کہا یا خدا میں گنہگار بندہ ہوں۔ کروڑوں گناہ مجھ سے سرزد ہوئے ہیں۔ مگر خداوندا تو ہی خوب جانتا ہے کہ میں نے بدرجہ مجبوری اِس مردار کو مُنہ لگایا۔ ہرگز میری دلی خواہش نہ تھی۔

کیا ذکر شراب یار توبہ خاور
رہ ایسا نہ شرمسار توبہ خاور
دوزخ میں جلیں گے می کے پینے والے
توبہ خاور ہزار توبہ خاور

میری حالت زار قابل افسوس ہے۔ مگر اس وقت میں بالکل مجبور ہو گیا تھا۔ توبہ کر چکا ہوں مگر ساقی توبہ شکن نے توبہ شکنی کی۔

یوں تو اے ابر پتا ہی نہیں ملتا تیرا
توبہ کرتے ہی جھلکتی ہی سیاہی تیری

خداوندا اگر واقعی میرا گناہ ہے تو میں اپنے گناہ پر منفعل ہوں۔

ہر کہ از تقصیر خود شد منفعل
آب رحمت از جبینِ خویش یافت

کلیرسا : یہ آبدیدہ ہونا کیا معنی۔ آبدیدہ کیوں ہوتے۔
ممتیڈا : اس وقت پھر جوش ہے۔ پی بھی تو بہت زیادہ گئے تھے۔
کلیرسا : خدا کی طرف مخاطب ہو کر کچھ کہہ رہے ہیں۔
ممتیڈا : یہ آخر سو رہنا کیا معنی، اٹھو ایسا نہ ہو۔ یہیں سو رہو۔ اب یہاں سے بھاگنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کوئی تلاش کرتا ہوا آجائے۔
آزاد : ہم اس وقت اور ہی خیال میں ہیں۔

دستی دہم بہ یار کہ بدمست می رود
دستی بدل نہم کہ دل از کار می رود

اب دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ بس ممتیڈا۔ اب تو ہم کلیرسا کے ساتھ شادی کیے لیتے ہیں پھر دیکھا جائے گا۔ اب صبر نہیں ہے۔

دل می رود ز دستم صاحبدلان خدا را
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

ممتیڈا : بس کلیرسا۔ بہن دیکھو۔ یہ باتیں اچھی نہیں۔
کلیرسا : وجہ کیا سبب کیا ہم خوبصورت ہیں جوان ہیں۔ ہم پر ایک جوان رعنا ریجھا۔ پھر

آپ کو کیا۔ ہمارے حسن خدا آفریں پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ حوریں ہمارے دامن پر نمازیں پڑھیں۔

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام

قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

آفتاب بلا خیز کی نگاہ ہمارے رُخ انور پہ نظر ڈالے؟ کیا مجال۔

نسرین بہ چمن بر نزند گر بدن اینست

با غنچہ صبا دم نزند گر دہن اینست

یک دیدہ جلا یافتہ از نگہت یوسف

صد دیدہ جلا یابد اگر پیرہن اینست

مِس میڈا: اس وحشت کے صدقے۔ اس نشے کے قربان۔

کلیرسا: ذہن کے پکے ہیں۔ جو بات شروع کی وہی کہے جاتے ہیں۔

اتفاق سے ایک شخص اُدھر سے پانی لیے جاتا تھا۔ مس کلیرسا نے اُس سے پانی لیا۔ اور میڈا اور کلیرسا نے مل کر پانی چھڑکا تو ذرا آنکھ کھول دی۔ کلیرسا نے اور پانی چھڑکا۔

آزاد: (اُٹھ کر)۔ اب چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہوئی۔

مِس میڈا: ہاں اب یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں۔ اب بھاگنے کی ٹھہرے۔

آزاد: چلو ذرا سا پانی پینا چاہتے ہیں یہاں کہاں ملے گا۔

کلیرسا: اس میں ابھی پانی ہے۔ پیو۔

آزاد: لاؤ اب اس بات کا فیصلہ ہو جائے کہ ہماری شادی کلیرسا کے ساتھ ہوگی۔ یا مس میڈا کے ساتھ کلیرسا کو چھوڑ کے میڈا کا نام لیا۔

کلیرسا: واہ چہ خوش میڈا کون۔

مِس میڈا: ہاں اور یہ تم نے کیا کہا کہ حسین ہوں، جوان ہوں۔ تم حسین اور جوان ہو۔ ہم نہیں ہیں۔ ہماری ایڑی اور تمہاری صورت یکساں ہے۔

آزاد: جوان اور حسین وہ جو ہماری بیوی ہو۔

کلیرسا: اب کچھ اور باتیں کرو۔

آزاد: فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے اور مس کلیرسا اور مس میڈا بھی سوار ہوئیں۔ چلے مگر کانپتے ہوئے۔ آزاد اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

چو محتاج خواہی شد آخر بدو　　متاب از وفاداری خویش رو
کسانے کہ فرمان رواگشتہ اند　　بگیرم ز حسن وفا گشتہ اند

وفاداری آئین شاہنشہی ست
غم عہد خوردن ز کار آگہی ست

انسان اس سے ملتفت ہے جو وفاداری سے پیش آئے۔

میل کسے کن کہ وفایت کند　　جان ہدفِ تیر بلایت کند
مہر چنیں دوست جانی کند　　دوستی جان ز گرانی کند
جان کہ از و بہ بجہان یار نیست　　ہیچ نیرزد چو وفادار نیست
یار توان یافت بگیتی بسے　　لیک وفادار نیابی کسے

صحبت آنکس کہ بصدق وصفاست
دامنِ او گیر کز اہلِ وفاست

تم دونوں باوفا ہو۔

دستِ وفا در کمر عہد کن
تا نشوی عہد شکن جہد کن

اور ہم عشق بازی کے معاملے میں ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ ان کان الکذب نیجی فالصدق انجی۔

راستی آنجا کہ علم برزند　　یاری حق دست بہم برزند
راستی خویش نہان کس نکرد　　بر سخن راست زیان کس نکرد
راستی آور کہ شوی رستگار　　راستی از ظفر از کردگار

چوں بسخن راستی آری بجائی
ناصر گفتار تو باشد خدائی

منیڈا : اب یہ باتیں تو بالائے طاق رکھو۔ اور تیز تیز چلو۔
آزاد : ابھی گھوڑے تھکے ہیں۔

فرس خوشترک ران کہ صحرا خوش ست
عنان در مکش بارگی دلکش ست

ابھی آہستہ آہستہ چلیے۔ تیز چلنے کی ضرورت ہی کیا۔ جلدی کا کام بُرا۔

کلیرسا : نہیں تیز چلنا چاہیے۔ سُستی اچھی نہیں ہوتی۔

میڈا : ہماری بھی یہی رائے ہے۔ اب جلد چلنا لازم ہے۔

آزاد : اچھا۔ ع

صلاحِ ما ہمہ آنست کان صلاحِ شماست

من نگویم کہ ایں مکن آں کُن
مصلحت بیں و کار آساں کُن

جب دو کوس نکل گئے تو مس کلیرسا کی طبیعت ناساز ہوئی۔ اُنھوں نے گھوڑے کی باگ روک کر کہا (آزاد ہمیں سنبھالو۔ ہماری طبیعت بہت سُست ہے) آزاد فوراً گھوڑے سے اُترے۔

آزاد : خیریت ہے۔ کیوں کیوں۔ مزاج کیسا ہے۔

تنت بناز طبیباں نیازمند مباد
وجود نازکت آزردۂ گزند مباد

میڈا بھی اُتریں اور کلیرسا کو گھوڑے سے اُتارا ایک صاف ستھرے مقام پر بٹھایا۔

آزاد : شطرنج ہمارے پاس موجود ہے۔ ایک نقشہ کوئی حل کرے تو جانیں۔ اور وہ نقشہ یہ ہے (شطرنج کی بساط بچھا کر)۔

آزاد نے کہا کہ یہ نقشہ اچھے اچھے شاطروں سے نہیں نکلا۔ کوشش بلیغ کی مگر فیل ہو گئے۔

میڈا : اچھا ہم تم دونوں مل کے حل کر دیں گے۔

کلیرسا : واہ دونوں؟ ہم اکیلے کافی ہیں۔

آزاد : اچھا پھر کوشش کرو۔ نقشہ یہ ہے۔

			سُرخ بازی				
شاہ سُرخ							سبز پیل
					وزیر سُرخ		
پیادہ سبز	پیادہ سبز	سُرخ پیادہ					
شاہ سبز		رخ سُرخ					
			سبز بازی				

تین چال میں سُرخ مات کرے۔

کلیرسا : اچھا ہم غور کریں گے۔

آزاد : منیڈا۔ ڈیر ایک اور نقشہ ہے اُس کو تم حل کرو:

شاہا دو رخ بدہ و دلا رام رامدہ
پیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشتِ مات

منیڈا : پہلے کلیرسا حل کر دیں۔ پھر ہم حل کریں گے۔ دیکھیں کون حل کرے۔

آزاد : واہ۔ نہ آپ حل کر سکیں گے نہ وہ کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔

منیڈا : آپ شطرنج کھیلنا کیا جانیں۔ بھلا شطرنج بہت مشکل ہے۔

آزاد : ہم اُستاد بے بدل اور مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔

منیڈا : اپنے مُنہ میاں مٹھو سبھی بننا جانتے ہیں۔

آزاد : خیر اب اس وقت ہم خاموش رہیں گے۔

دو چیز طیرہ عقل ست دم فرو بستن
بوقتِ گفتن و گفتن بوقتِ خاموشی

منیڈا : اچھا بتاؤ کون نقشہ ہے۔ دیکھیں تو سہی کیسا ہے۔

آزاد : بادشاہ نے ایک شخص سے شرط بد کے شطرنج کھیلی تھی اور بازی کی یہ کیفیت ہوئی،
مَتیڈا : اِس میں تو صریح مات ہے،
آزاد : مات نہیں ہے چال سُرخ کی ہے،
مَتیڈا : بے شک مات ہے، بھلا کھیل لو چاہے،
آزاد : تم غور کر لو نقشہ سامنے موجود ہے،

			سبز بازی				
		فیل سبز				شاہ سبز	
پیادہ سبز	پیادہ سبز				پیادہ سرخ	پیادہ سرخ	
			اسپ سبز				
						اسپ سرخ	رخ سرخ
							فیل سرخ
رخ سبز		رخ سبز					
	شاہ سرخ						رخ سرخ
			سُرخ بازی				

سُرخ مات کرے،

بس کلیرسا اور ہس مَتیڈا غور کر رہی تھیں، ایک شطرنج پر دوسری زمین پر اور آزاد اشعار پڑھ پڑھ کر ٹہل رہے تھے،

فروزاں رویش از فرِّ الٰہی   درخشاں کوکبے از برجِ شاہی
ابوالمحسن شہنشاہِ جوان بخت
کہ برخوردار باد از تاج از تخت

مَتیڈا : اب شطرنج تو ہوا ہی کرے گی۔ یہاں سے بھاگ چلنا اولی ہے۔ وہی مثل یاد رکھو جو کہی تھی کہ:

گرچہ کس بے اجل نخواہد مُرد
تو مُرو در دہانِ اژدرہا

آزاد : اب مطمئن رہو۔ کوئی نہیں آسکتا۔
کلیرسا : یہ نہ کہو۔ شاید آہی جائے تو کیا کروگے۔

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی ست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

اتفاق ہے کہیں لینے جانا ہے۔
آزاد : اچھا تو پھر ہم کو خوف ہی کیا ہے۔ آیا کرے پھر جائے گا :

تو پاک باش برادر مدار از کس باگ
زنند جامۂ ناپاک گاذران بر سنگ

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتاً ایک آدمی نے آزاد کی مشکیں کس لیں۔ میڈا اور کلیرسا ہائے کہہ کر بے ہوش ہو گئیں۔

زندانِ بلا

من ازان حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

ہمارے حبیبِ لبیب اور ادیبِ اریب۔ آزادِ فرخ نہاد بادل شاد اِن دونوں پری زادوں سے عشق کی گھاتیں اور مزے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ پیار اور محبت کا دم بھرتے تھے یکایک قہرِ خدا نازل ہوا۔ چند قوی ہیکل روسیوں نے پیچھے سے مشکیں کس لیں۔ میڈا کا رنگ فق ہو گیا۔ پیارے پیارے رخسار پر زردی چھائی۔ مس کلیرسا کے گورے گورے گال غم و غصّہ کے سبب سے تمتمانے لگے۔ میڈا نے اُن جفا کار روسیوں پر نظر ڈالی تو روح لرزنے لگی۔ کلیرسا نے کنکھیوں سے دیکھا تو کانپ اُٹھی۔ ہائے ابھی تو بے غل و غش لطف کے ساتھ گفتگو کرتے تھے اور اب دیکھتے ہی دیکھتے آزاد اسیر ہو گئے۔ ہے ہے انھوں نے کہنا نہ مانا۔ خود پرستی اور بدمستی نے کہیں کا نہ رکھا یا وہ مزے مزے کی حکایتیں اور شکایتیں تھیں۔ مس میڈا اپنے جوبن پر اتراتی تھیں۔ کلیرسا اپنے ناز و ادا کی توصیف کے پُل باندھتی۔ میڈا کو بتاتی تھیں۔ دونوں پریوں میں فرطِ محبت سے چُہل ہوتی تھی۔ اور یہ گفتگو تے اھنام

عربدہ جو آزاد کے دل سے گردِ کلفت دھوتی تھی۔ مگر چشم زدن میں وہ مصیبت پڑی کہ الامان الامان میاں آزاد کی آنکھوں میں تمام دنیا تیرہ و تار تھی کبھی معشوقہ گلگوں قبا مس میڈا پر نظر غلط انداز ڈالتے تھے کبھی ناطورۂ طاؤس زیب ملک فریب مس کلیرسا کے حسنِ صبیح کا نظارہ کرتے تھے۔ وحشتِ دل دم بدم بڑھتی تھی۔ آہوان صحرا بھی ان کی وحشت کے مقابل میں گرد تھے۔

وحشتِ دل نے کیا ہے وہ بیابان پیدا

سیکڑوں کوس نہیں صورتِ انسان پیدا

تین جوان روسی ان کے ارد گرد تھے۔ ہر ایک کشیدہ قامت فراخ پیشانی سینے چوڑے طلعتیں نورانی ہاتھ پاؤں سڈول سانچے کے ڈھلے ہوئے شانے بازو بھرے ہوئے شمشیر برآن لٹکائے پینچے کمر سے لگائے پرے جمائے آتے۔ معاً مشکلیں کس لیں ایک کی دوا دو۔ آزاد گو بانک پٹے لکڑی بنوٹ کے استادِ کامل فن تھے مگر نہتے اور بے خبر۔ طرہ اس پر یہ کہ آزاد ایک اور وہ تیس۔ آزاد نے بادل بردرد آہِ سرد بھری اور بصد جوش وخروش یہ اشعار زبان پر لائے:

بچرخِ چارم آو امیر سانم　　　فغان را تا مسیحا میر سانم

بدل جوش تمنا میر سانم　　　دریں یک قطرہ دریا میر سانم

جزیں مستانۂ انشانی گفت

چوں صنعان عشق سودا میر سانم

ایک نئی فشن کی بیش بہا گاڑی میں ان دونوں پریوں کو ادب کے ساتھ بٹھایا۔ اور آزاد کو پیادہ پا لے چلے۔ اثنائے راہ میں آزاد کی زبان پر جو کچھ آیا کہا۔ بار بار ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور اشعار حسرت بار کو ترجمان دل کرتے تھے:

آتش افروختہ در عالم　　　اے پر آشوب ترا میدانم

اے دل اندر غم او خواہی مرد

صبر ایوب ترا میدانم

میڈا نے بصد حسرت گاڑی پر سے سمجھانا شروع کیا۔ سنو آزاد جب اتنی مصیبتیں جھیلیں اور اس قدر سختیاں سہیں تو پھر اب کاہے کا خوف ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ شاید اب کی بھی اس زندان بلا سے رہائی پائیں۔ اور ہنسی خوشی روم جائیں خدا پر چھوڑ دو۔

ماکارِ خویش را بخداوندِ روزگار
بسپردہ ایم تاکرم اوچہاکند

پہلے خار ہے پھر گل ہے۔ رنج کے بعد انسان کو راحت حاصل ہوتی ہے۔ دل کو خوب مضبوط رکھنا چاہیئے۔ گھبراہٹ سے کام نہیں نکلتا:

دردِ ہر کسی گل عذارے نرسید تا بردلش از زمانہ خارے نرسید
در شانہ نگر کہ تا بصد شاخ نشد
دستش بسرِ زلف نگارے نرسید

ہبس کلیر سانے بھی ان کے کلام کی تائید کی اور کہا کہ عشق کے وار روکنے والے مردِ میدان کہلاتے ہیں۔ اور ابھی تو پہلی ہی منزل ہے:

ہنوز ایں اوّل عشق ست جاناں گریہ کم ترکن
کہ ایں طوفان رسوائی ست عالم گیر خواہد شد

اِس تقریر پر تنویر سے آزاد کے دل کو کسی قدر ڈھاس ہوئی۔ آسمان کی طرف نظر کر کے کہا۔ بار الٰہا۔ مجھ سے صدہا گناہ کبیرہ سرزد ہوئے۔ مگر امیدوار عفو اور سزاوار معافی ہوں۔

فارغ دمے زشاہد و ساغر بنودہ ام
پوشیدہ کردم ایں عمل و آشکارہ ام

لیکن اگر گناہ زیادہ ہے تو رحمت اِس سے بھی زیادہ ہے:

شنیدم کہ در روزِ اُمید و بیم
بدان را بہ نیکان بہ بخشد کریم

گو اکثر امور کے قائل نہیں ضعیف الاعتقادی کی طرف طبیعت مائل نہیں مگر مشرک نہیں کافر نہیں مرتد نہیں ملحد نہیں زندیق نہیں دہریہ نہیں:

بندۂ عشق بُتانم بیخود بخدا کار ندارم بخدا

گو بادی النظر میں باجتماعِ ضدّین معلوم ہوا مگر اس کو وہی سمجھتے ہیں۔ ناسمجھ کیا جانے کہ کیا رمز ہے۔ یہ مسئلہ بہت نازک ہے:

ہزار نکتہ باریک ــــــ ترز مو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

جب کہسارِ عظمت بار کا وہ مقام جو رشکِ فرخار اور سبزہ زارِ پُر بہار سے مالا مال تھا، نظر آیا اور اس معشوقہ پستہ دہن وسیم ساق یعنے شہزادی کے ایوانِ معلّے کے سنہرے منار جھلکتے ہوئے سامنے دکھائی دیتے۔ مس میڈا نے کلیرسا اور آزاد کی طرف مخاطب ہو کے کہا، یہ ٹھان لو کہ کسی مصیبت سے ذرا بھی ہراسان نہ ہوں گے۔ اپنے کُل کاموں کو خدا پر چھوڑ دو۔ وہی مسبب الاسباب ہے۔ اور وہی ہمارا بیڑا پار کرے گا۔ آزاد نے کہا بار خدایا میں نے اپنے کو تیرے سپرد کیا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مس کلیرسا نے بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کیے اور محلِ انور مثل بقعۂ نور نظر آیا۔ میڈا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ کلیرسا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ آزاد کا بحرِ جنون جوش زن ہوا:

کم بہت رکھتا ہے دل کو چرخِ ناہنجار خوش
غم دیا سو بار تو شاید کیا اک بار خوش

دو لونڈیوں نے باہر آن کر کہا کہ گاڑی اسی مقام پر روک لو۔ آزاد کو بحراست حاضر حضور کرو۔ آزاد پاشا دس روسیوں کی حراست میں اُس بُت پندار و جفا کار کے پاس چلے تو میڈا نے آبدیدہ ہو کر دل میں دعا مانگی کہ یا خدا پاک پروردگار جس طرح اس جوانِ رعنا نے پیٹھ دکھائی۔ اسی طرح اس کا مُنہ جلد دکھا۔ مس کلیرسا چپکے چپکے کہتی تھی۔ خداوندا اس بیچارے کی عزت اب تیرے ہاتھ ہے۔ ہائے یہ گُل بدن جوان اس جور و جفا کا مستحق نہیں۔

الغرض آزاد پاشا اکڑتے اینڈتے اس صنم جفا پرور کے روبرو حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ ایک تختِ طلائی و مرصع پر بصد شان برنائی و رعنائی متمکن ہے۔ اردگرد کنیزانِ باادب و ماہ سیما بیچ میں وہ عروسِ خورشید لقا کالبدر فی النجوم۔ مشاطگانِ کاملِ فن نے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔

یکے خود خوبرو بودی دگر آراستی خود را
بنا معلوم شد مارا کہ قصدِ جانِ ما داری

اس محبوب سراپا ناز شوخ و طناز نے تیکھی چتون سے میاں آزاد پر نظر ڈالی۔ یہ اسی طرح تنے ہوئے کھڑے رہے اور آنکھیں لڑائیں۔ ایک خادمہ رنگین ادا چمک کر بولی۔ حضور! یہ اندر قدم

رکھتے ہوئے کانپتے تھے. حواس غائب غلّہ تھے۔

شہزادی : کیوں بندہ پرور ہم ملک الموت ہیں یا اجل. اللہ اللہ اب آپ محل کے اندر قدم رکھتے ہوئے لرزتے ہیں. خیر کیا مضائقہ۔

آزاد : آپ اے لب لعل شکر خا مردے کو زندہ کر دیں. آپ مسیحائی کا دم بھریں تو جا دارد مگر ادبار کو کیا کروں :

بحضورش چساں رسم آزاد
کالفغال گنا کے دارم

خادمہ : اب بھی وہی ٹن باقی ہے یا اب حالت دگرگوں ہو گئی۔

آزاد : اب دیوانہ. جمنوں اپنی قضا کا نوحہ خواں ہوں.

حسرت آلودا آہ کے دارم زخمکے از نگا ہکے دارم
دشت فرسائے منزلِ عشقم
حالیا روبرو یکے دارم

شہزادی : (آنکھوں کا اشارہ کر کے) نادان بدتمیز.

آزاد : اس گردشِ چشمِ خونخوار ظالم مظلوم نما کے قربان ہاتے ہاتے۔

ہزار غمزہ بفرمان ہر نگہ ہستش
چہ آفتے ست ندانیم چشم بدمستش

اس چشم نرگسی نے مار ڈالا. رسیلی متوالی انکھڑیوں نے ستم ڈھایا بہ غارتگر دین و ایمان۔
عدوے صبر دشمنِ دل و جان ہیں :

زافسون نگاہ نرگسِ سحر آفرین ہیہات
مرا دیوانہ میسازو پری زادی کہ من دارم

شہزادی : (سینے کو تان کر) جو کچھ پوچھیں سچ بتانا ورنہ ہمیں جانتے ہو۔

آزاد : خوب واقف ہوں. میں اور نہ سمجھوں کیا مجال۔

شوخِ محبوب ترا میدانم
از ہمہ خوب ترا میدانم

اب سُنیے کہ پولینڈ کی شہزادی کو شک کی جگہ یقین تھا کہ آزاد نے اُن دونوں گل بدن اور غنچہ

دہن شہزادوں کو قتل کر ڈالا ہو گا. نشہ ہرن ہوتے ہی آزاد اور اُن نازک بدنوں کی تلاش کی.
جب کہیں پتا نہ ملا تو موپریشان اور گریہ کناں محل کے باہر آئی. چو طرفہ سوار اور پیادے دوڑائے.
کہ پتا لگائیں اور جس طرح ممکن ہو آزاد کو گرفتار کر لائیں. اُس موذی
کے پنجے سے اُن پری چہرہ نوجوانوں کو بچائیں. جب سُنا کہ وہ دونوں صحیح و سالم آئے.
تو باچھیں کھل گئیں. جی تو چاہتا تھا کہ آزاد کو کھڑے کھڑے چنوا دے مگر اس کے ہتھکنڈوں سے
خوف تھا کہ مبادا جان پر کھیل جاتے. لہٰذا بلطائف الحیل سوال کیے.

شہزادی: کل حال بیان کرو. اگر زندگی چاہتے ہو اور جان پیاری ہے تو صاف صاف
بیان کرو. ورنہ وہ اندازہ ہے اور تم ہو.

آزاد : (مسکرا کر) اگر یہ ہے تو بسم اللہ. ہرگز صاف صاف نہ بیان کروں گا. جائیے بس. اب
جہاں چاہیے بھیجیے اور جو چاہیے کیجیے. میں تو خوگر مصیبت ہو گیا ہوں. اب مصیبت اور قید خانے
سے مجھے کیا رنج پہنچے گا خاک؟ مگر:

حیف کی جا ہے ترے کوچے میں ہم غمگین رہیں
دیر میں ہیں گبر خوش مسجد میں ہیں دیندار خوش

شہزادی: اُن دونوں قمر طلعت شہزادوں کو کہاں چھوڑا. ابھی حاضر کرو. اسی میں تمہارے
لیے بہتری ہے.

آزاد : واللہ اعلم مجھے ان سے کیا واسطہ. وہ شہزادے ہیں درویش.

شہزادی: ارے نادان اب بہت بُن کی نہ لے. اتنی سی جان گز بھر کی زبان شانِ خدا. تم
اور ہمارے سامنے اکڑو. اور چبا چبا کے باتیں کرو:

بُت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

آزاد : اس قدر دل و دماغ کجا کہ گھنٹوں سر مغزن کروں. اب کسی بات کا جواب نہ دوں گا.
بس خاموش ہی رہوں گا. ایک چپ سو بلا کو ٹالتی ہے:

بفہمم ہیچ مضمون جز بلب بستن نمی آید
خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

اتنے میں اس سرمایہ نازنینی نے حکم دیا کہ آزاد بحراست سواران قوی الجثہ ایک مکان میں قید

پہنچ جائیں، اور وہ دونوں شہزادے آئیں۔ مَتیڈا اور کلیرسا گاڑی سے بصد ناز و تجمل اُتریں۔ شہزادی نے تا درِ خانہ پیشوائی کی۔ نوکروں چاکروں اور کنیزان نے ادب کے ساتھ تعظیم کی۔ بیچ میں شہزادی اِدھر اُدھر وہ دونوں ماہ رو قوس ابرو۔

شہزادی: (مَتیڈا کے گورے گورے گالوں پر ہاتھ پھیر کر شکر خدا ہزار شکر خدا کہ تم کو دیکھا۔ کس بدبخت کو امید وصل ہو۔

مَتیڈا: (مصنوعی تبسّم کے ساتھ) ہم کو اس سفاک کے سپرد کر کے خود نشے میں ایسی بدمست ہوئیں کہ ہماری ذرا بھی فکر نہ ہوئی۔

اتنے میں ایک کمرے سے آواز آئی۔

بیا کہ با دلم آن می کند پریشانی — کہ غمزۂ تو نہ کردست یا مسلمانی
ز دیدہ رفتی و مردم ہماں نفس فرہاد — کہ بے تو ہر دم وانکہ چنیں با سانی
متاعِ حسنِ تو سرمایۂ تہیدستی — خیالِ زلفِ تو مجموعۂ پریشانی
لبِ تو جرعۂ بادۂ دل آشوبی — غمِ تو شانہ کشِ طرۂ تن آسانی

کسے کہ تشنہ لبِ نازِ تست میداند
کہ موجِ آبِ حیات ست چینِ پیشانی

گو یہ زبان اور الفاظ کلیرسا کی سمجھ میں نہیں آئے۔ مگر مَتیڈا کچھ کچھ سمجھی اور دونوں نے آزاد کی آواز پہچانی۔ شہزادی نے حکم دیا کہ دور کے کمرے میں آزاد کو قید کیا جاوے۔ جہاں سے آواز نہ آئے:

ہائے صیادِ جفا پیشہ نے کیا گھا کترے
دور لے جا کے چمن سے پرِ بلبل کترے

آزاد نے جب خبر پائی کہ شہزادے اُس حور وش کے اغل بغل متمکن ہیں۔ اور ان کے نام حکم نافذ ہوا ہے۔ کہ دور کے کسی کمرے ہیں رہیں تو اور بھی طبیعت بے قرار ہوئی۔ بکمال پریشانی آہستہ آہستہ اُس کمرے کی طرف روسیوں کے ساتھ چلے:

باز گلبانگِ پریشان میزنم — آتشے در عندلیبان می زنم
جلوۂ گل بہرِ من بستند و من — سر بدیوارِ گلستان می زنم
در بُنِ ہر خار خنجر مے خورم — بر سرِ ہر نیش جولان می زنم

خون گرم از ریشہ دل می کنم　　جام زہر از شیشۂ جان می زنم

صد محیط زہر دارم در سفال　　مرحبائے کو کہ آسان می زنم

پائے ہجرم راہ حسرت می روم

دست عجزم فالِ دامان می زنم

ایک روسی نے ان سے گفتگو کی۔ وہ بیچارہ بھی چوٹ کھایا ہوا تھا۔

روسی : تم یہاں کیوں کر پھنسے۔ کجا ہند کجا روس۔ آئے کیونکر۔

آزاد : ارے ادبار نے مجھے اندھا کر دیا۔ بہک کر ادھر آنکلا۔

روسی : اب شہزادی نے وعدۂ شادی کیا ہے یا وہ بھی نہیں۔

آزاد : (آہ بھر کر) واہ۔ وعدہ شادی کجا توبہ۔

نہ شہد لطف کزو کام جاں شود شیریں

نہ وعدۂ کہ گلوے گماں شود شیریں

یہ تک اقرار نہیں کیا کہ اس قدر عرصہ میں قید سے نجات پائے گا۔ میں تو بلا میعاد قیدی ہوں۔ دائم الحبس بعبور دریائے شور۔ یہ اقرار نہیں ہوا کہ اس قدر زمانے کے بعد رہائی پائے گا۔ بلکہ یہ دھمکی دی کہ اندارے میں پھیکا جائے گا۔ خیر:

شاد باش اے دل کہ فردا روز بازار جزا

مژدۂ قتل ست گرچہ وعدۂ دیدار نیست

ادھر شہزادی نے بادۂ گلگوں کی گلابیاں چنوائیں اور قلقل مینا نے رنگِ محفل جمایا۔ مینڈا نے کہا کہ خدارا اس وقت اتنی نہ لنڈھانا کہ اپنے آپے میں نہ رہو اور خود رفتہ ہو جاؤ۔

شہزادی: اس وقت تو جس قدر پی جائے پیو کہ بچھڑے ہوؤں کو خدا نے ملایا ہے۔ تمہارے فراق میں کیسا کیسا تڑپا کی کہ دل ہی جانتا ہے:

ابر تھے دیدۂ پر آب سے ہم

برق تھے دل کے اضطراب سے ہم

یہ کہہ کر شہزادی، کے رخسار تابان پر اشک اضطراب خروش جھلکنے لگے۔ کلیرسا نے رومال سے اشک پونچھے اور اس بت ترسا کی چشم سیہ کار کا بوسہ لیا۔ پولینڈ کی شہزادی مس کلیرسا کے گلے لپٹ کر بصد حسرت زبان حال سے کہنے لگی۔

روو خونم زچشمہا جاری ست — موسم عشق و نو گرفتاری ست
نوجوانے بلائے جان شدہ است — چہ بگویم کہ امر ناچاری ست
شعلہ می آمدم بجائی نفس — عیسی مریم ایں چہ غمخواری ست

اے فدائی تغافلت گردم
ایں چہ آئیں و رسم دلداری ست

کلیرسا : پھر اب یہ آنسو بہانا کیا معنی۔ اب تو دونوں بغل میں بیٹھے ہیں۔ اب جشن ہو۔ بادۂ احمر کے جام ہوں نہ کہ اشک و گریہ:

حاصل زگریہ اے دل خانہ خراب چیست
آخر ترا چہ میشود ایں اضطراب چیست

شہزادی: شکر خدا کہ دُرِ مقصود ہاتھ آیا۔ جناب باری نے تم کو ہم سے ملایا۔ ورنہ بس گھٹ گھٹ کے جان دیتی:

در اُلفت بدست می آرد
آنکہ در بحرِ عشق غواص است

اتنے میں دور چلنے لگا۔ مینیڈا اور کلیرسا ایک دوسرے کو سمجھاتی جاتی تھیں۔ کہ کوئی بات خلافِ عقل نہ کرنا۔ جو کچھ یہ کہے وہ منظور کر لینا۔ خدا ہمارا مالک ہے۔ انشا اللہ اس زندان بلا سے نجات پائیں گے۔ شہزادی نے کہا چل کے سبزہ زار میں لب جو ئبار شراب ناب پئیں تو لطف زیادہ ہو۔ ان دونوں نے منظور کر لیا۔ لب چشمہ سار سبزے میں کرسیاں بچھیں، دورِ شراب گلگوں چلنے لگا:

نشے کے پینگ خوب بڑھیں گے بہار میں
بوتل بغل میں ہوگی تو ہم سبزہ زار میں

شہزادی : میری خواہش ہے کہ تم دونوں کے ساتھ شادی ہو۔

مینیڈا : کیا مضائقہ ہے ایک ایک دن۔ باری باری۔ ایسی بعض بعض ملکوں میں رسم ہے ہم دونوں کو منظور ہے۔ ع

صلاح ما ہمہ آنست کاں صلاح شما است

کلیرسا : (آہستہ سے مینیڈا کی طرف مخاطب ہو کر) خدا خیر کرے اب دھر لیے گئے۔

متیڈا: خاموش۔ ع

بخدائے خود سپردم ہمہ اختیار خودرا

کلیرسا: دونوں میں جو پسند ہو اُس کے ساتھ شادی ہو جائے۔

تھوڑی دیر میں پولینڈ کی شہزادی نے اپنے پادری کو تار دیا کہ پرسوں ہماری شادی ہونے والی ہے۔ تم ضرور بالضرور وقت پر آجاؤ۔ بلکہ اسپیشل ٹرین چھوڑوا کے آؤ۔ ایک شاہزادہ فریدوں کمر کجکلاہ کے ساتھ شادی قرار پائی ہے۔

مس متیڈا یہ ٹیلی گرام پڑھ کر کانپ اُٹھیں اور کلیرسا کے مُنہ پر ہوائیاں چھٹنے لگیں۔

پادری کے نام ٹیلی گرام بھیج کر پولینڈ کی شہزادی نے اپنے ایک ــــ معتمد اور معتبر غلام خانہ زاد سے کہا کہ آزاد کو پھر اُسی چاہ عمیق (تیرہ وتار میں لے جاؤ) اور یہ خط اُس کے حوالہ کردو۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

آزاد پاشا۔ دیکھو ہم پادشاہزادیوں سے تمہارے سے ادنا آدمی لڑ کر کبھی جیت نہ پائیں گے تم نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ کہنا نہ مانا شامت آئی۔ خدا نے ہمیں دو یوسف جمال نوجوان شہزادوں کی صورت یہاں دکھائی، اور ہم نے مُنہ مانگی مراد پائی۔ اب تم ہو اور زندانِ بلا۔ تم ہو اور چاہ وحشت زار اب کی اگر اس ظلمات سے نکل جاؤ تو جُھک کے سات بار سلام کروں۔ ہر دم و ہر لحظہ پہرا رہے گا۔ تمہارے اعمال کی سزا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم کو خدا نے یہ دن دکھایا کہ دو زیبا اندام و گلفام شہزادے ملے۔ جن کو قدرت نے خود بنایا ہے۔ ہر عضو بدن سانچے کا ڈھلا ہے۔ خدا کی خدائی نظر آتی ہے:

انوارِ حق در انسان دیدم ندیدہ بُودم
چیزے کہ من زخوبان دیدم ندیدہ بُودم

والسّلام۔ خدا حافظ ہے۔ اب ہند جانے کا خیال دل میں نہ لانا۔

یہ خط وہ غلام باادب آزاد کے پاس لے گیا اور کہا چلیے ہمیں حکم ہے۔ کہ اسی دم آپ کو اس چاہ وحشت مسکن میں قید کریں۔ سرکار نے تاکید کردی ہے کہ کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ خط پڑھتے ہی آزاد کا رنگ فق ہوگیا۔ مگر ضبطِ فغان کیا۔ صبر کو کام فرمایا۔

ما شکوہ زحالِ تباہے نہ کردہ ایم
خون گشتہ ایم و نالہ و آہے نہ کردہ ایم

آزاد: واسطے خدا کے اس قدر عرض کر دو کہ ایک دفعہ اپنی محفل میں آنے دیں یا اُسی طرف سے لے چلو میں ایک دم کے لیے صورت تو دیکھ لوں۔

صیّاد یک نفس قفس اندر چمن گذار
با عندلیب زمزمہ گاہے نہ کردہ ایم

چاہِ بلا میں ہم آزادوں سے رہا نہ جائے گا۔ بوئے گُل کی طرح نکل بھاگیں گے۔ کجا چاہِ تیرہ و تار کجا آزادہ رو۔ یہ خیال خام ہے:

طے کردہ ایم وادیٔ عشق پری رخاں
ہرگز قرار بر لبِ چاہے نہ کردہ ایم

غلام نے آن کر جواب دیا کہ سرکار منظور نہیں فرماتیں۔ آپ نے ایسا خفیف گناہ نہیں کیا ہے کہ رحم کے قابل ہوں۔ آپ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے۔ لہٰذا سزا پائیے گا۔

آزاد سخت بے قرار ہوتے، مگر کر کیا سکتے تھے۔ آبدیدہ ہو کر کہا:

ما را بانہام گرفتہ است عاصئے
آفا سرت کہ ہیچ گناہے نہ کردہ ایم

میں اس جور و جفا کا مستحق نہیں ہوں، مگر اس بُتِ سنگدل کے قربان جس کا دل ذرا نہیں پگھلتا۔ سنگدلی بھی تو کتنی الامان الامان:

دلے کہ بود مراز آبگینہ نازک تر
کدام سنگ دل از سنگِ جور بشکستش

آخر کار آزاد کو اجازت ہوئی کہ روبرو حاضر ہو کر جو کچھ عرض کرنا ہو عرض کر لیں۔ آزاد نے جا کر دیکھا تو تینوں پریاں سج دھج کیے بیٹھی تھیں۔ متیڈا آفتِ جان آزاد کلیر ساشکر لب پری زاد۔ پولینڈ کی شہزادی پر وہ جوبن تھا کہ چشمش مرساد۔

آفتِ جان غمزدہ جادوگرش	ہمچو سحر سامری صد چاکرش
بود صد تنجانہ در ہر نازِ او	عالمے دیوانۂ انداز او
ہر یکے از مستیش میزد خروش	ہوش کو چوں گرم شد بازارِ جوش

در جبینِ آفتاب آئینِ اُو
موجِ دریائے محبت چینِ اُو

محبوبۂ ماہ سیما مس میڈا پر نظر ڈالی تو ایک تیر سا کلیجے کے پار ہو گیا۔ دل مسوس کے رہ گئے، مگر خاموش غلط اندازِ نظر نے کام تمام کر دیا۔

خال زیر چشم او از خویشش گم ہندوے افتادہ در پائے خم

شوخیش یک یوسف گل پیرہن مدتے افتادہ در چاہِ ذقن

مالکانہ حسن گردش دست بُرد

یا زلیخائے جمالِ او سپرد

شہزادی : دشمن عقل۔ رہنا دریا میں اور مگر سے بیر۔ اس عقل پر خدا کی مار۔ شیطان کی پھٹکار یہاں رہ کر مجھ سے عداوت۔ اب یہاں آنے سے کیا مطلب نکلے گا۔ بس ان کو لے جاؤ۔ جو کچھ کہنا ہو کہہ لو۔ ہمارے عیش کو منغص نہ کرو۔

میڈا : گھبراؤ نہیں شاید خدا تمہاری سن لے۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ شاید شہزادی رحم کرے خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں :

ناصح نصیحتت ہمہ تحصیل حاصل ست

میداند ایں قدر بچۂ شیر خوار ہم

کلیرسا : عقل سے کام لینا لازم ہے۔ خدا کو یاد کرو گھبرانا کیسا۔

آزاد : دل کو ذرا ذرا ڈھارس ہوئی۔ خیر فی امان اللہ۔

خاک چھنواتا ہے عشق نرگس جادو مجھے

توتیائے چشم ہے گردِ رمِ آہو مجھے

یہ کہہ کر آزاد وہاں سے چلے تو میڈا اور کلیرسا دونوں کا دل بھر آیا۔ دونوں آبدیدہ ہوئیں نوبت باینجا رسید کہ ضبط نہ کر سکیں۔

دل می رود ز دستم صاحبدلان خدا را

دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

شہزادی : کیوں کیوں۔ یہ گریہ وزاری کیا معنے ایسے شقی اسی سزا کے قابل ہیں۔ ہم تم بے غل و غش لطف زندگی اٹھائیں گے اب کوئی کھٹکا نہیں ہے۔

کلیرسا : مگر اس قدر سختی نہ چاہیے کہ کوئیں میں قید کیا جائے۔

میڈا : ہاں ایسا جوان رعنا اور یہ قید فرنگ۔ ذرا رحم کرو۔ ع

کوئی دم رحم بھی فرماتے ہیں

قید رہے مگر کنوئیں سے نجات ملے۔

اتنے میں شہزادی ان دونوں ماہ رویوں کو لے کر باغ میں آئی۔ خواصیں ادب سے ساتھ ادھر اُدھر اُستادہ ہوئیں اور باغ کو اِن گل بدنوں نے نہال کر دیا:

وہ یکایک باغ میں آئے جو اٹھلاتے ہوئے

کبک بھاگے سامنے سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

اِدھر تو یہ باتیں ہوتی تھیں اُدھر آزاد پاشا سوچتے جاتے تھے کہ یہ سب خرابیاں شراب کی بدولت ہوئیں۔ نہ وہ شراب پیتے نہ بے ہوش ہوتے نہ ہم بھاگتے نہ گرفتار ہو کر واپس آتے۔ اس وقت پھر توبہ کی۔ بس اب آج سے شراب کو دور ہی سے سلام ہے۔ اس کی بُو تک سے نفرت کروں گا۔

کردم ز شرابِ ناب توبہ　　　وزگفتہ ناصواب توبہ

می ساختمش بہ بادہ مرفع　　　بے خستگی از گلاب توبہ

در لفظِ شراب چوں بود آب　　　با تشنہ لبی ز آب توبہ

در وصف بیادہ چوں شریک ست　　　صد بار ز شہد ناب توبہ

نو توبہ شدم کہ خانۂ عشق

بے شبہہ کند خراب توبہ

یا خدا میں کس مصیبت میں گرفتار ہوا۔ کجا حسن آرا کی فرمایش کجا جنگ و جدالِ روم کجا روس کی شہزادی اور یہ چاہِ بلا اور آزادِ مظلوم:

اے خدا خواہم دلِ دیوانہ　　　ہائی ہائی گریۂ مستانہ

از جنون جان و دلم را بر فروز　　　تا شب ہجرم شود در عشق روز

تیرِ آہم را اجابت شد ہدف　　　دامنِ پاکِ جنون آمد بکف

کفر د ایمان در رہش کردم نثار　　　گفتمش از روئے عجز و انکسار

خیر مقدم اے جنونِ نیک فال

اے توام شیر نیستان خیال

جس وقت آزاد رسے کے ذریعے سے اندارے میں اُترے خلق خدا زار زار رونے لگی۔ مگر نادری

حکم کی پابندی مقدم اور ضروری تھی۔ اب اس چاہ بابل اور غیرتِ چاہِ بابل کی کیفیت سُنیے۔ بستی سے تین کوس کے فاصلہ پر کمر کوہ میں ایک چشمہ سار کے قریب سبزہ زار تھا۔ اس کے پاس جنگل۔ اس جنگل میں جس کے ہر شجر سے وحشت برستی تھی ایک تختے میں اشجار رفیع اس قدر بلند تھے کہ گویا آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ اتنے گھنے کہ خرگوش تک دِقت سے جاسکتا۔ اس کے وسط میں یہ کنواں واقع تھا۔ الامان الامان حکم تھا کہ فوراً سب کے سب وہاں سے روانہ ہوں۔ کنوئیں کے اردگرد کوئی نہ رہنے پائے۔ آزاد کو کوئیں میں گرفتار کرکے سب ہُر ہو گئے۔ یہ بیچارے بآواز بلند آہ آہ کر رہے تھے کہ دفعتہً ان کے کان میں آواز آئی۔ کان دھرے سُنا تو یہ شعر کوئی پڑھ رہا تھا:

دعوی جو عشق کا ہے تو فریاد کس لیے
یہ آہ آہ اے دل ناشاد کس لیے

آزاد: بھائی کون ہو۔ میرے گھن گرج نالوں کو کیوں روکتے ہو۔

آواز: خدا کو یاد کرو۔ ہائے ہائے سے کچھ نہ ہوگا۔ سمجھے۔

تو گفتی ہر آنکس کہ در رنج وتاب
دعائے کند من کنم مستجاب

آزاد: خدا نے تو ذرا بھی مدد نہ کی میاں صاحب۔ ہائے ستم۔

آواز: یہ کلمہ کفر ہے۔ کفر کا کلمہ زبان سے نہ نکالو ورنہ مردود ہو جاؤ گے۔ اس سے کیا فائدہ ہر حالت میں بندے کو صبر لازم ہے۔ ع

ہر حال میں بندہ ہے گنہگار تمہارا

آزاد: کلمہ کفر! ہم تو کافر ہو ہی گئے۔ اب کفر کا ڈر کسے ہے۔

آواز: مردِ خدا استقلال کو ہاتھ سے نہ دو۔ الصبر مفتاح الفرج۔

آزاد: پُورا مشرک مرتد ملحد ہو گیا۔ اب خدا کا قائل نہیں ہوں۔

آواز: آزاد واسطے خدا کے کلمہ کفرانہ مُنہ سے نکالو۔

آزاد: ایں! کون ہے۔ یہ میرا نام کس نے بتادیا۔ میاں تم کون ہو؟ اہا ہا ہا۔ حسن آرا کے پاس سے آئے ہو۔ خوش آمدی:

مرحبا طائر فرخ پیٔ فرخندہ پیام
خیر مقدم چہ خبر یار کجا راہ کدام

آواز: قدرت حق نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ حسن آرا کون ہے۔

آزاد: قدرت نے بھیجا ہے تو بیرنگ واپس جائیے۔ ہم اب اُسی بُت کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اب مشرک ہو گئے۔

میرے حال پر رحم کرتا نہیں
خدا سے بھی اے بُت تو ڈرتا نہیں

آواز: بتوں کا عشق چھوڑ دو۔ اس میں اور اذیّت پاؤ گے۔

قضا کی نشانی ہے اُلفت بتوں کی
وہ جیتا ہے جو ان پہ مرتا نہیں ہے

بتوں کی الفت بھی کوئی اُلفت ہے وہ مرد نہیں جو عاشق خدا نہیں۔

چھوڑ دے عشقِ حسینانِ جہاں مردِ خدا
عاشق اللہ کا ہو عشق بشر کچھ بھی نہیں

آزاد: سُنا نہیں۔ ہائے افسوس یہ مشہور شعر نہیں سُنا۔

بندۂ عشق بتانم بیخود
بخدا کار ندارم بخدا

آواز: آزاد تمہاری مصیبت ظاہر ہے، مگر خدا کو یاد کرو۔ بھائی وہی بچانے والا ہے۔ خدا ہی تمہاری کلفت دور کرے گا۔ شرک کرنا قیامت ہے۔

مرد باش و آشنائے درد باش
سیّد انشا ایں چنیں فرمودہ است

مجھ کو تم نے اب تک نہ پہچانا۔ میں کون ہوں۔ گھبرانا نہیں۔

آزاد: خدا جانے۔ اور میں تو۔ ع
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

اے فلک عمر دو روزہ میں تیرے باعث سے
نہ گئی عرش پہ آہِ دلِ مضطر کس دن

آج پر کیا ہے سدا سے چمنِ عالم میں
بلبلیں نہیں دلِ نالاں سے برابر کس دن
وعدۂ حشر پہ کیا جان مری جلتی ہے
اپنا دیدار کیا اس نے مقرر کس دن
معرکہ زور کا ہے چرخ ستم پرور سے
یا الٰہی یہ مہم دیکھیے ہو سر کس دن
مانتا ہی نہیں پہلو میں دلِ خانہ خراب
دوڑے جاتے نہیں ہم یار کے در پر کس دن

آواز : آزاد۔ میں تمہارا خادم اور جلیس اور شریکِ حال ہوں۔

آزاد : (آہ سرد بھر کر)۔

یہ ہم جلیس یہ ہمدم ہیں بزمِ ہستی تک
لحد میں کوئی کسی کا شریکِ حال نہیں

آواز : آج کے دسویں روز تمہاری مصیبت کم ہو جائے گی۔

آزاد : ہو چکی مصیبت جان کے ساتھ ہے۔

تخفیف جور دام بلا ہو تو جانیے
کوتاہ ان کی زلفِ رسا ہو تو جانیے

مگر یہ خلش کیونکر ہوتی۔ ہائے اب تو آزاد درد آشنا ہو گیا۔

ترے تیر نیم کش کو کوئی مرے دل سے پوچھے
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

آواز : معقول، بندۂ خدا، وہی ہے جو ہر دم اور ہر لحظہ، اور ہر حال میں خدا کی یاد کرے اور خدا کو بھول گیا تو کیا۔

جور بتاں میں شکرِ خدا ہو تو جانیے
وقتِ قضا نماز ادا ہو تو جانیے

آزاد : حسن آرا ہائے حسن آرا یا خدا میں حسن آرا کو کہاں پاؤں یوں تو ہر در و دیوار سے اُسی کی صورت نظر آتی ہے مگر وہ کہاں۔

فارغ بہ تجلّی نشود شائقِ دیدار

پروانہ بہ مہتاب تسلّی نتواں کرد

یا الٰہی وہ کون دن ہوگا جب مَیں پیاری حُسن آرا سے ملوں گا مگر اب امید کی کمر ٹوٹ گئی، اب یاس ہی یاس۔ ہر سمت سے نظر آتی ہے۔

ازل سے خنجر قاتل ہے میرے سر کے لئے

مَیں وہ شجر ہوں کہ پیدا ہوا تبر کے لئے

بلا طویل شبِ ہجر ہے نہیں کٹتی

دُعائیں مانگتا ہوں شام سے سحر کے لئے

اسیر زار ہوں رکھ مجھ کو یوں ہی اے صیّاد

ضرور کیا ہے قفس ایک مشتِ پر کے لئے

آواز: بھائی آزاد ہمیں اس قدر جلد بھُول گئے۔ عورت پر ہاتھ کون اُٹھائے کوئی مرد ہوتا تو گیدی کو مار ہی ڈالتا۔ اتنی چھُریاں اور قرولیاں بھونکتا کہ چھٹی کا دُودھ یاد آتا۔

لن ترانی گوئے من جلوۂ برخار افگند

ہر طرف اک موسیٰ مبہوت وشل افتادہ بود

آزاد: مَیں نے مطلق نہیں پہچانا۔ بس اس قدر پہچانا کہ ہندی ہو۔ اُردو خوب بولتے ہو واللہ اعلم کون ہو۔

راوی: اس پریشانی اور جنون کو مُلاحظہ فرمایئے اس گیدی تک کو نہیں پہچانتے شعر کیا برجستہ پڑھ دیا ہے۔

خوجی: بابائے مَن مَن بدلیعا در زبان الفرس کہ مرادازان از زبان پارس منت نیز ہم گفتگوئے کردن مینوانم۔ نیز ہم۔ صحیح باشد کہ حافظ جی شیرازی گفتہ است، ومارا در زبان مختلف ہم دستگاہ پس زیرا کہ گفتی کہ اُردو خوب بولتے ہو۔

راوی: پھڑکا دیا (زیرا کہ) کے معنی یہ ہیں۔ (چرا گفتی)

آزاد: میرا دماغ نہ کھاؤ۔ خدا جانے کیا اول جلول بکتے ہو۔ تم دوسرے خوجی، میری جان کے لیے پیدا ہوئے۔

خوجی : واہ جناب بابائے من بدیع مارا خوجی گفتی۔ خوجی مردود مطرود ملعون کہ است من خواجہ بدیع الزماں، بدیع کمیدان دگلے والی پلٹن، سابق ہستم و بودم یعنے خواجہ بدیع الزماں بدیع ہستم دائخ بودم۔

راوی : اس ذکاوت کے صدقے۔ ہستم اور بودم کی تشریح کتنی مختصر ہے۔

اب آزاد سمجھ گئے کہ یہ خود خواجہ صاحب ہی ہیں۔ کمال خوش ہوئے کہا۔ خوش آمدی، تو علیک السّلام والاکرام۔ تم یہاں کیوں کر پہنچے۔

خوجی : (روکر) ہائے بھائی جان کیا کہوں۔ ذرا بس نہیں چلتا۔

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

آزاد : کسی ترکیب سے کنوئیں میں آسکتے ہو۔

خوجی : معقول اچھی فرمائش کی۔ میں افیمی آدمی۔ پانی کے نام سے رُوح لرزتی ہے، اور آپ اندارے میں بُلاتے ہیں۔

آزاد : سفرِ بحری کرکے بھی خوف نہ گیا۔ اب تک سہمتے ہو۔

خوجی : سُنا نہیں ایک بادشاہ کے لڑکے کے مزاج میں زنانہ پن بہت تھا، بادشاہ نے اس زنان منتری کو ایک مولوی کے سُپرد کیا۔ کہ اس کو شاہنامہ فردوسی طوسی علیہ الرحمۃ پڑھاؤ۔ شاید مردی کی طرف مائل ہو۔ جب شاہنامہ پڑھ چکے، اور باپ کے سامنے امتحان دینے آئے تو یہ شعر زبان پر لائے۔

منیژہ منم دُختِ افراسیاب

برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

حضرت ہم تو "کُتّے" کی دُم ہیں۔

آزاد : بھلا ہمارے مفر کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں۔

خوجی : ہے بھائی گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ سنو اب پرسوں ان دونوں کے ساتھ یہ نادان البیلی مست شہزادی بیاہ کرے گی، اور وہ دِل لگی ہوگی کہ بس کچھ نہ پوچھو مگر خرابی یہ ہے کہ کہیں جھلّا کر ان کو سزا نہ دے، ہائے یہی تو خرابی ہے۔ آج تار پر پادری کو اطلاع دی ہے، وہ دونوں گھبرائی

ہوئی ہیں۔ خدا خیر کرے، مگر تم کو اب ضرور یاد کرے گی۔

آزاد: آپ تو واہی ہیں، پاگل، دشمن عقل۔ اُلّو ہی رہے۔

خوجی: (جھلا کر) لونڈے ہو نہ عقل کہاں سے آئے۔ ارے ہم تجربہ کار آدمی ہیں۔ خرّانٹ۔ تم یہ باتیں کیا جانو بھلا۔

اظہارِ عشق نے اُنھیں پردہ نشیں کیا
کھولا جو راز بند ہوئیں کھڑکیاں تمام

اب میں وہاں جاکے ذرا ٹوہ لاؤں تو کچا چٹھا کہہ سناؤں۔ عجب عذاب میں جان ہے کجا حسن آرا کا حکم کجا مَیڈا کی شادی۔ کجا یہ کلیرسا۔ یہ سب تو تھیں ہی، لیجیے پولینڈ کی شہزادی بھی کود پڑیں، یک نشد دو شد، سنتے آتے تھے، یہاں یک نشد دو شد۔

آزاد: تم شہزادی کے پاس جاکر خوب مسخرے پن کی باتیں کرو۔ جس میں وہ تمھیں نقل محفل بنائے۔

خوجی: بندہ مسخرے کی ہفتاد پشت پر لعنت بھیجتا ہے میں ظریف ہوں، مسخرے کوئی اور ہوتے ہوں گے۔

ہم جو یاروں میں نہ بیٹھیں تو ہمیں چین نہ آئے
حضرتِ خضر کو کیا زیست کی لذّت ہوگی

یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے اجازت لی اور اس اقرار پر روانہ ہوئے کہ دو گھنٹے میں شہزادی کے ہاں کے حالات لائیں گے، اور مس مَیڈا اور مس کلیرسا کو دِلا سا دیں گے۔

شہزادۂ سنجر قدر مرزا ہمایوں فر کا جنازہ

ہر ایک گلشن عالم میں مُو بہ پریشاں ہے
چمن میں سنبل تر زُلفِ سوگواراں ہے
ہر ایک شاخ اُٹھائے ہے ہاتھ ماتم کو
ہر ایک نخل پہ بُلبل بھی مرثیہ خواں ہے

کلی جو چٹکی تو آواز آئی نالوں کی
چمن تمام یہ لبریز شور و افغاں ہے
اُڑا رہی ہے صبا خاک صحن گُلشن میں
گلوں کا چاک گریباں ٹکڑے داماں ہے
چمن میں پہنے ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک
برنگِ دیدۂ تر نرگس آج گریاں ہے
کسی روش پہ ہے صیاد خستہ دِل گریاں
اسیر دامِ الم اس کا طائرِ جاں ہے
پڑا ہے برگِ خزاں کی طرح کہیں گُل چیں
برنگِ سایۂ گُل خاک پر وہ غلطاں ہے
یہ کہہ رہا ہے کہیں باغباں بھی رو رو کر
ہجومِ داغ سے سینہ مرا گلستاں ہے
نہ ہیں وہ گل نہ وہ سبزہ نہ وہ بہارِ چمن
نہ نغمہ سنج ہے بُلبل نہ گُل ہی خنداں ہے

رواں زدیدۂ نرگس سرشکِ شبنم شد فغاں کہ ہر شجرِ باغ نخلِ ماتم شد

آج قلم خونیں رقم صفحۂ قرطاس پر اشکبار ہے اور دل نژند و منزل زلفِ خوبانِ فرخار کی طرح پریشان روزگار ہے، جگر میں درد ہے، تو لب پر آہ سرد ہے۔ چشمِ خوں چکاں سے اشکِ بے قرار و جگر خوار، رواں ہیں۔ حاملان فلک تک گریہ کناں ہیں۔ نالہ برق جولاں و شعلہ نشان آسمان تک کی خبر لائے۔ آہ آتشیں درون تاب نے ہزاروں خرمنِ دل جلائے الٰہی یہ داغِ جگر ہے۔ یا آفتابِ محشر ہے

یہ کیا الم ہے جو ہے چاک چاک جیبِ سحر
یہ کیا اَلم ہے جو خورشید ہے برہنہ سر
ہے چاندنی میں دِلا سیل اشک کا عالم
وفورِ گریہ سے ہے اب سفید چشمِ قمر

سیاہ پوش ہوا ہے، اَلم سے چرخ کبود

برنگِ داغ دِل ماہ ہے ہر اک اختر

بنا ہے چاند کا ہالہ بھی حلقۂ ماتم

ہے بُرج آبیٔ گردوں بشکلِ دیدۂ تر

نظر میں گُنبدِ گردوں ہے گُنبد مدفن

بنی ہے چادرِ مہتاب قبر کی چادر

یا الٰہی کس شہزادہ آتشیں جلوہ کا جنازہ نکلا ہے۔ کہ ساری خدائی مصروفِ ماتم ہے۔ شہر بھر میں ٹپس پڑ گئی۔ ہائے یہ نوخیز اور ہر دل عزیز شہزادہ، اب دُنیائے دوں سے، مُنہ موڑ کر خُدا جانے کہاں جاتا ہے۔

در ماتم تو دہر بسے شیون کرد

لالہ ہمہ خون دیدۂ در دامن کرد

گل جیب قبائے ارغوانی بدرید

قمری نمد سیاہ در گردن کرد

اب سُنیے کہ شہزادۂ خاقان کلاہ، جم جاہ، والا اقتدار گردوں مدار، حضرت مرزا ہمایوں فر بہادر، کی لاش کے اِرد گرد گل رخاں شوخ و شنگ، رو کش خوبانِ فرنگ کا حلقہ تھا۔ شہزادی بیگم اس قدر زار زار روئیں، کہ بار بار بے ہوش ہو گئیں۔ غش پر غش آئے۔ خورشید لقا بیگم کی آنکھیں مثلِ خونِ کبوتر سُرخ تھیں۔ مہ لقا گھڑی گھڑی بھائی کا نام لے کر پُکارتی تھی۔ اور دمبدم سرو سینہ پر دوہتھڑ لگاتی تھی۔ اندر سے باہر تک گریہ وزاری کی گرم بازاری تھی۔ مگر وہ شہزادہ بے خبر میٹھی نیند سو رہا تھا: ؎

صد حیف کہ گل رخاں کفن پوش شدند

در خاطر یکدگر فراموش شدند

آنانکہ بصد زباں سخن می گفتند

آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

اتنے میں فجوؔ بخار، اپنے فن کا اُستاد و آزمودہ کار آیا۔ صندل کا صندوق بنایا کشمیری مسلمان تابوت اُٹھانے کے لیے آئے۔ تمام شہر کے رؤسا و اُمرائے عالی مقام، اور شہزادگان ذوی الاحترام،

جوق جوق، جمع تھے۔ جب سب سامان تیار ہوا، مرزا ہمایوں فر کے چھوٹے بھائی نے ڈیوڑھی پر جاکر، درد آلود آواز سے پکارا۔ ذرا ہٹ جائیے۔ پردہ کیجیے۔ اس آواز حسرت ناک نے ستم ڈھایا۔ بیویوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ شہزادی بیگم کے سوا، اور سب شہزادیاں اور مخدرات عصمت سمات بین کرتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم دھرتی ہوئی۔ شہ نشینوں میں جاکھڑی ہوئیں۔ چھوٹے مرزا کی حالت زار قابل بیان نہیں ناگفتہ بہ گریباں چاک بدن پر خاک۔ برہنہ سر۔ لب پر آہ بے اثر۔ دیدہ مطروح، دل مجروح۔ منہ پر طمانچوں کے نشان۔ نالاں و فریاد کناں، اندر آئے۔ بیس پچیس نواب زادے اور شہزادے ہمراہ تھے۔ اندر آکر چھوٹے مرزا بھائی کی لاش سے چمٹ کر اس قدر روئے، اس قدر روئے کہ آواز بیٹھ گئی۔

زجوشِ آتشِ غم شعلہ افشاں شد چراغِ من

خدایا بر دلم رحمے کہ خوں گردید داغِ من

شہزادی بیگم: (بیٹے سے گلے مل کر) بیٹا کیوں ہلکان ہوتے ہو۔ اب مجھے سمجھالو۔ مجھے سمجھاؤ۔ ہائے تم رو رو کے یہ حال کروگے تو مجھے کون سمجھائے گا۔ ارے میرے لال ہائے اس بڑھوتی وقت چھوڑ کے کہاں چل دیا۔ ہائے ہائے۔

چھوٹے مرزا: اماں یہ کیا ہوا۔ اب بھائی سے کہاں ملیں گے۔

شہزادی بیگم: (سر پیٹ کر) ارے لوگو میں نصیبوں جلی اس کا کیا جواب دوں۔ ہائے ہائے میرے نازوں کا پالا۔ میری آنکھوں کا اجالا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا۔

خورشید لقا: امی جان سب کو ہٹا دو۔ ایک نظر بھائی کو دیکھ تو لیں اب کاہے کو ہمایوں فر کا دیدار نصیب ہوگا۔

مہ لقا بیگم کا بحرِ غم اس درجہ جوش زن ہوا کہ بال کھولے ماتم کرتی ہوئی۔ فوراً شہ نشین سے نکل آئیں اور چادر منہ سے اٹھا کر بھائی کا منہ دیکھا۔ اور دھم سے اسی مقام پر گر پڑیں تو بے ہوش نواب زادے اور شہزادے اور کشمیری معاً باہر چلے گئے۔ لوگوں نے پوچھا خیر تو ہے۔ گئے کیا اور آئے کیا۔ کہا وہاں کہرام مچا ہے۔

نواب: یا خدا یہ دن کبھی دشمن کو نہ دکھا۔ ہائے ستم! شہزادہ قیامت کا سامنا ہے۔ قیامت کبریٰ۔ افسوس صد افسوس۔

دوسرا: اندر جاکے مصیبت اور موت اور ماتم مجسم نظر آیا۔ مجسم۔

تیسرا: آخر ہو اکیا۔ لاش نہیں اُٹھانے دی۔ یا کہرام مچا ہوا ہے۔ اس سے آپ لوگ باہر چلے آئے ہائے کیا غضب کا سامنا ہے۔

چوتھا: ایسا سانحہ آج تک دیکھا نہ سُنا۔ اُف توبہ توبہ!

اتنے میں کشمیری پھر اندر گئے، صندوق ساتھ تھا۔ لاش کو پلنگ سے اُٹھاتے ہوئے، شورِ محشر بپا ہوا ہر سو خاتونوں اور گھر کی مُغلانیوں، مہریوں پیش خدمتوں، خواصوں کے رونے کی آواز تمام محلّے میں جاتی تھی۔ بردے کو اُٹھاتے ہوئے ہاتھ کانپ اُٹھے۔

اے مرگ ہزار خانہ ویران کردی
از بود وجودِ غارت جاں کردی
ہر گوہرِ قیمتی کہ آمد بجہاں
بردی وبہ زیرِ خاک پنہاں کردی

اگر شہزادے کے دِل میں کوئی درد تھا تو یہ تھا کہ مبادا سپہر آرا کے ساتھ شادی نہ ہو مگر اس دردِ دل کا علاج نہ ہوا۔ اَجل نے فیصلہ کر دیا۔

علاج دردِ ضمیری نشد نمی دانم
کہ گفتہ بود کہ دردت دوا پذیر مباد

چھوٹے مرزا صاحب کو ان کے احباب سمجھاتے جاتے تھے کہ بھائی اب ذرا صبر کرو۔ ہمایوں فر کو تو عمر بھر رونا ہے، مگر یہ استقلال اور امتحان کا وقت ہے، وہ بیچارہ مُصیبت کا مارا زار زار رو کر یہی کہتا تھا کہ۔

سنگین دلان بطفل سر شکم ترحمے
افگندہ ام بپائے شما ایں یتیم را

شہزادی نے بحالت جنون میں صندوق پر گر پڑیں۔ لڑکے نے اُٹھایا اور کہا اماں اب ذرا صبر کرو جس وقت جنازہ صندوق میں رکھا گیا اور لوگ لے کر چلے اس وقت کا ماتم خدا کسی کو نہ دکھائے ڈیڑھ سو عورتیں سینہ کوبی کرتی تھیں، اور کئی مخدرات دوہتھڑ پیٹتی ہوئی باہر نکل آئیں۔

شہزادی: ہائے، اس معصوم بچّے کو زبردستی لیے جاتے ہیں۔ ارے لوگو یہ بادشاہ کا لڑکا ہے۔ ارے یہ تاجدار کا لال ہے۔ کوئی تو بچاؤ۔ تمہیں بادشاہ کے نمک کا واسطہ، ارے لوگو جسے چھاتی

سے لپٹائے رہتی تھی، وہ اب قبر کی گود میں سوئے گا۔ کس کس ناز سے پالا تھا۔ ہے ہے ابھی خلعت اور جیغہ اور سرپیچ پہنے تھا۔ اور اب کفن پوش ہے۔ ہے ہے میرا فرزند جگر بند زمین کا پیوند ہو، اور میں جیتی جاگتی رہوں۔ ارے لوگو یہ کیا اندھیر ہے ہائے میرے لال۔

چھوٹے مرزا نے حسرت کے ساتھ جنازے کی طرف نظر ڈال کر کہا۔ بھائی جان اس دُور دراز سفر میں کسی کو ساتھ بھی نہ لیا۔ مجھے بھی چھوڑ چلے۔

حضرت کا رفیق زود میری میں تھا

بازوئے قوی دستگیری میں تھا

یہ دُور عدم کی راہ اور آپ ضعیف

مجھ کو نہ لیا عصائے پیری میں تھا

یاخدا یہ تو تنہائی کے سفر کے عادی نہیں ہیں۔ عدم تک کیوں کر جائیں گے، اور قبر کی منزل بھاری مشہور ہے۔ یاخدا مدد دے یا علی مشکل کشا مدد دے۔

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں

راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں

سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں

پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگ غم فرقت دل نازک پہ گراں ہے

اندوہ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

اِدھر جنازہ دروازے کے باہر آیا، اُدھر شہزادی بیگم نے اینٹوں کی دیوار پر سر دے دے مارا، اور خون کے سرانٹے رواں ہو گئے۔ خورشید لقا نے اس زور سے سر پیٹا کہ طلائی کڑا کھٹ سے سر پر بولا۔ خون جاری ہو گیا۔ سنبھالے کون اور روکے کسکو۔ وہ دوہتھڑ چلتا تھا کہ الامان الامان الحذر الحذر اپنے تو اپنے غیر تک از خود رفتہ تھے، دو چار عورتوں نے شہزادی بیگم کو سمجھایا، کہ حضور اس وقت اِک ذری دیر دِل کو قابو میں لائیں۔ جب تک قبر میں مُردہ دفنایا نہ جائے تب تک رونے سے اُس پر عذاب ہوتا ہے۔ وہ بیچاری یہی کہتی تھی کہ بہن رونا ضبط کرتی ہوں۔ تو دم رکتا ہے۔ روؤں نہ تو کیا کروں، ہائے کسی پہلو چین نہیں۔ میرا ہمایوں فر پیوند خاک ہو، اور میں ضبط گریہ کروں ہائے میرے دِل میں تو آہ شعلہ فشاں سے پھپھولے پڑ گئے۔ یہ غم تو کسی طرح سہا نہ جائے گا۔

اس سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

دلِ دردمند خود را شدہ ام زچارہ عاجز
شدہ وقت آنکہ اکنوں بجند اسپارم اُورا

جنازہ روانہ ہوا۔ صندل کا صندوق۔ زربفت کا شامیانہ، گنگا جمنی چوبیں، شامیانے میں سبز ریشمی ڈوریاں باندھی گئیں۔ کشمیریوں نے تابوت اُٹھایا، جنازہ اس طرح پر چلا۔
پہلے برچھی بردار سیہ پوش۔ پھر جھنڈی بردار سپاہی۔ چوبدار چار آدمی ڈوریاں تانے ہوئے۔ دو نقیب اِدھر اُدھر ساتھ، ایک نے کہا کُلُّ مَن علیہا فان۔ دوسرا بولا۔ اشہد اَن لا الٰہ الا اللّٰہ محمدٌ رسول اللّٰہ۔ اس زور سے کہ رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ اور سامعین حیرت کے ساتھ جنازے پر نظر ڈالتے تھے۔ گنہگار و سیہ کار، زانی فاسق بدکردار تھراتے تھے۔ جو لوگ ملتے تھے دس قدم جنازے کے ساتھ جاتے تھے۔ صندوق پر کم خواب کی گراں بہا چادر پڑی تھی۔ اُس پر سُرخ رنگ کا دوشالہ پڑا ہوا۔ سہرا بندھا ہوا۔

مہندی کے عوض ہاتھوں میں دولھا کے لگے زخم
آلودۂ خون پنجۂ مرجاں نظر آیا

روتے پیٹتے دریا پر پہونچے۔ میر و غسال اور بہت سے غسال تھے جنھوں نے دریا میں چاروں طرف بلّیاں گاڑیں۔ اُن پر تختے باندھے۔ اِدھر اُدھر قنات نصب کی۔ نم گیرہ تانا گیا۔ لاشِ مبارک کو بیسن سے پاک کیا۔ اس کے بعد آبِ خالص سے غُسل دیا۔ پھر آبِ سدرہ سے پھر آبِ کافور سے کربلائے مُعلّٰی کا کفن متبرک جس پر حضرت مولانا بحر العلوم، اور جناب شیخ زین العابدین مجتہدین مقدس کربلا کی مہریں تھیں پہنایا گیا۔ اس کفن پر بہت خوشخط کلام اللّٰہ لکھا تھا۔ چادر (بردیمانی) اور تبرکات بھی رکھے گئے۔ بعد الفراغِ غسل جنازہ قلعہ مُعلّٰی کی طرف روانہ ہوا۔ اس قلعے میں جو لب جُو واقع تھا، مرزا ہمایوں فر بہادر، کے آباؤ اجداد سلاطین سابق کے مقبرے تھے۔

جنازے کو دیکھ دیکھ کر خلق خدا زار زار روتی تھی۔ اور قاتلِ سفاک پر سب صغیر و کبیر لعنت بھیجتے تھے۔ خیر چھوٹے مرزا یعنی مرزا ہمایوں فر کے بھائی نے چوبدار کو حکم دیا کہ قبلہ و کعبہ سے عرض کرو، کہ اب حضور تشریف لائیں۔ نماز جنازہ پڑھنے کا وقت آگیا، چوبدار حکم پاتے ہی روانہ ہوا۔ قبلہ و کعبہ کی ڈیوڑھی پر آیا بہت جُھک کر ادب کے ساتھ آداب بجا لایا۔ اور عرض کی خداوند چھوٹے

مرزا صاحب نے بھیجا ہے کہا ہے کہ اب حضور تشریف لائیں (روکر) نمازِ جنازہ کا وقت آگیا۔ یہ کہہ کر چوبدار بے اختیار رونے لگا۔ آپ نے سمجھایا کہ بھائی دُنیا جائے آسائش نہیں۔ الدنیا دار الغرور و العقبیٰ دار السرور یہاں عیش و آرام کجا۔

دل منہ بر دنیا و اسبابِ اُو | زانکہ از وے کس وفاداری ندید
کس عسل بے نیش ازیں دُکان نخورد | کس رطب بے خار ازیں بُستاں نچید
ہر کہ ایامے چراغے بر فروخت | چوں تمام افروخت بادش در دمید
بے تکلف ہر کہ دل بر وے نہاد | چوں بدیدم خصم خود می پرورید
شاہِ غازی خسرو گیتی ستاں | آنکہ از شمشیر او خود می چکید
گہہ بیک حملہ سپاہی می شکست | گہہ بہوئے قلب کوہی می درید
سروران را بے گنہ می کرد حبس | گردنان را بے سخن سرمے برید
از نہیبش پنجہ می افگند شیر | در بیابان نام اُو چون می شنید
عاقبت شیراز و تبریز و عراق | چوں مسخر کرد و وقتش در رسید

آنکہ روشن بُد جہاں بنیش بدو
میل در چشم جہاں بنیش کشید

یہ فرما کر جناب امام العلما شریف کعبۂ تقدس، حضرت قبلہ و کعبہ مُجتہد العصر و الزماں نے سیاہ عبا دوش مبارک پر رکھی۔ کپڑے پہنے، سر مبارک پر عمامہ باندھا۔ ہاتھ میں تسبیح لی۔ اور فنس میں بیٹھے کہاروں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر فنس اُٹھائی۔

اِدھر جنازہ داخل قلعہ مُعلّٰی ہوا۔ اُدھر حضور مُجتہد العصر کی سواری نمودار ہوئی۔ فنس قریب آئی۔ بسم اللہ کہہ کر آپ اُترے۔

چھوٹے مرزا: حضور نے کچھ سُنا۔ (اس کے بعد فرطِ الم سے آواز نکلی) مُجتہد العصر (تھوڑی دیر خاموش رہ کر) ؎

امی یومین من الموت اُزفر
یومُ لا یقدر ام یوم قدر
یوم لا یقدر لا یاتی القضا
یوم قد قدر لا یغنی الحذر

بس اسکوفی الذہن رکھو۔

دو روز حذر کردن از مرگ روا نیست
روزیکہ قضا باشد و روزیکہ قضا نیست
روزیکہ قضا باشد کوشش نکند سود
روزیکہ قضا نیست درو مرگ روا نیست

چھوٹے مرزا: (نہایت تلخکلامی کے ساتھ رو کر) اب میں کیا کروں۔
مجتہد العصر: (سہولت کے ساتھ) صبر۔
چھوٹے مرزا: (آہِ سرد بھر کر) یہ ہوا کیا اور تھا کیا۔
مجتہد العصر: طلسم حقیقی ؎

ہر کہ آمد در جہانِ پرز شور — عاقبت بپایدش رفتن بہ گور
در رہِ عقبیٰ ست دُنیا چوں پلے — بے بقا جائے و ویراں منزلے
دل منہ بر ایں پل پر وہم و بیم — برگ ہا سازد مشو اینجا مقیم
من گرفتم خود توئی بہرام گور — خواہی افتاد آخر اندر دام گور

ہیچ کس را نیست زیں منزل گریز
از گدا و شاہ واز برنا و پیر

اتنے میں ہمایوں فر سے ایک بزرگ نے کہا، قبلہ و کعبہ آپ نے دیکھا یہ کیا ستم بپا ہو گیا۔ ہمارا ہونہار، ہوشیار، سعادت مند، دل بند معقول پسند فرزند، داغِ حسرت دے کر چل بسا۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون۔ ؎

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند
چہ دید اندر خم ایں طاقِ نیلیں
بجائے لوحِ سیمیں در کنارش
فلک بر سر نہادش لوحِ سنگیں

کبھی کسی شخص کے ساتھ بدی نہیں کی۔ ہنس مکھ شگفتہ پیشانی خندہ جبیں مرنج مرنجان۔
آدمی تھا مگر اجل کے ہاتھ سے جان بر نہ ہوا ؎

ما عادتِ خود بہانہ جوئی نکنیم
جز نیجی خلق و نیکخوئی نکنیم
دانہا کہ بجائے ما بدی ہا کردند
ما با ایشاں بجز نکوئی نکنیم

اس مسلک کا وہ سالک تھا۔

صندوق قبلہ رُخ رکھا گیا جضرت مجتہد العصر تابوت کے پاس تشریف لے گئے۔ حاضرین نے صفیں باندھیں، قبلہ وکعبہ نے نیت کر کے تکبیر کہی۔ نمازِ جنازہ ختم ہوئی تو چھوٹے مرزا دفعتہً علیل ہو گئے۔ حوالی قلب میں یکایک درد اُٹھا، اور اس درد کی چمک بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ ایں گلِ دیگر شگفت: ؎

ہر دم زمانہ داغِ غمم بر جگر نہد
یک داغ نیک ناشدہ داغِ دگر نہد

یک نشد دو شد، فوراً صاحب سیول سرجن اور بابو صاحب اسسٹنٹ سرجن بلوائے گئے اور کئی حکیم طلب ہوئے۔

اس وقت قلعہ معلّٰی میں عجب ہیبت ناک الم خیز اور درد انگیز سماں تھا ہر در و دیوار برگ و بار سے وحشت اور مرقدِ منوّر سے بے کسی برستی تھی۔ ہائے افسوس وائے افسوس!

مرزا ہمایوں فر کے دلی دوست عجب حسرت سے قبرِ نورانی و عنبریں پر نظر ڈالتے تھے۔

جتنے تکیے میں سو رہے ہیں تمبر
یار ہیں سب ہماری صحبت کے

ایک دوست: کیوں جی۔ مرزا ہمایوں فر یہی ہیں گویا پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔

دوسرا: کل من علیہا فان ابھی دھما چوکڑی مچی تھی، اور اس وقت سناٹا ہے۔ ابھی برات کر و فر سے جاتی تھی، اور اب جنازہ نکلا اور قبر بھی بن گئی۔

تیسرا: (رو کر)۔ ہا۔ کیا ہو گیا۔ اُف ارے یار آج نیند کیوں کر آ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔ ہمایوں فر سا جلیس اُٹھ گیا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی فٹن کھڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ اور لوگوں کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی۔

رنگین شاہ

ثریا بیگم اور مولوی صاحب اور تھانہ دار اور باورچی اسی مکان میں رہتے تھے۔ باورچی کو کھانا پکانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ تھانہ دار اور ثریا بیگم میں بول چال ترک۔ مولوی صاحب اس فکر میں تھے کہ اس زیبا عروس کے ساتھ شادی کریں۔ ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ ایک فقیر سامنے سے چلا آتا ہے۔ زعفران پوش۔ زعفرانی تہ بند۔ اور زعفرانی کفنی اور زعفرانی ڈوپٹا بال گھونگھر والے۔ برہنہ سر مانگ نکلی ہوئی۔ نیلے کا تیل پڑا ہوا کشیدہ قامت، گل رُخسار۔

ثریا بیگم : یہ درویش کون ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رسیدہ ہیں۔

مولوی : اب یہاں آئیں تو معلوم ہو کہ رسیدہ ہیں یا بنے ہوئے ہیں۔

ثریا بیگم : بنے ہوئے ایسے نہیں ہوا کرتے۔ ان کے چہرے سے نور برستا ہے۔

مولوی : ہاں مگر آدمی بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔ سُرمے کی تحریر بھی ہے۔ پان بھی کلّے میں دبا ہوا ہے۔ سیدھی مانگ بھی نکلی ہے۔ اینڈتا ہوا چلتا بھی ہے۔

اتنے میں درویش نے آن کر مولوی صاحب کو سلام کیا، اور کہا اگر مضائقہ نہ ہو تو رنگین شاہ بھی ذرا بیٹھ کے دم لے لیں۔ مولوی صاحب نے اجازت دی اور کہا خانہ بے تکلف ہے بیٹھیے۔

شاہ : بابا ہم دُور سے آتے ہیں۔ ادر چکرورتی سیر کر چکے ہیں۔

مولوی : کہاں کہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ کن کن ملکوں میں گئے ہو۔

شاہ : کشمیر، برہما، اٹک، کٹک، میسور، دکھن، گجرات، مدراس، بمبئی، کلکتہ، بنگالہ اڑیسہ نیپال، کابل، تبت، چین، بھوٹان، کاشغر وغیرہ وغیرہ۔

مولوی : اخاہ۔ ع

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

ہے کہ نہیں۔

شاہ : بچہ ایسی مت کہو ہم رمتے جوگی، سنت سادھو ہیں۔

مولوی : کیا ہندو ہو۔ اور ہم اب تک مسلمان سمجھ لیے۔

شاہ : اللہ سب کا ایک ہے۔ تم نے اللہ کہا ہم نے پرمیشر کہا۔ اور انگریزوں نے گاڈ کہا کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، مگر وہ ایک ہی ہے مصرع

کثرت ذات تو وحدت نہ گزینذ زصفات

ثنا ہا ہمہ ایزدِ پاک را

ثریا دہ نارم تاک را

مولوی : آپ نے اس فقیری میں کیا پایا۔ کچھ ملا یا نہیں ملا۔

شاہ : وہ ملا جو ملنا چاہیئے تھا۔ اور وہ پایا جو کسی نے نہیں پایا۔

شیخ کعبہ میں تم نے کیا دیکھا

ہم بتوں سے ملے خدا دیکھا

اس مائی کا نام کیا ہے؟

مولوی : تم کو اس سے کیا مطلب ہم سے باتیں کرو۔ مردوں سے۔

شاہ : واہ وا کیا موہنی صورت مائی کی ہے۔ کامنی اور پدمنی۔ آج دیکھی۔ کہو مائی تو یہاں کس کے ساتھ آئی، تو تو بادشاہوں اور راجاؤں کے قابل ہے۔

مولوی : شاہ جی آپ نہیں مانتے ان سے نہ بولیے۔

شاہ : کیوں مائی تیرا ہاتھ دیکھ کے تیرا حال بتا دوں۔

مولوی : ایسے بنے ہیں۔ بھلا بجا تو دو —— شاہ جی نے بالحان داؤدی گانا شروع کیا۔

با اثر یافت چوں فغان مرا	باغباں سوخت آشیانِ مرا
خوش نگاہاں بگردشِ چشمے	سرمہ کردند استخوانِ مرا
نالہ گفتم کند ہوا واری	داد برباد خانمانِ مرا
بچہ نام ونشاں تواں جستن	دلِ بے نام و بے نشانِ مرا
نازک آں طبع و من سخن گستاخ	اے ادب مُہر کُن دہانِ مرا
بسکہ گل گوں اشک شوخ افتاد	بُرد واقف زکف عنانِ مرا

مولوی : بیگم۔ تم اُدھر جا کے بیٹھو۔ اب اس کے سامنے نہ آنا۔

راوی : ایں! معقول۔ وارث علی خاں بن بیٹھے۔

بیگم : وجہ۔ آخر آپ میرے باپ ہیں، بھائی ہیں۔ آپ ہیں کون؟

شاہ : مائی۔ میں ذرا ہاتھ دیکھوں تو کُل حال بتا دوں۔

ثریا بیگم : (ہاتھ بڑھا کر) بسم اللہ دیکھیے۔

مولوی : بائیں ہاتھ ہٹا لو۔ ہمارا ہاتھ دیکھ کے بتائیے۔

تو براوج فلک چہ دانی چیست
چوں ندانی کہ در سرای تو کیست

شاہ : (ہاتھ میں ہاتھ لے کر) کیا گورا گورا ہاتھ ہے۔

مولوی : سخت بدمعاش ہو۔ سچ ہے۔ ع

اصل بد از خطا نکند

ثریا بیگم : تم کون ہو۔ تم بیچ میں کیوں بولتے ہو؟

شاہ : بیگم صاحب آپ کا نام ثریا بیگم ہے، اور آپ کسی زمانے میں جوگن کے بھیس میں رہی تھیں۔ اور آپ اپنے ماں باپ سے جُدا ہو گئی ہیں۔ عباسی مہری آپ کے ہاں ضرور رہتی۔

ثریا بیگم : (دنگ ہو کر) بیشک تم رسیدہ ہو۔ تمہارے قدم لے مگر ہندو ہو۔

شاہ : مائی ہم نہ ہندو میں ہندو نہ مسلمان میں مسلمان۔

نہ ہندو، نہ مسلماں نہ محتسب نہ فقیہ
بخیر تم کہ سر انجام ماچہ خواہد بود

راوی : یاد حشت! دوسرے کھوجی ہیں۔

مولوی : ایسے ایسے سادھو بہت دیکھے ہیں زمانے بھر کے بدمعاش اور سادھو بن بیٹھے۔ لعنت خدا، خبردار اب ان سے نہ بولنا، نہیں تم جانو گے فقیری رکھی رہے گی۔

شاہ : بچا بہت آہنکار کی نہ لو۔ مائی تم گانا سُنو۔

بہ بینید آن فتنۂ اہل دیں را	بہ بینید آن چشم سحر آفریں را
بہ بینید آن عارضِ آتشیں را	اگر خانماں سوزد لہانہ دید بد

بآن زلف سود از زیان نیست سودت بتکرار برسیده ام شانہ بیں را
چو بر بیدلان بگذرد گوید از ناز یہ بند بدہ آن را بہ گیرید ایں را

بر آن خاک در سجدہ کردیم واقف
نشاندیم بر تخت نقش نگیں را

ثریا بیگم : تمہارے گانے پر ہم عاشق ہیں کوئی اور غزل گاؤ۔

شاہ : مائی ابھی تو بیٹھک نہیں ہوئی۔ جب میل ہوگا تو پھر اور سنایا کروں گا۔

مولوی : یہ میل کیسا۔ سائیں تم کہیں پٹکے نہ جاؤ۔ تم ہندو یہ مسلمان۔ تمہارا ان کا میل کون۔ ہمارا ان کا میل البتہ ٹھیک ہے۔

بیگم : اچھا جان دینے پر تیار ہو تو ہم اِن سے نہ بولیں۔

مولوی : جب جان ہی نہیں پھر کیا عاشقی اور معشوقی۔

دل لے کے ہمارا جو کوئی طالب جان ہے
ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جی ہے تو جہاں ہے

شاہ : مائی میں ایک راجہ کا نوکر تھا۔ بس گیان آتے ہی نوکری چھوڑ دی۔

ما سپردیم یار جانی را
حاصل عمر و زندگانی را

مولوی : آپ دیوان ہوں گے کوئی ہزار روپیہ تنخواہ تھی۔

شاہ : بچہ میں دو سو ٹھیکریاں پاتا تھا۔

مولوی : بچہ! بابا کہتے شرم آتی ہے۔ اور روپے کو آپ ٹھیکریاں کہتے ہیں۔ ایسے بڑے قانع بنے ہیں۔ دنیا ساز چاپلوس آدمی۔

شاہ : بابا تو ہم کو لوگ کہتے ہیں بچہ۔ اور ہم تو بیشک ٹھیکریاں ہی سمجھتے ہیں۔ اب تک ہزاروں ہی جھنجھٹیں تھیں۔ اب موجیں کرتے ہیں۔ گنگا کے کنارے ایک کٹی بنائی ہے۔ اسی میں سادھو، ہر کا نام جپا کرتے ہیں۔ گنگا کے اشنان اور بھجن کرنا۔ گنگا توری لہر ہمارے من بھائی۔ گنگا توری لہر ہمارے من بھائی۔

مولوی : خدا سمجھے یہ بدبخت کہاں سے آیا۔

شاہ : نا۔ بچہ کسی کو برا نہ کہنا۔ خدا تم کو راہ راست پر لائے۔

بکشائی دری کہ درکشا یندہ توئی

بنمائی رہی کہ رہ نمایندہ توئی

من دست بہیچ دست گیری ندہم

کایشاں ہمہ فانی اند وپایندہ توئی

مولوی : اس قسم کے لوگ بہت ٹھگ لیتے ہیں۔ دو چار رُباعیاں یاد کرلیں، ذرا گانا سیکھ لیا، ستار بجانے لگے۔ چلیے جُہلا نے پوجنا شروع کیا۔

شاہ : بچّہ کچھ اس کا بھی ڈر ہے۔ سب کی بندیا (ہجو) کرتا ہے۔

آن کو کہ سرِّ حقیقتش باور شد

خود پہن تراز سپہر پہنا ور شد

ملّا گوید کہ بر شد احمد بفلک

سرمد گوید فلک باحمد ور شد

مولوی : اگر بس چلے تو قتل کر ڈالوں۔ واجب القتل ہے۔

ثُریّا بیگم : شاہ صاحب آپ کوئی غزل گائیں۔

شاہ : مائی اگر ہرج نہ ہو تو میں ایک بوشہ لے لوں۔

مولوی : کیا! بوشہ۔ شیخ ہے شاہ صاحب شیخ ہے۔ آپ تو بڑے بے تکلّف نکلے۔

راوی : اس بوشے کی لفظ پر ثُریّا بیگم بہت ہنسیں۔ اس عرصے میں تھانہ دار صاحب سیر و شکار افگنی کے لیے گئے تھے۔ باورچی بھی اُن کے ساتھ گیا تھا موقع وقت غنیمت جان کر ثُریّا بیگم نے ٹھان لی۔ کہ اس کے ساتھ نکل بھاگیں۔ اشارے سے بوسے کی اجازت دی، اور اس جوان مست نے گوری گردن میں ہاتھ ڈال کر گل رُخسار کے متواتر بوسے لیے۔ مولوی صاحب جل مرے اور اپنے دل میں کہنے لگے۔

بآن طمع کہ بمستی ببوسم آن لب لعل

چہ خوں کہ در دلم اُفتاد ہم چو جام و نشد

شاہ : مائی اس جہان گذران کا کون ٹھکانہ ہے کچھ بھی نہیں۔

دنیا گذران ست بہر بیش و کمی   خواہشیں بشادی گذران خواہ غمی

زیں منزلت البتّہ ہمی باید رفت   خواہی بہ ہزار سال خواہی بدمی

مولوی : اچھا بوس و کنار ہے۔ بے حیائی تیرا ہی آسرا ہے۔

شاہ : بچّہ حسد نہ کرنا۔ مائی ہم کو پہچان گئی۔

مولوی : ہاں پہچان گئی کہ بھائی ہیں، اور اب تک مائی کہے جاتا ہے۔

بیگم : شاہ جی اب تم ایسے ولیوں کے منھ نہ لگو۔

شاہ : ہم موجیں کرتے ہیں۔ ہم کو کیا واسطہ۔

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں — ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے — سوا اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب — تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم — چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

نوشتے کو میرے مٹاتے ہیں رو رو — ملائک جو لوح و قلم دیکھتے ہیں

مٹاتا ہے سب حرف ہی آنسوؤں سے — جو نامہ اسے کر رقم دیکھتے ہیں

اکڑتے نہیں کام سنبل کی ہم کو — کسی زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اُسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

مولوی : ایک بوسہ اور لے لو۔

شاہ : بچّہ سادھوؤں جوگیوں کی زبان نہ پکڑا کرو۔

روئے مقصود کہ شاہان بدعا می طلبند
سببش بندگیِ حضرتِ درویشاں است

مولوی : اچھا آنے دو ان کے میاں کو۔ معلوم ہوگا۔

شاہ : ہم کو کسی سے کیا واسطہ۔ سادھو آدمی کو کچھ مطلب نہیں۔

رنگین شاہ نے آہستہ سے کہا کہ اس کو باتوں میں لگاؤ اور کوئی ایسا چکمہ دو کہ یہاں سے ذرا ٹل جائے تو ہم تم کو لے کے بھاگ جائیں۔ ثریا بیگم نے کہا، تم گاؤ میں فقرہ چست کر دوں گی۔ شاہ جی نے گانا شروع کیا۔

تا خون بایاغ نیست مارا — دِل نیست دماغ نیست مارا

اے نالۂ مقصدیم از تو — گز گریہ فراغ نیست مارا

یک لخت جگر بسانِ لالہ بے بہرہ وز داغ نیست مارا
از ما احوالِ دِل چہ پُرسی بگذار دماغ نیست مارا
واقفِ شبہائے ہجر تو داغ
حاجت بچراغ نیست مارا

ثریّا بیگم: مولوی صاحب اپنے دِل میں سمجھے کہ یہ ان کے ساتھ چل دیں گی۔
مولوی: سمجھے کیا معنی۔ تم نے بوسہ دیا تھا کہ نہیں۔
شاہ: بچہ شاہ سنت سب کو مائی اور بہن سمجھتے ہیں۔ اور سب کے ساتھ ایک طور سے پیش آتے ہیں۔
مولوی: جی بجا ہے آپ ایسے ہی ہیں۔
ثریّا بیگم: مرد خوبصورت ہے۔ ایسا جوان کہاں پیدا ہوتا ہے۔
مولوی: اور جو ہوتا ہے تو مر بھی جاتا ہے۔
ثریّا بیگم: اے ہٹو بھی۔ یہ کونسی دِل لگی ہے واہ۔ موے کی باتیں تو دیکھو آیا وہاں سے وہ بن کے مولوی کی دُم۔
شاہ: نہیں مائی ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔
ثریّا بیگم: تم ہندو ہو۔ کون ہندو۔ باہمن یا ٹھاکر۔
شاہ: مائی ہمارے مذہب کی کیا پوچھتی ہو۔

مِلّتِ عشق از ہمہ دیں باجُداست
عاشقا نرا مذہب و مِلّت جُداست

پُوجا اور نماز دونوں سے واسطہ نہیں۔

در مذہبِ عاشقی حسابِ دگر است
رسمے دگر ست و احتسابے دگر است
در مذہبِ ما نیاز باشد نہ نماز
پیغمبرِ عشق راکتابے دگر است

ثریّا بیگم: مولوی صاحب اس وقت کچھ شکار لاؤ تو پکے۔
مولوی: اچھا یہ کون بات ہے۔ مگر اس کے واسطے تو نہیں منگواتی ہو۔

شاہ : (مسکرا کر) ہم گوشت خور نہیں ہیں۔ زبان کا ذائقہ بھی ایسا نہیں، کہ عُمدہ ہی غذا ہو۔ جو کچھ کھانے کو مل گیا کھا لیا۔

اے طالبِ لذّتِ غذا ہائے لذیذ
جو پائے حلاوتِ مربّائے لذیذ
بانان جویں بسازد پیش دونان
کفِ کفچہ مکن ازپے حلوائے لذیذ

مولوی : اچھا میں جا کے کوئی جانور لاتا ہوں۔

ثریّا بیگم : کہیں سُوّر نہ مار لانا۔

مولوی : استغفراللہ۔ توبہ توبہ الٰہی توبہ خوک خنزیر۔

ثریّا بیگم : پھر جاؤ مگر جلد آنا۔

مولوی صاحب سیدھے آدمی، ان ہتھکنڈوں کو کیا جانیں۔ بندوق لے کر شکار کے لیے گئے۔

اُدھر مولوی صاحب گئے اُدھر باہم مکالمہ رُوح پرور ہونے لگا۔

شاہ : تم تو جوگیوں کے قابل ہو۔

ثریّا بیگم : وجہ!

شاہ : ایسی حسین ہو کہ بیان سے باہر۔

ثریّا بیگم : واہ۔

شاہ : ایک بوسہ اور لوں۔

ثریّا بیگم : ذرا تامل کرو۔

شاہ : عاشق زار ہوں۔

ثریّا بیگم : کھُل جائے گا۔

شاہ : جان جاتی ہے۔

ثریّا بیگم : افسوس۔

شاہ : یہ مختصر و موزوں تقریر۔

ثریّا بیگم : بیشک۔

شاہ : جان من۔ خدا جانے کہاں سے ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں۔

ثریّا بیگم : ایں! (غور کر کے) تمہارا نام کیا ہے۔

شاہ : ہمارے نام سے کیا غرض۔

نے بُلبلِ چمن نہ گُلِ نو دمیدہ ہوں　　مَیں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

گریاں بشکل شیشہ و خنداں بطرز جام　　اس میکدے میں آہ عبث آفریدہ ہوں

مَیں کیا کہوں کہ کون ہوں سوداؔ بقول دردؔ

جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ثریّا بیگم : (پھر غور کر کے) کون ہے۔ ع

اے گُل بتو خرسندم تو بوی کسے داری

شاہ : پہچانا یا اب بھی نہیں پہچانا۔

ثریّا بیگم : آزاد۔ ہائیں یا خدا میری آنکھیں اس وقت دھوکا تو نہیں دیتی ہیں۔

شاہ : پھر غور کر لو۔ عاشق جانباز کو دیکھ لو۔

فردوس چہ کار آید اگر یار نباشد

جنّت نروم گر رُخِ زیباش نہ بینم

مارا نہ غم دوزخ و نے خبطِ بہشت ست

بردار ز رُخ پردہ کہ مشتاق لقائیم

ثریّا بیگم : آزاد۔ صُورت تو بعینہٖ ایسی ہی ہے۔

شاہ : (مسکرا کر) خوب غور کر لو۔ کن کن مصیبتوں سے پتا ملا ہے۔ مگر دل میں ٹھان لی تھی کہ یا یار سے ملیں گے یا جان دیں گے۔

گر تیغ بار دور کوے آن ماہ　　گردن نہادیم الحکم للہ

من رندو عاشق انگاہ توبہ　　اَستغفر اللہ اَستغفر اللہ

آئیں تقوٰی مانیز دانم　　اما چہ چارہ با بخت گمراہ

ماشیخ و زاہد کمتر شناسم　　یا جام بادہ یا قصہ کوتاہ

الصبر مرا تعمر فان

یالیت شعرے حتی مع القاہ

ثریا بیگم : یا خدا میں کیا کروں۔ آنکھیں کام نہیں کرتیں۔

شاہ : اب کوشش ٹھکانے لگی۔

بہارِ گل طرف انگیز گشت و توبہ شکن

بشادیِ رُخِ گل بیخ غم ز دِل برکن

رنگین شاہ نے حافظ شیرازی کے اس شعر کو ایسی خوش الحالی سے گانا شروع کیا کہ ثریا بیگم مست ہو گئیں۔

تا زمے خانہ و مے نام و نشاں خواہد بود

سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

اس بت نازنین کو شک تھا کہ یہ آزاد ہی ہے، مگر یقین کامل کا درجہ نہ تھا۔ شاہ جی نے آگے بڑھ کر پھر ایک بوسہ لیا۔ ثریا بیگم اس درجہ مست ہوئیں کہ خاموش رہیں۔

شاہ : اب یہی موقع ہے کہ بھاگ چلو۔ اور اگر نہ چلو تو مار ڈالو۔ ایک غمزہ کافی ہے۔

بدام زلف تو دِل مبتلائے خویشتن است

بکش بغمزہ کہ اینش سزائے خویشتن است

برسوں سے تمہارے حُسن گلوسوز نے خرمن دل پر بجلی گرائی ہے اور ستم ڈھایا ہے۔

الغیاث اے مایۂ جان الغیاث

کفرِ زلفت بُرد ایمان الغیاث

جان عذاب میں تھی۔ کوہ و دشت و ہاموں اور میدانِ جنگ میں جہاں جاتا تھا، آنکھیں تم کو ڈھونڈھتی تھیں۔

چشم بیمارت مرا بیمار کرد

جز لبانت نیست درمان الغیاث

چوں دو زلفت کرد سرگرداں مرا

گردش گردونِ گرداں الغیاث

ثریا بیگم نے کہا اچھا بسم اللہ کہہ کر چلو۔ اب بھاگ چلنے کا موقع ہے۔

دونوں رواں ہوئے۔

تھانہ دار کی بے قراری

محبوب شیریں ادا معشوقہ مہرلقا ثریا بیگم اس جوانِ رعنا شمایلِ زیبا خصائل سے ساتھ بھاگ گئیں۔

حضرات ناظرین خوب واقف ہیں کہ ثریا بیگم یعنی اللہ رکھی جو جوگن ہوگئی تھیں اور جن کا نام کچھ عرصے تک شبّو جان تھا۔ گو رنگین مزاج، اور خوبرو اور ہنس مُکھ تھیں۔ مگر پاک دامن اور عفیفہ۔ اس قوی ہیکل اور جوان خوبصورت پر آزاد کا دھوکا ہوا۔ مگر علم الیقین، یا حق الیقین کا درجہ نہ تھا تاہم۔ ع

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

کہہ کر خاموش ہو رہی تھیں۔

اب سُنیئے کہ تھانہ دار صاحب جو شکار کر کے واپس آئے اور یہاں مولوی صاحب کو نہ پایا نہ ثریا بیگم کو۔ تو کان کھڑے ہوئے۔ اِدھر گئے اُدھر گئے اس کونے میں جھانکا اس گوشے میں دیکھا جو طرفہ سناٹا پایا تب تو ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

اتنے میں باورچی بھی آیا انواع اقسام کے جانور ساتھ۔ آتے ہی کہا کہ صوبہ دار صاحب آج تو بیگم صاحب اور مولانا اور آپ اور ہم سب مزے سے ان جانورانِ صحرائی کا گوشت چکھیں گے اور دندنائیں گے۔

تھانہ دار: ارے یار ثریا بیگم ہیں کہاں۔ اُن کا تو کہیں پتا ہی نہیں۔

دلبری بُرد از دلم صبر و قرار
کز رخش بُرقع بود صبحِ بہار

باورچی: کیا! یہ آپ نے فرمایا کیا۔ ثریا بیگم کہاں ہیں۔ سبحان اللہ۔

تھانہ دار: بھائی چکمہ ہوگیا۔ وہ مولوی بھگا لے گیا۔ تڑکا ہوگیا۔

شاکی ہوں گردشِ فلک بدخصال کا
آئی شبِ فراق گیا دن وصال کا

اور اس پر کالۂ آتش نے تو ہم سے کہہ ہی دیا تھا کہ جب سے اپنا گھر بار چھوڑا، سینکڑوں

روپ بدلے، خدا جانے کون کون مصیبت زدہ اس پر عاشق ہوا کس کس کو گھائل کیا کون کون وصال سے مستفید ہوا کس کس پر ستم ڈھایا۔

عاشق ہزاریوں تو ہوئے صاد چشم کے
چہرہ مگر بحال رہا خال خال کا

اب اس مولوی نے ہم کو بھی دھتا بتایا۔ خدا جانے اب کہاں ہے اور وہ نام کا مولوی ان کو لے کر کس طرف نکل گیا۔

محوِ جمال رہ گئے ہم کچھ خبر نہیں
آیا کدھر سے یار، کدھر سے نکل گیا

ایک ہم پر کیا فرض ہے جس نے ایک نظر دیکھا عاشق زار ہوگیا۔ اور ہوا ہی چاہیے رخسار گل۔ قد سرو۔ آنکھیں نرگس۔ زلف کاکل۔

قد قیامت کا ملا چال غضب کی پائی
آفتیں ڈھائے نہ وہ فتنۂ دوراں کیونکر

مگر دنیا کے بھی عجب کارنامے ہیں۔ ثریا بیگم ہم پر جان دیتی تھیں۔ کوٹھے پر مو پریشان، مست و خندان، تاک جھانک کرتی تھیں۔ لونڈیوں کے ذریعے سے ہم نے پیغام بھیجے۔ مسکرا مسکرا کر جواب دیا کہ اُن سے کہو کچھ خیر ہے نکاح ثانی شرفا میں جائز نہیں۔ مانا کہ وہ حسین جوان ہیں۔ عالی خاندان ہیں، اور عالی دودمان ہیں، مگر یہ بات بھلا کیوں کر ممکن ہے) بہ ظاہر انکار مگر در پردہ عشق کا اظہار۔ وہ چھت پر گیسو سنوار کر آنا اور عاشق شوریدہ سر کو دیکھ کر زیر لب مسکرانا۔

سودا تھا ہم کو سنبلِ باغِ مراد کا
چلتی تھی اپنے گلشنِ دل میں ہوائے زلف
روزِ سیہ نصیب ہو موذی کے واسطے
دنیا میں کوئی ہو نہ پریشاں سوائے زلف

مگر وہ روزِ سیہ ہمیں کو نصیب ہوا۔ یا تو وہ گرما گرمی تھی، یا اب یہ سرد مہری ہے۔ اب ہم ہیں اور دلِ بے قرار ہم ہیں چشمِ اشکبار؟

ابر ہیں دیدۂ پُر آب سے ہم — برق ہیں دِل کے اضطراب سے ہم
دم میں فوج فنا مٹا دے گی — بحرِ ہستی میں ہیں حباب سے ہم

بے وفاؤں سے ہے وفا مطلوب

طالبِ آب ہیں سراب سے ہم

زندگی ہو گئی عذاب ہمیں

گذرے زاہد ترے ثواب سے ہم

تنگ آئے ہیں تنگ آئے ہیں

اس دلِ خانماں خراب سے ہم

مگر مولوی صاحب قبلہ ہاتھ آئیں تو ہم انھیں خوب بتائیں۔خیر۔اب تو جھانسا دے ہی گئے۔ سمجھا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

عاشقوں میں فرد ہیں نکتے وہم کو یاد ہیں

قیس کے اُستاد ہیں، فرہاد کے اُستاد ہیں

ہمیں بھی گھاتیں یاد ہیں۔زندگی شرط ہے۔ انشاء اللہ۔لیکن یہ ہجر ہمیں مار ڈالے گا کہیں کا نہ رکھے گا۔

اُفت کا زور ضعف کا بڑھتا ہے ہجر میں
انسان تو کیا ہے دیو پچھڑتا ہے ہجر میں

دم عاشقِ حزیں کا اُکھڑتا ہے ہجر میں
کیا کیا کمیت عمر بگڑتا ہے ہجر میں

چین ایک دم نہیں پڑتا ہے ہجر میں
خنجر کوئی گلے پہ رگڑتا ہے ہجر میں

روتا ہے آسمان مرے حالِ زار پر
بارانِ غم ہے، مُنھ نہیں پڑتا ہے ہجر میں

تدبیر وصل پڑتی ہے تقدیر کے خلاف
بنتا نہیں ہے کام بگڑتا ہے ہجر میں

وصلت میں مجھ سے پوچھتا ہے یار اے صبا

کس طرح چین آپ کو پڑتا ہے ہجر میں

باورچی : آپ نے چپہ چپہ ڈھونڈ لیا ہے۔شاید یہیں ہوں۔

تھانہ دار : اجی حضرت۔وہ یہاں سے پانچ کوس پر ہیں، یہاں کہاں۔

باورچی : لاحول ولاقوۃ۔ بڑی بُری ہوئی۔یہ شو بھی گیا۔

تھانہ دار : مولوی نے جھانسا دیا اور اُڑا لے گیا۔اب ہجر ہے۔

تقدیر شکل یاس کی تکتی ہے ہجر میں

رہ رہ کے بائیں آنکھ پھڑکتی ہے ہجر میں

باورچی : اچھا اب ان کو بھون بھون کے چکھیے۔غم غلط کیجیے۔

تھانہ دار: ارے یار یہ غم غلط ہونے والے ہیں بھلا۔ اے توبہ۔

فرقتِ ساقی ہیں یہ مقسوم پر پتھر پڑے

ہیں الگ کونے میں ٹوٹے شیشہ و ساغر پڑے

باورچی: سُنیئے حضور۔ دو دو باتیں عرض کروں گا بس۔

جُھکے آپ سے اُس سے جُھک جائیے

کِھنچے آپ سے اُس سے کِھنچ جائیے

جب وہ آپ کو چھوڑ کے بھاگ گئیں، تو اب آپ کو لازم ہے کہ کبھی نام تک زبان پر نہ لائیے۔ اپنی ایسی تیسی میں جائے۔

تھانہ دار: ایسا نہ کہو۔ میری جان جاتی ہے۔ عاشق صادق ہوں، مگر خدا ہم سے خلاف ہے، بت ہمارے دُشمن ہیں اور ہم عاشق خدا، اور عاشقِ بُتان رنگیں ادا ہے۔ ہائے کیا اُلٹی بات ہے۔

خُدا کا قہر بُتوں کا عتاب رہتا ہے

اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

اس فلک پیر کو اگر پاؤں، تو واللہ کچا ہی چبا جاؤں۔ جب دیکھیے اسی فکر میں رہتا ہے کہ عاشق و معشوق میں ملاپ کے عوض فساد ہو۔

اثر ایسا کہاں سے نالۂ شبگیر میں آئے

کہ جس سے فرقِ جورِ آسمانِ پیر میں آئے

ہماری نوکری گئی، آرام گیا۔ عیش گیا، چین گیا۔ اب ہم اشتہاری مُجرم ہیں۔ ہائے اُس بت بے پیر نے ہم کو کہیں کا نہ رکھا۔ ہم پر وہ ستم ڈھایا کہ الامان الامان۔ کہیں کا بھی نہ رکھا۔ اب نہ مغفرت کی فکر ہے۔ نہ جنّت کا خیال، دل سے لگی ہے کہ اس جانِ جان کو ڈھونڈ نکالوں۔

آئیں رضوان بھی جو لینے تو نہ جاؤں سوئے خلد

ٹھن گیا کوچۂ جاناں کا ارادہ دِل میں

باورچی: انسان کو ذرا استقلال بھی لازم ہے، مَیں تو جاہل ہوں۔ مگر اچھے اچھوں کی صحبت رہی ہے۔ بڑے بڑے علما کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اللہ جانتا ہے صبر اور استقلال عجب چیز ہے۔

تھانہ دار: ہاں صحیح ہے مگر زخم تازہ ہے۔

ہماری جان پہ آخر کو بن گئی اے دِل
بگاڑنی تھی نہ اس عیسیٰ زباں سے ہمیں

ہم نے ناحق اس سے بگاڑی۔ مگر مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ، خود باید زد۔ از ماست کہ بر ماست اب ہم ہیں اور داغِ جگر۔ ہم ہیں اور دیدۂ تر۔ ہائے افسوس وائے افسوس۔

جگر کا داغ ہے یوں دِل کے داغ کے نزدیک
چراغ جیسے ہو روشن چراغ کے نزدیک

باورچی : اب مجھے اجازت ہو تو کھانا پکاؤں۔

تھانہ دار : کھانا بھی کسی نے چھوڑا ہے۔ جو ہوا وہ ہوا۔ مَضیٰ ما مَضیٰ۔ ہم خود ہی چُوک گئے۔ مگر یقین نہ تھا کہ ایسی رنگین مزاج چمن طبع عورت کسی بد قطع سے تعلق پیدا کرے۔

باورچی : خدا جانے کیا بات ہو گئی۔ کیا دِل میں سمائی۔

تھانہ دار : اور ہم نے اس کے لیے اپنا عہدہ چھوڑا۔ حکومت سے مُنھ موڑا۔ مُجرم بنے دنیا وَمافیہا کے کام کے نہ رہے۔ مگر وہ ہمارے دِل میں ہے۔ معشوقوں کی بے وفائی دنیا میں ضرب المثل ہے۔ جو بیوفا نہیں وہ معشوق نہیں۔ ع

معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

رات دِن محوِ تماشائے بُتاں رہتا ہے
آئینہ صورت چشم نگراں رہتا ہے

ہجر کہتے ہیں کِسے فرق کہاں رہتا ہے
ہم بھی رہتے ہیں وہاں یار جہاں رہتا ہے

کون سی جا نہیں وہ جلوہ کُناں رہتا ہے
پر کوئی کہہ نہیں سکتا کہ کہاں رہتا ہے

دین و دُنیا کا نہیں ہوش تری الفت میں
اب تو کچھ اور ہی عالم ہے جہاں رہتا ہے

فصلِ گُل نے نہیں مُدت سے کرم فرمایا
نعرہ زن باغ میں ہر برگِ خزاں رہتا ہے

کچھ تعجب نہیں دامان اثر تک پہنچے
رات دن قافلۂ اشک رواں رہتا ہے

باورچی: افسوس ہے کہ ذرا دِل کو نہیں سنبھالتے۔ اب ذکر ہی جانے دیجیے۔ کسی اور بات کا خیال کیجیے۔ جان ہے تو جہان ہے۔

تھانہ دار: واہ اِسی میں تو لُطف ہے حضرت۔ کیسی جان اور کس کا جہاں۔ ہمارے نالۂ گردوں شگاف ابھی آپ نے سُنے کہاں۔

شبِ غم جو بندے کے نالے سُنیں
فرشتے پکاریں قیامت ہوئی

خُدا خُدا کر کے بعد مدت اس عربدہ جو کا وصال ہوا تھا۔ مگر پھر شامِ ہجر نے صُورت دِکھائی۔ پھر دامن وگریباں کی شامت آئی۔

یہ اندھیر کیسا ہے اے آسمان
نمودار پھر شامِ فرقت ہوئی

ہائے برسوں کے بعد ثُریّا بیگم کی تقریرِ رُوح افزا سُنی تھی مگر افسوس۔

سُنیں جو یار کی باتیں غش آ گیا ہم کو
یہ ناتوان تھے کہ لُطفِ بیان اُٹھا نہ سکے

اب تو زندگی وبال ہے مگر شاید دن بہورین خدا مالک ہے۔

تخمیف — جو رِوامِ رملا ہو تو جانیے — کوتاہ اُن کی زلفِ رسا ہو تو جانیے
حُسن اے جنوں جو عشق نما ہو تو جانیے — جامہ کسی پری کا قبا ہو تو جانیے
جو رِبتان میں شکرِ خُدا ہو تو جانیے — وقتِ قضا نماز ادا ہو تو جانیے
چھوٹے کسی طرح قفسِ تن سے مرغِ رُوح — یہ بُلبل اسیر رہا ہو تو جانیے

سُنتے ہیں مدتوں سے مسیحِ زماں تمہیں
کچھ اپنے دردِ دل کی دوا ہو تو جانیے

اس سے کہنے کو رازِ دل کہا، عرض کیا کہ ہم عاشق بے برگ و نوا ہیں۔ اور تمہارے نام پر نوکری اور نام، اور زبردست پر لعنت بھیج کر دُنیا سے الگ بستر جمایا ہے۔ مگر پھر بھی صاف صاف نہ کہہ سکے۔

یہ مُنھ کہاں ترے آگے جو عرض حال کریں
مجال ہی نہیں جنبشِ لب سوال کریں

جب میں نے جھڑک کر کہا کہ شادی ضرور ہوگی جواب دیا کہ۔

یہ اُلجھ پڑنے کی خو اچھی نہیں
بے محابا گفتگو اچھی نہیں

بھائی تمہیں بناؤ، کہ ایسی خوبرو کبھی آنکھوں دیکھی، یا کانوں سُنی، ہائے کیا صُورت زیبا ہے۔ کیا ادا ہے سُبحان اللہ سبحان اللہ۔

سُرخ ٹھہرا ترے رخ سے گلِ احمر کس دن
سرو نکلا قدِ موزوں کے برابر کس دن

باورچی: نواب مجھے اجازت ہے یا نہیں۔ آپ فاقہ کریں بندہ فاقہ کر چکا۔ مجھے اب بھوک لگی ہے۔

تھانہ دار: بسم اللہ آپ کھانا کھائیں۔ مگر۔ ع

واعظ کو جلاؤں یہ مرے دِل سے لگی ہے

منع کرتا ہے مجھے یار کے گھر جانے کو
ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو

آپ ہمارے ناصح ہوئے۔ خدا کی شان۔ واہ۔ آپ اور ناصح۔

اُلفت کی عجیب صُورتیں ہیں — مجنوں ہے کہیں کہیں ہے فرہاد
اِک دِل ہے ہزار آفتیں ہیں — درد و غم و یاس و داغ و حرمان
ہر روز نئی مُصیبتیں ہیں — اللہ ری گردشِ زمانہ

یہ کہہ کر تھانہ دار نے شمشیر برہنہ ہاتھ میں، اور سر بُریدن لازم ست کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔

باورچی نے فوراً ان کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی، اور کہا سُنو صاحب مجھ سے آپ سے چند روز کی ملاقات ہے۔ نہ کبھی جان نہ پہچان تھی، نہ مُلاقات نہ محبّت۔ نہ صورت آشنا۔ دو دن کی مُلاقات ہے۔ اس دو دِن کی مُلاقات میں مجھے آپ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ مگر آپ کی جوانی پر رحم آتا ہے۔ اگر مولوی صاحب کو قتل بھی کیا تو کیا۔ تم پھانسی ضرور پاؤ گے۔

تھانہ دار: ہر چہ مرضی مُولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

باورچی: مرضی مُولا تو یہ ہے کہ سالک مسلکِ صُلح کل ہو۔

تھانہ دار: آخاہ۔ آپ تو خود مولانا معلوم ہوتے ہیں۔

باورچی : حضور میں شاہی خاصہ پُز ہوں۔

تھانہ دار: خیر۔ تو نہ رو کواب، یا وہ نہیں یا ہم نہیں۔

باورچی : اس سے فائدہ۔ اگر اس کو زک دینا منظور ہے تو ہزار ترکیبیں ہیں اپنا نقصان کیوں کرو۔

تھانہ دار: نقصان کیسا۔ ؏

ہم عاشق جاں نثار ہیں مرزائے ڈھب کے

جان کیا ہے اور مال کیا ہے۔

قدرتِ حق ہے زہے جلوۂ کاشانۂ عشق
نورِ عرفان ہے۔ چراغِ رہ بت خانۂ عشق
زر کو کچھ مال سمجھتا نہیں دیوانۂ عشق
گنجِ اسرار سے خالی نہیں ویرانۂ عشق
مرگ عشاق کی جاتی نہیں کیفیت سے
جان بلب جب ہوئے لبریز ہے پیمانۂ عشق
غُل مچاتے ہیں جو کتوں کی طرح سے ناصح
شیر کی طرح بپھر جاتے ہیں دیوانۂ عشق

سمجھے اس شعر پر غور کرنا۔

باورچی : سُنتے تو ہم ہیں ہی۔ سگِ دُنیا۔

تھانہ دار: شاباش خوب سمجھے آدمی طبیعت دار ہو۔ آفریں باد۔

باورچی : اب واسطے خدا کے تلوار چھوڑ دو۔ اس جہالت سے کیا مطلب نکلے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ مولوی صاحب آسانی سے دستیاب ہوں، پھر کیا فائدہ۔ جو دیکھے گا سڑی سودائی سمجھے گا یا مجرم قرار دے گا۔ اس تلوار کا لیسنس آپ کے پاس ہے یا یوں ہی لیے پھرتے ہو۔

تھانہ دار: کس کا لیسنس اور کیسی تلوار اور کیسا مُجرم۔ ہم کسی سے ڈرتے تھوڑا ہی ہیں۔ اب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے ڈرنا کیا معنی۔ ؏

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

شاہد آن نیست کہ موی و میانی دارد — بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنی دارد
شیوۂ حور و پری خوب و لطیف است ولی — خوبی آنست و لطافت کہ فلانی دارد

در رہِ عشق نشد کس بیقیں محرمِ راز
ہر کسی بر حسبِ فہم گمانی دارد

یہ اشعار پڑھ کر تھانہ دار کا دل اس قدر بے قرار ہوا کہ تلوار از خود ہاتھ سے چھوڑ دی، اور ایک گوشے میں بیٹھ کر اس درجہ روئے کہ جوئے اشک رواں ہوگئی۔ آخر کار روتے روتے بکمال مصیبت و ذرا دل سو رہے۔

باورچی: (شانہ ہلاکر) اب اُٹھیے بہت عرصہ ہوا۔

تھانہ دار: اب خدا دُنیا ہی سے اُٹھائے تو بہتر ہے۔

الٰہی ایک ہم بھی ہیں کہ تنگ آئے ہیں جینے سے
اور اک خضر و مسیحا ہیں کہ اس جینے پہ مرتے ہیں

اتنے میں مولوی لدے پھندے سامنے سے تشریف لائے۔

باورچی: ارے، یہ مولوی صاحب کہاں سے آگئے۔

تھانہ دار: ایں! وہ کہاں ہیں۔

مولوی: ہم کو کیا معلوم۔ وہ تو رنگین شاہ سے باتیں کرتی تھیں ہم سے کہا شکار مار لاؤ۔ ہم شکار کے لیے گئے، ادھر اُس نے منصوبہ کیا۔ اور جو مجھے معلوم ہو تو حشر تک نہ جاؤں۔

تھانہ دار اپنا سر ٹکرانے لگا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے گئی۔ مگر مجبوری تھی۔

ثریا بیگم غائب ہوگئیں

یہ حسین، و زہرہ جبیں، نوخیز و ملک نظر فریب، دُشمن زہد عدوے شکیب، عارف باللہ، رنگین شاہ کے ساتھ اس مکان سے نکل بھاگی۔ بار بار شاہ صاحب کے چہرۂ نورانی اور حُسن پردہ سوز پر نظر غلط انداز ڈالتی تھی حیرت تھی کہ یا للعجب یہ کیا بوالعجبی ہے چال ڈھال، وضع قطع، شکل و صورت سب آزاد فرخ نہاد کی سی ہے مگر خو بو وہ نہیں۔ اس جوان شبیر اندام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چھاں چھاں اور خراماں خراماں جاتی تھی پتلی کمر ہزاروں بل کھاتی تھی اس وقت چرخ نیلی اور شفق رنگین اور باد مشک آلود، اور اشجار پر بہار شگفتا آلود نے

وہ لطف دکھایا کہ ثریا بیگم اور رنگین شاہ دونوں کے دل سے کلفت دور ہوگئی۔ شاہ صاحب نے اس سروِ سمن اندام، صنوبر خرام، کو چند شفتالو ے اردی دیئے۔ عاشق مضطر اور معشوق سیمبر دونوں اس وقت امنگ پر تھے۔ یہ سرو گلنار وہ جوان مست و طناز یہ حور لقا نازک اندام، وہ فراخ سینہ زیبا خرام۔ یہ نو عروس نوخاستہ۔ وہ زیور شجاعت و حسن سے آراستہ۔ دونوں کی چشم سیاہ شفق نگار۔ نرگس بیمار، شور انگیز۔ فتنہ خیز۔ لعلِ لب می چکان شکر فشاں۔ گوہر نثار شیریں گفتار۔

ثریا بیگم نے اپنے عاشق جان نثار کے دوش پاک پر ہاتھ رکھ کر انگڑائی لی، اور کہا آزاد ہمیں اس وقت نیند آتی ہے، اور مارے نیند کے آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔ اگر کہیں آرام کا مقام ہو تو ذرا ایک جھپکی لے لوں۔ شاہ صاحب نے کہا بسرو چشم۔ درویشوں کے لئے ہر مقام پر آرام ہے۔

جب دن قریب اختتام، اور آفتاب لب بام ہوا۔ رنگین شاہ نے ایک حلوائی کی دُکان پر ٹھہر کر کہا۔ کیوں بچہ سادھوؤں سے بھی واحد شاہد ہوگا۔ بڑی دور سے سنت آئے ہیں، اور سبیرے (سویرے) سے بھوجن نہیں پائے ہیں۔ جو موج ہو جائے تو پوری ترکاری، یا سیدھا تیرے یہاں سے پائیں۔ حلوائی نے ان کو ٹوکا یا۔ لڑکے کو اشارہ کیا کہ ان کو سیدھا اچھی طرح دلوا دو۔ اُس نے پوچھا بابا جی کتنے سیدھے دلوا دوں، بولے بچہ دو مورتیں ہیں۔ دو سیر آٹا۔ پاؤ بھر دال۔ گھی شکر نون لکڑی ترکاری دلوائی گئی تو شاہ جی نے کہا بچہ سادھوؤں کے پاس پکانے کا سامان نہیں ہے۔ اپنی پکائی کھلا۔ لہٰذا حلوائی نے اپنی دکان سے کھانے کا سامان کر دیا ثریا بیگم اور رنگین شاہ نے مل کر چکھا۔

اب سُنیئے کہ حلوائی کے لڑکے کا نام ننکو تھا۔ اور میاں ننکو پرلے سرے کے عیاش۔ دو گھڑی دکان پر بیٹھیں، تو تین پہر کوچہ گردی کریں۔ اور آوارہ پھریں۔ دو سو روپیہ ایک نٹنی کو دے دیئے، پچاس روپئے کا غلہ باپ کی چوری سے ڈوم ڈھاڑیوں کو کھلا دیا۔ بیوی کا زیور داؤں پر لگا دیا۔ اُس نے جوان کے ساتھ عورت دیکھی تو شوق چرّایا کہ دیکھیں کیسی ہے۔ جوان ہے یا پیر سال سا اب یہ فکر ہوئی کہ شاہ جی ذرا ادھر اُدھر جائیں تو میں اس عورت کو چھیڑوں۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ ملک دیرینہ روز ہے یا حسن عالم افروز ہے۔ اتفاق سے شاہ صاحب کسی ضرورت کے لئے باہر گیے اور ثریا بیگم چاندنی میں ٹہلنے لگیں۔ حلوائی کا لڑکا برفی لے کر قریب گیا، اور آہستہ سے کہا۔ لیجیے یہ مٹھائی آپ کے واسطے لایا ہوں۔ ثریا بیگم نے پیچھے پھر کر دیکھا۔ مگر مٹھائی قبول نہ کی۔ سمجھا دیا کہ جو کچھ دینا ہو شاہ جی کو دو۔ میاں ننکو نے پوچھا یہ شاہ جی ہیں، بابا جی۔ اور تم اِن کے ساتھ کہاں سے آئی ہو۔ اور کیوں آئی ہو۔

ثریا بیگم : تم کو اِن باتوں سے کیا واسطہ تو اپنی دُکان دیکھ جاکے۔

ننکو : (ہاتھ جوڑکر) گلام ہوں بے جر کھرید گلام ہوں صاحب۔

راوی : یعنی یہ

ع۔ درم ناخریدہ غلام تو ام۔

کی خرابی ہے ماشاء اللہ

ثریا بیگم : کچھ گھانس تو نہیں کھا گیا ہے موا اور سنو نگوڑے کی باتیں۔

ننکو : چھپے مار ڈالو مل ہم ہاتھ ہی جوڑے جائیں گے۔ اِن سے نہ کہنا۔ باباجی نہ سننے پائیں تم ہمارے کابل (قابل) ہو یا سنتوں کے کابل (قابل) یہاں رہو۔ ہر روج (روز) پیڑے برفی لڈو پوری کھاؤ مجے کرو۔ ان سنتوں کے ساتھ کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ مارے مارے پھریں اور ٹھوکریں کھائیں۔ کہا مانو پیاری۔

ثریا بیگم : اے کچھ دوانہ ہوا ہے اور سنو جو منھ میں آتا ہے واہی تباہی بکتا جاتا ہے۔ نہ آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ۔ کہیں سبزی تو نہیں پی ہے یا کالا پانی پی کر آیا ہے۔

ننکو : چھپے سو کہو لو۔ ہم بے مٹھائی دیئے نہ جائیں گے۔ ہم امیر کے لڑکے ہیں اور ہاتھ جوڑنے آئے ہیں۔ اس میں چھپے جو ہو سو ہو۔

ثریا بیگم : تیرے چھپے کو آگ لگے۔ موا تمباکو کا پنڈا۔ دیو کا بچہ، ذری الگ ہٹے رہنا۔ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنا۔ اللہ سمجھے۔

ثریا بیگم دل ہی دل میں ہنستی تھیں کہ یہ قطع، یہ وضع، اور یہ شوق۔ موٹا بھدا کاواک، بیڈول، بدصورت، سیاہ فام، چیچک رو۔ میلی دھوتی پہنے ہوئے ہے۔ اور شوق یہ کہ رنگین شاہ کو چھوڑ کے اِن کے ساتھ رہنا شروع کروں۔ شانِ خدا کجا آزاد۔ کجا یہ حلوائی۔ یہ منھ کھائے چولائی۔ ثریا بیگم نے جو کئی بار میاں ننکو کو گھڑکیاں دیں تو دوپٹا سر سے کھسک گیا اور موئے مشکین وعنبرین وشب رنگ اور سیدھی مانگ نے جوبن کی آگ کے ساتھ ہوا کا کام کیا۔ اور ننکو اس گورے گورے مکھڑے پر زلف سیاہ کو دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو گئے :

چھٹنا ضرور لکھ پہ ہے زلفِ سیاہ کا
روشن بغیر شام نہ ہو چہرہ ماہ کا

اتنے میں رنگین شاہ آئے۔ اور ننکو کھسکے۔ ثریا بیگم نے للکارا ارے یہ کیسا مردوا ہے تو۔ او بھد بھد جنازہ نکلے موئے کا۔ رنگین شاہ نے کان کھڑے کئے۔

شاہ : کیوں کیوں مائی کیا بات ہے۔ کرودھ (غصہ) کا شبدھ (لفظ) کیوں زبان سے نکالا۔ بچہ

یہ کیا بات ہے۔ سچ بتانا۔

ننکو: بابا جی۔ ہمارا اس عورت پر دل آیا ہے اور یہ ہم کو گالیاں دیتی ہیں اور ہم اس پر مرتے ہیں! اور یہ ہم سے بھاگتی ہے۔ آپ تو سنت سادھ ہیں آپ کے کس کام کی۔ ہم لڑکے بالے والے ہیں جہاں اور بکھیڑے ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی۔ سو جو ہے آپ ان سے بولیے کہ یہاں رہیں۔

شاہ: بچہ تیری صفائی کے ہم بھی قائل ہو گئے۔ کیا صاف صاف بیان کر دیا۔ تو اس قابل ہے کہ سادھو ہو جائے۔ تو تو پرمہنس ہے۔ اگر فقیر ہونے کا جی چاہے تو ہم منتر پڑھا دیں۔

ننکو: ہم کھُد (خود) تم ایسوں کو منتر پڑھا دیں۔ ہم جنتر منتر کیا جانیں۔ کس کا منتر اور کس کا جنتر۔ یہ بھرے کسی اور کو دینا۔ اب اِن سے یہ کہو کہ منجور ہے یا گیر منجور (منظور ہے یا غیر منظور)

شاہ: او ملعون۔ حلوائی والے۔ ہمارے سامنے یہ گستاخی۔ دور ہو مردک، یہ بے ادبی۔ اپنی صورت تو دیکھ تو۔ ہونہہ!۔

حلوائی کو کسی نے خبر دی کہ شاہ جی سے اور ننکو سے لڑائی ہوتی ہے۔ وہ فقیروں کا بڑا معتقد تھا۔ فوراً آن کر رنگین شاہ کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور کہا یہ لڑکا اکھڑ ہے۔ کہی سنی ما پھ (معاف)۔

بچہ ہم سادھو لوگ ہر کا نام لینے والے، ہمارے سے جو کوئی لڑے ہم سراپ دے دیں۔ برہمن آدمی ہیں کہ باتیں۔

حلوائی نے پھر ہاتھ جوڑے۔ رنگین شاہ خاموش ہو رہے، شب کو وہیں بستر جمایا حلوائی کے ہاں سے دو چھپر کھٹ اور بستر منگوایا، ایک پر خود دراز ہوئے، دوسرے پر ثریّا بیگم کو سُلایا۔ اور باتیں کرنے لگے۔

رنگین شاہ: جانِ من۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ تمھاری سی لالہ بنا گوش اور پری رخسار گل عذار آج تک کانوں نے دیکھی نہ آنکھوں نے سُنی۔

ثریّا بیگم: (کھلکھلا کر) اے واہ ہے یا وحشت۔ کانوں نے دیکھی نہ آنکھوں نے سنی۔ اچھے کان ہیں اور اچھی آنکھیں ہیں۔

رنگین شاہ: اے! لاحول ولاقوۃ اس وقت مارے غصّے کے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ خدا جانے کہتا کیا ہوں زبان سے نکلتا کیا ہے۔ لاحول۔

ثریّا بیگم: اب یہ بتائیے تو کسی اور کو یہ کہو کہ زبان سے نکل گیا۔ ایک دفعہ بادشاہ چھتر منزل کی سب سے اونچی چھت سے دریا کی سیر دیکھ رہے تھے۔ سامنے رمنا تھا۔ اِدھر اُدھر سبزہ۔ اتفاق سے ایک شتر سوار کا اس طرف گزر ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا اے یہ کس کی اونٹنی ہے۔ بادشاہ کی صورت

دیکھتے ہی حواس ٹھکانے نہ رہے۔ کہا جہاں پناہ یہ اونٹ چند کی دینی ہے۔ کہنا چاہیئے تھا کہ دیپ چند کی اونٹنی ہے۔ اسی طرح تم نے کہا۔

رنگین شاہ : سنو تو بھلا شادی کرنا کچھ فرض ہے۔ اگر عورت اور مرد دونوں خدا کی طرف مخاطب کر کے کہیں کہ یا خدا ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ازدواج میں قبول کیا تو حرام کاری اور زنا نہیں ہے۔

ثریا بیگم : اے ہے۔ توبہ توبہ۔ تو پھر زانی دنیا میں کوئی نہ نظر آئے گا۔ شادی کے معنی یہ ہیں کہ ہندو یا مسلمان مذہبی اصول سے نکاح یا بیاہ ہو۔ مرد اور عورت کے خالی خولی کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے۔

راوی : واہ میاں رنگین شاہ۔ کیوں نہ ہو۔ اچھی پٹی پڑھائی۔

شعابد سے مکائد سے دغا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

رنگین شاہ : اب ہم سے یہ اقرار کر لو کہ عمر بھر جدا نہ ہوں گے۔

ثریا بیگم : اللہ جانتا ہے کہ اگر تم آزاد ہوتے تو تمام عمر جدائی نہ ہوتی مگر تم آزاد نہیں ہو۔ اُن کی تمہاری صورت بہت ملتی ہے۔ جب ہی تو میں نے کہا تھا کہ۔

ع۔ اے گل بتو خرسندم تو بوے کسی داری۔

رنگین شاہ : اچھا فرض کرو۔ آزاد نہ سہی مگر حسن میں جمال میں شجاعت میں کسی شے میں اُس سے کم نہیں۔ پھر کیا۔

ثریا بیگم بیچاری مصیبت کی ماری، نصیبِ اعدا یہاں بھی صید الم اور نخچیر تیر غم ہوئیں۔ انھوں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ جب سے گھر بار چھوڑا مختلف حالتوں میں رہی۔ پہلے سرا میں اللہ رکھی بنی۔ اِس حالت میں لطف کے ساتھ زندگی بسر کی۔ مگر کمینوں اور پاجیوں کی صحبت رہی۔ شرفا کا وہاں گزر کہاں۔ جو دیکھتا تھا یہی سمجھتا تھا کہ کوئی بھٹیاری ہے۔ اس کے بعد جوگن ہوئی۔ جوگن کی حالت میں بہت عمدہ طرز پر رہی۔ اچھے اچھے رئیس زادے، اور حاکم اور جوہری بچے اور لکھ پتی جوق جوق آتے تھے۔ مقدس سمجھ کر تعظیم و تکریم کرتے تھے، اور ہمارے تقدس کا دم بھرتے تھے۔ بعض بعض رنگین مزاجوں نے ڈورے بھی ڈالے، مگر وہ بھی فریفتۂ حسن ہو کر رہ جاتے تھے۔ اِدھر سے ذرا بھی شہ نہیں پاتے تھے۔ جوگن پن میں جو لطف پایا، وہ عمر بھر نہ بھولے گا۔ اُس کے بعد

استانی جی کے ہاں رہی۔ یہاں تھانہ دار کے سبب سے جان عذاب میں تھی۔ پھر شبّو جان نام رکھا۔ بڑے کے پالے پڑی تھی وہاں سے تو پھر ثریّا بیگم ہوگئی۔ مغلانیاں خواصین نوکر چاکر، خدمتگار، داروغہ جھاڑ کنول، شیشہ آلات، فرش مکلّف، محلسرا رہنے کے لئے خدائی کا سامان موجود تھا مگر یہاں پھر تھانہ دار نے ناک میں دم کر دیا۔ چوری ہوئی۔ آزاد کے دھوکے میں ایک کمبخت موس لے گیا۔

اس مقام پر ثریّا بیگم نے خیال کیا کہ جس طرح ایک دفعہ غپّا کھایا تھا ایسا نہ ہو کہ اُسی طرح پھر یہ جھانسا دینے آیا ہو اور عجب نہیں کہ یہ وہی شخص ہو۔ صورت جو خیال کی تو بجنسہٖ اُسی کی سی۔ آواز بعینہٖ وہی۔ اور یہ بھی یاد کیا کہ فقیر بن کے آیا تھا۔ ماتھا ٹھنکا کہ وہی ہے۔ اور رفتہ رفتہ کامل یقین ہوگیا۔ کانپنے لگی کہ یا خدا کیسی بُری پھنسی۔ مگر جائے ماندن نہ پائی رفتن۔

رنگین شاہ : اس وقت کس سوچ میں ہو جانی کچھ باتیں کرو۔

ثریّا بیگم : خدا جانے کیا خیال آیا۔ دل ہی تو ہے۔ اپنی زندگی پر افسوس آتا ہے۔ مگر جو اللہ کی مرضی ہے وہی بات ہوگی۔

ع۔ بے رضائے تو یکی برگ نہ جنبد ز درخت۔

ہماری نادانی نے یہ دن دکھایا۔

رنگین شاہ : اگر کسی سے لاگ ڈانٹ ہے تو ہم سے کہو۔ ہم کھڑے کھڑے سمجھ لیں گے۔ اور اگر کوئی پوشیدہ بات ہے تو مجبوری ہے خیر۔

ثریّا بیگم : قول جان کے ساتھ ہے۔ قول ہارو تو بتا دیں۔

رنگین شاہ : نہیں اتنا کہہ دو کہ کسی سے لاگ ڈانٹ ہے یا کوئی اور کام ہے۔ اگر لاگ ڈانٹ ہے تو ہم حاضر ہیں۔

ثریّا بیگم : ایک تھانہ دار سے لاگ ڈانٹ ہے اُس کا نام تو نہیں معلوم مگر استانی جی کا مکان اسی کے تھانے میں ہے۔ اُس تھانہ دار کو کوئی سزا دلوا دو تو جانیں۔ بڑا نکمّا آدمی ہے۔ اللہ اس کو غارت کرے موئے کو۔

شاہ : ایک شرط ہے۔ مسجد میں چل کر نکاح پڑھوا لو۔

ثریّا بیگم : آخر کچھ خوف خدا بھی ہے۔ مذہبی اصول کے بغیر نکاح کیوں کر ہو سکتا ہے۔ تم تو دوزخی ہو۔ مجھے دوزخ نہیں جانا ہے۔ اوہ سُنیئے۔

شاہ : سُنو۔ حقائق و معارف آگاہ شیخ سیف اللہ نے کہا ہے کہ اگر بحقیقت نگاہ کنی بہشت و دوزخ

بجز نامے بیش نیست برائے مصلحت عالم است وگرنہ کہ رفت بدوزخ وکہ رفت بہ بہشت یک وجود ست کہ موجود ست کہ بصد اضداد و بر آمدہ است اگر در بہشت صور تے ونمودے ہست ازان وجود ست کہ بیحد و نہایت ست۔ اے عزیز بدانکہ وجود یکے ست و وجود اولیا و انبیا یعنی مرشد ہمیں حقیقت است کہ چون ایشان ہمہ را عین خود می بیند و غیر از خود نہ بیند بلکہ می داند کہ خو بصورت تعینات بر آمدہ ایم۔

ثریا بیگم نے کہا یہ بک کیا رہے ہو۔ بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگرائے۔ میں یہ کیا جانوں بھلا تم کیا کہہ رہے ہو۔

رنگین شاہ نے یہ فقرے صرف اظہار قابلیت کے لئے ادا کیے تھے تاکہ آزاد سے کم لائق ان کو نہ سمجھیں۔ ثریا بیگم نے جو کہا کہ ہم یہ باتیں کیا جانیں تو آپ بہت خوش ہوئے اور اظہار مزید لیاقت کے لئے اشعار فرس پڑھنے لگے۔

اے نسخۂ نامۂ الٰہی کہ توئی اے آئنۂ جمال شاہی کہ توئی

بیرون زتو نیست ہرچہ در عالم ہست از خود بطلب ہرانچہ خواہی کہ توئی

اے قطرہ تو غافلی کہ دریاست در جوی تو میرود ہویداست

یعنی چونگہ کنی چپ وراست

کین ہژدہ ہزار عالم این است

کلّ مَن علیہا فانٍ ویبقیٰ ربّک ذوالجلالِ والاکرام۔ کل شیءٍ ہالکٌ الّا وجہہٗ۔

رنگین شاہ تو اس دھن میں تھے، اور ثریا بیگم کسی اور ادھیڑ بُن میں تھیں۔ ان کے دل میں ٹھنی تھی کہ چاہے جو ہو اب میں پھر جوگن بن جاؤں گی اور مرتے دم تک جوگن ہی کے بھیس میں رہوں گی۔ دنیا سراب ہے حباب ہے اس میں پائداری کہاں۔ سوچی کہ اس کے پھندے سے کیوں کر بچوں گی اس کی پیاری پیاری باتوں نے میرے دل کو ایسا مسخّر کر لیا کہ ساتھ چلی آئی اب یہ نکاح کا پیغام کرنے لگے۔ سمجھی کیا تھی ہو اکیا۔

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

کارے کہ خدا کرد فلک راچہ مجال

ثریا بیگم نے خدا سے دعا مانگی کہ بار خدایا! آزاد جہاں ہو وہاں خوش رہے۔ خدا کرے لڑائی سے سرخرو آئے۔ جس معرکے میں جائے اُس میں فتح پائے اور ایک نظر میں اُس کو دیکھ لوں۔

دعا تازہ کردند بر جان او — بمانا و ایزد نگہبان او

مباد از نام تو گیتی تہی — ز اختر بجانِ تو یاد انہی

مبیناد چشم فلک بر تو تیز — سرِ دشمنت باد در خاک ریز

زنامِ تو نامِ دلیری بلند

بمانی با قبال خود ارجمند

شاہ جی نے اپنی جواں مردی ظاہر کرنے کے لیے لڑائیوں کا ذکر چھیڑا، اور فرمایا کہ جب سرکار لاہور کی طرف سے بھائی رام سنگھ اور سردار چتر سنگھ اٹاری اور سردار رنجور سنگھ اور دیوان دینا ناتھ پنڈت اور سرکار انگریزی کی طرف سے ایف کیری صاحب سکریٹری گورنمنٹ ہند اور میجر لارنس ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر عہدنامے کے لئے مقرر ہوئے تھے تو ہم بھی اس میں شریک تھے۔ کئی شرطیں ہوئیں۔

۱۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ اور سرکار انگریزی میں ہمیشہ اتحاد رہے۔

۲۔ مہاراجہ صاحب ملک دوآبہ کو سرکار انگریزی کے حوالے کریں۔

۳۔ کُل قلعے جو دوآبہ میں ہیں وہ سرکار انگریزی کے سپرد کریں۔

پنجاب کی سب لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ کنور نونہال سنگھ کو جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پوتے تھے میں نے گولی چلانا اور نشانہ لگانا سکھایا تھا۔ اور رنجیت سنگھ سے اور مجھ سے بڑا یارانہ تھا۔

ثریا بیگم اس کی اول جلول تقریر خاک نہ سمجھی۔ اس کو کیا معلوم کہ رنجیت سنگھ کون تھے اور دوآبہ کہاں ہے۔ میجر لارنس کون تھے اور دیوان دینا ناتھ پنڈت کون تھے۔ وہ اسی فکر میں غلطاں پیچاں تھی کہ کسی طرح اس موذی کے پنجے سے چھوٹوں۔ اور اب کی پھر جوگن بن جاؤں۔

رنگین شاہ: ہمارا ذکر تاریخ میں بھی ہے سنا ہوگا۔

ثریا بیگم: اے اب سو رہو۔ کیا بک بک لگائی ہے واہی تباہی۔

رنگین شاہ: اور سنو۔ واہی تباہی کی ایک ہی کہی بک بک ہونہہ! بک بک کیسی، ہم تو اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ ہم نے مہاراجاؤں اور بادشاہوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ یہ بک بک لیے پھرتی ہیں۔

یہ جھک باندھ کر حضرت رنگین شاہ نے آرام کیا اور ثریا بیگم کے دل میں اَنواع و اَقسام کے خیالات نے جگہ پائی۔ سوچی کہ یہاں سے بھاگوں تو کیوں کر بھاگوں۔ اور جاؤں تو کہاں جاؤں۔ رات کا وقت ہے۔ کوئی نہ بیگانہ خویش نہ یگانہ۔ رنگین شاہ کو آرام کرتے دیکھا تو بہت ہی خوش ہوئی۔ کہا خوابش بردہ بہ۔

اتنے میں ایک خوش گلو قوال نے گانا شروع کیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سن سن کرتے چلتے تھے اور رات بھی خوب بھیگی تھی۔ ثریا بیگم کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کو کہیں اِن کا پتہ ہی نہ تھا۔

سویرے مُنھ اندھیرے رنگین شاہ بیدار ہوئے تو لیٹے ہی لیٹے آواز دی۔ بیگم صاحب۔ بیگم صاحب اب اُٹھیے کوّے بولنے لگے۔ صدائے برنہ خاست۔ پھر پکارا۔ جانِ من کیا سوتی ہی رہو گی۔ جواب ندارد۔ رنگین شاہ نے مُنھ سے چادر ہٹائی تو چارپائی سونی پائی۔

شاہ : ایں! یہ کیا ماجرا ہے۔ بیگم صاحب۔ اجی بیگم صاحب۔

راوی : خدا ہی خیر کرے۔ پتہ ہی نہیں۔

شاہ : (چارپائی سے اُٹھ کر) ہائیں۔ یہ چلی کہاں گئیں۔

راوی : معقول۔ ایں گل دیگر شگفت۔

شاہ : یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ ارے کوئی ہے یہاں۔ اِدھر آؤ۔ بیگم صاحب کدھر گئیں۔ ابھی ابھی سوتی تھیں، اور ابھی غائب غُلّہ۔

راوی : اچھا! یہ نئی بات ہے۔

حلوائی کی دُکان پر گیے مکان پر گیے۔ گانوں بھر کو سر پر اُٹھایا مگر بیکار۔ ثریا بیگم نہ ملیں نہ ملیں۔ رنگین شاہ نے حلوائی کے لڑکے ننکو کو خوب ٹھونکا اور اِس کے علاوہ دو تین اوپر سے بھی ڈگ جمائے۔ مگر کہیں پتہ ہی نہیں۔ کوئی قبولتا ہی نہیں۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ اشک آنکھوں سے برابر جاری تھے۔

اگر ہے آنکھوں میں آنسو تو دل ہے غم سے بھرا　　جگر میں درد ہے تو ہے زبان پہ واویلا
کبھی یہ کہتا ہوں بے یار جاؤں میں صد حیف　　جو گُل نہ ہو تو عنادل کو سیر باغ سے کیا

الغرض رو پیٹ کے اپنا سا مُنھ لے کے رہ گئے۔

دوسرے روز بعد تلاش بیچارے مصیبت کے مارے رنگین شاہ فوراً تھانے پر گیے اور وہاں رپوٹ لکھوائی کہ زوجۂ منکوحہ رنگین شاہ من مظہر یہاں ایک چارپائی پر جو قریب چارپائی منمقر کے تھی آرام ناز میں غائب غلّہ ہو گئی۔ میں نے ہر چند اِدھر اُدھر تلاش بیشمار کی تاہم پتہ نہ ملا۔ لہٰذا مجبور ہو کر رپوٹ لکھوائی کہ بذریعہ پولیس چارہ جوئی کی جائے۔

تھانہ دار صاحب نے کہا آپ کو کسی پر شک ہے؟

شاہ : کسی پر نہیں۔ مگر حلوائی کے لڑکے ننکو پر البتہ شبہہ ہے۔

تھانہ دار : کیوں کر۔ کیا وہ تمھاری بیوی کو پہلے سے جانتا تھا؟

شاہ : جی نہیں مگر اس مردود نے ایک ہی دن میں غائب کر دی۔ قیاس چاہتا ہے کہ وہ سوتی کی سوتی رہی اور حلوائی مذکور نے مع چارپائی کے بذریعۂ بدمعاشاں اُس کو غائب کر دیا۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

تھانہ دار : کچھ آوارہ مزاج تھیں خدانخواستہ؟

شاہ : اے لَاحَولَ وَلَا قوۃ۔ پاک دامن، عفیفہ، طیبُ النّفس۔

تھانہ دار : سِن کیا تھا اور شکل و صورت کیسی تھی۔

شاہ : سن سترہ اٹھارہ برس کا اور صورت کا حال کیا عرض کروں۔

ع مکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا۔

تھانہ دار : (شاعر آدمی) پری کا ٹکڑا کہاں کا محاورہ ہے۔

شاہ : بابا تم تھانہ داری اور فوج داری جانو۔ شعر شاعری سے تمھیں کیا سروکار ہے، یہ ہم لوگوں کا کام ہے۔ یہ شعر ذوق کا ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق مخاطب بخاقانی یہ ایسے شاعر پر اعتراض کرتے ہو۔

تھانہ دار : جائز ہے سب شعرا تعلّی کی لیتے آئے ہیں۔

نظامی بسا صاحب آوازہ
کہن گشتی و ہچنان تازہ

اردو گو شاعر کا کلام سُنیے۔

ناسخ بہ فصاحت و بلاغت
گویا سلمان ساوجی ہے

فارسی شعر شاعر ہندی کا ملاحظہ ہو۔

عاشق تو گفتۂ غزلِ تر درین زمین
ناطق ز راہ خشک سوادِ سخن گرفت۔

شاہ تو تعلّی کو اعتراض سے کیا واسطہ ایسے اُستاد پر اعتراض کرتے ہو۔

تکیہ بر جاے بزرگان نتوان زد بگزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

چاند کا ٹکڑا اور مہ پارہ سب باندھتے آئے ہیں۔

تھانہ دار: سب باندھتے آئے ہیں؟ نظیر پیش کیجیے۔

شاہ: نظیر کوئی لونڈی تو ہے نہیں جو کہ ہاتھ باندھے کھڑی رہے۔

تھانہ دار: ہم اُردو شعرا میں اتنے آدمیوں کے قائل ہیں۔ ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ مومن۔ انیس۔ دبیر میر صاحب اور مرزا صاحب کو خدائے سخن کہنا جائز ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔ ذرا ان بندوں کو سُنیے گا حضرت۔

پیہم جو لگے تیر فرس بن گیا طاؤس
دم بھر میں لہو ہو گیا جرّار کا ملبوس
سینہ ہے کہ تودا ہے نہ ہوتا تھا یہ محسوس
غش آنے لگے تیر ہوا جنگ سے مایوس
رخ زرد تھا گلنار تھی پوشاک لہو سے
فوّارۂ خون چھوٹتے تھے ہر بُنِ مو سے

اور مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

اے فکر نظم آمدِ مضمون کا وقت ہے
اوجِ ہلالِ مصرعِ موزوں کا وقت ہے
دورِ قمر پہ گردشِ گردوں کا وقت ہے
فوجِ امیرِ شام پہ شبخون کا وقت ہے
تسلیم فتح کرتی ہے جُھک جُھک کے راہ میں
آمد امامِ دین کی ہے ناوردگاہ میں

چاندی کے کام سے ہے مزیّن تمام زین
تاروں کی طرح سے ہیں ستارے قرین قرین
ان پر جما ہے بہ کے جو خونِ امامِ دین
گویا عقیقِ سُرخ کے ہیں جا بجا نگین
اس زین پر جدھر شہِ جن و ملک گیے
دن کو شفق کے پردے میں تارے چمک گیے

میر صاحب فرماتے ہیں۔

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی
ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی
جاسوس کہہ رہے ہیں نہیں راہ پھیر کی
غش آگیا ہے شہ کو یہ ہے وجہ دیر کی
خوشبو ہے دشتِ بادِ بہاری قریب ہے
ہوشیار غافلو کہ سواری قریب ہے

اور شمشیر کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے۔

چھوڑے اگر شعاع کی چلمن نہ آفتاب
کیا تاب ہے کہ لا سکے اُس کی چمک کی تاب
آفت کا دم ہے قہر کی تیزی غضب کی تاب
دشمن اسے جو رات کو دیکھے میانِ خواب
بھاگے ہزار وہ پہ نہ پائے مَفَر کہیں
بستر پہ دھڑ کہیں ہو دمِ صبح سر کہیں

تھانہ دار: اس تعلّی کو دیکھیے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

شاہ: رباعیاں سُنی ہیں آپ نے۔

تھانہ دار: جی ہاں اکثر رباعیات سنی ہیں۔

ظلمت کدۂ ہند میں کیا ملتا ہے ۔۔۔ نے دوست کوئی نہ آشنا ملتا ہے
صحرائے نجف میں چل کے دیکھو توانیسؔ ۔۔۔ دُر ایک طرف نور خدا ملتا ہے

شاہ: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ بہت ہی خوب۔

تھانہ دار: آفتاب مہتاب ہیں دونوں۔

شاہ: آپ کو تصوّف اور توحید کی طرف بھی کچھ توجہ ہے۔

تھانہ دار: جی ہاں مگر کوئی عمدہ کتاب نہیں ملی۔

شاہ: میرے پاس ہی لیجیے (ایک کتاب دے کر) یہ صفحہ پڑھیے۔

تھانہ دار بسم اللہ کہہ کر پڑھنے لگے۔

از اصلِ اوّل، اگر ترا پرسند، کہ چون گفتی عالم عین حق ست، ہر آئینہ اعتقاد متکلمیں ست۔ کہ حق لامکان ست، وجسم ندارد۔ وبعالم می بینیم کہ مکان برمکان، وجسم برجسم ست، چگونہ راست آید۔ قول تو کہ گفتی عالم عین حق ست۔ جواب بگویم کہ عالم عین حق ست۔ باعتبار آنکہ عالم نیز لامکان ست و مکان عالم متصور نیست چون یک وجود ست۔ ہر چہ ہست ہمہ اوست۔ ہر آئینہ مکان او ہیچ نخواہد بود چہ اگر مکان ست آنہم داخل عالم ست۔ وجود ستا باز اور امکان باید۔ تسلسل لازم می آید۔ پس مکان معدوم شد۔ ہر چہ ہست مکین ست۔ اگر گوئی بچہ اعتبار توان دانست کہ وجود بکیست، ولامکان ست۔ بدانکہ چون حق قدیم و عالم را جدید گفتی لازم شد کہ پیش از عالم بود۔ پس بگو کہ آن زمان حق تنہا بود یا آنکہ ہمراہ او چیزے دیگر بود۔ اگر گوئی با او ہیچ نبود۔ بحکم کان اللّٰہ وَ لم یکن معہ شیئً ہیچ شہ با او ہمراہ نبود۔ پس چگونہ شے در وجود او گوئی، اگر بگوئی حق تعالیٰ خلق کرد، ہر آئینہ بگو کہ از مادہ آفرید، یا بے مادہ۔ اگر گوئی از مادہ آفرید۔ پس بگو کہ مادہ قدیم بود یا جدید۔ اگر گوئی قدیم بود۔ پس بگو کہ مکان مادہ برچہ چیز بود و مکان او عین او بود یا غیر او، و این ہر دو روا نیست۔ پس لازم شد کہ در ذات خدا بود۔ پس بگو کہ عین حق بود۔ ہر آئینہ آن مادہ نشد ذات خدا شد۔ چراکہ گفت کان اللّٰہ ولم یکُنْ معہ شیءٌ واگر گوئی کہ مادۂ عالم جدید است، ہر آئینہ آن مادہ نشد بلکہ او ہم داخل عالم شد کہ مخلوق نیست۔ لازم شد کہ عالم بے مادہ آفریدہ شدہ است۔ چراکہ اگر مادہ است حادث شد ہر آئینہ و مخلوق اول ست۔ او را نیز مادہ باید و این محال ست، ہر آئینہ لازم شد کہ مادہ از ذات خود آفرید۔ چون از ذات اوست۔ پس ہر آئینہ ذات او مادۂ موجودات شد، لازم آمد کہ ہمہ چیز عین ذات او مادہ شد۔ لازم آمد کہ ہمہ چیز عین ذات او باشد چراکہ از مادہ انچہ سازی ہر آئینہ او عین مادہ است و محال کہ عالم اجسام بے مادہ موجود باشد۔ بہر وجہ مقرر می شود کہ مادہ عالم از ذات او باشد، پس بگو کہ از پیدا شدن مادہ از ذات او چیزے کم شد یا زیادہ شد۔ چراکہ محال ست کہ بے نقصِ کمال مادہ از ذات صرف پیدا شود۔ اگر گوئی کم شد محال ست۔ چراکہ ذات مطلق ہرگز کم نمی شود۔ چہ اگر کم شود عدم شود۔ محال ست کہ موجود مطلق عدم شود، و کم گردد واگر گوئی کہ زیادہ شد محال ست۔ زیراکہ ذاتِ ساذج مطلق ہرگز زیادہ نمی شود۔

شاہ : ساذج سمجھے۔

تھانہ دار : جی نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔

شاہ : ساذج معرّب سادہ ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب لفظ فارسی کو معرّب بناتے ہیں تو دل مہملہ کو ذال معجمہ اور ہائے ہوز مختفی کو جیم تازی سے بدل دیتے ہیں۔ پس سادہ کا ساذج ہوا کما لا یخفی

عَلیَ الفطِنِ اللبیبِ۔

تھانہ دار: عالَم حادِث ہے یا نہیں۔

شاہ: حادث ہے۔

مرا در ارسد کبر یا و منی
کہ ملکش قدیم ست وذاتش غنی

قدیم خدا ہے۔ حادث عالم ہوتا ہے۔

تھانہ دار: اچھا پھر اِس کے کیا معنی ہوئے کہ ملکش قدیم ست۔

شاہ: یہ مشکل مسئلہ ہے۔

تھانہ دار کو لونڈا بنا کر اور خود اُن کے استاد بن کر انھوں نے اپنا مطلب نکالا۔ تھانہ دار سے کہا کہ اگر تم ہماری بیوی کا پتہ لگا دو تو ایک مہینے کے اندر ہی اندر کل تصوّف کی باتیں بتا دوں۔

تھانہ دار نے کہا بہت اچھا حاضر ہوں۔

تھانہ دار: جمعدار صاحب کو بلاؤ۔

جمعدار: کہئے میں ابھی باہر سے آیا ہوں تحقیقات کر کے۔

تھانہ دار: اس ننکو حلوائی کو بلواؤ۔ یہ بیچارے شاہ جی بڑے عالم و فاضل آدمی ہیں۔ مگر اتفاق سے اِن کی منکوحہ خدا جانے کہاں چل دیں اُن کا پتہ ہی نہیں۔ اِن کو ننکو حلوائی پر شک ہے۔ اس کی تحقیقات اچھی طرح کرو۔

جمعدار: ننکو۔ وہ موٹا کلوٹا لونڈا۔

شاہ: جی ہاں صوبہ دار صاحب۔

جمعدار: وہ کہاں ملا۔ کیا اُس سے کبھی کی ملاقات تھی۔

شاہ: میں اُسی کی دُکان کے پاس چبوترے پر سویا تھا' اور وہ عورت کے پاس گیا بھی تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ میں امیر ہوں میرے ساتھ نکل بھاگو۔

جمعدار: بڑا بدمعاش ہے اور پرلے سرے کا اوباش۔

شاہ: خدا اِن کا اُس کو انتقام دے گا۔

تو قیامت شو قیامت را ببین	دانش ہر چیز را شرط ست این
آفتاب آمد دلیل آفتاب	گر زلیلت یا بد اروے رو متاب

تونہ بینی ہیچ چیزے راعیان   تانگروی بایقین تو عین آن

یعنے جب تو عین قیامت ہوجائے گا تو قیامت کو دریافت کرے گا اور جب تک یہ بات نہیں

حاصل ہے تب تک اولیا کا قائل نہ ہوگا۔

جمعدار: حضور تو بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں۔

جمعدار فوراً انکو حلوائی کی تلاش میں چلا۔ ادھر شاہ جی نے تھانہ دار کو ایک غزل سُنائی۔

نہ گلچیں ہے شفیق اپنا نہ مونس باغبان اپنا
یہ دونوں ہوگیے دشمن ٹھکانا ہے کہاں اپنا

بیان کیسا تصور سے بھی ہے قصہ نہان اپنا
زبان کا ذکر کیا دل بھی نہیں ہے رازداں اپنا

ہمیں کیا کام تھا اِس گلشنِ ویراں میں آنے سے
چھُڑایا آب و دانہ نے قدیمی آشیاں اپنا

وہ گھبراتے ہیں تنہائی سے ہم غم سے تڑپتے ہیں
عجب عالم ہے فرقت میں وہاں اُن کا یہاں اپنا

تلاش اِک رشکِ یوسف کی رہی ایسی کہ دل برسوں
پھرا منزل بہ منزل کارواں در کارواں اپنا

شبِ وصلت ہوئی آخر عدم کو ہم بھی چلتے ہیں
کہو شمعِ سحر آگے بڑھے لے کر نشان اپنا

ریاض دہر میں ہے ختم مجھ پر خانہ بردوشی
کہ اپنے مشت پر کو جانتا ہوں آشیاں اپنا

پس آئینہ ہم طوطی ہیں جو سُنتے ہیں کہتے ہیں
زبان اُن کی زبان اپنی دہن اُن کا دہاں اپنا

تھانہ دار: ع۔ سینے کو چمن بنائیں گے ہم

اس پر کوئی مصرع کہیے۔

شاہ: بسم اللہ۔

سینے کو چمن بنائیں گے ہم   گل کھلائیں گے گل کھلائیں گے ہم

تھانہ دار: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

تصوّر روز و شب خاطر میں ہے گیسوئے جاناں کا | دلِ صد چاک شانہ بن گیا زلفِ پریشاں کا
تمہاری سُرخی لب نے اڑایا رنگ ہنس ہنس کر | حنا کا لعل کا یاقوت کا خونِ شہیداں کا

اب سُنیئے کہ جمعدار صاحب داخل ہوئے۔

جمعدار: ارے ننکو۔ ننکو کہاں ہے بلاؤ۔

ننکو: سلام جمعدار صاحب۔ آج کہاں بھول گیے۔

جمعدار: تمہارے ہی پاس آئے ہیں۔ بچہ اب تم بڑا گھر دیکھے بغیر نہ رہوگے بس۔ اچھے گھر بیعانہ دیا۔ وہ تھانہ دار صاحب کے مرشد ہیں اور ڈپٹی صاحب کے بھی مرشد ہیں۔

ننکو: میں سمجھا نہیں جمعدار صاحب۔

جمعدار: بس بھل منسی اسی میں ہے کہ کہا مانو۔

ننکو: باپ کی کسم (قسم) کھائے کے کہتا ہوں کہ میں نہیں سمجھا۔

جمعدار: کل تم کسی عورت پر کترائے تھے۔

زینہار از قرین بد زینہار
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

ننکو: ہجور ہم پارسی کیا جانیں۔

جمعدار: بچّہ۔ اچھے گھر بیعانہ دیا ہے۔

سفلہ چو جاہ آمد و سیم و زرش | سیلی خواہد بضرورت سرش

آن نشنیدی کہ فلاطون چہ گفت
مور جان یہ کہ بنا شد پر ش

ننکو: ہجور۔ ہمارا پر میشر جانتا ہے کہ ہم کچھ سمجھے نہیں۔

جمعدار: اچھا سور۔ چل کوتوالی۔ ابھی چل۔

ننکو: یہ جبر دتی (زبردستی) اچھی نہیں۔

جمعدار: اب زیادہ نہ بکواؤ۔ بس چپ چاپ چلے چلو۔

ننکو: بہت اچھّا چلتا ہوں مگر کسور (قصور)

جمعدار: ہاں؟ کیا ننھے بنے ہیں۔ ایسے بھولے بنے ہیں۔

ننکو: ہجور میں حلوائی کا لڑکا یہ باتیں کیا جانوں۔
جمعدار: چُپ سور۔ مت بیہودہ بکو۔
ننکو: ہجور چاہے مار ڈالو۔ ہم اُس کا حال نہیں جانتے۔
جمعدار: تم سور ہے۔ چل ہمارے ساتھ۔
ننکو: جمعدار صاحب جو حکم ہو مگر مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئی۔ اب مانیے تو اچھا نہ مانیے تو اچھا۔

محبّت میں سبھی یکساں ہیں جسکی جس سے بن آئی

جمعدار: ہاں شاعر بھی ہیں حضور۔
ننکو: (قدموں پر ٹوپی رکھ کر) ناہیں ہجور۔
جمعدار: کوئی ہے۔ چلو اس کی مشکیں کسو۔ سُور۔ بدمعاش۔ پرائی بہو بیٹیوں کو تو تکتا پھرتا ہے بے۔ نامعقول اور اب تو ہم خوب سمجھ گیے کہ۔

محبت کوڑیوں کے ہوا گر مول — نبی آدم نہ لے یہ دردِ سر مول
پسندِ دل ہوا ہے حُسن صورت — فلک بیچے تو لیں شمس و قمر مول
ہوا صف بندی مژگان سے ظاہر
ہمیں لے لیں وہ آنکھیں ڈھونڈ کر مول

ننکو تھانے پر گیا۔ قسم کھائی کہ مجھے اس عورت کا حال ذرا بھی نہیں معلوم ہے۔ تھانہ دار نے کہا غلط ہے۔ تم بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ اور تم نے اُس عورت کو رات کو بھی چھیڑا تھا۔ کامل ثبوت ہے کہ تم نے اُس کی چارپائی آہستہ سے اٹھوا دی۔
ننکو: صوبہ دار صاحب اگر یہ ہو تو مار ڈالیے۔
راوی: حضرات ناظرین۔ ذرا غور کیجیے۔ بھلا ثریّا بیگم ایسی نفیس مزاج عورت اُس میلے کچیلے حلوائی کے لونڈے پر پھسلے۔ اے لاحول! اے لاحول! اے لاحول!

غالب اِن سیمیں تنوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

پادری صاحب آئے غضب ہو گیا

نور کے تڑکے ان دونوں سیم بدن، اور بستہ دہن شہزادوں کی کرسیاں حوض کے کنارے ہری ہری دوب پر بچھی تھیں اور بیچ میں وہ عروس نازنین رشک بتان چین، بصد ناز و انداز معشوقانہ متمکن تھی۔ تینوں کی زلف چلیپا سے مشک اذفر اور عنبر سارا کی خوشبو آتی تھی۔ تینوں کے دل کی کلی نسیم بہجت سے کھلی جاتی تھی۔ کہسار پر گلزار اور گلزار میں بہار، اور بغل میں نگار، پولینڈ کی شہزادی کے چہرۂ انور پر جلال اور جمال دونوں نے رنگ جمایا تھا۔ شان خسروی سے بیٹھی تھی۔ مس میڈا کا جوبن اس وقت ستم ڈھاتا تھا۔ اغند آتش بیما مس کلیرسا کا بانکپن قابل دید تھا۔ بلکہ دید تھا نہ شنید۔ تیکھی چتون بانکی ادا پر شہزادی لوٹ تھی۔ بے اختیار چاہتی تھی کہ لب شکر بار کا بوسہ لے لے۔ کبھی میڈا پر نظر ڈال کر دل میں کہتی تھی کہ یا خدا وہ کون مبارک دن ہو گا جب پادری صاحب آن کر نکاح پڑھوائیں گے۔ کبھی کلیرسا کی پھبن اور بانکپن دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی کہ صبح شام آرزو بر آئے گی۔ دل کی حسرت نکل جائے گی۔

اتنے میں کلیرسا نے کہا، پیاری شہزادی رقابت بری چیز ہے۔ اور جب کسی خوبصورت پر کوئی جوان عاشق ہوتا ہے تو پھر ممکن نہیں کہ کسی اور مرد سے ہنستے بولتے دیکھ کر رشک کی آگ میں نہ جلنے لگے۔ پھر یہی جی چاہتا ہے کہ جو کوئی بدبخت اس پر نظر بد ڈالے اس کی آنکھیں تلووں کے تلے ملے۔ گولی مار دے۔ ذبح کر ڈالے۔ ایک مرتبہ یہی آزاد جو تمہارے ہاں قید ہیں۔ قسطنطنیہ کے ایک ہوٹل میں فروکش تھے۔ وہاں ایک خوبرو اور عنبریں مو دوشیزۂ قوس ابرو بھی آیا جایا کرتی تھی۔ وہ اس جوان شیر اندام، فراخ سینہ پر عاشق ہو گئی۔ اور اسی کنواری پر فرانس کا ایک گران ڈیل، کشیدہ قامت قوی ہیکل اور حسین جوان بھی جان دیتا تھا۔ جب آزاد پاشا اور مس میڈا میں بے تکلفی بڑھی، وہ دوشیزہ سیم تن، آزاد کی مفارقت ایک لمحے کے لئے بھی پسند نہیں کرتی تھی، اور اسی کے عشق کا دم بھرتی تھی۔ ایک روز افسر مذکور نے باغ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر تاک لگائی کہ دیکھوں یہ دونوں نوخیز مرد اور عورت یہاں یکہ و تنہا آن کر کیا کرتے ہیں۔ جب چاندنی نکھری اور سبزے میں اس نے کھیت کیا تو اس کو پاؤں کی چاپ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو دو آدمی نظر آئے۔ جب قریب پہونچے تو معلوم ہوا کہ آزاد ہیں۔ وہ پری زاد دیکھتے ہی جل بھن کے خاک ہو گیا۔ مارے غصے کے ہونٹھ چبانے لگا۔ آزاد اپنی معشوقۂ پری زاد کے دست سیمیں میں ہاتھ دے کر گلگشت چمن کرنے لگے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، اور عنبر بار صبا نے دماغ کو طبلۂ عطار

بنایا۔ گلہائے نودمیدہ کی مہک، غنچوں کی چٹک، باغ کو چاندنی نے جوئے شیر کر دیا تھا۔ وہ باکرۂ گل عذار اس سامانِ طرب سے اور بھی مست ہو گئی۔ ایک روشِ صفا پرور میں کرسی پر بیٹھ کر آزاد فرّخ نہاد کے رخسارِ تاباں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ فرانسیسی افسر سے یہ قیامت کا اختلاط نہ دیکھا گیا۔ دو بار شمشیرِ محرابی لنگردار تولی اور دو ہی بار قرولی کمر سے کھولی۔ مگر صرف اس خیال سے کہ یہ مردِ بیاری کا پیارا ہے۔ کندے تول تول کر رہ جاتا تھا۔ جب مس میڈا نے بلجن داؤدی گانا شروع کیا اور اُس نے نغمۂ دلربا کے ذریعے سے اظہارِ عشق بھی کیا تب ان سے نہ رہا گیا۔ تیغ دُو سر میان سے نکالی ہی تھی کہ آزاد نے اس کا عکس دیکھ لیا۔ اور اس خاتونِ بلقیس مرتبت سے کہا کہ سامنے ہم کو ایک کشیدہ قامت آدمی شمشیر بکف نظر آیا۔ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ مس میڈا اس وقت بادۂ جوانی کے نشے میں ایسی چور تھیں، جیسے بسنت کی رُت میں بھونرا کلیوں کا رس چوس چوس کر مست ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے بات ٹال دی، اور کہا جانِ من اس وقت مذاق اور لطف اور دل لگی اور چہل کے سوا اور کوئی بات بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ اتنے میں وہ خونخوار افسر شمشیر برہنہ لے کر کمین گاہ سے جھپٹ ہی تو پڑا۔ آتے ہی تلا ہوا ہاتھ جمایا۔ آزاد نے معًا خالی دی۔ مگر وہ مسلح یہ نہتے۔ اُس نے کئی ہاتھ لگائے مگر یہ کبھی آڑے ہو گئے کبھی ترچھے ہو گئے۔ ایک چوٹ تک نہ کھائی، اور افسر بدکور ہانپ گیا۔ اس کو غنیمت سمجھ کر آزاد نے ایک لکڑی جو اسی روش میں پڑی تھی اٹھالی۔ لکڑی کا اٹھانا تھا کہ برس پڑے۔ سر۔ طمانچہ۔ باہرہ۔ پالٹ۔ کٹرک جنبوا۔ انی۔ مونڈھا۔ اتنے ہاتھ لگائے کہ افسر کے رخ چھوٹ گئے۔ ساری اڑان گھائیاں بھول گیا۔ اس کے بعد آزاد نے جھپٹ کر اس پھرتی کے ساتھ کیلی کی کہ تلوار ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

تم تو عورت ہو، یہ باتیں کیا جانو مگر کوئی مردوں کے دل سے پوچھے کہ جس پری پر ہزار جان سے عاشق ہوں، اُس کے سامنے دوسرے مرد خصوصًا رقیبِ روسیہ و ناہنجار سے دب نکلنا ستم ہے قہر ہے۔

مس میڈا کے لوحۂ دل پر اس مقابلے سے آزاد کی بسالت اور جواں مردی کا نقش اور بھی منقوش ہو گیا۔ فرانسیسی افسر نظروں سے گر گیا۔ یہ رقابت بلائے بے درمان ہے جس کو ہم پیار کریں اُس کو کوئی اور پیار کرے، بڑی بدگمانی ہے:

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق ست و ہزار بدگمانی

پولینڈ کی شہزادی نے قہقہہ لگا کر پوچھا۔ آخر اس بحرِ طویل کا ماحصل کیا ہے۔ مس میڈا اپنا

ذکم خیر سُن کر خاموش تھی اور دل ہی دل میں ہنستی جاتی تھی۔ شہزادی کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا یہ بھی عجب بے تکے آدمی ہیں۔ ایک گھنٹے تک یہ روایت بیان کی اور مطلب کی دُم میں موٹا سا رسّا۔

اب سُنیے کہ مئیڈا اور کلیرسا میں چھیڑ چھاڑ ہونے لگی، مگر درپردہ تاکہ وہ سمجھ نہ سکے۔

آدمی ہیں حواس ہی حواس ہیں۔ ابھی اچھّے بھلے چنگے تھے، اور اب بیہوشی کی باتیں کرنے لگے۔ دماغ عقل سے کھکھل ہوگیا ہے۔

ہوش کی خبر پی کے کچھ واعظ
آج مستوں سے رنگ لائے ہیں

کلیرسا: مطلب ہم شہزادی کے کان میں کہہ دیں گے ذرا کان لاؤ۔

مئیڈا: ہرگز نہیں کان نہ دینا۔ ورنہ چوم لیں گے بس الگ۔

کلیرسا: دیکھا۔ ابھی سے رقابت کی لینے لگے، اچھا سمجھا جائے گا۔

مئیڈا: سمجھا کیا جائے گا۔ حُسن میں، جمال میں، طاقت میں، وضع میں، قطع میں، تم سے کسی بات میں کم ہیں تم سے بیس ہی ہوں۔

کلیرسا: شانِ خدا۔ آپ بھی اتنے ہوئے۔ اے تیری قدرت۔ دیکھو شہزادی رقابت کی لینے لگے نہ۔ یہ قصہ ہم نے اسی لیے تو بیان کیا تھا، دونوں کے ساتھ تعلق رہنا اچھا نہیں۔ اس میں سیکڑوں خرخشے ہیں۔ دونوں میں ایک کو چُن لو۔

راوی: اور اُس چھٹے ہوئے کے ساتھ شادی ہو جائے بس۔

مئیڈا: اچھا دونوں میں کون پسند ہے۔ تمھاری ہی رائے پر چھوڑا۔

مس مئیڈا اور کلیرسا دونوں تن کر بیٹھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے پر قہر آلود نظر ڈالی۔ پولینڈ کی شہزادی کو کیا معلوم تھا کہ ان میں کہی بدی ہے۔ سمجھی کہ واقعی آتش رقابت جوش زن ہوئی۔ مسکرا کر کہا۔ اے واہ ہم تو سمجھے تھے کہ تم دونوں دلی دوست ہو۔ مگر تم تو سچ مچ رقیب ہی بن بیٹھے۔ جب ان کو (مئیڈا) ازسرتاپا دیکھتی ہوں تو جی نہیں چاہتا کہ کسی اور مرد کی صورت دیکھوں۔ فریفتہ ہو جاتی ہوں۔ اور جب اس کی بانکی ادا پر نظر پڑتی ہے تو دل قابو سے جاتا رہتا ہے۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

مئیڈا: پھر وہی رقابت باقی رہی۔ اور خدا جانے اس میں تم نے کون بات دیکھی ہے۔ بھلا میرے

مقابلے میں یہ ٹھہر سکتا ہے۔ ہمارا حسنِ گلوسوز۔ کجا یہ کالا بھجنگا منگل کے روز۔ مگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن، کیا سانور کیا گورا رے۔

ع ۔ محبت میں سبھی یکساں ہیں جس کی جس سے بن آئی

کلیرسا: آخاہ۔ یہ کہیے۔ تم اور حسین۔ شانِ خداداد اپنے چہرے کی طرف دکھا کر) حسن اسے کہتے ہیں۔ ادھر دیکھو۔

کلیرسا اور مَیڈا میں خوب چہل ہوئی۔ شہزادی سمجھتی تھی کہ یہ دونوں واقعی اپنے اپنے حسن وجمال کی رقابت کے سبب سے تعریف کرتے ہیں، مگر مطلب سعدی دیگر است۔ کلیرسا نے بیان کیا کہ ایک بار اطالیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ احباب بذلہ سنج وموافق اور یارانِ صادق ساتھ تھے۔ وہاں ایک ہوٹل میں اترے۔ شام کے وقت اُدھر سے ایک نازک اندام کنواری چھوکری سمند گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتی تھی۔ میں اُس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ آنکھ بالکل ہرن کی سی۔ رنگِ رخسار رعنا۔ اور وہ چھل بل کہ الاماں الاماں۔ نظر غلط انداز، رخنہ انداز دین وایمان۔ ابروے کج قبلۂ کفر گرنیںان اور ایسی نازک کمر تو آج تک نظر سے نہیں گزری۔ ایک دن جوڑا کھلا ہوا تھا۔ باور کیجیے کہ اُس کے بار سے کمر لچکتی جاتی تھی اور ہزاروں بل کھاتی تھی۔

میانش را بیان کردن ضرورست
کہ چون حدِ وسط خیر الامُور است
چو وصفِ آن میان اندر میان است
قلم را موی حیرت برزبان است
زبانِ خامہ گرچہ موشگاف است
ضمیرِ آئینہ ہرچند صاف است
نہ زان موی میان گوید بیانی
نہ زان امری نہان جوید نشانی

اور دستِ نگارین کی تعریف میں زبان ناطقہ لال ہے۔

اشارت کرد ماہِ نو بہ انگشت
کہ آن انگشت مارا بیگنہ کُشت

وہ ساعد کی صفائی، اور وہ پنجۂ حنائی اور وہ گوری گوری کلائی، جس نے دیکھی دنگ ہو گیا۔ ہوٹل والوں نے بیان کیا کہ اس پری زاد کا حُسنِ خداداد تمام اٹلی میں ضرب المثل ہے۔ ایسا

نورانی پہونچا تھا کہ لباس کے اندر سے چھلکتا تھا۔ بے اختیار دل چاہتا تھا کہ سجدہ کرے، اور پہلو چیر کر دل میں جگہ دے۔

مانی چو نقش آن بُتِ بدست می کشند
چون میرسد به ساعد اودست می کشند

گو ہر عضو سانچے کا ڈھلا تھا مگر کمر نازک اور ساعد رنگین اور غبغب سیمین بوسہ فریب تھا۔

ہزار موج بر آبِ حیات کرد نمود
یکے زروے لطافت چو غبغب تو نبود

ایک روز میں اُس کے سمندِ فلک سیر کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ مگر اُس نے گردن پھیر کر دیکھا بھی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

چو نامی کہ مولاے نامِ توام
ورم نا فریدہ غلامِ توام

مگر جواب ندارد۔ کچھ بولی ہی نہیں۔

غرورِ حسن اجازت مگر ندادے گل
کہ پرسشی بکنی عندلیپ شیدارا

مجھے یہ غرور کہ جو درجہ اس پری وش کا عورتوں میں ہے، وہی درجہ میرا مردوں میں ہے۔ میرا غرور حق بجانب تھا۔

ہنیڈا: گھری پٹکی اور باسی ساگ، حسین بنے ہیں۔ چہرے پر پھٹکار برستی ہے، مگر دون کی ضرور لیں گے۔ پھر آپ پر عاشق ہو گئی ہو گی۔

کلیریا: میں آپ سے نہیں کہتا تھا۔ بس جب میں پھر آگے بڑھا اور اُس حور زاد نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا تو گھوڑے کو اور بھی آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ میں نے ٹکٹکی باندھی، اور ساتھ ہو لیا، راہ میں ایک مقام پر عمداً اور قصداً چابک پھینک دیا۔ میں فوراً جھپٹا اور چابک اٹھایا۔ رومال سے صاف کیا۔ بوسہ لیا، اور دینے لگا، تو چابک لے کر پھر پھینک دیا۔ اور کہا کہ اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ ناپاک آدمی نے اس کا بوسہ لیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا تو سہی کی چابک تو چابک تمھارے لب لعل شکر خا کے ہزاروں بوسے لئے ہوں۔ کلیریا نے نہایت فخر کے ساتھ کہا کہ اُس پریرو آئینہ زانو نے اسپ برق رفتار کی باگ روک لی، اور ایک کاغذ کے پرچے پر پنسل سے کچھ لکھ کر میری طرف

کھسک دیا' اور گھوڑا اکڑ کڑا دیا۔ تو یہ جا وہ جا۔ میں دھک سے رہ گیا کہ ہائے یہ کیا ہوا۔ سوچا کہ یا خدا مجھ سے ایسا کون قصور سرزد ہوا جس کے عوض یہ بے اعتنائی کی۔

چہ کردہ ام سبب بخش تو چیست بگو
بگو بگبر دِ مسِرِ بدگمانیست گردم

مارے وحشت کے وہ کاغذ اٹھایا۔ مگر دفعتہً خیال آیا۔ پڑھا تو فرانسیسی زبان میں لکھا تھا کہ کل شام کو جھٹپٹے وقت لال پُل پر ملنا' اور ضرور ملنا۔ باچھیں کھِل گئیں۔

ہزار شکر کہ ایزد نگاہ دارم شد
کفیل روزی و انجام بخش کارم شد

جناب باری کا شکریہ ادا کیا کہ آرزوئے دلی بر آئی۔

اے خدا قربانِ احسانت شوم
اینچہ احسان است قربانت شوم

ہوٹل میں کسی سے ذکر نہ کیا مگر اُس کی زیب و آرائش کا ہر دم خیال رہا۔

گر بدین شکل و شمائل سوئے محشر گزری
قاضی حشر بہ تعظیم تو از جا خیزد

وہ چشم مست کہ ایک نظر میں ہزاروں کو قتل کر ڈالے۔ لاکھوں گھائل ہو جائیں۔ رخسار تاباں اور عذار رنگین اور لباس لالہ گون ہر دم آنکھوں میں پھر گیا۔

تنِ او در لباس لالہ گون لطف دگر دارد
بود فانوس گلگون لفظِ رنگین شمع معنی را

دوسرے روز سعید بہتر از عید میں خوب نکھر کر لال پُل پر جا کے ٹھہرا۔

ہٹیپڈا: نکھرنے کے بعد تو آپ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہوں گے۔ ماشاء اللہ ایسے ہی حسین ہو۔ شکل چڑیلوں کی ناز پریوں کا۔ خدا کی قدرت۔ آپ اور دعویٰ حسن۔

شہزادی: اے ہے غضب کرتے ہو تم میں کون بات ہے جو اُن میں نہیں ہے۔

بہ قامت از قیامت مژدہ دادہ
ببالا از بلا حرفی زیادہ

بمردہ مژدہ داد آں سرو قامت   کہ نزدیک آمدہ روزِ قیامت

نزاکت اور لطافت میں فرد ہے جیسے تم ویسے یہ۔

خیالِ او بخواب آمد گرفتم در بغل تنگش
خزاں می گشت دیدم صبح دم در گلشنِ رنگش

کلیرسا: واہ کیا ہماری قدر کی ہے۔ اب میں ایسا گیا گزرا ہوا کہ ان ایسوں سے مقابلہ کیا جائے بجا۔ اچھا کسی اور سے دریافت کرو۔

مئیڈا: ایک شرط سے۔ دس آدمیوں سے پوچھو۔ اگر زیادہ آدمیوں کی رائے ہو کہ ہم حسین ہیں۔ تو ہمارے ساتھ ان کی شادی ہو' ورنہ تمھارے ساتھ۔

مس کلیرسا نے کہا کہ اُس روز شام کو وہ پری اسی کمبخت صرصر تنگ پر سوار پُل پر آئی۔ وعدہ کرلیا کہ آج کے تیسرے روز فلارنس کے گرجا میں شادی ہو جائے گی۔ تین گھنٹے تک میرا اور اُس بُت طنّاز کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد ہوٹل واپس آیا۔ تڑکے گجر دم میرے کمرے میں ایک شخص نے آن کر مجھے جگایا اور ایک خنجر آبدار دے کر کہا۔ اُٹھ اگر مرد ہے تو مقابلہ کر۔ میں متحیر ہوا کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ پوچھا وجہ' اس نے کہا میں یہاں کا انسپکٹر ہوں' اور میرے والد بزرگوار خیوا کے جج ہیں۔ جس زنِ خوبرو سے تم نے کل لال پُل پر گفتگو کی اُس کے ساتھ میری شادی ہونے والی تھی' اور اب سنا ہے کہ تم نے اس کو ورغلا لیا۔

میں: مجھے اِس کا علم نہ تھا۔ تمھاری بیوی تم کو مبارک رہے۔

انسپکٹر: نہ نہ۔ تم سے بے ڈوئیل لڑے نہ رہوں گا۔ آؤ سامنے۔

میں: میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں مگر بیکار جان دینے سے کیا فائدہ۔ تمھاری بیوی تم کو مبارک ہو۔ اگر پیشتر سے معلوم ہوتا تو میں کیوں کہتا۔ مگر ایک بات البتہ غور طلب ہے۔ یہ عشق کیسا ہے کہ دو گھنٹے میں وہ ہمارے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو گئی۔

انسپکٹر: اب سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔ بس آیئے آیئے۔

میں: اچھا پھر اگر یہ رائے ہے تو خیر۔ مفت جان دو گے۔

اتنے میں میرے دوست جو کمرے میں تھے۔ یہ حال دیکھ کر متحیر ہوئے۔ میں نے کل حالات بیان کر دیئے تو اونھوں نے انسپکٹر سے تلوار چھین لی اور اُس کو سمجھا دیا کہ ہم لوگ سیر کرنے آئے ہیں۔ نہ کسی کی جان لینے سے کام' نہ جان دینے سے واسطہ۔ یہ رقابت انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتی۔

ادھر تو یہ باتیں ہوتی تھیں اُدھر خواجہ بدیع الزّماں صاحب سامنے کھڑے لہراتے تھے۔

مرا چشمے است خون افشاں ز چشم آن کمان ابرو
جہاں پُر فتنہ مے بینم از ان چشم و ازان ابرو
غلام چشم آن ترکم درِ خواب خوش مستی
نگارین گلشنش رویست و مشکین سائبان ابرو
ہلالے شد تنم زین غم کہ با طغرائے مشکینش
کہ باشد مہ کہ بنماید ز طاقِ آن کمان ابرو
ہمیشہ چشم مستش را کمانِ حسنِ در زہ باد
کہ از پشتی تیر او کند بر سر کمان ابرو
روانِ گوشہ گیران راز حسنش طرفہ گلزاریست
کہ بر طرفِ سمن زارش ہمی گردد چمان ابرو
رقیبان غافل اند از ما کزان چشم سیہ مردم
ہزاران گونہ پیغام است و حاجت درمیان ابرو
دگر حور و پری راکس نگوید با چنین حسنے
کہ این را این چنین چشمت و آنرا آنچنان ابرو

کلیرسا: اخاہ، آپ تشریف لائے۔ کہو کہاں تھے۔
خوجی: دوزخ میں جانے والے تھے، مگر راہ بھول گیے۔
کلیرسا: خدا تم کو وہاں پہونچائے۔ مقام تو تمھارے قابل ہے۔
خوجی: ہاں ہم کو تو وہی پسند ہے۔ ہم افیمی آدمی آگ اور کوئلے خوب ملیں گے۔ باقی اور کسی شے کی یہاں ضرورت ہی نہیں ہے۔

اتنے میں ایک خادمہ نے آن کر کہا۔ حضور پادری صاحب تشریف لائے ہیں۔ مئیڈا اور کلیرسا کا رنگ فق ہو گیا۔ شہزادی پادری صاحب کے استقبال کے لیے گئی، تو اِن دونوں نے فرطِ غم سے زار زار، رونا شروع کیا۔

مئیڈا: اب کیا ہوگا بہن۔ یہ تو کھڑے کھڑے چنوا دے گی۔ بس اب گیے گزرے۔ یہ کیا ستم ہوا۔ آئے تھے آزاد کو بچانے۔ اب خود دھرے گیے۔
کلیرسا: (رو کر) کلیجہ لرزتا ہے۔ اب بے موت مرے۔ کچھ کرتے دھرتے بن ہی نہیں پڑتی۔ جائے

ماندن نہ پائے رفتن۔

مئیڈا: صاف صاف کہہ نہ دو۔ مگر اب تو پادری بھی آگیا۔ یہ کیا ہو گا کیا۔

کلیرسا: اُف اُف۔ قضا ہر در و دیوار سے نظر آتی ہے، روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ ہائے افسوس، وائے افسوس!

مئیڈا: ارے غضب، ہماری جان یوں جانی تھی، اور یہ انجام ہونا تھا۔ افتاد۔

کلیرسا: ہم سے عاجزی تو نہ کی جائے گی۔ مگر ہم اپنے اعزّہ اور روس کے افسروں کے پاس گمنام خط بھیجیں گے۔

خوجی کے ہاتھ پانوں پھول گیے۔ سگ پا سوختہ کی طرح اِدھر اُدھر بوکھلائے ہوئے پھرتے تھے۔ مس مئیڈا کے پاس گیے اور کان میں کہا۔ غضب ہو گیا۔ پادری صاحب تشریف لائے خدا خیر کرے۔ گھڑی دو من مریبا باجے گی۔ عورت ہے بدمزاج، اور شوخ، خدا جانے کیا غضب ڈھائے۔ اُف اُف! بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ لطف یہ کہ دونوں کے ساتھ شادی پر آمادہ ہے۔ اس بے حیائی سے خدا سمجھے۔ مس مئیڈا نے کہا، ہمارے نزدیک اب صاف صاف بیان کر دینا لازم ہے۔ اب بھی سویرا ہے۔ ورنہ جب گرجا میں جا کے شادی ہوگی تو ستم ہی ہو جائے گا۔ مس کلیرسا نے اس رائے سے اتفاق کر لیا۔ مگر خوجی نے سمجھایا کہ ایسا غضب نہ کرنا۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ مس کلیرسا سادہ پوشاک جنگی زیب تن کریں، جو اُس روز میدانِ حرب میں پہنی تھی، اور پوری وردی زیب بدن کر کے سینہ تانتی ہوئی سامنے آن کھڑی ہوں۔ تم (یعنی مئیڈا) بھی اپنی بانکی وضع سے ان کے ہمراہ ہو۔ اس رائے کو دونوں نے پسند کیا، اور خوجی اکڑ گئے۔ دیکھا ہم بوڑھے آدمی کس قدر کام آتے ہیں۔ ہم لوگ اس قابل ہیں کہ ڈبیا میں بند کیے جائیں۔ وہ بات بتا دی کہ دو کروڑ روپیے صرف کر کے بھی نہ معلوم ہوتی تو وجہ کیا ایک تو غلبۂ ذکاوت، دوسرے تیزی عقل، تیسرے چُنیا بیگم کی صحبت، اور ملاقاتِ دیرینہ ذہن کا بُغارا کھُل گیا۔ یوں تو خدا نے سب کو عقیل اور نیک اور صالح پیدا کیا ہے مگر جو بات ہم میں ہے وہ کوئی کہاں سے لائے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْم۔

ہر چہ بر صفحۂ اندیشہ کشد کلکِ خیال
شکلِ مطبوع تو زیبا تر ازاں ساختہ اند

مس کلیرسا خوب تنی ہوئی بیٹھی۔ اور جواں مرد عورتوں کی سی وضع (سرپیٹ کر) ہائے

اس وقت کوئی داد دینے والا نہیں۔ ذہن کا بغارہ کھلا ہے۔ عورت کے لیے جواں مرد خواجہ بدیع کمبخت ہی کا حصہ ہے مس کلیر سا شجیعہ (شجاع کا صیغۂ تانیث) ہیں ان مئیڈا جمیلہ ان اللہ یحب الشجاع بھی آیا ہے اور اللہ جمیلٌ و یحب الجمال بھی آیا ہے۔

مرگ در چشم ہر کہ خوار بود   در شجاعت بزر گوار بود

ہر کہ جان را عزیز میدارد

باجہاندار یش چہ کار بود

مس مئیڈا مسکرا کر بولیں کہ خواجہ بدیع کمبخت اس وقت بھی جھک باندھ رہا ہے۔ بھلا یہ وقت صلاح اور مشورے کا ہے یا بے تکی ہانک لگانے کا خواجہ صاحب نے اپنے کان پکڑے اور پادری صاحب کی زیارت کے لیے چلے دیکھا کہ ایک کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہے۔ بال سفید بھوں تک کے بال سن کے سے سفید تھے۔ اور صاحب تن و توش، جاتے ہی خوجی نے سلام کیا اور ایک بھدی کرسی اٹھا کر پادری صاحب کے قریب گیے۔

خوجی: اک ذرا تکلیف کیجیے۔ وہ کرسی چھوڑ دیجیے اور اس کرسی پر دندنائیے۔ بسم اللہ۔ بس اب کہا مانو بھائی جان۔ اینطرف اور لاحول ولا قوۃ۔

شہزادی: پاگل ہے کون۔ اس کرسی میں کیا اور اس میں کیا ہے۔

خوجی: اے ہے حضور تو سمجھتی ہی نہیں۔ اجی تن و توش دیکھتی ہو اس کرسی کی خیر نہیں نظر آتی۔ آئیے اس کرسی پر۔ مرد خدا تمھیں اس کا خود خیال چاہئیے۔ اس توندار کے صدقے۔ ہوا کا تکیہ ہے۔

شہزادی: یہ مسخرے ہیں۔ اِن کے منھ نہ لگیے۔ یہ ایسا ہی بکا کرتے ہیں۔

خوجی: حضور معاف فرمائیں۔ بندہ اس وقت افیم کی پینک میں ہے۔

شہزادی: مسخرہ ہے۔ چلو ہٹو سامنے سے۔

خواجہ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھپٹ کر پادری صاحب کے پاؤں دبانے لگے شہزادی مسکرائی۔ کہا۔ دیکھ ہم نے کئی بار سمجھایا مگر تم نہیں مانتے۔ مذاق اور دل لگی کا موقع محل دیکھ لیا کرو۔

پادری: تمھارا کیا پیشہ ہے پڑھے لکھے آدمی ہو یا نہیں۔

خوجی: حضور میں درزی ہوں۔ کپڑے سیتا ہوں۔ مگر اب اُس درزی کی شاگردی کرنے والا ہوں جو حضور کے کپڑے سیتا ہے۔ اللہ ری توند اس وقت مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گیے۔

ہیں الاماں الاماں۔ اس شہر میں یہ عجیب الخلقت دیکھنے میں آئے۔ ایک کنگار و جانور دوسرے حضور کا توند۔ کیا فرمائشی توند ہے۔ درزی کمر کیوں کر ناپتا ہوگا۔

پادری: ہم لوگ کسی کے بُرا کہنے کا رنج نہیں کرتے۔ جس کا جو جی چاہے کہہ لے۔ ہمیں اس کا خیال نہیں۔ مگر کسی کا دل دُکھانا بُرا ہے۔ خدا ناراض ہوتا ہے۔

توانی بہ نرمی و کار آگہے　　　　که تعبیر رائے سلاطین و ہی

دگر از درشتی بر آری نفس　　　　نیایند از ان رائے خود باز پس

پس آن بہ کہ اوّل مدارا کنی

بفرصت رہ چارہ پیدا کنی

جب دھوپ نکلی اور حضرت کی ریش سفید پر شعاع شمس پڑنے لگی تو کمرے میں جا کر بیٹھے۔ شہزادی نے حکم دیا کہ ان دونوں کو بھی بُلاؤ۔

شہزادی: دو شہزادے آئے ہیں۔ ایسے لطیف رو دیکھے نہ سُنے۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ابھی نہایت کم سن ہیں۔ وہ گلاب کے پھول کا سا بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کھلا ہے۔ طرّہ یہ کہ دونوں کا حُسن و جمال بے عیب ہے۔

کرا ارشد کہ کند عیب دامن پاکت

کہ ہمچو قطرہ کہ بر برگ گل چکد پاکے

پادری: تمھاری شادی کس کے ساتھ قرار پائی ہے۔ کیا دونوں بھائی ہیں۔ کس ملک کے رہنے والے ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ کس بادشاہ کے لڑکے ہیں۔ یہ سب حالات دریافت ہوں تو میں اپنی رائے دوں، ورنہ اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تربیت یافتہ ہیں یا نہیں۔

شہزادی: ایک تو روسی زبان ایسی صاف بولتا ہے جیسے ہم آپ۔ بالکل روسی معلوم ہوتا ہے۔ ذرا فرق نہیں، اور دوسرا فرانسیسی بولتا ہے اور کچھ کچھ روسی زبان بھی بول لیتا ہے۔

پادری: تو شادی کس کے ساتھ قرار پائی ہے۔ وہ جو روسی خوب بولتے ہیں یا دوسرے کے ساتھ۔

شہزادی: اب خرابی یہ ہے کہ دونوں میں ایک بھی چھوڑا نہیں جاتا۔ اس سبب سے ہم نے دونوں کو قبول کیا۔ دونوں کے ساتھ شادی ہوگی اور اُن دونوں نے بھی منظور کر لیا۔ آج شام کو گرجا میں چل کر اس کار خیر سے فراغت ہو جائے تو تمام عمر بخوشی زندگی بسر کروں۔

پادری: اب کیا کہوں۔ عقل چکّر میں ہے یہ آج تک کہیں ہوا ہی نہیں؛ یہ تو عرب و عجم وغیرہ کی طرف رسم ہے۔ یہاں یہ بات کہاں۔ اس خیالِ خام سے درگزر و یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کسی اور پادری کو بلاؤ۔

شہزادی: میں نے کچھ جواہرات اسی دن کے لئے رکھے ہیں، کہ جس معزز پادری کے ذریعے سے شادی ہوگی اس کو شادی کے دن نذر دکھاؤں گی۔ مگر افسوس ہے کہ وہ دولت تمھارے مقسوم کی نہیں ہے۔ وہ کسی اور کی تقدیر میں ہے۔ خیر۔ ہم کو اس جھگڑے سے کیا مطلب۔

پادری: ایک صلاح بتاؤں اُس پر عمل کرو۔ شادی تو دونوں کے ساتھ مگر مشہور ایک ہی کا نام ہو۔ کے طور پر دو ہوں مگر گرجا کے رجسٹرار پر ایک ہی کا نام درج کریں۔

شہزادی کو یہ بات پسند نہ آئی۔ سوچنے لگی کہ سب سے بہتر تدبیر کیا ہے کہ سامنے سے خادمہ آئی عرض کیا کہ حضور دو شہزادیاں کہیں باہر سے آئی ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ شہزادی نے کہا بلاؤ۔ یہ کہہ کر ان کے استقبال کو چلیں۔ پادری صاحب ہمراہ تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مس کلیرسا اور مس میڈا بانکی ادا کے ساتھ چلی آتی ہیں۔ دیکھتے ہی دھک سے رہ گئی۔ ارے! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں یا خدا یہ خواب میں دیکھا یا سچ مچ وہی ہیں۔

کلیرسا: نہیں۔ مرد کے بھیس میں تو پیار کر چکے، اب آؤ بہنیں بہنیں بن کے پیار کریں۔ ہم وہی ہیں جس کے ساتھ تم شادی کرنے والی ہو۔

شہزادی: (غصّے کے ساتھ) ہاں! خیر! کیا مضائقہ ہے!!!

کلیرسا: کچھ بستت کی بھی خبر ہے۔ میں آئی کس لیے ہوں۔ تم یہاں ماما پختیاں اڑاتی ہو۔ تم کو نہ وطن کی محبت نہ عزّت کا خیال، اور میں میدانِ کارزار میں جا کر کارنمایاں کرتی ہوں۔ میں نے آزاد کو گرفتار کیا جس نے تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اور تم یہاں شادی بیاہ اور ناچ رنگ اور مے خواری کے بکھیڑیں پڑی ہو۔

پادری: اخاہ۔ یہ مس کلیرسا ہوں گی یہ تو مشہور ہیں۔

شہزادی: مس کلیرسا۔ یہ وہی ہیں نہ جو آزاد کو گرفتار کر لائی تھیں۔

کلیرسا: اور کہتی کیا جاتی ہوں۔ (ہاتھ بڑھا کر) آؤ گلے ملیں۔ تم کو تو روس کے نام کا عاشق ہونا چاہیئے۔ آخر حب الوطنی کس دن کام آئے گی۔

شہزادی: ہم تو پولینڈ کی خیر مناتے ہیں روس سے کیا سروکار۔

شہزادی اپنے دل میں سوچی کہ یہ تو عورت نکلی مگر دوسرے شہزادے کے ساتھ نکاح ہوگا۔

جب جا کے مس کلیر سا کو لے کر کرسی پر متمکن ہوئیں اور مس میڈا پر نظر ڈالی تو دنگ ہوگئی۔ کہا کیا تم دونوں بھیس بدل کے آئی ہو۔ اچھا نہ کیا۔ اب تک تو مجھے رنج نہیں ہوا تھا مگر اب البتہ رنج ہوا بدنام کی بدنام ہوئی اور غم جو ہوا وہ طرّہ۔ مزید براں۔

کلیرسا نے کہا اب آزاد کو بُلواؤ۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم کو بھی مزہ چکھاؤں سرکاری قیدی اور ایسے نامی قیدی کو راستے سے بھگا دیا تھا مگر وزیر جنگ سے میں نے خود کہا کہ معاف کر دیجیے۔ میں آزاد کو لینے آئی ہوں یہ پھر سیبیریا کے میدان میں بھیجا جائے گا۔ اور برفستان میں تمام عمر رہے گا کئی معرکوں میں اس نے روسیوں کو نیچا دکھایا۔ شہزادی کے رہے سہے حواس بھی غائب ہوگیے اور بات ٹال کر باہر گئی۔ خوجی کو بُلوایا کہا افسوس ہے کہ آزاد بیچارہ صید مصیبت ہوا۔ خوجی نے جواب دیا بجا فرماتی ہیں آپ کے ہاں بڑے آرام میں تھے۔ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اُس کو کنوئیں سے تو نکلواؤ۔ پیچھے اظہار ہمدردی کرنا شہزادی اپنا سا مُنھ لے کر رہ گئی۔ دو گھنٹے کے بعد آزاد پاتا بلوائے گیے۔ پہلے اُنھوں نے خط بنوایا۔ پھر اُسی کنوئیں پر غسل کیا۔ کپڑے پہنے اور چلے۔ شہزادی آدھ کوس تک اُن کے استقبال کو گئی۔ راہ میں ملاقات ہوئی تو بے اختیار رو دی اسپ آہوشکار سے اتری اور آزاد کے گلے میں ہاتھ ڈال کر زار زار رونا شروع کیا۔ کہا آزاد۔ افسوس ہے کہ تم پھر کلیرسا کے پنجے میں گرفتار ہوئے وہ یہاں آئی ہے اور دھمکاتی ہے کہ اگر آزاد نہ آئے تو مکان پھونک دیا جائے گا اور قید ہو جاؤ گی۔ آزاد تو خدا سے چاہتے تھے کہ چھٹکارا ہو اُنھوں نے کہا اب ہم کو برفستان اور صحرا سب یکساں ہے۔ یہاں کون آرام تھا۔ مصیبت اور تکلیف برداشت کرنے میں اب ہم طاق ہو گئے ہیں۔

اس وقت پولینڈ کی شہزادی کے دل پر آزاد کے حُسن نے ایسا اثر پیدا کیا کہ دل میں ٹھان لی چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو وے آزاد کو کلیرسا کے حوالے نہ کروں گی۔ آزاد کو صلاح دی کہ تم یہیں چھپ رہو، میں تم کو ایسی پوشیدہ جگہ پر مکان دوں گی کہ دنیا میں کوئی نہ بتا سکے گا۔ ہائے میں نے تم کو دیدہ و دانستہ ہاتھ سے کھویا۔ میرے غرور نے مجھے نیچا دکھایا۔ اب میں پچھتاتی ہوں۔ مگر گریۂ و زاری اور افسوس نہ غم سے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

اے کہ خواہی کز بلا جان واخری
جانِ خود را در تضرع آوری
با تضرّع باش تا شادان شوی

گریہ کُن تا بے دہان خندان شوی
کین تضرّع را ابر حقِ قدرہا ست
وان بہا کا نخاست زاری رانخاست
اے خوشا چشمے کہ آن گریان اوست
وے ہمایوں دل کہ آن بریان اوست
درپسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

مگر ہم نے عاقبت اندیشی سے کام نہیں لیا۔ اب اس کا نتیجہ دیکھا اب تم اپنی رائے بتاؤ۔ آزاد نے غور کے ساتھ جواب دیا کہ میرے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں میں دب کے اور چھپ کے نہ رہوں گا لڑوں گا اور جان دوں گا۔

ما عاشقیم کشتہ شدن اختیار ماست — شمشیرِ عشق تیز زسنگ مزار ماست
بے زخم تیغِ عشق زعالم بمنسرویم — بیرون شدن زمعرکہ بیزخم عار ماست

شہزادی نے ان کے استقلال اور جواں مردی کی تعریف کی۔

درجگرخواری وسربازی شمارا مثل نیست
برچنین مردانِ یکدل آفریں باد آفریں

اتنے میں خواجہ بدیع الزماں صاحب سامنے آئے اور آہستہ سے کہا خواجہ صاحب بہادر بھی آداب عرض کرتے ہیں۔ برادرا آنچہ این عورت پختہ کار و خام پارہ می گوید ست آنرا اتر گوش برائے مصلحت انداختہ، باز بیرون کن۔ فہمیدی برادر امن بدیعامن می گفتم اکنون وقت کہ شمارا لازم ہست، کہ انچہ او کند بران امر کہ او گوید گوش۔ مکن۔ دنیا و برو۔ شتاب شتاب۔

ساقیا ساقیا شراب شراب — مطربا مطربا رَباب رَباب
جانِ خواجہ بدیعِ رنگینِ فکر — پیارے آزاد رو برو بشتاب

گفتۂ خواجہ چون عسل شیریں است
روکش بنرد کان بادۂ ناب

آزاد نے جھلّا کر کہا خدا کی مار تم بے ایمان مسخرے پر انھیں شاعری سوجھی اور یہاں جان پر بنی ہے۔ شہزادی سے کہا پھر اب جو حکم ہو اُس کی پابندی کیجیے، وہ آزاد کو لے کر

ایک نئی عمارت میں گئیں اور وہاں بیٹھ کر خوب زار زار روئیں)۔ اب سُنیے کہ خوجی نے جاکے مس کلیرسا سے کہا کہ اگر آزاد تمھارے ساتھ آج ہی چلے گئے تو اچّھا نہ ہوگا۔ اُس کو یقین ہو جائے گا کہ سازش کی ہے ورنہ دس پانچ سوار پیادے تو ساتھ ہوں بہتر یہ ہے کہ مس کلیرسا اپنے کسی دوست کو لکھیں اور وہاں سے دس بارہ آدمی بھیج دیں۔

خوجی نے یہاں آن کر بیان کیا کہ مس کلیرسا آج کے آٹھویں روز جائیں گی، وہ روسی فوج سے کچھ آدمی منگوانے والی ہیں۔ شہزادی کو اس خبر سے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ آزاد کو وہیں ٹھہرایا۔ اور مس کلیرسا اور مس میڈا سے کہا کہ اگر کچھ ہرج نہ ہو تو آزاد کو ہم یہاں بلوائیں وہ تو خدا سے چاہتی تھیں دونوں نے اجازت دے دی۔ آزاد پاشا تشریف لائے اور ایک کُرسی پر بیٹھے۔

کلیرسا نے کہا، پھر بہن اب دعوت نہ کروگی۔ اب تک تو اور ہی فکر میں تھیں۔ اب بہنیں بہنیں ساتھ ہیں۔

ہیچ وجہ بنا شد فروغ مجلس انس
مگر بروے نگار و شراب انگوری

شہزادی نے فوراً شراب ناب منگوائی۔ آزاد کی روح لرزتی تھی کہ خدا ہی خیر کرے۔ مجھ سے بھی اسرار کریں گی مگر اب کی توبہ شکنی نہ ہوگی۔ مس میڈا نے ان پر نظر ڈالی اشاروں سے گفتگو کی۔ عاشق ومعشوق دونوں میں نظارہ بازی ہوئی۔ اُنھوں نے کہا۔

چہ قامتے کہ ز سر تا قدم ہمہ جانی | چہ صورتے کہ بہیچ آدمی نمی مانی
چہ صورتے کہ گلِ گلستان فردوسی | نہ قامتے کہ سہی سرد باغ بُستانی

آزاد: (ترکی زبان میں) بعد مدّت آج ایک بوسہ ملے گا۔

روز ہا رفت کہ دستِ من مسکین نگرفت
ساق شمشاد قدے ساعدِ سیم اندامی

میڈا: اب تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ ذرا تامّل کرو۔

روزے برسی بوصل حافظ
گرطاقتِ انتظار داری

شہزادی: آزاد تم کو سیبیریا کے برفستان جانا ہوگا۔ اِس وقت تم ایک قیدی ہو، مگر خاطر سے تم کو قریب بٹھا لیا ہے۔

آزاد : اتفاق وقت۔ ہم وہ جانباز لوگ ہیں جن کو شہنشاہ قریب جگہ دیں۔
کلیرسا: اس میں تو شک نہیں مگر تم کو نیچا دکھایا تو ہیں نے۔
مئیڈا: پہلے جب ہم نے خبر پائی تب ہم کو اس بات کا یقین نہیں آیا پھر اخباروں میں پڑھا کہ مس کلیرسا کو آزاد لے بھاگے
آزاد : اتفاق! ان سے خود دریافت کر لو۔ صرف ان کی چوٹیں بچائیں۔ شب کو مس کلیرسا اور مئیڈا نے ایک کمرے میں آرام کیا۔ اور شہزادی آزاد کو لے کر محل معلیٰ کے باہر آئی۔

زشعرِ حافظ شیراز میگو بند و میر قصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

اللہ اللہ! آج تو عجب بہار ہے کہ سیہ مستی معنی ناصیہ مضمون ہی سے آشکار ہے۔ الٰہی یہ صریر قلم ہے، یا صوتِ عنادلِ یا نغمہ سنجی مرغ سحر۔ یہ رگِ گل ہے یا مسطر۔ الفاظ و معانی، عاشق و معشوق کی طرح ہم آغوش ہیں، ہندوے مضامین رنگین، حلقہ بگوش ہیں۔ زلیخائے دل یوسف مدّعا سے ہمکنار ہے ہر درو دیوار و برگ و بار سے عیش و عشرت نمودار ہے۔ نور کا تڑکا صبح کا وقت سہانا۔ سماں سمک سے سَما اور ثریٰ سے ثریا تک بہجت و خوشی کے نشان۔ گلہائے نو دمیدہ کی جلوہ گری اور رعنائی۔ نسیمِ سحر باد نوروزی کی عالیہ سائی۔ نرگس۔ شہلا کی نگاہ بازیان سنبل کی زبان و رازیان بلبل رنگین گفتار کے ترانہ گل وردِ زبان نوجوانانِ چمن زبان حال سے مبارکباد گو اور غزل خوان طلیعۂ صبح نشاط ہے وقت طلوع خورشید انبساط ہے الٰہی یہ صبح ہے یا فروغ تجلّیات ربّانی یا مسبحان ملاءِ اعلٰے کا دلِ نورانی چمن میں گلہائے شگفتہ اور گلوں پر جو بن ہے۔ گلزار میں نور کا مسکن ہے۔ اس روزِ طرب افروز پر عید قربان ہو جائے۔ رضوان آئے تو بہشت کا نام زبان پر نہ لائے۔

مژدہ اے دل کہ دگر بازِ صبا باز آمد
ہدہد خوشخبر از طرفِ سَبا باز آمد
بر کش اے مرغ سحر نغمۂ داودی را
کہ سلیمانِ گل از طرفِ ہوا باز آمد
مردمی کرد و کرم بخت خدا دادہ من
کان بت سنگ دل از راہ وفا باز آمد

ناہج مناہج سِداد پاکیزہ مشرب فرخ نہاد میاں آزاد آزاد اَصنام سیمتن و نازک بدن کے عاشق دلدادہ۔ کئی دن مصیبت و تکلیف مالا یطاق اٹھا کر شب کو گدگدے بستر بر باآرام تمام

سوئے۔ دائیہ بہار رات بھر بادِ عنبر فشان کا پنکھا جھلتی تھی۔ سویرے منہ اندھیرے اُن کے رفیقِ قدیم و واجب التعظیم حضرت خواجہ بدیع الزماں، دگلے والی پلٹن کے کمیدان، افیم کی پینک میں غین۔ جھومتے ہوئے آئے۔ دیکھا مسہری پر بستر مکلف بچھا ہے۔ ادھر ادھر گل تکیے۔ مکان عشرت نشان، چوطرفہ لخلخہ و عنبر سازگی ہوئے خوش آتی ہے۔ دل کی کلی کھلی جاتی ہے۔ آزاد کو آرام میں دیکھ کر جناب باری کا شکریہ ادا کیا سربسجود ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آزاد کو جگایا۔ حضور والا اب آرام کر چکے اُٹھیے۔ آفتاب بر آمد ہوا ہے۔ خداوند دیر تک سونا نشانِ ادبار ہے۔ آزاد نے بستر چھوڑا۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور خوجی سے باتیں کرنے لگے کہ اتنے میں ایک کنیز نوجوان شکر دہان۔ خوش نگاہ غیرت مہر رشک ماہ، پری چھم، برق دم آئی اور آزاد کو دیکھ کر مسکرائی۔

دمے کان نوش لب چون غنچہ خندید
زشیرینی لبش چون قند چسپید

مسکرا کر کہا۔ حضور اب انعام دلوائیے تو ایک مژدۂ روح افزا سناؤں۔ آزاد نے ازراہ مذاق جواب دیا۔ اگر انعام دے کے مژدہ سنیں تو ہم سے زیادہ بے وقوف کوئی نہیں۔ ہم تو چتونوں سے تاڑ جاتے ہیں۔ مژدہ یہی ہے کہ تمھاری شہزادی نے تم کو ہماری خدمت کے لئے بھیجا ہوگا۔ ہم نے تم کو دل و جان سے قبول کیا۔ کنیز لطف رو کسی قدر لجا کر بولی۔ واہ ایسی قسمت ہم کہاں سے لائیں کہ حضور کی محلسرا میں جگہ پائیں۔ ہم نے شہزادی سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ با مذاق آدمی ہیں، بات چیت میں چھیڑ چھاڑ ضرور کریں گے۔ کسی بوڑھی لونڈی کو بھیجیے۔ اُنھوں نے ہمارا کہا نہ مانا۔ آخر وہی بات ہوئی نہ۔ خوجی نے کہا یار آزاد، واللہ ایسی چمکتی ہے کہ بے اختیار شادی کرنے کا شوق چراتا ہے۔ مگر تم سے یہ کہاں ممکن ہے، کہ ہماری سفارش کرو۔ ہم رند قلندر۔ تم پاشا۔ کجا راجہ بھوج کجا گنگوا تیلی۔ کجا افیون پاک کی چنبلی۔ اس تک بندی پر آزاد کو بڑی ہنسی آئی۔ خوجی اکڑ گیے کہ کیا قافیہ ملایا ہے۔ موزوں طبع ہو تو خواجہ بدیع کا سا۔

اتنے میں وہ کنیز شیریں زبان بلائے جسم و جان، عدوے دیں و ایمان بصد ناز معشوقانہ آکے بیٹھی، اور آزاد سے کہا کہ آپ کے لیے ایک پیغام لائی ہوں۔ مگر بہت پوشیدہ بات ہے۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو ایک گوشے میں چلے چلیے۔ تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر گل چیں کہیں خار سے ڈرا کرتے ہیں۔ آزاد بسم اللہ کہہ کر اس سنبل مو آتشیں رو کے ہمراہ ایک گوشے میں گیے تو اس پختہ کار چست و طرار نے گوہر مدعا کو سِلک بیان میں یوں پرو دیا۔ حضور سے زیادہ خوش نصیب ساری خدائی میں

کوئی نہیں ہے۔ کل ہی شب کو کل امور طے ہو گیے۔ مس کلیرسا کی آتش غضب کو ہماری سرکار کے ابر نیسانِ تدبیر نے گل کر دیا۔ اب وہ آپ کی دشمن نہیں۔ حضور نے ستم ڈھایا کہ ایسی بانکی اور مشہور دوشیزہ کی ضرب شمشیر شیر صولت اژدہا ہیبات کا جواب بوسۂ جان پرور سے دیا۔ عشق بازی اور بوسہ بازی کو جنگ و حرب سے کیا سروکار ہے۔ مگر حضور عاشق مزاج آدمی، خاتون کجکلاہ نوخیز و ناوک نگاہ پا کر رخسار رعنا اور چہرۂ زیبا کے بوسے لینے شروع کیے۔ جس وقت ذکر آتا ہے، جھیپ کر گردن نیوہڑا لیتی ہیں، بے ادبی معاف سیکڑوں گالیاں دیتی ہیں۔ دوسرا مژدہ یہ ہے کہ ہماری شہزادی کا آج آپ کے ساتھ بیاہ ہو گا۔ اسی وقت سے مشاقگان چابکدست و کامل فن سنوار رہی ہیں۔ آج کا جوبن دیکھنے کے قابل ہو گا۔ ایک تو اٹھتی جوانی، دوسری بحرِ عشق کی طغیانی، تیسرے خلقی مستی، اور عشرت پرستی۔ دلھنیں تو بہت دیکھیں۔ مگر ان کی سج دھج کو ملاحظہ فرمائیے گا کہ ایک ایک عضو بدن سے حسن بیحجاب و دلآویز سبک پرواز و بلا انگیز نظر آئے گا۔ عورت کیا چھلاوا ہے۔ پری ہے۔ ستم کا بانکپن، قیامت کی جلوہ گری ہے۔ گو وہ بھی عورت ہم بھی عورت، مگر بعض اوقات بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لیں۔ لب می رنگ، سحر آموز، سے لب ملا لیں۔ آزاد نے قہقہہ لگا کر بات اڑا دی تو کنیز گل چیں نے پھر کہا کہ حضور اس بات کو غلط نہ سمجھیں۔ لونڈی صحیح عرض کرتی ہے۔ آزاد سخت متحیر ہوئے۔ بارالہا یہ کیا اصرار ہے۔ کجا مس کلیرسا اور مس میڈا کی باتیں۔ کجا ان کے عشق کی گھاتیں۔ رات ہی بھر میں کایا پلٹ ہو گئی۔ کنیز شیریں حرکات سے کل باتیں دریافت کیں۔ کیسا نکاح۔ کس کا بیاہ۔ مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ رمز یہاں نہ کھلے گا۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ شہزادی شعلہ جولان پستہ دہان کے ایک خادم کے ہاتھ آزاد کے نام نگار ماہ لقا مس میڈا کا خط آیا۔ آزاد نے لفافہ پڑھا، چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ کھولا تو یہ مضمون نظر آیا۔ بنام آزاد پاشا۔

غارت ہیں صبر و طاقت و تاب و تواں تمام
اے ترک تو نے لوٹ لیا کارواں تمام

پیارے آزاد، تمہارے حسن جانفزا نے ہمارے خرمنِ دل پر وہ بجلیاں گرائیں کہ ہمیں خوب جانتے ہیں، یہ چیستان حل کرو۔ یہاں تو ایک ایک روز ایک ایک قرن کے برابر ہے۔ اب تمہاری جدائی کی تاب نہیں۔ مگر ایک نیا گل کھلا۔ آج پولینڈ کی شہزادی کے ساتھ تمہاری شادی ہو گی، اور قیامت کا سامنا یہ ہے کہ میں بدبخت بھی وہاں موجود ہوں گی۔ مگر افتاد۔ ہائے مجھ سے یہ ستم

کیوں کر سہا جائے گا۔

بندے کے لیے جو آفتیں ہیں   اے عشق تری کرامتیں ہیں
دو دن کی حیات پر فلک سے   کیا کیا شکوے شکائتیں ہیں

اللہ ری گردشِ زمانہ
ہر روز نئی مصیبتیں ہیں

لیکن مایوس نہ ہو جانا۔ دو دن کے بعد تم یہاں سے منزل مقصود پر پہونچ جاؤ گے۔ گو یہ دل لگی اور مذاق کا موقع نہیں کیونکہ تنور سینہ سے طوفان الم جوش زن ہے، اور ہر عضو بدن نخچیر تیر محن ہے۔ مگر اتنا ضرور لکھوں گی کہ تم یوں بھی اچھّے رہے، چاند سی بیوی پائی۔ پھر جوان جہان۔ نازک بدن، دھان پان۔ دیکھو آزاد کہیں ایسی غلطی نہ کرنا کہ انکار کرو۔ ورنہ وہ شعلہ قامت، قیامت بپا کرے گی۔ میں سوچتی ہوں کہ میں اپنی آنکھوں سے کیوں کر دیکھ سکوں گی مگر مجبوری ہے۔ اپنے مسخرے خوجی کو کسی وقت بھیج دینا۔ اب شام کو تو ملاقات ہووے ہی گی۔ مگر اُس وقت دولھا بنے ہوگے۔ دماغ کاہے کو ملیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے ہاتھ ہی سے جاؤ۔ خدا خیر کرے۔
مس میڈا کا خط پڑھ کر شک کی جگہ یقین کامل ہوا کہ کنیز کا صبح کا پیغام صحیح ہے۔ لیکن حیرت اور زیادہ ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی ہی بات ہے جس کو مخفی رکھا۔ خوجی کو خط پڑھ کر سنایا، تو مچھئی ہنسنے لگے۔ فرمایا کہ بھائی جان تڑکے تڑکے آیا۔ کس لیے تھا صبح کو میں نے دیوان حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا۔

زشعرِ حافظ شیراز می گویند و میر قصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

بس فوراً سجدہ کیا، اور جناب باری کی درگاہ میں دعا مانگی کہ چاہے جو ہو اس زندانِ بلاخیز سے جلد نجات ملے۔ بس حافظ جی کی رائے پر چلیے، وہ جو حکم دیں۔

بمئی سجّادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بےخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

حافظ نے اسی غزل میں جو فال میں نکلی تھی۔ کل باتیں ہمیں بتادی ہیں۔ کوئی شعر بے کار نہیں ہے۔ سنیے۔

دل اندر زلفِ لیلیٰ بند و کارِ عشق مجنون کن
کہ عاشق را زیان دارد مقالاتِ خردمندی

اب شراب نہ پینا خردمندی ہے۔ مگر یہ خردمندی، جی زبان یعنی نقصان پہونچائے گی۔ لہذا اُس کو چھوڑو، اور جام پر جام لو۔ جو حافظ حکم دے وہ کرو۔

ع ۔ کہ سالک بیخبر نبود زراہ ورسم منزلہا

دعائے صبح وشام تو کلید گنج مقصود است

بایں راہ وروش میستو کہ بادلدار بیوندی

سمجھے؟ کیا صاف حکم دے رہا ہے۔ لسان الغیب خافظِ شیراز معرکہ سخن کا یکہ تاز تھا۔ ایک روز شاہ کج کلاہ ایران کی کوئی شے گم ہوگئی۔ دیوان حافظ منگوا کر فال دیکھی۔ تو یہ شعر نکلا۔

بفروغ چہرہ زلفت ہمہ شب زندہ دل

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اور جس لونڈی نے وہ شے چرائی تھی اُسی کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ حضرت سلامت آپ ابھی بچے ہیں۔ آزاد نے پوچھا آپ کی فال کی غزل کا مطلع کیا ہے۔ خوجی نے مطلع پڑھا۔

سحر با او دمی گفتم حدیث آرزومندی

خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

اور ساتویں صفحے کے شعر نے تو واللہ پھڑکا ہی دیا۔ اُستاد واللہ۔

صبح است وژالہ میچکد از ابر بہمنی

برگ صبوح ساز و بزن جام یک منی

کیوں ہے اچھا مطلع کہ نہیں۔ شادی کی شادی ہوئی، اور بھاگ جانے کی سبیل بھی نکلی۔ تم مزے میں رہے، ارے یار کوئی لونڈی باندی مِن بدیع راہم باید دہا بند کرد۔ اینکہ روبرو ہست قابل و لایق مِن بدیع ہست۔ آزاد نے اس خوش سلیقہ ورنگین طبع کنیرک سے کہا کہ ہمارے دوست خواجہ صاحب کا آپ پر بے طور دل آیا ہے، اور شادی کا شوق چرّایا ہے۔ اس پر کالۂ آتش نے بھڑک کر جواب دیا۔ اے واہ۔ اچھے آئے۔ پہلے اپنی صورت تو دیکھو میاں۔ ایڑی چوٹی پر ایسے موے جو نے ٹکے کو قربان کردوں۔ موئے خبیث کی باتیں سنو۔ ہم اچھے اچھوں پر نظر نہیں ڈالتے۔ یہ نگوڑا وہاں سے بڑا وہ بن کے آیا ہے۔ یہ اور مجھ سے چھیڑ چھاڑ۔ اے تیری قدرت۔

آزاد ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیے۔ خوجی کے غصّے کا پارہ ایک سوتیس درجے پر پہونچا۔

بہت بگڑے ہونھ۔ کیا شانِ خدا ہے۔ مصر میں جس طرف سے ہم نکل جاتے تھے امیر اور غریب سب کی عورتیں گھورنے لگتی تھیں۔ اچھی اچھی رئیس زادیاں انگلیاں اٹھاتی تھیں۔ اُنھوں نے ڈپٹنا شروع کیا۔ اکثر محاورے تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آئے۔ مس روز ہزار جان سے عاشق ہوگئیں۔ مس میڈا بھی۔

خیر۔ اب اس کا ذکر ہی کیا ہے۔ جو عورت دیکھتی ہے نہ دل سے عاشق ہو جاتی ہے۔ ایک عورت نے جو ہم پر عاشق تھی۔ اپنی کئی ہمجولیوں سے کہا کہ:

زلف کو دیکھ کے سنبل ہے پریشان کیسا
اُس کا منھ دیکھ کے آئینہ ہے حیران کیسا
تم کو اے قافلہ والو مۂ کنعان کی قسم
میرے یوسف کا یہ ہے چاہِ زنخدان کیسا
قامتِ سرو پہ ہے ناز تجھے اے قمری
دیکھ تو ہے یہ مرا سروِ خراماں کیسا
میں نے آنکھوں سے نہ دیکھا نہ چھوا ہونٹوں سے
کیا بتاؤں کہ ہے وہ سیب زنخداں کیسا

یہ ہماری شان میں کہا تھا' اور جس پری پیکر عورت نے کہا تھا کم سن اور خوبصورت۔ کوئی سینتالیسواں سال تھا' اور گندم گوں حسن برشتہ۔ مگر ہم درویش قلندر۔ ہمیں ان باتوں سے کیا واسطہ رہا ہے برو کا ہے بخور۔ بس۔

عطر مٹی کا لگایا چاہیئے پوشاک میں
خاک سے رغبت رہے ملنا ہے آخر خاک میں

کنیزک: کیا کچھ خلل دماغ ہے۔ نہیں اللہ جانتا ہے۔ یہ سودائی ہیں کل ایک درخت کے سایے میں کھڑے ہو کر درخت کو گالیاں دے رہے تھے۔

آزاد: ہاں کیوں خواجہ صاحب یہ صحیح ہے۔ آپ کو واللہ؟

خوجی: اجی میں چلا آتا تھا۔ ایک جانور نے تاک کر بیٹ کر دی' اور مجھے معاً شک گزرا کہ بمبئی کا بہروپیا ہے۔ پلٹ کے میں نے غل مچایا۔ بھلا بے گیدی۔ بھلا۔ اچھا بچہ۔ سمجھا جائے گا۔ کیا بچے نہ آؤ گے۔ دیکھا تو جانور۔ ارے مگر اُستاد۔ آثار برے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گیدی کا یہاں بھی گزر ہوا۔ یہاں حلال ہی کر ڈالوں گا۔ ارے یار تم نے قرولی نہ منگوا دی۔ واللہ قرولی منگوا دو

تو لاش پھڑکتی ہو۔

آزاد: خدا خیر کرے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ یہاں کی آب و ہوا راس آئی قرولی بھولی، مگر پھر جنون حضور کے کلّے پر سوار ہوا۔

خوجی: جناب سُنیے چاہے پاگل کہیے چاہے سڑی سودائی۔

ع۔ محبت میں سبھی یکساں ہیں جس کی جس سے بن آئی۔

بند قبا جو کھولے تو اے رشکِ آفتاب

کیوں کر نہ اپنی جیب کے ٹکڑے اڑائے صبح

اتنے میں عرب آئی۔ مصافحہ کیا، اور عربی زبان میں کہا کہ خدمت کے لئے دس خدمتگار، بیس سپاہی، اور دس کنیزیں حاضر ہیں جن میں ایک یہ بھی شامل ہیں۔ کنیز خوش تمیز یہ سُن کر مُسکرائی۔ کہا لیجیے حضور اب خدمت میں قبول کیجیے لونڈی حاضر ہے۔ تھوڑی دیر میں آزاد کے واسطے لباس بیش بہا بھیجا گیا، اور لونڈیوں نے ہر شے کو قرینے سے رکھا۔

اُس وقت آزاد کی طبیعت انتہا کی بشاش تھی، جس وقت اُس بُتِ یوسف جمال، و مشتری خصال کا چاند سا مکھڑا یاد آتا تھا کِھلے جاتے تھے۔ اللہ اللہ ایسی بلقیس مرتبت شہزادی، اور ہمارے عقد نکاح میں آئے۔ گردن فوارۂ نور ہے۔ یا شمع کافور۔ عارض رنگیں گل تر ہیں، یا رشکِ قمر۔ نزاکت نازک کمری کے صدقے ہو جائیے۔ حُسن تجلّی پر تو شاہدانِ چگل کو شرمائے۔ خوجی سے کہا اب سینہ فرطِ خوشی سے باغ باغ ہے اور فلکُ الافلاک پر دماغ ہے۔

چمن میں کیجے اشارہ جو سوئے نخلِ حنا

تو ساتھ اشارے کے اُنگلی برنگ مرجان ہے

ریاض دہر میں پھریے تو سائے کی صورت

مرادِ دل کے عقب آرزو شتابان ہے

چمن میں بات جو کیجے تو مُنھ سے پھول جھڑیں

اب اِن دنوں میں یہ فیض بہار بُستان ہے

زمیں پہ دانہ جو پھینکا تو گر کے نخل ہوا

نمو کی سعی سے صیاد سخت حیران ہے

کہیں ہے آئینے سے صاف تر زمینِ چمن

کہ اس سے سبزۂ نارستہ تک نمایاں ہے

پڑا ہے عکس یہ پُتلی کا وقت نظّارہ

جو داغِ لالہ میں کہتا ہے عین بہتان ہے

نہالِ گلشنِ تصویر بھی ثمر لائیں

بہار کا چمنِ دہر میں یہ فرمان ہے

خوجی نے کہا بھائی جان وہ جو حافظ شیرازی نے کہا ہے وہی ہو گا۔

یہ شعرِ حافظِ شیراز می گویند و می رقصند

سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

تمھارے بخت جوان نے یاوری کی۔ اب کیا پوچھتے ہو۔ آج کی رات عمر بھر یاد رہے گی۔ کن کن مصائب کے بعد یہ روزِ عشرت افروز نصیب ہوا۔ آزاد نے ہنس کر جواب دیا۔ بھائی ایسا نہ ہو کہ ہم یہاں ہی کے ہو رہیں۔ مگر اب طرح طرح کی فکریں دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر شادی ہوئی تو پھر چھوڑ کے بھاگ جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ وضع کے بھی خلاف ہے۔ اہلِ آبرو ایسے امور سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور بغیر شادی کے چارہ نہیں اور بھائی سچ یوں ہے کہ اب تو اگر شادی نہ ہو تو ستم ہو جائے خیر فہمیدہ خواہد شد۔ اگر زندگی ہے تو حُسن آرا بیچاری سے ضرور ملیں گے۔ ہائے عرصۂ دراز سے کوئی خط نہیں آیا۔ اور نہ ہم نے کوئی خط بھیجا۔ اس کے بعد مس میڈا کے خط کا جواب یوں لکھا۔

اے راحتِ جانِ بے قرارم	اُمّیدِ دلِ امید وارم
شادم بنعمت کہ در ہمہ حال	سوزِ غمِ تست سازگارم
تا رفتہ از کنارم اے دوست	یکبار ز عیش بر کنارم
تا مرگ نگیردم گریبان	من دست ز دامنت ندارم
چون ہیچ نشد بسعی حاصل	کام دلِ خستہ و فگارم
آن بہ کہ ز صبر رُخ نتابم	باشد کہ مراد دل بیابم

جانِ آزاد۔ تم پہیلیاں بُجھواتی ہو، اور میں اس مرض کا توتا نہیں پالتا۔ واسطے خدا کے بتاؤ تو سبب کیا ہے۔ شام کو کچھ باتیں ہوئی تھیں۔ اس وقت کچھ اور ہی خبر سُننے میں آئی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گُل کھلا ہے۔

سر فتنہ دارد دگر روزگار　　من و مستی و فتنہ چشم یار

جو امر تم نے لکھا وہ طوعاً و کرہاً منظور کرنا پڑا۔ آزاد۔

پری پیکر شہزادی اور آزاد کی شادی

بیا ساقی آن می کہ حور بہشت　　عبیر ملائک در ان می سرشت

بیا ساقی آن مے کہ تبریزی کند　　بباغ دلم مشک بیزی کند

بیا ساقی آن آتش تابناک　　کہ زردشت می جویدش زیر خاک

بیا ساقی اکنون کہ شد چون بہشت　　ز روے تو این بزم عنبر سرشت

بیا ساقی آن مے کہ شاہی دہد　　بپاکی او دل گواہی دہد

بیا ساقی از بادہائے کہن　　زجام پیاپی مرا مست کن

چو مستم کنی از مے بی غشت

بمستی بگویم سرود خوشت

ساغر سرشار ہو، اور رطل گران ہو۔ بغل میں نگار مشتری عذار ہو، اور طبع جوان ہو تو زیبا عروس رنگین مضمون اپنے حسن بیباک، و خدا آفریں پر کہاں تک نہ اترائے۔ شاہد دلربائی معانی اصنام سیم اندام قرخار کو کیوں کر نہ شرمائے۔ کرنگ سرنگ، خامہ مزاج، نوجوانان نوخیز کی طرح بلون پر ہے۔ فرط مستی سے اٹھکھیلیوں پر ہے۔ ہنگام خرام ناز معشوقوں کی جلوہ گری ہے۔ گلگون خامہ کیا وطین ہے۔ پرستان کی پری ہے، چکاروں کی سی چھل بل، ابر کی سی مستانہ چال ہے۔ سرعت میں برق جہندہ بلند پروازی میں عنقائے رنگین پر و بال، اور کیون نہ ہو آزاد فرخ نہاد کی شادی کتخدائی کا مضمون معرض بیان میں لاتا ہے۔ صفحۂ قرطاس کو نگار خانۂ ارژنگ بناتا ہے۔

اب سنیے کہ پولینڈ کی طاؤس زیب، اور دل فریب شہزادی ہر ہفت آرایش سے مشین، اور حلی پیرایش سے مزین ہوئی۔ ایک تو یوں ہی جوبن، اور جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ دوسرے مشاطگان کامل فن نے آتش حسن کو اور بھی بھڑکا دیا۔

یکے خود خوبرو بودی دگر آراستی خود را

بنا معلوم شد مارا کہ قصد جان ما داری

آج غضب کا سامنا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ دیکھیں یہ حُسنِ گلو سوز اور نور گیتی فروز کیا قیامت ڈھاتا ہے۔ آزاد کو خدا بچائے۔ اس محبوب مرغوب کا فریدکیش کی زلفِ چلیپا کے دام میں نہ پھنسائے۔ اس وقت تو معشوقہ دلربا، حُسن آرا اور ناظورۂ سرو بالا مِس مِیڈا کا حُسن بھی اس سمن عارض کے مقابل میں ماند ہے۔ انسان کا مکھڑا کیسا صاف چاند ہے۔ صدہا لالہ رُخسار اور گلِ عذار سہیلیاں جلو میں تھیں۔ سب کم سن نوجوان۔ ملک فریب، غنچہ دہان آفتاب جلوہ، جادو نگاہ۔ نسرین بدن غیرتِ ماہ۔ فوق البھڑک لباس زیب بر۔ زرّین کمر۔ کسی کی پوشاک دھانی، کسی کی ارغوانی، کسی کا لباس آبی کسی کا گلابی۔

ہے لطف حسینوں کی دورنگی کی امانت
دو چار گلابی ہوں تو دو چار بسنتی

ایوان کیوان تمثال کی تیاری کی توصیف میں زبانِ ناطقہ لال۔ جو شے تھی عدیم السہیم فقید المثال۔ اقمشۂ گوناگوں۔ اشیائے بوقلموں، قاقم و سنجاب، پرنیان و کمخواب ہی ہر سمت نظر آتا تھا۔ آنکھوں نے نور پایا تو کانوں نے سرور۔

محل عشرت منزل سے دو میل تک سڑک پر پانی کے عوض کیوڑے کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔ کیاریاں خوب سینچی گئی تھیں۔ بیچ میں لال لال سڑک ادھر ادھر سرسبز دوب کی لہک۔ اشجار پربہار پر میوے ہوا سے جھونکے کھاتے تھے۔ زمین کو بارآوری کے سبب سے بار بار چوم جاتے تھے۔ یا یوں کہیں کہ سجدۂ خالق بجالاتے تھے کہ ایسی گل زمیں میں جگہ پائی۔ چہرہ پرداز عروس ایجاد اور گدیور گلشنِ کون و فساد۔ اس زمین مینو آئین کو رشکِ گلزار ارم بنایا تھا۔ باغ نعیم سے زیادہ مرتبہ پایا تھا۔ کہسار پر گلزار، اور گلزار میں بہار، اور بہار میں پریوں کا نکھار، اور اس نکھار پر حوریان بہشتی دل و جان سے نثار۔ کہیں تدرو کا خندۂ سرشار۔ کہیں روح افزا صورتِ ہزار۔ کہیں موربلوں کی جھنکار۔ کہیں پپیہوں کی پکار کوٹھی کے سامنے حوضِ لطیف و صفا پرور رد کشِ تسنیم و کوثر، بے نظیر، لطافت تخمیر سورۂ کوثر کی تفسیر۔ انزلنا من السماء ماء کا مضمون اس حوض سلسبیل سلامت سے آشکار تھا۔ بانی مومیائی دل شکستہ، مرہم جگر فگار تھا۔

ہمیشہ در دہنِ کوثر آب مے گردد
ازاں کہ از لبِ حوضش کنند حسرت باد

باغ مینو سرشت کی گلریزی۔ باد غالیہ سا کی عطر بیزی۔ آب حوض کی روانی۔ عنادل کی

شیوا بیانی۔ گلوں کی رنگینی، شاخوں کی بہار آفرینی۔ یہ سامانِ طرب، وہ لطف دکھاتا تھا کہ غنچۂ دل کھلا جاتا تھا۔ جدھر دیکھو لالی تمیں، جدھر نظر ڈالو جواہر رنگین۔ حاصل کان وقرۃ العین عمان نے یہاں قدر پائی۔ لولوے لالا اور مروارید غلطان کی یہاں کی کنیزان لالہ رخسار، گل عذار نے وقعت بڑھائی۔ الٰہی یہ یاقوت ہے، یا پر پریخانِ چگل کا لعل نوشخند۔ یہ مروارید ہیں یا خماج سحاب۔ مشکین پرند۔ چپہ چپہ صاف و پاک۔ خس نہ خاشاک۔

نور فروغِ صفا آب رُخِ کار او

روشنی آفتاب سایۂ دیوار او

یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایوانِ فلک سائبان کو معمارانِ ساحر نے جادو کے زور سے بنایا ہے۔ سحرِ بابل کو شرمایا ہے۔ مکان کیا صفو تکدہ دلکشا ہے۔ نگارستان روح افزا ہے۔ عیش کا کاشانہ ہے۔ صنم کدہ ہے۔ پری خانہ ہے، اس نزہت کدہ فردوس زیب صنّاعی اور رنگ آمیزی، آب و تاب، جاویدہ اور دلآویزی سے خدا کی قدرت مجسّم نظر آتی تھی۔ عقل تک بحر حیرت میں غوطے پر غوطے کھاتی تھی کہ یا للعجب، یہ مکان ہے، یا پری ہے۔ صنّاعی ہے، یا جادوگری ہے۔ سحرِ سامری مات ہے۔ کشف ہے کرامات ہے۔

چہ روضہ ایست خدایا کہ رفت از یادش

خیال گلشنِ فردوس از دلِ زہاد

زعرش بال و پر افشاں فرود می آیند

پے زیارت آن قدسیان پاک نہاد

صفائے مرمر صحنش چگونہ شرح دہم

کہ تیرگی برواز چشم کورِ مادرزاد

شعاعِ شمسۂ آن گر فتد بروے قمر

دگر ز قید کلف چہرہ اش شود آزاد

بہر کجا کہ بود نامرادی اندر دہر

بان خجستہ حرم چون رسد رسد بمراد

کجاست دارا لامانی چو آن بزیر سپہر

کہ از حوادث دور سپہر ایمن باد

غنی شدہ است ز تعمیرش آنچنان مزدور
کہ گنجہا بہ سرِ یکدگر زِ مزد نہاد

اب سُنیے کہ مصاحبِ مجالس سدا و امیر اعلیٰ نژاد، میاں آزاد فرخ نہاد کا بحرِ عشق جوش زن تھا۔ ایک ایک گھڑی ایک ایک سال کے برابر گزرتی تھی؛ دعا مانگتے تھے کہ بار خدایا کہیں جلد شام ہو۔ عروسِ عدن تختۂ سیمیں فلک پر جلوہ افگن ہو۔ برق دم دولھا بغل میں پر پچھم دُلھن ہو۔ اب تو نشۂ بادۂ عشق میں بجز وصالِ محبوبِ زہرہ رُخ جادو جمال اور کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

مست مستان دگر از ساغر سرشار شدم
نشہ آمد بسرِ کار و من از کار شدم
ہمہ از بام و درش ظلمت عصیان میریخت
چون بطاعتکدۂ شیخ سیہ کار شدم
بخط ساغرِ می خطِ غلامی دارم
فارغ از کشمکشِ سبحہ و زنار شدم
چہ قدر خندہ بر آزادی سیمرغ زدم
بخمِ دام تو آندم کہ گرفتار شدم
توبہ از بادہ در آغاز جوانی کردم
اول مستی من بود کہ ہشیار شدم

اتنے میں خواجہ صاحب بدیع الزماں کرم پھوڑ، کم بختی کے نشان، لڑھکتے ہوئے آئے۔ السّلام۔ والسّلام۔ بندگی عرض ہے حضرت۔

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

آج آپ کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ ارے یار کچھ نہ پوچھو۔ وہ ٹھاٹھ اور وہ تیاریاں ہیں کہ بس دیکھنے سے تعلق ہے۔ کنیزانِ بلوریں رُخ پر وہ جوبن ہے کہ بھئی واللہ ابھی مذہب سے ہاتھ دھوتا ہوں۔ اور اُن کا بندہ ہوتا ہوں۔ ہائے ہائے جوان جوان، گوری گوری لونڈیاں، پوشاک زرّیں میں غرق۔ سَاق سیمیں، سینہ بلوریں، رخ رنگین۔ بھائی خدارا کسی کے ساتھ تو مِن بدیع کی بھی شادی ہو جائے۔ اللہ اللہ ایسی ایسی چنچل، شوخ، چلبلی، دیکھنے میں آئیں کہ

دل بے قابو ہو گیا تو من شدی من تو ہو گیا۔ اس تُک بندی پر آزاد بڑی دیر تک ہنسا کیے۔ مگر تعجب ہے کہ ابھی تک کوئی بے تُکا شعر حضرت کی زبانِ مبارک سے نہیں نکلا' آزاد نے کہا حضرت یہاں تو دست بدعا ہیں کہ کہیں جلد شام ہو تو اُس گل پیرہن سے نوبتِ بوس و کنار آئے۔ دولہا آزاد ہو دُلہن منھ مانگی مراد پائے۔ اب قرار اور چین نہیں۔

پردۂ طاقت و قرار مرا — کردۂ خون دل فگار مرا

من فدایت نسیم صبح گہی — بدرِ او رسان غبار مرا

انشاء اللہ۔ اب تھوڑی ہی دیر ہے۔ مگر دل گواہی دیتا ہے کہ آج کا حُسن ہمیں کہیں کا نہ رکھے گا' آپ کا جوبن آفت ڈھائے گا۔

خوجی نے کہا بھائی جان للہ ہماری کچھ فکر کرو۔ دل ہاتھ سے جاتا ہے' اب دل پر قابو نہیں رہا۔ یہاں قسم خدا کی کوئی ڈیڑھ سو کے قریب پرستارانِ لالہ غدار نسیم بدن' بلوریں زقن نازک کمر' پری پیکر دیکھیں' اور ایسی حسینہ و جمیلہ کہ بھوک پیاس صورت دیکھتے ہی فقرد ہو۔ اور ان سب باتوں پر طرّہ یہ کہ رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک گدبدی و بنگی نوخیز نے قریب آن کر اس زنّاٹے سے ٹیپ جمائی کہ کھوپڑی ہی جانتی ہے۔ مگر جی خوش ہو گیا کہ اس قابل تو ہوئے' اور جتنی تھیں سب یہی کہتی تھیں کہ وہ آزاد کے ابّا جان آئے ہیں۔ آزاد نے مُسکرا کر کہا بڑے شریر ہو۔ ان باتوں پر میرے ہاتھ سے ایک دن پٹو گے۔

خوجی: اچھا پھر ہم اب کس کے ساتھ شادی کریں۔ فرمائیے۔

آزاد: تم کو کوئی پوچھتا بھی ہے کہ شادی ہی کرو گے۔ چلے وہاں سے۔

خوجی: گستاخی معاف ہو' تو عرض کروں۔ بس روز کس پر پھسل پڑی تھی۔ مصر کی پریوں کی آنکھ کس سے لڑی تھی۔ آداب' جھینپے تو نہ ہو گے۔ اب شرماؤ' ذرا چلے وہاں سے وہ بن کے۔ یہاں یہ حُسن اور کندنی رنگ کسی کو نصیب کہاں ہوتا ہے۔

یہی بیداد ہے تو حشر کو ہم تم اے یار
دیکھ لینا کہ اٹھے دست و گریباں کیونکر

راوی: الحمد للہ۔ البتہ ایک شعر حسب حال پڑھ دیا۔ شاباش۔

آزاد: اچھا ہماری شادی ہوئے تو پھر کسی لیے پالک کے ساتھ فکر کر دیں' ذرا دو ایک روز تامل کرو۔ پچاسوں مل جائیں گی۔ تم تو جلد باز آدمی ہو بھئی۔ اور ہمیں آج اپنی شادی کی فکر ہے۔

خوجی: ارے یار ہمارے پیٹ میں چوہے چھوٹے ہوئے ہیں بھائی۔
آزاد: معقول پیٹ کیا چوہے دان ہے۔ کیا فرمائشی پیٹ ہے۔
خوجی: بھلا کمیدان صاحب اور ایسے خوبرو' اور جوان رعنا' اور بے پالک کے ساتھ شادی ہو اگر کوئی ماہ رو ہو تو یوں بھی سہی مگر سن چالیس برس سے زیادہ نہ ہو ورنہ۔

اُدھر رقیب ہوں' وہ ہوں اشارہ بازی ہو
اِدھر بھی دیکھ لیں اتنا انھیں خیال نہیں

یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ جناب قبلہ و کعبہ دو جہاں سلامت باشند۔
راوی: سُبحان اللہ۔ بات کیسی' پورا القاب لکھ گئے' اس وحشت کے قربان۔ آدمی میں حواس ہی حواس تو ہیں اور ہے ہی کیا۔
خوجی: خدا تم کو شادی مبارک کرے چین کرو۔ لطف اُٹھاؤ۔

تا صحن گلشن است ملالت زدای دل — تا صوتِ بُلبُل است طراوت فزای دل
بزم تو باد غیرت گلشن ز اہتزاز — خواجہ درو چو چہچہہ خوش رشکِ بُلبلان

آزاد: تسلیم۔ اب کیا وقت ہوگا۔

چون گوش روزہ دار بر اللہ اکبر است۔

مگر وہ بھی منتظر اور بے قرار ہوں گی۔ مار لیا ہے انشاء اللہ۔
خوجی: وقت کیا پوچھتے ہو' دیر آید درست آید۔ ہماری دُعا ہے کہ حق تعالےٰ تم کو میمون کرے۔ واللہ نہ دل سے خواجہ بدیع یہی دعا مانگتے ہیں۔
آزاد: تم کو خود خدا میموں کرے۔ شرارت سے نہیں چوکتے تم۔ خوجی بولے اب آج تو ہنسی' دل لگی چہل مذاق کا دن ہے

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

جس دن قید خانے تمہارے دشمن بھیجے گئے تھے۔ بھلا کوئی کہہ سکتا تھا کہ تم اس مہ پارہ کے میاں بنو گے۔ جس وقت مس میڈا اور مس کلیرسا کے ساتھ پکڑے گیے دل کی کیا کیفیت تھی۔ اجل ہر در و دیوار سے نظر آتی تھی یا نہیں۔ مگر آج خدا کے فضل سے دولھا بنے ہو۔ مخملِ کاشانی بیش بہا کے بستر پر آرام کرو گے۔ گل تکیے اور چار بالش اور پرند چینی اور ختائی اور دیبا اور سمور ہر سمت

ہفت اقلیم کا سامان شادی بہم ہوگا۔ طیور ذی شعور ہنگام صبح سر بالیں چہک رہے ہوں گے۔ بستر کے اِدھر اُدھر انواع و اقسام کے پھول مہک رہے ہوں گے۔ طیور خوش الحان گلزار بہشت کے مرغانِ اولی الاجنحہ کو رنگین گفتاری میں مات کر دے گی' اور باد صبا کے ہر عنبر بار و مشک بیز جھونکے کے ساتھ روضۂ رضوان کی لپٹیں آتی ہوں گی۔ خواسون ادر مغلانیوں' اور مہریوں اور حبشنوں کے عوض روس اور پولینڈ کی نازک اندام و صنوبر خرام عورتیں نظر آئیں گی۔

آزاد نے آہ سرد بھر کر جواب دیا۔ یار تم سے کیا کہیں طرح طرح کے خیالات دل میں جگہ پاتے ہیں۔ خدا جانے کون کون بُتانِ ہند یاد آتے ہیں۔ محبوب محجوب و دلربا پیاری حُسن آرا ہر دم نظر کے سامنے رہتی ہیں۔ اس ناز و انداز کی تصویر صفحۂ دل پر مرقسم ہے۔ وہ بات بات پر زیر لب مسکرانا۔ کبھی لجانا کبھی شرمانا۔ کبھی گورے گورے ہاتھوں سے سفید سفید مزے دار مشکبو بیڑے کھلانا۔ کبھی ہنسی ہنسی میں روٹھ جانا۔ کبھی گلے میں ہاتھ ڈال کر منانا۔

ع۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

خدا اس کی صورتِ زیبا دکھائے۔

من این مراد بہ بینم بعمر خود کہ تبے
بجائے اشک رواں در کنار من باشی

خیر سمجھا جائے گا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ مگر آج ایک بڑا ابرا سامنا ہے۔ آزاد کی زبان سے یہ لفظ نکلا ہی تھا کہ خوجی نے للکارا۔ او گیدی خبردار آج کے روز سعید ایسا لفظ زبان پر نہ لانا (برا) کیا معنی آج ہر سمت بھلا ہی نظر آتا ہے۔ مزاج مارے خوشی کے تختۂ زعفرانِ کشمیر ہوا جاتا ہے۔ اور تم زبان پر ایسے منحوس کلمات لاتے ہو' اور مجھ پیر فرتوت کو مفت میں جلاتے ہو۔

ع۔ مزن فالِ بد کارد حالِ بد۔

ہندوستان میں ہوتے تو اس وقت زنان خانے میں ڈومنیاں گاتی ہوتیں اور باہر ارباب نشاط کی دھما چوکڑی' اور پریوں کے جھرمٹ سے پرستان کا دھوکا ہوتا۔

بہار گائیو مطرب جہان گلستان ہے — پیالہ دیجیو ساقی کہ جوشِ باران ہے
نسیم پھرتی ہے مانند خضر کہتی ہوئی — کہ دستِ شاخ میں گل جام آب حیوان ہے

اتنے میں لیلائے شب زلف عنبرین کھولے ہوئے آئی۔ انجم و اختر نے خواصوں میں جگہ پائی' اور ضیغم نیستان شجاعت' ہزبر بیشہ بسالت ضرغام ظلمت باریک دم کوتاہ سم کی پشت پر آئے۔

خوجی چو بر اسپ عربی بر نشست | آمدہ بر فوج غزالان شکست
اسپ چہ اسپ اشہب بادِ صبا | اسپ بگوشہ رُخ گلگون قبا
اسپ ہابین شوخی دلچسپ ۔ کو | حور بگو اسپ مگو اسپ ۔ کو
پیش رو جوستِ طبع سلیم | گام نہد بر بر و دوش نسیم

خوش خرام۔ زرین لگام ۔عربی نژاد۔ صبا نہاد۔

از تعل او پُرمہ زمین وز گام او کوتہ زمین

ز آہنگ او آگہہ زمین در قلبت خالی غضب

باد بہاری خو بش او نادر و جولان کیش او

صحرا و دریا پیش او چون مہرہ پیش بو العجب

خنلی عنقا شکوہ پر یہ شیر دل شیر مرد حُسن خدا داد۔ میں بے نظیر جمال مبین میں فرد اس شان برنائی سے بیٹھا تھا کہ فغفور چین حاشیہ برداری کرتے ۔ خاقان ختن چاکری کا دم بھرتے۔ گھوڑا اچھلبل دکھاتا تھا زمین سے اڑا جاتا تھا۔ سعادت جلو میں تھی ظفر رکاب کو بار بار چومتی تھی۔ آزاد کجکلاہ بڑے عز و جاہ سے اس غیرت ماہ کے درِ دولت پر داخل ہوئے۔

خوجی نے کہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور آزاد فرشتہ نہاد پشت توسن سے اترے معاً چپاس اتوا پ اتر در دہان کی سلامی اڑائی گئی خوجی اس وقت جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے غنچہ گل کی طرح کھلے جاتے تھے درِ دولت پر با آواز بلند یہ شعر پڑھا۔

سرم بہ سجدۂ بہر در فرو نمی آید

بہ آستان تو نازم کہ آسمان خیز ست

وہاں جا کر دُلھن کو دیکھا تو سبحان اللہ سبحان اللہ۔

وصف رخسار تو گفتم سخنم رنگین شد

از لبت حرف نوشتم خط من شیریں شد

نازآفریں ۔ زہرہ جبیں ۔ گیسو کمند یوسف جمال ۔ خوش کلام شیریں مقال ۔ غارتگر صبر و ہوش ۔ آفت توبہ نصوح ۔ نمکپاش زخم سینۂ مجروح ۔ سنبل ہندوے زلفِ عنبر بو مردِ آزاد بندۂ قامت دلجو ۔ نرگس شہلا گرفتار چشم جادو در دندان سے گوہر خوش آب خجل ۔ چشم مست سے شراب ناب منفعل ۔ قلب شکن لشکر حواس و ہوش ۔ بلائے بے درمان ستم کوش ۔ لاکھوں میں انتخاب

کروڑوں میں لاجواب۔

یوں تو جو گل ہے خوب ہے لیکن
تیرا اے گلعذار کیا کہنا

مِس پالن

ایک پادری صاحب جن کی عمر اسّی سے تجاوز کر گئی تھی، اور جن کی ریشِ سفید، اور کمر خم، اور گالوں کی جھرّیوں اور پوپلے مُنہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بابا آدم کے ہم عصر ہیں۔ گرجا گھر میں تشریف لائے۔ اِن کے ہمراہ ایک نازک بدن، اور غنچۂ دہن صنم عربدہ جو بھی بصد نازِ معشوقانہ آئی۔ عارضِ تاباں، اور زلفِ چلیپا، اور نازک کمری، اور قدِ دلجو نے کل حاضرین کو جو سوا سو سے کم نہ ہوں گے فریفتہ کر لیا۔ یہ مس بیش بہا انگریزی پوشاک پہنے تھی، اور گلابِ بصرہ کے عطر کی وہ لپٹ آتی تھی کہ تمام عمارت بس گئی۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ بارِ خدایا اِس مُسن اور معمّر پادری کے ساتھ یہ پری کون ہے۔ جس کی مستانہ چال، اور چہرۂ زیبا، اور زلف عنبر بار نے سب کو لُبھایا۔

از کجا می آئی اے سرمستِ خوبی محو ناز
عطر آگیں تا بدامن عنبر افشاں تا کمر

پادری صاحب دراتے ہوئے آگے بڑھے۔ ایک کُرسی پر بیٹھے۔ اور اس محبوبۂ دلرُبا کو بھی قریب کی کُرسی پر بٹھایا۔ اس جوان عورت کی چال ڈھال، اور جھجک سے پایا جاتا تھا کہ کبھی صحبت میں نہیں بیٹھی ہے، اگر بیٹھی ہے تو گاؤں میں۔ شہر آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہر شے کو اجنبیت سے دیکھتی تھی۔ واقف کار آدمی بھانپ گئے کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ مُسن آدمی، دنیا بھر کے خرانٹ۔ جوان آدمی رنگین مزاج، قلندر مشرب، جو عورتوں کی صحبت میں عرصے تک بیٹھے تھے۔ اور ان کی خو بو سے خوب واقف تھے عورتیں جو خود رنگین طبع تھیں۔ یہ سب مرد ہوں، خواہ عورت بھانپ گئے کہ یہ مس صحبت میں کبھی بیشتر نہیں بیٹھی ہے۔ گرجا میں عبادت کے وقت کو ابھی دس بارہ منٹ باقی تھے، اور ہر فردِ بشر کی نظر اسی کی طرف تھی۔ پادری صاحب بھی لوگوں کی حیرت اور استعجاب پر نظر ڈال کر دل ہی دل میں ہنستے تھے اور وہ زن خوبرو اپنے کو اجنبی سمجھ کر کسی قدر پریشان تھی۔ بہار طبع اور رنگیلے نوجوانوں میں چُپکے چُپکے باتیں ہونے لگیں۔

ٹام: ارے میاں ڈیوس یہ پیچھے کون ہے ذرا دیکھو تو۔

ڈیوس : ہونھ! ہم سے کہتے ہو؟ ہم اُس وقت سے گھور رہے ہیں۔

ٹام : کپڑے انگریزی ہیں. گال گورے گورے ہیں، سُرخ وسفید۔ مگر زلف سیاہ ہے۔ بھورے بال نہیں، اور سیہ چشم بھی ہے۔ یوروپین تو نہیں ہے۔ مگر نمکینی اور خوبصورتی ملاحت، اور صباحت، مل کر یوروپین سے بڑھ گئی۔ کوئی ایسٹ انڈین ہے۔ لیکن چال ڈھال سے اس قدر وحشت برستی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی ہندوستانی عورت کو انگریزی لباس پہنا دیا ہے۔

ڈیوس : اوّل تو کرسی پر بیٹھنے کی طرح ہی نرالی ہے۔ دیکھو دیکھو!

ٹام : میں خوب دیکھ رہا ہوں، مگر قابل اس کے ہے کہ جورو بنائیے۔

ڈیوس : پھر آؤ ہم تم ڈورے ڈالیں۔ ہم بھی ناکتخدا تم بھی۔

ٹام : اچھا پھر تم سے رقابت ہی سہی۔ آپ بھی کوشش کریں اور این جانب بھی دیکھیں کون کامیاب ہوتا ہے۔ کسے باشد۔

ڈیوس : نا بھئی۔ ہم یوں ڈورے ڈالنے والے آدمی نہیں ہیں۔ جی ہاں، پہلے معلوم تو ہو کہ ہے کون۔ کس کی لڑکی ہے۔ کون ہے۔ کہاں تعلیم پائی۔ پڑھی لکھی ہے یا نہیں۔ ناچ گا سکتی ہے یا نہیں، (ضرور) پھر مقدم یہ بات دریافت کرنی ہے کہ چال چلن بی صاحب کا کیسا ہے۔ جب یہ سب باتیں دریافت کرلوں تب البتہ ڈورے ڈالوں۔

ٹام : ہم تو اسی وقت جا کے قریب بیٹھتے ہیں۔ عشق ہی تو ہے۔

ع ۔ اے توام تیر نیستان خیال۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

اور یہاں تو دیدار بھی ہو گیے۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ جو رائے ہو۔

ڈیوس : ابھی نہیں۔ بدنامی ہو گی۔ مگر کہیں پادری صاحب کی لڑکی تو نہیں ہے۔ اس قدر دریافت کر لینا لازم ہے۔ سمجھے بھائی جان۔

ٹام : صورت تو یوروپین کی سی نہیں ہے۔ مگر ہاں حسین ہے۔ بھئی چاہے جو ہو ہم تو یہی کہیں گے کہ کسی ہندوستانی عورت کو پادری صاحب نے عیسائی کیا ہے، اور یہاں لے آئے ہیں۔ لیکن کیا پری پیکر ہے۔

تین ہندوستانی جنٹلمین بھی گر جا گیے تھے۔ اُنھوں نے جو اس مہ پارہ عابد فریب کو دیکھا تو یہ

بھی آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کرنے لگے۔

مرزا: اُستاد۔ کیا مال ہے۔ سچ کہنا۔ اور ابھی دوشیزہ ہے۔

لالہ: اس پادری کے تو پہلے کوئی لڑکا بالا تھا نہیں۔

منشی: وہ تھا یا نہیں تھا۔ مگر سچ کہنا کیسی خوبصورت اور نازنین ہے۔ بس اس قابل ہے کہ ہر دم گھورا کرے۔ سُبحان اللہ سُبحان اللہ۔ (رو کر) میرا دل اس وقت بے قابو ہو گیا۔ ہاتھ سے جاتا رہا۔

دوش غریبی ہمہ شب می گریست
رفتم و گفتم کہ ترا حال چیست
گفت اگر قصّۂ خود گویمت
ہر دو درین غصّہ نخواہند زیست
خندہ زدو باز بہ گریہ فتاد
من متحیّر شدہ دردی کہ کیست
عاقبت الامر یقین شد مرا
کان دلِ من بود کہ برمن گریست

دو مسیں اس غارتگرِ ہوش آفت کوش کو دیکھ کر کان میں یہ باتیں کرنے لگیں۔

لزی: اے بہن۔ یہ کون ہیں۔ چہرے اور چال سے ابھی کنواری معلوم ہوتی ہے مگر گرجا میں کس قدر جھجکتی، اور ڈرتی ہوئی آئی۔

این: ہم خود اُس وقت سے دیکھ رہے ہیں۔ گرجا ختم ہو تو اِن کو اپنے گھر لے چلیں۔ پوچھیں تو کون ہیں۔ اس شہر میں کب آئیں۔

لزی: مرد تو مرد عورتیں تک گھور رہی ہیں۔ نک سک سے درست ہے۔ اور سُرخ سفید، مگر بال کھورے نہیں۔ اور پتلیاں سیاہ ہیں۔

این: بھلا تم کیا کہو گی۔ کبھی کی جان نہ پہچان۔ کہو گی کیا؟

لزی: پادری صاحب سے ہاتھ ملا کر کہیں گے کہ یہ بہن کہاں سے آئی ہیں۔ بس وہ بتا دیں گے ہم باتوں باتوں میں کہیں گے کہ ہمارے ساتھ چلو۔

این: اچھّا تو ہے۔ اِن دو گوروں کو دیکھو کس طرح کنکھیوں سے دیکھتے ہیں۔ اور ڈیوس تو

اِدھر اُدھر نظر کرتا ہی نہیں۔ انھیں کو گھور رہا ہے۔

لزی: لو پادری صاحب آ گئے، اب عبادت شروع ہو گی۔ خاموش۔

پادری صاحب ایک گوشے سے آئے تو بوڑھے پادری کے قریب گئے ہاتھ ملایا۔ اور مُسکرا کر کہا، آپ کب تشریف لائے۔ پیر فرتوت نے کہا تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر اس مس کی طرف اشارہ کر کے کہا اِن سے مصافحہ کیجیے، یہ میری لڑکی ہیں۔ پادری نے متحیّر ہو کر ہاتھ ملایا۔ مگر اس مِس نے ایسے بھونڈے طریقے پر ہاتھ دیا کہ پادری صاحب کو اور بھی تعجب ہوا۔ غور سے اس نوجوان خوش وضع پر نظر ڈالی۔

پادری: وَل بہن۔ تم کہاں رہتی ہو۔ کبھی پہلے دیکھا نہ تھا؟

بوڑھا: اِن کو ایک بیماری ایسی تھی جس سے ثقلِ سماعت کا عارضہ ہو گیا مگر علاج ہوتا ہے کچھ کچھ فائدہ ہے۔

پادری: وَل بہن۔ تم کہاں رہتی ہو۔ کبھی پہلے دیکھا نہ تھا۔

بوڑھا: ان کو ایک بیماری ایسی تھی جس سے ثقلِ سماعت کا عارضہ ہو گیا مگر علاج ہوتا ہے کچھ کچھ فائدہ ہے۔

پادری: یہ آپ کی لڑکی ہیں یا مثل لڑکی کے آپ سمجھتے ہیں۔

بوڑھا: جو کچھ سمجھو۔ مگر میں اس کو اپنی لڑکی ہی سمجھتا ہوں۔

پادری: بہن خدا کرے کہ تم اپنے باپ کی سی نیک اور لائق ہو۔ اور حضرت عیسیٰ کے قول اور اُس کے باپ کے حکم کے بموجب چلو۔ خدا کا بیٹا ہمارا سب کا منجی ہے، اور اُس ہی کے ذریعے سے مغفرت حاصل ہو گی۔ وہی ایک پیغمبر ہے جو انسان کو راہ نیک بتانے کے لیے اپنے باپ کی طرف سے بھیجا گیا تاکہ گمراہی کے ڈھرے کو چھوڑ کر خدا کے بندے شاہراہِ سداد پر آئیں اور مغفرت پائیں۔ یہ پہلا مرتبہ ہے کہ میں نے اس عفیفہ اور نیک اور ہونہار مس کو اِس گرجا (خدا کے گھر) میں دیکھا اور میری دعا ہے کہ ہماری کُل بہنیں اور کُل بھائی خدا کو ڈھونڈھیں، اور اس کے مقبول بندے کو جس نے بنی انسان کے لیے اپنی جان دی اپنا خاص منجی سمجھیں۔ اور یہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔

یہ سب تقریر انگریزی میں کی گئی۔ اور یہ بے چاری نوجوان عورت سمجھی کہ اب لوگ مجھے زبردستی عیسائی کریں گے۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ روح لرزتی تھی، اور سوچتی تھی کہ یا خدا کہاں آن پھنسی۔

لیے پھرتا ہے مجھ کو جا بجا دل   مرا بچپن میرا چُلبلا دل

سوچنے لگی کہ ہائے میں نے بے سبب بے وجہ اپنی جوانی خاک میں ملا دی۔

ملایا خاک میں کیوں اس کو تونے
بہت نازوں کا پالا تھا مرا دل

اگر دل قابو میں ہوتا تو کسی جوان پر کیوں مرتی۔ اب تو لکیر پر فقیر ہوں۔ میرا کیا میرے آگے آیا۔ از ماست کہ بر ماست

اٹھاتا کیوں بتوں کے نازِ بیجا
اگر ہوتا مرے بس کا مرا دل

خدا نے بادشاہوں کو سلطنت بخشی۔ امیروں کو زر دیا۔ حسینوں کو حُسن کی دولت سے مالا مال کیا۔ شہ زوروں کو طاقت عطا کی۔ معشوقوں کو ناز و انداز دیا، آفتاب کو ضو آسمان کو انجم۔ دریا کو موتی کان کو گوہر۔ گلشن کو گل، سب کو کچھ نہ کچھ دیا اور ہم کو یہ دردِ دل دیا۔

ملا روزِ ازل عالم کو سب کچھ
ہمیں آفت رسیدہ اِک ملا دل

پادری صاحب نے وعظ شروع کی۔ نماز ادا ہوئی۔ گانا شروع ہوا ستر اسی لیڈیاں اور تیس چالیس مرد اِستادہ ہو کر پیانو باجے پر انجیلِ مقدس کے اشعار گاتے تھے۔

پادری: (یعنی بوڑھا پادری) کھڑی ہو جاؤ کھڑی ہو جاؤ۔

مِس: (اُردو میں کہیے) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

پادری: (اشارے سے) استادہ ہو جاؤ۔ یہ بے ادبی ہے۔

مِس: (استادہ ہو کر اپنے دل میں) اچھی قواعد ہے۔ عمر بھر ایسے مقام پر کاہے کو آئے تھے۔ بیٹھو اٹھو۔ گاؤ بجاؤ۔ پھر اٹھو بیٹھو۔ اچھی اُٹھا بیٹھی ہے۔ واہ وا واہ۔

پادری: یہ کتاب ہاتھ میں لیے رہو۔ اس میں کیا ہرج ہے۔

راوی: بجا۔ پڑھنا تو خیر صلاح، مگر کتاب لیے رہو۔ مِس نے کتاب لی تو الٹی، اور ہاتھ میں کتاب لے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

مس اپنے ہی دل میں یہ اشعار پڑھتی جاتی تھی، اور کبھی کبھی گنگنا بھی اٹھتی تھی۔ وہاں اس غل میں سنتا کون تھا۔

خزاں ہے آخر بہار دینا بقا ہے ان میں ہوا کا جھونکا
غرور اتنا نہیں ہے اچھا بھلا یہ حُسن شباب کب تک

یہاں ہے جینے کا کیا بھروسہ کہ حادثوں سے بھری ہے دنیا
یہی جو ہے سوچ کا طمانچہ تو پھر قیام حباب کب تک
ضرور آفاق سے سفر ہے سروریاں قابل ضرر ہے
مقام عبرت یہ خشک و تر ہے شراب کب تک شباب کب تک

وحشت دل اور بھی دونی ہوئی۔ سوچی کہ میں کیا چاہتی تھی کیا ہوا۔ مگر پادری بوڑھا آدمی ہے، اس سے خوف نہیں ہے یہ بڑی کوشش کرے گا کہ عیسائی بنائے، مگر میں کب مانتی ہوں۔ گو دل بہلانا چاہتی تھی، مگر وحشت گریبان و دامن پکڑتی تھی۔

فصل گل قریب آئی اے جنون مبارک ہو
ہاتھ پھر لگا جانے خود بخود گریباں تک

چند روزہ زندگی کے لیے، اس بیچاری نے وہ وہ مصیبتیں سہیں کہ الاماں الاماں۔ گویا رنج ہی اٹھانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج
پیدا کیا تھا مجھ کو خدا نے برائے رنج

الٰہی یہ کیسا تفرقہ ہے کہ خبر ہی نہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ یار آشنا کہاں ہے۔

کس نے چمن میں آکے یہ ڈالا ہے تفرقہ
پھولوں سے آج جو ہیں عنادل الگ الگ

دل کو ہماری تلاش ہے اور ہم کو دل کی۔ یہ عجب بات ہے۔

فرقت میں اک صنم کے یہ تفرقہ پڑا ہے
دل ہم کو ڈھونڈھتا ہے ہم دل کو ڈھونڈھتے ہیں

نماز ختم ہوئی تو گرجا سے لوگ جانے لگے۔ بوڑھے پادری نے کہا اب نکل چلو، پادری صاحب آگے آگے، اور مس پیچھے پیچھے۔ اب جدھر یہ دونوں جاتے ہیں، لیڈیاں اور جنٹلمین گھیرے لیتے ہیں۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن، بوڑھے پادری نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور بھیڑ کو کاٹتے ہوئے لے چلے تو لوگوں نے ان سے مکالمہ شروع کیا۔

ٹام: آبا بندگی۔ آج اس قدر جلد کیوں جاتے ہیں آپ؟

پادری: میری لڑکی ساتھ ہے، اور یہ علیل ہے۔ اس سبب سے جلد جاتا ہوں تاکہ مکان پر پہونچ جاؤں۔

ڈیوس : میری گاڑی حاضر ہے. سوار ہو کر چلے جائیے۔
پادری : کیسی گاڑی ہے۔ پالکی گاڑی ہو تو کیا مضائقہ۔
ڈیوس : پالکی گاڑی تو نہیں ہے بمبو کارٹ ہے۔ چار سیٹ۔
راوی : بہت ہی خوب۔ پادری صاحب اور مس اور ٹام اور حضور چاروں بیٹھ کے چلے جائیں۔

اتنے میں این اور لزی بھی آئیں۔ بوڑھے پادری سے ہاتھ ملایا۔ کہا یہ کون ہیں ہم سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ پادری نے جواب دیا۔ یہ میری لڑکی ہے۔ اس وقت طبیعت علیل ہے۔ لہٰذا میں رخصت ہوتا ہوں۔ این نے کہا کیا گاڑی نہیں ہے۔ ہماری گاڑی پر آئیے۔ بروہم ہے۔

پادری صاحب اپنی لڑکی کو لے کر اسی (بروہم) پر چلے۔ این اور لزی بھی گاڑی پر بیٹھیں۔
این : تم سے آج ایسے وقت ملاقات ہوئی کہ تم کسی قدر علیل ہو۔
پادری : بیماری اور نقاہت کے سبب سے ذرا اونچا سُنتی ہیں۔
لزی : بہن کیسی ہو کیا درد ہوتا ہے کہیں بولو؟

مس کٹ کٹ جاتی تھی اور توحّش تو بڑھتا جاتا تھا۔ اُردو میں جواب دیں تو پادری صاحب خفا ہو جائیں، اور انگریزی سے ناواقف۔ لاحولَ وَلاقوۃَ۔

خدا خدا کر کے پادری صاحب مس کو لے کر گھر پہونچے۔ اور ان دونوں مسوں کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ اب رات آئی تم جاؤ۔ پھر ملاقات ہو گی۔ اُنھوں نے ہاتھ ملایا۔ اور چلی گئیں۔ گھر میں آن کر پادری صاحب نے کہا بیٹی تمھارا نام مس پالن رکھا۔ اب تم انگریزی پڑھنا شروع کر دو، اور رومن تو ہم تم کو دو دن میں سکھا دیں گے۔

مس : ہمیں کسی چیز کے سیکھنے کی آرزو نہیں ہے۔ ہمارا دل بجھا ہوا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ ہم مجبور ہیں۔ ہمیں بس یہی آرزو ہے کہ اب جان تن سے نکل جائے۔ کس کا پڑھنا اور کیسا لکھنا۔ بس جو کچھ لکھنا پڑھنا تھا لکھ پڑھ چکے۔ اب خدا جانے کیا ہونا ہے۔
پادری : دیکھو آج جس نے تم کو انگریزی میں بات کہی تم اُس کو جواب نہ دے سکیں، یہ بڑی شرم کی بات ہے تم خاص میم معلوم ہوتی ہو۔
مس : آج سے ہم گرجا گھر نہ جائیں گے۔ بس چھٹی ہوئی۔
پادری : یہ نہ کہو۔ خدا کے گھر میں جانا عاقبت کے لیے آرام کی فکر کرنا ہے، چاہے کوئی ہنسے چاہے برا کہے، چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ خدا کے گھر میں ضرور جانا چاہیئے۔ منہ پڑے، موسلا دھار

پانی برسے، مگر تم گرجا ضرور جاؤ۔ چلچلاتی دھوپ ہو، اور گرجا میں بلائی جاؤ تو ہرگز دھوپ کا خیال نہ کرو۔ ہر حالت میں گرجا جاؤ۔ اور ضرور جاؤ۔ سردی کے سبب سے روح لرزتی ہے، مگر گرجا جانے سے ہرگز باز نہ رہو یہ خدا کا حکم ہے اس کو مانو اور اُس کے پیارے بیٹے کو مانو، جو تم کو نجات دلوائے گا۔
دیکھو لاٹ نے افعال بد کا کیسا نتیجہ بد پایا جو بوئے گا وہی اُگے گا

گندم از گندم بروید جَو ز جَو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

راوی: اے سبحان اللہ۔ کیا موزوں شعر پڑھ دیا ہے۔

مس کو ان کی تقریر پسند آئی۔ کہا اگر تم مجھے اپنی بیٹی سمجھتے ہو تو میں بھی تمھیں اپنا باپ سمجھتی ہوں۔ اور صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ میں عیسائی مذہب نہ قبول کروں گی۔ پادری صاحب نے کہا اچھا کچھ ہرج نہیں۔ مگر ہم تو سمجھا سمجھا کے تمھارا عقیدہ بدل دیں گے کچھ زبردستی تھوڑا ہی ہے۔ پادری صاحب سونے گیے اور مس کو علیحدہ ایک کمرے میں آرام کرنے کے لئے جگہ دی۔ یہ بیچاری پلنگ پر لیٹ کر اپنی زندگی اور جوانی پر افسوس کرتی تھی کہ دفعتہً بائیں آنکھ پھڑکی اور مس خوش ہو گئی کہ شاید مدعا سے جلد ہمکنار ہوں گی۔

فراق گذرا وصال آیا کہو کہ اب حسرتیں ہوں رخصت
کہ ایک پہلو میں ہوگا ساقی تو ایک پہلو میں یار ہوگا
نہ کھینچو تلوار کیا ہے حاجت ہمارا دل ہے تشہیدِ ابرو
یہ آپ ہو جائے گا تصدق یہ آپ تم پر نثار ہوگا

آزاد نے آج تک خبر نہ لی۔ ایسے بھول گیے۔ ہائے افسوس۔

یہی ہیں چالیں اگر تمھاری تو دیکھنا مٹیں گے ہم بھی
جہاں پڑے گا قدم تمھارا وہیں ہمارا مزار ہوگا

مگر بیکار، جب آزاد ہمارے نہ ہوئے تو یہ باتیں عبث ہیں۔

تو اے دل عبث مبتلا ہے کسی کا	سمجھ تو کوئی بھی ہوا ہے کسی کا
فقط چار دن کی ہے یہ جاہ و حشمت	زمانہ کہاں آشنا ہے کسی کا
دیا دل تو ہم نے کیا اپنا نقصان	اجارہ کہو اس میں کیا ہے کسی کا

یہ سوچ کر مس بے اختیار رونے لگی۔ یہاں تک کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اسی گریہ وزاری میں

آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھا کہ ایک قمر طلعت مسن آدمی ان کے سرہانے کھڑا کہہ رہا ہے کہ اے ثریا مرتبت عورت تو خدا کا شکر نہیں کرتی کہ کس مصیبت سے کس آرام کی جگہ میں آئی ہو۔ فوراً آنکھ کھل گئی۔

مس : پادری صاحب۔ پادری صاحب۔

پادری : میں سمجھا۔ ذرا تامل کرو۔

مس پالن کو پادری صاحب نے تالیف قلب کر کے اردو پڑھائی۔ ایک مہینے میں مس پالن لقمان حکیم کی نصیحتیں پڑھنے لگیں۔ پادری صاحب کی دلی خواہش تھی کہ یہ ہونہار اور حسین تا کتخدا کسی طرح سے عیسائی مذہب اختیار کر لے اور پھر اس کی کسی تربیت یافتہ انگریز یا ایسٹ انڈین کے ساتھ شادی کر دی جائے اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ مس پالن پر پچاسوں آدمی ریجھے مگر انھوں نے ایک کی نہ سنی ایک روز مس پالن نکھر کر ایک نازک کرسی پر بیٹھی مطالعہ کتاب کر رہی تھیں کہ جانسن نامے ایک یوروپین جوریل کے دفتر میں نوکر تھا وہاں آیا اور اس حور نژاد کو دیکھ کر سخت متحیر ہوا۔ ایں!

پادری صاحب کے ہاں یہ کون دیکھنے میں آئی۔ یہ مجرّد آدمی عزیز نہ یگانہ ان کے نوکر سے دریافت کیا۔ پادری صاحب ہیں۔ اس نے کہا نہیں حضور کہیں گئے ہیں۔ پوچھا کہاں گئے ہیں۔ کہا حضور مجھ سے یہ نہیں کہہ گئے ہیں مس صاحب کو معلوم ہوگا۔ یہ کہہ کر آدمی چلا گیا اور ان کو اس پری پیکر سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ ادھر مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا۔ آپ مہربانی کر کے مجھے بتا سکتی ہیں کہ اوزنڈ جنٹلمین کہاں گئے ہیں۔ مس پالن نے کہا میں انگریزی نہیں سمجھتی۔ اب ان کو اور بھی حیرت ہوئی اردو میں دریافت کیا کہ صاحب کہاں ہیں مس پالن نے بتا دیا۔ جانسن صاحب موقع وقت غنیمت جان کر قریب کی کرسی پر بیٹھے اور ہم کلام ہوئے میں نے تم کو کبھی پیشتر نہیں دیکھا تھا بہن۔ کیا کہیں باہر سے آئی ہو۔ مس پالن مسکرا کر اخلاق کے ساتھ بولیں۔ جی ہاں میں یہاں نہیں تھی۔ پادری صاحب نے مجھے یہاں بلا لیا ہے۔ پوچھا بہن یہ کتاب کون ہے۔ مس پالن نے کہا مجھے پادری صاحب فارسی پڑھاتے ہیں۔ لقمان حکیم کی نصیحتیں ہیں۔ جانسن نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ نصیحتیں سننا چاہتے ہیں تو مس پالن نے چند پڑھ سنائیں اول آنکہ اے جان پدر خدائے عزوجل را بشناس۔ جانسن نے اس کے معنی پوچھے تو مس پالن نے یوں بیان کیے یعنی خدا کو پہچان۔ جان پدر کے معنی باپ کی جان۔ لڑکا باپ کی جان ہوتا ہے۔

نور چشم لخت جگر راحت جان قرۃ العین کہتے ہی ہیں۔ دوم ہر چہ از پند و نصیحت گوئی نخست بران کارکن یعنی جب کبھی تو کسی کو نصیحت کرکہ فلاں امر قابل ترک اور فلاں قابل اخذ ہے تو پہلے خود اُس پر عمل کر۔ یہ نہیں کہ خود را فضیحت و دیگران را نصیحت۔

ہر کسے ناصح برائے دیگران

ناصح خود یافتم کم در جہان

جانسن نے کتاب ہاتھ میں لے لی اور پڑھتے پڑھتے کہا (جوانی را غنیمت دان) اس کا مطلب سمجھیں یعنی جوانی کو ہزار غنیمت سمجھو۔ جوانی بار بار نہیں آتی اور جوانی کے دن پھر نصیب نہیں ہوتے بعض مردوں اور عورتوں کا قاعدہ ہے کہ جوانی کو مفت میں برباد کر دیتے ہیں اور پھر پچھتاتے ہیں۔ مثلاً ایک تم ہی ہو۔ خدا کے فضل سے جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ عین عنفوان شباب ہے۔ یہ بوٹا سا قد یہ نازک کمر کہ زلف کے بوجھ سے لچکنے لگے مگر افسوس صد افسوس کہ تم اس بوڑھے پادری کے پالے پڑیں۔ اس کا قاعدہ ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم دے کر (نن) بناتا ہے۔ مس پالن اس نوجوان کی تقریر سے تاڑ گئیں کہ شوق چرایا پوچھا (نن) کسے کہتے ہیں۔ کہا پادری لوگ عورتوں کا سر مونڈ کر اُس پر ہر وقت کپڑا باندھا رکھتے ہیں اور یہ پھر تمام عمر شادی نہیں کرتیں مگر ان میں سے بعض بعض بھاگ جاتی ہیں۔ مس پالن نے کہا اچھی بات ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ انہیں میں شامل ہو جاؤں اور تمام عمر شادی نہ کروں۔ باقی جوانی کا لطف وہ اُٹھائے جو دنیا کو پائدار سمجھتا ہو۔ یہ دنیائے دون ناپائدار ہے۔ جوانی اور شیب سب یکساں ہے۔ مجھے کچھ اور ہی لو لگی ہے لیکن تعجب ہے کہ تم انگریز ہو کر ایسی صاف اُردو بولتے ہو۔ جانسن نے کہا میں نے تین برس تک اردو فارسی پڑھی ہے۔ اور اب عربی شروع کی ہے اگر اجازت دو تو کبھی کبھی آیا کروں۔ پالن سوچی کہ آدمی مہذب اور تربیت یافتہ اور شائستہ ہے اور جوان حسین۔ کہا ہاں آپ آجایا کیجیے۔

جانسن: کیوں مس۔ آپ کے نام سے میں واقف نہیں ہوں۔

مس پالن: میرا نام ثریا۔ وہ میرا نام مس پالن ہے۔

جانسن: ڈیر مس پالن۔ آپ نے کبھی شراب انگوری پی ہے یا نہیں۔

مس: توبہ۔ توبہ۔ اللہ نہ پلائے۔ ہم تو کالا پانی پینے والے کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ اس مُردار کا ہمارے سامنے نام نہ لینا۔ موئی مست کرنے والی چیز سے اللہ سمجھے۔

جانسن: تمہارے ہاں کے علما اور حکما تعریف کر گیے ہیں۔ اگر بری ہوتی تو عقلا ہرگز اس کی

تعریف نہ کرتے۔ بوعلی ابن سینا نے اس کی تعریف کے پُل باندھ دیئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ دمنافعے کہ شراب دارد ہیچیک از ادویہ واغذیہ مفردہ ومرکبہ بآن برابری نتواند کرد بنا بران فضلائے اطبا و عرفائے حکما اعتراف نمودہ اند کہ ما قادر نیستیم بر ساختن چیزے کہ در منافع یعنے یا شراب مقاومت تواند نمود۔ از جملہ منافع نفیسۂ او تفریح ست وبسط نفس وتقویت وفسحت اہل شجاعت وازالۂ فکر فاسدہ رزانت وافادۂ جود وسخاوت وحدت فہم وفطانت وافزونی عقل وفراست وامامنافع بدنی واگرچہ ممکن ست کہ از استعمال بعضے از معاجین ومرکبات حاصل گردد الا بغایت دشوار است واز جملہ منافع بدنیہ سرخی رنگست ونضارت وانتعاش وتقویت حرارت وقوت دل وجگر وتیزی زبان وبصرو روانی دست وپا وتحریک آلات وقوت وخفت اعضا واندام وازالۂ آلام واسقام وتوسیع مجاری ومسامات وتجوید ہضم وتلطیف سودا وتکثیر ارواح وتقویت اجساد وتلمین خون وتعدیل صفرا) کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے شراب کی تعریف نہ کی ہو۔ حافظ شیراز کو دیکھو کیسا مست تھا۔ نظامی گنجوی نے ساقی کو جا بجا یاد کیا ہے۔ ظہوری ترشیزی کا ساقی نامہ مشہور ہے۔ سُنا ہے یا نہیں سُنا۔

بیا ساقی آن لُعبتِ لعل نوش — بیا ساقی آن آفتِ عقل وہوش

بہ یکبارہ ہم آغوشیم آرزوست — بمن دِہ کہ بیہوشیم آرزوست

مِس: ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ پی اور انٹا غفیل ہو گئے، پانوں لڑکھڑانے لگے، سو کے اوٹھے تو دس بجے۔ رندی ومستی میں تمام عمر ضائع کرنی ہو تو اس مُردار کو منھ لگائے۔

جانسن: اگر شراب پیے تو اُصول کے ساتھ۔ جب پیے بادۂ ممزوج پانی ضرور ملا ہو۔ شراب غیر ممزوج معدہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ اگر کثرت ہوئی تو اسہال کبدی استسقا، سرسام، سکتہ، تشنج، رعشہ، انواع واقسام کے عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہری
حُسن را پروردگارے عشق را پیغمبری

رنگ او صورت گداز و بوی او معنی نواز
در حقیقت مومنے و در شریعت کافری

شوق گوئی سودا ندو خواب رد حل کردہ اند
پیکر روح است مانند روح را گر پیکری

تا بود اندر صراحی چاہ چاہ تخشب است
ہالہ پرور گرد وار آید برون او ساغری

مس: تم لاکھ تعریف کرو' میں کب مانتی ہوں۔ دور ہی سے بو آتی ہے۔ دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ اے توبہ۔ اے توبہ۔

جانسن: اخاہ۔ تم اس ٹھرے کو شراب سمجھتی ہو۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ یہ شراب کاہے کو زہر ہے۔

یہ بدطعم بد ذائقہ۔ شراب سے مراد شراب انگوری ہے' خوش طعم خوشبو، خوش رنگ، لطیف' اس شراب کا کیا کہنا۔ تم میری خاطر سے ایک روز بادۂ انگوری چکھو۔ فقط بطریق امتحان۔

بیا ساقی آخر بیا شادمی — دمے بغمے بہتر از عالمے
بیا تا قدح ہائے پرے کشیم — لبالب کنیم و پیاپی کشیم

مس: ہمارے مذہب کے رو سے حرام ہے' لہذا ہم سے یہ ذکر نہ کیجیے کوئی اور ذکر چھیڑیئے۔ کہاں لقمان کی پند سودمند' کہاں اس مُردار کا ذکر جس کے نام کے سننے سے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں' زندگانی کُن بخدا یتقالی بصدق۔ بنفس بقہر۔ باخلق۔ بانصاف۔ بہ بزرگان بخدمت' بخردان بشفقت' بدرویشان بسخاوت' بدوستان دیاران بہ نصیحت' بہ دشمنان بحلم' بجاہلان بخاموشی' بعالمان بتواضع' کیا کیا نصیحتیں کی ہیں۔ ناآموختہ اُستادی مکن یعنی جب تک خوب واقف نہ ہو تب تک اُستاد نہ بن بیٹھو ورنہ جس کو سکھاؤ گے اُس کی مٹی خراب ہوگی۔ مادر و پدر را غنیمت دان۔ اس فقرے پر مس پالن کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور خدا جانے کون بات یاد آئی جس نے انھیں آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ افسوس صد افسوس۔ جانسن نے ان کو زار زار روتے دیکھ کر کمال حیرت سے سبب دریافت کیا۔ شک گذرا کہ شاید کسی کی بہو بیٹی کو یہ پیر فرتوت بھگا لایا ہو۔ مگر مس پالن نے آنسو پوچھے اور ان کا شک رفع کر دیا۔

جانسن: آج پادری صاحب نے بڑی دیر کی۔ خدا جانے کہاں جا کے بیٹھ رہے' اور مجھے ایک ضروری کام ہے۔ خدا جانے وہ کب تک آئیں۔ خیر۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔

مس: ان کے آنے کا تو ٹھیک وقت یہی ہے۔ آتے ہی ہوں گے یا شاید دیر میں آئیں۔

جانسن: مس پالن میں تم کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ تم انگریزی خواں نہیں ہو۔ ورنہ۔ ورنہ۔ خیر۔ پھر کہوں گا۔

مس : مجھے انگریزی سے کیا سروکار اُردو ہی کچھ شُد بُد جاننے لگوں تو غنیمت ہے۔ اور تھوڑی سی فارسی۔
جانسن : واہ۔ تم اس قابل ہو کہ کسی انگریز کے ساتھ تمھاری شادی ہو۔ حسین ہو۔ نازنین ہو سُرخ وسفید۔ نک سک سے درست ہو جو دیکھے عش عش کر جائے۔ تم اپنے وقت کی نوشابہ اور شیریں ہو میں ڈھائی سو روپیہ ماہواری پاتا ہوں اور والد بارہ سو۔ بھائی بیرسٹر ہے۔ چچا ڈبلن میں جج ہیں اور ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی۔
راوی : ایک بات بھی سچ نہیں۔ ان کی تنخواہ ایک سو اسّی۔ باپ بیکار۔ چچا ندارد۔ بھائی پولیس انسپکٹر۔ ہاں شادی البتہ نہیں ہوئی۔
مس : اس تقریر سے آپ کا منشا کیا ہے (مُسکرا کر) صاف صاف بتا دیجیے۔ شادی نہیں ہوئی کوئی میم تجویز کیجیے۔ بہت سی مل جائیں گی۔
جانسن : ہم جس کو چاہتے ہیں وہ ہمیں چاہے تو کیا مضائقہ ہے۔ ورنہ شادی کرنا فضول ہے۔ اور جس کو ہم پیار کرتے ہیں وہ ہم سے گریز کرے تو حیف کا مقام ہے۔
مس : وہ کون ایسی ہے جو آپ سے پرہیز کرتی ہے۔ میم ہے۔
جانسن : خدا جانے میم ہے یا کون ہے مگر قہر ہے آفت ہے چھلاوا ہے۔ بس اور کیا کہوں کہ کون ہے۔ اور اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہے اور باتیں کر رہی ہے۔ مس پالن (ہاتھ چوم کر) مجھے معاف کرنا تم پر بے اختیار میرا دل آیا ہے۔
مس : ہائیں۔ واہ پہونچا دیتے ہی ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ کہیں پی تو نہیں گیا ہے یہ کون انسانیت ہے واہ وا واہ۔ بس خیر اسی میں ہے کہ آپ یہاں سے جائیں، ورنہ میں پادری صاحب سے کہہ دوں گی آپ اس قسم کی باتیں کرنے والے کون۔
جانسن : (ہاتھ جوڑ کر) اچھا تم خفا نہ ہو۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔
جانسن سخت خفیف ہوا اور مکرر سہ کرر ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی۔ مس پالن نے کہا مجھے تم سے کوئی رنج نہیں ہے مگر شریف زادیوں سے اس قسم کا مذاق اچھا نہیں۔ جانسن نے مُسکرا کر جواب دیا ہمیں یقین واثق ہے کہ تم ہندوستانی عورت ہو۔ کیونکہ ہم لوگوں کے رسوم سے مطلق واقف نہیں۔ ہاتھ تک ملانا نہیں جانتیں۔ خیر ہم کو اس سے کیا۔ مگر کبھی کبھی آیا کریں گے۔ اگر خاصدان ہو تو ہم کو ایک گلوری دو۔ ہم پان کھانے کے بہت شائق ہیں۔ مس پالن نے کہا افسوس ہے کہ پان میں نے دو مہینے سے دیکھے تک نہیں۔ کھانا کیا معنے۔ مسٹر جانسن اپنی فارسی جتانے کے لیے پان کی تعریف کرنے لگے مگر

لب ولہجہ بالکل انگریزی۔

بوصفِ پان سخن را می کنم سر | کہ تا رنگین شود چون لعل دلبر
سخن را آمد از پان رنگ بر روئے | دہان چون غنچہ شد رنگین وخوشبوئے
زپان گلبرگ بہا گشتہ رنگین | زبوے او دہانہا نافۂ چین
خطِ سبزی درو رنگین معانی | دہد از سبزۂ گلگون نشانی
زحُسنِ برگ پان این نکتہ پیداست | کہ برگِ حُسنِ خوبان زو ہویداست
بخوبان ہمدم از رنگین بیانی | نمودہ سبز حرفِ تر زبانی
چو پان درو ہر ہمدم دلبرے نیست | نگارے ناز کے سبزے ترے نیست

اگر او را ازیں دندان خوری غم
شود راز تہ دل با تو ہمدم

جانسن: اور بھی اس کی تعریف ہم کو یاد ہے۔ وہ بھی فارسی ہے۔

نادرہ برگے چہ گلِ دلستان | خو بترین میوہ ہندوستان
سیر خورد گرسنہ دردم شود | گرسنہ را گرسنگی کم شود

کس نخورد خوردۂ دندان کس
انچہ تو ان خورد ہمیں است بس

مس: وہ پادری صاحب آتے ہیں۔ بڑی بات۔ شکر ہے۔

جانسن: اخاہ۔ کیسے نیک آدمی اور ہردل عزیز ہیں۔ سب کے ساتھ ہمدردی ہے سب کے دوست۔ ہر قسم کی مدد کے لیے موجود۔ ایسے آدمی پیدا کہاں ہوتے ہیں۔ پادری صاحب آئے تو جانسن سے ہاتھ ملایا، اور مس پالن کے رخسارِ تاباں کا بوسہ لیا۔ کُرسی پر بیٹھے۔

پادری: ول جانسن۔ تم کئی دن کے بعد نظر آئے۔

جانسن: میں علیل تھا۔ یہاں بڑی دیر سے بیٹھا ہوں۔ بہن سے باتیں کرتا تھا۔ یہ بڑی نیک اور صاف دل ہیں۔ میں اس وقت اِن سے بہت خوش ہوا۔

پادری: ہاں خدا اِن کو راہ راست پر لائے۔ یہ بڑی ہوشیار اور ہونہار لڑکی ہے۔ میں ایک بار گرجا بھی لے گیا تھا، تاکہ اس کا دل نورانی ہو جائے۔ نیک آدمی کے لیے مغفرت کا ایک نہ ایک ذریعہ ہو جاتا ہے۔ اس بیچاری لڑکی کے لیے خدا نے یہ اسباب پیدا کیے کہ یہاں آئی۔ اے خدا اس بےکس

اور معصوم کو وہ نور دکھا جو اپنے مقبول بندوں کو دکھاتا ہے اور اس کے دل کے آئینے کو ایسی جلا دے جیسے اپنے خاصوں کے آئینہ دل کو دی ہے۔ یا خدا میری دعا قبول کر اور اس پاک دامن لڑکی کو شر آفات سے بچا۔ اس پیارے لڑکے جوزف جانسن کے دل کو صفائی بخش۔ آمین۔ آمین۔ یا خدا یہ دعا قبول کر۔ آمین۔ آمین۔

پادری صاحب نے مس پالن کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ عالموں کا قول ہے کہ چار چیزوں کو بقا نہیں ہے۔ حاکم ظالم۔ وزیر بے خرد۔ مال حرام۔ گردش ایام۔ حاکم ظالم ہوا اور رعایا بگڑ کھڑی ہوئی۔ ظلم سے سلطنت کو بقا نہیں۔ تنبد بنائے سلطنت عدل سے ہوتی ہے خبر دوسرے وزیر بے خرد۔ وزیر گو کھا بے عقل کج فہم ہو اور لوگوں نے جوڑ توڑ کر کے اس کو ہٹایا۔ پھر وہ نہیں جم سکتا۔ اور مال حرام۔ مالِ حرام کی قدر نہیں۔ حرام کا مال ہمیشہ اُڑ جاتا ہے۔ اِدھر آیا اُدھر رفو چکر ہوا۔ اور گردش ایام آج فقیر ہیں کل امیر ہیں۔ آج گدا ہیں کل وزیر ہیں۔ اور چار چیزیں چار چیزوں کے بغیر تمام نہیں۔ دانش عقل کے بغیر۔ طاعت دل کے بغیر۔ عمل صدق کے بغیر۔ نعمت شکر کے بغیر۔ اور چاروں چیزوں کا نتیجہ خراب ہے۔ عاقبتِ خشم پشیمانی۔ عاقبتِ لجاج رسوائی۔ عاقبت بدگوئی دشمنی۔ عاقبتِ کاہلی خواری۔ اور چار چیزیں انسان کو ضعیف کر دیتی ہیں۔ دشمن بے شمار۔ قرض بسیار۔ کثرت عیال۔ خیالِ محال۔ اور چار چیزوں سے چار باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ خاموشی سے راحت۔ فضولی سے ملالت۔ سخاوت سے مہتری۔ شکر سے افزونی۔ اور چار چیزوں سے چار چیزیں جاتی رہتی ہیں۔ شہوت سے قوت۔ کسالت سے دولت۔ ناسپاسی سے نعمت۔ تکبر سے ثروت۔ اور یہ چیزیں انسان نہیں پا سکتا۔ سخن گفتہ۔ تیر انداختہ۔ قضائے رفتہ۔ عمر گذشتہ۔ اور چار چیزوں سے چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ سوال کرنے سے خواری۔ عاقبت اندیشی سے پشیمانی۔ ہزل سے سبکساری۔ اور بادشاہ سے دلیری کرنے میں ہلاکی۔ چار چیزیں دلیل نادانی ہیں۔ ناآزمودہ کے ساتھ دلیری۔ عورت سے چشم وفا۔ کودک کی صحبت۔ ابلہ پر اعتماد۔ اور چار چیزوں سے نقصانِ عمر ہے۔ بہ پیری مجامعتِ بسیار۔ بگرمابہ رفتن۔ زیادہ میوہ کھانا اور عورت سے صحبت رکھنا۔

مس: میوہ۔ میوہ تو سب ہی کھاتے ہیں۔ اس کے ہم قائل نہیں۔

پادری: یہ علما کے تجربے کی بات ہے۔ ہر عالم جانتا ہے۔ اور چار چیزیں چار آدمیوں میں نہیں ہوتیں۔ دروغ گو میں مروت۔ بخیل میں سعادت۔ حسود کو راحت۔ بدخواہ کو سرداری۔ اور چار چیزیں اصل ہیں۔ فرمانبرداری حق تعالیٰ۔ متابعتِ پیغمبران۔ خوشنودی مادر و پدر۔ راضی داشتن علما و حکما و فقرا و شفقت

بر خلق خدائے تعالیٰ۔ اور چار چیزیں نشانِ شقاوت ہیں۔ صحبتِ جاہلان۔ نکوئی بابدان۔ مجتنب از نیکمردان۔ عمل بقول زنان۔ اور چار چیزوں سے احتراز لازم ہے۔ عُجب و تکبر۔ خشم و غضب۔ بخل و امساک۔ شتاب و تعجیل۔ اور چار چیزوں کو کبھی حقیر نہ سمجھے۔ دشمن، آتش، سیل، بیماری، چار چیزیں بغیر چار چیزوں کے نہیں رہ سکتیں۔ بادشاہی نتوان کرد الّا بعدالت۔ محبّت نتوان کرد الّا بتواضع۔ دشمن ہلاک نتوان کرد الّا بدوستی۔ بمراد نتوان رسید الّا بصبر۔

جانسن: میں اب کل حاضر ہوں گا فقط آپ کے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔

مِس: یہ بیچارے بڑی دیر سے بیٹھے تھے۔ آپ دیر میں آئے۔

جانسن: جی ہاں میں عرصے سے بیٹھا تھا۔ یہ انگریزی ابھی بول نہیں سکتی ہیں۔

پادری: اب پڑھیں گی ہم نے اِن سے کہا ہے۔

جانسن صاحب پادری صاحب کو ایک گوشے میں لے جا کر پوشیدہ طور پر کچھ کہنے لگے، ادھر مِس پالن نے سعادت نامہ کھولا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر پڑھنے لگیں۔

مے سرایم نغمۂ حمد خدا　　آنکہ مرسل ساخت خیر الانبیا

وہ چہ مرسل ہادی جنّ و بشر

وہ چہ ہادی قاسم خلد و سقر

خواجہ بدیعا

حماقت نشان خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع۔ (بلکہ بدیعا) جامہ میں پھولے نہیں سماتے کھلے جاتے ہیں آدمی کیا کشت زعفران ہے۔ قطع مبارک ملاحظہ ہو۔ پون انچ کا قامت شریف۔ بالشتیے آدمی۔ جیبی کتے سے بھی کم وزن۔ ننھے ننھے ہاتھ پانوں، مگر آدمی جیوٹ کے ہیں۔ بات بات پر قرولی تیز ہوتی ہے اور خیر سے جہاں گیے پٹ ہی کے آئے، جس سے بھڑے اُس نے اُٹھا کے دے ہی مارا مگر شرم چہ کنی است کہ پیش مردان آید با این ہمہ پہلوانی اور کمیدانی کا زعم۔ آزاد پاشا سے حضرت نے کہا کہ اِس وقت یہاں کا انتظام ہمارے تعلق کیجیے۔ آزاد پاشا نے اجازت دی، اور کہا بسم اللہ۔ کل آپ ہی کا انتظام ہے۔ خواجہ صاحب نے آستین چڑھا کر دو خدمتگاروں کو حکم دیا کہ ہمارے ساتھ آؤ اور اُن کو لے کر باہر گیے۔ اور یوں گفتگو کرنے لگے۔

خوجی: نوشہ کا گھوڑا کہاں ہے۔ ارے یہ سائیس کدھر لے گیا۔

خدمتگار : حضور کس کو پوچھتے ہیں۔ گھوڑا کہاں ہے۔ کس کا گھوڑا۔

خوجی : پھر بکتا جاتا ہے بے تکی بات۔ کس کا گھوڑا کس کا گھوڑا۔ ابے نوشہ کا گھوڑا اس کو بلاؤ تو انعام دیں۔ عجب نالائق لوگ جمع ہوئے ہیں۔ ان گدھوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ نوشہ کے ہاتھی اور گھوڑے کو انعام ملتا ہے۔ سائیس کو بلاؤ۔ کہو انعام دینے آئے ہیں۔ اس کو چاہیئے کہ اپنے حق کے لیے ہم سے لڑے یا گھوڑا لے کے بھاگ جائے۔ واہ۔ مگر وہی گھوڑا ہو جس پر دولھا سوار تھا، یہ نہ ہو کہ کوئی سائیس غپّا دے کے انعام پٹیل لے جائے، ورنہ این جانب پھر قرولی ہی سے خبر لیں گے۔ اور ہمیں کوئی بھکوا کیا جھانسا دے گا۔ ہم ساری خدائی کے نیارے ہیں۔ گھوڑے کا سہرا دیکھ لیں گے۔ کیا سوجھی ہے واللہ۔ واہ رے میں۔ شاباش ہے۔ من بدیعا شاباش۔

حکمت محض است اگر لطف جہاں آفرین	اس کند بندۂ مصلحت عام را
دولتِ جاوید یافت ہر کہ نکو نام زیست	کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

وصفِ ترا گر کند ورنہ کند اہل فضل

حاجت مشاطہ نیست زلف دل آرام را

خدمتگار دنگ تھے کہ یہ جھک کیا مار رہا ہے۔ کبھی کوئی زبان بولتا ہے کبھی کوئی کسی نے جواب نہ دیا تو خواجہ صاحب اور بھی جھلائے۔ بھئی کچھ عجیب عجیب آدمیوں سے سابقہ ہوا ہے۔ قسم خدا کی اس قسم کے آدمی میں نے نہیں دیکھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ واللہ ڈھائی گھڑی کی بادشاہت ہو جائے نہ تو ان سب کو کھڑے کھڑے چنوا دوں۔

راوی : خدا گنجے کو ننجے نہیں دیتا اور جو حضور ڈھائی گھڑی کے لیے بادشاہ ہو جائیں تو وہ ڈھائی گھڑی کیا معنی ڈھائی چوک دس گھڑی تک پینک وہ رنگ جمائے کہ حضور کو سر و پا کی بھی خبر نہ ہو۔

خواجہ صاحب نے دونوں خدمتگاروں کو سمجھا کر کہا بھائی جان ہماری رسوائی کے کیوں خواہاں ہو۔ جب دُلھن والے سنیں گے کہ نوشہ نے سائیس کو انعام نہ دیا تو کیا کہیں گے۔ سوائے وہی پاجی پن کے دوسری بات نہیں۔

دونان نخورند گوش دارند	گویند امید بہ کہ خوردہ
روزے بینی بہ کام دشمن	رز ماندۂ و خاکسار مردہ
فریدوں گفت نقاشان چین را	کہ پیرامون خرگاہش بدوزند

بدان را نیک دار اے مرد ہشیار
کہ نیکان خود بزرگ و نیک روزند

سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اس وقت البتہ وہ اشعار پڑھ دیئے کہ پھڑکا دیا کیا ساری گلستان سعدی آج ہی ختم کر دیجیے گا۔

خوجی: لے اب تم لوگ یوں نہ مانو گے۔ لاتوں کے آدمی کہیں باتوں سے مانتے ہیں مگر ہائے ستم افسوس یہ ہے کہ سمدھیوں کے آدمیوں پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ واللہ عجیب دل لگی ہے گومگو کا معاملہ ہے خیر۔ افتاد۔ ہر چہ بادا باد۔

جب یہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی تو آزاد کے پاس تشریف لے گئے اور فریاد کرنے لگے۔ دیکھا آپ نے۔ اپنی سسرال والوں کی کرتوت دیکھیے۔ رسوائی کے خواہاں ہیں۔ وہی بات کرتے ہیں جس میں ذلت و خواری ہو۔ ہم چشموں میں آبرو جائے۔ جوتیاں کھائیں۔ دال میں جوتی بٹے۔ صریح ساری خدائی میں دستور ہے کہ نوشہ کے گھوڑے کا سائیس انعام پاتا ہے۔ ہماری شادی کے دن خچر والا مانتا ہی نہ تھا اور بے انعام لیے نہ ہلا، نہ ٹلا۔

آزاد: خچر والا! کیا برات کے روز حضور خچر پر سوار ہوئے تھے۔ یہ کہیے تو گدھے کی سواری بھی ہو چکی ہے۔ یہ تو معلوم ہی نہ تھا۔ اس وقت آپ کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہوں گے۔ اللہم زد فزد۔

خوجی: (اپنے منھ پر طمانچے لگا کر) ارے توبہ۔ ارے توبہ۔ اب کہیں مس روز کے سامنے نہ بک اٹھیے گا جیسے اس دن بک دیئے تھے کہ یہ بلّم بردار ہیں۔

آزاد: خیر وقت پر سمجھا جائے گا۔ فہمیدہ خواہد شد۔

خوجی: (سر پیٹ کر) افسوس۔ اس زبان سے ہم ہار گیے۔ یہ کمبخت ہزاروں جگہ ذلیل کروا چکی ہے۔ ہزاروں مقاموں پر جوتے کھلوا چکی ہے۔ اس سے ہمارا کچھ بھی بس نہیں چلتا۔ عاجز آ گیے۔ افسوس ہے واللہ۔ اک ذرا سی چیز اور ناک میں دم کر دیا۔ اس سے ہار گیے۔ مانتی ہی نہیں۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب سنیے کہ دونوں خدمتگار نابکار دونوں شریر دونوں ناکارے۔ گولی مار دینے کے قابل۔ مگر علاج کیا۔ سمدھیوں کے آدمیوں کو کون ڈانٹے اور جو سمدھنیں سن لیں تو غضب ہی ہو جائے۔ پھر تو بھائی صاحب اللہ دے اور بندہ لے۔ واللہ بس پھر کسی اور امر کی گنجائش نہیں ہے۔ جی ہاں۔ غرض کہ حضرت سلامت اب کوئی بات رسوائی میں باقی نہیں رہی۔ آزاد نے کہا ہم ان کے داروغہ کو گھوڑے کا انعام دے دیں گے۔ اب خواجہ صاحب پھر رنگ لائے۔ کہا یہ سمدھنیں یہاں

سب کی سب کس کونے میں چھپ رہیں۔ ان سب کو تو بلاؤ۔

آزاد: پاگل ہے کون۔ بھلا سمدھنیں سامنے آئیں گی۔

خوجی: (منھ پر تھپڑ لگا کر) لاحول۔ واللہ گنوار پن کی بات کی۔ اس وقت ٹوپی اتار کر سر جھکایا اور آزاد کے قریب جا کر کہا۔ بھائی صاحب ہمیں اک دو جوتے گن کے لگائیے۔ آپ کو واللہ خوب گِن لیجیے اور گن کے دو جوتے لگا دیجیے۔

آزاد ایک دل لگی باز۔ تڑ سے وہ چپت جمائی کہ خوجی کی کھوپڑی بھنا گئی۔ جھلا کر کہا۔ او گیدی۔ قسم خدا کی دوسرا ہوتا تو قرولی اس وقت پار کر دیتا خدا ان ہاتھوں سے سمجھے۔ لے کے بھیجا تک ہلا دیا۔ آج نوشہ ہو کیا بولوں خبر۔ ورنہ وہ گدّا دیا ہوتا کہ کھوپڑی ہی یاد کرتی اور سینے کیا مفت کا سرپایا ہے۔ آپ کی چپت گاہ پر ایک پڑے تو جانیے۔ آزاد نے کہا۔ ہائیں بے ادب گستاخ۔ ہماری شان میں کلمے۔ رو کر جواب دیا پھر یہ تو بنی بنائی بات ہے کسی کا ہاتھ کسی کا منھ چلے۔ اب اتنے سے گیے گزرے سمدھیانے میں ہمیں ذلیل کیا اور ہم باپ بنے تھے۔

آزاد نے کہا۔ بھئی تمہارے حکم کی آدھی تعمیل کی تم نے کہا تھا کہ دو جوتے لگاؤ۔ ہم نے ایک چپت جمائی۔ بس پھر کیا گناہ ہوا۔ فرمائیے اگر جوتے لگاتا تو شاید آپ بگڑ ہی جاتے۔ خوجی صورت دیکھ کر رہ گیے اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگے اور سینے گا۔ اپنے نزدیک آپ نے ایک ہلکی سی چپت لگائی تھی اور یہاں کھوپڑی کے ماتھے گئی۔ خیر۔ اب اس وقت دولھا بنے ہو ورنہ سمجھ لیتا۔ ہے ہے جو کہیں اس روز کے سامنے ایسی دھول پڑتی تو۔ اللہ کچّا ہی چبا جاتا۔

خوجی: (خدمتگاروں سے) ارے یارو یہ کیا ماجرا ہے۔ گلوری ہے نہ عطر نہ ڈلی نہ پان نہ قلیاں نہ حقہ نہ پیچوان۔ کچھ عجب اندھیر ہے۔ آخر کیا کوئی نفرہ سمجھے ہو جی۔

خدمتگار: حضور ہم سمجھے نہیں۔ قلیاں اور پان کے معنی سمجھا دیجیے۔

خوجی: ایسے ننھے ہیں۔ سمجھے نہیں۔ اپنے داروغہ کو فوراً بھیج دو۔ کہو نوشہ کے ابّا جان نے تم کو یاد کیا ہے۔ دست بستہ حاضر ہو فوراً حاضر ہو۔

خدمتگار: بہت خوب خداوند۔ ابھی حاضر ہوتے ہیں داروغہ۔

خوجی بولے واللہ یہ لوگ گنوار کے لٹھ ہیں۔ کچھ جانتے ہی نہیں تعظیم و تکریم ادب داب معاشرت سب سے بے بہرہ۔ نوشہ الگ جھک مار رہا ہے۔ رفقا الگ جھک مار رہے ہیں۔

کس نمی پرسد کہ بھیّا کون ہو
ایک ہو یا ڈیڑھ ہو یا پون ہو

آزاد نے کہا آپ بہت وحشت کی نہ لیں ورنہ اب سچ مچ جوتے ہی پڑیں گے۔ سمجھے حضرت سلامت۔ جی اتنے پڑیں کہ کبھی کبھی تو یاد کیجیے جو منھ پر آتا ہے۔ بکسا اٹھتا ہے۔ پان کیسے یہاں پان کبھی دیکھا بھی نہ کھا کر بے معنی ہی بکتا ہے۔ پان کھائیں گے اور حقہ کس سے مانگتا ہے۔ مردود یہ چرٹ پیتے ہیں یا حقہ۔ روس میں ہو یا ہندوستان میں ہو۔ تم پہلے یہ تو بتاؤ کہ ہو کہاں نوشہ کا گھوڑا اور سہرا اور یہ اور وہ۔ واہیات بکتا جاتا ہے بے تکی۔

خوجی کو یہ کلمات ناشائستہ سخت ناگوار گزرے۔ منھ پھلا کر باہر آئے۔ کچھ جواب نہ دیا باہر آن کر ایک لونڈی سے کہا۔ سنتی ہو جا کے نوشہ سے کہدو کہ آج سے ہم سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ بس اب تک صاحب سلامت تھی۔ اب سے وہ بھی ترک۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ ہم جا کے مس روز کے ساتھ شادی کرتے ہیں۔ مردک کو آدمی بنا دیا۔ اور پھر بھی ہم سے اکڑا ہی رہتا ہے۔

ادھر لونڈی پیغام لے کر گئی اُدھر اُنھوں نے مرثیہ خوانی شروع کر دی۔

آہو سے دوچند اس کے طرارے نظر آئے
سایہ جو پھرا ساتھ چکارے نظر آئے
آیا جو عرق ابر میں تارے نظر آئے
چل پھر فقط ابرو کے اشارے نظر آئے
یکتا ہوئے کل تین فرس دونوں جہاں میں
یہ رن میں ہے اور دلدل فردوس جناں میں

لونڈی نے جا کر آزاد سے دبے دانتوں کہا تو اُنھوں نے بات ٹال دی۔ وہ دیوانہ ہے۔ اُس کے مُنھ نہ لگو بکنے دو۔ ہندوستان میں خاصہ بھلا چنگا تھا۔ یہاں آتے آتے خدا جانے کیا ہو گیا۔

لونڈی: مجھے تو اِن کی صورت دیکھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ بے گالی کے بات ہی نہیں کرتے۔ اور بات بات پر مار پیٹ کے لیے مستعد۔ پھر ان سے کون بولے جو بولے وہ گالی کھائے۔

آزاد: جنون ہے۔ کئی مہینے سے جنون ہے۔ بکنے دو واہی ہے۔

لونڈی: اے حضور میرا ہاتھ پکڑ کر بہت ڈپٹ کے کہا کہ خبردار ضرور کہنا اور میں اس کی

کیا پروا رکھتا ہوں۔ میں ادھر آئی تو وہ غُل مچانے لگے۔

آزاد : لاحول ولا قوۃ۔ کیا غُل مچا رہا ہے ذرا خاموش رہو تو میں سنوں۔ لونڈی خاموش ہوئی تو آزاد نے یہ سُنا۔

اللہ ری تیغ لیتی تھی محصول سب سے یہ
تیغوں سے آب تیروں سے چلّے کمان سے زہ
موئے کمر سے کھولتی تھی ناف کی گرہ
سر سے تو خود لیتی تھی اور جسم سے زرہ
دستِ تہی بنا دیا ہر اک نیام کو
نیزے کی بھی گرہ میں نہ تھا بال نام کو
گر کوئی تیغ پڑتی تھی اس تیغ گرم پر
تو جوہر اس کے اڑتے تھے یوں جس طرح شرر
دندانے صاف تیغ میں پڑتے تھے سربسر
آہن بھی عجز کرتا تھا دندان نکال کر؁
دندانہ تیغ نے کیا پیدا تو کیا کیا
زورِ عدو پہ خندۂ دندان نما کیا

آزاد: خیر ابھی تک حواس تو درست ہیں۔ ہزار غنیمت ہے۔

خوجی: اللہ اللہ۔ ہم اور کسی کی آدھی بات سنیں۔ کیا مجال وہ کوئی اور ہوتے ہوں گے جو کسی کی سنتے ہوں گے۔ ہم گل پھڑے چیر ڈالیں۔ خواجہ صاحب سے رہا نہ گیا۔ خود تشریف لائے اور آزاد کے کان میں کہا میاں اس وقت تمھاری وہی مثل ہے کہ کانا ٹٹو بد ھونفر۔ ایک ٹڑوں ٹوں۔ ہم ساتھ ہیں اور ہم سے بھی بگاڑتے ہو ہم نے تمہارا کیسا کیسا ساتھ دیا کہاں کہاں جان معرض خطر میں ڈالی مگر تم اب ایسے دشمن ہو گیے کہ ہماری سنتے ہی نہیں۔ یہ کیا اندھیر ہے۔ ہمیں سخت استعجاب ہے کہ یہ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ میری خطا میرا قصور میرا جُرم۔ کچھ تو بتاؤ بھائی۔

بگفتند کاے سرور پُرخرو
تن و جان تو دور باد از ابد

راوی : اس گفتگو کو اس شعر سے کتنی مناسبت ہے۔ سُبحان اللہ۔

خوجی: سو حضرت اب ہماری سُنیے۔ مطلب یہ ہے کہ سسرال میں اس طرح پر رہنا لازم ہے کہ انسان کی قدر و منزلت ہو۔ نہ اس طرح سے کہ ذلت حاصل ہو جیسے آپ۔ ہم جب اپنی سسرال جاتے تھے تو کُل آدمی سروقد تعظیم کرتے تھے اور جس طرح یہ کنیزان خوبرو آپ کے سامنے ہنستی ہیں اس طرح کسی کی مجال نہ تھی کہ ہنستی۔ دانت تڑوا دیتا۔ سب باادب اور خاموش اور گردن نیچی چپ چاپ رہتے تھے مرد ہو یا عورت۔ ایک حکیم صاحب جو ہمارے چچیا سُسر تھے وہ البتہ بڑے مقدس تھے اُنھوں نے تو ہماری تعظیم کبھی نہیں کی مگر بس وہی ایک اور بھی بڑے نامی حکیم تھے مسیحائے زمان۔

تو آن حکیم مسیحا دمے درین ایام
کہ در زمان تو علت ز خلق بگریزد

آزاد: اس فضول تقریر کا ماحصل کیا ہے حضرت؟

خوجی: ماحصل یہ کہ عزت کے ساتھ زندگی بسر کرو سمجھے۔

آزاد: اب بالکل سمجھ گیا۔ بس اب اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

خوجی: ایک ذرا لیے رہو پھر دیکھو کیسی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ورنہ کوئی ٹکے کو نہ پوچھے گا۔ اور مُفت میں ذلیل و خوار ہوگے۔ آئندہ اختیار ہے۔

من نگویم کہ این مکن آن کن
مصلحت بین و کار آسان کن

آزاد: اچھا ہدایت ہوئی۔ اب ذرا لیے رہوں گا۔ بس حضرت۔ اتنے میں ایک خادمہ نے آن کر کہا۔ حضور ذری خاموش رہیے۔ غضب ہو گیا ستم ہو گیا۔ آپ کی تلاش میں سرکار نے لوگ دوڑائے ہیں۔ چنانچہ پچاس سوار اس طرف بھی آئے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت وزیر جنگ نے نادری حکم دیا ہے کہ آزاد پاشا کو فوراً لاؤ۔ مس کلیرسا اور مِنیڈا اور شہزادی گھبرا اٹھیں۔ ابھی تک ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہوا کہ آزاد کہاں ہیں۔ مگر اس قدر سُنا ہے کہ اس پہاڑ کی طرف روپوش ہیں۔ خدا خیر کرے۔ مس کلیرسا کو وہ سوار جانتے ہیں اور ان کی عزت و توقیر کرتے ہیں سب نے ان کو دیکھ کر ٹوپی اُتاری۔

آزاد: خدا خیر کرے۔ افسوس ہے سخت افسوس ہے۔ مگر خود کردہ را چہ علاج شہزادی نے ہم کو یہاں پھانس رکھا اب وہ بھگت لیں۔ ہمارا تو بال تک بیکا نہ ہوگا۔ ہم کو تو سزا ابھی اس سے زیادہ مل نہیں سکتی اور ہمارے لیے یہی سزا کیا کم تھی جو شہزادی نے دی۔

خوجی تھرتھر کانپنے لگے۔ آزاد نے سمجھایا کہ ہوش وحواس درست رکھو ورنہ ہاتھ پانوں پھول جائیں گے۔ یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ ایک اور خادمہ آئی۔ اُس نے مس میڈا کا خط دیا۔

ڈیر آزاد۔ اس وقت پولینڈ کی شہزادی کو تم دیکھ ہی چکے ہو کہ کس طرح کا جوبن ہے۔ وہ مجھ کو چھب دکھا کر ہم سب کو مل کے یہاں چلی آئی تھی تاکہ شام کو دعوت کے بعد ہم سب کو رخصت کرے اور پھر ہم ہوں اور وہ ہو۔ گل اور بلبل ہو۔ مینا کی قلقل اور جام مل ہو۔ مگر سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ پچاس سوار گھوڑے کڑکڑاتے ہوئے آئے۔ معلوم ہوا کہ تمہاری گرفتاری کے لیے آئے ہیں۔ مس کلیرسا کا رنگ فق ہو گیا۔ ان پچاسوں سواروں کو شک تھا کہ آزاد اس پہاڑ میں کہیں چھپے ہیں مگر مس کلیرسا کی ملاقات سے ان کا شک کافور ہو گیا کیونکہ اس شعلہ رو کے سبب سے آزاد گرفتار اور اس کی وجہ سے وہ سیبریا بھیجے جاتے تھے۔ اب سُنا ہے کہ یہ سوار اُتر کی طرف جائیں گے تم گھبرانا نہیں تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ عربن سے ان سواروں نے پہلے کئی سوال کیے تھے مگر وہ جہاندیدہ عورت ہے۔ اُس نے سمجھ بوجھ کے جواب دیئے ہیچ ہے

سخندان پرور دہ پیر کہن | بیندیشد انگہ بگوید سخن
بیندیش وانگہ برآور نفس | وزان پیش بس کن کہ گویند بس

بہ لطف آدمی بہتر است از دواب
دواب از تو بہ گر نہ گوئی صواب

تمہارے ساتھ وہ جو مسخرہ ہے۔ وہی بونا خوجی اُس کو باہر نہ نکلنے دینا۔ ورنہ وہ کوئی نہ کوئی حماقت کی بات ضرور کرے گا۔ اُس کو ہرگز نہ آنے دینا۔

مس میڈا۔ پرپوٹ

آزاد: سنا بھائی خواجہ صاحب یہ بڑی مصیبت پڑ گئی۔ ہا۔

خوجی: اور تو خیر مگر ہاں دل لگی کر بیٹھی۔ اور رشتہ ہی ایسا ہے۔ سالی ہیں نہ ہماری پھر کہاں تک ضبط کریں۔ خوجی۔ اور سنیے بونا لو صاحب ہم بونے ہیں۔ بونے ہوتے تو مصر کے ہوٹل والے پہلوان کو ٹھاکے دے مارتے۔

آزاد: اور مسخرہ بھی بنایا ہے۔ یہ ان سب پر بھی طرّہ ہے۔

خوجی: اجی جو جی چاہے کہہ لیں۔ گالیاں دے لیں۔ ہنس لیں۔

عاشقان کشتگان معشوق اند
برنیاید زکشتگان آزاد ؎

آزاد: عاشق آپ کس کے ہیں۔ کیوں صاحب دوں پھر ایک۔ عاشق!

خوجی: کیوں مس روز کے عاشق ہیں یا نہیں۔ ہونہہ کہنے لگے عاشق کس کے ہیں۔ بہت اچھے۔ پھر ارشاد ہوا۔ آپ لوگ میری ہی طرف جاتے ہیں۔ بھائی اصلا واسطہ نہیں رکھتے۔ مس روز ہماری جان ہے یا نہیں ہے۔ پھر عجب آدمی ہو بھئی۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب کو آزاد نے سمجھا کر بھیجا کہ جاکے اُن کے سواروں کو دیکھیں جو منجانب روس ان کی گرفتاری کے لیے آئے تھے۔ خواجہ صاحب نے کپڑے بدلے کچھ ترکی کچھ ہندی کچھ روسی ایرانی وضع بنا کر باہر تشریف لے گیے۔ بغل میں شطرنج دو خدمتگاروں کو سکھا دیا کہ تم اُن سواروں کے پاس کھڑے رہنا جب ہم اس طرف سے گذریں گے تو وہ عجیب الخلقت آدمی دیکھ کر ضرور متحیر ہوں گے۔ تم کہنا یہ شاطر ہے۔ ایران کا رہنے والا۔ ایران اور روم اور ہندوستان اور بڑی دور دور سفر کر آیا ہے۔ اس کو شطرنج بازی کا بڑا شوق ہے یہ کہہ کر حضرت لڑھکتے ہوئے روسی سواروں کی طرف پہونچے۔ تو وہاں اینڈنے لگے۔ سواروں نے ان کی قطع مبارک پر قہقہے لگائے اور ان دونوں خدمتگاروں میں سے ایک سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے۔ خدمتگاروں نے بیان کیا کہ یہ ایک عجمی ہیں۔ خاص ایران کے رہنے والے۔ ایران اور کابل اور ہندوستان اور روم کی سیر کر چکے ہیں۔ شطرنج بازی کا کمال شوق ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی بغل میں موجود ہے۔ سواروں میں دس پانچ شاطر بھی تھے۔ اُنھوں نے بڑے اشتیاق سے ان کو بلوایا۔ خواجہ صاحب نے کہلا بھیجا کہ ہم رند آدمی ہیں کسی کے پاس جاتے آتے نہیں۔

ایک سوار: (آگے بڑھ کر) ہم سپاہی آدمی بھی تو رند ہی ہیں۔

دوسرا: ہم آپ کی تواضع تکریم کریں گے آپ آئیں تو سہی۔ ہم کو بھی شطرنج کا بڑا شوق ہے۔

تیسرا: تمھارے سبب سے دو گھڑی غم ہی غلط ہوگا۔ آؤ۔

خوجی: بھئی ہم تو بندۂ لطف ہیں۔ موجود۔ مستعد۔ آمادہ۔

سوار: روم کھیلتے ہو یا فرنگ۔

خوجی: جو کچھ ہو۔ فرنگ ہی سہی۔ ہم کب بند ہیں کسی میں۔

سوار: اچھا شطرنج لاؤ۔ کچھ بد بد کے کھیلو تو کیا مضائقہ۔

خوجی: ہم اُس کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں جو ہمارے سوالوں کا جواب کافی دے۔ ورنہ خیر صلاح ہے۔

سوار: اچھا آپ سوال کریں ہم جواب دیں گے فرمائیے۔

خوجی: سوال بہت مختصر ہیں مگر موزوں۔

۱۔ گھوڑے اور پیل سے مات کر سکتے ہو یا نہیں

۲۔ دو پیلوں سے مات ممکن ہے یا غیر ممکن۔

۳۔ پیادہ کسے کہتے ہیں اور برد کے کیا معنی۔

۴۔ فرزین زیادہ یا دو رُخ۔

۵۔ گھوڑے اور رُخ میں کیا فرق ہے۔

۶۔ آخر بازی میں گھوڑا اچھا یا پیل۔

سوار: یہ کون مشکل سوال ہیں جواب سُنیے۔

۱۔ گھوڑے اور پیل سے مات ممکن۔

۲۔ پیلوں سے مات ہوسکتا ہے۔

۳۔ پیادیں پیادوں کے مات کو کہتے ہیں بُرد کے معنی کہ حریف کے پاس بجز شاہ کے اور کوئی مہرہ نہ رہے

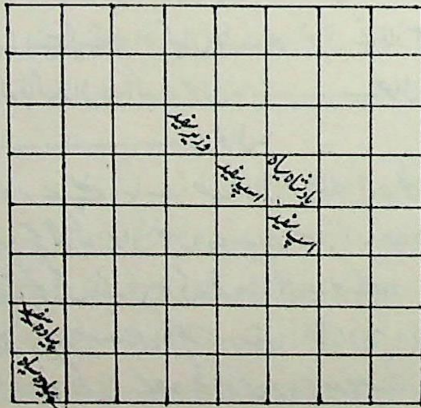
۴۔ دو رُخ فرزین سے زیادہ ہیں۔

۵۔ رُخ کی ترجیح ہے۔

خوجی: اچھا اس نقشے کو کوئی حل کرے۔

سیاہ بازی کو تین چال میں مات ہو۔ سیاہ پیادہ بادشاہ سفید کا رکا ہوا ہے۔ پہلے چال شاہ سفید کی ہے۔

بازی سیاہ



بازی سفید

سوار: بے شک حل کر دیں گے اس میں مشکل کیا ہے۔

خوجی: گھر کی پتلی اور باسی ساگ۔
سوار: پہلے کون چلے۔
خوجی: اے لاحول۔ بس تو لو۔ حل کر چکے نادان اتنا نہیں جانتے کہ پہلے ہمیشہ مات کرنے والا چلتا ہے۔ اے توبہ توبہ توبہ۔

کشائیم زبان را بشکر و نوا
کہ در بزم ما نیست کس بینوا

سوار: آپ کا مکان کہاں۔
خوجی: اجی جہنم میں ہے۔ اس سے کیا واسطہ تم کو۔
سوار: آپ ایرانی ہیں یا ہندی یا عربی یا ترکی۔
خوجی: عربی نہ فارسی نہ ترکی۔ تال کی نہ سم کی نہ سُر کی۔

پہیلی کہی ہے کسی لُبہ کی
حویلی علی نقی خان بہادر کی

بیڑے میں ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک سوار نے ان کو دور ہی سے چڑھانا شروع کردیا۔ اُنھوں نے دیکھا تو آگ ہو گیے اور شطرنج اٹھا کر پھینک دی۔ اس پر اور سواروں نے اس سوار کو منع کیا اور پھر نقشے پر غور کرنے لگے اتنے میں ایک سوار نے ان سے فارسی میں گفتگو شروع کی پوچھا تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاتے ہو۔ خوجی نے فارسی میں جواب دیا د بابلئے من بدمع شنیدن بما کہ خاکسار از بلدہ کہ در حوالی۔ ــــــــــ حوالی ــــــــــ ــــــــــــــــــــــــ در حوالی۔

اجی لاحول بڑے برے پھنسے۔ کیا بے ڈھب سوال کر بیٹھا۔ اجی در حوالی اصفہان واقع بود مسکن دارم۔ سوار ہنسا سمجھ گیا کہ ایرانی نہیں ہے۔ نہ ایرانیوں کا سا لب ولہجہ و زبان یہ بنا ہوا عجمی ہے۔ پوچھا آپ نے کس کس ملک کی سیر کی۔ فرمایا۔ بس یہ پوچھیے۔ از سرزمین ایران پاک ــــ آمدم اور کابل و از کابل رفتم بہ سبستان و از سیستان بخارا دیدم و در عرب آمدم و از عرب در بدخشاں رفتم۔ (اس بے تکے پن کے صدقے) و من دیدم ہندوستان و دریائے اٹک و گنگ و سندھ دور انجاز نان ہندی دیدم سبزان مصرستان ہم رفتہ ام (مصرستان کیا خوب۔ اور رومستان اور روستان اور بلونلستان کے پہلوان کا ذکر ہی نہیں) و باز آمدم روم و اکنون دیدم روس۔

سوار : (مسکرا کر) سن تمہارا کیا ہے۔

خوجی : بندہ شش سال و چہل سال آمیختہ عمر دارم۔

راوی : پھڑکا دیا۔ چہل و شش کہیں تو پھبتیاں ہوں لہذا چہل و شش کی آمیزش کی واہ۔ فارسی بولے تو ایسی۔ اس (آمیختہ) کے لفظ نے جان ڈال دی۔

سوار : (ہنس کر) مزاج تو اچھا رہا۔ کہیں فصد کی ضرورت تو نہیں ہوئی تھی۔

خوجی : او گیدی۔ اگر قرولی در دست من بدیعا بودے ہیں بدیع ضرور بھونک دیتا۔ چہ کہ مارا تاب سخن شنیدن درشت بنودہ و نہ بود و نخواہد بود۔

راوی : کیا خوب تمام آمدنامہ گردان گیے (نخواہد شد)

تین سوار نقشے پر غور کر رہے تھے اُنھوں نے بعد غور کامل کہا۔ حضرت اس کا حل کرنا محال ہے بلکہ ہمارے نزدیک یہ نقشہ حل ہی نہیں ہو سکتا۔ سینکڑوں منصوبے کیے مگر بیکار۔ اس ستم کو دیکھیے۔ اب ہمارا کیا بس ہے۔ لیکن آج شام تک غور کریں گے۔ اگر حل ہوا تو خیر ورنہ آپ سے شرط بدلیں گے۔ خوجی اکڑ کر بولے اجی حضرت روم اور مصر اور ہند اور عرب اور ایران میں تو کوئی بازی جیت نہ سکا آپ کیا بیچارے ہیں۔ سواروں کو غصہ آیا۔ کہا اچّھا خیر۔ ابھی تو ہم نے ہمت نہیں ہاری ہے لیکن اگر آپ سے بھی حل نہ ہو سکا تو اس سامنے والے کنویں میں پھینک دیں گے۔

خوجی : (فارسی وزن سے) می دیدی برادر من بدیعا کہ این چہ می گوید مارا الفاظ سخت نمی دہد کہ من بدیعا در عہد شاہی کمیدان بودم می شنوی و مار اور چاہ غبغب اندازد (چاہ غبغب بھی کیا خوب آیا ہے۔

سوار : عربی میں گفتگو کر سکتے ہو۔

خوجی : اجی ہمیں کیا نہیں آتا ہے۔ عربی سہی۔ الحمد للہ الذی جعل عن وشبیہ والنظیر وتعالیٰ عن النیر وانورین ومن شانہ توتی الملک من تشار وتنزع الملک ممن تشار لا یدرک ذہن البشر حکمتہ البالغتہ ولا یعیل مکرہ کنہ قدرنہ الکاملۂ والصلواۃ والسلام علی سیدنا خاتم النبیین وخیر الخلائق اجمعین وعلی آلہ واصحابہ الاتقیار الابرار والسادۃ الامجاد الاخیار۔

سوار بہت ہنسا۔ سمجھا کہ یہ اپنے دل میں مجھے بالکل بے تکا اور جاہل تصور کرتے ہیں اور یہ جانتے ہی نہیں کہ برسوں عرب اور ایران میں رہا ہوں۔ خوجی نے اکڑ کر کہا کلام نظم فاخرہ از بطن

من بدیع بشنو کہ من می گویم۔

چنان برتپش آمد آن پہلوان | چو شیرے کہ برگو سفند جوان
شگافے زداز دشنہ بر سینہ اش | کہ افتاد بیرون ز دل کینہ اش
بیکدم حصار تنش شد تہی | ہمہ خاک شد سروری و مہی
ببیں گردش چرخ دوار را | کہ از جان کشد ہم چو مردار را
ندانم کہ از گردشِ آسمان | چہ آید بجان و تن من زبان

ندانم کنون چارۂ کار خویش
کہ درمان کنم بہر آزار خویش

سوار : ایران اور عجم اور فارسی اور سیستان اور کابل اور بدختاں میں کیا فرق ہے اور کہاں کی زبان سب سے زیادہ معتبر و مستند ہے۔

خوجی : ایران عجم میں ہے، اور عجم فارس میں اور سیستان میں کابل ہے، اور بدختاں میں سیستان۔

راوی : اور آپ کی عقل کہاں ہے۔ گدی میں۔

سوار : آپ کے ایرانی ہونے میں شک نہیں ہے۔ اصل ایرانی ہو لیکن نہ بتایا کہ زبان کس مقام کی زیادہ مستند ہے۔

خوجی : ایران کی جس کو ماوراء النہر بھی کہتے ہیں۔ عرف مادر النہر۔

سوار : بجا۔ (مسکرا کر) درست ارشاد ہوا۔ اور بعض آدمی خوازرم بھی تو کہتے ہیں شاید۔ بدین عقل و دانش بباید گریست۔

خوجی : مارا از امتحان گرفتن مردم شما ہیچ نیست۔

سوار : میں سمجھا نہیں۔ آپ تو ٹھیٹھ فارسی بولتے ہیں۔

خوجی : ہاں اکنون براہ آمدی۔ (ہاں) اب راہ پر آئے) بشنو از من بدیع من کا نسلِ مصر اعرضی نوشتم کہ اودنگ بود۔ و در عنوان گفتم۔

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو
مصرعۂ ثانی فراموش خد والائے تو

واکثر بارہا قائل نمودم، مستدعیاں زیارت را۔ چنانچہ یک ایرانی در این جا ہم ہست

او از من درس می گیرد۔ من خوانم اورا۔ او زمن می خواند۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو براندازیم
اگر غم لشکر انداز د کہ خون عاشقان ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

ایک افسر نے خوجی کی شکل وصورت اور نئی گڑھت کی وضع دیکھ کر ان کو اپنے پاس بُلایا۔ خواجہ صاحب گیے۔ آداب بجالائے' اور ٹوپی ہاتھ پر رکھ کر بطریق نذر دکھائی۔ افسر نے ہنس کر کہا۔ آپ کس ملک کے باشندے ہیں۔ خوجی بولے' من بدیع باشندہ ایران' خاص شیرازی' زباندان بلا بالا و سروِ خرام۔

افسر: یہ وضع اہل ایران کی نہیں ہے۔

خوجی: آپ روسی آدمی' اہلِ ایران کی وضع کیا جانیں۔

افسر: سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ یہ آپ نے خوب بات کہی۔ میں ایران میں دو مہینے تک رہ چکا ہوں۔

خوجی: او بابا۔ من بدیع را اکنون معذوری لازم آمد۔ یہاں جو ہے وہ ایران ہو آیا ہے۔ اور ہمارے شہر کے آدمی نخاس کے باہر قدم نہیں رکھتے۔

حُبّ الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر
خارِ وطن از سنبل و رَیحان خوشتر
یوسف کہ بملکِ مصر شاہی می کرد
می گفت گدا بودنِ کنعان خوشتر

حُبّ الوطنی اس کو کہتے ہیں۔

افسر: ہم شیراز اور تبریز اور اصفہان اور جام وغیرہ مقام بخوبی دیکھ چکے ہیں۔ حافظ اور سعدی کی قبر بھی دیکھی۔

سعدی تو جوہری و کلام تو جوہر اند
ارزان چنان فروش کہ گجراتیاں خند

اور حافظ کا کلام ہمیں بہت پسند ہے۔

حافظا مینحور و رندی کن و خوش باش ولے
دامِ تزویر مکن چون وگراں قرآن را

مگر ہم اس کو لسان الغیب نہیں سمجھتے۔

خوجی: تو آپ ان کے بھائی نہیں ہمارے میاں آ۔۔۔

راوی: ہاں ہاں فرمائیے فرمائیے کس کے بھائی ہیں۔ آپ کے میاں کون (آ) کہہ کر خاموش کیوں رہے حضور۔ یہ زبان اگر قابو میں ہے تو سب کچھ ہے' ورنہ عزت کا خدا حافظ ہے۔ کہنے کو تھے کہ آپ میاں آزاد کے بھائی ہیں۔ یعنی جس طرح وہ فال کو صحیح نہیں سمجھتے' اور اس کے قائل نہیں' اُسی طرح آپ بھی فال کے قائل نہیں ہیں۔ مگر (میاں) کہہ کے رہ گیے۔ اگر آزاد کا نام لیں تو معاً گرفتار ہو جائیں۔ لیکن اس افسر اور اس سوار کو گمان قوی تھا کہ یہ ایرانی نہیں ہے۔ مگر ابھی تک ان کو یہ شک نہیں گزرا تھا کہ ہندی ہے' اور نہ یہ سمجھتے تھے کہ آزاد کا ساتھی ہے۔ ورنہ معاذ اللہ تمام کہسار تھرا اُٹھتا۔

خوجی: آپ شعر می گوید یا نمی گوید صاحب بہادر۔

افسر: بندہ۔ ا۔ بندہ کم کم می گوید۔

خوجی: برخوان۔ کلام مَالاَ یدرِک کُلّہٗ خوش برخوان برادر۔

راوی: اس فقرے پر افسر ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گیا۔ کلام کے بعد مَالاَ یدرِک کلّہٗ نے کیا لطف دکھایا ہے۔

افسر: کلام منظوم بخوان کہ از و استفادہ حاصل کنیم۔

خوجی: شاباش ہے بیان واہ کیوں نہ ہو یہ لیجیے انگریز ہو کر فارسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ مگر لب و لہجہ نہیں بدلا۔

راوی: اب آپ کا سا لب و لہجہ کہاں سے لائیں۔ آپ ایرانی الاصل اور انگریزی کی ایک ہی کہی۔ روسی اور انگریزی میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔

خوجی: از کلام بلاغت انضمام بندۂ بدیع مقام بشنو برادر۔

نکلی عروسِ فتح محافہ جدا ہوا
یا نامۂ ظفر سے لفافہ جدا ہوا

افسر : کلام پارسی برخوان کہ بفہم نزدیک تر باشد۔

خوجی : ارے! غضب کیا۔ اردو کا فقرہ پڑھ دیا۔

خواجہ صاحب کی شامت اعمال۔ بوستان سعدی کے اشعار جو یاد تھے سنانے لگے اور فارسی داں سوار ان سے خوب واقف تھا۔ آپ نے جھوم جھوم کر یوں کہا۔

طریقت شناسانِ ثابت قدم — بخلوت نشستند چندے بہم
یکے زان میاں غیبت آغاز کرد — درِ ذکر بیچارہ را باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ — تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش — ہمہ عمر نہ نہادہ ام پائے بیش

چنین گفت درویش صادق نفس

اس قدر خوجی پڑھ چکے تھے کہ سوار نے اس کے بعد کے تین مصرعہ بھی پڑھ دیئے۔

ندیدم چنین بخت برگشتہ کس
کہ کافر ز پیکارش ایمن نشست
مسلمان ز جورِ زبانش نرست

خوجی کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔

سوار : حضور یہ کوئی مخبر ہے۔ گرفتار کرنا چاہیئے۔

افسر : ہمیں خود شک تھا۔ یہ ہرگز ایرانی نہیں ہے۔

سوار : پھر گرفتار کر لیا جائے اور پہرہ رہے کہ بھاگنے نہ پائے۔

خوجی : او گیدی خبردار۔ ہم کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ خبردار۔ کمیدانوں کے منھ نہ چڑھنا۔ اور سلیے کیا نرم چارہ سمجھے ہیں۔

خواجہ صاحب غرفش کرتے ہی رہے سواروں نے ان کو گرفتار کر لیا۔

خوجی : اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا۔

سوار : کیوں صاحب۔ آپ تو ایرانی بنے تھے۔

خوجی : واہ میاں ——————— تم تو آج لطف زندگی اُٹھاؤ گے نئی دُلھن پاؤ گے مگر ہم دیکھیے کس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ناحق ایرانی بنے۔ مُفت میں دھر لیے گئے۔

چو شمشیر پیکار برداشتی
نگہداد پنہان رہ آشتی

کہ لشکر کشایان مغفر شگاف
نہان صلح جویند پیدا مصاف

افسر نے ایک آدمی کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ تم صاف صاف اپنا نام اور نشان اور مولد اور ملجا بتاؤ گے یا نہیں۔ اگر ٹھیک ٹھیک بتاؤ اور تشفی کر دو تو ہم تم کو رہا کر دیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا ہمارا نام سیتارام۔ نشان شہر اصفہان پتا محلہ ماکیان متصل مکان ملا فرقان مولد من شیراز۔ نام مقام مرتبان ملجا وماوا۔ افسر نے یہ سن کر کہا یہ شخص دو شقوں سے خالی نہیں۔ یا پاگل ہے یا بدذات حکم دیا کہ اس سے تحریری جواب حاصل کرو۔

ایک: تم یہاں کس تقریب سے آئے اور کس کے ساتھ آئے۔

جواب: تقریب۔ موج۔ طبیعت کا لہرا۔ اور ساتھ اپنے عزم کے۔

دوسرا: کب آئے اور کہاں کہاں مقیم رہے۔

جواب: تاریخ یاد نہیں۔ مقیم سایہ درخت کے تلے۔

تیسرا: اعزہ میں سے کون کون ہے اور کہاں ہے۔

جواب: 1۔ سب مر کھپ گئے۔

2۔ کوئی بہشت میں ہے۔ کوئی جہنم میں۔ کوئی دونوں سے بری۔

چوتھا: تم یہاں سے کس کے ساتھ جاؤ گے۔ کون تم کو لے جائے گا۔

جواب: موت اجل۔ مرگ۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع گئے تو تھے اس فکر میں کہ کچھ کھوج خبر لائیں۔ وہاں الٹی آنتیں گلے پڑیں۔ ایرانی بن کے آزادی سے ہاتھ دھویا۔ کس مزے سے خواجہ بدیع شطرنج بغل داب کر سواروں کے بیڑے میں داخل ہوئے تھے۔ وہاں دھرے گئے۔ شطرنج بازی کا شوق بھول گئے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بیٹھے ہوئے سواروں کو گالیاں دے رہے تھے کہ ایک شخص نے ان سے کہا چلیے وہ نقشہ حل کیجیے۔ کیسی

سے حل نہیں ہو سکتا۔ خواجہ صاحب سے ہوش و ہواس فقر دشطرنج بازی یہ کیا جانیں ناچار لنگوائے قہر درویش بجان درویش جانا پڑا۔ سواروں نے کہا حضرت یا تو اس نقشے کو حل کیجیے۔ یا وعدہ پورا فرمائیے ہم نے پہروں اس میں صرف کیے ہیں۔ خواجہ صاحب نے نقشہ یوں جمایا۔

ایک سوار نے شطرنج کو اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس پر خوجی بہت ہی چلّائے کہا تم لوگوں میں ذرا تمیّز نہیں ہے۔

سوار: اچھا پھر بسائیے۔ ایک دفعہ اور نقشہ جمے۔

خوجی: اے تو بابا۔ یہ گیدی اس قابل نہیں کہ اس کی طرف مخاطب ہو کر انسان گفتگو کرے۔

سوار: اچھا بسائیے تو اگر نقشہ ہم حل کر دیں تو آپ خدمتگار ہو جائیں اور عُمر بھر غُلام بنے رہیں ورنہ رہا کر دیے جائیں نقشہ پھر جمایا گیا۔ وہو ہذا۔

سیاہ بازی

		وزیر سفید					
			اسپ سفید	شاہ سیاہ			
				اسپ سفید			
پیادہ سیاہ							
شاہ سفید							

سفید بازی

سیاہ۔ تین چال میں سفید کو مات کرے۔

سوار: عجب پاگل ہو۔ دو پہر تک سر مغزنی کی حل نہ ہوا۔ اور اب دوسری طرح نقشہ بتاتے ہو۔

خوجی: خیر اب سُنیے آپ ہی حل کیجیے تو جانیں۔

سوار: بھلا آپ سے شطرنج سیکھیں تو کتنے دِنوں میں آئے۔

خوجی: یہی کوئی دو برس میں۔

سوار: ہاں۔ تو دو برس تک آپ کی مخلصی معلوم۔

خوجی: اس کے کیا معنی شطرنج سے اور ہماری رہائی سے واسطہ۔

سوار: جبتک بخوبی شطرنج سیکھ نہ لیں گے تب تک حضور کو جانے نہ دیں گے۔

خوجی: ہائے افسوس۔ ع

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

سوار: اور اگر دو مہینے میں سکھا دو تو سبحان اللہ۔

خوجی: (اپنے دل میں) یہاں شطرنج جانتا کون ہے۔

سوار: اچھا اب نقشہ حل کر دو۔

خوجی: حل کیجیے اگر نہ حل ہو تو افسوس کا مقام ہے۔

خواجہ صاحب نے دیکھا کہ سواروں میں بے طور پھنسے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پستہ قامت اور دُبلا پتلا سمجھ کر چپتیں لگانا شروع کر دیں۔ سوچے کہ مذاق کی باتیں کہو تاکہ انکا دل بہلے اور ہم سے بہ لطف و تواضع پیش آئیں۔ فارسی داں سوار کی طرف مخاطب ہو کر کہا بابائے من بدیع۔ اگر مضائقہ بنا شد البتہ بگویم حکایات و روایات چند بابت یک کس حرو انجل کہ جمیع الجمع بخیل است مگر شما در زبان روسیہ ترجمہ کردن و من گفتن خواہد شد (سبحان اللہ) اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ بسم اللہ حضرت خواجہ صاحب یوں گویا ہوئے بشنوید اے سخنداں پرورده پیرہن کہ ہر ظریف۔ ع

بیندیشد آنگہ بگوید سخن

یعنی بعد فہم و غور۔ آوردہ اند راویان رنگین بیانی و حاکیان شیوا زبانی (بیانی اور زبانی میں بے بغیر نہ بنے) کہ در زماں پاستان۔ یعنی قبل تولد گردیدن حضرت آدم (معقول) دو۔

من آں وقت بودم گر آدم نہ بود

کہ آدم عدم بود و حوا نہ بود

مردے بودہ اوّل زندہ و خوش مجاز (یہ مزاج کی خرابی ہے)۔ (افسردہ کلھے گا افسردہ) مگر بخیل سجدے تمام کہ بنام دادن در دریچہ نداد۔ (یہ ہندی کا محاورہ ہے) یعنی دینے کے بعد دروازے کے بھی نہیں سوتا تھا۔ ایسا بخیل تھا۔

سوار: کچھ مطلب بھی اس کا ہے۔ ایسا خود وقت ٹالنا۔

خوجی : واہ۔ بنتے کبھی تو کتنے ہو۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ دز نے داشت صاحب جمال کہ ما ہم پیش عارض تابون او خجل بود۔ در ہر بزم کہ ہر وقت چون نبشست خفا داز نہاد ما برخاست و چون نبشست دل از دست رفت روزے آن مرد ہیچک میخورد۔ ناگاہ صاحب غرض مندے بیامد و سوال کرد۔ آن زن حسین حُسن را در باید ساخت عشق توانم۔

بود از بس خرام گلعذاران　　شدہ این بزم پر گل چون خبابان

تلنگی مہوشان سبز چالاک　　کہ سبز بوستان از سایہ اش خاک

بباغ از قد رعنا بر فرازند　　گلستاں را نہال از جلوہ سازند

کنند این دلبران گر جلوہ بنیاد　　وہد سزد غلامان سرو آزاد

سزد عشاق را این نالہ و شور　　چو اشکب شور بختان چون چکد شور

کہ دادہ عمر انسان تیغ را تاب
زبہر قتل عاشق از نمک آب

سوار : اب نقشہ تو حل کیجیے۔

خوجی : اس وقت دل بے قرار ہے۔ انشاء اللہ پھر سہی پھر سہی۔

سوار : واہ اس وقت بتاؤ۔

خوجی : اچھا تین گھنٹے میں بتا دیں گے جو بھاگنا ہوتا تو ہم جھجک نہ جاتے۔

زتخم شہان یک سرا فراز مرد
بہ جبہ تسلیم برجائے ارشاد کرد

یک روز زن او داد خود نیز ہم اعتراض مکن کہ حافظ شیراز ہم گفتہ است۔ شیر رنج و پان و حلوا میخورد در زیر سایۂ درخت در سفر و یک کس گرسنہ ہم در انجا پیش رو استادہ بود۔ این بخیل بعد فراغ طعام گفت کہ اے برادر شما را از دیر می بینم کہ برائے تعظیم من استادہ چرا نشستن نمی کنی (سبحان اللہ

اور مرد گرسنہ دانست کہ ایں بخیل ہیچ نخواہد داد۔ لہٰذا رفت۔

اب سُنیے کہ اِن کی انوکھی وضع اور چال ڈھال اور قد و قامت دیکھ کر بہت سے آدمی اِدھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ اور خوجی کو تماشا بنالیا تو حضرت اکڑ اکڑ کر فرمانے لگے۔

خود پرستی کا جو سودا ہوگیا
آپ میں اپنا تماشا ہوگیا

سوار : کبھی شادی بھی ہوئی تھی یا نہیں۔

خوجی : اِس سوال کے صدقے۔ یوں نہیں پوچھتے کہ کتخدا ہو یا ناکتخدا سوال بھی کیا تو بھونڈا (کبھی شادی بھی ہوئی تھی)۔

وہ ایسا کونسا معشوق ہے جس کو نہیں چاہا
یہ فردیں جتنی ہیں اِن پر ہماری بھی نشانی ہے

بس روز صورت دیکھتے ہی ان اشعار کی مصداق ہوگئیں۔

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنون زا دِل میں
بندھ گیا ہے نمکین حسن کا سودا دِل میں
بات بھی آپ کے آگے نہ زبان سے نکلی
لیجیے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دِل میں

مگر اے فراق وائے فراق۔ اے ہمیں مار ڈالا۔

شکست تار نفس ہو جو ہوں عدوے فراق
ہمارا رشتۂ جان ہے رگ گلوے فراق
شکست دیکھئے دیتا ہے آسماں کس کو
عدو فراق ہمارا ہے ہم عدوے فراق
یقین ہے چمن عیش پر خزاں آئے
گلِ وصال سے آتی ہے مجھ کو بوئے فراق
لگی ہے قید غم ہجر کی مرے دم سے
پھنسا ہے جان کے پھندے میں تا گلوے فراق

بس روز جانِ من جانانِ من قابلِ دید ہے نازک کمر نازک اندام سیم بدن صنوبر خرام۔

ہلکانہ اس دھنک کے دوپٹے کو جانیے　　اِک تار بادلے کی ہے اے سیمبر کمر
زلفوں کو چھوڑ کر نہ کرو تم خرام ناز　　لچکے گی نازکی سے ہر اک گام پر کمر

پہلو میں بیٹھنے کو جو اُس نے کہا کبھی
لڑنے پہ مستعد وہ ہوئے باندھ کر کمر

سوار نے دریافت کیا کہ حضور کا قد اب کچھ اور بڑھے گا یا بس اتنا ہی ہے۔

خوجی نے کہا آپ لوگوں کو خدا نے آنکھ نہیں دی ہے۔ ورنہ ہم کو حسینوں کا بادشاہ کہیے۔

اتنے میں ایک سوار نے کہا کہ آج یہاں سے کوچ کی تیاری ہے۔ سُنا ہے کہ اس مقام سے چار دن کی راہ پر آزاد پاشا کسی رُوسی لیڈی کے ہاں فروکش ہیں اور اُن سے اُس نے وعدہ کیا ہے کہ اِن کے ساتھ شادی کرے گی اور فرانس میں جاکر رہے گی۔ سُنتے ہی خوجی کے حواس غائب ہو گئے۔ رنگ روزرد۔ دل سرد یا خدا خیر کیجو اور آزاد کو شر آفات سے بچائیو۔ بڑی اوس پڑ گئی یہ کیا ہوا۔ کہی تو کسی نے پتے کی ہے۔ مگر اِس قدر چوک گیا کہ چار دِن کی راہ کا پتا دیا۔ ایک آدمی نے بیڑے کے لوگوں سے کہا کہ یہاں بھی ہم نے ایک مرد۔ روم کا کوئی پاشا جس کا نام ہم نہیں جانتے دیکھا تھا۔ شیر کا سا سینہ ہے چیتے کی سی کمر خوش رو جوان ہے بس دو دِن رہ کر خدا معلوم کہاں چل دیا اور ایک دُبلا دُبلا ترک اس کے ساتھ اور بھی تھا۔ خوجی کا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یہ بڑی بیڈھب ہوئی۔ اب تو یار لوگوں نے پتے پتے کی کہنا شروع کی۔ خدا نہ کرے کہ کوئی حسین عورت کے پھیر میں پڑے۔

اے صنم سب ہیں ترے ہاتھوں سے نالاں آج کل
صورتِ ناقوس ہیں گبر و مسلماں آج کل

تھوڑی دیر میں پھر آزاد پاشا کی باتیں ہونے لگیں اور کئی آدمی اس گفتگو میں شریک تھے۔

ایک: آزاد پاشا کچھ رشوت دے کر بھاگ گئے ہوں تو عجب نہیں۔

دوسرا: اور رشوت کس کو دیتے کیا مجال۔ اے توبہ!!!

تیسرا: یہاں تو وہ آ نہیں سکتے تھے مس کلیرسا پھر گرفتار کر کے بھجوا دیتیں۔ مگر ہے کہیں اِنھیں پہاڑوں کی طرف۔ اگر پیچھا کیا جائے تو شاید مل سکے۔

چوتھا: اجی بیڑا اُٹھا کے آئے ہیں۔ لائیں اور پھر لائیں جی۔

خوجی: وہ بھاگ کے گئے کہاں ہیں۔ سو سوار تو اُن کے ساتھ تھے سو سواروں میں سے اگر نکل گئے تو ستم بپا کیا۔ بڑے جری اور چالاک ہیں۔

سوار: جس دن وہ ملے ہم سمجھیں گے کہ روس قسمت کا دھنی ہے ورنہ اگر وہ پھر ترکوں سے جا ملے تو ستم ہو جائے گا۔

اتنے میں ایک شخص نے آن کر کہا ارے یارو خوشی سے شادیانے بجاؤ آزاد پکڑے گئے۔ ایک مکان میں یہاں سے کچھ فاصلے پر چھپے تھے۔ مخبری ہوئی بس دھر لیے گئے۔

یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی خوجی نیم جاں ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

غافلو تقدیر کا رونا عبث — سب گلہ بیجا ہے سب شکوا عبث
ایک دن گرگ اجل کا ہے شکار — یہ تگ و دوائے سگِ دنیا عبث
کارخانہ عالم اسباب کا — کچھ نہیں بے فائدہ بیجا عبث
خیر میں جانا ہوں اے خانہ خراب — کیوں پڑا پھرتا ہے تو ہر جا عبث

کل کی کل کے ہاتھ ہے اے غافلو
آج تم کو ہے غم فردا عبث۔

جو آتا تھا وہ یہی کہتا تھا کہ آزاد پکڑے گئے اور شدہ شدہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ منجملہ ان سواروں کے تیس آدمی پہاڑ پر شکار کھیل رہے تھے انھوں نے ایک شخص کو درخت پر بیٹھا ہوا دیکھا پوچھا تو کون ہے۔ اُس نے جواب نہ دیا مجبور ہو کر ایک سوار نے چاہا کہ گولی لگائے تو اُس نے للکار کر کہا۔ بابا میں ایک فقیر ہوں مجھے ناحق دِق کرتے ہو۔

سوار: تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔

آدمی: ہم پاگل ہیں اور اس کو پاگل خانہ سمجھ کر یہاں آئے ہیں۔

سوار: باتیں تو پاگلوں کی سی کرتے ہو مگر شکل صورت سے پاگل نہیں معلوم ہوتے۔

آدمی: ہم کو بک بک کا دماغ نہیں۔

دوزخ مجھے قبول ہے اے مُنکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

آخرکار دو آدمیوں نے اس شخص کو درخت سے اُتارا اور کہا تم کو ہم نے گرفتار کیا تم آزاد پاشا کے ہم شکل ہو۔

حُلیہ ملایا گیا تو ہم شکل کیا معنی۔ خود آزاد ہی تھے۔

خوجی کی آنکھیں پھر پُرنم ہو گئیں اور کمال حسرت سے اشعار ذیل کے زبان پر لائے۔

اے چشم غرق آب حیا ہو جہاں تمام
خالی حباب داری ہے نہ آسماں تمام
غارت ہیں صبر و طاقت و تاب تواں تمام
اے یار تُو نے لُوٹ لیا کارواں تمام

ابر ہیں دیدۂ پر آب سے ہم — برق ہیں دِل کے اضطراب سے ہم
دم ہیں موج فنا مٹا دے گی — بحرِ ہستی میں ہیں حباب سے ہم
بیوفاؤں سے ہے وفا مطلوب — طالبِ آب ہیں سراب سے ہم
زندگی ہو گئی عذاب ہمیں — گذرے زاہد ترے ثواب سے ہم

تنگ آئے ہیں تنگ آئے ہیں
اِس دلِ خانماں خراب سے ہم

ایک سوار نے آہ بھر کر کہا کہ آزاد پاشا کے دیکھنے کے لیے مِس کلیرسا گئی ہیں اور ان کی ایک بہن بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ خوجی کو ڈھارس ہوئی کہ مِس کلیرسا اور مِس میڈا دونوں رعایت کریں گی اور کہہ دیں گی کہ یہ آزاد پاشا نہیں ہیں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

ہر دم ہے تیز خنجر بیداد کس لیے
یہ ظلم و جور اے ستم ایجاد کس لیے

کِسی روز یہاں عیش کا دن نصیب نہ ہوا۔ ہائے ستم۔

کِس دن شبِ غم جان کو آفت نہیں ہوتی
کب شام سے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی

مَیں اس وقت جان پر کھیل جاتا مگر افسوس ہے کہ حضور آزاد پاشا سے دُور ہوں مجبوری کا مقام ہے۔

بستر ہمارا یار کے ایوان سے دُور ہے
درویش آستانۂ سلطان سے دُور ہے

اِدھر یہ گفتگو ہوتی تھی اُدھر وہ شطرنج باز سوار آیا۔ کہا لیجیے حضرت نقشہ حل کر دیا۔ وہو ہذا۔

1- اسپ سفید بخانہ (3) فیل سیاہ

2- فرزین بخانہ سیاہ۔

3- فرزین کی کشت بخانۂ رُخ نمبر 4 - اور مات ہے۔

سفید شاہ جو چال چاہے چلے۔

خوجی : ٹھیک ہے۔ خوب حل کیا شاباش۔ اب ہم تمہاری شطرنج بازی کے قائل ہوئے۔ شاباش۔ شاباش۔

سوار : اب آپ بہت بنائیے نہیں۔

اتنے میں خبر آئی کہ آزاد پاشا پہچان لیے گئے اور گرفتار ہو گئے۔

خوجی : بیچارے کو غش آگیا۔

سوار : کیا مس کلیسا نے کہہ دیا کہ آزاد پاشا ہیں۔

آدمی : ہاں انھوں نے پہچان لیا۔

سوار : یہاں لائے جاتے ہیں یا نہیں۔

آدمی : ابھی وہیں تحقیقات ہو رہی ہے۔

اتنے میں خواجہ صاحب کو ہوش آیا تو یہ شعر زبان پر لائے۔

ہر دم زمانہ داغ غم بر جگر نہد
یک داغ نیک ناشدہ داغ دگر نہد

اللہ بس باقی ہوس۔

مکر و زور کے بغیر بعض اوقات کام نہیں بنتا۔ خدا کے مقبول بندے کسی حالت میں فریب نہیں دیتے لیکن ایسے قدیمی صفات آدمی دنیا میں کم ہیں۔

اب سنیے کہ مس کلیسا ہر ہفت آرایش سے مشین۔ اور مس میڈا کلی پیرایش سے مزین اور پولینڈ کی گل چہرہ شہزادی سولہ سنگار کر کے بیٹھی تھیں کہ دفعتًہ سواروں کے بیڑے سے ایک آدمی آیا اور مس کلیسا کو علاحدہ بلایا اور ادب کے ساتھ عرض کیا حضور آزاد پاشا کا پتا لگا ہے۔ حضور کو اس قدر تکلیف ہوگی کہ دیکھ کر پہچان لیں کہ آزاد ہی ہے یا کوئی اور ہے۔ مس کلیسا دھک سے رہ گئی میڈا کو بلا کر کہا۔ بہن ان کی زبانی معلوم ہوا کہ آزاد پاشا کا پتا پایا ہے۔ سو ہم کو لیے جاتے ہیں۔ کہ چل کے شناخت کرو۔ میڈا کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر یہ خبر سن کر کہ کلیسا کے سوا اور کوئی آزاد کو نہیں

پہچانتا، ذرا ڈھارس ہوئی کہ شاید بچ نکلے۔ سوار نے بیان کیا کہ تیس سوار پہاڑ سے دو کوس کے فاصلے پر شکار کھیل رہے تھے، دریا کے قریب ایک آدمی کو بیٹھا دیکھا جو اس ملک کا رہنے والا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ شکل و صورت خط و خال سب ایشیا والوں کا سا ہے۔ کشیدہ قامت، بہت کسا ہوا بدن، سینہ چوڑا، حسین، سرخ و سفید، کمر پتلی، پوچھا تم کون ہو۔ تو اُس نے کہا مَیں ملک بوریا میں پیدا ہوا تھا۔ جو چین کی سلطنت میں جانب شرق واقع ہے۔ باپ بلوچستانی، ماں ترک سمرقندی، آباؤ اجداد وہاں تجارت کرتے تھے، مَیں نے ایک اسکول میں چینی زبان کی تعلیم پائی، اور بطریق منشی سفارت چین کے ساتھ رُوس میں آیا۔ یہاں مَیں نے نوکری چھوڑ دی۔ گھر کا امیر ہوں۔ اپنے پاس سے کھاتا ہوں۔ اور دندناتا ہوں۔ اب صرف اس قدر کام ہے کہ سیّاحی کرتا ہوں۔ ایک مقام پر گذر نہیں دُنیا کے پردے پر کوئی ملک ایسا نہیں جہاں مَیں نہ گیا ہوں۔ ہاں ہسپانیہ ابھی نہیں دیکھا۔ قصد ہے کہ یہاں سے ہسپانیہ بھی جاؤں دریافت کیا گیا کہ تم کبھی ہندوستان بھی گئے تھے کہا۔ ہاں پانچ برس تک رہ آیا ہوں۔ پوچھا نام کہا محمد طاہر پوچھا تم اس کا کیا ثبوت دے سکتے ہو، کہ ہندی نہیں ہو۔ کہا ہم اس کے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں دیکھتے۔ ہم کوئی مجرم نہیں کوئی گنہگار نہیں۔ ہمارا ذرا قصور نہیں ہے۔ پھر ثبوت یعنی چہ۔ ایک سیّاح جہانیاں جہاں گرد آدمی ہیں ایک جگہ پر قیام نہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ پوچھا کوئی فن بھی جانتے ہو۔ کہا ہاں جانتے ہیں۔ ایک تو بانک اور بنوٹ میں ہم برق ہیں۔ کسی سے دب کر چلنے والے نہیں۔ دوسرے کشتی میں اُستاد بے بدل ہیں۔ چاہے جیسا پہلوان ہو۔ ہم لڑا دیں گے۔ تیسرے فن شاعری میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ فارسی شعر ایسا کہیں کہ سُننے والا پھڑک جائے۔ بشرطیکہ تمیزدار ہو۔ پوچھا کبھی کسی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ کہا ہاں۔ ملک اسٹریا میں ایک فرقہ ہے بونیرز۔ اس کے سرغنہ سے چل گئی تھی۔ باتوں سے گھونسوں اور لاتوں، اور لاتوں سے جوتوں کی نوبت آئی۔ اور آخر کار جنگ کی ٹھہری۔ دس مہینے تک سرکاری فوج کی طرف سے ہم اُن لوگوں سے لڑتے رہے۔ آخر کار شکست دی، جو حضرت سلطان المعظم کے خلاف ہو گیا تھا۔ اطالیہ کے ایک جنگی اسکول میں تعلیم پائی ہے۔ پوچھا آزاد پاشا کا نام سُنا ہے کہاں سُنا ہے۔ مگر اس سوال سے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور حیرت کے ساتھ حاضرین پر نظر ڈالی۔ مس میڈا کو یہ تقریر ایسی بُری معلوم ہوئی کہ اگر بس چلتا تو اس کے راوی یعنی رُوسی سوار کو خاک میں ملا دیتی۔ مس کلیرسا بھی کمال ملول ہو گئی کہ آزاد پر مصیبت پڑی۔ اس کے بعد سوار نے کہا کہ ہم لوگ گھوڑوں سے اُتر پڑے اور اس کو گھیر لیا۔ ایک آدمی نے جو آزاد کو حالت جنگ میں دیکھ چکا تھا پہچانا اور کہا آزاد یہی ہے۔ اس کی تلوار سے مَیں نے بھی دو زخم کھائے تھے مگر خدا نے

بچالیا۔ اِس نے تو اپنے نزدیک کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اس شخص سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ہم کو شک ہے۔ کہ تم آزاد پاشا افسر فوج روم ہو تمہاری تلاش میں ایک سو سوار بھیجے گئے ہیں جن میں سے تیس سوار اس طرف شکار کے لیے نکل آئے۔ اتفاق سے تم مل گئے۔ اب تم اپنے کو قیدی سمجھو۔ اس نے خشمگیں ہو کر جواب دیا کہ تم قیدی، تمہارا باپ قیدی، آزادوں کو کون قید کر سکتا ہے۔ اس کے پاس ایک نہایت نفیس شمشیر براں تھی اور ایک تپنچہ۔ صلاح ہوئی کہ ہتھیار اس سے لے لیں کہا گیا کہ ہتھیار ڈال دے اِس پر آگ ہو گیا اور معاً نیام سے تیغ خون آشام نکال کر تین سواروں کو قتل کر ڈالا۔ جب تک گرفتار کریں پکڑیں وار بچائیں۔ چوٹ روکیں۔ جواب دیں۔ اس نے تین سوار قتل کیے اور چھ کو چوٹیل کر دیا۔ بڑی خرابی اور وقت سے خدا خدا کر کے گرفتار ہوا۔ اب ایک مکان میں بند ہے، اور ایک روسی سوار شمشیر برہنہ لیے سر پر کھڑے ہیں۔ حضور تشریف لے چلیں تو پہچان لیں اب پولینڈ کی شہزادی کو اس حال کی اطلاع نہ تھی مگر سمجھی کہ سواروں کا آنا اور کلیرسا سے علاحدہ باتیں کرنا اور میڈا کا جانا خالی از علت نہیں ہے۔ کوئی وجہ خاص ضرور ہے ماتھا ٹھنکا کہ خدا ہی خیر کرے۔ کلیرسا اور میڈا باہم تخلیے میں گفتگو کرنے لگیں۔

کلیرسا: بہن یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا آزاد دیوانے ہو گئے۔ یہ انھیں سوجھی کیا کہ بھاگ گئے۔ ایسے محفوظ مقام سے بھاگ جانا جنون کی دلیل ہے۔ رہ رہ کے افسوس آتا ہے کہ یہ کیا سوجھی۔ ہم کو اطلاع تو دیتے بھاگتے تو صید مصیبت ہو لیے۔

میڈا: میری عقل خود کام نہیں کرتی کہ یہ کیا ہوا۔

کلیرسا: شکل و صورت سیرت خو بو وضع قطع چال ڈھال خط و خال سب حلیہ ملتا ہے۔ بیشک آزاد ہی ہیں۔ ہائے ناحق اپنی جوانی کا دشمن ہوا۔ مزے سے وہیں چھپا رہتا تو کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔ بھاگ کے اپنی جان کے ساتھ دشمنی کی۔

میڈا: بہن یہ تو سب ہوا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کیا کہو گی۔ صاف کہہ دینا کہ یہ آزاد نہیں ہے۔ وہ اس سے زیادہ حسین اور شہ زور ہے۔

کلیرسا: تمہارے سکھانے کی بات ہے۔ میں کیا بالکل نادان ہوں مگر بری ہوئی اور میرے لیے سب سے زیادہ۔ اگر بات کھل گئی تو غضب ہو جائے گا۔ ہائے افسوس وائے افسوس۔ مگر میں آزاد کا ساتھ مرتے دم تک دوں گی۔ تم خاطر جمع رکھو۔ میں جو کہہ دوں گی۔ اس کو سب باور کر لیں گے۔ میرے ہی سبب سے تو آزاد سیبیریا بھیجے جاتے تھے۔

یہ فقرہ کہہ کر مس کلیرسا نے ایک آہ سرد بھری، اور آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ناظرین اس کا سبب سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ اس مہ لقا کو اپنا عاشق زار یاد آیا۔ معرکہ دار وگیر میں آزاد کے ہاتھ سے مقتول ہوا تھا، اور جس کا بدلہ لینے کے لیے مس کلیرسا کو خود آنا پڑا تھا۔

میڈا: شہزادی کو تو اطلاع کر دو۔ وہ بھی سُن لیں۔

مس کلیرسا نے سوار سے کہا کہ تم کل سواروں کو تیار کرو، اور فوراً۔ ہم بھی سوار ہوتے ہیں۔ اس کو تو یوں ٹالا، اور اُدھر شہزادی کو بُلا کر کچا چٹھا کہہ سُنایا۔ شہزادی مثل پیکر تصویر خاموش ہوگئی گویا مُنہ میں زبان ہی نہ تھی۔ چُپ، ہوش و ہواس دُرست نہ تھے۔ ہائے ستم وائے ستم۔ کیا کیا آرزوئیں تھیں مگر سب کا خون ہوا اس قدر آرزو بر آئی تھی کہ برات ــــ کا دن دیکھ لیا۔ مگر دِل کی دِل ہی میں رہی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نِکلے
بہت نِکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نِکلے

ع

آرزوئیں ہوئیں سب خاک پڑا رن کیسا

میڈا: بہن اب افسوس کرنے اور رونے کا وقت نہیں ہے۔ اب سوچنے اور غور کرنے کا وقت ہے۔ غور کرو کہ اب کون تدبیر کارگر ہوگی کسی طرح آزاد کی جان بچا لانا۔

کلیرسا: شہزادی واسطے خدا کے استقلال کو ہاتھ سے نہ دو۔

شہزادی: میرے تو ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے ہائے غضب!!!

کیا سوچی تھی اور کیا ہوا۔ بڑا غضب ہوگیا۔ ہائے میں یہ نہیں جانتی تھی۔

خواب دیدم کہ خورم آب حیات از دستش
تیغ میراند بحلقوم چو بیدار شدم

ہمارا دوست نہ تھا قاتل تھا۔ سفاک تھا۔ آخر کار سفاکی کی اب اِس کے بغیر زندگی حرام ہے اور وہ اب افسران فوجی کے پھندے میں پھنسا ہے کہ چھٹکارا معلوم۔

سرے با مہوشے دارم کہ خواہد زدستِ او زمین و آسماں داد
من و دِل میر دم از کوچۂ تو ولاسائے بماہم میتواں داد

ہائے دردِ فراق مار ڈالے گا۔ یوں ہی کشتۂ ناز تھے اب فرقت میں کیوں کر بسر ہوگی۔

کشتہ ہوں تیغِ نگاہِ نرگسِ مخمور کا
زخم ہے ہر ایک ساغر بادۂ انگور کا

میں سمجھی تھی کہ اِن کے سبب سے تا دم مرگ ساری خدائی کا آرام ملے گا با آسائش تمام بسر کروں گی اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ یہی میری زندگی تلخ کرے گا۔

ہاتھ سے کچھ نہ ترے اے مہ کنعان ہوگا
ہاں جو ہوگا وہ مری موت کا سامان ہوگا

مِس میڈا نے کہا۔ حکم دیجیے کہ دو گھوڑے فوراً حاضر کیے جائیں اور مِس کلیرسا جائیں گی سواروں نے آن کر بیان کیا کہ اِس کو کوئی اچھی طرح پہچانتا نہیں لہٰذا مِس کلیرسا چل کر دیکھ لیں۔

شہزادی نے کسی قدر خوشی ظاہر کرکے کہا۔ شکر ہے کچھ کچھ جی میں جی آیا۔ شاید بات بن جائے۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی ارے اِن گیدیوں سے خُدا سمجھے۔ ہائے قرولی کی جان کو رو کے بیٹھ رہا۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ دس بارہ کی لاش پھڑک رہی ہوتی۔

میڈا: خواجہ تو آ گئے۔ تم اِس وقت خوب آئے۔ اِدھر آؤ۔

کلیرسا: کیا خبریں ہیں۔ یہ کیا مشہور ہو گیا ہے۔ کچھ بتاؤ تو۔

خوجی: بس اب گفتگو کا موقع نہیں۔ ایک قرولی جلد منگوا دو۔ بس جاتے ہی سواروں کے بیڑے میں گھُس کر ایک ایک کے دو دو اور دو دو کے چار چار کر دوں۔

پھر تو پکار ہو یہ اِدھر وہ اُدھر گرا
وہ نیچہ وہ ہاتھ وہ خود اور وہ سر گرا

میڈا: تم نے کیا خبر پائی۔ یہ بکنے اور جھک مارنے کا وقت نہیں ہے اِس وقت آزاد کے کام آؤ۔ اور ان کی مدد کو جاؤ قرولی سے کیا مطلب نکلے گا۔

خوجی: نا بابا من بدریغ ہیچ پروائے ایں امور نبست چہ کہ من در دگلے والی پلٹن شاہی کہ ہم سنگ اختری و جعفری پلٹن بود ملازم شدہ بودہ است۔

من آنم کہ اسپان شہ پرورم
بخدمت دریں مرغزار آمدم

راوی: ماشاء اللہ چشمِ بد دور۔ اللّٰہم زد فزد۔

گلیرسا: یہاں ابھی ایک سوار نے آن کر کہا کہ آزاد یہاں سے دو کوس پر گرفتار ہو گئے خدا جانے صحیح ہے یا غلط۔ تم کسی سے دریافت تو کرو۔

خوجی: جس مکان میں تھے اُس میں ہیں یا نہیں ہیں۔

کلیرسا: یہ تو نہیں پوچھا۔ دریافت کرنا چاہیے۔ اگر نہیں ہیں تو سمجھو کہ نکل بھاگے تھے۔ اور گرفتار ہو گئے، اور ہیں تو سُبحان اللہ جھوٹی خبر ہے۔

مَیڈا: ہاں یہ تو خوب بات ہے۔ اب تک ناحق چُپ چاپ بیٹھے رہے اِتنی دیر سے معلوم ہوا ہے مگر خاموش بیٹھے ہیں۔

خوجی: واہ ری میری عقل اور واہ رے ہیں، اور واہ رے میرے حواس کہ کبھی رتی کبھی ماشہ کبھی تولہ تو وجہ کیا چُنیا بیگم سے صحبت گرم رہی ہے۔ ہائے ہائے کر رہی ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جس مکان میں آزاد تھے۔ اس میں آدمی بھیج کر دریافت تو کریں۔ بس اس فراست ہی پر تو مَن بدیع کو ناز ہے۔

کیوں نہ صدقے تری دانش کے مَیں ہو جاؤں بدیع
اُنگلیوں پر تو فلاطون کو نچاتا ہوگا

(اکڑ کر) یہ مقطع کہلاتے ہیں۔

الغرض مِس کلیرسا نے آدمی بھیج کر دریافت کیا اتنے میں سوار آن پہنچے۔ مَیڈا اور کلیرسا بھی تیار ہو چکی تھیں۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر چلیں۔ شہزادی کو سمجھا دیا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے کوئی شے ایسی نہیں، جو ہمارے امکان سے خارج ہو۔ اثنائے راہ میں آدمی مِلا۔ اُس نے مِس کلیرسا کے کان میں کہا (آزاد پاشا وہاں نہیں ہیں) یہ جگر دوز خبر سُن کر کلیرسا کو کمال رنج ہوا، چار ناچار مَیڈا سے بھی کہا وہ بیچاری زار زار رونے لگی۔

کلیرسا: خاموش رہو۔ یہ لوگ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔

مَیڈا: اب تابِ ضبطِ فُغاں کہاں ہے اب تو دِل ہے اور درد ہے۔

دلِ میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

مِس مَیڈا کی حالتِ زار قابلِ افسوس تھی۔ مِس کلیرسا سمجھاتی جاتی تھیں، کہ بہن اگر اس طرح گھبراؤ گی تو زمانے بھر میں مشہور ہو جائے گا، پھر یہ سوار مجھے بھی نہ مانیں گے۔ لیکن مَیڈا کا رنج اور درد دِل کم نہیں ہوتا تھا۔

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دِل فرشِ راہ
پر کوئی اتنا تو سمجھادو کہ سمجھائیں گے کیا

کلیرسا: اب یہاں سے کتنی دُور ہے۔ قریب ہے یا دُور۔

سوار: اب قریب ہے۔ وہ جو درخت ہے اُس کے پورب کی طرف مکان میں قید ہیں۔

مَیڈا: اب ضبطِ گریہ محال ہے۔

کلیرسا: خدارا ضبطِ گریہ کرو۔ ورنہ حال کھُل جائے گا۔

اِتنے میں سواروں نے کہا بس باگ روک لیجیے۔ مس مَیڈا کا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ مگر خاموش سواروں نے کہا اگر حکم ہو تو ہم آزاد کو باہر لائیں۔ مس کلیرسا نے حکم دیا۔ کہ باہر لاؤ۔ دس سوار ننگی تلواریں لے کر اندر سے آزاد کو باہر لائے۔ پہلے مس کلیرسا نے گھوڑا بڑھا کر دیکھا پھر مس مَیڈا نے گو اس وقت یہ شخص سخت مُصیبت میں تھا مگر مَیڈا کے بشرے سے خوشی ظاہر ہوتی تھی۔

اب سُنیے کہ پولینڈ کی شہزادی سے اس آدمی نے (جس کو آزاد پاشا کے فرودگاہ پر بھیجا تھا) جاکر کہا کہ آزاد کو وہاں مَیں نے نہیں دیکھا۔ یہ سُنتے ہی شہزادی نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ خدا کے لیے اُس کی مدد کو جاؤ، ورنہ مَیں اپنی جان دے دوں گی خواصوں نے سمجھایا حضور کس کی مدد کو جائیں، اور کس قسم کی مدد دیں، اور کس سے لڑیں۔ کس کے مقابلے میں آپ کے آدمی آزاد کی اعانت کریں۔

شہزادی: ارے وہاں تم نے کیا دیکھا۔ آزاد تھے یا نہیں۔

آدمی: نہیں حضور وہاں نہیں تھے اِدھر اُدھر دیکھا کہیں نہ پایا۔ بس میں چلا آیا۔ اب کہیے پھر ہو آؤں۔ مگر وہ وہاں نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو کیا مجھے مِلتے نہیں۔

شہزادی: تم نے کسی سے پوچھا تھا یا نہیں۔

آدمی: نہیں حضور مَیں نے نہیں پوچھا۔ مگر اب دریافت کرلوں۔

شہزادی: افسوس صد افسوس۔ ہمارا آدمی اور ایسا گاؤدی۔

آدمی: حضور مَیں نے عمداً نہیں دریافت کیا۔

شہزادی: اچھا اب دو آدمی جاؤ اور گلابی پوش خواص کو ہمراہ لیتے جاؤ۔ وہاں جاکر چپے چپے کو دیکھو شاید کسی مقام پر اس غرض سے پوشیدہ بیٹھے ہوں۔ کہ اگر سوار پتا پائیں تو مقابلے یا مفرور ہونے کے لیے مُستعد ہو رہیں۔

دو آدمی اور گلابی پوش خواص اور ایک مس تجربہ کار اہلکار سب مل کر گئے۔ خیر۔

اب اُدھر کا حال سُنیے۔ مِس کلیرسا نے لوگوں کے دِکھلانے کے لیے اس شخص سے کئی سوال کیے۔

1۔ تم آزاد پاشا ہو یا نہیں۔ اِس کا ثبوت دو۔

2۔ تم یہاں کیوں آئے اور تم سے کس کس آدمی سے خط و کتابت ہے۔

3۔ اگر آسٹریا میں پیدا ہوئے اور اٹلی میں تعلیم پائی تو اٹلی کی زبان اور کوریا کی زبان سے ضرور واقف ہو گے۔

ان تینوں کے جواب یوں دیے۔

1۔ آزاد پاشا کا نام تو ہم نے سُنا ہے۔ مگر ہم آزاد نہیں ہیں۔

2۔ ہم بطریق سیر و سیاحت یہاں آئے۔ خط و کتابت تمام دُنیا میں کسی سے نہیں ہے۔

3۔ ہم اطالیہ کی زبان بول سکتے تھے اور اب بھی کچھ کچھ بول سکتے ہیں کوریا میں ہمارا سن بہت کم تھا، مگر وہاں کے حالات بخوبی یاد ہیں۔

مِس کلیرسا نے پھر سوال کیے۔

سوال : اطالیہ کی زبان میں بلّی کو کیا کہتے ہیں۔

جواب : کلیرسا۔

اُس پر فرمائشی قہقہہ پڑا۔

سوال : کوریا کی زبان میں چڑیا کو کیا کہتے ہیں۔

جواب : مِس میڈا۔

اس پر پھر قہقہہ پڑا۔ میڈا اور کلیرسا سخت خفیف ہوئیں۔

سوال : باپ کے لیے کون لفظ اطالیہ ہے۔

جواب : بیٹا۔ اور بیٹے کے لیے باپ۔

کلیرسا : یہ مسخرہ ہے ساتھ لے چلو۔

ناظورۂ پری رخسار ترائی میں

اور شیروں کا شکار

نیپال کی ترائی میں جو شیرانِ نَرِیاں کا مسکن ہے، ریاست کھریگڈھ کے ڈانڈے کے پاس ایک لق و دق جنگل میں چند شکاری جمع ہیں۔ خودرو پھولوں کی بُو باس، روح کو وجد میں لاتی ہے عندلیب

شیدا گلوں کا دم بھرتی ہیں۔ باد بہاری سے باغ نعیم کی لپٹیں آتی ہیں، اور دل کی لگی کو غنچۂ گل کی طرح کھلاتی ہیں۔ نور کا تڑکا ہے۔ سہانا سماں۔ طرب نشاں۔ سات کوہ پیکر ہاتھی جھومتے ہوئے اس جنگل کی طرف آ رہے ہیں۔ ایک فیل فلک شکوہ پر دو نوجوان طنطنہ و دبدبۂ خسروی سے متمکن ہیں۔ ایک کا سن بیس بائیس برس کا دوسرے کا مسا کر کے اٹھارہ۔ ایک کا نام وجاہت علی دوسرے کا نام معشوق حسین۔ وجاہت علی کا حلیہ سُنیے۔ دُہرا بدن، کرارے ہاتھ پاؤں، کس بل کا جوان، نگاہِ قہر آلود، آنکھیں سیاہ، چہرہ چاند کا ٹکڑا، وضع کچھ انگریزی کچھ ایرانی۔ دوسرے گلبدن کے چہرے مُہرے نک سُک، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت، حرکات سکنات، دیکھ کر سب کی رائے تھی، کہ اگر زنانے کپڑے پنہا دیے جائیں تو بالکل عورت معلوم ہو۔ چھریرا بدن، پتلی کمر، گورے گورے ہاتھ پاؤں، پیارا مکھڑا، تیکھی چتون، نازک بدنی کی قسم کھانی چاہیے۔ وہ صورت زیبا اس حور لقا نے پائی تھی کہ فرشتے دیکھتے تو ریجھ جاتے۔ ملائکہ نورانی اُس بُت بے پیر کا کلمہ پڑھنے لگتے۔ پیچھے پیچھے چھ ہاتھی آتے تھے، اور آگے آگے نواب نامدار، وجم اقتدار کا فیل عظمت نشان ابر کی طرح جھومتا ہوا جاتا تھا۔ جب خاص جنگل میں داخل ہوئے، تو ہاتھی روک لیے گئے۔ ریاست کھیری گڈھ سے نواب صاحب نے ایک واقف کار آدمی لے لیا تھا۔ جو اس جنگل کے مختلف مقامات اور شکار کے طرز سے اعلیٰ درجہ کی واقفیت رکھتا تھا، اس اہلکار نے کہا کہ یہیں پر تھوڑی دیر کے لیے ہاتھی روک لیجیے، تاکہ شیر کا حال دریافت کر لیا جائے، کہ کہاں ہے۔ اس فقرے پر معشوق حسین نے لرز کر کہا۔ اوئی کیا شیر کا شکار ہوگا۔ ہمارے تو ہوش جاتے رہے۔ اللہ کے لیے ہمیں بچاؤ۔ موئے شیر کے نام سے رُوح فنا ہوتی ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ہرنی اور پاڑھے اور مرغابیوں کا شکار کھیلنے چلتے ہیں، ہمیں جُل دے کے لے آئے۔ یہاں بے بسی کے عالم میں جان لوگے، وجاہت علی نے سمجھایا۔ پیاری کیوں گھبراتی ہو۔ تم تو کہتی تھیں۔ ہم بن بن پھرے ہیں۔ اکیلے رہے ہیں۔ بھوت پریت سے نہیں ڈرتے، جادو ٹونے کے قائل نہیں۔ یہ اب کیا ہو گیا کہ ذرا سے شیر کا نام سنا اور کانپنے لگیں۔ معشوق حسین تنگ کر بولی، (اوئی) ذری سارا شیر ہوتا ہے۔ اور وہ اس ہاتھی موئے دیو کے کان پکڑلے تو مس مسا کر بیٹھ جائے، یہ معلوم ہو کہ پہاڑ گر پڑا۔ ایک دفعہ شاہ مینا کی درگاہ جاتے ہوئے نواب محسن الدولہ بہادر کی ڈیوڑھی کے پاس ایک شیرنی دیکھی تھی۔ افوہ (ہاتھ سے دکھا کر) یہ موٹی گردن اور پنجہ جیسے شیر کا۔ اس پر وجاہت علی خاں بہادر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اور فیلبان بھی کسی قدر مسکرایا۔ تو انھوں نے ایک ادائے دلربا کے ساتھ کہا۔ مارے دہشت کے زبان قابو میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہی بات پھر شروع کی۔ کلائی اتنی اتنی چوڑی۔ یہ نگوڑا ہاتھی بس دیکھنے ہی بھر کا ہوتا ہے۔ اس کے بدن میں

خون کہاں۔ بس پانی ہی پانی ہے۔ بادی بدن ہے، ایک باری ہو کر کے جو کٹھرے سے جھپٹی تو میں نے کوچبان سے کہا، ارے قادر جلد گھوڑیوں کو بھگا۔ موئنڈی کاٹے تجھ پر خدا کی سنوار۔ اور خالہ جان کو تو بس غش ہی کی نوبت آ گئی وہ بڑی ڈرپوکنی ہیں۔ وجاہت علی خاں نے تشفی دی۔ کہا اوّل تو شیر کا شکار نہیں ہے، ہرن ہو، خرگوش ہو، یا ایسا ہی کوئی اور جانور ہو۔ دوسرے اگر شیر آیا بھی تو (بندوق دکھا کر) اس کا مقابلہ کر سکے گا؟ بولو۔ اور یہ اٹھارہ اٹھارہ گل چلے کیا اس کو چھوڑ بھی دیں گے۔ ایک سے ایک قادر انداز ہے اور ان میں دو آدمی ایسے بڑھے ہوئے ہیں کہ میں تعریف نہیں کر سکتا۔ آواز پر تیر لگاتے ہیں ملات کے وقت آواز پر ایسا تیر لگائیں کہ نشانہ خالی نہ جانے پائے۔ حکمی نشانہ لگاتے ہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ایسا لطف آئے گا کہ تمام عمر یاد کرو گی، ایسے موقع ہمیشہ ہاتھ نہیں آتے۔ معشوق حسین شیر کے نام سے اس قدر پریشان اور خائف ہوئے کہ چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کہا، تمہیں خاتونِ جنّت کا واسطہ ہمیں بستی بھیج دو، اللہ۔ کب یہاں سے چھٹکارا ہوگا۔ اُف۔ میرا کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ یا علی مشکل کشا مدد کرو۔ (ایسی بُری پھنسی کہ توبہ ہی بھلی) اِس کے جواب میں نواب صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔ (کس سے) معشوق حسین نے تنک کر کہا (اے ہٹو بھی) انھیں دل لگیاں سوجھی ہیں، اور ہم کیا جانے کیا کیا سوچ رہے ہیں۔ شیر ایسا جانور ایک تھپڑ میں دیو کو بٹھا دے۔ آدمی ذری سا بھنگا چلے ہیں شیر کے شکار کو۔ جہالت ہے کہ کچھ اور۔ سامعین کو حیرت تھی کہ یہ کون شخص ہے۔ بالکل زنانی باتیں۔ زنانے محاورے بولتا ہے۔ کوئی زناں منتری ہے۔ فیلبائن متحیّر، خواصی، خدمت گار، ششدر، ساتھ کے لوگ حیران۔ یا الٰہی یہ کون ہے۔ طرح طرح کے خیالات دل میں جاتے تھے۔ مصاحب میدان فکر میں عقل کے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔ ایک ہاتھی پر برکت اللہ صاحب برکتؔ۔ شاعر رفیق خاص اور منشی نندلال رفیق بیٹھے تھے۔ ان دونوں میں اس نازک بدن! مرد کی نسبت گفتگو ہونے لگی۔ برکت اللہ نے کہا یار رنگ برا ہے۔ بڑی بیڈھب ہوئی۔ اب تک اور سب شوق تو تھے ہی اب یہ نیا شوق ہوا ہے۔ ابھی دیکھیے کیا کیا سیکھتے ہیں۔ ع

انداز یار نے ہیں نکالے نئے نئے

نندلال نے کہا اچھا بتاؤ۔ امرد ہے یا عورت، ہم تو جانتے ہیں کہ کس کی چھوکری کو نواب صاحب دم دے کے لائے ہیں، اور مردانے کپڑے پنہا کر یہاں لے آئے یہ باتیں نہیں سنیں۔ مرد کو اوئی اور نگوڑے، اور موئنڈی کاٹے سے کیا واسطہ، یہ مردوں کی زبان نہیں ہے۔ دوسرے ہاتھی پر

محمد شیر خاں افغانی قادر انداز، اور ایک گل چلا تھا۔ خاں صاحب نے کہا کیوں بھئی یہ حضور کے ساتھ ہاتھی پر کون رئیس بیٹھا ہے شکل صورت، چال ڈھال، بات چیت، سے بالکل زنان پن پایا جاتا ہے۔ کبھی اُنگلیاں مٹکاتا ہے۔ کبھی ہاتھ چمکاتا ہے۔ اور نواب صاحب ایسے ریجھے کہ گھُل گھُل کر باتیں کر رہے ہیں۔ گل چلا بولا۔ بھائی صاحب مرد ہو یا عورت۔ خوبصورت ہونے میں شک نہیں۔ حسین ضرور ہے۔ آواز کس غضب کی ہے۔ برسوں گھورا کرے، اور سیری نہ ہو۔ ٹکڑا ہے یا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس کی ادا پر ادا خود لوٹ ہو جائے۔ نزاکت خود اس کی نازک بدنی کی قسم کھائے۔ آپ کے آنے کے قبل نواب صاحب باغ میں ساتھ لے کر ٹہل رہے تھے، کچھ کہہ نہیں سکتا خدا کی قسم کمر بہتر جگہ سے بل کھاتی تھی لچکی جاتی تھی۔ فرمائیے یہ صندلی عمامہ کیوں بندھا ہے، اور یہ دُلائی کیوں اوڑھے ہیں۔ اسی وجہ سے کہ زلف چلیپا چھپی رہے۔ اور جسم کو چورائے رہے مگر۔ ع

تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

کیری بتوں کی آڑ میں کب تک چھپے گی۔ آخر ایک نہ ایک دن ٹکے سیر بازار میں بکے ہی گی۔ ہم سے اور یہ حال چھپا رہے۔ کوئی میلا ٹھیلا خالی نہیں جاتا تھا۔ جب گئے دو تین کو ساتھ لے کر۔ مگر فرق یہ تھا کہ مردانے کپڑے پنہائے لائے ہیں کہتے ہیں۔ اور ہم نے زنانے ہی کپڑے پنہائے تھے۔ (راوی) اے سبحان اللہ۔ اور برابر سیر دکھانے لے جاتے تھے (شاباش بڑے حیا دار ہو) مگر ایک چھوٹ پن۔ نواب صاحب نے بھی کیا۔ باغ میں اِدھر اُدھر دیکھ کر آنکھوں کا بوسہ لیا تھا، میں نے دیکھ لیا، اور ان دونوں کی نظر مجھ پر پڑی، تو نواب کٹ گئے۔ اور اس نے آنکھیں نیچی کر کے نواب صاحب سے کمال طنز کے ساتھ کہا (اب خوش ہوئے)۔ ع

خود ہوئے رُسوا مجھے رُسوا کیا

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ معاً یہ شعر پڑھ دیا۔

شرم گیں آنکھوں کے بوسے لیے گستاخی سے

گد گدی دِل میں ہوئی ان کی حیا سے پیدا

اور بھائی صاحب ہم نے جو دیکھا وہ کسی نے نہیں دیکھا۔ جو زمانہ اِن آنکھوں سے دیکھ چکے، وہ اب کاہے کو دیکھنا نصیب ہوگا۔ نہ غازی الدین حیدر ہوں گے نہ ہم۔ مصاحب الدولہ ہوں گے نہ وہ عیش ہوگا، نہ وہ صورتیں دیکھنے میں آئیں گی۔ نہ وہ سیر نہ وہ دِل لگی۔ اب کہاں۔ مگر حسن وہی ہے۔ عاشق وہی، معشوق وہی، حسین وہی، چاہنے والے وہی، مگر زمانے

کا رنگ بدل گیا۔

رہ گئی حُسن و عشق میں اِک لاگ
آج تک قصّہ فیصلہ نہ ہوا

اتنے میں معشوق حسین نے کئی بار کہا۔ نواب اللہ جانتا ہے، ہم ہاتھی پر سے کُود پڑیں گے۔ بُلا سے جان جائے یا رہے۔ یہ سمجھاتے جاتے تھے۔ ہائیں! ہائیں! جان تمہارے دُشمنوں کی جائے۔ جان ہمارے رقیبوں کی جائے۔ جان اُس کی جائے جو تمہاری طرف دیکھ نہ سکے۔ آخر اتنے آدمیوں کو اپنی جان پیاری ہے یا نہیں۔ کوئی اور بھی چوں کرتا ہے، بہت بگڑ کر نازِ معشوقانہ سے یُوں جواب دیا۔ اتنے آدمی جائیں چولھے کی جڑ میں۔ ان موؤں کو جان بھارو ہوئی ہے۔ یہ گھر سے لڑ کے آئے ہیں۔ جوروؤں نے جوتیاں مار مار کر ان کو نکال دیا، ان کی اور میری کونسی برو بری کوئی چوں کرے یا نہ کرے۔ ہم کو اس سے کیا واسطہ۔ ہمیں اُتار دو۔ ہم اب جائیں گے۔ (اوئی۔ اللہ کیسے بے رحم ہیں، ارے تم ذرا ترس نہیں کھاتے ایسے ڈھیٹ ہو)۔ نواب صاحب نے ہاتھ پکڑ لیے۔ اور کہا تم ذرا تامل کرو میں بندوبست کیے دیتا ہوں۔ کسی بڑا اور تناور درخت پر ایک مچان باندھ دیں گے۔ بس وہیں سے بیٹھ کے دیکھنا۔ معشوق حسین نے کہا۔ اوئی۔ ذری سا مچان اور جنگل کا واسطہ۔ اس میدان بیابان میں اکیلی ڈر نہ جاؤں گی۔ حاشا، بندی اکیلی نہ بیٹھے گی۔ اور کوئی عورت یہاں ہے نہیں۔ اجنبی مردوے کے ساتھ بیٹھا نہ چاہوں۔ تم بھی بیٹھو تو کیا بات ہے۔ نواب نامدار نے کہا۔ جانِ من تمہاری بات حشر تک نہ ٹالوں گا۔ کیوں کر ٹالوں دل و جان، دین و ایمان سب سے زیادہ عزیز ہو، اگر بادشاہ ہوتا تو تمہارے لیے تاج و تخت ننگ سے ہاتھ دھوتا، درویش ہوتا تو خرقہ تقویٰ اُتار کر تمہارا درم ناخریدہ غلام ہو جاتا۔ مگر بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم مرد ہو کر مچان پر بیٹھیں، اور لوگ شکار کھیلیں۔ معشوق حسین نے کہا۔ اچھا ان سب سے کہدو کہ ہمارے دوست کی یہی رائے ہے کہ ہم دونوں آدمی مل کر ایک مچان پر بیٹھیں۔ اور وہاں سے شکار کا لطف دیکھیں۔ یا اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو صاف صاف کہہ دو کہ یہ عورت ہیں اور ہمارا ان کے ساتھ نکاح ہونے والا ہے۔ نواب صاحب نے کچھ دیر کے بعد سوچ کر فرمایا۔ یہ بات محال ہے۔ نکاح تو ضرور ہوگا۔ مگر یہ مشہور کرنا کہ ایک کم سن اور حور لقا کو مردانہ لباس پہنا کر یہاں لائے ہیں۔ نازیبا و نامناسب ہے۔ آئندہ جو تم کہو معشوق حسین مسکرائی اے ہے کیا کسو کا ڈر پڑا ہے، کچھ کسو کا دیا کھاتے ہو۔ تم خود اپنے گھر کے رئیس ہو، اور کیوں صاحب یہ آپ نے کیا فرمایا، کہ نازیبا بات ہے۔ اگر نازیبا بات ہے تو بسم اللہ ہم کو

جانے دیجیے۔ نواب صاحب نے کہا ارے! روٹھ گئیں۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ بھلا ذرا سی بات پر روٹھنا کیا معنی۔ ے اب ذرا ہنس دو۔ تمہیں خدا کی قسم مسکرا دو۔ اللہ ری کج ادائی۔ اُف ری قہر بھری چتون۔

قہر ہے قتل عام کرتے ہیں
ترک ترکی تمام کرتے ہیں
شیخ تم سے پناہ مانگتے ہیں
برہمن رام رام کرتے ہیں
جوہری پر ترے دُرِ دنداں
آب و دانہ حرام کرتے ہیں

بھلا یہ ہماری مجال ہے کہ تم کو خفا کر دیں۔ کیا تاب اچھا صاحب یہی منظور ہے۔ اب تو مسکرا دو۔ تم اور ہم یک جان دو قالب ہیں۔ جھگڑا کیسا۔ مگر ہاں روٹھنے منانے میں بھی ایک لطف ہے، ورنہ جو محبت ہم کو تم سے ہے وہ خدا کرے تم کو ہم سے ہو۔

ہم تم ہیں ایک جان دو قالب
آپس میں بڑی محبتیں ہیں

معشوق حسین نے کسی قدر مسکرا کر نواب خاقان کلاہ کی طرف نظر مہر سے دیکھا تو حضرت کھل گئے اور کہنے لگے۔ شکر خدا، ہزار شکر خدا ہم تو سمجھتے تھے کہ عشق کا قصہ تمام ہو گیا۔ اب حضور روٹھی ہیں بارے صد شکر کہ بختِ خفتہ نے یاری اور طالع نے مددگاری کی، ہیں ہم بھی قسمت کے دھنی۔

چمن چمن یہ نسیمِ سحر پکار آئی
خزاں کا کوچ ہوا بلبلو بہار آئی

اب اس وقت شرطِ محبت یہ ہے کہ بلا عذر ایک بوسہ دو۔ اس سیم بدن نے کج ادائی سے ساتھ کہا، سچ کہیے گا بوسہ دوں، کیوں حضور ایسے دن اور کہاں ملیں گے۔ بوسے کی قیمت تو پہلے لگاؤ۔ نواب صاحب بولے ایک بوسے کے عوض دل دیتے ہیں۔ معشوقہ زہرہ تمثال نے کہا۔ بس ایسا ارزاں بوسہ نہیں بکتا۔ نواب صاحب ہنسے۔ بجا ارشاد ہوا۔ دل کوئی مال ہی نہیں۔

جنس دل آپ گران سمجھے ہیں ایک بوسے پر
دھیان اتنا نہیں کیا دیتے ہیں کیا لیتے ہیں

معشوقہ: آخرش نگوڑی حیا بھی کوئی شے ہے۔ یا بھون کھاتی۔

نواب: حیا کیسی۔ ہم اس وقت ناصح و واعظ کی، اور طرز پر خبر لیتے ہیں۔ حیا کا کیا ذکر ہے۔ حیا کجا۔

کون سنتا ہے تری جوشِ جنون میں ناصح
خضر بھی آئیں تو ہم راہ بتا دیتے ہیں

معشوقہ: جوشِ جنون ہے تو شکار سے کنارہ کش ہو جیے۔ ورنہ مجنوں کی روح استقبال کے لیے آئے گی۔ سمجھے حضور۔

نواب: مجنوں کون۔ کس طفل مکتب کا نام لیا۔ مجنوں لونڈا تھا۔

ہم وہ مجنوں ہیں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلۂ کعبہ لکھا کرتے تھے القاب ہمیں

مجنوں ہمارے سامنے زانوے ادب نہ کرتا تھا۔ ہم وہ ہیں۔

اتنے میں آدمیوں نے عرض کیا۔ پیر و مرشد، سامنے ایک کچھار ہے اس میں ایک شیرنی بچوں سے پاس بیٹھی ہے یہی موقع ہے ریاست کا اہلکار کہتا ہے کہ ہاتھی اسی دم پیل دیجیے۔ اس قدر سننا تھا کہ نواب صاحب نے اہلکار کو بلوایا۔ اور خدمت گار کو حکم دیا کہ ان کو ایک شالی رومال اور پچاس اشرفیاں آج ہی دینا۔ ہاتھی کے لیے پیل کا لفظ خوب لائے۔ سبحان اللہ۔ واہ نواب صاحب ضلع جگت کے بھی حضور قدر دان ہیں۔ اَللّٰھم زِد فزد۔ اس جگت بازی کے قربان۔

کل مصاحبین اور رفقا نے طنطنہ توصیف بلند کیا۔

ایک: اے سبحان اللہ۔ واہ، میرے شہزادے کیوں نہ ہو۔ آفریں۔ آفریں۔

دوسرا: حاتم کا نام مٹانے والے یہ رئیس ہیں کیوں نہ ہو، واہ۔

تیسرا: قسم ہے والد مبرور کی تربت عنبریں کی۔ اگلے وقتوں میں حاتم کا نام مفت ہی مشہور ہوا۔ وہ بادشاہ بحر و بر تھا۔ اگر ہماری سرکار کے پاس اس قدر سلطنت اور خزانہ ہو تو اس سے بڑھ کر نام کریں۔ حق تعالیٰ تا صد و سی سال زندہ رکھے۔

چوتھا: آمین آمین۔ واہ داتا کیوں نہ ہو۔ درویشوں کی دعا ہمیشہ تیری رکاب کے ساتھ رہے۔ (ایک درویش تھے)۔

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دِل کو
آباد رکھے داتا ساقی تیری محفل کو

پانچواں : اللہ رے جود۔ اور اللہ رے فیض اور اللہ ری سخاوت اور اللہ ری قدر دانی اور اللہ ری ریاست کچھ ٹھکانا ہے۔ ع

کہ اِک دِن دو شالے دیے دس کروڑ

راوی : بہت بڑھ گئے اَودھ کے ایک بادشاہ کی تعریف میں ایک شاعر غرّا نے قصیدہ کہا تھا۔ جب ظِلِ سبحانی کے رُوبرو پڑھا گیا۔ تو اس مصرع پر بد دماغ ہو گئے۔ ع

کہ اِک دِن دو شالے دیے سات سے

کسی شاعر نے رقابت کے سبب سے کہہ دیا، کہ جہاں پناہ تو ایک روز میں چودہ چودہ سو دو شالے تقسیم کر چکے ہیں۔ یہ سات سے کہتا ہے۔ فوراً حکم ہوا کہ آپ تشریف لے جائیں۔ قصیدہ قابلِ سماعت بندگانِ جہاں پناہ کے کاہ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ صاحب ہوتے اور بھی بڑھ جاتے۔ فرماتے۔ ع

کہ اِک دِن دو شالے دیے دس کروڑ

سُبحان اللہ۔ چاندی تھی۔ خلعت و جاگیر ملتی۔ مَلِک الشعرا کا خطاب ملتا۔ چین کرتے۔ مقربانِ سلطانی کے مزاج میں دخیل ہوتے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ رُس ہو جاتے۔

نواب : اچھا سب تیار ہوں۔ اور کچھار کی طرف ہاتھی لے چلیں۔

معشوقہ : ہائے مرے اللہ۔ یا مُشکل کشا۔ ارے لوگو یہ کیا اندھیر ہے۔ ہائے دن دھاڑے اندھیر مچایا۔ اے آخر اتنوں میں کسی کے جورو، وورو، بھی ہے۔ یا سب نہنگ لاڈلے بے فکرے اُٹھاؤ چُولھا ہی ہیں۔ واسطے کبریا کے اِن کو سمجھاؤ، روکو۔ اتنی سی جان گولی لگی اور انسان ٹیں سے رہ گیا۔ آدمی میں ہے کیا اور چلے ہیں شیر کے شکار کو۔ اس حماقت سے خدا سمجھے۔ اللہ کرے شیر نہ ملے۔ نواب کے سر کی قسم جاتے ہی جانتے رُوح فنا ہو جائے گی۔ کیوں مُحبّت کرتے ہو۔ ہم گُھٹ گُھٹ کے مریں گے۔ موئی نکٹی۔ (بلّی سے تو ڈر) معلوم ہوتا ہے، جو کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوتی ہوں اور گلی نکل جائے تو سہم جاؤں میں شیر کی صورت کیوں کر دیکھ سکوں گی۔ بھلا اتنا بتاؤ کہ بندھا ہوگا، یا کُھلا ہوا۔ تماشے میں ہم نے شیر دیکھے تھے مگر کٹہروں میں بند تھے۔

راوی : حضرت ناظرین اب سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون ناظورہ نسترن بناگوش ہیں۔ کوئی پری پیکر خاتون سرکس کا تماشا دیکھنے گئی تھیں۔ یہ وہی ہیں۔ تب پردہ نشیں تھیں۔

افزوں ہے ترا حُسن حسینان چگل سے
سب بزم ہے مشتاق نکل پردۂ دل سے

شکار کا اور حال سُنیے۔

نواب ثریا جاہ و خاقاں کلاہ نے تنو تھمبو کر کے، اپنی معشوقہ شیریں حرکات، رنگین ادا سیمیں بدن، مشتری لقا کو اس بات پر راضی کیا کہ اس پیل دمان پر سے شکار کی سیر دیکھیں مگر شرط یہ کر لی کہ دو ہاتھی اِدھر اُدھر رہیں گے۔ تاکہ اس شعلہ رو پر آنچ نہ آنے پائے۔

اتنے میں دو پاسیوں نے جو جنگل کے ایک ایک چپے سے واقف تھے آن کر کہا کہ شیرنی کچھار سے چلی گئی۔ اب لوگ اِس کے تعاقب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا کہ ایک اسپک بیش بہا اس مقام پر نصب کیا جائے۔ خیمہ آیا۔ اپنے گلفام اور نازک خرام دوست کو لے کر خیمے میں داخل ہوئے۔ معشوق حسین نے کہا جانِ من، اب تو سب پر کھل گیا کہ تم دُلہن ہو پھر اب اس گھونگھٹ کے طلسم کو توڑو۔ لباس گران بہا حاضر ہے۔ زیب تن کرو، اور نکھر کے چلو یہ بات بھی یاد رہے گی کہ ایک بیگم صاحب بہادری کے ساتھ شیر سے جانور کا شکار کھیلنے گئیں۔ بیگم صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ اے واہ۔ جو شریف زادی سنے گی اپنے دِل میں یہی کہے گی کہ نوج ایسی ڈھیٹ کسی کی بہو بیٹی ہو۔ شریف کی لڑکی اور یہ دیدہ دلیل۔ کہ شیر کے شکار کو جائے۔ بھلے مانس کی بہو بیٹی کے یہ معنی ہیں کہ جنگل کے کُتے کا نام سُنتے ہی بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جائے۔ اکیلے کمرے میں بُلاؤ۔ آئے تو تھر تھر کانپنے لگے۔ خواب میں بھی رسّی دیکھے تو چونک پڑے۔ ہاتھی چنگھاڑے تو سہم جائے۔ نہ کہ شیر کا شکار جس سے موئی گنوار نیں بھی ڈر جائیں۔ اچھی پٹی پڑھاتے ہو۔ نواب صاحب نے کمال اصرار کیا کہ، اپنی خاص پوشاک زیب بر کرو اور سولہ سنگار کر کے باہر چلو۔ بیگم صاحب نے نکھار کیا تو جو بن دو چند ہو گیا۔ گیسوئے عنبر مو لیلتہ القدر، جبیں مبیں مطلع الفجر۔ چین ابرو تیغ جوہر دار، غیرتِ لعُبتانِ چینی، رو کشِ خوبان فرخار۔ مصحف رُخ سجدہ گاہ آتش پرستان۔ ابروئے کج قبلہ اکفر گزینان۔ عجب حُسنِ خداداد پایا تھا۔

اگر دیدی رُخِ آن ماہ پیکر
خلیلِ بت شکن میگشت آذر

یوں تو خُدا کی خُدائی میں ایک سے ایک پری چہم، برق دم معشوق ہے۔ مگر اس کی آن بان کا عالم ہی اور ہے۔

بہ نورِ خوبش بتاں راچو آفرید خُدا
ترا ازاں ہمہ در حُسن برگزید خُدا

زلف کیا بلائے بے درماں تھی۔ وہ کالی ناگن جس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

نہ زلف است آنکہ ہر دم بر قدِ دلدار می پیچد
زمستی ہر نفس بر شاخ صندل مار می پیچد

اور موباف مرقع و سرخ نے اور بھی ستم پر ستم ڈھایا۔

رشتہ ہائے سرخ را بالائے سر چون بستہ اند
بر سر ہر تارِ موئے تہمتِ خون بستہ اند

رسیلی نشیلی آنکھوں نے جادو کر دیا۔ نواب صاحب اسیرِ زندان عشق ہو گئے۔

دو چشم مست مخمورش ببرد آرام ہشیاراں
دو خواب آلودہ بر بود خواب از چشم بیداراں

ایک نظر غلط انداز زہاد کو بت پرست بنائے۔ وہ نگاہِ مست کہ پیر مغان تک کو مرید کرے۔

چوں سواری یکہ تازے گر سیاہ آید برون
از صفِ مژگان خوں ریزش نگاہ آید برون

غمزۂ دلربا اور غشوۂ ستم گر، قیامت کبریٰ کا نمونہ تھا۔ ستم ڈھاتا تھا۔

غمزہ آموز دچشمش شیوۂ بیداد را
طرفہ شاگردے کہ میگوید سبق اُستاد را

نواب صاحب کی یہ کیفیت تھی، کہ ٹکٹکی باندھے، اسی شوخ و شنگ رشکِ گل رخانِ فرنگ کو گھورتے تھے۔ اور وہ عربدہ جو قوس ابرو کبھی تبسم ناز سے ان کے دل حرمان منزل پر بجلیاں گراتی تھی۔ کبھی ناوک نگاہِ مست سے ہوش و حواس اُڑاتی تھی۔ ایک ایک اشارے میں لاکھ لاکھ انداز تھے۔ ستم کے نخرے قیامت کے ناز تھے۔

سر تا قدمش کرشمہ و ناز
ہم سر کشِ حُسن و ہم سر انداز

نواب: جانِ من۔ خُدا کے لیے ایک بوسہ، شکر ریز، دو تو جی اُٹھوں۔

بیگم: اے ہے۔ کیا موئے پر سو درے۔ خاصے جیتے جاگتے، ہٹے کٹے بیٹھے ہیں مگر مردوں میں ملے جاتے ہیں۔ اب کی شب برات کو فاتحہ پڑھ دیں گے۔

نواب: اگر بوسہ نہ لینے دوگی تو ہم کو جنون ہو جائے گا۔

اے خدا نخواہم دلِ دیوانہ　　ہائے ہائے گریۂ مستانہ
سینہ از نالہ رشکِ شعلہ زار　　خوشۂ آہے پُراز تخم شرار
تا چو برق از سوزِ دل خنداں شوم
در ہوائے خویش بال افشاں شوم

بیگم: آج جنگل میں کٹاؤ ہوگا۔ دس بیس کی جان جائے گی۔

نواب: خُدا خیر کرے۔ آج تو قیامت کبریٰ سے دوش بدوش ہو۔ آتش زن کالائے دین، غارتگر حواس و ہوش ہو۔ مگر جیسی رنگین ادا ہو، ویسے با وفا نہیں ہو۔

آفاقہا گرديده ام مہر بتاں ورزيده ام
بسيار خوباں ديده ام ليکن تو چيزے ديگرى

خُدا کا شکر ہے کہ ایسی مہ پارہ عابد فریب ہمارے ہتے چڑھی۔ سونے کی چڑیا ملی۔ ع
ہزار شکر خُدا صد ہزار شکر خُدا

بیگم: کہیں پھر سے اُڑ نہ جائے۔ ہاں ذری اس کا خیال رہے۔

یہ شکر لب شیریں حرکات اس لطف و نزاکت سے بولتی تھی کہ گویا لبوں سے قند گھولتی تھی۔ نواب نامدار عاشق زار بے قرار تھے۔ بغل در آتش۔ یہی جی چاہتا تھا کہ ساعد سیمیں کو چوم لیں کبھی خواہش ہوتی تھی کہ عارض رنگیں کے بوسے لیں۔ کبھی درِ دندان پر انجم کو نثار کرتے جاتے تھے۔ کبھی زلف چلیپا دیکھ کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ اس ناظورۂ طاؤس زیب کا ہر عضو بدن، بجائے خود ایک معشوق تھا۔ اور یہاں ایک دل

اِلٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں
ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستان میں

اور اس حُسن گلوسوز اور جمال تجلی شعلہ پر طرہ یہ کہ چُلبلاہٹ اور اچپلاہٹ لگاوٹ اور بناوٹ اور سجاوٹ نے اور بھی قیامت بپا کی۔

یکے خوبرو بر و بودی دگر آرا ستی خود را
بتا معلوم شد ما را کہ قصدِ جان ما داری

نواب: تو آج حضور قتل عام کریں گی۔ خُدا بے گناہوں کو بچائے۔

بیگم: گناہ اور بے گناہ یہاں سب یکساں ہیں۔

نواب: یاالٰہی اچھا بوسہ تو دو۔ پھر آخر قتل تو کرو ہی گی۔
بیگم: آپ چاہے جتنی باتیں بنائیں بوسہ ملنا معلوم۔
نواب: خیر صاحب معشوق ہو۔ پری ہو۔ دِلرُبا ہو۔ نہ دو۔

شاد باش اے دِل کہ فردا روز بازار جزا
مژدۂ قتل ست گرچہ وعدۂ دیدار نیست

ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔ خیر یاد رکھیں گے۔

بیگم: (سُنو ہاتھ میں ہاتھ دے کر) اللہ جانتا ہے ہمیں نہ لے چلو۔
نواب: اچھا تم یہاں ہی رہو۔ ہم جاتے ہیں۔ شام تک واپس آئیں گے۔
بیگم: اوئی۔ اے لو اور سُنو۔ یہ کیا کہی ہے۔ ہم اس ہو کے عالم میں اکیلے رہیں اور تم جاؤ۔ بھلا تم سے جایا جائے گا۔ اچھا جاؤ۔ یوں ہی سہی۔ بس مُحبّت کا حال معلوم ہو گیا تم مردوے بے وفا بے مروّت۔ ایک کے ہو کے رہنے والے کب ہو اپنے مطلب کے دوست ہو۔ خود غرض۔ خود مطلب۔ تم سے اُمید وفا کُجا۔ ع

بے وفائی میں طاق ہو تم لوگ

ایک مولوی صاحب کا لڑکا ہمارے مکان کے پڑوس میں رہتا تھا۔ زمیندار تھے اور علم بہت اچھا تھا۔ لڑکے کا سن کوئی اٹھارہ و اُنیس برس کا۔ اور ہم کوئی بارہ تیرہ برس کے تھے۔ ایک دن میں کوٹھے پر پتنگ اُڑا رہی تھی بال کُھلے ہوئے زیور سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی۔ مہری کے ہاتھ میں اُچکا ٹکلی پا ماہی جال کا لال پتا کنکوا بڑھایا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ کون موئی کا ٹا دور سے تاک جھانک کر رہا ہے۔ میں نے دوپٹا اُتار کر پلنگ پر رکھ دیا اور پیچ لڑانے لگی۔ اے اِدھر تو ہم پیچ لڑاتے تھے۔ اُدھر وہ صاحبزادے آنکھیں لڑاتے تھے۔ میں نے کنکوے کے کنّے ناتھ لیے اور کاٹنے ہی کو تھی۔ کہ مہری نے آہستہ سے کہا۔ (حضور ذری اِدھر تو دیکھیں) دیکھتی ہوں کہ اٹھارہ اُنیس برس کا ایک خوبصورت لڑکا سر ننگا کوٹھے پر کھڑا نظر آیا۔ بس کنکوا و نکوا چھوڑ کے بھاگی اور جھپٹ کے کمرے میں چلی گئی ٹاٹ باف بوٹ ایک پاؤں سے نکل گیا۔ دوسرے پاؤں کا پھُندنا ٹوٹ کے گر پڑا۔ باؤلا چھٹک گیا۔ سبز بوٹے دار اطلس کا پائجامہ پہنے تھی۔ پنڈلی کے پاس چوسے بولا دروازے کی کیل کا برا ہو چُبھ گئی۔ ایسی بھگدڑ پڑی کہ بس کچھ نہ پوچھو نواب صاحب نے ہنس کر کہا۔ ہائے اس وقت کی کیفیت بھی خالی از لطف نہ ہوگی۔ ہائے وہ گھبرا کے بھاگنا اور اس کم سنی کے عالم میں سوچنا کہ دوپٹا زیب دوش، حلقۂ گوش نہیں ہے۔

نامحرم نے اس حالت میں سراپا دیکھ لیا۔ اس وقت گورے گورے گالوں کا رنگ کئی بار سرخ سے سفید، اور سفید سے سرخ ہو گیا ہوگا۔ اور وہ بدن کو چورائے ہوئے بھاگنا قیامت ڈھاتا ہوگا۔ بیگم صاحب نے سلسلۂ سخن پھر شروع کیا، وہاں بس کمرے جا کر ہم نے اوٹ میں سے دیکھا تو برس اٹھارہ ایک کا۔ مگر ہڈی چوڑی بہت بھدا کھل تھل یا پچپس نہ تھا، بدن کسا ہوا اور عطر میں ایسا بسا ہوا کہ ہمارے کوٹھے تک مہک رہا تھا۔ شربتی کا انگرکھا اور نکے دار ٹوپی، اور چھوٹے پنچے کا مخملی بوٹ، زرد رنگ کا، گھڑی لگی ہوئی۔ چوڑیے کا چست گھٹنا۔ مَیں دیکھتے ہی ریجھ گئی۔ چھیڑنے کے لیے آوازِ بلند سے کہا، اے مہری ذرا کسو سے پوچھو تو کے بجے۔ وہ تو مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ آپ نے گھڑی کھول کر کہا۔ حضور چھ کا عمل ہے۔ یہ کہہ کر ہمارے کمرے میں طلائی گھڑی مع زنجیر کے پھینک دی۔ مَیں نے مہری سے کہا اُٹھا لے مہری نے گھڑی اُٹھالی۔ اور مَیں نے ذرا سا دروازہ کھول کر کہا۔ اب ہمیں کھٹکا ہو گیا۔ اس پر بہت مسکرائے کہا، سُبحان اللہ۔ حاضر جواب اور تیز طبیعت بھی ہو۔

نواب: کمرے میں گھڑی کدھر سے پھینکی یہ ہم نہیں سمجھے۔

بیگم: مُنھ کے آگے ناک سُوجھے کیا خاک۔ دروازے کی طرف سے پھینکی ہے۔ اور کدھر سے پھینکتے۔ کیا مشکل بات ہے کہ سمجھ ہی میں نہیں آئی۔

نواب: ہاں اچھا پھر۔ یہاں تک نوبت آئی کہ بات چیت ہونے لگی۔ پھر کیا ہوا یا بس اس قدر باقی پھر خیر صلاح۔

بیگم صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوا۔ اماں جان پر یہ بات نہیں کھلنے پائی۔ اِدھر مَیں اُدھر وہ تڑپتے تھے۔ مگر توبہ توبہ ایک روز کہیں دعوت تھی۔ اماں جان نے ہمیں بیش بہا کپڑے پہنائے اور اس دن ایسا نکھار تھا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ مَیں بہت روئی۔ لب پر بتخالہ۔ زبان پر تالہ۔

اماں جان نے سمجھایا کہ بیٹا روتی کیوں ہو۔ بڈھا کھوسٹ آج موا کل دوسرا دن۔ موا کب تک جیے گا۔ مُنھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، بہت جیا مہینہ بیس دن۔ قبر میں ایک پاؤں لٹکا ہی چُکا ہے۔ اب کی ہم تمھیں کسی گبھرو کے ساتھ بیاہیں گے۔ خاطر جمع رکھو۔ مَیں نے دُعا مانگی کہ اللہ کرے بوڑھا جنیث جلد مرے۔

نواب: وہ کون تھا۔ مَیں یہاں پر کچھ سمجھا نہیں ہوں۔

بیگم: وہ میاں تھے ہمارے۔ ابا نے روپے کی طمع سے ہمیں اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیا تھا۔

بارے خدا خدا کر کے وہ خبیث مُوا۔ اور ہم نے گھی کے چراغ جلائے۔ ایک دن بے حیائی کر کے ابا جان سے کہہ دیا کہ ہمیں مولوی صاحب کا لڑکا پسند ہے۔ اسی کے ساتھ نکاح ہو۔ اسے پہلے تو منظور کر لیا اور پھر اُڑن گھاٹیاں بتانے لگیں۔ کہا شریفوں میں دوسرا نکاح عورت کا جائز نہیں ہے۔ بس تڑ کا ہو گیا۔ عشق نے ہمیں اندھا کر دیا۔

شد دلم از کار و بارِ عقل سرد　　　گفتم انکہ با ہزاران سوز و درد

خیر مقدم اے جنونِ نیک فال　　　اے توام شیرِ نیستان خیال

ساختی بیگانہ ام از کفر و دیں　　　خوب کردی صد ہزارت آفریں

در ہوائے بوئے آن گل پیرہن　　　زرد میگردد غبارم در کفن

عشق را بنود بغیرے احتیاج　　　می ستاند از شہاں ایں عشق تاج

عشق چہ بود مایۂ ترتیب بود　　　عشق چہ بود نور خورشیدِ وجود

پردہ دار کبریا عشق است عشق

آب ایں نہ آسیا عشق است عشق

نواب: پھر مطلب نکلا یا فوت ہو گیا۔ عشق بھی بلائے بے درماں ہے۔

بیگم: (آہ سرد بھر کر) ہائے کیا جانے کیا کیا اس وقت یاد آتا ہے۔

نواب: بڑی سخت بلا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی اِس کے پھندے میں پھنسے۔

شاہنشۂ بے نبرد عشق است

سلطان خرابہ گرد عشق است

بیگم: چوٹ کھائے دِلوں سے کوئی پوچھے۔ ہائے کیا بُری چیز ہے۔

نواب: ہم بھی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ ایک نہیں کئی بار۔ برابر جان سے بیزار ہیں۔ زندگی تو تھی۔ مگر شکر ہے کہ تم کو پایا۔ شکر خدا۔

نواب صاحب کا بحر جنون جوش زن ہوا۔ اب تک مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ اب وامق و فرہاد کے ادب آموز ہوئے۔ مزاج کا اصلاح پر آنا محال ہو گیا۔ اشک خونیں مثل سیل فنا آنکھوں سے جاری ہوئے اور آہستہ آہستہ یہ غزل زبان پر لائے۔

حاصل زگریہ اے دل خانہ خراب چیست　　　آخر ترا چہ شیوہ دایں اضطراب چیست

نظارہ ام نریخت اگر رنگ تازگی　　　برگلشنِ جمالِ تو ایں آب و تاب چیست

نگذشتہ بہ محفلِ دُردے کشاں اگر درپیرہنت ایں مہ بوئے شراب چیست
جائے کہ درمیانہ ہم اختلاط نیست دزدیدن نگاہ چہ باشد عتاب چیست
انشاؔ اگر قسم ایں کہ نداری خیالِ عشق
ایں آہِ سرد وایں چہ چشم پر آب چیست

اس وقت تم نے ایسی باتیں چھیڑ دیں، کہ ہمارا دل بھر آیا۔ کہاں خوش وخرم تھے، کہاں آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ ہائے افسوس وائے افسوس۔

ہیچ چیزم بغیر درد نماند جز لب خشک وروئے زرد نماند
حیف واماندہ ایم قافلہ را اثرے شد نشان گرد نماند
وادی وخضر رہ دریں وادی کہ توان پیروِیش کرد نماند
با کہ سازیم عزم ہمسفری کاندریں راہ رہ نورد نماند
تا بکے عشق وے کشی انشاؔ
درجگر ہم یک آہ سرد نماند

اللہ باقی من کل فانی۔ اللہ بس باقی ہوس۔ خیر جو ہوا وہ ہوا۔

گر عشق زعفران صفتت چہرہ زرد کرد
چوں وچرانمی سزدت ہرچہ کرد کرد
از شوخیِ نگاہِ توائے حوروش مرا
در سینہ دل طپید بجائے کہ درد کرد
چوں عشق یار سرزدہ از پردہ سرکشید
بازار گرم جوشیِ زہاد سرد کرد۔

جانِ من از برائے خدا۔ اب تم تشفیِ دل کرو۔ خدا کا واسطہ۔

اب کون چھپائے ناظرین خود ہی سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ پرکالۂ آتش ثریا بیگم ہیں یعنی اللہ رکھی۔ جوگن۔ شبّو جان اور مس پالن بھی یہی تھیں۔ تھانہ دار کے پاس سے بھاگ کر گاؤں میں اِدھر اُدھر سراسیمگی کے ساتھ پھرتی تھی، کہ ایک چوکیدار ملا۔ پوچھا کون۔ کہا مسافر۔ راہ بھٹک گئی۔ اگر کوئی ہمرا ہو تو رات بھر وہاں رہوں تڑکے چلی جاؤں چوکیدار بولا میں نے آپ کو پہچان لیا۔ آپ وہی ہیں جو جوگن ہو گئی تھیں۔ ثریا بیگم کسی قدر جھجکیں تو اس نے کہا نہیں نہیں آپ جھجکیں نہیں۔ میں سب

جانتا ہوں۔ وہ جو چارپائی پر آن کر ٹکے ہیں۔ انھیں کے ساتھ آپ، آئی ہیں۔ ان سے آپسے کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ رُوٹھ کے چلی آئی ہو۔

بیگم: ہاں ہے تو یہی بات، مگر کسی سے ذکر نہ کرو تو احسان ہے۔

چوکیدار: کیا مجال۔ چوکیداری تو مرے حالوں کی۔ مَیں تو شاہی میں خدمت گاری کرتا تھا۔ نوابوں اور رئیسوں کی سرکار میں رہا ہوں۔

بیگم: اچھا پھر اب اس وقت میں کہاں جاؤں۔ اور کہاں رہوں۔

چوکیدار: میرے گھر پر۔ مگر وہاں جگہ بہت خراب ہے۔

بیگم: واہ اس گئے گذرے حال میں محل کی کس کو خواہش ہے۔

چوکیدار: پھر چلیے۔ حاضر میں حجت نہیں۔ غائب کی تلاش نہیں۔

بیگم: مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، ورنہ ہماری عزّت جائے گی۔

چوکیدار: کیا مجال مجھے کچھ مل جائے گا۔

بیگم صاحب چوکیدار کے ساتھ چلیں۔ اور کوئی بیس بائیس منٹ میں داخل مکان چوکیدار ہوئیں۔ چوکیدار کی بیوی نے چارپائی بچھا دی اور اُس پر ایک صاف ستھری چٹائی۔ بیگم صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر کے سو رہیں۔ تڑکے اُٹھ کر کہا کہ اب ہم کہاں جائیں، اور کیوں کر جائیں۔ چوکیدار بولا آج یہاں میلہ ہے۔ آج ٹک جاؤ۔ کل شام کو ڈولی پر چلی جائیے گا۔

خیر دن تو کسی نہ کسی طرح بسر ہوا۔ شام کو دو چار گھڑی دن رہے میلہ جما ہوا، چوکیدار کے مکان کے پاس ایک جھونپڑے پر پادری صاحب وعظ کہنے لگے۔ بوڑھا آدمی اَسّی برس کا سن بلکہ اس سے بھی زیادہ پستہ قامت، کمر خم، وعظ کہنا شروع کیا تو بہت سے آدمی اِدھر اُدھر جمع ہو گئے۔ ہندو مسلمان، چوڑے چمار، دُھنیے جولاہے۔

ایک: اچھا یہ بتا دو کہ اگر ہم عیسائی ہو جائیں تو کیا دو گے۔

پادری: خداوند تعالیٰ تم کو اجر نیک دے گا، اور تم اننت جیون پاؤ گے۔ اور تمہارا خدا اور اس کا بیٹا تم سے خوش ہو گا[1]

منطقۃ البروج شہریاری۔ خورشید مشرقستانِ جہانداری افشاں جبیں عظمت۔ گیسوے

---

[1] یہاں سے آگے کا کچھ مضمون رہ گیا ہے جس کا اندازہ آئندہ عبارت سے ہوتا ہے جو بے ربط ہے۔ سنہ ۱۸ اور سنہ ۶ اور۔

غدار حشمت۔ غواصِ قلزم سروری و امارت۔ گوہر کان بہتری و ریاست، نواب عالی جناب محمد وجاہت علی خاں بہادر، ولایتی شکاری لباس زیب بدن کرکے اسپک سے باہر برآمد ہوئے۔ نگار سیمیں بر سیم اندام ستمگر قیامت خرام چھم چھم کرتی نازواداکے ساتھ قدم دھرتی خیمے سے انا البرق کہتی ہوئی آئی جس نے دیکھا غش کرنے لگا۔ جنگل میں منگل ہے۔ الٰہی یہ صیدگاہ ہے، یا پریوں کا دنگل ہے۔ خدا کرے اس خیمے سے دس پانچ ایسی ہی پریاں پر کھولے ہوئے آئیں۔ عاشق تن مُنھ مانگی مُراد پائیں۔ الٰہی یہ خیمہ ہے یا صنم خانہ۔ یہ جنگل ہے یا حوروں کا کاشانہ۔ سُبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ کیا پیاری پیاری صُورت دیکھنے میں آئی۔

کہکشاں مانگ ہے، مُنہ چاند ہے، خال اختر ہے
ہالہ ہے تیرے گلے میں مہِ انور توڑا

نواب فرخندہ طالع نے اس آتش رخسار کے دست سیمیں میں ہاتھ دیا، اور مُسکرا کر کہا، پیاری اس وقت تو سج دھج کٹاؤ ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے، کہ کوئی پری کوہ قاف سے پر کھولے چلی آتی ہے۔ جنگل مقتل ہوجائے گا۔ خرامِ ناز سے ہنگامۂ محشر بپا کروگی، ایسا نہ ہو کہ تمہارا عاشق شوریدہ اپنی جان سے جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہونے پائے۔ سُن لینا کہ۔

آغازِ عشق ہی میں ہمیں موت آگئی
آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

اس مہ وش عاشق کش، نے ہاتھ چھوڑ کر ٹھنک کے کہا۔ بس یہ منحوس باتیں ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ مرنے جینے کا کون ذکر ہے۔

نواب فرخ کیش بولے۔ سُنیے حضور جو آپ بدمزاجی کریں گی تو ہمارا دل بھی بدمزاج ہوجائے گا۔ اتنا خوب یاد رکھیے۔

بدمزاجی دلِ بیمار کی لاحول و لا
روگ لایا تو بہت دِق وہ مسیحا ہوگا

بیگم: ازبرائے خدا۔ ذرا حیا سے کام لو۔ ان سب کے سامنے ہمیں رسوا نہ کرو۔ ہماری حیا پروری کی خود حیا قسم کھاتی ہے۔ حیا بھی سامنے آتی ہے تو آنکھ بند کر کے۔

درخلوتے کہ آئینہ بیدار بودہ است
ہرگز زشرم بند قبا وانہ کردہ ام

وہ شریف زادی کیا، جو شرم و ادب سے مُنہ موڑے۔ بے حیائی سے ناتا جوڑا ہے۔ حیا مقدّم ہے۔
مگر تم بڑے بے شرم سخت بے حیا ہو۔ اتنے آدمی کھڑے ہیں اور تم کو کچھ خیال ہی نہیں۔ اے سبحان اللہ
ایسی بھی کیا بے شرمی۔ بے شرمی کی کچھ حد ہے۔

نواب: اس حیا کے صدقے۔ اس شرم کے قربان۔

از تو محبوب ترے یاد ندار ایّام
بوئے گل چاک ندید ست گریباں ترا

بیگم: اب یہاں کھڑے کھڑے کب تک مصلحتیں کیا کرو گے۔ اب چلو۔

نواب: ان غمزوں کے صدقے، اس جلوے کے نثار، حُور ہے حُور ہے۔ بلکہ حُور سے زیادہ دور از قصور
ہے۔ پرستان کی پری ہے غضب کی جلوہ گری ہے۔

جلوۂ آن سرو قامت دیدہ ام
یا بچشم خود قیامت دیدہ ام

بیگم خفا ہو کر ایک کُرسی پر بیٹھ گئیں۔ کہا بس اب ہم نہ جائیں گے۔ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر
ہو جائے چاہے جو ہو ہم نہ جائیں گے۔ جانے کا نام کسی نے لیا، اور ہم تھر تھر کانپنے لگے۔

نواب صاحب نے قدموں پر ٹوپی رکھ دی مار ڈالو قتل کر و مگر اُٹھو۔ ورنہ گُھٹ گُھٹ کے جان
جائے گی۔ بیگم صاحب نے کہا اچھا یوں ہی سہی۔ خنجر لاؤ تو گردن پر پھیر دیں۔ اس پر حضور نے قہقہہ لگایا
اور یہ شعر پڑھا وزیر علی صبا۔

محو ابرو کے لیے خنجرِ فولاد آیا
ذبح کرنا بھی نہ تجھ کو مرے جلاد آیا

ہزاروں قسمیں دیں کہ اب قصور معاف کرو للہ اُٹھ کھڑی ہو۔ خدا خدا کر کے بڑے اصرار سے
اس صنوبر خرام گلفام نے کہنا مانا، اور بصد نازِ دلربا اُٹھیں۔

در چمن یار چو با آن قد و قامت برخاست
سرو بنشیت بدعوی و قیامت برخاست

افغانی کو اس کا خرام ناز ایسا پسند آیا کہ معاً یہ شعر زبان پر لایا۔

جلوۂ آن سروِ قامت دیدہ ام
یا بچشم خود قیامت دیدہ ام

نواب : اخاہ آپ بھی ریجھے ۔ شانِ خدا اتنے ہوئے اللہ اللہ۔

افغانی : مصنور والاعمدہ شے مقبول خاص و عام ہوتی ہے ۔ بیشک یہ حسین عورت ہر کو ٹیک ٹیک (ٹھیک ٹھیک) مطبوع ہوگا ہندوستان ہو یا پٹھان ۔

شاخ گل دیوانہ شد از قامتِ دل جوی اُو
باغباں تعویذ بست از غنچہ بر بازوی اُو

ایسی زن حسین چشم فلک نے کم دیکھا ہوگا ۔ آنے دار ور۔

من باین زفتار شیریں عمر خود در باختم
عمر من میرفت و من پنداشتم رفتار دوست

پری بیگم نے کہا، دیکھا ئیں کیا کہتی تھی کہ جب نکھروں گی تو قتلِ عام کروں گی، وہی ہوا اب اس وقت قتلِ عام ہو رہا ہے یا نہیں ۔ قتل کے یہی معنی نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ تلوار اور خنجر آبدار سے قتل کرے قتل یہ کہ جان نہ نکلے مگر زندگی نہ ہو، سو ہاں رُوح ہو جائے ۔ وہ بات حاصل ہے ۔ مگر جو عاشقِ زار اور عاشق صادق ہیں وہ ہر حالت میں معشوق کا دم بھرتے ہیں کبھی اُف تک نہیں کرتے ۔

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کان سوختہ را جان شد و آواز نیامد
این مدعیاں در طلبش بے خبر انند — کان را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس پٹھان کو دیکھو کیا کیفیت ہوگئی ضبط نہ کر سکا ۔ حُسن ایسی ہی بلائے بے درماں ہے میں نے ابھی چشمِ فسون پرواز کو قتل کی گھاتیں سکھائی کہاں ہیں ۔

راوی : واہ وہ خود سیکھی سکھائی ہیں ۔ ظالم مظلوم نما۔

زُلف را گفتہ صحن سائی کند — قتلِ عامے از خود آرائی کند

اِدھر زلفِ سیہ اُدھر رُخِ زیبا ۔ دونوں نے دِل لُوٹ لیے ۔

نواب : آخر کسی درد کی دوا بھی ہو یا دِل ہی لگانا آتا ہے ۔ ع

تجھے تو اوبت کا فر فقط ترسانا آتا ہے

بس اور کچھ نہیں آتا ۔

بیگم : یہی ہمارا کام ہے، اور اس میں ہم طاق ہیں ۔

خوبرو کج کلاہاں صُلح و صفا نیز کنند — غنچہ سازند دل و کارِ صبا نیز کنند

افغانی : اے صورتِ زیبائے تو رشکِ بتاں آذری — تو از پری چابک تری وز برگ گل نازک تری

نواب: بس بس اب شعر خوانی رہنے دیجیے اپنا کام کیجیے۔

چوکیدار: خداوند دو شیر جنگل میں نظرائی[1] دیے ہیں اب بھی موقع ہے۔ ورنہ شیرنی کی طرح وہ بھی بھاگ جائیں گے۔ اور پھر شکار نہ ملے گا۔

آدمی: شیرنی بھی آگئی ہیں دیکھے آتا ہوں موجود ہے۔

بیگم: آدمی کیسے موئے جان کے دشمن ہیں۔

حکم دیا گیا کہ ہاتھی کو بٹھاؤ (بری) کہہ کر فیلبان نے ہاتھی بٹھایا۔ نواب صاحب نے کہا زینہ لگاؤ۔ بیگم صاحب نے ایک زینہ پر قدم رکھا، اور اوئی کہہ کر اتر گئیں۔ پھر تو تھمبو کر کے نواب صاحب لائے۔

نواب: اس دفعہ تو بے جھجک بیٹھ گئی تھیں، اب کی ڈرتی ہو۔

بیگم: اے لو اس باری کہا تھا کہ مرغابیوں کا شکار ہوگا۔

نواب: شیر کا شکار آسان ہے مرغابی کا شکار مشکل ہے۔

بیگم: اے کیوں نہیں کیسا کچھ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں یہ بھرے کسی اور کو دینا روح لرزتی ہے کہ خدا کیا ہوگا اُف اُف!

نواب: ہوگا کیا؟ کچھ بھی نہیں ایک دفعہ شکار دیکھ لوگی بس جھجک جاتی رہے گی چلو چھٹی ہوئی۔

بہ ہزار خرابی بیگم صاحب بیٹھیں۔ نواب صاحب بھی متمکن ہوئے۔ حوالی موالی سب بیٹھے اور ہاتھی جھومتے ہوئے قطار باندھ کر چلے۔ تو ثریا بیگم کو آزاد یاد آئے۔ اور جو جو باتیں آزاد سے ہوئی تھیں، وہ یاد کر کے آبدیدہ ہوگئیں، جو فقرے اللہ رکھی نے آزاد سے اس وقت کہے، جب یہ سرائیں ٹکے تھے، اور بعزم روم بمبئی جاتے تھے۔ وہ یہ ہیں۔

(مجرا عرض کرتے ہیں) اے بندہ پرور ذری ادھر نظر کیجیے یہ مہینوں کی راہ طے کر کے ہم صرف آپ ہی کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ ہم سے آپ کو ایسی نفرت ہے کہ آنکھ تک نہیں ملاتے۔ واہ ری خوبی قسمت، اب ذرا سر تو اٹھائیے۔ گردن تو ہلائیے۔ وہ چاند سا مکھڑا تو دکھائیے۔ ہائے کیا ستم ہے۔ جن پر ہم جان دیتے ہیں وہ ہماری صورت سے بیزار ہیں۔ بقول صفدر۔

دل اور جگر خون ہو چکے ہیں حواس تک اپنے جا چکے ہیں
وہی محبت کا حوصلہ ہے ہزار صدمے اٹھا چکے ہیں

---

[1] دکھائی کے بجائے نظرائی استعمال کیا ہے۔

کیسے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں۔ ذرا ہم کو اُن کا جوبن دکھا دو۔ ہم نے سُنا بادِ بہاری کی طرح چمن میں ناز کرتی پھرتی ہیں۔ کبھی طاوس طناز کے مثل جھوم جھوم کر چلتی ہیں۔ کبھی بجبروں پر سیرِ دریا کو جاتی ہیں کبھی ہمجولیوں کو لے کر جشن اُڑاتی ہیں۔ اور نام خدا ابھی سولہ سترہ برس کا سن ہے۔ اور ان دنوں تو بناوٹ سجاوٹ پر اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔

مصاحب اِن روزوں آئینہ ہے سنگار اُن کو مشغلہ ہے۔
کبھی پٹی کبھی ہے سُرمہ کبھی ہے غازہ کبھی حنا ہے۔ نوان کے آگے سے کھینچتا ہے وہ نیرے سے آگے ہے انجمن میں۔

غرض کہ آئینہ کا بھی طوطی عجب حسینوں میں بولتا ہے۔ کیوں بندہ پرور۔ ہم بک رہے ہیں یا بھونک رہے ہیں۔ (رُخساروں پر ہاتھ پھیر کر) ہمارا ہی لہو پیے جو اِدھر نہ دیکھے۔ ایک نظر ذرا اِدھر بھی۔

آزاد: جناب باری کی قسم صرف تمہیں کو دیکھنے آیا ہوں۔

اللہ رکھی بولی خیر اتنی تو ڈھارس ہوئی کہ مرنے کے بعد ہمارا قاتل آنسو بہائے گا۔ لیکن کیا۔!

آئے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے
خاک اُڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

آزاد نے کہا اللہ رکھی اب ہماری عزت و آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو جلاؤ چاہو تو نہ جلاؤ۔ اگر ہم تمہارے معشوق ہیں تو ہمیں دق نہ کرو۔ ورنہ اب ہم سنکھیا ہی کھائیں گے۔ اور اسی دم جان دیں گے۔ اگر ہماری موت منظور ہو تو خدا کی قسم کمر کس کر مرنے پر آمادہ ہو جائیں اور اگر ہماری زیست چاہو تو ہمیں آزاد کر دو۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

اللہ رکھی بولی سنو آزاد۔ ہم بھی شریف زادے ہیں۔ کوئی ایسی ویسی نہ سمجھنا مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ ہم پاجیوں کی طرح سرا میں بھٹیاری بن کر رہیں۔ میں ایک شریف کی لڑکی ہوں، اور نادان ہم کو اس قدر جلد بھول گیا یاد ہے کہ ہمارے بوڑھے میاں نے تم سے ہمارے لیے خط لکھوایا تھا۔ تم ہمارے گھر کا پتا ڈھونڈھتے ہوئے آئے تھے۔ اور ہماری تمہاری چار آنکھیں ہوتی تھیں پھر

ہم ایک دن فنس پر سوار ٹھسّے سے جاتے تھے۔ مہری فنس کا کونا دبائے چمکتی ہوئی ساتھ ساتھ تھی۔ کئی دن تک آپ ہم پر لٹو رہے۔ آخر کار آپ تو نفرّد ہو گئے اور ہمارے بوڑھے میاں نے انتقال کیا۔ ہم کم سن کوئی چودہ پندرہ برس کی عُمر۔ وہ دقیانوس کے ہم عصر۔ ہمیں اُن کی صورت سے نفرت تھی۔ پوپلا مُنہ دانت چوہے کے نذر کر چکے تھے۔ کمر بہتر جگہ سے خم بھوں تک سفید حلوا دن رات کھائیں۔ آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ قوتِ سامعہ سے بے بہرہ۔ ہائے ہماری اماں جان نے ہمیں کس موئے بوڑھے کے ساتھ بیاہا تھا۔ دن رات ہم کڑھا کرتے تھے۔ ہماری جوانی مفت میں ضایع جاتی تھی۔ آخر کار تو وہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہی تھے، چل بسے۔ جس دن اُن کے مرنے کی خبر آئی ہم نے مسجد میں گھی کے چراغ جلائے۔ لیکن ہماری اماں نے پھر ہماری شادی نہ کی۔ ہم کو یہ سوجھی کہ گھر سے بھاگیں۔ لیکن اللہ جانتا ہے جو ننگ و ناموس میں فرق آیا ہو۔ تم سے بیاہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر تم یہ سمجھ کر کہ بھٹیاری کو کیا بیاہیں نکاح پر راضی نہ ہوئے۔ اب ہم نے سُنا ہے کہ حُسن آرا کے ساتھ تمہارا نکاح ہونے والا ہے اللہ مبارک کرے۔ خیر گھڑی بیاہ ہو۔ اچھی ساعت نکاح ہو۔ اب ہم اپنے آپ اجازت دیتے ہیں خوشی سے بیاہ کیجیے۔ پیاری پیاری دُلہن کے ساتھ نکاح کیجیے۔ چشمِ ما روشن دلِ ماشاد۔ لیکن ہمیں نہ بھول جانا لونڈی بن کر رہوں گی مگر تم کو نہ چھوڑوں گی۔ نہ چھوڑوں گی۔

ثریا بیگم کے روبرو آزاد کی تصویر کھنچی تھی۔ انھیں نہ شکار کھیلنے کو جی چاہتا تھا۔ نہ جنگل کے مختلف اشجارِ رفیع اور طرح طرح کے جانوروں پر نظر ڈالتی تھیں۔ خیال فقط یہی تھا کہ آزاد سے کیوں کر ملیں۔ بے اختیار آزاد آزاد دو تین بار زبان سے نکل گیا۔ مگر بڑا ضبط کیا اور بات ٹال کر خاموش ہو رہیں۔

اب سُنیے کہ ہاتھی جھومتے چلے تو ایک جھیل کے قریب پہنچے۔ اور ساتھ کے آدمیوں نے جو رہبر تھے کہا کہ جھیل میں پانی ایک قد آدم ڈباؤ ہے۔ ہاتھی بہت جلد نکل جائیں گے۔

بیگم : کیا کہا۔ اوئی کیا اس سمندر میں سے جانا ہوگا۔

راوی : سمندر! بجا۔ سمندر تو ذرا سا ہوتا ہے۔ سمندر تو اس بحر بے کنار کے ایک چھوٹے سے سوتے کا نام ہے۔

نواب : تم خاموش رہو۔ اور ہماری رائے پر سب باتیں چھوڑ دو۔

بیگم : اے واہ اچھے آئے۔ خاموش کیوں رہیں۔ ہمیں یہاں ڈبونے لاتے ہو۔ ذری ہاتھی کا پاؤں پھسلا اور چلیے غڑاپ پانی کے اندر غوطے کھانے لگے۔

نواب صاحب نے بہت سمجھایا اور ہاتھی جھیل کے اندر چلے تو بیگم صاحب نے آنکھیں بند کرلیں.
غل مچایا کہ جلدی نکل چلو. کبریا کے لیے ٹھہرنا دیر نا نہیں.

پانچ ہاتھی تو ساتھ ساتھ چلے. دو پیچھے تھے. نواب صاحب نے پھر اصرار کر کے کہا کہ آنکھیں کھول دو.
اب اس وقت آدھی دور تو چلے آئے ہیں آدھی دور اور باقی ہے. ثریا بیگم نے آنکھیں کھولیں تو پانی کی روانی اور جھیل کی کیفیت دیکھ کر کمال مسرور و محظوظ ہوئیں. کناروں پر اشجار رفیع عجب لطف دکھاتے تھے جو تھا سربفلک کشیدہ. کوئی درخت جھیل کے پانی کو چومتا ہے. کسی کی شاخیں طرح طرح سے جھیل کی طرف جھکی تھیں اور جانوران صحرائی کا ہاتھی اور انسان کو دیکھ کر بھاگنا خالی از لطف نہ تھا.

بیگم : اب ہمیں ڈر نہیں معلوم ہوتا. بلکہ سہانا سماں دیکھ کر دل خوش ہوگیا. مگر اللہ کرے شیر آج کوئی نہ ملے. یا میرے اللہ میری دعا قبول کر.

نواب : خدا نہ کرے. خدا کرے کوئی شیر ببر نظر آجائے.

بیگم : واہ. آجائے کیا مجال ہے. ہم منتر پڑھ دیں گے.

نواب : خیر اچھا. بھلا شکر ہے کہ آپ اتنی ہوئیں تو.

بیگم : اس کے کیا معنی. میں تم سب کو بتاتی ہوں. ڈر کیسا ملکوں ملکوں، جنگلوں جنگلوں پھری ہوں. کوئی کوہ و دشت و ہامون ایسا نہیں جس میں ہم نہ گئے ہوں. راتوں کو برسوں اکیلے رہے.

نواب : خدا کرے کہ تم سچ کہتی ہو.

بیگم : ہے ہے اگر شیر سچ مچ کہیں نکل ہی آئے تو غضب ہو جائے. اُف سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں. یا میرے اللہ.

ہاتھی جھیل کے باہر نکلے تو جان میں جان آگئی.

اس جھیل کے اُس پار کچھار تھا اور اُس کچھار میں ایک مادہ شیر خونخوار اپنے بچوں کو لیے ہوئے عظمت و جبروت خسروی کے ساتھ بیٹھی تھی کھیدے کے آدمیوں نے کہا حضور اب ہاتھی روک لیے جائیں. شیرنی یہاں سے تھوڑی ہی دور پر ہے. مگر بہت بڑی شیرنی ہے. ثریا بیگم کانپ اُٹھیں. کیا! ہے ہے (ہاتھ مل کر) ہائے یہ کیا ہوا. یہ موئی شیرنی کہاں سے نکل آئی یا تو اُس کو قضا لائی ہے. یا ہم کو. دو میں سے ایک کی قضا آئی ہے. نواب صاحب نے کہا پھر اب تو فکر بے کار ہے.

حمد بعد اُس خدائے پاک کو
نور ایمان جس نے بخشا خاک کو

اسی سے کہا ہے کہ صبر مفتاح فرج ہے۔ اِنّ اللہ مع الصابرین والشاکرین۔

منشیں ترش از گردشِ ایام کہ صبر

گرچہ تلخ ست ولیکن برِشیرین دارد

حکم دیا گیا کہ کھیدا کیا جائے۔ بیس آدمی بڑے بڑے کتّے لے کر کچھار کی سمت دوڑے اور خوب غل مچایا۔ اتنے میں ہاتھی قرینے سے قطار قطار کھڑے ہوئے اور دور سے روشنی نمودار ہوئی۔ ثریا بیگم بہت سہمی ہوئی تھیں مگر یا اینہمہ شکار میں ایک قسم کا لُطف بھی آتا تھا۔

بیگم: یہ روشنی کیسی ہے۔ وہ سامنے نظر آتی ہے۔

نواب صاحب نے کہا، شیرنی نکلی ہوگی۔ شاید حملہ کیا ہو۔ اسی سبب سے روشنی کی گئی کہ ڈر کے بھاگ جائے۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ روشنی سے منزلوں بھاگتا ہے۔ اِس سے ثریا بیگم کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ کہا شکر ہے کہ کسی شے سے ڈرتا تو ہے۔ اچھا پھر جو طرفہ روشنی ہو تو کیسا ر

ہاتھی آگے بڑھے۔

اوشالا پھیل کا بان

کیا؟ پھیل کا بان، سبحان اللہ پھیل کا بان خدا جانے کس زبان سے یہ لغت حضور نے پسند کیا۔ اوّل تو پھیل کے معنی ہی نہیں معلوم۔ پھیل کرامیگو یند۔ ہائے اس وقت خواجہ بدیعا نہ ہوتے۔ ورنہ معاً فارسی بولنے لگتے۔ گیدی کے بغیر لُطف ہی نہیں آتا۔ مگر گیدی خواجہ بدیعا خالی خولی نہ ہوں۔ قرولی ضرور ساتھ ہو۔ ورنہ خواجہ بدیع الزمان جھلائیں گے۔ خیر خوجی کو جانے دیجیے۔ اب پھیل کے بان کا ذکر سنیے۔

نواب قمر رکاب فیل فلک شکوہ پر سوار تھے۔ ناظور و طاؤس زیب، عابدِ نظر فریب، برق دم، پری چھم ثریا بیگم ساتھ تھیں۔ ہاتھیوں پر گل چلے۔ قادر انداز۔ آواز پر نشانہ لگانے والے۔ شیر کے مقابلہ کرنے پر آمادہ۔ مگر ثریا بیگم کی عجب حالت تھی۔ یہ اوّل مرتبہ تھا کہ یہ پری پیکر رشکِ قمر جنگل میں شیر سے جانور کے شکار کے لیے آئی۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ مگر اس لطف تماشا کو دیکھ کر طبیعت کسی قدر بشاش بھی تھی۔

اب سنیے کہ شیرنی نے جب حضرتِ انسان کی آواز سنی تو گھبرائی۔ مگر بچوں کو اُس وقت دودھ

بلا رہی تھی۔ اُن کو کچھار کے ایک ایسے مقام پر لے گئی جہاں انسان کا گذر محال تھا۔ کھیدے کے لوگ سمجھے کہ شیرنی بھاگ گئی۔ لہٰذا بڑی جرأت کے ساتھ انھوں نے نواب صاحب کو اطلاع دی کہ شیرنی کچھار سے بھاگ گئی۔ اب اُس کا تعاقب کیجیے۔ ثریّا بیگم یہ مژدہ طرب انگیز سُن کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ کہا خوب ہوا۔ شیرنی بھاگ گئی نا۔ نواب کھیلو شکار۔ بڑے وہ بن کے چلے تھے۔ ہماری دعا اور مقبول نہ ہو کیا مجال۔ اب حضور فرمائیں کہ ہماری دعا قبول ہوئی یا آپ کی شیرنی بھاگ گئی نہ۔ اچھا پھر کیا ہوا۔ اب دن تھوڑا رہ گیا ہے۔ دوسرا شکار ملے گا نہیں۔ (تالیاں بجا کر) اے لو آج کا دن بیکار ہوا۔ چلے تھے دعا مانگنے اور ہم نے کہہ دیا تھا کہ اللہ حسینوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ جمیل ویحب الجمال۔

خدا خوبصورت کو عزیز رکھتا ہے۔

خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے
ارادہ کون سے در پر کروں میں داد خواہی کا

نواب : اللہ اللہ۔ حضور ایسی ہیں۔ اچھا خدا نے چاہا تو شیر ببر سے سامنا ہو۔ واللہ۔ قسم کھائی ہے آج بے شکار کیے تو نہ جائیں گے۔

بیگم : تمہیں بائیں ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔ شیر کا شکار کھیلے بغیر جاؤ۔ بس اب کھانا نہ کھانا۔ اور نہیں۔ نواب نامدار رئیس اعظم تو تھے ہی۔ قسم کھائی کہ جب تک شیر کا شکار نہ کریں گے کھانا نہ کھائیں گے۔ اور اس قسم کے مطابق عمل بھی کیا۔

افغانی : حضور۔ ممکن ہے کہ شیر آج نہ ملے مگر یہ قسم کھانا کہ کھانا ہم نہیں کھائیں گے بات تیک (ٹھیک) نہیں ہے۔ اور جوت (جھوٹھ) بولنا ہم اور ہماری ولایت کا لوگ جانتا ہی نہیں۔

نواب : اس بارے میں اصرار فضول ہے۔ ہم ہرگز کھانا نہ کھائیں گے۔ جب تک شیر کا شکار نہ کریں گے۔ اس میں چاہے رات ہو جائے چاہے دو دن گذر جائیں اور شیر کا جنگل میں نہ ملنا کیسا؟

بیگم : بات تو یہی ہے۔ خدا تمہاری بات رکھ لے۔

افغانی : ام (ہم) نہیں جانتے۔

الا یا ایہا السّاقی اَدِر کاساً و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

بنگ پینا نیک ہے مگر بنگ کا مزہ دل لگی نہیں۔ بہت مشکل ہے اس کا مزہ۔

نواب : دلگی نہ کہو۔ دل لگی کہو۔ آغا سمجھا۔

افغانی : ام (ہم) خوب سمجھتا (سمجھتے ہیں) مگر۔

من بندہ حضرتِ کریم
پروردۂ نعمتِ قدیم

بیگم : نواب۔ خدا کے لیے۔ اب بھی چلے چلو۔ آخر تم پر کوئی جن سوار ہے۔ یا کسی نے جادو کر دیا ہے یہ ماجرا کیا ہے۔ اب دن کتنا باقی ہے۔

نواب : دو گھڑی۔ تین گھڑی مگر ہم شکار ضرور کریں گے۔

بیگم : ارے لوگو کوئی ان کو سمجھاؤ۔ یہ کسی کا کہنا مانتے ہی نہیں، کوئی صلاح دینے والا بھی ہے۔ یا نہیں۔ واہ وا۔ میاں واہ۔

برکت : حضور یہ صحیح فرماتی ہیں۔ اب سب بھوکے پیاسے ہیں۔ حضور اب سب کے حال پر رحم کریں۔ ورنہ سب کے سب ہلکان ہو جائیں گے۔

نواب : ہم کو کسی کا غم نہیں ہے۔ کچھ پروا نہیں۔

برکت : مانا مگر حضور۔ اوروں کا تو خیال ہے یا وہ بھی نہیں۔

اے آنکہ بہ اقبال تو در عالم نیست
گیرم کہ غمت نیست غمِ ماہم نیست

نواب : لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیّ العظیم۔ آخر یہ آپ لوگ اصرار کیوں کرتے ہیں۔ ہم بغیر شکار کے نہ جائیں گے نہ جائیں گے۔ ہرگز ہرگز نہ جائیں گے اگر آپ لوگ ہمارے رفیق ہیں تو ہمارا حکم مانیے۔

رفقا نے دست بستہ عرض کیا۔ خداوند۔ ہم سب جان نثار ہیں۔ جو حضور کا حکم ہو فوراً بجا لائیں۔ افغانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر معاً ہاتھی سے اُتر پڑا۔ اور شمشیرِ اصفہانی لے کر کہا۔ بچہ ہم سپاہی زادہ ہے۔ تلوار کے مُنہ مرنا اور جان دینا ہمارے لیے معراج ہے۔ شیخ کا شعر ساری دُنیا کو یاد ہے اور وہ ہمارا مسلک ہے۔

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندر میانِ خاک و خون بینی سرے

اب ہم شیر کے باپ سے لڑے گا (لڑے گا) ہم نیت پٹھان ہے۔

بیگم : کیا کہتا ہے۔ نیت کیا۔ ہم تو سمجھے ہی نہیں۔

نواب : یہ پٹھان آدمی ہے۔ ٹ کا تلفظ نہیں کر سکتا۔ نیت کے معنی ٹھیٹھ اور پٹھان کے معنی

پٹھان۔ یہ کہتا ہے کہ ہم ٹھیٹھ پٹھان ہیں۔
بیگم : چولھے میں جائے ایسی زبان۔ خدا سمجھے ان سے۔
نواب : یہ کیوں؟ اپنی اپنی زبان ہے۔ اس میں کسی کا کیا اجارہ ہم لوگ ان کی پشتو زبان نہیں بول سکتے پھر کیا ہم گنوار ہیں۔
بیگم : گنوار پنے کو تو چولھے میں ڈالو۔ اب یہ بتاؤ کہ یہاں سے چلوگے کب۔ اب کتنا دن باقی ہے۔ شام ہونے کو آئی اور شکار کا پتا ہی نہیں۔ پھر اب یہاں ٹھہرنا بے وقوفی ہے۔ یا کچھ اور کھانے نہ پینے کے مفت کی ٹھائیں ٹھائیں۔ بے کار وقت ضائع کرنا۔ ارے آخر کوئی تو ان کو سمجھاؤ۔ اللہ جانتا ہے تم کو جنون ہو گیا ہے۔
برکت : حضور ہی کے سب کانٹے بوئے ہیں۔ حضور ہی نے کہا۔ کہ اب جب تک شکار نہ ملے تب تک دائیں ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔ وہ تو رئیس زادے ہی ہیں۔ آگئے جھانسے میں۔ ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

یہ سب حضور ہی کی قسم کی پابندی ہے۔
بیگم : جھوٹے سے خدا سمجھے۔ دیکھو تو مُوا کیسی چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے۔ ارے ان کو ایسے طرار مصاحبوں نے لوٹ لیا۔ حضور شکار کو چلیں۔ حضور فلاں عورت کو بُلوائیں۔ ایسی بیسوا اس ملک میں تو نہیں ہے۔ تم پر خدا کی مار شیطان کی پھٹکار۔ اللہ کرے آسمان ٹوٹ پڑے موئے نابکار۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کھیدے والوں نے کہا خداوند اب ہوشیار رہیے۔ شیرنی آتی ہے۔ یہ آئی وہ آئی۔ ہوشیار۔ خبردار۔ اب عرصہ نہیں ہے۔ کچھار چھوڑ کے پورب کی طرف بھاگی تھی۔ اُدھر ہم لوگوں نے روشنی کی وہاں سے بڑی خونخوار ہو کر پھر کچھار میں آئی۔ اور اپنے بچوں کو لے کر پاس ٹھہری۔ ہم لوگ کلّے پر پہنچ گئے۔ تو قیامت کا سامنا تھا۔ ایسا بھری کہ الامان۔ الامان۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت پھر آئے۔ اس زور سے ڈکاری کہ ہوش اُڑ گئے۔ حواس بیترا بدل کر گئے۔ تیس آدمی ساتھ گئے تھے۔ دو خدا جانے کہاں رہ گئے۔ اٹھائیس آدمی ساتھ تھے۔ اٹھائیسوں بھاگ گئے۔ اُس وقت قدم جمانا محال تھا۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی گولی لگاتا ہے۔ تو آگ ہو جاتا ہے۔ بس پھر گولی کے باپ کو نہیں مانتا اگر بم کا گولہ بھی ہو تو وہ اس طرح پر آئے گا جس طرح توپ کا گولہ آتا ہے۔ اور شیرنی کا قاعدہ ہے کہ اگر اپنے بچوں کے پاس ہو اور ساری خدائی کے گولے اور گولیاں لے کے کوئی آوے تو بھی ممکن نہیں کہ اُس کے بچوں پر آنچ آسکے۔ کیا مجال۔ تو حضور اس وقت وہ اپنے بچوں کے پاس بیٹھی تھی اور ہم لوگ وہاں

پہنچے. بس اس درجہ خونخوار ہوئی. کہ الاماں. الاماں .

بیگم : بندھی ہے یا کھلی ہوئی ہے. تماشے والوں کے شیروں کی طرح کٹہرے میں بند ہے نہ. یا بالکل کھلی ہوئی ہے. بندھی ہوگی نہ .

رفقا : ہاں ہاں حضور بیگم صاحب. بندھی ہوئی ہے .

بیگم : اُف. دھک سے رہ گئی تھی. اس کو باندھا کس نے ہو گا. ہم جانتے ہیں یہ سارا کھیل جادو کا ہے. جادو برق ہے. کرنے والا کافر.

نواب : جادو تو حضور کی نگاہ میں ہے. یا حضور کی زبان میں.

اثر لبھانے کا پیاری ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

بیگم : اے ہے. اللہ اللہ. آپ اور ہم کو بنائیں. شکرِ خدا .

نواب : ہاں. اب ہم ایسے گئے گذرے. خیر صاحب .

اب ایک لطیفہ سُنیے. ایک ہاتھی پر دو بنگالی تھے. یہ بیچارے سیر و شکار سے کچھ واسطہ نہیں رکھتے تھے. انھوں نے صرف اس قدر سُنا تھا کہ نواب صاحب شکار کے لیے جاتے ہیں. اگر یہ معلوم ہوتا کہ شیر کے شکار کو جاتے ہیں تو کروڑ برس تک نہ آتے. سمجھے تھے کہ جھیلوں میں پرند جانوروں کا شکار ہو گا یا. شاید ہرن کا شکار ہو. جب یہاں آئے اور سُنا کہ شیر کا شکار ہے تو روح فنا ہوگئی. ایک کا نام بابو کالی چرن گھوش دوسرے کا نام شب دبب بوس تھا. ان دونوں میں گفتگو ہونے لگی. ذرا غور کرکے سُنیے گا. وہو ہذا.

بوس : مہاشائی. یہ تو بُری بات ہوئی. ہم کو نواب نے بڑا دھوکا دیا. ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں. دوست نہیں ہے.

گھوش : اوشالا. یہ لوگ ہمارا دشمن ہے. اچھا ہم ان سے سمجھے گا. اوشالا پھیل کا بان. ہمارے کو مت لے جائے گا.

راوی : کیا خوب پھیل کا بان. اس کے معنی ناظرین نہ سمجھے ہوں گے پھیل کے معنی فیل و پھیل کا بان. اس کے معنی فیل بان.

اب آپ پوچھیں گے یہ لفظ (کا) کہاں سے آیا. یہ بابو صاحب کی ایجاد خاص ہے. فیل بان کو اُنھوں نے (پھیل کا بان) کہا اس بے تکے پن کے صدقے. اوشالا پھیل کا بان. بے اختیار ہنسی آتی ہے. گُجا فیلبان. گُجا پھیل کا بان. فیلبان ہنسوڑ آدمی تھا اس نے جو دیکھا کہ بابو صاحب گھبرائے ہوتے ہیں

اور گالیاں بک رہے ہیں تو ہاتھی کو اور بھی تیز کیا اور دونوں بابوؤں کے دل پر اس قدر صدمہ ہوا کہ الامان والحذر۔ ایک نے کہا۔ او بھیل کا بان اُو شالا۔ دوسرا بولا باپ رے باپ۔ ارے اب ہم لوگ کا جان جاتا ہے بابا۔

فیلبان نے ہاتھی کو اور بھی تیز کیا، یہ تو دونوں صاحب بکمال منتشر ہوتے اور اس قدر گھبراتے کہ اگر موقع ملتا تو ہاتھی سے کود پڑتے۔

بوس : اوشالا۔ تم ہاتھی کا بان کا شالا ہے کون ہے۔

گھوش : اوشالا بھیل کا بان (دھوتی سنبھال کر) واہ اچھا ہم مجسٹریٹ صاحب کے ہاں تمہارے کا نالیش (نالش) کرنے کا۔ اوشالا تم ہمارے کی جان کا بیری ہے۔ تم بھیل کے بان کو پھیر دے گا۔

راوی : من چہ فش ام، برادر فلاں مابسیار فش است حضور کے ہاتھی تو بھیل کا بان۔ فیلبان کو کہتے تھے۔ اور حضور فرماتے ہیں بھیل کے بان کو پھیر دے گا۔ ان سے بھی بڑھ گئے۔

گھوش : ارے بابا۔ ہم لوگ جانے نہیں مانگتا۔ شیر شالا کا مکالبہ (مقابلہ) کون کرنے سکتا۔ ہم لوگ لکچر دینے مانگتا۔ اوشالا ارے اوشالا بھیل کا بان۔

فیلبان : (ہنس کر) بابو جی۔ ڈرو نہیں ابھی تو شیر دور ہے۔ جب ہودا بجر جائے گا تب دل لگی ہو گی۔ گالیاں دیتے جاؤ بس ایک ہی دفعہ بدلاؤں گا۔ دل لگی نہیں ہے۔ شالا شالا کہتے جاؤ۔

بوس : ارے بھائی تم ہمارے کا باپ۔ ہمارے باپ کا پتا۔ ہم ہاتھی کو پھیرنے مانگتا۔ اوشالا۔ تم آرام زادہ (حرام زادہ)۔

فیلبان : (ہاتھی کو تیز کرکے) اچھا بابو۔ دیتے جاؤ گالیاں خدا کی قسم عین شیر کے منہ میں ہاتھی نہ لے جاؤں تو پاجی۔ دیکھو تو سہی۔

بوس : او مہاشالی۔ باپ رے باپ۔ او بھیل کا بان تم ہمارے کا باپ۔ پتا جی۔ ہمارے کو بچلتے۔ ہم ربشوت (رشوت) دینے سکے گا۔ (شانہ پکڑ کر) او بھیل کا بان۔ تم روک لے گا روک لے گا۔ او۔ اب ہم کیا کرے۔ ہمارا باپ ہے۔ ماں ہے۔ سب تم ہے پتا جی۔ فیلبان نے ہاتھی دوڑایا تو گھوش بولے۔ اوشالا تم ہمارا جان لینے مانگتا ہے اوشالا تم ہمارے کو دیک (دق) مت کرے گا۔ ارے بابا ہم بنگال کا رہنے والا، بردوان سے آیا ہے۔ کہاں ہمارا مکان ہے کہاں یہ جنگل ہے۔ ہمارا تو باپ بھی کبھی شیر کا شکار نہ کھیلنے سکا۔ او بابا ہمارے پر رحم کرے۔ جتنے آدمی ساتھ تھے سب نے قہقہے لگائے۔ ان دونوں

کی بیتابی و بیقراری قابل دید تھی. کبھی فیلبان کے ہاتھ جوڑتے تھے. کبھی ٹوپی اُتار کر خدا سے دُعا مانگتے تھے. کبھی جنگل کی طرف دیکھ کر کہتے تھے. اُف. ارے بابا ہمارا جان لینے کو ہم یہاں آیا. ہمار امرت ہم کو یہاں لایا. اور جھیل کا بان ہمارا کہنا جرور نہیں مانتا. فیلبان نے ہاتھی روک کر کہا. بابو صاحب آخر آپ ہی ہاتھی پر سوار ہیں یا کوئی اور بھی ہے. جان سب کو عزیز ہے یا آپ ہی کو اس وقت کم سے کم پچاس ساٹھ آدمی شکار کھیلنے آئے ہیں. مگر آپ کی طرح کوئی بدحواس نہیں ہے. کبھی گالیاں دیتے ہو. کبھی دعا. کبھی ہاتھ جوڑتے ہو اور تمہاری بدحواسی دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے.

گھوش : ارے بابا ہم لوگ لکھنے پڑھنے میں اچھا ہوتا ہے. ہم لوگ بلویت (ولایت) جاکے انگریجی (انگریزی) کھوب (خوب) سیکھتے ہے اور ہم لوگ بڑا لمبا چوڑا لکچر دیتا. رام موہن رائے کیشب چندر سین، سرندر ناتھ بنرجی، پرتاپ چندر موجم دار، ڈاکٹر سرکار لال موہن گھوش اور ہجاروں (ہزاروں) آدمی ہے گا. اور ہم لوگ اپنا اپنا ہک (حق) واسطہ کھوب کھوب لڑتے. پر نتو ہم لوگ بنگال کا رہنے والا ہم کبھی شیر کا شکار جانے تم لوگ جان کو سمجھتے نہیں. ارے بابا یہ پھیر کے آنے نہیں والا ہے.

بوس : ہمارا جھیل کا بان. اب تم ہاتھی کو پھیر دے. ہم تربب (تعریف) تمہارا چھاپے گا. کھبر کے کالم میں اخبار کے کاغذ میں.

فیلبان : آپ اپنی تعریف رہنے دیں. آپ ہماری ہجو چھاپیں.

گھوش : ول نہیں. تمہارا نام ہو جائے گا. بڑا بڑا راجہ لوگ نواب لوگ بادشاہ لوگ کھبر کے کالم میں تمہارا پڑھے گا تو بولے گا. کہ جھیل کا بان بُلوانا سے شکار ملیں گے. تم پچاس ساٹھ کا نوکر ہو جائے گا. ضرور نوکر ہو جائے گا. سمجھا تم کو ہم نوکر رکھا دے گا.

فیلبان : افوہ. پچاس ساٹھ؟ اس قدر روپیہ میں رکھوں گا کہاں. اچھا دوسری شادی کر لیں گے. مگر تعریف لکھیے گا کس بات کی. ذرا ہاتھی دوڑاؤں تو لطف ہو.

بوس : تم بڑے نٹ کھٹ ہو. اور شالا تم پھر دوڑائے گا.

جب جھیل کے قریب پہنچے تو گھوش اور بوس کو اور بھی خوف معلوم ہوا. گھوش نے فیلبان سے پوچھا. ول جھیل کا بان. اس جھیل میں کتا گہرا. فیلبان نے کہا دس ہاتھی ڈباؤ. یہ سُنتے ہی دونوں کے رہے سہے حواس بھی ففرو ہو گے. بالکل سٹپٹا گئے.

گھوش : اور اس جھیل کے اندر سے ہم لوگ کو جانے ہو گا بھی.

فیلبان : جی ہاں اسی میں سے جانے ہو گا جی! کیوں؟

بوس : اور جو ہاتھی کے پاؤں پھسل گئی تو ہم لوگ کا کیا ؟

فیلبان : اگر ہاتھی کی پاؤں پھسل گئی تو تم لوگ کا ٹانگ اور ناک ٹوٹ جائے گا۔ بس اور کچھ نہ ہوگا۔ اور منہ بگڑ جائے گی تم لوگ کی۔

بوس : اور تم شالا کہاں سے بچنے سکے گا۔ اوشالا۔

فیلبان : ہم عمر بھر ہاتھی پر چڑھا کیے۔ ہمیں اس کے حالات خوب معلوم ہیں۔ ہاتھی پھسلے تو ڈر نہیں، اور بہہ جائے تو خوف نہیں۔

بوس : تمہاری ہاتھی پانی سے ڈرتی ہے یا نہیں ؟ بابا ہم سے سپاچ سپاچ (سچ سچ) کہہ دو۔ ہم جان نہیں دینے مانگتا ہے گا۔ بول دو۔

گھوش : بڑا بے وقوف ہم بنا۔ ہم شیں شیر کا شکار تو ہم آتے نہیں سکے۔ ہم سے نواب بولا۔ بابو شاہب ہم چڑیا کا شکار کریں گے۔

فیلبان : بابو شاہب آپ چڑیا کے شکار سے بھی ڈرتے ہیں۔

بوس : ارے بابا۔ گولی لگانے سے تو سب کوئی ڈرتا ہے۔ جان پھیر کے آنے سکے گا نہیں۔ اور ہم لوگ شکار نہیں جاتا۔ ہم شکار کھاتا ہے۔

گھوش : اب تم تو بات کرتا کرتا اس کے اندر جاتا ہے۔ بابا۔

فیلبان نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر ہاتھی کو جھیل میں ڈالا تو ان دونوں نے وہ چل پوں مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ ایک بولا۔ ارے بابا ہم نے ابھی اپنا (وِل) وصیت نامہ نہیں لکھا ہے۔ ہمارا کتاب کا کاپی رائٹ کون لے گا۔ ہمارا جاگیر کون کے پاس جائے گا۔ فیلبان مُسکرا کر بولا۔ وہیں سے سب لکھ کے بھیج دیجیئے گا۔ دوسرے صاحب نے دھوتی سنبھال کر کہا۔ ہم وِل فل مرڈر (قتل عمد) کرتا ہے تم ہم لوگ کو ڈبونے مانگتا ہے۔ تم تاجیراتِ ہند (تعزیراتِ ہند) نہیں جانتا ہے۔ اوشالا۔ تم ہمارا جان لے گا۔ تم جان لے گا شالا۔

فیلبان : بابو گول مال نہ کرو۔ خدا کو یاد کرو بابو صاحب۔

گھوش : اوڈشٹ۔ گول مال تم کرتا ہے کہ ہم کرتا ہے۔

بوس : ہاتھی ہلے گی تو ہم تم کو ڈھکیل دے گا۔ تم مر جائے گا۔ ہم مار ڈالے گا۔ ہم اب نہ مانے گا۔ تم کیا سمجھا ہے۔

گھوش : ہاتھی ہلے گی تو دانتوں سے تمہارا بوٹی نوچے گا۔

فیلبان : آپ گدھے کے گوشت پر دانت لگائیں گوشتِ خر دندانِ سگ۔ میں تو آدمی ہوں بھے خداوند۔

بوس : اچھا ہمارے گھوش لے۔ کل روپے لے بہت سا۔

فیلبان نے ان کے بنانے کے لیے کہا۔ اچھا۔ اس وقت ایک ہزار روپیہ دیجیے تو ہم ہاتھی کو پھیر دیں۔

بوس نے کہا ہم تمہیں مار ہی ڈالے گا۔ جان سے مار ڈالے گا۔ ہم ایسا بات۔

فیلبان : یا خدا کسی مرد کے ہاتھ سے قتل ہوں۔ اگر کسی کے ہاتھ سے میری موت بدی ہے تو سپاہی کے ہاتھ سے مروں۔ ہاتھی کچل ڈالے۔ شیر مار ڈالے۔ مگر ان دونوں کے ہاتھ سے موت نہ ہو۔ بابو صاحب آپ اتنا نہیں سوچتے کہ پانچ ہاتھی تو اس پار نکل گئے کسی کا بال بیکا نہیں ہوا اور ایک ہاتھی پیچھے آتا ہے۔ جان آپ ہی اکیلے کو عزیز ہے یا کسی اور کو بھی عزیز ہے۔

گھوش : ارے بابا تم بات نہ کرے، تم ہاتھی کا دھیان کرے جو پاؤں پھسلے گی تو بڑی گجب ہو جائے گا بابا بڑی گجب ہو گا۔ دیکھ کے چل۔

فیلبان : اجی نہ پاؤں پھسلے گی نہ بڑی گجب ہو گا۔ آپ چپ چاپ بیٹھے رہیے۔ بس بیٹھے تماشا دیکھتے جاتیے، بولیے چالیے نہیں۔

گھوش : کس ماپھک نہیں بولے گا، جرور کرکے بولے گا۔ او شالا ارے تمہارا باپ آج ہی ابھی ابھی مر جاتے۔ ابھی کھبر آئے۔

فیلبان : ہمارا باپ تو کب کا مر چکا ہے اب تمہارے باپ کے مرنے کی باری ہے تار آتا ہی ہو گا کہ ڈھلک گئے۔

بوس : ہمارا باپ کیسا اس دم تو ہمارا نانی مر گیا ہے کہ تم پانی میں لایا۔

راوی : خوب کہی اور پانی دس ہاتھی ڈباؤ اقوہ۔

اب سُنیے کہ فیلبان نے ازراہ شرارت ہاتھی کو دو تین بار دق کیا تو دونوں آدمی سمجھے کہ بس اب جان گئی اور باہم یوں باتیں کرنے لگے۔

بوس : آدمی دوئی جنی ڈوبی جابو (ہم دونوں آدمی ڈوب جائیں گے)۔

گھوش : اے ہاتھی والا بڑو بدو جات (یہ فیلبان بڑا بد ذات ہے)۔

بوس : جوئی آمی بچی آج تیکھے ولی کو رلام آر سنیکار کھیلنے جاؤ نہ یعنے اگر ہم بچ گئے تو اب آج سے قسم کھائی کہ شکار کو نہ آئیں گے۔

گھوشں : تمی امائیں جابردستی نئی اے چھو۔ (تم زبردستی ہم کو لائے)۔

بوس : ہمارا پران بھوائے آچے۔ (ہماری جان بھی معرضِ خطر میں ہے)۔

گھوشں : تمی تو ایک جون (تم اکیلے آدمی ہو) اور ہمارا چھیلے پیلے آچے (اور ہمارے لڑکے بالے ہیں)۔

بوس : اگن تو ہاتی توڑ جی (اب تو ہاتھی ہلنے لگا)۔

گھوشں : ہے پرمیشر امائیں پانچتی ہو (یا خدا ہمیں بچائیے)۔

بوس : آمی تو پاپ کری نی (ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا)۔

گھوشں : آمی کمسریٹ سری لکا کم کہئی چی (ہم نے کمسریٹ کا روپیہ کھایا ہے اس میں ہم کو شک ہے حضرت ہے)۔

راوی : یہ صاحب محکمہ کمسریٹ میں تھے۔

بوس : امی اور گھوش لو بونا (اب ہم رشوت نہ لیں گے)۔

گھوشں : ہاتی والا ہاتی روک لے۔

فیلبان : بابو جی اب ہاتھی ہمارے مان کا نہیں۔ اب اس کا پاؤں پھسلا چاہتا ہے ذرا سنبھلے رہیے گا۔ بہت مضبوط بیٹھے گا۔

بوس : اے شنی امی آپنا پرمیشر ے دھیان کو چی (اس وقت ہم اپنے پرمیشر کا دھیان کرتے ہیں)۔

گھوشں : شنئی امار کشٹو دور کورتی (وہی ہماری تکلیف دور کرے گا)۔

بوس : ہاتھی والا تمی بڑا دشٹو ہاتھی تھامے ناؤ (روک لو)۔

گھوشں : امرا اکھن لاپئی پوڑ بو (اب ہم کود پڑیں گے)۔

بوس : ہا پرمیشر امی کی کاسٹے پوڑ لام (یا خدا ہم کس مصیبت میں پڑ گئے) آج کے بانچبونا (آج نہ بچیں گے)۔

ایک مقام پر اتفاق سے ہاتھی کا پاؤں گڑھے میں چلا گیا۔ بس دونوں نے اس قدر غل مچایا کہ الامان۔ ارے باپ ارے باپ۔ کی کاسٹی پور لام یا پرمیشر۔ او شالا پھیل کا بان۔ ہاتھی نے گڑھے سے پاؤں نکالا اور پھر بدستور چلنے لگا۔ ان دونوں کی یہ کیفیت تھی کہ بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا تھا۔ اور زار زار روتے تھے۔ نواب صاحب نے فیلبان کو للکارا اور کہا خبردار جو ان کو ڈراوے گا تو جانے گا۔

گھوش نے باآواز بلند کہا نواب شاہب ہمارا مدد کرو۔ اب ہم جاتا ہے بیکنٹھ۔ فیلبان نے آہستہ سے کہا بیکنٹھ جا چکے جاؤ گے نرک ہیں۔ اس پر مسٹر گھوش بہت بگڑے اور گالیاں دینے لگے۔ تم شالا کو پانی کے باہر جاکے ہم مار ڈالے گا اس نے کہا جب پانی کے باہر جا سکو نہ یہ فقرہ اور بھی ستم تھا۔

گھوش : نواب شاہب یہ شالا ہمارے کو گولی دینا۔

نواب : گولی کیسی بابو آپ اس قدر گھبرائے کیوں ہیں۔

گھوش : ہمارے کو یہ شالا گولی دیتے بھی ابھی دیتے ہیں۔

نواب : بوکھلا گئے اب کنارہ قریب ہے۔ مگر گولی کیسی۔

بیگم : اے ہے اے کہیں گالی کی خرابی تو نہیں ہے گولی۔

نواب : ہاں ہاں خوب سوچیں گالی کے عوض گولی کہتا ہے۔ او فیلبان بدتمیز خبردار جو گالی گلوج کی ہو۔

فیلبان : خداوند میں ایسی سواری سے در گذرا ان کو ہر سمت سے اجل ہی اجل نظر آتی ہے ان ایسوں کو حضور شکار میں کیوں لاتے۔ یہ تو بڑے ڈرپوک ہیں۔ کانپتے تھرتھراتے ہیں اور جب سے جنگل کے اس طرف آئے برابر گالیاں دے رہے ہیں۔

بوس : ارے شالے کا شالا تم بات کرے گا۔ باہاتھی کو دیکھیے گا۔ ارے بابا اب ہم ایسا شواری پر نہ آئے گا۔

نواب : بابو صاحب ذرا تامل کیجیے اب آپ پار پہنچ گئے ہیں بس اک ذرا ٹھہر جایئے تو بیڑا پار ہے۔

خدا خدا کر کے ان کا ہاتھی پار پہنچا تو جان میں جان آئی۔ نواب صاحب نے اپنا ہاتھی بڑھوایا کہا بابو صاحب کوئی اس قدر ڈرتا ہے۔ آخر اتنے آدمی ہمارے ساتھ ہیں کوئی بھی خائف ہوا۔ جان سب کو پیاری ہے اور ابھی تو شیر کا سامنا بھی نہیں ہوا ہے ابھی سے یہ حال ہوا ہے سبحان اللہ سبحان اللہ۔

گھوش : یہ پھیل کا بان شالا بڑا نٹ کھٹ آدمی ہے نواب صاحب۔

نوابصاحب : پھیل کا بان کیا معنی میں آپ کی تقریر نہیں سمجھا حضرت۔

بوس نے کہا پھیل کا بان کے معنی ہاتھی والا۔ مہاوت بڑا بو دجات (بدذات) موکوف (موقوف) کرتے کا بل (قابل) مسٹر بوس نے آبدیدہ ہو کر کہا نواب صاحب ہم اسی کا ساتھ بڑا تکلیف

(تکلیف) پایا یہ مہاوت ہمارا اس جنم کا بیری ہے۔ ہم ایسا نٹ کھٹ کبھی دیکھا نہیں تھا آج تک ہمارا جان کا کوئی دسمن (دشمن) نہیں نکلا جیسا یہ شالا نکلا۔ ہم تو بڑا دیک (دق) ہوا۔ بابا ہم ویسا شکار نہیں کھیلنے چاہتا ہمارا جان لیا تھا۔ اب ہم ہاتھی پر سے اتر جائے گا۔ نواب صاحب نے فیلبان کو حکم دیا کہ ہاتھی بٹھاؤ۔ ہاتھی بٹھایا گیا کہا اچھا اگر آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ تو ہاتھی پر سے اُتر جائیے اس پر گھوش اور بوس دونوں سر پیٹنے لگے۔ ارے بابا۔ ایس (اس) جنگل کے بیچ میں تم ہم کو چھوڑ کے بھاگنا مانگتا۔ ہم جاتے گا کہاں۔ اِدھر جنگل اُدھر جنگل ایس (اس) طرف سمندر ساگر اس طرف کھائی اور شیر کابن۔ ہم بھاگ کے کدھر جائے گا بابا ہمارے کو ہمارے گھر پہنچا دو ہم بھاگ جانے مانگتا ہے۔ اب ہم شکار نہیں کھیلے گا۔ نواب صاحب نے کہا سنیئے بابو صاحب اگر ایک ہاتھی کو اکیلا بھیج دوں تو شاید شیر یا سور یا کوئی اور جانور حملہ آور ہو ہاتھی کا ہاتھی زخمی ہو جائے فیلبان کی جان پر بنے اور جگت ہنسائی ہو۔ آپ لوگ گولی چلانے سے رہے۔ گھوش نے سر پیٹ کے کہا آپ کو اپنا ہاتھی پیارا۔ پھیل کا بان پیارا ہمارا جان پیارا نہیں۔ سب کا نام لیا ہمارا نہیں لیا۔ کیسا بات ہم انسان تم انسان ہمارا جان کچھ نہیں مانتا اس کا جان مانتا۔ پھیل کا بان چار پانچ یا سات آٹھ روپیہ کا نوکر ہم لوگ سر دفتری کرتا ہیڈ کلرکی کرتا ہم لوگ ــــــ سپرنٹنڈنٹی کرتا اور کیا بات کرے گا۔ ہم جان نہیں رکھتا۔ وہ رکھتا ہے۔ بڑا جان والا۔ اور کچھ بات نہیں اور ایسا کہاں ہونے سکتا۔ نواب صاحب نے کہا اچھا پھر بیٹھے رہو مگر ڈرو نہیں۔ خوف کی بات نہیں ہے۔

گھوش : اچھا ہم کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔ اپنے اب نہ بولے گا۔

بوس : کیسے نہ بولے گا تم نہ بولے گا تو ہم بولے گا۔

گھوش : تم شالا شور ہے۔ تم کیا بولے گا۔ بولے گا تو ہم تم کو کتل (قتل) کر ڈالے گا۔ شالا ہمارے کو پھانس کے لایا اور اب جان لینا مانگتا ہے۔ نہیں دینا سکتا۔

بوس : (دھوتی سنبھال کر) تم دشت چپ رہے۔ تمہارا کوم (قوم) کون ہے۔ کون تمہارا کوم (قوم) ہے۔ تم نیچ کوم ہے ہمارے مکابلے (مقابلے) کا ہے۔

گھوش : (ہاتھ دکھا کر) بولے گا تو ہم حلال کرے گا۔

بوس : (دانت سے اشارہ کر کے) ہم تمہارا بوٹی بوٹی نوچ لے گا۔

گھوش : ارے تم بکے جائے شالا بود جات دشت دُر گدھا۔

بوس : تم بدکوم، نیچ قوم، چھوٹا کوم، بھیک مانگنے والا شور۔

دونوں میں خوب گلمنپ ہوئی۔ حاضرین قہقہہ اُڑاتے تھے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دیتا تھا کبھی بوس نے گھونسا تانا، کبھی گھوش نے چپت لگانے کا قصد کیا۔ یہ دانت پیستے تھے کبھی وہ۔ مگر ممکن کیا تھا کہ دونوں میں کوئی حریف پر ایک وار بھی کرتا۔ سب زبانی داخلہ تھا۔ بیگم صاحب کو یہ کیفیت بہت پسند آئی کھِل کھِلا کھِل کھِلا کر ہنسیں۔

الغرض دونوں بہادر کُندے تول تول کے رہ جاتے تھے۔ نواب صاحب نے جو یہ حال دیکھا تو چاہا کہ علاحدہ علاحدہ ہاتھیوں پر بٹھاتے جائیں۔ مگر گھوش نے منظور نہ کیا۔ بولے کہ یہ ہمارے دیش کا اور ہم اِسکے دیش کا۔ اور کوئی ہمارا دیش کا نہیں جو شیر کھائے تو ایک ساتھ دونوں دیش والا کو کھائے اور نہ کھائے تو دونوں دیش والا سے ایک کو بھی نہ کھائے۔ نواب صاحب بہت ہنسے۔ کہا آج اس قدر لُطف آیا کہ اور کبھی نہ آیا تھا۔ اتنے میں دو آدمیوں نے للکار کر کہا۔ ہوشیار ہوشیار۔ شیرنی نکلی جاتی ہے۔ حکم ہوا کہ ہاتھی اس طرف بڑھاؤ۔ سب ہاتھی بڑھائے گئے۔ دیکھا کہ ایک درخت کی آڑ میں شیرنی دو بچّے لیے ہوئے دُبکی کھڑی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً گولی سر کی۔ مگر خالی گئی۔ اور شیرنی بچّوں کو لے کر چلی انھوں نے اپنا ہاتھی بڑھایا۔ اور ساتوں ہاتھی اس طرف تیز تیز چلے۔ نواب صاحب نے پھر بندوق سر کی۔ اب کی گولی نے شیرنی کا ایک گال اُڑا دیا۔ بس گولی کھانا تھا کہ بلائے ناگہانی کی طرح پلٹ پڑی اور اِس طرح سُرعت کے ساتھ چلی جیسے گولہ توپ سے چھوٹتا ہے۔ اُدھر سب گل چلے تیار ہو گئے۔ شیرنی نے آتے کے ساتھ ہی ایک ہاتھی کے بڑھ کر تھپڑ لگایا تو وہ چنگھاڑ کے بھاگا۔ نواب صاحب نے بندوق سر کی مگر نشانہ خالی گیا اور اِس عرصہ میں شیرنی بدرجہ اتم خونخوار ہو گئی تھی۔ اسی ہاتھی کو جو تھپڑ کھا کر تلملا رہا تھا کان پکڑ کے بٹھا دیا۔ اب شیرنی اِس کے کان پکڑے ہے اور ہاتھی دونوں پاؤں ٹیک کر جُھکا ہوا ہے۔ اور فیلبان نے مشک کو چھوڑ دیا ہے۔ افغانی اور گل چلے نے کہا نواب صاحب اب آپ دیکھتے کیا ہیں۔ گولی چلائیے ورنہ شیرنی ہاتھی کو اَدھ مرا کر دے گی۔ نواب صاحب نے بندوق فیر کی شیرنی کے پائے چپ میں لگی۔ اور وہاں سے نکل کر ہاتھی کے پاؤں کو زخمی کیا۔ ہاتھی جھکا ہوا تو تھا ہی اور بھی جُھک گیا۔ اب اگر شیرنی چاہے تو پشتِ فیل سے آدمیوں کو اُتار لے۔ مگر وہ اِس خوف سے نہیں چھوڑتی تھی کہ مبادا ہاتھی غالب آ جائے۔ اِس پر افغانی نے بکمال جوانمردی اپنا ہاتھی بڑھوایا اور عین اِس مقام پر لے گیا جہاں شیرنی تھی۔ قریب جا کر بندوق سر کرنے ہی کو تھا کہ شیرنی اِس ہاتھی کو چھوڑ کر ان کی طرف جھپٹی۔ اور کمال خونخواری کے ساتھ مُنہ کھول کر ہو کھ کر آئی۔ مُنہ کا کُھلا پانا تھا کہ انھوں نے مُنہ ہی میں بندوق جھونک دی اور شیرنی تڑپ کے گری بس افغانی نے بندوق رکھ دی اور شمشیر برہنہ لے کر دھم سے کود پڑا اور اللہ اکبر کہہ کر شیرنی کے گلے پر پہنچا۔

شیرنی تو کسی مصرف کی نہیں رہی تھی مگر اس قدر دم باقی تھا کہ ایک دفعہ ڈکار کر ان کی طرف آئی۔ اور بڑے غصے میں تھپڑ لگانا چاہا مگر افغانی کب چوکنے والا تھا، دونوں گھٹنے ٹیک کے تلوار کا ایسا تلا ہوا ہاتھ دیا کہ شیرنی کی چین کٹ گئیں۔ اور ایک مرتبہ ڈکار کر گر پڑی۔ نواب صاحب نے بڑی تعریف کی۔ اور کل حاضرین نے طنطنہ توصیف بلند کیا۔

اب سنیئے کہ ادھر تو یہ کیفیتیں ہو رہی تھیں اُدھر دونوں بنگالی بابو ہودے کے اندر اوندھے پڑے تھے۔ آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند۔ اور بالکل سکوت کا عالم۔ ہودہ کے باہر ایک اُنگلی تک نہ تھی۔ ایک صاحب نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور دوسرے بزرگوار نے ایک ہاتھ سے دونوں آنکھیں بند کیں۔ (اس جوانمردی کے صدقے) بیگم صاحب نے جوان کے ہاتھی کی طرف دیکھا تو کمال متحیر ہوئیں۔ پوچھا۔ نواب کیا یہ دونوں بابو بھاگ گئے۔ نواب صاحب نے ان کے ہاتھی کی طرف نظر کی تو یہ بھی متحیر ہوئے۔

نواب : فیلبان۔ کیا یہ دونوں بابو ہاتھی سے اُتر گئے تھے۔

فیلبان : نہیں خداوند۔ (مسکرا کر) میں ہاتھی بڑھائے لاتا ہوں۔

نواب : بتاؤ تو سہی۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ اب ایسے بودوں کو ساتھ نہ لائیں گے۔ بزدل آدمی۔

فیلبان ہاتھی قریب لایا تو ثریا بیگم شوخی کے ساتھ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اے اِدھر تو دیکھو۔ نواب صاحب نے اس ہاتھی کی طرف نظر ڈالی تو اس قدر ہنسے اس قدر ہنسے کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ دونوں صاحب سر نیچے اور گٹھری بنے ہوئے پڑے تھے۔ آنکھیں بند دبکے دبکائے ہوئے پڑے ہیں۔

نواب : اب اُٹھو گے بھی یا سوتے ہی رہو گے۔ کب تک سویا کرو گے۔ بابو جی۔ بابو صاحب! ایں! بولتے ہی نہیں۔

بیگم : (شوخی کے ساتھ) کیا اچھے آدمی تھے بیچارے۔

نواب : مگر چل بسے۔ افسوس۔ ابھی باتیں کر رہے تھے۔

بیگم : اب کچھ گور و کفن کی فکر کرو گے یا نہیں۔ یا ہاتھی ہی پر لاش پڑی رہے گی۔ بیچارے باتیں کرتے کرتے مرے۔

نواب : رہے نام اللہ کا۔ دنیا کے کیا کارخانے ہیں۔ فیلبان شانہ پکڑ کے ہلاؤ۔ اور اوٹھاؤ۔ کہ اب اُٹھیے۔

فیلبان نے شانہ پکڑ کے ہلایا۔ تو مسٹر بوس اُٹھے مگر سہمے ہوئے اُٹھتے ہوئے شیرنی کی لاش دیکھی تو کانپنے لگے۔ نواب شاچ شاچ بولو یہ مٹی کا شیر ہے یا ٹھیک ٹھیک شیر ہے۔ نواب صاحب نے کہا میں اُتر پڑوں۔ یہ کہہ کر نواب صاحب فوراً ہاتھی سے اُتر پڑے اور کہا لیجیے۔ اب معلوم ہوا۔

بوس : مٹی کا ہے۔ ہم سمجھ گیا تھا پہلے ہی۔

گھوش : (گردن اُٹھاکر) نواب صاحب یہ مٹی کا شیر ہے یا جادو کا شیر ہے۔ مگر مٹی ہی کا ہے۔

نواب : آپ تو ہیں پاگل۔ خاصے سڑی اور خبطی ہو۔

اتنے میں ایک آدمی نے شیرنی کی دم ہلائی اور اس کی کمر پر بیٹھ گیا تو گھوش اور بوس کو سخت تعجب ہوا۔

گھوش : آپ لوگ جان کو مفت سمجھتا ہے۔ ہم لوگ مفت نہیں جانتا۔

بوس : یہ لوگ شب وحشی ہے ہم لوگ ایم اے، بی اے، بی این۔ ہم لوگ بلایت کا لکچر دیتا ہے۔ ہم لوگ بہت سا بات ایسا کرتا ہے کہ آپ لوگ نہیں جانتا۔ کھالی کھالی شیر مارنے سے کیا۔ لال موہن گھوش پارلیمنٹ میں لڑتا ہے۔ ممبر بننا لگتا ہے۔ ہم لوگ ایسا تم لوگ ویسا۔

نواب : اچھا اب ہاتھی سے تو اُترو۔ ادھر آؤ ذرا۔

آدمی : حضور بابو صاحب شیرنی تو مرگئی۔ اب اِس کا پتا کہاں ہے۔ اب ڈر کیا ہے۔ آئیے۔

نواب : فیلبان۔ ذرا ہاتھی بیٹھنے دو۔ لے اب اُتریے حضرت آئیے اس طرف تشریف لائیے۔ آؤ صاحب لاحول ولا۔ مسٹر بوس اُترے اور ان کے بعد مسٹر گھوش۔ اب شیرنی کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ دور سے کمال غور کے ساتھ دیکھا کیے۔

بوس : (گھوش سے) آگے بڑھو مہاشائی۔ بڑھو بڑھو۔

گھوش : تم ہی بڑھو۔ تم بڑا مرد ہے گا تو تم بڑھے۔

نواب : لاحول ولاقوۃ۔ بڑھنا نہیں۔ خبردار۔ بڑھے اور شیر کھا گیا۔ ہضم ہی کر جائے گا۔

گھوش نے کہا۔ بابا اب چاہے جان جاتا رہے گا چاہے جو ہو گا۔ اب بودا آدمی نہیں ہے۔ اب جرور کر کے جائے گا۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے اور پھر غور سے دیکھا۔ اور الٹے پاؤں بھاگے۔

اِن دونوں صاحبوں کی باتوں کا لطف اُٹھاکر نواب صاحب نے کوچ کیا۔ اور اپنے خیمے میں آئے۔ خیمے میں جملہ سامان عیش و عشرت مہیا ہوا تھا۔ فرش مکلف پلنگڑی نازک چاندی کے پائے ڈوریاں کسی ہوئیں۔ خاصدان، عطردان، آئینہ طبلہ بایاں۔ ستار، ہاتھی سے اُترے تو خدام باادب

ے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر ادب کے ساتھ خیمے کا پردہ اُٹھایا۔ بیگم صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اندر تشریف لائے۔ اور مسند مخملی پر معشوقہ سیم بر پری پیکر طنطنہ خسروی سے بیٹھے۔

کچھ عجب ساماں سے ہیں وہ بزم میں مسند نشیں
خاصدان ہے، عطرداں ہے، آئینہ ہے، شانہ ہے

محبوب نے بزم عشرت کو دو بالا کر دیا۔ رفقا اور مصاحبین ہزار جان سے عاشق ہو گئے تھے مگر ادب مانع اظہارِ عشق تھا۔ مگر جس نے دیکھا تیر نگاہ سے گھائل ہو گیا۔

قمریاں عاشق ہیں تیری سرو بندہ ہے ترا
بلبلیں تجھ پر فدا ہیں گل ترا دیوانہ ہے

مسند زرنگار پر نواب فرخندہ اختر اور بغل میں نگارِ مشتری پیکر مگر نظر ڈالتے ہیں تو گل رخسار پر شبنم اشک دیکھ کر متعجب ہوتے اور کہا۔

بھرے آتے ہیں آنسو آنکھ میں اے یار کیا باعث
نکلتے ہیں صدف سے گوہر شہوار کیا باعث

ثریا بیگم نے آنسو پوچھ کر کہا۔ کچھ نہیں یوں ہی آنسو نکلنے لگے۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجیے۔

دبے دانتوں نکاح کا اقرار

فریدوں مرتبت خاقان منزلت دارا سطوت سنجر صولت نواب والا صفات افتخار الدولہ محمد وجاہت علی خان بہادر، اس خیمہ آسمان تو امان میں نگارِ آتشیں رخسار شاہدِ غنچہ دہن گل عذار رعنا شمائل مشتری خصائل کو بغل میں لے کر مسند زرنگار و پُر بہار پر بیٹھے۔ مزے مزے کی باتیں کرتے تھے، اور اس صنم قیامت پیکر سمن بر کی عاشقی کا دم بھرتے تھے۔ ہاتھ میں ہاتھ دے کر اور لبِ لعل کا بوسہ لے کر کہا۔ بیگم صاحب میں اور میرا خدا، اس پچیس برس کے سن میں پچاسوں معشوقوں پر دل آیا۔ مگر تم نے واللہ باللہ، سچ مچ جادو ہی کر دیا۔ تمہاری آنکھ میں جادو ہے۔ غمزے میں جادو ہے۔ عشوے میں جادو ہے۔ آواز میں جادو ہے۔ جو انداز ہے جادو بھرا ہوا۔ کوئی معشوق ناز و ادا سے خالی نہیں۔ مگر یہ آن یہ ادا کہاں۔

یوسف کے رُخ میں نور نہ تھا یا ضیا نہ تھی
پر تجھ میں جو ادا ہے وہ آن میں ادا نہ تھی

سراپا کیا چمن ہے اور چمن بھی پھولا پھلا۔ قدِ دلجو سروِ آزاد رشک شمشاد۔ رخسارے گل تر۔ بلکہ رشک قمر۔ آنکھیں نرگس غمزہ زن۔ گیسوے مشکین سنبل پُرشکن۔ عنادل تجھ پر فدا۔ قمریاں تیری شیدہ۔ گل تیرے دیوانے۔ ملائکہ نورانی اگر یہ رُخِ انور دیکھ پائیں تو تابِ جمال نہ لائیں۔ غش پر غش کھائیں۔

تابِ نظر ہے شرط رُخِ یار کے لیے
چشمِ کلیم چاہیے دیدار کے لیے

مگر تم اپنا کُل حال بتاؤ۔ مکان کہاں ہے۔ کس شہر کی رہنے والی ہو۔ کس پرستان کی پری ہو۔ یہ دلبری کس نے سکھائی۔ یہ مستانہ چال اور شوخی کہاں پائی۔ بیگم نے شوخی کے ساتھ جواب دیا۔ گنوار ہو کون۔ مکان کیسا۔ خاص اندر کے اکھاڑے سے آئی ہوں۔ آدم زاد میں ایسی کامنی، پدمنی، کبھی دیکھی تھی۔ دلبری ہمیں کون سکھاتا۔ ہم وہ ہیں جو ادا کو خود ادا سکھائیں۔ دلبری ہم سے دلبری کا سبق سیکھ جائے۔ مستانہ چال خلقی ہے۔ شوخی روزِ ازل سے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ گل و بُلبل دونوں ہمارے اُدب آموز ہیں۔ اچھا سوال کیا۔ واہ وا واہ۔

لے اُڑی طرزِ فغان بُلبُل نالان ہم سے
گُل نے سیکھی روشِ چاک گریبان ہم سے

نواب صاحب نے فرمایا اس میں کیا شک ہے۔ چور سے کہو چوری کر۔ اور شاہ سے کہو ہوشیار رہ۔ گُل کو بیوفائی سکھائی بُلبُل کو نالہ زاری کی تعلیم دی۔ باغبان کو بے رحمی کا سبق دیا۔ عندلیبِ شیدا کے دل پر بجلی گرائی۔

باغبان بے درد ہے گل بے وفا گلچیں رقیب
کون سُنتا ہے چمن میں نالہائے عندلیب

نواب صاحب نے آئینہ دیکھ کر کہا ہم پر بھی خدا کے فضل سے جوبن ہے اور حضور تو خسرو خوبان جہاں ہیں۔ مگر واسطے خدا کے اس وقت کا نکھار ذرا آئینے میں دیکھ لو۔ یہ تو آئینہ پرستان کی پری بھی دیکھے تو شرما جائے کیا حُسن ہے۔ خدا کی قدرت مجسّم نظر آتی ہے۔ بیگم صاحب نے آئینہ کو جھٹک دیا۔ اے ہٹاؤ بھی کہاں کا آئینہ، کس کا آئینہ ہم کو آئینے سے واسطہ؟ ناحق بن ناحق نظر لگ جائے تو بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑیں۔

آئینہ دیکھتے نہیں جادو کے ڈر سے آپ
اللہ اب تو بچتے ہیں اپنی نظر سے آپ

نواب : اگر میں بلبل کو طرزِ فغاں سکھاؤں تو سارا چمن رونے لگے۔ باغ ماتم کدہ بن جائے۔۔ نوجوانانِ چمن ماتمی پوشش ہوں۔ گل پر اوس پڑے۔ قمری کی گردن میں نمد سیاہ ہو۔ گلستان میں ہر سمت کہرام مچا ہو۔

باغباں نالے کرے گلچیں کلیجا تھام لے
طرز اگر کچھ میرے نالوں کی اُڑائے عندلیب

ایک روز کسی پری وش کی فرقت کے صدمے نے مجھے آٹھ آٹھ آنسو رُلایا پھر یہ کیفیت تھی کہ جس نے میرے نالے سُنے فوراً رو دیا۔

راتوں کو مری سُن کر فریاد بہت رویا
دل تھام لیا اپنا صیّاد بہت رویا
وہ عاشقِ پُر غم ہوں سُن کر مرا افسانہ
مجنوں نے کیے نالے فرہاد بہت رویا
پُر درد وہ افسانے بلبل نے کہے شب بھر
گل چیں کے بہے آنسو صیّاد بہت رویا
وہ عاشقِ گریاں ہوں کھینچا جو مرا نقشہ
مانی کو ہوئی رقت بہزاد بہت رویا
ہر بیت میں مضموں تھا پُر درد جوائے صفدرؔ
دیکھی جو غزل میری اُستاد بہت رویا

بیگم : اب یہ رونے دھونے کی باتیں رہنے دو۔ ہنسی خوشی مذاق دل لگی کی باتیں کرو۔ ماتم اور کہرام سے ہم کو کیا واسطہ۔

نواب : بہت اچھا سُنیے کیا شعر سُناتا ہوں۔

اندر کا اکھاڑا ہے چمن موسمِ گُل ہے
ہر پھول پہ ہر شاخ پہ عالم ہے پری کا

بیگم : ہاں ایسے ایسے شعر پڑھو۔ جن میں اندر کے اکھاڑے اور پرستان اور پریوں کے جھرمٹ اور کوہ قاف کا ذکر ہو۔

نواب : جب تم زانو بزانو روبرو بیٹھی ہو تو اس کے سوا اور کوئی ذکر کہاں سے ہو سکتا ہے۔

گل بھی ہے۔ بُلبُل بھی جام بھی ہے مل بھی ہے۔ صراحی بھی ہے۔ قلقل بھی ہے۔ جملہ سامانِ عیش مہیا ہے۔

دختِ رز میخانہ مینا جام ہے میرے حضور
حور کا فردوس کا طوبیٰ کا کوثر کا جواب

میں نے جس وقت تمہیں باغ میں دیکھا دل کا عجب حال ہوا۔ کبک کی سی چال دیکھ کر دل ہاتھ سے جاتا رہا۔

جو گل تھا باغ میں ترا آئینہ دار تھا
پرتو ترے لباس کا رنگِ بہار تھا

تم تو گلوں سے مقابلہ رُخِ رنگین سے کرتی تھیں اور نازک بدنی و غنچہ دہنی کا دم بھرتی تھیں کچھ دیر سوچ کر یہ شعر پڑھا۔

پھولوں میں ہے شہرہ تری گل پیرہنی کا
غنچوں میں ہے چرچا تری نازک بدنی کا

اور ادھر ہم عندلیب نالاں سے برابر مقابلہ کرتے تھے۔

بُلبُل کو نالہ کر کے جو صفدر کیا ذلیل
گل ہنس پڑے تو مجنوں نے بھی مسکرا دیا

جب تک تم اِدھر اُدھر ٹہلا کیں میں چپ چاپ سیر دیکھا کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم کون ہو۔ مگر چال اور گردن اور حسن و جمال اور گورے گورے گال ان سب کی جھلک دُور سے دیکھ لی تھی جب تم نے ادھر رُخ کیا تو۔

جلوہ جو اپنے حُسن کا اس نے دکھا دیا
دم میں فروغ شمس و قمر کو مٹا دیا

غشوں پر غش آئے۔ سوچا کہ یا خدا یہ عورت ہے یا پری ہے۔ بڑی دیر تک شک کی جگہ یقین تھا کہ حور بہشت ہے۔ آدم زاد نہیں ہے۔ پری زاد ہے۔ غش آتا تھا اور پھر سنبھلتا تھا۔ پھر غش آتا تھا۔

دیکھا جو برقِ طور کو موسیٰ نے غش کیا
آساں نہیں ہے جلوۂ دلدار دیکھنا

بیگم : اللہ نے ہمیں ایسا ہی حسن دیا ہے۔ ہمارے جوبن اور ہمارے جمال کا کیا کہنا۔ یہ حسنِ عالم افروز کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

روئے تابان جس نے دیکھا صرفِ حیرانی ہوا
مبتلائے زلف یا بندِ پریشانی ہوا
خضر و یوسف دونوں عاشق ہیں مرے اتنا ہے فرق
کوئی زندانی ہوا کوئی بیابانی ہوا

نواب : اللہ رے غرور حسن۔ اُف رے گھمنڈ۔ اس دولت حسن پر اتنا ناز اور یہ دولت بھی پائدار نہیں۔ مگر اس پر بتوں کو ناز حسینوں کو فخر ہے۔ عشّاق جان دیتے ہیں۔ صدمہ فراق سے دم توڑتے ہیں۔

جسے سمجھتے ہیں سب محبت وہ ہے حقیقت میں علیں دولت
کسی کو شیدا کسی کو رسوا کسی کو خانہ خراب دیکھا

نواب صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد دُنیا کی بے ثباتی کا ذکر چھیڑا دیکھو بیگم اس زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ ہمارے ملک کا شہزادہ گردوں مدار جم اقتدار فریدوں کمر مرزا ہمایوں فرکس شان اور آن بان سے دس ہزار روپیہ کے سمند و غاپسند پر سوار دولہا بنا ہوا جاتا تھا۔ اور آج اس کا مقبرہ بن رہا ہے۔ مرقدِ منوّر پر تاریخ وفات لکھی ہے۔ اُف اس وقت دل بھر آیا ہے اور بیچاری سپہر آرا کا حال ناگفتہ بہ دل کی دل ہی میں رہی۔ کوئی حسرت نہ نکلی۔ ع

آیا جو عدم سے پھر عدم ہے

اس موت سے خدا سمجھے۔

اس عمر میں کیا تمام ہو حرص
قصّہ ہے طویل رات کم ہے
اتنا ہے درازِ روزِ فرقت
جتنی کہ شبِ وصال کم ہے

مگر ہم کو اب دنیا و مافیہا سے سروکار نہیں۔ اب تو صرف یہی خواہش ہے کہ ہم ہوں اور تم ہو۔ اور چاہے ساری خدائی ہو۔ ہمیں کسی بات کا غم نہیں ہے۔ نہ کسی امر کی خوشی۔ رنج و شادی سب یکساں ہے۔

اے جوشِ جنون تری بدولت
دنیا کا نہ آخرت کا غم ہے

اب تو ہم ایک نئی دنیا میں ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں۔

عجب نیرنگ دکھلایا ہے ہم کو جوشِ وحشت نے
نئے عالم میں پہنچے ہیں نکل کر دونوں عالم سے

اگر ہم کو چھوڑ کر چلی جاؤ تو اختیار ہے اور اگر پہلو کو آباد کرو تو احسان ہے بہرکیف۔ ع

ہر حال میں بندہ ہے گنہگار تمہارا

قفس میں یا الٰہی ایسی ہو گویا زبان میری
کلیجا تھام لے صیّاد سن کر داستان میری

یا خدا جہاں رہوں زبان ہمیشہ مدد کرے اور چاہے کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو اس کا بھی دل پسیج جائے۔ آمین۔ ہم کو اب کسی سے مطلب نہ سروکار نہ غرض نہ واسطہ

دل ہمارا مستِ عشقِ نرگسِ مستانہ ہے
کیا غرض ساقی سے ہے کیا حاجتِ پیمانہ ہے

میں آپ کی اس تقریر کا مطلب سمجھی۔ ابھی کچھ جواب نہ دوں گی۔ دو چار دس پانچ روز یکجائی ہو۔ آپ کی خو بو سے واقف ہوں۔ تو کچھ عرض کروں مگر اتنا کہے دیتی ہوں کہ مجھ سی عورت ہندوستان میں نہ ملے گی۔ کچھ حُسن و جمال کا ذکر نہیں کرتی ہوں مگر میری کُل سوانح عمری سے واقف ہو تو تعجب کرو اور کہو کہ واہ اچھی ڈھیٹ عورت ہے۔ سب کو دیکھ لیا۔ آزما لیا۔

باوفا ایک بھی ہمیں نہ ملا

دل رُبا سیکڑوں ملے لیکن
کوئی معشوق باوفا نہ ملا

نواب صاحب نے دستِ حنائی کا بوسہ لے کر کہا۔ لالہ رُخ خدا گواہ ہے۔ اگر تم ساتھ رہو تو بادشاہی کی حقیقت نہ سمجھوں۔ سچّا عاشق ہوں من و خدائے من یقین نہ آئے تو آزما لو۔ اُنگلی جلا دو۔ کوئی عضو بدن کاٹ ڈالو۔ ہاتھ پاؤں کان۔ مگر کہیں ناک نہ اُڑا لیجیے گا۔ واللہ عاشقِ صادق

ہوں۔ تمہاری صورت زیبا دیکھ کر مجھے خدائی یاد آتی ہے۔ صانع ہیچوں وچرا ہے۔

صانع نے اُس کو آپ ستمگر بنا دیا — ابرو کو قتل کے لیے خنجر بنا دیا
مانی نے کھینچیں دونوں شبیہیں الگ الگ — اُس کے قدم پہ کیوں نہ مراسر بنا دیا
آنکھوں نے میری وقت نظارہ بنا کے اشک — تارِ نگہ کو رشتۂ گوہر بنا دیا
بخشا جو اُس کو حسن تو مجھ کو خدا نے عشق — قمری مجھے تو اُس کو صنوبر بنا دیا

پردہ اُٹھاتے ہی رُخِ روشن سے یار نے
ذرّوں کو آفتابِ منوّر بنا دیا

بیگم : آپ صاف صاف اپنا منشاءِ دلی ظاہر کر دیجیے۔ مگر صاف صاف۔
نواب : صاف صاف کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے کہ مبادا بد دماغ ہو جاؤ۔
بیگم : نہیں یہ کیا بات ہے۔ آپ بیان تو فرمائیں حضور۔
نواب : (دبے دانتوں، بہت آہستہ سے) نکاح۔
بیگم : سُنیے مجھے نکاح میں کوئی عذر نہیں۔ میرا اللہ جانتا ہے آپ اوّل تو کم سِن۔ دوسرے رئیس زادے۔ تیسرے روپیے والے چوتھے خوبصورت ابھی سبزہ آغاز بھی نہیں ہوا۔ پھر مجھے عذر کیونکر ہو سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ عرض کروں گی کہ کس سبب سے مجھے منظور نہیں ہے۔
نواب : ہائے ہائے کیا ستم ڈھایا۔ یہ تو قیامت ہے:

بہار بے تو برنگِ بریدہ می ماند — گل شگفتہ بجیبِ دریدہ می ماند
بروں کہ رفت زمحفل کہ قلقل مینا — بہ دم کشیدنِ حلقِ بریدہ می ماند
بہ پیشِ رنگ حنائے تو اے گلِ رعنا — اگرچہ سرو بقدِ کشیدہ می ماند
بقامتت چہ تواند برابری کردن — چمن بہ بسمل درخون طپیدہ می ماند

ہر آنکہ زلفِ سیاہ تواش پریشان ساخت
بہ بے قراری افعی گزیدہ می ماند

بیگم : سُن لیجیے۔ میں مجبور ہوں۔ اس کی وجہ عرض کر دوں گی۔
نواب : ہم نے جس سے دل لگایا اس نے مایوس ہی ٹالا۔ تھوڑے دن ہوئے لالہ خوشوقت رائے صاحب اپنی بیگم صاحب کے ہاں ہم کو لے گئے تھے بیگم کو ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ گو ان کی بڑی بہن سے آنکھ لڑی تھی۔ میں کیا عرض کروں کہ کیسا جوبن تھا۔ بس ایسی صورت دیکھی نہ سُنی یا اُس کو دیکھا یا اب

آج حضور کو دیکھا۔

میری زباں سے مدح کہاں اُس کی ہو سکے
توصیف میں ہے جس کی زبانِ قلم قلم

اچھا پھر اگر منظور نہیں تو ہمیں قتل کر ڈالو۔ بس چھٹی ہوئی۔

بیگم : اب ہمیں کوئی گنوار مقرر کیا ہے۔ کیا واہ وا۔

دم بدم جھوٹ کے یہ مُفت بھارے دے کر
کیوں کلیجے میں مرے آگ لگاتے ہو تم
غیب سے آپ کی جُھلسا لگے اِس چاہت کے
کس لیے آ کے بھلا اور جلاتے ہو تم
بھیرویں ہے نہ یہ بھیروں نہ الھیا نہ للت
چیز جب دیکھو تو کچھ اپنی ہی گاتے ہو تم

نواب : (ہاتھ جوڑ کر) اب زندگی اور موت تمہارے ہاتھ ہے۔ بس۔

بیگم : اِس نگوڑے دل کو کس بھاڑ میں جھونک دوں۔ خوبصورت آدمی دیکھا اور رپچھ گیا۔ خوش وضع پر نظر پڑی اور دل آ گیا۔ مگر پاک دامنی قدم قدم پر ساتھ رہتی ہے۔ جہاں گئی کوئی نہ کوئی دکھ ضرور دیکھا۔ جی نگوڑا کبھی ٹھکانے نہ رہا۔ زندگی اب حرام ہے۔ ایسے پڑھے لکھے آدمی اور اس قدر عجلت یہ جلد بازی میں تو بہ شکنی نہ کروں گی۔

بُرو اے واعظ از برائے خدا — تو بہ ام مشکن از برائے خدا
گر مجوشی دگر نمی خواہم — بگذر از بحث از برائے خدا
مژدہ اے صوفیان من کردم — ترک دیبا دخز برائے خدا

دین و دُنیا سے واسطہ نہیں رکھا۔ عقبیٰ کا حال خدا جانے اب تو تارک الدنیا ہو گئے۔ اور یہ دولت نصیب ہوئی۔

نواب نے جوش جنون میں اشکوں کا طوفان بہا دیا اور ثریا بیگم پر اِن کی کیفیت زار سے صاف کُھل گیا کہ عشق صادق ہے۔ بناوٹ اور رگاوٹ نہیں ہے نواب نامدار زبان حال سے کہتے تھے کہ:

شوق بر گرد دلم پر می زند — از طپیدن حلقہ بر در می زند

زخمہای سینہ ام برداشت آب ۔ نوبہاری شد خزانم زین سحاب

بردلم زد عشق اکسیرِ گداز ۔ شد ز خونِ مردہ ام پروانہ ساز

جملہ صرفِ عشق شد اندیشہ ام ۔ خود بخود می شد ہوا در شیشہ ام

فکرتم بنیاد بر حیرت اساس ۔ گشت فصلِ برگ ریزانِ حواس

خود بخود سامان عشقم شد درست ۔ بر تنم چوں فلسِ ماہی داغ رُست

کاوشِ غم میکند در دل شیار ۔ نالہ کار و دردلم تخمِ شرار

اشکم آمداز دلِ پر اضطراب

از گلِ برق ست در جانم شراب

ثریا بیگم کا اس جوان حسین ومہ جبین خوش رو، وخوش خو پر دل آیا تھا۔ سوچی کہ اگر اس رئیس زادے کے ساتھ نکاح ہو جاتے تو دن رات کی ٹھوکروں سے بچوں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں اب تکلیف نہیں برداشت کی جاتی ہے۔ اب دل ضعیف ہوگیا۔

جب نواب صاحب کی بے قراری اور گریہ وزاری دیکھی تو اور بھی ریجھیں۔ کہ یہ ہمارا سچا عاشق ہے۔ کہا سنو نواب صاحب اگر دو دن کی مہلت دو تو جواب باصواب دوں۔

نواب : جانِ جاں۔ یہاں ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کے برابر ہے۔ تم دو دن کہتی ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو ترس کھاؤ۔

بیگم : اُف ری جلد بازی۔ سچ کہتے ہیں مردوے بڑے بے شعور ہوتے ہیں۔ دو دن کی مہلت نہیں دیتے۔

نواب : دو دن تو دو برس کے برابر ہیں۔ ہائے دردِ دل کس سے کہوں اور کس کے سامنے جاکے روؤں۔

بیگم : (دبے دانتوں) منظور ہے۔ مگر دس دن کے بعد نکاح ہوگا۔

یہ مژدۂ طرب انگیز سُن کر نواب گردوں مدار کی باچھیں کھل گئیں۔ منہ مانگی مراد پائی۔ دل کی تمنا بر آئی۔

دیدارِ شد میسر و بوس وکنار ہم

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

اُسی دم حکم دیا کہ پانچ سو روپیہ معاً لٹا دیا جائے۔ حکم پاتے ہی داروغہ نے دو سو روپیہ

اس جنگل میں لٹایا۔ وہاں معدودے چند تو تھے ہی روپیہ دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹا۔ چودہ روپیہ افغانی جوان کے بھی ہتے چڑھے۔ انھوں نے عمامہ کھول کر پھادیا تھا لوگوں سے کہہ دیا کہ لوٹنا تو ہماری وضع کے خلاف ہے۔ مگر اس عمامے پر جو گرے وہ مال حلال ہے۔ چودہ روپیہ ان کے ہاتھ لگے۔ ثریا بیگم نے ٹھان لی کہ اب اس جوانِ رعنا اور رئیس کج کلاہ کے ساتھ شادی کروں گی۔ آزاد کا کون ٹھکانا۔ کہیں پتا ہی نہیں۔ خدا جانے روم میں ہیں یا یہاں آ گئے۔ اُن کا انتظار کب تک کروں۔ اتنے دن اسی انتظار میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھایا کی۔

نواب صاحب مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے اور بات بھی ایسی ہی تھی۔

شہزادہ مرزا ہمایوں فر

بروالله مضجعه

ایں ماتم سخت ست کہ گویند جواں مرد

شہزادہ سنجر رشک مرزا ہمایوں فر بہادر کی موت ستم ہے۔ قیامت ہے یہ کیا ہوا اور ستم پر ستم یہ کہ دُلہن سولہ سنگار کرکے بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ ادھر دولہا سمند باد رفتار سے زخمی ہو کر زمین پر آرہے۔ گرتے ہی مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ دُلہن سے یہاں ہمجولیاں چھل کرتی ہیں چھیڑتی ہیں۔ دل لگیاں ہوتی ہیں۔ حسن آرا اور روح افزا گیتی آرا اور جہاں آرا، بہار النسا اور جانی بیگم اور نظیر بیگم اور ایسی ہی اور شوخ وشنگ پریاں ادا و ناز کے ساتھ چہل کر رہی تھیں۔ سپہر آرا کبھی لجاتی تھی کبھی مسکراتی تھی۔ بات بات پر ٹھنکنا اور ٹال جانا۔ کبھی بہار النسا کو بلانا اور کان میں کہنا باجی جان دیکھو یہ سب ہم کو دق کرتی ہیں اور ہم اس وقت جواب نہیں دے سکتے۔ بہار النسا سمجھاتی تھی بہن ہنسنے دو۔ سب کو ہنستے ہیں یہ تو خاص ہنسنے بولنے چہل پہل کا وقت ہے۔ تم بُرا کیوں مانتی ہو۔ جانی بیگم سمجھیں۔ کہ سپہر آرا نے کان میں میری ہی شکایت کی ہوگی۔ ان کو تاب کہاں کہ ضبط کر سکیں۔ بجلی کی طرح چمک کر آگے بڑھیں اور پیاری پیاری حنائی اُنگلیاں مٹکا مٹکا کر پچاسوں باتیں سُنائیں۔ میں سمجھی میں سمجھی۔ مجھ سے اُڑ کے کہاں وہ کوئی کہاں جائے گا۔ اُڑتی چڑیا تو میں پکڑتی ہوں۔ چاہے بلاؤ چاہے نہ بلاؤ یہ نگوڑی زبان تو نہ رُکنے کی ہرگز ہرگز

نہ رکنے کی اور ہم نے کہا ہی کیا جہاں دس ہمجولیاں ملتی ہیں چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔ ان کو بھی ابھی سب چھیڑ رہی تھیں کہ تمہارے میاں نے بہو دن نوکر رکھی ہے جو تم سے کبھی آفتابہ بھی اُٹھواتے۔ میں کچھ روئی تو تھی نہیں کہ ہنسی ہنسی میں رو دیتی۔ میں نے کہا اچھا کیا خوب کیا۔ سوتیا ڈاہ تو تب ہو جب کوئی بیاہتا آئے۔ مجال ہے۔ منہ نہ پکڑ کے جھلس دوں۔ کیا کوئی اور مقرر کیا ہے۔

بہار النسا: تمہارا ذکر نہ تمہاری بات تم ناحق کو تکتی ہو۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ آؤ پڑوسن لڑیں۔ وہ بولی لڑے میری جوتی۔ اُس نے کہا جوتی لگے تمہارے مُنہ پر۔ چلیے لڑائی ہونے لگی۔ اب رات بھر پڑوسیوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ممکن نہیں کہ تمام شب کوئی پلک پر پلک مار سکے۔ بہن اللہ جانتا ہے تمہارا ذکر نہ تھا۔

روح افزا: اِن کی باتوں کا بُرا ماننا ہی فضول ہے۔ تم کہے جاؤ۔ گو اس مقام پر اس ذکر کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن اس وجہ سے معرضِ بیان میں لائے کہ ناظرین کے سامنے دُلہن کے خانہ عشرت کاشانہ کی تصویر کھینچ جائے۔ ہائے کیا کیا سامان ہو رہے تھے۔ کیا کیا تیاریاں تھیں کیسی دھوم تھی۔ دونوں طرف عیش و طرب کی باتیں مہیا تھیں۔ دُلہن کا نکھار قابلِ دید تھا بلکہ دید تھا نہ شنید تھا۔ اور دولہا کے بُشرے سے بشاشت چہرے سے عظمت و شانِ ریاست برستی تھی۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا۔ سپہر آرا کے دل کی کلی کھلنے ہی کو تھی کہ بادِ صرصر کے جھونکے نے بالکل جھلسا دیا۔

ہر غنچہ بشگفت الا دلِ من
اے وا دلِ من اے وا دلِ من

خیر روح افزا اور بہار النسا نے جو جانی بیگم کے خلاف کہا تو اور بھی تیکھی ہوئیں۔ کہا تم دونوں بہنیں مل گئیں۔ اللہ کرے دونوں میں کھٹ پٹ ہو جائے تو ہم گھی کے چراغ جلائیں۔ اور ایسی خوش ہوں۔ کہ جامے میں پھولی نہ سماؤں۔ اِن کے جھونٹے ان کے ہاتھوں میں ہوں۔ اور اُن کے جھونٹے اِن کے ہاتھ میں۔ ہم سب دُور سے قہقہے لگائیں۔ چٹکیوں پر اُڑائیں یہ گرما گرم فقرے سن کر روح افزا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ قریب تھا کہ جانی بیگم کو دندان شکن جواب دے مگر گیتی آرا ان کے چہرے سے تاڑ گئیں کہ کمال غیظ و غضب میں ہیں۔ علاحدہ لے جا کر کہا سُنو بہن۔ جانی بیگم کا حال تو سب جانتے ہیں۔ وہ تو شوخی میں غرق ہے۔ مُنہ پھٹ۔ جو مُنہ میں آتا ہے بک اُٹھتی ہے۔ مگر بات اتنی ہے کہ آج تک کوئی بات ایسی نہیں سُنی کہ جس سے جانی بیگم کی بدی ثابت ہوئی ہو۔ بس زبان تو البتہ کترنی کی طرح چلتی ہے باقی خیر صلاح اتنی بات اِس میں ہے۔ کسی کی آدھی بات سننے کی تاب نہیں۔ اب

اس وقت جانے دو۔ تمہارے گھر میں بیٹھی ہیں۔ تمہارے مکان پر آئی ہیں۔ روح افزا بیگم خاموش ہو رہیں۔ اتنے میں جانی بیگم اٹھیں۔

بہار النسا: کہاں کہاں۔ بہن کہاں روٹھ کے چلیں۔

جانی بیگم: بس بس دیکھ لیا۔ دیکھی تری کالپی اور باون پورے اجاڑ۔ یہی کہتی تھیں کہ ہم کو تم سے بڑی محبت ہے۔ کھانے کے دانت اور، اور دکھانے کے دانت اور۔ اب آج سے یہاں آنے کا نام تو یوں گی نہیں۔

گیتی آرا: اے ہوش کی دوا کرو۔ واہ یہ روٹھنا بگڑنا کیا معنی چہ خوش بھلا جاؤ تو۔ دیکھیں تو کیوں کر جاتی ہو۔

جانی بیگم: نہیں گیتی آرا بیگم اب ہمیں جانے ہی دو۔ بھر پایا۔

گیتی آرا: (دوپٹے کا کونا پکڑ کر) بخدا جاؤ تو سہی۔ جائیے جائیے۔

جانی بیگم: اوئی۔ کیا کچھ زبردستی ہے۔ یا شہر شملہ ہے۔ واہ۔

گیتی آرا: اللہ جانتا ہے دوپٹا نکل جائے گا۔ اور ہم نہ چھوڑیں گے۔

جانی بیگم: نکل جائے گا۔ نکل جائے۔ ایک نگوڑے دوپٹے کے چھوٹے جانے سے کیا ہوگا۔ کیا اچھی دل لگی ہے ان بھروں میں ہم آ چلے۔

نظیر بیگم: یہ ناحق کا جھگڑا ہے۔ کیا ہوا کیا جو روٹھ چلیں۔

جانی بیگم: (چمک کر) تم کو بھی میرے لیے زبان آئی۔ خدا کی شان آپ بھی بولیں اپنے وقت پر تو رونے لگتی ہو۔ دل بہار۔ کہاروں کو حکم دو۔ فنس نکالیں۔ ہم جائیں گے۔ دیکھو چوبدار ساتھ ہیں یا نہیں۔ نہ ہوں تو بلوالو۔ اور کہو اب ہم یہاں نہ رہیں گے۔

جہاں آرا: خبردار دل بہار جاؤگی تو تم جانوگی۔

دل بہار: (پان چباتے ہوئے مسکرا کر) اوئی۔ دو ملاّ میں مرغی حرام اب ہم جائیں تو نہیں بنتی۔ نہ جائیں تو نہیں بنتی۔

اتنے میں جانی بیگم نے بے جھجک گیتی آرا کو زور سے گلے لگایا اور کہا بہن تم کتنی سیدھی ہو۔ میں کیا ایسی بچہ تھی کہ ذرا سی بات پر روٹھ کے چل دیتی۔ توبہ توبہ۔

جتنی بیگمات اور مخدرات عصمت صفات بیٹھی تھیں سب دنگ ہوگئیں کہ ابھی تو رسیاں توڑ کر بھاگی جاتی تھیں اور اب یہ اختلاط اور گرم جوشی ہے۔

بڑی بیگم کا چھوٹی بڑی سب لحاظ کرتی تھیں کچھ ان کے تقدس، کچھ پیرانہ سالی کچھ ثروت و دولت غیر محدود کے سبب سے اِن کو سب مانتے تھے مگر جانی بیگم کو ان کا کبھی مطلق خیال نہ تھا۔ بڑی بیگم کو ان کی دو باتیں خاص کرنا پسند ہوتیں یہ ان کی وضع اور تقریر اور چال سے اس بات کی روادار نہ تھیں کہ جانی بیگم کو اپنے ہاں آنے دیتیں۔ مگر لڑکیوں کے باعث سے مجبور ہو کر بُلوانا پڑتا تھا وہ لفظ جو خاص کر ناگوار طبع ہوتے تھے۔

۱۔ ایک بار جانی بیگم نے کہا تھا دیکھی تیری کابلی اور باون نو ریے اُجاڑ یہ اُجاڑ کا لفظ اِن کو زہر معلوم ہوا۔ اِس وقت آبادی اور شادی اور عیش اور خوشی خرمی کا ذکر ہونا چاہیئے نہ کہ اُجاڑ اور ویرانے کا تذکرہ یہ نحوست کی بات ہے۔

۲۔ جانی بیگم نے ایک بار کہا تھا! ایسی باتیں مرگھٹ میں کرنا ان باتوں سے بڑی بیگم کو اور بھی رنج ہوا۔

اب سُنیئے کہ گھوڑا کھڑے کھڑے مر گیا۔ ناظرین اِس حال سے واقف ہیں۔ بڑی بیگم نے جس وقت یہ خبر پائی اِن کے ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ اُف ہے ہے۔ دروازے پر گھوڑا مر جائے۔ اور شادی کا دن۔ برات آنے والی ہے اور جب آگ لگی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

بیگم : خورشید دولہا کو بلاؤ۔ ارے کوئی جلدی جا کے بُلا لاؤ۔

خورشید: ذرا گھبرایئے نہیں۔ گھبرایئے نہیں۔ سب بندوبست ہو رہا ہے۔ آپ اس قدر بدحواس ہوں گی تو سب گھبرا جائیں گے۔

بڑی بیگم : ہے ہے میرے تو ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ اُف میرے اللہ۔

حُسن آرا : دولہا بھائی۔ اب کیا ہوگا۔ دُلہن کو تو کہیں لے جاؤ ایسا نہ ہو یہاں تک خدانخواستہ دشمنوں کے کان بہرے کہیں آنچ آ جائے۔ یہ ہوا کیا ہزاروں آدمیوں کے سامنے آگ لگ گئی۔

خورشید دولہا: نہیں نہیں بہن۔ تم گھبراؤ نہیں اپنی اماں جان کو سمجھاؤ۔

بڑی بیگم : آخرش اب یہاں اندر کیا کرتے۔ تم سب کو گھبرانے دو مگر باہر جا کے بندوبست کرو۔ واسطے خدا کے بندوبست کرو۔

الغرض بڑی خرابی سے آگ فرو ہو گئی تو دو بلیاں باہم لڑنے لگیں ان کی آواز سے بیگم صاحب منتشر ہوئیں۔ مہریوں کو حکم دیا۔ ابھی ابھی نکال دو۔ یہ بڑی منحوس آواز ہے۔ مگر بلیاں لڑتی ہی رہیں۔

بڑی بیگم کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اور آدمیوں کو سخت سست کہا۔

اب سُنیئے کہ بلی جامن کے درخت پر چڑھ گئی اور بلاؤ دیوار پر بیٹھا رہا۔ نیچے سے ڈھیلے مارتے تھے آخر کار ایک مغلانی نے کوٹھے پر سے تاک کے اینٹ ماری اور بلاؤ تڑپ کے بھاگا۔

اُس وقت حسن آرا بیگم گلوریوں پر سونے کے ورق لگا رہی تھیں ان کو شوق تھا اپنے ہی ہاتھ سے بنائیں ایک سونے کا ورق جس کاغذ میں لپٹا تھا اُس میں آزاد کا لفظ نظر سے گذرا۔ پڑھا تو اخبار اور یہ سطریں درج تھیں۔

خوجی نے جو غور سے جو پانی کی صورت دیکھی اور گول گول دیدے پھاڑ کر لہروں اور ان کے تھپیڑوں پر نظر ڈالی تو کفن پھاڑ کر چیخ اُٹھے۔ اور کوئی پچاس قدم اُلٹے پاؤں بھاگے۔ وہاں پر خدا جانے کس مصلحت سے کسی نے ایک میخ گاڑی تھی۔ ٹھوکر جو کھائی تو ارارا دوں لڑھکتے ہی حضرت نے غُل مچایا کہ بھلا بے گیدی یہاں بھی ہماری جان کا گاہک آن ہی موجود ہوا۔ اچھا، بچّا ٹھہر تو جاؤ اتنا چپتیاتا ہوں کہ عمر بھر یاد ہی تو کرے مردک۔ ہم جو پیٹ کی طرف مُنہ اور مُنہ کی طرف دُم کیے بھاگے جاتے تھے تو گیدی نے اچھی گھات پائی ایک پٹخنی چلتے چلتے بتا ہی دی اب اوندھے پڑے بھر دپیے کو للکار رہے ہیں مگر اٹھنے کی قسم کھالی ہے۔

اتنے میں مرزا صاحب اور میاں آزاد بھی کلّے پر جا پہنچے۔

آزاد : بس اب اٹھیے۔ اُٹھیے خاصی دیر تک سویا کیے۔

خوجی : (جھاڑ پونچھ کر) پہلوان کبھی چت تو گرے ہی گا۔ نہیں جب گرے گا چت گرتے ہی زمین پکڑ لی۔

آزاد : اب سفر کی تیاری ہے۔ چلیے روم بھی دیکھ آئیں۔

خوجی : توبہ کرو بڑے بھائی خشکی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے ورنہ سلام، پانی کی صورت دیکھی اور زہرہ آب ہو گیا میں تو راہی سے تھر تھرا کر ٹھنکر بن جاؤں گا روم تک جا کون سکے گا۔

یہ کہہ کر میاں خوجی بگٹٹ بھاگے۔ آزاد اور مرزا صاحب بھی ساتھ ہی چھپٹے لینا لینا۔ جانے پائے چور۔ بچّہ ادھوری استر کا چور ہے راہ میں ایک شخص نے میاں خوجی کا ٹیٹوا لیا۔ پہلے تو بہت ہی جھلّائے اور لگے گاؤ زوریاں کرنے مگر آزاد اور مرزا بھی آن ہی موجود ہوئے۔ چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ لو بھئی ہم آگئے۔

مرزا : آزاد کے کان میں حضرت یوں نہیں جائیں گے ان کو خوب افیم پلوائیے اور اُلّو بنائیے۔

جب یہ نشے میں غیں ہوں تو لادلود کر جہاز پر بٹھا دیں گے۔

آزاد : اچھی ترکیب ہے (خوجی سے) ارے میاں خوجی۔

خوجی : خواجہ صاحب نہیں کہتے۔ خوجی کی ایسی تیسی۔ خواجہ بدیع خاصہ نام ہے۔ خوجی کیا معنی۔

آزاد : خواجہ صاحب آپ نے آج افیم تو پی ہی نہیں۔

خوجی : یہ کاہے سے معلوم ہوا آپ کو۔

مرزا : آنکھوں سے جمائیوں سے۔

آزاد : کیوں صاحب آپ نے افیم پیتے دیکھا تھا انھیں۔

مرزا : جی میں تو خود ٹوکنے کو تھا۔

خوجی : ہاں حضرت کچھ نشہ تو ہم کو بھی ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ (جمائی آئی) بے شک افیم نہ پی ہوگی۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو اپنے ہوش کا حال ہے۔

آزاد : اس وقت جمائی بھی آئی آپ کو۔ وہ لیجیے دوسری آئی۔

مرزا : تیسری آئی۔ واللہ۔ اس وقت تو جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔

خوجی : بھائی بندہ بے پیے اب بات تو کرنے کا نہیں۔

میاں خواجہ بدیع صاحب نے پیالیاں نکالیں افیم گھولی اور چسکی لگائی آزاد ہشاش بشاش کہ تر پر تہ جمائی، مرزا خوش کہ ہماری تدبیر کارگر ہوئی۔ خوجی نے افیم جو پی تو مارے ہوس کے ذرا زیادہ پی گئے۔ پیتے ہی غین۔ آنکھیں بیربہوٹی۔ آزاد نے ایک چھپر کھٹ پر لاد کر حضرت کو کشتی پر سوار کیا اور وہاں سے جہاز پر خوجی کو سروپا ہی کی خبر نہیں ورنہ اس قدر روتے کہ الامان آزاد سوار ہونے ہی کو تھے کہ مرزا صاحب کا دوسرا خدمت گار بے تحاشا دوڑتا ہوا گھر سے آیا۔

آزاد : خیر تو ہے۔ خیر تو ہے۔

مرزا : اُف خداوندا خیر کیجیو۔

خدمت گار : (ہانپتے ہوئے آزاد سے) حضور بیگم صاحب۔

آزاد : ہاں ہاں۔ کیا ہوا بتاؤ۔

مرزا : ارے غضب۔ ارے کمبخت بول تو کیا ہوا۔؟

خدمت گار : (روکر) حضور۔

مرزا : ہائے غضب، اُف۔ ستم ستم ستم۔ پیاری بیگم دھوکا دے گئیں۔

حسن آرا بیگم نے جو یہ فقرے پڑھے تو ان کا دل بھر آیا۔ گلوریاں پٹک دیں۔ سونے کے ورق پھینک دیئے اور ایک گوشے میں جاکر خوب روئیں۔ اب یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب کہ چار پانچ منٹ میں قادر انداز قضا و قدر ابدی رنج و غم کے زہر بجھے ہوتے تیر سے سپہر آرا کے کلیجے کو نشانہ بنانے والا ہے۔ جب حسن آرا تھوڑی دیر تک نہ آئیں تو بڑی بیگم نے مغلانی سے کہا۔ ذری جائے حسن آرا سے کہو کر باہر آن کے بیٹھو۔ وہاں کیا کر رہی ہیں۔ جلد بُلا لا۔ کہ گلوریاں مانگی ہیں۔

مغلانی : (شہ نشین میں جاکر) حضور چلیے سرکار نے یاد کیا ہے۔

حسن آرا : (اشارے سے) اچھا ٹھہر جاؤ۔

مغلانی : کیوں کیوں خیریت تو ہے۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔

حسن آرا : (آہستہ سے) تم چلو میں آئی۔ ابھی آئی۔

مغلانی : (بڑی بیگم سے) حضور وہ تو اس وقت۔

بڑی بیگم : کیا۔ اس وقت کہہ کر خاموش کیوں ہو گئی۔ خیریت تو ہے۔

مغلانی : حضور وہ تو خدا نا کردہ رو رہی ہیں۔

بڑی بیگم : خدا نا کردہ رو رہی ہیں۔ اس کے کیا معنی۔؟

مغلانی : اب معنی تو اس کے ظاہر ہیں۔ آنکھیں سُرخ بیر بہوٹی ہو گئی ہیں۔ کیا جانے کیا سبب ہے۔ بہت روئیں۔ زار زار روئیں۔ میری عقل حیران ہے۔ جہاں آرا اور گیتی آرا اور روح افزا اور نظیر بیگم اور جانی بیگم کو تاب کہاں کہ یہ خبر سُنیں اور خاموش ہو رہیں۔ پھُرتی اور تیزی کے ساتھ شہ نشین کی طرف چلیں۔ مگر جانی بیگم سب کے پہلے پہنچیں اور یوں ہم کلام ہوئیں۔

جانی بیگم : حُسن آرا بہن۔ (گلے لپٹ کر) اے ہے۔ اے یہ کیا کر رہی ہو۔ ذری آنکھیں تو دیکھیں (آنکھوں کو چوم کر) پیاری بہن۔ بتاؤ تو یہ ہے کیا۔

روح افزا : حُسن آرا۔ ایں! کچھ کہو تو۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

جہاں آرا : اب مُنہ سے بولو۔ کیا سب کو رُلواؤ گی۔

جانی بیگم : کیا گنواروں کی سی باتیں کرتی ہو۔ رُلواؤ گی۔ رُلواؤ گی۔ ہم سے پوچھو۔ یہ روتی اس مارے ہیں کہ بڑی بہن کونے میں بیٹھی رہیں اور چھوٹی بہن کی شادی ہو۔ اکثر چھوکریوں اور چھوکروں کو اس بات کا خیال ہوتا ہے۔ ان پر کیا موقوف ہے۔ سب کو یہ خیال آتا ہے۔

گیتی آرا : یہ ہنسی دل لگی کا کون موقع ہے۔

جانی بیگم : یہی موقع ہے۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔

جہاں آرا : حسن آرا اچھا منہ تو دھوڈالو بی مغلانی کھڑی دیکھتی کیا ہو۔ پانی منگواؤ۔ لے منہ دھوڈالو، مار کے ہلکان کر دیا۔ اپنے کو۔

پیاری : بیگم صاحب۔ اس وقت جو سونے کا ورق اٹھایا تو کاغذ پڑھنے لگیں، بس اسی کو پڑھ کر خوب روئیں۔ اتنے میں اماں آ گئیں اور اب آپ سب آئیں۔

جانی بیگم : (حسن آرا کے کان میں) روؤ نہیں بہن تمہارے واسطے ہم چاند سا دولہا تجویزیں گے۔ رونے کی کون بات ہے۔ رونے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ ناحق اپنی جان کو ہلکان کرتی ہو۔ آج کے آٹھویں دن دولہا ہو حسن آرا نے منہ دھویا۔ روح افزا نے اپنے ہاتھ سے گلوریاں کھلائیں جانی بیگم پھر گلے لپٹی۔ اور پھر آنکھوں کے بوسے لیے۔ حسن آرا بولی اللہ جانتا ہے تم بڑی بے جھجک اور ڈھیٹ ہو کسی مقام پر بند ہی نہیں۔ زبان رکتی ہی نہیں مقراض سے بھی دو ہاتھ آگے جاتی ہے۔

جانی بیگم : آؤ بہن ہم سب مل کے گائیں۔ رنگ رلیاں منائیں۔

شادیِ جلوۂ گلفام مبارک ہووے
عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے

آؤ ایک کام کریں۔ ایک روز ہم سبز پری بنیں اور حسن آرا بنیں لال پری۔ نظیر بیگم۔ پکھراج پری۔ اور مغلانی بنے لال دیو اور اس نگوڑی حبشن کو کالا دیو بنائیں اور اندر سبھا کا تماشا کریں۔ بڑا لطف ہو جائے۔

جہاں آرا : کیا دور کی سوجھتی ہے۔ جب سوجھی ایسی ہی سوجھی۔

حسن آرا : ان سے بعید نہیں ہے۔ ایک دن یہ کر دکھائیں گی۔

جانی بیگم : اوئی یہ کھڑی بولی تو دیکھو۔ مردوں کی سی۔

روح افزا : اور سنو تو بہن۔ پریاں تو بن چکیں۔ راجہ اندر کون بنے گا۔ یہ نہیں تجویزا۔ یہ بھی تو تجویز کرو۔ کسی کو راجہ اندر بھی بناؤ۔

جانی بیگم : تمہارے دولہا۔ راجہ اندر بنیں۔ اور کوئی گلفام بن جائے۔

حسن آرا بیگم گلوریاں چباتی ہوئی۔ بڑی بیگم کے پاس گئیں مگر دل میں شرمندہ تھیں کہ اگر رونے کا سبب پوچھا تو کیا بتاؤں گی۔ بڑی بیگم نے اس وقت بات ٹال دی پوچھا گلوریاں بنائیں۔

گئی تو بڑے دعوے سے تھیں۔ جس کا کام اُسی کو چھاجے حسن آرا نے کہا اماجان کیا مجال کہ کوئی ہم سے بڑھ کے گلوری بنائے۔ آزما لیجیے۔

بس یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ تیرِ غم نے گھر بھر کے دلوں کو نشانہ بنایا۔

شوخ

نواب قمر رکاب اور نا تورۂ یوسف جمال مشتری تمثال نے شبکو ہرن کے کباب ہریل اور چے کا گوشت خرگوش کا سالن بارہ سنگھے اور پاڑھے کے انواع و اقسام کے کباب چکھے۔ شکاریوں نے شکار کا انبار لگا دیا۔ اِن کے خیمے کے اِرد گرد ہر درخت کے نیچے جانور بھن رہے تھے۔ کوئی ہرن کی ران بھون رہا ہے۔ کوئی خرگوش پر چھری تیز کرتا ہے۔ کوئی ہریل کے کباب مزے سے چکھتا ہے۔ کوئی چھوں پر دانت لگائے ہے۔ بجز ٹھاکر کاشی سنگھ اور لالہ ہری چند کے اور سب گوشت خور ساتھ تھے۔

اِن بیچاروں نے سب سے الگ تھلگ بستر جمایا اور ایک دوسرے کو ہمدرد پاکر باہم گفتگو کرنے لگے کہ گوشت کھانا بری بات ہے۔ لالہ نے کہا۔ رام رام کوئی جانور بچنے نہیں پاتا۔ ہریل یہ کھائیں، چہے یہ کھائیں پاڑھا یہ کھائیں بارہ سنگھا یہ کھائیں خرگوش ہرن کوئی جانور بچتا ہی نہیں۔ ٹھاکر بولے بھائی صاحب ہم تو بارہ برس سے ماس مچھلی نہیں چھوتے۔ ایک دن دریا میں پیرتے جاتے تھے۔ تو ایک مچھلی دیکھی۔ روہو۔ سوچے کہ اگر یہ مچھلی ملے تو ماہی کباب خوب پکیں۔ آدمی کو حکم دیا کہ جال اور کانٹا لاؤ۔ اتنے میں دیکھا کہ وہ مچھلی ایک چھوٹی مچھلی کو کھا گئی۔ بس نفرت ہو گئی۔ پھر ہم نے عہد کر لیا کہ آج سے ماس مچھلی نہ چھوئیں گے۔ لالہ نے کہا شاباش! جتنے حلیم اور سلیم جانور ہیں وہ بھی گوشت خور نہیں۔ ہاتھی، گینڈا، بھینسا، گھوڑا، نیل گائے، یہ جانور کبھی گوشت نہیں چھوتے۔ اسی طرح جو سلیم الطبع آدمی ہیں وہ بھی گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ ٹھاکر کو یہ بات پسند آئی۔ کہا دیوانجی آپ نے خوب ہی مثال دی۔ ذی رُوح کو اپنے ذائقے کے لیے ذبح کرنا عقل کے خلاف اور سراسر بے انصافی ہے۔

اتنے میں نواب صاحب کے ساتھ کے دو شکاری باتیں کرتے آتے تھے۔ ایک نے کہا یار جب کچھ بھی شکار نہ ملا تو بندے نے جھلا کے پانچ سات کوّے گرا دیے اور تین چلیں گرائیں۔ لالہ سے

نہ رہا گیا۔ کہا شاباش۔ شاباش۔ ع

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

مطلب تو جان مارنے سے ہے۔ اُس نے پھر کر دیکھا تو مسکرایا۔ دیوانجی ہیں۔ کیوں آپ بیڑے سے الگ تھلگ جا کے کیوں بیٹھے۔ لالہ بولے۔ وہاں تو اس وقت بڑا پاپ ہو رہا ہے ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی جاندار کی گردن پر چھری پھیری جائے۔ تم لوگ گوشت کھاتے ہو تو کھاؤ۔ مگر بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھیں۔ ہرنی اور بچھے کو تو خیر کھاتے ہو۔ ان کا شکار زبان کے ذائقے کے لیے کرنا۔ مگر یہ چیل اور کوّے نے کیا بگاڑا تھا۔ جو ان پر بھی آپ نے نظرِ عنایت کی اور کس فخر سے بیان کرتے جاتے تھے کہ جب کچھ اور نہ ملا تو ہم نے کوّے گرا دیئے۔ واہ واہ واہ۔ کوّے کے مار ڈالنے سے کیا ملا۔ دوسرا شکاری بولا اجی آپ کو گوشت کا ذائقہ کیا معلوم آپ نے کبھی کھایا ہو تو جانیے گوشت کا مزہ گوشت خور سے پوچھیے کہ بغیر سالن کے کھانا حرام ہو جاتا ہے۔

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

ٹھاکر نے کہا بھیّا ہم در گذرے۔ غضب خدا کا جس درخت کے تلے دیکھو دو چار جٹے ہوتے ہیں۔ خدا جانے یہ بیچارے جانور کیا کرتے تھے کیوں کر رہتے تھے۔ حضرت انسان کے لینے میں نہ دینے میں۔ مگر بستی سے بندوقیں اور چھرے اور گولیاں لے کر آئے اور داغنا شروع کیا۔ شیرنی بیچاری کے بچے بھی مرے اور وہ بھی مری۔ یہ گناہ نہیں تو اور کیا۔ بستی میں آپ رہیے۔ جنگل ان کو دیجیے۔ نہیں کہ بستی اور جنگل والوں پر قبضہ کر لیجیے۔ جب جی چاہا بندوق اُٹھائی اور دو چار بے گناہوں کا خون کیا۔ توبہ توبہ بڑی بُری بات ہے۔

شکاری: پھر اب تو ہم سے گوشت نہیں چھوٹ سکتا۔ چاہے جو ہو۔ اب تو خون مُنہ سے لگا۔ مرتے دم تک گوشت کھائیں گے۔ ہم سے اب نہیں چھوٹ سکتا۔

ٹھاکر: اچھا بھئی۔ اپنی اپنی سب بھگت لیں گے۔ اِس میں کسی کا کیا اجارہ ہے جو جیسا کرے گا وہ ویسا پائے گا۔ ع

ہر کسے آں دُرو د عاقبت کار کہ کشت

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

لالہ : اگر ہریل ہو اور کوئی شکار کرے تو اپنے دل میں کیا سوچو۔ انچہ برخود م پسندی بر دیگرے ہم پسند۔ بس اس قدر خیال چاہیئے۔

شکاری : جانور کا دل کیسا اور قوتِ متخیلہ اس میں کہاں ہے۔ خدا نے جانور اسی لیے پیدا کیے کہ انسان اُن کو کھائے۔ اگر حلال جانور نہ کھائیں تو وہ جناب باری سے روز حشر انسان کے شاکی ہوں گے۔

لالہ : ہاں یہ کہیے تو پھر ضرور کھائیے ہرگز نہ چھوڑیے۔ ان پر احسان کیجیے۔ اور موقع ہی نہ دیجیے کہ شکایت کر سکیں۔ روز چھری اِن کی گردن پر تیز ہو۔

اِدھر نواب صاحب اور معشوقِ گل بدن میں میٹھی میٹھی باتیں ہوتی تھیں۔

نواب : پہلے تو تم رنگ لائی تھیں۔ بارے پھر سنبھل گئیں۔

بیگم : پھر جب ڈر جاتا رہا۔ پہلے ہم سوچے کہ ایک تو جنگل کا واسطہ دوسرے شیر کا شکار۔ اور شیر وہ جس کے نام سے بدن کانپتا ہے۔ ہے ہے۔ پہلے سمجھی تھی کہ بندھا ہوگا۔ جب سُنا کہ شیرنی کچھار میں بچے لیے بیٹھی ہے تو روح لرزنے لگی۔ پھر ڈر ور کچھ نہ معلوم ہوا۔ اچھی طرح سیر دیکھا کی۔

نواب : اِن بابوؤں نے بڑی سیر کی۔ اُف فوہ۔ پھڑکا دیا۔

بیگم : وہ دیکھا تھا جب دھوتیاں سنبھال سنبھال کر او شالا کہہ کر دونوں آپس میں لڑنے کو تھے۔ مگر گندے تول تول کر رہ جاتے تھے۔ افوہ۔ مجھے بڑی ہنسی آئی یہ اِس کو شالا کہتے وہ اُس کو شالا کہتے۔ اور خدا جانے کیا کیا بکتے تھے۔ میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آیا۔ واہی تباہی کیا بکا کیے۔

نواب : بلواؤں۔ بلواؤں۔ دل لگی تو ہوگی۔ کوئی ہے۔ دونوں بابو صاحبوں کو بُلا لاؤ۔ کہنا نواب صاحب کہتے ہیں یہاں آ کے بیٹھے۔

دس بارہ منٹ میں مسٹر بوس اور مسٹر گھوش دھوتیاں پھڑکاتے ہوئے آئے۔ نواب صاحب نے کہا کہیے بابو صاحب خدا نے آپ دونوں کو بہت بچایا ورنہ شیرنی کھائی جاتی۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

بوس بولے ہم ڈرتا نہیں تھا۔ ہم اس شالا چپبل کا بان کو مارنے چاہتا تھا۔ وہ شالا۔ ہم کو بہت دیک (دق) کیا وہ جانتا تھا کہ ہم ایش دیش (اس دیس) کا آدمی نہیں ہے دوسرا دیش کا ہے۔ اس ماپھک

ہمارے کو ڈرانے سکتا کہ ایسا بات ویسا بات اور ہاتی کو بود جاتی (بدذاتی) سے ہلانے مانگتے۔ جب تو ہم لوگ بڑا گسا (غصہ) ہوا کہ ارے سب لوگ، کا ہاتھی ہلنے نہیں مانگتا تم کیوں ہلنے مانگتا۔ اور ہم سے بولا کہ بابو شاہب اب تم مرے گا ہاتھی کا پاؤں پھسلے گی اور تم مر جائیں گی۔ (سبحان اللہ) ہم بولا۔ ارے جو ہاتھی کا پاؤں پھسل جائے گی تو تم شالے کا شالا کہاں بچ جاتے گا۔ تم تو بھی ہمارا ایک ساتھ مرے گا۔ (بہت ہی خوب) ثریا بیگم اِس قدر ہنسیں اس قدر کھکھلائیں کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے ہاتھ جوڑ کر کہا نواب خدا کے لیے اب اس جانگلو کو رخصت کرو۔ نہیں مارے ہنسی کے بُرا حال ہو گا۔ اُف فوہ۔ یہ تو بات کہتا ہے بے تکی (مر نیگا گا) پھیلبان مر جائیں گی۔ (پاؤں پھسلے گی)۔ (ہمارے کو ڈرانے سکا) (بود جاتی) (ہلنے مانگتا) (ایش دیش) دق کو دیک۔ غصّہ کو گسّا سب کو شب (مارنے چاہتا) واہ وا کیا تقریر ہے۔

نواب صاحب نے پوچھا بابو جی یہ تو جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب یہ فرمایئے کہ کل شکار کھیلنے جایئے گا یا نہیں۔ بابو نے کہا۔ جائے گا تو جورور (ضرور) کرکے مگر پھیل کا بان بدجاتی کرے گا تو ہم آپ کا برائی کھبر کے کالم میں چھاپے گا۔ ہمارا ہاتھی پر بیگم شاہب ہمارا ساتھ رہے تو ہم چلے جائے گی۔

اس پر ثریا بیگم تیکھی چتون کر کے بولیں۔ چل موئے در گور بڑے چوکھے بیگم شاہب تو تم ایسوں کو اپنا سایہ تک نہ چھونے دیں۔ پہلے مُنہ تو بنواؤ۔ نواب صاحب نے فرمایا اچھا اِس میں ہرج کیا ہے۔ آخر بندۂ خدا یہ بھی ہے صورت شکل آدمی ہی کی ہے۔

بوس : ہم لوگ آپ کا کھواسی (خواصی) کے اوپر بیٹھے گا۔

نواب : بجا ہاتھی بھاگتا نہ ہو تو بھاگ جاتے۔ میں در گذرا۔

بوس : نہیں ہم بندوک (بندوق) لیے رہے گا اور شکار کھیلے گا۔ اب ہمارے کو ڈر پاس نہیں آتے۔ ہم کھوب جان گیا کہ جان جانے والا ہے۔

بیگم : کہیں اِس بھروسے بھی نہ رہنا کہ جان نہ جائے گی۔

بوس : اب ہم کھانے جاتا ہے بھوکا ہے۔ سلام شاہب سلام۔

بیگم : اچھا اب آپ تشریف لے جایئے۔ خدا کے لیے یہاں سے جایئے۔

بابو صاحب تشریف لے گئے تو ثریا بیگم کو اور بھی ہنسی آئی۔ ان کی باتیں یاد کر کے بڑی دیر تک ہنسا کیں۔ ایک بات کی اور ہنسی آئی۔ ایک فقرہ زبان سے نکلا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ دو لفظ کہتے اور ہنسنے لگیں۔ نواب صاحب نے سمجھایا کہ بس اب بہت ہنس چکیں۔ اب ضبط کرو۔ یہ خندہ بے محل

اچھا نہیں۔ مگر انھوں نے ایک نہ سُنی بے اختیار ہنسی آتی تھی اور بابو صاحب کے فقرے یاد تھے جن کو بار بار زبان پر لاتی تھیں۔ او شالا پھیل کا بان تم ہماری کا جان لینے مانگتا۔ (ارے بابا ہمارا نانی مرگیا بڑا بود جات ہے) جان جائے گا (جان سے مارنے سکتا نہیں) ایک ایک جملے پر دس دس منٹ تک ہنسا کیں اور نواب صاحب بھی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

اتنے میں چوبدار نے آن کر عرض کیا خداوند ریاست کے اہلکار نے دریافت کیا ہے کہ حضور کل شکار کھیلیں گے یا نہیں۔ اگر کھیلیے تو وہ مقیم رہیں ورنہ جائیں۔ نواب صاحب نے کہا کیوں جانے کا کیا سبب ہے۔ ہم ابھی ایک ہفتے تک شکار گاہ میں رہیں گے۔ راجہ صاحب سے دریافت کر کے اہلکار ریاست بھی مقیم رہے۔ اس کے بعد نواب صاحب نے اشعار پڑھنا شروع کیے۔

ثریا بیگم یعنی مس پالن پادری صاحب کے ہاں تین مہینے تک مقیم رہ کر اردو کے اشعار سمجھنے لگی تھیں۔ اچھے بُرے میں تمیز ہو گئی تھی۔

کوئی صورت سے گر صفا ہو — آئینہ دل خدا نما ہو
ماشا اللہ چشم بددور — کیا خوب جوان مہ لقا ہو
منصف ہوں جو شیخ و گبر دل میں — قصہ چک جائے فیصلا ہو
دوزخ کو بھی مات کر دیا ہے — اے سوزش دل ترا بُرا ہو
مسند کیسی فقیر ہوں میں — تھوڑی سی جگہ ہو بوریا ہو

کہتے ہیں وہ میرے دیکھنے پر
دیکھو کوئی نہ دیکھتا ہو

نواب: مطلب سمجھتی ہو۔ یا زبان ہی تیز ہے۔ کچھ سمجھیں۔

بیگم: ہم کچھ پڑھے لکھے ہوں تو سمجھیں۔ ہماری سمجھ میں کیا آئے بھلا۔

نواب: تمھیں خدا کی قسم سچ کہو۔ کچھ سمجھیں بھی۔ شعر پڑھوں۔

بیگم: پڑھیے بسم اللہ۔ مگر ترکی عربی فارسی نہ ہو۔ اردو ہو۔

نواب: ہاں ہاں۔ اردو۔ اردو۔ اور بہت صاف صاف سُنیے۔ اب!

اثر آتش سودا سے دوا جلتی ہے
تیرے بیمار کی صورت سے شفا جلتی ہے

بیگم: سودا کی آگ میں ایسا اثر ہے کہ دوا تک جل جاتی ہے۔ اور جب دوا ہی جل گئی تو فائدہ

معلوم۔ اگر خالی خوبی سودا کا لفظ تو ٹھیک تھا لہذا آتش سودا لایا۔ دوسرے مصرعے کے یہ معنی ہیں کہ تیرے بیمار کی صورت دیکھی اور شفا یعنی صحت جلنے لگی۔ بس جب شفا خود ہی جل گئی تو مرض کا دفع ہونا معلوم۔

نواب : شفا اور شفا میں کیا فرق ہے۔

بیگم : یہ ہم کو نہیں معلوم۔ ہم تو شفا شفا بولتے ہیں۔

نواب : شفا بفتح کے معنی موت اور شفا بالکسر کے معنی آرام صحت۔ نواب صاحب کمال محظوظ ہوتے۔ کہا جانِ من اب ہم تمہیں پڑھایا کریں گے اِس سے زیادہ لطف اور کسی بات میں نہیں کہ نوجوان میاں نوخیز بیوی کو پڑھاتے عجب لطف آتا ہے۔ اچھا اس کے معنی بتاؤ۔

ہے نسیم صبح کا عالم خرام ناز میں
سبزۂ خوابیدہ کو چلتے ہو چونکاتے ہوئے

بیگم صاحب نے کہا۔ معشوق کی چال کی تعریف کرتا ہے کہ خرام ناز میں نسیم سحری کا عالم ہے۔ یعنی جس طرح صبح کے تڑکے ہوا سے سبزۂ خوابیدہ لہلہاتا ہے اسی طرح معشوق کی سبک خرامی اور نازک رفتاری سے سبزہ چونکنے لگتا ہے۔ سبزے کو خوابیدہ اور بیگانہ کہتے ہیں۔ نواب صاحب نے ہاتھ کا بوسہ لیا اور کہا۔ لبِ لعل کا بوسہ پھر کبھی لیں گے۔ بیگم صاحب نے ہنس کر کہا۔ اے واہ اُلٹی گنگا بہائی۔ کجا شعر کے معنی۔ کجا ہاتھ۔ ہاتھ کو اس سے کیا تعلق ہے بھلا۔

نواب صاحب بھی اِس فقرے پر ہنسے کہا نازک خرام کہا کرو۔ نازک رفتار نہ کہا کرو۔ نازک رفتار غلط ہے۔

رُخ پر ترے نقاب نہیں اے نگارِ سُرخ
خورشید پر ہے لکّۂ ابرِ بہار سُرخ

بیگم صاحب نے اس کے معنی یوں سمجھاتے۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق کے رُخِ انور پر جو نقاب پڑا ہے اصل میں یہ نقاب نہیں ہے۔ پھر کیا۔ یہ آفتاب پر لال لال بادل کا ٹکڑا ہے۔ رُخِ انور کو خورشیدِ تاباں سے مشابہت دی۔ اور نقاب کو لکّہ بھر سے۔ ابر بہار یعنی وہ ابر۔ وہ ابر جو معنی تو جانتی ہوں۔ یہی معنی ہیں کہ وہ ابر جو ایام بہار اور موسم گل میں جو گلوں کو شاداب و سیراب کرے۔

نواب : سبحان اللہ۔ یا خدا میں تیرا ایسا مشکور و ممنون ہوں کہ اگر بفرض محال ایک ایک رونگٹا کروڑ کروڑ زبان ہو جائے تو بھی ادائے شکر سے قاصر ہوں۔ اب پھر عیش کریں گے۔ پھر ایام نشاط آیا۔ پھر۔

گلستان دل پر ابر بہار چھایا۔ ہزار شکر خدا صد ہزار شکر خدا۔

پھر عیش ہو پھر خسرو گل کا ہو زمانہ
پھر صحن گلستاں میں کرے باد صبا رقص

بیگم : ہمارے ہاتھوں کی مہندی چھوٹ گئی ہے۔ سونے ہاتھ بُرے معلوم ہوتے ہیں پہلے ہم کو مہندی منگوا دینا۔ تمہارے کوئی باغ واغ ہے۔ بس وہیں رہا کریں گے۔ رات دن سیر گل و سنبل میں رہا کریں گے۔

نواب : ایک باغ ؟ ہو ہو: دو باغ تو نانا کے پر ہیں۔ ایک پُرانے حیدر گنج میں ہے۔ ایک باغ جھنجھٹ کے راستے میں ہے۔ باغوں کی کمی نہیں ہے۔

بیگم : ہمیں پڑھایا کرو گے۔ کوئی کتاب علم طبیعات کی پڑھاؤ۔

نواب : کیا! کون علم ہم نے نام بھی نہیں سُنا (بہت چکراتے)۔

بیگم : علم طبیعات ہم کو پادری صاحب نے اس تین مہینے کے عرصے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ زمین اور سمندر کے بخاروں کو آفتاب اپنی طرف کرن کے ذریعے سے کھینچ لیتا ہے اور جب وہ ابخرے اوپر جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ کرۂ زمہریر کے پاس پہنچتے ہیں یہ وہ کرہ ہے جہاں ہوا سرد ہے اور سردی سے کل چیزیں جم جاتی ہیں۔ پس یہ بخار بھی جم جاتے ہیں۔ اور جم جانے کے سبب وزنی ہو کر زمین پر گرتے ہیں۔ اسی کو بارش کہتے ہیں۔ مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ نواب نے کاغذ لیا پڑھا۔

بیگم : کیا تم نے یہ علم نہیں پڑھا پڑھنے کے قابل ہے۔

نواب : ہم نے بجز شاعری کے اور کچھ نہیں سیکھا۔ فقط شاعری ہی جانتے ہیں۔ بیگم صاحب نے کہا اُنھوں نے ہم سے بیان کیا تھا کہ بادل کی سات قسمیں ہیں۔ اور برف کی نسبت اُنھوں نے بیان کیا تھا کہ ٹھنڈی ہوا کی برودت سے بخار جم جاتے ہیں اور اسی قسم کے جمے ہوئے بخار کو برف کہتے ہیں۔ سردی کے دنوں میں برف سے زمین گرم رہتی ہے۔ اور نباتات اس کے سبب سے سبز ہو جاتے ہیں۔ اور گرمی میں برف نہ گرنے کا سبب یہ ہے کہ جب اُوپر سے برف گرتی ہے تو زمین کے قریب کی گرم ہوا اس کو پگھلا دیتی ہے لہٰذا زمین پر برف بن کر نہیں گرتی۔ ہمیں پادری صاحب نے چاند دکھایا۔ عطارد دکھایا مریخ دکھایا۔ اور کتنی ستارے دکھاتے دور بین بھی کیا شے ہے۔ نواب صاحب کے ہوش اُڑ گئے ان کو علم طبیعات سے کیا واسطہ۔ سوچے کہ اگر یہی گفتگو رہی تو ہم کو جھیپنا پڑے گا۔ لہٰذا پھر شعر و شاعری

کا چرچا شروع کر دیا کہا۔ بھلا اس شعر کے معنی تو کہیے۔

نو بہار آمد کہ افشاند چو حُسن یار گل
چوں وصالِ یار ریزد ہر خس و ہر خار گل
گلشن اقبال و دولت شاہ اکبر کز ازل
بوئے خلقش کرد از خوابِ عدم بیدار گل
عزم او گر باغبانِ دہر گردد در زیست
گر شود چون آفتاب اندر جہاں بسیار گل

بیگم صاحب تو فارسی جانتی تھیں نہیں ان اشعار کے معنی کیوں کر بتا سکتیں۔ اس پر نواب صاحب بہت خوش ہوتے۔ کیوں سچ کہیے گا۔ کیا شعر ہیں۔ مجھ کو تو شاعری کا عارضہ ہے تم شعر لکھا کرو۔ بیگم صاحب نے کہا اگر اصلاح دیا کرو اور کچھ پڑھاؤ تو کیا مضائقہ۔ حضرت نے قسم کھائی کہ ضرور فارسی پڑھائیں گے۔ اور اصرار کے ساتھ کہا کہ آج سے تمہارا تخلص شوخ رکھا۔ اب آج سے ثریا بیگم شوخ ہم بھی کہا کریں گے۔

بیگم صاحب نے کہا ابھی تین مہینے ہوتے کہ ایک حرف تک نہیں جانتی تھی۔ اور اب تم کہتے ہو کہ شوخ تخلص رکھو اور شعر کہا کرو۔ پہلے کچھ پڑھنے تو دو کم سے کم برس بھر تو پڑھ لوں۔ کوئی دیوان پڑھا دو۔ دو چار دیوان پڑھ لیں۔ سو دو سو شعر یاد ہو جائیں تب تو شعر کہہ سکوں۔ نواب صاحب نے کہا ہم چٹکیوں میں تم کو شاعر بنا دیں گے۔ ہمارے ڈھائی سو تین سو شاگرد ہیں۔ اور ایک سے ایک بڑھا ہوا۔ بطور خود اُستاد ہے۔

بیگم : اب کل پھر شکار ہو گا۔ اور جو شیر نہ ملا تو کیا ہو گا۔

نواب : نہ ملنا کیا معنی۔ نہ کیوں کر ملے۔ نہ ملے۔ نہ ملے ضرور ملے۔

بیگم : دیکھنا جو ہم کہیں گے وہی ہو گا۔ دوسری بات نہ ہونے پائے گی۔ جو حکم دے دیں اس کے خلاف ہو۔ کیا مجال۔ ممکن نہیں۔

نواب : یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہ بُری سُنائی۔

خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے
ارادہ کون سے در پر کروں میں داد خواہی کا

بیگم : بد صورتوں پر خدا کا عذاب اور قہر ہے مگر خوبصورتوں پر مہر ہے۔ ہم چاہے جس قدر

لن ترانی کی لین جائز ہے۔ سزاوار ہے۔ زیبا ہے۔

بیجا نہیں حسینوں کی ہیں لن ترانیاں
اے عاشقو یہ حسن امانت خدا کی ہے

نواب : دیکھیں اب کل بابو صاحب کیا دل لگی دکھاتے ہیں۔ میں فیلبان کو سکھادوں گا۔ کہ آج اور بھی زیادہ ڈرانا۔

بیگم : فیلبان نہیں۔ پھیل کا بان۔ بلکہ شالا پھیل کا بان (ہنس کر) بڑا مزا آتا ہے۔ ان کی بولی ہیں۔ او شالا پھیل کا بان۔ اور دھوتی گھڑی گھڑی سنبھالتے جاتے ہیں۔

یہ گفتگو ہو کر نواب صاحب سو رہے اور ثریا بیگم شوخ علاحدہ پلنگ پر لیٹیں اور اپنی سوانح عمری پر غور کرنے لگیں کہ پہلے ثریا بیگم تھیں پھر اللہ رکھی ہوئی اس کے بعد جوگن بنی۔ پھر شبّو جان نام ہوا پھر بیرٹن مشہور ہوئی پھر مس پالن اور اب شوخ کا خطاب پایا۔ بڑی دیر تک غور کیا کیں کہ نکاح کا اقرار پورا کریں یا نہ کریں۔ مگر دل یہی گواہی دیتا تھا کہ قول کے مطابق عمل میں لائیں اسی فکر اور خوض میں آنکھ لگ گئی تو خوب میٹھی نیند سوئیں۔

اے میرے نامراد پسر کم سخن پسر
دولہا پسر یتیم پسر بے وطن پسر
زخمی پسر شہید پسر خستہ تن پسر
سیمیں بدن پسر مرے پستہ دہن پسر

ہے ہے یہ کیا ہوا۔ حسن آرا بیگم گلوریوں پر سونے کے ورق جماتی تھیں اور بیڑا اٹھا کے گئی تھیں کہ ایک گلوری کے کھانے سے پسینے آجائیں گے لوگ فرمائشیں اور خوشامد سے بیڑے بنوائیں گے سپہر آرا کھلی جاتی تھی بات بات پر ہنسی آئی تھی۔ جانی بیگم کی چہل اور طراری نظیر بیگم کی نستعلیق شوخی۔ روح افزا کی پیاری پیاری باتیں گیتی آرا کا جوبن جہاں آرا کی دل ربائی کی گھاتیں بہار النسا کی بناوٹ اور سجاوٹ۔

غرض کہ بڑی بیگم کے مکان عشرت نشان میں پریوں کا دھاڑے کا دھاڑا تھا مکان کیا کوہ قاف تھا یا اندر کا اکھاڑا تھا ادھر شہزادی کی دخت گلفام خورشید لقا اور سیمتن غنچہ دہن مہ لقا سولہ سنگار کرکے برات کے ساتھ ٹھسے سے آئی تھی۔ حسن آرا اور ان کی بہنوں سے چوٹ چلتی مگر سب کھیل بگڑ گیا۔ عنوان کے شعر شہزادی بیگم کے ورد زبان تھے خورشید لقا نے سینۂ بلورین کو اس قدر کوٹا کہ نیلا ہو گیا

وشش گریہ سے مہ لقا بیگم کی صورت نہیں پہچان پڑتی تھی یہ شوریدہ سروہ خون در جگر۔ اور
چشم خونچکاں۔ اُدھر لب پر بتخالہ زبان پر شور و فغان۔ اِدھر سینۂ مجروح اُدھر دیدۂ مطروح شہزادی
بیگم فرطِ الم سے۔

کہتی تھی آنکھیں کور ہیں دل پاش پاش ہے
لوگو کہاں کدھر مرے بیٹے کی لاش ہے

سر پیٹا۔ سینہ کوبی کی اور گریہ وزاری کر کے بصد حسرت۔

بولی کہ ہائے لال نہ پھولے نہ تم پھلے
اک ہاتھ دل پہ ایک سر لاش کے تلے
خنجر کا زخم سینے میں ناسور لاتے ہو
دم توڑنے کو اماں کے پہلو میں آئے ہو

خورشید لقا: ارے لوگو بھائی جوانہ مرگ ہوا۔ یہ برات کو کس نے درہم برہم کر دیا۔ یہ باجے
والے کیوں چپ ہیں۔ اللہ یہ سنناٹا ہے۔ ہائے یہ کیا ہوا۔ ہمایوں فر کی برات نکلی ہے۔

مہ لقا: بھائی ارے میرے بھائی۔ شہزادے بھائی۔ ہائے دونوں بہنیں۔ گلے مل مل کے خوب
روئیں۔ اُس بُکا کی آواز سے سنگدل تک تھر تھر کانپتے تھے اور دُور تک ——— کہرام
مچا تھا۔

صید افگنی

دوسرے روز اِدھر شاہینِ خورشید نے کبک ماہ کا شکار کیا اور شہباز نور نے مرغِ
ظلمت کو بھگا دیا۔ اُدھر دارا حشم خاقان خدم نواب ذوالاحترام وعالی مقام بسترِ استراحت سے
اُٹھے سب سے پہلے اس نازک بدن نازک کمر کامنی روکش نگار ارمنی پر نظر پڑی۔ عنبریں جوڑا
کھل کر کچھ سینۂ بلورین پر منتشر تھا اور کچھ پیچ وتاب کھا کر رُخ رنگین کی بلائیں لے رہا تھا۔
سچ ہے۔

چھٹنا ضرور رُخ پر ہے زلفِ سیاہ کا
روشن بغیر شام نہ ہو چہرہ ماہ کا

گل تکیوں پر سر تھا۔ بیقرار ہو کر اُٹھے اور اُس آفتاب جبیں کے رُخ تابان کو دو بار فرط مستی سے چوم کر پھر اپنی جگہ پر چلے آئے۔ اور وہیں سے باآواز بلند کہا۔ بیگم صاحب بیگم صاحب ارے حضور اب اُٹھیے۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اب آخر کب تک سویا کرو گی۔ بھلا یہ سونے کا کون وقت ہے۔ اُٹھ کر شانہ ہلایا۔ اُٹھو صاحب۔ بیگم نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی اور پھر سو گئیں۔ نواب صاحب نے پھر شانہ ہلایا۔ آنکھیں کھول دیں کہا۔ کیوں خیریت تو ہے۔ سرہانے کیوں بیٹھے ہو۔ فرمایا آپ کے جگانے کے لیے تنک کر جواب دیا کچھ خبر ہے۔ ہماری جوانی کی نیند ہے۔ اُٹھتے اُٹھتے اُٹھیں گے۔ جلدی کیا ہے۔ کیا امیر خاں کا لشکر پیچھے آتا ہے۔ اللہ جانتا ہے۔ کچی نیند نہ جگاؤ۔ ذری دیر اور سونے دو۔ بہت دق نہیں کیا کرتے۔ نواب صاحب نے زبردستی جگایا اور کہا۔ واہ اچھی آپ کی نیند ہے۔ یہاں شکار کا وقت جاتا ہے۔ آپ کو نیند کی پڑی ہے بیگم بہزار خرابی اُٹھیں۔ آنکھ ملتے ہوتے کہا۔ ارے اتنا دن چڑھ آیا۔ پانی منگوایا۔ دونوں نے منہ دُھویا بیگم صاحب کے سامنے مہری نے حسن دان اور آئینہ رکھا۔ کپڑے بدلے۔ عطر ملا اور نکھر کر شکار کے لیے تیار ہوئیں۔

نواب : آج تو کل سے بھی زیادہ جوبن ہے۔ چشم بد دور۔

پھر آج سامنا ہے کسی ماہِ عید کا
تارا چمک گیا مرے بختِ سعید کا

بیگم : پھر یہ تو اللہ کی دین ہے اور حُسن چیز ہی ایسی ہے۔ کیا کہا ہے۔

مشہور ختن میں ہے ترا گیسوئے مشکین
شہرہ ہے سمرقند میں شیرین دہنی کا

نواب : اب چلو چلے چلیں۔ اب کب تک ترساتے رکھو جی۔

کچھ دے کسی فقیر کو منعم ثواب کے
کام آئے گا ترے یہ کسی دن لیا دیا

بیگم : ابھی برس دو برس تڑپو۔ نکاح کیا دل لگی ہے۔

نواب : کیا! اب رنگ لائی گلہری۔ یہ عتاب یہ ظلم۔

کرو ظالموں ظلم جتنا کہ چاہو
بپا کیا کسی روز محشر نہ ہو گا

بیگم : کیا جلدی پڑ گئی ہے اُف ری تری جلدی۔ ہونہہ۔

نواب : اب ہم آپ سے نہ بولیں گے بس اب ہم بھی روٹھ گئے۔

بیگم : روٹھ گئے تو روٹھ جاؤ۔ ہماری پیزار سے ہم کو اس سے کیا۔

گر تم نہیں تو اور بت مہ جبیں سہی
ہم کو تو دل لگی سے غرض ہے کہیں سہی

نواب : اچھا یوں ہی سہی ہم بات کے دھنی ہیں قسمت کے دھنی نہیں تو نہ سہی۔ ہم کو تم سے عشق ضرور ہے مگر جب تم کو عشق نہیں تو یک طرفہ عشق کس کام کا۔

نگاہ ترچھی کلاہ ترچھی روش ہے ترچھی ادا ہے ترچھی
جو بانکپن ہم نے تم میں پایا کسی میں یہ بانکپن نہ دیکھا

مگر ہماری قسمت میں لکھا ہے کہ جب عاشق ہوں گے بے وفاؤں پر۔

رہِ وادیٔ غم میں نہ چین ملا مجھے صفدر الم ہی ہمیشہ رہا
کہیں زیر شجر جو ٹھہر بھی گیا کبھی سایہ فگن وہ شجر نہ ہوا

مہری نے نواب صاحب اور بیگم صاحب میں ملاپ کرا دیا۔

بیگم : ذرا سی شوخی میں تنک کر روٹھ گئے۔ بس دیکھ لیا۔

نواب : کیا مجال۔ ہم کو کوئی مار بھی ڈالے تو نہ روٹھیں اور پھر تم سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ دل و جان سے عاشق ہیں۔ میں تو بے موت مر جاتا مگر تم کو اطلاع دے دیتا کہ جانِ جاں اب جان جاتی ہے۔

قاتل سے کہہ دو دیکھ لے للّٰہ اک نظر
دُنیا سے آج کوچ ہے تیرے شہید کا

بیگم : اخاہ ایسے بڑے ولی اللہ ہیں۔ آپ کو پہلے ہی سے مرنے کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اُف رے جھوٹ۔ لچھن ایسے اور روشن ضمیری کا دعویٰ۔

نواب : تمنّا یہ ہے کہ تمہاری زلف کے دام میں پھنسوں۔

کس قدر شوقِ اسیری نے کیا ہے بیقرار
پوچھتے پھرتے ہیں ہر کوچے میں گھر صیّاد کا

اتنے میں خدمت گار نے دست بستہ عرض کیا حضور والا۔ اب دن چڑھ گیا ہے۔ اور سب لوگ بڑی دیر سے تیار ہیں۔ فوراً لیس ہوئے۔ کمر میں شمشیر آبدار شکاری لباس زیب بر

وہ بندوقیں گل چالوں کو دیں۔ جو خواصی میں بیٹھے تھے۔ بیگم صاحب بھی ناز و شوخی سے اُٹھیں۔ ہاتھی پر سوار ہوئے اور کہا چلو۔

بیگم : وہ بابو آج کہاں ہیں۔ بارے ڈر کے نہ آتے ہوں گے وہ نہ چلیں گے تو ہم بھی نہ جائیں گے۔ بُلوالو۔

بوس : ہم تو آج شبو (صبح) ہی سے شات شات (ساتھ) رہے گا۔ اب ہمارے کو کچھ کھوپھ (خوف) للگتی نہیں۔

بیگم : (ہنس کر) او شالا چھیل کا بان کو دیک نہیں کرتی ہے گا۔ جس طرح اُس دن تنگ کرنے سکتے نہیں۔

نواب : اُف فوہ۔ تم تو غضب ڈھاتی ہو۔

بیگم : بابو تمہارے کو ہاتھی تو نہیں ہلتی۔

گھوش : نا آج ہاتھی نہیں ہلتی۔ کل کا بات کل کے شاتھ گیا۔ آج کا بات اب آج شات ہے۔ سمجھا آپ۔

بیگم : ہم تو سمجھا مگر تم سمجھایا نہیں سمجھا۔

ہاتھی چلے، چلتے چلتے ایک مقام پر لوگوں نے اطلاع دی کہ شیر یہاں سے آدھ میل پر ہے اور بہت بڑا شیر ہے۔ نواب صاحب بہت ہی محظوظ ہوئے کہا بہت جلد چلو۔ ہاتھیوں کو دوڑا دو۔ یہ حکم پاتے ہی فیلبانوں نے ہاتھی دوڑائے اور فیلبانوں نے کہہ دیا تھا کہ ہوشیار رہیے گا مگر بوس اور گھوش کے مہربان نے اطلاع نہ دی۔ ہاتھی جو تیز کیا تو مسٹر بوس مُنہ کے بھل زمین پر آ رہے۔

گھوش : ارے شالا ہمارا باپ کو جمین (زمین) پر گیرا (گرا) دیا ارے تم اب روک لے گا۔

فیلبان : چپ چپ غل نہ مچایئے میں نے ہاتھی روک لیا۔

گھوش : گول نہ مچائے گا تو پھر کیا مچائیں گا۔

فیلبان : وہ دیکھیے۔ بابو صاحب اُٹھ بیٹھے چوٹ نہیں آئی۔

گھوش : مہاشائی۔ لاگے نے تو (چوٹ تو نہیں آئی)۔

بوس : اجی ہاتھی والا کے میرے پھیلبو رہے (ہم فیلبان مار ڈالے گی)، بڑو بود لوگ۔

(بڑا بدمعاش ہے)۔

گھوش: آگے اپنا شما چار بولو (پہلے اپنا حال بیان کرو)۔ تار پورے میرو (پھر مارنا)۔

بوس: اپنا شما چار کی بولیو پایا ساتھا ہی جاتے ہے۔ کھوپڑی ہی جانے ہے۔

گھوش: ہاتھ ماناک بیچے تھے (ہاتھ پاکے ناک — تو بچا)۔

بوس: سب بیچے جی کیچھو پاچے نہیں (سب بچا اور کچھ نہیں بچا)۔

گھوش: کے جانے تمار دوش جھیلو کی ہاتی والا (کیا معلوم تمہارا قصور ہے یا فیلبان کا)۔

بوس: اجی جان لو چھاڑ بو نہ (ہم جان سے نہیں چھوڑیں گے)۔

گھوش: ٹھیک ٹھیک بولو لاگی بنوا (تم صاف صاف بتاؤ کہ چوٹ تو نہیں آئی)۔

بوس: سور منش لاگے کچھو بھورے کو رے نا (بہادر چوٹ سے نہیں ڈرتے)۔

راوی: دریں چہ شک اور پھر آپ ایسے بہادر۔

گھوش: تمام بات بوانت جھیلو کہ تمی ہولے (تمہارا باپ بھی بہادر تھا یا تم ہی بہادر بن بیٹھے)۔

بوس: تمے جو دی اے راکم بولے تھالے تما کے ماربو۔ تار پورے جہاوت کے (اگر اس طرح کی باتیں کروگے تو فیلبان کو پیچھے ماریں گے پہلے تم کو پیٹیں گے)۔

الغرض مسٹر بوس جھاڑ پونچھ کر ہاتھی کے قریب آئے اور اس قدر جھلائے کہ فیلبان کو ہزاروں گالیاں دیں۔

بوس: مہاشائی۔ تم ابش کو مارو ابھی ابھی سجا (سزا) دیں گے مارو اس دشٹ کو۔ مارو اس دشٹ کو۔

گھوش: (دانت پیس کر) ارے شالا۔ تمہارا پٹا سر پر نہیں ہے نہیں ہم۔ پٹے پکڑ کے تم کو مار ڈالنے مانگتا۔

راوی: بھڑکا دیا۔ اس بہادری اور جرأت کے صدقے۔ وہ تو کہیے خیر گذری کہ فیلبان کے

سر پر پٹے نہ تھے ورنہ بیچارے کی درگت ہو جاتی۔ بوس نے بنگالی زبان میں کہا تم اِس سے ڈرتے کیوں ہو۔ دو چار گھونسے لگا دو۔ تو مسٹر گھوش نے آہستہ سے جواب دیا۔ اِس کے پاس ہاتھی کے چلانے کی لوہے کا چیز ہے اور ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ مسٹر بوس نے جھلا کر پتا اور توڑی اور چھوٹا سا گٹھا لے کر فیلبان کی طرف جھپٹے۔ او شالا ہم آج تم کو کھا جائے گا۔ فیلبان کی خرابی۔ اتفاق سے ہنس دیا۔ اِس پر بوس آگ ہو گئے اور ہاتھوں سے مٹی کھود کر کئی ڈھیلے مارے مگر خیر سے کوئی ڈھیلا اِس قدر اُٹھ نہ سکا کہ فیلبان تک پہنچتا۔ فیلبان نے کہا حضور اب ہاتھی پر بیٹھ لیں یہ گھر نہیں ہے۔ جنگل ہے۔ یہاں شیر سور نیل گاؤ گینڈا ہر دم آ سکتا ہے۔ بیٹھ لیجیے تو ہم نواب صاحب کے ہاتھیوں سے ملا دیں۔ بوس بولے ہم ڈرپوک نا آدمی نہیں ہے ہم مہاراجہ بردوان کے یہاں کسم کسم (قسم قسم) کا جانور دیکھ چکا ہے۔ گینڈا ہاتھی سب دیکھا ہے۔

گھوش : ارے مہاشائی۔ اب باتیں کب تک کرے گا۔ بیٹھ جائے۔ کوئی جانور ہم لوگ کو کھا جائے گا۔ بس یہاں کا یہاں رہے گا۔ ہڈی پسلی کچھ ملنے کا نہیں مہاوت ہاتھی کو روک لے تم بیٹھ پھر بو دجاتی کرے گا اور ہم گر پڑے گا۔

فیلبان : حضور قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں میرا قصور نہیں آپ کبھی ہاتھی پر سوار تو ہوئے نہیں۔ ہودے پر لٹک کر جھکے ہوتے تھے۔ ہاتھی دوڑا تو آپ بھد سے گر پڑے۔ میں کیا کروں۔

گھوش : کی مہاشا پھیلبان ٹھیک بولتا ہے۔

بوس : ہمارا دل میں آئی کہ ہم تمہارا کان نوچ ڈالے ہم کبھی ہاتھی پر نہیں چڑھا تم بولتا ہے۔ تمارا باپ کے سامنے ہم ہاتھی پر چڑھا تھا۔ تم کیا جانے گا۔ جو لوگ جانتا ہے اُس سے پوچھو۔

گھوش : تم باپ کی بات بولتا اسی سے گرا۔ ہمارا باپ کے سامنے تم ہاتھی کہاں سے لایا۔ وہ کون تھا چرکٹا تھا کون تھا۔ تم شالا کہاں سے ہاتھی لایا۔ جھوٹ بولتا باپ کا بات۔

بوس : ارے بابا۔ ہمارا ہاتھ ہمارا پیر ہمارا بیری ہے۔ اب تم بھاگ جاؤ۔

فیلبان نے کہا شکر ہے میری جان تو بچی اب ان دونوں میں ہونے دو۔ کہا اب سنبھلے بیٹھے رہو۔ ایسا نہ ہو کر پھر گر پڑو۔ دونوں نے ہودے کو خوب زور سے پکڑا اور آنکھیں بند کر کے

کہا اب ہمارا جان پرمیشور کے حوالے ہے۔ وہ جو کرے سو کرے ہم کچھ نہیں جانتا۔

اب سُنیئے کہ جب شیر تھوڑی دور پر رہ گیا اور نواب صاحب نے دیکھا کہ چھ ہی ہاتھی ساتھ ہیں اور بابوؤں والا ہاتھی ندارد تو کمال تشویش ہوئی۔ اور بیگم صاحب نے اصرار کیا کہ یا تو خود واپس چلو یا اُن بیچاروں کو بچاؤ۔ یا دو ہاتھی بھیج دو۔ خدا جانے اُن بیچاروں کی کیا حالت ہوگی۔ بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ جان عذاب میں ہوگی جینے سے بیزار ہوں گے۔

نواب صاحب نے حُکم دیا کہ سب ہاتھی روک لیے جائیں اور دھرتی دھمک (ہاتھی کا نام) کو دوڑاتے لے جاؤ دیکھو اُس ہاتھی پر کیا تباہی آئی۔ دھرتی دھمک روانہ ہوا۔ اور نواب صاحب نے ایک کنج میں اپنے ہاتھی کو روک لیا۔ بیگم نے کہا کیوں نواب اگر خدانخواستہ شیر کا پنجہ ہودے تک آجائے تو کیا ہو۔ نواب نے کہا وہ ضرب لگاؤں کہ شیر کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ یہ تلوار خارا شگاف ہے۔

اللہ ری تیغ لیتی تھی محصول سب سے یہ

تیغوں سے آب تیروں سے چلے کمان سے زہ

موتے کمر سے کھولتی تھی نافے کی گرہ

سر سے تو خود لیتی تھی اور جسم سے زرہ

دستِ تہی بنا دیا ہر اک نیام کو

نیزے کی بھی گرہ میں نہ تھا مال نام کو

بیگم : یہ سب باتیں ہیں ابھی شیر للکار کر آجائے تو ساری شیخی نکل جائے شیر کے نام سے آدمی بھاگتا ہے مقابلہ کیا۔

نواب : ہم نے دس برس کے سن سے شکار کھیلا ہے۔ اور سب کے پہلے شیر کو مارا ہے۔ آنکھ بند کر کے نشانہ لگانے میں فرد ہیں ہم کچھ دل لگی تھوڑا ہی ہے خدا نے ہمیشہ مدد کی ہے۔ اور کبھی آج تک نشانہ خالی نہیں گیا ہے۔ ہم خدا کے مقبول بندے کیوں نہ ہوں وہ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ دشمن تک کی مدد کرتا ہے نہ کہ دوستوں کی۔ بقول مرزا دبیر صاحب۔

یا علی آپ کے کرم کی ہے دھوم — بھیجا شربت برائے قاتلِ شوم

اِس عنایت سے ہوگیا معلوم — دوستاں را کجا کنی محروم

تو کہ با دشمنان نظر داری

بیگم صاحب کو یہ رباعی از بس پسند آئی۔ مکرر ان سے اور فرمائش کی میرزا دبیر صاحب کا کچھ اور کلام سناؤ نواب صاحب نے فرمایا۔

جنت کی ہوا میں جو یکایک ہوا جولان

رہوار پری بن گیا زین تخت سلیمان

صرصر نے قدم چوم لیے اور کہا ہاں ہاں

بن بن کے ہوا خواہ ہوا بولی میں قربان

یہ کھل گئی اِک جست میں سب سلسلہ بندی

نے عرض تھا نے طول نہ پستی نہ بلندی

عکس ان کا پڑا مہر درخشاں کی جبیں پر

یا برق گری خرمن خورشید مبیں پر

یا چھائی گھٹا نور کی افلاک بریں پر

بوندوں کے عوض تاروں کا مینہہ برسا زمیں پر

یہ حرف لب شوکت و اقبال سے نکلا

خورشید قدم مشرق اجلال سے نکلا

بیگم: کیا نور کی سی طبیعتیں پائی تھیں (واہ وا کرکے) ہمارے ہاں بھی دو دفعہ پڑھے تھے۔ گہہ شرق میں خورشید کے مانند عیاں تھی۔ ایک دفعہ یہ مرثیہ پڑھا۔ خورشید نقیبانہ لیے چوب کرن کی۔ ان دونوں بابوؤں میں خوب گلچھپ ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو گالیاں دیں اور کندے تول تول کر رہ گئے۔

الغرض فیلبان کی جان عذاب میں تھی مگر مجبوری۔ نواب صاحب کے خوف سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ دل ہی دل میں گالیاں دیتا تھا۔

دس بارہ منٹ کے عرصے میں بابو صاحبوں کا ہاتھی دور سے نظر آیا۔ چوبداروں نے دوڑ کر نواب صاحب سے عرض کیا۔ خداوند ہاتھی آگیا اب حضور تشریف لے چلیں۔ بیگم صاحب بہت محظوظ ہوئیں۔ اُف جان میں جان آئی۔ میں تو سمجھی تھی کہ دونوں کا شکار ہوا۔ آئے تو تھے شکار کھیلنے مگر خود شکار بن گئے۔ بارے بخیر گذشت۔ جب قریب آیا تو نواب صاحب نے پوچھا بابو صاحب خیریت تو ہے۔ ہاتھی کہاں رہ گیا تھا۔ جواب ندارد پھر دریافت کیا۔ ارے صاحب واسطے خدا کے جواب دو۔ یہ

ہاتھی دیر میں کیوں آیا۔ صدائے برنخاست۔ گول گول دیدے پھیر پھیر کر دیکھتے جاتے ہیں مگر بولتے نہیں۔
نواب صاحب بے اختیار ہنس پڑے اور ثریا بیگم نے فیلبان سے دیر کی وجہ دریافت کی۔ فیلبان بولا حضور
ایک بابو صاحب نے کہا ہاتھی آہستہ آہستہ لے چلو۔ ہمارے پیٹ کا پانی ہلتا ہے۔ دوسرا بولا تیز چلو تیز چلو۔
اب ان کی سی کروں تو وہ خفا ہو جائیں اور ان کی سی کروں تو یہ بگڑ جائیں۔ میں نے ہاتھی روک لیا اور
کہا اب آپ دونوں صاحب آپس میں فیصلہ کر لیں۔ بس دونوں میں ہونے لگی۔ ایک غالب آیا۔ دوسرا
مغلوب ہو گیا۔ اتنے میں دھم کی آواز آئی۔ پیچھے پھر کے دیکھتا ہوں تو ایک صاحب نیچے پڑے ہوتے ہیں
بیگم نے سن کر پوچھا ہاتھ پاؤں تو بچ گئے منہ ہاتھ تو نہیں ٹوٹا۔ فیلبان نے کہا وہاں تو بالو پڑی تھی۔
جھیل کا کنارہ تھا بلسٹر بوس سے نہ رہا گیا۔ بگڑ کر کہا۔ او شالا تم ہمارا منہ پر جھوٹ جھوٹ سے بات
بولتا ہے۔ ایسا بولتا ہے ویسا بولتا ہے تم شالا بگیر (بغیر) اطلاع کے ہاتی کو دوڑا دیے ہم تو ہے گا پھل
(غافل کی خرابی گا پھل) پڑا تھا۔ گیر پڑا (گر پڑا) نواب صاحب نے فرمایا ہم شام کو اس کی تحقیقات
کریں گے۔ ایک تو ہم سے جھوٹ بولا۔ دوسرے اس نے یہ بے ادبی کی سزا دی جائے گی۔ یہ کہہ کر حکم
دیا کہ ہاتھی بڑھاؤ اور آدمیوں نے اطلاع دی کہ شیر سامنے کی جھیل کے کنارے پر لیٹا ہوا ہے۔
بندوقیں لے لے کر روانہ ہوئے۔ ایک گل چلے نے کہا حضور یہ بائیں جانب کون جانور ہے۔ ذرا ہوشیار
رہیے۔ دیکھا تو بنڈ بلا سور۔ بڑی بڑی اور اونچی اونچی پتاور میں بیٹھا تھا۔ پہلے نظر آیا۔ پھر غائب ہو گیا
بیگم صاحب نے بڑے غور سے دیکھا مگر نظر نہ آیا۔ اب سب کی صلاح ہوئی کہ پتاور میں چو طرفہ سے
خالی نشانے لگائیں۔ بادِ ہوائی۔ تاکہ گھبرا کر نکلے۔ اور فوراً گولیوں سے گرا دیں۔ مگر نواب صاحب کے
دل میں ٹھن گئی کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ہم اس پتاور میں ضرور ہاتھی لے جائیں گے۔
ثریا بیگم اب تک تو بڑے لطف سے سیر دیکھتی تھی۔ مگر پتاور میں جانا کمال شاق گذرا۔ کہا نواب کے
سر کی قسم اب ہم نہ جانے کے پتاور تلوار کی دھار سے بھی تیز ہوتی ہے۔ تم پر تو جنگل میں بھوت سوار ہو
جاتا ہے۔ کسی کی سنتے تو ہو ہی نہیں۔ ہمیں کسی اور ہاتھی پر بٹھا دو۔ حکم دیا گیا کہ افغانی اور ان کے
ساتھی اس ہاتھی پر آئیں اور بیگم صاحب اُس ہاتھی پر جائیں اور ایک قادر انداز خواصی میں بیٹھے۔
ایک اور ہاتھی ان کی حفاظت کے لیے ساتھ ساتھ رہے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور نواب صاحب
پانچ ہاتھی لے کر پتاور میں چلے۔ جب سور نے دیکھا کہ غنیم کی فوج سامنے سے مثل سیل عظیم اُمنڈی
چلی آتی ہے۔ تو اُٹھا اور بھاگ جانے کا قصد کیا مگر ایک گل چلے نے معاً غل مچایا۔ وہ نکلا۔ وہ نکلا
دوسرا بولا میں نے دُم دیکھی تیسرے نے کہا میں نے پیٹھ دیکھی اور اتنے میں سور بھاگا۔ آگے آگے

بنڈیلا پیچھے پیچھے ہاتھی۔ پتاور سے نکلا۔ نواب صاحب نے گولی چلائی۔ پھر دوسرے نے بندوق سر کی۔ دونوں گولیاں کاری لگیں اور سور تڑپ کے جھیل کی طرف جھپٹا۔ اتنے میں افغانی نے تیسری گولی لگائی وہ پھسلتی ہوئی پڑی تو پانی میں کود پڑا۔ اور ہاتھی نے گھیر لیا۔ گھبرا کر بھاگا تو ایک گولی اور کھائی۔ لوگ سمجھے کہ اب کام تمام ہوگیا۔ افغانی اور ایک راجپوت ننگی تلواریں لے کر کود پڑے۔ پہلے افغانی نے ایک تلا ہوا ہاتھ لگایا۔ سور غرا کر باہر آیا۔ آنا تھا کہ راجپوت نے دوسرا ہاتھ دیا اور بنڈیلا پھر جھیل میں چلا گیا۔ نواب صاحب کا شوق چرایا کہ اپنے ہاتھ سے قتل کریں۔ ہاتھی سے اُترے شمشیر دو پیکر میان سے نکالی۔ ساتھیوں کو جھیل کے کنارے سے ادھر اُدھر ہٹا دیا کہ بنڈیلا سمجھے کہ سب چل دیے ہیں جب سور نے دیکھا کہ میدان خالی ہے۔ تو آہستہ آہستہ جھیل سے نکلا۔ نواب صاحب تو کمینگاہ میں تھے ہی تاک کر اس زور سے کمر پر تیغ دو دم کا ہاتھ دیا کہ نبڈیلا بول گیا۔ لوگوں نے چاروں طرف سے واہ واہ کا طنطنہ بلند گیا۔

ایک : اعجاز اعجاز۔ حضور یہ کرامت ہے۔ واللہ کرامت ہے۔

دوسرا : سبحان اللہ سبحان اللہ۔ کیا تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ باید و شاید۔

تیسرا : بنوٹ اور تلوار کے دھنی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایک ہی ہاتھ میں چورنگ کر دیا بنوٹ سیکھے ہیں نہ۔ کیا ہاتھ بڑا ہے واہ۔

چوتھا : دھوم پڑ گئی دھوم پڑ گئی۔ شہسواری میں ویسے ہی۔ تیر اندازی میں ویسے ہی قادر اندازی میں ویسے ہی۔ صید افگنی میں ثانی نہیں رکھتے۔ شاعری میں اچھے اچھے شاعروں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ جس نے ایک شعر سُن لیا بحر حیرت میں غوطے کھانے لگا کہ ہندی اور ایسا شعر کہے گویا خاص ایرانی ہے۔

ہمت والا یم از کون و مکان بگذشتہ است
برفضائے لامکان پر میزند عنقائے من

عرفی کے قصیدے پر جو قصیدہ حضور نے کہا ہے وہ سُننے کے قابل ہے۔

پانچواں : اجی اس وقت تو کمال کیا۔ اور ایک ہی ضرب میں ٹھنڈا کر دیا مگر آفرین ہے اس ہمت مردانہ کو کہ سب کو ہٹا دیا اور تن تنہا فقط تلوار سے اس مہیب جانور کا مقابلہ کیا۔ ع

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو

خدا کا سایہ ہے ظل اللہ۔

نواب : ارے بھئی ۔ دیکھتے ہو برسوں شکار کی نوبت نہیں آتی ۔ مگر ریاض کیا ہے ۔ لڑکپن سے شکار کھیلا ہے ۔ وہ بات کہاں جا سکتی ہے ۔

رفقا : اے خداوند حضور کے ہاتھ نِلے ہوئے ہیں ۔ جب قصد کیا ۔ بندوق ابھی سر ہی نہیں ہوئی کہ ۔ ع

قضا گفت گیر و قدر گفت دہ

شکار سامنے پھڑ پھڑانے لگا ۔

نواب صاحب نے کہا کسی صورت سے بیگم صاحب کو یہاں لاتے اور اُن کو دکھاتے کہ ہم نے شکار کیا ہے ۔ مگر پتاور کے سبب سے وہ نہ آئیں گی ۔ اس پر دو چار آدمیوں نے جو راہ سے واقف تھے کہا ۔ حضور اب پتاور کہاں پتاور تو کب کی چھوٹ گئی ہے ۔ اب ہم جا کے اُن کو دوسری راہ سے لے آئیں گے ۔

بیگم صاحب کا ہاتھی آیا ۔ بنڈیلے کو دیکھ کر ڈر گئیں ۔ اوئی اللہ یہ اس موذی سے مقابلہ کیا اللہ جانتا ہے مردوے جان کو ذری عزیز نہیں رکھتے ۔ اس عقل کے صدقے اور جو بھیر پڑتا تو پھر کیسی ٹھہرتی ۔

نواب : تعریف نہ کی کہ کس جواں مردی سے اکیلے آدمی نے مقابلہ کیا اور تلوار سے مارا ۔ ایسا مارا کہ سانس ڈکار تک نہ لی ۔ تعریف درکنار وہ اور اُلٹی ہجو کرنے لگیں ۔ ماشا اللہ خدا کی قسم اس طرح کا شکار آج تک کسی نے نہ کیا ہو گا ۔ اتنا بڑا جانور ۔ لاش تو دیکھو کہاں سے کہاں تک ہے ۔

رفیق : حضور نے وہ کام کیا جو ساری دُنیا میں کسی سے نہیں ہو سکتا خداوند ۔ دس پانچ آدمی مل کر تو سب جانوروں کا شکار کر سکتے ہیں ۔ مگر ایک آدمی کا تلوار لے کر بنڈیلے سے مقابلہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے ۔ دوسرا ۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

سبحان اللہ ۔

بیگم : اے ہے ۔ تم اکیلے مقابلے کو گئے تھے ۔ اوئی اللہ ! اتنے ڈھیٹ ، اُف رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں ۔ اللہ جانتا ہے ہم سے کوئی کہے کہ اس وقت ہاتھی پر سے اُترو ۔ تو ہم ہرگز نہ اُتریں یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندہ ہے ۔

نواب : اب تو ہماری بہادری کا یقین آیا یا اب بھی نہیں۔ اور تمہارے لیے تو جان پر کھیل جائیں۔ بنڈیلا کیا مال ہے۔ شیر ہو تو کیا پروا ہے۔

اُس لالہ رو کو دیکھ کے بھولا ہے عشق گل
بے رنگ ہے عنادل گلزار کا مزاج

بیگم : تمہاری بہادری کا سب سے زیادہ ثبوت یہی ہے کہ تم نے میرے دل کو فتح کر لیا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ اِس محبت ہی کے سبب سے دو دن سے تمہارے ساتھ جنگل میں سختیاں سہتی ہوں۔ ورنہ کجا میں اور کجا جنگل۔

نواب : سچ ہے۔ واللہ سچ ہے اس میں ذرا شک نہیں ہے۔

نازکوں سے بھی کہیں اُٹھتا ہے بار سختی
بارش ژالہ کو گلہائے سمن کیا روکیں

نازک بدنوں سے کہیں شکار کی سختی اُٹھتی ہے۔ اے توبہ کیا مجال۔ مگر محبت عجب شے ہے ہم تم پر فدا تم ہم پر فدا۔ ہم عاشق شوریدہ سر تم معشوق پری پیکر۔

یہاں سے پھر شکار کے لیے روانہ ہوئے۔ اب بیگم اور نواب صاحب ایک ہی ہاتھی پر متمکن تھے۔ یہاں سے اُس جھیل کی طرف گئے جہاں یہ شیر سو رہا تھا بنڈیلے کا شکار تو جملہ معترضہ تھا۔ جھیل کے قریب پہنچے اور آدمیوں کو حکم دیا کہ شیر کی تلاش کریں۔ کہا حضور اسی مقام پر لیٹا ہوا تھا معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں کی آہٹ پا کر چلا گیا۔ اتنے میں ہاتھی اور زور سے زمین پر پاؤں ٹپکنے لگا۔

افغانی : شیر ارد گرد ہے۔ ورنہ فیل اپنے پاؤں کو زمین پر دے نہ مارتا۔ اب ہوشیار رہنا چاہیے۔ یہاں جھاڑیاں کثرت سے ہیں اور درختوں کے سایے کے سبب سے تاریکی بدرجۂ کمال ہے۔ عجب نہیں کہ ظلمات یہی ہو۔

گل چلا : شیر یہاں سے بیس قدم پر ہے۔ بس کہہ دیا ہم نے۔

شکاری : حضور بس ہر دم یہی سمجھیے کہ اب نکلا اور اب نکلا آیا ہی چاہتا ہے۔ کاشی سنگھ ہاتھی پر آجاؤ۔ دلارام سے بھی کہو کر بہت نہ بڑھیں۔

کاشی : ہونہہ۔ شہر کے منی (شہر کے آدمی) نیولا دیکھے ڈر جائیں۔ ہم کا تدبیر سکھاوت ہیں وہ سیر تو ہم سوا سیر۔

نواب : یہ اُجڈپن اچھا نہیں۔ کاشی سنگھ آجاؤ۔ ولارام ٹھہرو۔ خواصی میں بیٹھ لو۔ یا کسی اور ہاتھی پر چلے جاؤ۔ مانو کہنا۔

دلارام : ہجور۔ چار برس کی عمر سے باگ سارے کو مارت ہوں۔ ہم تو یہی جنگل کی پیدائش ہے کھاجاتے سسر کھاجاتے۔

بیگم : اے ہے بڑے ڈھیٹ ہیں۔ نواب تم اپنا ہاتھی سب ہاتھیوں کے بیچ میں رکھو۔ ہمارے کلیجے کی دھڑکن تو دیکھو (سینۂ صافی پر نواب صاحب نے ہاتھ رکھ کر اور کلیجے کی طرف اشارہ کرکے) دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔

نواب : افوہ۔ دو دن میں بھی بھڑک نہ گئی۔ اتنے گل چلے اور قادر انداز شکاری ساتھ ہیں۔ شیر کیا کوئی ہوت ہے۔

اب سنیئے کہ اتفاق سے ایک گل چلے نے شیر دیکھ لیا۔ جھاڑی میں ایک درخت کے تنے کے پاس چت سو رہا تھا۔ انھوں نے کسی سے کچھ کہا نہ سُنا آؤ دیکھا نہ تاؤ بندوق داغ ہی تو دی۔ گولی پیٹھ پر پڑی۔ شیر آگ ہوگیا۔ اور غرّاتا ہوا لپکا تو کھل بلی مچ گئی۔ آتے ہی کاشی سنگھ کو ایک تھپڑ دیا اور سنگھ جی بیٹھ گئے۔ دوسرا تھپڑ دینے ہی کو تھا کہ کاشی سنگھ سنبھلا اور سنبھل کر تلوار لگائی۔ تلوار داہنے ہاتھ پر پڑی تلوار کھانا تھا۔ کہ آگ بھبھوکا ہوگیا۔ بلا کی طرح ہاتھی کی طرف جھپٹا۔ کاشی سنگھ کے امکان میں تھا کہ کسی ہاتھی پر سوار ہو جاتا مگر مارے خوف کے ایسا بدحواس ہوا کہ تھر تھر کانپنے لگا۔ شیر نے آتے ہی نواب صاحب کے ہاتھی کے دونوں کان پکڑے۔ ہاتھی نے ٹھوکر دی تو شیر پانچ چھ قدم پر گرا۔ اِدھر ہاتھی اُدھر شیر گرجا اور بابو صاحبوں نے دُہائی دینا شروع کی۔

بوس : ارے ہمارا نانی مرگیا۔ ہمارا جان جاتا ہے۔ ارے بابا ہم تو کال (کل) ہی سے روتے تھا کہ ہم شیکار (شکار) کو نہیں جاتے گا۔

گھوش : اور راجپوت تم شیر کو روک لے گا جلدی سے۔

بوس : وَل ہم اگر نیچے ہوتا تو جرور کرکے روک لیتا۔

گھوش : آنکھ بند کرلو مہاشائی۔ شیر سے آنکھ نہیں ملاتے اچھا۔

اب سنیئے کہ شیر اس زور سے ڈکارا کہ دو ہاتھی نوک دُم بھاگے۔ اور بہت زور زور سے زمین پر پانوں مارے بابو کا ہاتھی ڈٹا کھڑا تھا۔ اس پر بوس نے رو کر کہا او شالا ہمارا ہاتی۔ ارے تم کس مافک بھاگتے نہیں۔ اور تمہارا بھائی لوگ بھاگے جاتا ہے۔ تم کیوں نہیں بھاگے۔ گھوش نے

کہا آنکھ بند رکھو مہاشائی آنکھ بند کر کے شیر نے جھپٹ کر نواب صاحب کے ہاتھی کی مستک پر ایک ہاتھ دیا تو گوشت کھنچ آیا۔ اور ہاتھی بلبلا اٹھا۔ نواب صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک گل چلا خواصی سے گر پڑا۔ اور ہاتھی بھاگا۔ مگر شیر نے پھر تھپیڑ دیا۔ اتنے میں ایک چوکیدار نے دور سے گولی چلائی۔ اتفاق سے وہ گولی خالی گئی۔ دوسرے گل چلے نے بندوق سر کی پھر گولی توڑ کے باہر نکل گئی۔ اور شیر گرا۔ مگر نواب صاحب ایسے بدحواس تھے کہ اب تک گولی نہ چلائی۔

لوگ سمجھے کہ شیر اب مر گیا مگر یہ غلطی تھی۔ کاشی سنگھ کو ایک ہاتھی پر لاد کر بھیج دیا تھا کہ سیدھے ڈاکٹر خانے جائیں۔ اور شیر سامنے پڑا تھا۔ دو آدمی آہستہ آہستہ قریب گئے۔ کہا حضور اب اس میں جان نہیں ہے مر گیا۔ نواب صاحب ہاتھی سے اترنے ہی کو تھے کہ شیر گرج کر اٹھا اور ایک چوکیدار کو جو بالکل قریب کھڑا تھا چھاپ کے بیٹھ گیا اور چوطرفہ ہلڑ مچا۔ لینا لینا۔ کوئی بندوق چھتیاتا ہے کوئی للکارتا ہے کوئی کہتا ہے تلوار لے کے دس بارہ آدمی پہنچ جاؤ۔ اب شیر اٹھ نہیں سکتا۔

نواب : کیا کوئی گولی نہیں لگا سکتا۔

ایک : حضور شیر کے ساتھ آدمی کی بھی جان جائے گی۔

نواب : پٹھان کہاں ہیں۔ کابلی تم تو اپنی قدر اندازی کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اب اُستادی کہاں گئی۔ لگاؤ گولی۔

پٹھان : حضور۔ اسی دم۔ ابھی ابھی۔

یہ کہہ کر افغانی نے بندوق فیر کی۔ گولی پیٹھ کو چھوتی ہوئی نکل گئی اور شیر گرجا۔ اُنھوں نے ایک اور گولی لگائی اُس نے شیر کا کام تمام کر دیا مگر یہ گولی اس اُستادی سے چلائی تھی کہ چوکیدار پر آنچ نہ آنے پائی۔ کل حاضرین نے تعریف کی۔ شیر اوپر اور چوکیدار نیچے پانچ سات آدمی تلواریں لیکر جھپٹے اور شیر پر وار کرنے لگے جب خوب یقین کامل ہو گیا کہ شیر مر گیا ہے تو لاش کو ہٹا دیا۔ دیکھا کہ چوکیدار نزع کی حالت میں ہے۔

افغانی : حضور اس کا کام تو شیر نے تمام کر دیا۔

لالہ : سانس چلتی ہے۔ مگر دو ہی ایک گھڑی کا مہمان ہے۔

نواب : غضب ہو گیا یارو۔ ہائے افسوس۔

بیگم : (کانپتی ہوئی) ہاتھی یہاں سے ہٹا لے چلو۔ ایسا نہ ہو بھتنا بن کے چمٹے کہتے تھے کہ شکار کو نہ چلو نہ چلو مگر تم نے میرا کہا نہ مانا جان کی جان گئی اس کی اور عذاب کا عذاب ہوا۔

نواب صاحب نے کہا ہاتھی بٹھاؤ ہم اُتریں گے۔ مگر بیگم صاحب نے باصرار کہا کہ ہم نہ جانے دیں گے۔ اُنھوں نے کہا۔ بیگم تم تو ہم کو بالکل ڈرپوک ہی بنایا چاہتی ہو۔ کیا سبب کیا کہ ہم اس وقت ہاتھی پر سوار رہیں۔ ہم کو جانے دو اُنھوں نے کوشش کی کہ کود پڑیں مگر معشوق گل عذار نے گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ جائیے۔ بسم اللہ جائیے۔ اب یا تو ہم تم دونوں گریں گے یا یہیں رہیں گے۔

نواب نامدار دل میں کمال مسرور ہوتے کہ اس بت شیریں حرکات کو ہم سے اس درجہ محبت ہے۔ آدمیوں کو حکم دیا کہ اگر کوئی بید۔ یا حکیم ملے تو فوراً لاؤ۔ اُنھوں نے کہا۔ خداوند کس کے لیے لائیں اس میں اب باقی کیا ہے۔ سہم کے مر گیا ہوگا۔ غضب خدا کا اتنا بڑا اور خونخوار شیر اتنے عرصے تک چھاپ کے بیٹھا۔ گھٹ گھٹ کے مر گیا ہوگا۔ بھلا اس قدر دیر تک کہیں زندہ رہ سکتا ہے۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ اس نے آنکھیں پھیر دیں۔ اور دم توڑا ثریا بیگم نے مارے ڈر کے لاش پر نظر نہیں ڈالی اور نواب صاحب مصلحتاً ہاتھی کو وہاں سے دور لے گئے۔ خدام کو حکم دیا کہ فوراً تجہیز و تکفین کرو۔ اور فیلبان سے کہا بس اب شکار ہو چکا۔ ہاتھی پھیر دو۔ چار ہاتھی ان کے ہمراہ گئے باقی یہیں رہے۔

بیگم : اب پھر کبھی شکار کو آؤ گے۔ ایک آدمی کی جان لی نہ۔

نواب : سبحان اللہ ہم نے جان لی اور جو ہمیں کو شیر مار ڈالتا۔

بیگم : (ہاتھ جھٹک کر) کیا منحوس باتیں زبان سے نکالتے ہو واہ۔ ہزار بار کہہ دیا۔ ع

مزن فال بد کاورد حال بد

جب دیکھا اپنے آپ کو کوسا کرتے ہو۔ اس سے خدا اور خدا کا رسول بُرا مانتا ہے۔

نواب : تم عورتوں کے مزاج میں بڑا شک ہوتا ہے اور ضعیف الاعتقادی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ خیمے میں پہنچ کر نواب صاحب نے ہاتھ مُنہ دھویا۔ بیگم صاحب نے تھوڑی دیر ٹھہر کر حمام کیا اور لباس فاخرہ بدل کر نکھر کر سامنے آئیں اور کہا ایک ـــــ بات مان لو تو ایک بوسہ دیتے ہیں۔ نواب صاحب نے کہا خدا کی قسم اگر اس وقت خوشی سے بوسہ دو، اور لو تو جان حاضر ہے جو کہو منظور قول دیا۔ بوسہ لے کر بیگم صاحب نے کہا قسم کھاؤ کہ آج سے شکار نہ کھیلیں گے اگر کھیلیں تو آج ـــــ

نواب صاحب فرط طرب سے یہ اشعار زبان پر لاتے۔

ملار گا کہ سر کو ہہسار لال ہوا
عروسِ لالہ کو طاؤس وار جال ہوا
ہوا کو عطر لگا اور نہ گُل کھلا ہوگا
وہ ماہ مالکِ عمر دہ وزدو سال ہوا

بیگم صاحب نے پھر شوخی سے کہا۔ اللہ گواہ ہے اگر تم نے قول پورا نہ کیا تو ہم سے ایک دم بھر بھی نہ بنے گی۔ نواب صاحب نے دستِ نازک چوم کر فرمایا۔ کیا مجال۔ قول جان کے ساتھ ہے۔ ایسی بات ہے بھلا جو وعدہ کیا وہ کیا۔ اب چاہے جان جائے بات نہ جائے گی۔

بیگم: اُمید تو ایسی ہے آگے خدا جانے۔

نواب: دیکھ لیا آزمالیا۔

راتوں رات نواب صاحب اپنے گھر پہنچے۔

ثریّا بیگم اور فیروزہ

بدہ ساقی آن تلخِ شیرین گوار — کہ شیرین بود بادہ از دستِ یار
بدہ ساقی آن جوہر روح را — دوائے دلِ ریشِ مجروح را
سبک باش در ظلِ گرانم بدہ — دگر فاش نتواں نہانم بدہ
بیا ساقی آن مے کہ شاہی دہد — بپاکی او دل گواہی دہد
چو مستم کنی از مے بے غشت
بمستی سرایم سرد و خوشت

صبح کا سہانا سماں۔ بادِ نوروزی عنبر سرشت مشک افشاں غنچے مُسکرا رہے تھے۔ گل کھل کھلاتے تھے۔ عنادل سیہ مست و غزل خواں فاختہ دستکِ زناں۔ چمن میں رقص طاؤسانِ رنگین پر و بال۔ گلاب کے کٹورے بادۂ شبنم سے مالا مال، اس بہار میں عاشق و معشوق نوجوان ہاتھ میں ہاتھ دیے مصروف گلگشت چمن و مشغول تماشائے نسرین و نسترن تھے۔ ریحان و ضیمران سے تختۂ باغ لہلہاتا تھا۔ غنچۂ دل کھلا جاتا تھا۔ نگارِ گل رخسار رُوکشِ شاہدانِ فرخار ثریا بیگم شوخ اس وقت اپنے جوبن پر آپ اتراتی تھیں۔ فرطِ مستی سے جھوم جھوم کے قدم رکھتی تھیں۔ سرد شمشاد کو خرامِ ناز سے شرماتی تھیں۔ نواب

سکندر صولت خاقان منزلت ستارہ سپاہ ثریّا جاہ رئیس کجکلاہ اپنے طالع فرخ پر ناز کرتے تھے کہ ایسی زن جبین و معشوقۂ زہرہ جبین ہاتھ آئی چاند سی بیوی پائی۔ ثریا بیگم سینہ بلورین تان کر چمک چمک کر باتیں کرتی تھیں۔ کبھی ہنس کر نواب نامدار کے دلِ فگار پر بجلی گراتی کبھی گردش چشم سے آفت ڈھاتی۔

نگاہت رنگ مستی بر در میخانہ می ریزد
باندازی کہ صہبا از لبِ پیمانہ می ریزد

بیگم صاحب کو شوق چرایا کہ گانا سُنیں۔ کہا اس وقت چمن بھی ہے۔ بہار بھی ہے۔ لطف بھی ہے۔ بغل میں نگار بھی ہے۔ مگر مغنّی کے بغیر لطف نہیں۔ بھیرویں اُڑے تو بڑی کیفیت ہو۔ برسوں سے کسی خوش الحان کو گاتے نہیں سُنا۔ نواب صاحب نے اُسی دم حکم دیا اور خدام باسلیقہ و باادب قوال بار بد نژاد کو بُلا لائے۔ دست بستہ عرض کیا کہ خداوند خاں صاحب حاضر ہیں۔ اور اُن کے دو شاگرد بھی آئے ہیں اور خوب گاتے ہیں۔

مغنّی بزن چنگ برار غنوں ۔۔۔ بپرداز دلم فکرِ دنیای دوں
مغنّی کجائی بگلبانگ رود ۔۔۔ بیاد آور آن خسروانی سرود
مغنّی کجائی کہ وقتِ گل ست ۔۔۔ ز بُلبُل چمن ہا پُر از غلغل ست
مغنّی کجائی کہ لطفے کنی ۔۔۔ زمے آتشے در دلم افگنی
مغنّی بیا عود را ساز کن
نوائیں نوائی نو آغاز کن

قوال خوش گلو نے بھیرویں شروع کی۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ نور کا تڑکا باغ کی نشست۔ اور باغ بھی کیسا پھلا پھولا ہرا بھرا گلوں کی بو باس چشمہ تختۂ بلوریں۔ از سمک تا سماک بہار آ گئیں۔

عیدست و موسم گل ساقی بیار بادہ
ہنگام گل کہ دیدست بے مے قدح نہادہ

مُطرب نے یہ عاشقانہ غزل گائی جس سے سامعین کی روح وجد میں آئی۔ سندھ بھیرویں سننے کے لائق ہے۔

وصل کی شب ہو چکی رخصت قمر ہونے لگا
آفتاب روز محشر جلوہ گر ہونے لگا

بارِ صندل سے عرق آیا جبینِ یار پر
بوئے زلفِ عنبریں سے دردِ سر ہونے لگا
رات بھر مردہ پڑا رکھا مسیحا نے مجھے
قم باذنی جب کہا وقتِ سحر ہونے لگا
ایک دو دم ہوں مسیحا دم کے دم آخر تو آ
جانبِ ملکِ عدم دم کا سفر ہونے لگا
پاس رہتا تھا شہیدی جب نہ تھا اِتنا خیال
بعد مرنے کے محبّت کا اثر ہونے لگا

ثریا بیگم کو اس دُھن نے ایسا مست کر دیا کہ پھر فرمایش کی اور کہا کوئی اور چیز کہیے نواب صاحب بھی بدرجہ غایت محظوظ و مسرور ہوتے۔ افغانی نے تعریف کے پُل باندھ دیے۔ حضور خاں صاحب کا کیا کہنا اُستاد ہیں۔

بیگم صاحب نے فرمایش کی۔ اب کی کوئی ٹھمری کہو۔ قوال نے یہ ٹھمری چھیڑی۔ جو بنوا ہو چار ونا و بنو ساتھ۔ جوبن لوٹ جات سب ہی مکھ موورت رے سکرو کو نہ پوچھے بات۔ جو بنوا چار ونا د بنو ساتھ۔

رفیق : نور کا گلا ہے۔ اُستاد ہیں۔ اُستاد بے بدل۔

مصاحب : آواز کیا چینی کھنک رہی ہے۔ گلا جیسے اصیل گھوڑا۔ جدھر چاہو باگ پھیر دو۔ سبک عنان۔ ہر دم آواز قابو میں۔

ایک شاگرد : تان کتنی سُر میں ہے۔ اور تیاری ماشا اللہ سے کیسی اچھی۔

گوالیار سے ایک اُستاد آتے تھے۔ کہنے لگے بعض اوقات آئی گئی بھی معلوم نہیں ہوتی۔

دوسرا : بس دم غنیمت ہے اُستاد کا۔ اگلے اُستادوں کی روح کو زندہ کر دیتے ہیں اور اب ہے کون۔ حق تعالیٰ تم کو صد و سی سال کی عمر عطا کرے۔

رفیق : خداوند! اس شہر کی ناک ہیں ہمارے خاں صاحب ان کے بعد قوالی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اب کوئی اور نظر نہیں آتا۔ بھیرویں کے سُروں سے کمرہ بھر دیا۔

خاں صاحب : میں کس قابل ہوں یہ کچھ آپ ہی لوگوں کی عنایت ہے کچھ گالیتا ہوں۔ گانا بہت مشکل امر ہے۔ علم موسیقی دریائے ناپیدا کنار ہے۔

نواب : بہت اچھے ہو۔ اور حق تو یوں ہے کہ یہ راگنی اپنا رنگ دے ہی جاتی ہے اور پھر اُستاد کی زبانی ہو تو سبحان اللہ جیسے سونے میں سُہاگا۔

خاں صاحب : حضور قدر دانی شرط ہے ایک صاحب نے جھنجھوٹی فرمائش کی میں نے کہا اچھا۔ گایا۔ بس خداوند وجد کرنے لگے۔ اُسی دم پانچ سو کی اشرفیاں اور دو تھان گلبدن کے اور ایک تھان چوڑیے کا انعام دیا۔ ایک مہینے تک ٹکایا۔ چلتے وقت سو روپیہ نقد دیے اور ایک انگوٹھی۔ اور اپنے ملک کی رسم کے مطابق کچھ اور بھی دیا۔

ثریا بیگم : کتنی نشیلی سُریلی آواز ہے جیسے راگ اور راگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ گانا یہ کہ مست کردے۔ اور آدمی وجد کرنے لگے۔

نواب : شکر ہے کہ حضور کو پسند آیا۔ آج اس ملک میں ان کا ثانی نہیں ہے۔ خاں صاحب ہزار غنیمت ہو۔ واللہ غنیمت ہو۔ بس ایک تم دوسرے حسن خاں۔ سو وہ تو اب اس قابل نہیں رہے کہ کسی معرکے میں گائیں مگر معلومات اچھی ہے تحقیقات میں شک نہیں۔ تان سین خاں سے ہمارے خاں صاحب ہی نے مقابلہ کیا تھا۔

خاں صاحب : حضور تو کبھی یاد ہی نہیں کرتے۔ بڑا تعجب ہے۔

نواب : آپ تو کبھی آتے ہی نہیں اور اِدھر سے روز جاتے ہو۔ کبھی کبھی آیا کرو۔ دو گھڑی دل لگی ہی رہے۔ ناچ رنگ، لطف مذاق۔

خاں صاحب : حضور یوں تو آپ کے غلام تک بُلائیں تو فوراً حاضر ہوں۔ مگر بن بلائے کہیں جانا اپنی وضع کے خلاف ہے۔ تھوڑی سی عزّت کو میں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ دوسرکاروں سے کچھ ملتا ہے، اور اِدھر اُدھر کسی رئیس نے بلالیا۔ ورنہ میں تو کہیں جاتا ہوں نہ آتا ہوں۔ جاتے کہاں اور ملے کس سے حضور کے سے دو چار رئیس امیر ہیں۔ انھیں سے کھانے بھر کو ملتا جاتا ہے اب گانے کا شوق کسے ہے۔ اے توبہ۔

بیگم صاحب نے کہا اب یہ باتیں تو ہوا ہی کریں گی کوئی پھڑکتی ہوئی غزل سناؤ۔ خاں صاحب نے کہا بہت —— اچھا۔ بہت اچھا جو غزل فرمائیے۔ (شاگردوں سے چھیڑے جاؤ۔

شبِ غم بھی آخر بسر ہو گئی — تڑپتے تڑپتے سحر ہو گئی

جو اس بُت کی ترچھی نظر ہو گئی — تو دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو گئی

بگڑ کر شبِ وصل کروٹ جو لی — مناتے مناتے سحر ہو گئی

حسینوں کی کیا بات کا اعتبار — کدھر تھی طبیعت کدھر ہو گئی

لپیٹے جو چوٹی میں پھولوں کے ہار — نزاکت سے دُہری کمر ہو گئی

ہوئے بال غفلت سے سر کے سفید
اُٹھو نور جاگو سحر ہو گئی

بیگم : کیا غزل ہے۔ اللہ جانتا ہے۔ پھڑکتی ہوئی غزل اسی کو کہتے ہیں۔

لپیٹے جو چوٹی میں پھولوں کے ہار
نزاکت سے دُہری کمر ہو گئی

نواب : ایسی آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ کہ کمر پھولوں کے ہار سے لچکنے لگے۔ شعروں میں البتہ سُنا کرتے ہیں۔ مگر بعض بعض نازک کمر ہم نے ایسی دیکھی ہیں کہ بیان سے باہر۔

بیگم : اے تم نے دیکھا کیا ہے۔ ابھی گھر سے باہر تو نکلے نہیں۔ ذرا سفر کرو۔ سیاحی کرو۔ تو دُنیا کا حال معلوم ہو۔ شکار کھیلنے سے کہیں عقل آتی ہے۔

نواب : ع

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

سفر مقدم ہے۔

بیگم : اچھا اب نکاح کے بعد چلو کسی سمت چلیں۔ کلکتہ چلو۔

نواب : نہیں قصد ہے کہ حج کو جائیں۔ سفر کا سفر اور ثواب کا ثواب مگر۔

دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست
از ہزاران کعبہ یک دل بہتر ست

بیگم : اے اور سُنو۔ کجا وہ گرما گرمی کجا یہ سرد مہری کہاں تو سفر کو چلتے تھے کہاں زیارت کا شوق ہوا۔ خیر یہ تو اچھی بات تھی مگر گھڑی گھڑی گرگٹ کے سے رنگ بدلتے ہو۔ آدمی کیا دھوپ چھاں ہے۔

جب قوال کو رخصت کیا اور تخلیے کی صحبت ہوئی تو نواب صاحب نے اپنی معشوقہ عابد فریب

سے کہا۔ ایک بات پوچھیں، مگر شرط یہ ہے کہ سچ سچ بتاؤ قسم کھاؤ کہ سچ بتائیں گے۔ بیگم صاحب کسی قدر کج ادائی کے ساتھ بولیں قسم کھانے سے کیا فائدہ اگر سچ بولنے کا خیال ہے تو یوں بھی بولیں گے ایک نہیں ہزار بار قسم کھائیں تو کیا ہوتا ہے۔

نواب: بھلا کبھی ایسا پانی بھی پیا ہے جو آگ کا خواص رکھتا ہو۔ دیکھو قول ہار چکی ہو، سچ سچ بتاؤ راست راست بلا کم و کاست۔

بیگم: ایسے پانی پر ہم لعنت بھیجتے ہیں۔ اور جو پیے اُس کو کچھ کہتے ہیں یہی بات تو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس بات کو جائز اور روا رکھیں۔

نواب: ہائے ہائے بیگم خدا جانتا ہے تم نے ابھی دیکھی ہی نہیں۔ سونگھی ہی نہیں۔ دیکھنے میں یاقوت زمرد موتی کا رنگ اور سونگھنے میں مشک اذفر اور عود اور عنبر کی بوئے خوش اور پینے میں گلاب اور شربت سے زیادہ خوشگوار و خوش ذائقہ۔ چاہے دو چند پی جائے مگر سرخوش و تردماغ ہی رہے۔ ممکن کیا کہ سیہ مست ہو سکے۔ بڑے بڑے صوفیاں صافی طینت اور شعرائے گرامایہ دختر رز کے شائق تھے۔ تعریف کے پل باندھ دیے ہیں۔

اعجازِ بادہ ہیں کہ مسیحا بصد نیاز
تعلیم قم قم از لبِ مینا گرفتہ است

دیکھو کس قدر بڑھا دیا مسیحا نے قم قم صراحی سے سیکھا ہے۔ اللہ اللہ اور بو علی سینا تک اُس کی تعریف کر گیا ہے۔ اس سے بڑھ کے اور کون حکیم حاذق تھا مسیحائے ثانی نے شراب کی تعریف کی ہے۔ امتحاں کن تا بہ بینی مدزت پیر مغاں کادمی سازو بہ یک پیمانہ منشتِ خاک را

بیگم: خیر آپ کو اسی کا یاقوتی اور زمردی رنگ اور ذائقہ اور مستی مبارک رہے۔ درگذری دور رہی اسے سلام ہے۔ اس میں دختر رز ہو یا بنت العنب ہو۔ ترئی یا کدو۔

نواب: قسم کھا کے کہتا ہوں کہ دلہائے شکستہ کی مومیائی ہے۔ دردِ دل کی دوائی ہے۔ اس وقت الفاظ کی غلطی کی سند نہیں۔ نام زبان پر آیا اور چت ہو گیا۔ اس کی تلچھٹ آبروئے جامِ جمشید ہے۔ گلگونہ چہرہ خورشید ہے۔ عندلیبِ مزاجانِ گلشن عشق سے کوئی اس کی تعریف پوچھے۔ اور رندانِ قلندر مشرب کی زبان سے کوئی اس کے اوصاف بے حد و لاتعد سُنے۔ رنگ بدن کو سُرخ کر دے۔ قوتِ دل و جگر تیزی زبان و بصر روانی دست و پا۔ تحریک آلات و قویٰ۔ خفتِ اعضاو اندام۔ ازالہ آلام

واسقام بجوید ہضم . وتلطیف سودا. تکثیر ارواح وتقویتِ اجساد۔

ساقی دمید صبح قدح پُر شراب کن
از روئے لطف خود بطِ مے راکباب کن
زان پیشتر کہ یاسمن صبح بشگفد
خود را بیک پیالۂ گل آفتاب کن

بیگم : حشر کے دن ساری قلعی کھل جائے گی بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے ہو۔ وہاں یہ زبان جو کترنی کی طرح چلتی ہے نہ چلے گی اور ان بھروں سے کسی ایسے کو پھانسو۔ بندی ان بھپاروں میں نہ آنے کی۔

نواب : بخت جواں کی یاری اور طالع فرخ کی مددگاری سے ایک جوان اور غنچہ دہاں ہاتھ آئی ہے۔ اگر خواستہ خدا ہے تو ایک روز دور چل رہا ہوگا۔ انشا اللہ۔

فردا شراب کوثر وحور از برائے ماست
امروز نیز دلبر مہ روئے و جام می

ثریا بیگم کی چمک دمک ستم ڈھاتی تھی۔ ململ کا دوپٹا ہلکا دھانی اس پر آڑی بیل کامدانی سُرخ بوٹے دار اطلس کا پائجامہ سر کے چھپکے سے بانکپن برستا تھا۔ دستِ حنائی بوسہ زیبِ ملائک نظر فریب۔

زساعد پنجۂ رنگین نمودار چو شاخِ گل کہ آرد غنچہ ہا بار
بپنجہ در پنجۂ جاناں کہ دئے شوخی رنگ حنا را دیدئے

نواب صاحب کی ایک مطبوعہ خادمہ نوجوان وحسین اور ثریا بیگم میں باتیں ہونے لگیں۔ اُس کا نام فیروزہ تھا۔

فیروزہ : یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ کیوں بہن۔ اور کسو بات میں خدا کا خوف نہیں۔ ایک موئے کھانے پانی ہی میں ڈر پڑا ہوا ہے۔ جوانی میں کچھ نہیں سوجھتا۔ جب بوڑھی ہوگی توبہ کر لینا۔

بیگم : تم نے تو پی ہوگی بہن۔ بھلا بو باس کیسی ہوتی ہے۔

فیروزہ : ہمارے نزدیک دُکان میں بسا ئیے تو گندھی اور نشہ پیے تو شراب اور نکاح کرے تو جمعہ کی رات کو ایسی بو باس ہوتی ہے کہ بس سونگھنے اور پینے سے تعلق ہے۔

بیگم: اچھا جیسی خوشبو ہمارے دوپٹے میں آرہی ہے ویسی ہوتی ہے۔

فیروزہ: حضور نے فتنے کا عطر لگایا ہے یہ فتنہ ڈھائے گا۔

نواب: یہ اطلس کا پاجامہ کتنے جوبن پر ہے۔ عورت کیا اندر کے اکھاڑے کی پری ہے۔ جان کی آفت۔ صبر کی دشمن ہے۔ خدا کی قدرت ہے یا جوبن ہے۔

چو گل شگفتہ بصد آب و رنگ می آئی

زشہر آئینہ ہا از فرنگ می آئی

فیروزہ: اب خدائی رات پرسوں ہے نہ (نواب کی طرف) ہاں پرسوں ہے۔ ہم کچھ کہیں گے مگر ہماری بات ماننی پڑے گی۔ نہ مانو گے تو ہم کو بڑا رنج ہو گا۔

بیگم: تم ڈھیٹ بہت معلوم ہوتی ہو اور نواب صاحب کی آنکھ پڑتی ہے۔ جب ہی چاپن کرتی ہو۔ ان سے کچھ رشتہ ناتا بھی ہے یا یوں ہی کبھی کبھی جاتی ہو۔

فیروزہ: ایں! اے واہ ہے۔ اب رنگ لائی۔ گلہری۔ اے میں بیاہتا ہوں جوانی کا عالم ہے جوبن کے مدھر میں بھری ہوں جوانی اُبلی پڑتی ہے۔ پھر میاں کے مطبوع طبع نہ ہوں کیا معنی۔ اور اللہ کی عنایت سے صاحب تمیز اور خوش سلیقہ ہوں۔

بیگم: بٹی پڑے ایسی جوانی کو۔ کوئی باتیں تو سُنے۔ بے حیائی تو کتنی آخر کچھ انتہا بھی ہے۔ توبہ توبہ۔

فیروزہ: لگیں اکھل کھرے پن کی باتیں کرنے۔ واہ واہ واہ۔

نواب: یہ کیا اتنا کلکل لگائی ہے۔ ہنسی دل لگی کی باتیں کرو۔

فیروزہ: تکلف برطرف (ثریا بیگم کے زانوئے سیمیں پر سر رکھ لیا اور گانے لگیں)۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ

بادۂ گلگوں سے پیمانہ پیمانہ

رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

ترا آباد میخانہ

گذر یارب گلستان میں ہوا ہے کس شرابی کا

کہ شاخیں جھومتی ہیں نالۂ بلبل ہے مستانہ

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ

بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ

بیگم : آواز تو اچھی پائی ہے۔ مگر گانا تم نے سیکھا کس شخص سے ہے۔

فیروزہ : اپنی بہنوں سے۔ اماں جان سے پھوپھی اماں سے اور کس سے۔

بیگم : (مسکراتی ہوئی) ایں! تو اللہ کی عنایت سے گھر بھر کی عورتیں گانے میں مشاق ہیں نگوڑی بیسواؤں کو بھی مات کیا۔ مکان کہاں ہے بہن تمہارا۔؟

فیروزہ : ہمارا مکان مشہور ہے بیا باٹی کی گلی بسنی ہے وہی۔

بیگم : اے ہے۔ وہاں تو ڈومنیاں رہتی ہیں۔ مشہور ڈومنیاں ہیں۔

فیروزہ : ہمارا مکان بھی وہیں ہے۔ ڈومنی تو ہم ہیں ہی۔

بیگم صاحب نے کہا۔ بس سر ہمارے زانو سے ہٹاؤ۔ نواب خاتون جنت کی قسم ایک لمحہ (لمحہ) بھی تمہارے ہاں رہنے کی روادار نہیں ہوں۔ منگواؤ فنس ہم اپنی بہن کے ہاں جائیں گے۔ یہ موئی نگوڑی ڈومنیاں اور ہمیں بہن کہیں۔ دوگانا بنیں۔ زانو پر سر رکھ کر سوئیں۔ تم کو پیاری ہیں۔ تو ہوں تم ان کے ہاتھ کی جوتیاں کھاؤ۔ ہم ایڑی چوٹی پر ان ایسیوں کو صدقے کرتے ہیں۔ یہ بھی اتنی ہوئیں! ارے تیری قدرت۔

فیروزہ : معاف کیجیے حضور۔

بیگم : بس چلو الگ۔

نواب : قصور ہوا۔

بیگم : افسوس افسوس۔

خوجی خم ٹھوک رہے ہیں

درخت کے سایہ میں ایک بونا امیروں کا کھلونا اکڑ کر کھڑا ہے۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ہمارے ناظرین اس گیدی کو سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون ہے۔ اگر ہمارے پاس قرولی ہوتی تو بھونک دیتے۔ ہات تیرے گیدی کی۔ مردود آج بونا بنکے آیا ہے۔ اور ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ بہروپیا ہے۔ ناظرین کو اس قدر ضرور یاد ہوگا کہ آزاد کو گرفتار کرکے مس کلیرسا اس مقام پر لائیں جہاں سوار تھے۔

اس کے بعد کا حال اب سنیے۔ خوجی نے جو آزاد کی گرفتاری کی خبر پائی تو تلملانے لگے۔

سواروں نے ان کو رہا کر دیا۔ ان کو اس وقت خوجی کی گرفتاری کا خیال نہ تھا جب خود آزاد مل گئے تو خوجی کس کھیت کی مولی ہیں۔ جب سوار آزاد کو گرفتار کر لائے تو خوجی روئے سر پیٹتے ہوئے ان کے دیکھنے کو گئے۔ تو کھل کھلا کر ہنس پڑے یہ بے محل ہنسی کیسی خوجی نے غور سے دیکھا تو آزاد کا پتا نہیں۔ سمجھے کہ ان لوگوں نے غچہ کھایا۔ کسی بے گناہ کو آزاد کے دھوکے میں پکڑ لائے۔ فرط حیرت سے اِدھر اُدھر بغلیں بجاتے تھے۔ ارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ ایک بار مس مِتیڈا کے قریب جا کر کہا اچھا جھانسا دیا۔ کلیرسا کے کان میں کہا ان جانگلو گیدیوں کو خوب بنایا۔ الو ہی رہے۔ مگر خواجہ بدیع معاً پہچان گیا تھا کہ یہ شدنی ہے۔ آزاد اور کسی کے پنجے میں پھنسے توبہ توبہ۔ کروڑوں میں بند نہیں ہے حضرت۔

اگر بنیم کہ نابینا و چاہ است

اگر خاموش بہ نشینم گناہ است

کلیرسا اور مِتیڈا نے سواروں سے کہا کہ ہم جاتے ہیں۔ تم ان کو قید رکھو۔ کل تحقیقات کی جائے گی۔ سوار اس کو لے کر راہی ہوئے۔ اِدھر کلیرسا اور مِتیڈا نے پولینڈ کی شہزادی کے ہاں جا کر کل کیفیت بیان کی۔ اور خواجہ صاحب نے جنابِ باری کا شکریہ ادا کیا۔

خوجی: ع

شکر شکر ہزار شکر شکر اُو

اُوہ میری تو روح فنا ہو گئی تھی کہ یارو آزاد پاشا ایسا جوّار و کرّار اور گرفتار بدست سواران نابکار شود وَالّا خدائے ما شنوائی نمودہ گرفتار کردہ را رہا ساخت۔

ہزار شکرِ خدا صد ہزار شکرِ خدا

کہ آمدہ است عروس دغا نبزد بدیعا

حضرات ناظرین اس شعر کی لطافت کو ملاحظہ فرمائیں۔ انشاءاللہ دوسرا مصرع خیر سے موزوں کس قدر ہے۔ اور بدیعا کی لطافت تو ظاہر ہی ہے۔

شہزادی: آخر ہوا کیا۔ یہ کس نے کہا کہ آزاد ہی ہیں۔

کلیرسا: خدا جانے مگر ہمیں حیرت ہے توبہ ہے کہ اتنے آدمی بھیجے۔ ایک نے بھی نہیں کہا کہ آزاد اس مکان میں ہیں اب یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ آزاد کہاں ہیں۔

مِتیڈا: ہم نے خود جا کے دیکھا مگر وہ نہ ملے۔ اسی سبب سے مجھے خیال تھا کہ بیچارے دھرے

نہ گئے ہوں۔ بارے شکر صد شکر کہ بچ گئے ورنہ بڑی مصیبت میں پڑتے۔

خوجی : اچھی دل لگی ہوئی۔ کرے کوئی دھرا مشٹنڈی والا جاتے یہ اُلّو خدا نے کہاں سے پھانسا ہے۔ اور لطف یہ کہ بولتا تک نہیں گویا سچ مچ کے آزاد پاشا ہیں۔ تو وجہ کیا۔ اس میں ایک لم ہے پھر مجھ سے فرمائیے وہ کیا ہے۔

واقف جو ہم نہیں ہیں اس بزم میں کسی سے
ہیں کیا غریب بیٹھے چپ چاپ اجنبی سے

کلیرسا : دو چار آدمی اِدھر اُدھر بھیج دو کہ آزاد کا حال تو معلوم ہو جاتے۔ وجہ کیا کہ اب تک کچھ سننے میں نہیں آیا کہ کہاں گئے۔ کہاں نہیں گئے۔

شہزادی نے فوراً آدمی دوڑائے۔ خواجہ صاحب بھی جانے کو تھے مگر مس میڈا نے کہا آپ یہیں رہیے۔ آپ کا جانا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ خدا جانے کیا بک اُٹھو۔ خوجی بہت بگڑے فرمایا۔ گو تم سے دل لگی رشتہ ہے کیا معنی کہ تم مس روز کے سبب سے ہماری سالی ہو مگر یہ موقع دِل لگی کا نہیں بے موقع بات نہ کرنی چاہیے۔

گل بادِ بہاری نے سو ٹکڑے گلابی کی
اس پردے میں اُچھلی روح ایک شرابی کی
انداز و ادا اک سو پر قتل ہی کرتی ہے
اک پیچ کی دھج تیری دستار گلابی کی

کلیرسا : تم داڑھی منڈوا ڈالو۔ بالکل صفاچٹ۔ جس میں کوئی پہچان نہ سکے کہ کون ہو۔

خوجی : اُہو ہو ہو۔ خوب کہی۔

داڑھی کے منڈانے کو اندر سے جو فرمایا
زاہد نے کہا اچھا جو کچھ ہو رضا بی کی

میڈا : مجھے رہ رہ کے ہنسی آتی ہے کہ اس اجنبی کو اچھا پھانسا۔

خوجی : خوب دھرا گیا گیدی۔ اب بچہ جی کو معلوم ہوگی۔ ہم تو جاتے ہیں۔ ذرا سیر کے لیے دیکھیے کیا دل لگی ہوتی ہے۔ مُنہ چڑھاؤں گا۔

فنا وہ عکسِ رخت بر صبوحی و دیدم
نوشتہ پر ورقِ آفتاب سورۂ نور

کلیرسا : کوئی آدمی واپس آیا یا نہیں۔ نہ آیا ہو تو دو چار اور روانہ کرو۔ اور کہو جہاں ہوں

پتنا لگائیں۔

اب سُنیئے کہ خواجہ بدیع صاحب عقلمند تو انتہا سے زیادہ تھے۔ سوچے کہ مِس ملیڈا کی آنکھ چوکے تو ہم آزاد کی تلاش کے لیے باہر نکل جائیں۔ اُردو میں باآواز بلند اپنے دل سے باتیں کرنے لگے بھئی واللہ دن سے نکل جاؤں گا۔ آنکھ چوکی اور پگڑی غائب۔ بندۂ درگاہ ایسے ویسے تو ہیں نہیں کہ دھر لیے جائیں۔ اور پھر خدا کے فضل سے یہ بات بھی ہے کہ پہلوان ہیں۔ مصر کے پہلوان کی کشتی نکالی۔

من آنم کہ اسپان شہ پرورم
بخدمت دریں مرغزار اندرم

ایک روز کی دل لگی سُنیئے کہ ایں جانب ایک دور کا بے سمند گھوڑے پر سوار گومتی کے کنارے کنارے جاتے تھے اور گھوڑا اس طرح اُڑتا ہے جیسے اُڑن کھٹولا یہ چمکا وہ چمکا۔ پری کہوں ڈُلہن کہوں۔ چڑیا کہوں۔ گرد کہوں۔ کیا کہوں۔

راوی: اور تو اور چڑیا اور گرد کی ایک ہی کہی۔

بس حضرت سلامت بادشاہ کی نظر پڑی اور گھوڑا ہوا کی طرح جاتا تھا۔

جو نکلے جیم مُنہ سے، چین میں تو لام لندن میں
سوار ان سے ذرا چل کہہ کے دیکھے ان کی جولانی

یہ گھوڑے کیا پرندے ہیں۔ چرندے ہیں۔

اسپے کہ جہاز یب فزائے تن اوست کوہے ست کہ لالہ زار در دامن اوست
نے نے غلطم کہ آسمانے دگرست در رنگِ شفق بر پیراہن اوست

بس جناب والا اتنے میں یہ ہوا کہ بادشاہ نے ہم کو سلام کیا۔

راوی: بجا ارشاد ہوا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ بہت جھک کر سلام کیا تھا مگر حضور نے جواب نہیں دیا۔ بلکہ بد دماغ ہو گئے ہیچ ہے گاہے سلامے بر نجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند۔

ہر کہ شاہ آن کند کہ او گوید
حیف باشد کہ جز نکو گوید

نہ کہو گے ہم نے بھی نمک ملا دیا نہیں تو۔

تکوئی بابدان کردن چناں است

کہ بد کردن بجائے نیک مردان

لیجیے دوسرا شعر بھی پڑھ دیا۔

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بس حضرت خدا آپ کا بھلا کرے۔ ہم نے جواب دیا مگر مُسکراتے ہوتے۔ پھر بادشاہ سے ہم نے باتیں ہونے لگیں۔

بادشاہ: اجی حضرت اب تو آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔

بدیعا: اس کے کیا معنی۔ آخر جو تم نے طعنہ دیا کہ (اب) آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے تو اس (اب) کے کیا معنی۔ اور ہمارے دماغ ملتے کب تھے۔

راوی: صحیح ہے دماغ میں تو ابتدا سے فتور تھا۔

خوجی: بس حضرت سلامت بندے نے ڈپٹ کے جواب دیا کہ تو بادشاہ یوں بولے۔ ذری گفتگو غور سے سُنیئے گا۔ ہاں سننے کے قابل ہے۔

بادشاہ: ارے یار تم تو بگڑے ہی جاتے ہو۔

بدیعا: یار ایار چہ معنی دارد۔ یار کون ہے۔ ہم ایسوں سے یارانہ نہیں رکھتے جن کے قول و فعل ایک نہیں۔ قولِ مردان جان دارد۔

بادشاہ: آخاہ میں اب سمجھا۔ یہ کہیے۔ بھائی تم سے یہی وعدہ تھا کہ ڈھائی گھڑی کی سلطنت دیں گے۔ وہ وعدہ پورا کیے دیتے ہیں۔ بادشاہ تم ہی سہی۔

راوی: کیا ہولی کے دن تھے یا شطرنج کا دیوانہ بادشاہ بنایا۔

بدیعا: ہم بادشاہی کو لے کے کیا کریں گے۔ مگر

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

بادشاہ: اچھا ایک کام کرو ہم سے کچھ جرمانہ لو۔

بدیعا: ہاں یہ بات مانی تم منادی کرا دو کہ جس وقت خواجہ بدیع الزمان بدیع کی سواری نکلے اس وقت کوئی بیٹھا نہ رہے۔ سب کھڑے ہو کر آداب بجا لائیں اور اس کے علاوہ اور شرطیں بھی ہیں۔

۱۔ صبح کو ہر فرد بشر بہ آواز بلند کہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مہنگا کر پانی اور سستی کر افیم

۲۔ جو شخص افیم نہ پیتا ہو وہ نوکری نہ پائے اور جو افیم پی کر پینک سے بری رہتا ہو وہ نوکری پائے۔ مگر ترقی ندارد اور جو افیوں نہ کھائے۔ وہ قید کر دیا جائے۔ اور افیوں کے قبلہ گاہ حضرت چانڈو باز متبرک اور مقدس سمجھے جائیں۔ چلیے مانجیر و شما سلامت۔

تیسری شرط بڑی کڑی ہے۔ جی ہاں حضرت۔ بادشاہ بولے۔ بھائی خدا کے لیے کہو تو کڑی اور سخت جو کچھ ہو ہم مان لیں گے۔ جرمانہ دیں گے۔ ہم نے کہا جو پہلوان اس شہر میں ہے پہلے ہم سے خم ٹھوک کے لڑے۔ اٹھاؤں اور گدسے پھیکوں۔ اٹھاؤں اور دن سے دے ماروں۔ اٹھاؤں اور دوں گدا۔ حضرت سلامت ایں جانب استادوں کے استاد نامی پہلوان ہیں۔ ایسے ویسے نہیں۔

بادشاہ کی سنیے، ڈرتے ڈرتے کہا۔ بھائی جان ذرا ذرا سے تو تمہارے ہاتھ پاؤں ہیں۔ ننھا سا قد، ہڈیاں پسلیاں نکلی ہوئیں کوئی پھونک مارے تو اڑ جاؤ، اور دعویٰ یہ کہ پہلوان سے لڑوں گا۔ اتنا کہنا تھا کہ بندہ آگ ہوگیا۔ پس اسی دم گھوڑے کو درخت سے باندھا اور کپڑے اتار کر خم ٹھوک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہل من مبارز۔

ملبیڈا: پھر کشتی ہوئی یا نہیں ہوئی۔ تم نے کشتی نکالی ضرور ہوگی۔ وہ تو ہاتھ پاؤں کہے دیتے ہیں۔

خوجی: اب ایک بات کہوں تو خفا ہو جاؤ۔ ہاتھ پاؤں کی بات تو ایسی ہے کہ حضور کی ہمشیرہ جان ریجھ گئیں۔ بس اب منہ نہ کھلوائے گا۔

خیر خم ٹھونک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا۔ وزیر کو بلاؤ۔ وزیر سے کہا کہ اسی دم پہلوانوں کو جمع کرو، اور بندے نے خم ٹھونک کے ٹہلنا شروع کیا۔ وزیر نے دیوان کو بلایا۔ ان سے کہا کہ پہلوانوں کو بلاؤ۔

الغرض سترسو اور سانڈنی سوار ہرکارے روانہ ہوئے اور بندہ درگاہ نے خم ٹھونک کر کہا کہ آئے جس کا جی چاہے اور شعر خوانی کی طرف جھک پڑا۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش | عذر بدرگاہِ خدا آورد
ورنہ سزاوارِ خداوندیش | کس نتواند کہ بجا آورد

بادشاہ نے کہا خواجہ صاحب کمیدانی کے بھروسے نہ بھولیے گا کمیدانی رکھی رہے گی۔ رسالداری، اور کمیدانی کو پہلوانی سے کیا واسطہ پہلوانی اور شے ہے اور کمیدانی اور شے ہے۔ میں نے کہا:

منم کردہ ام رستم داستان
دگر نہ یلے بو دور سیستان

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دوسو آدمیوں کا غول چلا آتا ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر جو تھا پھل بنا ہوا۔ معلوم ہوا کہ نورا پہلوان اور اُس کے پٹھے آتے ہیں۔ خم ٹھونک کے سامنے کھڑا ہوگیا:

اُٹھ نہ اے دردِ جگر ابر بہاران سے لپٹ
رعد ہو صاعقہ ہو برق درخشان سے لپٹ
یاد میں اُس قدر رعنا کے بھری میں نے جو آہ
وہیں وہ آہ گئی سرو گلستان سے لپٹ

خواجہ صاحب کی باتیں سننے سے مس میڈا اور پولینڈ کی شہزادی اور مس کلیرسا کا غم غلط ہوگیا۔ ورنہ آزاد کی جدائی سخت شاق گذرتی۔ اتنے میں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بندۂ درگاہ چٹ لنگوٹ تو باندھے تھے ہی۔ ایک دفعہ ہی خم ٹھونک کے من بدیع اُس پہلوان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ میرا بدن چور۔ دیکھنے میں کچھ بھی نہیں مگر اکھاڑے میں کھڑا ہوا اور بدن پھول کے کُپا ہوگیا۔ بالکل بعینہٖ گل ڈانک (مثل ڈاگ کی خرابی ہے گل ڈانک) بس حضور پھر تو یہ کیفیت تھی کہ دو سو آدمی ایک طرف اور بندۂ درگاہ ایک بینی و دو گوش دوسرے جانب۔

پہلوان: استاد ہم سے لڑنے کا بوتا ہے۔ کیوں لڑو گے۔

بدیعا: پٹھے تو کیا لڑے گا مگر دعویٰ نہیں کرتے۔ ہم تو ایک بات جانتے ہیں خم ٹھونک کے بدیع کے سامنے آتو جاتیں۔

پہلوان: خم ٹھونکنا کیا معنی بد دو ایک روز۔

بدیعا: ایک روز! ایک روز کی ماں گھوڑے ملتی ہے۔ ابھی سہی اسی بالو میں چٹ پٹ کی ٹھہرے۔ آئیے بس آئیے:

جواں مرداں نہ پیچند از سخن رُو
ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گو

پہلوان گینڈا بنا ہوا۔ کہنے لگا اچھا آؤ۔ بس آؤ کا لفظ سننا تھا کہ ایں جانب نے خم ٹھونک کے بستر ا بدلا۔ دیکھتا ہوں تو پہلوان ندارد۔ کہیں پتا ہی نہیں۔ ہات تیرے گیدی کی دم میں نمدا۔ آنکھوں میں دھول کانوں میں گرما گرم پانی مُنہ میں خاک کیوں بچہ۔ پھر مردوں کا مقابلہ کروگے:

ہم رستم داستان ہیں سُن لو
ہم تم سب پہلوان ہیں سُن لو

ایک شاگرد نے آن کر کہا۔ پہلے ہم سے کُشتی لڑلو پھر مقابلہ کرنا۔ اُستاد سے مقابلہ کرنا دل لگی نہیں ہے۔ پہلے ہم سے مقابلہ کیجیے پھر کسی اور سے مقابلہ کا دعویٰ کیجیے گا۔ میں نے خم ٹھونک کے کہا۔ آیئے آپ ہی سے سہی۔ اس وقت ہاتھ کھُجلاتا ہے۔ اُس نے برجستہ جواب دیا۔ ہاتھ تو کھُجلاتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ سر بھی کھجلانے لگے۔

راوی: خوب کہی۔ واللہ اچھی پھبتی کہی۔

بدیعا: کیا سر۔ ہاں! اچھا آجاؤ اپنے ساتھی کو بھی لاؤ اور مقابلہ کر دیکھیں تو کیا کر لیتا ہے۔

آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اُٹھا کے مارا تو چاروں شانے چت۔ دوسرا آیا۔ اُس کو بھی پٹخنی دی۔ تیسرا آیا اُس کو بھی اُٹھا کے دے مارا۔ چوتھا آیا اور لگا چیں چپڑ کرنے۔ میں نے قلاجنگ کے پیچ پر اُس کو بھی اُڑایا الغرض پچپن آدمیوں کو لڑایا۔

راوی: جھوٹے کو افیم کی مار۔ جھوٹے پر چانڈو بازوں کی پھٹکار۔ جھوٹے پر ٹھنڈے پانی کے دو سو گھڑے۔ کہو بیش باد۔

خوجی: بس جناب پھر تو وہ پہلوان بلا کی طرح آیا۔ ہاتھ ہلاتے ہی غلام نے زمین پر مُنہ کے بھل گرایا۔ دہ مارا۔ مگر سنبھلا اور اس زور سے گردن پکڑی کہ توبہ ہی بھلی میں نے پیچ کیا تو گردن چھوٹ گئی اور پہلوان کی اُمید کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر جھپٹا میں نے دستی کی اور دن سے پیٹھ پر۔ آنٹی دی اور تڑ سے زمین پر لایا۔ سواری کس دی:

خورت ار بیان نسازی بجہات پرسم آخر
بگوا تے نسیم الفت زکجات پرسم آخر

پہلوان ہانپ گیا اور میں نے کہا ہار گیا ہے:

ہو یقین دل کو کہ ہے حسن کے دریا کا بھنور
گھر کے ساری ہی نزاکت نہیں آتی ہے سمٹ

مٹیڈا : پھر تو وہ سامنے نہ آیا ہو گا۔ ڈر گیا۔

کلیرسا : بڑے پہلوان ہیں۔ ابھی ایک عورت کو بلواتی ہوں تو پہلوانی رکھی رہتی ہے۔ بلواؤں بھی۔

خوجی : ایک شرط ہے۔ جلشن نہ ہو۔ بوا زعفران کی بہن نہ ہو۔ اور ع
ہرچہ باداباد ماکشتی در آب انداختہ

کیا چیز بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے

میرے آگے پہلوان اکھاڑے میں آئے تو مار ڈالوں مگر بعض اوقات زعم آ جاتا ہے۔ یہ ہماری بدبختی ہے۔

سیہ بختوں کو ساتھ اپنے اُٹھایا داغ غم نے یوں
لپٹ کر مہر سے کاغذ کے جیسے فرد اُٹھتی ہے

بس کلیرسا نے ایک موٹی تازی ہٹی کٹی دیونی کو اشارہ کیا کہ اِن کو اُٹھا کے دے مار۔ خوجی خم ٹھونک کے اکڑ رہے تھے کہ وہ عورت ان کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ کہا کیا خم ٹھوکتے ہو۔ اجی کہو تو ایسی پٹخنی دوں کہ یاد کرو۔ بڑے پہلوان بنے ہیں۔ خوجی بگڑے ہی تھے اُس نے ایک چپوٹا جمایا اور دونوں ہاتھ پکڑ کر ایک گڈا دیا اور اُٹھا کے پھینکا تو دھم سے زمین پر اُس نے ان کو معاً اُلٹ دیا اور کہا بس اب نہ اُٹھنا۔ بہت خم ٹھونک ٹھونک کے شیخی بگھارتے تھے۔ اب بولو۔ بچہ پھر خم ٹھوکو گے۔ ہات تیرے گیدی کی۔

خوجی : اللہ جانتا ہے عورت سمجھ کر چھوڑ دیا ورنہ ایسا دق کرتا اور اس طرح پٹخنی بتاتا کہ واہ رے میں، اور واہ رے میں واللہ چھٹی کا دودھ یاد کرتی۔

خوجی خم ٹھونک ٹھونک کے ادھر اُدھر دیکھتے تھے کہ جتنی پریاں یہاں جمع ہیں۔ وہ سب ہم کو اس وقت گھور رہی ہوں گی مگر جلشن نے وہ پٹخنی بتائی کہ ساری شیخی نکل گئی۔ بڑی کرکری ہوتی مگر بے حیائی بلا دور ان کو اس سے کیا واسطہ جلشن کی طرف دیکھ کر مُردار تو بوا زعفران کی بھی

نانی ہے۔ وہ تو خیر میاں کے دھوکے میں تھی اور توبے میاں بنے ہوئے بگڑا کھڑی ہوئی۔ پولینڈ کی شہزادی نے کہا مزاج شریف کیسے اب پھر تم ٹھونکیے گا۔ اے لعنت خدا۔ پہلوانوں سے تم کیا بگڑو گے، جب ایک عورت تک کا مقابلہ نہ کرسکے۔ مگر زبان البتہ کترنی کی طرح چلتی ہے۔ باقی خیر صلاح۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شہزادی صاحب آپ سمجھیں نہیں۔ ع

ناز بران کن کہ خریدارِ تست

یہ ہم پر ریجھ گئی ہیں۔ اور ہم ان پر ریجھے ہیں۔ تو یہ نخرے کیا ہی چاہیں ان کے ن خ ہم سہیں گے۔ اور ہمارے چونچلوں کی یہ داد دیں گی۔ ابھی کیا ہے۔ ابھی تو ہمارا سر ہوگا اور ان کا جوتا۔ ہماری ناک اُن کی چھری۔ ہمارے دانت اِن کے پتھر اور یہ ادنیٰ ادنیٰ سی باتیں ہیں۔

عاشقان کشتگانِ معشوق اند

بر نہ آید ز کشتگان آواز

مرغ سحر کو چاہیے کہ عشق پروانے سے سیکھے کہ اُس جلے ہوئے کی جان گئی آواز تک نہ نکالی۔ یہ مدعی ہیچ طلب اُس کی کے بے خبر ہیں کہ اُس کی جس کو خبر ہوئی خبر اُس کی پھر نہیں آئی۔ مطلب یہ کہ عشق صادق ہونا چاہیے اور پختہ مغز جنون ورنہ عشق ہیچ ہے:

عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ

پختہ مغزان جنون را کے حیا زنجیر پاست

کیا خوب۔ لڑکپن یاد آگیا۔ گویا گلستان کا سبق پڑھ رہے ہیں۔

مَلیڈا: ابھی تک آزاد کا حال نہ معلوم ہوا کہ کہاں ہیں۔

خوجی: کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ وہ کہیں محفوظ مقام پر ہوں گے آدمی کائیاں ہیں اور ہم نے اُن کو اکثر پیچ بھی سکھاتے ہیں۔

مَلیڈا: ہاں۔ تو شاگرد آپ ہی کے ہیں خدا خیر کرے۔

خوجی: شاگرد۔ شاگرد کیسے میرا لڑکا ہے صاحب۔

خواجہ صاحب نے کہا ایں جانب پھر ایسے پہلوان اور خلقی پیچیت ہیں کہ ایک ایک پور میں پیچ ہے۔ صرف اُنگلی کے دوسو پیچ معلوم ہیں۔ اور اُن سب کے توڑ۔ ایک ایک پیچ کے دو دو توڑ اور ہر توڑ کا توڑ جس روز من بدیعا تولد ہوا اُس روز تولد گاہ میں ایک شیر کی صورت دکھائی، پر از خود بن گئی۔ لوگوں نے کہا یہ بدیعا بڑا شیر مرد ہوگا۔ چنانچہ ویسے ایں جانب ہوئے۔ مس کلیرسا نے کہا۔ اس

میں کیا شک ہے شیر نہیں تو بکری کی صورت البتہ بن گئی ہوگی۔ خوجی کے اس فقرے پر ہمیں ایک مثل یاد آئی۔

ایک زمیندار اپنے دروازے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اُدھر سے ایک بھڈری کا گذر ہوا۔ ساعت بچاریں۔ زمیندار آدمی تھا ضعیف الاعتقاد۔ بھڈری کو بلایا۔ تعظیم کی عزت کے ساتھ بٹھایا۔ دروازے پر زمیندارنیاں آن کر بیٹھیں۔ گھر کی اور عورتیں بھی ٹھہریں زمیندار نے اپنے لڑکے کو بلایا اور بھڈری سے کہا مہراج اس کا ہاتھ تو دیکھو۔ بھڈری نے ہاتھ دیکھا اور کہا اہاہا۔ یہ تو بڑا بھاگوان ہے۔ چاروں کونے میں نام کرے گا اور ہاتھی کی سواری بھیل نشین (فیل نشین) ہوگا۔ اتنا سننا تھا کہ زمیندار نے سر پیٹ لیا۔ عورتوں کو سخت تعجب ہوا کہ بے محل سر کوبی یعنی چہ اس کو کمال خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اس کا فرزند دلبند فیل نشین اور صاحب عز و تمکین ہوگا۔ مگر خوشی کے عوض اس کو رنج ہے یہ سر پیٹ رہا ہے۔ زمیندار کی جورو نے ڈانٹ بتائی۔ اور اپنی زبان میں کہا کہ تم کچھ سڑی تو نہیں ہوگئے ہو۔ ہاتھی کی سواری نصیب سے ہوتی ہے زمیندار بولا۔ ہائے ہائے یہی تو افسوس ہے کہ یہ سارا (لڑکے کی طرف اشارہ کرکے) بھیل نشین کیا ہوئی۔ یو سالا چر کٹا ہوئی (یعنی یہ سالا فیل نشین تو کیا ہوگا۔ یہ چرکٹا ہوگا) اس پر عورتوں نے قہقہہ لگایا کہ فیل نشینی تو زمیندار نے قائم رکھی مگر امارت کے عوض چرکٹے کی اچھی سوجھی۔ اسی طرح حضرت خوجی کے تولد کے وقت شیر کی تصویر دیوار پر بن گئی تھی۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ ہر در و دیوار سے ان کو شیر ہی نظر آئیں گے۔ اور تو خیر یہ تولد گاہ کی اچھی کہی۔

اتنے میں ایک خادمہ نے کہا۔ حضور۔ میاں آزاد بآرام ایک ایسے محفوظ مقام پر ہیں جہاں پرند تک پر نہیں مار سکتا۔ آپ مطمئن رہیے۔ مجھے سبز پوش نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جس مکان میں آزاد تھے اُس کے دروازے پر بھی دس سواروں کا پہرا بیٹھا تھا۔ لہٰذا سبز پوش خادمہ اُن کو کوٹھے پر سے دوسرے کوٹھے پر لے گئی اور وہاں سے دوسرے محفوظ مکان میں جگہ دی۔ اس خبر سے مس میڈا اور مس کلیرسا کی جان میں جان آئی۔ پولینڈ کی شہزادی کی باچھیں کھل گئیں مگر خوجی چنداں خوش نہ ہوئے۔ کلیرسا نے اس کا سبب دریافت کیا۔ تو خواجہ صاحب نے مُنہ بنا کر فرمایا۔ آپ ابھی کمسن ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سے آپ کو کیا واسطہ یہ کوئی خوشی کی بات تھوڑا ہی ہے۔ میاں آزاد ہیں عاشق تن آدمی اور وہ سبز پوش آدمی خادمہ ایک ہی چمکو اور معشوق مزاج ہے۔ خدا کی پناہ۔ ایک آزاد اور دس معشوق۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ کریں گے کیا۔ اللہ رکھی پری چم سفید دُلائی میں بغیر زیور کے ایسا نکھرتی ہے کہ صلّ علےٰ ایک ہوئی بمبئی کی شوخ اور چنچل بیگم۔ چھلاوا ہے۔ ستم ہے۔

قیامت کبریٰ سے دوش بدوش ہے۔ دو ہوئیں۔ اختر النسا اور زینت النسا دونوں آفتِ جاں بلائے بے درماں۔ زاہد صد سالہ تک سجدہ کرنے لگے عشق کا دم بھرنے لگے۔ تین چار ہوئیں۔ اب آگے چلیے حسن آرا بیگم اُن کا حال اظہر من الشمس ہے۔ اُن کے حُسن و جمال کی تعریف تحصیل حاصل ہے۔

کہ ماند کند تو بہ تیغ کرشمہ کشتہ نہ شد
ہمیں سبزۂ حسن تو با خدا کہ نہ بست

پانچ ہوئیں۔ اور لیجیے۔ بس منتیڈا۔ وہ بانکی ادا اور تیکھی چتون کہ برسوں ملائکہ اس تمنا میں رہیں کہ ایک دفعہ نور کا جھمکڑا دیکھ لیں۔

نگاہش باسر مژگان بجنگ است
خدایا فضلے کند جوشش فرنگ است

چہ خوش اور چلیے پولینڈ کی شہزادی۔ ماہ لقا۔ رنگین ادا۔ قوس ابرو۔ عنبر مُو۔ رشکِ حور۔ دور از قصور۔

بہ نیم غمزہ جہاں جملہ قتل عام کنی
نعوذ باللہ اگر غمزۂ تمام کنی

سات ہوئیں۔ اور خدا جانے کون کون ہے۔ یہ سبز پوش آٹھویں ہوئیں یا الٰہی سننے سے ہوش اُڑتے ہیں۔ خوجی کا بیان کسی قدر صحیح تھا۔ سبز پوش کو آزاد کی ایک ایک ادا دل میں بھائی تھی۔ بار بار نظر غلط انداز ڈالتی تھی آزاد بھی سمجھ گئے کہ اس پری وش کا ہم پر دل آیا ہے۔ خواہ مخواہ ان کو بھی کسی قدر محبت ہو ا ہی چاہے۔ اور پھر نوجوان حسین۔ خوش قطع۔ خوش وضع، خوش پوش معنبر و معطر۔ بات چیت ہنسی مذاق میں طاق دلربائی میں شہرۂ آفاق۔ یوں تو ہر عضو بدن سانچے کا ڈھلا تھا مگر کمر اور آنکھیں غضب کی تھیں۔ جادو نگاہ اور انتہائی نازک کمر:

کس نشان مبانت نداد جز کمرت
زہے کمر کہ نشانے زبے نشان آورد

میاں آزاد قسمت کے بڑے دھنی تھے۔ روپوش بھی ہوئے تو ایک معشوق کے ذریعے سے۔ سبز پوش نے کہا آزاد پاشا ایک بات کہنے کو ہوں۔ اگر اجازت دو اور بُرا نہ مانو تو کہوں۔ آزاد نے کہا، میں بے سُنے ہوئے تاڑ گیا کہو تو بے سنے ہی جواب بھی دے دوں۔ سبز پوش لجا کر بولی حضور ہم غریب

آدمی اور خادمہ مگر دل کو کیا کریں۔ آزاد پاشا نے کہا تم صاف صاف بیان کرو۔

سبز پوش : صاف صاف کہتے شرم آتی ہے۔ صرف اس قدر عرض ہے کہ خفیہ طور پر ہم سے نکاح ہو۔ میں اپنی عزت کو عزیز رکھتی ہوں۔ مگر ایک پادری صاحب ایسے ہیں کہ وہ بلا تامل نکاح کرا دیں گے۔

آواز : سنو۔ تمہارے حسن اور عنفوان شباب اور چمک دمک اور خوش ادائی میں ذرا شک نہیں۔ مگر پولینڈ کی شہزادی پر کھل جائے تو کیا ہو۔ ستم بپا ہو یا نہیں۔ بس یہی خیال ہے ورنہ ہمیں اصلا عذر نہیں۔ تم غور کر لو۔

راوی : آزاد کو سبز پوش کی اس عجلت اور بے قراری اور خیال نکاح پر بڑی ہنسی آئی۔ مگر مہذب آدمی تھے۔ ٹکا سا جواب دینا خلاف عقل سمجھے لہٰذا بعنوان مناسب بات ٹال دی۔

سبز پوش : خیر آپ کو اختیار ہے۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی حیا کی آنکھ پر پٹی رکھ لی تھی تب یہ بات کہی مگر اب تم قسم کھاؤ کہ کسی سے بیان نہ کروں گا۔ اگر بیان کیا تو زہر کھا لوں گی۔

آزاد : استغفر اللہ۔ بیان کیا کرتے ہیں کوئی اور اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ تم کو کوئی بے حیا نہ کہے گا۔

حیا بہ پیش رخت چشم بستہ می آید
ادب ز بزم تو صد جا نشستہ می آید

سبز پوش سوچی کہ اگر آزاد کو پولینڈ کی شہزادی کے ہاں لے گئی۔ تو یہ موقع نہ ملے گا۔ یہاں تخلیے میں رہنے سے شاید راہ راست پر آئے۔ اور نکاح ہو جائے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ مس کلیریسا اور مس میڈا اور شہزادی آزاد کی مفارقت سے کمال بے قرار ہیں تو آدمی کی زبانی کہلا بھیجا کہ کچھ فکر نہ کرنا۔ آزاد بخیریت ہیں۔ میں انھیں ہر قسم کا آرام دیتی ہوں۔

اب ادھر کا حال سنیے۔ وہی حبشن جس نے میاں خواجہ بدیع الزمان کو پٹخنی بتائی تھی۔ ان کے قریب آ کے بیٹھی۔ خوجی اس کی صورت دیکھتے ہی جل بھن کے خاک ہو گئے۔ کسی قدر پیچھے ہٹے وہ آگے بڑھی یہ پھر ہٹے۔ وہ بھی ساتھ ہی کھسکی تو جھلا کر ٹوپی اتار کے کھوپڑی پر دو ہتھڑ لگانا شروع کیا تو آدھ گھنٹے تک پیٹا کیے۔

میڈا : (ہنس کر) یہ خوب بات ہے بڑے مردوے بنے ہو۔ جب جانیں کہ ان کو یہاں سے ہٹا دو۔ ایک عورت تک سے مقابلہ نہیں کر سکتا اور دعوی یہ کہ ہم پہلوان ہیں۔

کلیبرسا : جاؤ بس دیکھی پہلوانی ۔ پہلوان بن کے آئے ہیں ۔
خوجی : عورت سے کون بولے ۔ کوئی پہلوان ہوتا تو سمجھ لیتے ۔ اُس کو اگر پٹخنی دی تو کیا اور نہ دی تو کیا ۔ اگر گر گئی تو بد نام ہوئے اور دے مارا تو لوگ ہنسیں گے کہ واہ ایک عورت تک کا مقابلہ نہ کر سکے ۔ کس بوتے پر تتا پانی ۔ اور عورت بھی کچھ ایسی کراری نہیں ہے ۔
کلیبرسا : تم اس قابل ہو کہ دریا میں ڈبو دے ۔
خوجی : خیر آپ کی بلا سے ۔ فرس کو چمکا جب فوج غنیم کو ڈپٹا تھا تو کلیجے ہل ہل جاتے تھے ۔ تیغ دو سر یوں چمکتی تھی جیسے بجلی ۔ یہ چمکی وہ چمکی یہ آئی وہ آئی ۔ تلوار کیا اجل تھی :

بدستِ خواجہ بدیع الزمان بدا شمشیر
برائے ضربتِ وقتل عدو و خصم شریر

وہ جلشن ان کے اور بھی قریب آئی ۔ اور قریب آن کر میاں خوجی کے کان پکڑ کر ہلائے ۔ تب تو خوجی آگ ہو گئے ۔ کہا چاہے ادھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے ۔ ایں جانب اب ایک نہ مانیں گے اور ضرور لڑیں گے :

بہر کارے کہ ہمّت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

میڈا : کیا لڑائی پر آمادہ ہو ۔ اب بھی نہ ہو تو افسوس ہے ۔
خوجی : لڑوں اور بیچ کھیت لڑوں یہ تو اب ہاری مانتی ہے نہ جیتی کسی کی سنتی ہی نہیں ہے ۔ افسوس تو یہی ہے میں جس قدر طرح دیتا ہوں اُسی قدر اور بڑھتی آتی ہے ۔ اب خواجہ بدیع نے بھی آستینیں اُلٹ لیں آخر کروں کیا مانتی ہی نہیں ۔ ہاری مانے نہ جیتی ۔ خم ٹھونک کے بندہ آن پہنچا :

کند تحمل بسیار مرد را بے قدر
کمان چو تن بکشیدن دہد کبادہ شود

تحمل کی بھی کوئی حد ہے ۔ یا کوئی انتہا ہی نہیں ۔ جب تلوار کو میاں سے نکالا اور فوج عدو پر لپکا تو پھر یہ کیفیت تھی :

بچھ بچھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اُس طرف اِدھر آئی وہاں چلی

دونوں طرف کو فوج پکاری کہاں چلی
اُس نے کہا یہاں وہ پکارا وہاں چلی
مُنہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی
سرگرم رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

یہ خواجہ بدیع کی شمشیر برآن کا زور و شور تھا اور یہ جلبشن مقابلہ کرے یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے کپڑے اُتارے اور سامنے آن کھڑے ہوئے کہا خم ٹھونک کے آ۔ او جلبشن زادی۔ خم ٹھونک کے سامنے آ:

بد ہاتھ میں شکست و ظفر نیک ہاتھ ہیں
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کتنی ہاتھ ایک ہاتھ ہیں

ایسا ہاتھ لگاؤں کہ تو بھی یاد کرے۔ ہائے نہ ہوئی قرولی۔

جلبشن : اب خم ٹھونک چکے یا کل تک خم ہی ٹھوکا کرو گے۔

خوجی : اسی خم ٹھونکنے سے اچھی اچھی جوڑوں کو اُٹھا اُٹھا کے دے مارا ہے جی۔ اُس کی آواز جہاں تک جائے وہاں تک شیر ہو تو وہ بھی تھرا جائے۔ یہ خم نہیں جادو ہی۔ چھلاوا ہے۔ چھلاوا ہے۔

جلبشن : پھر اب میں گردن لے لوں آن کے۔

خوجی : (جھپٹ کر) سنبھل سنبھل (گردن میں ہاتھ ڈال کر) بول۔

جلبشن : اخاہ۔ بڑے شہ زور ہو۔ کچھ ٹھکانا ہے۔

خوجی : ہات تیرے کی۔ کہتے تھے کہ ہمارا بدن چور ہے نہ مانا نہ مانا اچھا نہ مانو پھر اس سے کیا کہوں۔

جلبشن نے اپنی گردن چھوڑائی اور اُن کی گردن زور سے پکڑی۔

خوجی : اور بدبخت گردن تو چھوڑ۔ ارے گردن چھوڑ۔ خدا کا واسطہ۔ خدا سمجھے۔ دیکھو میں بولتا نہیں ہوں، ورنہ اب تک کھا جاتا کہ کچا کھا جانے والوں میں ہوں۔ ایسا ویسا نہیں ہوں، مگر ذرا گردن چھوڑ دے تو اشعار مردانہ پڑھ لوں جس میں جرأت آجائے۔

راوی : اشعار مردانہ سے آپ کو کیا سروکار:

منیژہ توئی دخت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنت آفتاب

خواجہ صاحب اشعار مردانہ زبان پر لاتے. گردن چھوڑ دی گئی۔

چمکار کے روکا فرسِ تیز قدم کو
بعد اُس کے ندا دی یہ شقی نحس قدم کو
او بے خبر آ سامنے کچھ کہنا ہے ہم کو
مکّار نے لبیک کہا شاہِ اُمم کو
استادہ ہوا خسرو جمہور کے آگے
ناری نے قیام آ کے کیا نور کے آگے
عکسِ رُخِ پُر نور سے رن بن گیا ایمن
فانوس کا پردہ ہے بیابان کا دامن
کانٹے عوض شمع ہیں فانوس ہیں رُوشن
ہے دھوپ کی گرمی کہ ہے اک تختۂ گلشن
یہ دھوپ پہ عکسِ رُخِ گل رنگ پڑا ہے
یا تختۂ الماس پہ یاقوت جڑا ہے

یہ اشعار پڑھ کر حضرت خواجہ بدیع الزماں نے کہا۔ لے اب آ سامنے اتنا کہنا تھا کہ جبشن نے پھر گردن پکڑ لی. خوجی نے جھلا کر چانٹا رسید کیا. جبشن نے اُسی دم اُن کو پٹخنی دی، اور اوپر بیٹھ گئی۔ اس پر بڑا قہقہہ پڑا. خوجی قرولی بھول گئے. بھیگی بلی بنے دبے پڑے ہیں. جبشن نے کان گوشی کی اور کان گوشی کے بعد اُٹھی۔

خوجی: لاحول ولا قوۃ. کیا اتفاق ہوا ۔ اپنے زعم میں آپ آ رہا. لڑائی چاہیے تھی. ٹنگڑی دے بیٹھا تھا اور اسی پیچ پر ایک دفعہ مار کھا چکا ہوں۔

کلیرسا: اب پھر کبھی ٹراؤ گے. کیوں اب پھر بڑھ بڑھ کے باتیں بناؤ گے. پہلوان سے لڑنا دل لگی بازی نہیں ہے. جب تم عورت سے ہارو گے. پہلوان سے کیا کھا کے لڑو گے۔

خوجی: آپ پیچ ہی کے اصول سے واقف ہوتیں تو ایسا ہرگز نہ کہتیں آپ کو معلوم ہی نہیں کہ پیچ کیا شے ہے. اپنے زعم میں انسان خود گر پڑے تو کوئی کیا کرے چلتے چلتے نہیں آدمی گر پڑتا ہے پھر اُس سے کہیں پہلوانی میں حرف آتا ہے. ہم نے تو بڑے بڑے ملکوں کے نامی گرامی پہلوانوں کی کشتی نکالی ہے. کسی سے دبکے نہیں رہے مصر کے ایک ہوٹل میں پہلوان ہم سے بھڑا. مارا چار دن

شانے جیت اور شاہی کا حال تو بیان ہی کر چکے ہیں کہ کیسے کیسے کارنمایاں کیے۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

دوسرے روز مس کلیرسا نے تحقیقات کر کے حکم دیا کہ آزاد (مصنوعی) بکراست [illegible] روس فوراً روانہ میدان جنگ ہو۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا۔ یہ بیچارا مصیبت کا مارا سخت پریشان اور مبتلائے بلا ہوا اور سوچنے لگا کہ میں اچھا پھنسا اور مفت میں دھرا گیا۔ جب سوار چلے گئے تو خوجی شہزادی کے ہاں آئے۔ خوجی نے کہا۔

شادی جلوۂ گلفام مبارک ہوئے
عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہوئے

اب مزے مزے سے شادی ہو گی۔ سواروں کو انھوں نے نکال دیا۔ مگر وہ اچھا آتو بنا۔ لاحول ولاقوۃ۔ کرتو کرنہیں تو خدا کے غضب سے ڈر لینے میں نہ دینے میں مفت میں پھنس گیا۔ رات قرار پائی کہ دوسرے روز میاں آزاد کا نکاح ہو۔ اور اسی دن جشن منعقد ہو۔ اب دوسرے روز کی تیاری قابل دید ہو گی بلکہ دید ہو گی نہ شنید ہو گی۔ دولہا اور دلہن چندے آفتاب چندے مہتاب۔ خدا مبارک کرے بڑی مصیبت سہی ہے۔ اب شاہد آرزو سے ہم آغوش ہوں۔

مرقدِ منوّر

رنج و الم کی داستان غم و ماتم کا بیان کسی کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر شادی و غم توام ہیں۔ ایک وہ مبارک دن اور سعید وقت تھا کہ شہزادہ سنجر فر فریدوں کمر مرزا ہمایوں فر بہادر اپنے محل معلیٰ کی چھت سے خاتونِ ماہ سیما سپہر آرا سے آنکھیں لڑاتے تھے چھپ چھپ کے کوٹھے پر جاتے تھے۔ وہ مہ پارہ عابد فریب پری چہرہ بتمام زیب جسم کو چراتے ناز دلربا سے پائینچے اٹھائے کبھی اُن کو دیکھتے ہی مارے شرم کے چھت پر بیٹھ جاتی تھی تاکہ نامحرم کی نظر نہ پڑے بیگانے مرد سے آنکھ نہ لڑے۔ کبھی فرط حیا سے چمک کر مہتابی سے چھت پر چلی جاتی تھی۔ عاشق زار کو تڑپاتی۔ خون رلاتی تھی۔ ایک وہ وقت تھا کہ عاشق النسا بیگم بن کر مرزا ہمایوں فر حسن آرا سے مل آئے تھے وہ موقع ہمیں خوب یاد ہے۔ سپہر آرا اور حسن آرا دونوں خوب نکھر کر بیٹھی تھیں دوپٹے جامدانی کے

اور اس پر بیل بوٹے کامدانی کے فوق البھڑک لباس اور اس پر عطرِ فتنہ کی بوباس عاشق النسا بیگم کا ان دونوں پریوں کو بے حجاب دیکھنا اور آنکھیں سینکنا۔ کبھی زانوے سیمیں اور ساق بلوریں پر رکھ کر سونا۔ کبھی ایک ایک بانکی ادا اور نازِ دلربا پر لٹو ہونا۔ کبھی مرزا ہمایوں فر کا ذکر کبھی شادی کی فکر کبھی گلوریوں کی فرمائش کبھی نکاح کی فہمائش خوب ہنسی دل لگی مذاق میں گذری۔ مگر چلتے وقت مہری کے ہاتھ اپنی تصویر بھیجی تو غضب دکھایا۔ سپہر آرا آگ بھبوکا ہو گئی۔ حسن آرا دھک سے رہ گئی۔ دونوں بہنوں نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی۔ ایک کانپ اٹھی دوسری تھرائی۔ یا الٰہی اب کیا ہو گا۔ اماجان سن پائیں گی تو آسمان سر پر اٹھائیں گی۔ اڑوسیوں پڑوسیوں کو ضرور خبر ہو گی۔ کیا جانے کوئی کیا سمجھے کوئی کیا کہے۔ رنگ رخسار متغیر ہو ہو جاتا تھا۔ ہائے ستم! عاشق النسا بیگم نے ایک ہی دن بلکہ ایک ہی گھڑی میں حسن آرا اور سپہر آرا سے بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ اس وقت کا مکالمہ سننے کے قابل ہے۔

عاشق النسا بیگم: آؤ بہن گلے تو ملیں۔ دیوار سے دیوار ملی ہے۔

حسن آرا: پڑوس رہ کے ہم نے آج تک آپ کی صورت نہیں دیکھی۔

آپ نے ہماری صورت نہیں دیکھی۔ ہاں نام البتہ سنتے تھے۔

سپہر آرا: آپ تو یہاں بہت کم رہتی ہیں ہے کہ نہیں۔

عاشق النسا بیگم: آزاد حسین، یا آزاد علی یا آزاد خاں، یہاں کوئی رہتے ہیں ہم نے سنا۔ اس نام کے کوئی ہیں یہ آخر تمہارے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا۔ ان سے ہم بھی ملنا چاہتے ہیں بہن۔

حسن آرا: اے واہ۔ اور سنو۔ آزاد خاں تو ہمارے ہاں کوئی نہیں ہیں نہ آزاد حسین نہ آزاد علی خاں کوئی ہیں۔ کیا خواب دیکھا تھا۔

عاشق النسا بیگم: جی ہاں خواب دیکھا تھا۔ ایک نگوڑی باؤلی چڑیا کان میں کہہ گئی تھی۔ کہو تو ساری داستان کہہ چلوں پہلے خواب کا حال کہوں یا وہ کہوں جو چڑیا نے کہا تھا۔ اے لو پھر رنگ بدل گیا۔ اچھی دل لگی ہے۔ آخر شرمائی کیوں جاتی ہو بہن۔ وجہ؟

حسن آرا: اللہ جانتا ہے۔ ان بہکی بہکی باتوں سے ہمیں کچھ اور شک گذرتا ہے۔ کبھی خواب کا ذکر کرتی ہو کبھی کچھ تم ہو کہاں۔

عاشق النسا بیگم: ہم اس وقت روم میں ہیں اور ہمارا نام آزاد ہے۔

حسن آرا: ہوش کی خبر (ہنس کر) آزاد نام ہے نہ؟

سپہر آرا: چہ خوش ابھی دیکھتی جاؤ کیا کیا کہتی ہیں۔

عاشق النسا بیگم: ہمارے ہاں بھی ایسا ہی کمرا ہے اور اِدھر اُدھر ایسی ہی شہ نشینیں ہیں۔ سامنے بادلے کا نمگیرا ہے۔ اور اس کے نیچے ایک تالاب ہے۔ صاف شفاف پانی۔ ایک حوض تم بھی بنوالو، میں سُرخ سُرخ مچھلیاں تیرتی ہوں۔ سوسوا سو مشکوں میں سقے چھلکا دیں۔

حسن آرا: اتنا بڑا تالاب ہے۔ سوسوا سو مشکیں۔ اوہو!

پیاری: حضور ہمارے پڑوس میں ایک تلاؤ (تالاب) ہے اُس میں سے بہشتی پانی بھر کے لے جاتے ہیں۔ اور کم نہیں ہوتا۔

عاشق النسا بیگم: (حسن آرا کے زانو پر سر رکھ کر) تکلف بر طرف ذری لیٹنے دو بہن پرسوں رات سے جاگتے گذری ہے۔ پلک سے پلک جھپکی ہو تو قسم لو۔ کل پھوپی اماں کے ہاں خدائی رات تھی۔ پرسوں بہن کے ہاں ڈومنیاں آئی تھیں۔ آج خوب سوؤں گی۔

سپہر آرا: آپ کی بہن کا نام تو خورشید لقا بیگم ہے اور وہ جو نواب امین الدین حسین کے ہاں بیاہی ہیں ان کا نام مہ لقا بیگم ہے آپ کا نام عاشق النسا بیگم۔ یہ اچھا نام ہے (مسکرا کر) عاشق النسا بیگم۔

عاشق النسا بیگم: جیسی زیب النسا تھی ویسی ہی ہم بھی ہیں۔
بالکل ایسے ہی اشعار سنیے تو پڑھوں:

واے بر شاعران نادیدہ — غلطی راکجود پسندیدہ
سرور اقد یاری نامند — سرو چوبے است ناتراشیدہ

حسن آرا: زیب النسا کا کلام ہے مگر یہ کیا جانے کیا سبب تھا کہ عمر بھر شادی نہ کی ناکتخدا ہی مری، تربتش عنبرین باد۔

عاشق النسا بیگم: کیوں بہن ایک بات پوچھیں بتاؤ گی یا نہیں بتاؤ گی۔

حسن آرا: ضرور۔ مگر جو بتانے کی ہوگی تو بتائیں گے ہاں۔

عاشق النسا بیگم: واہ، چہ خوش۔ یہ بھی کوئی اقرار ہے۔ وعدہ کرلو۔

حسن آرا: بے سمجھے بوجھے کیونکر وعدہ کریں بہن سن تو لیں۔

عاشق النسا بیگم: اچھا کان لاؤ (کان کے پاس مُنہ لے جاکر) گانا جانتی ہو یا نہیں ہمارا ہی

مردہ دیکھے جو جھوٹ کہے ہمیں کو روئے۔

حسن آرا: نہیں خاتون جنت کی قسم ہمیں گانا نہیں آتا۔

عاشق النسا: ہمارے بھائی کا کیا گلا ہے۔ جو سن لو تو عاشق ہی ہو جاؤ اور واقفکار بھی ہیں۔ بین خوب بجاتے ہیں۔ سنو تو عشق ہو جاتے۔

حسن آرا: ماشاء اللہ۔ کیا تقریر ہے۔ شریف زادیاں یہ باتیں کیا جانیں۔ بھلا عاشقی معشوقی کسے کہتے ہیں۔ عشق ہے کیا بلا۔

عاشق النسا: سنو بہن۔ تم لاکھ چھپاؤ نگاہ کہیں چھپاتے سے چھپی ہے۔ اشارت آشنا نگاہ لاکھوں میں پہچان لیں۔ ع

بھلا چھپی ہیں ادائیں کہیں چھپانے سے

ہمارے بھائی کو کبھی دیکھا ہے۔

سپہر آرا: ہاں کیوں دیکھا کیوں نہیں ہے۔ آپ سے صورت بہت ملتی ہے۔ بالکل ہم شکل ہو۔ دونوں بہن بھائی خوب صورت اور حسین چندے آفتاب چندے مہتاب آنکھیں بھی دونوں کی ایک سی ہیں۔ کیا مرزا ہمایوں فر کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں ہوئی۔ ابھی تک۔

اس فقرے پر حسن آرا بد دماغ ہوئیں اور قہر کی نگاہ سے اپنی بہن کو دیکھنے لگیں ہمایوں فر تو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ تہ دل سے پسند کرتے تھے کھل گئے کہ آرزو تے دلی بر آئی۔ اس کے جواب میں کہا (نہیں بہن) ابھی تو شادی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن جو تمہاری عنایت ہو تو صلّ وجلّ اسی مہینے میں نکاح ہو جاتے۔ سپہر آرا اب سمجھیں کہ انھوں نے غلطی کی تھی مگر تیر از کمان جستہ و وقت از دست دفتہ کا نقشہ تھا۔ خاموش ہو رہیں۔

جن بزرگواروں نے فسانۂ آزاد کی جلد اوّل پڑھی ہے وہ اس فقرے کو خوب سمجھیں گے۔ خوب یاد ہو گا کہ مرزا ہمایوں فر بہادر نے جیسا کہ ہم نے لکھا ہے بہن کے فرضی نام سے مہری بھیجی کہ حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم سے عاشق النسا بیگم ملنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے منظور کر لیا یہ بھیس بدل کر فنس پر سوار ہو گئے اور وہاں انھوں نے دو ہی تین گھڑی میں بے تکلفی کر لی چوک اُن سے اس قدر ہوئی کہ رخصت کے بعد باہر آن کر اپنی تصویر بھیج دی ورنہ دوسرے روز حسن آرا اور سپہر آرا بھی شاید ان کے ہاں جاتیں۔ استانی جی یا معتبر اور معمّر مغلانیاں ساتھ ہوتیں۔ مگر ہمایوں فر نے ایسی جلدی اور غلطی کی کہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اس کے بعد مرزا ہمایوں فر

ایک مرتبہ ہمایوں باغبان بنے تھے اور سپہر آرا کے لوحۂ دل پر ان کی محبّت کا نقش بخوبی نقوش ہوا تھا۔ دل و جان سے ان پر نثار تھی۔ اور ہمایوں فر سے ہر روز اشاروں میں گفتگو ہوتی تھیں۔ نامہ و پیام خط کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ کبھی ہاتھی پر سوار ہو کر آئے کہ دیوار کے پاس سے اپنی معشوقۂ نسرین بدن کا حُسن گلوسوز مشاہدہ کریں کبھی مہتابی پر گئے۔ مگر افسوس:

یہ کیا الم ہے جواب خواب میں ہے چشم نہاں
یہ کیا الم ہے جو ہے وا مصیبتا لب پر
فلک زبار مصیبت — خمید واویلا
ملک چو صبح گریباں درید واویلا

کجا وہ سامان شادی۔ کجا یہ خانہ بربادی۔ کجا وہ عیش و سرور کجا عشرت منزلوں دور شمع طرب گُل مسرت کافور کجا وہ تیاریاں وہ خوشی کے شادیانے وہ دھوم کجا۔ بحرِ غم کی طغیانی اور اشکوں کا ہجوم اب تک کیا تھا اور اب کیا ہو گیا:

اب ایسا گرم ہے بازار رنج و آفت کا
کہ مشتری ہے خریدار سوزِ درد جگر

اس اجل مُردار سے خدا سمجھے اس کو جو قتل کرے وہ بڑا مرد ہے۔ ع

از دست — اجل بسے جگر ہا خون شد

اناللہ و انا الیہ راجعون مگر اس دو روزہ زندگی پر انسان کیا کیا گھمنڈ کرتا ہے۔ اہل دول اپنی دولت فانی پر اتراتے ہیں۔ بادۂ نخوت کے نشے سے سیہ مست ہو جاتے ہیں۔ حسینوں کو اپنے جمال اور حُسن خداداد کا فخر ہے۔ خدا نے ہم کو حُسن کی دولت سے مالا مال رشکِ قمر بنایا۔ چاند سا مکھڑا دیا علما و فضلا اپنے علم و فضل پر ناز کرتے ہیں۔ جُہلا کو بہائم و غنائم سے بدتر سمجھتے ہیں۔ سپاہیوں کو یہ غرور ہے کہ ہم تلوار کے دھنی ہیں۔ جان کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ ہم بہادر ہیں۔ تلوار کے مُنہ چڑھتے ہیں۔ سینے کو سپر بناتے ہیں۔ مصوّر اسی تکبّر میں مرے جاتے ہیں کہ ہم نقل کو اصل کر دکھاتے ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے کہ تصویر مُنہ کھولا ہی چاہتی ہے۔ گویا بولا ہی چاہتی ہے۔ فصحا کو یہ ناز ہے کہ ہم سیف بیان ہیں ہم آتش زبان ہیں۔ ہم غیرت سلمان ہم رشک سحبان ہیں۔ دم تقریر منہ سے پھول جھڑتے ہیں، جو سنتے پھڑک جاتے۔ مگر حیف صد حیف کہ مآل کار پر کسی کو نظر نہیں۔ کل من علیہا فان کو سب بھولے ہوتے ہیں اور جو مبصر ہیں۔ ہر در و دیوار سے اُن کے کان

میں یہی صدا آتی ہے کہ دنیا گذشتنی و گذاشتنی ہے :

ایں عمر کہ بے تاب بہ بینی آنرا
نقشے است کہ در جو آب بہ بینی آنرا
دُنیا خوابے و زندگانی درِ دے
خوابے است کہ در خواب بہ بینی آنرا

آسودگی کنجِ عدم میں ہے۔ مرزا بیدل خوب کہہ گئے ہیں۔ دُنیائے دوں کو آرائش کے اسباب سے کیا واسطہ آسایش منزلوں دور ہے۔

بہر از جہاں ببر کہ غذاے لطیف تو
خونست در لباس اگر شیر مادر است

شہزادہ ہمایوں فر اوریوں وفات پاتے ہیں غفوانِ شباب میں قضا آئے۔ کیا جگر دوز سانحہ ہے۔ کیا حسرت انگیز واقعہ ہے۔ نادیدنی و ناشیندنی ہے مگر اتفاق۔ انسان مجبور ہے۔ ذرا بس نہیں چلتا۔ اگر دُنیا میں کوئی مرض لاعلاج ہے تو یہی ہے :

آگاہ بود خضر ز آفاتِ زندگی
دانستہ آب راز سکندر دریغ داشت

ایک روز کا حال بر سبیلِ تذکرہ حضرات ناظرین سُن لیں۔ مرزا ہمایوں فر بہادر چھت پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے تھے کہ شاید ناظورۂ طاؤس زیب کا نظارہ ہو جائے مگر محروم رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد خدمت گار نے آن کر کہا خداوند آج سرکار نے نماز نہیں پڑھی تو یہ چونک پڑے۔ افسوس کمال رنج ہوا مگر تعجب ہے کہ تم میں سے کسی نے ہم کو مطلع نہ کیا یہ کہہ کر مرزا ہمایوں فر اسی مقام پر خوش الحانی کے ساتھ یہ غزل گانے لگے۔

لگا کر دل بتِ نا آشنا سے — عبث ہم پھر گئے اپنے خدا سے
سوالِ بوسۂ لب سے رُکے تم — لگے چڑھنے فقیروں کی دُعا سے
ملایا مہر و مہ نے بار ہاتھ — نہیں نسبت تمہارے نقشِ پا سے
عجب ہے یار کی تصویرِ رفتار — پری کے نقشے کھینچے نقشِ پا سے
ذرا دیکھو تو اللہ ری نزاکت — قدم اُٹھتا نہیں بارِ حنا سے

ہر اک محبوب کے کیا سر چڑھی ہے
رسائی سیکھیے زلفِ رسا سے

یہ شعر پڑھ ہی چکے تھے کہ سامنے والی مہتابی سے یہ آواز آئی۔

مسلمان بھی کریں سجدے بتوں کے

دُعا مانگی تو یہ مانگی خدا سے

سپہر آرا بیگم مہتابی سے ان کی کیفیت بے قراری اور گریہ وزاری و اختر شماری دیکھ رہی تھیں۔ اُدھر حضرت نے شعر خوانی موقوف کی ادھر سپہر آرا بیگم نے ایک شعر پڑھ دیا اور پھرتی کے ساتھ تڑپ کے مہتابی سے نیچے جلدیں ہمایوں فر نماز و روزہ کے بڑے پابند تھے۔ ان کو سخت شاق گزرا کہ نماز قضا ہوگئی۔ مگر تشفی یہ تھی کہ جس ناظورہ آتش رخسار سے لو لگائی۔ وہ دوڑی آئی۔ جذب اسے کہتے ہیں۔ دل میں محظوظ و مسرور ہوئے اور سوچے کہ کوشش ٹھکانے لگی۔ ورنہ اِس بُت بے پیر کی بدولت نماز مُفت ہاتھ سے جاتی۔ افسوس ہے کہ ایسی ہی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں جن کے لکھنے سے قلم قاصر ہے۔ واہ وا۔ وامصیبتا۔ واحسرتا ہائے ستم۔ وائے ستم! یہ کیا ہوا:

یہ کیا الم ہے جو ہے چاک چاک جیبِ سحر

یہ کیا الم ہے جو خورشید ہے برہنہ سر

سیاہ پوش ہوا ہے الم سے چرخِ کبود

برنگِ داغِ دلِ ماہ ہے ہر اک اختر

بنا ہے چاند کا ہالہ بھی حلقۂ ماتم

ہے بُرجِ آبیٔ گردوں بشکل دیدۂ تر

وفورِ غم سے تعجب نہیں اگر مریخ

اب اپنے قتل کو مانگے ہلال سے خنجر

وفور آتش غم سے ہر ایک دل ہے تنور

ہے آفتاب قیامت ہر ایک داغِ جگر

مرزا ہمایوں فر کے جنازے کا حال ہم کسی قدر معرض بیان میں لاچکے ہیں۔ اب باقی ماندہ حال بھی بصد حسرت نذر ہے۔

اب سُنیئے کہ قلعہ معلّٰی کے امام باڑے میں صندلی صندوق رکھا تھا۔ قبر کے قریب لائے۔ معمار مجوزے تیار کرا چکے تھے۔ چونے کی چنائی ختم ہو چکی تھی۔ دو آدمیوں نے قبر کو اندر سے صاف کیا۔ صندوق سے سہرا اور دوشالہ اتارا گیا۔ ہائے ابھی ابھی دولہا کے سر پر سہرا تھا اب لاش کے

صندوق پر نظر آتا ہے۔ دوشالہ اُتارا یہ دوشالہ مرزا ہمایوں فر نے بڑے شوق سے مول لیا تھا قبر تک اُس نے ساتھ دیا۔ دو آدمیوں نے پوٹ پکڑ کر لاش آتاری بند کفن کھولا گیا۔ داہنیں رُخسار کے نیچے مٹی کا ڈھیلار کھا گیا۔ اور داہنے شانے کو ایک شخص نے آہستہ سے ہلایا۔ قاری نے تکفین پڑھی اور ختم ایک شخص نے تختے لگاتے۔ اُس کے اعزہ و اقرباو احباب اور حاضرین قبر کے قریب آئے اور سب نے مٹی دی۔ مرزا ہمایوں فر کا چھوٹا بھائی قبر پر گر پڑا۔ اس طرح پر زار زار رویا کہ کل حاضرین کے دل بھر آتے۔ دو چار اعزہ نے سمجھایا۔ گلے لگایا۔ آنسو پوچھے۔ مگر اس بیچارے کی عجب حالت تھی۔ جوئے اشک جاری لب پر آہ آتشین۔ سینہ بریاں دل بے قرار قبر کی طرف نظر کی اور آہ سرد بادل پر درد بھری۔ پھر قبر کو دیکھا اور پیٹنا شروع کیا۔ ہائے بھائی۔ کمر ٹوٹ گئی:

توعزم جنان کردی و رفستی زبرمن

بستی کمر خویش و شکستی کمرمن

ایک بزرگ نے گلے لگا کر کہا بیٹا اس وقت کا رونا بُرا۔ ذرا صبر کرو۔ سوچو کہ ایک روز ہم کو تم کو بھی یہی منزل طے کرتی ہے اور یہی شربت مرگ ہم تم سب کے پینے ہو۔ دُنیا فانی تو ہے ہی۔ اب تم کو لازم ہے کہ اپنی ضعیف اور خستہ جان مادرِ مہربان کو ڈھارس دو۔ کہا اماں جان تم کیوں روتی ہو۔ میں تو خدا کے فضل سے موجود ہوں۔ مجھ کو دیکھو کہ بھائی نہ رہا۔ قوتِ بازو اب کہاں سے لاؤں گا۔ نہ کہ تم خود اپنا اس قدر بُرا حال کرو۔ وہ بیچارا باآواز بلند پکار کے کہنے لگا۔ قبلہ وکعبہ اس وقت ہمیں کچھ نہیں سوجھتا۔ ہمارا جوان بھائی دنیا سے اُٹھ گیا۔ ہائے، بلند آواز سے ہائے گورکن نے قبر کو برابر کیا۔ سقے نے سرہانے سے پانی ڈالا اور سرہانے ہی پر ختم کیا۔ لوگ کہتے جاتے تھے کہ خبردار دھار نہ ٹوٹنے پاتے۔ پہلے نین سکھ کی چادر اس پر زربفت کی چادر بچھائی گئی۔ پھر پھولوں کی چادر آئی۔ فاتحہ خوانی ہوئی۔ سب نے ہاتھ دھوتے اور روانہ ہوئے۔

آشنائے راہ میں ہر کوچہ و برزن، ہر دکان اور ہر مکان سے یہی آواز آتی تھی کہ ہائے یہ کیا ہوگیا ابھی ابھی اِدھر سے برات گئی تھی اور ابھی ابھی جنازہ گیا اور دفنا کے چلے آئے۔

ہائے ستم وائے ستم۔ اس سلیمان مرتبت برجیس منزلت شہزادے سے کون واقف نہ تھا۔ دوسرے تیسرے شہر کے خاص خاص بازاروں میں وکڑی پر نکلتے تھے۔ کبھی کیمیت کبھی عربی کبھی ویلا کبھی کیپ پُھنے ہوئے۔ ایک ایک گھوڑا دو دو چار چار ہزار کا فٹن اور آدھے اس وضع اور فیشن کے تمام اسٹیس کے امراء کے پاس نہ نکلیں۔ جب یہ لوگ دفنا کر گھر چلے تو راہ میں لوگ باہم یوں

باتیں کرتے جاتے تھے۔

ایک : رہے نام اللہ۔ بھائی رہے نام اللہ کا۔ بس!

دوسرا : واہ میرے شہزادے ابھی دغا دے گئے۔ قیامت بپا کی۔

تیسرا : بھائی ہماری نظروں کے سامنے اُن کی تصویر پھر رہی ہے۔ وہ سمند گھوڑے پر سوار ہوکر شان سے چوک کی طرف سے گذرنا۔ بادشاہ تو تھے ہی جُھک جُھک کے لوگ سلام کرتے تھے۔

چوتھا : جس وقت دُلہن جنازے پر آئی واللہ عرش تھرآنے لگا۔ زمین ہل ہل گئی یہ کیفیت ہوئی۔ بس کچھ نہ پوچھیے۔ اُف وہ ستم کا سامنا تھا۔ ارے غضب دُلہن اور جنازے پر کھڑی کُہرام کر رہی ہے۔ آج تک ایسا سانحہ نہیں سُنا:

نہ آشنا کوئی گل ہے نہ کوئی بلبل یار
ہے مثل سبزۂ بیگانہ بوستان افسوس
چمن میں پھیری ہے نرگس نے آنکھ اب مجھ سے
نہیں نظارے کے قابل ہیں ناتوان افسوس

پانچواں : شہزادی بیگم کے حال پر روؤں کہ اس پیرانہ سالی میں یہ سانحہ دیکھا۔ جس کے سُننے سے انسان کانپ اُٹھتا ہے۔

یا سپہر آرا کی حالتِ زار پر سر پیٹوں کہ ہائے یہ کیا ستم ہوگیا۔ جو آج تک کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ یا ہمایوں فر کے بھائی کی گریہ وزاری پر سینہ کوبی کروں۔ ہائے یہ کیا ہوا۔

مکان پر پہنچے تو کہرام مچ گیا۔ ایک شخص دروازے پر مولیاں لیے کھڑا تھا جو گیا۔ اس نے پتا توڑا اور کھٹک لیا۔ مرزا ہمایوں فر کا چھوٹا بھائی جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوا بٹس پڑگئی۔ یہ بیچارہ مو پریشان اور گریہ کُناں و نوحہ کُناں تھا۔ دل حسرت منزل نخچیر ترحرمان تھا۔ شہزادی بیگم نے سر پیٹ کر کہا۔ بیٹا۔ میری کمائی کو کہاں چھوڑا۔ خورشید لقا رو رو کر کہتی تھی۔ ہائے کس جنگل بیابان میں ہمارے بھائی کو چھوڑ آئے۔ ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ارے لوگوں ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ہمیں بھی وہاں ہی لے چلو۔

شہزادی بیگم : ہائے میرا لال زمین کا پیوند ہوگیا۔ ہے ہے!

خورشید لقا : اماں جان۔ بھائی کو اکیلا چھوڑ دیا۔ وہاں اور کوئی نہیں ہے اس لق و دق بیابان میں بیچارے اکیلے پڑے ہیں اس بیکسی کو تو دیکھو۔

مہ لقا: (سینہ کوبی کرکے) یا اللہ مجھے بھی موت آجاتے۔

مغلانی: (آہستہ سے) اللہ نہ کرے ابھی موت ہی موت پکار رہی ہو (یہ مغلانی بڑی بوڑھی عورت بہت مدت سے ان کے ہاں نوکر تھی)۔

شہزادی: میری پیری کا سہارا تھا۔ میری پتلیوں کا تارا تھا۔ کن کن ناروں سے میں نے پالا تھا۔ کیسی کیسی منتیں مانی تھیں ہائے لوگو یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا۔ دن رات اسی سوچ میں رہتی تھی کہ اس کا کنول کھلا کرے، اس کے پاؤں میں کبھی کانٹا نہ چبھے کیسی کیسی نعمتیں اُس کے لیے موجود تھیں۔ اُف کبھی بیمار نہیں ہوا۔ مجھ سے ایک روز کہنے لگا کہ اماں آج ڈاکٹر صاحب ہمارے ہاں آتے تھے، جو سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں انھوں نے ہم سے کہا کہ تم بڑے صحیح مزاج اور تندرست آدمی ہو، ایک نسخہ لکھ گئے ہیں سردی میں اُس کا استعمال کرو میں نے کہا۔ بھیا اِن کی دواؤں میں کالا پانی ملا ہوتا ہے۔ دوسرے دن کہا۔ اماں جان اِس دوا نے بڑا فائدہ کیا اور صاحب مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ آپ کا سا تندرست آدمی اس اسٹیشن میں کوئی نہیں ہے۔ سینے پر دو ہنٹر لگا کر ہائے یہ کیا معلوم تھا کہ از غیبی تباہی آئے گی۔ یہ کون جانتا تھا کہ ایک ہی جھونکے میں گل خندان مرجھا جائے گا۔ سمجھے تھے کہ میں بڑا تندرست ہوں اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ۔

ہائے ہائے خورشید لقا بیگم نے مارے غم کے اس قدر سر پیٹا کہ دونوں رخسارے نیلے ہو گئے آہ سرد بھر کر کہا ہم نے ایک باری سُنا تھا کہ دو دن سے بخار آتا ہے۔ بس اس قدر کُڑھی اس قدر کُڑھی کہ بیان سے باہر ہے۔ ہائے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ از غیبی گولا آئے گا۔ ہائے ابھی تھوڑے ہی دن ہوتے کہ آس ٹوٹ گئی تھی۔ اپنے حساب دفنا آئی تھی۔ مگر اُس مرحلے سے نجات پائی۔ بھائی کی صورت دکھائی شادی مرگ کی نوبت آئی۔ (روکر) بھائی یہ کیا غضب ڈھایا۔

ہمایوں فر کے برادر اصغر نے کہا اس وقت قلب کا عجب حال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسوس رہا ہے اور بیقراری دمبدم بڑھتی جاتی ہے۔ اِن کے ایک بزرگ نے قریب آن کر کہا۔ بھائی بیقراری کا سبب ظاہر ہے۔ دل کیوں کر آتے یہ سانحہ جگر دوز ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھاتے مگر خیال یہ ہے کہ اس جہاں فانی میں کوئی ایسا بھی ہے جو بچ جائے کوئی نہیں۔ صرف فرق اتنا ہی ہے کہ کوئی آج کوئی کل۔

رہے نہ حضرت یوسف نہ حُسنِ پاک اُن کا

رہی نہ اب وہ زلیخا نہ عشق اُس کا ہے

نہ اب ہے لیلیٰ و شیریں نہ قیس نہ فرہاد

نہ اب جہان میں وامق ہے اور نہ عذرا ہے

نہ اب ہے قیصرہ خاقان نہ سلطنت نہ حشم

نہ ہے سکندر و جمشید اور نہ دارا ہے

نہ جس کو بسترِ مخمل پہ نیند آتی تھی

سو اُن کے واسطے اب خاک کا بچھونا ہے

سرِ عزیز پہ تھا جن کے تاجِ سلطانی

ہر ایک فقیر کی ٹھوکر سر اُن کا کھاتا ہے

نہ گُل سے کان ہیں اُن کے نہ آنکھ نرگس سی

نہ مثلِ سُنبلِ تر کا کل چلیپا ہے

نواب: بھائی جان اب خدا کو یاد کرو۔ الصبر مفتاح الفرج۔

آغا: خدا صبر جمیل کرامت فرماتے۔ آمین آمین ثم آمین۔

منشیں ترش از گردش ایام کہ صبر

گرچہ تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

بزرگ: جوان خوبرو تربیت یافتہ حلیم الطبع خندہ پیشانی خوش اخلاق ذی مروّت، بہمہ صفت موصوف تھا۔ مگر موت سے کسی کی بھی چلتی ہے۔ ہائے افسوس برسوں نہ بھولوں گا۔ بلکہ تمام عمر نہ بھولوں گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا۔ خداوندا کس شان سے برات جاتی تھی اور یہ کیا ہو گیا۔ اس درد کی دوا ممکن ہی نہیں۔ لاعلاج محض ہے:

وصلِ توام چو نیست میسّر علاجِ نیست

بر دردِ عشق داغِ جدائی خزودہ اند

ایک ایرانی نے جو عرصہ دراز سے ہندوستان میں رہتے تھے مرزا ہمایوں فر کے برادر اصغر کو بہت سمجھایا اور نصائح دلپذیر سے دل بُھانا چاہا۔ مگر فہمائش آتشِ غم والم پر روغن کا کام کرتی تھی اور یہی شعر ترجمانِ دل تھا:

شررِ جوش ست سرناپاتے دل اے یاس تدبیری

مکرر آزمودستم ندارد عشق تاثیری

ہزار ہا لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ماتم کر رہے تھے۔ ایک جہاں کو شہزادہ رفیع المنزلت کے ماتم میں نوحہ گر پایا جس نے اِس واقعۂ جگر دوز کا حال سُنا اُس نے کہرام مچایا۔

ایک : بس یہی جی چاہتا ہے کہ زہر کھا کے مر جاؤں۔ ہائے۔

دوسرا : اس علم اور بُردباری کو خیال کیجیے کہ نوشہ تو بنے ہیں گھوڑے پر سوار دولہا بنے چلے جاتے ہیں اور جھک کے مجھے سلام کیا اور مُسکراتے رہے۔ یا خدا یہ کیا ہوا۔ وہ بیچارہ تو اس جور و جفا کا مستحق نہ تھا۔ فلک پیر اور چرخ کج رفتار نے وہ ظلم کیا کہ الامان الامان۔ اس حلم کو غور کیا آپ نے سچ ہے۔ ع

نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمین

بادشاہزادے تھے کہ ایسے ویسے۔

تیسرا : صبح کو میں گیا تھا۔ ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا حضور کو دُلہن مبارک ہو۔ غلام کا انعام دلوائیے۔ کہا بھئی یہ جلد بازی اچھی نہیں ہے۔ انعام بھرپور لو۔ مگر شادی تو ہونے دو۔ جس دن دُلہن آئے اُسی دن انعام لو۔ نہ دیں تو جرمانہ۔ یہ کہہ کر خدمت گار کو اشارہ کیا وہ دو اشرفی ہاتھ میں چپکے سے دے گیا میں نے جُھک کر آداب عرض کیا اور کہا تا وصلی شب زیر مشق خامۂ تقدیر است نستعلیق عمر و دولت از شکستن محفوظ باد بالنون والصاد۔ آمین آمین کی آواز بلند ہو گئی۔

چوتھا : خفیہ طور پر بہت خیرات کرتے تھے۔ کسی کو دس دیے کسی کو پچاس کسی کو سو کسی کو دو سو مگر کیا مجال کہ زبان پر لائیں۔ کبھی نہیں آج تک کسی سے ذکر ہی نہیں کیا اور پھر طرّہ یہ کہ جس کو دیا اُس سے بھی کبھی نخوت کی نہ لی۔ امیر اور غریب دونوں سے جُھک کے ملے یہ بہت مشکل ہے۔ ورنہ وہ تو بادشاہ کی اولاد شہزادے کروڑپتی آدمی تھے۔ یہاں جس کے پاس بیس پچیس ہزار روپیہ ہوتا ہے وہ زمین پر قدم نہیں رکھتا جی حضرت دل لگی نہیں ہے۔ ع

گر بدولت برسی مست نگردی مردی

مرزا ہمایوں فر کے چھوٹے بھائی سلیمان شوکت نے کہا۔ بڑی تمنّا کے بعد شادی کا دن دیکھا تھا۔ برسوں کی آرزو بر آنے کو تھی۔ مگر وہ دولہا بن کے رہ گئے۔ ہائے ہائے۔ ؎

ہیہات کہ بجانِ من درویش آمد گوئی نمکی بر جگرِ ریش آمد

می ترسیدم زتو شوم روزی دور
دیدی کہ ہماں روز بدم پیش آمد

رُباعی حسبِ حال ہے۔ ہمیں مار ڈالا۔ قتل کر گئے بھائی۔

در ہجر تو من شمع افزوں گریم
مانند صراحی اشک گلگوں گریم
چوں ساغر بادہ ام کہ از و دل تنگ
چوں نالۂ چنگ بشنوم خوں گریم

دو آدمی جو بڑی بیگم کے ایوانِ فلک نشان کے قریب رہتے تھے باہم بصد حسرت و یاس یوں ہم کلام ہوئے۔ آغا اور لالہ۔

آغا: سپہر آرا بیچاری کی خدا جانے کیا کیفیت ہوگی۔ اب تمام عمر تلخی کے ساتھ گذرے گی۔ ہا۔ کیا ہوا:

من حاصل عمر خود ندارم جز غم
در عشق تو یار خود ندارم جز غم
یک ہمدم و ہمراز ندارم نفسے
یک مونس و غمخوار ندارم جز غم

لالہ: مجھے خوب یاد ہے کہ بجرے پر سوار ہو کر دونوں بہنیں کس شان سے جاتی تھیں کہ ہیں کیا عرض کروں۔ مگر اتفاق وقت سے سب مجبور ہیں۔ ع

کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

ایں نکتۂ سربستہ بیادم ز حباب است
کایں عمر بیک چشم زدن نقش بر آب است

ایں جہاں نقشے بر آبی بیش نیست — موج آبی یا سُرابی بیش نیست
پیش نور چشم عبرت بین ما — اوج گردوں جز حبابی بیش نیست

ایں ہمہ جوش و خروش ہر دو کون
جز خیالاتی و خوابی بیش نیست

سب لوگ رخصت ہوئے۔ چند اعزا شب کو وہیں رہے تاکہ مرزا سلیمان شوکت کو تشفی دیتے رہیں۔ تمام شب اندر باہر ماتم ہوا کیا۔ خورشید لقا بیگم کا بہت بُرا حال تھا۔ روتے روتے آنکھیں خونِ کبوتر کی سی سُرخ ہو گئیں اور ہچکی بندھ گئی۔ جو سمجھاتا تھا اُس کو سخت جواب دے بیٹھتی تھیں۔ مہ لقا بیچاری سکتے کے عالم میں تھی اگر کبھی کچھ کہا بھی تو یہ کہا کہ ہائے لوگو یہ کیا ہوا۔ بس اس کے سوا اور کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ شہزادی بیگم دیواروں اور کھمبوں سے سر ٹکراتی تھیں۔ سینے پر دو ہتڑ ہاتھ لگاتی تھیں۔ رشتے کی بیگمات و مخدرات زار زار روتی تھیں۔ ہائے ہمایوں فر وائے ہمایوں فر کی صدا بلند تھی محلّے والے رات کو چونک چونک پڑتے تھے کہ یا خدا ان سب کو بچا۔ دو چار آدمی رو رو کے جان دیں گے۔ اُس وقت سے برابر کہرام مچا ہوا ہے ایسا نہ ہو آسمان پھٹ پڑے یا خدا ان کی جان کا تو محافظ ہو جا۔ خورشید لقا بیگم کوٹھے پر چڑھ کر دو ہتڑ پیٹ رہی تھیں۔ مرزا سلیمان شوکت باہر حشر بپا کرتے تھے۔ شہزادی بیگم نے سر پھوڑ ڈالا۔ یا خدا مدد دے یا خدا مدد دے۔ ؎

کسی طرح سے سمجھتا نہیں دلِ ناشاد　　وہی بکا ہے وہی زاری اور وہی فریاد

بیا بیا کہ دگر تاب — انتظارم نیست

خدا برا نظرے طاقت — و قرارم نیست

یہ اشعار ہر در و دیوار کی زبان پر گویا جاری تھے۔

دوسرے روز صبح کو ایک صاحب مرقد منوّر و مطہر پر گئے اور قبر کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا (شب کیسی گذری) تو یہ آواز آئی:

در آرزوی بوس و کنارت مردم　　در حسرت — لعل آبدارت مردم

قصہ چہ کنم دراز کو تاہ کنم

باز آ باز آ کز انتظارت — مردم

یہ آواز ان کے کان میں آئی تو کانپ اُٹھے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے خدمت گار پیچھے کھڑا تھا۔ اُس سے پوچھا تم نے کچھ سُنا۔ کانپ کر کہا حضور کوئی آواز سی قبر سے آئی۔ مجھے صرف ایک لفظ سمجھ میں آیا (مردہ) اور الفاظ مارے خوف کے مجھے یاد نہیں ہیں۔ مرزا صاحب جنھوں نے خود قبر کے قریب جا کر (شب کیسی گذری) پوچھا تھا فوراً ایک سادے کاغذ پر پنسل سے لکھ دیا۔

در آرزوئے بوس و کنارت مردم
در حسرت لعل آبدارت مردم

دوسرا شعر یاد نہ تھا۔ انھوں نے قلعے کی درگاہ کے مجاور کو بلایا اور کہا ایک تعجب انگیز داستان سُناتا ہوں۔ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ مگر ضرور سُنیے۔ میں نے آن کر حسب معمول و رواج پوچھا۔ (شب کیسی گذری) تو وہاں سے آواز آئی کہ:

در آرزوئے بوس و کنارت مردم
در حسرتِ لعل آبدارت مردم

اور میرے خدمت گار نے بھی سُنا۔ ہم دونوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے قبر سے یہ آواز کیسی آئی۔ اللہ جانے کیا بھید ہے۔ مجاور نے کہا خداوند میں تو حضور کے پاس جانے ہی کو تھا۔ شب کا ذکر سُنیے تو سخت تعجب ہو۔ مگر مجھے اجازت نہیں کہ عرض کروں۔ شب کو تو قبر پر جلسہ ہو رہا تھا۔ وہ دھما چوکڑی مچی تھی کہ کچھ نہ پوچھیے لیکن جب تک اپنے مرشد سے نہ پوچھوں گا تب تک زبان سے نہ نکالوں گا۔ مگر اس قدر بتائے دیتا ہوں کہ حافظ شیراز کی یہ غزل گائی جاتی تھی۔ غزل کے بتانے میں ہرج نہیں ہے۔

رفتم بباغ تاکہ بچینم سحر گلی — آمد بگوش ناگہم آوازِ بلبلی
مسکین چومن بعشق گلی گشتہ مبتلا — واندر چمن فگندہ بفریاد غلغلی
میگشتم اندران چمن و باغ دمبدم — میکردم اندران گل و بلبل تاملی
خون کرد دردلم اثر آواز عندلیب — گشتم چنانکہ ہیچ نماندم تحملی
بس گل شگفتہ میشود این باغ راولے — کس بے جفائے خار نچیند ازو گلی
گل یار خار گشتہ و بلبل قرین عشق — آنرا تغیئے و نہ این راتبدلی

حافظ مدار امید فراغ از مدار چرخ
دارد ہزار عیب و ندارد تفضلی

مرزا: ہاں! سبحان اللہ سبحان اللہ۔ مگر ہم لوگ ذرا ان باتوں کو کم مانتے ہیں۔ لیکن بات ساری یہ ہے کہ وہ مقدس اور ملکوتی صفات اور برگزیدہ کائنات ضرور تھا۔

مجاور: کہا نہ آپ سے جو کچھ میں نے آج دیکھا وہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور شاذو نادر ہی کسی نے دیکھا ہوگا۔ واللہ میں کچھ بیان نہیں کرسکتا۔ میرے ساتھ اور لوگوں نے بھی دیکھا۔ اللہ اللہ

بس اب گوگو کا معاملہ ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ کہوں مگر زبان بند ہو جاتی ہے کچھ کہنے نہیں پاتا:

ایں مدعیان در طلبش بے خبر آنند
کانرا کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد

مرزا صاحب ضعیف الاعتقاد آدمی تھے اور مجاور نے اس لسّانی اور چرب زبانی کے ساتھ بیان کیا کہ مرزا جی کو شک کی جگہ یقین ہو گیا۔

اتنے میں مجاور نے ایک اور آدمی کو بلوایا۔ اُس نے بیان کیا حضور والا کل شب کو عجب بات دیکھنے میں آئی مگر جس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں جیسے کوئی شخص مُنہ کو بند کر دیتا ہے، اور کہنے نہیں دیتا۔ مرزا صاحب کو اور بھی یقین کامل ہوا کہ کچھ اسرار ضرور تھا۔ قبر کو دیکھ کر کہا سچ کہنا ذرا بیکسی نہیں برستی۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ قبر کیا دولہا ہے۔ واہ ہمایوں فر (آہ سرد بھر کر) یہ کیا غضب ڈھایا بھائی۔ ہائے ستم وائے ستم۔

مجاور: آپ۔ ہر قریب کے عزیز تھے۔ میں جانتا ہوں۔

خدمت گار: عزیز! لڑکے تھے۔ مگر رہے نام اللہ کا۔

مجاور: یہی بات ہے بھائی۔ بجز ذاتِ خدا اور سب فانی ہے۔ ہر شے کے لیے فنا ہے۔ اگر نہیں ہے تو ذات خداوند تعالیٰ جل شانہ کے لیے:

کس عسل بے نیش ازیں دُکان نہ خورد
کس رطب بیخار ازیں بستان نہ خورد

اللہ بس باقی ہوس۔ اللہ باقی مِن کل فانی۔

نزدِ اہلِ معنی ایں کاخ سپنج
ہست چوں ویرانہ خالی ز گنج

مرزا: آج شب کو ہم بھی اس قلعے میں آئیں گے۔ اور ضرور آئیں گے دیکھیں کیسا نور تجلا جلوہ افگن ہوتا ہے۔ انشا اللہ انشا اللہ۔

اب سُنیے کہ مرزا صاحب نے تمام شہر میں مشہور کر دیا کہ شہزادہ ہمایوں فر کے مرقدِ منوّر پر شب کو بڑی پہل پہل تھی۔ پریوں کا جُھرمٹ تھا راجہ اندر کے اکھاڑے کی پرے کھڑیاں ناچنے آئی تھیں۔ درگاہ کا مجاور جو معتبر اور مقدس ہے گواہی دیتا ہے۔ اس خبر کو ضعیف الاعتقادوں نے باور کر لیا۔

جب سب لوگ بعد تجہیز و تکفین کے رخصت ہونے کو تھے۔ نواب جعفر حسین خاں بہادر نے سب صاحبوں سے بحسرت کہا، پنجشنبہ سوم کا دن قرار پایا ہے (آبدیدہ ہوکر) آٹھ بجے سب صاحب تشریف لائیں اس فقرے نے کل حاضرین کو خون رُلایا۔ اور ہمایوں فر کے ایک دوست نے کہا۔ ہمارا تو لطف زندگی گیا۔ اب ہم کسی مصرف کے نہ رہے جائیں گے کہاں بیٹھیں گے کہاں، ہنسیں بولیں گے کس سے۔ کس قدر ربط ضبط تھا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ اب تا حشر ساتھ نہ چھوٹے گا مگر:

ہزار حیف کھلا اب کہ سب وہ دھوکا تھا

وہ ربط اور وہ صحبت تھی مثلِ موجِ شراب

جدا اگر چہ رہیں دن کو شمع و پروانہ

اُٹھاتے چہرۂ مقصود شب کو رُخ سے نقاب

نسیمِ صبح اُسے دیوتے صبح مژدۂ وصل

رہے فراق میں نالاں جو رات بھر سرخاب

یہ ایک ہیں ہوں کہ یکساں گذرتے ہیں شب و روز

جگر کو آتشِ فرقت نے کر دیا ہے کباب

الغرض پنجشنبہ سوم کا دن قرار پایا۔ اب کل یا پرسوں سوم کا حال سنیے گا۔ بالفعل ایک بات بیان کرنی ہے کہ اس شب کو سپہر آرا بیگم نے تمام رات گریہ و زاری کی۔ حسن آرا رات بھر تڑپا کی۔ بڑی بیگم قریب مرگ ہوگئیں۔ روح افزا اور بہار النسا دیوانہ وار سر پیٹتی تھیں۔ اور جہاں آرا اور گیتی آرا کا بُرا حال تھا۔ جانی بیگم سپہر آرا کے ہاتھ پکڑے تھیں اور نظیر بیگم حیرت اور حسرت سے سب کی طرف نظر ڈالتی تھیں کہ ہائے یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ کیا ہوا۔

مطلبے گر بود از ہستی ہمیں آزار بود

ورنہ در کنجِ عدم آسودگی بسیار بود

سوم کے روز ہزاروں آدمی جمع تھے۔ خلقت ٹوٹ پڑی۔ اس کے کئی سبب تھے ایک یہ کہ شہزادہ ثریا جاہ فلک بارگاہ کا سوم تھا دوسرے مجاور کی تقریر اور قلعہ معلیٰ والوں کی شہادت نے لوگوں کے دلوں پر عجب رنگ اثر جمایا تھا۔ اکثر آدمیوں کو تو یقین بلکہ حق الیقین تھا کہ شہزادۂ انجہانی تُروَاللہ مضجعہ صرف مقبول بندۂ خدا ہی نہ تھے، بلکہ اولیا اور صدیق اور صلحا میں ان کا درجہ تھا اور ان کی تربت

عنبرین پر شب کو جشن حوران بہشتی ہوا تھا۔ لہذا سوم کے حصّے لینے کو تبرک سمجھ کر لوگ آئے تھے۔ ان میں اکثر آدمی ایسے بھی تھے جو محض ہمایوں فر کی محبت یا رسم و رواج کے مطابق شریک ہوتے تھے اور جن کو نجاور کی داستان کا مطلق یقین نہ تھا۔ آٹھ بجے کے قبل اس قدر آدمی جمع ہوئے کہ گو مرزا ہمایوں فر کا محل کیواں فشاں بدرجۂ غایت رفیع الشان و عظمت توامان تھا تاہم اُس میں اس قدر گنجائش نہ تھی کہ سب شرکائے مجلس سوم بیٹھ سکتے۔ لہذا فوراً نمگیرے اور خیمے نصب کیے گئے۔ فرش دو گھڑی رات ہی سے بچھا تھا اور صندوقوں میں سیپارے رکھے تھے۔ جب سب روسا و امرا و عمائد شہزادے اور احباب اور اعزہ و اقربا جمع ہو گئے قاریوں نے قرآن خوانی شروع کی جو لوگ پڑھ سکتے تھے اُن میں اکثر کے ہاتھ میں سیپارے تھے۔ اور قرآن خوانی بارہ امام پڑھے گئے۔ بعد ازاں اعزہ نے دونے بیلے چنبیلی کے پھول اُٹھائے ایک پیالے میں صندل اور خوشبو دار تیل تھا۔ اس میں دو دو چار چار پھول ڈالے۔ مرثیہ خوانوں نے مرثیے پڑھے۔ جناب فضیلت انتساب خدائے سخن میر انیس صاحب مبرور و مغفور اتے ایک شاگرد رشید نے یہ مرثیہ پڑھا جس سے کل شرکائے مجلس عزا پھوٹ پھوٹ کر روئے:

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر

اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر

توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر

گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے

اقلیمِ سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اور جس وقت حسرت ناک آواز سے ذاکر جناب سید الشہدا نے یہ بند پڑھا ٹپس پڑ گئی۔ شایقین مجلس خامس آل عبا سینہ کوبی کرنے لگے۔

چلّائے محمد کہ میں بسمل ہوا بھائی

اے وائے اخی کیا یہ خبر مجھ کو سنائی

دل ہل گیا برچھی سی کلیجے میں در آئی

یہ واقعہ سن کر نہ بچے گی مری جائی

ممکن نہیں دنیا میں دوا زخم جگر کی

کیوں کر کہوں زہرا سے خبر مرگ پسر کی

مجلس میں ہنگامہ محشر بپا تھا۔ ہر مومن پاک سر پیٹ رہا تھا۔ ہائے حسین کی آواز بلند تھی۔ ایک تو ذکر سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنائی طرز مرثیہ خوانی دوسرے معجز بیانی شیوا زبانی۔ تیسرے ذکر رقت و پریشانی چوتھے مومنین حق میں عشاق ائمہ ہدیٰ کے بحرِ غم والم کی روانی۔ اس سب نے مل کر کہرام مچا دیا۔ ہنود تک دھاڑیں مار مار کر روتے تھے اشکوں سے منہ دھوتے تھے۔ بیان مصائب سن کر کلیجہ منہ کو آتا تھا دل شق ہوا جاتا تھا:

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے ترے سخن کی تاثیر انیسؔ
رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے

مرثیہ خوانی نے ان بندوں سے سامعین و حاضرین کو خون رلایا۔

جس وقت سنی فاطمہ نے یہ خبرِ غم
شادی میں ولادت کے بپا ہوگیا ماتم
چلاتی تھی سر پیٹ کے وہ ثانیٔ مریم
بیٹے پہ چھری چل گئی یا سیدِ عالم
خنجر کے تلے چاند سی تصویر کی گردن
کٹ جائے گی ہے ہے مرے شبیر کی گردن
دنیا مجھے اندھیر ہے اس غم کی خبر سے
شعلوں کی طرح آہ نکلتی ہے جگر سے
دامن پہ ٹپکتا ہے لہو دیدۂ تر سے
بس آج سفر کر گئی شادی مرے گھر سے
جس وقت تلک جیتی ہوں ماتم میں رہوں گی
مظلوم حسین آج سے میں ان کو کہوں گی

سامعین نے انتہا سے زیادہ گریہ و بکا کیا۔ اور باہم باتیں ہونے لگیں۔ ایک نے کہا۔ صاحب خوب پڑھتے ہیں۔ واللہ بہت خوب پڑھتے ہیں۔ دوسرے صاحب بولے اے حضرت کیوں نہیں۔ شاگرد کس کے ہیں سحبان وائل اور امراؤ القیس اور حسان عجم اس کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے بشاگردی کا دم بھرتے۔ کوئی بادشاہ سخن ہوتا ہے جناب میر صاحب قبلہ کو خدا بخشے وہ خدائے سخن تھے۔ ایک

ایک مصرع اس قابل ہے کہ کروڑوں دُرِ خوش آب و شاہوار کی لاکھوں لڑیاں اُس پر نثار کرے مرثیہ خواں نے یہ بند شروع کیا:

پھر دیکھ کے فرزند کی صورت یہ پکاری
اے میرے شہید اے میرے بیکس ترے واری

اس بند کا ایک شعر پڑھا تھا کہ سامعین و حاضرین سر پیٹنے لگے. اس قدر ماتم کیا کہ چرخ اطلس تک آواز بکا و بین پہنچی ہوگی. کوئی فرد بشر کیا ہندو کیا مسلمان ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں اشکبار نہوں اس بند کے اور شعر پڑھے:

یاں بعد مرے ذبح کریں گے تجھے ناری
بنتی ہوں ابھی سے میں عزادار تمہاری
دل اور کسی شغل میں مصروف نہ ہوگا
بس آج سے رونا مرا موقوف نہ ہوگا
مر جائے گا تو تشنہ دہن ہائے حسینا
ہو جائے گا ٹکڑے یہ بدن ہائے حسینا
اک جان پہ یہ رنج و محن ہائے حسینا
کوئی تجھے دے گا نہ کفن ہائے حسینا
گاڑیں گے نہ ظالم تن صد پاش کو ہے ہے
رہواروں سے روندیں گے تری لاش کو ہے ہے

مرثیہ خوان نے بہت بلند آواز سے یہ بند پڑھے. کیوں کہ سامعین و مومنین اس قدر زور سے روتے اور سینہ کوبی کرتے تھے کہ سُننا محال تھا ایک بار ممبر سے کہا. جس قدر رونا ہو رو لو. یہ رونا بھی ذریعۂ مغفرت و وسیلۂ نجات ہے. ارشاد ہے کہ:

غم میں مرے بچوں کے یہ سب کرتے ہیں فریاد
اللہ سلامت رکھے ان لوگوں کی اولاد
مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو
آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو
ایذا جو ہو محفل میں تو راحت اسے جانو

فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمہارے لیے کیا ظلم سہے ہیں

مرثیہ خوانی کے بعد حصے تقسیم ہوتے اور الائچی دانے اور بتاشے۔

عورتیں پُرسا دینے آئی تھیں۔ محلسرا میں الگ کہرام مچا تھا۔ شہزادی بیگم کی بصارت کم ہو گئی۔ تین ہی دن میں نورِ بصر کے غم نے نورِ نظر کو کم کر دیا۔ اس صدمۂ جانکاہ نے ساغرِ دل کو بادۂ محن سے بھر دیا۔ ہر دم انتہائی بیقراری اور چشمِ خونچکاں سے اشک جاری۔ خورشید لقا بیگم کا گلِ رخسار اس سانحۂ جگر دوز کے سبب سے زرد ہو گیا۔ مہ لقا بیگم کا رنگ چہرۂ زیبا مثلِ سحر فق تھا۔ مرزا سلیمان شوکت کا دل دنیا سے پھر گیا۔ بھائی سے عشق تھا۔ جدائی ابدی اور مفارقتِ دائمی مطلق نہ سہہ سکے۔ بھائی کے بغیر ایک دم خوش نہ رہ سکے۔ پچاسوں اعزہ اور مصاحب اور احباب سمجھاتے تھے۔ ہر دم انھیں کے پاس رہتے تھے، مگر اُن کا حال ہر آن دِگرگوں ہی ہوتا جاتا تھا۔ تین ہی دن میں اس قدر نقیہ اور کمزور ہو گئے تھے۔ کہ پہچان نہیں پڑتے تھے۔ ڈاکٹروں کی رائے سے ایک عرق دیا جاتا تھا مگر اس سے کیا ہوتا۔ دردِ دل اور دردِ جگر کا علاج ہوتا تو طاقت بھی عود کرتی۔ اور یہ درد لا دوا ہے کبھی کوٹھی پر نظر ڈالی اور بھائی یاد آئے۔ کبھی گھوڑوں کو دیکھا اور سر پیٹنے لگے ہر دم کوئی نہ کوئی شے ایسی نظر سے گذرتی تھی کہ بے اختیار روتے تھے۔ لوگوں کی صلاح ہوئی کہ اس کے لیے سفر اور نقلِ مکان ضروری ہے۔ اس کوٹھی میں رہنا خلافِ مصلحت ہے۔ کیوں کہ ہمایوں فر کے بیٹھنے کا کمرہ اور حمّام اور باغ اور ڈرائنگ روم اور مختلف کمرے اور اشیا اور سواریاں دیکھ دیکھ کر بھائی یاد آئیں گے اور یہ اپنا بُرا حال کریں گے۔ ایک صاحب نے رائے دی کہ اگر بڑی بیگم صاحب کو عذر نہ ہو تو سپہر آرا کے پاس گھڑی دو گھڑی کے لیے جائیں۔ مگر اکثر نواب زادوں نے ہمایوں فر کے عزیز اور دوست تھے اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ ایک نے کہا یہ بات ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ابھی نکاح نہیں ہوا تھا بڑی بیگم صاحب کو (دبے دانتوں) ہر امر کا اختیار ہے (مطلب یہ کہ نکاح کر سکتی ہیں) علاوہ بریں وہ اس رائے سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتیں۔ یہ بھی ماشا اللہ جوان ہیں۔ وہ بھی جوان ہیں۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔

ایک نواب صاحب نے جو محمد عسکری کے دوست ... پوشیدہ طور پر دو چار نواب زادوں سے کہا کہ بڑی بیگم صاحب اس رائے سے تو اتفاق نہ کریں گی مگر غالباً اس تجویز کو منظور کر لیں کہ مرزا سلیمان شوکت کے ساتھ سپہر آرا کا نکاح ہو جائے۔ اس کے جواب میں اُن لوگوں نے یوں رائے دی۔

ایک : اچھا تو ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ خدا کی قسم۔

دوسرا : نکاح تو ہوا ہی نہ تھا۔ اگر نکاح ہو جاتا تو بھی بعد وفات شوہر نکاح ثانی جائز ہے۔ حدیث و قرآن کی رو سے اس میں ہرج نہیں۔ الا رسم و رواج۔ اچھا مگر نکاح جب ہوا بھی ہو۔ اور جب نکاح نہیں ہوا تو شادی میں کیا قباحت ہے۔

تیسرا : وضع اہل آبرو کے خلاف ہے۔ غور کر لیجیے۔ حضرت!

چوتھا : سبحان اللہ۔ ایسی آبرو پر تین حرف۔ وضع اہل آبرو کے کیوں خلاف ہے۔ دعویٰ بے دلیل محض مہمل ہوتا ہے۔ یا تو خاموش رہیے یا کہتے ہو تو دلائل قاطع اور براہین ساطع کے ساتھ۔ ع

ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

وضع اہل آبرو کی ایک ہی کہی۔ بھئی کیا کیا عقلمند جمع ہیں شان خدا۔ ع

بریں فہم و دانش بباید گریست

جو صاحب اس تجویز کے خلاف تھے ان کا کسی نے ساتھ نہ دیا سب نے اُن کے خلاف رائے دی۔ اور خوب للکارا۔ محمد عسکری کے دوست سے اکثر احباب نے اُسی وقت کہا بھئی سنتے ہو اس بارے میں کوشش بلیغ کرنی چاہیے۔ شاید مرزا سلیمان شوکت کی اسی سے تشفی ہو۔

حضرات ناظرین دنیا کے بھی کیا کارخانے ہیں۔ ابھی کل ہی مرزا ہمایوں فر نے انتقال کیا اور آج سپہر آرا کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کیا انقلاب ہے۔ ابھی سب کے سب ماتم کرتے تھے۔ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ اور اب سپہر آرا کے نکاح کی فکر ہو رہی ہے۔ واہ۔ اور لطف یہ کہ جو لوگ مرزا ہمایوں فر بہادر کے دلی دوست اور سچے شفیق اور یار پائدار تھے وہی سب سے زیادہ فکر کر رہے تھے۔ زمانہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے دھوپ چھاؤں سے بڑھ کر تغیر و تبدل ہے۔ ایک کمرے میں احباب مرزا سلیمان شوکت کو سمجھاتے تھے کہ بھائی جان خوب غور کرو۔ یہ دُنیا دار محن ہے۔ یہاں آسایش منزلوں دور ہے۔ آپ کے والد بزرگوار نے جب انتقال کیا تب آپ نے کیا کر لیا۔ جب دوسرے بھائی نے قضا کی تب کیا کر لیا۔ اور ایک دن سب کو مرنا ہے۔ جو ہوا وہ ہوا۔ اب کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اُن کے نام پر خیرات کیجیے۔ اور اس میں شک ہی نہیں کہ لاکھوں روپیہ خیرات ہو چکا اور لاکھوں خیرات ہوگا۔ دوسری فکر یہ کیجیے کہ جناب والدہ مقدسہ شہزادی بیگم کو تشفی دیجیے اور بہنوں کو سمجھائیے۔ بچوں کا دل بہلائیے۔ اب آپ ہی آپ ہیں۔ خدا آپ کو خضر و الیاس کی عمر عطا کرے۔ ایک کمرے میں یہ باتیں ہوتی تھیں، دوسرے میں سپہر آرا بیگم کے نکاح کا ذکر تھا۔ معاذ اللہ ایک نواب صاحب نے کہا

اگر مرزا سلیمان شوکت کو منظور ہو تو ہم چٹکیوں میں فیصلہ کرادیں. بمعقول! ان حضرت کا بایاں قدم لینا چاہیے یہ. ے صاحب اور بے تکلف معلوم ہوتے ہیں. دوسرے صاحب نے کہا ابھی اُن سے ہم لوگ اس قسم کی گفتگو نہیں کر سکتے. مگر آپ فکر میں رہیے. کوشش کیجیے کہ محمد عسکری کے ذریعے سے سب معاملہ ٹھیک ہو جائے.

نواب: اجی عسکری تو میرا لنگوٹیا یار ہے. اس کے ذریعے سے کل امور کا فیصلہ ہو جائے گا. عسکری ہی نے تو مجھ سے کہا تھا.

مرزا صاحب: بہت اچھی بات ہے. اور ایسا ہی ہونا چاہیے.

نواب: بڑی بیگم تو فوراً منظور کر لیں گی. ابھی تو نیم جان ہیں. ابھی ان سے کون تذکرہ کر سکتا ہے. توبہ توبہ کیا مجال.

دوسرا: یار غضب ہو گیا بھائی. ستم کا سامنا ہے.

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے ــــ جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانند حُباب ــــ غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

ہائے مرزا ہمایوں فر اس قدر جلد چل بسیں. کیا دیکھا کیا کھایا. کیا کیا. کوئی حظ نہ اُٹھانے پائے. اور راہی ملک جنان ہوتے. افسوس صد افسوس. ایسا خوش رُو جوان اور یوں قتل ہو:

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفان ہے ــــ مانندِ حباب ہستی انسان ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس باد مراد ــــ سینہ کشتی ہے ناخدا ایمان ہے

حضرات ناظرین. انسان ایک آنکھ سے روتا ہے اور (ایک آنکھ سے ہنستا ہے) ایک ہی مقام پر احباب رنج اور غم دونوں کی باتیں کر رہے ہیں. کبھی تو ہمایوں فر کے جوانمرگ ــــ مرنے پر روتے اور گریہ وزاری کرتے تھے. اور باہم سپہر آرا بیگم اور سلیمان شوکت ــــ کے نکاح کا چرچا ہوتا تھا.

اب سُنیے کہ نواب انور علی خاں بہادر محمد عسکری کے دوست مرزا سلیمان شوکت کو تشفی دے کر رخصت ہوتے. تو سیدھے محمد عسکری کے پاس گئے اور یوں ہم کلام ہوئے.

نواب: بھئی اس امر خاص میں ضرور بالضرور فکر کرنا اُستاد.

محمد عسکری: ضرور ایسی بات ہے بھلا. نہ فکر کرنا کیا معنی.

نواب : سپہر آرا بیگم کی کیا کیفیت ہے۔ بڑا بُرا حال ہوگا۔

محمد عسکری : کچھ پوچھو نہ بھائی۔ مصیبت ہی ایسی پڑی۔ چونک چونک پڑتی ہیں۔ بس کچھ عرض نہیں کر سکتا کیا حال ہے۔ خدا ہی ہے جو بچ جائیں۔ کل امید منقطع ہوگئی تھی۔

نواب : ایں! ایسی کیفیت ہے؟ یا خدا خیر کیجیو خدا خیر کرے۔ بڑا صدمہ ہوا نہ۔ کیا سمجھتی تھیں اور کیا ہوگیا۔ وائے افسوس۔

محمد عسکری : ذرا ہوش آئے تو میں کہوں۔ دیکھیے تو سہی۔

نواب : نوجوان خوبصورت، مہ جبین اور شہزادے تربیت یافتہ حلیم الطبع چال چلن اچھا ہونہار کوئی نقص نہیں۔ ہمایوں فر کے قدم بقدم ہیں۔ اور سارا زمانہ جانتا ہے کہ والدہ کی کس قدر اطاعت کرتے ہیں اور جاگیر کو تعلقے کو گھر کے انتظام کو کس حسنِ لیاقت سے انجام دیتے ہیں۔ بہمہ صفت موصوف ہیں۔

محمد عسکری : اجی مجھ سے کیا کہتے ہو۔ میں تو خود واقف ہوں۔

یہ مکالمہ ختم ہوا اور نواب صاحب رخصت ہوئے خیر۔

اب سُنیے کہ مرزا ہمایوں فر کے مرقدِ منوّر پر اُس دن سے ہجوم عام تھا۔ جو لوگ ان باتوں کو نہیں مانتے تھے وہ تک صرف اس نظر سے گئے کہ چلیں دیکھیں تو کیا اسرار ہے۔ ضعیف الاعتقاد آدمیوں کا حال تو کچھ نہ پوچھیے۔ سجدے کرتے تھے۔ ہندو تک جا جا کے قبر کو چومتے تھے۔ عجب بھیڑیا دھسان خلقت ہے۔ علما اور فضلا سے بھی لوگوں نے کہا۔ اُنھوں نے بات ٹال دی۔ یہ خبر یہاں تک مشہور ہوئی کہ دو تین یوروپین افسر بھی قبر دیکھنے گئے۔ ابھی تک مجاور نے پوری پوری کیفیت نہیں بیان کی تھی۔ جس کسی نے حال پوچھا اُس نے کہا کہ ابھی ہمارے مرشد کا حکم نہیں ہے، اُس رات پر کیا فرض ہے ہم ہر شب کو جلسے دیکھتے ہیں۔ ایسے ایسے جلسے جو کسی نے نہ دیکھے ہوں۔ شہزادہ تو ولی اللہ تھا۔ گلزار ارم کی سیر کر رہا ہوگا۔ میں نے جب کبھی اُن کی صورت دیکھی دل نے گواہی دی کہ اس کی آنکھیں بادہ عرفان کے نشے سے مخمور ہیں۔ چال کہے دیتی تھی کہ بہشتی ہے۔

ایک ایک قدم لغزشِ مستانہ ہے　　　گلزارِ بہشت اپنا میخانہ ہے
سرمست ہیں جب ساقی کوثر سے　　　آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہے

مجاور نے مرزا ہمایوں فر فردوس آرام گاہ کے اعزّہ سے کہا کہ مرقدِ منوّر پر میر انیس صاحب جنت آشیانی کی رباعی ضرور چاہیے :

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے

نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد

مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

ایک عزیز نے کہا۔ اس رباعی پر کیا فرض ہے۔ شعرائے گرانمایہ نوحے اور قطعے تصنیف کر رہے ہیں۔ وہ سب کندہ ہوں گے۔ ہم اس فکر سے غافل نہیں ہیں۔ ایسے جگر دوز اشعار نہ سُنے ہوں گے۔ مجاور سے لوگوں نے اصرار بلیغ کیا کہ تم اُس شب کا حال مفصل بیان کرو۔ ہم لوگ سُننے کے کمال مشتاق ہیں۔ اس نے کہا آج نہیں۔ جس دن مرشد کا حکم ہوگا۔ اسی دن عرض کروں گا۔ وہ حال سُننے کے قابل ہے۔ ہائے کل خوش الحانی سے آواز آتی تھی۔ حافظ شیراز کی مست کرنے والی غزلیں۔

اے صبا نکہتے از کوے فلانی بمن آر

زار و بیمار غم راحت جانی بمن آر

قلب بے حاصل ما را بزن اکسیر مراد

یعنی از خاک در دوست نشانی بمن آر

در کمینگاہ نظر با دل خویشم جنگ است

زابر دو غمزۂ او تیر و کمانی بمن آر

ساقیا عشرت امروزہ بفردا مفگن

یا ز دیوان قضا خط امانی بمن آر

دلم از پردہ چہ شد دوش کہ حافظ میگفت

اے صبا نکہتِ از کوے فلانی بمن آر

جو سُنتا تھا متحیر ہوتا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ مجاور کی خوشامد کرتے ہیں مگر با اینہمہ نہیں بتاتا۔ قلعے والوں سے دریافت کرتے ہیں تو وہ حال بتانے کے عوض اَئیں بائیں شائیں بکتے ہیں۔ خدا جانے کیا اسرار ہے۔ مجاور نے بڑی دقت کے بعد اقرار کیا کہ آج کے آٹھویں دن کل حال معقول طور پر سُنا دوں گا۔ صاف صاف بیان کر دوں گا۔

نواب : اور اگر آپ نے نہ بیان کیا تو پھر۔

مجاور : ضرور بالضرور پُر ضرور کہوں گا۔

فنس کے لیے چھٹکے کی فکر کی یا نہیں

گوکھوں کے سردار بیوقوفوں کے ہادی گھامڑوں کے سرغنہ جانگلوؤں کے مُنشی خواجہ بدیع الزمان علیہ الغفران کا آج دماغ ہی نہیں ملتا۔ عقل اِدھر اُدھر سے سمٹ کر گدّی میں ہو رہی۔ ذہن کا بغا ہ کُھل گیا۔ ایک آنکھ پر حماقت کے پردے پڑ گئے دوسری پر اُن کے عم بزرگوار شیطان الرجیم نے پٹی باندھ دی۔ پاؤں پر سنیچر سوار ہوا۔ اس کا سبب کیا۔ وحشت تو جبلی ہے۔ گدھا پن خلقی یہ دونوں بہن بھائی خوجی کے ساتھ پیدا ہوئے تھے مگر آج وحشت پر وحشت کی ایک اور تہ جم گئی۔ بس لے اُڑی۔

اب سُنیے کہ مِس کلیرسا کی ہوشیاری اور بیدار مغزی اور مِس مِیڈا کی فہمائش و دوراندیشی سے سوار تو مصنوعی آزاد کو لے کر رفوچکر ہوئے۔ دیکھیے اس مصنوعی آزاد کا حشر کیا ہوگا۔ آئندہ سمجھا جائے گا۔ ادھر آزاد فرخ نہاد شادان و خندان مست غزل خواں جھومتے ہوئے آئے۔ پولینڈ کی شہزادی نے فرطِ طرب سے گلے لگایا۔ پاس بٹھایا۔ عزت بخشی۔ رتبہ بڑھایا۔ خاتون مہ لقا مِس مِیڈا سے اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ اِدھر اُدھر وہ مُسکرائے۔ مِس کلیرسا کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی کہ سبز پوش خادمہ حسین کی نظر آزاد پاشا سے جھینپتی ہے اور خوجی تو پہلے ہی سے غل مچاتے تھے۔ آزاد نے ہنس کر کہا، خدا جانے کس بدبخت کی تباہی آئی۔ ہماری بدولت بندھا بندھا پھرتا ہے۔ کلیرسا بولی اور ہم شکل بھی نہیں، مگر ہاں کشیدہ قامت وہ بھی ہے۔ اور شہ زور آدمی معلوم ہوتا ہے۔ فنون سپہگری سے بھی واقف ہے۔ ان لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ گرفتار کر لاتے۔ اب لیے لیے پھرتے ہیں۔ مِس مِیڈا نے کہا۔ چلو اب تم کو اُس سے کیا واسطہ خیال تو تب ہو جب تم نے اُس کو گرفتار کر کے بھیج دیا ہو یا تمہارے سبب سے گرفتار ہوا ہو۔ آزاد نے مِس مِیڈا اور کلیرسا کا شکریہ ادا کیا۔

آزاد : تم دونوں کا بندۂ احسان ہوں۔ کمال مشکور ہوں۔

مِیڈا : (مسکرا کر آہستہ سے) بجا۔ درست۔ احسان کیسا!

کلیرسا : تکلف کی باتیں کرتے ہیں۔ احسان اور شکریہ کیا معنی۔

آزاد : غضب ہی ہو گیا تھا۔ خدا نے بچا لیا۔ نہیں تو آج بڑے بڑے پھنستے تھے، مگر کسی مخبر

نے پتا خوب ٹھیک دیا۔ سید ھے یہیں آن پہنچے۔

خوجی: اجی حضرت آداب عرض ہے۔ غلام بدیعا حاضر شد۔ ابدوں من بدیعا پارسی گوشدہ۔ پارسی الاصل و پارسی زبان:

خوبان پارسی گو۔ بخشندگان عمر اند
ساقی بگو بشارت۔ پیران پارسارا

آزاد: واللہ اب تو آپ ماشا اللہ اچھی فارسی بولنے لگے۔

خوجی: ہونہہ! (اب تو) کی خوب کہی۔ کہنے لگے (اب تو آپ ماشا اللہ اچھی فارسی بولنے لگے) اس اب تو کو ملاحظہ فرمایئے گا اب تو ہونہہ! اب تو کیا معنی۔ اور ہم فارسی خراب کب بولتے تھے۔ فرمایئے۔ مصر میں کانسل کے نام کس دھوم دھام کا فارسی خط لکھا۔ پڑھ کے دنگ ہوتے اور یہاں ایک ایرانی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ آپ فرماتے ہیں (اب تو) اب تو آپ فارسی بولنے لگے۔ ہم ہمیشہ سے خوب فارسی بولتے ہیں اور ایک فارسی بولنے پر کیا موقوف ہے شعر کیسا کہتے ہیں۔ ناثر ویسے ہی ناظم ویسے ہی۔ سپاہی ویسے ہی، بانکے ویسے ہی:

یاران بفکر بخیہ و مرہم فتادہ اند
دیں جامہ ام ہنوز صد جا دریدہ ست

آزاد: یہ تو آپ کے ابا جان کا شعر ہے ایک بار تو آپ نے فرمایا تھا کہ حضور کے والد ماجد کی تصنیف لطیف ہے۔

خوجی: نا اُن کا شعر یہ ہے۔ آپ کو یاد نہیں رہا:

بہ تحریر آورم گرنامہ بے تابی دلہا
نویسند خامہ جائے بسم اللہ بسلمہا

یہ مطلع دیوان ہے اور اس غزل کا ہر شعر رشک بوستان ہے سُنیئے اور کان دھر کے سُنیئے۔

اگر حور و پری پروانہ اش گردد بزو کاشب
فتادہ آتش زشمع روے او در جان محفلہا

اور مقطع سُننے کے قابل ہے واللہ وجد کرنے لگو گے بھائی۔

بوجد آورد امشب نغمۂ شیراز سرور را
اَلا یا ایہا السّاقی اور کاسا دونا دلہا

راوی: یہ شعر آپ کے باپ کے ہیں شاید سرور تخلص کرتے تھے۔

ہات تیرے گیدی کی۔ اب تو شرمایا اب بھی نہیں شرمایا۔ چاہے جو شعر ہو جہاں شعر پسند آیا اپنے باپ کا کہا۔

اب سنیئے کہ پولینڈ کی قوس ابرو اور عنبر مو شہزادی نے دوسرا دن شادی کی تقریب سعید کے لیے مقرر کیا۔ خوجی نے شہزادی سے کہا سنیئے حضور آپ اپنے ملک کی رسم کیجیے ہم اپنے ملک کی رسم کے مطابق عمل میں لائیں۔ ہم برات ضرور نکالیں گے۔ ہاں ایک بات ہو سکتی ہے کہ آزاد پاشا چاہے برات کے ساتھ نہ ہوں مگر برات ضرور آئے اور اس کا انتظام بندہ خواجہ بدیعا کے سپرد ہو۔ یہاں کے جانگلو وحوش کیا جانیں۔ ہم چٹکیوں میں انتظام کر دیں گے۔

آزاد نے کہا تمہاری شامتیں آئی ہیں۔ تم اب ہمارے ہاتھ سے پٹو گے اور یہ تو ہم خوب جانتے ہیں کہ تمہاری قضا ہمارے ہاتھ ہی، ہماری گردن پر تمہارا خون ہو گا۔ خیر پھر کچھ پروا نہیں۔ خوجی نے شہزادی سے کہا۔ سنیئے اُن کو تو آپ بکنے دیں۔ اور ہماری رائے مان لیں مس کلیرسا نے خواجہ صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ کہا اس میں ہرج ہی کیا ہے ایشیا کی دھوم دھام اور ترک احتشام اور ٹیم ٹام کا حال بہت کچھ سُنا ہے دیکھیں برات کسے کہتے ہیں۔ اور جلوس کے کیا معنی۔ دوسرے روز خواجہ صاحب نے حسب سابق بیس خدمت گار ساتھ لیے اور انتظام کرنا شروع کیا شام کے وقت دس دس بارہ بارہ کوس کے آدمی جو شہزادی کے رعایا میں سے تھے جمع ہوئے کہ برات دیکھیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ایک فرانسیسی کے ساتھ شادی ہو گی۔ آزاد پاشا کا نام ظاہر نہ کیا۔ خواجہ صاحب نے برات کو کروفر کے ساتھ نکالا پہلے برات کی دھوم دیکھ کر پہاڑی کمال شوق سے اس ٹھاٹھ کو دیکھنے آئے۔

سب کے پہلے ڈنکا تھا۔ بڑی اونچی سانڈنی پر اُس کے بعد جھنڈا۔ یہ بھی سانڈنی پر۔ سانڈنی سواروں کی وردیاں بھی نئی اور انوکھی تھیں۔ روسیوں نے کبھی ایسی وردی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد پچاس اونٹوں کی قطار۔ حکم تھا کہ جو اونٹ زیادہ بلبلائے گا اور سب سے زیادہ شتر غمزے کرے گا۔ اُس کے شتربان کو انعام کثیر ملے گا۔ دُلہن کے مکان پر پہنچ کر اونٹ ضرور بلبلاتے۔ اور یہ معلوم ہو کہ بس بھاگا ہی چاہتا ہے۔ سب اونٹوں اور سانڈنیوں کی گردن ہلتی ہو۔ اور ہر سانڈنی اور اونٹ کے مُنہ میں ایک ہری شاخ ضرور ہو۔ ہری بھری چیز عمدہ شگون ہے۔

اس کے بعد تخت اُن پر عورتیں۔ کسی تخت پر ناچ ہوتا تھا۔ کسی پر گانا بجانا۔ آٹھ آٹھ دس دس

بارہ بارہ آدمی تخت اُٹھائے ہوتے تھے حکم تھا کہ دُلہن کے دروازے پر پہنچ کر خوب دھماچوکڑی مچے۔ ایسی بلند آواز سے گائیں کہ کان کے پردے پھوٹ پڑیں۔

اس کے بعد باجا۔ حکم دے دیا کہ خوب زور زور سے باجا بجے تال سے سُر سے کچھ واسطہ نہیں۔ آواز ایسی ہو کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔

اس کے بعد بڑی دراز قامت سانڈنیاں سانڈنی سواروں کے ہاتھ میں بڑے لمبے لمبے بانس۔ ایک بانس میں دوسرا بانس باندھا تو اور بھی لمبا ہو گیا اور اس کی نوک پر پنجشاخے روشن کیے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ایک تو سانڈنی اُونچی دوسرے دو بانسوں کی لمبائی اور اُس پر روشنی معقول واہ میاں خواجہ بدیعا واہ سبحان اللہ مانتا ہوں کیا فرشتوں کو روشنی دکھاتے تھے۔ بھلا ان پنجشاخوں کی روشنی زمین پر کیونکر آنے پائی۔ اس عقل کے صدقے اس فہم کے قربان۔ مردِ خدا روشنی آسمان کے لیے تھی یا زمین کے لیے برات میں اندھیرا پڑا ہوا مگر پنجشاخے سیکڑوں ساتھ۔ جو دیکھتا تھا قہقہے اُڑاتا تھا۔ اور خواجہ صاحب کا حکم تھا کہ دلہن کے دروازے پر پہنچتے ہی پنجشاخے ہلائے جائیں تاکہ روشنی اور بھی تیز ہو جائے۔ واہ رے بیوقوف اس عقل پر خدا کی مار علی کی پھٹکار لاحول ولاقوۃ عقل سے بہرہ ہی نہیں۔

اس سامان کے بعد گھوڑوں کی قطار تھی۔ نہایت عمدہ عمدہ برق دم اور اصیل گھوڑے۔ عربی کیپ، ترکی، ایک سے ایک بڑھ کے۔ ایک گھوڑا جو خاص شہزادی کی سواری کا تھا اس طرح بن کے جھومتا ہوا جاتا تھا کہ ایک ایک قدم پر تماشائی عش عش کرتے تھے۔

چال ابر کی چلا جو گلستان میں جھوم کر

طاؤس نے قدم ترے رہوار کے لیے

خوجی اس گھوڑے کو دیکھ کر کہنے لگے۔ واہ ہے۔ واہ ہے۔ واہی واہ ہے۔ اور بن کے چل اور بن کے چل۔ پری ہے پری دُلہن ہے۔ نو عروس ہے۔

چوں تصور کنم میانش را

ہست باریک تر ز راہ خیال

بدیعا کو اس وقت اپنا کاسنی رنگ کا فرس خوش غلاف یاد آیا۔ بس ایسا ہی تھا۔ بعینہ ایسا ہی۔ یہی قد یہی کمر پری وش رشک قمر اسی طرح بن بن کے اور تن تن کے جاتا تھا۔ بس ایسا خوبصورت اور زیبا اندام اور خوش خرام گھوڑا نہیں دیکھا اور بالکل خوش غلاف ہے

میان او کہ در اندیشہ در نمی آید
عجب نباشد اگر در نظر نمی آید

راوی : اور تو خیر مگر خوش غلاف کے معنے ہم نہ سمجھے۔ خوش غلاف تلوار البتہ سُنی ہے۔ مگر اسپِ خوش غلاف ایجادِ خواجہ صاحب غزغادُم ہے خواجہ صاحب بُرا نہ مانیں جس طرح انھوں نے گھوڑے کو خوش غلاف کہا اُسی طرح ہم نے اُن کو غزغادُم بنایا۔ مگر وہ تو بے دُم کے گدھے ہیں۔ ایک شخص نے جو خوجی کے قریب کھڑا تھا پوچھا کیا آپ کسی شہر کے رئیس ہیں۔ خواجہ صاحب مسکراتے کہا جی نہیں بندہ تو سائیس ہے۔ بلکہ خاکروب۔ گیدی صورت ببین حالش مپرس ہمارے چہرے سے شانِ ریاست برستی ہے۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ صورت سوال ہے۔ (کیا خوب) عجب عجب جانگلو اس مجسّم وحشت ملک کے بیچ میں (بہت ہی خوب) پیدا ہوتے ہیں۔ ماں ٹینی باپ کلنگ انڈے بچے رنگ برنگ۔ کس مزے سے آپ پوچھتے ہیں۔ کیوں صاحب کیا آپ کہیں کے رئیس ہیں۔ بدتمیز نامعقول۔ ارے ہم رئیس ہمارے جناب والد رئیس ہیں۔ ان کے والد رئیس، والدہ رئیسہ والدہ در والدہ رئیسہ، ابن رئیسہ۔

راوی : سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ حضور خود اور حضور کے والد رئیس ایک پشت کا حال تو معلوم ہوا مگر والد کے بعد دادا کا ذکر نہ کیا۔ اپنے والد کے والد کو رئیس بنایا مگر دادا جان کا ذکر نہیں۔ ہم سمجھ گئے بوچڑ ہوں گے۔ بس ہم سمجھ گئے جب ہی مخفی رکھا۔ والدہ در والدہ نیا جملہ ہے۔ اسپِ خوش غلاف کا بھائی والدہ در والدہ شاید آپ نے دادی سے مراد لی ہے۔ اور یہ فقط تو اس قابل ہے کہ آبِ زر سے لکھے (رئیسہ ابن رئیسہ) ابن کی ایک ہی کہی اور حضور خواجہ بدیع الزمان بنت رئیس ہیں۔

خیر اس آدمی نے مسکرا کر کہا کہ جناب خواجہ صاحب حضور نے صرف اتنی سی بات کے پرچے پر کر (آپ کسی شہر کے رئیس ہیں) مجھے گیدی بنایا اس ملک کو مجسّم وحشت کہا۔ یہاں کے اعلا اور ادنا باشندوں کو جانگلو کا خطاب عنایت فرمایا۔ غرض اس قدر مسلسل اور طویل وعریض تقریر آپ نے کی مگر یہ نہ بتایا کہ حضور کہاں کے رئیس ہیں۔ خوجی بولے ہم ماوراالنہر کے رئیس ہیں۔ اور اباجان روم کے تھے۔ اور اباجان کابلی ہیں اور نانا خوارزم کے تھے اور نانی کی نسبت اس قدر سُنا ہے کہ وہ کوہِ ہمالیہ کے قریب پیدا ہوئی تھیں اور جس وقت وہ تولد ہوئیں اُس وقت حافظ شیراز وہیں تھے اور یہ غزل تصنیف کر رہے تھے۔

دردِ ما را نیست درمان الغیاث   ہجرِ ما را نیست پایان الغیاث

دین و دل بروند وقصدِ جان کنند　　الغیاث از جورِ خوبان الغیاث
خون ما خوردند این کافر دلان　　اے مسلماناں چہ درمان الغیاث
ہر زماتم درد دیگر می رسد　　زین حریفابردل و جان الغیاث
ہمچو حافظ روز و شب بیخویشتن
گشتہ ام سوزان و گریان الغیاث

آزاد پاشا کے پاس لپک کر گئے اور کہا یار چے جیغہ اور سر پیچ کی فکر تو کی ہی نہیں از برائے خدا کہیں سے منگواؤ. کسی رئیس کے ہاں ضرور ہو گا اور رئیس کے کیا معنی اپنی سسرال ہی سے منگوالو بس کافی ہے. اس کے کیا معنی چڑیا کا دودھ تک تو موجود ہے۔

ہمہ اسبابِ شاہی حاصل او
نماندہ آرزوے در دل او

آزاد : آپ کو تو خبط ہے، بندہ پاگل نہیں. ان کے ہاں جیغہ سر پیچ کجا. عجب سڑی سوداتی سے سابقہ پڑا ہے. لاحول ولاقوۃ۔

خوجی : ارے نادان. ان کے ہاں سب کچھ ہے. ان کے ہاں کیا نہیں. ہمہ نعمت تمام دنیا کی اشیا موجود ہیں. جی!

فلک در نمیاش از جوزا کمر بند
عطارد ــــــــــــــ؟

آزاد : ایں بس! اتنے ہی پر سے اُکھڑ گئے۔ عُطارو! وہ کاٹا اُگے آیت. جناب مولوی صاحب. اتنا نہیں سمجھتا ہے پاگل کہ کجا ہندوستان کی رسم کجا روس! عجب گدھے سے سابقہ پڑا ہے خدا بچائے۔

خوجی یہ فقرہ کہہ کر آزاد کے پاس سے معاً چلاتے گدھے سے سابقہ پڑا ہے. گدھے تم کو نہیں ہم کو سابقہ پڑا ہے اور ہم گدھے ہی سہی مگر یہاں تو سب تمہارا باپ ہی کہتے ہیں. یہ گرما گرم فقرہ کہا اور جھپ سے بھاگ گئے کہ ایسا نہ ہو آزاد گردن ناپیں. برات کے شریک ہو کر پھر مصروفِ انتظام ہوئے. خوجی کو غالب غلہ پا کر سانڈنی سواروں نے بانس نیچے کر دیے تھے کہ روشنی ہو اُنھوں نے جو دیکھا کہ بانس اس قدر نیچے ہیں تو آگ ہو گئے. اوگیدیاں، اور گیدبان. تم عجب طرح کا آدمی ہے. ہم نے جو حکم دیا اس کو مانو. یوڈیمیڈ عجب قماش کا گیدی ہے اوگیدی۔

راوی: اب تک تو گیدی کہتے تھے اب گیدی کی جمع گیدیاں بنائی۔ واہ گیدی خوجی۔ بہت دن سے پٹے نہیں ہیں گیدی ارے ہم خود بھولے ابھی کل ہی پرسوں تو پلیتھن نکل چکا ہے۔ بوا زعفران کی نانی جلیش نے اُٹھا اُٹھا کے وہ پٹخنیاں بتائی ہیں کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد ہوگیا ہوگا۔ مگر بیمیا کی بلا دور انتظام مناسب کر کے پھر آزاد کے پاس دوڑے آئے۔

خوجی: گھبرائے ہوتے دروازے ہی کے پاس بوکھلا کر بولے۔ وِل آزاد صاحب سُنا بھی۔ ارے یار فنس کے لیے چھٹکا منگوایا ہے یا نہیں۔ بھئی تمہارے سبب سے ناک کٹے گی۔ ایک شخص نے آزاد سے کہا تھا کہ برات کا نکلنا بُرا ہوا۔ اب سب میں مشہور ہو جائے گا کہ شہزادی نے کسی ہندی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ تم اور آزاد دونوں گرفتار ہو گے۔ اگر چُپ چپاتے شادی ہو جاتی تو خوب بات تھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی اِس کہسار میں کون آتا جاتا ہے معدودے چند وہ بھی جن کو آپ سے توسل ہے آزاد کے دل میں یہ بات کُھب گئی اور دو چار آدمیوں نے یہ بھی آن کر کہا کہ آپ کے والد ماجد انتظام میں مصروف ہیں۔ مگر عقل کی کوتاہی ہے۔ آزاد بد دماغ ہو گئے۔ کئی بار قصد کیا کہ باہر جا کر خوجی کو پیٹیں۔ شامتِ اعمال ان کو خود کشاں کشاں لائی۔ یہ بھرے تو تھے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا برس پڑے۔ خوجی کا اتنا کہنا تھا کہ ارے یار فنس کے لیے۔ چھٹکا منگوایا ہے یا نہیں کہ آزاد نے اُن کے پٹے پکڑے اور چانٹے جمانا شروع کیے۔ گو بہت زور سے نہیں پیٹا۔ مگر مور را شبنم طوفان۔ زبان سے کہتے جاتے تھے (ارے یار فنس کے لیے چھٹکا منگوایا ہے یا نہیں) اور ہاتھ سے پیٹے جاتے تھے کم سے کم کوئی تیس چالیس بار کہا ہوگا کہ ارے یار فنس کے لیے چھٹکا منگوایا ہے یا نہیں۔ خوجی یہ فقرہ کہہ کر بہت پچھتاتے بڑے شوق سے تشریف لاتے تھے مگر بہت خوش ہوتے ہوں گے پٹ پٹا کر چپتیں کھا کر آزاد کو خوب گالیاں دیں۔ او گیدی اگر آج دولہا نہ ہوتا تو مارے قرولیوں کے الّو بنا دیتا۔ سبحان اللہ۔ او گیدی آج راہِ خدا پر چھوڑ دیا۔ ورنہ بسمل کر دیتا۔

راوی جانے دیجیے آپ اپنی کچی داڑھی کی طرف دیکھیے۔ مردِم آزادی اور غریب آزادی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ آپ کی بھل منسی تھی کہ آپ چپکے ہو رہے شریف زادے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ بولتے تو بے ادبی معاف اور ذلیل ہوتے بڑی دیر تک خواجہ بدیع الزمان صاحب بدیع بگڑتے رہے۔ آزاد کو گھورتے جاتے تھے اور گالیاں دیتے جاتے تھے آزاد کو پہلے تو بڑا غصہ تھا مگر جب دل کھول کر سزا دے چکے تو غصہ فرو ہو گیا۔

اب سُنیے کہ ایک خادمہ نے آزاد کو پیٹتے ہوتے دیکھ لیا تھا خوجی کے پاس جا کر کہا اب آپ ـــــ

جانے دیجیے جلوس تر بتر ہوا جاتا ہے اب ان کی حالت پر رحم کیجیے۔

خوجی: ہشت دہشت۔ ایسی تیسی ایسے آزاد کی۔ جاؤ یہاں سے۔

خادمہ: اب آخر جلوس اور برات کا کوئی والی وارث بھی ہے۔

خوجی: ہماری پاپوش سے کوئی ہو چاہے نہ ہو۔ مارا چہ ازیں قصہ۔ تم نہ بولو۔ اُسے ہم سے ایسی اکثر ہوا کرتی ہے۔ کبھی ہم نے ان کو پیٹا کبھی انھوں نے ہم کو چہ مضائقہ دارد۔ ع

کشتی دروں دریا دریا دروں کشتی

کبھی کشتی دریا میں کبھی دریا کشتی میں سمجھیے۔

آزاد: بھائی خوجی۔

خوجی: خوجی سور کی ایسی تیسی مروک کی جناب خواجہ صاحب قبلہ کہو۔ ادب کے ساتھ۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب مسکرائے اور باہر جا کر پھر مصروف انتظام ہوتے مگر اب فلس اور چھٹے کی فکر سے ہاتھ دھو یار۔

خواجہ صاحب بڑے زعم میں آتے تھے کہ فلس کے لیے چھٹے کی بندوبست کرنا چاہیے اپنے حساب آزاد پر بڑا احسان کیا تھا۔ پہلے جیغہ اور سرپیچ کی فکر ہوئی تھی پھر دُلہن کی فلس کے لیے چھٹکا یاد آیا مگر اتنی دھولیں پڑیں کر چاند گنجی ہوگئی۔ قسم کھائی کہ اب آج سے چھٹے کا لفظ زبان پر نہ لاؤں گا آزاد کی صورت سے نفرت ہوگئی مگر پردیس کا واسطہ ہے ورنہ بتا دیتا شان خدا۔ دیس میں ہوتے تو کیا کرتے دو چار اور پڑ جاتیں جب برات دُلہن کے مکان پر پہنچی تو خواجہ صاحب نے باجے والوں کو ڈپٹنا شروع کیا۔ زور۔ زور۔ زور۔ زور۔ بہت زور۔ زور باجا بجاؤ۔ ارے زور زور سے بجاؤ باجا اور تاشے والے کہاں چلے گئے اُن کو بلاؤ۔ ارے میاں روشن چوکی کہاں ہے میاں خوجی کے بوتے ہیں یا نہیں یا وحشت خدا خیر کرے۔

خوجی: یارو یہ کیا حماقت ہے شہنائی والے کو بلاؤ۔

راوی: حاضر ہوتے ہیں سب حاضر ہوتے ہیں گھبرائیے نہیں۔

خوجی: ارے یہ خاص بردار کہاں ہیں۔ آتشباز کدھر چھپ رہے۔

راوی: دیمک چاٹ گئی آتشبازی میں گندھک بہت تھی شہزادی نے منع کر دیا کہ یہ آتشبازی یہاں نہ چھوڑی جائے۔

خوجی: چرخیاں لاؤ۔ رنگ برنگ کی چرخیاں لاؤ۔

راوی : عقل چرخ ہوئی کیا شان خدا۔

خوجی : انار کہاں ہے ہزارہ لاؤ ۔ بڑے بڑے انار داغ دو۔

راوی : ایک انار وصد بیمار۔

خوجی : یہ آرائش کیا ہوئی۔ تخت کدھر چلے گئے۔

راوی : لُٹ گئے انتظام خراب تھا۔ اسے پھٹکار۔

خوجی : سب ہیں عمدہ قسم کے انار کون بنائے ہیں۔

راوی : جی حضور دم چور حضور ہی نے تو کمہاروں کو حکم دیا تھا۔

اس انتظام کے بعد خواجہ صاحب اس ایرانی کے ہاں گئے اور کہا کہ ایک خط فارسی میں لکھا ہے سُنیئے۔

ایرانی : فرمائیے فرمائیے۔ ضرور سُنوں گا۔

خواجہ صاحب یوں فرمانے لگے۔ وھو ہذا۔

سید السادات سید معین الدین محمد سفاہت لائی متعالی سلام و دُعا از جنبش عمانِ شوق ولا متوجہ صراط مستقیم کعبہ وصدق وصفا و منہج قویم حریم اجتباء و اصطفاء عنی جناب مقدس و مآب معلی مخدوم اعظم و مصص افخم بکمال علوم الادا بال حلال غوامض المسائل مجمع البحرین من انتظام الدین والدنیا۔ مطلع السعدین فی زمانہ التناد الاولے والاخرے رافع و سادۃ السیادت صاحب الافاضت والا فادت ذوا للسانین والبیانین امام الحرمین مکیس المترب مظہر المثال مجمع الشرقین تذکرۃ اکابر سلف ابوالمکارم معین الدین اشرف ادام اللہ افضالہ علی المستفیضین ساختہ مکشوف ضمیر الہام پذیر کہ منہل فیض الٰہی و سنبل اشیا کماہی است میگرداند کہ ہرچند دیدہ نادیدہ بمشاہدہ دیدار گرامی اقتباس انوار سعادت نکردہ اما گوش ہوش و کاخ صماخ از صیت طنطنہ جلائل صفات عالیہ کہ نہایت مرتبہ جامعیت انسان کامل ہماں تواند بود مملو و مشحو نست و زبان بذکر محامد اوصاف و نشر مکارم اخلاق کہ سرمایہ التذاذ قلوب ارواح و پیرایہ افتخار انفس و آفاق تواند شد مسرور و محظوظ الحمد للہ علیٰ وجود افتخر الزمان بوجود واہتر الکون بشرف در آوردہ شرح حالات و تفصیل کمالات انسان سابقاً و لاحقاً بکرات مذکور مجلس اقدس اعلیٰ حضرت شاہنشاہی خلد ملکہ کہ محفوف بعلم و ادب و حکمت است شدہ و بسبب التیام موروثی کہ اُستاد البشر و العقل الحادی عشر قدس سرہ بایں دودمان والا ثابت است کمال وضوح دارد توجہ عالی بورود فیض مور والیشان در پایہ سریر سردر ہر وجہ اکمل و اتم ظاہر است کہ مطالب در ظہور ایں

ارجمند موانع قوی خواہد بود اگر جمعیت آباد سواد اعظم ہندوستان از میا امن عدالت و برکات جود و رافت بحدیست کہ قوافل آمال ہفت اقلیم اینجا باز میکشاید و سفاین امانی از ہفت اقلیم در اینجا زمام سے سپارند۔

ہے عیش روزگاری خوش بگذران کہ دانش

سرتا بیا مجسم لطف است و مہربانی

ہندوستان بدورش مستانہ جلوہ دارد

چوں موسم بہاراں طاؤس بوستانی

برکام دل مبارک برکام جان گوارا

دہرے بکام بخشی شاہی بہ کامرانی

حصول قواعت خوانی نہایست امید کہ رفع موانع بطریق ایمن شود و سبیل احسن صورت بندد و استدعا آنکہ تا ہنگام ملاقات قدسی مضاہات ایں محب خیر خواہ مالکہ بموجب الاذن تعشق قبل العین احیاناً در بساط محبت شطرنج غائبانہ می بازد و بمفاوضات مخنوقہ الاقاضات منت بر جان نہند۔

ایرانی کو یہ خط سُنایا تو وہ دنگ ہو گیا۔ بڑی تعریف کی اور کہا آپ لکھتے اچھا ہیں مگر بولنے کا کم ربط ہے۔ خواجہ صاحب اکڑ گئے فرمایا نہیں ربط تو کم نہیں ہے مگر میں عمداً ٹھیٹھ فارسی نہیں بولتا۔ اگر بولوں تو بجز آپ زبان دانوں کے اور کوئی نہ سمجھے۔ پھر اس سے کیا فائدہ۔

ایرانی : کیا ہندوستان میں شادی اسی طرح پر ہوتی ہے۔

خوجی : جی ہاں۔ یہی قاعدہ ہے۔ یہاں ہاتھی کہا۔ تامدان پالکی نالکی ہوادار کہا۔ خاص بردار کہاں جھنڈی بردار کہاں یہ سب یہاں کہاں سے آئیں سناٹا۔ پتا ہی نہیں ہے۔ مگر یہاں کا حسن ہم کو پسند آگیا۔

ایرانی : کبھی آپ فوج میں بھرتی ہوئے تھے یا نہیں۔

خوجی : (مُسکرا کر) ہونہہ! کبھی کی ایک ہی کہی۔ سُبحان اللہ۔ عمر بھر کیا کیا گلے والی پلٹن کا رسالدار رہا کمیدان رہا۔ چکلے داریاں کیں نظامتیں کیں بادشاہی میں جو چین ہم نے کیا وہ کسی کو نصیب کہاں ہوا۔ مگر اب البتہ مصیبت پڑی ہے۔

ایرانی : آپ وہاں سے کیوں بھاگ آئے کیا شریک دعوت نہ ہو جیے گا۔ الضرام تو آپ کے

تعلق تھا اور اب آپ کو کوئی نہیں پوچھتا۔

خوجی: جی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں تھکا بہت تھا۔ اگر تھکا نہ ہوتا تو جاتا۔ اگر گیا تو پھر کام میں جوتا جاؤں گا۔

راوی: بجا ارشاد ہوا۔ یہ نہیں کہتے کہ پیچھے گئے تھے۔

خوجی: ہم مبارک باد کے وقت جائیں گے۔ اور اپنے اشعار سنائیں گے۔

دعا تازہ کردند۔ برجان او　　بمانا دیزدان نگہبانِ او

مباد از نام تو گیتی تہی　　زاختر بجاں تو بادا بہی

مبیناد چشمِ فلک برتو تیز　　سر دشمنت باد بر خاک ریز

زنام تو نامِ دلیری بلند　　بمانی باقبال خودار جمند

زشاہ وز بیداد کردند یاد　　بتو بیں او ہر یکے لب کشاد

وزاں سمت شوریدن مردماں

بشاہ و وزیر و سپاہ گراں

ایرانی سیدھا آدمی تھا ان کی بڑی توصیف کی اور دل میں سوچا کہ یہ شخص بڑا فارسی داں ہے۔

ایرانی نے خوجی سے پوچھا کہ آپ اپنے وطن کابل سے ہندوستان کب گئے۔ خوجی بولے حضرت ہم اُس زمانے میں صغیر سن تھے کوئی آٹھ دس برس کا سن ہوگا مگر جناب والد علامہ دہر تھے۔ جس دن اُن کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی شہنشاہ اکبر رُو دیے۔

شہنشاہِ جہاں رادر وفاتش دیدہ پُر نم شد

سکندر را اشکِ حسرت ریخت کافلاطونِ زعالم شد

راوی: بجا۔ کیا ابوالفضل حضور کے والد ماجد تھے یہ کہیے۔ نئی بات سننے میں آئی خیر۔ اب تک یہ کہاں معلوم تھا۔ یہ تو اب معلوم ہوا۔

ایرانی: ہم بھی آپ کے کابل کی سیر کر چکے ہیں۔ کابل اور قندھار اور غزنیں کی لڑائی دیکھے ہوئے ہیں۔

خوجی: اکبر خاں نے غزنیں پر کیونکر قبضہ کر لیا۔ بچہ طور غزنیں گرفت۔ ایرانی نے یوں بیان کیا جوں سپہدار۔ لشکر خود بموجب عہد و پیمان کہ با افاغنہ نمودہ بود کابل را گذاشت و روانہ ہندوستان

شد در اثنائے راہ بہ قصبۂ گلد جک بوقتِ برف باری فوج تباہ شد۔

بیک چشم برہم زدن شد تباہ — چہ تاج وچہ تخت وچہ گنج وسپاہ
جہاں را ہمیں است رسم کہن — کہ آورد بر روئے ہر انجمن
بشاہ وگدا و بنا مرد و مرد — نیارد بکس ہیچ افسوس کرد
گہی میفرازد بہ تخت و کلاہ — گہی می نشاند بخاکِ سیاہ

یکی را برآرد بھروی و زور
دگر را ز تخت اندر آرد بگور

القصہ قدرے فوجِ او کہ قلعۂ جلال آباد استقامت داشت تباہ نشد۔ اگر ماں بہ شہدا ز غنیم نگاشت کہ ترا از حالِ ہلاکی وزیر و بربادی لشکر اطلاع شدہ باشد۔

خوجی: اس بحرِ طویل سے کیا واسطہ ازیں خرافات چہ سود دید کہ بگفتی بگو۔ چہ سود دید۔ ہر ہمہ میداند کہ خدا کسی را بد بخت۔

یکے را بہ گردوں برآرد بلند — بفرد بزرگی کند ارجمند
دگر را ز گردوں در آرد بخاک — دلش را بغم دار داندوہناک
یکی را چو فنر زند می پرورد — یکی را ز خنجر جگر پرورد
بہ بخشد گہے کشور و مال و گنج — گہے میدہد زحمت و درد و رنج
گہہ از بند و زندان برآرد بہ تخت — بفیروزی و شوکت و فر و بخت

یکے را چناں خوار سازد بہ تن
برہنہ بود مردہ اش از کفن

اب دس بجے کا وقت ہوا مگر خوجی اُٹھ ہی بیٹھے تھے۔ آزاد کی دلی خواہش تھی کہ خواجہ صاحب اس وقت تشریف نہ لائیں تو بہتر ہے مگر پولینڈ کی شہزادی نے کہلا بھیجا کہ خوجی کو ضرور بلاؤ۔ اُن کے بغیر لطف نہیں۔ ابھی تک آزاد اور شہزادی علاحدہ علاحدہ تھے اُن کو اُن سے کام۔ اُن کو ان سے سروکار۔ ایک خادمہ سے آزاد نے حالات پوشیدہ طور پر دریافت کیے۔

خادمہ: اس وقت مشاطہ سنوار رہی ہیں۔

آزاد: (اپنے دل میں) جوبن قابلِ دید ہوگا۔ بھلا مس کلیرسا اِس وقت کہاں ہوں گی یہاں ہیں۔

خادمہ : جی ہاں ہیں۔ دو تین شہزادیاں اور آئی ہیں۔

آزاد : اور مس میڈا بھی ہوں گی۔

خادمہ : ہاں ہیں تو وہ بھی مگر اُداس اور رنجیدہ ہیں۔

آزاد : (اپنے دل میں) ہوا ہی چاہیں۔

رقیباز آتش عشقش مَنِ مہجور می سوزم
نمی سوزی تو از نزدیک و مَنِ از دور می سوزم

رقابت بڑی چیز ہے خدا نہ کرے کوئی کسی کا رقیب ہو۔

خادمہ : حضور جس وقت جمال مبین دیکھیں گے پھڑک جائیں گے۔

اگر دیدی رُخ آن حور پیکر
خلیلِ بُت شکن میگشت آذر

آزاد : مس میڈا افسوس کرتی تھیں۔ افسوس کی بات کیا ہے۔ ہمیں تعجب ہوا۔ شادی میں غم۔ کجا۔

خادمہ : نہیں۔ افسوس نہیں کرتی تھیں۔ مگر اُداس سی ہیں۔

راوی : ہوا ہی چاہیں۔ اُداس ہونے کی تو بات ہی ہے۔

آزاد : ہاں کوئی سبب ہوگا۔ تمہاری شہزادی خوب نکھری ہیں ستم کا جوبن ہوگا۔

راوی : تھوڑی دیر میں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

اتنے میں شہزادی نے ایک خادمہ پھر بھیجی۔ اور کہلا بھیجا کہ خوجی نہ ہوں گے تو ہم بُرا مان جائیں گے۔ آزاد نے کہا مجھے اُس مردود کے نام سے نفرت ہے۔ کہہ دینا کہ مہربانی کر کے مجھے معاف کریں۔ میں ان کو نہ بلاؤں گا وہ اس قابل نہیں ہے۔

خادمہ : اب اس وقت اُن کی بات کو فوراً مان لو۔

آزاد : ہم کیوں کر مان لیں اور جو کہیں ہم مان لیں یہ بات ہم ہرگز نہیں مان سکتے۔ ہاتھ جوڑ کر ہماری طرف سے عرض کر دو۔ خادمہ چلی گئی۔ اُس نے جا کے کہا۔ حضور اُنھوں نے ہاتھ جوڑے ہیں، اور کہا ہے کہ اس بارہ میں ہمیں معاف کیجیے۔ وہ تو اُس وقت سرمایۂ نازبینی تھیں۔ اپنے حُسن پر مغرور ہو کر کہا۔ جا کے کہو کہ ابھی ابھی خوجی کو بلائیں۔

جس وقت اُس زہرہ جبیں خادمہ نے آن کر کہا کہ خداوند آپ ناحق بات بڑھاتے ہیں۔ خوجی

جہاں کہیں ہوں وہاں سے بُلوا لیجیے۔ آزاد کو کمال رنج ہوا۔ سوچے کہ دو بار آدمی آچکا۔ اب اگر فرمایش کے خلاف کہا تو طبع نازک کو سخت ناگوار گذرے گا۔ مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ اچھا۔ بُلواتا ہوں۔ دو آدمیوں کو بھیجا کہ جا کے خوجی کو بُلا لاؤ۔ دونوں روانہ ہوئے مگر خوجی کا پتا ہی نہیں ملتا۔ ایک ایک سے پوچھتے ہیں۔ کوئی بتاتا ہی نہیں۔ آخر کار ایک آدمی نے کہا کہ خوجی کی آواز آئی یہ خوجی کے سوا اور کسی کی آواز نہیں ہو سکتی۔ دونوں آدمی ٹھہر گئے یہ سُنا کہ خواجہ صاحب بہادر ایرانی صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اُس وقت یہ اشعار اُن کی زبان پر تھے۔

چنان بر تنش آمد آن پہلوان جو شیری کہ بر گو سفندِ جوان
شگافے زد از دشنہ بر سینہ اَش کہ افتاد بیرون ز دل کینہ اَش
بیک دم حصار تنش شد تہی ہمہ خاک شد سروری و مہی

ببیں گردشِ چرخِ دوّار را
کہ از جان کشد ہمچو سردار را

ان میں سے ایک شخص نے کہا۔ جناب خوجی صاحب آداب عرض ہے۔ خواجہ صاحب نے چونک کر معاً جواب دیا خوجی کی دُم میں نمدا اور بڑا سا رسّا۔ خوجی ہے کون نامعقول ہم عظمت وحشمت نشان جنابِ والاخطاب مولانا حکیم مفتی قاضی محمد خواجہ بدیع الزمان صاحب بہادر بدیع ہیں۔ کہنے لگے خوجی۔

آدمی: آپ اِس سے بڑھ کر سہی مگر اب چلیے گا یا نہیں۔

خوجی: ہمیں کیا غرض ہے۔ ہم ایک آزاد منش قلندر ہیں۔

از ند ہم مپرس نہ مومن نہ کافرم
من رسم ایں و یار ندانم مُسافرم

معقول مذہب اور مومن اور کافر سے کیا واسطہ۔ اور رسم راہ سے کیا غرض ذکر کچھ۔ شعر کچھ۔ اے لعنت خدا۔ یہ کہہ کر خواجہ صاحب پھر شعر پڑھنے لگے۔

امیر و سپاہش ز میدان جنگ برون رانده زان بحر خون چون نہنگ
شنا کرده در موج دریائے خون بیک روز میدان برآمد برون
بب لائے کوہے برآمد فراز برآسود از چالش ترکتاز

بیک کوه دیگر سپاه فرنگ
برآسود از کین و پرخاش و جنگ

آدمی : حضور آزاد پاشا نے بُلایا ہے اور تاکید کردی ہے۔

خوجی : کون آزاد۔ ہٹاؤ بھی۔ ہم کسی کو کیا جانتے ہیں۔

آدمی : بہت ضروری کام ہے۔ نہایت ضروری کام ہے۔

خوجی : کہو تو ضروری کام کیا ہے۔

آدمی : حضور شہزادی نے کہلا بھیجا ہے کہ خواجہ صاحب ضرور ہوں ورنہ مجھے بڑا بُرا معلوم ہوگا۔ تو آزاد پاشا نے ہمیں دوڑا دیا۔ ہم دوڑے سر ٹُحکم ہے کہ جس طرح ہو لاؤ۔ ہاتھ جوڑو۔ پاؤں پڑو سجدہ کرو۔ مگر لاؤ اور ضرور لاؤ۔

خوجی : ہاں (اکڑ کر) بات تیرے کی اب آیا راہ پر۔

پھنس کے دل مت دُہل سمجھ لیں گے

زلف کرتی ہے بل سمجھ لیں گے

ہم سپاہی ہیں او کمان ابرو

تیغ پکڑے اجل سمجھ لیں گے

فہمیدہ خواہد شداب دیکھو۔ کیا دل لگی بازی ہے۔ اچھا ہم ایک خط لکھے دیتے ہیں۔ یہ لیتے جاؤ۔

خط سُننے کے قابل ہے۔

کم فہم کم عقل کم تمیز آڑو گزیر سلم العزیزیہ بو دعائے کہ مافوق آن بناشد۔ اینکہ آدم رسید بندہ دید۔ واہ دید نہ شیند۔ مرا طلبید، مارا عید وقت سعید۔ الّا یاران کید (اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ لیجیے لفظ (کید) کے قبل (ی) لاؤ تو کیدی ہوا۔ سُبحان اللہ سُبحان اللہ۔ بشنو آزاد یارِ من دلدارِ من وغمخوار من وغمگسارِ من تو کہ باشی کہ بر خاطرِ عاطرِ من بگذری۔ ع

تو کہ باشی کہ بریں خاطر عاطر بگذری

مگر مرا از گفتنہ تو ہیچ انکارے نہ۔ الّا کنوں شما نوبت بزدو کوب میکنی ومن راز دو کوب نا تحمل نہ۔

کند تحمل بسیار مرد را بے قدر

کمان چو تن بکشیدن دہد کبادہ شود

راقم آثم حقیر فقیر پر تقصیر خاکپائے فصحا خواجہ بدیعا خراسانی محقق فارسی عفی اللہ عنہ۔

آدمیوں نے یہ رقعہ حضرت آزاد کو دیا۔ پڑھتے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑے اور جواب یوں لکھا۔

جناب خواجہ صاحب قبلہ زمین دوز ہو کر۔ آداب بجا لاتا ہوں۔
احسان ہوا۔ الحمدللہ کہ حضور نے خاکسار کو قابل سمجھا۔ مہربانی کرکے آیئے۔ اور واسطے خدا کے ضرور تشریف لایئے ورنہ میری عزت جاتی ہے۔ خادم آزاد۔

خواجہ صاحب نے خط پڑھا۔ اور افیم کی پینک میں جھومتے ہوئے تشریف لائے۔

حالاتِ جنگ

اب سُنیئے کہ شب کو گیارہ بجے خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ رخصت کیے گئے۔ اور ادھر پولینڈ کی شہزادی کے ہاں جشن جمشیدی شروع ہوا۔ شہزادی نے حکم دے دیا تھا کہ بجز عورتوں کے اور کوئی نہ ہو۔ مردوں میں صرف آزاد اور عورتیں سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ سن کی نہ ہوں۔ خواجہ صاحب کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ مگر قہر درویش بر جانِ درویش سمجھے تھے کہ پولینڈ کی شہزادی نے جو اِس تاکید سے بُلایا ہے تو کوئی نتیجہ ضرور نکلے گا مگر ٹائیں ٹائیں فش۔ آزاد سے پوچھا کیوں بھائی صاحب یا تو اس گرماگرمی سے ہم کو بُلوایا تھا یا اس سرد مہری سے پیش آئیں۔ آزاد نے کہا آپ کس کھیت کی مولی ہیں آپ کس شمار قطار میں ہیں۔ شانِ خدا آپ بھی اتنے ہوتے۔ معشوق ہے جب جو بات سوجھی فوراً حکم دیا کہ ابھی ابھی اِس کی تعمیل ہو۔ خواجہ صاحب جبراً و قہراً پھرے اور وہاں سے چلے ایرانی کے مکان پر آئے۔ غُل مچایا کھولو کھولو۔ ارے بھئی دروازہ کھولو مگر صدائے برنخاست۔ آخرکار سوچے کہ فارسی میں پکاریں تو شاید کوئی جواب دے۔ بہ آواز بلند کہا۔ بکشا۔ بکشا۔ دروازہ بکشا۔ بابائے من بدیع تو باغلامت یا برادر مہربانت اگر بیدار چشم باشد برخیز و بکشا۔ بہت ہی خوب۔ جواب ندارد۔ بہت جھلائے۔ مگر کریں کیا۔ دروازے پر کئی بار ہاتھ مارا اور یہ شعر زبان پر لائے۔

بکشا سرِ مشک ودر گلویم درده
سائل بکفم قدح ندارم ساقی

بڑی دیر تک چلایا کیے مگر آواز نہ آئی۔ تو کوسنے لگے۔ مر گئے سب مر گئے۔ اِس مکان کے

سب کے سب انتا غفیل ہو گئے۔ سانپ سونگھ گیا۔ چھت گر پڑی۔ زمین کے پیوند ہو گئے۔ خدا کرے صبح کو ایک بھی زندہ نہ نکلے۔ چلاتے چلاتے گلا پھٹ گیا۔ اور کسی نے جواب ہی نہ دیا۔ اور من بدیع کو ہلکان کر دیا۔ اچھا گیدی نہ بول خراٹے لیتا جاتا ہے کل ہماری قرولی ہے اور تمہاری گردن۔ بھلا بے گیدی بھلا۔ یہ ہانک لگا کر خواجہ بدیع الزمان بدیع اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے لگے۔ سوچتے تھے کہ یا خدا اس وقت جاؤں تو کہاں جاؤں آزاد نے تو نکال ہی دیا۔ شہزادی نے اِس شدومد سے بُلایا اور ٹائیں ٹائیں فش۔ اچھا خیر۔

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو
از شما یک تن نہ شد اسرار جو

بکتے بکتے تھک گیا مگر کسی نے بات کا جواب نہ دیا۔ اچھا نہیں تو نہ سہی ہم بھی خاموش ہو رہے۔ مگر یہ خموشی عین گویائی ہے۔ آخری بار میگویم برادر کہ مرا ازیں کار بسیار تردد و ملال لاحق حالِ تفکر مآل است۔

جب کسی نے جواب نہ دیا تو خواجہ صاحب بدرجۂ مجبوری وہاں سے روانہ ہوئے اور قسم کھائی کہ اب ہرگز ہرگز اِن حضرات کے پاس نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا۔ راہ میں ایک شخص ملا۔ اُس سے اُنھوں نے کہا بھائی ہم اس وقت کمال پریشانی میں ہیں۔ اگر سونے بھر کی جگہ دو تو پڑ رہیں۔ اور رات کو آرام کرکے صبح گجردم نفرؔو ہوں۔ اُس شخص نے کہا ضرور چلیے۔ مکان حاضر ہے۔ بندہ بے تکلف ہے۔ یہ شخص خوجی کو برات کا انتظام کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ جب خواجہ صاحب اُس کے مکان پر گئے اور لیٹے تو باہم مکالمہ ہونے لگا۔

خوجی: کہو بھئی۔ کچھ جنگ کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔

جواب: جی ہاں۔ خوب لڑائی ہو رہی ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایشیا میں ہماری فتح کا ڈنکا بج رہا ہے۔ کرّم دھم کرّم دھم یورپ میں ابھی مساوی ہیں۔

خوجی: ہاں! آپ تو روسیوں کا جنبہ کرتے ہوں گے۔

حُبِّ الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بملکِ مصر شاہی می کرد
میگفت گدا بودنِ کنعان خوشتر

حُب الوطنی کا کیا کہنا۔ حُب الوطن سے بڑھ کر اور کیا ہے ہم کو دیکھیے کہ کس طرح سے یہاں آئے، اور لطف یہ کہ جان بکف ہیں اور ہر دم ہتھیلی پر جان لیے رہتے ہیں۔

راجہ صاحب گو دشمن عقل مدعی خرد گو کہیے نامعقول خبط الحواس تھے مگر ایک ہزان میں یہ تھا کہ مذہب کے بڑے پابند تھے۔ ہوٹل میں کھانا حرام سمجھتے تھے چاہے جان جائے ہوٹل میں ہرگز ہرگز نہ کھائیں گے۔ اس میں ہر چہ باداباد۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ترکوں کے حال سُنوں۔ کئی بار مختلف امور جنگ دریافت کیے۔ روسی نے یوں بیان کیا جنرل گرکو نے بڑا کار نمایاں کیا۔ فتح پر فتح حاصل کی۔ بڑا نامی سپہ سالار ہے۔ سوچینا اور اجنیا کے درمیان میں جو کوہ عظیم واقع ہے۔ اس کو گرکو نے چٹکیوں میں فتح کر لیا۔ تُرک تاب مقاومت نہ لائے۔ مگر جب تک لڑے خوب لڑے یہ فتح حاصل کر کے جنرل گرکو جنوب کی جانب روانہ ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی فوج کے چار حصّے کیے۔ جانب راست کا کالم بسر کردگی جنرل ولہیل مناف 7 جنوری کو سوفیا سے روانہ ہوا۔ حکم دیا گیا کہ مقام سیما کوداکی طرف روانہ ہو۔ تاکہ اُس ترکی فوج کا تعاقب کرے جو مقام رودامر کی جانب بھاگی جاتی تھی۔ خاص کالم بسر کردگی کونٹ سویلاف تھا۔ وہ۔ 9۔ ماہ مذکور کو روانہ ہوا۔ جانب چپ ایک اور کالم تھا۔ یہ دریائے ٹپالیکا کے قریب رہا۔ چاکر پاشا کی نسبت خبر مشہور ہوئی کہ وہ اِس مقام کے قریب تھے اور کوشش بلیغ کر رہے ہیں کہ معاً دریا عبور کر کے بھاگ جائیں۔ ایک کالم نے اُن کا بھی تعاقب کیا۔ الغرض ترک چوطرفہ سے محصور ہو گئے۔

خوجی: آپ بھی بس عجب باتیں کرتے ہیں۔ یہ کس نے کہا آپ سے؟

روسی: مشہور ہے۔ خبر تمام ملک میں شہرت ہو گئی ہے۔ اخباروں میں چھپ گیا ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں یہ خبر مشہور نہ ہوئی ہو۔ ترکوں کی نسبت ـــــ بھی اکثر باتیں سننے میں آئی ہیں۔

خوجی: جی۔ بجا ارشاد ہوا۔ وہ کون گیدی ہے۔ نامعقول جو ایسی باتیں سُنے۔ اچھا آزاد کو جانے دو۔ سمجھا جائے گا۔ فہمیدہ خواہد شد مگر آزاد کے تعلق تو اب دو باتیں ہو گئیں۔ ایک تو شادی کرتے پھرنا اور دوسرے جنگ۔ دونوں کا حاصل ہونا محال ہے۔

ہے عشق خط بھی الفتِ زلفِ دوتا کے ساتھ
کیوں کر بچے گی جان بلا ہے بلا کے ساتھ
طرز نگہ نے چھین لیے قدسیوں کے دل
آنکھیں جو اُن کی اُٹھ گئیں دست دعا کے ساتھ

ہوکر شہید ناز یہ پایا ہے مرتبہ
خلق خدا ہے آج ترے مبتلا کے ساتھ

روسی: بس جناب جنرل گرکو نے حکم دیا کہ لشکر فوراً روانہ ہو۔ چھ دن کی خوراک ساتھ کر دی اور کہہ دیا کہ اور رسد بھی جلد بھیجی جائے گی۔ توپخانے کے ساتھ دُھرے دُھرے گھوڑے دیے، اور گولہ گولی بارود دوچند سے کسی قدر زیادہ۔ ترکوں کو جب اس کی خبر ہوئی اور انھوں نے دیکھا کہ روسی فوج کسی جانب سے جوق جوق چلی آتی ہے۔ فوراً کمیٹی کی کہ اب کیا تدبیر لازم ہے۔ معاً رائے قرار پائی کہ بھاگ چلیں۔ لہٰذا سوچنا انھوں نے چھوڑ دیا۔ باقر پاشا اس فوج کے ہمراہ تھے ان کی جرأت اور واقفیت امورِ جنگ سے ترکوں کا بال تک بیکا نہ ہوا اور تلوہ بچ نکلی۔ روسیوں نے بڑے استقلال سے ترکوں کا تعاقب کیا۔ 7 جنوری کو جنرل ولیل مناف تھوڑی ہی دور بڑھے تھے کہ انھوں نے ترکوں کے ایک حصّہ کو دوربین کے ذریعے سے دیکھا۔ قبل اس کے کہ جنگ ہو۔ قسطنطنیہ سے ٹیلی گرام آیا کہ روسیوں سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ اور بالفعل مہلت جنگ حاصل کی گئی ہے۔ 8 کی صبح کو ترکی فوج کا پتا بھی نہ تھا۔ جنرل گرکو سوفیا سے آگے بڑھے مگر برف باری نے دور تک جانے نہ دیا۔ مجبور ہو کر واپس آئے۔ سمجھے تھے کہ ایک موضع میں جو وہاں سے قریب تھا پناہ پائیں گے مگر اس موقع میں بعد خرابی بصرہ داخل ہوئے تو دیکھا کہ سپاہیوں نے اس گاؤں کو جلا دیا تھا۔ اب غور کیجیے کہ فوج تھکی ماندی شل۔ سپاہی بھوکے پیاسے ہلکانِ حیران۔ بہزار دقت ایک موضع ملا تو وہ بھی اس وقت ایک چھپر تک نہ تھا۔ کمال پریشانی ہوئی۔ ناچار اُسی موضع میں بسیرا لیا۔ اوپر سے برف پڑ رہی تھی اور یہ بیچارے ٹھٹھر ٹھٹھرا کر بسر کرتے تھے۔ صبح کو جو اُٹھے تو کوئی کھنگر بنا ہوا۔ کوئی اینٹھا ہوا۔ کوئی تختہ بن گیا تھا۔ آب و ہوا کئی دن تک خراب تھی۔ اگر جنگ ہوتی اور غنیم مقابلہ کرتا تو آب و ہوا کی سختی کو سپاہی بالکل نہ مانتے۔ مگر جنگ تو ہوئی نہ تھی۔ صرف تعاقب کرتے تھے۔ لہٰذا موسم کی سختی کی برداشت کرنا محال تھا۔ ۱۰ تاریخ کو جنرل گوکو شہر اچٹمیں میں داخل ہوئے یہاں پھر خبر ہوئی کہ مہلت جنگ دونوں سلطنتوں نے منظور کر لی۔ میجرز کی جو سلیمان پاشا کے ایڈیکانگ تھے انھوں نے بیان کیا کہ مہلت جنگ دونوں سلطنتوں نے منظور کر لی۔ مہلتِ جنگ کو طرفین نے منظور کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے بیان کیا کہ وہ اپنے چند آدمیوں کے ساتھ نشان جنگ لے کر جاتے تھے اور وہ نشان جنگ ایسا نہ تھا جیسا میدان کارزار میں ہوتا ہے مگر دن کو جنرل گورکر کے پاس گرینڈ ڈیوک آف نکولس کا حکم آیا کہ تم آگے بڑھتے جاؤ مہلت کا مطلق خیال نہ کرو۔

خوجی: غلط کہا۔ بالکل غلط کہا۔ کیا نکولس کو معلوم نہ تھا کہ مہلت ہو گئی ہے۔ بیشک معلوم ہو گیا ہو گا۔

روسی: ہاں۔ اُن پر یہ جُرم ترکوں نے قائم کیا ہے کہ نکولس نے ازراہِ دغا حکم دیا کہ آگے بڑھتے جاؤ۔ ایسا اُن کو لازم نہ تھا۔

خوجی: ہائے افسوس۔ آزاد نہ ہوتے خیر اب سہی۔ انشا اللہ۔

روسی: ترکوں میں اندرونی انتظام اچھا نہیں ہے۔ اور افسر سب خراب ہیں۔ ہاں اس کی جرأت اور جوانمردی اور جیالے پن کا کیا کہنا۔

خوجی: جری کرّار۔ جرّار۔ مردِ شیر دل شہ زور۔

روسی: اور ہمارے ملک کے سپاہی کیا کچھ کم ہیں۔ وہ بھی جری اور طاقتور اور جنگ آزما ہیں اور مستقل مزاج۔

خوجی نے کہا ہم اس قسم کی خبریں نہیں سُنا چاہتے ہیں۔ روسی اپنی ہی گاتا تھا۔ لہٰذا خواجہ بدیع الزمان نے بات ٹالنے کے لیے اشعار پڑھنا شروع کیے۔

کیا صدموں نے ہم کو ناتوان آہستہ آہستہ
بہارِ باغ پر چھائی خزان آہستہ آہستہ

کسی کی ابرو و مژگان نے ہم کو مار ڈالا ہے
چلی شمشیر رُک رُک کر سنان آہستہ آہستہ

نہ پایا آج تک ظالم نے مجھ سا صبر میں کامل
ہوتے سب عاشقوں کے امتحان آہستہ آہستہ

ابھی جلدی ہے کیا صیاد فصلِ گل تو آنے دے
سُنا دوں گا تجھے سب داستان آہستہ آہستہ

کہیں گھبرا نہ جانا رعب سے اُس شوخ کے قاصد
ہمارا حال سب کرنا بیان آہستہ آہستہ

روسی: کوہ بلقن کے قریب ۱۸، جنوری کو روسیوں نے فتح عظیم حاصل کی۔ اُسی وقت لندن میں پارلیمنٹ کے ممبر بحث کرتے لگے، کہ روس اور ترکی کی نسبت کس قسم کی کارروائی کی جائے۔ حضور ملکہ معظمہ نے یہ اسپیچ دی۔

مابدولت واقبال کو یہ بات مناسب معلوم ہوئی کہ آپ کو وقت مقررہ و معمول کے قبل بلائیں اور پارلیمنٹ منعقد کریں۔ تاکہ آپ کو اس کوشش بلیغ سے آگاہ کریں جو مابدولت واقبال نے جنگ روم وروس کے اختتام کی نسبت کی یہ وہ جنگ ہے جو مشرقی یورپ اور ملک ارمن کو ستیاناس کیے ڈالتی تھی۔ مابدولت کی خواہش ہے کہ پارلیمنٹ سے اس امر اہم میں صلاح لیں اور اعانت پائیں۔ اب تک دونوں سلطنتوں میں سے ایک نے بھی ان قواعد کے خلاف نہیں کیا۔ جس کے سبب سے ہم نے اس معاملہ جنگ میں دخل نہیں دیا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ان دونوں کی دلی خواہش ہے کہ ہمارے خیالات حکومت کی تعظیم کریں اور ہم کو اس امر کا موقع نہ دیں کہ ہم کسی کی طرف سے بولیں یا کسی کا جانبہ کریں۔ جب تک اس قسم کی کارروائی ہوگی۔ مابدولت اسی طرح خاموش رہیں گے لیکن یہ البتہ کہنا لازم آیا۔

اگر بوجہ من الوجوہ کوئی بات ایسی ہوئی جس سے ہم کو مجبور ہو کر ساکت نہ رہنا پڑے تو ہوشیاری ضرور کی جائے گی۔ لیکن پر ظاہر ہے کہ اس ضروری احتیاط کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا پارلیمنٹ کو بتانا چاہیے کہ کن کن تدبیروں اور کس ذریعے سے روپیہ اس کام کے لیے مل سکتا ہے۔

خوجی: خدا کرے حضور ملکہ معظمہ ابدالآباد تک زندہ رہیں، آمین لاکھوں کروڑوں روپیہ ہندوستان سے ترکی میں کھینچ آیا۔ نوابوں اور امیروں نے لکھو لکھا روپیہ دیا۔ اور سرکار عظمت مدار نے سب قبول کیا یعنی اجازت دی کہ جس کا جی چاہے زر کثیر بھیجے کچھ پروا نہیں۔

الٰہی در جہاں باشی باقبال
جواں بخت و جواں دولت جواں سال

روسی: ہاں۔ برٹش گورنمنٹ نے اس میں اعتراض نہیں کیا۔

خوجی: وجہ۔ آخر وجہ کیا؟ شہزادوں اور شہنشاہ اور خسروانِ ثریا جاہ کو ایسا ہی لازم ہے۔ تاقیام زمین و زمان و ابقائے آسمان روشنی شمس و ماہ سلامت باکرامت باد۔ آمین۔

ایں دعا از من و از خلق خدا آمین باد

روسی: یونان بھی ترکی کے خلاف ہے بلغارستان بھی۔ آرمانیا بھی مانٹی نیگرو بھی۔ کوئی مقام ایسا نہیں جو خلاف نہ ہو۔

خوجی: اجی سب سے سمجھ لیں گے۔ ہاتھ پاؤں ہی دشمن ہو گئے ہیں پھر اس کو کوئی کیا کرے۔ مگر ہمتِ مرداں مددِ خدا۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے آپ* کیا

روسی نے کہا۔ حضرت سنیے کسی زمانے میں ترکی کی تمام عالم میں دھاک تھی۔ ہوا بندھی تھی۔ جھنڈے گڑے تھے۔ یورپ میں ترکی کا راج ایشیا میں ترکی کی عملداری اور افریقہ تک میں ترکی کے نشان کے پھریرے اُڑتے تھے۔ قسطنطنیہ سے شہر کا قبضہ اور اتنی بڑی کچھری فوج اسی عظمت کے لیے دلیل قاطع تھی۔ بحر میڈی ٹیرینیں میں ترکی کا بھی نشان تھا۔ ایشیائے کوچک اور ملکِ ارمن کے قبضے سے اس کی عظمت اور بھی دو بالا ہو گئی ہے۔ کیوں کہ دریائے دجلہ و فرات پر اس کا قبضہ تھا۔ نہر سوئیز کے معاملات میں اس کو دخل تھا۔ کیونکہ ملک مصر اس کی ماتحتی میں تھا۔ یوروپین سلطنتوں نے سوچا کہ اگر ایسی سلطنت رفیعہ روسیوں کے قبضۂ اقتدار میں آگئی تو بہت بُرا ہوگا۔ کیوں کہ ترکی ایسی سلطنت نہیں ہے، جس سے حملے کا خوف ہے۔ انھیں وجوہ سے معاملاتِ ترکی کی طرف کل سلاطین یوروپ انتہا سے زیادہ توجہ کرتے تھے۔ سب سے زیادہ توجہ انگلستان اور روس اور آسٹریا اور جرمنی کو ہے۔

خوجی: اجی ہم کو اس بحرِ طویل سے کیا سروکار۔ ہم ان اُمور کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آخر روس ہوتا کون ہے۔ ہمیں اپنے گھر پر اختیار ہے۔ نیکی بدی سیاہ سفید سب ہمارے پاس ہے۔

روسی: فرانس کے ایک مدبر نے کہا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ترکی پر کس قوم کو قابض رہنا چاہیے تو میں کہوں۔ ترکوں کو۔ دنیا کے پردے پر ایسی کوئی قوم نہیں ہے جو ترکوں کے سوا اس قابل ہو کر روم پر حکمراں رہے۔ یوروپ کی کسی قوم کو اُس سے ضرر کا احتمال نہ ہو یا بس۔

خوجی: اگر وہ مدبر زندہ ہے تو روس کا شہنشاہ ہو جائے اور اگر مر گیا ہے تو بہشت بریں میں جگہ پائے آمین آمین ثم آمین۔

روسی: آپ اس سے بہت خوش ہوئے۔ خیر شکر ہے کہ آپ خوش تو ہوئے۔ تمہاری تشفی کے لیے

---

* نسخہ: خوب۔

یہی کافی ہے. مگر وہ ترک نہ تھا فرانسیسی تھا۔

خوجی : آپ بھی بھیا کے تاؤ ہی رہے. کہتے ہیں کہ اگر مر گیا ہے تو بہشت میں جگہ پائے۔ اگر ترک ہوتا تو یہ دعا کیوں مانگتے. وہ تو ضرور بالضرور بہشت میں جگہ پاتا. پھر دعا یعنی چہ تحصیل حاصل بات ساری اتنی ہے۔

روسی : اس جنگ میں قابل غور یہ بات ہے کہ روس کو ذرا بھی خوف نہیں. ترکی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ روس کے حملوں کو روکے بس. مگر روس کو کسی حملے کے روکنے کی ضرورت نہیں. وہ خود حملہ آور ہے. اگر روس ہارا تو نام گیا. اور ترک ہارے تو ملک گیا. آزاد بھی گئے. ہمیں اس کا خیال ہے. جس سے آپ کو رنج ہوگا۔

خوجی : کچھ پروا نہیں. خدا ہمارا دوست ہے. باقی بس۔

بماناد آن دوست کو دوستان را
غذائے دل و راحتِ جان فرستد

آپ ہم سے کل باتیں کہہ دیا کیجیے. دیکھیں جنگ ـــــ کا انجام کیا ہوتا ہے. جنگ دو سر دارد۔

روسی : ہمارا بال بیکا نہ ہوگا. آپ دیکھ لیں گے۔

خوجی : تو قبلہ ہمارا ملک بھی نہ جاتے گا اور یوں فتح اور شکست اتفاق پر منحصر ہے۔

روسی : یہ خوب بات ہے. شاید ایسا ہی ہو۔

خوجی : دل نے چوٹ کھائی ہے. واللہ کسی مصرف کے نہ رہے۔

ہزاروں درد حسرت یاس وارمان دل میں مہمان ہیں
کہاں اُٹھیں، کہاں بیٹھیں، ذرا سا ہے یہ کاشانہ

اس وقت آزاد دھما چوکڑی مچاتے ہوں گے. دماغ ہی نہیں ملتا ہوگا۔

شہزادہ خلد مکان اور مجاور کی داستان حیرت بیان

کشتۂ عشق فتنہ بنیادم
نو اسیر کمند بیدادم

شہزادۂ خلد مکان عرش آشیاں کے مرقدِ منور و مطہر پر صبح شام میلا جما رہتا تھا۔ پھولوں کی چادروں کا اس قدر انبار ہوا تھا کہ قبر بالکل ڈھک گئی۔ اور نازک نازک پھولوں کی بھینی بھینی مہک کو بادِ صبا کے جھونکے ناز کے ساتھ دور تک لے جاتے تھے۔ مشام روح کو طبلۂ عطار بناتے تھے یوں تو صبح سے شام اور شام سے صبح تک کوسوں اور منزلوں سے لوگ آتے تھے۔ چادریں چڑھاتے تھے مگر دو گھڑی دن رہے سے پریوں کا جمگھٹا قابلِ دید تھا۔ بلکہ دید تھا نہ شنید تھا۔ جسے دیکھو سمن اندام ندرو خرام۔ نورِ مصباح مجالسِ خوبی شمعِ بزمِ محبوبی شعلہ رُو، تند خو۔

حُسن میں ایک ایک ماہ جبین

غیرتِ لُعبتان لندن و چین

طرفہ جوبن عجیب عالم ہے جتنی تعریف کیجیے کم ہے

آنکھ میں سحر کی لگاوٹ ہے

بات میں قہر کی بناوٹ ہے

شہزادۂ مبرور برد اللہ مضجعہ کے اعزہ و اقربا نے مرقدِ شاہِ فردوس آرامگاہ کے مجاور سے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی مرد یا عورت چادر چڑھانے آئے تو اُس کو نہ روکنا۔ اگر وہ ازراہِ محبت والفت چادر چڑھائے۔ منشا یہ ہو کہ شہزادے کی قبر پھولوں کی بو باس سے مہکتی رہے تو مضائقہ ندارد چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ بعض آدمی اس پر معترض بھی ہوئے۔ شہر میں چھوٹے بڑے پڑھے بے پڑھے رعایا پرایا حکام عوام ہندو مسلمان سب کی دلی خواہش تھی کہ مجاور کی زبانی وہ حالات سُنیں۔ مجاور نے سب کو ایک روز جمع کر کے قلعے کی درگاہ فلک پائگاہ میں وہ حال سنایا۔ سامعین کی یہ کیفیت تھی کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ جگہ کے لیے گرتے تھے۔ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ بڑی دقت سے درگاہ کے اندر جانے کا موقع ملتا تھا۔ مجاور سے کہا گیا کہ بیچوں بیچ میں آ کے تقریر کرو ورنہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ ساری داستان اور کوشش بیکار جائے گی۔ الغرض مجاور ایک اونچی میز پر کھڑا ہو کر زمزمہ سنج بیان ہوا۔ یہ صاحب معمر آدمی تھے مگر سُرخ و سفید۔ کسی زمانے میں مرثیہ گوئی کا شوق تھا۔ عرصہ تک ذاکرِ حسین رہے حدیث خوانی بھی کی۔ مگر آنکھوں سے کم سوجھتا تھا۔ اعزہ و اقربا سب نے انتقال کیا۔ تنِ تنہا رہ گئے۔ لہٰذا درگاہ میں آ بیٹھے۔ جوانی میں بڑے صالح متقی اور پرہیز گار تھے۔ مگر عالم پیری میں وہ بات نہ رہی گو گوشہ نشینی اختیار کی مگر طمع بڑھ گئی یہ صاحب بڑے جہاندیدہ تھے۔ ع

سفر کردہ دریاؔ ہاموں بسے

اور ظاہر ہے کہ۔ ع

جہاندیدہ بسیار گوید دروغ

داستان یوں بیان کی۔

از یار وفا کہ دید تا من بینم　　راحت زجفا کہ دید تا من بینم
تو عمر منی و بے وفائی چہ کنم
از عمر وفا کہ دید تا من بینم

مجاور کی داستان

ایہا السامعین۔ شہزادۂ سکندر قدر مرزا ہمایوں فر کی وفات سے جو رنج والم ساری دنیا کو ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔ مہر نیم روز کی طرح روشن ہے۔ اس سانحہ جگر دوز و نادیدنی اور واقعۂ حسرت خیز و ناشنیدنی سے ہر فرد بشر کا دل نخچیر پرمحن ہے۔ واللہ اعلم ان کو کیا سوجھی کہ دنیا سے اُٹھ گئے۔ صحبت دیرینہ کا مطلق خیال نہ کیا اور چل بسے۔ یہ جوانی اور ایسی موت! ہائے۔ ہائے!

نمیدانم ترا در دل چہ افتاد
کہ دادی صحبت دیرینہ برباد

مگر شکر خدا ہزار شکر خدا کہ بہشت بریں اور خلدِ علیین میں اُنھوں نے جگہ پائی۔ اور اس کا ثبوت بھی میرے پاس ہے۔ اور ایسا ثبوت جس کو سب تسلیم کریں۔

حضرات سامعین! ذرا کان لگا کے سُنیے۔ جس روز ہمارے پیارے شہزادے کا وصال ہوا اور آپ سب اُن کو دفنا کر چلے گئے۔ اُس شب کو عجب تماشا دیکھنے میں آیا۔ جو فلک پیر نے باوصف پیرانہ سالی آج تک نہ دیکھا ہوگا اور کانوں نے کبھی نہ سُنا ہوگا۔ دس بجے کے وقت میں آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا تربت کے قریب گیا۔ اور کھڑا ہو کر حسرت کے ساتھ انسان کی زندگی چند روزہ پر غور کرنے لگا۔ کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے یہ کیا ستم ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت ہم چلتے پھرتے بولتے چالتے ہیں۔ اور دم کے دم میں بالکل سناٹا ہے۔ وہی ہاتھ، وہی

پاؤں، وہی ناک آنکھ مُنہ، وہی جسم، وہی شکل، وہی صورت مگر گفتگو ندارد۔ حس و حرکت غتر ربود۔ ایک دن بھر لاش کو رکھے تو سڑ جائے یا خدا وہ کون شے تھی جو اس جسم خاکی سے نکل گئی۔ پتا ہی نہیں ملتا کوئی لاکھ میدان فکر میں عقل کے گھوڑے دوڑائے ممکن ہی نہیں کہ پتا پائے۔ کوئی ہزار بحر خوض میں غوطے کھائے۔ کیا مجال جو دُرِ مقصد ہاتھ آئے موت خدا نے اپنے ہاتھ رکھی ہے۔ باقی کُل اختیارات انسان کو دے دیے خیر سوچتے سوچتے میرا دل بھر آیا۔ دل میں غور کرنے لگا کہ یا خدا یہ اُس شہزادے کی تربت عنبرین ہے۔ جو اس ملک میں اپنی آپ ہی نظیر تھا۔ اس جوانی کے عالم میں موت نے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ افسوس دفعۃً ایک آواز کان میں آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ طوفان آنے والا ہے۔ ہوا اس زنّاٹے سے چلی کہ ہوش و حواس بلا اجازت و استفسار رخصت ہو گئے۔ ففرو۔ اور ویسے ہی ہوا پر ایک کھٹولا سن سے زمین پر آ رہا۔ کھٹولا کیا نور کا مسکن تھا۔ آنکھ جھپک گئی۔ اِس مسکن نور سے دو پریاں اُتریں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اُس صانع کے صدقے جس نے یہ نورانی صورتیں بنائیں۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ آفتاب کو انسان شاید بلا خیرگی نگاہ دیکھ سکے۔ مگر اُن پریوں پر نظر پڑتے ہی آنکھوں میں چکا چوند کا عالم ہوتا تھا۔

چسان خورشید خوانم روی اورا
کہ مصحف را غلط خواندن گناہ است

اٹھلاتی ہوئی چلیں تو بے اختیار زبان سے نکلا (اس خرام ناز کے صدقے اِس رفتار مستانہ کے قربان) کبک کی کیا حقیقت ہے۔ اے توبہ۔

از رشکِ خرامیدن تو سرو چو طاؤس
در ہر قدمی تازہ کنند ماتم پارا

میں تو محو ہو گیا۔ کھٹولا از خود اُڑا اور اُڑ کے آسمان پر ہو رہا۔ اور وہ دونوں پریاں خنداں و فرحاں مست و رقصاں قبر کے پاس گئیں۔ ایک پر کالۂ آتش نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھایا اور دفعۃً ابر گھر آیا۔ قبلہ رُخ سے گھٹا جھومتی اُٹھی مگر لطف یہ کہ روشنی کم نہیں ہوئی بوتل سے ایک گلاس میں شراب ناب لنڈھائی اور دونوں نے مل کر پی۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے ستم کا سامنا تھا۔ کمر لچکا لچکا کر اِس مستی کے ساتھ ناچتی تھیں کہ ہر قدم پر مجھ ایسے پارسا کا دل پامالِ خرام ناز ہوتا تھا۔ دونوں اُبلی پڑتی تھیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اگر قبرستان میں ناچیں تو مردے قبریں چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوں۔

طورِ رقص تو کم از دورِ قیامت نبود
بنشین یک نفس اے فتنۂ دوران بنشین

ایک نے جھک کر قبر کو چوم لیا دوسری نے اٹھا کر پھول کی چادر کو بوسہ دیا۔ اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس شوخی اور چمک دمک کے ساتھ ناچنے لگیں کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ بے اختیار دل میں آئی کہ دونوں کے قدم لوں۔ سجدہ کروں۔ پاؤں پڑوں اور کچھ نہ ہو تو بلائیں ہی لوں۔ ایسا ناچ دیکھا نہ سُنا۔ دونوں سبز پوش۔ دونوں ناز آفریں۔ دونوں سمن پوش۔ دونوں طرزِ رقص میں طاق۔ دونوں دلربائی میں شہرۂ آفاق۔ انا البرق کہتی ہوئی ناچتی تھیں۔

زرقصِ سبز پوشی مردہ زیرِ خاک می رقصد
تو گوئی در لباسِ خضر پیدا شد مسیحائی

سر تا قدم نور۔ آفتِ جان۔ اب سُنیئے کہ ابر گھر آیا اور شراب کے نشے اور مستی نے رنگ جمایا۔

گھر کے آیا ہے ابرِ دریا بار
بھینی بھینی سی پڑ رہی ہے پھوہار
قہقہہ زن کسی طرف ہیں چکور
کہیں کویل کہیں پپیہے کا شور
برق سے تھی عیاں تجلی طور
سارا جنگل ہے نور سے معمور
ایک ہنگامہ ہے ہزاروں میں
مرغ زرّین ہے مرغزاروں میں
ہے معطّر گلوں سے سارا بن
صورتِ وادی تتا روختن
ابر میں کوندتی ہے یوں بجلی
مسی آلودہ لب پہ جیسے ہنسی

یہ صاحب اس قدر کہہ چکے تھے کہ ایک انگریزی خواں نوجوان نے اُٹھ کر قطع کلام کیا۔ کہا۔ کیوں حضرت یہ کویل اور پپیہے اور چکور اور مرغ زرین اور ہزار یہ سب جانور اس قلعے

یں کہاں سے آگئے۔ اور بن کہاں ہے۔ جو معطر ہو گیا یہ تو بستی ہے۔ شہر سے آدھ کوس کے فاصلہ پر بن نہیں ہوا کرتا۔ تو مسکرا کر جواب کیا دیتے ہیں۔ یا حضرت یہ کون تعجب کی بات ہے حکم کی دیر تھی۔ ہوا پر اشیا آتی تھیں۔ ہاتھ بڑھایا اور شراب ناب، بادۂ گلگوں کی بوتل موجود۔ ذرا یوں اشارہ کیا مرغان خوش رنگ و خوش منقار و خوش نوا چوطرفہ اڑنے لگے۔ وہاں تو اشارے میں کام ہوتے تھے۔ کہہ چکا کہ اڑن کھٹولا آیا۔ پریاں اتریں اور پھر بھی پوچھتے ہیں کہ بن کیسا، مرغ کہاں سے آیا۔ یہ قلعہ اس وقت بالکل بن معلوم ہوتا تھا۔ ابھی سنتے تو جاتیے ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ بس حضرت آپ ہی آپ قبر پر شامیانہ نصب ہو گیا اور ہوا سے بین کی آواز آنے لگی۔ اس آواز پر وہ دونوں پریاں اور بھی مست ہو کر ناچیں اور ایک پری نے قبر کے پاس جا کر باآواز بلند کہا۔

کیوں میاں کس طرف سے آنا ہوا
کتنا اس جوگ کو زمانا ہوا
کس پری رو کو پیار کرتے ہو
کس مسیحا نفس پہ مرتے ہو
نام سے اپنے مطلع کیجیے
کچھ نسب کا ہمیں نشان دیجیے
کس قدر دلفریب ہے جوبن
دیکھنا کتنی تیکھی ہے چتون

ان اشعار کے جواب میں قبر سے بھی آواز آئی۔

اُف بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں کچھ عرض نہیں کر سکتا اس سوز و گداز سے آواز آئی کہ دل ہی جانتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی شخص کسی چاہ عمیق سے بول رہا ہے جواب یہ تھا۔

خسرو ملک کوہ و ہاموں ہوں
رشک فرہاد و فخر مجنوں ہوں
سینہ بریز زخم صورت گل
خستہ دل مثل خاطر بلبل

داغِ وحشت ہے دِل پہ دیوانہ
سوزِ غم ہے مگر یہ پروانہ
محوِ آشفتگی ہے گیسو پر
عاشق افسردگی ہے ابرو پر
خشکی ہونٹوں پہ ہے نثار اگر
زردی رنگ ہے فدا رُخ پر
لختِ دل ہر مژہ پہ شیفتہ ہے
خونِ دِل آنکھوں پر فریفتہ ہے

دوسری پری نے قبر معبز کو چُوم کر پُوچھا۔ اس خاکساری اور شہریاری کو کیوں چھوڑا۔ اب چلو بہشت کی ہوا کھاؤ۔ اور شراب طہور لنڈھاؤ۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ شعر سُنا۔ قبر سے آواز آئی۔

گو کہ سامان خاکساری ہیں
پر سب آثار شہریاری ہیں

پری: آخر اپنا نام لقب حسب نسب کچھ تو بتاو مردِ خُدا۔

آواز: نام عاشق۔ لقب مجنوں۔ حسب نسب یعنی چہ سُنا نہیں۔ ع

کہ دریں راہ فلا ابنِ فلاں چیزے نیست

پری: (چادر گل چوم کر) اے آدم زاد تجھ کو اُسی کی رُوح کا واسطہ جس کے سبب سے تو مقتول ہوا سچ بتا کون ہے۔

اس کے جواب میں قبر سے یہ آواز آئی۔

کیا کہیں تم سے کون ہیں کیا ہیں بُلبلِ گُلشنِ تمنا ہیں
وطن آوارہ خانماں برباد نامراد و ستم کش و ناشاد
کشتۂ عشق فتنہ بنیادم
نو اسیرِ کمند بیدادم
آہ فرہادِ کوہِ غربت ہوں قیسِ صحرائے درد و محنت ہوں
جھوٹ کہتا نہیں مَیں سچ جانو کافرِ عشق ہوں مُسلمانو
کشتۂ عشق فتنہ بنیادم نو اسیرِ کمند بیدادم

ہدفِ ناوکِ ملامت ہوں کشتۂ خنجرِ شماتت ہوں
کچھ نہ پوچھو حقیقتِ غم کیش کچھ نہ پوچھو فسانۂ دلِ ریش

کشتۂ عشقِ فتنہ بنیادم
نو اسیرِ کمندِ بیدادم

وہ پریاں کان لگا کر سنا کیں، جب یہ اشعار سُن چکیں، تو ایک بلائے جسم وجان و دِل نے کہا خُدارا اپنی سرگذشت مفصّل طور پر سناؤ تو اس کے جواب میں یہ آواز آئی۔

سرگذشتِ بلاکشان نہ سُنو نہ سُنو میری داستان نہ سُنو
فقرہ فقرہ ہے اِس کا پُر تاثیر ہو نجاؤ کہیں بلا میں اسیر

کشتۂ عشقِ فتنہ بنیادم
نو اسیرِ کمندِ بیدادم

پری : اب جو ہوا وہ تو ہوا۔ اب تو خوش و خرم اور شاد ہو کر نام و نسب بتاؤ۔

آواز : نام مجنوں۔ نسب سے کیا واسطہ، خاکساری۔

کیا بتائیں تمھیں نسب اپنا
اب تو ناشاد ہے لقب اپنا

پری : اب خاکساری ہی پسند ہے۔ ذرا جھگڑا ابھی دِکھاؤ گے۔ اگر حکم ہو تو قبر کھُل جائے۔ ابھی چٹکیوں میں قبر صاف ہوجاتی ہے۔

آواز : آپ اپنی قدرت اپنے پاس رہنے دیں۔ ہم خود فضلِ خدا سے اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ ابھی چاہوں تو قبر سے اس طرح نکل جاؤں جیسے بُوئے گُل چمن سے۔

کب سبکدوش رہے قیدی زندانِ وطن
بُوئے گُل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

اتنے میں پھر اُڑن کھٹولا آیا اور دس پریاں اُتریں۔ پہلے تو رقص ہوا۔ اس کے بعد حافظ شیراز کی غزلیں گائی گئیں۔ ایک پری نے چنگ ذٗرک کر یہ شعر لسان الغیب شیراز کا گایا۔

ہما ے اوجِ سعادت بدام ما افتد
اگر ترا گذرے بر مقامِ ما افتد

اس کے بعد اُن بان سے اُن پریوں نے جامِ زمرّدیں میں بادۂ گُل گوں، راحِ رُوح کیمیائے

فتوح ے کر پی اور یہ شعر زبان پر لائیں۔

حُباب وار براندازم از نشاط کُلاہ

اگر ز روئے تو عکسے بجام ما اُفتد

قبر سے آواز آئی۔ (ایک نگار پری) رُخسار کے پیار نے مجھے کہیں کا نہ رکھا مگر افتاد۔ دِل کی دِل ہی میں رہی۔ بُزدل، بُودا، وحشی آدمی میرا رقیب تھا، ورنہ اگر کوئی جری یا سپاہی آدمی ہوتا تو کہہ کے آتا۔ للکار کے آتا اور مجھ پر ہرگز ہرگز ہاتھ نہ چلاتا۔ مگر خیر مضیٰ ما مضیٰ۔ ایک پری نے جواب دیا۔ عشق کا یہ نتیجہ ہوتا ہی ہے۔ فرہاد کو دیکھو کس مشقت سے جوئے شیر لایا۔ مگر بدی یوں ہی تھی، کہ اُسی تیشے سے جان جائے۔ جس سے پہاڑ کاٹا تھا۔ لیلیٰ و مجنوں کا کیا انجام ہوا۔ وامق کی جان پر کیسی گذری۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجان

شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

معلوم ہوتا ہے یہ شعر شہزادے کو بہت پسند آیا کیونکہ کئی بار پڑھا مکرر سہ کرر یہی شعر زبان پر لائے۔ اتنے میں خدا جانے کس چیز کا عکس پڑا کہ سبز سبز روشنی ہوئی، اور ایک پری نے بادۂ گلگوں و رنگیں کا جام زمردیں دستِ نگارین میں لے کر قبر کے سرہانے جائے آہستہ سے کہا۔

ساغرے نوش کن و جُرعہ براَفلاک فشاں

تا بچند از غمِ ایام جگر خوں باشی

اس کے بعد سلامی سر ہوئی۔ قبر سے دنادن کی آوازیں آئیں، اور دفعتہً قبر سے تڑاق کی آواز آئی۔ اور معاً لاش باہر۔ اُف۔

حضرات سامعین! راوی خاکسار کے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا، لاش کے نکلتے ہی اس طرح کی خوشبو آئی۔ اس طرح کی خوشبو آئی۔ کہ میں کیا عرض کروں، عطر و عنبر اور مشک اُذفر کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ معاً پریوں نے قدم لیے، بس حضرت باور کیجیے کہ لاش کھڑی ہو گئی۔ اور کفن گر پڑا۔ شہزادۂ سکندر رفر رشک سنجر کا جوبن اس وقت قابل دید تھا۔ اتنے میں لالہ جوکھو رام محرر قلعہ آ گئے۔

اس تقریر کے بعد لالہ جوکھو رام صاحب عینک اور دھوتی سنبھالتے ہوئے اُٹھے۔ کہا۔ (صاحبان یہ خبریں جو کہیں خیلے راست براست ہیں۔ ہم نے بھی پریاں حوری اور لاش مردہ کا زندہ دیکھی۔ ہم اس وقت حین تھے۔ اس فقرے پر ناظرین کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اور لالہ صاحب سخت خفیف

ہوئے۔ گو ہنسی کا موقع نہ تھا۔ مگر اُن کی تقریر نے سب کو ہنسا دیا۔ مجاور نے کہا حضرات سامعین لالہ صاحب بڑے پارسا اور متقی آدمی ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جھوٹ نہیں بولتے۔ اس وقت روشنی دیکھ کر قبر کے قریب آئے، تو یہ تماشا غریب دیکھا۔ اور مرزا ہمایوں فر سے باتیں بھی ہوئیں۔

لالہ: عقل حیران ہے۔

لوگ: بیشک۔ بلاشبہ۔ لاریب۔ حیرت سی حیرت ہے ___ افسوس۔ صد افسوس۔

شاید جی اُٹھیں دنیا بامید قائم

جاناں مرا بمن بیارید این مردہ تنم باو سپارید
چوں بوسہ زند برین لبانم
ار زندہ شوم عجب مدارید

مجاور نے کہا حضرات سامعین۔ شہزادہ فرخ نہاد کو ایک پری نے بصد شان دلبری جام شراب دیا اور شہزادے بہادر نے اس جام کو چوم کر پی لیا۔ تو سبحان اللہ سبحان اللہ۔ عالم ہی اور تھا۔

اب سُنیئے کہ بارہ پریاں اُس پری رُخسار کے اِرد گرد کھڑی چُہل کر رہی تھیں۔ اور عاشقی کا دم بھر رہی تھیں۔ دفعتہً ایک طشت زمرد یں پُر از دُرِ خوش آب، و گوہر نایاب، ہوا کے ذریعے سے شہزادہ بہادر پر نثار ہونے لگا۔ قبر کے قریب ایک نہر ظاہر ہوئی۔ شہزادہ نے اُس نہر پاک سے ایک چلو پانی لے کر پیا اور جھومتے ہوئے فرطِ طرب سے یہ شعر پڑھا۔

بہت ہے غم گیتی شراب کم کیا ہے
غُلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

ایک پری نے شہزادے سے سپہر آرا بیگم کی نِسبت گفتگو کی۔

پری: تعجب ہے کہ لاش پر معشوق آئے، اور عاشق کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ ہم نے خود دیکھا کہ وہ تفتہ جگر، عین حالتِ بے قراری و مُصیبت میں مو پریشان و گریاں لاش کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ خوف ہوا کہ مبادا ڈر جائے ابھی کچھ سن نہیں ہے۔ ہائے اس کی بے کسی پر رحم آتا ہے۔

کیسی بے بس ہے بیماری، مگر آپ کیسے عاشق زار بنے ہیں مرنے سے کہیں عشق چلا جاتا ہے۔

مرے تو نشۂ الفت اُتر گیا عاشق
وہ کیا شراب تھی جس کا خمار تک نہ رہا

شہزادہ: جانِ من۔ یہ تو کچھ خدا کی عنایت تھی کہ اس وقت میں باتیں کر رہا ہوں ورنہ کجا مردہ اور کجا تقریر۔ سپہر آرا کا نام لے کر تم نے میرے دل میں برچھی کی نوک چبھو دی (آبدیدہ ہو کر) ہائے یہ کیا ہوا۔ مجھے اپنے مرنے کا رنج نہیں ہے مگر حسرت ہے تو یہ ہے کہ سپہر آرا بیماری کڑھتی ہوگی عجب نہیں ہے کہ رو رو کے جان دے۔

فنا ہے سب کے لیے مجھ پہ کچھ نہیں موقوف
یہ رشک ہے کہ اکیلا رہے گا تو باقی

پری: اب بھی معاملہ روبراہ آسکتا ہے۔ اب بھی سب چیزیں ممکن ہیں۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اب بھی دونوں کی ملاقات ممکن ہے۔

شہزادہ: ہاں۔ کیا مجال۔ ایسا کہیں ہو سکتا ہے۔

پری: آدم زاد کی یہ مجال ہے کہ ہمارے سامنے زبان کھولے۔ جو بات تمہارے نزدیک محال ہے اُس کو ہم ممکن کر دکھاتے ہیں۔

جاناں مرا بمن بسپارید　　این مردہ تنم باو سپارید
چوں بوسہ زند بریں لبانم
ار زندہ شوم عجب مدارید

شہزادہ: یہ کہانیاں ہم نے بہت سُنی ہیں۔ ایسی ایسی باتوں کا عقیدہ ہی نہیں کہیں مردے بھی زندہ ہوا کرتے ہیں۔

پری: جی۔ ہاں۔ جی ہاں۔ مردے زندہ ہوا کرتے ہیں۔

شہزادہ: اچھا ہمیں زندہ کر دو تو جانیں۔ ورنہ کیا۔

پری: سپہر آرا بیگمؔ جھمکڑے کے ساتھ قبر پر آئیں اور بوسہ لیں۔ دیکھیں تو تم کیوں کر زندہ نہیں ہو جاتے ہو۔ تجربے کے بغیر تو ہم کبھی کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ کیا مجال۔

شہزادہ: یقین نہیں آتا کہ مردہ قبر سے اُٹھ بیٹھے۔

پری: اِس یقین کے صدقے۔ صریح قبر سے اُٹھ بیٹھے ہو اور اب بھی یقین نہیں آتا۔ اب

اس سے زیادہ تصدیق کیا چاہتے ہو۔

جانان مرا بمن بسپارید　　　این مردہ تنم باو سپارید

چوں بوسہ زند بریں لبانم

ار زندہ شوم عجب مدارید

شہزادہ: آپ بار بار یہی رباعی پڑھتی ہیں مگر میں سوچتا ہوں کہ ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا۔ یہ بات حسب عادت وحسب عقل دونوں طرح محال ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔

پری: بہت سی باتیں دنیا میں حسب عادت و حسب عقل محال ہیں۔ مگر اکثر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ عورت کے پیٹ سے سانپ کا بچہ پیدا ہونا محال ہے یا نہیں؟ مگر پچاسوں جگہ پیدا ہوا ہے۔ اونچی چھت سے پتھر گر کر بچ جانا، سخت حیرت کی بات ہے یا نہیں؟ مگر صدہا ہزارہا آدمی بچ گئے ہیں۔

شہزادہ: اچھا خیر۔ سپہر آرا پیاری آن کے قبر کو چومیں۔ اگر خواستہ خدا ہے شاید قبر سے ہم اٹھ کھڑے ہوں۔ مگر باسی کڑھی میں اُبال آتا ہے آپ کو اختیار ہے۔

اتنے میں دوسری پری نے آن کر ان کو چوم لیا اور گلے لگا کر کہا شہزادے ہم نے برسوں سے تمہارے عشق کا تیر دل پر کھایا ہے، اور تیری ایک ایک ادا پر دل آیا ہے مگر اب تک موقع نہ ملا اور اب تم ہو اور ہم ہیں۔ مگر آدم زاد خبردار بے وفائی نہ کرنا۔ ورنہ برا ہو گا۔

شہزادہ: بے وفائی اور عشق اس کے کیا معنی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

پری: وہ بے وفا نکلی ورنہ جب لاش پر آئی تھی لازم تھا کہ اس کا بھی دم نکل جاتا۔ عاشق معشوق خالہ جی کا گھر نہیں ہے اور تمہارے لیے؟ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔

آپ بھی اب دل اور سے بہلائیں　　　تا وہ سن سن کے دل میں خار تو کھائیں

آپ معشوق کو ہیں کیا محتاج　　　پیر و مرشد خدا کے فضل سے آج

لاکھوں معشوق شہرہ آفاق　　　آپ کی اک نظر کے ہیں مشتاق

ہم نہ سمجھے تھے یوں کرے گی جفا

لے کے دل ہم سے ایسی دے گی جفا

شہزادے کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ سمجھے کہ یہ نگار قوس ابرو سپہر آرا۔ کے خلاف ہے اس سے اپنے درد دل کا علاج چاہنا امر فضول ہے اب وہ خار کھائیں یا نہ کھائیں ہم کو اس سے کیا

واسطہ۔ دل میں دعا مانگتے تھے کہ خدا کرے وہی آئے جو زندہ کرنے کا بیڑا اُٹھاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئی۔ کہا ہم ابوں فرآج کے تیسرے روز تک تو تم زندہ نہیں ہو سکتے۔ مگر اس کے بعد ایک مہینے تک جب کبھی سپہر آرا بیگم تمہاری قبر پر آن کر بوسہ لیں گی تم فوراً زندہ ہو جاؤ گے۔

جانانِ مرا بمن بیارید   ایں مردہ تنم باد سپارید

چوں بوسہ زند بریں لبانم

ارزندہ شوم عجب مدارید

مگر خوب بن ٹھن کے آئیں۔ دُلہن بنی ہوئی ہوں۔ سولہ سنگار۔

اک ذرا بن سنور کے آئیں وہ

سر سے پا تک نکھر کے آئیں وہ

شہزادے کا دل بھر آیا۔ دُلہن کا لفظ سُن کر اُن کو بے اختیار رونا آیا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر کہا یا خدا مجھ سے ایسا کون قصور سرزد ہوا تھا۔ جس کے جلد وہیں یہ سزا پائی کہ بعدِ مرگ بھی راحت نصیب نہ ہوئی۔ یہاں تو آسودگی پاتا۔ مگر پھر وہی دردِ دل ہے۔ پھر وہی عشق کی پہلی منزل ہے۔

عشق نے کی جنون کی پھر تقریب   چاک پر پیرہن کے دی ترغیب

دل سے پہلو تہی کی راحت نے   سوزشیں کیں جنونِ اُلفت نے

شعلے آہوں کے یہ بلند ہوتے   خالِ رُخ دانۂ سپند ہوئے

داغ گلدستہ نذر کو لایا   صبرِ رُخصت کے واسطے آیا

دل کو تڑپایا شوقِ وصلت نے

کی ترقی ملالِ فرقت نے

اب سُنیے کہ وہ سب پریاں مل کر شہزادے کے پاس آئیں اور قبر کے قریب ایک فرشِ مکلّف بچھا اُس پر بھی شامیانہ نصب ہوا، اور آپ ہی آپ گانے اور بین باجے کی آواز آنے لگی۔ اِدھر اُدھر پریاں اور بیچوں بیچ میں شہزادہ خلد مکان جنّت آشیاں۔

ساقیا تو اگر ہے دریا دل   ہم کو دکھلا دے آج اپنا دل

چاندنی رات کس بہار پہ ہے   نشّہ مے بھی اب اُتار پہ ہے

اتنے بھر بھر کے دے تو جامِ بلور　　دل سے دھو جائے میکشی کا غرور
سختیاں بحرِ مے کی جھیلیں گے　　بطِ مے کا شکار کھیلیں گے
قافِ خم کی پری جو پیار کرے
عیش کیا ہی یہ بادہ خوار کرے

رقص شروع ہوا۔ ایک ایک پری باری باری چمک دمک کے آتی تھی اور رقص ناز سے دل کو پایمال کرتی جاتی تھی۔ اِس کے بعد دور چلا عجب شراب تھی۔

مجاور نے اِس قدر بیان کیا تھا کہ لالہ صاحب نے قطع کلام کیا اور کہا (صاحبان) غلام فدوی نے بھی ایک کچی پی تھی مگر واہ کیا ہی تھی۔ ایسی دارو کبھی نہیں پی۔ جیسے ذائقہ۔ شراب الموسوم بہ سونفی۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ تعریف بھی کی تو سونفی کی۔ ماشا اللہ۔ اور (موسوم لی ایک ہی کہی) لوگوں نے پوچھا آپ کو نشہ معلوم ہوا تھا۔ فرمایا۔ ذراسی پیتے ہی نشہ چڑھ گیا اور میں غین ہوگیا۔ آنکھیں سرخا سرخ لال انگارا اور کل بھید کائنات کھُل گیا۔

راوی: دریں چہ شک۔ وہ تو چیز ہی ایسی ہے۔ (انگارا اور بھید کائنات)۔ واہ حضرت واہ۔

لالہ: چو آتشہ شراب سونفی بود۔ وخوب مزہ بود۔

راوی: اینٖ! اُردو بولتے بولتے اب فارسی بولنے لگے۔ للہ فارسی کے حال پر نظر عنایت رکھیے۔ فارسی بیچاری کی ٹانگ نہ توڑیے۔ آپ اُردو ہی بولیے اور خیر سے اُردو بھی ولندیزی ہے۔

تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پر داختی

ایک کام تو آپ نے خوب کیا اب دوسرے کی طرف مخاطب ہوتے۔

مجاور نے پھر سلسلۂ سخن جاری کیا اور اس طرح کہا۔ دو پریوں نے یہ غزل اس سوز وگداز اور خوش الحانی کے ساتھ گائی کہ ہم دونوں مست ہوگئے۔

فاش میگویم واز گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم
طائرِ گلشنِ قدسم چہ دہم شرحِ فراق
کہ دریں دامگہِ حادثہ چون افتادم

من ملکِ بودم و فردوسِ بریں جایم بود
آدم آورد دریں دیرِ خراب آبادم
سایۂ طوبیٰ و دلجوئیِ حور و لبِ حوض
بہوائے سرِ کوئے تو برفت از یادم

حضرات سامعین اس شعر پر شہزادۂ خلد آشیاں نے بڑا وجد کیا۔ اور فرمایش کی کہ پھر ب دفعہ پھر ایک بار۔

نیست بر لوحِ دلم جز الفِ قامتِ یار
چہ کنم حرفِ دگر یاد نداد اُستادم

یہ بھی حسبِ حال تھا۔

کوکبِ بختِ مرا ہیچ منجم نہ شناخت
یارب از مادرِ گیتی بچہ طالع زادم

مرزا ہمایوں فر کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ دل بے اختیار ہو گیا۔

تا شدم حلقہ بگوشِ درِ میخانۂ عشق
ہر دم آید غمی از نو بمبارک بادم

اُن پریوں نے وہ غزل ڈھونڈھ کے نکالی جس کا ایک ایک مصرعہ ان کے حسبِ حال تھا۔ اور جس کا ہر شعر اُن کو خون رُلاتا تھا۔ میری یہ کیفیت کہ چُپ چاپ کُل حالات دیکھتا ہوں مگر وہی ٹکٹک دیدم وم نکشیدم۔ اور لالہ جوکھورام کی یہ کیفیت تھی کہ تھر تھر تھر تھر کانپتے تھے۔

گر خورد خونِ دلم مردمکِ دیدہ رواست
کہ چرا دل بجگر گوشۂ مردم دادم

ہمایوں فر نے کہا خونِ دل بھی تو یہاں باقی نہیں رہا۔ یہاں نہ تو خدا کے فضل سے وہ درجہ حاصل ہوا ہے کہ دل ہی نہیں۔ خون کہاں سے آئے۔

پاک کُن چہرۂ حافظ بسرِ زلف باشک
ورنہ ایں سیل دمادم بکند بنیادم

اس غزل کے بعد ایک پری نے ہاتھ پھیلائے تو زرد رنگ کی کوئی شے ہاتھ آئی۔ گولی کے برابر تھی مگر اس قدر جھلکتی ہوئی کہ میں کیا عرض کروں اُس کو پری نے قبر پر دے ٹپکا تو فوارہ چھوٹنے لگا۔

اور اس طرح کی خوشبو آئی کہ میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ قبر کے چاروں کونوں پر ایک ایک فوارہ چھوٹنے لگا اور ایک فوارہ بیچ میں تھا۔ اب لطف دیکھیے کہ فوارہ سے صورتیں نمودار ہوئیں کیا بیان کروں بس میرا دل ہی مزے لے رہا ہے۔ ابھی تک ہم کو کسی پری نے نہیں دیکھا تھا لالہ صاحب نے کہا کہ بھائی جان اب بیٹھ جاؤ۔ بیٹھے تماشا دیکھیں۔ خیر صاحب یہ کیفیت ہوئی کہ پریوں میں باہم مذاق ہونے لگا۔ ہائے ہائے دل مسوس مسوس کے رہ گیا۔ اُہو ہو ہو۔ دل مزے لوٹ رہا ہے۔ اور روح وجد کرتی ہے کہ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ یہ پرستان بھی عجب مقام ہو گا۔

مرزا ہمایوں فر کو پھر ایک جام شراب دیا۔ مگر اس کا دل اس وقت بھر آیا تھا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ اب اس وقت مجھے معاف رکھیے۔

فتوے پیر مغان دارم و عہدیست قدیم
کہ حرامست مے آنرا کہ نہ یاراست و ندیم

پری نے کہا۔ غم غلط کرنے کے لیے شراب سے بہتر اور کون شے دنیا میں ہے۔ شراب پی اور غم بھاگا۔ ففرو۔

خشک شد بیخ طرب راہِ خرابات کجاست
تا دران آب و ہوا نشو و نمائی بکنم

ہمایوں فر نے دیکھا کہ اس وقت اور کوئی چارہ نہیں ہے طوعاً و کرہاً جام لیا اور بادۂ گلگوں پیا۔

بہت سہے غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

پریوں نے وعدہ کیا کہ ہم تم کو زندہ کر دیں گے مگر شرط یہ ہے کہ ایک مہینے کے اندر ہی اندر سپہر آرا بیگم وہی لباس عروسی زیب بر کر کے قبر پر آئیں اور تاج میں کلغی ضرور ہو۔ مرزا ہمایوں فر بہادر نے کہا کہ اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔ مگر یہ محال ہے اس پر پریوں نے پھر وہی رباعی پڑھی:

جانانِ مرا بمن بسپارید   ویں مردہ تنم باو سپارید
چوں بوسہ زند بریں لبانم
ارزندہ شوم عجب مدارید

شہزادہ: یہ تو مشہور بات ہے مگر شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ کے وقت کا تذکرہ ہے۔ میں نے بچشم خود مردے کو زندہ ہوتے آج تک نہیں دیکھا اور نہ اب کوئی اس بات کو باور کرتا ہے۔

پیری: ایک ایسا کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ انسان جان بلب ہو گیا مگر بچ نکلا۔ اعزہ واقربا رو رہے ہیں کہ اب نزع کا عالم ہے۔ زیست سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اطبائے حاذق نے جواب دے دیا۔ تجہیز و تکفین کی فکر ہونے لگی، اور پھر جی اُٹھا۔ بارہا ایسا ہوا ہے۔ اور اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ خاصے ہٹے کٹے بیٹھے ہیں۔ نہ کوئی عارضہ ہے نہ بیماری ہے۔ مگر ٹھوکر لگی اور چل بسے۔ بیٹھے بیٹھے جان تن سے نکل گئی۔ خدا کی خدائی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

کوئی فرد بشر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کہنہ بے چون کو سمجھ گیا۔ کوئی آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اسرار الٰہی سے واقف ہو گیا ہوں۔ کیا مجال۔ بڑے بڑے علما فضلا اور کملا اور حکما گذر گئے ہیں مگر یہ دعویٰ کسی نے نہیں کیا۔

توان در بلاغت بہ سحبان رسید
نہ در کنہِ بیچونِ سبحان رسید

پھر آپ کے دل پر اس بات کا نقش کیوں کر مرتسم ہو گیا کہ مردہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں ہے۔ شق القمر کیونکر ہو گیا۔ طوفان نوح کیوں کر آیا۔ یہ باتیں بھی تو بادی النظر میں حسبِ عادت و حسبِ عقل محال معلوم ہوتی ہیں۔ مگر چشم بینا اور گوش شنوا چاہیے۔ تب اِن اسرار الٰہی کو انسان سمجھ سکے۔ دل کی صفائی مقدم ہے۔ ما عرفناک حق معرفتک اور ما عبدناک حق عبادتک یاد ہے۔ پھر انسان ضعیف البنیان کس برتے پر دعویٰ ہمہ دانی کر سکتا ہے۔

بدہ ساقیا مے کہ تادم زنم	قلم بر سرِ ہر دو عالم زنم
سُبک باش در طلِ گرانم بدہ	دگر فاش نتوان نہانم بدہ
کہ این چرخ و این انجمِ آبنوس	بسے یاد دارد چو بہرام و طوس

جز ایں مرکز ہفت پرکار نیست　　　جز ایں ہفت پرکار پرکار نیست

بدہ ساقی آن آبِ آتش فشاں

ازاں پیش کزمن نیابی نشاں

یہ اشعار پڑھ کر پریوں نے کئی جام لنڈھائے۔ مرزا ہمایوں فر کے دل پر اس تقریر نے عجب اثر پیدا کیا۔ یقین واثق ہو گیا کہ سپہر آرا سے ضرور ملیں گے اور زندہ ہو جائیں گے۔ پریوں نے ان کو ہر پہلو سے سمجھایا اور ذہن نشین کر دیا۔ سامعین نے جو یہ تقریر سنی تو دنگ ہو گئے۔ اور دل میں سوچنے لگے کہ یا خدا یہ کیا اسرار نہاں ہے۔ نصف سے زیادہ کو شک کی جگہ یقین تھا کہ مرزا ہمایوں فر ضرور زندہ ہو جائیں گے۔ اگر سپہر آرا بیگم لباس عروسی زیب بر ہو کے آئیں اور قبر کو بوسہ دیں تو ممکن نہیں کہ شہزادہ بلند ارادہ زندہ نہ ہو جائے۔

مجاور سے ایک صاحب نے استادہ ہو کر پوچھا کیوں حضرت۔ اس کا ثبوت کیا ہے۔ اگر ثبوت دیجیے تو سبحان اللہ۔ سبحان اللہ مگر ثبوت آسان نہیں ہے۔ ہم نے آج تک ایسی بات نہیں سُنی۔ ایک اور صاحب نے اُن کا قطع کلام کیا اور کہا یہ خبر ہرگز غلط نہیں ہے۔ آپ انگریزی خواں لوگ دُنیا میں عقل کے سوا اور کسی شے کو نہیں مانتے۔ آپ کو چڑھ گئی ہے کہ جو کچھ ہے عقل ہی ہے مگر یہ آپ کو معلوم نہیں کہ عقل سے بھی بڑی کوئی شے ہے۔ آپ لوگ واقف ہی نہیں۔ اگر سپہر آرا قبر پر آئیں تو ممکن نہیں کہ ہمایوں فر زندہ نہ ہو جائیں۔

جانان مرا بمن بسپارید　　　دیں مردہ تنم باد سپارید

چوں بوسہ زند بریں لبانم

ار زندہ شوم عجب مدارید

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ صدہا آدمیوں نے اس تقریر کو یاد کر لیا۔ بعض کو شک تھا اور بعض اس کو بالکل لغو سمجھتے تھے۔

ذکرِ حرب

خواجہ بدیع الزمان صاحب وہاں سے آکر سوتے۔ صبح کو اُٹھے اور آزاد کی خیر و عافیت دریافت کرنے چلے۔ اثنائے راہ میں ایک مسافر سے ملاقات ہوئی۔

خوجی : لنگڑاتے کیوں چلتے ہو بھئی خیر تو ہے۔؟

مسافر : گولی لگی۔ میں میدان جنگ سے آتا ہوں۔

خوجی : ہاں یہ کہیے۔ کس مقام پر جنگ ہوئی تھی۔؟

مسافر : دریائے ڈینیوب عبور کر کے بڑی لڑائی ہوئی۔

خوجی : بھلا تمہارے نزدیک روسی غالب ہیں یا ترک۔؟

مسافر : روسیوں کے آدمی بہت کام آئے۔ مگر غلبہ ابھی کسی کو نہیں ہے۔ ترک بڑی جوانمردی سے لڑ رہے ہیں۔ افسر ابھی تک دونوں طرف خراب ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ترکی راشی ہیں اور روسی افسر راشی نہیں ہیں۔ ہاں یہ البتہ ہے کہ روسی افسر لایق نہیں ہے۔

خوجی : خیر ابھی تک تو خبر اچھی سننے میں آئی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم میدان سے نکالے گئے۔ افسوس صد افسوس۔

فریبِ غیر نے ہم کو نکالا کوئے جانان سے

کیا ابلیس نے آدم کو باہر باغِ رضوان سے

پھرے دل دورِ خط میں کیا لب جان بخش جاناں سے

ملی ظلمت تو کیا ہم ہاتھ دھوئیں آبحیوان سے

نظر جب وہ پری آتا ہے تو لیتا ہے ہوش اپنا

بلند اس دم مری پرواز ہے تختِ سلیمان سے

کیوں بھئی تمہاری ٹانگ میں گولی لگی تو نکل گئی۔ یا ابھی ٹانگ ہی میں ہے۔ اس سے اطلاع دو۔ خدا کرے آرام ہو جائے۔

مسافر : جی نہیں نکل گئی مگر بڑی تکلیف پائی تھی۔ افوہ۔

خوجی : (اردو میں) خدا کرے کہ دوسری ٹانگ بھی اسی دم زخمی ہو جائے، اور خدا کرے کل فوج روس لنگڑی ہو جائے۔ آمین آمین ثم آمین! بھلا کون جیتے گا تمہارے نزدیک۔

مسافر : خدا جانے ظاہرا تو طرفین سے برابر لڑائی ہو رہی ہے۔ مگر ترکی سپاہ کا جوش بڑھا ہوا ہے اور ادھر ہماری طرف جوش بھی ہے اور سامان بھی ہے۔ جس کو خدا فتح دے۔ دیکھیے مسافر نے کہا۔

چرا کر آنکھ ہم سے بھی نہ کیوں عالم گریزاں ہو ہمارا جسم عریاں کم نہیں شمشیر عریاں سے

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ شپگا گھاٹی پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ جس طرح شپگا گھاٹی اور کوہ بلقان کا

ہٹانا محال ہے، اسی طرح روسیوں کا وہاں سے ہٹانا دشوار اور غیر ممکن ہے۔ بلقان سے فوج اتر ہی گئی ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ معدودے چند ہوں۔ فوج کثیر ہے۔ مقام فلوپوس میں ہمارے سپاہی اور سوار مزے سے دندناتے ہیں۔ سلیمان پاشا جن پر آپ کو بڑا ناز تھا وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ اب مصلحت وقت یہی ہے کہ صلح کر لیتے مگر کسی نے مانا ہی نہیں۔ روسی آرے بلے کرنے لگے۔ صلح کی درخواست کو قطعی نامنظور کرتے تو روسی سے اور سلاطین بگڑ کھڑے ہوتے لہٰذا انھوں نے نہ قطعی اقرار کیا نہ انکار ظاہر میں صلح کے پیغام کو منظور کرنے کے لیے مستعد ہوئے اور سوال جواب کرنے لگے، مگر در پردہ کوشش بھی رہی کہ جہاں تک ممکن ہو فتح پر فتح حاصل کر لو۔ ایسا موقع شاید پھر ہاتھ نہ آتے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ جس قدر زیادہ فتح حاصل کریں گے اسی قدر زیادہ سخت شرائط کرنے کا موقع ملے گا۔ ترکوں کے افسر اس قابل ہیں کہ بلا تحقیقات سزا دے وے۔ سب خود غرض اور طامع مگر فوج سبحان اللہ۔ سبحان اللہ جس قدر خیر خواہی ترکی سواروں اور پیادوں نے ظاہر کی اور جو جوش حب الوطنی انھوں نے دکھایا وہ تو تاریخ میں ابدالآباد تک یادگار رہے گا۔ ستو باندھ باندھ کے لڑنا جسے کہتے ہیں وہ انھوں نے دکھایا۔ افسروں کی طمع اور خود پسندی اور نفسانیت کے سبب سے کل امور میں ابتری واقع ہوئی، ورنہ ترکی کے جوان قوی ہیکل وہ وہ کارنمایاں کرتے کہ غنیم کے دانتوں پسینا آجاتا۔ شہنشاہ کے خاص بھائی سپہ سالار افواج مقرر ہوتے۔ روسیوں سے غلطی یہ ہوئی کہ معدودے چند آدمی لیکر ترکوں کے ان قلعوں اور مقاموں پر حملہ کیا جو بالکل محفوظ تھے اور جن میں وہ چند زیادہ فوج تھی۔ اوّل تو ترک جری اور بہادر دوسرے مقام محفوظ، تیسرے فوج زیادہ۔ جب مقابلہ ہوا، روسیوں نے شکست پائی۔ اسی سبب سے روس کے آدمی ترکوں کے مقابل میں زیادہ مقتول و مجروح ہوتے۔

اگر سپہ سالار افواج روس پر کوئی الزام ہے تو یہی ہے۔ اور اس الزام سے وہ اپنے کو بری نہیں کر سکتے۔ زار ایک استاد۔ تجربہ کار۔ خرانٹ۔ سوچے کہ ان شیروں سے کام نہ بنے گا۔ لہٰذا تغیر و تبدل لازمی اور ضروری ہے۔ پس انھوں نے ایک بہت بڑے آزمودہ کار مرد میدان کو بلوایا۔ فوراً حکم دیا کہ معرکہ کارزار میں حاضر ہو۔ یہ شخص جنگ کریمیا میں بڑے بڑے کام کر چکا تھا اور اس کی بہادری کا نقش بادشاہ کے دل پر منقوش تھا۔ یہ صاحب انجنیری میں بھی برق تھے۔ جنرل ٹوڈلبین تمام یوروپ میں اُن کی قابلیت فنون جنگ اور لیاقت فن انجنیری کے جھنڈے گڑے تھے۔ دور دور تک مشہور تھے۔ جنگ کریمیا میں ان صاحب نے ہتیلی پر سرسوں جمائی۔ غنیم کلے پر آن پہنچا، انھوں نے بزور انجنیری معاً دُھس تیار کر لیے۔ قلعہ کی دیوار چٹکیوں میں درست کر دی۔ ملکہ حاصل تھا۔ جنگ

کریمیا میں ان کے سپرد وہ مقامات تھے۔ جن کو یہ بچاتے تھے اور اس مرتبہ ان کو حملہ کرنے کی ضرورت تھی مگر سب لوگ واقف تھے کہ یہ پرکالۂ آتش کُل فنونِ جنگ پر حاوی ہے۔

جنرل ٹوڈربین بلغارستان میں داخل ہوتے۔ شہزادہ رومانیا کے اسٹاف کے افسر مقرر کیے گئے۔ پھر اُن کو حکم ہوا کہ تم پلونا کے بچانے کی کوشش کرو۔ جنرل گر کو بھی اسی کام کے لیے مقرر ہوئے۔ زار نے بہت جھلا کر بعض افسروں کے نام فرمان بھیجا کہ اگر اس مرتبہ کسی افسر جنگ سے کسی قسم کی بزدلی یا بے ضابطگی ہوگی تو سزائے سخت ضرور پائے گا۔ یہ سُن چکے تھے کہ پلونا کے سپہ سالار کے پاس ترکوں نے کچھ پیام لے کر چند سوار بھیجے تھے روسی فوج نے اُن کا تعاقب کیا مگر اُنھوں نے بکمال مستعدی و جانبازی ان کو زک دی۔ اور صاف نکل بھاگے۔ اس خبر سے زار کو سخت رنج تھا۔ آخر کار کچھ ترکی گرفتار ہوتے۔ تو زار کو ذرا تشفی ہونے لگی۔ اب سُنیے کہ پلونا ایک ایسے مقام پر واقع تھا جس کو بھول بھلیاں کہنا نازیبا نہیں ہے۔ چاروں طرف کوسوں تک دلدل ہے۔ پلونا میں ایک مسجد ہے۔ ایک گرجا۔ ایک جیل خانہ اور ایک خانقاہ۔ پلونا کی آبادی کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر ایسے مقام پر واقع ہے کہ اگر ادھر اُدھر ایک ایک لاکھ آدمی اس کے قبضے کے لیے کام آئیں تو جاوارد روسی چاہتے ہیں، اس پر قابض ہو جائیں۔ ترک چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس سے کبھی نہ نکلے۔ اگر کوئی اور پاشا یا سپہ سالار ہوتا تو پلونا سے ترکوں کو فائدہ نہ حاصل ہوتا۔ مگر وہ بات ہے کہ جس کے پاس پلونا اب ہے۔ اپنے ملک کا ٹوڈربین ہے۔ پلونا داخل ہوتے ہی پاشا نے جگہ تجویز کی اور دھس بندی کر دی۔ قلعے پر قلعہ بننے لگا اور سب قلعے توپ اور گولی بارود اور فوج اور رسد سے لیس۔

الغرض ترکوں کو یقین ہے کہ اس قلعے پر ایسی جنگ ہوگی، ایسی جنگ ہوگی کہ شاید ادھر اُدھر دونوں طرف نئی فوج بھرتی کرنے کی ضرورت واقع ہو۔

اب سُنیے کہ ایک مقام ہے۔ گارنے اسٹوڈنٹ۔ زارِ روس کا خیمہ اسی مقام پر تھا۔ میں نے جو جا کے خیمہ دیکھا تو دنگ ہوگیا۔ بالکل سادہ۔ اب وہاں لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ خیمہ کہاں ہے۔ کوئی بتاتا ہی نہیں۔ اور قہقہے لگاتے ہیں۔ مگر جب سُنا کہ زار کا خیمہ یہی ہے۔ تو سخت تعجب ہوا کہ اتنا بڑا شہنشاہ اور اس سادگی کے ساتھ بسر کرے۔ یہ بہت خوبصورت مقام ہے۔ وسط میں ایک گرجا ہے۔ شمال میں ترکوں کے گھر تھے۔ مگر محلے ویران اور اُجاڑ پڑے ہوتے۔ جب روسی فوج نے اس مقام کو فتح کرلیا اور داخل ہوئی تو ترک روسیوں کے جبر و تعدی کے خوف سے اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سناٹا پڑا تھا۔

شہر ہے پر عجب ہے یہ روداد
نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد

ان مکانوں میں ایک مکان سب سے زیادہ عظیم الشان اور فلک نشان نظر آتا تھا۔ یہ عمارت بلغارستان کے ایک تاجر کی تھی۔ یہ شخص قوم کا عیسائی تھا۔ مگر ترکوں کا دوست اور اس کی نسبت مشہور تھا کہ خفیہ طور پر مذہبِ اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ جب ترکی یہاں سے بھاگے تو یہ تاجر بھی مارے خوف کے بھاگا۔ اس کا مکان جو خالی پایا تو زارِ روس نے اسی میں پڑاؤ کیا۔ اردگرد خیمے نصب تھے اور جن لوگوں کو خیموں میں جگہ نہیں ملی۔ وہ ترکوں کے ویران گھروں میں رہنے لگے۔ جس وقت روسی داخل ہوئے تھے شہر میں کوئی بھی نہ تھا۔

دیکھیے جس در کو الگ بند ہے
کوئی نہ بوڑھا ہے نہ فرزند ہے

اسی مکان میں تار لگایا گیا۔ شہنشاہ بڑی مستعدی سے کُل کارروائی دیکھتے تھے، صبح گجر دم بستر سے اُٹھتے تھے، اور ضروری کام دیکھتے تھے۔ دوپہر کو کوئی پچاس ایک خیمے میں جمع ہوتے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے زار روس آتے تھے۔ کھانا چنا گیا۔ مگر وہ پنیر، مچھلی، گوشت بریاں شوربا تین قسم کا چرندوں کا گوشت۔ بس اور کھانے کے بعد چائے۔ اس کے بعد پھر کام کرتے تھے۔ 6 بجے شام کا کھانا کھایا۔ اس میں صرف ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ 9 بجے چائے پی۔ دس بجے آرام کیا۔ حکم تھا کہ جو ٹیلی گرام شب کو پہنچیں، وہ فوراً ہمارے پاس لائے جائیں۔ اگر سوتے ہوں تو جگا دو۔ فوج کے مجروح اور بیمار سپاہیوں اور افسروں کے ساتھ زار بڑی ہمدردی کرتے ہیں۔ بعض اوقات رجمنٹوں کی حالت پر ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اور وہ چھپاتے تھے۔ مگر آنسو ٹپک ٹپک کر دامن کی خبر لاتے تھے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ کل فوج کو اپنے اعزّہ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ہر ادنا و اعلا سے بہ ہمدردی پیش آنا اور سب کی تواضع و تکریم کرنا ادنی سی بات تھی۔ ایک روز غربا کو بہت سے شرٹ اور کوٹ اور پتلون بخشے۔ اور جو لوگ اردگرد کھڑے تھے اُن کو اجازت دی کہ پرٹ بیو اور رجمنٹوں کو دیکھتے گئے وہاں سب سے علاحدہ علاحدہ اُن کا حال پوچھا۔ اور بڑی ہمدردی ظاہر کی۔ اور کہا کہ شہنشاہ بیگم نے تم لوگوں کے لیے کچھ تحفہ بھیجا ہے۔ اُس کو تم قبول کرو۔ چاقو اور تمباکو رکھنے کی چمڑے کی تھیلی۔

خوجی: ایں! واہ۔ دیکھی تیری کالپی اور باوَن پُرے اُجاڑ۔ اجی ہمارے ہاں ایک ایک چکلہ دار

لاکھ لاکھ روپیہ ذرا ذرا سی بات پر دے دیتا تھا۔ رائے دلارام کو بانگر مئو کی چکلہ داری تھی۔ بس حضرت ایک دفعہ کرم بخش طوائف نے اُن سے امام باڑے کے لیے شیشہ الات مانگا۔ دوسرے دن روتی پیٹتی آئی کہ آگ لگ گئی اور حقیقت میں آگ لگ گئی تھی۔ بس جناب کیا مجال کہ رائے صاحب کچھ کہیں۔ اُسے خاطر سے بٹھایا اور کہا پاپوش سے جل گیا۔ اور حساب کرتے ہیں تو ایک لاکھ دس ہزار کی مالیت۔ مگر تیور پر بل نہ آنے دیا۔ آپ اپنے شہنشاہ کی تعریف کرتے ہیں کہ چاقو تقسیم کیے! اور چمڑے کی تھیلی! لے بس جاؤ بھی۔ رائے دلارام کا نام سُنا ہو گا جن کا کٹرا مشہور ہے۔ ارے میاں جن کی بارہ دری ہے۔

راوی: واہ بے گیدی، واہ روس کا آدمی اور رائے دلارام کا ذکر اور طرّہ یہ کہ کس طرح فرماتے ہیں کہ آپ نے تو رائے دلارام کا نام سُنا ہی ہو گا۔ اِس خبط اور اِس جنون کے قربان۔ اے لاحول۔ اور بارہ دری والا فقرہ اور بھی چُست ہوا۔ واہ گیدی کیوں نہ ہو۔

رُوسی نے کہا شہنشاہ کے ہاتھ زخمیوں نے چومے اور زار نے اُن کی پیٹھ ٹھونکی اور اِس لطف سے پیش آتے جس طرح کوئی اپنے بچّوں سے پیش آتا ہے۔ اب سُنیے کہ رومانیا اور بلگیریا کے درمیان میں سڑک دُرست نہ تھی اور روسیوں نے اُس کی مرمت بھی نہ کی۔ اور سسوڈا سے پلونا تک سڑک بالکل خراب تھی۔ بارش نے ایسا غارت کر دیا تھا کہ آمدورفت مُحال تھی۔ جنرل ٹوڈربین بھلا اِس غفلت کو کب جائز رکھتے۔

خوجی: توبہ توبہ۔ دُگلے والی پلٹن میں ہم نے بھی کئی سڑکیں بنوائی تھیں اور ہم سے بڑھ کر اِس کام کو کوئی کیا جانتا تھا۔

راوی: معلوم ہوتا ہے۔ قُلی تھا گیدی۔ اب پتا ملا۔

روسی: سڑکوں کے سبب سے ذرا خط کتابت اور رسل رسائل میں بھی دقّت واقع ہوتی تھی۔ اور ایک طوفان نے دو تین پُلوں کو بالکل ستیاناس کر دیا تھا۔ ایک پُل جہ گیا۔ اب صرف کُشتیوں کا پُل رہ گیا۔ اور یہ پُل بھی بودا تھا۔ لیکن اِس کے قبل روسیوں کا لشکر داخل بلغارستان ہو چکا تھا۔

خوجی: بھلا آزاد پاشا کا نام بھی سُنا ہے۔؟

روسی: ہاں کیوں سُنا کیوں نہیں ہے وہ تو اب قید ہیں۔

خوجی: یہ قید کیوں کر ہوئے وہ تو بڑا جری آدمی ہے۔

روسی : ایک بڑی داستان ہے۔ کوئی کہاں تک بیان کرے۔ وہ سیبیریا بھیجے گئے تھے۔ وہاں جانے بھی نہ پائے کہ بیچ ہی میں کسی نے اُڑا لیا۔ سُنا کوئی لیڈی اُن پر عاشق ہوئیں۔ مگر تحقیقات کی گئی تو یہ خبر بالکل غلط نکلی محض لغو۔

خوجی : (اپنے دل میں) آپ کی ایسی تیسی۔ کہیں ہو نہ غلط۔

روسی : پھر وہ کسی پہاڑ پر پکڑے گئے اور اب پھر سیبیریا بھیجے گئے۔ اب وہ واپس نہیں آسکتے وہاں اجل اُن کو لے گئی ہے۔ بس مرے اب۔

خوجی : (اپنے دل میں) تمہارا سر۔ وہ چین کر رہا ہے یہ مرتا ہی پھرتا ہے۔ وہ جشن اُڑاتا ہے یہ سیبیریا کے پھیر میں ہے۔

روسی : زار بڑی مستعدی ظاہر کر رہے ہیں اور دل سے لگی ہے۔ کہ فتح حاصل کریں۔ جس جنرل نے ٹرکی کو مریض اور بیمار بیان کیا تھا وہ معتوب ہے۔

خوجی : خوب ہوا۔ دیکھیے تو سہی اب ہوتا کیا ہے۔ جی حضرت۔ خدا چاہے گا تو ہم کو فتح دے گا اور حضرت کا ڈنکا بجے گا۔

یارب خلاق مور و ماہی تو ہے
بخشندہ تاج و تخت شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

خدا مسبب الاسباب ہے۔ مگر آزاد نے خوب ٹھیک بنایا۔

روسی : خیر آزاد نے تو ٹھیک بنایا یا نہیں بنایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں ٹھیک بناؤں۔ نامعقول ہمارے سامنے اور روسیوں کی ہجو۔ ایک بار سُنا، دو دفعہ سُنا۔ تین مرتبہ سُنا۔ بکتا ہی چلا جاتا ہے۔

خوجی نے کہا انشا اللہ تعالیٰ آج کے چوتھے دن یا پانچویں دن ایں جانب میدان کارزار میں فرس کو پویا لے کر غنیم کی فوج پر چھاپا ماریں گے۔ دنادن۔ دنادن۔ گولے چلتے ہوں گے۔ اور بندۂ درگاہ اینڈ رہے ہوں گے۔ ہماری آپ نے تعریف ابھی نہیں سُنی۔ ہم بھی بڑے پُرانے چغادری خرانٹ ہیں۔ سارا زمانہ ایک طرف ہو اور ہم دوسری طرف کچھ پروا نہیں۔ کچھ پروا کا بات نہیں۔ ہم کسی گیدی سے نہیں ڈرتے۔ شاہی زمانے میں ہم نے بڑے بڑے کارنمایاں کیے ہیں۔

من آنم کہ اسپان شہ پرورم
بخدمت دریں مرغزار اندرم

روسی سمجھ گیا کہ یہ سودائی ہیں ان کی بات کا جواب دینا ہی فضول ہے۔ کہا آپ سے اگر گفتگو کرتے تو پاگل ہو جاتے۔ لہٰذا رخصت والسلام۔

خواجہ صاحب نے سلام کا جواب نہ دیا اور کمال خشونت سے کہا اچھا سمجھوں گا۔

مسافر نے بیان کیا کہ پہلے جنرل گرکو بہت آگے بڑھ گئے تھے مگر مجبور ہو کر اُن کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ بہت بڑی غلطی روسیوں سے سرزد ہوئی۔ اسی طرح ایشیائے کوچک میں بھی روسی آگے بڑھ گئے تھے، قلعہ اردھان لے لیا اور قرس اور بڑھتے چلے گئے۔ آخر کار احمد مختار پاشا نے جو باگ اُٹھائی تو روسی جس مقام سے گئے تھے وہاں بھاگ آئے یہ روس کے نوجوان افسروں کی تیزی اور فہم کا قصور ہے۔ ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا۔ اسی طرز پر جنرل گرکو کو بھی جنوب بلقان سے بھاگ آنا پڑا۔

خوجی: (مونچھوں پر تاؤ دے کر) انشاء اللہ سب کو بھاگ آنا پڑے تو سہی یہ کیا بات ہے۔ ارے یار ایک بار ہم بھی اسی طرح بھاگ آئے تھے مگر شیران شیر ہوں واللہ۔ بھاگنا کیسا۔

بھاگ کر کیا تجھ سے جانبر کوئی اے قاتل ہوا
اُڑ چلا گر ہوش اپنا طائر بسمل ہوا

مسافر: تین بار جنرل مارس نے کوشش کی کہ پلونا سے ترکوں کو بھگا دیں۔ مگر اُن کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ بڑی بدنامی ہوئی اور ترک ڈٹے رہے سارا دار مدار پلونا کی جنگ پر ہے۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ شپکا گھاٹی سے ہماری فوج کو ترک نہ ہٹا سکے نہ ہٹا سکے۔

خوجی: مرنا معقول۔ عجب طرح کا آدمی ہے۔ ارے کم بخت یہ خوشی کی بات ہے یا رنج کی۔ اور سُنیے گا۔ معقول۔

مسافر: رنج کی کون سی بات ہے اس میں رنج کیا ہے۔

خوجی: تو آپ خوش ہوں۔ ہم تو روئیں گے۔ ہم ترکوں کا جنبہ کرتے ہیں۔ روسیوں سے ہمیں کیا واسطہ۔ ہونہہ۔

مسافر: ہم لوگوں سے بہت غلطی ہوئی کہ پلونا کو تو چھوڑ دیا اور مقام ٹرنو دا کو لے لیا اور اس کے بعد پہاڑوں کی طرف جھک پڑے۔ مگر لافچہ محفوظ نہ تھا۔

خوجی: اجی ابھی دیکھو تو کیا کیا غلطیاں کرتے ہو۔
مسافر: ترکوں کی فوج صوفیہ میں بہت ہے اور یہ مقام کوہِ بلقان کے جنوب میں واقع ہے اور سرویا کی سرحد کے پاس اُس قصبے میں بھی فوج کثرت سے ہے اور اِدھر مشرق کی جانب شملہ میں کئی ہزار آدمی جمع ہے۔

جشنِ طرب

بیا ساقی آن مے کہ حال آورد — کرامت فزاید کمال آورد
بیا ساقی آن بحر مستور مست — کہ اندر خرابات دارد نشست
بیا ساقی اکنون کہ شد چون بہشت — زردے توایں بزم عنبر سرشت
بیا ساقی آن جام یاقوت وش — کہ بردل کشاید در وقت خوش
بیا ساقی آن جام چون سلسبیل — کہ دل را بفردوس باشد دلیل
بیا ساقی آن مے کہ حکمش زجام — بہ کیخسرو و جم فرستد پیام

بمن دہ کہ بدنام خواہم شدن
مرید مے و جام خواہم شدن

اللہ اللہ! آج تو قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ نوجوان کے مزاج کی طرح بل کرتا ہے۔ معشوقوں کے مانند اٹھکھیلیوں پر ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ ایک جشنِ طرب کا حال لکھتا ہے جو بزمِ فریدونی اور جشن جمشیدی پر طعنہ زن تھا۔

ساقی بنور بادہ برافروز جامِ ما
مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

نگار یاقوت لب سیم تن لالہ رخ شیرین سخن سرو گل اندام صنوبر خرام ثریا بیگم شوخ خوب نکھر کے بیٹھی ہیں۔ مکان سجا سجا۔ لونڈیاں مغلانیاں مہریاں پیش خدمتیں سب بناؤ چناؤ کیے ہوئے ہیں۔ جس طرف نکل جائیے ایک پری چہرہ پری چہرہ دیکھنے میں آتی ہے۔ فکر و غم کا کوچ تھا، ہر سمت شادی۔ ہر طرف صدائے مبارکبادی۔

مغنی بزن چنگ — برار غنون   ببراز دلم فکر ونسیانی. دوں

مغنی دف وچنگ — راسازدہ   بیاران خوش نغمہ آوازدہ

یا الٰہی ثریا بیگم اس قدر زرِ خطیر اور مالِ کثیر کہاں سے لائیں. ترک اِحتشام یہ مال اور مثال یہ اِتنی لونڈیاں، مغلانیاں خواصیں کہاں سے آئیں. بیگم صاحب کا حُسن اِس وقت ایسے جوبن پر ہے کہ مسبحّانِ ملا اعلانک سجدہ کریں۔

اے زشرم عارضت گل کردہ خوے

درعرق بیش حقیقت — جامِ مے

مغلانیاں اور خواصین خوش خوش باہم گفتگو کرتی تھیں۔

مغلانی: (پانزدہ سالہ) اے بی سیدانی. اے ہے آج تو مجاز (مزاج) ہی نہیں ملتے. اِس گلابی جوڑے پر اتنا اترا گیئں۔

سیدانی: ہاں کبھی بابا راج کاہے کو پہنا تھا. آج پہلے پہل ملا ہے. تم اپنے جوڑے کا حال تو کہو تم کو جوڑا اچھا ملا یا بُرا۔

مغلانی: تم تو دل لگی کرتی ہو. اللہ جانتا ہے. ہم اِس جوڑے کو کہتے تھے. جو پہنے ہو تم خدا جانے کیا کا کیا سمجھیں.

سیدانی: جوان جہان ہو. ماشا اللہ سے ابھی اُٹھتی جوانی ہے. اُبلی ہو اس سن میں مغلانی ہوئیں جسے پی چاہے وہی سہاگن. گورے کالے پر کچھ موقوف نہیں.

مغلانی: جوانی میں تو تم پر جوبن ہوگا بی سیدانی کیوں؟

سیدانی: ہاں ہو اب تو ہم بالکل بوڑھے ہو گئے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت بال سب برف سے سفید ہو گئے۔

اتنے میں ایک اور خواص آئی. آتے ہی کہا. کیا ہے بی سیدانی کس سے بال سفید ہو گئے کون بوڑھی ہو گئی ہے. کچھ بتاؤ تو۔

سیدانی: ہم. دانت سب چوہے کے بل میں ڈال دیتے. بال بال سفید ہو گیا. سر ہلنے لگا، ہاتھوں میں رعشہ ہو گیا. کمر ٹیڑھی ہو گئی. اب چل چلاؤ ہے. لڑکپن کھیل کھایا ہے. جوانی نیند بھر سویا، بڑھاپا دیکھ کر رو پا. بنی جی آسرا تیرا. سو اب بوڑھے ہو گئے۔

خواص: اے ہے یہ کاہے سے. کاہے سے بوڑھی ہو گئیں. تمہاری برابر والیاں تو دس دس دن

کے لڑکے گود میں کھلاتی ہیں تم سے بڑی بڑی جنتی جاتی ہیں تم بوڑھی کاہے سے ہو گئیں ۔ بال بھی تو نہیں پکے ابھی ۔ ماشا اللہ سے ابھی خاصی ہو ۔ یہ کون کہتا ہے کہ تم بوڑھی کھپٹ ہو گئیں اور چل چلاؤ اللہ نہ کرے ۔ آخر یہ کہا کس نے بہن ۔

سیدانی : جو مارے اُمنگ کے پھٹی پڑتی ہے اور کون کہے گا ۔

مغلانی : اے ہے ۔ یہ تو بات بات پر بگڑنے لگیں ۔ اور اللہ جانتا ہے ہم نے فقط اتّا (اتنا) پوچھا تھا کہ جوانی میں تو جوبن پر ہو گی ۔ بس اللہ دے اور بندہ لے ۔ اب ان کو جوان کون موئی اندھی کہے گی ۔ جوان ہم ہیں یا تو اب ادھیڑ بھی نہیں رہیں آئیں وہاں سے وہ بن کے ۔ اور نہیں ۔

سیدانی : (مسکرا کر) اب بھی تم ایسی بیس سے اچھی ہو ۔

مغلانی : (چمک کر) اے ہے ۔ کیوں نہیں ۔ آپ ایسی ہی ہیں ۔

مہری : خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بی مغلانی کی ماں سے سن میں زیادہ ہوں گی ۔ اور دعویٰ یہ برو بری کا (برابری) ۔

سیدانی : اخاہ ۔ تم کو ہمارے لیے زبان آئی ۔ خیر!

مہری : آج تو دُلہن پر جوبن ہے ۔ چندے آفتاب چندے مہتاب ۔

سیدانی : کیا پوچھنا ہے ۔ کوٹ کوٹ کے نور بھرا ہے ۔

مغلانی : ایک ایک رگ وپے میں حسن ہے نواب صاحب بڑے قسمت کے دھنی ہیں ۔ عورتوں کی طرف سے ہمیشہ اُنھوں نے عیش کیا جو ملی پری کا سا مکھڑا چاند کا ٹکڑا ۔ مگر نبا ہنا نہیں جانتے یہ اتنا بڑا عیب ہے کہ سب ہنروں کو اس نے چھپا دیا اور کوئی عیب نہیں ہے تو یہ ہے ۔

سیدانی : پھر بے عیب تو ذات خدا کی ہے ۔ اور سب عیب سے بھرے ہیں ۔ کوئی کم کوئی بیش ۔ خالی کوئی نہیں ہے ۔ تم چاہو کوئی خالی ہو یہ بات کہاں مگر نواب صاحب کی خیرات ان کے کام آتی ہے ۔ ہندوؤں کے ہاں کہتے ہیں کہ جس نے بہت سونا دان کیا ہوتا ہے ، وہ چاند سی جورو پاتا ہے انھوں نے معلوم ہوتا ہے سونا خوب دان کیا ہے ۔

مغلانی : اے ہٹو بھی ۔ تم بھی موئے ہندوؤں کی باتیں لائی ہو ۔ ہماری باتیں تو وہ مانتے نہیں ہم اُن کی باتیں کیوں سُنیں ۔

سیدانی : کیوں بی مغلانی آج تک تمہارا بھی کسی پر دل آیا ہے ۔ سچ سچ کہنا ۔ دیکھو یہاں کوئی غیر نہیں ہے سب آپس ہی کے ہیں ۔

مغلانی: ہاں کیوں نہیں آیا جس کے ساتھ ہمارا نکاح ہوا اُنھیں پر دل آیا ہے۔ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کے کبھی دیکھا ہو، تو دیدے پٹم ہو جائیں۔ ایسی بات ہے بھلا جب تو محلات میں جمنے پائے، اور نہ جھونٹے پکڑ کے نکال نہ دیے جاتے۔ ہاں ہمارے میاں البتہ ہمیں پسند آئے ہم نے اماں سے کہا۔ اُنھوں نے منظور کر لیا۔ اُن کا بھی دل آیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے باپ سے کہا۔

مہری: اُف فوہ۔ ایسا دیدہ دلیل۔ ارے غضب خدا۔ اُف توبہ! بڑی شوخ اور ڈھیٹ۔ کچھ ٹھکانا ہے۔

مغلانی سینہ تانتی اینڈتی ہوئی اٹھکھیلیاں کرتی ناز کے ساتھ دُلہن کے کمرے میں جانے لگی۔ اتفاق سے دروازے پر پانی پڑا تھا۔ پاؤں پھسلا مگر وہ شوخ طرار سنبھلی اور چمک کے طرارہ بھرا، تو دس قدم پر تھی۔ اس شوخی کے صدقے۔ اس اُمنگ کے قربان۔ اس ترنگ کے نثار جس وقت پاؤں پھسلا سیدانی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ (شیطان کا دھکا) مگر مہری اور دواجی کی زبان سے فوراً (یا علی) کی آواز نکلی۔ سنبھل کر مغلانی نے کہا بس دونوں اچھی ہو۔ دواجی بیچاری نے فوراً کہا۔ یا علی بگڑی بی سیدانی کو ہم سے جانی دشمنی ہے۔

مہری: اور ہمارا نام ہی نہیں۔ اِدھر تمہارا پاؤں پھسلا اُدھر ہم نے کہا یا علی۔ پھر کہیں دواجی نے کہا۔ آپ نے مجھ غریبنی کا نام ہی نہ لیا۔ خیر ہم نے کچھ ایسا ہی قصور کیا ہو گا۔

دواجی: اس زبان کے آگے کوئی کیا جیت سکے گا بھلا۔

سیدانی: میں دُعا ہی مانگتی تھی کہ اللہ کرے پیر پھسلے۔

مغلانی: ہو نہ کلبھی۔ اچھا ٹھہر تو جاؤ سمجھا جائے گا۔ دیکھو تو سہی اے ایسی جگہ بدلہ لوں کہ عمر بھر یاد رکھو۔

سیدانی: اخاہ۔ اخاہ۔ کیا بڑی بدلہ لینے والی ہیں۔

اتنے میں ایک خادمہ نے کہا بی مغلانی۔ اے بی مغلانی۔ دیکھو یہ بولتی ہی نہیں۔ بہری بلا۔ کیا کانوں میں تیل چھوڑا ہے کیا۔ اللہ کرے بہری ہو جاؤ۔ دوسری عورت دوڑی آتی ہے اے مغلانی واہ واواہ۔ سرکار کب سے یاد کرتی ہیں۔ بولتی ہی نہیں۔ یہ آخر اتراتی کس پر ہو۔ کس برتے پر تتا پانی۔ مغلانی چمک کر بولی۔ اے ہے۔ اے ہے یہ نکتوڑے کس پر کرتی ہو۔ جاؤ کہہ دو ہم نہیں آتے بس اور ؟ آئی وہاں سے چودھراین بن کے۔ اب گھورتی کیا ہو۔ جاؤ کہہ دو نہ۔ وہ عورت بھی پرکالۂ آتش تھی۔ تنک کر کمرے میں گئی۔ ثریا بیگم سے کہا حضور وہ تو اب ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ اُف فوہ میں نے

جو اتنا کہا کہ سرکار نے یاد کیا ہے تو اس قدر کا تنگی اس قدر کا تنگی کر اُف فوہ سینکڑوں باتیں سنائیں کہنے لگی تیرے اوّل و آخر پر زوف. تیری ذات بنیاد پر زوف. تیرے کُنبے پر زوف. یا میرے اللہ لاکھوں باتیں سنا ڈالیں. کہیں پر بند ہی نہیں رہی۔

ثریا بیگم اس وقت بناؤ چناؤ کر کے نکھر کر ٹھسے کے ساتھ بیٹھی تھیں. ایک دفعہ اُس عورت پر نظر ڈالی. بس جتنی عورتیں اور خواصیں وہاں پر تھیں. سب خاموش ہو رہیں. اور وہ خود بھی سمجھی کہ اُس نے غلطی کی مغلانی دور سے کھڑی ہنس رہی تھی کہ چغلی کھائی تو مُنہ کی کھائی جب وہ عورت شرما کر باہر گئی تو مغلانی نے جھک کے سلام کیا اور خوب ہنسی۔

مغلانی: بندگی. کہو. پھر چغلی کھاؤ گی. یاد تو کرو گی۔

عورت: ایسی بنی ہوں کہ بس آج سے کبھی چغلی نہ کھاؤں گی اُف (کان پکڑ کر) کان پکڑے۔

مغلانی: توبہ کرو. توبہ کرو. کہو توبہ۔

عورت: توبہ صاحب توبہ. ہزار بار توبہ. توبہ. توبہ۔

مغلانی: ہاں بس اب میں خوش ہوئی. کیا مزے سے پاجامہ پھڑکاتی چلی تھیں. سرکار. اے سرکار (مُنہ چڑا کر) سرکار. مغلانی تو اب کسی کی سنتی ہی نہیں. اب سوار کو گھوڑے سے اُتار لیتی ہے. وہاں پڑا جوتا. اے پھٹے سے مُنہ۔

عورت: اب جو چاہو سو کہہ لو بہن. ہم تو خود بن گئے۔

مغلانی: ہم سے اُڑ کے کوئی جائے گا کہاں۔

گانا ہی بجانا ہی سدا کام ہے میرا
آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا

عورت: اخاہ. آپ گاتی بجاتی بھی ہیں خیر۔

مغلانی: اللہ جانتا ہے اب تو مہینوں چرچا ہی نہیں رہتا. نہیں تو اندنوں میں دن رات یہی شغل تھا. اور پڑوس کی ڈومنی سے صحبتیں رہتی تھیں۔

اب سُنیے کہ ثریا بیگم کی والدہ معظمہ بڑی بیگم ایک شہ نشین میں بیٹھی ہوئی اہتمام کر رہی ہیں. اور دوسری شہ نشین میں جو اُس کے محاذی تھی ثریا بیگم کی بہن جعفری بیگم بن ٹھن کے متمکن تھیں. اب ناظرین کو حیرت ہوگی کہ ثریا بیگم کی ماں اور بہن کہاں سے آئیں. اُن کا تو پتا ہی نہ تھا اُن کی بوڑھی ماں مالک دیرینہ روز قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اب اتنا غفیل ہوگئی ہوں گی بہنوں

کا ذکر ہی نہیں سُنا۔ یہ نئی بات سُننے میں آئی۔ اور طرّہ یہ کہ ثریا بیگم کے ابا جان باہر روسا کے پاس بیٹھے ہیں۔ اور مصروف انتظام ہیں۔ چہ خوش، یک نشد دو شد۔ اتنے رشتہ دار کہاں سے۔ واضح ہو کہ نواب نامدار گردوں مدار نے ثریا بیگم سے کہا کہ اگر یونہی نکاح پڑھوا لیا تو ہمارے اعزہ واقربا تم کو نظرِ حقارت سے دیکھیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ کوئی بیوہ ہے اس کو گھر ڈال لیا ہوگا یا بنظر مزید احتیاط نکاح کر لیا ہوگا۔ بہتر ہے کہ ایک سیّد کی بھانجی مشہور کریں اور اس کو کچھ روپیہ دیں اور اپنی بھانجی بنا کر رکھیں۔ ثریا بیگم کو یہ بات پسند آئی۔ کہا، نواب ایسا نہ ہو کہ وہ سیدھی ہم کو لوٹ لیں اور ہمیں اور تمھیں دونوں کو بنائیں۔ نواب نے تشفی کی۔ گو اب ان کا زمانہ بکام نہیں مگر بڑے شریف آدمی ہیں۔ عالی خاندان، صائب رائے۔ بھلے مانس، نیک مزاج۔ عورتیں خوش مزاج، ملنسار۔ کسی بات پر تکرار نہیں کرتیں۔ ہمارے ہاں کبھی کبھی آتے جاتے ہیں۔ بڑے بھلے مانس ہیں تم وہاں دو چار روز رہو گی بس دو چار روز کے بعد نکاح ہو جائے گا۔

ثریا بیگم نے کسی قدر شرما کر کہا نواب۔ دیکھو زمانہ کیسا جاتا ہے کوئی کسی کا نہیں آج کل کا زمانہ بڑا نازک ہے۔ شاید وہاں کوئی جوان یا کم سن آدمی ہو۔ سوچ سمجھ لو۔ ہم سے بنے گی نہیں۔ عزت ایک دفعہ جا کر پھر نہیں آسکتی اللہ کرے دشمن تک کی عزت برقرار رہے۔ جان چاہے جاتی رہے مگر آبرو پر پانی نہ پھرے۔

نواب صاحب ہنسے۔ اے سبحان اللہ۔ بھلا اگر ایسی بات ہوتی تو ہم کبھی منظور بھی کر لیتے۔ کیا مجال۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر ایسا ہرگز ہرگز نہ ہو سکے گا۔ وہ سب شریف اور بوڑھے لوگ ہیں اور سب وضعدار۔ جو ہے خوش وضع اور مجسّم اخلاق۔ ثریا بیگم نے یہ بات منظور کر لی۔

دوسرے روز ثریا بیگم اس سیّد کے مکان پر گئیں۔ مشہور کیا کہ ثریا بیگم سیّد کی بھانجی ہیں اور ان کی بیوی ممانی۔ سیّد صاحب کی قسمت کھل گئی۔ نواب صاحب کے خسر بنے۔ روپیہ ہاتھ آیا۔ دو چار روز جشن رہا۔ خوب دھما چوکڑی تھی۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

یہ شعر سیّد صاحب کے وردِ زبان تھا۔ پڑوسی سخت متحیر تھے کہ یا الٰہی ان کے پاس اس قدر روپیہ کہاں سے آیا کہ ڈومنیاں بھی آئی ہیں اور ناچ رنگ بھی اور سیّد صاحب نے جوڑے بھی بنوائے اور گھر میں سب بیش بہا کپڑے بھی پہنے ہیں اور بھانجی اس قدر زیور سے متجلی ہے۔

اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ نواب کی مطبوعہ ہیں اور یہ سارے کرشمے انھیں کے روپے کے ہیں۔ سیّد صاحب کے

ایک پڑوسی نے جن کو یہ شان اور عظمت دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ حیرت سے یوں گفتگو کی۔

پڑوسی : یا حضرت آداب عرض ہے۔ مزاج ہی نہیں ملتے مگر خیر آپ چاہے آدھی بات نہ کریں بندہ تو چھیڑ کے گفتگو کرے گا۔

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

سیّد : حضرت تشویش میں ہوں۔ خدا کرے۔ بخیر و عافیت انجام پائے۔ آپ جانتے ہیں لڑکی کی شادی جھنجھٹ سے خالی نہیں۔

پڑوسی : خدا مسبب الاسباب ہے۔ منسوب کہاں ہیں ؟

سیّد : نواب وجاہت علی خان بہادر کے ہاں۔ یہی سامنے محل ہے۔

ہمہ اسباب شاہی حاصل او
نماندہ آرزوے در دل او

پڑوسی : مجھ کو آپ سکھاتے ہیں۔ شہر میں ایسا کوئی ہے جو ان کو نہیں جانتا۔ نواب وجاہت علی خاں بہادر بڑے مشہور آدمی ہیں۔

سیّد : جی ہاں، بڑی کوشش کی جب غلام نے منظور کیا ورنہ میری خواہش تو یہی تھی کہ کسی شریف اور غریب کے یہاں بیاہوں۔

پڑوسی : ہاں کیوں، یہ کیوں ؟ وجہ، غریب کے ہاں بیاہنے کی۔ آپ سادات ہیں، خاندان کا نام مشہور ہے۔ باقی رہا روپیہ یہ ہاتھ کا میل۔ شریف آبرودار آدمی درزی کی سوئی ہے۔ کبھی زربفت میں کبھی گاڑھے میں

با چشم کم مبیں من ظاہر ذلیل را
عیب از غلاف کہنہ چہ تیغ اصیل را

اصالت کا ہونا مقدم ہے، اصل بات یہ ہے کہ انسان اصیل ہو۔ دو فصلوں کا کام نہیں، اور دیکھ لیجیے کہ جس قدر کہ شریف ہیں وہ کس قدر جھکتے ہیں، اور کیوں نہ جھکیں۔

خمیدہ کرتا ہے انسان کو جوہر شرافت کا
اصالت جن میں ہوتی ہے وہی تلوار کستی ہے

آپ کی وضعداری اور لیاقت کا حال تو سب ظاہر ہے۔ وہ کون ہے جو حضور کو نہیں جانتا مگر اب یہ فرمائیے کہ سب بندوبست کر لیا ہے نا۔ میں پڑوسی ہوں، اور حضور کا خادم ہوں۔ سید صاحب نے

کمالِ تہذیب کے ساتھ کہا۔ اے حضرت آپ کے فرمانے کی بات ہے۔ آپ بندہ نواز۔ دوست مخدوم مکرم، کلاہ بے کساں فیض بخش، فیض رساں ہیں یا ایسے ویسے۔ آپ کی نوازش اور بزرگوں کی دعا اور سب سے زیادہ مقدم جناب باری کی عنایت ہے خاکسار نے اپنی حیثیت کے موافق بندوبست کرلیا ہے۔

پڑوسی: الحمدللہ۔ ہمسایہ ماں کا جایا مثل مشہور ہے۔

راوی: ہاں بہت صحیح ہے۔ مگر جب سید صاحب کے پاس ٹکا نہ تھا تب اس تپاک سے حضور باتیں نہیں کرتے تھے، اب جس قدر گھل گھل کے باتیں ہورہی ہیں۔ سچ ہے، یہ شعر خوب کسی نے کہا ہے ؎

اے زر تو خدا نہٗ ولیکن بخدا
ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

؏ زر بر سر فولاد نہی نرم شود۔ زر وہ شے ہے۔

سید: آپ کو شریک ہونا بھی لازم ہے پشتہا پشت کے پڑوسی ہیں۔ آپ کی صرف شرکت سے مجھے اعزاز ہوگا۔ بس آپ آن کے بیٹھ جائیے گا فقط اس قدر خواہش ہے۔

پڑوسی: بسر و چشم۔ بخوشی دلی۔ بالراس والعین آنکھوں کے بھل۔

راوی: اور دو چار جملے فرمائیے اور دعوت مزے سے چکھیے۔

ادھر تو یہ باتیں ہوتی تھیں ادھر نواب کے احباب ان سے چہل کررہے تھے، ایک دوست نے قسمیں دے کر پوچھا۔ کیوں یار سچ بتانا تم اس چھوکری پر کیوں ریجھے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہیں دیکھ پایا ہے۔ اور کوئی ادا دل میں کھب گئی ہے۔ نواب صاحب نے کہا بچہ حور ہے۔ اب ہرچہ باداباد ہم نے نکاح کی ٹھان لی۔ چاہے کوئی بدنام کرے۔

دکھلاؤ زلف مجھ کو سودا ہوا تو پھر کیا — وابستۂ محبت رسوا ہوا تو پھر کیا
نازو ادا سے چلیے لیکن ذرا سنبھل کر — ہنگامۂ قیامت برپا ہوا تو پھر کیا
اے دل تڑپ نہ اتنا لازم ہے ضبط نالہ — عالم میں رازِ الفت افشا ہوا تو پھر کیا

کانوں تک اس کے پہنچے ایسا کہاں مقدر
گردوں کے پار اپنا نالا گیا تو پھر کیا

دوست: حضرت اس بارے میں تو آپ قسمت کے دھنی ہیں۔

نواب: بھائی خدا کی قسم وہ صورت پائی ہے کہ لاکھوں میں انتخاب کروڑوں میں لاجواب ہے۔ دیدہ نہ شنید۔

قہر ہے آفت ہے یہ آنکھیں لڑانے کی ادا
خوب آتی ہے تمھیں فتنے جگانے کی ادا

یہ شعر اس معشوقِ شوخ و شنگ کے حسبِ حال ہے۔

دوست : ہے کون۔ ع برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن

نواب : اے ہے۔ اب تو کھود کھود کے پوچھنے لگے حضور۔

نامِ خدا اب ان کا جوبن ابھار میں ہے
جلوہ دکھا رہا ہے حُسن و شباب کیا کیا

اور سیّد صاحب تو ایک فقیر درویش آدمی ہیں۔

یہ اوج یہ مرتبہ ہما کو نہ ملے یہ دلق مرقع اُمرار کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈھے تو بادشاہ کو نہ ملے

دن رات وظیفہ خوانی کا شغل رہتا ہے اور کسی امر سے واسطہ نہیں۔ دنیا و مافیہا سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ عزلت نشیں، گوشہ نشیں خمول عجب رنگ کے آدمی ہیں اور دعا میں تو ایسا اثر ہے کہ میں کیا عرض کروں جس کے واسطے جو دعا مانگی فوراً قبول ہوگئی۔ دوست نے کہا ہم جانتے ہیں، اپنی بھانجی کو بھی دعائے خیر دی ہوگی کہ کسی عالی خاندان شریف زادے کے ساتھ نکاح ہو۔ میر صاحب نے فرمایا، واہ۔ یہ خوب بات کہی آپ نے عالی خاندان، شریف زادہ کیا معنی۔ یوں نہیں کہتے کہ رئیس اعظم۔ اپنے وقت کا شہنشاہ ہے، شہزادوں کے ہاں جو نہ نکلے وہ ان کے ہاں ہے۔

لالہ : ہاں امیر ہیں، مُل ایک ایک شہزادہ یہاں ایسا پڑا ہے جس کے ہاں ہاتھی جھومتے ہیں۔ ایک سے ایک رئیس زادہ ہیں۔

میر صاحب : کچھ بید ھا ہو کے تو نہیں آیا ہے۔ ان سے بڑھ کر کون ہے یہ بات کس کے ہاں ہے، یہ سامانِ ثروت یہ عیش یہ راحت کس کو نصیب ہے؟

لالہ : اجی آپ خوشامد خوری کی بات کرتے ہیں اور بندہ صاف صاف۔

خدا کے گجب سے ذرا دل میں کانپ
چگلکھور کے مُنہ میں ڈستے ہیں سانپ

میر صاحب : جا پہلے مُنہ بنوا۔ چلا وہاں سے گجب اور چگل کھور۔

دوست : ہماری صحبت میں اگر کوئی ایسا مصاحب ہو تو نکلوا دیں۔ واللہ کھڑے کھڑے نکلوا دیں۔ اس کے کیا معنی ایک شخص تو صریح تعریف کر رہا ہے اور تو مردود چین چپڑ کی لیتا ہے گو گھے پن کے سوا اور کوئی بات نہیں۔

نواب : بدتمیز آدمی ہے کبھی صحبت میں کاہے کو بیٹھا ہے۔

میر صاحب : بڑے کھرے بنے تھے۔ کھرے کے بچے بنے ہیں۔ واہ۔

نواب : جی ہاں۔ لاحول ولاقوۃ۔ اجی سخت بدتمیز ہے۔ میر جی۔

ساقیا آج تو بصد عجلت — دے کوئی جام داروئے صحت

فرقتِ رخت رز میں مر مر کے — جی بچا ہوں خدا خدا کر کے

چاہتا ہے جو مجھ کو راحت دے — تو مجھے اتنی اب اجازت دے

خم ہے شیشوں میں آب سرخ بھروں — غسل صحت بھی میں اسی سے کروں

جلد اے ساقی قمر طلعت

دے کوئی جام بادۂ الفت

دوست نے کہا۔ حضرت سلامت سنیے ان کے نکھار کا اب ذکر نہ کیجیے گا یاران سرپل بگڑ جائیں گے۔ بھئی اس قدر یارانہ ہے یار۔ ایک دن صورت دکھا دینا۔ احسان ہو گا۔ بس دور دور سے۔

ادھر نواب صاحب اور ان کے احباب بذلہ سنج میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ ادھر ثریا بیگم بناؤ چناؤ کر کے دلہن بنی بیٹھی تھیں اور ہمجولیاں چھیڑ چھاڑ چہل دل لگی مذاق کرتی تھیں۔ آسمان جاہ نامی ایک غیرتِ مہر و ماہ کم سن، آتشیں رخسار گل عذار نوخیز نے جو از بس طرار و شوخ تھی ثریا بیگم کو چھیڑنا شروع کیا۔ آج طبیعت امنگوں پر ہے۔ جوانی تو یوں بھی پھٹی پڑتی ہے۔ مگر آج کا نکھرنا ستم ہے۔ چشم بد دور۔

ثریا بیگم : (مسکرا کر) بہن تم تو ہنسواتی ہو۔ کوئی بڑی بوڑھی آجائیں تو اپنے دل میں کیا کہیں۔ آج کے دن معاف کرو، پھر دل کھول کے ہنس لینا۔ مگر تم مانو گی کاہے کو۔

آسمان جاہ : واہ (بن کر) آج تو دن ہے۔ اس وقت سہمی ہوئی کیوں بیٹھی ہو۔ نہیں۔ کوئی وجہ ضرور ہے مگر اللہ جانتا ہے ایسا دولھا پایا کہ لاکھوں میں انتخاب ہے۔ ہرنی سی آنکھیں، شیر کا سا سینہ ہے۔ چیتے کی سی کمر۔ دیکھیے تو بھوک پیاس بند ہو جائے اتنے میں ایک خاتون ماہ لقا، ہاتھ میں کاغذ لے کر آئی اور اٹھلا کر بولی اے بی ذرا یہ غزل تو سن لو۔ ریاض کوئی شاعر ہیں۔ ان کی غزل ہے ایک ایک مصرع موتیوں میں تولنے کے قابل ہے در خوش آب کے مقابل ہے۔

آسمان جاہ : حقانی کلام ہو تو کسی مسجد میں جا کے پڑھیے، جو چٹپٹے کا ہو تو ہم کو سنائیے ورنہ ؏

عزیز و حق تعالیٰ کبریا ہے

ہم تو پھڑکتے ہوئے شعر کے عاشق ہیں یعنی جس میں جوانی اور مستی اور رندی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔

خاتون : اے ہے پہلے سُن تو لو۔ غزل کی غزل دُلھن کی طرح مرصّع ہے۔ ریاض کوئی اچھا شاعر معلوم ہوتا ہے۔

دل کسی طرح چین پا جائے غیر کی آئی ہم کو آجائے

دیدہ و دل ہیں کام کے دونوں

وقت پر جو مزا دکھا جائے

آسمان جاہ : اچھل کر اُہو ہو — ؏ وقت پر جو مزا دکھا جائے

کیا بات پیدا کی ہے۔ اے لو اتم کہاں ٹھہر گئیں بیگی کی طرح ادھر اُدھر بھر رہی ہو ذری سنا تمہیں خاتون جنّت کی قسم سننے کے لائق کلام ہے۔

خاتون : اور شعر سنیے گا۔ رندی کے سامان ہیں۔

مے کشی ہو چھپا کے گردوں سے

گھر کے بادل فلک پہ چھا جائے

آسمان جاہ : شعر تو اچھا ہے مگر پھیکا ہے۔ تو سبب کیا۔ ہائے تم یہ نہ سمجھوگی۔ معلوم ہوتا ہے، زبانی داخلہ ہے۔ بادہ گُسار کا رنگ اور ہی ہوتا ہے لاکھ چھپائے اس کی ادا۔ اور اس کا رنگ ضرور دکھائے گا مگر مضمون اچھا پیدا کیا۔ معشوق کا حُسن اور شے ہے اور نگاہِ اشارت آشنا دوسری چیز ہے، یہ کلام وہ شے ہے جس کے حُسن میں کوئی دھبہ نہیں لگا سکتا مگر نگاہِ اشارت آشنا نہیں۔ ایک جام پی کے پھر بے خودی کی کیفیت دیکھلیں۔ وہ رنگ اثر جسے کہ آتش اور ناسخ کی روح وجد کرنے لگے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

خاتون : اچھا اس شعر سے بتاؤ کیا ثابت ہوتا ہے۔

شیخ صاحب برائیاں مے کی

اور جو کوئی چیت کی آجائے

آسمان جاہ : اگر ہمارے سامنے ہوتے تو ہم کہتے کہ یہ شعر ہماری طرف سے قبول کرلیجیے، شاید تائب

ہوگئے ہیں، ان مردوں کے قول و فعل کا کیا اعتبار، اور بعضے موے شاعر تو زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، اور بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔

جان تو کچھ گزر گئی اس پر
مُنہ چھُپائے جو کوستا جائے

آسمان جاہ، جادو نگاہ، زیرلب مسکرائیں، اور ادائے معشوقانہ کے ساتھ گردن نیوڑھا کر کہا آگے پڑھو، آگے پڑھو۔

لاش اٹھے کی جبھی کہ ناز کے ساتھ
پھیر کر مُنہ وہ مُسکرا جائے

آسمان جاہ: اللہ جانتا ہے، اس کمبخت نے بلا کی طبیعت پائی ہے، کیا شعر کہا ہے (اس پھیر کر مُنہ نے استم ڈھایا۔ ہاں پڑھیے نہ ..

پھر نشاطِ لحد رہے نہ رہے ؛ آکے دشمن بھی خاک اڑا جائے

کہیں ایسا نہ ہو یہ نالۂ دل
کنگرے عرش کے گرا جائے

آسمان جاہ: (منہ بنا کر) پھیکا۔ پہلا شعر اچھا تھا۔ ہاں اور۔

وہ ملیں گے گلے سے خلوت میں
مجھ کو ڈر ہے حیا نہ آجائے

آسمان جاہ: واہ، وا، واہ۔ ہائے کیا خوف ہے، کم سنی ہے۔ نہ کوئی فرہاد کُش۔ بڑھیا کی ہم جولی تو ہے نہیں۔ خوب کہا ہے، ہم ضرور داد دیں گے۔

گالیاں کھائے پر مزے کے ساتھ
گال گورے سے چومتا جائے

خاتونِ مہ لقا نے اور شعر سُنائے اور آسمان جاہ نے کان دھر کر سنے۔

کیونکر آغوش میں اُسے کھینچوں
لاکھ بل جو ہوا سے کھا جائے

آسمان جاہ: بس۔ یہی کلام تو ہم کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ معشوق کیا موکھے کا عارضہ ہے، نزاکت کی تعریف پر آئے تو ایسا بنا دیا کہ جانو اٹھ ہی نہیں سکتے۔ جنبش کی اور تین تین بل کھانے لگے۔

ثریا بیگم : واہ۔ اور نہیں تو کیا۔ یہ کہیے کہ معشوق قصائی کا کتا یا گھی والے کا کپا یا ہوائی تکیہ ہے۔ نزاکت کی تو سبھی تعریف کرتے آئے ہیں۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ دبنگی یا موٹی تازی بھدی عورت پر ہم عاشق ہیں۔

بسیں نزاکت موئے میاں او گویا
کہ ہم چو تار نگہہ در نظر نمی آید

اس میں نازکی کی تعریف کی ہے، یا دبنگے پن کی۔ موٹائی کی کون تعریف۔

بُرد بوی تازہ اندامش صبا سوی چمن
گل ندامت باکشید و از خجالت شد گلاب

اس میں بھدّے پن کی تعریف ہے یا نازکی کی۔ اور شعر اسی مضمون کا سنو۔

نزاکتِ تو نسیم بہار شوخی ماست
ز بارِ سایۂ گل کج شود کلاہِ ترا

یہ نزاکت کہلاتی ہے۔ ریاض نے اچھا شعر کہا ہے۔ مُنھ چوم۔ اِس قدر کہہ چکی تھیں کہ ہمجولیوں نے فرمائشی قہقہہ لگایا، اور ثریا بیگم اس قدر شرمائیں، اس قدر جھینپیں کہ بیان سے باہر۔ کہنے کو تو جوش میں کہہ گئیں، مگر معاً سوچیں اور دانتوں کے تلے انگلی دبا کر مُنھ پھیر لیا۔ گردن نیوڑا لی۔ آسمان جاہ ایک ہی شوخ تھی۔ چڑھانا شروع کیا۔ ذری ایک بار پھر کہنا۔ ہاں کیا۔ مُنھ چوم لے، ریاض کا۔ پھر قہقہہ لگا۔ کئی نوخیز بیگمیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ثریا بیگم کے قریب جا کر جاہ زخداں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اے تو اب لجاتی کاہے کو ہے۔ قدردانی کی۔ کچھ اور ثریا بیگم نے دستِ سیمیں سے آسمان جاہ کا ہاتھ ہٹا کر کہا چلی بیٹھو۔ واہ، سوائے وہی چُلبلے پن کے دوسری بات نہیں۔ آسمان جاہ نے کہا مقطع سناؤ۔ خاتونِ ماہ لقا نے یہ مقطع پڑھا۔

ہے ریاضؔ اک جوانِ مست خرام
نہ پیے اور جھومتا جائے

آسمان جاہ : ہاں اس شعر سے البتہ جوشِ شباب اور مستی کی ترنگ برستی ہے۔

ع نہ پیے اور جھومتا جائے

شعر ہمیں بہت بھاتا ہے۔

خُم کے خُم الٹے پڑے ہیں میکدے میں چار سو
قابلِ نظارہ ہے مستوں کی محفل آج کل

بس لوٹ ہوں تو ایسے کلام پر۔ اور ایک شعر سُنا یہ بھی سننے کے لائق ہے۔

بھر دیا مجھ فقیر مست کا جام
ساقیا تو ہو اور دنیا ہو

آسمان جاہ نے جھوم کر مستانہ وار یہ شعر پڑھا تو ثریا بیگم نے آہستہ سے کہا یہ شریف زادیوں کے طرز نہیں ہیں۔ اُبلی ہی پڑتی ہیں۔ آتو مغلانی، خواصین، دس گھر کی دس بڑی بوڑھی آئی ہیں۔ وہ سب کیا کہیں گی یہ جھوم جھوم کے شعریں پڑھنا کیا معنی۔ آسمان جاہ بولی تم تو سایہ سے بھی اب ڈرنے لگیں۔ اللہ جانتا ہے اگر ہم سے یہ اکل کھرے پن کی باتیں کروگی نہ تو ہم چلے جائیں گے۔ آسمان جاہ کی بڑی بہن عالم آرا تھا اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ اجی باجی بھلا یہ شعریں پڑھنے میں کوئی عیب ہے۔ انھوں نے مسکرا کر یوں جواب دیا (اے لے مجھے کیوں اس جھگڑے میں سمیٹتی ہو۔ اس دانتا کلکل میں ہم نہیں پڑتے) شعر پڑھنے میں عیب کاہے کا ہے۔ مگر بات اتنی ہے کہ آپس کی ہم سن ہمجولیاں ہوں۔

ثریا بیگم : (اٹھلا کر) اماجان یہیں کھڑی تھیں۔ ذری انھوں نے پیٹھ پھیری اور چلنے ہی کو تھیں کہ ہنوز آنکھوں سے اوجھل بھی نہیں ہوئی تھیں کہ آپ نے قہقہہ لگایا، اور وہ وہ باتیں کیں کہ توبہ ہی بھلی ہے۔

عالم آرا : یہ بیہودہ پن ہم کو اچھا نہیں لگتا کیا سچ مچ کہتی ہو؟ اچھا ہمارے سر پر ہاتھ تو دھرو۔ بہن تمھیں ہمارے سر کی قسم۔

ثریا بیگم : (سر پر ہاتھ رکھ کر) اس سر کی قسم جھوٹ نہیں ہے۔ ہم نے بضد ہو کے کہا کہ آسمان جاہ بہن خدارا ذری اماجان کو جالینے دو۔ مگر جب وہ کسی کی ماں بھی ہوں۔ بی مغلانی، اے ذری کسی سے کہو۔ نمگیرہ تان دے۔ وہ بادلے والا نمگیرا لے آؤ۔ مہریوں سے کہو تان دیں۔ جھٹ پٹ دیر مت کرو۔

آسمان جاہ نے انگوٹھا دکھا کر کہا۔ ایسی بڑی وہ بنی ہیں، ہمیں نصیحتیں کرنے چلی ہیں۔ یہ کہہ کر پھر جھومی اور جھومتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

ناصحا پند مجھ سے وحشی کو
اس کو سمجھا جو کچھ سمجھتا ہو

کوئی کتاب لاؤ تو پڑھیں۔ دو گھڑی دل ہی بہلے گا۔ ایک مغلانی جاکے ایک دیوان اٹھا لائی۔ آسمان جاہ پڑھنے کو تھیں کہ ایک مہری نے آن کر کہا حضور حشمت بہو چھم چھم کرتی ہوئی آئیں۔

انکھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز	دل رُبا بات بات کا انداز
سامری تاب کیا جو آنکھ ملائے	چشم ہاروت جن سے آنکھ چرائے
نشہ کے لال لال وہ ڈورے	جن پہ نرگس کے پڑتے ہیں ڈورے

موجِ دریائے نور ہے بینی　　عکسِ انگشتِ حور ہے بینی

خشمگیں برقِ خرمنِ دل وجان

چتونیں رہزنِ متاعِ توان

سوائے دُلہن یعنی ثریّا بیگم کے سب کا رنگ اس کے حُسنِ صبیح کے مقابل میں ماند ہو گیا۔ ایک خوجیز خاتون نے کہا۔ بہن ہم نے اُڑتی سی خبر پائی ہے کہ۔

امتحان عاشقوں کے ہوتے ہیں　　جان نثار اپنی جان کھوتے ہیں

کتنے دل پائمال ہوتے ہیں　　روز کتنے حلال ہوتے ہیں

کتنے ہیں بُلبُلِ گُل رُخسار　　کتنے ہیں قمری صنوبر بار

دولتِ دید لوٹتا ہے کوئی

رشک سے چھاتی کوٹتا ہے کوئی

حشمت بہو نے کہا۔ یہ کس موئی نے آپ سے کہا۔ اللہ کرے اس کا جنازہ نکلے اور حضرت عباس کا علم اس پر ٹوٹ پڑے۔ نیک بیبیوں کے ساتھ اس کا حشر نہ ہو۔ واہ۔ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ اے ہے تو تنکتی کیوں ہو بہن۔ ہم سے بڑی معتبر عورت نے کہا ہے۔ چاہے اپنی آنو سے پوچھ لینا۔ وہ تو شمشیر برہنہ ہی ہے۔ وہ بھی آگ ہو گئی تھی۔ یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ حشمت بہو نے شطرنج منگوائی اور ثریا بیگم سے کہا آؤ شطرنج کھیلیں بہن۔ ایک نقشہ نکالو تو جانیں کہ بڑی شطرنج باز ہو۔

ثریّا بیگم: ہم سے اور شطرنج۔ اے تیری قدرت۔

حشمت بہو: اللہ جانتا ہے۔ ایسا پیچیدہ نقشہ ہے کہ اچھے اچھے غوطے کھاتے ہیں۔ بھلا نکال لو نقشہ تو جانوں کہ بڑی کھیلنے والی ہو۔ دانتوں پسینہ آتا ہے، اور تین چال میں مات ہے۔

ثریّا بیگم: اے دواجی ذری شطرنج تو لے آؤ۔ حشمت بہو سے بد بد کے کھیلیں گے، جلدی سے لاؤ، ابھی لاؤ۔

دواجی: آج یہ کون موقع ہے بھلا۔ جو بات ہے انوکھی، جو کھیل کھیلیں گی بے وقت، جو بات کریں گی بے تک۔

آسمان جاہ: لاؤ بھی۔ انوکھی لائیں، وہاں سے (دبی زبان) جوانی میں دواجی نے بھی بہتوں کو گھائل کیا ہو گا۔

ثریّا بیگم: (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ارے۔ توبہ توبہ۔

حشمت بہو: بھلے کو انھوں نے سنا نہیں۔ نہیں تو جہاں کی ہو وہیں پہنچا دیتیں۔ بہت زبان دراز عورت ہے۔ اور دعوٰی بھی ہے۔ اسی گھر میں ٹری ہوئی ہے۔ زمانہ دیکھا ہے اور ایک بات اور بھی ہے۔ خیر خواہ ہے اور بے لالچ۔ ذرا چھو تک نہیں گئی۔ بالکل بے طمع۔

دواجی شطرنج لائیں۔ فالسائی اطلس کی بساط ایک انگشتی لچکا اور لیس ٹکی ہوئی۔ بادلے کے خانے بنے ہوئے۔ چاندی سونے کے مہرے مگر چھوٹے چھوٹے اور ہلکے ہلکے۔ بیبیاں بیگمیں کم سنیں بساط کے ارد گرد بیٹھیں۔ سب حسین اور مہ جبین۔

مست سب بادۂ جوانی سے — چھین لیں دل کو خوش بیانی سے
چوٹیاں نور کی گندھی ہوئی صاف — جلوہ گر رنگ رنگ کے موباف

دستِ نازک وہ مہندی سے رنگین
سخت خونریز عاشق مسکین

حشمت بہو: اب بتاؤ۔ کیا کیا بدتی ہو۔ بولو جھٹ پٹ۔

ثریا بیگم: ہم بد کے پاس کھڑے نہیں ہوتے۔ بد کو اپنے ہاں پھٹکنے نہیں دیتے۔ نقشہ کو جماؤ۔ دیکھیں تو کیسا نقشہ ہے۔

حشمت بہو: واہ یوں نہیں بتاتے۔ پہلے کچھ بد لو ہم سے۔

ثریا بیگم: اچھا اگر ہم نقشہ نکال لیں، تو یہ انگوٹھی ہماری۔ اور جو نہ نکال سکیں تو تمہاری یہ انگوٹھی ہم لے لیں۔ بس یہ انصاف کی بات یا نہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔

آسمان جاہ: موئی انگوٹھی بھی کوئی کائنات ہے۔ ہم تو میاں بدتے ہیں، چاہے جو بدے، کیوں منظور ہے۔

اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔ ان سب کم سنوں کی یہ کیفیت تھی کہ بے اختیار ہنس رہی تھیں، پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ کسی نے دانتوں تلے انگلی دبائی۔ کوئی آسمان جاہ کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ سب کی سب دنگ تھیں کہ یا خدا یہ کیا معاملہ ہے۔ ایسی زبان دراز، شوخ و بیباک آج تک دیکھی ہی نہیں۔ انھوں نے جانی بیگم کے بھی کان کاٹے۔ گو وہ بھی انتہا کی شوخ و بیحیا ہے مگر ان کا نمبر بڑھا ہوا ہے۔
حشمت بہو نے یہ نقشہ رکھا۔

سبز بازی

		شاہ سرخ	پیادہ سرخ			پیادہ سرخ	
فیل سرخ	پیادہ سرخ					پیادہ سبز	
			سبز شاہ	خانہ الف			
						سرخ رخ	

سرخ بازی

سُرخ چلے اور تین چال میں مات کرے۔

حشمت بہو: سُرخ چلے اور تین چال میں مات کرے۔ بڑا مشکل ہے۔

ثریّا بیگم: چلو تو اس سے کیا مطلب۔ وہ مشکل ہو یا سہل ہو۔

آسمان جاہ: کوئی ناک ناک بدے تو ہم نقشہ حل کر دیں اور (چٹکی بجا کر) لوں، ابھی ابھی اسی دم یہ نقشہ بھی کوئی چیز ہے۔ اس سے مشکل سے مشکل ہم نے حل کیے ہیں۔

ثریا بیگم: تین چالوں میں مات ہے اور بادشاہ کو کتنے گھر چلنے کو ہیں فقط ایک۔ گھر الف، اچھا اور کوئی خانہ نہیں ہے اور نقشے میں پہلے ہاتھ بادشاہ کو کشت نہیں دیتے۔

حشمت بہو: لاکھ منصوبے کرو۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔ نقشِ علی بھی آئیں تو چال نہ نکل سکے، چاہے غور کرو تو۔ آخر کچھ تو سمجھ کے کہتی ہوں، بیچاسوں شطرنج بازوں نے کوشش کی نہ حل ہوا نہ حل ہوا۔

ثریا بیگم نے کہا۔ اچھا ایک نقشہ ہم جمائیں وہ تم نکالو۔ دوسری شطرنج منگوائی اور یہ نقشہ جمایا۔ دو دو اشرفی بازی۔ نقشہ یہ ہے۔

سبز بازی

				رخ سرخ			
					شاہ سرخ		
		پیادہ سبز			شاہ سبز		
وزیر سرخ		پیادہ سرخ		پیادہ سبز	پیادہ سرخ		
							رخ سرخ
				پیادہ سرخ			

سُرخ بازی

حشمت بہو: اس میں تین چال میں مات ہے۔ اے ہے اندھیر جو تیتی ہو کہیں نہ ہو تین چال میں مات اچھا تم اس شطرنج میں غور کرو ہم اس نقشے پر غور کرتے ہیں سب ہے نہ معاملے کی بات۔

آسمان جاہ دیوان پڑھنے لگیں، کبھی یوں ہی پڑھتی تھیں کبھی گاتی جاتی تھیں، اور کبھی کبھی ناز و ادا کے ساتھ بھاؤ بھی بتاتی تھیں اور سب کو اپنی طرف مخاطب کرتی تھیں۔

ہم نزع میں رہے نہ وہ آیا غضب کیا
مرتے ہوئے کو مُنھ نہ دکھایا غضب کیا

دل کی طرف میں دیکھ کے کہتا ہوں عشق میں — اس چاند کو یہ داغ لگایا غضب کیا

تڑپا کیا میں نشہ میں بجلی کی طرح سے — ابر آ کے میکدے پہ نہ چھایا غضب کیا

طرّۂ نگاہِ یار ہوئی برق طور پر — سرمہ جب آنکھ طوں میں لگایا غضب کیا

کرّوبیانِ عرش نہ گھبرائیں اے بتو — نالوں کو قہقہوں میں اُڑایا غضب کیا

دل نے جو کچھ کہا وہ کیا میں نے عمر بھر — کچھ دھیان میں کسی کو نہ لایا غضب کیا

نازل عجب بلا کرۂ خاک پر ہوئی — کیوں تم نے گیسوؤں کو بڑھایا غضب کیا

جامِ شراب کی نہ ہوئی محتسب کو قدر — رندوں کا کیا چراغ بجھایا غضب کیا

عمرِ دو روزہ میں نہ کوئی کام بن پڑا — رہ رہ کے آسماں نے مٹایا غضب کیا

گل کی طرح کیا نہ گریبان چاک چاک — آئی بہار رنگ نہ لایا غضب کیا

کوتاہ ہمتی مرے ذہنِ رسا نے کی — حالِ مزاجِ یار نہ پایا غضب کیا

تیرتے پھریں گے ہفت فلک صورتِ حباب — طوفان آنسوؤں نے بہایا غضب کیا

ہنسنا نہ تھا تمھیں مرے رونے پہ اے گلو — روتے ہوئے کو اور رُلایا غضب کیا

آنکھیں لڑائیں یار سے کیوں عین بزم میں — نظروں میں دشمنوں کے سمایا غضب کیا

دُنیا کے کاروبار میں تم اے صبا رہے
عقبیٰ کا کام کچھ نہ بنایا غضب کیا

ثریّا بیگم: بہن خدارا ہمیں ذلیل نہ کرو جو گانا ہی ہے تو اس طرف کی چھت پر جا کے گاؤ۔ کوئی کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ اور یہاں سے بازار والے سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

آسمان جاہ: کہیں گے کیا اور سنیں گے کیا۔ سمجھ جائیں گے کہ کوئی ڈومنی ہے۔ بس اور کیا کہیں گے، اور ڈومنیوں سے ہم سے بہناپا ہے۔ بیابانی والی حیدری ہماری دوگانہ ہے۔ ہم تو ضرور گائیں گے۔

تقریر اختلاف میں کیوں کر بڑھے نہیں
ہندو بڑھے نہیں کہ مسلماں بڑھے نہیں

اے جی۔ ہندو پڑھے نہیں کہ مسلماں پڑھے نہیں۔

اب سنیے کہ اس مصرعۂ ثانی کو آسمان جاہ نے کئی طرح پر بتایا۔ جب مسلمان کا لفظ کہا تو شیخ کا اشارہ کیا۔ کانوں پر ہاتھ رکھے اذان سے مراد ہے۔ جب ہندو کا لفظ کہا تو جنیو کا اشارہ کیا، تلک بتایا، مالا بتایا۔ الغرض کئی طرح سے اشارہ کر کے بتایا اور مافی الضمیر سمجھایا۔ جتنی بیگمیں بیٹھی تھیں سب کی سب دنگ ہو گئیں

کہ اچھا بھاؤ بتایا۔ آسمان جاہ نے پھر گانا شروع کیا۔

تری سنجیدگی پر جان قربان اے کمان آبرو
ترازو ہو گیا تیر نگہ دل کے نشانے میں

ثریّا بیگم : خدا تمھاری اس شوخی سے سمجھے ، بڑی بے حیا ہو۔

آسمان جاہ : ہاں۔ اور وہ بھول گئیں کہ شاعر کا منہ جو مستی تھیں اور شاعر بھی کون، ریاض سا شوخ طبع۔

ثریا بیگم نے آدھ گھنٹے میں نقشہ حل کر دیا، اور کہا لے انگوٹھی داہنے ہاتھ سے نکالیے اور بائیں ہاتھ سے حوالے کیجیے۔ ہم نے نقشہ نکال لیا۔ نقشہ نہ ہوا ایک وہ ہوا کہ حل ہی نہ ہو سکے یہ کیا دشوار تھا جو نقشہ زمانے بھر میں کوئی نہ حل کر سکے، خدا چاہے تو ایک دم میں نہیں نکال دوں اس کی کیا حقیقت ہے۔ یہ بھی کوئی مشکل تھا۔ حشمت بہو دوپٹا سنبھال کر اٹھیں۔ کہا نکال لیا ہو نہ، تو اور جس قدر کہو اس قدر بد لوں ایک انگوٹھی کی کیا اصل و حقیقت ہے۔ ثریا بیگم نے کہا۔ یہ بھی کوئی نقشے میں نقشہ ہے۔ ہزاروں نقشے نکال ڈالے پہلے ہماری چال ہے ، اچھا ملاحظہ ہو ہم پہلے اس گھر میں آئے (خانہ ب) تم کو حکمی بادشاہ یہاں جانا پڑا (خانہ الف) میں نہ جاؤ گی تو جاؤ گی کہاں ؛ سوا اس گھر کے اور کوئی گھر ہی نہیں ۔ مجبوری آؤ۔ اچھا آئے۔ پھر ہم شاہ کو اس گھر (ج) میں لے آئے۔ دیکھا آپ نے۔ اب تم بادشاہ خواہی نخواہی اس خانہ میں لاؤ گی۔ (خانہ د) ہاں اس گھر کے سوا اور جاؤ گی کہاں۔ اچھا اب ہم نے اس پیادے کو بڑھ کر کشت دی۔ پیادہ اس گھر میں بڑھے۔ اب کشت اور مات ، پیل کی کشت اور وہی مات۔ سُرخ پیل کے زور سے ہو گیا۔ اب بادشاہ کہیں جا نہیں سکتا۔ جس طرف جائے مات ہی مات ہے۔ فرض کرو اگر خانہ الف میں آئے تو ہمارا بادشاہ ہے ادھر آ نہیں سکتا۔ اور رہی یہ بٹی وہ رُخ سے بند ہے۔ رُخ بھی کس غضب کا مہرہ ہے۔ ایک خانہ میں رکھ دیا تمام بٹ کے حاکم بنے ہیں۔ اور وہ بٹی پیل سے رُکی ہوئی ہے۔

لے اب انگوٹھی نکالیے ، کیوں اس طرح نقشہ حل کرتے ہیں۔ ہم نے نقشہ دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ یہ نقشہ سہل ہے۔ کوئی دشوار نہیں۔ بہن میں کیا تم سے کہوں کہ کیسے کیسے مشکل نقشے ہم نے حل کیے ہیں۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ جب ہم بہت ہی کم سن تھے۔ اور وہی شروع شروع شطرنج کھیلنا سیکھا تھا۔ بس اسی طرح ایک ہمسائی ہمارے پاس نقشہ لائیں ، اور کہا کہ بہن ایک نقشہ ہمارے میاں لائے ہیں ، اور کہتے ہیں کہ اس نقشہ کے حل کرنے میں تمام شہر کے شاطر دنگ اور ایک مہینے سے فکر کر رہے ہیں مگر حل نہیں ہوتا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ بہن ذرا لاؤ تو ہم بھی فکر کریں بس بہن انھوں نے شطرنج لا کر نقشہ جمایا۔ میں نے نقشہ کو غور سے دیکھا۔ کہا ہاں بہن دشوار تو ہے مگر آٹھ روز میں ہم غور کر کے نکال لیں گے۔ انھوں نے کہا بہن ہرگز نہ نکلے گا۔

بیکار وقت رائیگاں کرنا ہے، ہم نے کہا بغیر حل کیے ہم ہرگز نہ آرام لیں گے۔ اگر تم کو باور نہ ہو تو کچھ شرط سہی۔ انھوں نے کہا اچھا دس دس اشرفیاں ہم نے کہا دس اشرفیاں کیا سو سو اشرفیاں بدو' انھوں نے بدیں۔ بس میں نقشہ لے کر بیٹھ گئی تین دن فکر کی اور نقشہ حل نہ ہوا چوتھے دن رات کو چال سمجھ میں آگئی اور نقشہ حل کر لیا۔ علی الصباح مہری کو بھیج کر ان کو بلوایا۔ اور نقشہ جا کر ان کو سمجھا دیا' دیکھتے ہی دنگ ہو گئیں اور کہا بہن تم نے کمال کیا، خوب حل کیا۔ میں نے کہا بڑی دقت سے نکالا ہے۔ اب لائیے اشرفیاں بائیں ہاتھ سے رکھ دیجیے۔ ہر چند بڑے حیلے کیے مگر میں نے اشرفیاں لے ہی لیں۔

یہ کہہ کر ثریا بیگم انگوٹھی کی طالب ہوئیں۔

حشمت: لو یہ موئی انگوٹھی کیا مال ہے۔ اب اس وقت تو من گئیں یہ ہمیں کیا معلوم تھا۔ اے سچ مچ تقاضا ہی کرنے لگیں۔

ثریا بیگم: اے لو! اے ہے۔ ہم کو کیا معلوم تھا بہن آپ اپنی انگوٹھی رہنے دیں ہم در گزرے۔ ایسی انگوٹھی سے اچھا دھوکہ دیا۔

آسمان جاہ: کا ہے کی ہے کا ہے کی۔ قیمتی نہیں ہے؟ اگر قیمتی ہوتی تو یہ انگوٹھی شرط میں نہ لگاتیں۔

ثریا بیگم: قیمتی! اے پکھراج کی ہے۔ دیکھو تو۔ کوئی دو نہیں تین سو روپے کی ہوگی اور ہماری عقیق کی انگوٹھی پانچ سو ستاون کی خرید ہے اور جب خریدی تھی اس وقت آٹھ سو ملتے تھے۔

آسمان جاہ: اب لے بھلا کس کو معلوم تھا کہ اتنے بڑے نواب کی صاحبزادی' ایسے نواب زادے کی بہو' اور ایسا وضعدار میاں، اور پکھراج کی انگوٹھی پہن کے آئے گی۔ ہمارے یہاں کی مہریاں بھی ہاتھ سے نہ چھوئیں۔ بس معلوم ہو گیا اب کبھی بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنانا۔ بس دیکھ لیا۔

ثریا بیگم: سچ کہو کیا گھر سے سوچ کر آئی تھیں کہ ہم جا کر شرط لگائیں گے اور شرط میں یہی انگوٹھی لگائیں گے۔

آسمان جاہ: نہیں حضور ہم سمجھ گئے' کسی کی مانگ کر پہن آئی ہوں گی کیوں بہن حشمت بہو جھینپو نہیں شرماؤ نہیں۔

حشمت بہو: پھر کیا کسی کا اجارہ ہے اچھا کیا ہم نے پھر آپ کو کیا اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اپنا دل اپنی خوشی۔

ثریا بیگم: ہم نے اتنی دیر محنت کی اور ملا کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ ہماری محنت رائیگاں ہوئی۔ مفت اوقات ضائع کی۔

حشمت بہو: کیا مفت کی انگوٹھی تاکی تھی۔ کیا ہمیں بیوقوف سمجھی تھیں۔ ہونہہ! منھ دھو کے رکھیے۔

آسمان جاہ: اتنی دیر محنت کی تو مزدوری (مزدوری) لے لو۔ پکھراج کی انگوٹھی پائی تو کیا گم ہے۔ پھر بھی کہے چار پانچ سو کی ہوگی۔ اچھا تم نہ لو تو ہم کو دے دو۔ مگر ہم نہ لیں گے کہو تو کسی فقیر کو دے دیں گے۔ اسکی روٹیاں چل جائیں گی۔

ثریا بیگم: بی مغلانی۔ اپنی نواسی کو یہ انگوٹھی دے دینا وہ پہنے رہے گی۔ اس کے کام کی ہے۔ اس کو انگوٹھیوں کا شوق بھی ہے۔

مغلانی: اے بی وہ یہ انگوٹھی لے کر کیا کرے گی اس کے پاس اس سے اچھی اچھی انگوٹھیاں موجود ہیں آپ کی عنایت سے۔

ثریا بیگم: لے لو بی مغلانی ہمارے کہنے سے۔

راوی: اللہ اللہ ایسی انگوٹھی ناچیز ہوگئی کہ کوئی لیتا ہی نہیں۔

مغلانی: (انگوٹھی لے کر) بندگی۔ حسینی لو سرکار سے انگوٹھی ملی ہے۔ بندگی کر۔ جھک کر آداب بجالا۔

حسینی: (بندگی کر کے) حضور ہمارا انعام ابھی باقی ہے۔

آسمان جاہ: آئیں۔ واہ۔ وہ کتاب کون لے گیا۔ ہاں یہ رکھی ہے۔ اور اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

بستر ہمارا یار کے ایواں سے دور ہے ‏ درویش آستانۂ سلطاں سے دور ہے

یوں ہی اڑا کریں گی گریباں کی دھجیاں ‏ جبتک کہ ہاتھ دامنِ جاناں سے دور ہے

مجھ عاشقِ غریب سے چھوٹا ہے کوئے یار ‏ مورِ ضعیف ملکِ سلیماں سے دور ہے

کیفیت خراب میں ہے بے تکلفی ‏ پاس ادب مجالسِ رنداں سے دور ہے

کیا دولتِ وصال کی ہم آرزو کریں
بوسہ ملے یہ تہمت جاناں سے دور ہے

ایک بیگم صاحب نے ان کے گانے کی تعریف کی، دوسری نے بتانے کی توصیف کی، کچھ بولیں، اے بہن اب بس ایک کسر رہ گئی ہے، پیشواز منگوا کر ناچنا شروع کر دو۔ یہ بھی ہوس کیوں باقی رہے، نفع سے خالی نہ ہوگا۔ وقت بے وقت ڈومنیوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ آسمان جاہ نے کہا۔ جی میں تو آتا ہے کہ ناچنا بھی سیکھوں مگر پھر سوچتی ہوں کہ واہیات بات ہے گانا اور بتانا ہی کافی ہے۔ یہ دو باتیں کیا کم ہیں کہ ایک ناچ کی مشق کروں۔ ہاں ایک بات کو جی چاہتا ہے ہارمونیم ہمیں نہیں بجانا آتا' یہ ضرور سیکھوں گی۔ کیا باجا ہے۔ مست کرنے والا۔ آدمی قابو میں نہیں رہتا۔ گانے میں ہم برق ہیں۔ ٹھمری ٹپا، غزل، خیال، دھرپت جو کہو، گا دوں، کسی میں بند نہیں مگر چلتی پھرتی چیزیں بہت پسند ہیں۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

ترا آباد میخانہ، ترا آباد میخانہ، اس کی بہت تکرار کی اور اچھی طرح ادا کیا۔

ع بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ

یہ شعر ضرور سننا اس کو بتاؤں گی بھی۔ ذرا دیکھنا خیال رکھنا۔

گزر یا رب گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ثریا بیگم : خوب، بہت ہی خوب، اللہ جانتا ہے۔ جیسے برسوں کی سیکھی سکھائی تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہو۔

آسمان جاہ : پھر سے اسی کو سنئے گا۔ دیکھو کس طرح بتاتی ہوں، اس طرح ادا کروں کہ اچھے گویّے سے بھی نہ ہو سکے۔

گزر یا رب گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں نالۂ بلبل ہے مستانہ

شراب کو ہزار طرح پر بتاؤں اور شاخوں کا جھومنا دو ہزار طرح سے ظاہر کروں۔ ہر ادا سے پیدا ہو تو صحیح۔

اب کی بہار آئے تو مانند شاخِ گُل
رکھیے نہ ہاتھ سے جو پیالہ اٹھائیے

اے جی رکھیے ہاتھ سے، اے اے۔ جو پیالہ اٹھائیے۔ اٹھائیے۔

مے پی کے عید کیجیے گزرا مہِ صیام
تسبیح رکھیے ساغر و مینا اٹھائیے

یہ صحبت ہمیں سازوار ہے۔ بس ایسی ہی صحبت کی بھوکی ہوں۔ ایسی صحبت سب کو بھاتی ہے وہ کون دل ہیں جو ایسی صحبت سے نفور ہوتے ہیں۔ یہ چہل پہل سب کو بھلی معلوم ہوتی۔ لطفِ زندگی یہی ہے۔ چہلیں بھی ہوتی جاتی ہیں۔ دل لگی بھی ہوتی جاتی ہے۔ مذاق بھی ہے، چھیڑ چھاڑ بھی ہے شعر خوانی بھی ہے گانا بھی ہے، یہ نہیں بھتنے بنے بیٹھے ہیں۔ غمزدوں کی صورت بنائے ہوئے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

مگر اگر عیش و سرور، شراب و کباب میں بسر نہ کی تو کیا کیفیت تو یہی ہے۔ اور میرا تو اس شعر سے بہت دل خوش ہے۔

بے غم شراب پیجیے مسجد میں بیٹھ کر
زاہد کی کیا بساط مصلا اٹھائیے

کسی روز آپس کی اور تخلیے کی صحبت ہو تو پھر لطف آئے۔ ایک دن بہو بیگم کے ہاں ہم نے جہل سے گایا تھا کوئی چار یا پانچ ہمجولیاں تھیں سب کی سب پھڑک گئیں۔ یہ غزل گائی تھی۔

دولت سے ہیں تمام سمن بر بھرے ہوئے
ہر گل ہے اپنی جیب میں یاں زر بھرے ہوئے

جتنی ہمجولیاں تھیں، وہاں عشعش کر گئیں۔ بڑی واہ واہ ہوئی۔

خوجی پکڑے گئے

خواجہ بدیع الزماں صبح کو آزاد کی ملاقات کے لیے جاتے تھے کہ اثنائے راہ میں دو تین مسافر ملے اور ان کو دیکھ کر ٹھہر گئے۔ ایک نے سلام کیا تو ان کو سخت حیرت ہوئی کہ یہ یوروپین ہندوستانیوں کی طرح کیونکر سلام کرتا ہے۔ پوچھا آپ لوگوں کا نام۔ ایک نے کہا رامولاف دوسرے نے کہا باسوقاف۔

خوجی : آپ لوگ میدان جنگ سے تو نہیں آتے ہیں۔

رامولاف : ہاں خوب لڑائی ہو رہی ہے۔ ابھی دونوں مساوی ہیں نہ ادھر کی ہار ہے نہ ادھر کی۔ برابر کی چوٹ ہے۔

خوجی : بھلا ترک جیتیں گے یا روسی۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔

رامولاف : ترک۔ روسیوں کے پاس روپیہ کہاں ہے۔

خوجی : ہاں، مگر ہم نے سنا ہے کہ ترکی افسر خراب ہیں۔

رامولاف : بیشک۔ مگر سپاہ اچھی ہے، اور ترک بھی روسیوں کی طرح جری ہیں۔ دونوں طرف کی سپاہ لڑنے مرنے والی ہے۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر میان خاک و خوں بینی سرے

ہزاروں میں فرد ہوں لاکھوں میں لاجواب۔

رامولاف : آپ کا مکان کہاں ہے ۔

خوجی : در ہندوستان جنت نشان، و من باشندۂ کابلستان ہستم ۔ من خواجہ بدیع اشعر ہم نیز می گویم۔

رامولاف : آئیے جوا کھیلیں ۔ ہندوستان کا جوا ہم کھیل سکتے ہیں ۔ اور ہم بھی مٹھیا خیل افغان ہیں۔ آئیے سلہی ہو ۔

خوجی : ہم بد کے پاس نہیں کھڑے ہوتے ۔ جی ہاں ۔ ہو نتھ ۔

رامولاف : کیا خواجہ آپ ہے ۔ آؤ ۔ ایک ایک داؤں ۔

خوجی : جوا بہت خراب شے ہے، ہم نے آج تک نہیں کھیلا ۔ جوا حرام ہے ۔ جواری کی صحبت تک میں ناجائز ہے ۔

رامولاف : یہ آپ نے کیونکر کہہ دیا اس پر کوئی سند لائیے ۔

خوجی : سنیے میں سناتا ہوں ۔

اول : جوے اور شتل دونوں کی ناجائز آمدنی ناجائز اور مضر افعال ہی میں صرف ہوتی ہے، غور کر لیجیے گا ۔

دوم : جب جواری اور شتل لینے والے ؛ دونوں کی نیت خراب ہوتی ہے ۔ دونوں دوسرے کا مال تاکتے ہیں۔ تو دونوں فعل ناجائز اور داخل گناہ ہیں ۔ اس عذر سے کوئی گناہ ثواب اور ناجائز فعل جائز نہیں قرار پا سکتا کہ کھانے پینے کے صرف میں وہ ناجائز آمدنی صرف ہوئی اگر اس بنیاد پر مال کی نقصان رسانی کے مجرم جرم سے بری ہو جائیں، تو چور اور ڈاکو وغیرہ سب سے پہلے بری ہو جائیں ۔ کیونکہ شتل تو اکثر شریف اور مالدار بھی مانگتے ہیں ۔ چوری وغیرہ کے جرائم تو اکثر ننگے بھوکے، بدچلن، فاقہ مست ہی لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں ۔ بس شتل والے کی فاقہ کشی تو ثابت نہیں ہو سکتی، اور چور وغیرہ اکثر فاقہ کشی کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں ۔ اے جناب جوا اور شتل اور چوری وغیرہ یہ سب وہ جرائم نہیں ہیں کہ جن میں کوئی صورت مستثنیٰ بن سکے جو ایک روز ہو یا چند روز چوری ایک دفعہ ہو یا کئی دفعہ ۔ شتیل ایک بار مانگی جائے یا کئی بار سب ناروا اور داخل گناہ عظیم ہے ۔ نہ دیوالی کی رات جوے کے گناہ کو مستثنیٰ کر سکتی ہے اور نہ اندھیاری رات، شب تار چوری کو اور نہ خیرات اور بھیک کا حیلہ شتل کو ۔ جب کسی کا ایک تنکا یا کسی کو ایک خرمہرہ کا نقصان پہنچانا یا کسی کی نقصان رسانی کی نیت کرنا بھی داخل گناہ عظیم ہے تو پھر جوے اور چوری اور شتل وغیرہ ان سب جرائم کا (جن میں دوسرے کی نقصان رسانی مقصود ہوتی ہے) ارتکاب کیسا ۔ ایسے افعال بد کی نیت یا ایسے افعال کے جواز کا خیال اور تصور بھی گناہ عظیم ہے اور شرع اور شاستر اور اصول اخلاق اور انسانیت ہو سراسر

خلاف ہے۔ منوجی نے جوے وغیرہ کو چوری ہی میں شامل کیا ہے۔ فقط فرق یہ رکھا ہے کہ ایک میں مخفی نقصان پہنچایا جاتا ہے، اور دوسرے میں صریحی، نیت نقصان رسانی کی دونوں میں ہوتی ہے اور نیت ہی مقدم ہے۔ نیت ہی پر سارا دارومدار ہے۔

رامولاف: ہاں صحیح ہے۔

خوجی: ع کس بہ شنود یا نہ شنود من گفتگوی می کنم۔

جس طرح سے شودروں نے بے تہذیبی کے واسطے ہولی کا ایک سوانگ بنالیا۔ اسی طرح اور لوگوں نے جوے وغیرہ کے ذریعہ سے پرایا مال تاکنے اور اُڑانے کے واسطے دیوالی کا ایک فقرہ گڑھ لیا مگر شکر ہے کہ برہمن جو عالم تھے اور چھتری جو راجہ تھے۔ ان بلاؤں سے بچے رہے تھے، فقط وہی فرقے جو جاہل تھے۔ ایسے ایسے افعال ناجائز کو ابتدا میں اختیار کرتے، دین و دنیا کے مردود بنے۔ مگر افسوس ہے کہ اب برہمن اور چھتری بھی جاہلوں کے گرو گھنٹال ہو کر افعال بد کے مرتکب ہونے لگے۔ غرض غایت جہالت سے اب طبائع ہوا کہ چاروں برن کی شناخت، جو سابق میں اعمال اور عادات اور افعال سے ہوتی تھی نہ رہی بلکہ ہر ایک برن میں شودر یعنی بداعمال پنچ کرم کے لوگ کثرت سے ہو گئے۔ اسی وجہ سے اب برن کی تخصیص فضول ہو گئی۔ اور نتیجہ جہالت عام کا یہ ہوا کہ مفصلۂ ذیل بہت سے بداعمال فرقے بن گئے اور ہر ایک فرقے نے بجائے خود اپنے اپنے پیشہ ہائے نقصان رسانی اور بے تہذیبی کے واسطے ایک نہ ایک حیلہ بنا لیا۔ چوروں نے اندھیری رات کی چوری۔ ڈاکہ زنوں نے جھٹپٹے وقت کی ڈاکہ زنی۔ جواریوں نے دیوالی کی قمار بازی، اور شتل۔ جھوٹے گواہوں نے اُجرت لے کر جھوٹی گواہی دینی، بے تہذیبوں نے ہولی کی بے تہذیبی، غافلوں اور بے عقلوں اور ناعاقبت اندیشوں نے شادی بیاہ میں فضول خرچی، دشمنانِ جاں نے جوانی کی نشہ بازی، دشمنِ تہذیب نے تیوہاروں اور شادی بیاہ کی گالی گلوج۔ پنجاب کی اکثر اُناث نے بے غیرتی سے دریا و تالاب میں کھلے بندوں برہنہ نہانا اکثر دیہاتی برہمنوں اور چھتریوں نے شادی کے حیلہ سے بُردہ فروشی وغیرہ وغیرہ کو جائز قرار دے کر ہند کی قدیم تہذیب اور شائستگی لیاقت اور علم و عقل کو خاک میں ملا دیا اور دین و دنیا کے وبال میں مبتلا ہو کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا اور کر رہے ہیں لیکن نہایت شکر کی جگہ ہے کہ ہماری قوم کے پڑھے لکھے لائق آدمی ان بلاؤں سے بچے ہوئے ہیں اور جو لوگ صحبتِ بد کی بدولت نشہ بازی وغیرہ کے پھیر میں آ گئے ہیں وہ بھی اس بلا سے نجات پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دونوں روسی باہم چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ خوجی کو طرز کلام سے معلوم ہوا کہ پٹھان ہیں مگر یہ غلطی تھی۔ ایک روسی نے ان سے پوچھا آپ آزاد کو جانتے ہیں خوجی دشمنِ عقل تو تھے ہی۔ کہا جی ہاں،

نہ جاننا کیا معنی۔ بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میرے لنگوٹیے یار تھے اتنا کہنا تھا کہ دونوں روسی بشاش ہو گئے اور مسکرائے مگر یہ احمق اب بھی نہ سمجھا پھر انھوں نے پوچھا کہ آپ بھی ہندوستان سے آئے ہیں۔ کہا۔ جی ہاں۔ پوچھا انھیں کے ساتھ آئے تھے۔ فرمایا جی ہاں۔

رامولاف: تم کو معلوم ہے کہ آزاد پاشا کہاں ہیں۔

خوجی: آزاد پاشا (اب گھبرائے) آزاد پاشا کون؟

رامولاف: جس کا ابھی ابھی تم نے ذکر کیا تھا۔ وہی اور کون؟

خوجی: ہم کو سال میں دو چار بار جنون ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج جنون کی باری ہے۔ کہتے ہم کچھ ہیں اور زبان سے کچھ نکلتا ہے۔

ترچھی جو پڑی زیرِ بغل فرق سے نکلی — مُنہ غرب کی جانب جو کیا شرق سے نکلی

یوں جا کے تنِ ظالم پر زرق سے نکلی — العظمۃ للہ کی صدا برق سے نکلی

اُڑ اُڑ کے جھپکتی تھی جو اعدا کے سروں پر

دم نادِ علی کرتے تھے جبریلؑ پروں پر

رامولاف: ہم ترکوں کی طرف سے آئے ہیں اور گو بندے ہیں۔

خوجی: (غور سے دیکھ کر) ہاں! شاباش، کہیں آزاد کا پتہ لگایا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ گرفتار ہو گئے کئی روسی سوار ایک شخص کو لیے جاتے تھے شاید آزاد ہی ہوں گے اور ہم تو مجنون ہیں، کہتے کچھ ہیں زبان سے کچھ نکلتا ہے۔ ہاں فارسی نظم و نثر میں ایں جانب کو ملکہ حاصل ہے اگرچہ ہندیم والا فارسی زبان ہستیم۔ من بدیع شعر فارسی می گوید۔ بشنو رقعہ کہ بنام نامی بزبان فارسی من بدیع گفتہ بودہ است و آں ہمیں است کہ برمی گوید۔

امید کہ عفر شریف حضرت قبلہ ابوی گاہی از بلیات ناگاہی و نکبات آسانی بہ تقدیر الٰہی موفق و محفوظ باشد فقیر خود بلقضائے یزدانی کشتی قالب را دریا کردہ در تلاطم امواج عمر فرسائے در آمدہ اگر شرط موافقت کرد طواف آں کعبۂ افضال و سجود آں قبلۂ اقبال نصیب خواہد شد والاچہ گنجائش تجلی خواستن است در غور تقصیر بندہ امیدوار است کہ ہرگز محظور ضمیر فیض پذیر نہ شود۔ و ہمچنیں از دیگر امہات مقدمات ملتمس است دیگر چہ نویسد ظل عالی مستدام باد۔ الحمد للہ کہ از اسباب دنیوی ہیچ نداشتہ و ہیچ نگذاشتہ مکتوب بخدمت خلاصۂ دودمان اجلال و اقبال و نوبادۂ گلشن بہت و استقلال ارسطو منش بقراط منش مستشار و موتمن پایگاہ خاقانی دانشور حق پژوہ کارگاہ سلطانی بزم آرائے محفل قدس شاہنشاہی یکتا گوہر

دریائے خدا آگاہی منتخب مجموعۂ جرائد کون و فساد حلال غوامض اسرار آبائے اجتہاد سخنور دانش پرداز وزارت پرور سلطنت طراز بزرجمہر وقت کشاف مضامیر شگفت دستور دستوران افضل الانامی شیخ ابوالفضل علامی قیامی ورونق ناظری و نظر بیانی مخاطبا بالنفسی الدہر العاصیۃ الصلحاء اللہ تعالیٰ۔

زوق فنا نیافتۂ ورنہ در نظر
رنگین تر از بہار بود جلوۂ خزاں

حق سبحانہ تعالیٰ نظر کرامت فرماید احوال خانہ کہ ماتم کدہ خانہا و غم خانۂ دلہاست چہ نویسد نظر بر ظرماں عقلات کہ سرنوشت عالم کون و فساد بانست انداختہ قیاس می فرمودہ باشند بندہ ہم فرد کامل اسباب عقل ستجوں تفاوت درجات قوابل و استعدادات خواہند فرمود معذور خواہند داشت والحق معذورست آلان ہمگی خاطر مستہام نگراں نصیحت و عافیت انسان است المنۃ للہ کہ بعافیت مقرونند امید کہ شفائے تمام کرامت شود چوں دو روز گزشتہ بود شرح احوال نوشتہ این دو کلمہ در چاشت پنجشنبہ ہفتدہم ربیع الثانی درعین برہم زدگی و دل نگرانی نوشت سلامت باشند حضرت قبلہ گاہی صحت و سلامت اند و مفاوضۂ گرامی فرستادہ اند دیگر خورد و کلاں دعامیرسانند حضرت نواب جیوخوں بلغم می ستند و کار برایشاں تنگ شدہ بود چوں ایام ماتم بود ظاہر نمی گردید از مدتے ظاہر شد الحمدللہ کہ صحت تمام یافتند۔ بحال خود آمدند غنیمت است۔

اخوت و عطوفت پناہا بنوعیکہ دل افسردگی و دل سردی و ضعف قوی و اختلال جراح این مستہام را بہم رسیدہ کہ شرح نتواں کرد ما تقدیر چیست در یں دو روز نقل مکان معہود خواہد شد و دریں ایام کتابہائے فقیر کتاب مصیبت نامہ عطار و آمد جتر ستادن آں مناسب دید کہ سلوک اختیار کردم فرض وقت است و آنچہ خاطر را تسلی می بخشد مصیبت آن اسلت کہ بندگان حضرت خلافت پناہی ہنوز ولایت خاص الجماعہ را دریافتہ آمد و تعصب و بے دیانت آنہا را دانستہ۔ الحمدللہ علیٰ کل ذالک حق سبحانہ ظلال دولت و اقبال است حضرت را مستدام دارانہ۔ و آنکہ نوشتہ اند کہ از ناکوریان در مجلس بعضی دشمناں نام والدہ سیدہ فقیر را باہانت بردہ اورا بالغضب خدا سپردہ شدہ است فرزند ارجمند از نسب لاف زدن استخوان پدر فروختن است و افتخار بکمال غیر کردن نشاں۔

بندۂ عشق شو و ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

رامولاف نے خواجہ بدیع الزماں صاحب کا قافیہ خوب تنگ کیا۔ کہنے کو تو خواجہ صاحب کہہ گئے ہیں کہ میں آزاد پاستا کو خوب جانتا ہوں مگر جب رامولاف نے سوال کرنا شروع کیے تب جکڑ گئے۔

خوجی : ہمارن پارکی حضور نے ملاحظہ فرمائی یا نہیں۔

رامولاف: یہ آپ کے باپ کا کلام ہے یا آپ کا۔

خوجی : باپ سے کیا واسطہ خاص ہمارا کلام ہے۔ کلام خاص بدیع الزماں ایسے ایسے ہم نے رقعے بہت لکھے ہیں۔

رامولاف : آزاد پاشا کا پتہ بتاؤ ورنہ تم بھی قید خانے بھیجے جاؤ گے۔

خوجی : میں نے کیا قصور کیا ہے۔ جناب۔ بندہ تو خادم ہے۔ بلکہ خادم کا خادم میں کیا جانوں کہ آزاد پاشا کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ نام البتہ سُنا ہے۔ آزاد پاشا آزاد پاشا سنتا آیا ہوں مگر یہ نہیں معلوم کہ آزاد پاشا کہاں کے باشندے ہیں کون ہیں کون نہیں ہیں۔ بالکل علم دیقین سے خارج ہے۔

میں کیا جانوں مجھے خبر کیا

آزاد کون کدھر گیا ؟

راوی: ایک مصرعہ کی گھٹ گئی ہے دم۔

رامولاف : تم خوجی ہو۔ تمھارا نام مشہور ہے۔ تم آزاد کے ساتھ ہندوستان سے آئے ہو اور تم کو بخوبی معلوم ہے کہ آزاد پاشا کہاں ہیں۔ جو شخص آزاد کے دھوکے میں گرفتار ہوا، وہ اصل میں آزاد پاشا نہیں ہے۔ دو آدمیوں کی گرفتاری کا حکم ہوا ہے۔ ایک خواجہ بدیع دوسرے آزاد پاشا ہے۔ تم تو مل گئے۔ اب وہ باقی رہے۔

خوجی : کچھ خیر ہے۔ مجھ غریب مسافر کو گرفتار کرتے ہو۔ اور مسافر بھی کون کہ دیوانہ کہتا ہے کچھ زبان سے نکلتا ہے کچھ۔

اب خواب سے چونک وقتِ بیداری ہے　　بے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے

مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں

یہ قید کی منزل بھی غضب بھاری ہے

رامولاف اور ان کے دوست دونوں نے خواجہ صاحب کے ہاتھ پکڑ لیے اور ان کی زبان چلی۔ اوگیدی بھلا بے گیدی۔ ابے گیدی او گیدی۔ تم دونوں گیدیاں کو ہم سمجھ لیں گے۔ ہم سے اور ٹررنت۔ بھلا دو دن سے تپ نہ آتی ہوتی، تو مار ہی ڈالتا۔ سور۔ دونوں گیدیاں کے لیے ہم کافی ہیں۔ مگر وقت، اتفاق، افتاد کی خیر سمجھا جائے گا۔ فہمیدہ خواہد شد۔ ہم سمجھ لے گا۔ کچھ اس بات کا پروا نہیں ہے ہم کو۔ ع

ہرچہ بادا باد، ما کشتی در آب انداختم

اب جو چاہے سو ہو۔

رامولاف : جب تک تم نہ بتاؤ گے تب تک پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

خوجی: خدا تجھ سے سمجھے او گیدی۔ بلکہ گیدیاں۔ تم سے لڑنے آیا ہے۔ اچھا ذرا ہاتھ چھوٹے تو ہم سمجھ لیں۔ نہ ہوئی قرولی۔ ورنہ اس دم دم کے دم میں سمجھ لیتا' اور ایک کی دو' دو' تم دو ہم ایک بڑا فرق ہے۔

راوی: وہ ایک ہی آپ کے لیے کیا کم ہے۔ دو نہ ہوں تو آپ کیا بنا لیں۔ عورت تک نے اٹھا کے دے مارا۔

خوجی: اگر قرولی در دست ما بدے من ہر دو گیدیان را بریند۔

فکر سے میں نہیں خالی غم جاناں میں کبھی
کبھی زانو پہ مرا سر ہے گریباں میں کبھی
ناتواں ایسے ہیں ہم سایہ گلوں پر جو پڑے
نکہت گل سے نہ جنبش ہو گلستاں میں کبھی

ہے یہ میرے دل صد چاک سے نفرت ان کو
شانہ کرتے نہیں وہ زلف پریشاں میں کبھی

راموولا: اس گفتگو سے کیا فائدہ اس سے مطلب بر آری معلوم۔

خوجی: تم گیدیاں سے ہم نہ بولے گا۔ ہم نے تم کو حوالۂ شیطان کیا۔ بس وہی تم سے سمجھے گا۔ کھڑے کھڑے سمجھ لے گا۔

اس مست نے جو کی سوئے دریا نگاہ گرم
پانی ہوا شراب تو ماہی کباب ہے

اب سنیے کہ پولینڈ کی شہزادی کے ہاں خوجی کی گرفتاری کی خبر پہنچی۔ مس کلیرسا اور شہزادی صبح کو میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ ایک شخص نے جا کے کہا' ان کو اطلاع دی کہ خوجی پکڑے گئے۔ پولینڈ کی شہزادی بھی خواب ناز میں ہی تھیں' اور آزاد پاشا بھی آرام کر رہے تھے مگر گھر بھر میں کھلبلی مچی ہوئی' لونڈیاں' مِس خدمتیں خواصیں باہم گفتگو کرتی تھیں کہ آزاد پاشا کو جلدی سے جگا دیں تاکہ اپنے بھاگنے کی فکر کریں۔

کلیرسا: پہلے تو دریافت کرلو کہ خوجی کو انھوں نے کیوں گرفتار کیا ہے۔ شاید کوئی اور سبب ہو۔

خادمہ: بہت خوب میں ابھی ابھی جا کے دریافت کرتی ہوں۔

خواص: اب اس طرح نہ پوچھنا کہ بھڑک جائیں' اور تم کو ہی گرفتار کرلیں۔ تمیز کے ساتھ دریافت کرنا اور خوجی سے مخاطب بھی نہ ہونا کہ کوئی مطلب ظاہر ہو۔

خادمہ: میں اُدھر سے آؤں گی ان کو دیکھ کر پوچھوں گی کہ کس ملک کے آدمی ہیں۔ بس ہوتے ہوتے اور باتیں بھی دریافت کرلوں گی یہ کہہ کر خادمہ روانہ ہوئی۔ دیکھا کہ خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع کے دونوں ہاتھ چوروں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خواجہ صاحب نے یہ شعر پڑھے۔

کھل گیا ہے پیرہن میں جسم تجھ مایوس کا
ایک عالم کو گماں ہے شمع اور فانوس کا
جو کہ ہیں بے درد کیا اُنکو ہے قدر داغ عشق
مرتبہ زخمی سمجھتے ہیں پر طاؤس کا

خادمہ : (رامولاف سے) یہ کس ملک کے رہنے والے ہیں؟
رامولاف : بتاتے تو کابل کے ہیں، مگر ہیں ہندوستانی۔
خوجی : ہم ہندوستانی ہیں۔ اور یہ خراسانی۔ بلکہ خرِ خراسانی۔
خادمہ : ان سے کیا قصور ہوا جس کے جلدو میں پکڑے گئے۔
خوجی : بلا قصور پھانس لیا

وصلِ نوشاہ کج کلاہ ناوک نگاہ
وعروسِ قوسِ ابرو عبرتِ مہر و ماہ

ساقیا ہے یہ وقتِ میخواری	رختِ رز کر رہی تیاری
ساقیا جم حشم کدھر ہے تو	حال میکش سے کچھ بے خبر ہے تو
ساقیا کیا ہے لطف تیرے بغیر	میری بدمستیوں کی دیکھ تو سیر
ساقیا دیر کا نہیں یہ مقام	مے دیدار کا کوئی دے جام
ساقیا آج دن خوشی کا ہے	یہی ہنگام مے کشی کا ہے
ساقیا آج ناخدائی کر	رندوں کا پاس آشنائی کر
دھوم مستوں نے یہ مچائی ہے	دخترِ رز کی بات آئی ہے

رختِ رز آج بیاہی جاتی ہے
پیرِ میکش تلک براتی ہے

آج عجب سماں ہے۔ طاؤس خامہ چمن صفحہ پر رقص کناں ہے۔ صریر قلم سے مبارکباد کی آواز آتی ہے۔ دل کی کلی کھلی جاتی ہے۔ بادِ صبا مشک بیز و غالیہ بار ہے۔ پیش رو قافلہ سا و تاتار ہے۔ ایوان کیواں نشان نوعروس چاردہ سالہ کی طرح آراستہ ہے۔ ہر دیوار و در لطافت سے مملو، ہر مقام پیراستہ ہے۔ شیشہ آلات سے محل معلّی جگمگاتا ہے۔ بہشت شدّاد کو چپہ چپہ شرماتا ہے۔ حاصل کان و بحر، اس مقام پر بہار و مینو سواد پر نثار ہے۔ الٰہی یہ آراستگی ہے یا کسی نوخیز و عنبر مو دلھن کا نکھار ہے۔ کسی طرف طرب و مسرت کے چہچہے۔ کسی سمت طائران خوش نوا کے قہقہے۔ نسیم عنبر شمیم کو یہ دعویٰ تھا کہ آتش نمرود کو دم میں گلزار خلیل بنا دوں۔ ایک جھونکے سے سحر سامری کا لطف دکھا دوں۔

عجب ہے نام خدا لطف رنگ خاکِ چمن	حنائی ہوتے ہیں پا سے بتانِ دم رفتار
نسیم گل میں ہے تاثیرِ معجزِ عیسیٰ؟	نہ کوئی دیدۂ نرگس کو اب کہے بیمار

خروشِ خندۂ گل اس قدر ہے گلشن میں | کہ کان تک نہیں آتی نوائے بلبلِ زار
چمن میں لائیں اگر عندلیب کی تصویر | تو صفحے سے وہ نکل جائے ہے یہ جوشِ بہار
زمین تو غیرتِ آئینہ ہے عجب کیا ہے | لگے جو بولنے طوطی سبزۂ گلزار
چمن کے سبزے پر آ کر گرا جو شاخ سے پھول | سنا نہ تھا کبھی ہوتے گل پیادہ سوار
یہ پاسِ نازکیِ شاخِ گل ہے گلشن میں | کہ دم چرائے ہوئے پھرتی ہے نسیمِ بہار
شراب اوس ہے گل جام غنچے مینا ہیں | نسیم لاتی ہے گردش میں ان کو ساقی وار

ہر ایک شے میں رطوبت نے یہ کیا ہے اثر
بنا ہے کاغذِ ابری برنگِ ابرِ بہار

اب سنیے کہ شبِ عروسی کو پولینڈ کی گل رخسار شہزادی نے وہ سامانِ طرب بہم پہنچایا کہ بزمِ فریدونی، اور جشنِ جمشیدی دونوں کو مات کر لیا۔ ایک سمت سبز پری پیکر شہزادیوں کا جھرمٹ، ایک طرف غنچۂ دہن گل بدن خواصوں کا جمگھٹا۔ چہل پہل، مذاق، دل لگی۔ میاں آزاد بلا تشبیہہ اپنے وقت کے کنہیا بنے ہوئے اور طرہ یہ کہ سب سے دل لگی کا رشتہ، سب کے بہنوئی بنے ہوئے تھے۔ گو چھیڑ چھاڑ کرتے تھے مگر طبیعت یہی چاہتی تھی کہ تخلیہ ہو۔

شوق کہتا تھا اب حجاب ہے کیا
شرم مانع کہ اضطراب ہے کیا

شہزادی بھی زبانِ حال سے در پردہ یہی کہتی تھی کہ:

آ گلے سے لپٹ جا میری جان
ہمکناری کا ہے بہت ارمان

مگر وفورِ حیا سے لب پئے اظہارِ مسؤل کھولنا شاق گزرتا تھا۔ دل میں دعا مانگتی تھی کہ یا خدا کہیں تخلیہ ہو۔ دُلھن اور دولھا ہو۔ اتنے میں آزاد کی نظر مس میڈا پر پڑی۔ دیکھا کہ گل رخسار مرجھائے ہوئے ہیں۔ آنکھیں پُرنم ہیں، آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں، آثار سے پایا جاتا تھا کہ دل بھر آیا ہے۔ رقابت نے ستایا ہے۔ اشارے سے کہا کہ تمھاری محبت مستور ہے بلکہ پہلے سے دو چند زیادہ کیونکہ بندہ تمھارا کمال مشکور ہے، مگر وہ گل اندام زیبا خرام، زبانِ حال سے یہی کہتی تھی کہ:

چلو تم ابھی اُن سے بات کرو
جن سے الفت ہے آج کل تم کو

مس مَتنیڈا کے سوا اور سب خوش و خرم تھے۔ یہ بیچاری کیوں کر خوش ہوتی۔ اوّل تو یہ حسد کہ جس پر دل آیا تھا اور جس کو پیار کرتی تھیں وہ دوسری کا پیارا ہوا۔ دوسرے یہ خیال کہ یہ تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہی رہیں۔ اور بہت سرخرو ہو گئی۔ تیسرے یہ خوف کہ مبادا آزاد اس پری پر ریجھ جاتے اور پھر ترک کی جانے کا لفظ زبان پر نہ لائے، الوداع اور اقسام کے خیالات نے مَتنیڈا کو انتہا سے زیادہ پریشان کر دیا تھا مگر عالم مجبوری تھا۔

شرم سے چپکے چپکے رویا کی　　رات بھر فرش غم بھگویا کی

دردِ دل سے عجیب نوبت تھی　　جانکنی سے سوا اذیت تھی

پھنکی جاتی تھی شرم کے مارے

گُل بستر بنے تھے انگارے

کلیرسا: دیکھو بہن! یہاں بہت سمجھ بوجھ کے رہنا چاہیئے۔ سمجھیں؟

مَتنیڈا: اندر والا ذرا نہیں مانتا۔ لاکھ سمجھاؤں سمجھتا ہی نہیں۔

اب بتاؤ میں کیا کروں تدبیر

یہ تو بن کر بگڑ گئی تقدیر

کلیرسا: جانتی تو ہو کہ دو چار روز کے بعد آزاد بھاگ چلیں گے۔

مَتنیڈا: ہائے، یہی تو حسرت ہے کہ یہاں سے چھٹکارا محال ہے۔

کلیرسا: تمہارے کہنے سے محال ہے۔ یہ کاہے سے تم نے جانا؟

مَتنیڈا: ان کی طبیعت ایک سی نہیں رہتی۔ شاید اس شہزادی کا جادو کارگر ہوا، اور اس نے پھسلا دیا پھر ہمارے ماں کے نہ رہیں گے۔

کلیرسا: کتنی سادی ہو بہن۔ آزاد اور پھسلانے میں آئیں۔

مَتنیڈا: یہ نہ کہو بہن۔ یہ بہت بُرا کوچہ ہے، بڑے اچھے اچھے ڈگمگا جاتے ہیں۔ اور چٹکیوں میں بڑے بڑے خرانٹ نیچا دیکھتے ہیں۔

عشق آیا قیامت آئی ہے

پارسائی پر آفت آئی ہے

اب تو بجز کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ سو اس سے کیا ہوتا ہے سچ یوں ہے تمام عمر کا رونا ہے۔ خیر۔

آہ موزوں کے ساتھ نالہ کروں　　خوب مصرع ہے یہ برابر کا

کب تلک ان بتوں کے ظلم سہوں — اے خدا دل نہیں ہے پتھر کا
یادِ رنداں میں ہم جو روئیں ابھی — اٹھے طوفان آبِ گوہر کا
کھو ابرِ بہار سے آئے
دیکھ لے جوشش دیدۂ تر کا

ہمجولیوں نے شہزادی کو چھیڑنا شروع کیا۔

ایک: اے بہن اب دیر ہوتی ہے۔ اتنی رات آگئی کچھ ٹھکانا ہے۔

دوسری: لے خدا حافظ۔ اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔

شہزادی: اے ہے۔ ابھی سے آج رات کو یہیں رہ جاؤ تو کیا ہرج ہے۔

ہمجولی: (مسکرا کر) سچ کہیے گا۔ ایسا نہ ہو پھر کوسنے لگو۔

دوسری: اوپر کے دل سے کہتی ہیں۔ دل میں تو چاہتی ہوں گی کہ کسی طرح سب دفان ہوں، ہے کہ نہیں؟

تیسری: دل میں! ای دعا مانگتی ہوں گی بہن کہ سب دفان ہوں۔

چوتھی: اب زیادہ دق نہ کرو۔ (خواصوں سے) اب اللہ نے چاہا تو سویرے ملیں گے مگر آج تو صبح کو شاید ہی ان کی آنکھ کھلے۔

پانچویں: (اٹھ کر) خدا حافظ ہے بہن اللہ کو سونپا کل مزے مزے کی باتیں ہوں گی۔ سلام کیا خاموش بیٹھی ہیں بیچاری۔

شہزادی: اللہ جانتا ہے ابھی کچھ ایسی رات نہیں آئی ہے۔

ہمجولی: (تنک کر) اے ہٹو بھی۔ کوئی گنواری مقرر کیا ہے۔ واہ۔ اور سینے گا ذری۔ اچھا پھر برا نہ ماننا۔ دل میں چپکے چپکے کوسنے کی سند نہیں ہے۔ کہو تو اسی بات پر آج یہیں سو رہوں۔ اور دس اور کو ساتھ لے کے۔

اس فقرے پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا اس ہمجولی کا منشا یہ تھا کہ اگر اسی بات پر آجاؤں تو دس بارہ اور ہمجولیوں کو لے کر سو رہوں تو شہزادی بہت برا مانیں، مگر ہمجولی کا لفظ محذوف کر دیا اور دو تین شہزادیوں نے ہنس کر کہا۔ اے واہ بی۔ ایسی حیادار ہو دس کو ساتھ لے کے سو رہو گی۔

الغرض تخلیے کی صحبت ہوئی۔ دولھا اور دلھن کے سوا تیسرے کا نام نہیں، دس پانچ ہمجولیاں قریب کے کمرے میں تھیں، اور برامدے میں خواصیں۔ سب کی سب جوان اور حسین۔

آزاد: اللہ اللہ۔ میں اور ایسی سمن پوش عروس نازآفریں سے ہمکنار ہوں، اور ایسی عروس جس کے

غرور کی انتہا ہی نہیں۔

تجھ سے مغرور کی جھکی گردن
یہ بھی اک شانِ کبریائی ہے

شہزادی: تیرے حسن گلوسوز نے خرمن غرور کو سوخت کر دیا۔ مگر میں ہی اکیلی ملزم نہیں ہوں۔ تمھارا بھی جرم ہے۔

گو زدستِ زلفِ مشکینت خطائی رفت رفت
ور ز ہندوے شما بر من جفائی رفت رفت
گر دلم از طرۂ دلدار تابی رفت رفت
در میانِ جان و جاناں ماجرائی رفت رفت

ہمارا تو یہ قول ہے اور تم بھی دل سے یہ باتیں بھلا دو۔

آزاد: میں بھلا دوں! چہ خوش۔ ایک بوسہ شکر بار کو خدا نے تاثیر بخشی ہے کہ ہزاروں باتوں کو انساں دم کے دم میں نسیاً منسیاً کر جائے۔ چلو خیر انجام تو بخیر ہوا۔

شہزادی: شکریہ ہے۔ (بوسہ لے کر) واسطے خدا کے اب پچھلی باتوں کا ذکر نہ کرنا۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔

آزاد: اس وقت جوش اور ولولے کی باتیں لطف دیتی ہیں، یا اگلی پچھلی باتیں۔ میں نے صرف تمھارے چھیڑنے کے لیے کہا تھا۔

شہزادی: تو جانِ من، چھیڑنے کی اور بہت سی باتیں نہیں ہیں۔

راوی: کیا غضب کا فقرہ کہا۔ کس قدر جامع ہے۔ اللہ۔ اللہ۔

آزاد: ہم تو مس کلیر ساکی نوازش کے کمال ممنون ہیں۔ اب ایسے مقام پر لے چلو جہاں روسیوں کا خوف نہیں بس۔

شہزادی: جانی خدارا ایسی باتیں نہ کرو، اس وقت لطف صحبت اور ہمارے تمھارے مزے کو کرکرا کر دیں۔ واسطے خدا کے ایسا نہ کرنا۔ تیری ایک ایک ادا دل میں کھپ گئی ہے چاہے ثروت جاتی رہے، آرام و راحت سے ہاتھ دھوؤں عیش کھوؤں مگر آزاد سے مفارقت گوارا نہیں۔

ہے ترے رُخ سے آفتاب خجل	کفِ پا سے ہے ماہتاب خجل
جام پر ہنس رہا ہے ساغرِ لب	چشمِ میگوں سے ہے شراب خجل
ہنستے ہیں جب وہ دانت دیکھ لیے	ہو گیا گوہرِ خوش آب خجل
دیکھتے ہی عرق عرق ہو جائے	آگے اس گل کے ہو گلاب خجل

آزاد : کیوں پیاری۔ بھلا تمام عمر ایسی ہی محبت رہے گی۔

شہزادی : اور یہ ترقی پائے گی اور محبت بڑھتی جائے گی۔

آزاد : بھلا یہ وعدہ کرتی ہو کہ میری زندگی بھر تمھارا پیار بدستور قائم رہیگا اور کبھی ذرا بھی کم نہ ہونے پائے گا۔

شہزادی : معقول۔ میں یہ اقرار البتہ کرتی ہوں کہ اپنی زندگی بھر اسی طرح دل وجان سے قربان رہوں گی۔ مگر یہ اقرار کیوں کر کر سکتی ہوں کہ تمھاری زندگی بھر محبت کم نہ ہوگی۔

آزاد : (مسکرا کر) بات تو واقعی اچھی پیدا کی۔

اتنے میں دور چلنے لگا۔ شہزادی اپنے دست نگاریں سے بھر بھر کے جام دیتی تھیں اور صحبت کے مزے لیتی تھی دفعتاً قبلہ رُخ سے گھنگھور گھٹا اٹھی اور بجلی چمکنے لگی پھر کیا پوچھنا تھا۔

گردش گرداب ساقی گردش پیمانہ ہے　　ابر ہے آب رواں ہے لغزش مستانہ ہے

دست ساقی شاخ ہے ہر ایک گل پیمانہ ہے　　سرو مینا ہے نوائے فاختہ مستانہ ہے

راحت وعیش و طرب کس کا گزر ہوتا نہیں

یا الٰہی دل ہے میرا یا مُسافر خانہ ہے

آزاد : یا خدا جیسے خوش وخرم ہم دونوں آج ہیں ایسے ہی تمام عمر رہیں۔ یا الٰہی یہ طرب ونشاط کم نہ ہو۔ یا رب یہ مسرت وانبساط کالعدم نہ ہو۔ یا باری تعالیٰ ہم دونوں ہمیشہ فائز بمرام رہیں، ہمیشہ آرزوئیں بر آئیں اور نیک نام رہیں۔

تا حوریں پھریں خلد میں غلماں کے برابر　　جب تک ہے بقا ساری خدائی کو خدایا

پھٹکے نہ خزاں تیرے گلستاں کے برابر　　دشمن ترے پامال رہیں صورتِ سبزہ

ہو ایسی تری حشمت واقبال کو رفعت

پہنچے نہ فلک بھی ترے داماں کے برابر

شہزادی : (بوسے کر) آمین خدا کرے یہ دعا مقبول ہو۔

آزاد : بیشک قبول ہے۔ ہم خدا کے مقبول بندے ہیں۔

اب سنیے کہ دور شراب کے بعد مستی نے رنگ اثر جمایا۔

بیا ساقی آں مے کہ جاں آورد　　کرامت فزاید کمال آورد

بیا ساقی آں جام چوں مہر وماہ　　بدہ تا زنم بر فلک بارگاہ

بیا ساقی آں جام چوں سلسبیل　　کہ دل را بفردوس باشد دلیل

بیا ساقی آں لعل یاقوت رنگ — کہ بُرد از رُخ لعل و یاقوت رنگ
بدہ ساقی آں آب افسردہ را — بیا زندہ سازایں دل مردہ را
بدہ ساقی آں بکر مستور مست — کہ اندر خرابات دارد نشست

پولینڈ کی شہزادی کا جوبن پھٹا پڑتا تھا اور نشہ شراب نے اور بھی آتش حُسن کو بھڑکا دیا تھا۔ آزاد پاشا چشمان نیم نرگسی اور جبین مبین اور پیشانی نورانی اور زنخداں صفا پرور اور گل رخسار اور بناگوش صفا گوش کے بوسے لیتے جاتے تھے اور برابر جواب پاتے تھے۔ آزاد نے ان اشعاروں کو من مستی میں ترجمان دل کیا۔

چہ قامتے کہ ز سر تا قدم ہمہ جانی — چہ صورتے کہ بہیچ آدمی نمی مانی
چہ صورتے کہ گل گلستان فردوسے — چہ قامتے کہ سرو باغ و بُستانی
بے حکایت حسنت شنیدہ ام جاناں — کنوں کہ دیدمت الحق ہزار چندانی

ز جستجوے تو ننشینم ارچہ ہر تقسیم
میان خون دل و آبدیدہ نیشانی

شہزادی دل میں سوچنے لگی کہ دیکھیے یہ عیش و طرب دائمی ہے یا دو روزہ مارے خوشی کے اشک پریشان روزگار آنکھوں سے جاری ہو گئے تھے۔ آزاد آنسو پوچھتے ہیں اور دونوں آنکھوں کے پیارے بوسے لیتے ہیں مگر طرفین کی یہ کیفیت کہ کبھی خوش کبھی ناخوش۔ کبھی شکریہ باری ادا کرتے تھے کہ مُنہ مانگی مراد پائی۔ آرزوئے دل برآئی۔ کبھی یاس و نومیدی صورت ہیبت دکھاتی تھی۔ بڑی کھڑی سامنے نظر آتی تھی۔

گاہ امید گاہ نا امید — رنگ رخ گاہ سرخ گاہ سفید

آزاد کو حسن آرا بیگم یاد آئیں تو بے اختیار رو دیے۔

بے وفائی کا ابھی گاہ خیال — اور بدنامیوں کا گاہ ملال
فوج غم دل پہ عازم شبخوں — مائل چاک جیب دست جنوں

جان دینے پہ یاس ابھارتی تھی
دل سے لطف حیات اتارتی تھی

شہزادی: اس وقت ہم دونوں کو خدا جانے کیا یاد آیا کہ لاکھ ضبط کیا مگر آنسو آنکھوں سے نکل ہی پڑے۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

آزاد : زیادہ خوشی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ مقامِ خوف نہیں۔

شہزادی : اُف میں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ ضبط گریہ کروں مگر نہ رہا گیا۔ مجبور ہوگئی اور آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔

آزاد : علیٰ ہذا القیاس۔ آؤ اب مُنہ دھو ڈالیں۔

شہزادی نے خواصوں کو آواز دی وہ پانی لے کر آئیں۔ ادب کے ساتھ میاں بیوی کا مُنہ دھلایا۔ کچھ فواکہہ لذیذ ولطیف کھلائے اور باہر چلی گئیں۔ ادھر بالکل تخلیہ ہو گیا۔

شہزادی : بس اب رنج و غم پاس پھٹکنے تک نہ پائے گا۔

آزاد : (مسکرا کر) ابھی ایک بات کہوں تو تنکنے لگو گی۔

شہزادی : (تیکھی چتون کر کے) تمھیں قسم ہے جو نہ کہو۔ فرمائیے۔

آزاد : اب ہمیں یہ فکر ہو گئی ہے کہ کسی اور شہزادی کو پسند کر رکھیں تمھارا تو اعتبار نہیں رہا۔

شہزادی : کیا! ہمارے ہوتے ساتھے اور کی ضرورکیا ہے۔ تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو۔ اور۔

آزاد : شاید —— کہوں —— میں سوچتا ہوں کہ شاید —— مبادا —— کوئی ——

شہزادی : یا میرے اللہ۔ اے صاحب کچھ کہیے گا بھی۔ توبہ۔

آزاد : شاید کسی ملک کے دو اور شہزادے آجائیں تو ہم پھر نکلوا دیے جائیں۔ (کھنکھار کر) کیوں!

شہزادی بہت شرمائی جھینپ کر گردن نیوڑھا لی۔ اب اس کے بعد کیا لکھیں، دولھا دُلھن کی بات وہی دونوں جانیں۔

ہمجولیاں باہم چُہل کرتی تھیں اور تاک جھانک کی فکر میں تھیں۔ ایک شوخ نے دروازے پر ہاتھ مارا مگر صدائے برنخاست۔ خواصوں نے منع کیا اور کہا حضور ہمارے اوپر بدنامی رہے گی۔ حضور خفا ہو جائیں گی کہ تم نے کیوں نہ روکا۔ وہ خواصوں کی باتیں کب ماننے والی تھیں کسی نے آئینے میں سے جھانکا۔ کوئی دروازے کی درار میں سے دیکھنے لگی لیکن آزاد پاشا نے چالاکی کی تھی کہ کمرہ بدل دیا تھا۔ آخر کار سب تھک کے سو رہیں۔

صبح کو ہمجولیاں بن ٹھن کے آئیں تو کمرے کے دروازے بند پائے۔ کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ کسی نے زنجیر ہلائی کسی نے آواز دی ایک نے چلا کر کہا۔ سونے والو جاگو۔ جاگو جاگو۔ بخیر سونے والو۔ رات اندھیری ہے، مینہ رم جھم برستا ہے۔ چوروں کی بن آئی ہے۔ جاگو سونے والو۔ قہقہے پر قہقہے پڑتے تھے اور خیر سے جتنی تھیں سب چمن طبع رنگین مزاج۔ ہنسوڑ دل لگی باز، عیار شوخ کوئی نہذب نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہیں کہ پولینڈ کی شہزادی ناز و ادا سے دلربا کے ساتھ جھومتی ہوئی سامنے سے چلی آتی ہے۔ جتنی کھڑی تھیں دنگ ہو گئیں اور قہقہہ لگا کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک : ارے! کیا خوب۔ یہ کدھر سے آگئیں۔ شاباش شاباش۔

دوسری : اڑکے آئیں کیا؟ آخر یہ آئیں کس طرف سے۔ واہ!۔

تیسری : ہم جانتے ہیں اس طرف کوئی کمرہ ہے، وہیں سوئی تھیں۔

چوتھی : ہاں! ہاں! اور وجہ سمجھیں جس میں کوئی جھانکنے نہ پائے۔ یہ تو ایک کلاکار ہیں نہ۔ ہم سمجھ گئے۔ خیر۔

شہزادی : اللہ جانتا ہے۔ تمھاری کسی کی بھی باتیں جو ہماری سمجھ میں آئی ہوں۔ خدا جانے یہ سب کی سب کیہ کیا رہی ہیں۔ زعفران کا تختہ تو نہیں ہے۔ جہاں کوئی ہنسی ضبط ہی نہیں ہو سکتی۔

ہمجولی : اس وقت تو کل سے بھی زیادہ جوبن ہے۔ مگر بال بے طور بگڑے ہوئے ہیں نرگس غمزہ زن کی چشمک زنی اور ہی لطف دکھاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے شب کو عطر کے دریا بہا دیے۔ گیسوئے دراز کی عطر بیزی اور لباس کی گل ریزی ستم ڈھاتی ہے کہ روح وجد میں آتی ہے، مست ہوئی جاتی ہے۔ اس وقت واقعی شہزادی کا حسن اور جوبن قابل دید تھا بلکہ دید تھا نہ شنید تھا۔ عورت کیا آفت تو بہ نصوح تھی۔ نمکپاش جگر مجروح تھی عدوے شکیب و ہوش۔ سیمبر سمن پوش۔

طوبیٰ مثال سروی و شمشاد قامتے

من وصف قامت تو چہ گویم قیامتے

اور نزاکت کا تو اور ہی عالم تھا ہر رگ و پے میں نزاکت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، یوں تو جو تھی نازک بدن۔ مگر ان کی نزاکت سب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ کئی ہمجولیوں سے مل کر کہا (واقعی نزاکت اسے کہتے ہیں۔ نزاکت اس کے معنی ہیں۔)

نازک اندامے کہ عالم کشتۂ آغوش اوست

سایۂ بالائے او از سرکشی ہمدوش اوست

شہزادی اٹھلاتی ہوئی چلی کہ کمرے کے دروازے کھول کر آزاد کو جگا دوں تو ہمجولیاں ہنس کر تالیاں بجانے لگیں۔ ایک نے کہا کیا مستانہ چال ہے، دوسری بولی عجب خرام ناز ہے۔

بس کہ جاں بخشد خرام آں پری

ساز داز نقش قدم کبک دری

ایک خادمہ کو حکم دیا کہ آزاد پاشا کو جگا دو۔ کہو دن چڑھ گیا ہے۔ اب اٹھیے۔ خادمہ نے چمک کر کہا۔ حضور میں تو نہ جاؤں گی، واہ۔ بھلا میں کیونکر جاؤں۔ اور نام خدا میں بھی جوان، اگر جگانے جاؤں تو خدا جانے وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں۔

شہزادی : اب باتیں نہ بناؤ۔ جا کے جگاؤ جلدی۔

خادمہ : اے حضور ذرا غور کر لیجیے، میں جوان ہوں' یا بوڑھی اچھا جوان ہی ہوں نہ۔ اور وہ ماشاءاللہ جوان آدمی ہیں' تو دونوں جوان اب اکیلے کمرے میں جہاں ایک جوان مرد سو رہا ہو' وہاں جانا۔ ہماری وضع کے خلاف ہے۔ ہم نہ جانے کے۔ یوں جیسا حکم ہو تعمیل کروں۔ مگر ذری غور کر لیجیے۔

شہزادی : اری نادان۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑے گی۔ جس سیج پر ہم سوئیں' وہاں خادمہ کا گزر نہیں۔

خادمہ : حضور یہ کہیے۔ میں نہ مانوں گی' جوانی اور حسن بلائے بے درماں ہے' اور پھر جوانی بھی کیسی اٹھتی جوانی۔

الغرض خدا خدا کر کے' وہ حسین خادمہ جھمکتی ہوئی کمرے کے اندر گئی' باآواز بلند کہا' حضور کسی اور خواص کو بھی بھیجیے۔ دونوں ہوں وہ تو گھوڑے۔ بیچ کر سو رہے ہیں۔ (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) اجی خداوند! اب کب تک آرام کیجیے گا۔ اٹھیے حضور! دن بہت چڑھا ہے۔ سارے میں دھوپ پھیل گئی ہے۔ حضور وہ تو بولتے تک نہیں۔ لب تک نہیں ہلاتے۔ بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔

شہزادی : شانہ پکڑ کے ہلاؤ' ضرور جاگ اٹھیں گے۔

خادمہ : حضور ڈر معلوم ہوتا ہے۔ خدا جانے بُرا مانیں۔ بددماغ ہو جائیں گے کچھ کہہ اٹھیں' مفت میں خفا ہو جائیں۔ حضور خود ہی آن کر جگا دیں۔ آزاد انگڑائی لیتے ہوئے اٹھے۔ خواص نے جھک سلام کیا اور کہا خداوند! آج دیر تک سویا کیے۔ اب اٹھیے سب عورتیں جمع ہو گئی ہیں۔

اتنے میں کل شہزادیاں کمرے کے اندر داخل ہو گئیں' اور جاتے ہی قہقہہ لگایا۔ ایک نے کہا سلام۔ دوسری بولی مبارک۔ تیسری نے کہا اب آپ آج دعوت کیجیے۔ خدا نے یہ دن دکھایا کہ چاند سی بیوی پائی۔ اب آج جشن ہو۔ اور خوب اظہار مسرت ہو۔

آزاد : جشن تو مہینوں رہے گا۔ ایک دو دن چہ معنی دارد۔

شہزادی : مہینوں! خدا جانتا ہے' برسوں بلکہ تمام عمر۔

ہمجولی : خدا کرے تمام عمر جشن رہے! مگر آج کل تو ضرور لطف ہو' یہی دن تو خاص لطف اور جشن کے ہیں۔ اور کیا۔

بما ناد آں دوست کو دوستاں را
غذائے دل و راحت جاں فرستد

آزاد پاشا نے کہا' میں حمام کر کے ابھی ابھی آتا ہوں' شہزادی کی طرف مخاطب ہو کے کہا ان سب کو بٹھاؤ'

جانے نہ دینا۔ آج بڑی دل لگی ہوگی۔ شہزادی نے کہا۔ مگر شرط یہ ہے کہ جلد آؤ' ورنہ یہ سب طعنے دیں گی کہ

ع طاقتِ مہماں نداشت خانہ بہ مہماں گزاشت

آزاد ایک کمرے میں غسل کے لیے گئے۔ ادھر بزم طرف آراستہ ہوئی۔ شہزادی نے کہلا بھیجا کہ چاہے دیر میں آؤ مگر

اک ذرا بن سنور کے آئیے گا

سر سے پا تک نکھر کے آئیے گا

ہمجولی : اے ہے۔ آج اس وقت تم پر البتہ عالم ہے۔ خدا جانتا ہے اس طرح کا جوبن ہے کہ ہم تک کو

بے اختیار چومنے اور گلے لگانے کو جی چاہتا ہے۔ بس اور کیا کہوں

ساق نور آہنش در پیراہن رنگین او

شمع کافور ست در فانوس روشن کردہ اند

اور ادھر آزاد پر نکھار ہو تو وہ ایک ستم ڈھائیں۔ خوب جوڑ چھلکے۔ ہے تو آزاد بھی نہایت حسین اور مہ جبیں۔

اتنے میں آزاد پاشا بھی نکھر کے آئے۔ کرسیوں کی نشست تھی۔ اور باہم چہل اور دل لگی ہوتی تھی، دو چار رنگین طبع اور

شوخ نوجوان چھوکریاں شہزادی کو چھیڑتی تھیں۔

ہم جولی : مبارک حضور۔ کیسے شہزادی پسند آئیں۔ حضور تو بھاگے جاتے تھے۔ شرم تو نہ آئی ہوگی۔ وہ کون پری

دلھن ہیں جن پر آپ ریجھے تھے۔ یہ شہزادی کیسی برق دم پری پیکر، غیرت حور ہیں۔ ان کو چھوڑ کر اور کو چاہنا کم ہے۔

آزاد : گزشتہ را صلوٰۃ آیندہ را احتیاط۔ مضیٰ مامضیٰ۔

ہمجولی : ایسا نہ ہو کہ اب پھر وحشت دکھاؤ۔ اب اس کو اپنا گھر سمجھو کہیں جانے آنے کا نام زبان پر نہ لانا۔

آزاد : کیا مجال، کیا تاب، کیا طاقت، آنا جانا کیسا۔

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم

کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

یہ ہمارے حسن روز افزوں کا اثر ہے کہ شہزادی اس پر عاشق ہوگئی۔ ورنہ ایسی معقول اور امیر عورت کو کیا کمی

تھی۔ اچھے اچھے شہزادے چوم کے شادی کر لیتے۔ مگر ہمارا سا حسین بھی جب کوئی ہو۔

آزاد : قول مردان جان دارد۔ ایسی بات ہے بھلا۔

شہزادی : اب یہ باتیں جانے دو۔ میں یقین نہیں کہ کوئی انسان جس کو خدا نے ذرا بھی عقل دی ہو ایسے پیغام کو

چھوڑ کر کہیں اور جانے کا نام زبان پر لائے۔ کیا مجال۔

آزاد : کچھ جنگ کا حال بھی معلوم ہوا، ذرا اخبار تو منگوائیے۔ عرصے سے اخبار نہیں پڑھا ہے۔

ہمجولی: ابھی تک کوئی جیتا ہارا نہیں ہے۔ دونوں مساوی ہیں، مگر ترک ذرا دب گئے ہیں۔ ایک مقام پربلونا ہے وہاں آج ترکوں کی فوج جوق در جوق جمع ہوتی ہے۔ روسی بھی فکر کر رہے ہیں کہ کسی طرح ترکوں کو وہاں سے ہٹالیں۔ ایشیائے کوچک میں ترک مغلوب ہوگئے ہیں، اور روسی غالب۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

آزاد: اور یورپ میں اب فوج کہاں ہے۔

ہمجولی: کہا نہ کہ بلونا کے پاس ترکوں کی فوج جمع ہو رہی ہے اور روس شیکا گھاٹی پر دندناتے ہیں۔ ایشیا میں البتہ ترک غالب ہیں۔

شہزادی نے آزاد کے کان میں کہا۔ سنیے حضورِ والا۔ اگر آپ نے چھوڑ دیا اور موقع پاکر ہندوستان بھاگ گئے تو یہ سب کی سب ہمیں طعنے دیں گی اور بُرا بھلا کہیں گی۔ آزاد نے مسکرا کر جواب دیا اب ہمارا مطلب تو نکل گیا رہنا نہ رہنا خدا کے اختیار ہے۔ اس پر شہزادی نے کہا، واہ۔

دل میں منصف تو ہو جیے صاحب

ہم نے تو آپ کے لیے صاحب

سلطنت ترک کی وطن چھوڑا

باپ ماں سے بھی اپنے منہ موڑا

اقربا سے گوارہ کی فرقت

پر نہ چھوڑی حضور کی الفت

آپ بے اعتنائی کرتے ہیں

اتنی ہم سے رکھائی کرتے ہیں

واہ کیا تم نے قدر دانی کی

داد دی خوب جانفشانی کی

آزاد نے ہنس کر کہا خدا جانتا ہے ان باتوں سے ہمیں سخت رنج ہوتا ہے۔ بار بار مفارقت اور غم اور جدائی کا ذکر کرتی ہو، یہ کیا بات ہے۔ اس تقریر سے کیا واسطہ۔ اگر مجھے بھاگنا ہوتا تو منظور ہی کیوں کرتا۔ اور اب بیوی بنا کے بھاگ سکتا ہوں۔ غیرت نہ آئے گی۔ پھر یہاں جو چین و آرام ہے وہ ساری عمر خدائی میں تو ملے ہی گا نہیں۔

شہزادی: (کلیرسا سے) آج مس میڈا کو نہیں دیکھا۔ یہ کیا۔

کلیرسا: کچھ طبیعت علیل ہے، سر میں درد بتاتی ہیں، لیٹی ہوئی ہیں۔

ہمجولی: وہ کل ہی سے سست ہیں، رات کو آنکھ تک نہیں، سر شام ہی سے سو رہی تھیں۔ درد سر ہے اور کھانسی آتی ہے۔

راوی: درد سر نہیں، درد دل ہے اور ہوا ہی چاہے۔

غمہائے مردہ در دل ما زندہ ساخت ہجر — گویا شب فراق از روز قیامت است

مسیڈا دل میں سوچی کہ میں نے روپیہ کی نکری، تب کہیں آزاد پاشا میدان جنگ کے لائق ہوئے مگر اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہزادی کی بغلیں گرم ہوئیں، اور یہاں افسردہ دلی نصیب ہوئی۔ افسوس صد افسوس، وائے ستم وائے ستم!

فراق دوستاں دیدن نشانے باشد از دوزخ

معاذ اللہ غلط کردم کہ دوزخ زاں نشاں باشد

اب اس قدر بھی طاقت نہیں ہے کہ نظر اٹھا کے دیکھوں، بس فرط نقاہت سے یہی جی چاہتا ہے کہ پڑی رہوں اور جنبش تک نہ کروں۔

نمی رسد نگہ از دیدہ تا در دیدہ — ازاں زماں کہ تو رفتی نگاہ بیمار ست

اب جان کوئی دم کی معلوم ہوتی ہے کہ میرے سامنے آزاد کی شادی ہو۔ بڑے بڑے سپہ سالار اور نامی گرامی وزیر زادے اور اچھے اچھے امیر اور رؤسا تمنا رکھتے کہ میرے ساتھ شادی ہو۔ مگر ہزاروں میں میں نے آزاد کو منتخب کیا تھا۔ اب زندگی کا خدا حافظ ہے۔

بے تو آمد جاں بدل وز دل کنوں آمد بلب

ایں مسافر تا عدم منزل بمنزل میرود

آزاد تیرے فراق نے مجھے زندہ درگور کر دیا اور کہیں کا نہ رکھا، اب یاس کی صورت ہر دیوار اور ہر در سے نظر آتی ہے۔ اور جگر خون ہو گیا ہے۔

در دم بے تو شد دریائے خوں از شوق دیدنہا

حبابش داغہائے سینہ موجش دل طپیدنہا

مگر میرے نالۂ شبگیر میں اثر ہے تو انشاء اللہ آرزو بر آئے گی، دعائے سحری ہرگز بے کار نہ جائے گی۔

نہ کہیے نالۂ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر

سنی ہے تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

اگر آرزوئے دل بر آئی تو فہو المراد ورنہ ہم اور اجل یہی ہمارا بیڑا پار کر دیگی۔ ایسی زندگی سے موت ہی اچھی جب رنج ہی رنج ہو، جب پیمانۂ دل غم ہی سے لبریز ہو جائے تو زیست پر تین حرف۔

دل ہے غذائے رنج، جگر ہے غذائے رنج
پیدا کیا ہے ہم کو خدا نے برائے رنج
حاصل کسی سے کچھ نہیں ہوتا سوائے رنج
دنیا میں لائی ہے ہمیں قسمت برائے رنج

اتنے میں مس کلیرسا نے شہزادی کے کان میں کہا تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔ خوجی پکڑے گئے ہیں۔ سنا ہے پھر کچھ لوگ آزاد کی تلاش میں آئے ہیں۔ میں نے خادمہ بھیجی ہے کہ جا کے پتہ لگائے۔ دیکھیے کیا خبر لاتی ہے۔ یہ خبر وحشت اثر سن کر شہزادی دھک سے ہو گئی، آزاد جیتونوں سے تاڑ گئے کہ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ پوچھا۔ خیر باشد آثار برے ہیں، شہزادی کے تیور بید ڈھب پڑتے ہیں۔ شہزادی نے چپکے سے کہا سنتے ہیں خوجی کو چند آدمیوں نے گرفتار کر لیا۔ آزاد کا چہرہ اداس اور رنگ فق ہو گیا۔ مگر استقلال کے ساتھ پوچھا کہ ان لوگوں کا حال تو اچھی طرح دریافت کر لو کہ وہ کون لوگ ہیں۔

اتنے میں وہ خادمہ بد حواس اور سراسیمہ در آئی۔ مس کلیرسا کو علیحدہ بلوایا۔ شہزادی اور آزاد بھی ہمراہ گئے۔ خادمہ نے کہا حضور خبر تو اچھی نہیں ہے۔ بڑی بری خبر ہے۔ خوجی بونے کو گرفتار کر لیا ہے، اور اب دھمکا رہے ہیں کہ بتا آزاد کہاں ہے، اور وہ بیچارے بہت پریشان ہیں۔ کرتے دھرتے کچھ نہیں بن پڑتا ہے۔ مجھ کو دیکھ کر اشارے اشارے میں کہا کہ خبردار ہمارا اور آزاد کا حال اور لوگوں کو نہ بتانا میں نے ان سے پوچھا یہ بونا کون ہے، تو انھوں نے کہا۔ ہمارے ملک کے دشمن کا دوست ہے، اگر آزاد کا حال معلوم ہو اور راست راست بلا کم و کاست بتا دے تو خیر ورنہ ہم اس کو بھی برفستان میں قید کر دیں گے۔ ہم تحقیقات کر رہے ہیں، مس کلیرسا نے کہا خراب خراب خبر لائی ہے۔ یہاں جس کسی سے دریافت کریں گے سب کے سب یہی کہیں گے کہ یہ آزاد کی شادی کے جلوس میں ساتھ تھے۔ اور انھیں کا انتظام تھا۔ رفتہ رفتہ سب باتیں کھل جائیں گی۔ شہزادی نے گھبرا کر پادری صاحب کو بلوایا، اور رقم دے کر سارا حال کہہ سنایا۔ اس کے بعد اصرار کیا کہ آپ مہربانی کر کے نبر لائیے۔ اور یہ بھی دریافت کیجیے گا کہ آزاد پاشا کو تو تم لوگ گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ اب ان کی تلاش کیسی ہو رہی ہے۔ پادری صاحب نے تھوڑی دیر غور کیا اور کہا۔ لڑکی تیری خاطر سے میں جاتا ہوں۔ حال تو سب دریافت کر لوں گا۔ مگر جھوٹ نہ بولوں گا۔ جھوٹ سے مجھے کلی نفرت ہے، یہ کہہ کر پادری صاحب روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ ایک مقام پر دو آدمی خوجی کو گرفتار کر کے سوالات کر رہے ہیں۔ پادری صاحب کو دیکھ کر ایک نے سلام کیا۔ خوجی بد ذات تو تھے ہی، پادری کی صورت دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ادب کے ساتھ کہا۔ حضور فوج کے افسر ہیں نہ۔ ان لوگوں نے مجھے مفت میں پھانس لیا ہے اور دھمکاتے ہیں۔ ذرا آپ میری بلند مدد کیجیے۔ خدا کے لیے اعانت ضرور فرمائیے۔

پادری: تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ کس ملک کے رہنے والے ہو۔ اور یہاں کیوں آئے ہو۔

خوجی: میں پٹھان ہوں، کابل کا باشندہ، آیا پشاور سے۔

پادری: یہاں کس ضرورت سے آنا ہوا تمھارا سچ بتاؤ۔

خوجی: خداوند مسیح بلکہ مسیح کا بھی باپ کہوں۔ میں تاجر انار ولایتی اور سیب بیچتا ہوں۔ آزاد کا نام سنا ہے مگر صورت آشنا نہیں۔ یہ سب مجھے زبردستی پھانسے لیتے ہیں۔

پادری: تم لوگ کیا سرکاری نوکر ہو۔ کس محکمے کے ہو

ایک: ہم فوجی ملازم ہیں، اور یہ بھی ہمارے ساتھی ہیں۔

دوسرا: حضور کو میں جانتا ہوں، دو بار دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ شہر وارسا میں، دوسری بار دریائے ینوا کے پل پر، پادری ہیں آپ۔

پادری: ہاں۔ ہم پادری ہیں۔ دریائے ینوا کے پل کے قریب ہمارا مکان ہی ہے۔ اور وارسا بھی دوسرے تیسرے دن جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہاں ہماری بہن رہتی ہیں۔ آپ لوگ یہاں کس کی تلاش میں آیا ہے۔

ایک نے کہا آزاد پاشا کی فکر کیلئے آئے ہیں، دوسرے نے بھی یہی کہا۔

آزاد پاشا کو پادری کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ انھیں کی تلاش میں آئے تھے۔ پادری صاحب نے ان دونوں سے حالاتِ جنگ دریافت کیے، اور آزاد کو کچا چٹھا کہہ سنایا۔ اور حالات ٹرکی یوں بیان کیے۔ جہانتک افسر متعلق شاذونادر ایسے پائیے گا جو رشوت سے بری ہیں۔ شاید فیصدی دس بھی ایسے نہ ہو۔ اور جو مرتشی نہیں وہ باہمی حسد کے سبب سے کام بگاڑے دیتے ہیں۔ مگر سپاہ ابتک جاں نثار اور نمک حلال ہے، جوش و خروش روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ سلطان المعظم کے اعزہ کی نسبت لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اعزہ سلطنت کے دشمن ہیں اور ان کے سبب سے دولت رفیعہ ٹرکی کو نقصان پہنچے گا۔

مرا گدائے تو بودن ز سلطنت بہتر

یہانتک مشہور ہوا ہے کہ انھوں نے اس ملک کو روسیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ لہٰذا اکثر آدمیوں نے گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ فوراً موقوف کیے جائیں، اور ایسا نازک کام ان کے ہاتھ سے نکال لیا جائے۔ نومبر کے مہینے میں رعایا نے کئی ہزار اشتہار جابجا چسپاں کر دیئے کہ جو لوگ ٹرکی کے دلی دوست ہیں ان کو چاہیے کہ مدد کو آئیں۔ اس اشتہار میں گورنمنٹ کے خلاف رائے ظاہر کی تھی۔ اور لکھا تھا کہ

گورنمنٹ نے ایسے افسروں کو فوج میں بھرتی کیا ہے جو افسری کے قابل نہیں ہیں۔ یہ بھی بیان تھا کہ ترک کبھی صلح نہ چاہیں گے کیونکہ افسران صیغۂ جنگ رشوت لے کر روس کی خاطر صلح کیے لیتے ہیں۔ ہم رعایائے ٹرکی نے عہد کر لیا ہے اور دل میں ٹھان لیا ہے کہ اپنی جان شیریں اپنے ملک پر نثار کر دیں۔ لہٰذا آخری دم تک ہم ضرور لڑیں گے۔ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ ہم فتح نہ پائیں تو ہم کو لازم ہے کہ پہلے اس افسر کو قتل کر ڈالیں، جس کے یہ سارے کانٹے بوتے ہیں۔ اُس کے بعد لڑ کر مر جائیں۔ یہ اشتہار گورنمنٹ کے حکم سے فوراً چاک کر ڈالے گئے۔ مگر ان کا اثر بہت کچھ ہوا۔ دوسرے ہی روز تمام شہر میں مشہور ہو گیا کہ اُس افسر کو کسی نے زہر دے دیا۔ یہ افسر سلطان کا عزیز قریب تھا۔ اُن کے اطبا نے اس خبر کی تردید کی۔ مگر اس امر کو تسلیم کیا کہ عارضہ سخت ہے۔ اور کئی دورے ہو چکے۔ چند روز میں انھوں نے صحت پائی۔ مگر ان کا رعب کم ہو گیا تھا۔ اُن پر یہ تہمت تراشی کی گئی کہ یہ سلطان مراد کو تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ خبر بہت صحیح تھی اور بعض کو اس میں شک تھا۔ بعض اس کی تردید کرتے تھے۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو گورنمنٹ نے سلطان مراد کے مقام سکونت کو سپاہ نے گھیر لیا۔ چند روز کے بعد سلطان سابق کے چالیس پچاس ملازم گرفتار کر لیے گئے۔ مگر مشہور ہے کہ گورنمنٹ کے حکم سے وہ سب پھانسی دے کر مارے گئے۔ مگر ٹرکی اخبارات سے یہ بات منکشف نہیں ہوتی۔ ایک اخبار نے لکھا تھا کہ وہ جلاوطن کیے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تھوڑے عرصہ میں یہ بات مشہور ہوئی کہ رعایا نے واقعی اس افسر کو زہر دیا تھا۔ مگر اطبا نے نہایت کوشش سے اُس کے اثر کو دفع کیا۔ اس عرصے میں حضرت سلطان المعظم نے خواب دیکھا کہ اگر صلح ہو جائے تو ٹرکی کے لیے انسب و اولیٰ ہے۔ اور شیخ الاسلام نے بھی یہی خواب دیکھا۔ لہٰذا مساجد میں علما نے اس خواب کا حال بعد نماز بیان کرنا شروع کیا۔ مگر رعایا کے دلوں پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔ ادھر تو رعایا ٹرکی صلح کے خلاف تھی اُدھر روسی ان کی خواہش تھی کہ جب اچھی طرح فتح حاصل کریں۔ جب صلح کرنے پر راضی ہوں، تاکہ زیادہ فائدہ ہو۔

اب سُنیے کہ اخباروں کو تاکید کی گئی تھی کہ خبردار ایسی خبر نہ شائع کرنا۔ جس سے عوام کے دل برانگیختہ ہو جائیں۔ اگر ایسی خبر شائع ہوئی تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کو خوف ہوا کہ مبادا رعایا بگڑ کھڑی ہو۔ مگر حضرت سلطان آج کل مختلف سلطنتوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ جس رفاہ اور تبدل کی ضرورت ہے وہ دریغ نہ کریں گے۔

آزاد: افسوس صد افسوس۔ اب یہ نوبت آ گئی ہے۔ خیر اچھا۔

پادری ۔ خدا کرے صلح ہو جائے جنگ اخلاق کے بالکل خلاف ہے ۔
آزاد ۔ جی ہاں ۔ مگر حکمت عملی کے خلاف تو نہیں ہے۔ بس۔
پادری ۔ روس اب کسی قدر غالب ہے ۔ ترک جیوٹ کے ہیں ۔ مگر افسر نکمے پائیے ۔ پھر خالی خولی سپاہ سے کیا ہو سکتا ہے بھلا۔
آزاد ۔ یہی تو خرابی ہے ۔ بھلا اپیلنئ کا نام بھی کسی سے سنا ۔
پادری ۔ نہیں ۔ وہ لوگ پادری صاحب سمجھکر اس قدر کھُلے ، ورنہ ہرگز ہرگز کل امور بالتفصیل نہ بتاتے ۔ جنگ دو سرداروں ابھی کوئی نہیں جانتا کہ کون فتحیاب ہوگا مگر روسی شبکا گھاٹی پر بڑی مستعدی سے قابض ہیں یہ بہت اچھی بات ہے ۔
آزاد ۔ واللہ اعلم انگلستان میں وزیر اور ممبران پارلیمنٹ اور وقائع نگاروں کی کیا رائے ہے ۔ اخبار یہاں نظر سے نہیں گزرتا ۔
پادری ۔ وزرار کی یہی ہے کہ دونوں کو لڑنے دو ۔ جہاں تک ممکن ہو صلح کی فکر کرو اور اگر اتفاق سے قسطنطنیہ پر روس کا قبضہ ہو جائے تو روس سے کہہ دیا جائے کہ آپ تشریف لے جائیں ۔ یورپ کی کوئی سلطنت آپ کو ترکی کے دارالسلطنت میں جمنے نہ دے گی ۔ انگلستان بیشک اپنے حقوق کا خیال رکھے گا اور یہ انگلستان پر فرض ہے ۔ سلطان ترکی نے سب سلطنتوں کو یقین دلایا ہے کہ وہ اپنی کُل رعایا کی جان و مال کی حفاظت کریں گے ۔ عام اس کہ مسلمان ہو یا عیسائی ۔
آزاد ۔ آپ مجھے کیا اصلاح دیتے ہیں ۔ جب تک میں یہاں رہوں گا میری جان معرض خطر میں رہے گی ۔ روز ایک نہ ایک مصیبت سے سامنا ہوگا ۔ اب یہاں سے بھاگنا یقت مردانہ اور وضع اہل آبرو کے خلاف ہے ۔
پادری ۔ یہاں آپ بادشاہی کرتے ہیں ، اور یہ کہنا گویا آپ ہی کا ہے ۔ بادشاہی کو چھوڑ کر امید موہوم پر کہن مانا عقل کے خلاف ہے ۔
آزاد ۔ مجھے بادشاہی اور شہریاری کی مطلق خواہش نہیں ہے ، مگر ہاں فوجی جان کے ساتھ ہے ۔ فقط اتنا خیال ہے ۔
آزاد پاشا نے جس وقت ترکی کا حال سنا ۔ آنکھوں میں خون اتر آیا ۔ ٹھان لی کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ترکی کی مدد کو ضرور پہنچیں گے ۔ مس کلریسا سے تنہائی میں باتیں ہوئیں ۔ انھوں نے ان کو بہت

سمجھایا، کہ آزاد پاشا جہالت سے کام نہیں نکلتا۔ آدمیت کو ہاتھ سے نہ دو۔ عقل سلیم سے کام لو۔ یہاں تمہارے لئے ساری خدائی کی نعمت حاصل ہے۔ آزاد نے بکمال سہولت یوں جواب دیا۔ سنئے مس کلیریا۔ میں آپ کی نوازش اور فہمائش کا کمال مشکور ہوں لیکن غور کیجئے کہ میں کیا کہہ کر آیا تھا۔ یہ شادی بدرجہ مجبوری قبول کرنی پڑی۔ مہینوں قید تنہائی بھگتی کنویں کے اندر بند رہا۔ مگر میں نے انکار ہی کیا حسن آرائے جو وعدہ میں لے کیا اس کا مجھے ہردم خیال ہے۔ "جان جائے مگر بات نہ جائے" میں ہرگز ہرگز شادی نہ کرتا لیکن افسوس ہے میں مجبور ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ اگر اب بھی انکار کرتا رہوں تو پولینڈ کی شہزادی وزیر جنگ کو لکھ بھیجے گی اور میں سیدھا سیبیریا کے برفستان کو بھیج دیا جاؤں گا اس سے بہتر یہی ہے کہ اس شہزادی سے شادی کرلوں اور پھر ہنسی خوشی رخصت لوں اب مجھے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ترکی اس بلا میں ہو اور میں یہاں بادشاہی کروں۔ ع۔ مرا گدائی تو بودن زسلطنت بہتر۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو تمام عمر لطف کے ساتھ زندگی بسر کروں، اور واقعی بادشاہوں کی طرح چین اور آسایش نصیب ہو۔ مگر ویسے آرام پر تین حرف۔ ہندوستان سے تا باتصالئے روم، اور روم سے روس تک میرا نام مشہور ہوگیا ہے کہ آزاد اپنی معشوقہ عفت کوش کے حکم سے روم جاتا ہے۔ اگر سرخرو واپس آیا تو اس پری پیکر کو عقد نکاح میں لائے گا ورنہ ع۔ باقسمت بانصیب بابخت۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر میں ترکی میں شمشیر شجاعت کے جوہر دکھاؤں اور کارنمایاں مجھ سے سرزد ہوں تو مجھے سچی خوشی حاصل ہو۔ جو مسرت دلی مجھے اس حاصل ہو وہ یہاں کے رہنے میں نہیں حاصل ہوسکتی۔ لہذا میں نے عزم بالجزم کرلیا ہے کہ شہزادی سے رخصت ہوں، آپ بھی ان کو سمجھائیے تو مزید احسان ہو۔ ورنہ مجھے تو اب کوئی روکنے والا نظر نہیں آتا۔ ہاں اس میں اصلاً شبہہ نہیں کہ بعد اختتام جنگ اگر زندہ رہا تو شہزادی کو ہمراہ لے چلوں گا۔ قول مرداں جان دارد۔ جو لفظ زبان سے نکلا اس میں حشر تک فرق نہ آئے گا۔ کیا مجال۔ اگر میں گرفتار ہوگیا، تو شہزادی کے کام کا رہا نہ میری آرزو برآئی۔ کوئی سبب تو ہے کہ اس بادشاہی سے دست بردار ہوکر جانا چاہتا ہوں۔ حسن آرا، کے حکم کی تعمیل بسرو چشم منظور ہے۔ ع

مرا گدائے تو بودن زسلطنت بہتر

مجھے شہزادی کی خوشی بھی ہر طرح منظور ہے، مگر عقل سے کام لینا چاہئے اور یوں تو اگر اس سے جان بھی قربان ہوجائے تو کیا مضائقہ۔

قاتل کی ہر طرح مجھے منظور ہے خوشی
سر پیشکش ہے جان فدا ہے نثار دل

میرا تو قاعدہ ہے کہ حسین عورت کو دیکھا اور دل آگیا۔ مگر بات اور قول جان کے ساتھ ہے۔ ہاں حسین کو دیکھ کر دل کسی قدر بے قابو البتہ ہو جاتا ہے۔

ہوتا ہے بے قرار حسینوں کو دیکھ کر
ایسا دیا ہے کیوں مجھے پروردگار دل

خدا جانے کیا سبب ہے کہ روزِ ولادت سے آج تک انواع و اقسام کی مصیبتیں سہیں۔ اب تک تکلیف اور پریشانی ہی میں عمرِ عزیز بسر ہوئی۔ اگر کبھی خوشی بھی ہوئی تو اس کا انجام رنج ہی ہوا۔ خوشی کی صورت دیکھی ہی نہیں اور رنج نے استقلال کیا۔

زہر گلی کہ ہوا نے دلم نقاب کشاد
فلک بگلشن حسرت نوشت وداد بباد
ہر آن گرہ کہ درو نقدِ مدعا بشند
بدامن طلب مدعی نہادو کشاد
زمانہ غیر اَلَم نامہ نیست تصنیفش
دلم زصفحہ فہرست اوگرفتہ سواد
چراغِ مہر نمی میر دائے فلک یک صبح
بروئیم ارنگشائی دریچہ بیداد
کدام نالہ سرشتم بداغ دل کورا
زمانہ درکرّہ زمہر بر غوطہ نداد
مخند اگر بہ فسونِ زمانہ دل بستم
نہ بہترم زسلیمان کہ نکتہ زد برباد

اب چاہے جو ہو، ترکی ضرور پہنچوں گا۔ جنگ میں ضرور شامل ہوگا۔ ع
ہر چہ باداباد ماکشتی در آب انداختیم
خدا حافظ ہے ناصر ہے۔ حسن آرا نے میرے ہوش و حواس کو ایسا لوٹا کہ کسی کام کا نہ رکھا۔ اس کے حکم کی تعمیل پر جان دوں گا۔

دل بردی و در کمین دینی | با عاشق خود چرا چنینی
پر خون دل و دیده از تو تا کی | در بند خیال آن و اینی
دل بردی و دین و جان شیریں | دین طرفہ کہ باز در کمینی
حسن تو ز ماہ و مہر بگذشت | خورشید سپہر ہفتمینی

برگرد تو حلقہ بستہ خوبان
چوں خاتم حسن را نگینی

کلیرسا: اچھا مس میڈا سے مشورہ لے لو۔ دیکھو ان کی کیا رائے ہے۔ وہ بڑی فہمیدہ ہیں۔ ضرور رائے صاحب دیں گی۔ کیا ہرج ہے۔

آزاد: اُن سے الگ شرمانا پڑتا ہے۔ خدا خیر کرے۔

کلیرسا: وہ ایسی نہیں ہیں کہ بے سبب خفا ہو جائیں۔

آزاد: اچھا آپ ان سے دریافت کریں۔ مجھ سے تو نہ پوچھا جائے گا۔ مجھے کمال خفت ہے مگر کیا کروں، مجبور ہوں، یہ شادی نہیں اس کو ماتم کہتے ہیں، مگر اس میں کسی کا کیا بس چلتا ہے۔

صبح دم چوں درد مند دل صور شیوں زائی من
آسمان صحن قیامت گردد از غوغائی من
گوش اہل آسمان و حلقۂ ماتم یکے ست
شیونم تا برکشید آہنگ بابا ہائی من
زان دل شوریدہ را بر تارک خود می نہم
کاشیان مرغ مجنوں شد دل شیدائی من
آیۂ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ شد گرہ
بر زبان جبرئیل از شرم عصیانہائے من

مس کلیرسا نے مس میڈا سے مشورہ لیا۔ میڈا تو چاہتی تھیں کہ اس گورکھ دھندے سے آزاد نجات پائیں دل میں کمال خوش ہوئی مگر مسرت ظاہر نہ کی تاکہ مس کلیرسا اپنے دل میں یہ نہ سمجھیں کہ صرف اپنے فائدے کے لیے آزاد کو رائے دی۔

کلیرسا: بہن آزاد تو بپھرے ہوتے ہیں کہ میدان جنگ میں ضرور جائیں گے، ہاری مانتے ہیں، نہ جیتی اب تم سمجھاؤ۔

مٹیڈا: اگر ہماری رائے ہو تو ان کو بے شک میدانِ جنگ میں جانا چاہیے۔ سپاہی آدمی ہیں ایسے ویسے نہیں ہیں۔ سپاہی کے لیے سب سے زیادہ فخر اسی میں ہے کہ معرکہ سے مُنہ نہ موڑے وہ سپاہی کیا جو کسی پر ریجھے اور اپنے کام کو ترک کر دے۔

کلیرسا: مگر دفعۃً چلے جانا بھی تو وضع کے خلاف ہے۔

مٹیڈا: اور جو روسیوں نے گرفتار کر لیا۔ اور کیا تم جانتی ہو کہ یہ خبر چھپی رہے گی۔ ہرگز نہیں۔ ع

نہاں کی ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

یہ باتیں کہیں پوشیدہ رہ سکتی ہیں۔ اے توبہ!

کلیرسا: پھر چلو چل کے شہزادی سے کہیں۔ وہ کہتی ہیں جب لڑائی ختم ہو گی، تو ہم ان کو بھی اپنے پاس بُلا لیں گے۔

مٹیڈا: اچھا تو ہے۔ اور اب لڑائی کا خاتمہ بھی ہے۔

کلیرسا: تو پھر شہزادی سے پہلے تم کہو گی یا پہلے میں کہوں۔؟

مٹیڈا: تم ہی چھیڑو پھر میں بھی تمہاری مدد کروں گی۔

مِس کلیرسا نے شہزادی کو علاحدہ بلایا اور کہا بہن دیکھو دوسرے تیسرے دن صیغۂ جنگ سے گوئندے اور مخبر اور سوار آزاد کی تلاش میں بھیجے جاتے ہیں اور ایک نہ ایک دن آزاد گرفتار ہو جائیں گے۔ خوجی نے بہت سی باتیں کہہ دی ہیں۔ اس سے یہی ہے کہ اِن کو کسی طرف بھگا دو۔ جب جنگ کا چراغ گل ہو جائے پھر بلا لینا ورنہ اگر یہاں رہے تو دو چار روز کے بعد تمام عمر کے لیے جدا ہوں گے اور فوراً قید کر لیے جائیں گے۔ اگر آزاد کو دل و جان سے چاہتی ہو تو بہتر یہی ہے کہ ان کو اب آزاد ہی کر دو۔ ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ اس بھونڈی محبت سے ان کی جان جائے۔ تمہاری عظمت و شوکت اور امارت و ریاست خاک میں مل جائے گی۔ اور پھر افسوس اور حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

شہزادی کے دل پر اس تقریر نے بڑا اثر کیا تھوڑی دیر تک سوچا کی آخر کار مِس کلیرسا کی رائے سے اتفاق کیا اس وقت شہزادی کی عجیب حالت تھی چشم خونچکان۔ سینہ بریاں۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا مجبوری کا عالم تھا۔ آزاد پاشا بُلوائے گئے۔

شہزادی: آزاد تخلیے میں تم سے کچھ کہنا ہے۔ چلو۔

آزاد: خدا خیر کرے۔ اِس وقت تم اِس قدر اُداس کیوں ہو۔؟

شہزادی: (روکر) خدا کو منظور نہیں کہ میں خوش و خرم رہوں۔

آزاد کو شہزادی ایک کمرے میں لے گئیں۔ سب دروازے بند کر دیے گئے۔ گلے میں ہاتھ ڈال کر خوب روئیں۔ آزاد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دونوں عاشق و معشوق بڑی دیر تک رویا کیے۔ آخر کار آزاد نے روئے زیبا کا بوسہ لے کر کہا جانِ من میری ہرگز خواہش نہیں کہ میں دھوکا دوں میں سپاہی آدمی اور شریف زادہ ہوں۔ اور اس کے علاوہ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم میری عاشق زار ہو۔ میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر میں یہاں رہا تو تمہارے اور میرے دونوں کے حق میں اچھا نہ ہوگا اس سے بہتر یہی ہے کہ میں اب تم سے رخصت لوں اور تمہیں خدا کے سپرد کروں۔ مگر میں تم سے اقرار کرتا ہوں کہ اگر حیات مستعار باقی ہے۔ تو تم اور میں پھر یکجا ہوں گے۔ اِس میں ہرگز ہرگز فرق نہ پڑے گا۔

شہزادی: (گلے لگا کر) پیارے آزاد اب تم مجھے زندہ نہ پاؤ گے۔ کیا تمہیں اُمید ہے کہ تمہاری جدائی میرا دل برداشت کرے گا۔

آزاد: (زار زار رو کر) ہائے کیا اتفاق ہے افسوس!

شہزاد: (آہ سرد بھر کر) تمہارا اس میں کچھ قصور نہیں یہ سب میرے دل کا قصور ہے مگر اب تو جو ہوا وہ ہوا۔

آزاد: خدا مالک ہے۔ ہم نے کُل امور خدا ہی پر چھوڑے۔

ما کارِ خویش را بخداوند کارساز
بسپردہ ایم تا کرم او چہا کند

شہزادی: چھوڑا نہیں جاتا۔ اب تمہاری رائے پر منحصر ہے۔

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں دکار آساں کن

مگر یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔ لونڈی سمجھنا۔

یہ فقرہ کہہ کر شہزادی بہت روئی اور غش آگیا۔ آزاد نے خواصوں کو آواز دی اپنے زانو پر سر رکھا مس کلیرسا اور مس میڈا کو چپکے سے بلوایا پانی چھڑکا۔ لخلخہ سنگھایا۔ تو تھوڑی دیر میں ہوش آیا۔ شہزادی نے آہستہ سے کہا آزاد یہ تو پہلی منزل ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ابھی تو عشق کی پہلی ہی منزل ہے۔

الا یا ایہا الساقی اَدِر کاسا رنا ولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولی افتاد مشکلہا

تمہارے جانے کے بعد اس سے بھی زیادہ بُری نوبت ہو گی مگر جو کچھ خواستۂ خدا ہے مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ سوچتی کیا تھی ہوا کیا۔

من درچہ خیالیم و فلک ــــ درچہ خیال
کارے کہ خدا کند فلک ــــ راچہ مجال

آزاد: خوجی گرفتار ہو گئے ہیں۔ دیکھئے اس بیچارے کا کیا حال ہوتا ہے۔ سیدھا آدمی ہے۔ ایسا نہ ہو قبول دے۔ مگر اس سے یہ اُمید نہیں ہے آئندہ جو مرضی خدا ہے چارہ ہی کیا ہے۔

شہزادی: میں دل سے دعا مانگتی ہوں کہ میرے آزاد پر آنچ نہ آنے پائے۔ یا خدا میری دُعا قبول کر لے۔ آمین!

یا رب ایں آرزوے من چہ خوش ست
تو بریں آرزو مرا برساں

یہ کہہ کر شہزادی اٹھی اور تھوڑی دیر میں ایک چھوٹا سا ڈبا لائی۔ نشانی رہے۔ آزاد لے کر سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا اور کئی بار چوما۔ آزاد پاشا کے سفر کی تیاریاں ہونے لگیں خواصوں نے اسباب باندھا مشورہ ہوا کہ راتوں رات بھاگیں۔ چنانچہ پانچ پانچ کوس پر گھوڑوں کی ڈاک بٹھادی گئی ایک آزاد پاشا کے واسطے دوسرا شہزادی کے ایک خدمت گار کے لیے کوشش بلیغ کی گئی کہ صبح تک دریا کے پار داخل ہو جائیں۔ خوجی کی نسبت اس عرصے میں مختلف خبریں آئیں ایک مرتبہ سُنا کہ خواجہ صاحب کو وہ روسی اپنے ساتھ لے گئے پھر ایک شخص نے اس کی تردید کی۔ پھر معلوم ہوا کہ روسیوں نے بازار والوں سے ان کا حال دریافت کیا آخر کار معتبر خبر یہ پائی کہ دس روسی ادھر اُدھر آزاد کی تلاش میں گئے تھے اور قریب سو کے ایک مقام خاص پر ٹکے ہیں۔

خوجی سڑی بن گئے

واہ اُستاد۔ کیوں نہ ہو، مانتا ہوں۔ مگر گیدی بُرے پھنسے اور سب سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ

گے والی پلٹن کے کمیدان صاحب کے پاس قرولی بھی نہیں ورنہ دس پانچ کے ماتھے جاتی۔ خواجہ صاحب ایسے ویسے نہیں ہیں مصر کے پہلوان کو انھوں نے پٹخنی بتائی۔ بوا زعفران کو عورت سمجھ کر چھوڑ دیا ورنہ کہا ہے چبا جاتے۔ روس کی جشن یعنی پولینڈ کی شہزادی کی کلوٹی خواص کو وہ ڈانٹ بتائی کہ صرف ما لگا کر رہ گئی۔ لیاقت یہ عالم کہ کانسل کے نام فارسی میں عرضی لکھی اور ایسی ادق کہ طاہر وحید کے جدامجد کی سمجھ میں بھی نہ آئی۔

اے قبائے بادشاہی رست بر بالائے تو
مصرعۂ ثانی غت ربود والائے تو

یہ عنوان کا شعر تھا چنیا بیگم کے ایسے عاشق زار کہ جہاز سے لائف بوٹ پر آئے مگر آتے ہی یہ غل مچایا کہ ارے یارو میری افیون کی ڈبیا تو لاؤ۔ یا خدا چاہے سب ڈوب جائیں مگر افیون کی ڈبیا نہ ہاتھ سے جائے۔ میری پیاری چنیا بیگم اور مجھ سے جدا ہو ستم ہے، غضب ہے، قیامت ہے۔

اب سنیئے کہ دونوں روسیوں نے ان کو چپر غٹو کیا۔ قہر درویش بر جان درویش جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ بہت تلملائے مگر بیکار۔ آدمی کا نبان اور اپنے مطلب کے پکے تو تھے ہی معاً ایک تدبیر سوچی بسوچے کہ سڑی بن جاؤ۔ دل سے یوں مشورہ کرنے لگے۔ شنو بھئی خواجہ بدیع یار، مرنا برحق ہے۔ اور مرنے ہی کے لیے ہندوستان اپنا پیارا وطن چھوڑ کر اس دور دراز ملک میں آئے۔ کجا روم کجا ہند۔ اس فاصلے کو خیال کیجیے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو اتنی دور کیوں آتے۔ خاصے مزے میں نواب کے ہاں دندناتے تھے۔ اُلو بنا بنا کے مزے اڑاتے تھے، چینی کی پیالیوں میں مالوے کی افیون گھلتی تھی۔ چنڈو کے چھینٹے اُڑتے تھے چرس کے دم لگتے تھے۔ یہ سب لطف چھوڑ چھاڑ کر اُلو بنے اور آئے کہاں۔ روم میں۔ اس عقل پر خدا کی مار مگر پھنسے سو پھنسے۔ اکنوں چہ میشود۔ بابائے بدیع مَن مَن کردم عقل بر خلاف زماں، مارا و عقلم را رسوا کردہ یسو داشت بر من بدیع و پدر من بدیع بہزار نفریں برائے من۔ زیرا کہ بد فعل سر زند و ہر پدر چرا کہ من بدبخت را تولد کردن بیسنے نمود والانہ انچہ شدہ بود باز واپس آمدن محال۔

مرا بارہا در حضر دیدہ
زخیل و چراگاہ بر سیدہ

راوی: سبحان اللہ سبحان اللہ بجا ارشاد ہوا۔ اردو بولتے بولتے فارسی بولنے لگے مگر اس فارسی کو سمجھے کون۔ ہندی بیچارہ کیا سمجھے گا۔ ایرانی سمجھے تو سمجھے اور تو اور مگر (والانہ) کیا ٹھیٹھ فارسی جملہ ہے۔ (والانہ) کیا خالص محاورہ ہے۔ خوجی اور ایسے محاورے سے (نامحروم) رہے۔ کیا مجال مگر خوجی بیچارے

(بے غافل) تھے۔ اچھا چڈھا گل خیر داب ـــ کی ہی تو پھنسے ہو۔ فہمیدہ خواہد شد۔ بات تیرے
ںیدی کی ایسی تیسی۔

اب سنیے کہ ان دونوں روسیوں نے ان سے سوال شروع کیے اور انھوں نے اناپ شناپ
بے تکے جواب دینا شروع کیے۔ سڑی تو تھے ہی اور اب تو اور بنے۔

سوال : تمہارا نام کیا ہے۔ سچ سچ بتادو۔ سمجھا!

خوجی : کل تک دریا چڑھا تھا آج چڑیا دانہ چگے گی۔

راوی : اے سبحان اللہ اچھی بے پر کی اڑائی۔ شاباش۔

سوال : ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے۔ صاف صاف بیان کرو۔

جواب : گھاس کا گٹھا گر پڑا اور چرکٹا چلا آیا۔

راوی : خاصے ہم کو تو کوئی گراسلٹ معلوم ہوتا ہے۔

سوال : کبھی تمہاری شادی بھی ہوئی تھی، یا نہیں ہوئی۔

جواب : واہ۔ ہمارے باپ کی بھی کبھی شادی ہوئی تھی یا ہماری شادی ہوتی۔ بقدرِ سلامت کشتی۔

راوی : واللہ بکھیڑا کا دیا۔ واہ گیدی بڑبیا کیوں نہ ہو۔ واہ!

سوال : تمہارے باپ کا نام کیا تھا۔ یاد ہے یا نہیں یاد ہے۔

جواب : (مسکرا کر) ہم کو اپنا نام تو یاد ہی نہیں۔ باپ کے نام کی کون کہے مگے کچے بارہا
پڑے ہیں۔

سوال : تم عقل کے دشمن ہو۔ الول جلول بک رہے ہو۔

جواب : ہم تو سڑی ہیں بھائی جان۔ تم ہمارے بڑے بھائی ہو۔ اور سگ زرد برادر گیدڑ الدولہ
بہادر بھیگی جنگ۔

راوی : کیا خوب۔ گیدڑ الدولہ بہادر بھیگی جنگ۔

سوال : تم یہاں کس کے ساتھ آئے۔ اور کیوں آئے۔

جواب : شیطان کے ساتھ دوڑے آئے اور اب یہ پوچھتے ہو کہ کیوں آئے یہاں (ہنس کر) یہاں
یہ نہ پوچھو۔ کیوں آئے۔ کیا کرنے آئے اس لیے کہ لوگوں کو اور حرد مان کو بہکا دیں۔

منم غلام شیاطین دہریا بابا
منم تلام وجو لام قہہریا بابا

میں ہوں میں غلام شیطانوں زمانے کا یا باپ میرے اور میں ہوں میں غلام کے تلام کے جو لام قہر کا اے میرے ابا جان۔

پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بجوئے نفروشم

سوال : تم پیدائشی سڑی ہو یا حال میں پاگل بن گئے۔

جواب : روم تو روس میں ہے اور بدخشاں کے بیچ میں دریا بہتا ہے۔ نام اس دریا کا کوہ بلقران والیقران فیہ علیہ لکم ایک یا ناظریں الاتواب۔

راوی : بہت ہی خاصے۔ یہ اللہ شانی جواب۔

سوال : تم اس وقت سڑی بن گئے ہو۔ اچھا سمجھا جائے گا۔

جواب : نہ کوئی جائے گا نہ آئے گا۔

سوال : کیا تم سمجھے ہو کہ دیوانہ بننے سے تمہارا مفر ہے۔

جواب : دو گھڑی دن اور تین گھڑی رات اور جمعرات۔

سوال : خواجہ تم بہت ذلیل ہوگے۔ بہت خراب و خوار ہوگے۔ اس ہٹ اور استبداد اور ضد سے کیا ہوتا ہے۔

جواب : دماغ کھکھل۔ عقل گدی میں۔ طبع پاک ناپاک۔

درپسِ آئینہ طوطی صفتم ساختہ اند
انچہ اُستاد ازل گفت ہماں میگویم

سوال : بتاؤ آزاد پاشا سپہ سالار افواج روم کہاں ہیں۔

جواب : بالائے زمین و زیر آسمان۔ یا زیر آسمان و زمیں۔

ایں حکایت شنو کہ در بغداد — رایت و پردہ را خلاف افتاد
رایت از رنج راہ و گردِ رکاب — گفت با پردہ از طریق عتاب
من و تو مرد و خواجہ تاشانیم — بندۂ بارگاہِ سلطانیم
من زخدمت دمے نیاسودم — گاہ بیگاہ در سفر بودم

قدم من بسعی بیشتر است
پس چرا قربت تو پیشتر است

روسی: (اپنے دوست سے) یہ شخص پکّا بے ایمان، دغاباز، جعلساز، کائیاں، خرانٹ آدمی ہے۔ اس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

دوست: یہ سڑی بن گیا ہے۔ اصل میں سڑی نہیں ہے۔

روسی: اچھا بچہ۔ دیکھو تو سہی۔ ایسے ذلیل ہو کہ عمر بھر یاد کرو۔ ہاتھیوں سے گنّے کھاتے ہو۔ بہت پچھتاؤ گے۔ یاد رکھو۔

دوست: یہ کیا یوں مانے گا۔ لاتوں کے آدمی کہیں باتوں سے مانتے ہیں۔ ایسے بھلے مانس نہیں ہیں درخت کے تنے میں باندھ کے رسّوں سے مارو تو البتہ شاید کچھ قبولے ورنہ کیا مجال۔

روسی: اچھا لاؤ رسّا۔ دیکھو ہم ابھی قبول وائے لیتے ہیں۔

خوجی: گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ سامنے والے درخت میں خواجہ بدیع ہوں گے اور رسّے میں لٹکے ہوں گے اور رسیّوں کی مار پڑ رہی ہوگی۔ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی لے خداوند نعمت۔

روسی: تم نہ بتاؤ گے۔ اچھا بچہ۔ اب تمہاری شامت آگئی۔ اب تم جیتے نہ بچو گے۔ ہم کو کیا۔

خوجی: آؤ تم کو ایک شکایت سُنائیں۔ راوی کہتا ہے کہ بادشاہے با غلامے عجمی در کشتی نشستہ بود۔ ایک بادشاہ ساتھ غلام عجمی کے کشتی میں بیٹھا تھا۔ غلام دیگر دریا ندیدہ۔ غلام نے کبھی دریا نہ دیکھا تھا۔ و محنت کشتی نیازمودہ۔ اور محنت کشتی کی نہ آزمائی تھی۔ گریہ و زاری آغاز نہادہ۔ رونا پیٹنا شروع کیا۔ و لرزہ در اندامش افتاد اور جوڑی بیچ بدن اُس کے کے گھُس گئ۔ چندانکہ ملاطفت کروند آرام نیافت۔ کتنا ہی تسلّی دی مگر آرام نہ پایا۔ ملک را عیشش ازو منغص شد۔ بادشاہ کو عیش اُس سے کڑوا ہوا۔ چارہ ندانست۔ چارہ نہ جانا۔ حکیمے دران کشتی بود ایک حکیم اُس کشتی میں تھا۔ ملک را گفت ملک را کہا۔ اگر فرمان دہی من اورا خاموش گردانم۔ اگر حکم دیں میں اُس کو خاموش کروں میں۔ گفت غایت لطف باشد۔ کہا غایت لطف ہوئے۔ آخر من نا غلام را بدریا انداختند۔ فرمایا کہ غلام کو بیچ دریا کے ڈالیں۔ بارے چند غوطہ بخورد۔ بارے چند غوطے کھائے۔ مویش بگرفتند۔ دسوے کشتی آوردند۔ موئے اُس کے پکڑے اور سوئے کشتی لایا۔ بہر دو دست در سکّان کشتی درآویخت۔ بہر دو ہاتھ بیچ سکان کشتی کے لٹکایا۔ چوں ساعتے برآمد۔ جب ایک ساعت اوپر آئی۔ بگوشہ بہ نشست و قرار گرفت بیچ گوشہ کے بیٹھا اور قرار پکڑا۔ ملک را پسندیدہ آمد و گفت۔ بادشاہ کو پسندیدہ آمد اور گفت۔ اندرین چہ حکمت بود بیچ اس کے کیا حکمت تھی۔ گفت کہا۔ اوّل محنت غرق شدن نیازمودہ بود۔ اول محنت ڈوبنے کی نہ

آزمائی تھی۔ وقدر سلامت کشتی نمی دانست اور قدرِ سلامتی کشتی کی نہیں جانتا تھا۔ ہمچنیں قدر عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید۔ ہمچنیں قدر عافیت کی وہ کس جانتا ہے کہ بہ مصیبت پکڑا آوے۔

— اے سیر ترا نانِ جویں خوش نہ نماید

اے سیر تجھ کو نانِ جو کی خوش نہیں آتی

— معشوق من است آنکہ نزدیک تو زشت است

معشوقِ میرا ہے وہ جو نزدیک تو بُرا ہے

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف

بہشتی کی حوروں کو اعراف دوزخ ہے

— از دوزجناں پُرس کہ اعراف بہشت است

دوزخیوں سے پوچھ کہ اعراف بہشت ہے

1. ماشاء اللہ بیچ بدن اس کے گھس گئی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

2. (حکیمے دران کشتی تھا) کیوں نہ کہہ یا حضور تھے۔

3. یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ من چہ فش ام برادر من بسیار فش است یہی مثل صادق آئی ہے۔ سبحان اللہ۔

4. میں اُس کو خاموش کروں میں۔ اس تو تو میں میں کے صدقے۔

5. (نرا) کے لیے اُردو لفظ خوجی بیچارے کو نہیں معلوم ہے۔

6. اوہو ہو ہو۔ (اوپر آئی) کی ایک ہی کہی۔ واہ خوجی واہ۔

7. (گفت) کے معنی بھی خواجہ بدیع الزمان کو نہیں آئے۔ اور کیوں کہ جانیں۔ کابل کے رئیس اُردو سے کیا مطلب۔

8. حکمت کیا حکمتا کہیے۔ جب تو مذکر ہو گا۔ حکمت اور حکمتا۔

9. کیا فصیح ترجمہ ہے۔ اے لعنت خدا۔ ہات تیرے گیدی کی۔

10. بہشتی کی حوریں۔ یہ نئی حوریں پیدا ہوئی ہیں۔

روسی: اب تم کو قسم ہے کہ چپ نہ رہو بکتے ہی جاؤ۔

خوجی: دو اور دو چار دیوانے۔ ایک اور ایک دو کانے۔

راوی : ایک روسی واحد العین تھا۔ اُس پر آوازہ کسا۔
روسی : بکتے جاؤ بکتے جاؤ۔ تمہیں قسم ہے جو خاموش رہو۔
خوجی : زبینہ سیدھی۔ موندھا شکر کا موندا ہے۔

چنین یاد دارم کہ سقائے نیل
یہ سقائے نیل اِک جو ہے ابر تر

نکرد آب بر مصر سالے سبیل
نہ اک سال برسا کہیں مصر پر

گروہے سوئے کوہساران شدند
پہاڑوں پہ خلقت گئی بھاگ تب

ہزاراں طلبگار باران شدند
وہ رو رو کے تھے مانگتے پانی سب

کہ ہستند واز گریہ جوئے رواں
وہ اِس درجہ روئے کہ ندی بہی

بباید مگر گریۂ آسمان
کہ شاید فلک ان پر روئے کبھی

بذوالنوں خبر برد از ایشاں کسے
تو ذوالنوں سے جا کر کسی نے کہا

کہ بر خلق رنجست وسختی بسے
کہ ہے خلق پر رنج و سختی سوا

فرو ماندگان را دعائے بکن
تو بیچاروں کے واسطے کر دعا

کہ مقبول را رو بناشد سخن
ہو مقبول اچھوں کی اکثر دعا

شنیدم کہ ذوالنوں بمدین گریخت
وہ ذوالنوں بھی مدین کو بھاگا وہیں

بسے بر نیامد کہ باران بریخت
نہ گذرا بہت مینہہ برسا وہیں

خبر شد بمدین پس از زور بیست
خبر دی کسی نے یہ ذوالنوں کو واں

کہ ابر سیہ دل برایشان گریست
کہ بیچاروں پر رویا آپ آسمان

سبک عزم باز آمدن کرد پیر
تو پھر آنے کا قصد اُس نے کیا

کہ پر شد سبیل بہاران غدیر
کہ ہر چشمہ آب منہ سے بھرا

بپرسید ازو عارفے در نہفت
لگا پوچھنے اُس سے اِک پارسا

چہ حکمت دریں رفتنت بود گفت
کہ کیا حکمت اِس جانے میں تھی کہا

شنیدم کہ بر مرغ و مور و دوان
سُنا چیونٹی اور چڑیا چوپاؤں کی

شود تنگ روزی بفعل بدان
بدوں کی بُرائی سے روزی رُکی

خوجی نے کہا۔ یارو تم نے تو کئی سوال کیے۔ اور منِ بدیع نے برجستہ جواب دیے۔ مگر اب چند سوال

ہمارے ہیں۔ جواب طلب ضروری۔

1۔ آسمان کا زینہ۔ ع

کدھر ہے کس طرف ہے اور کہاں ہے

2۔ خدائے ذوالجلال کا رُخ۔ کسی کی طرف ہے یا نہیں۔

3۔ اگر شیطان ناری ہے تو۔ دوزخ کا اُس کو کیا خوف ہے۔

4۔ وجہ کیا کہ من بدیع کو لوگ شیطان ابن شیطان نہ کہیں۔

منم شیطاں منم شیطان اعلیٰ

اللہ باقی من کل خاکی۔ انت انتما۔ انتم۔

5۔ روم اور روس میں کس کا قصور ہے اور کس کی عقل کا فتور ہے کہ عاقل نہ کہ غافل نہ محروم نہ کہ مجروم کہ جری وکہ ہری۔

مست ذوقم در خراباتِ مغاں جائے من است

دل صراحی دیدہ ساغر گریہ صہبائے من است

دل تو صراحی ہے۔ صراحی اور دل کی ایک شکل ہے۔ ایک کُتّا یعنے مادہ سگ کا دل دیکھا تھا یہ صراحی۔ اچھا۔ اب سُنیئے کہ دنیا ساغر آنکھ مثل پیالے کے بس یہ بات ہے اور ذوق کا مست ہوں۔

خواجہ تو گفتہ غزل تر دریں زمین

سلماں زراہ خشک سوادِ سخن گرفت

راوی: سبحان اللہ۔ یہ شعر تو مضمون خیز اور بامحاورہ ہے۔ مگر خواجہ بدیعا کا کلام نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کسی اُستاد بے بدل کا شعر ہے۔ یا شاید۔

گاہ باشد زپیر دانشمند | برنیاید درست تدبیری
گاہ باشد کہ کودکِ نادان | بغلط بر ہدف زند تیری

6۔ آواز پر روس میں کون تیر لگاتا ہے۔ کوئی ہے بھی۔؟

7۔ اگر آزاد بھاگ گئے تو خواجہ صاحب قبلہ نے کیا قصور کیا ہے۔ کرے کوئی پکڑا مشعلچی والا جائے۔ یہ کون انصاف ہے۔

ہر کہ شاہ آں کند کہ او گوید | حیف باشد کہ جز نکو گوید

8۔ کوئی نجومی ہو تو ہم کو بتائیے کہ ستارہ کب تک منحوس ہے۔ اور اس نحس اور نحس مرز بوم زمین بوم سے من بدیع کو کب چھٹکارا ملے گا۔

روسی نے ازراہ مذاق ان سوالوں کے جواب یوں دیے۔

1۔ آسمان کا زینہ ادھر ہے اس طرف ہے اور یہاں ہے۔

2۔ شمع کا رُخ کس کی طرف ہے۔ بس یہی جواب ہے۔

3۔ تم خاکی ہو۔ اگر دو من کا مٹی کا ایک ڈھیلہ کوئی تمہارے سر پر مارے تو چوٹ آئے یا نہیں۔ اگر تم خاکی ہو۔ تو مٹی سے چوٹ کیسی۔

راوی: خوب اچھا جواب دیا۔ مگر خوجی کے لیے دو من کے ڈھیلے کی کیا ضرورت تھی۔ خاک! ایک کنکری کافی ہے۔

4۔ بدیع اور بدیع کے باپ اور اُن کے دادا کے پردادا کو شیطان کہیں تو ہی زیبد۔ اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔

5۔ روم نہ روس کا قصور ہے۔ صرف حضور کی عقل کا فتور ہے۔ باقی خیر صلاح ہے کہ نہیں۔

6۔ آواز پر تیر تو کوئی نہیں لگاتا۔ مگر خواجہ بدیع کی گدّی پر چپت جمانے والے بہت ہیں۔ جھکاؤ سر۔ نیچی کرکھوپڑی۔

7۔ خوجی آزاد کے پٹھو ہیں۔ جیسے آفتاب اور سایہ۔

8۔ نحوست آپ کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔

خوجی نے یہ جواب سُن کر کہا۔ مگر دو روز تک ہوائے سرد اور آج ایک دوست کی ملاقات، کلکٹر صاحب کی بگھی۔ اگر ہم سمجھے ہیں تو وہی اور ہے بات یہ کہ مرغ کی دو ٹانگ ـــــ مگر ہم تو آدمی جری ہیں۔

گر سایۂ مبارکت ـــــ اُفتاد بر سرم
جرأت غلام من شدہ اقبال چاکرم

اتنے میں اُن لوگوں نے ایک موٹے رسّے کو درخت میں باندھا اور کہا۔ خواجہ اب بولو۔ دو گھڑی کی مہلت ہے۔ اس مہلت میں اگر تم جواب شافی دو تو فہوالمراد۔ ورنہ تم ہو اور ہمارا رسّا اور یہ درخت مار پیٹ کے اسی میں پھانسی دے دیں گے۔ خوجی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ سوچے کہ اب ہم دو گھڑی کے مہمان ہیں۔ خدا سے دعا مانگی کہ باری تعالیٰ تیرا خادم بندۂ بدیع تو اب راہی ملک بقا ہوتا ہے۔

مگر مرتے وقت صرف یہ دُعا مانگتا ہے کہ خدا کرے حسن آرا کو یہ صدمہ نہ پہنچے کہ آزاد سے شادی نہ ہو۔ ع

این دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

روسی: حضرت اب اُٹھیے۔ چلیے پھانسی حاضر ہے۔

خوجی: (بکمال استقلال) دل ہمارا تری نذر ہے۔

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

روسی: (دوست سے) سُنتے ہو۔ میاں سڑی ہے۔

دوست: اجی سڑی نہیں ہے۔ ہم کو سڑی بناتا ہے۔

خوجی: درخت زیب اور بکری کی کلیجی۔

ہر چہ از دو نان بہمت خواستی
در تن افزودی و از جان کاستی

آزاد پاشا مفرور ہوئے

آزاد پاشا سواروں کے ساتھ مارا مار چلے جاتے تھے۔ کبھی دل میں خوش ہوتے تھے، کبھی ملول خوشی یہ تھی کہ خدا نے وہاں سے بچایا اور رنج یہ تھا کہ شہزادی چھوٹی اور مس میڈا چھوٹیں پھر یہ بھی خیال تھا کہ مبادا راہ میں گرفتار کر لیے جائیں۔ بہر کیف بمفوائے قہر درویش بر جان درویش چُپ چاپ چلے جاتے تھے۔ حسن آرا کی صورت ہر شجر اور ہر سمت سے نظر آتی تھی۔ عشق صادق کا کیا کہنا ہے۔

اے خونبہائے نافہ چیں خاکِ راہ تو
خورشید سایہ پرورِ طرفِ کلاہ تو

یہ شعر میاں آزاد کے وردِ زبان تھا۔ فرس آہو شکار کو کڑکڑاتے ہوئے بگٹٹ لیے جاتے تھے۔ راہ میں روسی سوار سے جو شہزادی کا نوکر تھا اور ملازم خاص تھا۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔

آزاد: خدا نے چاہا تو راہ میں ہمیں کوئی نہ روکے گا۔
ایک سوار: (ملکاف) اگر کوئی روکے بھی تو ہم مستعد ہیں۔
دوسرا: (اگنائف) کیا مجال ہم لوگ جوابدہی کریں گے۔
آزاد: مبادا دن چڑھ جائے اور صورت سے وہ لوگ ہم کو پہچان لیں۔ لیکن تم دونوں کے سبب سے بڑا سہارا ہے۔ ہمیں تمہاری وجہ سے مطلق خوف نہیں ہے۔ تم زباندان آدمی ہو۔
ملکاف: آپ اندیشہ نہ کریں۔ جب تک ہم دونوں ساتھ ہیں۔ آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ہم نہ ہوں تو بیشک تمام خوف ہے اور جب تک ہم ہیں تب تک خدا کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔
آزاد: مگر مجھے اس وقت ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی قتل کرنے کے لیے شمشیر برہنہ لیے ہوئے آتا ہے۔

اس دم کوئی برچھی ہے مرے دل پہ لگاتا
گویا ہے کلیجہ کوئی صیرا لیے جاتا
کوئی میرے سینے کو ہے آتش سے جلاتا
اس دم مری آنکھوں سے نہیں کچھ نظر آتا
لذت مرے جینے کی لیے جاتا ہے کوئی
بے تیغ مجھے ذبح کیے جاتا ہے کوئی

اگنائف: نہیں ایسا خیال نہ کیجیے۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔
ملکاف: دریائے ڈینیوب کے پار تک ہم آپ کے ساتھ ہیں۔
آزاد: بس اس پار جائے ہم کو فوج ٹرکی مل جائے۔
ملکاف: یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا۔ فوج کو آپ خود تلاش کر لیجیے گا۔ مگر دریا پار تک آپ کا بال کوئی بیکا نہیں کر سکتا۔
اگنائف: کیا طاقت۔ کوئی بے وجہ کیوں بولنے لگا۔
آزاد: اب تو ہم ہیں اور ہمارا خدا ہے۔ اس میں چاہے۔ جو ہو ہر چہ بادا باد۔

ما کار خویش را بخداوند کارساز
بسپردہ ایم تا کرم او چہا کند

ملکاف: اگر کوئی ٹوکے گا تو ہم لوگ روسی زبان میں اس کو قائل کر دیں گے۔ اور شہزادی کا ایک خط

وزیر جنگ کے نام موجود ہے۔ بس کافی ہے۔

اگناتف: اور بس کلیر سانے بھی کچھ لکھ دیا ہے۔

آزاد: ہاں، مگر ہم سے ذکر نہیں آیا۔ ان کی تحریر کی بڑی ہی وقعت ہوگی کیا انھوں نے بھی صیغۂ جنگ کے کسی افسر کے نام لکھا ہے۔؟

آزاد پاشا کوئی چار کوس نکل گئے ہوں گے کہ ایک مقام پر تاریکی اور نشیب و فراز کے سبب سے گھوڑا روکنا پڑا۔ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے کہ اتنے میں سامنے سے بھی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور ایک شخص نے پکار کر کہا۔ کون آتا ہے۔ روک لو گھوڑے ہم سرکاری سوار ایک ضروری کام کے لیے آتے ہیں۔ تم لوگوں سے کچھ دریافت کرنا ہے آزاد پاشا اور سواروں نے گھوڑے روک لیے۔ جب پولینڈ کی شہزادی کے سواروں نے روسی زبان میں فصاحت اور بلاغت سے گفتگو کی تو سرکاری سواروں کو ذرا بھی کھٹکا نہ باقی رہا اور جنگ کا حال یوں بیان کیا۔ ہم لوگوں نے کئی گاؤں کئی قلعے کئی قصبے ترکوں سے چھین لیے ہیں۔ مگر وہ لوگ ابھی تک ہم سے کچھ کم ایسے کم نہیں ہیں۔ بڑی جوانمردی اور جرأت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ اب تک سمجھا جاتا تھا کہ میدانِ جنگ کی لڑائی میں ترک کم ہیں مگر آنسوؤں نے ثابت کر دیا کہ یہ خیال غلط تھا۔

سوال: آپ لوگ اس وقت پہاڑ میں کیا کرنے جاتے ہیں۔ کیا فوج کے لیے لوگ بھرتی کرتے ہیں یا کوئی اور کام ہے۔

جواب: آزاد پاشا کی نسبت خبر ہے کہ وہ اسی طرف کہیں چھپے ہیں۔ ایک بار ان کی نسبت تحقیقات کی گئی تھی، اب پھر بھیجا ہے۔

سوال: اِدھر تو پولینڈ کی شہزادی کی عملداری ہے۔

جواب: سُنا ہے انہیں کی عملداری میں کسی شخص کے ہاں ہے۔

سوال: اور آزاد تو سیبیریا کے برفستان بھیجے گئے وہ وہاں سے کیوں کر بھاگ آئے ہم کو سخت ہی حیرت ہے۔

جواب: اثنائے راہ میں سواروں کو دھوکا دے کر چل دیے۔

سوال: اب جنگ کی نسبت جنرلوں کی کیا رائے ہے۔

جواب: آثار سے ظاہر ہے کہ ترک دم آخر تک لڑیں گے۔ اور خوب لڑیں گے۔ مگر فتح تمہاری ہی ہوگی اس میں شک نہیں۔

سوال: بھلا قسطنطنیہ پر روسیوں کا قبضہ ہوگا یا نہیں۔

جواب: نہیں۔ اس قبضے کو یورپ کے سلاطین خصوصاً فرمانروائے انگلستان جائز نہ رکھیں گے کہ قسطنطنیہ پر روسیوں کا قبضہ ہو جائے۔

سوال: اب آپ لوگ آزادی کی تلاش میں کہاں تک جائیں گے۔ کل کوہستانی مقامات ڈھونڈھ ڈالیے گا کیا۔؟

جواب: دیکھیے اگر کہیں پتہ ملا تو خیر ورنہ روانہ ہو جائیں گے اور ہمیں تو ذرا بھی یقین نہیں ہے کہ پتا لگے۔

پولینڈ کی شہزادی کے سوار خاص پولینڈ کے باشندے تھے۔ اور روسیوں کے جانی دشمن۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ روسی شکست پائیں جب بھی روس کی کامیابی کا حال سنتے تھے کمال ملول ہو جاتے تھے۔ اور جب روم کی فتح کا ذکر گوش گزار ہوتا تھا جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ وجہ یہ کہ روس اور پولینڈ میں عرصہ دراز سے ناچاقی تھی۔ پولینڈ والے روسیوں سے بالکل صاف نہ تھے۔ اس ملک کو مختلف والیوں نے مل کر تباہ کر دیا تھا اور ان کے حصے بخرے کر دیے تھے کچھ حصہ ملک پروشس کو ملا۔ کچھ آسٹریلیا نے لیا اور کچھ روس کے قبضے میں آیا۔ روسی اہل پولینڈ پر کمال ظلم کرتے تھے۔ اور وہاں کے باشندوں کو روسیوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ روس کے پاس اس ملک کی ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار میل مربع زمین تھی۔ پروشس کے قبضے میں باون لاکھ میل مربع زمین آئی۔ اور آسٹریا نے چونسٹھ ہزار میل مربع پر قبضہ کیا۔ 806ء میں پھر حصے بخرے ہوئے۔ انگلستان کی یہ خواہش ہوئی کہ روس اور آسٹریا اور پروشس کے درمیان میں کوئی آزاد ملک ہو جس کو ان تینوں عظیم الشان سلطنتوں سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہے۔ کیوں کہ ایسی بڑی سلطنتوں کے درمیان میں کسی آزاد والی ملک کا ہونا امن کے لیے منافی ہے۔ آسٹریا نے بھی یہی رائے دی بلکہ یہاں تک کہا کہ جو مقامات پولینڈ اس کو مل گئے ہیں وہ واپس دینے پر تیار ہے۔ بشرطیکہ پولینڈ پھر بدستور ویسا ہی آزاد ملک ہو جائے۔ جیسا پیشتر تھا۔ چنانچہ اس رائے کے مطابق کسی قدر عمل میں آیا۔ اب روس کے تحت میں ایک لاکھ اٹھتر ہزار میل مربع زمین پولینڈ ہے۔ پروشس کے قبضے میں انتیس ہزار۔ آسٹریا کے پاس تیس ہزار۔ سینتالیس ہزار میل مربع زمین پر ایک والی ملک کا قبضہ ہے اور اس ملک کا نام پولینڈ رکھا گیا ہے۔ اس میں اب اٹھائیس لاکھ آدمیوں سے زیادہ کی آبادی نہیں ہے مگر روس کے پاس جو حصہ پولینڈ ہے۔ اس کی آبادی ستر لاکھ کے قریب ہے۔

پیشتر یہاں دریا کے ذریعے سے بڑی سوداگری ہوتی تھی۔ لیکن اب کچھ سال سے بند ہے۔ خصوصاً اُن دریاؤں کی سوداگری بالکل مفقود ہوگئی ہے۔ جو روس کے قبضۂ اقتدار میں ہیں۔ غلّہ شراب بن تیل اِس ملک میں باہر سے جاتا ہے اور ریشمی کپڑے۔ جھیلوں کے بکس، مویشی وغیرہ اس ملک میں لائے جاتے ہیں۔

سرکاری سواروں نے کہا ہم لوگ آج شب کو پولینڈ کی شہزادی کے سواروں کے ہاں مدعو ہوں گے کل اُن سے ملیں گے اور پرسوں اُن کے واقف کار آدمی لے کر کہسار میں آزاد پاشا کی تلاش کے لیے روانہ ہوں گے۔ اگر آزاد پاشا مل گئے تو ہم لوگوں کو کثیر انعام ملے گا۔

آزادِ پاشا چُپ چاپ کُل باتیں سُن رہے تھے، کچھ تو ہنسی آتی تھی اور کچھ خوف معلوم ہوتا تھا۔ مبادا بات کھل جاتے تو اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ لیکن تشفی یہ تھی کہ روسی خود اُن کے ساتھ موجود ہیں یہ دونوں سوار روس میں رہے، روس میں پیدا ہوتے۔ زباندان تھے۔ سرکاری سواروں کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ آزاد پاشا اُن کے ساتھ ہیں اور کیوں کر ہوتا۔ آزاد نے عمداً اور قصداً زبان نہیں کھولی کہ مبادا کوئی لفظ غلط نکلے یا کسی لفظ کا تلفظ درست نہ ہو یا کوئی بات بے محاورہ کہہ جاؤں تو لینے کے دینے پڑیں۔

سرکاری سوار: تم لوگ وزیر جنگ کے پاس کس غرض سے جاتے ہو۔ کوئی خاص کام ہے یا نوکری کی تلاش ہے۔

سوار: کہا نہ آپ سے کہ ہم پولینڈ کی شہزادی کے مُلازم ہیں اُنھوں نے پار جمنٹ پر لکھا ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ بحفاظت وزیر جنگ کو دو۔

سرکاری سوار: اور صرف تین سوار بھیجے، کافی نہیں ہیں۔

سوار: معقول ہم کو زیادہ آدمی کرتے ہی کیا ہیں۔

سرکاری سوار: آج کل مُلک میں آگ لگی ہوئی ہے۔ فرض کرو کہ کہیں ترک مل جائیں تو پھر کیسی ٹھہرے۔

سوار: واہ ترک مل جائیں۔ کیا دل لگی ہے۔ ترک نہ ہوئے ہوّا ہوئے اور ترک ملیں گے تو کیا کریں گے۔ بہت کریں گے کاغذ چھین لیں گے لیکن ہم بڑی ہوشیاری سے جائیں گے۔

سرکاری سوار: اگر کہیں آزاد کا حال معلوم ہو تو فوراً اطلاع دینا، دریافت کرنا کہ روسی لشکر اس مقام سے قریب کہاں پر ہے۔ معاً جانا اور اطلاع دینا کہ آزاد فلاں موضع کی طرف ہیں۔

راوی: ضرور۔ بالضرور۔ دریں چہ شک منہ دھو رکھو۔
سوار: بلاشبہ۔ ضرور۔ بالضرور اطلاع دی جائے گی۔
دوسرا: مگر وہ ایک کائیاں ہے وہ نہ ملے گا۔
سرکاری سوار: ہاں ہے تو اُستاد۔ اور بڑا لڑنے والا ہے۔ ہم لوگ تو اس کو مان گئے ہیں۔ اخبار ٹائمز کے ایک نامہ نگار نے میدان جنگ سے لکھا تھا کہ ترکوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ آزاد کا سا جنرل ملا۔ کل فوج ٹرکی میں ایسا جیوٹ اور بہادر نہیں ہے۔ آزاد وہ شخص ہے۔
آزاد: بھلا ٹائمز کے کس پرچے میں درج ہے۔
آزاد پاشا کے لیے مصلحت اسی میں تھی کہ سُنتے سب کی مگر خاموش ہو رہتے۔ زبان نہ کھولتے لیکن اپنی تعریف سُنی تو نہ رہا گیا۔ ابلہ را ستائش پسندی آید۔ یہ مثل غلط ہے۔ ابلہ اور زیرک سب کو تعریف اچھی معلوم ہوتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ بیوقوف اس تعریف پر اترانے لگتا ہے چاہے اس کا مستحق نہ ہو مگر دانشور میزانِ خرد میں تولتا ہے کہ وہ تعریف کہاں تک جائز ہے۔ بس اس قدر فرق ہے۔
سرکاری: تاریخ تو ہمیں نہیں یاد ہے مگر اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ دو ہفتے ہوتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہم نے ٹائمز کا آخری پرچہ دیکھا تھا چنانچہ زار روس نے اِس تحریر کو پڑھ کر ایک سکریٹری سے کہا کہ اِس شخص کی تصویر اگر ملے تو ہم بہت خوش ہوں۔
سوار: ہاں تو روس کے شہنشاہ کے کان تک آزاد کا نام پہنچ گیا۔ سبحان اللہ۔ ازیں چہ بہتر۔ بڑا نام ہوا۔
سرکاری: سپاہی کو اِس سے بڑھ کر اب اور کیا چاہیے بس۔
سوار: اِس اخبار کو ہم بھی پڑھنا چاہتے ہیں بڑا نام ہوا۔
سرکاری: جرمنی کے سپہ سالار نے جنگ قلعہ کا نقشہ دیکھا تو کہا اگر میں بھی اِس جنگ میں شریک ہوتا تو اتنا ہی کرتا جتنا آزاد نے کیا اِس سے زیادہ کار نمایاں انسان کی طاقت سے خارج ہے۔
آزاد: کون قلعہ رومانیا کی سرحد کے قریب۔ جو واقع ہے یا بلغارستان کے قلعہ کا ذکر ہے۔ یا اور کوئی۔؟
سرکاری: ہمیں یہ کیا معلوم۔ یہ ہم نے جرمنی کے ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ آزاد کو کون نہیں جانتا ہم نے سُنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان آزاد کو اس قدر عزیز رکھتے ہیں کہ مسجد میں نماز کے بعد اِن

کی فتح یابی اور سرخروئی کی تعریف کرتے ہیں۔
آزاد پاشا ان خبروں سے اس قدر خوش ہوئے کہ جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ جناب باری کا شکریہ ادا کیا کہ آج یہ خبر فرحت اثر سننے میں آئی۔

صد شکر کہ آفتابِ مقصود
از برجِ اُمید چہرہ بنمود

پولینڈ کے سوار بھی بدرجۂ غایت مسرور و محظوظ ہوئے۔

پیر مرد اور کتاب شمس الضحیٰ کا مضمون

اب سنیے کہ بمبئی کے مرزا صاحب جن کے ہاں آزاد پاشا فروکش ہوتے تھے مرزا ہمایوں فر کے عرس کی تقریب کے لیے آئے۔ اُن کے داخل ہوتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا صاحب باہر آئے دیکھا کہ پیر مرد ایک کتاب پڑھ رہے ہیں پوچھا آپ کیا ملاحظہ فرماتے ہیں۔ کہا شمس الضحیٰ اس سانحے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اب دل بہلانے کے لیے تمام دن یہی پڑھا کرتا ہوں۔ آزاد نے یہ کتاب مجھے دی تھی۔ مرزا صاحب نے کتاب لی اور پڑھنے لگے۔

جو لوگ بڑے لائق فائق مشہور ہیں اور تربیت یافتگی کا دم بھرتے ہیں وہ تک اس بات کے قائل ہیں کہ ذات الذنب یعنی ستارۂ دنبالہ دار نہج بہ نحوست ہوتا ہے۔ پس یہ جہلا چہ رسد اگر دہاقین ایسا خیال کریں۔ تو کچھ تعجب کی بات نہیں اور اصلاً مقام حیرت نہیں۔ گنوار تو اَن پڑھ ہوتے ہیں۔ آپ چاہے کیسے دلائل ساطعہ پیش کریں وہ مُرغی کی ایک ہی ٹانگ قائم رکھیں گے۔ لیکن اندھیر تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں روشن ضمیر اور ذی علم تصور کرتے ہیں وہ تک۔ ؎

ازیں ستارۂ دنبالہ دارے ترسند

ایسے ضعیف الاعتقاد آدمی تربیت یافتگی پر دھبا لگاتے ہیں۔ تربیت و تعلیم کو بدنام کرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ نظر انصاف سے دیکھیے کہ ستاروں کو انسان کے معاملات میں کیا دخل ہے۔ معاذ اللہ۔ کہاں ستارہ کہاں انسان کے افعال۔ بھلا ستاروں کو ہماری بدقسمتی یا خوش طالعی سے واسطہ۔ سبب غرض یہ تو وہی بھدیسل مثل ہوئی کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ جہاں دُمدار ستارہ نمودار ہوا کہ بس کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے کوئی صاحب غلبۂ جودت سے فرماتے ہیں کہ جس

طرف اس ستارے کا رُخ ہے اُس طرف دو بادشاہوں میں باہم معرکہ جنگ و جدل گرم ہوگا۔ خون کی ندیاں بہیں گی۔ ہزار ہا بندگانِ خدا کی ناکردہ گناہ جان جائے گی۔ کوئی صاحب مشیخت سے نبکارتے ہیں کہ امسال کسی آفت ارضی یا سماوی کا ظہور ضرور ہوگا۔ لیکن اس خیال کو پختہ مغز خیال خام تصوّر کرتے ہیں۔ ایسے توہمات یا طلہ پر لاحول پڑھتے ہیں۔

ذات الذنب یعنی ستارۂ دنبالہ دار کی نسبت اہل ہئیت نے یوں تحقیقات کی ہے کہ ستارۂ مذکور کرۂ شمس کے گرداگرد اور سیاروں کی طرح دورہ کرتا ہے۔ سر آئزک نیوٹن صاحب نے جو علم ہئیت میں اپنی آپ ہی نظیر تھے اور جن کی تحقیق انیق کو ایک عالم مسلّم سمجھتا ہے لکھا ہے کہ سیارۂ دنبالہ دار ایک جرم مصمت یعنی غیر مجوّف ہے۔ یہ دُم جو دکھائی دیتی ہے اصل میں نجارات ہیں۔ کچھ آفتاب کی گرمی اور کچھ خود سیارہ مزبور کی تمازت سے نجارات روشن ہوجاتے ہیں۔ صاحب معزی الیہ نے 1680ء میں ایک دُمدار ستارہ دیکھا تھا جبکہ کرۂ شمس سے اِس قدر قریب تھا کہ اُس کی گرمی جلتے بلتے لوہے کی گرمی سے دو ہزار حصّے زیادہ تھی۔ 1807ء میں عالم اجل ڈاکٹر برشل صاحب نے ایک ستارہ دیکھا تھا جس کی دُم نوّے لاکھ میل دراز تھی۔ پھر ڈاکٹر ممدوح نے 1811ء میں ایک اور ستارہ معائنہ کیا۔ جس کی دُم تیس کروڑ تیس لاکھ میل کی تھی یہ 1805ء و 1454ء و 1680ء و 1859ء میں علمانے اس کا حال کسی قدر دریافت کیا ہے۔ ورنہ اوائل میں لوگوں کو خوف تھا کہ مبادا یہ سیارے آفتاب میں جاگریں اور افتاب کی گرمی کو دو چند زیادہ کردیں جس سے زمین کے باشندے بیٹھے بٹھائے سخت مصیبت میں مبتلا ہوں اور جل بھن کر خاک ہوجائیں۔ لیکن یہ خیال صرف وہم پر مبنی تھا۔ فلپ صاحب کا مقولہ ہے کہ ذات الذنب نے کرۂ شمس میں گرنے کا کبھی میلان نہیں کیا اور بفرض محال اگر گرے بھی تو اصلامقام خوف نہیں کیوں کہ اُس کا جسم آفتاب کے جسم سے بہت چھوٹا ہے۔ ستارۂ دنبالہ دار آفتاب کے گرد زمین کے محاذات میں دورہ کرتا ہے۔ شروع اکتوبر میں زمین ستارۂ دنبالہ دار سے دو کروڑ میل کے فاصلے پر ہوتی ہے۔ دسمبر اور جنوری میں ان کا بعد کسی قدر زیادہ ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ستارۂ مذکور نظر ہی سے غائب ہوجاتا ہے۔ ان کُرون میں تابستان اور زمستان دونوں کی ایسی شدت ہوتی ہے کہ ذی روح مخلوق کا رہنا وہاں غیر ممکن ہے۔

مرزا صاحب نے کہا ہم بھی شمس الضحیٰ خریدیں گے۔ اچھی کتاب ہے اس میں علوم کا ذکر ہے اور اِس خوبی سے بیان کیا کہ مصطلحات کی دقت ہرگز باقی نہیں رہی۔

پیر طرد: تو آپ سے اور آزاد پاشا سے بڑی ملاقات تھی۔

مرزا : جی ہاں بمبئی میں عرصہ دراز تک رہے ہیں خوب جانتا ہوں۔
پیر مرد : رخصت کے وقت ہم سے کہا تھا۔

اب تو جاتے ہیں روم کو آزاد
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

افسوس ہے کہ جب سے گئے پھر نہ ملے اور ملیں کیونکر وہ تو پہنچے روم اور ہم یہاں ہیں۔ خیر یار زندہ و صحبت باقی۔

مرزا : حسن آرا بیگم کے نام تو اکثر خطوط آتے ہیں، بخیریت ہیں۔ اور اخباروں میں ان کا حال پڑھا۔ بڑا کار نمایاں کر رہے ہیں۔ شہنشاہ روس تک اُن کے مداح ہیں۔

خوش ہوائیست فرح بخش خدایا بفرست
نازنینی کہ برویش مے گلگوں نوشم

دینا ہو، اور جام شراب ہو۔ شراب ہو اور نرگسی کباب ہو (لے اُڑے) اور ساقی پستہ دہن سیم ساق بے حجاب برانگندہ نقاب ہو۔ زاہد صد سالہ تک شاہ مینا کا مرید ہو جائے۔ صراحی کو منہ سے لگائے۔ جام پر جام لنڈھائے۔ مستی و رندی کا زور ہو۔ ہو حق کا شور ہو۔ تمام محفل میں دھوم مچے۔ بزم طرب دلہن کی طرح سجے۔

اب سُنیئے کہ ٹھنڈھی ہوا کے جھونکے سن سن چل رہے تھے، اور کانٹوں کے لمپ سامنے جل رہے تھے آزاد پاشا لب رود ڈینوب فرس طوطی بر صرغام پر سوار ہو جوں کا لطف اُٹھا رہے تھے اور خیالات مندرجہ بالا ان کے دل میں جگہ پا رہے تھے۔ روسی سواروں سے کئی بار بادۂ گلگوں کی فرمائش کی مگر اُنھوں نے ہر بار فہمائش کی۔ کہ حضور بڑا نازک وقت ہے۔ سامنے روس کی فوج بے شمار ادھر اُدھر طلایہ کے سواراں جرار۔ اس طرف رود بار قہار۔ اس سمت کہسار عظمت بار۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ خدا خدا کر کے دریا عبور کیا۔ مگر ذرا لغوبت ہوئی تو دھر لیے جائیں گے۔ پھر تمام عمر پچھتائیں گے مگر اس وقت کی ہوائے خنک نے جگر تک کو سرد کر دیا تھا۔ رات بھیگ گئی تھی۔ برف باری سے ہاتھ پاؤں کھنکھیے جاتے تھے اور دریا کا کنارا ان سب پر طرہ تھا۔ آزاد گو شراب کے خلاف تھے مگر بے جام مروق کے زندگی وبال تھی اور حافظ شیراز کے اشعار ورد زبان تھے۔

حاشا کہ من بموسم گل ترک مے کنم

من لافِ عقل میزنم این کار کے کنم

مطرب کجاست تا ہمہ محصول زہد و علم

در کار بانگ بربط و آواز نے کنم

از قیل و قال مدرسہ حالا دلم گرفت

یک چند نیز خدمت معشوق میکنم

سواروں نے پھر سمجھایا۔ نشیب و فراز دکھایا۔ کہا۔ حضور ہم اس لیے ساتھ بھیجے گئے ہیں کہ حضور کو منزل مقصود تک پہنچائیں۔ اور ترکوں سے ملائیں۔ واسطے خدا کے جام سے اجتناب کیجیے۔ عقل سے کام لیجیے۔ آزاد نے کہا۔

ساقی بیار بادہ کہ اندر زمان گل

تا بشکنیم توبہ دگر درمیان گل

آزاد پاشا کو شک کی جگہ یقین کامل تھا کہ اب نہ بچیں گے۔ سامنے روسیوں کا لشکر مور و ملخ سے زیادہ ہے۔ بھاگنے کا راستہ بالکل مسدود ترک مفقود۔ صرف دو آدمی ساتھ۔ اب مفر کی کون صورت ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد سویرا ہو جائے گا کوئی نہ کوئی پہچان لے گا۔ قید کر کے وزیر جنگ کے پاس لے جائے گا۔ لہذا سوچے کہ جام بادۂ مصفا لنڈھا کر غم و رنج کی گرد لوح دل سے دھوئیں اور لمبی تان کر بے غل و غش اسی میدان بلا خیر میں سوئیں۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

مے پینے سے ہوتا ہے فراموش غمِ دہر

حفرِ رہ آرام ہے یہ جام نہیں ہے

مگر سواروں نے ان کو منع کیا۔ اور کہا اب چلیے۔ ہم لیے چلتے ہیں اگر اس فوج سے نکل گئے تو سبحان اللہ ورنہ۔ ع

بر سرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد

آزاد نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ اشعار پڑھتے ہوئے چلے۔

بر بینا مداز تمنائے بست کامم ہنوز

برامید جام لعنت دردی آشامم ہنوز

روزِ اول رفت جانم در سر زلفین تو

تا چہ خواہد شد دریں سودا سرانجامم ہنوز

ساقیا یک جرعۂ زان آب آتش گوں کہ من
درمیان پختگان عشق او خامم ہنوز

سوار: اِن سرکاری سواروں سے تو خدا خدا کر کے چھٹکارا ہوا۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اِس فوج سے اگر محفوظ رہے تو فہوالمراد ورنہ خدا حافظ و ناصر ہے۔ پھر جو کچھ ہو۔

دوسرا: کچھ بھی نہ ہوگا۔ ہماری رائے پر چھوڑ دو پھر لطف دیکھو۔

سوار: بہتر۔ مگر اتنا سوچ لو کہ اگر ذرا کھٹکا ہوگیا تو دھر لیے جاؤ گے اور اگر داہنے بائیں چلے تو طلایہ کے آدمی جانے نہ دیں گے یہ بڑے شریر ہوتے ہیں۔ ان سے خدا ہی بچائے۔

دلا زہجر مکن نالہ زانکہ در عالم
غم است و شادی و خار و گل و نشیب و فراز

سوار: آزاد پاشا۔ اب حضور اپنی رائے دیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

دوسرا: حضور کی رائے اِس وقت صائب نہیں ہے۔ حضور تو جام و صراحی کی تلاش میں ہیں۔ یہاں جان پر بنی ہے۔ خیر۔ خدا مالک ہے۔

آزاد: اس وقت دو دو پگ لو اور مزے سے دَرّاتے ہوئے چلو۔

صبح دولت میدمد کو جام ہمچوں آفتاب
فرصتے زین بہ کجا باشد بدہ جام شراب

الغرض سب کی رائے قرار پائی کہ گھوڑے پھیکتے ہوئے چلے چلو۔ جو کچھ ہوگا سمجھا جائے گا۔ میاں آزاد اور دونوں سوار صرصر تگ اور باد رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے۔ روس کی فوج کو کمال حیرت ہوئی سوار اور پیادے اور افسر سمجھے کہ ترکی فوج قریب آگئی ہے۔ طلایہ کے سوار اطلاع دینے آئے ہیں۔ لوگوں نے گھبرا کر کہا خیریت ہے۔ پولینڈ کے ایک سوار نے کہا جلد بتاؤ وزیر جنگ کہاں ہیں۔ کہا وزیر جنگ یہاں کہاں۔ یہاں جنرل گارچگاف ہیں۔ تم کہاں سے آتے ہو۔ طلائے پر تھے نہ مطلب تو بتاؤ۔ کیا کہنا کیا ہے۔

سوار: وزیر جنگ سے ایک بڑا ضروری کام ہے۔ سخت ضروری کام ہے۔

فوجی سوار: کچھ کہو تو سہی۔ کیا ضروری کام ہے۔ کیا ٹرکی لشکر قریب ہے۔

سوار: ہم کو پولینڈ کی شہزادی نے بھیجا ہے اور ایک پارچمنٹ دیا ہے۔ حکم ہے کہ وزیر جنگ جہاں ہوں فوراً اُن کے پاس پہنچو اور اُن کے سوا اور کسی کو نہ دو۔ چنانچہ ہم چو طرفہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ

وزیر جنگ کہاں ہیں کوئی سوار ہمارے ساتھ بھیج دیجیے۔

فوجی سوار : پارچمنٹ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پارچمنٹ پر کیوں لکھتیں۔ پولینڈ کی شہزادی تو مشہور ہیں مگر وزیر جنگ سے کیا تعلق ہے۔

سوار : آزاد پاشا کی نسبت کچھ حال ان کو معلوم ہوا ہے۔

فوجی سوار : اخاہ! تو ہم کو تو اطلاع دو۔ شاید ہم کچھ فکر کر سکیں۔ ہم یہاں سے قریب ہیں۔ اگر مقام معلوم ہو تو ہم خود جائیں۔

سوار : ہمیں کچھ مطلق نہیں معلوم ہم کو فقط پارچمنٹ دیا ہے۔

فوجی سوار : اچھا ہم جنرل کو اطلاع دیتے ہیں۔ تم ٹھہرو۔

اب سنیے کہ دونوں سوار باہم عمداً لڑنے لگے۔ ایک نے کہا تم نے کیا سمجھ کے خط کا حال بتا دیا۔ یہ راز سربستہ تھا۔ اگر بات پھوٹی اور آزاد نے سن لیا اور بھاگ گئے تو روس کے حق میں کس قدر مضر ہوگا۔ دوسرا بولا ہم نے اپنی فوج کے بیڑے میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے۔ کسی غیر کے سامنے نہیں کیا ہے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ یہ راز کی بات ہے۔ دونوں سواروں میں باہم خوب گلنمپ ہوئی ایک تو یہی کہتا جاتا ہے کہ ان لوگوں سے آزاد کی خبر اور خدا کا حال بیان کرنا خلافِ مصلحت نہ تھا۔ دوسرے کی رائے تھی کہ آزاد بڑے نامی گرامی جنرل ہیں۔ اُن کے حالات کو سخت مخفی رکھنا چاہیے۔ روسی بھی سمجھے کہ یہ دونوں واقعی خیر خواہ ہیں، اور روسی تو یہ خود بھی تھے۔ لہٰذا اِن دونوں کی خاطر کی گئی۔

اتنے میں ایک لفٹننٹ نے آن کر کہا۔ آپ دونوں کو جنرل افواج نے یاد کیا ہے۔ سوار اُن کے سامنے آئے۔ تینوں کے نام پوچھے۔ آزاد نے اپنا نام کرشولاف بتایا۔ جنرل نے ان سب سے سوال کیے۔

جنرل : تم کو پولینڈ کی شہزادی نے ہماری پاس بھیجا ہے۔

سوار : حضور ہم کو وزیر جنگ کے پاس روانہ کیا ہے۔

جنرل : کوئی خط کوئی لفافہ کوئی تحریر دی ہے یا یوں ہی۔

سوار : ہاں حضور ایک پارچمنٹ سربمہر دیا ہے۔

جنرل : اگر مضائقہ نہ ہو تو پارچمنٹ ہمارے حوالہ کر دو۔

سوار : حضور کو اختیار ہے مگر ہمیں حکم نہیں دیا ہے۔

جنرل : قواعد جنگ روس سے ہمیں پورے پورے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ کاغذ آپ سے لیں خود

کھولیں اور پڑھیں اور پھر بدستور آپ کو وزیر جنگ کے پاس مع اُس کاغذ کے بھیج دیں۔ سواروں نے پارچمنٹ دے دیا۔ جنرل فوج نے تخلیہ کر کے پارچمنٹ کھولا اور پڑھا۔ اس میں یہ عبارت لکھی تھی۔

حضرت وزیر جنگ کو معلوم ہو کہ ہماری عملداری میں کئی بار سوار اس ٹوہ میں آئے کہ آزاد پاشا تو یہاں نہیں آئے۔ اس سے ہمیں خود شک ــــ ہو گیا کہ غالباً وہ یہاں ہی کے کہسار میں ہوں گے۔ ع

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

ہم آزاد کے حالات سے بخوبی واقف نہیں ہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ آزاد کون شخص ہے۔ مگر سُنا ہے کہ وہ روم کے ایک پاشا ہیں۔ یہاں کچھ دن تک مس کلیرسا رہی تھیں ایک بار آپ کے سواروں کو خبر ملی کہ آزاد پاشا ایک پہاڑ کی طرف ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ اُس سمت دوڑ گئے اور کچھ عرصے کے بعد مس کلیرسا بھی گئیں۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم کو یقین ہے کہ آزاد یہیں ہیں۔ وہ شخص سواروں کے ساتھ روانہ کیا گیا اب پھر کئی سوار آن موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ کامل تحقیقات کیجیے۔ ورنہ ہماری رعایا کی امن میں فرق واقع ہوتا ہے۔

یہ پڑھ کر جنرل نے لفافے کو سر بمہر کیا اور سواروں کو دیا۔ ایک سوار اور اُن کے ساتھ بھیجا کہ وزیر جنگ تک ان کو پہنچائے۔

اثنائے راہ میں آزاد پاشا نے ایک موضع میں فوج کے لفٹنٹ سے کہا کہ آپ کے ہاں کہیں اِس وقت شراب مل سکتی ہے۔ اُس نے کہا ہاں ایک بوتل ہے۔ باقی سب صرف ہو گئیں۔ وہ بوتل اُنھوں نے آزاد کو دی۔ انھوں نے لیبل پڑھا اور کہا (جمیکا رم) دل میں سوچے کہ ہمیں وقت ضرورت جب شراب ملتی ہے جمیکا کی رم ہی ملتی ہے اس سے ہمیں نفرت ہے۔ مگر اس وقت ہزار غنیمت ہے۔ جمیکا رم کے دو تین پیگ سے تو خوف اور تشویش خیرباد کہہ کر سدھاری۔ گویا بھرہ کھل گیا نڈر ہو گئے۔

ہنر بر ہیشۂ شداد میاں آزاد فرخ نہاد جام مے دوسالہ لنڈھا کر بےخوف و خطر سواروں کے ساتھ گلگوں عقاب ہیئت ضیغم شکار سُبک پو یہ کرتے جاتے تھے۔ اثنائے راہ میں انواع و اقسام کے خیالات ــــ ان کے دل میں جگہ پاتے تھے۔ کبھی اپنی بادہ خواری پر نفرین کی کبھی آیہ لاتقنطوا من الرحمۃ اللہ نے تقویت ــــ دی سوچے کہ خدائے عزوجل عطا پاش و خطا پوش ہے۔ اس وقت بادہ خواری سے یہ غرض نہ تھی کہ رندی و مستی حاصل ہو۔ بلکہ اصلی منشا خاص یہی تھا کہ جھجک نہ باقی رہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

جمیکارم نے اس دم مرہم زخم دل و جگر کا کام کیا۔ خدا خوب جانتا ہے کہ آزاد رند خم خانۂ محبت ہے۔ خاص مطلب یہی تھا کہ جس کام کے لیے ہندوستان سے آیا ہوں اس کو پورا کروں۔ خدا نے چاہا تو وہ پورا ہو، اور میں سرخرو جاؤں ورنہ

ع یا قسمت۔ یا نصیب۔ یا بخت

خدا کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہوئے بھی خوف آتا ہے اور بے دعا مانگے رہا بھی نہیں جاتا۔

حافظ اندیشہ کن از نازکی خاطر یار
برواز درگہش این نالۂ و فریاد ببر

دیکھیے خدا وہ دن کب دکھاتا ہے کہ ہم فوج رومی کے افسر بنے ہوئے میدان کارزار میں جنگی کارروائیاں کر رہے ہوں گے۔ ادھر آزاد پاشا تو ان خیالوں میں تھے، ادھر پولینڈ کے سوار سوچتے تھے کہ روسی فوج کا سوار ہمراہ ہے۔ اس کی موجودگی میں آزاد کی مطلب برآری معلوم۔ اور اس کو یہاں سے کسی طرح ٹال بھی نہیں سکتے۔ آخر کار ایک پہاڑی کے قریب گھوڑے روک لیے۔ اس سوار نے کہا ذرا دم لے لو۔ ابھی ایسی جلدی نہیں ہے۔ سرکاری سوار گھوڑے سے اترا۔ ایک درخت کے تنے سے گھوڑا باندھا، اور کہا میں گاؤں سے آگ لاتا ہوں۔ ورنہ ٹھٹھر جائیں گے۔ ان تینوں نے اس کا گاؤں میں جانا غنیمت سمجھا اور باہم مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا تدبیر کی جائے۔

"گھوڑے کو ذبح کر ڈالو، اور بھاگ چلو۔ بس یہی تدبیر ہے۔"

"واہ کیا گاؤں میں اس کو گھوڑا نہ مل سکے گا، معقول۔"

"ہمارے نزدیک سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ اسی موذی کو قتل کر ڈالو۔ بس فراغت ہوئی۔ بس کوئی خرخشہ باقی نہ رہے گا۔

ع نے غم دزد نہ غم کالا

"اس میں بھی دقت ہے۔ لاش کو کہاں پھینکو گے بھلا۔"

"جنگ کے زمانے میں کوئی لاش کی فکر کیا کرتا ہے۔ اس کنویں میں کاٹ کے ڈال دو۔ بس۔ کون پوچھتا ہے۔"

آزاد اور ان دونوں سواروں میں بحث ہونے لگی۔ کسی نے کچھ رائے دی کسی نے کچھ۔ اتنے میں ایک سوار نے میان سے تلوار نکالی اور بڑھ کے تلا ہوا ہاتھ دیا، تو گردن کھٹ سے الگ۔ معاً تینوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کڑکڑاتے ہوئے چلے۔ مقتضائے مصلحت تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو تا بھاگ جاتے۔ آزاد گھوڑے کو للکارتے جاتے

تھے۔ گٹ آن سر۔ گٹ آن۔ شاباش، آئی بوائے شاباش۔ گٹ آن۔ وہ غازی مرد۔ کیوں نہ ہو۔

اشاروں میں چلا کرتے ہیں یہ شائستہ گھوڑے میں
کہ صورت ان کی حیوانی ہے سیرت ان کی انسانی

آزاد اس وقت خوب گرمائے ہوئے تھے۔ گو سردی بھی اچھی چمکتی تھی اور برف بھی کسی قدر پڑ رہی تھی مگر ایک تو جمیکا رم کی گرمی، دوسرے گھوڑے کی سواری، فرس تند خو کا بگٹٹ جانا۔ سردی ذرا بھی نہ معلوم ہوئی۔ تین کوس نکل کر دم لیا۔

اب سنیے کہ وہ سوار جو گاؤں سے دو چار آدمیوں کو لے کر آیا تو گھوڑا ندارد۔ پولینڈ کے سواروں کا پتہ ہی نہیں، ایں! بھائی سوارو۔ بھائی سوارو! ارے یار کدھر چل دیے۔ بھئی بڑے دل لگی باز ہو۔ آخر اس سے کیا فائدہ دیر ہوتی ہے بھائی، اور جانا دور ہے ہم کو کیا۔ ہم سے کہو ہم بھی پڑ کے سو رہیں، اور لطف یہ کہ گھوڑا بھی درخت سے کھول کے لے گئے بڑے ہنسوڑ ہو۔

اتنے میں ایک آدمی نے کہا وہ سامنے کیا چیز نظر آتی ہے؟ گھوڑا ہی تو نہیں ہے۔ جا کے دیکھتے ہیں تو گردن الگ، دھڑ الگ۔ لاش پڑی ہے اور خون کے سرّاٹے جاری ہیں۔

سوار: ارے! ان! بڑا دھوکا ہو گیا۔ دغا دے گئے۔

شدائد سے مکائد سے دغا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

آدمی: یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا لٹیروں کے ساتھ آئے تھے کیا۔

سوار: بڑا چکما ہو گیا۔ اُف۔ اُف۔ دغا۔ دغا۔ دغا۔

آدمی: کچھ بتائیے تو کس نے دغا دی۔ کس بات کی دغا دی۔

سوار: دغا! دغا!۔ ہم ہی کو دغا نہیں دی۔ بلکہ جنرل تک کو چکما دیا۔ مگر اب تک ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون لوگ تھے شہزادی کا خط موجود۔ پارچمنٹ موجود۔ روسی آدمی لیکن اس قتل کا سبب نہ معلوم ہوا۔ کمال افسوس کا مقام ہے۔

آدمی: آپ کے ساتھ تھے کون لوگ؟ کچھ معلوم تو ہو۔

سوار: اب اس سے کچھ مطلب نہ نکلے گا۔ تم کوئی سواری لاؤ۔ گھوڑا ہو یا بو ہو۔ اور دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ تین گھوڑے یا تین یابو ہوں تو کام بن جائے۔

آدمی: دس۔ بلکہ اور پچاس۔ یہ کون مشکل بات ہے۔

یہ کہہ کر ایک گھنٹے میں گاؤں کے آدمی چار گھوڑے لائے۔ ایک پر سوار اور دو پر آدمی سوار ہوئے، ایک گھوڑا واپس کر دیا۔ سوچے کہ اس لق و دق میدان میں خدا جانے وہ لوگ کس طرف نکل گئے۔ ہم تعاقب کریں، تو کس پتے سے، اور یہ بھی دل گواہی نہیں دیتا کہ اسی مقام پر بیٹھے رہیں۔ ذرا بھی ہیچپانہ کریں۔ سپاہی پن کے خلاف ہے۔ خیر خدا کا نام لے کر چلے چلیں۔ اگر ملے تو سبحان اللہ نہ ملے تو دل کا ارمان تو نکل جائے گا۔ تینوں آدمیوں نے شمال کی جانب راہ لی اور آزاد جنوب کی طرف گئے تھے۔ یہ لوگ دو کوس جا کے واپس آنے لگے سمجھ گئے کہ سوار نکل گئے وہ ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہوں گے ان کا تعاقب کرنا دل لگی بازی نہیں ہے۔ واپس آتے تھے کہ اثنائے راہ میں ڈاکوؤں کا گروہ ملا۔ انھوں نے نرم چارہ سمجھ کر ان سے ہتھیار رکھوا لیے اور کہا گھوڑے چھوڑ دو، ورنہ قتل کیے جاؤ گے۔ قہر درویش بر جان درویش۔ ایک کی دوا دو۔ دو کی دوا چار۔ یہ تین وہ بے شمار۔ اور وہ بھی مسلح۔ طوعاً و کرہاً ہتھیار رکھ دیے۔ اور گھوڑے بھی ڈاکوؤں کے حوالے کیے۔ یہ وہی مثل ہوئی کہ چوبے جی چھبے ہونے گئے تھے وہاں سے دوبے ہو کے آئے، نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑے۔ ڈاکوؤں نے اپنی راہ لی اور یہ مصیبت کے مارے پیادہ پا چلنے لگے۔

اتنے میں ایک شخص نے جو ڈاکوؤں کا سرغنہ اور کا سک تھا اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ان تینوں کو قتل کرنا چاہیے، ورنہ راز افشا ہو جائے گا۔ ایک آدمی ہم کو پہچانتا ہے (حالانکہ یہ صرف واہمہ ہی واہمہ تھا) الغرض چار ڈاکو پلٹ پڑے، اور ان تینوں بے گناہوں کو دم کے دم میں مار ڈالا۔ اس سفاکی پر خدا کی مار۔ ان کا قصہ تو یوں تمام ہوا، اب کوئی اتنا بھی نہ رہا کہ جنرل کو ان امور سے مطلع کرتا۔

اب سنیے کہ آزاد پاشا اور وہ تینوں سوار ایک ایسے مقام پر پہنچے جس سے آدھ کوس کے فاصلے پر روشنی نمودار تھی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ فوج کا پڑاؤ ہے۔ ورنہ میدان اور کہسار میں روشنی کجا۔ گاؤں میں بھی شب کو اگر بہت جلے دس پانچ لمپ۔ لہذا یہ روشنی اس امر پر دال تھی کہ فوج ٹکی ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ روسی ہیں یا ترک۔ تینوں آدمی عقل دوڑانے لگے۔ ایک نے رائے دی کہ روسی ہیں۔ مگر آزاد اور ایک سوار نے کہا کہ گو حق الیقین سے نہیں کہہ سکتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ ترکوں کی فوج ہے۔ رائے قرار پائی کہ ایک سوار تھوڑی دور جا کے دریافت کرے اور ٹوہ لے کہ کس کی فوج ہے۔ ایک سوار آہستہ آہستہ اس سمت گیا جدھر روشنی تھی۔ آزاد پاشا دوسرے سوار سے چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ کہا اس وقت جمیکا نے وہ لطف دکھایا کہ

ع دلِ مَن داند و مَن دانم و داند دلِ مَن

صرف معشوق گل رخسار و باغ و بہار کی ضرورت ہے کہ دو گھڑی قہقہے اڑیں۔ مس کلیرسا نو بہار حسن و جمال ہے۔ میڈا نادک نگاہ، مشتری خصال ہے۔ پولینڈ کی شہزادی سیم اندام زیبا خرام ہے۔ قوس ابرو شیریں کلام ہے۔

یہ تینوں پریاں اس وقت روبرو ہوں تو سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اب قسم کھائی کہ بلا معشوق سمن بر پری پیکر کے اس کا شغل نہ کریں گے ؎

کردہ ام توبہ بدستِ صنم بادہ فروش
کہ دگر مے نہ خورم بے رُخ بزم آرائے

آزاد پاشا فرط طرب سے ساقی نامہ زبان پر لائے اور جھوم جھوم کر بے خوف و خطر لہرا لہرا کر پڑھنے لگے۔

بیا ساقیا مے کہ تا دم زنیم — قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
سُبک باش و رطل گرانم بدہ — وگر فاش نتواں نہانم بدہ
بدہ ساقی آں آب آتش فشاں — ازاں پیش کز ما نیابی نشاں
کہ در آتش ست ایں دل روشنم — ہمانا کہ آبے بر آتش زنم
نوشتہ است بر جامِ نوشیرواں — کہ بیفزائے از جام نوشیں لباں
بدہ ساقی آں آب آتش خواص — کزاں بلکہ یابم ز آتش خلاص

کدام ست جام جم و جم کجا ست
سلیماں کجا رفت و حاتم کجا ست

اتنے میں وہ سوار واپس آیا۔ ان دونوں نے کہا بھئی دال میں کالا کالا ضرور ہے ورنہ اگر ترک ہوتے تو یہ وہیں سے غل مچاتا آتا۔ سوار نے قریب آکر کہا۔ حضرت جانے کو تو میں چلا گیا مگر مجھے راہ میں خیال آیا کہ اگر روسی فوج نہ ہوئی ترکی لشکر ہوا تو مجھے فوراً قتل کر ڈالیں گے لہذا واپس آیا کہ تم سب کو لے کر چلوں۔ ترکوں کی فوج ہوگی تو آزاد پاشا جو ابد ہی کو موجود ہیں' اور روسیوں کی سپاہ ہوگی تو ہم کافی ہیں۔ الغرض، ہم تینوں سوار ہوئے اور چلے۔ جب قریب پہنچے تو ایک لشکر والے نے آواز دی۔ کون؟ کون کہتا تھا کہ آزاد نے باآواز بلند کہا (ہم آزاد پاشا) وہ شخص فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس قدر خوش ہوا' اس قدر خوش ہوا کہ بیان سے باہر۔ فوراً بیڑے میں خبر ہوئی اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

ایک : آزاد پاشا (قدموں پر گر کر) شکرِ خدا ہزار شکر خدا۔
دوسرا : یہاں سنتے تھے کہ سیبیریا بھیجے گئے اور مار ڈالے گئے۔
تیسرا : یا خدا اس وقت جو مانگتا مل جاتا۔ میں ابھی دعا ہی مانگ رہا تھا بارے قبول تو ہوئی۔
آزاد : بڑی بڑی مصیبتیں سہیں۔ بارے بخیر گزشت اُفّوہ۔
چوتھا : حضور یہ دو سوار کون ہیں۔ یہ روسی ہیں!

آزاد : یہ وہ ہیں جنھوں نے میری جان بچائی۔ یہ روسی بڑے دوست آدمی ہیں۔ شاباش بھائیو شاباش یارانے کا حق خوب نباہا۔ اب یہاں سے فوج کتنی دور ہے۔

جواب : ابھی ایک میل کا فاصلہ ہے۔ ہم چالیس آدمی یہاں تعینات ہیں اور وہ سامنے چالیس آدمی ہیں۔ اور دس آدمی اس طرف طلائے کے لیے گئے ہیں کل دو سو کی جماعت ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر دس ہزار سوار اور دو ہزار پیادے ہیں۔ اٹھارہ ضرب توپ۔ پہاڑی باٹری بھی ہیں اور توپے بنی۔ ایک ہفتے کی رسد ہے۔ سب سامان لیس ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر دم لے کر آزاد نے حکم دیا کہ فوج میں ہمارے آنے کی اطلاع دی جائے ایک سوار فوراً روانہ ہوا۔ فوج سے دو افسر اور چار سوار چلے۔ پہنچتے ہی غل مچایا (آزاد۔ آزاد)

آزاد : ہیلو۔ اپیلٹن۔ خوش آمدی۔ خوش آمدی۔

اپیلٹن : (گھوڑے سے اتر کر مصافحہ تو کرو۔ شکر ہے شکر ہے۔

آزاد : بھائی بڑی مصیبت پڑی تھی۔ بارے بخیر گزشت۔

اپیلٹن : ہم تو سمجھے تھے کہ تم سیبریا کے برفستان میں ہو۔

آزاد : بڑی بڑی پریشانیاں اور سختیاں جھیلی ہیں۔ مسز اپیلٹن کا حال کہو۔ خدا کرے۔ بخیریت ہوں۔ آمین۔

تنت بناز طبیباں نیاز مند مباد

وجود نازکت آزردۂ گزند مباد

اپیلٹن : آخری خط جو انھوں نے بھیجا ہے، اس نے مجھے خون رلایا۔

آزاد : (چونک کر) کیوں کیوں خیر تو ہے خیر تو ہے۔

اپیلٹن : کسی اخبار میں انھوں نے تمھارے مصائب کا حال پڑھا تھا بس نہ رہا گیا۔ بڑا لمبا چوڑا خط بھیجا ہے۔ پڑھنے کے قابل ہے۔

آزاد : خدارا جلد لکھ بھیجو کہ آزاد مع الخیر واپس آیا۔

اپیلٹن : ضرور اور بہت جلد شکر خدا۔ ہزار شکر خدا۔

شکر خدا کہ از مدد بختِ کارساز

برحسب مدعاست ہمہ کاروبار دوست

بلغارستان میں کوہ قاف کی ایک پری گرفتار کی ہے۔ یہ عورت جس کے جادو جمال ہونے میں ذرا بھی شک نہیں، بلگیریا سے روسیوں کو خفیہ مدد دیتی تھی۔ اتفاق سے اس کا حال درج اخبار ٹیمز ہوا۔ اور ایک وزیر کی نظر سے گزرا۔ اس کی گرفتاری کا کام میرے سپرد ہوا سبحان اللہ سبحان اللہ۔ عورت کیا ہے یہ مج

پری ہے۔ اب لوں میں چلو تو دکھا دوں۔ پھڑک جاؤ گے۔

آزاد: چلو۔ بسم اللہ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔

دم کے دم میں داخل ہو گئے۔ اس عورت کو دیکھا تو خدا کی خدائی مجسم نظر آئی۔ کہا یہ بُت یوسف جمال اس قابل ہے کہ اس کا کلمہ پڑھے۔ کیا خدا کی شان ہے۔

توازپری چابک تری وز برگ گل نازک تری

وز ہرچہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ ہاتھ سے جاتا رہا۔ طبیعت پر دل کا اور دل پر آزاد کا قابو نہ رہا، اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔

ہر آہ جگر سوز کہ سینہ بر آید

دو واست کز و بوئے کباب جگر آید

اپیلیٹن: کیا چہرہ ہے۔ کیا رنگ ہے۔ کیا حُسن خداداد ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اب تڑکا ہو گیا۔ رات بھر کے جاگے ہو۔ آرام کرو۔ دن کو انشاء اللہ باتیں ہوں گی۔

فوج کے کل آدمی، افسر اور پیادے اور سوار، آزاد پاشا کی ملاقات کے لئے دوڑے آئے۔ ان کو دیکھ کر کمال محفوظ ہوئے۔

کرنل: ہم نے مُردہ کو آج زندہ پایا۔ اللہ اللہ۔

لفٹنٹ: دو چار آدمیوں کی زبانی سُنا تھا کہ آپ بھاگ گئے۔

سوار: یہاں مشہور تھا کہ پولینڈ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

آزاد: میں ایک روز اپنے کل حالات بیان کروں گا۔ ایک دفتر ہے۔ صدہا مصائب سے دو چار ہوا۔ بڑے عذاب میں جان تھی۔ مگر خدا خدا کر کے چھٹکارا ملا۔ ورنہ بڑی بے ڈھب ہوتی۔

سوار: خبر تھی کہ کوئی خوش الحان شہزادی ان پر ریجھی ہے۔

آزاد: واہ۔ بے وقت کی شہنائی کسی کو نہیں بھاتی۔

تھا اپنے ہی سوچ میں وہ سنسان دھن راگ کی تھی نہ رنگ کا دھیان

بے وقت وہ راگ خوش نہ آیا

بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا

کرنل: اس میں شک نہیں کہ تم پر کوئی مہ جبیں ضرور عاشق ہوئی تھی۔ میں بہت بوڑھا آدمی ہوں اور عاشق تن آدمی ہوں۔

آزاد: زمانہ مُساعد بھی رہا اور نامُساعد بھی۔ مگر اب تو غنچۂ دل کھل گیا کہ اس فوج میں داخل ہو گیا۔ شکرِ خدا ہزار شکرِ خدا۔ صد ہزار شکرِ خدا۔

کچھ گُلشنِ جہاں کے موافق ہے یہ ہوا ‏ ‏ کھٹکا گلوں کو بادِ خزاں کا نہیں ذرا

شبّو کھلی ہوئی ہے مہکتا ہے موگرا ‏ ‏ ہیں چمپے گلوں میں بندھا ہے عجب سما

صدقے ہے لاکھ جان سے خزاں ان بہار پر

جوبن ٹپک رہا ہے ہر اک گل عذار پر

بدلی جو جھوم جھوم کے اٹھتی ہے بار بار ‏ ‏ جھونکوں میں باد سرد کے پڑتی ہے کچھ پھوار

پھرتے ہیں کس خوشی سے بیاباں میں گلعذار ‏ ‏ کوئل کے کوکنے سے ہیں گلچیں بھی بیقرار

کلیاں قبائے گل کی جو شبنم بھگوتی ہے

آ کر صبا گلوں سے بغل گیر ہوتی ہے

جھڑتے ہیں گفتگو سے جواہر نگار پھول ‏ ‏ دکھلاتے ہیں ریاضِ سخن کی بہار پھول

یاں شاخِ فکر میں ہیں شگفتہ ہزار پھول ‏ ‏ کیا ہو گا گیا جو کوئی آ کے چار پھول

لپٹیں نکل رہی ہیں معطّر دماغ ہے

سینے میں یاں بھرا ہوا پھولوں کا باغ ہے

آزاد پاشا نے جنگ کے حالات دریافت کیے تو کرنل نے کہا۔ ہماری فوج بیچ میں ذرا دب گئی تھی — روسیوں نے نرغہ کر دیا تھا۔ مگر ہم نے دو افسروں کو خوب رشوت دی۔ اب ہم غالب ہیں۔ ایشیا کے سپہ سالار نے البتہ رشوت لینے سے انکار کیا۔ پہلے ہماری فوج قلعہ اردھان وفرص کو فتح کر کے بہت دور بڑھ گئی تھی مگر سپہ سالار موصوف نے ہم کو ہٹا دیا۔ وجہ یہ تھی کہ فوج نوجوان افسروں کی غلطی سے اس قدر دور بڑھ گئی کہ رسد کا سامان ہم نہیں پہنچتا تھا۔ تجربہ کار اور بوڑھے افسر کہا کیے مگر ان لوگوں نے ایک نہ مانی۔ اگر ترکی فوج کی طرح افسر بھی اچھے ہوتے تو لوہے سے لوہا لڑتا اور برابر کی جنگ ہوتی۔ مگر افسر عموماً راشی ہیں۔ فوج بیچاری کیا کرے۔ سپاہ کا مطلق قصور نہیں ہے۔

آزاد: زار روس تو میدانِ جنگ میں خود آئے ہیں۔

کرنل: ہاں۔ نہایت جوش ہے۔ پُرانے افسروں کو بدل دیا نئے افسر مقرر کیے ہیں۔ صبح شام، دن رات، جنگ کے حالات سُنا کرتے ہیں۔ ان کا خیمہ نہایت سادہ ہے اور آج کل غذا بھی سادی ہی کھاتے ہیں۔ روز و شب یہی فکر ہے کہ فتح حاصل کریں۔ اپنے بھائیوں کو قطعی حکم دیا ہے کہ چاہے شکست پاؤ چاہے گرفتار

ہو جاؤ۔ غنیم کو پیٹھ نہ دکھانا۔

آزاد : یہ سب سچ ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اہل مانٹی نیگرو کے سوا دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں۔ جو ترکوں کے نقطہ مقابل ہو۔ ہاں مانٹی نیگرو والے البتہ ترکوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

کرنل : دنیا میں بہت سی طاقتور اور جری اور بہادر قومیں ہیں۔ ایک سے بڑھ کر زولو کیا کم ہیں، ترکمان کیا کچھ کم ہیں اور روسیوں کو آپ کیا کم سمجھتے ہیں۔ کاسک سب سے بڑھ کر ہیں اور مانٹی نیگرو والے تو ستم کے بہادر ہیں۔ ہاں ترکوں کی جرأت میں بھی اصلاً فرق نہیں۔ ہماری فوج نے اکثر مقامات پر کارنمایاں کیے ہیں۔ روسی تک مان مان گئے ہیں۔

آزاد : اب فرمائیے کہ ہم کس فوج میں بھیجے جائیں گے۔

کرنل : وزیر جنگ کو آپ کے آنے کی اطلاع دی جائے گی تب تک آپ اسی فوج میں ہیں۔ سنا ہے کہ روسی کل ہم لوگوں سے اس مقام پر جنگ کریں گے مگر ہم کچھ اُن سے دب کے نہیں رہیں گے۔

آزاد : (اپنے دل میں) یا خدا مس میڈا اور مس کلیر سا کا کیا حال ہوگا۔ تڑپ رہی ہوں گی۔ ہائے افسوس جس سے دل ملایا اس کو صید رنج محن کیا۔ واہ رے ہم۔ پولینڈ کی شہزادی بیچاری کس مصیبت میں پڑی کہ خدا دشمن کو بھی اس سے محفوظ رکھے۔ ہم بھی عجیب خوش نصیب آدمی ہیں۔

آں طوبی ام کہ برگ و برش داغ داغ گر است　　زاغ و ندر و شاخچۂ او سمندر است

آں روضہ ام کہ ہر شجرش باغبان اگر　　آبش بخون دل ند ہد خشک و بے بر است

آں پائے تا بسر ہمہ زخم و جراحتم　　کو را بخواب عاقبت الماس نشتر است

آں خستہ ام کہ در تپ صفرا و جوش خوں　　فصادش آتش جگر و شعلہ نشتر است

آں تیغ آبدیدۂ زہر ملاطفم
کش پائے تا سر از زہر زخم جوہر است

حسن آرا ہم پر عاشق ہوئیں اور ہم ان پر۔ مگر اب تک بجز مصائب بے شمار اور تکلیف مالا یطاق کے اور کچھ نصیب نہ ہوا۔ اللہ رکھی بیچاری کس محبت سے ہماری تلاش میں دوڑی آئی مگر ہم کوہ و ہامون میں پھر رہے ہیں۔

آں شعلہ دوست ہیزم خشکم کہ خاک وے
صندل فروش ناصیۂ عود و عنبر است

اب اس وقت نازنیں مہ جبیں ہو تو لطف آئے۔ کل کی کل کے ہاتھ ہے۔ دیدہ باید کہ شب حاملہ فردا

چہ زائد۔ ایک گولی کافی ہے۔ اس وقت سپہر آرا بیگم یاد آگئیں۔ اور آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور نشہ خوب تیز ہوا تو آزاد نے یہ شعر پڑھا۔

عروس بس خوشی اے وحشت زر
ولے گہہ گہہ سزاوار طلاقی

کرنل: ہم نے سوار بھیجے ہیں کہ جاکے روسی فوج کی حس وحرکت کے حالات دریافت کریں۔ آتے ہی ہوں گے، دیکھیں کیا کہتے ہیں۔ پلونا میں ہماری بہت فوج ہے اور یہ فوج بسر کردگی سپہ سالار تجربہ کار غالباً فتح کامل پائے گی اور غنیم کو شکست فاش دے گی۔

اتنے میں ایک گرد سامنے سے نظر آئی اور فوج میں غل اٹھا، افسروں نے دوربینوں کے ذریعے سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ طلایہ کے سوار گھوڑے بگٹٹ دوڑائے چلے آتے ہیں۔ معاً شک گزرا کہ غنیم قریب ہے۔ جب گھوڑے قریب آئے تو اکثر آدمی دوڑ پڑے۔ سواروں نے گھوڑوں کی باگیں روک کر کہا۔ بس۔ صرف ایک دن کی مہلت ہے، ایک دن کے بعد پلونا چو طرفہ سے محصور ہو جائے گا۔ اگر روسیوں نے غفلت کی تو شاید دو چار روز کے بعد محاصرۂ کامل ہو جائے۔ ورنہ اب جنرل کمانیر افواج پلونا کا محصور ہو جانا مشکل نہیں ہے۔

جنرل: روسیوں کی کس قدر فوج پلونا کے اردگرد ہوگی۔

سوار: کم از کم ایک لاکھ آدمی۔ اور سب جری۔ لڑنے بھڑنے والے آدمی کاسک بھی بہت ہیں۔ اور جو رجمنٹ ہے، بہادر اور آزمودہ کار۔

جنرل: رسد کا سامان روسیوں کے پاس کیسا ہے۔ اچھا یا بُرا۔

سوار: اس سے بہتر سامان رسد کسی کمسریٹ سے نہیں ہو سکتا۔

جنرل: پلونا میں ہماری فوج کی کیا کیفیت ہے۔ گھبرائی تو نہیں؟

سوار: مطلق نہیں سب جان دینے پر آمادہ ہیں اور سپہ سالار کی لیاقت میں تو اصلاً شک نہیں ہو سکتا۔ کیا مجال ہے جو ذرا بھی شبہ ہو سکے۔

جنرل: کس طرف کی فوج پلونا تک جا سکتی ہے۔

سوار: امید نہیں کہ ہماری فوج بیرونی مدد دے سکے۔

جنرل: تو یہ کہو کہ وہ سب سمجھ گئے ہیں۔ بُری ہوئی۔

آزاد: مجھے حکم ہو تو میں پلونا میں اب بھی داخل ہو سکتا ہوں، صرف دس ہزار سواروں کی ضرورت ہے۔ بس زیادہ کی ضرورت نہیں۔ اب تو معشوقوں سے مفارقت نصیب ہی ہوئی ہے۔ اس کا کب تک غم کروں۔

تا کے زغم تو زار گردم | دیوانہ و بے قرار گردم
برباد تو خوں ز دیدہ بارم | از فکر تو دل فگار گردم
سیلاب غم گذشت از سر | آں رفت کہ برکنار گردم
کار من بے قرار عشق است | دیگر ز پے چہ کار گردم

دانم نہ رسم بگرد وصلت
از ہجر تو کز غبار گردم

بس جان دینے پر آمادگی چنداں مقام ہرج نہیں۔ اگر اتفاق سے بچ گئے تو فہو المراد

ع یا قسمت یا نصیب یا بخت

نو عروس زیبا شمائل

پچھلے کو میاں آزاد کی آنکھ جھپکی، تو خواب میں دیکھا کہ ایک شوخ و شنگ رشک پری رخان فرنگ بت سیم ساق چالاک و چاق سے ہم کنار ہیں۔ تڑکے تڑکے آنکھ کھلی دیکھا کہ سر بالیں وہی پری چھم، برق دم، حور بہشتی یعنی کوہِ قاف کی پری بصد شان دلبری متمکن ہے۔ سامنے ان کے یارِ وفادار و بذلہ سنج مرنجان مرنج اسپلیٹن پاشا بیٹھے چرٹ پی رہے ہیں۔ آزاد نے اس رشکِ خوبانِ فرخار نگارِ گل رخسار کو سر بالیں دیکھ کر کہا۔

اے خوش آں صبح کہ عاشق ز شکر خواب وصال
دست در گردن معشوق حمائل برخاست

گورے گورے مکھڑے پر زلف سیاہ جب جوبن دکھاتی تھی، اور نکھرے ہوئے بالوں کے بوجھ سے کمر نازک لاکھوں بل کھاتی تھی۔ یکایک سر بالیں سے شوخی کے ساتھ طرارہ بھرا، اور چمک چمک کے سینہ تانتی ہوئی گلگشت چمن کرنے لگی۔ معشوقی کا دم بھرنے لگی۔ مست صہبائے ناز ایک ایک اشارے میں ہزاروں انداز۔

جلوۂ حسن رشکِ شعلۂ طور | چشم بددور آنکھیں موتی چور
رگِ گل سے کمر لچکتی ہوئی | جوڑی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

بے مسی کے وہ دانت رشکِ گہر
جانِ عاشق نثار ہو جس پر

چلبلا پن ایک ایک رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ لٹیں کالی ناگن کی طرح لہراتی تھیں۔ جوانِ طنّار،

انکھڑیاں بناوٹ یا نہ۔ کبھی طرارہ بھرنا، کبھی اشارے کرنا، کبھی زیرلب مسکرا کر عشاق ناز کے دلوں پر بجلیاں گرانا۔ کبھی بدن چھپا کر جانا۔ دل لبھانے کی خوب ادا یاد تھی۔ مدرسۂ دلبری کی استاد تھی۔ آزاد پاشا کا قاعدہ تھا کہ جہاں کسی نوخیز حسینہ جمیلہ کو دیکھا ایک ساعت کے لیے جنون ہو جاتا تھا۔ آہ سرد کھینچنے لگتے۔

پھر کچھ اب دل کو بے قراری ہے　　سینہ جویائے زخم کاری ہے

چشم دلاّل جنس رسوائی　　دل خریدارِ ذوق خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی

وہی صد گونہ اشکباری ہے

نسیم عنبر شمیم اور بادِ نوروزی، خاتون سحر کی جلوہ افروزی۔ غنچوں کا چٹکنا۔ گلوں کا مہکنا "مسجدوں سے صدائے اللہ اکبر بلند تھی۔ خوشی ونشاط دہ چند تھی۔ عنادل اس کیفیت اور گلکاری کو دیکھ کر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ شاخ گل کے قدرتی جھولوں پر بہار گاتے تھے۔ اپیلٹن نے اس مہوش سمن پوش کی پیاری پیاری، بھولی بھالی باتیں آزاد کو سنائیں تو اس کی چاہ میں ان کی طبیعت ڈانواں ڈول ہوگئی۔

آزاد : جانِ جاں۔ کچھ رحم بھی ہے یا ظلم اور ستمگار ہی ہو۔

پری : ظلم وجفا ہمارا شیوۂ خاص ہے۔ رحم کسے کہتے ہیں۔

آزاد : اللہ اللہ رحم کے نام سے بھی واقف نہیں ہو۔ شان خدا۔

پری : ہمارے معلم نے تعلیم جفا کی ہے۔ وفا تو ہم کو کسی نے سکھائی ہی نہیں۔ پھر ہم باوفا کہاں سے ہوں۔ جور و تعدی کا سبق کوئی ہم سے لے اس میں ہم بھی برق ہیں۔

آزاد : اچھا پھر ہمارے دل کو زیر مشق بناؤ، اور جور و جفا کا اسی پر امتحان لو۔ نازونعم پرورده ہے۔ اس کو ظلم و تعدی کی خوب لذّت حاصل ہوگی۔ مگر آپ کے استاد کے صدقے۔

تعلیم جفا کرد وفا ہیچ نیاموخت

زیں درس غلط بحث براستادِ تو دارم

پری : یہاں نہ شراب ہے نہ جام۔ نہ کھانے پینے کا لطف نہ کوئی مقرر یا شاعر زیبا کلام۔ ہم تو کڑھ کڑھ کے مرجائیں گے ہم سے ایک دم بغیر لطف کی صحبت کے نہیں رہا جاتا۔

صبح است ساقیا قدحی پُر شراب کُن

دور فلک درنگ ندارد شتاب کن

کہیں سے جام بادۂ احمر ملے تو آنکھیں کھل جائیں ورنہ قید تو ہیں ہی۔ تم ایک رنگین مزاج، جوان خوش رو،

عنبر مو، لسان آتش زبان، یہاں نظر سے گزرے ہو، جی خوش ہو گیا اور اس قدر مکالمے کی نوبت آئی، ورنہ کسی اور سے تو اس قدر کہنا بھی شاق تھا۔

آزاد: وجہ۔ کسی غیر سے کیوں فرمائش کیجیے۔ بندہ حاضر ہے۔

فرمائشیں حضور نہ اغیار پر کریں
موجود ہے یہ تابع ارشاد کس لیے

پری: یہ تو فقط میری ایک شوخی تھی ورنہ مجھے اس وقت جام و صراحی کی کیا ضرورت تھی۔

آزاد: ہے ہے۔ یہ شوخی تو ستم ہے۔

خوب رو جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

پری: ہمیں مفت میں لوگ گرفتار کر لائے مگر۔

تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گازران بر سنگ

آزاد: سچ ہے مگر جانِ من تمھاری ایک ایک ادا دل میں کھُب گئی ہے۔

پری: علیٰ ہذا القیاس۔ مگر ہم تو قیدی ہیں۔

مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

آزاد: واہ۔ اگر ہماری زندگی ہے تو ہم تم کو بچا لیں گے۔ ہم عاشق تن آدمی ہیں۔ جہاں اچھی صورت دیکھی پھسل گئے۔ بات تو یہ ہے۔

وہ ایسا کون سا معشوق ہے جس کو نہیں چاہا
یہ فردیں جتنی ہیں ان پر ہماری بھی نشانی ہے

تم مطمئن رہو، ہم تمھاری طرف سے لڑیں گے۔ انشاء اللہ تم ایسی نازنیں، نازک بدن، نازک کمر اور مصائب قید برداشت کرے کیا مجال اب خدا ہمیں تمھاری زلف کی کالی ناگن سے محفوظ رکھے۔ آمین آمین!

خدا محفوظ رکھے دل کو اس افعی کا کل سے — نہیں ممکن سلامت چھوٹنا موذی کے چنگل سے
شراب سرخ کا ساغر چلے ساقی لب جو پر — چمن سرسبز ہے باران رحمت کے تفضل سے
پری لاتی ہے صندل گھس کے مجھ دیوانے کی خاطر — جو سر میں درد ہوتا ہے کبھی زنجیر کے غل سے

چمن کی سیر سے نفرت ہمارے دل کو ہوتی ہے — طبیعت کو خفا کرتی ہے صحبت خار کی گل سے
خدا پر رکھو نظر طالب اگر ہے دین و دنیا کا — یقین ہے دولت کونین حاصل ہو تو گل سے
ضرر پہنچاتی ہے معشوق کو بیتابی عاشق — پھٹے ہیں پردہ ہائے گوش گل فریاد بلبل سے

قیامت میں بھی کوئی حال کو اُنکے نہ پوچھے گا
کیا ہے کُشتہ تو نے جن کو شمشیر تغافل سے

پری: (گلے لگا کر) مگر بھول نہ جانا۔ یاد رکھنا۔

آزاد: ایسی بات ہے بھلا۔ شرفا کہیں کہہ کر بھول جایا کرتے ہیں۔

پری: فوجی آدمی اکثر جوش میں آکر اقرار کر لیتے ہیں، مگر پھر ایفائے وعدہ میں دقت واقع ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میرے سبب سے تم کو کبھی پریشانی حاصل ہو۔

آزاد: جانِ من۔ جو زبان سے کہتے ہیں، وہ کر دکھاتے ہیں۔

پری: آزاد۔ میں تمھارے نام سے خوب واقف ہوں۔ میں بلگیریا کی لیڈی نہیں ہوں، مگر خاتونِ روس ہوں، تمھاری تعریف اکثر اخباروں میں پڑھتی ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تم ایسے سپہ سالار کے ساتھ شادی کروں، مگر تم ہندی مسلمان، اور میں روسی لیڈی شادی کیونکر ہو۔ روسی اور ترکی میں اس قدر جانی دشمنی ہے کہ اگر ترکوں اور روسیوں کی بوٹیاں ایک قاب میں رکھی جائیں تو قاشیں اُچھل اُچھل پڑیں نہ کہ باہم شادی ہو۔ اب تم کو دیکھا تو اس صورت سے کہ تم آزاد اور افسر فوج، اور نام برآوردہ جنرل، ہم اسیر قیدی بے بس۔ مگر۔

کب سبکدوش رہے قیدئے زندانِ وطن
بوئے گل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

جب جہاز سے تم نے صدہا آدمیوں کو بچایا تب سے تمھارا عشق دل میں پیدا ہوا ہے۔ جب تم نے میدانِ کارزار میں فتح پر فتح حاصل کی تب سے ہم تمھارے چاہنے والوں میں ہیں۔ جب مس کلیریسا کے گل رخسار کو تم نے بے جھجک چوما تب سے ہمیں تمھاری ملاقات کا شوق چرّایا ہے ہر رنگ میں تمھارے عاشق تھے۔

خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے
یوسف تھا اگر تو تو خریدار ہمیں تھے

مجھ پر کیا فرض ہے جس نے دیکھا گھائل ہو گئی، جان دینے لگی۔

مرض عشق سے ایک خلق خدا ہے رنجور
جلوۂ حسن جاں سوز بھی فصلی تپ ہے

میں نے تمہاری ایک تصویر دیکھی تھی۔ السٹریٹڈ لنڈن نیوز میں چھپی تھی تصویر نے اور بھی عاشق کر دیا۔ ہزار جان سے عاشق ہوگئی۔

عجب ہے کھینچی مصور نے کس طرح تصویر
کہ شوخیوں سے تو اک رنگ پر رہا کیوں کر

آزاد : لنڈن نیوز میں! دیکھی ہوگی! ہم نے تو نہیں کھنچوائی۔

پری : مشہور آدمی اپنی تصویر کہیں کھنچوایا کرتے ہیں۔

آزاد : یہاں مشہور کون ہے۔ گمنام آدمی ہیں۔

پری : روسیوں کے ظلم کی خبریں بہت مشہور ہوئی ہیں، مگر ابھی تک کسی کو یہ نہیں معلوم ہوا کہ روسی لیڈیاں کیسی پرکالۂ آتش ہیں۔ اور کیسی کیسی کارروائیاں کرتی ہیں، اور کسی شہر کے تو مرد بھی اس قدر شقی اور سفاک نہ ہوں گے جس قدر سفاک اور شقی روس کی لیڈیاں ہیں۔ رحم تو چھو نہیں گیا۔ جانتی ہی نہیں کہ رحم کہتے کسے ہیں۔

آزاد : کیا اسی قسم کی لیڈیوں میں تم بھی تھیں۔ افوہ!

پری : خدا نہ کرے مگر ہاں جس جرم میں ہم گرفتار ہوئے۔ صحیح ہے۔ ہم نے کئی جہاز ڈبوا دیے، سُنا کہ فلاں مقام پر ٹرکی کا جہاز ہے فوراً کوشش کی کہ غرق کر دیا جائے، دو مقام پر تارپیڈو کے ذریعے سے جہازوں کو غرق کیا۔ تین گاؤں میں آگ لگا دی۔ دس آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، اور بھی کئی قسم کی کارروائیاں کیں۔ آخر کار اتفاق سے گرفتار ہوگئے۔ اب ایک نہیں چلتی۔

آزاد : جو جور و جفا کرد ٔ می زیبد۔ سب روا ہے۔ حُسن میں بے نظیر ہو، از سر تا پا حور ہو بلکہ حور سے بھی بہتر ہو، کیا ادا ہے۔ ہائے کوئی میرے دل سے پوچھے۔

عجب چشم سیہ کا ہے رُخِ رنگیں جاناں میں — تماشا ہے عوضِ بلبل کے ہے شاہیں گلستاں میں
وہ چشم سُرمگیں ہے فتنہ پردازی کے ساماں میں — کھنچی رہتی ہے تیغ ابرو کی صف بندیِ مژگاں میں
پری پیکر نہیں اس دلرُبا سا قوم انساں میں — فلاطوں کو کرے دیوانہ جانکلے جو یوناں میں
جنوں پردہ دری دکھلا رہا ہے داغ سینہ کا — تماشائے چمن ہے کوچۂ چاک گریباں میں

یہ مجھ دیوانے کی زنجیر سے آواز آتی ہے
وہ کیچڑ میں پھنسا ہے جو ہے آب و گل کے زنداں میں

پری : ہمارے ملک کا قاعدہ ہے کہ جتنے باشندے ہیں ان میں سے نصف آدمی سے زیادہ ہی زیادہ سرکار کے دشمن رہتے۔

ہیں اور یہ آج ہی کل کا قاعدہ نہیں ہے ۔ مدت العمر سے یہ بات ہوتی آئی ہے ۔ اس قسم کے لوگوں کو روس میں نہلسٹ کہتے ہیں ۔

آزاد : ہاں ہم نے اس فرقے کا ذکر سُنا ہے ۔ بڑے شورہ پُشت ہوتے ہیں اور سرکار کے جانی دشمن، خدا ان لوگوں سے بچائے ۔ معاذ اللہ ۔

پری : یہ کیوں ۔ یہ لوگ تو اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں ۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوش تر　　　خار وطن از سنبل و ریحاں خوش تر

یوسف کہ بملکِ مصر شاہی می کرد
می گفت گدا بودنِ کنعاں خوش تر

آزاد : زارِ روس کو جان بچانا مشکل ہے مگر آدمی جری معلوم ہوتے ہیں اور باوصف پیرانہ سالی محنت اور مشقت سے نہیں چوکتے ۔

پری : ہاں اس میں کیا شک ہے ۔ مگر ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ اب ہمارے ملک میں بھی انگلستان کی طرح پارلیمنٹ ہو ۔ یا فرانس اور امریکا کی طرح سلطنت جمہوری ہو جائے ورنہ شاہی انتظام میں رعایا پر جبر ہوتا ہے ۔

چو خواہد کہ ویراں کند عالمی
نہد ملک در پنجۂ ظالمی

آزاد : روس کے یہ خیالات وحشت انگیز ہیں ۔ لاحول ولا ۔

پری : آپ کو ابھی ان کے حالات معلوم کہاں ہوئے حضرت ۔ جبر، تعدی، ظلم، خود پسندی، خودستائی، خود غرضی ۔ یہ روسی حکام کی ادنیٰ صفتیں ہیں اور بائیں ہاتھ کا کرتب اور زار تو جان و مال کے مالک ہیں ۔

آزاد : قانون کی پابندی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ۔ یہ بتائیے ۔

پری : کیسا قانون اور کس کی پابندی ۔ طوائف الملوکی کی سی کیفیت ہے ۔ جس نے جو چاہا کیا ۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا ۔

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم　　　ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ ست و جدل با مادر　　　پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر می بینم

ہیچ شفقت نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ مہرے نہ پدر را بہ پسر می بینم

یہ بالکل ہمارے ملک کے حسب حال ہے ۔ کالجوں کے طلبہ سرکار کے خلاف لیڈیاں دشمن ۔ رعایا عدو ۔ ہاتھ پاؤں خلاف بس ۔ انتہا ہے ۔ یہ اختلاف ۔

آزاد: شکر خدا کہ ہمارے ہندوستان میں امن وامان کا ڈنکا بجتا ہے۔

ع نے غم ذرد نے غم کالا

جھگڑا نہ فساد، حکام رحیم غریب پرور، عدل گستر، رعایا شاد، ملک آباد۔ اگر کسی کو کچھ شکایت ہوئی بھی تو اس نے حکام تک پہنچائی اور ہاتھوں ہاتھ داد پائی

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

پری: پھر ہندی اپنی گورنمنٹ کے جان نثار کیوں نہ ہوں۔ سچ ہے۔

رعیت چو بیخ ست وسلطاں درخت

درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

آزاد: پولینڈ کی شہزادی کا نام کبھی سنا ہے۔ وہ کون ہے۔

پری: وہ ہماری جان پہچان کی ہیں کتنی حسین شہزادی ہے۔ واہ واہ۔ حسن خداداد اسی کو کہتے ہیں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بلا کا حسن ہے۔ آدمی منہ تکتا ہی رہے۔

روسیوں نے بمقابلہ اقوام یورپ علم وتہذیب میں بہت کم ترقی کی ہے۔ گو یہاں کے باشندے سب کے سب ناخواندہ اور جاہل ہی نہیں، مگر بحیثیت مجموعی علم وفضل کا چرچا کم ہے۔ فرانس اور جرمنی اور انگلستان کو دیکھیے اور روس کو ملاحظہ فرمائیے، عوام حالتِ جہالت میں گرفتار ہیں اور انتہا سے زیادہ متعصب۔ کئی کتب سے ظاہر ہے کہ روس نے علم وفضل میں بالکل ترقی نہیں کی ہے۔

اکثر سیاح جو روس گئے انھوں نے نہایت استعجاب اپنا اس امر کی نسبت ظاہر کیا ہے کہ کل یورپ میں یہی ایک ملک ہے جس میں اس قدر جہالت و بے تہذیبی رعایا میں پائی جاتی ہے۔

یورپ کے نامی حکما میں سے کوئی ایسا نہیں، جس کا مسکن روس میں ہو۔ یا جو پیدائش سے روسی سمجھا جا سکے کوئی مقولہ فلسفی یورپ یا اور فنون ڈاکٹری وغیرہ میں ایسا نہیں ہے جس کی ابتدا روس سے ہوئی ہو۔ کوئی ایجاد کوئی کل ایسی نہیں ہے جس کے اجرا کا یورپ روس کا مشکور ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس ملک کے چند رؤسا نہایت تعلیم یافتہ ہیں مگر ان لوگوں کی بھی اکثر تعلیم فرانس یا جرمنی میں ہوئی ہے اور اس قسم کے نہایت معدودے چند رئیس ہیں، چند اشخاص کے تعلیم یافتہ ہونے سے کوئی قوم مہذب و تعلیم یافتہ نہیں متصور ہو سکتی، جائے تعجب یہ ہے کہ گو اس قدر جہالت ملک روس میں پھیلی ہوئی ہے الا کوئی کوشش از جانب گورنمنٹ اشاعتِ علوم وفنون کی خاص ملک روس میں بھی نہیں ہوتی ہے۔ وجہ اس کی صاف یہ ہے کہ سلطنت روس نوعی ہے اور تخم آزادی کا اس سلطنت میں بالکل مفقود ہے۔ اس قسم کی سلطنت کا مدار اور تعلیمی رعایا پر ہے۔ جہاں رعایا تعلیم یافتہ ہوئی اپنے حقوق سمجھنے لگی

ضرور ان کے دل میں ایک طبعی خواہش آزادی حاصل کرنے کی پیدا ہوتی ہے، روس میں ہمیشہ زار کی جانب سے اس امر کی کوشش ہوتی ہے کہ رعایا ترقی علوم وفنون نہ کرے بلکہ جہالت میں گرفتار رہے، اکثر سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس کو تعجب کے ساتھ لکھا ہے کہ روس میں کل کارخانہ جات میں جہاں کہ کل سے کام لیا جاتا ہے۔ مہتمم و افسر اعلیٰ ضرور بالضرور غیر ملک کا شخص دیکھا گیا ہے۔ روس میں خود اس قدر ترقی نہیں کہ کارخانجات تجارت کے لیے کلیں تیار کر سکیں، لہٰذا اکثر تجار روس اپنے فوائد کے لیے کلیں انگلستان، فرانس یا جرمنی سے خرید کرلے جاتے ہیں۔

آزاد : یہ کُل حالات ہم سُن چکے ہیں۔ بڑی ابتری ہے وہاں۔

پری : انتہا سے زیادہ طوائف الملوکی ہے۔ افسوس کا مقام ہے۔

آزاد : بیشک روس میں آزادی کا پتا اور نام ونشاں نہیں، جس قدر مال اور جائداد رعایا ہے وہ سب زار روس کی جائداد سمجھنا چاہیے۔ ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ ٹیکس جاری کریں۔ زار روس کو اختیار ہے کہ جس سے جس قدر چاہے روپیہ وصول کرلے۔ اگر کسی نے نہ دیا تو سیبریا کے جنگل میں فوراً بھیجا جائے گا۔ جب خود فرمانفرمائے ملک کا یہ حال ہے بقول ایک مصنف کے حکام کی تعدی ظاہر ہے۔

به نیم بیضه که سلطان ستم روا دارد
زنند لشکریانش هزار مرغ به سیخ

جس دن سے روس نے پولینڈ پر قبضہ کیا ہے۔ اس دن کے بموجب فرمان شاہی اسکول اور کالج وہاں بند کر دیے گئے تاکہ رعایا تعلیم نہ حاصل کرسکے۔

آزاد : اہل پولینڈ پر بڑا جبر کیا ہے۔ اور یہ شایان شان سلطنت نہیں ہے۔ سولہویں صدی میں سات دار العلوم پولینڈ میں تھے۔

پری : اب سناٹا ہے۔ یہاں تک حکم نادری ہے کہ کوئی شخص پولینڈ کی زبان میں گفتگو نہ کرے، ورنہ سزا پائے گا۔ اور اکثر دن پر اس جرم میں سنگین سزائے جرمانہ ہوئی کہ وہ اپنی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

آزاد : لاحول ولاقوۃ۔ یہ آئین شہریاری کے خلاف ہے۔

پری : اس سے بھی زیادہ بدعتیں ہوتی ہیں توبہ ہی بھلی۔

آزاد پاشا نے اس خاتون شیریں حرکات سے روس کی نسبت بڑی دیر تک گفتگو کی اور وہاں کے حکام اور گورنمنٹ کی تعدی اور جور وجفا کا حال سن کر سخت افسوس کیا۔ خاتون عنبر مو نے کئی روایات بیان کیں جن سے آزاد کو یقین کامل ہو گیا جس قدر مفسدہ پرداز روسی لیڈیاں ہیں اس قدر ساری دنیا کی عورتیں نہ ہوں گی۔ مردوں کے بھی کان کاٹے سیج ہے۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

پری: ایک شہر ہے۔ اس میں گلاب کا باغ بہت مشہور ہے۔ ایک روز شہر کی لیڈیوں نے جمع ہو کر باہم جلسہ قرار دیا۔ دو بجے کے وقت وہ سب پھول توڑ رہی تھیں کہ دفعتاً دو سو آدمیوں نے باغ کو گھیر لیا اور سب عورتوں کو گرفتار کر لیا۔

آزاد: قصور، بے وجہ گرفتار کر لیا۔ اچھا اندھیر ہے۔

پری: وجہ اور سبب اور قصور سے کیا واسطہ۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ وہاں کسی قانون کی پابندی ہو تو قصور اور سبب دریافت کیا جائے۔

آزاد: لاحول ولا قوۃ۔ تو حکام کیا جابر ہیں۔

جو خواہد کہ ویراں کند عالمے
نہد ملک در پنجۂ ظالمے

روس کی خیر نہیں نظر آتی ہے دیکھیے کیا ہو۔ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ مگر ابھی تک جنرلوں کی لیاقت میں کسی کو کلام نہیں ہے۔

پری: ہاں بڑے بڑے لائق جنرل موجود ہیں اور جنگ آزما، تجربہ کار ایسے ویسے نہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔

آزاد: ہم تو جانتے ہیں کہ ہم سے بڑھ کر جری کوئی نہیں جس نے ہمارے قلعۂ دل کو دم کے دم میں فتح کر لیا۔ تمھاری سفاکی سے خدا کی پناہ۔

خدا پناہ میں رکھے تمھاری پلکوں سے
ستم کی فوج کھڑی ہے پرا جمائے ہوئے

فتح الباب دل آسان نہیں ہے۔ ملک فتح کرنا اس قدر مشکل نہیں جس قدر جگر و دل کا فتح کرنا مشکل ہے۔ خدا کی قسم جادو نگاہ ہو۔ کیا آنکھ ہے۔

پری: (آبدیدہ ہو کر) آزاد، مردی و مردمی اب اسی میں ہے کہ ہمارے کام آؤ۔ اور ہم تو بے بس اور بے کس اب ہیں ہی۔ مگر مردی کے یہی معنی ہیں کہ ہمارے کام آؤ۔

آزاد: (مسکرا کر) ایک شرط سے، تم بھی ہمارے کام آؤ۔

پری: یہ دل لگی کا موقع نہیں ہے۔ ہم اب دل لگی کے قابل نہیں رہے۔ ہم تو قیدی ہیں۔ مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے بچا لوگے۔

آزاد: اگر میں تم کو نہ بچا سکا تو زندہ نہ رہوں گا۔ جان دے دونگا۔ بس اب تو یقین آیا یا اب بھی یقین نہ آیا۔

پیری : بس۔ اب ہم اس بارے میں اصرار نہ کریں گے۔

آزاد : وزیر جنگ کے نام ٹیلیگراف بھیجا جائے گا کہ پلونا کے بارے میں کیا کیا جاوے۔ اگر ہم کو پلونا جانے کا حکم ہو تو ہم تم کو فوراً اپنے ساتھ لے چلیں گے تم مطمئن رہو۔

پیری : تسلیم کمال مشکور ہوئی۔ ہمارے روس میں بھی اکثر لوگ ایسے ہیں جو لیڈیوں کی طرف سے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

آزاد : آپ روس کے حالات کو بس رہنے ہی دیجیے۔

پیری : ابھی آپ نے کُل حالات سُنا کہاں ہے۔ وہاں تو حکام ضلع کا عام قاعدہ ہے کہ متمول آدمی کو جرم میں ماخوذ کر کے پھانس لیتے ہیں اگر اس نے زر کثیر دیا تو خیر ورنہ حکم دے دیا کہ بیس ضربت کی سزا دی جائے۔ مجبور ہو کر روپیہ دے نکلے گا۔

آزاد : افسوس کا مقام ہے اور حُکام بالادست ذرا بھی تدارک نہیں کرتے یہ سخت تعجب ہے۔ کس مپرسی کا معاملہ ہے۔

پیری : من چہ فش ام برادر فلاں من بسیار فش است کا نقشہ ہے۔ مذہبی متعصب بھی بحد ہے۔ غرضیکہ بڑا خراب ملک ہے۔

اب سنیے کہ وزیر جنگ کے نام ٹیلیگرام لکھا گیا کہ (پلونا کے قرب وجوار میں روس کی فوج جوق جوق جمع ہے اور زار کا نادری حکم ہے) کہ چاروں طرف سے پلونا کو محصور کرلیں چنانچہ ان کے جنرل بڑی سرگرمی سے کوشش بلیغ کر رہے ہیں، اور خوف ہے مبادا ہمارے سپہ سالار متعینۂ پلونا، چوطرفہ سے گھر جائیں، لہٰذا ایسی تدبیر مناسب ہے۔ ان کی کمک کے لیے فوج بہت جلد روانہ ہو۔ آزاد پاشا ہندی جو اس قدر عرصے تک روسیوں کے ہاں گرفتار تھے۔ اب خدا کے فضل سے مع الخیر واپس آئے ہیں، ہمارے علم ویقین میں اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں اور کوئی پاشا بالفعل نہیں ہے۔ اگر حکم ہو تو کچھ سوار اور پیادے لے کر پلونا کی سمت روانہ ہوں۔ جواب جلد مرحمت ہو، آزاد پاشا نے بڑے بڑے کارنمایاں کیے ہیں، اور وہ مستحق ہیں کہ تمغۂ مجیدی ان کو ملے، ہم اس بارے میں ان کی سفارش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ سفارش بیکار نہ جائے گی۔ تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ بلگیریا کی ایک عالی خاندان، خاتونِ نوجوان، جن کے سبب سے آتش فساد مشتعل تھی اور جو کُل بلغارستان کو ورغلا کر سلطنت رفیعہ کے ساتھ کمال دشمنی اور سخت عداوت ظاہر کرتی تھی۔ اس کو اپیلٹن پاشا (اپیلٹن) نے گرفتار کیا ہے۔ اس کی لسبت کیا حکم ہوتا ہے۔

پچاس سواروں کو حکم ہوا کہ فوراً تار کے سبب سے زیادہ قریب مقام پر جا کر اسی دم تار بھیجیں چنانچہ وہ پچاسوں سوار معاً روانہ ہوئے۔ تار کا قریب ترین مقام اس پڑاؤ سے دس کوس پر تھا سواروں نے گھوڑوں کی

باگ اٹھائی تو ہوا ہو گئے۔ جب پری کو یہ حال معلوم ہوا کہ میری نسبت وزیر جنگ سے استفسار ہوا ہے تو کانپ اٹھی۔ ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ اوسان خطا۔ آزاد سے کہا واسطے خدا کے اب کچھ فکر کرو۔

آزاد : آپ اور استقلال کو ہاتھ سے دیں! حیرت ہے۔

پری : وقت ہی ایسا پڑا ہے۔ اس کو میں کیا کروں۔ مجبوری ہے۔

آزاد : گو میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ سے اس کا کوئی معاوضہ لوں مگر جبکہ آپ سے اس قدر یارانہ ہے تو اس درخواست کو قبول فرمائیے۔

پری : اگر مجھے زیبا ہو۔ تو اس سوال کا جواب دوں۔

آزاد : پھر اسی طرح مجھے بھی مناسب نہیں کہ اپنے ملک کے قیدی کو بلا حکم حکام بالا دست رہا کر دوں کچھ تو دل کو تشفی ہو کہ ایک قیدی بے ضابطہ رہا کرنے سے یہ فائدہ ہوا۔ ورنہ جو اقرار کیا ہے وہ تو ضرور ہی پورا کروں گا اس میں فرق نہ واقع ہو گا۔

پری : اچھا پھر وہ باتیں بتاؤں کی کہ آپ بھی یاد کریں گے۔ سوچتی ہوں کہ اگر اب اس وقت نہ بتاؤں تو مجبور ہو کر دو دن بعد وہ باتیں بتانا ہوں گی۔

آنچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار

آزاد : کوئی تدبیر ایسی بتاؤ کہ زار کے خیمے کو جلا دوں۔

پری : (مسکرا کر) بہت دور کی سوجھتی ہے۔ کیا ادنیٰ سی بات کہی ہے۔ شان خدا، تم اور میں کجا، زار روس کجا۔ بھلا شہنشاہوں کے خیمے کہیں ایسے غیر محفوظ رہتے ہیں۔

آزاد : اچھا پلونا۔ ہم کس طرف سے جائیں، ہمارا منشا، صرف یہ ہے کہ جنرل کو مدد دیں، تاکہ ہماری فوج وہاں گھر نہ جائے۔ بس اور کچھ نہیں۔

پری : پلونا کا نقشہ منگواؤ تو ہم فوراً بتا دیں کہ فلاں سمت سے جاؤ۔ اور ہماری رائے قابل تسلیم ہو۔ ہمیں اس ملک کے ایک ایک چپے سے واقفیت ہے۔

آزاد : لیجئے یہ نقشہ حاضر ہے۔ بسم اللہ۔ یہ پلونا ہے۔

پری : میں غور کر لوں ذرا تو جواب دوں۔

آزاد پاشا اس پری کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چہل قدمی کرنے لگے۔ اہلپلٹن اور کرنل اور کئی اور افسروں کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔

آزاد : ہنسا کرو۔ ہنسنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو رند مشرب آدمی ہیں۔ دل لگی چہل سے واسطہ ہے۔
بس اور کسی بات سے سروکار نہیں۔

کرنل : قیدی کے ساتھ اختلاط کرنا چہ معنی۔

آزاد : ہم تو مذاق کے عاشق ہیں دنیا ہو اور مذاق ہو۔ کوئی مہ جبیں ہو۔ کوئی حسین ہو۔

گر تم نہیں تو اور بت مہ جبیں سہی
ہم کو تو دل لگی سے غرض ہے کہیں سہی

کرنل : چین لکھتا ہے۔ تمھارے لیے یہاں بھی چین لکھتا ہے۔

پری : ہم تو مسافر بے کس، بے بس قیدی ہیں۔ اس قابل نہیں کہ کسی سے مذاق کریں مگر ہاں ایک بات ہے،
طبیعت رنگین ہے۔ دل میں اچپلاہٹ ہے۔

کرنل : اگر تمھارے نام حکم آگیا کہ جنگ کے میدان میں روانہ ہو، تو پھر کیا کروگے۔

آزاد : فہمیدہ خواہد شد۔ سمجھا جائے گا۔ اب اس وقت تو لطف حاصل کرلیں۔

بہار عمر ملاقاتِ دوستاران است
چہ حظ برد خضر از عمر جاوداں تنہا

اتنے میں آزاد اس پری کو لے کر اور سمت چلے گئے۔ پری نے روس کی بدعت کے اور بھی حالات بیان کیے۔ کہا ایک مقام پر حاکم بالادست کو ایک شریف زادی سے جو بہت متمول تھی خلش پیدا ہوگئی۔ پھر وہ بیچاری کیا مقابلہ کرسکتی۔ اس پر ایک مقدمہ دائر ہوا۔ اور مقدمہ دائر ہونا کون مشکل بات تھی۔ جھوٹا مقدمہ بنا کر اس عزت دار اور بے گناہ عورت کو پھانس لیا۔ اس کے ورثا نے افسر کو زر کثیر دیا، افسر پولیس نے اس خاتونِ پری وش کو رہا کردیا۔ اب سنیے کہ ورثا نے افسر کو تو رشوت دی۔ مگر ان کے ماتحتوں کو ٹکا نہ دیا۔ دوسرے ہی ہفتے میں پھر وہ بے چاری ماخوذ ہوگئی اور جرم اس پر یہ عائد کیا گیا کہ وہ یونیورسٹی کے طلبا کو ورغلایا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ بیچاری طلبا سے واقف تک نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بیچاری کو مجبور ہو کر زر کثیر صرف کرنا پڑا۔ دوسرے ہینے پھر پولیس والوں نے پھانسا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال میں لنگوٹی بندھ گئی۔ ٹکا پاس نہ رہا۔ دھرّے اڑ گئے۔

آزاد : افسوس صد افسوس۔ کمال رنج ہوتا ہے۔

پری : اس سے بڑھ کر بدعتیں ہوتی ہیں۔ ابھی آپ کو معلوم کہاں ہے۔ چند روز کے لیے روس میں چل کر رہیے پھر حال معلوم ہو۔

آزاد: ہم سمجھ گئے۔ خدا کو روس کی بہبودی منظور نہیں ہے۔

چو خواہد کہ ویراں کند عالمے
نہد ملک در پنجۂ ظالمے

ہم تو بار بار یہی کہیں گے۔ اس ظلم کا انجام بہت بُرا ہے۔

آزاد: اب جام شراب منگوائیں؟

زاہد کے بس ضرور ڈرانے سے ڈر گیا
جام شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

پری: ہم تو کہتے کہتے عاجز ہو گئے۔ اس وقت بہت ضرورت ہے۔

آزاد: اچھا میں ابھی فکر کرتا ہوں۔

شراب کہنہ کہ روشن گر روانِ من است
مصاحبِ من و پیرِ من و جوانِ من است

ادھر یہ باتیں ہوتی تھیں، ادھر روسی اور خوجی میں یوں گفتگو ہوتی تھی جو ذیل میں درج ہے۔

روسی: بس اب ہم ایک نہ سنیں گے۔ چلو ٹھہو۔

خوجی: گھڑی دو میں مُر لیا باجے گی۔ خوب مُر لیا باجے گی۔

روسی: اچھا اس کو ساتھ لے چلو۔ ڈاکٹر سے رائے لی جائے۔

دوست: دو ایک رتے ان پر پڑیں تو ٹھیک ہو جائیں۔ ابھی بتا دیں۔

خوجی: (اپنے دل میں) خدا تجھ سے سمجھے مردود۔

روسی: اب صاف صاف کہہ دو۔ ہوگے یا آزاد ہونے کی فکر کرو گے۔ اگر ہمارے سوالوں کا شافی جواب دو تو خیر ورنہ لاش پھڑکتی ہوگی۔ آئندہ اختیار ہے۔ ہم نے آگاہ کر دیا پھر نہ کہنا۔

خوجی: مرا دہ نصیحت بعد کردیم۔ باقی چہ گویم۔

گوش تواند کہ ہمہ عمر وے | شنود آواز دف و چنگ و نے
دیدہ شکیبد ز تماشائے باغ | بے گل و نسریں بسر آرد دماغ
گر نبود بالش آگندہ پر | خواب تواں کرد حجر زیر سر
ورنہ بود دلبر ہمخوابہ پیش | دست تواں کرد در آغوش خویش
دین شکم بے ہنر پیچ پیچ | صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

مگر من بدیع اس قسم کے ہیں کہ چاہے کھانے کو نہ ملے لیکن اتنا معلوم ہو جائے کہ آزاد اور حسن آرا میں نکاح ضرور ہوگا۔ بس پھر چاہے کوئی قتل کرے، چاہے پھانسی دے۔ آزاد کو لازم ہے اب جنگ کے میدان میں نہ جائیں۔

ع ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے

شاید کوئی نہ کوئی بخت غنیم خدا نا کردہ۔

صیاد نہ ہر روز شکارے ببرد
افتد کہ یکے روز پلنگش بدرد

اتنے میں ایک شخص نے کہا۔ یہ خبر ہی نہیں کہ پلونا پر جنگ ہونے والی ہے۔ خوجی کے ہوش اڑ گئے۔ اب آزاد کا حال سنیے۔

آزاد : کوہ بلقان کا مفصل حال آپ کو معلوم ہے۔

پری : مجھے کیا نہیں معلوم۔ وہ کون مقام ہے جس کے جغرافیہ اور تاریخ سے میں ناواقف ہوں۔ کوہ بلقان اور ڈینیوب، یہ دو بڑی سرحدیں ہیں۔ جنوب دریائے ڈینیوب جو حصہ ٹرکی کا ہے۔ اس میں اس پہاڑ پر چڑھے تو انسان جنوبی ٹرکی میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر سپہ سالار لائق ہوں تو تھوڑی ہی فوج سے بڑی فوج کثیر کو روک دیں۔ موسم زمستان میں اس کے درّوں سے گزرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ اول تو برف باری مارے ڈالتی ہے۔ اکثر مقام پر قلعے ہیں، اگر دو تین سو آدمی توپ اور گولے لے کر ان قلعوں میں ہوں تو ہزاروں غنیم مقابلہ نہ کر سکیں نہایت دشوار گزار پہاڑ ہے۔

آزاد : واقعی سخت دقّت سے غنیم دریائے ڈینیوب اور بلقان سے گزر سکتا ہے۔

پری : مگر روسی فوج نے کس جوانمردی سے دریا کو عبور کیا۔ نوے ہزار آدمی ایک دن میں پار چلے گئے۔ اللہ اللہ اور کوہ بلقان کو بھی دیکھ لیا۔ برف باری نے ستایا نہ درّوں کی چلی۔

آزاد : ہاں پھر رشوت جو چاہے سو کرے۔

پری : رشوت! تو یہ رشوت ہی کے سبب سے روسی اس قدر بڑھے جاتے ہیں، بجا تم نے بھی رشوت دی ہوتی۔ تمھاری بھی تو سلطنت ہے

آزاد : ہم تلوار اور بندوق سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ کوہ بلقان کی سب سے زیادہ اونچی چوٹی تین ہزار فیٹ سے زیادہ نہیں ہے، اور نیچے کے حصّے کی بلندی کا ہزار فیٹ سے زیادہ۔

پری : ہاں معلوم ہے۔ مجھے کل حالات سے واقفیت ہے۔ میں ڈاکٹروں کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں۔

آزاد : اس میں کیا فرق ہے۔ آپ کو واقفیت نہ ہوگی تو پھر کس کو ہوگی۔

پری : ایک مقام پر آپ نے بڑا کار نمایاں کیا۔ اور وہ خوجی کہاں ہے وہ بونا سا آدمی۔ ہنسوڑ۔ مسخرہ۔

آزاد : ہاں! شکر ہے۔ خوجی بھی مشہور ہو گئے۔

پری : روس کی لیڈی اور آزاد کو نہ جانے۔ کیا مجال۔ اور خوجی تو آپ کے سایہ ہیں۔ جہاں آپ وہاں وہ۔

آزاد: وہ تو بیچارہ ہم سے چھوٹ گیا۔ اب خدا جانے کہاں ہے۔ خدا کرے جہاں ہو خوش ہو۔ افسوس ہے۔ واللہ اعلم کیا حالت ہوگی۔
پری: ہم اس کا حال دریافت کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کو رہا کر دو تو اس کو بھی رہا کر دوں۔ چاہے قسم لے لو۔
کوہ بلقان کی شاخیں آٹھ ہیں جن میں سے تین شمال میں واقع ہیں۔ دو خاص گھاٹیوں کے الحاق کے مقام پر جہاں دریائے ایما پر فوج خیمہ زن ہے، یہ مقام کمال دلکش اور بہت پُر فضا ہے۔
ایک روز نور کے تڑکے میں ایک خوشرو عنبر موجوان کے ساتھ مصروفِ گلگشتِ چمن و تماشائے نسرین و نسترن تھی۔ ادھر ریحان و ضمیران کی بوئے عنبر بار، ادھر جوئبار لطافت آثار اور گلزار سراپا مبار، باد نوروزی پیش رو کاروان ختن و تاتار۔ میں جوان رعنا اور ہاتھ میں جام شراب ناب۔ اور یہی مقام پر ایک مرتبہ دو عیسائی قوموں میں جنگ ہوئی تھی۔ اس پہاڑ کے تاریخی بڑے بڑے واقعات صحت سے چھپے ہیں۔ کوہِ ارجن بیرونی مقام ہے اس کے گرداگرد بڑے بڑے غار ہیں جس کو روسی زبان میں کولس کہتے ہیں۔ دامن کوہ میں ہرن سہ پہر کو چوکڑیاں بھرا کرتے ہیں، ایسے خوبصورت ہرن تمام یورپ میں نہ پائے۔ گوشت لذیذ مگر خشک اور آنکھوں کا عالم ہی اور ہے۔ کوہِ وسو دیس۔ یہ معروف و مشہور کوہِ آتش بار ملک اطالیہ کے جنوب میں نیپلس سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور خلیج نیپلس سے 3950 فیٹ اونچا ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی سے عجب دلربا فضا اور دلکش تماشا نظر آتا ہے۔ حدِ نظر کی خوبی اور دور روی نگاہ ایسی کیفیت دکھاتی ہے کہ یہ تحریر میں نہیں سماتی۔ اس کا اوپر کا حصّہ متواتر اور متوالی آتش انشانی کی وجہ سے منشق ہو گیا ہے اور پارہ ہائے سنگ جو طرفہ منتشر ہو گئے۔ حصّۂ وسط کی سطح پر لاوا پہاڑ سے نکل کر منجمد ہو گیا ہے۔ حصّۂ سفلی میں خدا کی قدرت مجسّم نظر آتی ہے۔ یعنی ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں۔ قسم قسم کے خوشنما گل بوٹے کھلے ہیں۔ جا بجا پھلواریاں ہیں۔ چوٹی بشکل مخروطی اور راکھ سے ڈھکی رہتی ہے۔ دہانہ کا محیط قریب ڈیڑھ میل کے ہے۔
1796ء کی آتش افشانی میں چوٹی کے کسی قدر دھنس جانے اور منفذ کے بند ہو جانے سے جو مادۂ آتشیں پہاڑ کے جوف میں ابل رہا تھا۔ جب اس کو باہر نکلنے کا راستہ ملا تو بصورت لاوا اِدھر اُدھر پھیل گیا۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار ہے جس کا قطر 12 فیٹ ہے۔ اوخنہ اس میں سے ہمیشہ نکلا کرتے ہیں۔ اور کبھی بڑے بڑے انگارے اور سُرخ سُرخ پتھر نکل کر بڑی دور جا کر گرتے ہیں۔ جو شے ان کے آگے آتی ہے اس کو جُھلسا دیتے ہیں۔
472ء، 1779ء، 1834ء، 1855ء اور 1860ء میں بڑے مہیب خروج واقع ہوئے تھے۔ شہر رسینا اور پورٹیٹی کے باشندے خائف رہتے ہیں کہ مبادا کسی روز پتھر اور مادۂ آتشیں خروج کر کے ان کو سوخت کر دے، کیونکہ وہ دونوں شہر دامنِ کوہِ مذکور میں واقع ہیں۔ کوہ ہکلایہ کوہِ آتش فشاں، جزیرہ آئیس لینڈ کے جنوب ہے۔ پری نے بیان کیا کہ ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ قوت سلطنت روس کی نسبت عوام الناس کی رائے غلط ہے۔ ٹرکی میں اگر بدنظمی نہ ہوتی تو روس کا نقطۂ مقابل تھا۔ بوجہ وسعت ملک عوام الناس یہ خیال کرتے ہیں کہ روسیوں کو نہایت قوت حاصل ہے۔ مگر یہ

خیال غلط ہے۔ وسعتِ سلطنت باعثِ ضعف روس کا ہے، نہ باعثِ تقویت وجہ اس کی خاص انتظام روس سے پیدا ہوتی ہے۔ ناظرین کو استعجاب ہو گا مگر اصل امر یہی ہے کہ اصل قوم روس بھی باعثِ تقویت و قوتِ شہنشاہ روس نہیں ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ بوجہ ظلم و بد انتظامی کے رعایا زار روس سے نہایت ناراض ہے، اور کروڑوں آدمی اس فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں کہ کوئی تدبیر ایسی کی جائے جس سے زار کی جان جائے۔

نہلسٹ کے ممبر ایسے ہیں جن کے شرکا، کو عداوت قلبی سلطان روس اور ان کے خاندان سے ہے۔ ایک سال میں پانچ افسر اعلیٰ جو نہایت مغرور تھے، دار السلطنت میں انھیں لوگوں کے ہاتھ سے قتل کیے گئے۔ اہل پولینڈ و باشندگان صوبہ جات کوہِ قاف و وسط ایشیا بھی روسیوں کے ظلم و بدعت کی وجہ سے نہایت تنگ ہیں اور جبکہ سلطنت روس سے کسی غیر ملک سے جنگ شروع ہوتی ہے۔ اصل ملک روس و صوبجات مفتوحہ میں فوراً تدبیریں کرتے ہیں کہ زار کی سلطنت تباہ ہو جائے۔ اہل پولینڈ میں سے ہزارہا آدمی فوجِ روس میں افسر ہیں، مگر جب کوئی تدبیر آزادی پولینڈ کی ہوتی ہے یا ہنگامہ اس غرض سے رعایا برپا کرتی ہے۔ یہ افسر اپنے ہموطنوں کے شریک ہوتے جاتے ہیں۔ 1863ء میں جو غدر رہا اس میں باغیوں میں اکثر شخص ایسے گرفتار ہوئے جو کہ بڑے معتمد افسر فوج اور کمانڈر انچیف کے دفتر میں تھے اور صرف ایک روز قبل ہنگامہ کے سب طرح کی صلاح و مشورہ میں شریک تھے۔ جس زمانہ میں درمیان سلطنت روس و روم کے لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک بندش جس میں اکثر افسران فوج شریک تھے۔ اس غرض سے ہو رہی تھی کہ خاندان موجودہ کو تخت سے اتار دیں کسی اتفاق سے یہ تدبیر کھل گئی۔ اور بہت سے شرفا اور افسران فوج گرفتار کر کے سیبیریا کو بھیجے گئے۔ بدیں ہر وقت حکام روس کو اپنے خاص ملک و نیز دیگر صوبجات مفتوحہ میں ایک بڑا جزو اپنی فوج کا اپنی حفظ بقا کے واسطے رکھنا پڑتا ہے اور چونکہ سلطنت روس نہایت وسیع ہے اور مختلف مقامات میں نہایت فاصلہ ہے اس وجہ سے کثرت سے فوج کی ضرورت اس غرض سے ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت روس سے کسی زردار بادشاہ سے نوبت جنگ کی آئی تو ضرور یہ بات باعث بربادی سلطنت روس ہو گی اور ذری سی مدد اگر ان فرقوں کی کسی بادشاہ کی جانب سے ہوئی تو اصل ملک روس میں وہ آگ پھیل جائے گی کہ اس کا شاید فرو کرنا حکام روس کو مشکل پڑ جائے

آزاد: شہنشاہ بیگم کی کیا رائے ہے؟

پری: وہ زار روس سے ناراض ہیں۔

آزاد: اور ولیعہد سلطنت۔ زار وچ؟

پری: ان سے بادشاہ سے بھی نہیں بنتی۔

آزاد: ہم نے سنا ہے کہ زار روس جنگ کے خلاف ہیں اور وزیر جنگ بھی مسلک صلح کل کے سالک ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پری : بہت صحیح ہے لیکن رعایا سے سخت خائف ہیں۔
آزاد : رعایا سے اتنے بڑے زار کی پیش نہیں کی جاتی۔
پری : اور تاہم ان کی سلطنت نوعی ہے۔
آزاد : یہی تو برہمی کا باعث ہے۔ رعایا کی خواہش ہے کہ مثل انگلستان آزادی حاصل ہو وہ بات یہاں کہاں۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

وہاں تو اس شعر پر دارومدار ہے۔
پری : یہ بات نہیں ہے۔ بادشاہ کو وہاں مانتا کون ہے۔
آزاد : دیکھیں۔ ٹیلیگرام کا کیا جواب آتا ہے۔ ہماری سلطنت میں بھی عجب طوائف الملوکی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

ہر کہ شاہ آں کند کہ او گوید
حیف باشد کہ جز نکو گوید

شہنشاہ کے مقربوں کو لازم ہے کہ خیر خواہ اور نمک حلال ہوں۔ ایسے نہ ہوں کہ بدخواہی کریں۔
پری : بیشک۔ ایسے ہی ہونا چاہیے۔

الانتظار

ولا چند باشی زغم در خمار
سر از جیب مستی چو عشرت برآر
حیاتِ ابد جو بہ میخانہ رو
کہ بخشد شراب کہن جان نو
بکن اوّل از زمزم مے وضو
چو دستِ امانت دہی با سبو
ہر آنکس کہ پیمان بہ پیمانہ بست

بجز توبہ ہیچش نیاید شکست

چہ گویم ز خون گرمی مے فروش

کہ خونِ مے آمد زمہرش بجوش

نیاوردہ از خم مے لالہ گوں

کہ آوردہ از چاہ یوسف بروں

سزد گر زند لاف افسوں گری

کہ پیوستہ در شیشہ دارد پری

فروغِ مے از شیشہ شد آشکار

چو از آئینہ عکسِ رخسار یار

بیا ساقی آں ہمدم جاں نثار

کہ درد سر است اختلاط خمار

بمن دہ کہ ہستم ہوا خواہِ مئے

چو جام بود چشم در راہِ مئے

ازاں مے رساند آنکہ کیف بلند

در افگند افلاک را در کمند

برد قطرۂ گر ازیں مے سحاب

زند سر ز گلشن گل آفتاب

ثریا بیگم کا مکان پری خانہ تھا۔ عیش و طرب کا کاشانہ تھا۔ ہر دیوار و ہر در نور بار تھا۔ کم سن اور ماہ پیکر بیگمات باہم چہل کرتی تھیں۔ ہنسی دل لگی کی گرم بازاری تھی، اور دلہن زبان حال سے کہتی تھی۔

ساقیا دیر کا نہیں یہ مقام

مئے دیدار کا کوئی دے جام

دیر سے راہ دیکھتا ہوں میں

منتظر تیری دید کا ہوں میں

حسرتِ دید بڑھتی جاتی ہے

وحشتِ عشق سر اٹھاتی ہے

بادۂ عشق ہے زبس سر جوش
نہ رہا مجھ کو نشہ میں کچھ ہوش

ثریا بیگم: آسمان جاہ۔ تم ذری نچلی نہیں بیٹھتیں۔
آسماں جاہ: پھر آپ کو کیا، ہاں وہ نقشہ تو حل کیجیے۔
ثریا بیگم: ہم نے کچھ دعویٰ نہیں کیا تھا۔ مگر حل کر لیا۔ اب میری چالیں دیکھیے اسپ سرخ کو ہم خانۂ الف میں لے آئے۔ اب بادشاہ زچ ہو گیا۔ کوئی گھر نہیں۔ صرف ایک گھر تھا وہ گھوڑے کے سبب سے بند ہو گیا اب ایک پیادہ سبز تو پیادہ سُرخ سے بند ہے۔ صرف ایک پیادہ سبز کھلا ہے اس کو خانۂ (ب) میں حکمی چال ہے۔
آسمان جاہ: اچھا آیئے وہ تو حکمی چال ہی چلو۔
ثریا بیگم: ہم وزیر سرخ کو خانہ (ج) میں لے آئے۔ مات ہے۔
آسمان جاہ: واہ۔ مات کہیں نہ ہو۔ مات اچھی کہی۔
ثریا بیگم: چلو نہ۔ اس جھگڑے سے کیا مطلب ہے چل کے دیکھ لو۔
آسمان جاہ: ہم نے وزیر سُرخ کو پیٹ لیا۔
ثریا بیگم: ہم نے پیادہ سُرخ کو بڑھایا۔ خانہ (ش) میں جہاں پہلے پیادہ سبز تھا۔ ہم نے کشت دی۔ بس مات ہے۔ اب بتاؤ بادشاہ کو کہاں لے جاؤ گی۔
آسمان جاہ: ہوش کی خیر۔ کچھ خیریت ہے۔ پیادہ کے گھر چلتا ہے۔ بس اس وحشت کے صدقے اے آخر بتاؤ کہ پیادہ کے گھر چلتا ہے۔
ثریا بیگم: دو گھر بھی فرنگ میں چلتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب پیادہ چلتا ہے تو دو گھر بھی چل سکتا ہے۔
آسمان جاہ: اے ہے۔ آخر ہم بھی تو شطرنج کھیلتے ہیں۔
ثریا بیگم: اچھا یوں ہی سہی تم نے فرزین پیٹ لیا۔ اچھا ہم پیادہ سُرخ کو آگے بڑھے۔
آسمان جاہ: ہم فرزین بن گئے۔ بس مات وات ندارد ہے۔
ثریا بیگم: ہم نے پیادہ بڑھ کے مات کر دیا۔ بس
آسمان جاہ: ابابابا سچ کہیے گا۔ ہوش ٹھکانے نہیں، اور کے چالوں کی شرط ہے۔ تین چالیں تو ہو چکیں۔ یہ چوتھی چال ہے۔
ثریا بیگم: تین چالوں میں تو مات کر دیا تھا اب دوسری طرح پر مات کر دیا تھا۔ جب تم مانو ہی نہیں تو کوئی کیا کرے۔ لے اب کوئی اور نقشہ جماؤ۔

آسمان جاہ : بس اسی برتے پر تتا پانی ۔ اور نقشہ جماؤ ۔ بدبو ۔ بد بد کے بناتے ہیں ۔ آؤ بدتی ہو ۔
ثریا بیگم ہاں ہم بھی ویسی ہی انگوٹھی بدتے ہیں ۔
آسمان جاہ : ویسی انگوٹھی آپ اپنے ہی پاس رہنے دیں ۔
ثریا بیگم : نقشہ تو ہم نے حل کر ہی لیا ہے ۔ مگر انگوٹھی چھوڑے دیتے ہیں ۔ خاطر ہے بدوگی تو پچھتاؤ گی ۔
آسمان جاہ : اچھا یوں ہی سہی ۔
نقشہ یہ ہے :

سبز بازی							
				اسپ سرخ	اسپ سرخ		
					شاہ سرخ		
		پیادہ سبز			الف		
وزیر سرخ		پیادہ سرخ			شاہ سبز		
				پیادہ سبز	پیادہ سرخ		
							اسپ سرخ
			رخ سرخ	پیادہ سرخ			
سرخ بازی							

جو بیگمیں شطرنج سے واقف تھیں انھوں نے ثریا بیگم کی بڑی تعریف کی ۔
آسمان جاہ : اللہ جانتا ہے بڑی طبیعت دار ہو ۔ اب ہمارے میاں جھین لو ، بلواؤں ۔
ثریا بیگم : گردن نیچی کرکے یہ دل لگی ہمیں گوارا نہیں ہے ۔
آسمان جاہ : اے ہے ۔ تم تو بات بات پر بگڑتی ہو ۔ ہم سے ان سے وہ محبت ہے ہمیں دشمن اور اور دن کو بڑی وہ سمجھنے لگیں ۔

خیر یہ بھی خدا کی شان بہن
غیر تو دوست ہم ہوئے دشمن

ثریا بیگم : تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو ۔

پیاری خانم : اے بیوی تمہارے میاں تم کو مبارک رہیں اللہ صدوسی سال عمر کرے کسی کو چھینے سے کیا واسطہ۔ باقی دشمنی کیسی۔

آسمان جاہ : انھیں سے پوچھو۔ ہم کیا جانیں۔

پیاری خانم : حضور ہماری سرکار کا یہ منشا تھا کہ حضور ہر گھڑی ان کا نام کیوں زبان پر لاتی ہیں۔

آسمان جاہ : اونہہ سیاں ہمارے گئے بدیس درو جوا (دروازہ) ٹٹیا لاگ رہی (لہرا کر) ٹٹیا لاگ رہی۔

ثریا بیگم : توبہ نوج ایسی ڈھیٹ کسی کی بہو بیٹی ہو۔

آسمان جاہ : (چڑا کر)۔

ساقیا وہ شراب دے مجھ کو — جس سے رفع حجاب فرقت ہو
یار کو جب میں ڈھونڈھنے جاؤں — راہ ہی میں وہ راہبرِ پاؤں
موج صہبا ہر ایک ہو پر شوق — بط بادہ ہو مرغِ رہبر شوق
جبکہ شعلہ پری ہوئی بیدار — دیکھنی کیا ہے وہ قمر رخسار
کہ بغل میں نہیں وہ ماہ کمال — خالی آغوش ہے برنگ ہلال
سارے سامانِ عیش برہم ہیں — بستر درد و غم ہے اور ہم ہیں

وہی سنسان ہے سیہ نامہ
وہی اُجڑا ہوا ہے کاشانہ

بوڑھی مغلانی : اوئی۔ واہ حضور واہ۔

آسمان جاہ : کیا اب تمہارے مارے کوئی پڑھے بھی نہیں۔

بوڑھی مغلانی : حضور کو میں کچھ کہہ سکتی ہوں بھلا۔ مگر اتنا خیال کیجیے کہ آج شادی کے دن مبارکباد گائی جاتی ہے۔ یا یہ جو آپ فرما رہی ہیں اجڑی بستی۔ اندھیر نگری چوپٹ راج۔ سنسان، ویران، غم، ماتم، اِن باتوں سے آج کیا واسطہ۔

دُلہن جان : ہاں کہی تو بات سچ۔

آسمان جاہ : ہاں سٹھیا گئی ہے۔ تو کیا ہوا۔ بات پتے کی کہتی ہے۔ کتنی ٹھکانے کی بات کہی۔ اچھا مبارکباد سہی۔

ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشاد — سلامت سلامت مبارک مبارک باشاد
ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشاد۔

فرمایشی قہقہہ پڑا۔ آسمان جاہ تو غضب کی شوخ تھیں۔ یہ گاتی ہی گئیں (ہمیشہ دلبر بسمان مبارک باشاد) ہمجولیوں نے آوازے کسے اور قہقہے لگائے۔

ایک: کتنا پیارا گلا ہے اور کیا نور کی آواز پائی ہے۔

دوسری: کھٹکا کتنا اچھا ہے۔

تیسری: ڈومنیوں کو مات کر دیا۔

چوتھی: یہ مجرے کو جایا کریں تو کچھ پیدا کر لائیں۔

پانچویں: بہن ایسی کڑی نہ کہو۔

چوتھی: (پھر) اب تم لڑواؤ۔ وہ ایسی سادی نہیں ہیں۔

آسمان جاہ: مگر اللہ جانتا ہے۔ ان کے دولہا کی کتنی پیاری صورت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عاشق ہو جائے۔ اور چاند کا ٹکڑا ہے۔ مُکھڑا نہیں ہے۔

طرفہ جوبن عجیب عالم ہے
جتنی تعریف کیجیے کم ہے

بیگم: کیا آپ بھی دیکھی ہیں۔

آسمان جاہ: ایک ہوئی۔ پھر اپنے داؤں نہ رونا۔

بیگم: ہم نے تو ایک بات پوچھی۔ بُرا نہ مانو۔

آسمان جاہ نے کہا۔ ہم اب مہذب ہو جائیں گے۔ بس اب آج سے مذاق نہ کریں تم سب روکھی پھیکی ہو۔ ہماری باتیں بھی یہاں نستعلیق ہوں گی دو چار ہمجولیوں نے کہا ضرور کیوں نہیں چرا بنا شد ضرور ضرور تم اور دل لگی مذاق چہل چھوڑ دو۔

آسمان جاہ: اچھا دیکھ لینا۔ کیا مجال جو ہنسی تک آئے۔

ثریا بیگم: شکر خدا۔ ہزار شکر خدا۔ صد ہزار شکر خدا۔

ایک: کون۔ اگر یہ چہل چھوڑ دیں تو ہم مسجد میں گھی کے چراغ جلائیں۔

دوسری: وہ مسجد میں گھی کے چراغ روشن کر دیا چاہے جو کچھ کرو ان سے چُہل نہ چھوٹنے کی نہ چھوٹنے کی۔ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

تیسری: اے بی تمہارے میاں کا نام کیا ہے۔

آسمان جاہ: ہم سے یہ دل لگی نہ کیجیے۔

بیگم: ہم نے سنا آپ فال خوب دیکھتی ہیں۔

آسمان جاہ: بہن دیوان حافظ منگوا کے دیکھ لو نہ۔

پیاری خانم دوڑ کے دیوان حافظ لے آئیں۔ بیگم صاحب نے فال دیکھی تو یہ غزل نکلی۔

کجاست اہل ولی تاکند دلالت خیر

کہ مابدوست نہ بندیم ہیچ رہ بطریق

ورق الٹ کر اس کا مطلع پڑھا۔

مقام امن و مے بیغش و رفیق شفیق

گرت مدام میسر شود زہ توفیق

آسمان جاہ: اُہو ہو۔ کیا اچھی فال نکلی ہے۔ مقام امن ہے۔ ع

نے غم زرد نے غم کالا

اور شراب ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم حافظ شیراز نہیں چلتے۔

بیا کہ توبہ ز لعل نگار و خندۂ جام

بصورت ست کہ عقلش نمی کند تصدیق

لعل نگار سے مراد لب معشوق سے ہے۔ اور خندۂ جام سے مراد کیا ہے۔ جام کے لیے خندہ ہی لکھتے ہیں۔ ساتویں ورق میں یہ شعر نکلا۔

چون خون خصم ہمچو صراحی بریختی

با دوستان بعیش و طرب گیر جام جم

ثریا بیگم: اب کچھ مطلب بھی تو سمجھاتی جاؤ۔

آسمان جاہ: دشمن تو زیر ہو گیا۔ اب دوستوں کے ساتھ عیش کرو۔

بشنو زیام بادہ کہ ایں زال تو عروس

بسیار کشت جوہر چون کیقباد و جم

بس جہاں دیکھو شراب ہی کا ذکر ہے۔

حافظ بہ کنج میکدہ دارد قرارگاہ

کالیطر فی الحدیقہ واللیث فی الاجم

اس شعر کا مطلب کیا آسمان جاہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ طیر اور حدیقہ اور پشت کے معنی نہ سمجھیں۔ مگر

عورت شوخ اور ذکی الطبع تو تھیں کہا مطلب یہ کہ (حافظ تو ہر روز اور ہر دم شراب پینے میں رہتا ہے مگر خمار نہیں اُترتا۔ اگر کسی نئی دُلہن کو دیکھ لوں تو خمار اُتر جائے اور نشہ ہرن ہو جائے)۔

ثریا بیگم: بجا عربی بھی آپ پڑھی ہیں۔

اتنی بیگموں میں صرف دو اُردو خوان تھیں، باقی ناخواندہ وہ صورت دیکھتی رہیں مگر ثریا بیگم سب سے زیادہ سمجھ دار تھیں۔ ان کو اس سے تشفی نہ ہوئی۔ کہا بہن سنو! تم زیادہ پڑھی لکھی ہو۔ ہمیں تو کچھ آتا جاتا نہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں۔

اتنے میں ایک مغلانی نے کہا حضور کل برات نہ آئے گی کل قمر در عقرب ہے اب پرسوں برات نکلے گی۔

ثریا بیگم کو سخت افسوس ہوا ایک ایک گھڑی ایک ایک برس کے برابر تھی۔

آسمان جاہ: چلو خیر۔ آج نہ سہی پرسوں سہی۔

حشمت بہو: دیکھو ان کے چہرے کا رنگ فق ہوا جاتا ہے۔

آسمان جاہ: کیوں یہ کیوں وجہ۔؟

ثریا بیگم کو اس قدر ملال ہوا کہ اشک آنکھوں سے جاری ہو گئے۔

آزاد کا پلونا جانا

آزادِ فرخ نہاد اُس پری زاد سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے اور عشق و محبت کا دم بھر رہے تھے کہ سامنے سے گرد نظر آئی اور فوج میں ایک غُل مچا۔ سب کے سب گرد کی سمت دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں سوار نظر آئے۔ لوگ سمجھ گئے کہ تار کا جواب لائے۔ سواروں نے جنرل کو لفافہ دیا۔ جواب یہ تھا۔

(آزاد پاشا کے حالات سن کر وزیر جنگ بہت خوش ہوئے۔ ایسے لائق اور شجاع سپہ سالار پر جو فنون سپہ گری سے بخوبی واقف ہے۔ وزیر جنگ کو پورا پورا بھروسا ہے۔ پلونا کا حال معلوم ہوا۔ حکم دیا جاتا ہے کہ آزاد پاشا لشکر کثیر لے کر پلونا کی سمت روانہ ہوں۔ تمغہ مجیدی ان کے لیے تیار ہے۔ جلد بھیجا جائے گا۔ آج پچیس ہزار سوار تمہاری سپاہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں)۔

یہ جواب وزیر جنگ کے ملٹری سکرٹری نے بھیجا تھا۔

جنرل: آزاد پاشا۔ آپ کو تمغہ مبارک ہو۔ اب آپ بعجلت تمام پلونا جائیے اور وہاں بھی شمشیر لیاقت

کے جوہر دکھایئے۔ یورپ اور ہندوستان کا کوئی اخبار ایسا نہیں جس میں تمہاری تعریف درج نہیں ہوئی ہو۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ سپاہی کے لیے معراج ہے تو یہ ہے۔ ؏

کہ معراج مرداں ہمیں است و بس

آزاد: میں مستعد ہوں۔ مگر وزیر جنگ نے یہ نہیں لکھا کہ کس قدر آدمی میرے ساتھ جائیں۔ صرف فوج کثیر دو لفظ لکھ دیے۔ میرے نزدیک اس قدر جماعت نہ ہونی چاہیے کہ راہ میں مصیبت پڑے۔

جنرل: ابیلٹن پاشا کو بھی ساتھ لیتے جانا۔ ہم اسی دم افسروں کو منتخب کیے دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم کامیاب ہوں بس پلونا ہی پر نچوڑ ہے۔

آزاد: خدا مالک ہے۔ میں خاص اس کام کے لیے ہندوستان سے آیا تھا کہ اپنے بھائیوں کو ہاتھ بٹاؤں میں نے صدہا مصائب اور ہزارہا سختیاں برداشت کیں۔ مگر کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم اس کی پروا نہیں کرتے۔ ہاں اگر سرخرو اور کامیاب اور فائز بمرام ہوں تو سبحان اللہ کل محنت اور کوشش ٹھکانے لگے۔

جنرل: پلونا کا نقشہ یہ ہے۔ اور دو راستے ہیں ایک راہ میں خطرہ ہے۔ دوسرا صاف راستہ ہے۔ اگر اس صاف راستے میں روسی فوج ہو تو بڑی خرابی پڑے گی۔ ہمیں یقین نہیں کہ پھر کسی اور راہ سے گذر ممکن ہو۔

آزاد: میں کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور نکالوں گا۔ ممکن نہیں کہ بے نیل مرام واپس آؤں۔ پلونا والوں کی مدد ہم پر فرض ہے۔

جنرل: ہماری سپاہ ایک ہفتے سے گرفتار ہو جاتی ہے۔ جو لوگ مقام ٹرنوا میں گرفتار ہوئے تھے، وہ شمال کی جانب بھیجے گئے تھے۔ رومانیا میں ایک شہر ہے۔ اسکندریہ دریائے ڈینیوب کے قریب ہے۔ اس مقام سے روسی فوج روانہ ہوئی تو ڈبل کوچ کرکے آئی۔ اور اس قدر کسل تھی کہ الاماں۔ اوّل تو راستہ پرخطر اور صعب دشوار گذار، دوسرے برف باری اور بھی مارے ڈالتی تھی۔ تیسرے شب کا وقت، چوتھے غنیم کا ہر قدم پر خوف، جب فوج داخل منزل مقصود ہوئی۔ سُنا کہ روسیوں کا رسالہ پرے جمائے کھڑا ہے۔ ہوش اُڑ گئے۔ خوب یقین تھا کہ اس وقت کبھی تاب مقاومت نہ لاسکیں گے۔ ترکوں نے دھاوا کیا اور دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ خوب لڑائی ہوئی۔ آخر کار نوبت بانیجا رسید کہ ترکوں نے شکست فاش دی اور روسیوں کو بھاگنا پڑا۔ مگر تعاقب نہ کیا گیا۔ ورنہ دو تین ہزار آدمی گرفتار ہو جاتے۔

آزاد: تو اب میں تیاری کرتا ہوں۔ وقت کم ہے۔

جنرل: ہاں اب آپ تیاری کیجیے۔ اور فوج کے نام بھی ہم حکم دیتے ہیں۔ ابھی سب بندوبست ہو جائے گا۔

دیر نہ ہونے پائے گی۔

آزاد: سینٹ پیٹرسبرگ میں ایک اخبار چھپتا ہے۔ جنرل دی سینٹ پیٹرسبرگ یہ اخبار وزرا کا ہے، اور اس کی روس میں بڑی وقعت ہے۔ اس میں ایک مضمون میری نسبت درج تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مضمون کسی طرح حضرت سلطان المعظم کی نظر سے گذرے۔

جنرل: تاریخ بتایئے تو ہم بذریعہ ملیٹری سکریٹری وزیر جنگ کے پاس بھیجیں۔ اور اُن سے درخواست کریں کہ سلطان المعظم کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے۔

آزاد اُن سے رخصت ہوئے، اور پری سے باتیں کرتے ہوئے انتظام روانگی کی تیاریاں کرنے لگے۔ پری نے بصد شان دلبری ناز کے ساتھ کہا۔ اب آپ تو میدان جنگ میں چلے اور ہم یہاں بالکل اکیلے رہے۔ الکریم اذا وعد وفا۔ یا تو اقرار ہی نہ کیا ہوتا اور اب اقرار کیا تو پورا کرو۔

اس دلبر شیریں حرکات کو شک کی جگہ یقین تھا کہ آزاد ایسے نازک وقت میں مدد نہ دے سکیں گے۔ آزاد نے ٹھان لی تھی کہ جس طرح ممکن ہوگا پلونا میں ضرور داخل ہوں گے ان کو اس وقت نہ حُسن آرا یاد آتی تھیں نہ مس میڈا نہ پولینڈ کی عنبر مو، اور خوبرو شہزادی کا خیال تھا۔ اس بت سیمتن سے بھی تھوڑی دیر کے بعد گفتگو میں سرد مہری ظاہر کی۔

پری: قول مرداں جان دارد۔ جو کہا اُس کا خیال رکھو۔

آزاد: از برائے خدا مجھے اس وقت دق نہ کرو مجھے اپنے قول اور اقرار کا ہر دم خیال رہتا ہے۔ بس صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے۔

پری: اب گھنٹے دو گھنٹے میں تم پلونا کی طرف کوچ کرو گے۔ مجھے کیوں کر یقین آئے کہ تم کو میرا خیال ہوگا۔ اور اب تمہارے امکان میں کیا ہے۔

آزاد: میرے امکان میں سب کچھ ہے۔ جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے بلکہ اب اور بھی زیادہ ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔

پری: دنیا بامید قایم مگر یاس ہوتی جاتی ہے۔

آزاد: ایک گھنٹے میں تم آزاد ہو جاؤ گی۔ ہم کو دیکھو کہ صرف بھائیوں کی مدد کے لیے وطن چھوڑا۔ ہموطن چھوڑے۔ عیش و آرام چھوڑا۔ کل لذات دینوی سے مُنہ موڑا۔ اور اب قضا کے استقبال کو جاتے ہیں۔ تم اتنی بڑی نامی لیڈی ہو کے ذرا سی گرفتاری میں گھبرا گئیں۔ ہم تو وطن اور برادران دینی کے نام پر جان نثار کرتے ہیں۔

حُبُّ الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر
خارِ وطن از سُنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بملک مصر شاہی می کرو
میگفت گدا بودن کنعان خوشتر

پری: اب تک تمہارے امکان میں یہ تھا کہ چوری سے مجھے رہا کر دیتے۔ مگر اب یہ بات باقی نہیں رہی۔ اب تم تیار ہو کر میدان کارزار میں جاتے ہو۔ خدا ہی ہے جو رہا ہو سکوں۔

آزاد: چوری؟ کیا تم کو یقین ہے کہ میں چوری سے تم کو رہا کر دیتا کبھی نہیں تم ڈنکے کی چوٹ رہا کر دی جاؤ گی۔ مگر یہ بتاؤ کہ بعد رہائی کیا کرو گی۔

پری: مجھے افسوس یہ ہے کہ میں اپنے وطن کے کام نہیں آسکتی۔ اس کا سخت ملال ہے۔ اگر میری جان جاتی رہتی تو میں سمجھتی کہ میری دلی آرزو بر آئی۔ میں نے مُنہ مانگی مراد پائی۔ لیکن افسوس ہے کہ میں رہا نہیں ہو سکتی۔ خدا کرے مجھ سے کوئی کارنمایاں سرزد ہو۔ چاہے جان جاتی رہے مگر روس کے کام آؤں۔

آزاد: تو اب غور کرنے کا مقام ہے کہ تم تو عورت ہو کر اپنے وطن کا اس قدر خیال کرو اور میں مرد ہو کر یہ بے ایمانی کروں کہ اپنے ملک کے صیدی کو جس نے ضرر پہنچایا ہے رہا کر دوں اور ایسی حالت میں جبکہ تم خود مُقر ہو کہ ترکوں کو ضرر پہنچاؤں گی۔ اس قدر آمادگی ظاہر کرتی ہو کہ جان تک ـــــ سے دریغ نہیں۔

پری: اچھا میں وعدہ کرتی ہوں کہ میدان جنگ سے سیدھی روس چلی جاؤں گی۔ ہاں ایک بات البتہ ہے۔ میں بالکل خاموش تو رہ نہیں سکتی مگر اخباروں کے ذریعے سے اس جنگ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کروں گی۔

آزاد: مانا۔ منظور۔ اس میں ہمارا ہرج نہیں۔

پری: اب تو جنرل سے کہہ کر ہمیں رہا کرا دو۔

آزاد: ذرا آدھ گھنٹے تامل کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

پری: خدا تم کو اس کا اجر دے گا۔ آمین آمین!

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک فقیر بیڑے میں آیا۔ کشیدہ قامت، دہرا بدن، سرخ و سفید سیر چشم سر کے بال لمبے لمبے۔ ڈھیلا پائجامہ زعفرانی رنگ کا پیرہن برہنہ سر برہنہ پا۔ عربی زبان میں گفتگو کرتا۔ آزاد پاشا اور کئی ترکی افسروں نے اس سے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے۔ کہاں جاتے ہو۔

درویش نے کہا۔ میں تھکا ماندا بھوکا پیاسا بڑی دور سے آتا ہوں۔ ایک ٹکڑا روٹی کا کھا کر پانی پیوں تو جان میں جان آئے۔ ایک آدمی نے دو روٹیاں اور کسی قدر شوربہ اور دو بوٹیاں گوشت کی دیں۔ درویش نے کھا کر پانی پیا اور کہا میں ایک پاشا سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔ تخلیے میں ان سے کچھ کہنا ہے۔ اُن کا نام آزاد پاشا ہے۔ یہ فقرہ سن کر آزاد پاشا سخت متحیر ہوئے۔ اس درویش کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ کرنل اپیلٹن نے کہا۔ ہم تخلیے کی ملاقات پسند نہیں کرتے۔ ہاں اگر ہماری یہ تشفی ہو جائے کہ تمہارے پاس کوئی تلوار یا تپنچہ یا قرولی یا ایسا ہی اور کوئی ہتھیار نہیں ہے تو کیا مضائقہ درویش نے کہا آپ اپنی تشفی کر لیجیے۔ تھوڑی دیر کے بعد آزاد اس درویش کو لے کر بیڑے سے چند قدم کے فاصلے پر گئے۔

درویش: مجھے تمہارے پاس ایسے شخص نے بھیجا ہے جو تم پر عاشق ہے۔ مگر مجھے حکم دیا تھا کہ بجز آزاد پاشا کے اور کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔ میں تمہیں پہچانتا نہیں ہوں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ پہلے اس بات کی تشفی ہو جائے کہ آزاد پاشا تمہیں ہو۔ تب تم سے اس بارے میں گفتگو کروں۔ میرے سوالات کے جواب دو۔

1. تم کو کسی لیڈی نے قید کیا تھا۔ وہاں کا کل حال بتاؤ۔
2. مس کلیرسا کون ہیں۔ ان کو تم جانتے ہو یا نہیں۔؟
3. مس میڈا آج کل کہاں ہیں اور تم سے اُن سے کب ملاقات ہوئی تھی اور وہ کس کے ساتھ ہیں۔
4. خواجہ بدیعا کون شخص ہے ہندی ہے یا کابلی۔
5. دریائے ڈینیوب کے اس پار سے تم کیوں کر بھاگے تھے۔
6. پہرے میں کبھی کوئی سوار ملا تھا اور اس نے تم کو مچھلی کھلائی تھی۔ اُس کا کیا نام ہے۔ صراحت کے ساتھ بیان فرمائیے۔

آزاد نے کہا میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ پولینڈ کی شہزادی نے تم کو بھیجا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آزاد میں ہی ہوں تم ہرگز نہ گھبراؤ۔ مگر جو کچھ پیغام ہو صاف صاف بیان کرو۔ میں کلیرسا اور میڈا سب کو جانتا ہوں۔ درویش نے جواب دیا یہ ہرگز نہ ہوگا میرے سوالوں کے جواب شافی دو۔ آزاد نے کہا بہتر۔

1. مجھے پولینڈ کی شہزادی نے قید کیا تھا اور مجھے یقین کامل ہے کہ اُسی نے تم کو بھیجا ہوگا۔ میں کنوئیں میں قید کیا گیا اور بڑی بڑی سختیاں میں نے جھیلیں۔ انتہائی مصیبت پڑی اور یہ سب صرف اس وجہ سے کہ میں اُس لیڈی کے ساتھ شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ اُن کا محل معلیٰ جو دو چار محلوں سے بھی

بڑا ہے۔ پہاڑ پر واقع ہے۔

۲۔ مس کلیرسا وہ روسی لیڈی ہے جس کے سبب سے میں تباہ ہوا۔ مگر آخر کار اُسی لیڈی کی بدولت جان بچی۔ میدان جنگ میں میں نے اُس لیڈی سے مقابلہ کیا اور اس کی ضرب شمشیر کے جواب میں میں نے بوسے لیے وہ مجھے قید کرلے گئی۔ حکم ہوا کہ آزاد کو سیبیریا کے برفستان بھیج دو۔ مگر میں بچ گیا۔ آخر کار پولینڈ کی شہزادی کے ہاں ملاقات ہوئی تو مس کلیرسا نے مجھے بڑی مدد دی۔ روسی سوار میری تلاش میں وہاں آئے۔ مس کلیرسا کے سبب سے میری جان بچ گئی۔ میں ان کا کمال ممنونِ احسان ہوں۔

درویش نے آزاد کے جواب بہت غور اور تعمّق سے سنے۔ آزاد نے صاف صاف بیان کیا کہ پولینڈ کی شاہزادی کے ساتھ شادی ہوئی تھی اور آزاد کے دھوکے میں ایک شخص کو روسی سواروں نے گرفتار کیا تو مس کلیرسا نے ہماری کمک کی اور کہا یہی شخص آزاد ہے۔ اس کو پکڑ لے جاؤ۔ اس طرح پر ہماری جان بچی۔ خوجی کے نسبت کہا کہ یہ شخص ہمارے ساتھ ہندوستان سے آیا ہے۔ اور روسیوں کا جانی دشمن ہے۔ اس کے بعد رہی سہی اور بھی تاریخ بیان کر دی اور کہا کہ جس روز شہزادی کے ساتھ شادی ہوئی اُس کے دوسرے روز روسی سوار کہسار پر آدھمکے۔ اور مس کلیرسا نے صلاح دی کہ اب تم بھاگ جاؤ۔ دو سوار شہزادی نے میرے ساتھ بھیجے، راہ میں جس کسی نے پوچھا کون ہو۔ انھوں نے روسی زبان میں جواب دے دیا۔ اور ہمیں گفتگو کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اثنائے راہ میں ایک مرتبہ ہم روس کی فوج میں پہنچے۔ وہاں جنرل کو دھوکا دیا کہ ہم وزیر جنگ کے پاس جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک آدمی ساتھ کر دیا ہم نے اُس کے گھوڑے کو ذبح کر ڈالا اور بھاگ آئے۔

درویش: مس میڈا کا حال نہ بیان کیا۔ وہ کون ہے۔؟

آزاد: وہ کوہ قاف کی ایک رئیس زادی ہے۔

درویش: تم سے اُس سے کیا واسطہ ہے۔ کہاں کی ملاقات ہے۔؟

آزاد: قسطنطنیہ کی۔ عجب ادائے دلربا ہے۔ حُسن و جمال میں اپنے آپ ہی نظیر ہے۔ اور کوئی لیڈی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میڈا سے ہم سے اقرار ہو گیا ہے کہ بعد جنگ شادی کریں گے اگر زندگی ہے تو شادی ہوگی۔ ورنہ یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

درویش: خوجی کون شخص ہے۔ اُس کا نام تو خواجہ بدیعا ہے۔ پھر اسے خوجی خوجی کیوں کہتے ہیں۔ وہی بونا۔

آزاد: (مسکرا کر) ان کے بہت نام ہیں۔ خوجی۔ خواجہ صاحب خواجہ بدیع خواجہ بدیعا بدیع۔ بدیعا

آدمی کیا ایک تماشا ہے۔

درویش : مِس کلیریسا روسی لیڈی اور تمہاری مدد کرے۔!

آزاد : خدا کی شان۔ اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

درویش : شہزادی آپ کے فراق میں مثل ماہی بے آب تڑپ رہی ہے۔ ایک دم چین نہیں آتا۔ جان پر بن پڑی ہے۔ دن رات رویا ہی کرتی ہیں۔

آزاد : اب پیغام تو صاف صاف کہہ دو۔ اب تو ہمارے آزاد ہونے میں شک نہیں ہے یا اب بھی شک ہے۔ جو کچھ دریافت کرنا ہو۔ دریافت کر لو۔

درویش : ابھی کچھ کچھ احتمال ہے۔ ایک سوال اور ہے۔

آزاد : یا الٰہی۔ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہ تھی اس کا کیا علاج ہے۔ آپ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ سب باتیں تو بتا دیں۔ اب اور کیا بتائیں۔ کون بات باقی رہ گئی ہے جو پوچھتے ہو۔

درویش : اچھا بتاؤ کہ سبز پوش لونڈی سے تم سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔ کیوں کیسے پتے پتے کی پوچھتا ہوں نہ کہوگے۔؟

آزاد : (مُسکرا کر) سبز پوش اور صندلی پوش تو یاد نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ ایک کم سن اور مہ جبین خواص سے کچھ باتیں ہوئی تھیں وہ مجھ پر جان دیتی تھی اور جب روسی میری گرفتاری کے لیے آئے تھے تب وہی مجھ کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں پھندا لے گئی تھی وہاں اُس نے مجھ سے اپنے عشق کا حال بیان کیا۔

درویش : اس سے بھی کسی قسم کی مدد ملی تھی یا نہیں۔؟

آزاد : اُس سے کیا مدد ملی۔ بس یہی مدد ملی تھی کہ مکان بدل دیا۔ مدد جو مجھ کو ملی۔ مِس میڈا اور مِس کلیریسا سے ملی۔ یہ دونوں بڑی نیک اور ملنسار ہیں۔

درویش : اب ہم کو کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ اب مطلب سُنیے۔ شہزادی نے آپ کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ آپ جنگ سے کنارہ کش ہوں۔ اور اُن کو لے کر ہندوستان جائیں اور مزے دند نائیں۔ اُنھوں نے یہ بھی دھمکایا ہے کہ وہاں چاہے اور جس کے ساتھ شادی کرو۔ آزاد پاشا نے کہا ہم کو اس وقت بڑا رنج ہوا۔ وہ بیچاری ہم سے محبت کر کے صیدِ محن ہوئی۔ مگر خدا خوب جانتا ہے کہ

اس میں ہمارا ذرا قصور نہیں ہے۔

درویش: میں بیان نہیں کر سکتا کہ کس قدر رنج اور افسوس ہوا ہے۔

آزاد: میں خوب سمجھ سکتا ہوں۔ جو سے آپ کیا کہتے ہیں۔

درویش: ہر در و دیوار سے سر ٹکراتی رہتی ہیں۔

آزاد: ہائے ستم وائے ستم۔!

ٹکرائے سر کو جان نہ دوں میں تو کیا کروں
کب تک فراقِ یار کے صدمے سہا کروں

درویش: مس میڈا اور مس کلیرسا وہاں سے روانہ ہوئیں۔

آزاد: ہاں! اب تو اور بھی پریشانی ہوتی ہوگی۔

درویش: بالکل تنہائی ہے اور اس پر ستم یہ ہے کہ روسی سواروں کا پہرا رہتا ہے یہ اور بھی قیامت ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔

آزاد: ایسی حسینہ اور یوں صدمہ سہے۔

لالۂ بیداغ تجھ سا کوئی گلشن میں نہیں
ایک بت اس حسن کا دیرِ برہمن میں نہیں

خیر ہم بھی اُف نہ کریں گے۔ خاموش ہی رہیں گے۔

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

درویش: آپ کو ایسا لازم نہیں۔ آپ چلیے اور میدانِ جنگ ——— سے کنارہ کشی اختیار کیجیے۔

آزاد: یہ تو محال ہے۔ توبہ توبہ۔

درویش: کوئی مر جائے اس کا آپ کو خیال نہیں۔

آزاد: ہرچہ بادا باد۔

درویش: افسوس۔ کتنے سنگدل ہو۔ یہ سختی۔

آزاد: مردِ میدان اور آزمودہ کار ہو کر ہم سے یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہم میدان جنگ سے منہ موڑیں کیا مجال۔

درویش: اِس میں مردی نہیں ہے۔ مردی یہ ہے کہ جو اپنے اُوپر جان دے اس کا خیال رکھے۔

آزاد پلونا کے قریب پہنچ گئے

دگر روز کیں ساقی صبح خیز | زمی کرو بر خاک یاقوت ریز
درا تے جگر تاب و فریاد رنگ | زسر مغز می بردو ازروے رنگ
ہماں کوس رومی زگر کینہ چرم | نہ دل بلکہ پولا ذرا کرو نرم
زمین راز شورش برافتاد بیخ | فگند آسمان لعل و خورشید زیخ
زنیزہ نیستان شدہ روے خاک | زگو پالہا کوہ گشتہ مغاک
نہنگان شمشیر جوشش گداز | بہ گردن کشی کردہ گردن دراز
نہ پوئیندہ رابر زمین پای بود | نہ پرندہ رابر ہوا جای بود
چو انجم برآراست لشکر گہی | کشیدہ بہ گردوں درد خرگہی
سپاہی کہ اندیشہ راپی کند | چو برکہ زُند کوہ راخوی کند
دلیرانِ شمشیر زن بے شمار | بہردم گرائی چو پیچیدہ مار

کمند افگنائی کہ چون تند شیر
درآرند سرہای پیلان بزیر

شجاعت کے نہنگِ بحر آشام سپہ سالارِ عالیمقام آزاد خوش نہاد اس شب کو پانچ کوس پر خیمہ زن ہوئے۔ دوسرے دن نور کے تڑکے کوچ کیا۔ شب کو جاسوسوں کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر روسیوں کی جماعتِ کثیر نے فوجِ ترک کو جو غنیم کے مقابلے میں کم تھی شکست دی۔ بعد فتح وہ مقام چھوڑ دیا۔ اس پر قبضہ نہ کیا اور ترکوں کی فوج کا تعاقب ہوا۔ پلونا کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ ترکی سپہ سالار تین جانب سے محصور ہے۔ مگر چوتھی طرف ایک جنگل ہے۔ پاشا نے بکمال جواں مردی جنگل کی طرف سے باغیوں کو نکال دیا ہے اگر جنگل کی طرف سے فوج پہنچے تو سبحان اللہ ورنہ ایک لاکھ آدمی گرفتار ہو جائے گا۔ یہ خبر سن کر آزاد کا چہرہ فرطِ غم سے سُرخ ہو گیا اور شیر نر کی طرح ڈکار کر بولے۔ کیا پرواہے۔ جب تک تن پر سر اور قالب خاکی میں جان باقی ہے، ہم پلونا جانے کی کوشش بالغ کریں گے۔ بس اب تو ٹھان لی ہے کہ یا جان جائے گی یا فتح پائیں گے۔ جیتے جی

بے نیلِ مرام واپس نہ آئیں گے ہم مردِ میدان ہیں۔ مرد کہیں غنیم کو پیٹھ دکھاتے ہیں کیا مجال ممکن نہیں۔

آزاد نہایت غیظ و غضب میں آئے۔ معاً اُٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ آنکھ سے غصّہ برستا تھا اور چہرہ انگارے کی طرح لال بھبھوکا ہو گیا تھا۔ کُل افسر اور سپاہ اِن کی کیفیت دیکھ کر خاموش تھے۔ اِس وقت اگر شیر بھی آتا تو آزاد ایک ہی ہاتھ میں کام تمام کر دیتے۔ شاہنامہ کے اشعار وردِ زبان تھے۔

زاسپانِ تازی بزرّین ستام — زشمشیر ہندی بزرّین نیام
زدیبا و خرو بہ یاقوت و زر — زگستر ولی ہائے بسیار مر
از ایران در آمد بہر سو خروش — شد آرام گیتی پُر از جنگ و جوش
بشمشیر از آن لشکرِ نامدار — بیفگند بسیار در خاکزار
چو دریائے الماس شد کان لعل — تن کُشتہ فرسودہ در زیر نعل

بدنیسان بباریدہ گوپال و تیغ
شدند آن دلیران براہِ گریغ

ایک افسر نے جو معمر آدمی تھا آزاد کو سمجھایا۔

افسر: بھائی میں سینتالیس برس سے فوج کی افسری کرتا ہوں اور پچپن سال سے فوج میں بھرتی ہوں۔ سہولت سے کام لینا چاہیے۔

آزاد: آج کل کے چند روز بس نچوڑ کے دن ہیں۔

افسر: مگر عجلت سے کیوں کام لو۔ ایسی کیا جلدی ہے۔ سُنا نہیں۔ ع
کہ تعجیل کارِ شیاطین بود
التعجیلُ من الشیطانِ۔ والتاخیر من الرحمٰن۔

آزاد: خدا خیر کرے چوطرفہ سے گھر گئے۔ الامان۔ الامان۔

افسر: ہاں ہے تو نازک معاملہ اور پلونا ہی بقول آپ کے نچوڑ کا مقام ہے۔ دیکھیے کیا خواستۂ خدا ہے۔

آزاد: فوج کو خوب آمادہ کیجیے کہ ہرگز ہرگز ہراساں نہ ہوں جان دیں اور جان لیں۔ اب دوبارہ زندہ ہونے سے رہے۔ پھر وطن ہی کے نام پر نہ جان دوں۔

افسر: اچھا۔ میں سمجھاتا ہوں۔

آزاد پاشا اور ایپلٹن میں گفتگو ہونے لگی۔

ایپلٹن : بلغارستان کی اُس عورت کو کہاں رکھا۔ رہا کر دیا۔ یا نہیں اقرار کیا تھا تو بیشک رہا کرنا لازم تھا۔ ہیں تو عمداً اُس کافر کے قریب نہیں گیا۔ ایسی صورت باقی ہے کہ زاہد تک مُرید ہو جاتے اور اُس کا کلمہ پڑھنے لگے۔

آزاد : یہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا کہ میں نے رہا نہیں کیا۔

ایپلٹن : ہم نے نہیں سُنا۔ کیا خود بخود رہا کر دیا۔؟

آزاد : جنرل کے پاس گیا۔ وہاں اُن سے بیان کیا کہ اس عورت کو ہماری خاطر سے رہا کر دیجیے عورت کو قید کیا تو کیا۔ مقابلہ تو مردوں سے ہے۔ روسی جنرلوں اور افسروں اور سپاہیوں کو گرفتار کرو تو مضائقہ نہیں۔ کہنے کو ہو گا کہ سپاہی کو گرفتار کر لائے۔ فوجی افسروں کو گرفتار کر لیا۔ عورت کو قید کیا تو کیا۔

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
پلنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

جنرل بھرّوں میں آگئے یہ کون بات تھی کہا اچھا تم رہا کر دو۔ مگر ایپلٹن پاشا سے دریافت کر لو جب تمہارا نام لیا تو میں نے فوراً رہائی کا حکم دے دیا۔

ایپلٹن : جنرل ہیوم نے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔

آزاد : سب سے بڑی تعریف اُس دن ہو گی جب ہم پلونا سے فتح یاب ہو کر آئیں گے خدا نے چاہا تو ایک دن ایسا بھی ہو گا۔

ایپلٹن : حُسن آرا بیگم سے کیوں خط کتابت ترک کر دی۔ ہم لوگوں میں بہ قاعدہ نہیں ہے۔ ہمارے خطوط برابر آتے جاتے ہیں۔ ابھی وینشیا کا خط ہم نے پایا۔ اس کا حال اُنھوں نے بھی سُنا۔ سخت افسوس ظاہر کیا ہے۔

آزاد : آپ اُن کو ضرور لکھیے گا کہ اب آزاد پاشا رہا ہو گئے ہیں اپنے ہاتھ سے دو چار سطریں لکھوں گا کہ ان کی تشفی ہو۔ ورنہ سمجھیں گی کہ صرف دل کی تسلی کے لیے لکھ دیا ہے۔ دیکھیں ہم اور آپ اور وینشیا اور خوجی یہ چاروں آدمی کب تک ملتے ہیں۔ یار زندہ وصحبت باقی۔

ایپلٹن : اُس درویش سے تم نے خوجی کا حال نہ پوچھا کہ وہ ہے کہاں۔

آزاد : ارے لاحول وَلا قوۃ اور کُل باتیں پوچھیں مگر یہ پوچھنا بھول گئے۔ بُلا کے دریافت کروں۔ یاد ہی

نہ رہا۔ خوجی کا حال پوچھنا ہی بھول گئے۔ ہم کو اُمید نہیں کہ خوجی سے ملیں۔ اب اُس کو یہاں تک کون لائے گا۔ یا تو روسی قید کرکے لے جائیں گے یا کوئی مار ڈالے گا اور قرولی اُس کے پاس ہے ہی نہیں۔ ایک تو یوں ہی مرا ہوا ہے۔ دُبلا پتلا آدمی۔ اگر ہوا زور سے چلے تو پتنگ ہو نے لگے۔

گھُل گیا ہے پیرہن میں جسم مجھ مایوس کا
ایک عالم کو گمان ہے شمع اور فانوس کا

وہ بھی ہمارا ہی سا بد بخت ہے۔ کس مزے سے نواب صاحب کے ہاں رہتا تھا۔ صبح شام افیم گھولتا اور چانڈو پیتا اور گپیں اُڑاتا۔ مگر نحوست نے کہیں کا نہ رکھا۔

برق کی اُس پر عبث گرنے کی ہیں تیاریاں
برگ گل ہی آشیاں کو اپنے ہیں چنگاریاں

خیر یہ گفتگو تو ہوا ہی کرے گی۔ اب یہ فرمائیے کہ راہ میں کتنے دریا ملیں گے۔ تین دریا نقشے کی رو سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک پہاڑ۔ شاید دو ایک دریا اور ملیں۔ مگر بڑے بڑے دریا تین ہی ہیں۔ ڈینوب کو جو ہم نے دیکھا تو بڑا لطف حاصل ہوا۔ اُس کی موجوں نے ہمیں ایسا محظوظ کیا کہ بیان سے باہر ہے۔

عاشق مہجور کے مانند ہے بیتاب موج
رکھتی ہے دریا میں حال ماہی بے آب موج

ہم نے کئی دریا دیکھے اور ایک سے ایک بڑھ کر مگر جو لطف ڈینوب سے حاصل ہوا۔ اور کسی دریا سے حاصل نہیں ہوا۔

یوں ہے آبادی میں بازیب و صفا دریا رواں
جس طرح انجم میں شب کو آسمان پر کہکشاں

مگر جب ہم قید ہو کر جاتے تھے تب ڈینوب کو دیکھ کر خون روتے تھے کہ ہائے اب روتے دریا پہنچے اور قید خانے سے قریب ہوتے۔ جب واپس آتے تھے تب غنچۂ دل کھلا ہوا تھا کہ خدا نے ڈینوب کے اس پار بھیجا۔ اُس کی عنایت کا کیا کہنا۔

صدقے اس بندہ نوازی کے تری میں جاؤں
باپ ماں ہوتے ہیں کب ایسے شفیق و اشفق

ایپلٹن: سامنے دیکھیے کچھ نظر آتا ہے یا کچھ بھی نہیں۔ وہ جماعت کیسی ہے۔

آزاد اور ایپلٹن پاشا دونوں نے گھوڑے روک لیے معلوم ہوا کہ ایک میل کے فاصلے پر سواروں

کا پرا جما ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ روسی ہیں یا ترک۔

آزاد: بس۔ اب ہمارے ہوش ٹھیک نہیں۔ بڑا افسوس ہوا۔

ایپلٹن: ہمارے نزدیک فوج کو روک کر تھوڑی دیر کے بعد واپس چلو۔

آزاد: ہائے پلونا۔ وائے پلونا۔ یار اس وقت ستم ہو گیا۔

ایپلٹن: اب ہمارے آپ کے امکان سے خارج۔

آزاد: اُف۔ ہائے افسوس۔ وائے افسوس۔!

ایپلٹن: اب دوسرے راستے سے کوشش کرو۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ چو طرفہ سے فوج نے محصور کر لیا ہے۔ اور اب کسی طرف سے راہ باقی نہیں ہے۔ روسی فوج نے حس و حرکت نہ کی آزاد اور ایپلٹن پاشا اپنے لشکر کو لے کر وہاں سے بعجلت تمام روانہ ہوئے۔ دوسری طرف سے پلونا کے جانے کا قصد کیا۔ شام تک بخیر و عافیت سفر کیا۔ مگر دو گھڑی رات جا کر اس قدر برف باری ہوئی کہ الامان الامان۔ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا۔

رُخِ آسمان گشتہ کافور بار — زمین شد زیخ بستہ الماس وار

ازان برف و یخ دست و در بستہ شد — زمین با فلک پاک پیوستہ شد

ہمہ روز و شب برف بود و ہوا — فرو بست راہِ دم اندر فنا

سپہ شد ازان درد نالان و زار — ز رفتار پا ماند و بازو ز کار

ز تن جنبش دست دشوار شد — سلیح و سلب جملہ بیکار شد

سپاہ و ہمہ سروران بے درنگ — ز سرما فشر دند چوں تحت سنگ

ازان یخ چقان شند گزند درشت — جدا شد ز کف نیدا انگشت و مشت

فرو مارے یختہ جان و تن مردمان — پے و پوست بے گوشت از استخوان

ہوا بود و یخ بود و سرمائی سخت — نہ سایہ نہ آتش نہ موئینہ رخت

فرو بستہ شد نائی توپ و تفنگ — نہ آب و ز شبنم ز برف و ز زنگ

کسے را بہ تن تندرستی نماند — رواں را بہ تنہا درستی نماند

ہمہ زندۂ و مردہ یکساں شدند
ز افسردنِ برف بیجاں شدند

اتنے میں چلتے چلتے ایک ترکی (آوٹ پوسٹ) ملا تو جان میں جان آئی۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ

پلونا کی طرف سے جو خبر آئی ہے اس سے مایوسی ہی ہوتی جاتی ہے۔ اب ہمیں یقین نہیں کہ ہم کامیاب ہوں۔ روسیوں کا ڈیڑھ لاکھ آدمی پلونا کے چاروں طرف جمع ہے۔ مگر ابھی تک صرف تین طرف سے بخوبی محاصرہ ہے۔ اگر اس چوتھے راستے سے آپ جا سکیں تو سبحان اللہ ورنہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ خبر سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ پوچھا روسیوں کا جنرل گرکو کس سمت کو ہے۔ کیا کرتا ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ جنرل گرکو نے ایک بہت بڑی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔

گرہ کو و فوجش زمیدان جنگ | بروں راندران رود خون چون نہنگ
شناکروہ درموج دریائے خون | بیگ سوز میدان برآمد بروں
بہ بالائے کوہے برآمد فراز | برآسود از چالش ترک و تاز

ازاں بعد برکوہ مانو تزنگ
برآسود از کیں و پرخاش و جنگ

معلوم ہوا کہ روسیوں نے اس مقام پر ترکوں کو شکست دی تھی۔ آزاد اور اپیلٹن کی رائے ہوئی کہ تھوڑی دیر کے لیے اس مقام پر ٹھہر کر غور کر لیں کہ کس راہ سے جائیں۔ باہم مشورہ ہونے لگا۔ آخر کار کل افسروں نے رائے دی کہ دو چار گو بندے بھیجے جائیں۔ تاکہ وہ جلدی خبر لائیں۔ حکم ہوا کہ دو ہزار سوار طلائے کے لئے مقرر ہوں۔ باقی سب کمر کھول ڈالیں۔ جب اطمینان کے ساتھ بیٹھے تو درویش بھی آزاد اور اپیلٹن کے پاس آئے اور شعر شاعری کا چرچا شروع کیا۔

درویش: فارسی شعرا میں ہمیں فردوسی اور عنصری اور رودکی کے اشعار بہت پسند ہیں۔ اور خاقانی کے قصیدے۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

آزاد: کیا فارس میں بھی آپ رہے ہیں؟ تو یہ کہیے کہ سیاح کامل ہیں۔ آپ کو اور کہاں کہاں جانے کا اتفاق ہوا۔؟

درویش: تبت، تاتار، ختن، ہندوستان، ایران، کابل، عرب، چین، روس، روم، جرمنی، امریکا، انگلستان کوئی مقام ہم سے نہیں بچا۔ روایت ہے کہ ایک بار ہاتفی نے جو مقام جام کا شاعر اور حضرت جامی کا بھانجا تھا۔ جامی سے کہا کہ ہم فردوسی طوسی کے شاہنامے کا جواب لکھنا چاہتے ہیں۔ اسمٰعیل باریک نے جب وہ خراساں کا مالک تاج و تخت ہوا تو ان سے کہا گیا کہ جس طرح فردوسی نے شاہ محمود کی تعریف کی ہے۔ تم میری تعریف کرو۔ جامی نے ہاتفی سے کہا کہ فردوسی کے نقطۂ مقابل تم نہیں ہو۔ اور اگر واقعی یہی دعویٰ ہے تو بسم اللہ۔ فردوسی کے ان اشعار کے جواب میں کچھ کہیے۔

درختے کہ تلخ است دے را سرشت — گرش در نشانی بباغ بہشت
در از جوئے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ انگبین ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بکار آورد
ہمساں میوۂ تلخ بار آورد

ملا ہاتفی نے برجستہ جواب دیا اور خوب جواب دیا۔

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت — نہی زیر طاوس باغ بہشت
اگر وقت آں بیضہ پروردنش — ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمہ سلسبیل — دران بیضہ دم در دمد جبرئیل
شود عاقبت بیضۂ زاغ زاغ
بردرنج بیہودہ طاؤس باغ

درویش نے کہا شاعری کا لطف عرب میں نہیں ہوا۔ ایران میں البتہ شاعر ہی شاعر نظر آتے ہیں۔ سب شعرائے عرب ہما۔ ہندوستان میں بھی بعض بعض شاعر بہت اچھے ہیں۔ انیس کہتا ہے۔

زمین پہ پاؤں ہے اور آسمان پر ہے دماغ
فلک بڑھائے گا اب تا کجا کمینوں کو

آزاد: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ یہ سلام کا سلام مرصع ہے۔

زمین پہ سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
اجل کہاں سے کہاں لائی ہے کمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین تازہ کے انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مگر حیرت ہے کہ آپ اردو زبان سے کیوں کر واقف ہو گئے۔ عرب کے باشندے اور ایسی صاف اردو۔ جائے استعجاب ہے۔

درویش: ۴۰ برس تک ہندوستان میں رہا ہوں۔ ع
کشتۂ ہندم و سبزان گلابی پوشش

حسنِ ملیح کی کان ہندوستان جنت نشان ہے۔

ملاحت آنقدر ہا داشت ساقی
کہ مے خوردن ز دست او حلال است

یہ شعر میزانِ ہند کی شایاں ہے۔ علی حزین نے خوب ہی کہا ہے۔

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

آزاد: آپ تو اس قابل ہیں کہ عمر بھر آپ کو ساتھ رکھے، اور آپ کو ادب آموز بنائے۔ عربی عجم ادب اور زبان سیکھے۔ مگر آپ بھاگے ہی جاتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ پولینڈ کی شہزادی کے ہاں ہم نے آپ کو نہیں دیکھا۔

درویش: میں کسی سے ملتا نہیں۔ ملا فرقان کی بیعت لایا ہوں۔

دیدہ ام در علمِ حکمت ہائے دنیا صد کتاب
کردہ ام یک نکتہ تنہا نشینی انتخاب

گوئندوں نے اطلاع دی کہ اٹھارہ ہزار روسی ایک سمت گھیرے ہیں۔ پچپن ہزار روسی دوسری جانب سے اور دس بارہ ہزار کے قریب تیسری طرف سے اور تیاریاں ہو رہی ہیں کہ جنگل کی سمت بھی محاصرہ کر لیں مگر ایک دریا حائل ہے۔ اور اس دریا کے کناروں پر جو جو مقامات عبور کرنے کے ہیں۔ وہاں ترکوں کا قبضہ ہے۔ یہ ترکی سوار ایسے ایسے خوش رو اور قوی ہیکل جوان ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ہے خوبصورت سیم تن غیرت رستم رشک روئیں تن، خدا ان جوانوں کو بچائے۔ خدا کرے باری تعالیٰ کو ان پر رحم آئے۔ رسولوں نے بیان کیا کہ راتوں رات ہماری فوج چلے اور سب کو پڑاؤ کرے تو بہتر ہے گو دن کو سفر کرنا چنداں مشکل نہیں۔ مگر شب ہی کے وقت مصلحت ہے۔ آزاد نے کہا اچھا یوں ہی سہی۔

آزاد: حال میں کوئی جنگ ایسی بھی ہوئی۔ جس میں ہم نے فتح پائی یا ہر جنگ میں غنیم ہی نے فتح پائی۔ اور ہم نے شکست۔

جاسوس: ایک لڑائی میں ہم کامیاب ہوتے۔ مرتضیٰ پاشا کی سرکردگی میں دو ہزار سوار بھیجے گئے تھے۔ اس سپاہ میں سرکیشیا کے لوگ تھے۔ یہ لوگ کاسکوں کے مقابل ہیں۔ موضع سوبتیں سے گذر کے انھوں نے ایسی دانائی اور چالاکی اور حکمتِ عملی کی کہ توپخانۂ روس کے عقب میں آگئے۔ روسیوں کو

خبر بھی ہوئی۔ پیچھے سے باڑھ پڑی، تو روسی چکرائے پھر کیا ہو سکتا تھا۔ بھاگتے ہی بن پڑی۔ بلکہ بھاگتے بھی راہ نہ ملی لیکن دو گھنٹے کامل مقابلہ رہا۔ اس کے بعد روسی تابِ مقاومت نہ لائے۔ وہ شب اور دوسرے دن شام تک یہ فوج اسی مقام پر رہی۔ شبا شب کوچ کیا تو پلونا سے تین کوس کے فاصلے پر دم لیا، اور اسی مقام پر خیمہ انداز ہوئے دو جاسوس بھیجے گئے کہ سپہ سالار پلونا کو اس مژدۂ طرب انگیز سے مسرور کریں کہ کمک کے لیے فوج قریب آگئی ہے۔

چہل پہل

بیا ساقی آن جام کیخسروی کہ نورش دہد دیدہ ہا را نوی
لبالب کن از بادۂ خوشگوار بنہ پیش کیخسرو روز گار
بیا ساقی آن جام زرین بیار کہ مانند فریدوں و جم یادگار
مےَ ناب دہ عاشقِ ناب را بہ مستی توان کردن ایں خواب را
بیا ساقی آن آب چوں زعفران کزو پیر فرتوت گردو جوان
بہ من دہ کہ ناز و جوانی کنم گل زرد را ارغوانی کنم

بیا ساقی آن بکر پوشیدہ روی
بمن دہ گرش ہست پروای شوی

نازنین برق دم پری چہم نواب ثریا بیگم شوخ کا صنم خانہ عروس رعنا کی طرح سجا سجایا تھا۔ کمرے اور شہ نشین باز یب و تزئین۔ فرش مکلّف، پردے رنگین خواصیں غاہرو پیش خدمتیں قوس ابرو، مغلانیاں ناوک نگاہ، سیم اندام، مہریاں بانکپن ترچھیں، رنگین کلام جلیسیں خوشرو خوش وضع سہیلیاں عنبر مو چمن طبع بیگمات اور مخدّرات عصمت سمات فوق البھڑک لباس سے آراستہ جواہرات اور زیور سے پیراستہ حیرت کو بھی حیرت ہوتی تھی کہ الٰہی یہ مکان ہے یا پرستان ہے۔ اندر کا اکھاڑا ہے یا حسن کی کان ہے۔ سبحان ملاءِ اعلی بھی ایک نظر دیکھتے تو دنگ ہو جاتے۔ حوران جناں پر مُنہ آتے انھیں بتوں کا کلمہ پڑھتے بیعت لاتے آہوان صحرا چشم سیہ دیکھ پاتے تو چوکڑیاں بھول جاتے۔

دیکھا جسے گھائل کیا تاکا جسے مارا!
اُس آنکھ سے ڈریے جو خدا سے نہ ڈرے آنکھ

اور خدا سے ڈرے تو کافر کیوں کر کہلائے۔ کفار کو کہیں خوف خدا ہوا کرتا ہے۔ یوں تو ایک سے ایک ستم کوش اور سمن پوش تھی۔ مگر آسمان جاہ کی شوخی ستم ڈھاتی تھی۔ کبھی مسکرا مسکرا کر عشاق کے دلوں پر بجلیاں گراتی تھی۔ دو تین نوجوان نواب زادے ایک روشن دان سے چپ چاپ گھور رہے تھے۔ آسمان جاہ کو کیا معلوم کہ نامحرم کی نظر بے طور پڑ رہی ہے۔ دوپٹے کی فکر تھی نہ بدن چھپانے کا خیال۔ وہ تینوں عاشق تن ان سب گل بدنوں کے حسن خداداد کا نظارہ کر رہے تھے اور ٹھنڈی سانسیں بھر رہے تھے۔

فرشتہ در ایشان نہ بنید دلیر ۔۔۔ دگر بنید افتد ز بالا بزیر
نظر طاقت آں ندارد ز نور ۔۔۔ کہ بنید در ایشان ز نزدیک و دور

کجا قاقم یا حریر است نرم
بلرزد بر اندام ایشان ز شرم

اور انواع و اقسام کے زیور مرصع اور مروارید دور خوش آب و گوہر ناب سے آتش حسن اور بھی دو بالا ہو گئی تھی۔ گوری گوری گردنوں میں منت کے طوق ڈنڈوں پر نورتن۔ نرم نرم کلائیوں میں جڑاؤ کڑے اور کنگن۔ گوش صفا کوش میں، بجلیاں، پتے، جھالے، انتیاں ڈر۔ سر پر چھپکے۔ آنکھیں بے زیور کے کٹا و کرتی تھیں۔

بہ آہو نسبت چشمش چو دارم چنین برابر و شد
کہ چشم شیر گیر من ندارد ہیچ آہوئے

دو چار کم سنیں بالکل سادی وضع سے آئی تھیں مگر ان کی سادگی حسن سے بھی زیادہ کام دیتی تھی۔ ان نواب زادوں کا دل چھینے لیتی تھی۔ ثریا بیگم اس روز انواع و اقسام کے بیش بہا زیور پہنے تھیں۔

ز لعل و ز دُر گردن و گوش پُر
لب از لعل کانی و دندان ز دُر

آسمان جاہ کو اپنی اٹھتی جوانی اور شیواز بانی پر ناز تھا۔ تو حشمت بہو رخ رنگین اور زلف عنبریں پر اتراتی تھیں۔ بیگما بیگم اپنے دست حنائی اور گوری گوری کلائی پر گھمنڈ کرتی تھیں۔ گلشن آرا حسن خدا آفریں اور جعد مشکیں دیکھ کر جامے میں پھولے نہیں سماتی تھیں۔ آبادی بیگم چمن میں ناز و ادا سے قدم دھرتی تھیں۔ الغرض ہر سمت چہل پہل اور دل لگی تھی۔

خنک روزگارے کہ بے رنج و غم

نشینند آسودہ یاران بہم

ہمہ ہمدل و ہمدم و ہمزبان

ہمہ آسودہ از کار و بارِ جہاں

دمے خوش نشینند باہمدگر

بفضلِ خداوند جن و بشر

آسمان جاہ: بہن چلو ذری باغ کی ہوا کھائیں۔ اللہ جانتا ہے اتنے وقت وہاں اس قدر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوگی کہ جی خوش ہو جائے گا۔

ثریّا بیگم: اے واہ ہنسواؤ گی کیا؟

مغلانی: حضور دُلہن کہیں اس شوخی کے ساتھ چمنوں میں ٹہلا کرتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں برات آتی ہوگی۔ اتنے وقت ان کو گردن جھکا کے بیٹھنا چاہیے یا ہڑدنگا کرنا چاہیے۔

آسمان جاہ: جھوٹ کے چھپر اُڑاتی ہو۔ جھوٹ بھی تو کتنا تھوڑی دیر میں برات آتی ہوگی بھلا کتے بجے ہوں گے۔ آخر معلوم تو ہو۔

مغلانی: اے یہی کوئی نو بجے ہوں گے اور کیا۔

آسمان جاہ: اور رات کو برات آئے گی۔ دس بارہ گھنٹے ہوئے۔ تھوڑی دیر کہاں گئی۔ دھوپ میں چونڈا سفید کیا ہے کیا؟ یا کوئی عارضۂ نزلہ گرا ہوگا بالوں پر جب ہی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔ آدمی میں حواس ہی حواس تو ہیں۔

اتنے میں ایک بوڑھی بیگم نے جو آسمان جاہ کی تقریر سُن رہی تھی، کہا لڑکی تجھے ہوا کیا ہے۔ بڑی بوڑھی کا لحاظ نہ کسی کا خیال۔ اے واہ۔ جو زبان پر آیا بک دیا۔ دُلہن کو کبھی باغوں میں سیر کرتے آج تک کسی نے بھی دیکھا ہے۔ جب تم دُلہن بنی تھی تو پاؤں پاؤں اپنی سُسرال گئی ہوگی۔ یہ فقرہ سُن کر وہ شوخ گلپوش مُسکرا کر بولی اور سُنیئے۔ ایک نشد دو شد۔ ہم تو اپنی ہمجولیوں میں ہنستے تھے۔ کیا ہمیں نہیں معلوم کہ دُلہن کو کس طرح بیٹھنا چاہیے۔ بوڑھی بیگم نے کہا۔ تو اسی ہنسی کیا۔ اور باتیں چلبتیں کرو۔ ایک نگوڑی یہی ہنسی رہ گئی ہے۔ جب سے ان کو مانجھے بٹھایا۔ تب سے دُلہن بنیں ابھی کل تو تمہاری شادی ہوئی۔ آج سب رسمیں بھول گئیں۔ اللہ ری بھول۔

آسمان جاہ: ہمیں نہیں یاد رہیں، اور یاد کر کے کرنا کیا ہے۔

بوڑھی بیگم : تو اتنی بھی بھول گیا ابھی جما جما (جمعہ) آٹھ دن کی پیدائش اور حافظے کا یہ حال. خدا ہی خیر کرے. جب ہماری طرح بوڑھی ہوگی تو اپنا نام بھول جایا کروگی. اچھی بھول ہے.

ثریا بیگم : خالہ جان! آپ کچھ اور کام دیکھیے. سینکڑوں دھندے ہیں. ان کی تو ایسی ہی باتیں ہیں. ہم ہمجولیاں جو آپس میں جو چاہیں (آہستہ سے) سو کہیں.

آسمان جاہ : (خالہ بناکر) خالہ جان سچ کہتی ہوں آپ کی جان کی قسم میں نے بے ادبی کی بات نہیں کی مگر آپ حق ناحق کو خفا ہوگئیں.

بوڑھی بیگم نے دوسرے کمرے میں جاکر مغلانیوں کو حکم دیا کہ جتنے خاصدان ہیں سب ہمارے پاس لے آؤ. اور ادھر ثریا بیگم اور اُن کی ہمجولیوں میں میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں. آسمان جاہ نے پوچھا کیوں بہن تمہارے ماں باپ نے تم سے پوچھا تھا کہ فلاں شخص کے ساتھ نکاح منظور ہے یا نہیں. ثریا بیگم تو مسکراکر خاموش ہو رہیں مگر اُن کی بڑی بہن نے کہا. ہاں ہاں پوچھا تھا انھوں نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ منظور غیر منظور میں کچھ نہیں عرض کر سکتی. میں نے یہ سب باتیں حضور ہی کی رائے پر چھوڑ دیں. مگر اس قدر البتّہ ہے کہ چاند کو گہن نہ لگے. اور یوں میں تو یہی چاہتی ہوں کہ جب تک جان میں جان ہے میں اماں جان کے پاس سے جدا نہ ہوں. اور یوں شادی بیاہ کو تو کوئی روک ہی نہیں سکتا. یہ تو حکم خدا و رسول ہے. جس بہن کے ذریعے سے پیغام آیا تھا اُس سے کہا کہ میری جانب سے بعد تسلیمات

عرض کرو یجیو تم اتنی بات

کہ تصدق سے آپ کے حضرت

کوئی باقی نہیں رہی حسرت

مگر ارمان دل میں ہے اتنا

کہ یہ جے دن کی زندگی ہے بقا

آپ کے زیرِ دامنِ دولت

یہ بھی عزت سے ہو بسر حضرت

اماں جان اِس نکتے اور مطلب کو سمجھ گئیں کہ چاند کو گہن نہ لگے. کہلا بھیجا کہ ایسا دولہا تجویز دوں جس کے سامنے چاند بھی بلند نظر آئے. جسے مہ تاباں گہہ کے چھوٹتا ہے.

آسمان جاہ : ثریا بیگم اپنے دل میں دعا مانگتی ہونگی کہ اللہ آج کہیں کوئی اور جھگڑا نہ پیدا ہو جائے۔ مگر اب ہنسی خوشی بیاہی جاؤگی۔ چین ہی چین لکھا ہے۔ چاند سا دولھا اور چاند سی دُلھن (گاگر)۔

شوخی حسن سے کہتے ہو چھلاوا ہم ہیں — تم کو ہم عاشق کا ہیدہ بدن کیا روکیں

کچھ بھی قیمت لب جاناں نے رکھی لعلوں کی — ترک اب راہ بدخشان و یمن کیا روکیں

نازکوں سے کہیں اٹھتا ہے بارِ سختی — بارش ژالہ کو گلہائے سمن کیا روکیں

چاہیے وصف قد یار میں مضمون بلند — ہم طبیعت کو دمِ فکر سخن کیا روکیں

چاہیے پاس ادب قیس سے یارانہ ہے — دشت میں ناقۂ لیلیٰ کو ہرن کیا روکیں

شرر جستہ ہیں بے تابی سوزِ غم سے
اے صبا آپ کو ہم سوختہ تن کیا روکیں

تم کو ہم عاشق کا ہیدہ بدن کیا روکیں۔

بیگما بیگم : ہمارا تمھارا مکان پاس ہوتا۔ تو ہم گانا ضرور سیکھتے۔

چھوٹی بیگم : ضرور سو کام چھوڑ کے۔ مگر آواز کتنی پیاری ہے' اور ادا بھی اچھی طرح کرتی ہیں کہاں سیکھا تھا۔

آسمان جاہ : تان سین کی روح سے۔ سمجھیں۔ تان سین کی روح سے۔

چھوٹی بیگم : ہاں! درست! پھر کیوں نہ اچھی طرح گا سکو۔

اتنے میں بسنتی بھری نے باہر سے آن کر کہا۔ اے حضور بڑی بھیڑیں ہیں اوہ۔ اللہ جانتا ہے ٹھٹ کے ٹھٹ ہوئے ہیں اور ایک پر ایک گرا پڑتا ہے۔ اس قدر دھکم دھکا ہے کہ میں کیا بیان کروں۔ بڑی کشمکش سے آنے کا اتفاق ہوا' میں تو چلی جاتی تھی۔ مردوں میں کون جائے بیس پچیس آدمی ہوں تو راستہ کترا کے جائے اور جہاں ہزاروں کی گنتی ہو وہاں جاتے ہوئے جھجک معلوم ہوتی ہے۔ بعض بعض ہٹرونگیاں گھس بیٹھ کے دھکم دھکا کر کے نکل ہی جاتی ہیں۔ بعض بعض نگوڑے ڈھیٹ مردوئے قتل کے قابل ہوتے ہیں۔ چاہے جگہ ہو یا نہ ہو خواہی نخواہی بھیڑ کے چلیں گے۔ ایک موا گورا گورا سا ہے میں جھپٹ کر تو چلتی ہی ہوں۔ اے بس سامنے آن کے کھڑا ہو گیا اب ادھر تو شاہ جی کے ہاں کا گھوڑا۔ ادھر نواب رونق الدولہ کی دُم کٹی ہتنی۔ میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ تب تو میں نے اس کو ڈانٹ بتائی۔ میں نے کہا چل چخے' دور موے' ادھر سنو' رانڈ کا سانڈ' ہمیں یہ چھیڑ خانی نہیں بھاتی' چھیڑو اس کو جو موئی شہدی ہو۔

آسمان جاہ : تم لاکھ باتیں بتاؤ' ہم ایک نہ مانیں گے تم نے اپنے آپ چھیڑا ہوگا۔ تمھاری آنکھیں کہے دیتی ہیں کہ تم ویسی ہو۔

بسنتی : اب سرکار' مالک ہیں۔ کوئی ایسی ویسی کہتی تو جواب پاتی۔ حضور کو کیا جواب دوں۔ مجھ میں کون سی بات دیکھی۔

حشمت بہو : اچھا اچھا بربری (برابری) نہ کرو چپ رہو
آسمان جاہ : ہاں، وہاں کا حال تو بتاؤ۔ بڑی بھیڑیں ہیں۔
بسنتی : جی ہاں ہزاروں آدمی جمع ہیں، اور ہر قسم کے آدمی۔ نواب زادوں، شہزادوں، راجاؤں، مہا راجوں، ساہوکاروں، مہاجنوں، سب کے ہاں سے آدمی آئے ہیں۔ برچھی بردار اور جھنڈی بردار اور یہ اور وہ ڈیوڑھیوں سے بھی لوگ آئے ہیں۔ سناگوروں کا باجا ہوگا۔ ہاں خوب یاد آیا یہ تو کہنا میں بھول ہی گئی تھی حضور پچپن ہاتھی جلوس کے ساتھ ہوگا۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ پچپن ہاتھی۔
آسمان جاہ : جھوٹ بولے تو اتنا۔ اُف۔
بسنتی : جھوٹ کہتی ہوں تو دونوں آنکھیں پٹم ہو جائیں۔
آسمان جاہ : پچپن ہاتھی سارے شہر میں تو ہیں نہیں، یہ آئے کہاں سے۔ ہم سے کہو تو انگلیوں پر گنوا دیں۔ دو ہاتھی نواب مرتضیٰ کے ہاں ہیں۔ ایک ہتھنی اور ایک پاٹھا گڑھیا والے چودھری کا ہے۔ ایک ہاتھی حیدر کا ہے۔ اور تین ہاتھی اُن کے میاں کے ہاں ہیں اور اسی طرح سارے شہر میں کوئی دس بارہ ہوں گے۔ بندرہ سہی۔ بیس سہی یہ پچپن کہاں سے آ گئے۔
بسنتی : اے میں کیا جانوں۔ حضور۔ جو سنا وہ کہا۔ میں کچھ گننے تو بیٹھی نہیں تھی۔ سنی سنائی کہتی ہوں۔
آسمان جاہ : اے واہ ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ پتا کھڑکا اور بندہ سرکا۔ بھانڈ نقل نہیں کیا کرتے ہیں ہم نے دو کروڑ بلیاں دیکھیں۔ دوسرے نے کہا۔ واہ کہیں دیکھی نہ ہوں کہا اچھا دو کروڑ نہیں تو چار لاکھ بیٹھک تھیں کہا اچھا قسم کھاؤ انھوں نے کہا قسم کھا کے کہیں تو پھر پچاس کروڑ دیکھیں۔ کہا اچھا ایمان سے کہو اس نے جواب دیا۔ ایمان کی نہ کہو۔ ایمان سے پوچھتے ہو تو دو لاکھ کروڑ بلیاں دیکھیں اور جو صاف صاف پوچھو تو دو بلیاں تھیں۔ دوسرے بھانڈ نے کہا اب ہم کو یقین نہیں کہ دو بھی دیکھی ہوں سچ سچ بتاؤ۔ اس نے کہا بھائی جان سچ سچ تو یہ ہے کہ پتا کھڑکا اور بندہ سرکا خدا جانے کوئی بلی بھی تھی یا نہیں۔
حشمت بہو : مثلیں کوئی ان سے سن لے۔ ہزار دو ہزار۔
آسمان جاہ : اے جانی بیگم کو بلواؤ۔ ان کے بغیر سونا ہے۔
حشمت بہو : ہاں تمھاری ان کی خوب جوڑ ہے۔
آسمان جاہ : ہی ہے۔ سہی ہے۔ جوڑ میں کیا شک ہے۔
حشمت بہو : اچھا جب جانیں کہ وہ تم سے بند ہو جائیں۔
آسمان جاہ : واہ۔ بہنوں بہنوں میں پھوٹ ڈالو گی۔

حشمت بہو : نہیں ہنسی ہنسی میں۔ آپس کے طور پر بات چیت ہو۔

آسمان جاہ : وہ تو ہماری بہن ہیں جتنی ہم سے ان سے محبت ہے اتنی ہیں اپنی بہنوں اور کنواری بہنوں سے محبت نہیں ہے۔

ثریا بیگم : (آہستہ سے) جوڑ اچھی ہے۔

آسمان جاہ : اخاہ آپ بھی بولیں۔ آپ کو بھی ہمارے لئے زبان آئی۔ خدا کی شان رو۔رو۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ جانی بیگم چھم چھم کرتی ہوئی آئیں۔ آسمان جاہ نے جھپٹ کے گلے لگا لیا۔

آسمان جاہ : یادش بخیر۔ ابھی تمھارا ہی تذکرہ تھا۔

جانی بیگم : ہم نے تو تمھارے ہاں مہری بھیجی کہ جانا تو ادھر سے ہوتی جانا ہم بھی چلیں گے۔ اس نے کہا وہ تو چلی گئیں۔

آسمان جاہ : اور ہم سمجھتے تھے کہ تم آ گئی ہو گی۔

جانی بیگم : اب روزں کے دن قریب ہیں۔

آسمان جاہ : ہم کو کیا۔

ہم رند پریشاں ہیں ماہِ رمضان ہے
چمکی ہوئی ان روزوں میں واعظ کی دکان ہے

جانی بیگم : ہاں ہم تو تیس روزے رکھتے ہیں۔

آسمان جاہ : اور عید کے دن۔

جانی بیگم : واہ عید کے دن! بہت دن سے، شعر نہیں سنائیں بہن۔

آسمان جاہ : کس کو سنائیں یہاں اتی بیٹھی ہیں کسی کو تمیز ہے؟ سب جاہل مورکھ ان پڑھ۔ تم سنو تو سنائیں۔

جھولا جھلوائیں گے ہم جا کے چمن میں تجھ کو
رُت کہیں آئے تو اے حور لقا ساون کی

یہ گانے کی غزل ہے۔

ساقی کی بھول چوک سے ہم رند لُٹ گئے
جامِ جہاں نما سے جو ساغر بدل گیا

پھر گا کر! جامِ جہاں نما سے جو ساغر بدل گیا۔

ساقیا نوروز ہے سامان کر	روح پر جمشید کے احسان کر
رحم کر میرے گناہوں پر نہ جا	اے صنم اپنی طرف تو دھیان کر
یا الٰہا اپنا جوشِ عشق دے	قطرۂ ناچیز کو طوفان کر

ایسے خوش طالع کہاں سے لائیے مسکرا دے یار کہنا مان کر
بندہ خانے میں کرم فرمائیے اے صنم اپنے خدا کو مان کر
موج کوثر ایک اک مصرع ہوا
یہ صفا بیدا کی باتیں چھان کر

جانی بیگم: ہم نے سنا ہے کہ دولھا ہزار دو ہزار میں ایک جوان ہے۔

آسمان جاہ: دولھا دولھن چندے آفتاب، چندے مہتاب ہیں۔ دونوں جوان، دونوں حور پیکر، دونوں سیم بدن، ہم سے میاں میاں بدلیں تو ہم بدل ڈالیں۔ کیوں ثریا بیگم بدلتی ہو۔

جانی بیگم: (مسکرا کر) اوئی۔ میاں نہ ہوئے لوہا ہوئے کہ چرڑوے والے کے چرڑووں سے بدل ڈالو۔ جو تمھارے میاں سن لیں اور تم کو بدل ڈالیں تو کیسی ہو۔

آسمان جاہ: اب اس شہر میں اور تو کوئی ایسی خوبصورت نہیں ہے کہ جس سے وہ ہم کو بدل ڈالیں، ہاں ایک ہو تو تم ہو تمھیں دیکھ پائیں تو بیشک ریجھ جائیں۔

حشمت بہو: خوب کہی۔ اچھا جواب دیا۔

ثریا بیگم: اب تو جانی بیگم ذرا جھیپیں۔ ادھر دیکھنا۔

حشمت بہو: اب بہت غیرت نہ دلواؤ۔

گلشن آرا: سچ مچ جھیپ ہی گئیں۔ ذری گردن اونچی کرو منھ کی کھائی نہ۔ خوب شد۔

حشمت بہو: میں بہت ہی خوش ہوئی۔ بہت چھیڑا کرتی تھیں۔

آسمان جاہ: (جانی بیگم کو گلے لگا کر) اے واہ سب نے مل کے بنا لیا۔ ہماری بہن کو سنو بہن شعر سنو۔

وہ یکا یک باغ میں پہنچے جو اٹھلاتے ہوئے
کبک بھاگے سامنے سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

جانی بیگم کو سب نے مل کے بنا لیا اور کئی فرمائشی قہقہے پڑے، تو لال لال گورے گورے گال تمتمانے لگے۔ شوخ تو انتہا سے زیادہ تھی۔ بات ٹال دی اور خود بھی مسکرانے لگی۔ مگر کئی گھڑی تک بہی دل لگی رہی۔ ایک نے پوچھا۔ کیوں جانی بیگم بھلا اگر ان کے میاں ریجھیں تو تم سے ان سے بنے یا نہ بنے۔ دوسری نے کہا یہ آسمان جاہ سے پوچھو۔ کیوں بی تم سے میاں سے سچ چلے یا نہ چلے۔ تیسری جھک کر بولی دال میں جوتی بٹے، جانی بیگم جو مکھی لڑتی تھی۔ آسمان جاہ نے کہا یہ وقت غنیمت جانو، بہن سائیں سو کھیل۔

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

نگارے چابکے شوخے پری وش

حریفے مہوشے ترکے قبا پوش

یعنی ناظورۂ گلپوش بلائے جان ستم کوش، غیرتِ مہر و ماہ نواب آسمان جاہ اور ان کی منھ بولی بہن یانیِ ستم، جانی بیگم باہم چہل کر رہی تھیں کہ ایک اور نو خیز دگلر خسار بیگم صاحب تشریف لائیں۔ آسمان جاہ نے دیکھتے ہی کہا اے لومنڈی بیگم بھی آگئیں۔ اتنا کہنا تھا کہ قہقہہ پڑا، اور وہ بیچاری کسی قدر شرما گئی۔ جانی بیگم بولیں بہن اس وقت تو انھوں نے خطاب بے طور دیا ان بیگم صاحب کا نام امراؤ بیگم تھا مگر ڈنگو فیور نے ان کو اس قدر ستایا کہ برس بھر تک علیل رہیں۔ اور بال بھی جابجا سے جھڑ گئے تھے مگر جس روز ثریا بیگم کے ہاں آئیں خاصی اچھی تھیں، سر کے بال بدستور حالتِ اصلی پر، ہاں چوٹی ذرا چھوٹی تھی۔ آسمان جاہ نے ان کے آتے ہی آوازہ چست کیا۔

حشمت بہو : آتے دیر نہیں کہ انھوں نے دل لگی شروع کر دی۔ اب ان کے منھ کون لگے۔ بڑی ایک ہو۔

آسمان جاہ : آخر ہم نے کہا کیا۔ کوسا۔ گالی دی۔ برا بھلا کہا۔ منڈی بیگم نہیں لنڈوری خانم سہی۔

جانی بیگم : (ہنس کر) یہ اس سے بھی اچھا نام ہے۔ لنڈوری خانم۔

حشمت بہو : ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ دونوں ایک سی۔

بیگما بیگم : آسمان جاہ گلابو ہیں، تو جانی بیگم شتابو۔

جانی بیگم : جنیا لال ملوں گی۔ ہم شتابو۔ یہ گلابو۔ اور تم۔

آسمان جاہ : یہ مہتابو۔ بولو، بی بی مہتابو کچھ سر سے کھیلو، کچھ منہ سے بولو، اے ہے بڑی ختیان ہیں۔ اوںھ۔ اُف۔

جانی بیگم : اس ڈنگو کو خدا غارت کرے، امراؤ بیگم کا جوبن لوٹ لیا۔

بہ بوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید ز تابِ جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم

جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

امراؤ بیگم : کسی ایسے کو چھیڑو، جو جواب دے۔ ہم نے تو ایسی ہنسی کسی سے آج تک کی ہی نہیں۔ ہم کو جا ہو جتنا بنا لو۔ دل کھول کے ہنسو۔

جانی بیگم : اب ہاں بنے ہوئے کو بنانا۔ یہ تو بنی بنائی ہیں۔ ان سے کسی شریف آدمی سے ملاقات ہے نہیں۔ جب ملیں گی کنجڑنوں، چمارنوں، بھٹیاریوں سے۔ ہر مزی کسگرن کو انھوں نے وہ گانا بتایا ہے۔ ابھی مہربان مالنیں،

کہ برادری کی نیچ قوم عورتیں آئیں تو پھر دیکھو کیسا پھنکارتی ہیں۔ بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں میں کبھی بیٹھی ہوں تو بات کرتے۔

امراؤ بیگم بڑی ذی شعور اور ستعلیق مزاج تھیں۔ اس کا کچھ جواب نہ دیا خاموش ہو رہیں۔ ثریا بیگم نے اپنے پاس بلایا اشارے سے قریب بٹھایا اور کان میں کہا ان کی باتوں کا بُرا نہ ماننا یہ جب سے آئی ہیں سب پر آوازے کس رہی ہیں۔ آسمان جاہ تو تھیں ہی، جانی بیگم کا آنا جیسے سونے پر سہاگا، ایک کڑوا کریلا، دوسرے نیم چڑھا۔ امراؤ بیگم تو ہیں یہ اس لائق نہیں کہ ان سے بات کرے یا صحبت میں بٹھائے۔ منڈی بیگم لنڈوری خانم۔ یہ تو ان کی تقریر ہے۔ ثریا بیگم نے پھر سمجھایا کہ اب جانے دو، ان دونوں کے منہ نہ لگو۔

آسمان جاہ چند دنوں سے تاڑ گئی کہ امراؤ بیگم ہم سے خفا ہیں۔ ہاتھ جوڑے اور مسکرا کر کہا۔ بہن بُرا تو نہیں مانا۔ آؤ گلے مل لیں یہ کہہ کر امراؤ بیگم کو گلے لگایا اور یہ شعر زبان پر لائیں۔

شکر ایزد کہ میانِ من و تو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند

حالاتِ حرب

اب خواجہ بدیع الزماں صاحب کا حال سنیئے۔ ان کو فوج والوں نے چھوڑ دیا تھا۔ پاگل سمجھ کر سب کی رائے قرار پائی کہ ان کو رہا کر دو۔ یہ ایک روسی سپاہی کے ساتھ روانہ ہوئے۔

آرمینیا میں بڑی جنگ ہوئی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں، اور میدانوں میں اس قدر سردی تھی اور اس شدت سے برف پڑتی تھی کہ الامان، انتہا یہ کہ مئی کے مہینے تک سڑکوں پر برف نظر آتی تھی اور چلنا سخت دشوار ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن تھا۔ روسی تاہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ بکمال شوق منتظر تھے کہ کہیں موسم زمستان جائے تو جان میں جان آئے۔ ادھر ترک اُدھر روسی، تبدیل فصل کی خواہش کرتے تھے۔ ترک کہتے ہیں کہ روسیوں نے اس عرصے میں بڑی بڑی بدعتیں کیں، اور روسیوں کا مقولہ ہے کہ جب ترکوں کی سپاہ نے دیکھا کہ برف باری کے سبب سے جنگی کارروائی اچھی طرح نہیں ہو سکتی، تو ظلم و تعدی شروع کر دی۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو بُرا کہتے ہیں اور تہمت تراشتے ہیں۔
خوجی: بھلا ترکوں نے کسی مقام پر جرأت بھی ظاہر کی۔
سپاہی: کئی لڑائیوں میں۔ آرمینیا جنگ میں ترکوں نے بڑی جوانمردی کے ساتھ کارروائی کی۔ ایسی مستعدی دکھائی کہ روسی دنگ ہو گئے۔ اس برف باری اور سردی کی حالت میں غنیم کے ملک میں جانے کا قصد کیا اور بندوبست

کر لیا کہ آرمینیا کو روسیوں سے باآسانی چھین لیں۔ اس کے علاوہ کچھ فوج اس عجلت کے ساتھ فوج روس کے عقب میں بھیجی کہ روسی دو طرف سے گھر گئے۔

خوجی: بھلا ترک ورغلاتے بھی ہیں یا نہیں ورغلاتے۔

سپاہی: ابھی چند ہی مہینے ہوئے کہ ترکوں نے ہزاروں آدمی خاص اسی کام کے لئے مقرر کیے تھے کہ مختلف مقامات کی رعایا کو بہکائیں۔ چنانچہ کوہِ قاف کے پاس ایک مقام ہے ابھیسیا۔ وہاں سرکیسیا کے کچھ آدمی بھیجے۔

خوجی: شکر خدا ہزار شکر خدا۔ اب ہم بہت خوش ہوئے۔

روسی: اتنی سی جان گز بھر کی زبان۔ قضا سر پر کھیلتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ ذکر۔ شکر خدا۔

خوجی: بھائی حبِّ وطن کو کوئی کیا کرے۔ انصاف کیجیے۔

روسی: اس میں شک نہیں کہ اس ملک کی طرف تم لوگوں نے بڑا جبر کیا تھا جس کے سبب سے رعایا کے دل برانگیختہ ہو گئے تھے۔ سرکیشیا والوں نے جو پرچک دی تو اور بھی رعایا بھڑکی، اور اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ روسیوں سے مقابلہ کرے۔

ابھیسیا والے بالکل دیوانے اور وحوش ہیں، اور مثل مشہور ہے کہ دیوانہ را ہوئے بس است۔ ان کا ملک بحر اسود، مشرقی ساحل، اور ملک منگریلیا کے شمال میں واقع ہے، یہ لوگ مسلمان ہیں۔ یہ ملاؤں نے وعظ دے دے کر ان کو اور بھی بھڑکایا سب کے سب بگڑ اٹھے اور تمام ملک میں منادی ہو گئی کہ جتنے آدمی ہتھیار اٹھا سکتے ہیں، وہ سب آئیں۔ مہینوں یہی کیفیت رہی۔ روسیوں کو مجبور ہو کر کوہِ قاف کے ملکوں میں فوج کثیر رکھنی پڑی مگر اہل ابھیسیا کی بغاوت سے جنگ پر ذرا بھی اثر نہ پہنچا۔ ترکوں کو کچھ اس سے مدد نہیں ملی۔ مگر تشفی اتنی ہوئی کہ اس کارروائی میں کامیاب ہوئے۔

خوجی: تم کس جنگ میں زخمی ہوئے تھے اور کتنے دن ہوئے؟

سپاہی: 26۔ اپریل کو جنگ باطوم میں زخمی ہوئے۔

خوجی: کتنے دن جنگ رہی تھی۔ باطوم تو قلعہ ہے؟

سپاہی: ہاں۔ 25۔ اور 26۔ اپریل کو جنگ رہی ایک بار روسیوں نے اس قلعہ کے قریب شکست پائی۔ اس کے بعد روسیوں کا ایک کالم آگے بڑھا اس کالم کے ساتھ بے شمار سوار تھے اور کوہی توپخانہ۔ یہ لوگ قلعہ اردہان کی طرف چلے، یہ قلعہ قرص کی سڑک پر واقع ہے۔ 29۔ اپریل کو آرطوین پر روسیوں کا قبضہ ہوا۔

خوجی: باطوم سے بہت فاصلہ دراز پر واقع ہے۔

سپاہی: نہیں بہت ہو بہت ہو کوئی چالیس میل۔ بس اور کیا، خیر صاحب اس کے بعد ہم نے قرص کا محاصرہ

کرلیا۔سپہ سالار عساکر ترک متعینۂ ایشیا کو جو خبر ہوئی تو فوراً ہزار ہا آدمی لے کر چل کھڑا ہوا۔ 29۔ اور 30۔ اپریل کو خوب جنگ ہوئی۔ لیکن چونکہ روسی پہلے سے سب بندوبست کرچکے تھے۔ لہٰذا سپہ سالار نے شکست پائی۔ اب سنیے کہ پہلی مئی کو بیازد جو کوہ ارارات کے دامن میں واقع ہے اس پر روسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس مقام پر ترکوں نے مقابلہ کیا۔ واللہ اعلم کیا مصلحت تھی۔

خوجی: اب اس وقت میں ترکوں کی سپاہ کس مقام پر تھی۔

سپاہی: کچھ ارض روم میں داہنی جانب کی فوج، اور کچھ باطوم میں یہ وسط کا کالم تھا، اور سکم کالی، واقع ابھیسیا میں مشرقی حصہ فوج تھا اس سے ان کا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری آمدورفت اور خط وکتابت مسدود ہوگئی۔ جائیں تو کدھر جائیں۔ ارض روم کی طرف سے ڈاک جا نہیں سکتی باطوم خالی نہیں۔ اور ادھر ابھیسیا کی طرف آتش بغاوت مشتعل۔ اب روسیوں نے یہ تدبیر کی کہ مغرب کی جانب سے بڑھنا شروع کیا اور باطوم پر حملے کا پھر قصد ہوا۔ پہلی بار تو شکست پائی تھی۔

خوجی: اور باطوم پر قبضہ جو ہوگیا۔ پھر حملہ کیسا۔

سپاہی: باطوم پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔ باطوم تو ابھی تک ترکوں کے ہی پاس تھا ایک سمندر پوکسا میں۔ اس کے ساحل پر باطوم واقع ہے۔ ۱۱ مئی کو روسیوں نے فوج بھیجی کہ باطوم کا محاصرہ کرے۔ ترکوں کی سپاہ جرار کہیں زیادہ تھی۔ یہ فوج کوہ خط ربوبی پر پرے جمائے آمادۂ جنگ کھڑی تھی۔ جنگ چھڑی تو ترکوں نے ایسی داد شجاعت دی کہ ہم لوگوں تک نے تعریف کی۔ روسیوں کا نقصان عظیم ہوا۔ گو بڑی دیر تک مقابلہ کرتے رہے، تاہم مجبور ہو کر بھاگنا پڑا۔ ترکوں نے یہ دانائی کی تھی کہ دمدموں کے نیچے سے گولے چلاتے تھے۔ یہ جنگ ترکوں کی دلیری کی یادگار رہے گی۔ روسیوں نے اس جنگ میں کئی دھوکے کھائے۔ افسروں کی عقل نے کوتاہی کی۔ لہٰذا ہارنا پڑا۔

خوجی: (اپنے دل میں) خدا کرے ہر میدان میں ایسا ہی ہو۔

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

ہم لوگوں سے یہ شقی بھڑے ہیں۔ خدا نے چاہا تو ایک ایک گیدی کی لاش پھڑک رہی ہوگی۔ ہمارا مقابلہ کرنا دل لگی نہیں ہے کہ جو چاہے منہ چڑھے

باصاف دل مجادلہ باخویش دشمنی ست
ہر کو کشند بر آئنہ خنجر، بخود کشد

سپاہی: اس کے بعد پھر ترکوں نے بلکہ ترکی افسروں نے اچھی کارروائی نہ کی۔ روسیوں کی فوج ادھر ادھر سے

برابر ملتی چلی گئی۔

خوجی : ابھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نتیجہ جنگ کیا ہوگا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

خدا کو سونپا وہی بیڑا پار کرے گا۔ اللہ مالک ہے۔

سپاہی : قلعہ اردہان کے آخری حملہ میں افسر اعلیٰ بھاگ گیا اور ماتحت افسر اس کے ساتھ بھاگے۔ اب فوج کس کی رائے کے مطابق کارروائی کرے۔ فوج نے دیکھا کہ سب بھاگے جاتے ہیں تو سپاہی اور سوار بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ سب کے سب ہر۔

خوجی : ہشت گیدی۔ سب غلط۔ ترک بھاگنے والے جوان نہیں ہیں۔ جان پر کھیل جانے والے لوگ ہیں۔ ایسے ویسے نہیں ہیں۔

سپاہی : ہاں سچ ہے مگر شاید افسر اعلیٰ ملے ہوں۔ سازش کرلی ہو۔ رشوت لی ہو۔ حضرت سلطان کو جب خبر ہوئی تو حکم نافذ فرمایا کہ افسر اعلیٰ پر کورٹ مارشل میں مقدمہ دائر ہو۔ کل ترکی کیا افسر اور کیا پیادے ادنیٰ سے اعلیٰ تک سب آگ ہوگئے، کہ ترکوں کا نام اس کمبخت نے بد کیا اور حضرت سلطان المعظم کی دلی خواہش یہ تھی کہ افسر اعلیٰ جو رنگ کیا جائے مگر آخر کار معلوم ہوا کہ روسی پچاس ہزار آدمی لے کر آئے تھے اور ترکوں کی طرف صرف دس ہزار آدمی تھے۔ قلعہ کی دیواریں عرصہ دراز سے بالکل خراب حالت میں تھیں۔ روسیوں نے جو گولے اتارنے شروع کیے تو دیواریں اور بھی منشق ہوگئیں پھر بھلا کیونکر مقابلہ ہوسکتا۔ افسر اعلیٰ کو بھاگتے ہی بن پڑی، اور اردہان روسیوں کے حیطۂ اقتدار میں آگیا۔ اس شکست سے ترکوں کا بڑا نقصان ہوا۔ اردہاں کا قلعہ بڑا مشہور قلعہ تھا۔

خوجی : اور دو ہزار قلعے ابھی تک جو ترکوں کے پاس ہیں۔

سپاہی : کچھ لبنت کی بھی خبر ہے۔ اب چل چلاؤ ہے۔

خوجی : شکست اور فتح منجانب خدا ہے۔ مگر مقابلے میں تو ہم بھی کبھی دب کے نہیں رہے، ہم اور کسی سے دب چلیں کیا مجال۔ ای لاحول مگر۔

شاد باش اے دل کہ فردا روز بازار جزا

مژدۂ قتل است گرچہ وعدۂ دیدار نیست

اب آزاد کجا اور خواجہ بدیع کجا۔ خدا جانے آزاد کجا رفتہ و مرا ایں گیدی بہادر روس کجا می برند۔ دیدہ باید۔

خدا مالک و ناصر است۔

سپاہی: قلعہ اردہان کی فتح سے روسیوں کا فائدہ کثیر ہوا کہ میں آدمیوں کو اس قلعے کے راستے جن حفاظت کیلیے مقرر کیا تھا، وہ اب ان سے ہٹا دیے گئے اور ان سے جنگی کام لیا گیا۔ اب یہ لوگ ارضِ روم کی سمت روانہ ہوئے مئی کے اواخر میں مقام اٹلی تک داخل ہوئے۔ جو ارض روم اور اردہان کے درمیان میں واقع ہے، اور ادھر قرص پر حملہ ہوتا تھا۔ روسیوں کے بہت آدمی اس جنگ میں ضائع ہوئے اور ترک بہت کم۔

خوجی: شکر خدا بھیا ہزار شکر خدا۔ ان گیدیوں سے خدا سمجھے۔

سپاہی: مگر انجام بخیر نہیں، اور مقدم انجام ہی پر نظر ہونا چاہیے۔ ابتدا اچھی ہوئی کو کیا انتہا اچھی ہو تو سبحان اللہ۔

خوجی: نادان ہو، ارے پاگل جس کی ابتدا اچھی اس کی انتہا بھی اچھی ہوگی سمجھے اور ابھی لڑائی کا کون ٹھکانا۔

سپاہی: قبرص کے محاصرے میں ترک ہمارا کچھ بھی نہ کر سکے۔

خوجی بکتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ قبرص پر کتنے آدمیوں سے تم نے حملہ کیا تھا، اسی ہزار آدمی تمھارے ساتھ تھا اور غضب خدا کا دو سو چالیس توپیں کچھ ٹھکانا ہے۔ ۳۰۔ اپریل کو ہمارے سپہ سالار نے وہاں سے کوچ کر دیا، اور کیا کرتے۔ وہاں رہ کے بناتے کیا۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جا ہا سپر بایدا نداختن

جناب چچا سعدی فرما گئے ہیں کہ ہر مقام پر گھوڑے دوڑانے والا منھ کے بل گرتا ہے اور ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اب ہم کو اگر فکر ہے تو یہ ہے کہ آزاد پاشا سے ملاقات ہو ان کی مفارقت کے صدمے سے کمال رنج ہے۔

از غم خویش چناں شیفتہ کردی بازم   کز خیالِ تو بخود نیز نمی پردازم

ہر کہ او نالۂ شبگیر من آگاہ شود   ہیچ شک نیست کہ چوں روز بد اندازم

گفتہ بودی کہ خبر دہ کہ بجرم چونی   آنچنانم کہ بہ بیسنی و ندانی بازم

اگر از دام تو خود نیز خلاصم بخشی

ہم بخاک سر کوئے تو بود بر دازم

خوجی نے دریافت کیا کہ کبھی ترکی نے بھی فتح پائی یا نہیں۔ ہم سے وہ قصے بیان کرو جن میں ترکوں نے فتح پائی ہو۔

سپاہی نے کہا سکم کھالی میں ترکوں نے ۱۴۔ مئی کو فتح پائی۔ چار جنگی جہاز، چار بڑی بڑی کشتیاں جن پر اسباب اور سامان رسد اور گولہ بارود تھا اور کئی توپ۔ دس ہزار آدمی، پانچ کوہی باٹریاں، اور پچاس ہزار رفل، ۱۳۔ مئی کو یہ سب جہاز مع سامان کے ابھسیا کے قریب آئے اور ساحل پر اترنے لگے۔ روسی سپہ سالار متعینہ لشکر بھیجا گیا کہ ترکوں سے

مقابلہ کرے، اور ہٹا دے۔ ترکوں نے اس مقام پر غنیم کو پھر مغالطہ دیا۔ اور مشہور کر دیا کہ جو ترکی فوج جہازوں سے اتری تھی، وہ واپس چلی گئی۔ روسی اس دھوکے میں رہے۔ صبح کو ترکوں کی فوج ظفر موج سکم کالی کے سامنے نظر آئی۔ روسیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شہر کا محاصرہ ہوگیا، اور ترکوں کے قبضہ میں آیا۔

اب سنیئے کہ ایک تو ابھیسیا والے یوں ہی روسیوں سے سخت ناراض تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ سرکیشیا والوں نے ان کو اور بھی بھڑکایا اور اب ترکوں نے سکم کالی پر قبضہ کر لیا تو ان کو خوب موقع ملا کہ ابھیسیا والوں کو بھڑکائیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ چونکہ روسی اس ملک میں کئی مقام پر شکست پا چکے تھے، لہٰذا ان کی ہوا نہ بندھی اور جما جمایا رنگ پھیکا ہوگیا۔ ہاں ترکوں کی البتہ دھاک تھی جس طرف ترک نکل جاتے تھے اس طرف لوگ خوشی ظاہر کرتے اور شادیانے بجاتے تھے۔

خوجی نے کہا شکر ہے شکر ہے۔ ہم خوش ہوئے، روم معشوق ہے اور میں عاشق زار۔ خدا اس معشوق کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔

حسن تو ہمیشہ در فزوں باد	رویت ہمہ سال لالہ گوں باد
اندر سرِ من ہوائے عشقت	ہر روز کہ ہست در فزوں باد
قدِ ہمہ دلبرانِ عالم	در خدمتِ قامتت نگوں باد
ہر سرو کہ در چمن بر آمد	پیش الفِ قدت چو نون باد

چشم تو ز بہر دلربائی
در گردن سحر ذو فنون باد

آمیں آمیں، یا خدا ہم غریبوں کی سن لے۔

اس گفتگو کے بعد جناب خواجہ بدیع الزماں صاحب اور وہ سپاہی دونوں سو رہے۔ صبح کو اٹھ کر قافلے کے ساتھ خواجہ صاحب بہادر روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس درجہ سردی کھائی کہ اینٹھ گئے۔ دانت بجنے لگے کہا یارو آج ہم پر نئی مصیبت پڑی۔ ہندوستان میں مزے سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شیطان نے انگلی دکھائی، اور شامتِ اعمال یہاں لائی۔ اب ہم کس کے سامنے روئیں، اور کس سے دردِ دل کہیں، کون داد دے گا۔ افسوس صد افسوس۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و من بدنام عشق
داوری دارم بسے یارب کرا داور کنم

خیر۔ ع برسر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد۔ اللہ مالک ہے۔

خوجی کی نئی ترانیاں

حماقت نشاں، جہلا کی روح رواں، میاں خواجہ بدیع الزماں، صاحب بدیع علیہ الرحمۃ والغفران، نور کے تڑکے روسی سپاہی کے ساتھ روانہ ہوئے تو سردی نے ایسا دق کیا کہ ٹھنکر بن گئے۔ روح تک ٹھٹھری جاتی تھی۔ دانت بجنے لگے جھلا کر اپنے ساتھی سے کہا۔ یار کچھ نہ پوچھو، بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ جان عذاب میں ہے۔ کس مزے سے ہندوستان میں چین کرتے تھے۔ نواب صاحب کی بدولت بادشاہ بنے پھرتے تھے۔

ع نے غم زردنے غم کالا

صبح سے دس بجے تک چانڈو کے چھینٹے اڑائے۔ گیارہ بجے دستر خوان بچھا۔ بندۂ درگاہ بھی پہنچے۔ پلاؤ، زعفرانی کھیر، بالائی، قند، قند کے چاول، خوب دل کھول کے چکھے۔ صراحی کا جھلا پانی پیا۔ گھنٹے دو گھنٹے فقرہ بازی کی پڑ کے سو رہے تو چار بجے کی خبر لائے۔ چار بجے سے افیم گھلی، چسکی لگائی جاتی ہے۔ پونڈے سامنے رکھے ہیں، چھیلا اور آہستہ آہستہ گنڈیریاں چوسیں، اور باتیں ہونے لگیں۔ نواب صاحب برآمد ہوئے۔ مصاحب اور رفقا راستادہ ہو کر آداب بجالائے۔ سرکار نے جواب دیا۔ مسند تکیہ لگا ہوا ہے۔ شاہی سامان مہیا۔ گفتگو شروع ہوئی تو کسی نفیس نفیس باتیں ہونے لگیں کہ میں کیا بیان کروں اور ہندوستان کے رئیس یہاں دیکھنے میں کہاں آتے ہیں۔ قسطنطنیہ میں جا کے ہر مرزجی کی کوٹھی میں ٹکے۔ کروڑپتی آدمی مگر سوداگر۔ سوداگری براد ھار کھائے بیٹھے ہیں، اور ہمارے ملک میں نواب زادے وثیقہ دار امرار روسا چاہے بھیک مانگیں مگر تجارت نہ کرینگے اور بھائی جان ان کا سا دل تو کسی کا ہو۔ ایک دن کا تذکرہ ہے کہ ہمارے نواب صاحب ناچ دیکھ رہے تھے غنچہ کھلا ہوا۔ آدمی ٹھہرے شوقین، اور شوقین بھی کیسے کہ سب سے نمبر بڑھے ہوئے اور رئیس اعظم یہ روپے والے ایک لڑکی شوخ و شنگ پر ریجھے تو حکم دیا کہ آج جس قدر شیشہ آلات اس کمرے میں اس وقت موجود ہے اٹھا دو۔ واہ ری ہمت۔ اللہ ری شان۔ اُف رے دل۔ یہاں اول تو شیشہ آلات کس کے ہاں ہے اور پھر اگر ہے بھی تو بے کار۔ دینے کے نام کبھی دروازے کی کنڈی بھی نہ دیں۔ ہائے واللہ کتنی کمی ہے۔ اے صاحب وہاں کے ایک ادنیٰ کہار نے بیس لاکھ کی دارو اپنے برادری والوں کو ایک رات میں پلادی۔ یہاں جس کے پاس بیس لاکھ ہوں، تو بھس بھر لیں۔ اور دس برس تک بیچا کریں۔ جی ایسے وضعدار۔ ماشاء اللہ۔ غور کیجیے ایک بیرا اور یہ دل کہ بیس لاکھ کی دارو برادری والوں کو پلادی۔ اللہ اللہ۔ تمام ہندوستان کے کہار جمع تھے۔ ڈیریا۔ گرڈیا۔ پسکونا۔ کبوٹ۔ تراہے۔ رواتی۔ بوٹ۔ بھوٹر۔ بیٹھا۔ کھروا۔ ودیتا۔

ملک کے کہار کجیاں لیے ہوئے دارو پی رہے ہیں اتنے میں راجہ مہرانے کہا بھائی پنچوں مٹی کی کجیاں پھینک

دو۔ سونے چاندی کی کجیوں میں پیو۔ پھر ایک بوڑھے خرانٹ کہار نے کہا، نا بھائی بجوں اپنی مرجاد نہ چھوڑب۔ ہمرے باپ بھی کجی پیہیں۔ ہمرے دادا پیہیں۔ ہمرے کاکا پیہیں۔ اپنی مرجاد نہ چھوڑب، راجہ مہرا نے فوراً سونے چاندی کی پیالیاں منگوائیں۔ اور فقیروں کو تقسیم کردیں۔ دس ہزار پیالی چاندی کی تھی، اور دس ہزار سونے کی پی پی کر کہاروں نے وہ دھاند مچائی کہ جہاں پناہ تک خبر پہنچی۔ جب سُنا کہ راجہ مہرا نے اپنی برادری کے لوگوں کو نیوتہ دیا ہے تو بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ جتنے کہار آئے ہیں سب کو ایک ایک لہنگا دلوایا جائے، چار پانچ روز تک سلطانِ عالم کہاروں کا ناچ دیکھا کیے۔ ہڑک بجتے تھے۔ دے دے ماکو، چلم تمباکو، لال چنری کی پھریا اور لال ہی لہنگا پہن کر ایک امرد کہار تھرکنے لگا۔ تو جہاں پناہ بہت خوش ہوئے۔ یہ اگلے وقتوں کے ذکر ہیں بھائی جان اب اس گئی گزری حالت پر بھی جو بات وہاں ہے وہ کہیں نہیں ہے۔ ہاں یہ تو بھول ہی گیا تھا۔ ہمارے نواب صاحب نے کمرے بھر کے جھاڑ اس ثبت رنگیں ادا کے حوالے کردیے۔ ایک ایک جھاڑ پچیس پچیس ہزار کا، چالیس چالیس ہزار کا، پچاس پچاس ہزار کا، اور دو جھاڑ لاکھ لاکھ روپے کے، زرد، سرخ، گلابی، بسنتی، زعفرانی، دھانی، بیجنی اور قرمزی۔ ایک سوا ایک ــــ بتی کا جناب ریل کی لال لٹینیں دیکھ کے اب لوگ عش عش کرتے ہیں کہ واہ واہ سبز رنگ کتنا اچھا۔ سُرخ رنگ کس قدر شوخ ہے، اور یہاں کوئی رنگ جنچتا ہی نہیں تو جنچے کیا۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اب سُنیے کہ حساب لگاتا ہوں تو اس کمرے کا شیشہ آلات گیارہ لاکھ کا۔ خیال کیجیے لاکھ دو لاکھ نہیں۔ گیارہ لاکھ۔ ارے میاں گیارہ لاکھ۔ اللہ اللہ۔ اللہ اللہ۔ اور نواب صاحب کی چتون پر میل نہیں۔ وہی تیور گویا جیسے دس پانچ روپے کسی کو دے ڈالے۔ جناب۔ دل لگی نہیں ہے۔ کوئی اس دل کا ہو تو لے۔ بہت مشکل ہے۔

سنیے دھنیا مہری کی ہمت کا حال سُناؤں۔ قسم خدا کی بھڑک جاؤ۔ ایک دن خبر ہوئی اور خبر ہوئی کیا معنی، منادی ہوئی۔ شتر سوار، سانڈنی سوار، دوڑائے گئے کہ کل شہر میں حضرت قدر قدرت سلطانِ عالم خلد اللہ ملکہ و دولت کی سواری نکلے گی۔ آئینہ بندی ہو رہی ہے۔ شام کو دو گھڑی دن رہے۔ سواری مثل بادِ بہاری نکلی۔ نقیب ساتھ آواز دیتے جاتے تھے۔ دھنیا مہری بھی جھکتی ہوئی نکلیں، اور ایک کمرے پر کھڑے ہو کر لوہے کا توا جہاں پناہ کو دکھایا فوراً ہاتھی رُکوا لیا، پوچھا یہ کیا بات، اس کے کیا معنی ہیں؟ دھنیا مہری نے کہا میں نے سُنا تھا کہ حضور جہاں پناہ پارس ہیں۔ سوچی کہ لوہے کا توا دکھاؤں تو سونے کا ہو جائے گا۔ اسی لیے یہاں آن کے کھڑی ہو گئی۔ جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اس کو ساتھ لاؤ۔ جی۔ یہ نوازش۔ کہا۔ اگر تیرا جی چاہے تو محل بنا دوں یا کہے تو جاگیر دوں۔ وہ بولی مجھے تو اپنا مہرا ہی پسند ہے، مجھے جاگیر دیجیے۔ جہاں پناہ نے دوسرے روز مرزا قنبر علی بیگ رسالدار کو سوار لے کر بھیجا کہ جا کے ٹھاکر راج سنگھ کو مار کے نکال دو، اور اس کے گاؤں پر اس مہری کو قبضہ دلوا دو۔

رسالدار صاحب اس ٹھاکر سے خوش تھے اس کو تو چھوڑ دیا۔ دوسرے ٹھاکر کے گاؤں پر چڑھ دوڑے۔ مار کر نکال دیا اور دُن سے دھنیا مہری کو قبضہ مل گیا۔ اب اور دل لگی دیکھیے، وہ ٹھاکر اتفاق سے کہیں بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔ اتفاق ہی تو۔ ورنہ اچھے اچھے ٹاپا کرتے ہیں۔ وہاں تک گزر ہونا کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔

ع بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

جہاں پناہ نے پوچھا تم کون۔ کہا حضور میں ٹھاکر رگھنا تھ سنگھ ہوں، رسالدار نے میرا گاؤں لوٹ لیا اور مجھ کو نکال دیا۔ اب دھنیا مہری کا قبضہ ہے۔ جہاں پناہ بد دماغ ہو گئے۔ فرمایا۔ کیوں قنبر علی کیا بات ہے۔ ہم نے تو تم کو ٹھاکر راج سنگھ کے گاؤں پر بھیجا تھا تم ان کے ہاں کیوں گئے۔ اور ان کو کیوں نکال دیا۔ رسالدار بہادر نے کہا۔ جہاں پناہ کس کی نسبت فرماتے ہیں۔ حضور یہاں تو کوئی ٹھاکر نہیں ہے۔ ٹھاکر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ کیا سامنے کھڑا ہے۔ کل حاضرین نے متفق اللفظ ہو کر کہا۔ پیر و مرشد یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہمیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ ٹھاکر چلاّتا ہے، روتا ہے مگر کل حضاّر کہتے ہیں۔ خداوند ہم نہیں جانتے۔ ہمیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ حضور فرماتے کیا ہیں۔ ہمیں معلوم تو ہو۔ جہاں پناہ نے کہا مجھے ایک آدمی نظر آتا ہے، اور وہ کہتا ہے کہ ٹھاکر راج سنگھ بتاتا ہے۔ حُضاّر نے ادب کے ساتھ عرض کیا حضور اس وقت یہاں نہ تشریف رکھیں۔ حکم ہوا کہ کسی عامل کو بلاؤ۔ جہاں پناہ وہاں سے بھاگے۔ ٹھاکر سر پیٹتا ہوا باہر آیا۔ کسی نے شنوائی نہ کی۔ بادشاہ کو بھاگنا پڑا، روسی سپاہی نے یہ کہانی سُن کر کہا حضرت اگر ایسے ہی بادشاہ ہیں تو رعایا کا خدا حافظ و ناصر ہے۔ جب صریح ایک آدمی سامنے کھڑا ہے اور وزرا، اور اراکین اندھا بنا کے کہتے ہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا، تو خدا ہی رعایا کو بچائے تو بچائے، ورنہ اراکین سے تو ذرا امید نہیں ہے' لاحول ولا قوۃ۔ خواجہ صاحب بگڑے جھلا کر فرمایا۔ اجی حضرت آپ ان امور کو کیا جانیں بھلا۔ ان کو بادشاہ ہی سمجھتے ہیں۔

رموز مصلحت ملک خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

ایک مرتبہ کا ذکر سنیے سیار شب کے وقت بول رہے تھے۔ راجہ نے دیوان کو بلا کر پوچھا دیوان یہ سیار غل کیوں مچاتے تھے، دیوان نے دست بستہ عرض کی حضور والا یہ سردی کھاتے ہیں۔ اس لیے سب کے سب مل کے فریادی آئے ہیں۔ فرمایا۔ دو شالے دیے جائیں تاکہ بادِ سرد آزار نہ دے۔ دیوان نے چودہ لاکھ کا پشمینہ اڑایا۔ کچھ وزیروں کو دیا۔ کچھ اپنے گھر میں رکھا۔ دوسری شب کو سیاروں نے پھر غل مچایا، راجہ کو سخت استعجاب ہوا، دیوان کو طلب کیا اور کہا ابھی کل ہی تو چودہ لاکھ کا شال دیا گیا ہے اور آج پھر یہ گل مچانے لگے۔ اب کیا اپنا راج ان کے حوالے کر دوں۔

تم ان سے کل پشمینہ واپس لو۔ یہ احسان فراموش ہیں۔ دیوان ایک کائیاں۔ دیکھا کہ اب دوشالے اور کل پشمینہ ہاتھ سے جاتا ہے فوراً بات بنالی۔ کہا مہاراج ادھراج آج یہ حضور کو دعائیں دیتے ہیں۔ احسان فراموش نہیں ہیں راجہ خوش ہو گئے اور کئی گاؤں کی آمدنی ہمیشہ کے لیے سیاروں کے نام وقف کر دی کہ سردی میں دوشالے سیاروں کو دیے جائیں۔ ایسے بادشاہ کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ قافلے والے یہ حماقت کی باتیں سُن سُن کر ہنستے تھے۔ مگر خوجی اپنے دِعْم میں تعریف کر رہے تھے۔ اس قصے کے بعد خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ کے ملکوں میں سب کے سب مولوی بننا چاہتے ہیں مگر ہمارے ملک میں رؤسا اور امرا اس کو عیب سمجھتے ہیں ان کے خیالات ان پست باتوں کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے وہ کبھی ان امور کا خیال ہی دل میں نہیں لاتے۔ پڑھنے لکھنے سے ہوتا کیا ہے۔ خاک ان کے شغل ہی اور ہیں۔ بٹیر بازی، کبوتر بازی، کہیں کنکوون کا میدان بدلا ہے۔ اشرفی پر پیچ لڑ رہا ہے۔ برسوں میدان رہا۔ لاکھوں صرف ہو گئے۔ بلا سے جوتی کی نوک سے۔ روپیہ کیا چیز ہے۔ نام پر جان دیتے ہیں روپیہ کو مٹی سمجھتے ہیں۔ جناب بس اب میں کیا عرض کروں۔

خواجہ صاحب تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ سردی نے قافیہ تنگ کر دیا تھا۔ ایک رحمدل روسی نے شالی چغہ دیا۔ حضرت نے پہنا تو کہا بھائی گرمانے کو تو گرمایا مگر بڑی سردی کھائی اور اب یہ سوچتا ہوں کہ اس قدر بوجھ لے کر کب تک چلوں گا۔ ٹھٹھر گیا۔ ٹھٹھر گیا۔ لاحول ولاقوۃ۔

روسی: آپ کے ملک میں تو سپاہی اچھے ہوں گے۔

خوجی: پجوڑاں کا ملک نہیں ہے۔ ہمارے ملک کے مرزا منش مشہور ہیں اور سپاہیوں کی نہ پوچھیے۔ جو ہے رستم دستان۔

روسی: بجا ارشاد ہوا۔ اور حضور بھی رستم ہیں۔

خوجی: دریں چہ شک۔ بیشک رستم ہیں۔

روسی: آئیے کشتی ہوتی ہے۔ ہے کچھ زور

خوجی: اس وقت تو سردی نے مار ڈالا ہے۔ اور اب بڑھاپا۔ جوانی میں البتہ ایں جانب بھی ہاتھی کی دم پکڑ لیتے تھے تو ہمس نہیں سکتا تھا۔ اب وہ شوق نہ ذوق۔ اب تو فقیری اختیار کی، دنیا کا عیش و آرام چھوڑا۔

ٹاٹ کا ٹکڑا لباس فقر میں
قاقم و سنجاب ــــ و دیبا ہو گیا

اب تو اپنے کو مٹا دیا۔ بالکل مر مٹے گئے گزرے۔

روسی: تاہم ہاتھی لیٹے گا تو کہاں تک لیٹے گا۔ ہے کہ نہیں۔

خوجی: اچھا دن چڑھنے تو سمجھ لوں۔ گیدی۔ سمجھ لوں گا۔

راوی: دریں چہ شک۔ مصر کے پہلوان کو کیسی پٹخنی بتائی تھی کہ آجتک نہ بھولا ہوگا۔ آپ ایسے ہی ہیں۔ اے لاحول۔

روسی: آپ کی شادی بھی ہوئی ہے۔ بیوی کہاں ہیں۔

خوجی: (مسکرا کر) آپ نے بھی وہی بات پوچھی۔ بس شاق۔ اجی فقیر آدمی آزاد ہیں۔ شادی نہ ہوئی نہ ہوئی۔ برابر کے لڑکے ہیں۔

روسی: آپ کے لڑکے بالے ہیں کیتے۔

خوجی: (ہنس کر) میرے لڑکے! میرے باپ کے بھی کبھی لڑکا پیدا ہوا تھا۔ آپ بھی بس وہی باتیں کرتے ہیں۔

اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ فرمایا۔ ہمارے ملک میں میر ذوالفقار علی بیگ، مرزا محمد جان رسالدار شور خاں اور مسور علی خاں یہ بانکے گزر گئے، تین تین ہزار ہاتھ۔ جوڑی کے ہلاتے تھے، دو دو ہزار ہاتھ پانچ پانچ ہزار ہاتھ ڈنڈوں پر جھک گئے، تو چار پانچ ہزار ڈنڑ پیل ڈالے۔ ہاتھی کے پاٹھے معلوم ہوتے تھے۔ گل چلے ایسے کہ مچھلی کا پانی میں شکار کیا۔ جی اور تیر اندازوں نے تو معجزے اور کرامت دکھائی۔ رات کا وقت ہے، اور اندھیری رات، بالکل تیرہ و تار۔ روشنی کا نام تک نہیں اور آدھ کوس کا پر۔ کوئی بولا۔ صرف آواز پر تیر لگایا اور نشانہ خالی نہ گیا۔ لوہے کی دیوار ایک شخص نے بنائی اور اس پار بھینسا باندھ دیا۔ دیوار توڑ کر بھینسے کی پسلی توڑی، ایک درخت کے تنے میں سوراخ کرتا ہوا پہاڑ میں لگا تو سو ہاتھ پیر گیا، تیر کیا نشتر تھا کہ بدن میں پیرا دیا تو اس پار نکل آیا۔ اللہ اللہ تھی قادر اندازی، اور ہمارے ملک میں چانڈو کا شغل ہے چرس مدک کا گانجے کا شغل بھی ہے۔ مگر چانڈو زیادہ۔ یہ پڑھنے لکھنے کا عارضہ تو یہاں ہی دیکھا ہے۔ اس مرض کا تو تا وہاں کوئی نہیں پالتا، ہاں اگلے زمانے میں عادت تھی۔ مگر اب ریاست کی شان کا زیادہ خیال ہے۔ اب ہندو رؤسا مطلق پڑھتے ہی نہیں۔ برہمن اکثر لُر۔ اگر پڑھا بھی تو شد بد۔ کشمیر اور بنارس میں کچھ لوگ پڑھے لکھے سنسکرت داں ہیں اور پونا میں۔ بس۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔

روسی: آپ کے نزدیک بڑی تعریف کی بات ہے۔

خوجی: جی تعریف نہیں تو کیا ہجو کی بات ہے۔

روسی: خبطی ہو، تم کیا اور تمہارا ملک کیا۔

خوجی: تم خود کیا اور تمہارا ملک خود کیا۔ ہندوستان جنت نشاں ہے، ہمارے ملک کا حُسن بھی مشہور ہے۔ جس عورت کو ہم نے دیکھا حسین اور ملیح ہی دیکھا۔ اور ادا تو ایسی کہیں دیکھنے ہی میں نہیں آئی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

سُرخ ٹھہرا ترے رخ سے گلِ احمر کس دن
سرو نکلا قدِ موزوں کے برابر کس دن

مگر ظالم بے رحم، بے مہر، بے وفا، عدوئے شکیب، دشمن جان خون کر ڈالیں اور اُف تک نہ کریں. قاتل، سفاک، دشمن عشاق۔ باہمہ صفت موصوف ہیں مگر عاشق بھی سنگدل ہیں۔ فولاد چاہے پگھل جائے مگر ان کا دل نہ پگھلے گا۔ وہ سنگدل ہیں۔

جورِ بتاں میں شکر خدا ہو تو جانیے
وقتِ قضا نماز ادا ہو تو جانیے

روسی: یہاں آپ پولینڈ کی شہزادی سے ملے تھے یا نہیں؟

خوجی: اجی میں اپنے کو ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھتا ہوں. کون شہزادی اور کس کا شہنشاہ۔ ما بدولت خود ملکِ جنوں کے فرماں روا ہیں گدائی میں بادشاہی کا دماغ ہے۔ زر نہیں نہ سہی، دل تو ہے۔

نہ اہل زر سے ملوں گا خاکسار ہوں میں
کروں گا میل نہ ذروں سے وہ غبار ہوں میں

اہل زر سے ملنے کو ہتک سمجھتے ہیں۔ کیوں ملیں۔ ہمیں زر سے کیا واسطہ زردار کوئی ہوا کرے، بات یہ ہے کہ زر ہو، اور لوگ تعظیم کریں، خواجہ سیدھے ایسے ویسے نہیں ہیں۔ خدا کی دین ہے۔ روسیوں نے دریافت کیا کہ آپ کے ملک میں علم جیالوجی کے علماء بھی ہیں یا نہیں۔ فرمایا دنیا میں کوئی ایسا علم نہیں جو ہندی نہ جانتے ہوں ایک ایک لونڈا اپنے وقت کا بقراط اور جالینوس ہے، جو ہے وہ عالم ہونے کا دم بھرتا ہے۔ جی ہندوستان ہے کوئی وحشی ملک نہ سمجھیے گا. جو اس بھروسے آپ ہوں۔

بھائی جان۔ ہندوستاں لاکھ گیا گزرا پھر ہندوستان ہے۔ روسیوں نے کہا ہندوستان کی تعریف ہم نے بھی سنی ہے مگر جب یہ کیفیت ہے تو ستم ہے بادشاہ ایسے ایسے اور ارکان دولت ایسے۔

ع وزیرے چنیں شہریارے چناں

ایسے وزیر، ایسے اراکینِ سلطنت، ایسے ارکانِ دولت، رعایا کی تباہی کے یہی سامان ہیں، یہی کارخانے ہیں، اچھی اچھی روایتیں سننے میں آتی ہیں۔ ہمارا ملک کے پاشا بھلا جابر کہے جاسکتے ہیں۔

خوجی: نہلسٹ کون لوگ ہیں۔ باتیں بناتے ہو۔

روسی: پھر اس سے کیا واسطہ، یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ایسے سوال سے کیا مطلب۔

الغرض روسیوں نے باتوں میں ان سے دریافت کیا کہ اہل ہند کی شادی بیاہ کے مراسم کیا ہیں تو خواجہ صاحب فخریہ بیان کرتے ہیں کہ تاجداروں کے دو دو سو محل ہیں، رؤسائے نلدار کے ساٹھ ساٹھ محل اور اوسط درجہ کے لوگ بھی علیٰ ہٰذالقیاس اپنی حیثیت کے موافق شادی کرتے ہیں۔

روسی: ایک مرد کی دو دو سو بیویاں۔ الاماں۔

خوجی : واہ۔ واہ واہ الامان کی ایک ہی کہی، اس میں الامان کی کیا حاجت تھی۔ اور یوں ہٹ دھرمی کی تو اور ہی بات ہے۔

روسی : ہمارے ملک میں یہ جائز نہیں۔

خوجی : پھر ہر ملکے و ہر رسمے یہ تو بنی بنائی بات ہے۔ رسوم مختلف ہیں۔

روسی : اچھا ہم پوچھتے ہیں آپ کا ملک اچھا ہے یا ہمارا ملک۔

خوجی : آپ کا ملک بھی کسی شمار قطار میں ہے۔ ہونہہ! شان خدا۔

آزاد پاشا کی کارگزاری

گر ایندہ باشد ہر دو لشکر بخوں ۔۔۔ علم برکشیدند چوں بے ستوں

در آمد ز دریا بغریدن ابر ۔۔۔ ز ہر بیشہ سر بروں زود ببر

تفیر دبیراں برآمد باوج

ز ہر گوشہ می رفت خوں موج موج

ادھر عامل روز نے سپاہ ماہ و انجم کو شکست فاش دی، اور اشعۂ زرنگار مہر سے تاریکیِ شب کافور ہوتی، ادھر نیشانِ شجاعت، شیر دل، شیر مرد آزاد پاشا سمند دغا پسند و ضرغام شکار پر سوار ہوئے۔ اور خدا کا نام زبان پر لا کر فوج کے ہمراہ پلونا کی طرف چلے۔ اہل پلونا کے پاس شبا شب آدمی بھیجا گیا تھا۔ یہ مژدہ روح افزا سنتے ہی پلونا والوں کی جان میں جان آئی۔ منہ مانگی مراد پائی۔ سپہ سالار آزمودہ کار نے کئی ہزار سوارانِ جرار روانہ کئے۔ کہ روس کی سپاہ آزاد کو روک نہ سکے۔ گو فاصلہ بہت تھوڑا ہے، تاہم خالی از خطر نہیں، مبادا یہ خبر پا کر کہ کمکی فوج فلاں سمت آگئی ہے۔ غنیم اس کے روکنے کی فکر کرے۔ دو میل آزاد پاشا کا لشکر آگیا ہوگا کہ جاسوسوں نے ایک خبر وحشت اثر سنائی ہراولوں نے بھی اس کی تصدیق کی کہ غنیم کئی اتواپ اژدر دہاں، اور پچیس ہزار آدمی سوار و پیادہ لے کر پلونا اور فوج آزاد کے درمیان مستعد دار و گیر ہے۔ پلونا سے آمد و رفت بالکل مسدود۔ رسد کا ٹھکانا نہیں۔ یا خدا یہ بڑی بری ہوئی۔ فوج اسی میدان میں ٹھہرادی گئی۔ اپیلٹن پاشا نے صلاح دی کہ اس درویش کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ پلونا کی سمت جا کر خبر لائے۔ اغلب ہے کہ روسی اس سے نہ بولیں۔

آزاد پاشا نے درویش کو بلوایا، اور بکمال منت و سماجت یوں تقریر کی۔ شاہ جی صاحب آپ خوب جانتے ہیں کہ پولینڈ کی شہزادی پر میں دل و جان سے عاشق ہوں، اور وہ بھی میری عاشق زار ہیں۔ تم ان کے

فرستادہ ہو، ایسے ایلچی کو میں ہمیشہ گزند اور خوف وخطر سے معنون رکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ وقت بہت نازک ہے۔ پلونا کا معرکہ قابل تعریف ہوگا، اور اسی پر جنگ کا خاتمہ اور لڑائی کا نچوڑ ہے۔ ہماری فوج اور پلونا کے درمیان میں پچیس ہزار روسی حائل ہیں۔ نہ ہم میں سے کوئی اس طرف جا سکتا ہے نہ پلونا والے اپنی خبر بھیج سکتے ہیں شب کو انھوں نے بڑی مسرت دلی سے سُنا تھا کہ کمکی فوج آتی ہے، اور اس بیرونی مدد سے وہ کمال محظوظ ہوئے ہوں گے۔ لیکن غنیم کے مخبروں نے ہماری خوشی مبدل بہ رنج کر دی۔ اب ہماری سپاہ قلعہ محصور کی فوج کے مطلق کام نہیں آسکتی۔ افتاد۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ آپ اس قدر مدد دیجیے کہ پلونا تک کسی طرح گھُس پیٹھ کے جائیے اور اہل پلونا کو ہمارا مراسلہ دیجیے۔ آپ کو کوئی پہنچائے گا نہیں۔ سب یہی سمجھیں گے کہ روسی ہے اور روسی زبان بھی آپ بول لیتے ہیں۔

درویش نے بسہولت تمام کہا۔ آزاد۔ میں پولینڈ کی شہزادی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں، میرے والد نے ان کو علم موسیقی کی تعلیم دی ہے۔ کروڑ روپیہ بھی کوئی دیتا تو میں عبادت اور یادِ الٰہی چھوڑ کر وطن سے نہ آتا مگر۔ بہن کی محبت اس کی بے قراری اور گریہ وزاری نے مجھے مجبور کر دیا۔ میرا سن بیس سال سے زیادہ نہیں ہے صرف ایک روسی خدمت گار لے کر میں نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ خیر۔ وطن خاص کہیں ہے اور بود وباش کہیں ہے، میری بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر جاتے ہو تو اتنا یاد رکھنا کہ واپس آنا۔ اُجڑ بن میں جان نہ گنوانا، اب جو اجازت دو۔

آزاد نے کہا آپ نے واقعی اس سن میں کہ ابھی سبزہ آغاز بھی نہیں بڑا کارنمایاں کیا کہ اس قدر فاصلہ دور دراز آپ نے بکمال مشقت اس سن میں طے کیا یہ سب باتیں کیونکر حاصل کرلیں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں لیکن اب اس وقت ہم سب کی عزت وآبرو تمھارے ہاتھ ہے۔

درویش بسم اللہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ بڈھا جاتا ہے۔ خدمتگار کو ساتھ لیا۔ آزاد اور افسرانِ فوج سے مصافحہ کیا، اور روانہ ہوا۔ آزاد اور افسران فوج خوش تھے کہ اس درویش کے ذریعے سے پلونا والوں کو کُل حالات معلوم ہو جائیں گے، مگر تشویش یہ تھی کہ ان پچیس ہزار آدمیوں کو یہاں سے کون ہٹائے گا اور کیونکر پلونا تک گزر ہوگا۔

یہ مشورہ ہو ہی رہا تھا کہ درویش کا خدمتگار چار گھڑی کے بعد سامنے نظر آیا۔ سب کو حیرت ہوئی کہ بار خدایا یہ کہاں عقل کے میدان میں فکر کے گھوڑے دوڑانے لگے۔

ایک نے کہا معلوم ہوتا ہے درویش کو کسی نے مار ڈالا۔ یہ آدمی بچ کے چلا آیا۔ افسوس صد افسوس۔ ابھی تو جوان تھا۔ سبزہ تک نہیں نکلا تھا۔

هنوزش گرد گل نارستہ شمشاد
زخوبی سردار چوں سروِ آزاد

دوسرا بولا۔ یہ بات نہیں ہے ہم نے کئی بار غور کیا تو مردانہ پن اس میں نہیں پایا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ میں کہنے کو تھا کہ یہ عورت ہے مگر میں نے کہا تم لوگ ہنسو گے۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا، اور لیفٹننٹ بیچارہ جس نے یہ انوکھی رائے ظاہر کی تھی بن گیا۔ جب خدمت گار سے دریافت کیا گیا تو وہ مسکرایا اور مسکرا کر بولا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ درویش کہاں گئے، مگر یہ خط انھوں نے مجھ کو دیا ہے۔

آزاد نے خط لیا اور پڑھا تو دھک سے رہ گئے۔ عبارت سننے کے قابل ہے۔

نامہ بنام آزاد پاشا

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

اجی حضرت تسلیم۔ سچ کہیے گا منھ کی کھائی یا نہیں۔ انصاف شرط ہے، واللہ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔ ایک ذرا سے بھرّے میں کچا چٹھا کہہ سنایا، پولینڈ کی ناوک نگاہ شہزادی کے عشق صادق کا حال، مس کلیرسا کی دلربائی اور اعانت کا ذکر، میڈا کی پاکبازی اور ہمدردی، اور حسن گلوسوز کا بیان۔ ایک بات بھی نہ اٹھا رکھی۔ ارے ناداں میں درویش نہیں ہوں، میں بھی ایک مس ہوں۔ جھیپے تو نہ ہوگے مگر میں کلیرسا اور پولینڈ کی شہزادی کی طرح اپنے پیارے وطن کی دشمن نہیں ہوں۔ کلیرسا اگر ملے تو خون پی لوں، اور اگر بس چلے تو پولینڈ کی شہزادی کے تکّے تکّے اڑاؤں، اور بوٹیاں چیل کوؤں کے حوالے کردوں، مگر واہ میرے طالع فرّخ کہ کل امور تیری زبان سے صاف صاف سُن لیے۔ خدا کی شان ہے، مگر یہ ہتھکنڈے چھوڑ دو ورنہ بُری ہوگی۔

جو جو اسرار تھے نہانی
سب تجھ سے سنے تری زبانی

یاد رکھنا روس کی لیڈیاں اپنے وطن کے نام پر جان قربان کرنے کو ہمیشہ آمادہ رہتی ہیں۔ روس کی لیڈیاں کلیرسا کی سی نہیں ہوتیں، اس چھوکری نے وہ نام پیدا کیا تھا کہ روس کی کل لیڈیاں عش عش کرتی تھیں مگر نباہ نہ سکی، ہائے افسوس۔ کلیرسا اور آزاد سے پاشا کو مدد دے۔ حیرت ہے۔ خیر۔ اب خوب یاد رکھو کہ مس کلیرسا اور پولینڈ کی شہزادی دونوں تمام عمر مصیبت میں گرفتار رہیں گی۔

اس قدر پڑھ کر آزاد اشکبار ہو گئے۔ خدمتگار یعنی حامل خط کی طرف دیکھ کر کہا۔ اللہ اللہ۔ یہ دغابازی۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ بڑا چکما دیا۔ بڑا دھوکا کھایا۔ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ کس لطف کے ساتھ کل حال مجھ سے پوچھ لیا۔ اور میری آنکھوں پر کیسا غضب کا پردہ ڈالا۔ اب کلیرسا اور مسیڈا کو کون بچائے گا۔ اور پولینڈ کی شہزادی کو کون مدد دے گا۔ یا خدا مدد دے۔ یا خدا مدد دے۔

یارب سببے ساز کہ یارم بسلامت

باز آید و برہاندم از چنگِ ملامت

ایپلٹن پاشا اور کئی افسر منتظر تھے کہ آزاد اس خط کا مطلب بیان کریں، مگر ان کو گریاں و پریشاں دیکھ کر سخت متحیر ہوئے۔ پوچھا خیریت ہے، انھوں نے کہا خیریت منزلوں دور ہے۔ خیریت کجا بڑی مصیبت پڑ گئی۔ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ یہ کہہ کر خط کا بقیہ حصہ پڑھا۔ وہو ہذا۔

سنو آزاد پاشا۔ پلونا تک تمھارا گزارہ محال ہے۔ اس خیال خام سے درگزرو۔ افواجِ ظفر امواجِ روس، مور و ملخ سے زیادہ ہے۔ اب اگر اپنی جان کو عزیز رکھتے ہو تو گھر کی راہ لو۔ ورنہ یہ دشت بلاخیز ہے اور تم ہو۔ لاش کا بھی پتا نہ ملے گا۔ ہاتھیوں سے گنے کھانا عقل و مصلحت دونوں کے خلاف ہے۔ اگر شیطان نے یہ پٹی پڑھا دی ہے کہ پلونا میں داخل ہو جائیں گے تو یاد رکھو بہت پچھتاؤ گے۔

کیا سمجھتے ہو کہ امید یہ بر آئے گی

آج یا کل کبھی حسرت یہ نکل جائے گی

کیا مجال، کیا تاب، کیا طاقت۔ دیکھ ہی لو گے۔

کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا

تھوڑا لکھنا بہت سمجھنا

اب میں آپ سے رخصت ہوتی ہوں، اور مس کلیرسا سے عوض لیتی ہوں۔ جو شہزادی آپ کی چاہتی بیوی ہی ہیں، وہ اسی مہینے میں سیبیریا کے برفستان کی ہوا کھائیں گی اور وہ تمام عمر پچھتائیں گی۔ مس صوفیا۔

آزاد پاشا نے یہ خط سب کو سنایا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ارے بڑا چکما ہوا۔ بڑا دھوکا دیا۔ اب روس کی فوج اور بھی مستعد ہو جائے گی۔ کل حالات اور امور کی اطلاع پائے گی۔

اب سنیے کہ مس صوفیا نے اپنے لشکر میں جا کر آزاد، کلیرسا، پولینڈ کی شہزادی اور مسیڈا سب کا پوست کندہ حال بتا دیا۔ فوراً تار دیا گیا کہ وزیر جنگ کو ان حالات سے اطلاع دیجیے تاکہ اگر مناسب سمجھیں تو ان سب کو سزا دیں۔

ادھر آزاد پاشا اور افسران فوجی باہم مشورہ کرنے لگے کہ اب تاخیر کا موقع باقی نہیں ہے۔ فوراً حملہ کر دو۔ آزاد پاشا کے ساتھ ۲۴ توپیں تھیں۔ پندرہ ہزار سوار، تین ہزار پیادے، اور صرف دو دن کی رسد۔ سب کی رائے یہی قرار پائی کہ حملہ آور ہونا بہتر ہے۔ لہٰذا فوج آراستہ ہو کر بڑھی۔

بیا ساقی از غم مرا دور کن　　جہاں از مے لعل پُر نور کن

مے کو مرا رہ بمنزل برو

ہمہ دل برند او غم دل برو

فوج ظفر موج سیل کی طرح چلی۔ سپاہیوں کے دل بڑھے ہوئے تھے۔ افسروں نے ٹھان لی تھی۔ کہ قتل ہوں گے اور قتل کریں گے ماریں گے اور مریں گے مگر غنیم کو پیٹھ نہ دکھائیں گے۔ بھاگنے کا لفظ زبان پر نہ لائیں گے۔

زغرّیدن کوس خالی دماغ

زمیں لرزہ افتادہ در کوہ و راغ

دلاوروں نے نعرہ بلند کیا۔ کاندھے پر بندوق، کمر سے تلوار لگی ہوئی، باڑھیں چڑھی ہوئی، وردی چمک رہی تھی۔ گھوڑے بلوں پر تھے۔ تمام میدان نعروں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج رہا تھا۔

خروشیدنِ کوس روئینہ طاس

نیوشندہ را داد بر جان ہراس

جلاجل زنان از نوا ہائے زنگ

برآوردہ خون از دل خارہ سنگ

آزاد: یارو بڑھے ہوئے۔ ہاں جوانو شاباش۔ یہی وقت ہے۔

ایلپٹن: حمیت اسی کی مقتضی ہے کہ اس میدان جنون زار میں جان دیجیے۔

کرنل: انشاءاللہ، دل اور ہمت ہو تو کیا بات ہے، اے توبہ۔

لفٹنٹ: مار لیا ہے اس جوش اور ولولے کے بحر ناپیدا کنار کو کون روک سکتا ہے۔ یہ سیلاب غنیم کی جمعیت خاطر کی کشتی کو بہالے جائے گا۔ یہ سیل کہیں روکے رُکے ہیں۔

آزاد: ہماری سپاہ فولاد پوش ستم ڈھائے گی۔

زفولاد پوشان لشکر شکن

تن کوہ لرزید بر خویشتن

زنوکِ سناں چرخ دولاب رنگ
زبر کار گردش فرو ماند لنگ

مگر زیادہ جوش و خروش نہ چاہیے۔

ع۔ بوقتِ دانائی بوقتِ صلح نادانی

اس مصرع پر عمل ہو تو سبحان اللہ سبحان اللہ۔

کرنل : ابھی کوئی دو میل زمین باقی ہے۔ اس کے بعد پھر دھاوا ہوگا۔

لفٹنٹ : ہاں بس ہماری بھی یہی رائے ہے۔ اس میں شک نہیں۔

آزاد : اس وقت تو ہم مست ہیں۔ بادۂ حب الوطنی کے نشے نے مخمور کر دیا ہے۔ عجب شراب ناب ہے۔ کیا کہنا۔

بیا ساقی از مے مرا تازہ کن
دریں رہ صبوحی بہ اندازہ کن

روسیوں نے ترکی فوج کی حس و حرکت کا حال سُنا تو فوراً بندوبست کیا۔ منجملہ پچیس ہزار آدمیوں کے دس ہزار مقابلے کے لیے بھیجا اور پانچ ہزار کو فوج رزرو مقرر کیا اور دس ہزار اسی مقام پر ڈٹی رہی۔ میدان میں اِدھر رومی اُدھر روسی فوج صف باندھ کر کھڑی ہوئی اب کوئی چار پانچ گھڑی دن باقی تھا۔ مگر نہایت عمدہ سماں تھا۔

فروزندہ روزے کہ فردوسِ پاک | برآوردہ سر گنج قاروں زخاک
بعزلت کمر بستہ بادِ خزاں | نسیم بہاری زہر سو وزاں
ہمہ صحنِ گلشن ہمہ کوہ و راغ | جہاں چشم روشن بزریں چراغ

زمانہ بہ کردار باغِ بہشت
زمیں از گل و سبزہ مینو سرشت

پہلے ترکوں نے گولہ چلایا ان کے ہمراہ ایک بڑا نامی گرامی گولہ انداز تھا۔ اس قادر انداز نے تاک تاک کر ایسے گولے اُتارے کہ روس کے کئی افسروں کے سر بھٹے کی طرح اڑ گئے۔ آدھ ہی گھنٹے میں چونتیس افسر کام آئے اور ترکوں کا صرف ایک سب لفٹنٹ کام آیا۔ اپیلٹن کی رائے تھی کہ ایک عمارت کی آڑ سے گولے مارے جائیں، مگر آزاد پاشا نے صلاح دی کہ میدان کی لڑائی ہو۔

آزاد : غنیم کے بہت سے افسر کام آئے۔ میدان انشاءاللہ ہمارے ہی ہاتھ رہے گا مگر ابھی تک کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

کرنل : اس طرح پر تو تھوڑی دیر میں ادھر اُدھر کے کل آدمی کام آ جائیں گے۔ اور مطلب خاک نہ نکلے گا۔

آزاد : آپ ذرا خاموش رہیے۔ میں ایک اور فکر میں ہوں، بہتر ہو کہ ان کو دھوکہ دے کر دریا کی طرف سے گھوم کر کوئی دو ہزار سوار بائیں جانب سے باڑھ ماریں، یہ نہایت مشکل کام تھا کیونکہ خفیہ طور پر ترکی رسالے دریا کی جانب نہیں جا سکتے تھے اور یہ یقین واثق تھا کہ جب رسالے روانہ ہوں گے تو روسی ہوشیار ہو کر کچھ سپاہ کا رُخ دریا کی جانب کر دیں گے۔

آزاد پاشا نے اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ ادھر فوج بسرکردگی آزاد پاشا روانہ ہوئی، ادھر روسیوں نے بندوقیں چھتیا کر باڑھ پر باڑھ ماری اور دونوں طرف سے گولی چلنے لگی تو دھوئیں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے نیچے ایک اور آسمان بن گیا۔ طرفین کی فوج خوب دل کھول کر لڑی مگر چونکہ ترک کسی قدر بلندی پر تھے، لہٰذا روس کی سپاہ زیادہ کام آئی ادھر آزاد پاشا دریا کے کنارے پہنچ گئے، اور بائیں جانب سے باڑھ ماری تو روسیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آزاد پاشا نے اس مقام پر ایسی جوانمردی کی کہ تاریخ پلونا میں یادگار رہے گی۔ فوراً گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور سترہ سوار لے کر اس پار آ گئے۔ اس اثنا میں روسیوں نے گولیاں چلائیں مگر بیکار۔ اب مجبور ہو کر رزرو فوج کے پانچ ہزار آدمی بلوانے پڑے۔ اب کیا تھا، اِدھر ایلیٹن پاشا کے سوار، اُدھر آزاد کی فوج نصرت موج، جب تک رزرو فوج آئے تب تک قلع قمع کر دیا۔ آزاد پاشا سوچے کہ یہ لوگ اب جان پر کھیل جائیں گے۔ لہٰذا ان کو گولی مارنے کا موقع نہ دو۔ ان کے ماتحت افسروں نے منع کیا اور کہا آپ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ گولہ بارود ان کے پاس بہت کم ہے۔ اگر تلوار کی لڑائی ہوئی تو جان پر کھیل جانا کون بڑی بات ہے۔ مگر آزاد نے ایک نہ سُنی، فوراً تلوار میان سے نکالی اور جھپٹ پڑے۔ اس وقت اتنی تلواریں چمکتی تھیں کہ نظر جھپکی جاتی تھی۔ دھوپ کا رنگ ان کی چمک دمک کے مقابل میں ماند پڑ گیا تھا۔

ع رن کی زمیں تو سُرخ تھی اور زرد آسماں

یہ مصرع صادق آتا تھا۔

زخاریدن کوس خارا شگاف
پراگندہ سیمرغ در کوہِ قاف
زفریاد خر مہرۂ وگا دُم
علی اللہ برآمد زرد سینہ خم

ایک ایک آدمی ایک ایک سے گتھ گیا۔ آزاد پاشا پینترے بدل بدل کر تُلے ہوئے ہاتھ لگاتے تھے، اور سر جنگیوں میں اڑتے جاتے تھے۔ ایک ایک نے سو سو کے سر اڑائے۔ گویا ایک بار تھا کہ اس سے سبکدوش کر دیا۔

یہ مصرع یہاں پر صادق آتا تھا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

ع سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

ان کی تلوار پیغامِ اجل تھی جس طرف جھکی آنکھوں میں چکا چوند آگیا۔ جس طرف گئی پرے کے پرے صاف کر دیے

بس اس کا گھٹا تھا جو دلیرانہ بڑھا تھا

منہ کی وہی کھاتا تھا جو منہ اس کے چڑھا تھا

کئی روسی جوانوں کو آزاد نے نیچا دکھایا۔ بیس پچیس سواروں کو ایک ایک ہاتھ میں مقتول کیا۔ کئی افسروں کو تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ کئی مردانِ کاری کو آپ خنجر بلایا۔ جس طرف اُن کی شمشیر محرابی لنگردار جھکی۔ ایک کے دو دو کیے چار کیے۔ مگر ایک روسی جوان جھلا کر آگے بڑھا اور طالب پیکار ہوا۔ آزاد شیرِ نر کی طرح آگے بڑھے اور تلوار چلنے لگی یہ کیفیت قابلِ دید تھی اس وقت آزاد نے ایسے ایسے فنونِ سپہ گری دکھائے۔ وہ وہ حملے دلیرانہ کیے کہ شاید و باید دس منٹ تک مقابلہ مساوی رہا، اس کے بعد آزاد فرخ تہا ہتھ نے چالاکی کا ہاتھ دیا تو خون کے شرائے بہنے لگے۔ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ انھوں نے ایک ہتھ کٹی دی اور اس کا دست راست کھٹ سے کٹ کے گر پڑا۔ اور ادھر ترکی فوج میں نعرہ خوشی بلند ہوا۔ کچھ دیر میں میدان صاف ہوگیا اور آزاد پاشا کے نام فتح لکھی گئی۔ میدان میں فوج کے مقتول ایک سمت ہمیشہ کے لیے میٹھی نیند سو رہے تھے، اور دوسری جانب مجروحین کی فریاد اور نالہ و زاری کرب سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے رن کی زمین میں باوصف کثرتِ فوج سناٹا پڑا تھا۔

بیا ساقی آں آتشِ تو بہ سوز   بآتشگہِ مغزِ من بر فروز

بیا ساقی از شادی نوش و ناز   یکے شربت آمیز عاشق نواز

بہ تشنہ رہ آں شربتِ دل فریب

کہ تشنہ ندارد ز شربت شکیب

رن کی زمین میں آزاد پاشا اپنے کمیت طوطی پر کو اِدھر اُدھر کڑ کڑانے لگے۔ فوج کے جوانانِ روئیں تن خوشی کے شادیانے بجانے لگے۔ آزاد پاشا نے قرب وجوار کے گاؤں میں دریافت کیا کہ کوئی عمارت بلند و وسیع بھی یہاں ہے یا نہیں، تو معلوم ہوا کہ روسیوں نے کُل بڑے بڑے مکانوں کو مسمار کر دیا۔ انھوں نے دو جاسوس روانہ کیے کہ اہلِ پلونا کی خبر لائیں اور ان کو اطلاع دیں کہ اس جنگ میں کامل فتح پائی اور غنیم کو شکست فاش دی۔ میدان میں ہزاروں لاشیں پڑی تھیں۔ ایک ایک پر دو دو۔ تلوار کی لڑائی نے چٹکیوں میں جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ ایک مقام پر دو زخمی پڑے سسک رہے تھے۔ ایک روسی دوسرا ترک۔ روسی نے گولی کے تین زخم کھائے تھے، اور تلوار کی ضرب سے بایاں ہاتھ جھول گیا تھا۔ ٹانگیں دونوں بے کار ہو گئی تھیں۔ ترک بھی

بہت تڑپ رہا تھا ایک گولی توڑ کے نکل گئی تھی، اور تلوار نے ایک ہاتھ اُڑا دیا تھا۔ تلوار اب تک داہنے ہاتھ میں تھی۔ وجہ یہ کہ اس شخص کے پاس اصفہان کے قریب ایک گاؤں کی شمشیر خاراشگاف تھی نہایت جوہردار اور صراحی مگر عام تلواروں سے زیادہ طول تھا اس لنگر کے سبب سے تلوار جب تک تول نہیں لی جاتی تھی، چلانا مشکل تھا۔ کلائی پر بڑا زور پڑتا تھا۔ ایک بار زور سے اس نے تلوار چلائی تھی کہ ایک ہی ضرب میں دو روسیوں کو کاٹ ایک درخت کے تنے پر رُکی۔ اتنے میں اس پر کئی تلواریں پڑیں، اور بے دم ہو کر گرا تو تیورا گیا۔ مگر تلوار پنجے سے نہیں چھوٹی۔ اس شخص نے گیارہ آدمیوں کو اسی تیغ خوش غلاف سے قتل کیا تھا۔ جب گرا تو تلوار کا قبضہ ہاتھ میں دھنس گیا۔

ان دونوں میں تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر دانت پیستا تھا مگر دونوں شخص بے بس۔ روسی نے کہا۔ یا خدا اتنی فرصت دے کہ اس بدبخت کو جو مجھے دیکھ دیکھ کر دانت پیستا ہے قتل کر ڈالوں۔ گو ہاتھ اور پاؤں دونوں بے کار ہو گئے ہیں لیکن اور کچھ نہیں تو دانتوں سے بوٹیاں ہی نوچوں، اور ترک کہتا تھا کہ ٹھہر جا ٹھہر جا ذرا خون رک جائے تو اسی شمشیر بُرّاں سے گلا کاٹوں گا اور جہنم رسید کر دوں گا انشاءاللہ۔

روسی: دیکھیں جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے، ہائے ہم کسی کام نہ آئے ہم سے کچھ بھی اعانت نہ ملی۔ اے کاش دس پانچ کو مار کے مرتا تو آرزو بر آتی۔ اور سمجھتا کہ میں اپنے وطن کے کام آیا۔ مگر آہ سرد بھر کے۔ خیر۔

ترک: اتنی ڈھارس تو ہوئی کہ بیس پچیس کو قتل کر کے جان دی اور مرتے دم اپنے ملک کی فتحیابی کا حال سُنا۔ بس اس سے زیادہ معراج سپاہی کے لیے اور کیا ہے کہ تلوار کے مُنہ مرے۔ بڑی سپہ گری یہی ہے کہ

ع دست بگیر دسرِ شمشیر تیز

اور ہر بُن مو سے بزن بزن کی آواز نکلے۔ جب تک گر نہ پڑے دم نہ نکلے۔ جب تک جان میں جان رہے تلوار ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ مردی اور مردمی اس کے معنی ہیں۔ سمجھا۔

روسی: ذرا خون بند ہو اور کھسکنے تک کی طاقت ہو تو سمجھ لوں۔

ترک: ہُشت! تو کیا سمجھے گا نامرد۔ دیکھ مرتے دم تک تیغ صف شکن ہاتھ میں ہے۔ اور تو ڈھیر پڑا ہے۔ یہ فرق ہے۔

روسی: کہاں۔ کہاں پڑے ہیں۔ میدانِ کارزار میں۔ خیر اب اس بک بک سے کیا واسطہ۔ اب تھوڑی دیر کی زندگی ہے۔ خدا سے دعا مانگنے دو کہ روسی اس جنگ عظیم میں کامیاب اور سرخرو ہوں۔ آمین آمین۔ ثم آمین

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ترک: (تیکھی چتون کر کے) منہ دھو کر رکھو۔ تم اس خیال میں مرتے ہو کہ روسی فتح پائیں گے اور ہمیں یہ خیال ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔ غرض کہ دونوں خوش خوش مرتے ہیں، جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوئے گا ہی۔

روسی: خدا ہم کو اور تم کو دونوں کو بہشت بریں میں جگہ دے۔ اب اس وقت ہم تم کیوں لڑیں، اور کیوں

دشمنی کریں۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف و با دشمناں مدارا

ترک: اب وہ لوگ آگئے۔ آزاد پاشا آتے ہیں۔

روسی: خوش ہو۔ مگر یاد رکھنا۔ ہماری تمھاری دونوں کی تیمارداری ہوگی۔ ترک سپاہی آدمی ہیں، اور سپاہی کی قدر سپاہی کرتے ہیں۔ بودے آدمی سپاہی کی قدر کیا خاک کریں گے۔

اتنے میں آزاد پاشا نے حکم دیا کہ کل ڈاکٹر اور کمپونڈر بہت عجلت اور مستعدی کے ساتھ مجروحوں کی فکر کریں۔ جب اس ترک کے قریب آئے تو اس نے آہستہ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب مہربانی کرکے اس روسی کا بھی علاج کرنا۔ کیونکہ یہ بیچارہ سسک رہا ہے۔

جس طرف نظر جاتی تھی کشتوں اور زخمیوں کے ڈھیر ہی دکھائی دیتے تھے۔ کوئی پڑا سسک رہا تھا۔ کوئی روتا تھا، کوئی فرطِ کرب سے گریہ و زاری، اور نالہ و فریاد کرتا تھا۔ خون کی ندیاں ہر سمت بہہ رہی تھیں جس طرف دیکھو لاش ہی لاش نظر آتی ہے۔

آزاد: اللہ اللہ۔ زندگی کا مطلق بھروسا نہیں ہے۔

کرنل: دیکھیے نہ۔ ابھی تک سب کے سب زندہ جیتے جاگتے تھے، اور اب یہ کیفیت ہے کہ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ دنیا میں آئے ہی نہیں تھے۔ خدا کی شان ہے گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔

بہر لحظہ بہر ساعت بہر دم
دگرگوں می شود احوال عالم

آزاد: یہ جتنے اس وقت یہاں پڑے ہیں، اس قابل ہیں کہ ان کی قبریں بنوائی جائیں۔

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ ایک مسافر نے جو اس طرف سے گزرا بیان کیا کہ صوفیہ کے راستے میں ترکوں سے بڑی جنگ ہوئی جس میں روسیوں نے پلونا کے قریب فتح پائی اور اس کا حال یوں بیان کیا۔

قلعہ پلونا گو کہ محصور کرلیا گیا ہے مگر تاہم محفوظ و مامون رہا۔ رشید پاشا کی جرأت و دلیری میں کوئی شک نہیں لاتا۔ مگر چونکہ عساکر معاند وجود مخالف پاشا موصوف کو ہر طرف سے گھیرے تھے لہٰذا انھوں نے اپنی دلیری و بہادری و فطانت و چالاکی سے اپنی صف لشکر کو دائرہ حفاظت سے نہ خارج ہونے دیا، جو صوفیہ کے راستہ پر واقع تھی وہ قبلِ اختتام ماہ اکتوبر میں 15 میل تک پھیل گئی۔ 19۔ ماہ اکتوبر کو جبکہ فوج رومانیا اپنے حملہ میں ناکامیاب رہی اس وقت تین گولے پے درپے ان پر نازل ہوئے اور ایک منٹ میں

ہر ایک گولے سے تخمیناً تیس ہزار گولیاں برآمد ہوئیں۔ امر یقینی تھا کہ اب قلعہ میں مدد نہ پہنچ سکے گی اور اس پر قابض اور متصرف ہوں، ایک امر محال اور غیر ممکن تھا۔ یہ مصیبت منجملہ ان مصائب و مشکلات کے تھی، جو مقام پلونا میں واقع ہوئی تھیں اور جس سے روسیوں کو اس امر کی امید واثق ہوگئی تھی کہ ان کا حملہ دیوار قلعہ کے حق میں ایک طوفان اور بلا نازل کریگا۔ کمانڈر فوج ترکی نے جب یہ تہلکہ اور آفت دیکھی۔ تو بغرض افتتاح طریق و کشادگی راہ اس صف پر حملہ کیا جو صوفیا کی راہ پر واقع تھی مگر فوج ترکی بوجہ خستگی اور ناتوانی کے نجات نہ پاسکی اور فوج روس ان پر غالب و کامیاب ہوئی۔ پلونا کے قریب آگئی۔ اور رشید پاشا نے مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں اپنی گڑھی میں پناہ لی۔ یہ ضرور ہے کہ اگر رشید پاشا حسب خواہش حصار سے باہر آجاتے تو قضیہ مباولہ شاید مختلف مقدمات سے مرکب ہو جاتا اور یہ امر شاید اس وجہ سے تھا جب پاشا موصوف کی فوج مایوسی سے بیدل ہوگئی۔ تب پاشا کے دل سے کل خیالات حفاظت مقام پلونا کے جاتے رہے لہذا مجبور ہو کر صف دشمن پر بامید بہبود حملہ کیا۔ غرض کہ بعد فتحیابی روسی بہت خوش و خنداں ہوئے اور اپنی فوج کی صف بندی پلونا کے قریب کردی اور ایک خندق اس کے گرد تیار کرکے غنیم کے منتظر رہے۔

شروع نومبر میں بوجہ بے ترتیبی اور بدنظمی کے فوج ترک کو بھاگنے کا عمدہ موقع کافی طور پر ہاتھ آگیا تھا۔ مقام رومانیا میں پانچواں اور ایکیسواں دستہ مقام بلیبیا میں سنبھل گیا۔ بعدازاں ایک بسر کردگی جانسن آیا جس نے 9 نومبر کو ایک پہاڑی پر قائم ہو کر اپنی فوج کی صف بندی کی۔ جس مقام پر کمانڈر موصوف مقیم تھا، وہاں پر اس کی فوج شمالی مغربی جانب قائم ہوئی تھی اور توپخانہ اُس پُل کے مقابلے پر واقع تھا جو ملک اوڈلیہ کے مغرب جانب واقع ہے اس پر رومانیا کا چوتھا دستہ قابض و متصرف تھا۔ شمالی اور مشرقی اضلاع پر دوسرا دستہ قابض تھا۔ صف مذکور ۳۰ میل کے فاصلے تک تھی، اور فوج میں تخمیناً بارہ ہزار آدمی تھے۔ اس وقت میں رشید پاشا بہت گھبراتے تھے اور کرتے دھرتے نہیں بن پڑتی تھی۔ ایام گرما بھی آگئے، مگر کوئی صورت نجات کی نہ ہوئی۔ آزاد پاشا کو اس کلام کا مطلق اختیار نہ تھا۔ یہ کہانی سُن کر فوراً حکم دیا کہ اس شخص کو گرفتار کرو۔ سواروں نے فوراً آکر گرفتار کرلیا۔ شب کو کرنل نے سب افسروں کی دعوت کی اور کھانے کے وقت باہم خوش خوش گفتگو ہونے لگی۔

ایبلیشن: آپ کی شمشیر کی چمک کے ہم قائل ہوگئے۔ کیا کاٹ ہے۔

آزاد: آپ نے اس وقت دیکھا ہوگا کہ وہ جوان رعنا کس ڈانٹ ڈپٹ سے تلوار سوت کے جھپٹتا تھا۔ اور کس بانکپن سے تلوار تول تول کے لڑتا تھا۔ مگر ہم نے بھی کیسی مستعدی سے جواب دیا۔ چوٹ بچائی اور چوٹ لگائی۔ یہی صفت ہے۔ سپہ گری کے یہی معنی ہیں۔ حواس ہوں۔

کرنل: سبحان اللہ سبحان اللہ ہم تو عش عش کر رہے تھے۔ تلوار کیا پیام اجل ہے۔ پری ہے دلہن ہے۔
واہ ری تلوار۔ اہو ہو ہو۔

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے — تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے — دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

آزاد: بس یہی ولولہ تھا کہ سو دو سو آدمیوں کو کاٹ کے پھینک دوں اور لطف یہ کہ تلوار خود جوش بڑھاتی تھی۔ دل کو حوصلہ دلاتی تھی۔

بولی یہ تیغ دم سر اعدا پہ لوں گی میں
برُّش پکاری تو یہ ٹھہرنے نہ دونگی میں

کرنل: اور ایک سوار کی بھی تعریف کریں گے۔ وہ بھی ستم ڈھا رہا تھا۔ اس کی شمشیر زنی اور جرأت کے ہم بھی قائل ہیں۔

اسپلٹن: مگر مار ڈالا گیا بیچارہ۔ عجب مقام نازک ہے کیا کہوں

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ برکنار

افوہ۔ ایک تو آبادی کے جنگ میں ہم کس قدر بچے ہیں کہ الامان الامان۔ گولی آئی اور سن سے نکل گئی اس پہلو سے معاً دوسری گولی آئی اور سن سے نکل گئی۔ ہنوز سنبھلے نہ تھے کہ تین گولیاں تابڑ توڑ آئیں۔ اب بچیں تو کہاں سے بچیں مگر خدا کی شان ایک تو آتے ہی آتے ٹھنڈی ہو گئی دوسری گولی سن سے نکل گئی۔ تیسری تو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ مگر خدا نے نلوہ بچایا۔ ورنہ خدا جانے کیا کیفیت ہوتی۔

اتنے میں ایک دودھ والی دودھ بیچتی ہوئی آئی اس نے کہا میں خاص پلونا سے آئی ہوں۔ وہاں کا حال کچھ نہ پوچھو۔ سپہ سالار دن رات نقشہ دیکھا کرتے ہیں۔ دن اور رات میں بہت کم سوتے ہیں۔ ہر دم دہر لحظہ یہی فکر رہتی ہے کہ کسی تدبیر سے نکل بھاگیں گو اس صورت میں بھی یہ خرابی واقع ہو گی کہ پلونا سا مقام روسیوں کے قبضے میں آجائے گا۔ آپ لوگ تو اس طرف کارروائی کر رہے ہیں مگر آپ کو یہ خبر ہی نہیں کہ پلونا کے شمال کی جانب کیسی جنگ ہو رہی ہے۔ خون کے دریا بہہ گئے۔ تین دن برابر لڑائی رہی۔ بڑے معرکے کی جنگ تھی۔ یہ کہہ کر عسکری پاشا کا خط ایک کرنل کو دیا اور کہا پلونا کے سپہ سالار نے مجھے بلا کر

یہ خط دیا تھا، اور کہا تھا کہ جس قدر ممکن ہو فوراً آزاد پاشا کی فوج میں پہنچاؤ۔ اگر اس کا جواب دیجیے گا تو میں لے جاؤں گی۔ خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

خیر خواہانِ سلطنتِ رفیعہ روم کو مژدہ تازہ اور نوید بے اندازہ کہ قلعہ پلونا کے شمال میں تین روز تک معرکہ دار و گیر اور میدان رستخیز گرم رہا، مومنوں کی فوج جرار اور افسران کرار نے خوب دادِ شجاعت دی، گولی اور تلوار دونوں کی لڑائی میں پالا ہمارے ہی ہاتھ رہا۔ جب تلوار چمکی دھوپ شرما گئی۔ جدھر گئی ادھر۔

اللہ کے غضب کی نشانی دکھا گئی — دریائے قہر حق کی روانی دکھا گئی

جل جل گئے وہ شعلہ فشانی دکھا گئی — کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی

لب صورتِ شگاف قلم بند کر دیے

فقروں کے ذوالفقار نے دم بند کر دیے

فوج عدو میں غل مچ گیا کہ تلوار نہیں موت کی ماں جائی بہن ہے چلی اور جان بدن سے نکل گئی قریب آئی، اور روح نے پرواز کیا۔

چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق

رو کیں کسے رکی ہے کسی کی سپر سے برق

بجلی کہیں کسی کے روکے رکی ہے، تین دن تک یہی مصیبت رہی۔ گولوں کا مینہہ برس رہا تھا۔ گولیوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ تیسرے روز فوج عدو ہٹ گئی اور میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ مگر پلونا میں داخل ہونا محال ہے اگر فوج کمکی آئی تو ہو المراد۔ ورنہ ہم لوگ جان پر کھیل جائیں گے اور پلونا میں داخل ہونے کی کوشش بلیغ کریں گے۔

آزاد: شکر ہے۔ کسی طرف سے فتح کی تو خبر آئی۔ الحمد للہ۔

کرنل: مگر زیادہ خوشی تب ہوتی، جب یہ خبر سنتے کہ عسکری پاشا ابھی سپاہ لے کر پلونا میں داخل ہو گئے۔

اب سنیے کہ پلونا کی راہ سے ایک مسافر آتا تھا۔ جس کو سواروں نے گرفتار کر لیا اور آزاد پاشا کے پاس لائے۔

آزاد: اس بیچارے کو کیوں پھانس لائے۔ اب کوئی تمھارے مارے سفر نہ کرے، اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ جاسوس ہے۔ چھوڑ بھی دو۔

سوار: خداوند یہ سب جاسوس ہیں اور یہ عورت جو دودھ بیچنے آئی تھی یہ بھی سکھائی پڑھائی تھی۔ ان کا ہرگز

اعتبار نہ کیجیے گا، قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔

آزاد: اللہ اکبر۔ یہ دغا بازی۔ ایک درویش بن کے آئے، کل حال دریافت کر لے گئے۔ دوسری دودھ والی بنی۔ اب یہ مسافر بن کے آئے ہیں۔

سوار: اس کے دونوں کان کاٹ لیے جائیں، تو خوب ہو۔ اکثر ملکوں میں قاعدہ ہے کہ ڈاکوؤں کے کان کاٹ لیتے ہیں تاکہ جہاں کہیں جائے فوراً لوگ سمجھ لیں کہ ڈاکو ہے۔

آزاد: چہ خوش۔ تو وہ ڈاکوؤں کے بھی کان کاٹتے ہیں۔

اس مسافر کی تحقیقات کی گئی اور سوالات ہونے لگے۔

سوال: تم کس ملک کے باشندے ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔

جواب: ہم جرمن کے باشندے ہیں۔ یہاں علم جیالوجی کی تحقیقات کے لئے آئے ہیں۔ ہم کو اس کا بڑا شوق ہے۔

سوال: جنگ کے زمانے یہاں آنا کیا ضرور تھا۔

جواب: ہم کو جنگ اور صلح سے کیا واسطہ۔ طالبعلم آدمی ہیں۔

سوال: سنسکرت زبان سے کچھ واقف ہے یا نہیں جانتے۔

جواب: بخوبی تمام واقف ہیں۔ برسوں سنسکرت پڑھی۔ ہمارے ملک کا ایک ایک بچہ انگریزی خواں ہیں۔

سوال: جنگ کا کیا حال ہے۔ پلونا کی جانب سے آئے ہو نہ۔

جواب: پلونا کے شمال میں ایک جنگ ہوئی تھی جس میں ترکوں نے فتح پائی۔ تین چار روز تک لڑائی رہی۔ روسی بھی دل کھول کر لڑے اور ترک بھی آخر کار روسیوں نے غنیم کو پیٹھ دکھائی اور شکست فاش پائی۔

سوال: اب ترکوں کا وہ لشکر کہاں ہے جو فتحیاب ہوا تھا۔

جواب: پلونا سے دو کوس کے فاصلے پر مگر آگے نہ بڑھنے پایا۔ روسیوں نے گو شکست پائی مگر ترک اس سبب سے آگے نہ جا سکے کہ روسیوں کے کئی ہزار آدمی پلونا کے قریب لین باندھے بہت مستعدی اور مضبوطی سے کھڑے تھے۔ آپ لوگ اگر ان کو مدد دیں تو سبحان اللہ۔

آزاد پاشا اس قسم کی تحقیقات میں بالکل ناآزمودہ تھے۔ اینڈے بینڈے سوالات کیے۔ جیسے کوئی مطلب نہ نکلا۔ پھر ایلیٹن پاشا نے سوالات کیے تو مسافر گڑبڑا گیا۔ بغلیں جھانکنے لگا۔ انھوں نے ہر سوال کے جواب میں اس کو جھپا دیا اور آخر کار کامل ثبوت بہم پہنچایا کہ یہ شخص جاسوس ہے وہ ذات شریف گرفتار کیے گئے، اور سخت ذلیل ہوئے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے آدھ کوس کے فاصلے پر لشکر عظیم مثل طوفان آب موجزن ہے۔ دو بلینوں

کے ذریعے سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ترکی فوج مدد کے لیے آتی ہے۔ کل اہل لشکر نے نعرۂ خوشی بلند کیا اور اکثروں نے ٹوپیاں اُچھال دیں۔ دم کے دم میں سپاہ آن پہنچی، یہ لشکر بسرکردگی ریاض پاشا حسب الحکم سلطانی روانہ کیا گیا تھا۔ اس میں سترہ ہزار سوار اور دس ہزار پیادے اور چالیس توپیں تھیں۔ مگر جوان سب نوخیز اور کرارے اور شہزور۔ افسر سب جبری اور تجربہ کار۔ افسر اعلیٰ یعنی ریاض پاشا جنگ کریمیہ میں شریک ہو چکے تھے۔ فرانس اور جرمن کی لڑائی دیکھے ہوئے تھے اور معاملات حرب خوب سمجھتے تھے آزاد پاشا، ریاض پاشا اور سب افسروں نے باہم مصافحہ کیا اور آخری جنگ کا حال بیان کر کے کہا کہ اب انشاء اللہ کل اور بھی کار نمایاں کیا جائے گا اور ایسا کار نمایاں ہو گا کہ یادگار ہو گا۔

سانحۂ جگر دوز

بمبئی کی پری جہرہ بیگم جو حُسن آرا کی بہنوں میں تھیں، ہر ہفت آرائش سے مزین ہو کر بناؤ چناؤ کے ساتھ نازک پلنگڑی پر متمکن ہوئیں بشّو مہری سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ یہ وہی بیگم صاحب ہیں جن کے ہاں آزاد فرخ نہاد فروکش ہوئے تھے۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ شوخ چنچل آزاد سے محبت رکھتی تھی۔ محبت کی وجہ یہی تھی کہ آزاد پر حسن آرا بیگم جان دیتی تھیں۔ حُسن آرا ان کی خالہ زاد بہن تھیں۔ خیر بیگم صاحب نے اچھتی سے کہا۔ پرسوں سپہر آرا بیگم کی شادی تھی۔ مرزا ہمایوں فر بہادر کی تصویر ہمارے پاس بھی بھیجی ہے۔ وہ صندوق تو اٹھا لاؤ جس پر سنہرہ غلاف ہے۔ بشّو جان چستی و چالاکی کے ساتھ گئیں اور صندوق لائیں۔

بیگم : اے ہے۔ کسی کور تو نہیں آتی ہے۔ تم کو دتوندھی آتی ہے۔ صندوق کا پتا دیا کچھ، لائیں کچھ۔ واہ۔ اے وہ صندوقچی لاؤ۔ جس پر سنہرہ غلاف ہے۔

بشّو جان : (تھوتھو کر کے) حضور اس بیماری کا نام زبان پر نہ لایا کیجیے۔ اس کے نام سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایک دن کوئی سات بجے ہوں گے، بڑے آغا صاحب کی سرکار میں نوکر تھی۔ گھنٹا بیگ کی گڑھیا کی طرف سے آتی تھی۔ راہ میں ایک آدمی نے کہا کون جاتا ہے۔ میاں خدارا ہم کو ذری راستہ بتادو۔ میں سمجھی کہ مجھ کو میاں بنایا۔ اور راستہ بتانے کو کہتا ہے۔ کوئی اندھا ہے۔ میں نے کہا میاں آنکھوں سے سوجھتا نہیں تو رات کو نکلے کیوں تھے۔ کہا آنکھوں سے سوجھتا ہے مگر رات کو نظر نہیں آتا۔ پوچھا کہاں جاؤ گے کہا کاظمین کی طرف۔ میں بھی کاظمین ہی میں رہتی تھی۔ میں نے کہا چلو اچھا ساتھ ہوا۔ چلتے چلتے ایک گلی میں کھڑا ہو گیا اور اندھیاری رات آدمی نہ آدم زاد۔

بس ایک میں اور دوسرے وہ باقی خیر صلاح۔

بیگم: اور وقت کیا تھا کوئی آدھی رات ہو گی۔

شبّو: نا بیوی۔ آدھی رات کہاں۔ اے کوئی سات ساڑھے سات بجے ہوں گے۔ بس یہ سمجھیے کہ آٹھ کا عمل ہو گا اور اندھیاری۔

بیگم: اور گلی کا واسطہ۔ کیا گر پڑا کیا ہوا وہاں۔

شبّو: میں نے کہا یہاں کیوں ٹھٹکے ابھی کاظمین ذری دور ہے۔ اے بس سرکار اتنا کہنا تھا کہ جھپٹ کے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

بیگم: واہ ہے۔ تو کیا اندھا بنا ہوا تھا۔ کوئی۔ کیا دنیا ہے۔ پھر کچھ دست درازی کی۔ کوئی چور چکار تھا کیا۔

شبّو: سنتی جائیے۔ ہاتھ پکڑ لیے تو میں دھک سے رہ گئی۔

بیگم: بات ہی ایسی تھی۔ غیر مرد۔ اندھیری رات اور گلی کا واسطہ طبیعت کیونکر ٹھکانے رہے بھلا ہم کو تو غش آجاتا۔

شبّو: ہاں حضور پھر ہم لوگ تو بازار کے جانے والے۔ گلی کوچوں کے پھرنے والے۔ جو ڈریں تو حضور کی تابعداری کیسوں کریں۔ بس سرکار اس نے جو میرے دونوں ہاتھ پکڑے تو میں بہت ڈری۔ جھٹکا دیا مگر ہاتھ کیوں کر چھوٹے۔ مرد پھر مرد ہے، اور عورت لاکھ ہو پھر عورت ہی ہے۔ تب تو میں نے غل مچا کر کہا۔ ہاتھ چھوڑ موئے تجھ پر خدا کی مار اللہ کرے تیری کھٹیا چھپاتی ہوئی دیکھوں۔ لوگو دوڑو چور ہے۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور دو انگوٹھیاں نکال لیں، چھلے پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ایک آدمی آن پڑا۔ اس کو دیکھ کر چور بھاگا۔ اب میں للکارتی ہوں کہ لینا لینا چور ہے چور ہے۔ وہ میری صورت دیکھتا ہے۔ کہتی جاتی ہوں چور ہے۔ وہ سامنے آجاتا ہے، اور موا میرا منہ دیکھتا ہے۔ میں جلی ہوئی تو تھی ہی، ایک دوہتڑ منہ پر لگایا۔ اتنے میں دس پانچ آدمی جمع ہو گئے اور سب نے اس کو قائل معقول کیا کہ مردوا بنا ہے، اور ایسا بودا۔ کہنے لگا۔ وہ صاحب ہمیں کیا پڑی تھی کہ کسی کے پھٹے میں پانوں ڈالیں۔ تو حضور اس بیماری کے نام سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

بیگم: آج بائیں آنکھ پھڑکی تو آزاد آئے۔ اب کی برس دیکھیں کیا خوشی ہوتی ہے سپہر آرا کے بیاہ کا خط آتا ہو گا کہ اتنا جہیز دیا۔ اور اس قدر مہر ہوا۔ اے ہاں خوب یاد آیا وہ صندوقچی اٹھا لاؤ۔

شبّو جا کے وہی صندوقچی اٹھا لائی۔ جس میں تصویریں تھیں۔ بیگم صاحب نے کھولی اور کہا دیکھو ہمایوں فر کی یہ تصویر ہے۔ کیا جوان ہے۔

شبّو: ماشاءاللہ سے کلے ٹھلے کے گبھرو ہیں۔ اے یہ تو ہمارے یہاں کے شہزادے ہیں۔ واہ کیا میں جانتی نہیں ہوں۔ دو دن سے بمبئی میں رہی تو کیا ہوا۔ کیا ان کو دیکھا نہیں ہے۔ خورشید لقا بیگم کے بھائی ہیں۔

بیگم : ہاں۔ مہ لقا چھوٹی بہن ہے اور خورشید لقا بڑی بہن کا نام ہے۔ میں خورشید لقا بیگم کے ہاں نوکر رہ چکی ہوں، میں تو نہیں نوکر تھی، اماں نوکر تھیں مگر ان کے میاں کا ایسا اچھا مزاج تھا کہ میں کیا عرض کروں، ذرا کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ بڑے سیدھے بیچارے اور لوگوں کی طرح نہیں تھے۔ بعض مردوے بُرے ہوتے ہیں۔ ایک دن لکھنؤ میں لالہ ہربنس کی دکان پر میں چکنی ڈلی خریدنے کے لیے آئی تھی تو ایک شخص یہ شعر گانے لگا۔

حجاب آئے انھیں کیونکر نہ شبنم کے دوپٹے میں
کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ حیدر جابجا پہلے

میں مسکرادی تو دکان پر بڑا قہقہہ پڑا۔

بیگم : اور تم سے مسکرایا کیونکر گیا۔ بڑی ڈھیٹ ہو۔

شبّو : اے تو وہاں کوئی غیر تھوڑی ہی تھا۔ لالہ روز کا آنے والا۔ دوسرے تیسرے سرکار میں آتا تھا اور منّے میاں سے ہمارے بھائی سے جان پہچان۔ ایک اور لالہ بیٹھے تھے ان کا سن کوئی اسّی برس کا تھا۔

بیگم : اب کی چاند ہو تو ہم بھی جائیں۔ مہینے دو مہینے چہل پہل ہنسی دل لگی رہے گی۔ کئی برس سے یہاں رہے۔ اب جی نہیں لگتا۔

شبّو : ہمارے سرکار کا بھی تو قصد ہے۔ کل تو باتیں کرتے تھے کہ ضرور ضرور جائیں گے اور دو چار مہینے رہیں گے۔ ایک دو دن نہیں۔

بیگم : دو مہینے کے لیے جاتے ہیں۔ رہتے تو اسی تقریب بھر مگر صاحب نے کہا کہ یہاں نمائش گاہ ہوگی۔ آپ کو بندوبست کرنا پڑے گا۔ اب صاحب کا کہنا کیونکر نہ مانیں اور سب سے بڑے صاحب ٹھہرے۔

شبو : ہاں پھر یہ تو ہے ہی۔ مگر حضور جو لطف اب ہوتا، وہ کہاں ہوگا۔ یوں تو جب جائیں تب لطف ہے۔ حسن آرا بیگم کا مزاج چھوٹی بہن سے اچھا ہے، وہ ذری ذری تیز ہیں۔

بیگم : دونوں کا مزاج اچھا ہے۔ حسن آرا ذرا مستعلیق ہیں، اور سپہر آرا کے مزاج میں تیزی ہے۔ بس اتنا فرق ہے مگر دونوں بہنیں پڑھی لکھی خواندہ۔ شہر میں ان کی سی ایک تو ہوگی نہیں۔

شبّو : اس میں کیا شک ہے حضور۔ تو اب چاند کو کتنے دن ہیں۔ آج کو تھی ہے۔ ہوگی کوئی ساتویں۔

بیگم : آج پانچویں ہے۔ جمعرات کو چاند ہوا تھا اور بیس سے نمائش گاہ شروع ہوگی۔ کوئی چار دن رہے گی۔ بڑی بڑی دور سے صاحب لوگ آئیں گے اور بڑی دھوم ہوگی۔

شبو : بھلا ہم لوگ بھی جانے پائیں گے یا نہیں، کیا ہرج ہے کیا، ہم تو مرزا صاحب سے کہیں گے کہ سرکار ہم کو بھی لے چلیں۔

بیگم : ضرور۔ ہزار کام چھوڑ کر۔ تم نہ جاؤ گی تو پھر کون جائے گا۔

شبّو نے کہا کیوں بیگم صاحب یہ تو انوکھی بات ہے کہ حُسن آرا بیگم نے آزاد ایک اجنبی کو ولایت بھیج دیا، اور کہا کہ اگر تم لڑائی سر کر کے آؤ تو ہم تمھارے ساتھ شادی کر لیں۔ یہ بات آج تک کبھی ہوئی نہ تھی کسی شریف بہو بیٹی سے ایسی بات کاہے کو ہوئی ہوگی۔

بیگم : تم سمجھیں نہیں، پہلے پہل چوٹ کھائی تھی نہ۔

شبّو : وہ لاکھ چوٹ کھائی، مگر پھر شریفوں میں اور ان میں کچھ فرق بھی ہے یا نہیں۔ اور ہمیں بہت تعجب ہے کہ بڑی بیگم صاحب نے کیسے جائز رکھا۔ ان کو بھی بُرا نہ معلوم ہوا۔

بیگم : جس طرح ہم یہاں رہتے ہیں، اس طرح بھلا شہر میں رہ سکتے ہیں، یا جس طرح مہاراجہ کی عورتیں گھوڑے پر سوار ہوتی ہیں۔ اس طرح ہماری طرف کسی عورت کو دیکھو گی۔ یہ تو فقط رسم اور رواج کی بات ہے۔

شبّو : آپ کی بڑی انتظاری کریں گی۔ سب کے سب منتظر ہوں گی۔

بیگم : حسرت دید ہمیں بھی مارے ڈالتی ہے۔ جس دن آزاد یہاں سے گئے ہیں کیا کہوں کہ میرا کیا حال تھا۔ افوّہ کچھ نہ پوچھو۔ لاکھ لاکھ ضبط کیا مگر جب دل سے لگی ہو تو پھر ضبط نہیں ہو سکتا۔ دل بھر آیا اور اشک جاری ہوئے۔ بھید ایک ایک پر کھُل گیا۔ ان کے رخصت ہونے کے وقت دل ہی میں کوفت کھایا کی۔ اف تک نہ کی۔ چپ۔ لب بند۔ مگر آنکھیں پُر نم ہونے لگیں۔ اللہ کرے جس طرح انھوں نے پیٹھ دکھائی تھی اسی طرح منھ بھی دکھائیں۔ ان کا حال بھی مارے رنج فرقت کے بے طور تھا۔ مگر مجبوری اور ان کے ساتھ ایک بونا بونا تھا۔ خوجی۔ اے ہے میں کیا کہوں کتنا ہنساتا تھا کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اور ہنستے ہنستے لوٹنے لگتی تھی، مگر جتنا ہنسی نہ تھی اتنا ہی رخصت کے وقت روئی۔ ساری کسر نکل گئی۔

شغل گریہ مدام تھا مجھ کو

آہ و زاری سے کام تھا مجھ کو

جب سے گئے کوئی خط بھی نہ بھیجا بڑے بے مروّت نکلے۔

جیسے گیوری موری سدھ ہی نہ لینی کیسو کٹھن کٹھور کیسو کٹھن کٹھور

جب سے گیو موری سدھ ہی نہ لینی کیسو کٹھن کٹھور . . . .

شبّو : صدقے۔ اس گلے کے صدقے۔ اللہ جانتا ہے۔ کیا آواز پائی ہے۔

بیگم : چپ چپ (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) چپ کہیں سُن نہ لیں۔ ہم نے ان کے سامنے کبھی نہیں گایا۔

شبّو : تو سرکار یہاں ہیں کہاں، وہ تو باہر شطرنج کھیل رہے ہیں۔

بیگم : دیوار ہم گوش دارد، فہمیدہ لب بجنباں۔ دیوار کے بھی کان ہیں۔ ہم نے جیسے میاں پائے ہیں ویسے چراغ لے کے بھی ڈھونڈھو تو نہ ملیں۔ پھر ہم ان کی تابعداری دل وجان سے کیوں نہ کریں۔ وہ کون ہوتی ہیں جو بڑی سوروالی کھولا سے نباہ کرتی ہیں۔ وہ کون ہوتی ہیں جو بدمزاج میاں کے ساتھ مل جل کے رہتی ہیں۔ مکان کے پڑوس ایک بزاز رہتا تھا۔ مذہب کا ہندو وہ ایک ہی کنجوس تھا۔ چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے۔ کھانا تک تول تول کے دیتا تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ذرا سی بات ہوئی اور پیٹنے لگا۔ قصائی۔ مگر اس کی جورو۔ واہ ری نیک بخت۔ ایسی عورت بھی نہیں دیکھی، روز مار سہتی تھی گالیاں کھاتی تھی پٹتی تھی لیکن کبھی اف تک نہ کرتی تھی۔ میں اس بیچاری پر بڑا ترس کھاتی تھی۔

شبو : حضور ہماری آنکھوں کی دیکھی یہ بات ہے کہ ایک قلعی گر کی جورو کو اس کا میاں بس یہ کیفیت تھی کہ اٹھتے جوتی بیٹھتے لات، اوپر کیوں دیکھا نیچے کیوں دیکھا۔ سیدھی کیوں چلی۔ ٹیڑھی کیوں چلی۔ ہائے اللہ۔ اور وہ اس قدر کی قبول صورت تھی کہ کئی رئیسوں نے پیغام بھیجے، مگر وہ میاں کو چھوڑ کر نہ گئی۔ نہ گئی۔ یہاں تک کہ اس کمبخت نے دوسری شادی بھی کی مگر وہ وفادار ہی رہی۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ زیبن باہر سے کئی خط لائی۔ بیگم صاحب نے کہا کیا ڈاک پر آئے ہیں، زیبن بولی ہاں حضور۔ پوچھا پڑھے نہیں، کہا پڑھے کون۔ سرکار تو چھوٹے میاں کے ہاں چلے گئے۔ شطرنج بچھی ہے۔ اور سب کے سب جمع ہیں۔ محلہ بھر۔ بیگم صاحب نے تنک کر کہا، جا کے ابھی بلا لاؤ۔ کہو اس شطرنج کو آگ لگے۔ جب دیکھو شطرنج کا ہی شغل رہتا ہے۔ کھانا، پینا اس کی بدولت چھوٹ گیا۔ موئی بُری لت ہے کہ توبہ توبہ۔ جا کے کہو ابھی بلایا ہے سب کے سامنے کہنا کہ بیگم صاحب خفا ہو رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ خط تو پڑھ جاؤ۔ زیبن چھوٹے میاں کے ہاں گئی اور کل حاضرین کے روبرو کہا۔ حضور بیگم صاحب اس وقت بہت خفا ہیں ابھی اسی دم بلایا ہے۔ شطرنج کو چھوڑیے کئی خط آئے ہیں چل کے پڑھ دیجیے۔

مرزا صاحب کے احباب نے قہقہہ لگایا ایک نے کہا جائیے جائیے۔ بسم اللہ۔ اب ایسا نہ ہو کہ بیگم صاحب خود چلی آئیں۔ دوسرا بولا کیا نادری حکم ہے۔ تیسرے نے کہا گئے اور پٹے۔ بے پٹے اب نہیں آتے اور واقعی سچ کہتی ہیں۔ اس کے کیا معنی۔ دن رات شطرنج۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، شطرنج ہی شطرنج۔ خواب میں بھی شطرنج ہی سوجھتی ہوگی۔ جاؤ تو بچہ دیکھو کیسی بے بھاؤ کی پڑتی ہیں کہ عمر بھر یاد کرو۔ چوتھے نے کہا۔ بھائی جان گر بہ کشتن روزِ اول، مرزا صاحب نے کہا تم کہا کرو۔ ہم تو جائیں گے اور ضرور جائیں گے نہ جانا کیا معنی یہ کہہ کر مرزا صاحب چلے گئے، مگر وعدہ کر گئے کہ بازی بدستور قائم رہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ گھر میں گئے تو دیکھا بیگم صاحب ناک بھوں چڑھائے ہوئے۔ بیٹھی ہیں۔

مرزا صاحب : اوہ۔ اس وقت تو بہت ہی بگڑی ہوئی بیٹھی ہیں۔ خدا خیر کرے بیگم صاحب (مسکرا کر) بیگم صاحب،

یاالٰہی۔ مزاج ہی نہیں ملتے۔ یا خدا۔

بیگم: یہ دل لگیاں ہم کو نہیں بھاتیں شطرنج نہ ہوئی وہ ہوگئی۔ خط آئے ان کا پڑھنا تک محال ہے۔ ڈاکیے کو حکم دیا کہ جاؤ ڈیوڑھی پر خط بھجوادو۔ واہ واہ واہ۔ ابتک یہاں جما ہوا تھا اب چھوٹے میاں کے ہاں پہنچے۔

مرزا صاحب: خط لاؤ دیکھیں کس کس کا خط آیا ہے، اخاہ۔ ایکدم سے اتنے خط کچھ ٹھکانا ہے۔ ایک دو نہیں۔ دس بارہ۔ سب کے پہلے حسن آرا کا خط نظر سے گزرا۔ لفافہ دیکھتے ہی کہا۔ حسن آرا کا خط ہے۔ کھولا پڑھا اور بیگم صاحب کو سنایا۔ عبارت درج ذیل ہے۔

باجی جان بندگی۔ مرزا ہمایوں فر بہادر کی تصویر پہنچی ہوگی۔ خوش ہوئی ہونگی کہ سپہر آرا کا دولہا ایسا خوشرو اور وضعدار جوان ہے۔ اس شہزادے سے تمام دنیا کے لوگ خوش ہیں، لیاقت کا یہ عالم کہ شاعریہ نثاریہ، منطق، علم ادب، عربی، فارسی، انگریزی سب میں طاق۔ عالی خاندانی کا حال کہنا بیکار ہے۔ کون نہیں جانتا کہ شہزادے ہیں۔ بادشاہ جہاں پناہ کی اولاد، سعادتمند، معقول پسند، باوضع، ملنسار، حسین، پابندِ صوم وصلوٰۃ اور حسن تو خدا نے ایسا دیا ہے کہ لاکھ دو لاکھ میں انتخاب۔ اماں جان نے بڑی منتیں مانی تھیں کہ دونوں لڑکیاں اچھے گھر جائیں۔ ایک تو ٹھکانے لگی، دوسری کا خدا حافظ ہے۔

اس قدر پڑھ کر مرزا صاحب بے اختیار ہنس پڑے، اور بیگم صاحب بھی خوب کھلکھلائیں، واقعی یہ فقرہ ہی ایسا تھا اپنی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ایک تو ٹھکانے لگی، دوسری کا خدا حافظ ہے۔ خواہ مخواہ ہنسائے گا۔

مرزا صاحب: اور یہ خبر ہی نہیں ہے کہ دوسری اس سے اچھے ٹھکانے لگے گی۔ آزاد پاشا سا مشہور آدمی ملے گا۔ جس کے نام سے ساری دنیا واقف ہے۔

بیگم: کیا معلوم کیا ہوگا۔ انسان تو سب کچھ سوچتا ہے۔ مگر جب ایسا ہو بھی ویسا ہوتا کہاں ہے۔ جب آزاد آئیں تب کی بات ہے۔

مرزا صاحب: اب تو خفگی دور ہوگئی حضور کی۔ ہم تو پوچھتے ہیں۔ مزاج شریف۔ آپ ناک بھوں چڑھائے بیٹھی ہیں۔ واہ۔ انصاف۔

بیگم: اچھا اب ختم کرو۔ خط تو ختم کرو کہیں جلدی سے۔

مرزا صاحب نے بقیہ خط سنایا — اس وقت جانی بیگم اور نظیر بیگم اور روح افزا بہن، بہار النساء بہن، جہاں آرا بہن، گیتی آرا، نواب جان، امراؤ جان، عمدہ خانم سب یہاں ہی ہیں۔ اور جانی بیگم سے چہل ہو رہی ہے۔ تم کو سب یاد کرتی ہیں۔ مگر تم نے آنے کی قسم ہی کھائی ہے۔ اماں جان نے جب دولہا بھائی کا خط سنا تو بہت جھلائیں کہ ایں سپہر آرا کی شادی ہو اور دور دور سے مہمان آئیں۔ غیر غیر شریک ہوں اور بہنیں شریک نہ ہوں اور سنو وہ کہتی ہیں

کہ نواب دولھا تو ایسے نہیں ہیں یہ ساری کارستانی اس چھوکری ہی کی ہے ۔ وہ تمھیں الزام دیتی ہیں اب اس کا کیا علاج ہے تار بھیجا تھا پہنچا تھا۔ اماں جان نے حکم دیا کہ اسی دم تار پر خبر دو کہ ضرور بالضرور آؤ۔ مگر اب آنا معلوم سپہر آرا کہتی ہیں کہ واہ باجی بس دیکھ لیا۔ ایسی ہی بہنیں ہوتی ہیں بہت کہا کرتی تھیں۔ کہ ہم کو سپہر آرا کا بڑا پیار ہے سب بہنوں میں انھیں کی سب سے زیادہ محبت ہے مگر جاؤ۔ اب قلعی کھل گئی۔ زبانی داخلہ تھا۔ بہار النساء بہن تم سے بہت خفا ہیں۔ کہتی ہیں کہ اب دیکھیے کب ملنا ہو۔ یہ بہانہ تھا۔ غرضیکہ تمھارے نہ آنے سے۔ یہاں سب کو بہت رنج ہوا۔ رنج ہوا ہی چاہیے۔

دولھا بھائی بندگی۔ واہ واہ وعدے کے کتنے سچے ہیں۔ آپ اور چلتے وقت قسمیں کھا گئے تھے ضرور آؤں گا)۔

حسن آرا۔

بیگم: بندگی۔ دیکھا وہی بات ہوئی نہ۔ سب کی شکایت رہی۔

مرزا صاحب: تو اب اس میں ہمارا کون قصور ہے۔ ہم اس کو کیا کریں۔ بتاؤ۔ صاحب گورنر نے روک لیا۔ اتنے بڑے حاکم کا کہا کوئی ٹالتا ہے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔

بیگم: ہاں! سچ ہے اور جو ابھی تمھاری بہن کے ہاں شادی ہوتی تو ہم دیکھتے کیونکر نہ جاتے۔ تم کو سسرال والوں کی ذرا الفت نہیں۔

مرزا: ایں سبحان اللہ ہم تو اپنے خاندان میں بدنام ہیں کہ یہ سسرال والوں کے ہاں بک گیا۔ چہ خوش۔ ادھر وہ طعنے دیں۔ ادھر تم طعنے دو۔ بیچ میں ہم تو بنیں۔ ماشاء اللہ۔

بیگم: اچھا اس خط کا جواب تو بھیج دو۔ ذرا نرمی سے لکھنا۔

مرزا صاحب نے کہا اب اس وقت تو ہم جاتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے بازی چھوڑ کے آیا ہوں۔ اب کل لکھوں گا۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب تشریف لے گئے تو شام کو گھر آئے۔ بیگم صاحب نے گلوریاں بنا کر کھلائیں۔

تختوں پر فرش مکلف بچھا تھا۔ میاں بیوی بیٹھے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے کہ خدمتگار نے باہر سے مہری کو آواز دی۔ اور کہا تار آیا ہے لے جاؤ۔ مرزا صاحب نے کہا یا خدا ایک تار ابھی دس دن ہوئے آچکا ہے۔ ایک اب آج' یہ کیا آیا ہے۔ مہری تار لائی۔ انھوں نے کھولا اور پڑھا تو (ارے!) کہہ کر رونے لگے۔ بیگم صاحب نے کہا۔ ہے ہے یا میرے خدا خیر کیجیو۔ ارے کیا ہوا رو رو کر کچھ کہو تو۔ مرزا صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ چہرے پر زردی چھاگئی۔ آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے۔ بیگم صاحب نے سر پیٹنا شروع کیا۔ سمجھ گئیں کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ گریہ و زاری بے وجہ نہیں ہے۔ معاً شک ہوا کہ بڑی بیگم کے یہاں سے تار آیا ہے اور بے خبر زار زار رونے لگیں۔ آخر کار مرزا صاحب نے ہمایوں فر کے سانحہ کا حال بتایا تو بیگم صاحب آٹھ آٹھ آنسو روئیں۔

ثریّا بیگم کی شادی اور پری زادوں کا جھرمٹ

بیا ساقی آں بادہ بردار زود — کہ بے بادہ شادی نباید نمود
مغنی کجائی بزن بربطے — بیا ساقیا پُر کن از مے بطے
کہ باہم نشینیم و عیشے کنیم
و مے خوش برآریم و عیشے کنیم

معشوق عنبر پری پیکر ثریا بیگم یہاں وہی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ پریوں کا جھرمٹ، کم سن نوجوانوں کے جم گھٹے۔ آپس کی چہل اور ہنسی سے لطف صحبت دو بالا تھی۔ جتنی خواتین مہمانی کے لیے آئی تھیں سب حسین و مہ جبین، سب گلپوش، آفتِ جاں، عدوے صبر و ہوش اور ثریا بیگم کا جوبن ان سب پر فوق لے گیا تھا۔ ایک تو یوں ہی یوسف جمال زہرہ تمثال تھی۔ اس پر نکھار اور سنگھار نے اور بھی طرہ کیا۔

ع یکے خود ماہ رو بودی، دگر آراستی خود را

لب او چہ لب شود بازار ہا — درو قند و شکر بخروار ہا
سمن را تماشا در آغوش او
تماشہ کہ گل بنا گوش او

کئی نوخیز بیگمات عصمت سمات مزے مزے کی گفتگو کر رہی تھیں کہ مغلانی نے آن کر کہا حضور رام نگر سے اصغر میاں کی بیوی آئی ہیں ابھی ابھی بہلی سے اتریں۔ بڑی حضور سے باتیں کر رہی ہیں۔ جانی بیگم نے پوچھا کون آئی ہیں۔ اصغر میاں کون ہیں کوئی دیہاتی بھائی ہیں۔ اس پر حشمت بہو بولیں۔ (از برائے خدا خاموش رہو بہن! وہ دیہاتی نہیں، اس سے بھی بدتر سہی۔ اب تو ہماری مہمان ہیں۔ آسمان جاہ نے کہا۔ ہاں ہاں۔ تمیز سے بات کیا کرو۔ مگر وہ جو آئیں ہیں ان کا نام کیا ہے۔

ثریا بیگم نے آہستہ سے کہا (فیضن)۔ اس پر دو تین شوخ بیگموں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

حشمت بہو: واہ کیا پیارا نام ہے۔ فیضن۔ کوئی میراثن ہے کیا؟

ثریا بیگم: تم آج لڑاؤ گی۔ خود را فضیحت دو دیگراں نصیحت۔ جانی بیگم کو تو سمجھاتی تھیں۔ اور خود یہ کیفیت ہے۔ اے واہ۔ وا۔ واہ۔

آسمان جاہ: دیہات کے تو یہی نام ہیں۔ وہاں بیگم اور خانم سے نفرت ہے۔ عمدہ، محمدی، زیبن، زینت، یہ نام ہوتے ہیں۔

ثریا بیگم: واہ۔ عمدہ ان کی ساس کا نام ہے۔ یہ جو آئی ہیں ان کی ساس کا نام عمدہ ہے۔ بڑی خوش مزاج عورت ہے۔ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فیضن تشریف لائیں اور مسکرا کر کہا۔ مبارک ہو۔ جتنی بیٹھی تھیں سب زیر لب مسکرائیں۔ فیضن کی وضع ہی سے دیہاتی پن برستا تھا۔ ان کی بہن کا نام کریم النساء تھا۔ ثریا بیگم نے ان سے آہستہ آہستہ باتیں کیں۔ فیضن نے پوچھا۔ بہن آج ہی برات آئے گی نہ اور کون کون سی رسم ہوئی۔ ہم تو پہلے ہی آتے مگر ہمارے دیور کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ اس لیے ذری دیر ہو گئی۔ آسمان جاہ ان کی طرف مخاطب ہوئیں، پوچھا بہن تمھارا نام کیا ہے۔ کہا فیضن۔ پوچھا تمھارے میاں کا نام۔ اس پر کچھ بیگمیں زیر لب مسکرائیں۔ فیضن نے مسکرا کر کہا۔ ہمارے قصبے میں میاں کا نام نہیں لیتے۔ تم اپنے میاں کا نام بتاؤ۔ آسمان جاہ نے تڑسے جواب دیا۔ اصغر میاں اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ بڑی دور تک آواز گئی۔ اور کئی منٹ تک ہنسی رہی۔ فیضن۔ قصبات کی یہ عورت یہ سن کر دنگ ہو گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی اس شہر کی عورتیں بڑی بے حیا اور ڈھیٹ ہیں۔ ان سے ہم عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔ حشمت بہو نے آسمان جاہ کے آہستہ سے چٹکی لی۔ فیضن اب تک تو بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتی تھیں اب ذرا دبک کے بیٹھیں۔

امراؤ بیگم: تو اصغر میاں بی فیضن کے میاں ہیں۔ آسمان جاہ۔ یہ عجیب بات ہے اس کا فیصلہ ہو جائے۔

آسمان جاہ: اے ہے تو اتنا بھی نہ سمجھیں بہن۔ ان کے ساتھ نکاح ہوا۔ مگر انھوں نے دیہاتی پنے کی باتیں کیں تو اصغر میاں کو فکر ہوئی کہ کسی شہر والی کو بیاہیں۔ باتیں ہوئیں ہم نے منظور کر لیا۔ اب ان کے دو محل ہیں۔ ایک تو یہ بی فیضن جان صاحب دوسری ہم۔ اب اس قدر پھر قہقہے پر قہقہہ پڑا۔ فیضن کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ اب اس قدر جرأت بھی نہ تھی کہ زبان کھول سکیں۔ چپ۔ بالکل خاموش۔ ثریا بیگم دل ہی دل میں ہنستی تھیں۔ جانی بیگم نے کہا کیوں فیضن بہن تمھارے ہاں کون کون رسمیں ہوتی ہیں۔ فیضن بولی برات سنگنی یہی ہوتی ہیں۔ کہا۔ کچھ ہم سنیں تو ہمارے ہاں کی رسمیں کہو تو کہہ چلیں، ثریا بیگم ہی کے ہاں کا حال سنو۔ جب گفتگو طے ہو گئی۔ اور نواب صاحب نے ان کو پسند کر لیا تو امام ضامن کا روپیہ بھیجا گیا۔ فیضن نے کہا کیا یہاں میاں پہلے ہی بیوی کو دیکھ لیتے ہیں۔ نہ دیکھ لیں تو ہرگز نہ بیاہیں۔

جانی بیگم: اور کیا۔ جب مشاطہ پیام لاتی ہے، تو دولھا اس لڑکی کے گھر جا کے اپنی آنکھ سے دیکھ آتا ہے۔ ہنسی دل لگی ہو کے پھر بات طے پاتی ہے۔

فیضن: قصبے میں تو نو برس بھی ایسا نہ ہونے پائے گا۔ واہ۔

آسمان جاہ: (ہنس کر) نو برس۔ یہ نئی بات ہے۔ یہ نو برس کیا معنی ہیں۔ کوئی ٹوٹکا ہے۔ کیا۔؟ نو برس کی قید ہوئی کیسی۔

فیضن : (جھلاکر) موئی ٹوئی ہم کیا جانیں، اور ٹٹکا تو ہم کہا ناہیں۔

یہ الفاظ سُن کر جتنی بیٹھی تھیں سب بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور فیضن بیچاری بہت جھینپی۔ ایک تو موئی ٹوئی پر ہنسی آئی، دوسرے ٹوٹکے کے عوض جو فیضن نے قصباتی لفظ (ٹٹکا) کہا اس پر اور بھی ہنسی آئی۔ تیسرے (ہم کہا ناہیں) لٹا دیا۔ فیضن نے لاکھ چاہا کہ شہر والیوں کا تتبع کریں مگر قصباتی محاورے زبان سے نکل ہی گئے، بیویوں نے چڑھانا شروع کیا۔

آسمان جاہ : اے یہ مغلانی موئی ٹوئی کہاں چلی گئی، موئی ٹوئی کو لاؤ۔ یہ بہریاں موئی ٹوئی کوئی بھی دکھائی نہیں دیتیں۔

جانی بیگم : نہیں، نہ کہو بہن (ناہیں کہو) ناہیں ٹھیک محاورہ ہے۔

بیگما بیگم : اچھا بہن کا ٹٹکا بھی کسی کو معلوم ہے کہ ناہیں۔

حشمت بہو : ہم کا معلوم ہے مگر ہم ہرگز ہرگز نہ بتاب۔

آسمان جاہ : ارے موئی ٹوئی۔ پنکھیا کہاں غائب غلہ ہوگئی۔

حشمت بہو : جس موئی ٹوئی کو گرمی معلوم ہو، وہ ڈھونڈھے۔

آسمان جاہ : گرمی لگے تو ٹٹکا کیوں نہ کرے۔ سمجھتی ہو کہ ناہیں۔

ثریا بیگم نے آسمان جاہ اور جانی بیگم کے ہاتھ جوڑے کہ اب زیادہ نہ بناؤ، ورنہ یہ رو دیں گی۔ ہنسنے اس قدر کہ کسی کو ناگوار نہ ہو۔ اور جو ہنسی ہنسی میں رو دے تو پھر بنانا اور ہنسانا واہیات بات ہے۔ از برائے خدا اب تو خاموش رہو۔ جانی بیگم نے کہا۔ اچھا اب ہنسی ہو چکی، فیضن بہن کہا سُنا معاف کرو۔ آؤ ہم تم کو یہاں کی رسمیں بتائیں۔ پہلے امام ضامن کا روپیہ بھیجا تھا۔ سرخ اطلس لچکا بٹھا، کرن، مقیش، دو چار عزیز ساتھ گئے۔ انگریزی باجا بجتا تھا۔ چاندی کی کشتی میں لگا کے لے گئے۔ اور مہریاں ساتھ تھیں۔ تمھارے ہاں بھیجا جاتا ہے یا نہیں۔

فیضن بولی۔ ہمارے ہیاں (ہاں) منگنی کے بتاشے بھیجے جاتے ہیں اور دولھا کے ہیاں سے بھی بتاشے آتے ہیں۔

جانی بیگم نے کہا اس کے بعد مانجھے کی رسم ہوتی ہے۔ چاندی کی چوکی پر کمخاب کی چادر بچھائی جاتی ہے۔ اس پر گنگا جمنی لوٹا کٹورا تھا۔ دلھن کے ہاں سے دولھا کے لیے مانجھے کا جوڑا گیا۔ زرد، بہت قیمتی تھا۔ نواب صاحب نے بنا نہیں یہ جوڑا بھی کشتیوں میں لگا ہوا تھا، اور اس کے ساتھ بٹنے اور ہینڈیوں کے خوان تھے۔ باجا بجتا ہوا مہریاں، اعزہ اقربا ہمراہ۔ دولھا کے ہاں شربت پلایا گیا۔ کالپی کی مصری اور عمدہ سے عمدہ قند کی شربت، اور کٹورا اب مہندی کا حال سُنو۔ مہندی بھی بڑی دھوم سے اٹھی۔ اور بہت بھاری جوڑا بھیجا گیا۔ طرح طرح کے عطر در روغن خوشبو بہنوں سے عطاروں سے فرمائشیں کی تھیں کہ عمدہ سے عمدہ عطر کھنچو، شیشوں اور کنٹروں میں عطر و

پھلیل تھا۔ حنائی رومال، سُرخ کنگنا، مقیشی انگوٹھی۔

فیضن: ہمارے وہاں مہندی مانجھا کچھ نہیں ہوتا۔ دولھا کو دولھا کی بہنیں، خالہ زاد ہو یا چچازاد، مانجے کا جوڑا پہناتی ہیں۔ اور دُلھن کو اس کے رشتہ دار۔ بس۔ یہ بہیں کی زیادتی ہے

جانی بیگم: سانچق کے روز دلھن کا بیش بہا جوڑا دولھا کے یہاں سے آیا سُرخ زری اطلس کا کارچوبی پائجامہ لچکا ٹھپا بنت گوکھر ٹکا ہوا۔ زردوزی بیل بہت قیمتی تھی۔ دوپٹا کامدانی کا مگر سُرخ رنگا ہوا۔ آنچل مقیش کے ایک ایک بالشت اور بیل۔ کرتی کامدانی کی اور جوتا کارچوبی۔ اس میں کرن اور گوکھرو اور موتی لگے ہوئے۔

فیضن: (جانی بیگم کے کان میں) ہم کو جوتا دکھا دینا۔ جوتے میں موتی ہم نے آج تک سنے ہی نہیں۔ اور کیونکر سنتے۔ ہم یہاں رہے کب؟

آسمان جاہ نے یہ گفتگو سُن لی تو ہنس کر کہا۔ جوتا دیکھوگی۔ ٹھہری ذرا دولھن کا جوتا لے آنا۔ ٹھہری سمجھی شاید کسی ضرورت سے دو چار قدم جائیں گی۔ فوراً جوڑا حاضر کیا۔ فیضن غور سے دیکھنے لگیں۔ پھر قہقہہ پڑا اور آسمان جاہ نے کہا۔ سونگھ لو بہن۔ اے ذری سونگھ لو۔

ایک مغلانی بولی حضور میں نے دیہات کی شادی دیکھی ہے۔ دولھا اور دولھن دونوں کو تین دن کی سلطنت ہوتی ہے، اور نئی نئی باتیں سننے میں آئیں۔ میں تیل۔ کاٹھی۔ جانی بیگم نے فیضن سے ان رسموں کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا میمن کے دن مہندی اگاتے ہیں، اور بہت سی رسمیں ہیں۔

جانی بیگم: اور سانچق کے ساتھ نقل کے جوگھرے اور میوے کے جوگھرے یہاں بھیجے جاتے ہیں سانچق بڑی دھوم سے آئی تھی۔ اکثر عمائد اور رئیس، اور نواب زادے شریک تھے۔ ہاتھی اور گھوڑے اونٹ اور ہر طرح کا باجا۔ بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔

آسمان جاہ: کیوں بہن (فیضن کی طرف مخاطب ہو کر) تمھارے میاں تمھیں چاہتے ہیں، سچ سچ بتانا۔ تم اپنے میاں کی چاہتی بیوی ہو؟

فیضن: (شرما کر) ہمیں یہ باتیں نہیں آتیں۔ اور نہیں۔ چاہتے ہیں کہ نہیں چاہتے ہیں تم کو اس سے کیا۔

آسمان جاہ: ابھی کم سن ہو۔ خوبصورت ہو۔ انکھڑیاں کتنی لگاوٹ باز ہیں۔ بھلا آنکھوں کا بوسہ لیتے ہیں یا نہیں لیتے۔

فیضن: (کسی قدر مسکرا کر شرماتے ہوئے) بڑی بے حیا ہو۔ اُف فوہ۔

جانی بیگم: اے تو یہاں سب اپنی ہمجولیاں ہی تو بیٹھی ہیں۔ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے۔ سب اپنی ہی ہیں۔ سب ہم سن، سب شوخ، سب طرار، تم یہاں جھینپتی کس سے ہو۔ کیا کوئی مردوا یہاں بیٹھا ہے۔

فیضن : وہ نہ بیٹھا ہو کوئی تو کیا ہے، اپنی بھی شرم ہے یا نہیں ہے۔
آسمان جاہ : اب گانے کو جی چاہتا ہے کچھ تم گاؤ کچھ ہم گائیں۔

بہوئے نافۂ کاخر صبا زاں طرّہ بکشاید
ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

حشمت بہو : بس یہی ایک غزل یاد ہے، یا کوئی اور بھی یاد ہے۔
آسمان جاہ : ایک غزل ! پچاس غزلیں یاد ہیں۔ پوری پچاس۔

سالہا دفتر ما در گرد صہبا بود
رونق میکدہ از درس دو عائے ما بود

بگما بیگم : پھر وہی فارسی غزل پڑھی۔ کوئی اردو غزل پڑھو۔

فیضن نے جانی بیگم کے کان میں آہستہ سے پوچھا (کیا میراثن ہیں یہ یا ڈومنی ہیں) جانی بیگم ایک ہنسوڑ کہا۔ ڈومنی ہے۔ اس پر فیضن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ با آواز بلند کہا جو ہم یہ باتیں جانتے تو ہر گز ہر گز نہ آتے۔ آپس میں جس کا جو جی چاہے کہہ لے، اس کے کیا معنی کہ ڈومنیاں ہم سے ہنسیں۔

ہمجولیاں تاڑ گئیں کہ جانی بیگم نے انکو پٹی پڑھا دی کہ آسمان جاہ ڈومنی ہیں۔ وہ سب کی سب ہنستی جاتی تھیں۔ واہ۔ یہ دل لگی کیسی۔ ڈومنیاں اور ہم کو بنائیں۔ جب ثریا بیگم نے دیکھا کہ فیضن بہت خفا ہو گئی ہیں تو اپنے قریب بلا کر سمجھا دیا اور قسمیں کھا کر کہا کہ یہ ڈومنی نہیں نواب زادی ہیں۔ ان کے میاں کا وثیقہ چار سو روپیہ کا اور وثیقہ کے علاوہ روپیہ بھی پاس ہے۔ آسمان جاہ تنک کر بولی۔ جب شہزادیوں اور رئیس زادیوں نے ہم ڈومنیوں کو منہ لگایا ہے تو ہم تو اس قدر ڈھیٹ ہوئے پھر اب تو ہم برابر کی گفتگو کریں گے چاہے جو ہو۔ ثریا بیگم کے قسمیں کھانے سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ آسمان جاہ ڈومنی نہیں ہیں مگر اس پر کالۂ آتش نے وہ فقرہ چست کیا کہ پھر شک ہو گیا۔

الغرض بڑی دیر میں فیضن کا غصہ فرو ہوا۔

آسمان جاہ : کیوں فیضن بہن، کرسی[1] تمہارے قصبے سے کس قدر فاصلے پر ہے۔ ڈامڈا ملا ہے نہ سچ بتانا معلوم ہوتا ہے کرسی کی رہنے والی ہیں۔
جانی بیگم : اے یہ تو گویا مئو کی رہنے والی ہیں۔

---

[1] لکھنؤ کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہاں کے بعض باشندوں کی حماقت کے واقعات مشہور ہیں۔ اس لیے کسی کو بیوقوف بنانا ہوتا ہے تو اسے کرسی سے منسوب کرتے ہیں۔ کرسی مولانا عبد الحلیم کا وطن تھا۔

حشمت بہو نے آسمان جاہ کو ڈانٹ بتائی۔ واہ یہ کیا بات ہے۔ جو کوئی اپنے ہاں آتا ہے۔ اس کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ یا بناتے ہیں۔ تمھارے شہر میں آئی ہیں' ان کی خاطر کرو۔ یہ تو سب بالائے طاق لگیں بنانے۔ آسمان جاہ نے کہا اچھا اب ان کی خاطر کریں گے۔ فیضن بہن کل ہمارے ساتھ شہر دیکھنے چلو۔ بادشاہ باغ۔ ستکھنڈا' جامع مسجد' نواب باغ' خاقان پسند' فرحت بخش' ڈاڈ کی کوٹھی' چوک[1] اور جو جو چیزیں دیکھنے کی ہیں سب دکھا دیں گے۔ فیضن نے پوچھا کیا یہاں باہر نکلتی ہیں۔ اس سادگی کے سوال پر اور بھی قہقہہ پڑا۔ حشمت بہو نے کہا تمھارے ہاں مہندی کون لگاتا ہے' دلھن کو۔ کہا۔ ناون۔ اس پر چھوٹی بڑی سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

فیضن: ہوگا چکر۔ اور یہاں مہندی کیونکر لگائی جاتی ہے۔

آسمان جاہ: یہاں دلھن کو دولھا مہندی لگاتا ہے' اور دولھا کو دلھن۔ یہاں یہ ہوتا ہے۔ اور تمھارے ہاں ناون بلائی جاتی ہے۔

حشمت بہو: یہاں یہ قاعدہ ہے کہ کئی سیر اعلیٰ سے اعلیٰ مہندی منگواتے ہیں۔ مہریاں پیس کر سانتی ہیں۔ خوب باریک سرمہ سا پیسی جاتی ہے۔

فیضن: واہ وا۔ کیا سرمہ بھی ملایا جاتا ہے' یہ نئی بات ہے۔

بیگما بیگم: (ہنس کر) جی ہاں۔ سرمہ مستی۔ ہینگ پھٹکری نرکچور' بازنگ' ریشہ خطمی' غرضیکہ پنساری اور بساطی کی دوکان کھول کر ملا دی جاتی ہے۔ بہن تم نری گنوارن ہو۔ سرما سا کے یہ معنی ہیں کہ سرمہ جیسا باریک ہوتا ہے ویسی ہی باریک مہندی بھی پیسی جائے۔ اب سمجھیں۔ جب مہندی پس کے تیار ہو گئی تو مغلانیوں اور اعزہ نے لگائی۔ ہاتھوں پاؤں میں مہندی ملی جاتی ہے اور سرخ سوہے سے ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔

ع اڑائے جائے گا دزدِ حنا چھلا نشانی کا

فیضن: ہم نے یہ لفظ ہی نہیں سنا۔ چھلا نشانی کا۔ واہ۔

آسمان جاہ: اور سویرے جب ہاتھ کھولتے ہیں تو عطر ملتے ہیں جس سے رنگ سرخ ہو جائے اور خوشبو کی خوشبو ہوئے۔

فیضن نے سادہ پن کے سبب سے پوچھا کہ ہاتھوں میں کپڑا باندھتے ہیں اور رات کو جو کھجلی آئے۔ اتنا کہنا تھا کہ تیس چالیس بیگمات نے وہ فرمائشی ٹھٹھا لگایا کہ گھر بھر میں آواز گونجنے لگی۔ مارے ہنسی کے ایک پر ایک گری پڑتی تھی۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ کوئی ادھر لوٹتی تھی کوئی ادھر۔ نوبت بایں جارسید کہ

---

[1] یہ سب لکھنؤ کے باغوں اور محلوں کے نام ہیں۔

ہنسی کی شدت سے دو ایک کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، اور بڑی دیر میں ہنسی ضبط کر سکیں لیکن جب فیضن کا فقرہ یاد آتا تھا بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ جہاں ایک ہنسی اس کی دیکھا دیکھی اور بھی ہنس پڑتی تھیں۔

وتنے میں تیاریاں ہونے لگیں کہ دولھا کے لیے سہرا بھیجا جائے۔ دروازے پر ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، باجے، خاص بردار برق انداز۔ رؤسا، امرا، سب جمع تھے۔ فیضن جھروکے کی راہ سے سب سامان دیکھ کر عش عش کرتی تھی۔ ہوا دار آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ فنس کے ایسے چھٹکے کبھی ان کی نظر سے نہیں گزرے تھے۔ اس سامان کو دیکھ کر فیضن بہت خوش ہوئیں۔

فیضن: (جانی بیگم سے) کیوں بہن یہ ہاتھی گھوڑے کہاں سے آئے ہیں۔ امیروں، رئیسوں کے ہاں سے منگوائے ہوں گے۔ یا سب انھیں کے ہاں کے ہیں۔

جانی بیگم: ادھر ادھر سے منگوا لیے۔ کسی کے ہاں سے ہاتھی کسی ڈیوڑھی سے خاص بردار کسی سرکار سے گھوڑے، سات پانچ کی لاٹھی اور ایک جنے کا بوجھ۔ اب سب جلوس قرینے سے لگا کر دولھا کے ہاں سہرا بھیجا جائے گا۔

فیضن: آج جب دولھا گھر میں آئے گا تو پردہ ہو گا یا نہیں۔

جانی بیگم: برات کے دن دولھا سے کوئی پردہ نہیں کرتا، اور دولھا اس وقت اچھی طرح سب کو دیکھ بھی تو نہیں سکتا۔ ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ادھر ادھر نظر پڑی، تو بدمعاش سمجھا جائے گا، دوسرے سہرہ سامنے پڑا ہوتا ہے۔

الغرض جلوس آراستہ ہوا، اور دولھن کے ہاں سے دولھا کے لیے سہرا گیا، چاندی کی خوشنما اور نئی گڑھت کی کشتیوں میں پھولوں کے ہار، بدھیاں، طرہ مقیشی جڑاؤ، سہرہ، بڑی دھوم دھام سے سہرہ گیا۔ دو چار نفسوں کے ساتھ مہریاں کونا دبائے ہوئے جاتی تھیں۔ لنگیوں کی جوڑی جوڑی گوٹ دیکھ کر فیضن دنگ ہو گئی۔ اُف فوہ۔ اتنی چوڑی گوٹ۔ آدھا پائجامہ آدھی گوٹ۔ جب فضیلت کا بیاہ تھا تو یہاں سے ایک مہری کسی کام کے لیے گئی تھی۔ بس کچھ نہ پوچھو۔ باتوں باتوں میں اپنا مطلب نکال لیتی تھی۔ ایک تو اس کے مقابلے کی تھی نہیں اور نام بالکل انوکھا۔ گلبدن۔ جوان عورت تھی، اور مردوں سے بالکل نڈر۔

آسمان جاہ اتنے عرصے میں دوسرے کمرے سے جلوس کی کیفیت دیکھتی تھیں۔ جب جلوس نکل گیا تو سینہ تانی ہوئی، خرام ناز کے ساتھ ثریا بیگم کے کمرے میں آئیں۔ کہا۔ کہو بی فیضن جان۔ جلوس دیکھ کر خوش ہوئیں۔

فیضن: فیضن جان! فیضن جان۔ ہم کا فیضن جان نہ کہو۔

آسمان جاہ: (ہنس کر) بھرکا دُکھی تم کا۔ موئی ٹوٹی بنائی۔

ثریا بیگم: (آہستہ سے) پھر وہی باتیں۔ پھر چھیڑ خانی۔ اب اس گفتگو سے درگزر و۔

آسمان جاہ: اے تو ہنستے ہی گھر بنتے ہیں۔ بڑی دیر سے ہنسی نہیں ہوئی تھی بی بی فیضن صاحب نے سب کو ہنسا دیا۔

کیا کام ہم کو کعبہ رہ دیر و حرم کے ساتھ — مستوں کا سر جھکے ہے صراحی کے خم کے ساتھ

او جانے والے مُڑ کے ذرا دیکھیو ادھر
مانندِ سایہ ہم بھی ہیں تیرے قدم کے ساتھ

چو شب زیورِ عنبریں ساز کرد — سرِ نافۂ مشک را باز کرد
شب جشن بود آں بتِ دل نواز — پری پیکراں چوں پری جلوہ ساز
بر آراست از زینت و فرِ زیب — چو باغِ ارم مجلسِ دل فریب
کنیزاں چو پرویں بہ پیرامنش
زتارک در آمود تا دامنش

ادھر عروسِ عدن نے تختِ فلک پر بصد زیب و تجمل جلوہ فرمایا اُدھر دولھا کے ہاں برات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کا حال ہم پھر معرضِ بیان میں لائیں گے۔ بالفعل دلھن کے ہاں کے جشن کا حالِ مفصل کان دھر کے سنیے۔ شہر کی مشہور مشہور ڈومنیاں طلب ہوئی تھیں۔ محبوبن، حیدری، امامن، عباسی، بسم اللہ۔ سب دست بستہ حاضر تھیں۔ بی فیضن بہت خوش ہوئیں کہ لکھنؤ خصوصاً بیا بانی کی ڈومنیوں کا گانا سنیں گے۔ جانی بیگم سے انھوں نے کہا ہم نے ان ڈومنیوں کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ ایک بوڑھی مغلانی نے پوپلے منہ سے کہا۔ اے حضور اب تو نام ہی نام ہے نہیں تو ہمارے لڑکپن میں بھی بیا بانی کا تکیہ ایسی رونق پر تھا کہ میں کیا عرض کروں۔ ڈومنیوں کے کئی گھر تھے۔ یہ محبوبن جو سامنے بیٹھی ہیں ان کی دادی کا وہ دور دورہ تھا کہ اچھے اچھے شہزادے سر ٹیک کر آتے تھے جہاں پناہ تک ان کے ہاں آتے تھے۔ بس حد ہو گئی۔ جہاں پناہ اور بیا بانی کی گلی میں آئیں۔ ہاتھی وہاں تک نہیں جا سکتا تھا۔ حکم دیا کہ مکان مسمار کر دیے جائیں۔ جو گنا روپیہ مالکوں کو دیا جائے۔ بوڑھی عورت جس کی بھویں تک سفید تھیں، ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کہا میں جہاں پناہ کے ہاتھی کو آگے نہ بڑھنے دوں گی میرے بزرگوں کی ہڈیاں حضور کے حکم سے کھود کر پھینک دی گئیں۔ یہ مکان میرے بزرگوں کی استخوان ہے۔ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اس کے بزرگوں کے نام سے ایک خیرات خانہ جاری کر دو اور اس کو زر و گنج سے مالامال کرو۔ جب جہاں پناہ کا ہاتھی ان کی دادی کے مکان پر پہنچا تو دس بارہ ہزار آدمی گلی اور تکیہ میں کھڑے تھے اور ڈومنی کا دماغ عرش بریں پر۔ مگر واہ ری ظہورن با ایں ہمہ اوج ذرا غرور نہیں۔ غرور چھو نہیں گیا۔ پھر اس دل و جان سے اٹھ کر ظہورن نے تانیں لی ہیں۔ برسات کے دن تھے ساون کا مہینہ مگر مینہ نے ہوا بنائی تھی۔ جہاں پناہ نے فرمایا۔ ظہورن جب جانیں کہ مینہ برسا دو۔ مسکرا کر کہا حضور لونڈی ایک ادنیٰ سی ڈومنی ہے مگر خدا کی خدائی سے بعید نہیں کہ مینہ بھی برس پڑے۔ گانے کو خدا نے ایسی ہی تاثیر بخشی ہے۔ یہ کہہ تان لی۔

(آیو بدرا کارے کارے، رہی بجلی چمک مورے آنگن میں۔

برق چشمک زن زِ طرف کوہساراں میرسد

ساقیا سامانِ ساغر کن کہ باراں میرسد

اے بس خدا کی کبریائی کے صدقے۔ قبلہ رُخ سے جھومتی ہوئی گھٹا اٹھی، ایسی گہری گھٹا گھنگھور سیاہی جھلکنے لگی۔ ظہورن کو خدا بخشے پھر تان لگائی۔ بی مغلانی خود بھی گلے باز تھیں۔ انگلیاں مٹکا مٹکا کر اور بتا بتا کر گانا شروع کیا۔ (آسون برکھا رم جھم برسے۔ آسون برکھا۔ رم جھم برسے۔ آسوں برکھا) بس حضور شہر میں غُل مچ گیا کہ ظہورن اونچ کی لے رہی ہیں۔ پھر یہ ملاحظہ فرمائیے کہ عالم باغ کے ناکے سے تا بہ بیا بانی کی گلی تک، یہ بھیڑ تھی کہ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جاتی۔ بس آناً فاناً میں مینہہ رم جھم برسنے لگا اور ایسا برسا، ایسا برسا کہ دریا چڑھ گیا اور تالاب سے دریا تک بس تختۂ آب ہی نظر آتا تھا جب تو بیا بانی کی ڈومنیاں مشہور ہیں۔ جس ملک میں جاؤ بیابانی کی ڈومنیوں کا ذکر سُن لو۔ اور اب تو خدا کا نام ہے۔ اللہ اللہ۔ خیر صلاح۔ یہ اتنی ڈومنیاں بیٹھی ہیں۔ لے کوئی گائے تو۔

خدارا جلد لے آکر خبر اے عیسیٰ دوراں

ترے بیمار کا اب کوئی دم میں دم نکلتا ہے

نصیحت دوستو کرتے ہو پر اتنا تو بتلاؤ

کہیں آیا ہوا دل بھی سنبھالے سے سنبھلتا ہے

محبوبن: بڑی گلے باز ہیں آپ۔ اور اصول سے واقف۔ اور کیوں نہ ہو کن کی آنکھیں دیکھی ہیں ہم لوگ کیا جانیں۔

حیدری: دریں چہ شک۔ ہم لوگوں کی آوازیں اس سن میں کام نہیں کرتیں۔ جب انکے سنوں کو پہنچیں گے تو خدا جانے کیا حال ہوگا۔

عباسی: اور گلا کس قدر قابو میں ہے۔ جہاں جاتی ہیں کچھ اپنا ہی کر لاتی ہیں، برسوں گلے کی پرورش کی ہے۔

امامن: گلے کی قطع بندی کتنی درست ہے۔ استادوں سے سیکھا ہے۔

بوڑھی مغلانی قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ سر ہلتا تھا، جیسے گھڑی کا ٹھینگا۔ کمر خم لٹھیا ٹیک کے چلتی تھیں مگر طبیعت ایسی رنگین کہ جوانوں کو مات کرتی تھیں، سویرے بٹنا ملیں تو چین نہ آئے۔ پٹیاں ضرور جماتی تھیں، یوں تو کمال خوش مزاج اور ملنسار اور ہنس مکھ تھیں، مگر جہاں کسی نے ان کو بوڑھی کہا بس پھر آپے میں نہیں رہتی تھیں۔ آسمان جاہ نے چھیڑنے کے لیے کہا۔ بی مغلانی نے جو زمانہ دیکھا ہے وہ ہم لوگوں کو نصیب کہاں ہوگا۔ کوئی سو برس کا سن ہوگا بی مغلانی، ادھر انھوں نے یہ سوال کیا، ادھر بی مغلانی آگ بھبھوکا ہو گئیں۔ گردن ہلا کر پوپلے مُنہ سے کہا۔ اب اس کا جواب کیا عرض کروں۔

بوڑھی ہیں کاہے سے ہوگئی۔ بیر ابن ایسا کیا ہے۔ نزلہ گرا یا بال سفید ہو گئے، اس سے کوئی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ آسمان جاہ ایک شوخ، مسکرا کر بولی۔ کیوں بی مغلانی۔ بال تو نزلے کے سبب سے سفید ہو گئے۔ اور یہ دانتوں کو کیا ہوا۔ یہ کمر کیوں ٹیڑھی ہو گئی۔ گالوں پر جھریاں کیونکر پڑیں۔ آخر یہ معلوم تو ہو۔ بی مغلانی نے اس تقریر کا جواب نہ دیا۔ قہر آلود نظر ڈالی کہ خاموش ہو رہیں۔ کچھ دیر کے بعد چند عورتوں کے اصرار سے انھوں نے گانا شروع کیا۔

قتل عشاق کیا کرتے ہیں — مت کہیں خوف خدا کرتے ہیں

مہندی ملنے کے بہانے ظالم — کف افسوس ملا کرتے ہیں

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج — ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

یہ گوری کی دھن ہے۔ شوری کے بٹے سناؤں تو بھڑک جاؤ۔ ایک ٹھمری سنو! جانِ عالم کے نیناں نکیلے، ہاں ہاں جانِ عالم کے نیناں نکیلے۔ نیناں نکیلے گو یاں نینا نکیلے۔ تلوار کھینچے۔ جانِ عالم۔ سلطان عالم کے نیناں نکیلے، نیناں نکیلے۔ گو یاں ابرو نکیلے۔

گاتی بھی جاتی تھیں اور بتاتی بھی جاتی تھیں۔ اور ادھر تعریفیں ہوتی تھیں۔ قہقہے پڑتے تھے۔ ڈومنیاں داد دیتی جاتی تھیں۔

اتنے میں دو بوڑھی بیگمیں آئیں تو چہل پہل غائب سب خاموش بیٹھیں۔ مگر باہم اشارہ بازی ہوتی جاتی تھی کہ ان دونوں بوڑھیوں کو کیا بڑھ بھس ہے کہ کم سنوں میں اس وقت آن کے بیٹھیں۔ سارا مزا کرکرا کر دیا۔ کوشش کی کہ کسی طرح اٹھائیں، مگر وہ جمیں تو اٹھنے کی قسم کھائی۔ جانی بیگم نے آسمان جاہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور آسمان جاہ نے جانی بیگم کی طرف۔ آخر کار آسمان جاہ سے نہ رہا گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کہا، ہم سنوں کی صحبت کا کیا کہنا۔ ابتک سب ہمجولیاں بیٹھی تھیں۔ کیسی دل لگی ہو رہی تھی کہ واہی واہ۔ اب کوئی ہنستا ہی نہیں، اور کیونکر ہنسے۔ بڑی بوڑھیوں کو کم سنوں میں بیٹھنے سے کیا مطلب۔ بوڑھی بیگمیں جہاں دیدہ تو تھیں، ٹال کے چلی گئیں اور یہاں پھر قہقہے پڑنے لگے۔

حشمت بہو: آخر کار تم سے نہ رہا گیا نہ۔ بڑی ایک ہو۔

بیگما بیگم: افوہ ان سے بڑھ کے اور ہے کون۔ یا یہ یا جانی بیگم۔

جانی بیگم: میں بھی تلی ہوئی تھی کہ وہ نہ بولیں تو میں کچھ کہوں۔

آسمان جاہ: میں کب چپ رہنے والی تھی۔ بھلا۔ ہونہہ۔

حشمت بہو: سمجھ گئیں۔ اور دل میں شرمائی بھی ہوں گی کچھ کہا نہیں۔

جانی بیگم: کچھ کہتیں تو کچھ سنتیں بھی۔ ہم بند رہنے والی نہیں ہیں۔

آسمان جاہ: مکان قریب ہوتا تو ان سے (مغلانی کی طرف اشارہ کرکے) ہم بھی کچھ سیکھتے۔ اللہ جانتا ہے خوب گاتی ہیں۔ (گنگنا کر)

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

مغلانی: آواز تو بہت اچھی ہے۔ مگر بے قاعدہ گاتی ہیں۔

جاسوس

آزاد پاشا اس فکر میں کہ اب کیا فکر اور کارروائی کریں۔ ایک درخت کے سائے میں بیٹھے طرح طرح کی باتیں سوچ رہے تھے کبھی یہ خیال آتا تھا کہ پلونا میں جو لشکر ترک فتح یاب ہوا ہے اس کی مدد کریں۔ کبھی یہ خیال آتا تھا کہ خدا کا نام لے کر فوراً حملہ آور ہو جائیں۔ الغرض مختلف اقسام کے خیالات ان کے دل میں جگہ پاتے تھے۔ آزاد پاشا کو خوب معلوم تھا کہ اس محاصرہ پلونا میں روسی کامیاب ہو گئے تو پھر ہمارے کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گی۔ ان خیالات میں غلطاں پیچاں تھے ہی، کہ ایک شخص نے جھک کر سلام کیا، اور کہا خداوند مجھے حضور سے کچھ عرض کرنا ہے۔ آزاد نے اجازت دی تو اس اجنبی نے یوں جواب دیا۔ سنیے حضور ہر ملک اور ہر قوم کا قاعدہ ہے کہ ایلچی کو گزند اور نقصان سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ایلچی راچہ زوال مثل مشہور ہے۔ اطالیہ کے ایک بادشاہ نے اپنے غنیم کے پاس ایلچی کی زبانی پیغام بھیجا کہ اگر تمھارا بادشاہ اپنی لڑکی سے ہمارے وزیر کے لڑکے کو بیاہ دے تو کیا مضایقہ ہے۔ ہم صلح منظور کرلیں، مگر انھوں نے یہ فقرہ سُن کر ایلچی کو قتل نہیں کیا۔ چنانچہ نوشابہ کے پاس جب اسکندر یہ بن فیلقوس خود بہ نفس نفیس گئے تھے تو یہی کہا تھا کہ میں ایلچی ہوں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ نظامی گنجوی کہتا ہے۔

زنِ زیرک از سیرت شاہِ او — دراں داوری شد ہراسانِ او
کہ ایں کارواں مرد آہستہ رای — چرا حق خدمت نیارد بجای

کز و کرد باید پژوہندگی
کہ از ماند ارد شکوہندگی

جب اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا، تو سکندر نے یہی کہا کہ میں ایلچی ہوں اور بہت بڑے شہنشاہ بحر و بر نے مجھے بھیجا ہے۔

در آئینِ شاہان و رسم کیان
پیام آور ال ایمن اندازِ زیاں

آزاد پاشا نے اس زبان آور سفیر کو از سر تا پا دیکھا، اور کسی قدر شک ہوا کہ یہ روسی گوئیندہ ہے۔ مگر ابھی تک اپنا خیال ظاہر نہ کیا۔ پھر اجازت دی کہ جو کچھ کہنا ہے بے دھڑک کہو۔ اس میں شرم کیا ہے۔

سفیر مذکور نے جو نہایت لسّان اور بڑا آتش زبان تھا یوں جواب دیا۔

مجھے ایک ایسے نامی گرامی سپہ سالار نے بطریق ایلچی تمہارے پاس بھیجا ہے۔ جن کا نام ساری خدائی میں مشہور ہے اور جو اپنی آپ نظیر ہیں۔ ایسے صاحب عظمت و جلال کا ایلچی ہوں جس کے نام سے فوج کے قدم ہٹ جائیں۔ جس نے ایک شب میں لاکھ آدمی دریائے ڈینیوب کے پار اتار دیے۔ جس نے شپکا گھاٹی پر دم کے دم میں قبضہ کر لیا۔ جس نے اپنی عاقلانہ تدبیروں سے ایک ایک جنگ میں دس دس ہزار آدمی گرفتار کر لیے۔ لہٰذا میں ایلچی گری میں دبتا نہیں ہوں۔ مجھے کسی لومڑی نے نہیں بھیجا ہے۔ میں شیر دل مرد کے پاس سے آیا ہوں۔

اگر در میانجی دلیر آمدم
نہ از روبہ از نزدِ شیر آمدم

جو کچھ مجھے حکم دیا میں وہ بجا لایا۔ اب جو آپ حکم دیں اس کی تعمیل کروں۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ اس نام آور کا نام سنیں گے جس کا میں ایلچی ہوں، تو بیشک اور بلاشبہ مجھے سنگسار نہیں کریں گے۔

مرا با پیام بزرگاں چہ کار
تصرف نباید دریں پردہ یار

آزاد نے اس کی تقریر سنی تو صاف ظاہر ہوا کہ روس کے کسی جنرل کے پاس سے آیا ہے۔ کہا۔ ہم دوبار اجازت دے چکے۔ اب اگر کچھ کہنا ہے تو کہو ورنہ اپنی راہ لو۔ ہم خدا جانے کن خیالات میں غلطاں پیچاں ہیں۔

سفیر: تو میں اب عرض کرتا ہوں، کچھ تمہید کی ضرورت نہیں ہے جو کچھ سمجھانا تھا بخوبی سمجھا چکا۔ اب کیا کہوں۔

آزاد: یا خدا کہو نہ۔ میں بخوبی سمجھ گیا۔ کہ تم کو کسی نے بھیجا ہے۔

سفیر: میرے پاس کوئی تحریر نہیں ہے مگر نشان کے لیے صرف تمہاری تصویر دی ہے وہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔

آزاد: ہم صرف پیغام سننا چاہتے ہیں اور بس۔

سفیر: آپ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے۔

فرستادہ را نیست ایں دسترس
کہ بر ما بہ تندی برآرد نفس

مگر ایک شیر کے پاس سے پیغام لایا ہوں، لومڑی کے پاس نہیں آیا ہوں۔ مجھے روس کے مشہور و معروف جنرل اغناٹیف نے جو جنگ کریمیہ کے سپہ سالار اعلیٰ تھے، آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے حکم ہے کہ آپ کو اطلاع

دوں کہ ترکی اب چراغ سحری ہے، اور آفتاب لبِ بام۔ آپ ہزار کوشش کریں مطلب براری معلوم۔ اکثر جنگوں کے حالات آپ کو نہ معلوم ہوں گے۔ لہذا آپ کی اطلاع کے لیے بیان کیے جاتے ہیں۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ پلونا ہر سمت سے محصور ہو گیا ہے۔ اور اب صبح شام ہم لوگوں کے قبضے میں آیا ہی داخل ہے بشیکا گھاٹی سے آگے اب ہم بڑھ گئے ہیں۔ ایشیا میں ہر طرف ہم ہی ہم ہیں پھر تم کس صورت سے غالب آسکتے ہو۔ تمہارے جس قدر افسر ہیں سب راشی رشوت خور۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

کسی جنگ میں اب تم کامیابی نہیں حاصل کر سکتے۔ مگر پلونا کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ زخمی ہو جاؤ گے، لاش پھڑکنے لگے گی۔ تھوڑی دیر میں دم توڑو گے۔ اول تو تم صاحبزادے ہو۔ تم کو جنگ سے کیا واسطہ۔ روسی جنرل کجا۔ اور تم کجا۔ وہ آزمودہ کار، جنگ آزما، تجربہ کار، تم کیا جانو۔ بہتر ہے کہ اس خیال سے درگزرو، اور جس قدر جواہرات کہو تم کو منجانب روس عطا ہوں، زر اور جواہر سے مالا مال ہو جاؤ۔ ہندوستان کی راہ لو۔ مزے سے دندناؤ۔ ورنہ بدنام ہو گے۔ اور ہندی ہنسیں گے کہ یہاں سے بیڑا اٹھا کر گئے تھے اور وہاں سے شکست پا کے آئے۔

آزاد : اگر تمھارا جنرل اس قسم کی تقریر کرتا تو اس کو جواب شافی دیتا۔ مگر تم ایلچی ہو تم کو کیا دنداں شکن جواب دوں۔

سفیر : مجھے قتل کر ڈالو۔ مار ڈالو۔ تمھیں اختیار ہے۔

آزاد : ایک تمھارے قتل سے روسی کم نہ ہو جائیں گے۔ پھر فائدہ۔

سفیر : اور سلطنت روس اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ آپ کو مع الخیر ہندوستان پہنچا دے گی۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے مانیے چاہے نہ مانیے۔

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں و کار آساں کن

آزاد : تم لوگ تلوار اور بندوق کی لڑائی خاک نہیں جانتے۔ بس جانتے ہو تو صرف اس قدر کہ دغا بازی اور بے ایمانی کر کے اور کسی نہ کسی طرح ورغلا کر رشوت کے ذریعے سے کام نکالو۔ مگر خوب یاد رکھو کہ آزاد باش سچے آزاد منش آدمی ہیں۔ یہ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر آئے ہیں۔ ہم اور رشوت، اے توبہ۔ اس خیالِ خام کو دل سے نکال ڈالو۔ ہم مرد میدان ہیں۔ لاش میدان کارزار میں پڑی ہو۔ سر الگ ہو دھڑ الگ ہو۔ یہ منظور ہے، مگر یہ ہرگز ہرگز منظور نہ کریں گے کہ رشوت لیں اور اپنے ملک کا نام بدنام کریں۔ کیا مجال۔ کیا طاقت۔

چو بر جوشم از خشم چوں تند میغ — در آب آتش انگیزم از برق تیغ

کفد گاہ شیراں در آرم بداغ

زبیم نہنگاں فروزم چراغ

میں وہ ہوں جس نے سلطنت روس میں زلزلہ ڈال دیا۔ جس کے نام سے شیروں کا زہرہ آب آب ہو جاتا ہے اگر کسی درخت پر میرا کوٹ لٹکا دیا جائے اور سپاہ روس سے کہا جائے کہ آزاد کا کوٹ ہے تو لاکھوں آدمیوں کے قدم اٹھ جائیں۔

سفیر نے کہا جنگ کا حال تو ذرا سن لیجیے۔

دسویں جولائی کو جنرل روس نے اپنی فوج کا بہت بڑا حصہ ملک ارمن کی جانب شرق، بسر کردگی کرنل سلیکوف روانہ کیا۔ وہاں کمکی فوج کے لیے کچھ عرصہ تک مقیم رہی۔ علیٰ ہذا القیاس ترکوں کے جنرل نے بھی کچھ اور فوج کی ضرورت دیکھ کر اپنی سپاہ فوراً بھرتی کرنی شروع کی، اور ان کو قواعد جنگ جہاں تک جلد ممکن ہوئے سکھائے۔ والینٹر بھی مختلف مقاموں سے شریک جنگ ہوئے۔ سرسٹھ اتواپ، اژدرہاں اور کئی ہزار افسر اس عقاب ہیبت کے حسب الحکم سلطانی معاً روانہ کیے اور ارض روم اور قرص کے درمیان میں بڑے اہتمام بلیغ سے دھس بندی کی گئی اور اس کی کھائی پر بہت سی سپاہ جرار مقیم ہوئی۔ پہاڑوں کے سبب سے ترکوں کی سپاہ بہت محفوظ اور انجنیروں کی عمدہ کارروائیوں سے اور بھی بے غل وغش تھی۔ روسی ان سب وجوہ سے مجبور ہو گئے اور حملہ نہ کر سکے جبراً اور قہراً ایسے مقام پر رہے جہاں ان کو کچھ بھی امن وامان کی صورت نظر آئی۔ کوہ قاف کی بغاوت کی وجہ سے ان کو بہت سی فوج اس صوبہ میں رکھنا پڑی۔ امن کی لڑائی کے لیے تھوڑی سی فوج رہ گئی جنرل ملسکوف کے ساتھ بہت سے باشندے تھے۔ روس کی فوج کے ہمراہ مع مویشیوں اور اسباب خانہ داری کے رہتے تھے۔ ان کو اس جنرل نے شہنشاہ کی جانب سے محفوظ رکھنے کا اقرار کیا تھا ان لوگوں نے اس جنرل پر یہ ظاہر کی تھی کہ ہم لوگ اگر ترکوں کے پابند ہو جائیں گے تو ہمارے ساتھ نہایت ظلم کیا جائے گا۔ اور ہم پر بڑی بدعت ہوگی، اس امر میں بھی کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا ترحم نہ کیا جاتا، قوم کرد وایشیائیں وہی برتاؤ کر رہی تھی جو اقوام سرکیشیا اور باشی بزوق کا حال یورپ میں تھا۔

ہمایوں فر کے مرقدِ منوّر پر دُلہن کے جانے کا مشورہ

تمام شہر میں غل مچ گیا کہ سپہر آرا بیگم مرزا ہمایوں فر کی قبر پر جانے والی ہیں۔ آپ جانیے دنیا ضعیف الاعتقاد

آدمیوں سے خالی نہیں۔ اور پھر ہندوستان میں فی صدی نوے کو یقین کامل تھا کہ ادھر سپہر آرا قبر پر گئیں ادھر ہمایوں فر اٹھ کھڑے ہوئے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مگر عقل نہیں قبول کرتی۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ ہمایوں فر قبر میں آرام کر رہے ہیں ان کا زندہ ہونا کیا معنی۔ قبر بن گئی اور قبر پر مقبرہ بھی بن گیا۔

زمین پہ سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو

اجل کہاں سے کہاں لائی ہے مکینوں کو

حسن آرا بیگم نے بہار النسار کے شوہر سے کہا، دولھا بھائی کچھ خبر ہے۔ بھلا کہیں مُردوں کو کسی نے زندہ ہوتے دیکھا ہے۔ اندھیر ہے۔ مُردے زندہ ہو جایا کرتے تو کوئی کاہے کو مرتا۔ کسی کو موت کیوں آتی۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ واسطے خدا کے ان سب کو سمجھانا اور آپ ایسے فہمیدہ ہو کر ان باتوں کو مانتے ہیں۔ ادنی، ہے ہے، لوج ایسی کوئی دلھن ہو جو قبر پر یہ سمجھ کر جائے کہ دولھا زندہ ہو جائے گا۔ یہ تو دیوانوں کی باتیں ہیں۔ سمجھ دار آدمی کہیں ان باتوں کے قائل ہوا کیے ہیں۔ نواب صاحب نے کہا نہیں یہ معاملے بڑے نازک ہیں۔ بزرگوں کی یہی رائے ہے کہ جائیں اور ضرور جائیں۔ پھر ہم منع کرنے والے کون ہیں۔ مگر ہاں عقل کے تو ضرور خلاف ہے۔ عقل سلیم کبھی تسلیم نہیں کرے گی۔

حسن آرا: خدارا اس میں کوشش کیجیے۔ ورنہ خوب یاد رکھنا دولھا بھائی، سپہر آرا اسی ہاتھ سے جائیں گی۔ یہاں سے تو اس امید پر جائیں گی کہ ہمایوں فر کو زندہ پائیں گی اور یہ معلوم۔ پھر زندگی کا کون بھروسا۔

نواب: ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا بہ امید قائم ہے۔ جب آس نہ رہی تو یاس ستم ڈھائے گی مایوسی کو خدا غارت کرے۔ کسی مصرف کا نہیں رکھتی۔ انسان کا بچنا پھر محال ہو جاتا ہے۔ خیر اب سنیے۔

سپہر آرا بیگم تمام شب بے قرار مثل ماہی بے آب مضطر رہیں۔ ایک دم چین نہیں آتا تھا۔ شہزادہ مہرور کا خیال آٹھ آٹھ آنسو رلاتا تھا۔ پچھلے کو ذری آنکھ لگی تو خواب دیکھا۔ دیکھتی کیا ہیں کہ شہزادۂ فریدوں کمر مرزا ہمایوں فر ایک رشک قمر مشتری پیکر کم سن دلھن کے ساتھ ساتھ گلزار پُر بہار میں مصروف گلگشت ہیں۔ باغ مینو سواد ہے اور وہ پری زاد ہے۔ رقیب کو اپنے معشوق کی بغل میں دیکھ کر کہا۔ بجا ہے۔ ہم تو آپ کے رنج مفارقت میں گھلیں اور آپ پریوں کے ساتھ ادھر اُدھر رنگ رلیاں منائیں اور دل جلوں کو اور جلائیں۔

تم بھی کس قدر بے مروت ہو　　　　کتنے کج خلق و بے حمیت ہو

مرد کی ذات بے مروت ہے

اور دغا باز ان کی خلقت ہے

ہمایوں فر نے اس بُت شیریں حرکات کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور دانتوں کے تلے انگلی دبا کر کہا۔ ارے! توبہ توبہ سپہر آرا تنک کر بولی۔ بس بس۔ دیکھ لیا۔ جبھی مکر کر کے قبر میں سو رہے۔ جاؤ خیر ہم بھی اپنے کو

دفن کر دیں گے۔ ہم کچھ کم تھوڑا ہی ہیں، اس موئی درگور کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر، باغوں میں اٹھکیلیاں کرنا اور ہم کو دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں دبانا۔ خیر صاحب یوں ہی سہی۔

ع جائیے بس خوب الفت آزمائی آپ کی

ہم سنا کرتے تھے مردوے بے حمیت ہوا کرتے ہیں۔ سو آج تجربہ بھی کر لیا۔ کل اسی میدان میں رات بھر تمہارا راستہ دیکھا کیے، مگر تم گلچھرّے اڑاتے تھے۔ اتنے میں جنگل کا کتّا (ھکوھکو) دکھائی دیا۔ مجھے بہت خوف معلوم ہوا، اور ایک درخت پر چڑھ گئی۔ اب آپ بتائیے منظور کیا ہے۔ کہا ہماری منظوری غیر منظوری کی نہ کہو۔ ہم تو دل و جان سے نثار ہیں۔

شہزادہ: بس ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ہم تمہارے عشق میں مر مٹے۔

سپہر آرا: بجا۔ ہم میدانوں بیابانوں کی ہوا کھائیں اور آپ عاشق جتائیں۔ مکر کر کے مر گئے اور ہم کو بتے بتاتے ہیں۔ جب جانیں کہ جیتے جاگتے سامنے آؤ۔ موت موئی نگوڑی کی کیا حقیقت ہے۔

شہزادہ: تم کتنی ناسمجھ ہو۔ میں کچھ مرا تھوڑا ہی ہوں۔ اللہ جانتا ہے جس دن تم مو پریشان آئیں اسی دن اٹھ کھڑا ہوں گا۔ اور اسی دم نکاح ہو جائے گا۔

جو کہ ہیں مرد باوفا ہیں وہ　　راست گو ثابت آشنا ہیں وہ
جانِ جاں کیا نہیں ہے آپ کو یاد　　قصۂ قیس و وامق و فرہاد
جتنے عاشق تھے سب ہوئے جانباز
جان کھو بیٹھے یہ اٹھائے ناز

سپہر آرا: اب ایسا نہ ہو کہ ہم تو علانیہ لاکھوں آدمیوں میں بے حجاب تمہارے مرقد پر جائیں، اور لوگ ٹھٹھے لگائیں کہ واہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بات کی بات جائے اور جان کی جان۔ خوب سمجھ لو۔ سمجھی کہ تمام عمر تمہارے ساتھ زندگی بلطف بسر کروں گی۔ مگر یہ معلوم ہی نہ تھا کہ

ع آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ جلاد آیا

یہ لب لعل شکر خا اور یہ رُخ زیبا میری قسمت کا نہ تھا۔ افسوس۔ جتنی باتیں جوان شریف خصوصاً شہزادوں میں ہونی چاہئیں وہ سب خدا نے تمہاری ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ حسین ویسے ہی، ذی اخلاق ویسے ہی۔ فیاض اور جواد ویسے ہی، اور ان سب پر طرّہ یہ کہ مومن پاک۔

شہزادہ: نامرد تھا۔ اگر مرد ہوتا تو نہتے پر ہاتھ نہ اٹھاتا، ذرا بھی مہلت ملتی تو ولایتی کا ایسا تلا ہوا ہاتھ دیتا کہ تمام عمر یاد کرتا۔ میری شمشیر خارا شگاف کی چمک نمونہ قیامت ہے۔

پہنچی سمِ فرس پہ جو بالائے سر گری چمکی ادھر زمین سے نکل کر ادھر گری
ناری گرے ادھر وہ جدھر کوند کر گری جس صف سے لگ چلی یہ وہ صف خاک پر گری

دکھلا کے اوج جاتی تھی یوں ہر سوار پر
جنگل میں باز گرتا ہے جیسے شکار پر

سپہر آرا: محبت کا مقتضا تو اب یہی ہے کہ اٹھ بیٹھو اور زیادہ نہ ستاؤ۔ مگر تم کب مانوگے ہماری جوانی اور زندگی تلخ ہوگئی۔ ہائے موت بھی نہیں آتی۔

شہزادہ: جانی اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ موت سے بے بسی ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مگر بیڑا اٹھالیا ہے کہ پھر اسی طرح منہ دکھاؤں گا۔ قبر شق ہو جائے گی اور کفن پہنا ہوا قبر سے نکلوں گا۔ ہنستا کھلکھلاتا چہکتا۔ خندہ زناں، مست و غزل خواں۔

سپہر آرا: آمین اللہ۔ آمین آمین۔ ازیں چہ بہتر۔ خدا ہمچنیں کند۔

شہزادہ: ساری خدائی کو حیرت ہوگی۔ مگر ہوگا ایسا ہی۔

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ شہزادۂ خاقان کلاہ و ثریا جاہ نے بے تاب ہو کر اس بت تنگ چشم کو گلے لگایا۔ اور لب جان بخش پر لب رکھ کر پیار کیا کہ اتنے میں سپہر آرا کی آنکھ کھل گئی، اور معاً مغلانی کو آواز دی۔ مغلانی مغلانی۔ اے مغلانی سویرے کا وقت۔ مغلانیاں میٹھی نیند سو رہی تھیں۔ مگر حسینی خانم محلدار کی آنکھ کھل گئی۔ کہا حاضر ہوئی حضور۔ ارشاد۔ اس کی آواز سن کر اور عورتیں بھی جاگ اٹھیں۔ حسن آرا کی آنکھ کھلی۔ بہار النساء اور روح افزا جاگ پڑیں۔ طشت آیا پانی منگوایا۔ سب نے منھ دھویا۔ اور کمرے میں متمکن ہوئیں۔ تو سپہر آرا نے آبدیدہ ہو کر یوں تقریر شروع کی۔

سپہر آرا: باجی جان۔ اس وقت جی کو ہول ہوتا ہے۔ رات کا قصہ سناؤں تو آنسوؤں کے دریا بہا دو۔ ہائے کیا جانے میں نے کیا دیکھ لیا۔ کیا جانے کون کشتۂ ناز نظر پڑا۔ ایسا خواب خدا روز دکھائے، گو اب خواب و خیال مرہم جگر ریش نہیں ہو سکتا۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے تسکین تو ہو جاتی ہے۔ ہائے لوگو یہ کیا ہو گیا۔ میں تو کہیں کی نہ رہی لٹ گئی لٹا گئی۔ لاکھ ضبط کرتی ہوں مگر آنسو نہیں تھمتے اور کیونکر تھمیں زخم کاری لگا ہے کچھ کھیل تھوڑا ہی ہے۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

حسن آرا: ہمیں رونا تو تمام عمر کا ہے۔ خواستۂ خدا ایسا ہی تھا کہ کوئی کیا کرے۔ کسی کا بس چلتا ہے، اسی جگہ تو لاچار ہے۔ کچھ کرتے دھرتے بن ہی نہیں پڑتی۔

روح افزا: خواب میں اسی بیچارے کی صورت دیکھی ہوگی۔

بہار النسا: بیان نہ کرنا۔ دن کے وقت خواب کا ذکر کرنے سے مسافر راہ بھٹک جاتے ہیں اور خواب کا اثر جاتا رہتا ہے۔ رات کو کہہ دینا۔

حسن آرا: واہ۔ اثر۔ اثر کیسا۔ اور مسافروں کے راہ بھٹکنے کی اچھی کہی۔

سپہر آرا: ہم کو وہ سب باتیں یاد ہیں جو جو ہم نے دیکھیں۔ ایک اندھیرا سا چھایا ہوا ہے۔ میرے اللہ میں کیا کروں۔

بلائے جسم ہے جان اور وبال دوش ہے سر — ہر ایک دم دم خنجر ہر ایک مو نشتر

نہ ہوگا مجھ سا کوئی خستہ و پریشاں حال — ستم رسیدۂ ہجراں و بے کس و مضطر

الم گزرتے ہیں جو جو خدا ہی واقف ہے — ہزار داغ مصیبت ہیں اک مرے دل پر

نہیں ہے اس کا بھی کچھ غم مگر ہے تیرا دھیان — نہ اپنے جی کا مجھے ہوش ہے نہ دل کی خبر

ے مزار پر جاروب کریے مژگاں سے — چھڑکیے پاکی طینت سے آب دیدۂ تر

امید نیست دگر دافع ایں ملال شود
اگر بمیرم وائے جاں بتو وصال شود

بڑی بیگم صاحب کو کسی نے اطلاع دی کہ سپہر آرا بیگم نے ایک خواب دیکھا ہے جس کو وہ بیان نہیں کرتیں۔ مگر زار زار روتی ہیں۔ وہ بیتاب ہو کر ان کے پاس آئیں، اور چٹ چٹ بلائیں لے کر کہا، بیٹا خبردار خواب کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ رات ہو تو مجھ سے کہنا۔ میں حافظ جی کو بلواؤں گی، وہ بڑے معتبر ہیں۔ سپہر آرا نے کہا، اماں جان میں نے دیکھا کہ ہمایوں فر ایک عورت کے ساتھ باغ کی ہوا کھا رہے تھے۔ مگر مجھے دیکھ کر وہ عورت بھاگ گئی، اور میں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ انھوں نے کہا تم میرے مزار پر مو پریشان آؤ تو میں فوراً اٹھ کھڑا ہوں، اب جو رائے ہو، جو صلاح ہو۔ یہ کہہ کر سپہر آرا کی آنکھ سے دریائے اشک جاری ہوا۔ بڑی بیگم صاحب نے بیٹی کو گلے لگایا اور یوں سمجھایا۔

بڑی بیگم: سنو بابا۔ خدا کی خدائی سے کوئی بات بعید نہیں۔ کبھی تم نے یہ بھی سنا ہے کہ عورت کے پیٹ سے سانپ کا بچہ پیدا ہوا مگر ایسا ہوا ہے۔ کبھی یہ سنا ہے کہ تین لڑکے عورت جنی۔ مگر یہ ہمارے ہوش کی بات ہے، ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ کبھی یہ بھی سنا ہے کہ نیم کے درخت میں کیلے لگیں۔ مگر ایسا ہوا ہے، اور کنوئیں سے کنوؤں دودھ

نکلا ہے بابا۔ تم ابھی یہ باتیں کیا جانو۔

بہار النسا : ہاں ہاں سچ تو فرماتی ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوا کرتی ہیں۔ آدمی کیا اور عقل کیا۔ خاک کا پُتلا خدا کی خدائی میں دخل دے سکتا ہے۔ بھلا۔ ہرگز ہرگز نہیں۔

روح افزا : اچھا اور کسی سے صلاح لو۔ یہاں تو کل سے یہ بات مشہور ہے کہ سپہر آرا بیگم قبر پر جانے والی ہیں، ایک زمانہ کہتا ہے اور خبر بڑی گرم ہے۔ مگر سوچ سمجھ لیجیے۔

حُسن آرا : آغا جعفر شاہ صاحب ہیں۔ نواب فرتام الدولہ ہیں۔ نواب منجھلے صاحب ہیں۔ ان سب کو بُلوا کر رائے لیجیے۔ دیکھیے وہ سب کیا کہتے ہیں۔

مغلانی : حضور خورشید لقا بیگم تو کہتی ہیں۔ خدا را ایسا ہی ہو۔

حُسن آرا : جو سب کی صلاح ہو وہ ہو بس۔ ہزار بات کی ایک بات یہ ہے جو سب صلاح دیں اس کے مطابق کام ہو۔

بڑی بیگم صاحب نے ایک معبّر کو جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھا۔ فوراً طلب کیا اور کہا حافظ جی اس خواب کی تعبیر تو دیجیے۔ لڑکی نے خواب میں ہمایوں فر کو دیکھا۔ اور انھوں نے اس سے کہا کہ اگر میری قبر پر آؤ تو میں زندہ ہو جاؤں۔ مگر مو پریشان آؤ۔

معبّر : خود انھیں کی زبانی کل حالات سننا چاہتا ہوں۔

بڑی بیگم : مغلانی۔ سپہر آرا بیگم کو بلاؤ تو۔ کہو ذری یہاں آئیں۔

معبّر : کل امور من وعن بیان فرمائیں یاد کر کے کہیں مگر کوئی بات رہ نہ جائے۔ خواب پریشان ہوا کرتا ہے۔ اور اس کو میں ہی خوب سمجھتا ہوں کہ اس کے امور کیا ہیں۔ کل ایک رئیس نے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی کہا ہم نے خواب میں دیکھا کہ ہم کنوئیں پر کھڑے ہیں۔ لوگ پانی بھر رہے ہیں، سیکڑوں سقے بچاسوں آدمی جمع مگر جس سے پانی مانگتے ہیں وہ کہتا ہے الگ ہٹ۔ آخر کار ایک بوڑھی عورت نے ہمیں پانی پلانے کی کوشش کی تو دو پر آ بخورے پر جم گئے۔ ہم نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ پروں کو ہٹائیں مگر کوشش بیکار گئی۔ وہ پر وہاں سے نہ ہٹے۔ معاً کہہ دیا کہ آپ کے جانور پیاسے رہتے ہیں۔ رئیس نے آدمیوں کو چھڑا دیا اور اپنے داروغہ سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ۔ یہ کیا بات ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دن جانوروں کو پانی نہیں ملا تھا۔ خاں صاحب جو اس کام کے لیے مقرر تھے وہ پینک کے سبب سے پانی دینا بھول گئے۔

بڑی بیگم : جبھی تو تم کو بلوایا ورنہ اور بہت سے آدمی تھے۔

معبّر : میں تو اس سرکار عالی کا نمک پروردہ قدیم ہوں۔

من بندہ حضرت کریمم پروردۂ نعمت قدیمم
گر بے ہنرم وگر ہنرمند
لطف است امیدم از خداوند

اتنے میں معلانی نے کہا حضور ذری خود چل چلیں تو بات بن جائے۔ بڑی بیگم صاحب جریب ٹیک کر
اٹھیں اور سپہر آرا کے پاس گئیں۔ اور سمجھانے لگیں، بیٹا۔ جو مصیبت ہم پر پڑی وہ دشمن پر بھی نہ پڑے مگر شاید
خدا مصیبت دور کر دے۔ دروازہ بھڑا ہے، دُہری ڈیوڑھی ہے۔ چقیں پڑی ہیں۔ بوڑھا آدمی ہے۔ تم فقط
حال سب بیان کر دو۔ اتنا کہنا مان لو۔ سپہر آرا آبدیدہ ہو کر اٹھی حسن آرا اور بہار النسا اور روح افزا ساتھ
گئیں۔ چق کے پاس سے سپہر آرا نے خواب کا حال یوں بیان فرمایا۔ کل رات کو مجھے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔
اور اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھی کہ یا خدا یہ کیا ہوا۔ پچھلے کو خدا خدا کر کے آنکھ لگی تو خواب میں اس بیچارے کو
دیکھا کہ ایک عورت کے ساتھ چمن کی ہوا کھا رہا ہے۔

معبّر: جی۔ عورت خوبصورت تھی یا سیاہ فام اور بدصورت؟

سپہر آرا: نہایت حسین، ماہرو، پری چہرہ، شیریں حرکات، رنگین ادا۔

معبّر: سن کیا تھا صاحبزادی خوب یاد کر کے بتاؤ۔

سپہر آرا: سن کوئی سترہ اٹھارہ برس کا۔ کشیدہ قامت۔

معبّر: ہاں میری ایک خواہش ہے کہ تم کوئی شعر پڑھو۔

سپہر آرا: بہت خوب

فنا ہے سب کے لیے مجھ پر کچھ نہیں موقوف
یہ رشک ہے کہ اکیلا رہے گا تو باقی

معبّر: اچھا اور سب امور بیان کیجیے۔ اس کے بعد پھر کیا دیکھا۔

سپہر آرا: پھر؟ مجھ سے باتیں ہونے لگی اور عورت ہٹ گئی۔ میں نے کہا کیوں بندہ پرور شرط وفا یہی ہے۔
ہم تو دل و جان سے عاشق ہوں اور آپ منہ چھپا کے چل دیں۔ کہا جانِ من اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ قضا آئی
لے گئی۔ قضا سے کوئی لڑ سکتا ہے؟ میں بھی خاموش ہو رہی۔ مجھ سے کہا جانِ جان اگر قبر پر مو پریشان آؤ تو
کیا مضائقہ ہے فوراً زندہ ہو جاؤں۔ اس میں ہرگز ہرگز دریغ نہ کرنا۔ اس کے بعد ہاتھ میں ہاتھ لیا اور آنکھ کھل گئی۔

معبّر: آخری حصہ چبا چبا کے بیان کیا۔ اس کی سند نہیں کوئی خادمہ ایسی بلوائیے جو ان کی ہم سن ہو۔
اس سے کچھ سوال کروں گا۔

حسّو دائی کی لڑکی بھیجی گئی۔ معبّر نے کہا بیگم صاحب کے کان میں پوچھو کہ بوسہ بازی کی نوبت آئی تھی یا نہیں۔ دائی کی چھوکری نے سپہر آرا کے کان میں کہا۔ اتنا بتادیں حضور کو بوسہ لیا تھا یا نہیں۔ سپہر آرا نے گردن ہلا کر اشارے میں بتادیا ہاں لیا۔ معبّر نے کہا۔ میرے نزدیک ان کو قبر پر ضرور جانا چاہیے۔ مگر وقت شب، چاندنی رات ہو، قلعے کے پھاٹک تک سواری پر جائیں، وہاں سے پیادہ پا۔ یہ کہہ کر معبّر تو تشریف لے گئے اور ادھر بیگم صاحب نے اپنے اعزّہ کو بلوایا۔ آغا صاحب، نواب جعفر حسین خانصاحب، شہزادۂ دارا مرتبت، بہار النسا کے میاں اور کئی اور عمائد نے باہم مشورہ کیا۔

آغا: واللہ ہے بڑی جیرک ہو اگر سپہر آرا بیگم کو وہاں نہ بھیجو۔

جعفر: بیشک اور دیکھ لینا قبر شق ہوجائے گی ذرا شک نہیں۔

آغا: ہم تو قسم کھا کے کہہ سکتے ہیں کہ اس بات میں فرق آ ہی نہیں سکتا۔

جعفر: توبہ توبہ۔ مجاور مرد معتبر ہے۔ پھر لالہ نے اس کی گواہی دی اور دونوں نے کہا کہ اگر دُلھن آئے تو یہ زندہ ہوجائیں اور پھر خود دُلھن نے خواب دیکھا۔

آغا: اور ایسے مشہور معبّر نے رائے دی کہ ضرور بالضرور جائیں۔

بہار النسا کے میاں نواب صاحب نے کہا ہم اس رائے کے خلاف ہیں۔ یہاں نہ خواب کے قائل ہیں نہ معبّر کو مانتے ہیں، نہ مجاور کو۔ بھلا یہ عقل کی بات ہے۔ مردے بھی کہیں زندہ ہوتے ہیں۔ ایک نہیں دس ہزار خواب کوئی دیکھے تو کیا ہوتا ہے۔ قبر شق ہولی۔ بجا ارشاد ہوا، اور قبر سے ہمایوں فر زندہ نکلیں گے، اور بہت بہت صحیح ہے۔ خدا خدا کیجیے، عقل کے ناخن لیجیے۔ ہم ہرگز صلاح نہ دیں گے۔

جعفر: بھائی جان، ابھی صاحبزادے ہو تم یہ باتیں کیا جانو۔

آغا: ان سے اتنا تو پوچھیے کہ نام بدل کے قائل ہیں یا نہیں۔

نواب: کس کے قائل۔ نام بدل! نام بدل گیا۔

آغا: اے صاحب میرا نام قائم علی، اور آپ کا نام بھی قائم علی ہے۔ اچھا حکم ہوا کہ ان کی روح قبض کی جائے۔ فرشتے نے غلطی کی، اور میری قبض کرلی۔ میں مرگیا۔ اب تجہیز و تکفین کی فکر ہوئی اتنے میں غلطی معلوم ہوئی اور میں فوراً زندہ ہوگیا۔ جناب خدا کے کارخانوں میں کسی کو دخل نہیں۔

توان در بلاغت بہ سحباں رسید
نہ در کنہ بیچون سبحاں رسید

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ ۔ وَمَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ

نواب : آپ کی عقل کے صدقے، کہنے لگے فرشتے نے غلطی کی۔ اور نام بدل گیا۔ آپ مر گئے۔ تجہیز و تکفین کی فکر کی اور آپ جی اٹھے جناب بس ان خیالات سے حذر کیجیے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
عقل کی بات کو جو کفر و خطا کہتے ہیں

آغا : آپ انگریزی پڑھ کر بالکل کرسٹان ہو گئے۔

جعفر : اس میں کیا شک ہے۔ دریں چہ شک۔

اکثر عمائد اور روسا میں بحث ہوئی، بیشتر دن کی رائے تھی کہ سپہر آرا بیگم کو ضرور بالضرور جانا چاہیے۔ مگر نواب صاحب اس رائے سے اختلاف ظاہر کرتے تھے۔ آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ مجاور کو بلائیں اور اس سے دریافت کریں مجاور بلایا گیا۔ کہا کل شب کو قبر پر بڑا جشن تھا۔ دو سو آدمیوں سے کم کی جماعت نہ تھی۔ عورتیں اور مرد اور طائفے اور تماشبین صدہا آدمی۔ بڑی دیر تک ناچ رہا اور پچاس آدمی گواہ ہے۔ پورا پچاس۔ ایک دو بھی نہیں۔ ایک لالہ وہی ہے اس دن گواہی دیتے آئے تھے۔ دوسرے منولال۔ تیسرے شیر محمد خاں، چوتھے مولوی لطف احمد ان سب کو بلوائیے تو حال کھل جائے۔ چاروں طلب ہوئے۔

آغا : مولوی لطیف احمد صاحب آداب عرض ہے۔ اس جگر دوز سانحے نے شہر بھر کو خون رلایا۔ ہر کس و ناکس ماتم کرتا ہے۔

مولوی : (آہ سرد بھر کر) آپ کے تو عزیز نور چشم قرۃ العین تھے۔ آپ کا ماتم کرنا عجیب نہیں، مگر خدا گواہ ہے۔ جس گلی کوچے سے نکل جائیے ہر زن و مرد کو روتے پائیے گا۔ کل ایک بڑھیا کہتی جاتی تھی کہ لوگو میں نے آج تک بجز حسینؓ کے کوئی غم نہیں کیا مگر اس شہزادے کے غم سے میرا کلیجہ پھٹ گیا۔

نواب : ہاں، مولوی صاحب، کل شب کا حال کچھ فرمائیے۔ آپ نے کیا دیکھا۔

مولوی : وہ کیفیت دیکھی کہ عقل دنگ ہے۔ واللہ عقل کام نہیں کرتی۔ قبر پر میلا لگا ہوا تھا اور صدہا پریاں ایک سے بڑھ کر ایک۔ کوئی ناچتی ہے کوئی تھرکتی ہے، کوئی گاتی ہے۔ عرس میں آج تک ایسی بھیڑ نہیں دیکھی۔ ایک شخص کو حال آیا۔ قوال تربت عنبریں پر بیٹھا ہوا گاتا تھا۔ گاتے گاتے ایک مرتبہ اس نے یہ شعر گایا۔

غلام ہمت آن رند عاقبت سوزم
کہ در گدا صفتے کیمیا گری دارد

یہ شعر سنتے ہی ایک پیر مرد اچھل پڑے۔ حق حق۔ اور قوال نے پھر بدستور گانا شروع کیا اور اس

مرتبہ اور بھی جی لگا کے

ع کہ در گدا صفت کیمیا گری دارد

اور ایک مقام پر ایک عورت نے جو پیشہ دلالی کرتی ہے، اور واجب القتل ہے، قبر کو بوسہ دے کر کہا، ہائے ہمایوں فر، ہائے ہمایوں فر اور فوراً غش آگیا گر پڑی۔

یہ تقریر سن کر ایک خدمتگار نے کہا۔ خداوند اس میں تحقیقات کی کیا ضرورت ہے۔ اور تعجب کی کون سی بات ہے، کل رات کو غلام بھی شہزادۂ بہادر کی قبر پر تھا۔ وہاں تو روز شام سے ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ پریاں اور حوریں کیسی۔ نجبن کی چھوٹی بہن تھی۔ بریلی والی امامن تھی۔ اور کل تو تنبولیوں کی دکانیں بھی تھیں۔

مولوی صاحب نے کہا۔ ہاں! یہ حال ہمیں نہیں تھا، ہم سمجھے سچ مچ پرستان کی پریاں آئی ہیں۔

نواب: یہ تو حال ہے، بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ سوئی کا بھالا، واہ رے زمانے اور اسی پر ہمارے بزرگوں کو ناز ہے۔

آغا: بھئی اب یہ حال ہمیں کیا معلوم تھا۔ تو اول مرتبہ جو مشہور ہوا تھا، وہ بھی کچھ ایسا ہی واقع ہوا ہوگا لاحول ولا قوۃ۔ قبر شق ہو گئی تھی۔

مجاور: جی نہیں۔ اول مرتبہ تو سبحان اللہ قبر شق ہو گئی تھی۔ اس روز ہمایوں فر سے ہمارے سامنے باتیں ہوئیں۔ اشعار پڑھے گئے۔ شہزادے نے ایک پری کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا۔

شراب لعل کش درو‌ئے مہ جبیناں بیں
خلاف مذہب آناں جمال اینان بیں

پری نے اٹھلاتے ہوئے اس کا جواب دیا، اور وہ بھی شعر میں۔

باصبا در چمن لالہ سحری گفتم
کہ شہیداں کہ اند ایں ہمہ خونیں کفناں
گفت حافظ من و تو محرم ایں راز نہ ایم
از مئے لعل حکایت کن و سیمیں ذقناں

آغا: پھر اب جو تجویز ہو اس کے مطابق عمل میں آئے۔

نواب صاحب نے کہا ہماری رائے ہے کہ اس خیال خام سے آپ درگزریں اور اگر یہی رائے ہو کہ سپہر آرا بیگم بالضرور جائیں تو کوئی صاحب اس امر کا ذمہ کریں کہ ان کے قلب پر صدمہ نہ پہنچے گا۔ خوب یاد رکھیے کہ ہمایوں فر تو زندہ ہونے سے رہے۔ یہ تو ایسا ہی غیر ممکن ہے، جیسا بندے کا خدا ہو جانا (معاذ اللہ) اور جب وہ زندہ نہ ہوں گے تو ضرور ہے کہ سپہر آرا کی جان جائے۔ ممکن نہیں کہ یہ بچ سکیں۔ اتنا بڑا صدمہ ہوگا کہ جان نکل جائے گی۔

اس امر سے اکثر رؤسا نے اتفاق کیا۔

اتنے میں خدمتگار نے کہا۔ حضور، بی مغلانی نے کہا (گھر میں بلاتی ہیں) نواب صاحب اندر گئے۔ ڈیوڑھی کے قریب حسن آرا اور بہار النسا کھڑی تھیں۔ حسن آرا نے کہا دولھا بھائی اب کیا رائے قرار پائی۔ برائے خدا ایسا نہ ہونے دینا، نہیں تو سپہر آرا بھی ہاتھ سے جائیں گی۔ نواب صاحب بولے کچھ خیر ہے بھلا میں ایسا ہونے دوں گا۔ حشر تک نہیں۔ کیا مجال۔

ع این خیال است و محال است و جنوں

کیا مجال۔ بہار النسا نے خفا ہو کر کہا۔ واہ اتنی سی لڑکی کی عقل میں آگئے، آخر کچھ اپنی بھی عقل ہے یا نہیں۔ چلو تم کو اماں جان بلاتی ہیں۔ نواب صاحب بڑی بیگم کے پاس گئے۔ انھوں نے کل امور انھیں کی رائے پر چھوڑ دیے۔ اب سنیے کہ قبر پر ہزار ہا آدمی جمع تھے اور سب کو شک کی جگہ یقین تھا کہ سپہر آرا ضرور آئیں گی، دو چار انگریز بھی آئے تھے، جب شام ہوئی تو اور بھی جماعت زیادہ ہوئی، اور جھٹپٹے کے وقت قلعے میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی کہ اتنے میں ایک شخص نے کہا رائے پلٹ گئی۔ اب نہ آئیں گی۔ رفتہ رفتہ یہ خبر سب میں مشہور ہو گئی اور اکثر آدمی مایوس ہو کر بڑی بیگم کے مکان پر آئے۔ یہاں کا حال سنیے ایک گھڑی رات گزری ہو گی کہ بڑی بیگم کے محل معلیٰ کے چاروں طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، اور سو سو آدمی مل کر غل مچاتے تھے کہ خدا کے لیے ان کو ضرور بھیجو۔

حسن آرا: خدا کی سنوار ان نگوڑوں پر۔ آج ہمیں نے یہ بُرا دن دیکھا ان کا بھی کوئی مواجیتا ہے۔ ان کی اماں بہنیا بھی قبروں پر مردوں کو جلانے گئی ہیں۔

بہار النسا: ہاں یہ تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ اللہ سمجھے ان سے۔

بڑی بیگم: چپ رہو بیٹا۔ چپ رہو۔ اُف۔ ہائے ہائے۔

حسن آرا: اور یہ سب باہر بیٹھے مُنہ ہی تاکتے ہیں کسی سے اتنا بھی نہیں کہا جاتا کہ ارے چپ رہو خدا کے لیے چپ رہو، جب شہزادی بیگم کو اس امر کی اطلاع ملی کہ سپہر آرا ہمایوں فر کی قبر پر جانے والی ہیں تو فوراً مہریاں بھیجیں، اور اپنے دیور کو بھی پیغام دے کر بھیجا۔ مہریاں اندر گئیں، اور وہاں جا کر انھوں نے کہا۔

مہری: حضور شہزادی بیگم نے بھیجا ہے اور کچھ پیغام لائی ہوں۔

بڑی بیگم: (آہ سرد بھر کر) کہو۔

مہری: حضور تخلیے میں عرض کرنا ہے۔

بڑی بیگم: اچھا قریب آن کر آہستہ سے کہو۔

مہری : (کان میں) حضور سرکار نے بھیجا ہے کہ جو بات سب میں مشہور ہوئی ہے، اس کے مطابق کام نہ کیجیے گا۔ ورنہ آپ کو اختیار ہے

بڑی بیگم : نہ ہرگز نہیں۔ جو اُن کی رائے ہے وہی ہماری بھی رائے ہے۔

حسن آرا : دیکھا اماں جان ہم نے کیا عرض کیا تھا۔

بڑی بیگم : بیٹا میرے حواس برجا کہاں ہیں۔ میرے تو ہوش اُڑے ہیں۔

حسن آرا : اس میں کیا فرق ہے۔

مہری : یہ پیرانہ سالی اور صدمہ۔

بہار النسار : ہم نے تو سُنا تھا کہ خورشید لقا بیگم کی مرضی ہے کہ ضرور جائیں۔ اب تم یہ پیغام لائیں۔

مہری : نہیں حضور سب کوئی یہی کہتی ہیں کہ ان کی خدا نہ کرے جان جاتی رہے گی۔ اور وہ صدمہ سہہ نہ سکیں گی۔

مہری رخصت ہوئی اب سنیئے کہ شہزادی بیگم کے دیور محمد احسن خاں صاحب نے بھی مردوں میں یہی تقریر کی اور کہا کچھ خیر ہے کیوں اس بیچاری معصومہ کے دشمن ہوئے ہو۔ مفت میں اس کی جان لوگے۔ نواب صاحب نے کہا۔ میں بھی کل سے یہی بک رہا ہوں۔ اور میں کہتا گیا تھا۔ میری یہی رائے ہے، مگر سنتا کون ہے۔ کوئی سنے نہیں تو میں کیا کروں۔ رو پیٹ کے بیٹھ رہا۔

واقعاتِ جنگ

روسی جاسوس گرفتار کر لیا گیا۔ ہر چند اس نے عذر کیا کہ میں ایلچی ہوں، سفیر ہوں۔ ایلچی راجہ زوال۔ مگر ترکوں نے ایک نہ سنی۔ تھوڑی دیر میں محمود پاشا نے کہا۔ کل میرے پاس بھی ایک شخص آیا تھا۔ پہلے تو مجھ سے کہا، بھائی میں مسلمان ہوں، اور باایمان ہوں۔ تم میرے برادر دینی ہو۔ اگر امکان میں ہو تو مجھے کچھ دو۔ میں وطن سے اس قدر دور ہو گیا ہوں کہ بلامدد برادران دینی اپنے لڑکوں بالوں اور اپنی بیوی، اور بوڑھے والدین کو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا تم اس قدر لجاجت کیوں کرتے ہو۔ تمھارے لیے چندہ ہو جائے گا۔ اپنا حال تو بتاؤ؟ کہا میں ترکی فوج میں بھرتی ہوا تھا، مگر اڈریا نوپل کی طرف ایک جنگ میں گرفتار ہو گیا۔ اس طرح بیان کیا کہ مجھے یقین آ گیا۔ جب میں نے چندے کا نام لیا تو کہا، چندہ میں نہیں چاہتا۔ جو کچھ دو گے، لے لوں گا۔ میں نے ان کو بٹھایا، مگر کچھ دیر کے بعد قلعی کھل گئی۔ آہستہ سے کان میں کہا اگر کچھ ضرورت ہو تو جواہرات دلوا دیں۔ تب تو

مجھے حیرت ہوئی۔ اور متحیر ہو کر اس شخص پر نظر ڈالی۔

میں : جواہرات کیسے، تم یہ کہتے کیا ہو آخر۔

روسی : اگر زر و زیور اور زر و گوہر کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ اب سمجھ جاؤ جس قدر رقم کہو دلوا دوں۔

میں : تم سچ بتاؤ کہ ہو کون۔ روسی یا ترکی۔

روسی : اس سے کیا مطلب۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ نوکری کیوں کرتے ہو، فوجی نوکری کی تم کو کیا ضرورت ہے۔ یہی نہ کہ روپیہ ملے۔

میں : نہ صرف اس وجہ سے کہ مجھے فوجی نوکری دل و جان سے پسند ہے، اور سبب بھی ہے کہ میں اپنے ملک کے نام پر جان دیتا ہوں۔

حبّ الوطن از ملک سلیمان خوشتر

خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

اس پر وہ اٹھ کھڑا ہوا میں تاڑ تو گیا ہی تھا فوراً اس کو روکا۔ اب جاتے کہاں ہو، بچہ جی۔ ادھر تو آؤ ذرا۔ اب ہم تم کو جانے بھی دیں گے۔ اس نے اس طرح پر ہاتھ جوڑے اور ایسا گڑگڑایا کہ مجھے بہت رحم آیا اور میں نے چھوڑ دیا۔

آزاد : واہ رے آپ کے رحم۔ بہت برا کیا۔

کرنل : بڑی غلطی کوئی ایسا کرتا ہے بھلا۔ واہ۔ ہونھ!

اپلیٹن : فوراً گرفتار کر لینا تھا، مگر اللہ ری دغابازی دیکھیے تو کہاں کہاں پہنچتے ہیں۔ کچھ ٹھکانا ہے۔

آزاد : میں اس کی صورت ہی سے پہچان گیا تھا کہ یہ بد آدمی ہے۔ مگر لب و لہجہ درست۔ شکل صورت اچھی۔ باوضع، خوش قطع، یہ سب باتیں ہیں لیکن چہرے سے حرامزدگی برستی ہے :

تواں شناخت بیک روز از شمائل مرد

کہ تا کجاش رسیداست پائے گاہ علوم

ولے ز باطنش ایمن مباش و غرّہ مکن

کہ خبث نفس نہ گردد بہ سالہا معلوم

کرنل : پھر اب کیا رائے ہے۔ حملہ یا سکوت؟

آزاد : سکوت! بجا ارشاد ہوا، سکوت کیسا۔ حملہ ضرور ہو گا وہ لاکھ ہوں چاہے دس لاکھ ہوں۔

اسی روز فوج ترک کا ایک کالم آزاد پاشا کی سپاہ جرار سے آملا۔ اور ایک خط جنرل لشکر کا دے کر کہا حکم ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کی تعمیل کرو۔ اسپلیٹن پاشا نے خط کھول کر مضمون سُنایا۔

آزاد پاشا اسپلیٹن پاشا کرنل ریاض پاشا کو معلوم ہو کہ ایشیا اور یورپ دونوں پر غنیم کی یورش ہے، اور اب اکثر لڑائیوں میں عساکر سلطانی نے شکست پائی ہے۔ مگر فوج اور رعایا جاں بکف ہے۔ پلونا سے برابر خبریں آتی ہیں کہ کمکی فوج کی کمال ضرورت ہے۔ ہمارے پچاس ساٹھ گوئندے قتل کر ڈالے گئے۔ اب ہم جاسوس بھی نہیں بھیج سکتے۔ نور پاشا نے بڑی نمک حرامی کی، روسیوں سے رشوت لے لی۔ اور کئی ہزار ترک قتل کروا ڈالے:

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

اب اس ملک کی عزت تم لوگوں کے ہاتھ ہے۔ تم کو پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ جب چاہو حملہ کر دو۔ حضرت سلطان آج کل ہر دم اسی فکر میں رہتے ہیں کہ پلونا سے کوئی مژدہ آئے۔ ایسا فرمان فرما ساری خدائی میں نہ ملے گا۔

خورشید ملک پرور و سلطان داد گر — دارائے عدل گستر و کسریٰ کے نشان
اعظم جلال دولت دیں آنکہ رفعتش — دارد ہمیشہ توسن ایام زیر ران
سیمرغ وہم را نبود قوت عروج — آنجا کہ باز ہمت او دارد آشیان

گر در خیال خرج فتد عکس اوج او
از یک دگر جدا شود اجزائے آسمان

زیادہ کہنا فضول ہے۔

آزاد: خدا کی قسم اس قدر جوش ہے کہ دل ہی جانتا ہے۔

اسپلیٹن: بیشک۔ لاریب۔ بلاشبہ۔ مگر جنگ دو سر دارد۔ لیکن ہراساں نہ ہونا چاہیے۔

آزاد پاشا نے ان لوگوں سے کہا کہ پلونا کا حال جہاں تک آپ نے سُنا ہے، اس سے ہمیں اطلاع دیجیے۔ اُن کے ایک افسر نے کہا حال اچھا نہیں، مگر ہماری فوج ایسی جوانمردی سے لڑتی ہے کہ آج تک کبھی نہیں لڑی تھی۔ آخر دسمبر تک جنرل گر کو نے محمد پاشا سے برابر لڑائیاں کیں، اور سب یہی کہتے تھے کہ جنرل کامیاب ہو گا۔ محمد پاشا نے کوشش بلیغ کی کہ پلونا میں داخل ہو جائیں۔ ۱۴ دسمبر کی صبح کو فرزند پاشا اور ایزد پاشا نے مقام مہران پر جو النیا سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے حملہ کیا۔ یہ جنگ کوہ بلقان کا ذکر ہے۔ ترکان آزاد نے خوب دادِ شجاعت دی۔ سپہ سالارانِ آزمودہ کار نے ہمت بڑھائی اور ملاؤں نے آیات قرآنی سے وہ کارِ نمایاں کیے کہ فوجِ ظفر موج کا بھر بحر جوش موجزن ہوا۔ دو گھنٹے تک معرکہ ستیز در میدان رستخیز گرم رہا۔

دو اتواپ اژدر دہان سے کاخ چنبری کے تلے ایک اور آسمان بن گیا۔ اس وقت ترکوں کی جوانمردی قابلِ دید تھی۔ بلکہ دید بھی نہ شنید تھی۔ اخبار ٹیمز کا نامہ نگار جو اس میدانِ جنگ میں شریک تھا۔ لکھتا ہے کہ ترکوں اور فراخ سینہ نوجوان سپاہیوں نے جوش میں آ کر اپنے برادرانِ دینی کی حمیت اور حمایت کی تھی۔ بڑی جرأت کے ساتھ آمادہ پیکار ہوئے۔

واقعاتِ جنگِ ترکی میں کوئی امر اس سے زیادہ مشہور و معروف نہیں ہے کہ افواج مانٹی نیگرو ہمیشہ بمقابلۂ غنیم ہر جنگ وجدل میں فتحمند و کامیاب ہوئی۔ گرینڈ ڈیوک چارلس جو شہنشاہ کے اعزّہ میں سے ہے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ انھوں نے مانٹی نیگرو والوں کی بڑی تعریف کی ہے یہ لوگ جاسوس کے دشمن ہیں۔ جنگ میں دغا سے کام نہیں لیتے۔ اکثر موقعوں پر مانٹی نیگرو کے افسروں نے بڑے کارنمایاں کیے اور اپنی شجاعت کا کامل ثبوت دیا۔ مگر ظاہراً بعض حملے میں ان کی قوت اور بہادری کا اظہار کامل طور پر نہیں ہوا۔ جن مقامات پر ترکی فوج نہایت شجاعت اور دلیری سے حافظ و نگہبان تھی ان پر روسیوں نے حملہ کیا۔ مگر مغلوب و پسپا ہوئے۔ آخر کار مانٹی نیگرو کی فوج بھیجی۔ اور یہ فوج اس قدر کامیاب ہوئی کہ ترکوں کو ہٹا دیا۔ زار نے حسب اقتضائے وقت اور عاقبت اندیشی افسران اور سپاہ مانٹی نیگرو کا بہم پہنچانا، مصلحت وقت تصور کیا اور برطبق ان کے روسی نوکر رکھے اور اس سپاہ نے کارنمایاں کیے۔ قلعجات مفتوحہ کو نہایت بہادری اور جرأت سے محفوظ اور مامون رکھا۔ جس وقت قلعۂ داؤد کے جنوب میں حملے ہونے لگے اس سپاہ جرّار نے نہایت چابکدستی اور عقلمندی سے گولے مارے اور حصار وغیرہ کا انتظام بخوبی کیا۔ جس شجاعت کا اظہار اس سپاہ نے اس موقع پر کیا وہ بعینہٖ ویسا ہی تھا کہ ثانی نپولین یا سکندر نے کیا تھا۔ اسی وجہ سے سپاہِ موصوف کی بڑی توقیر اور عزت ہوئی۔

آزاد پاشا نے کہا کل ہم ضرور جنگ کریں گے۔ پھر چاہے جو ہو۔ کل کی کارروائی پر ہمارا کل دارومدار ہے انشاء اللہ وہ کارنمایاں کریں کہ باید و شاید۔ اور بہی ہماری شجاعت یادگار ہوگی۔ اگر بچے اور حیات مستعار نے امان دی تو سبحان اللہ فہو المراد اور مرے تو خیر فہمیدہ خواہد شد، خدا مالک، اور ناصر ہے، کچھ غم نہیں۔

واقعاتِ مختلف

خوجی: کرم پھوڑ کم بختی کے نشان، میاں خواجہ بدیع الزماں بدیعا علیہ الرحمۃ والغفران افتاں وخیزاں

گرتے پڑتے بہزار خرابی منزل پر داخل ہوئے، مگر بالکل شل۔ ایک تو تھکاوٹ دوسرے سردی کی شدّت۔ تیسرے منزل کڑی۔ چوتھے مصیبت کے دن۔ راستہ دوبھر ہوگیا۔ منزل اور سفر نے بیدم کردیا پڑاؤ پر آکر ٹکے۔ سوچے کہ اب کھائیں تو کیا کھائیں۔ روسیوں کے ساتھ کھانے سے رہے اور یہاں سرا کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اس فکر میں غلطاں بیچاں تھے۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کیوں بھائی جان یہاں کوئی مسلمان بھی ہے۔ ہم نے آج تک کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں پکایا۔ اگر کوئی مسلمان ملے تو کھانا پکوائیں۔ مگر ہماری غذا کچھ بھی نہیں ہے۔ تین انڈے اس وقت، تین اس وقت نیم بریاں۔ ایک چوزہ۔ پاؤ بھر بکری کا گوشت۔ بریانی پلاؤ۔ اور صبح کو چائے پیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

ایک روز کا تذکرہ ہے کہ نواب صاحب بہادر کے ہاں ہم بیٹھے گپیں اڑا رہے تھے کہ ایک مولوی صاحب آئے یہاں اس وقت نشے جمے ہوئے، سرور گھٹے ہوئے۔ ہم نے از راہ مروت عرض کیا کہ مولوی صاحب اگر ارشاد ہو تو چینیا بیگم جھکڑے کے ساتھ حاضر ہوں۔ مولانا چکرائے منھ بنایا۔ میں معاً تاڑ گیا کہ جانگلو ہیں۔ ان کو آڑے ہاتھوں لو یہ بن جائیں گے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھائی جان ایک چسکی لو۔ مولانا نے آنکھیں نیلی پیلی کیں، اور کہا کوئی مسخرا ہے بے تو۔ میں نے کہا یار سچے ایمان سے کہہ دو کہ تم نے کبھی افیم پی یا نہیں پی۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا جناب مولوی صاحب اس مسخرے نامعقول سے پیچھا چھوڑائیے۔ خدا کے لیے صاف صاف بیان کر دیجیے کہ آپ نے کبھی افیم پی ہے یا نہیں؟ مولانا صاحب کو کمال رنج ہوا۔ بولے نواب صاحب حضور اور ایسا فرمائیں۔ کس مردود نے آج تک افیم چھوئی بھی ہو۔ اس پر میں نے آہستہ سے کہا خیر۔ پھر اشک بلبل ہی سہی۔ ایک قطرہ ہی سہی۔ اس (اشک بلبل) کے فقرے پر قہقہہ پڑا کہ چھوٹے بڑے لوٹ لوٹ گئے اور مولوی صاحب کا چہرہ مارے غصہ کے سُرخ ہو گیا۔

اس تذکرے کے بعد خواجہ صاحب بہادر نے افیم گھولی اور روسیوں سے اصرار کیا کہ ذرا سی افیم پیو۔ سب نے انکار کیا، مگر خواجہ صاحب نے بکمال لجاجت و منّت و سماجت کہا بھائی ذرا چسکی لو۔ ہماری خاطر سے پیو، ایک مسافر کی شامت جو آئی خوجی کے اصرار سے چسکی لگائی تو دم کے دم میں نشے نے رنگ جمایا اور جھومنے لگا۔ پینک آئی سر چلا، ساتھیوں نے قہقہہ لگایا۔

روسی: اب ان سے نہ بولو ان کو چپ چاپ سو رہنے دو۔

خوجی: بڑی سردی ہے۔ ہاتھ ٹھٹھرے جاتے ہیں۔ اُف۔

روسی: یہ وقت ہوا کھانے اور سیر کرنے کا ہے۔

خوجی: واہ خدا کی مار اس عقل پر، یہ ہوا کھانے کا وقت ہے؟ ارے نامعقول یہ ہوا کھانے کا وقت ہے، یا

آتش خانے میں بیٹھنے کا وقت ہے۔ ہمارے ملک کے رؤسا اس وقت تین تین کمرے بند کر کے بیٹھے ہوں گے۔ اور اس قدر گرم فرش ہوگا کہ جیٹھ بیساکھ کی گرمی کو بھی مات کرے۔ جی یہ ٹھٹھرن کا وقت ہے۔ ہوا کھانے کی اچھی سوجھی۔ ہم تو اس سوجھ بوجھ کے قربان ہیں۔ واللہ کیا عقل ہے۔ افوہ یہاں تو روح تک لرزتی ہے اور اس کو ہوا کھانے کی خوب سوجھتی ہے۔

روسی: یہ وقت آتش خانوں میں بیٹھنے کا نہیں۔ آتش خانے میں اپاہج، لولے، لنگڑے، اندھے بیٹھتے ہیں۔ یہ وقت شکار کا ہے۔ دس کوس زمین بندوق لے کر دوڑے۔ اور ہرنوں کا شکار ہو، اور اسی مقام پر ہرن بھونے جائیں۔ اور مزے سے کباب چکھیں۔ اور نمک ہو پھر دیکھیں سردی کیونکر معلوم ہوتی ہے۔ سردی کیسی، واللہ کپڑے اتار کے پھینک دو۔ تم لوگ بودے بزدل یہ باتیں کیا جانو۔

خوجی: اب بودے پن کا حال تو تمھارا دل ہی جانتا ہوگا۔

روسی: ایک سیاح نے ہم سے کہا تھا، کہ ہندوستان میں پرانی رسموں کے لوگ بہت پابند ہیں۔ اور چاہے رسمیں خراب ہی ہوں۔ وہ انھیں کی پابندی کرتے جائیں گے۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔

خوجی: بجا۔ بجا ارشاد ہوا۔ کیا ہمارے آبا و اجداد بیوقوف تھے؟ ان کی رسموں کو جو ہم نہ مانیں تو ناخلف۔ جو رسم جس طرح پر چلی آتی ہے وہ اسی طرح پر رہے گی۔ اب کچھ دن سے بعض جہلا نے انگریزی پڑھ پڑھ کے اپنے باپ دادا کو گالیاں دینی شروع کی ہیں۔ ان لوگوں کو بہت چرٹھ گئی ہے۔ سمجھتے ہیں کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ ایک انگریزی خواں سے میں نے کہا کہ کیوں حضرت آپ نے اپنے باپ دادا کی وضع کیوں چھوڑ دی؟ نہ وہ شملہ ہے۔ نہ وہ پٹکا ہے۔ نہ وہ اچکن ہے۔ نہ وہ اوگی ہے۔ نہ وہ جریب ہے۔ نہ وہ میانہ ہے۔ جریب کے بدلے ڈنڈا، بڑا موٹا لٹھ کتے ماروں کا سا۔ کھتیلے جوتے کے عوض بوٹ، لکڑ توڑ، کھٹ پٹ کھٹ پٹ۔ چکن اب نظر ہی نہیں آتی۔ اب کوٹ، فراک کوٹ، دو دو کوٹ پہنے ہیں۔ پائجامہ کے عوض پتلون ہے۔ شملہ ندارد۔ مندیل یا ترکی ٹوپی یا یہودیوں کی سی کلاہ سرخ، و سیاہ پہنے ہیں۔ پٹکا ندارد۔ عجب عجب قطعیں بنا کے حضرات نکلتے ہیں۔

روسی: اگر کوئی رسم خراب ہو تو اس میں ترمیم کرنا گناہ ہے۔ فرض کیجیے کہ بابا آدم کے وقت سے ایک خراب رسم چلی آتی ہے، اور اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

خوجی: لاکھ ضرورت ہو تو کیا۔ کبھی ترمیم نہ کرنا چاہیے۔

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

بزرگوں کی باتوں میں دخل دینا ناخلفی اور گناہ کبیرہ ہے۔ کیا وہ لوگ احمق تھے۔ ایک آپ ہی بڑے

دانا بینا پیدا ہوئے ہیں۔ ہم ان باتوں کو مطلق نہیں مانتے۔ اور نہ کبھی ان امور سے اتفاق کریں گے۔ کیا مجال۔

اب سنیئے کہ خواجہ بدیع الزماں صاحب بعد خرابی بصرۃ، ترکوں کے ڈانڈے میں داخل ہوئے۔ شب کو ایک لشکر میں رہے۔ وہاں اپنی مصیبت کا حال بیان کیا۔ آزاد پاشا کا حال پوچھا۔ صبح کو روانہ ہوئے تو ایک ہفتہ میں قسطنطنیہ پہنچے۔ اور ہرمزجی بھائی کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ ان کا حال یہاں چھوڑا۔

زینت النسا: ناظرین باتمکین کو یاد ہوگا کہ آزاد فرخ نہاد کو ایک ریل کے اسٹیشن پر دو پری زاد نوجوان عورتیں ملی تھیں۔ چونکہ شبانہ روز ان کا اُن کا ایک ہی درجے میں ساتھ رہا تھا، پہلے تو دونوں ان سے کسی قدر جھجکیں پھر راہ راست پر آئیں۔ آزاد رنگین طبع تو تھے ہی عشق کی باتیں در پردہ چھیڑ دیں۔ نوبت بایںجا رسید کہ یا تو وہ پری زادیں ان سے بگڑ گئی تھیں۔ یا آپ ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں۔ گلوریاں بنا کر دیں۔ آوازے کسے۔ بات بات پر کھلکھلائیں۔ آزاد نے اس قدر سوخ بہم پہنچایا کہ ان کے ہاں آنے جانے لگے۔ یہ دونوں چھوکریاں عیسائی تھیں۔ مگر یہ عیسائی عقائد مذہبی کے علاوہ بالکل ہندوستانیوں ہی کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے چچا نے آزاد کو شریف، حسین باوضع اور تربیت یافتہ دیکھ کر اجازت دی کہ کبھی کبھی آیا کیجیے۔ ایک بہن کا نام زینت النسا تھا، دوسری کا نام اختر النسا۔ جب آزاد نے وہ شہر چھوڑ دیا تو پھر ان کو اُن کی اور اُن کو ان کی خبر نہ رہی۔ مگر برسوں کے بعد آزاد نے ان کو دیکھا۔ اختری کا بیاہ ہو گیا تھا۔ زینت النسا ابھی دوشیزہ ہی تھی۔ آزاد کو دیکھ کر ان دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ زینت النسا اپنے دل میں خوش ہوگئی کہ اب آزاد کے ساتھ شادی ہوگی۔ مگر آزاد حسن آرا بیگم سے وعدہ کر چکے تھے۔

اب سنیئے کہ ادھر آزاد پاشا روانہ روم ہوئے، ادھر دوسرے ہفتے زینت النسا کی ایک لائق عیسائی کے ساتھ شادی ہوئی۔ اور وہ اسی شہر میں نوکر ہو کر آیا جہاں حسن آرا بیگم رہتی تھیں۔ مرزا ہمایوں فر کی وفات کے قبل زینت النسا حسن آرا کے ہاں گئی اور کہا بہن ہم وہی ہیں جن کے بوڑھے چچا سے تمہارے ہاں کے کسی بوڑھے ملازم نے آزاد کا حال پوچھا تھا۔ زینت النسا ہمارا نام ہے۔ اور آزاد کو ہم خوب جانتے ہیں۔ حسن آرا نے پیارے کی پیاری کو پایا گلے لگایا اور تعظیم کے ساتھ بٹھایا۔

حسن آرا: بہن اللہ جانتا ہے تم کو آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں۔

زینت النسا: ہم بھی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے کہ خدایا آزاد نہیں تو آزاد کے کسی پیارے سے ہی ملتے۔ چچا نے جب ہم سے آپ کا ذکر کیا تو ذری ڈھارس ہوئی کہ اور بھی کوئی ہمارا ساتھی ہے۔ ہم سے آزاد نے کل حال بیان کیا تھا۔ جب ہمارے میاں کی یہاں بدلی ہوئی تو جی خوش ہو گیا۔ اختر النسا، ہماری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ وہ بھی صبح وشام آنے والی ہے۔ ہاں بہن، آزاد کا کیا حال سنا، خوش تو ہیں۔

حسن آرا: ہاں خوش و خرم ہیں، اور ترکوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ خوب خوب لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اللہ ان کو بچائے۔ آمین۔

زینت النسا: آمین آمین۔ ایسا خوش رو جوان آج تک نظر سے نہیں گزرا، کتنے خلیق آدمی ہیں کہ میں کیا کہوں۔

حسن آرا: کوئی اللہ رکھی نامی ہے، وہ کھرا اُلے رہتی ہے۔ سُنا کہ آزاد کے نام پر جوگن ہو گئی، اب بنوں میں رہتی ہے۔

زینت النسا: ہاں بہن ہم نے بھی سُنا ہے۔ وہ آدمی ہی ایسا ہے۔

حسن آرا: تم کس محلے میں رہتی ہو بہن۔ پاس ہے یہاں سے۔

زینت النسا: پیسا دو پیسا ڈولی تو ہے نہیں۔ دو آنے فقط آنے کے دیے ہیں۔ دور ہے مقبول گنج۔

حسن آرا: اے تو فنس کیوں نہ منگوا لی۔ فنس منگوا لی ہوتی۔

زینت النسا: ہم غریب آدمی ہیں۔ فنس کس کے گھر سے لائیں۔

حسن آرا: (مسکرا کر) ہر شے گھر میں موجود ہے۔ وہ اسی لیے ہے کہ کام آئے۔ صورت دیکھنے کے واسطے تو ہے نہیں۔ بگھی منگوا لینا۔

سپہر آرا بیگم سے بھی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے کہا۔ بہن اب تو یہ دعا مانگو کہ آزاد پاشا کسی طرح جلد سرخرو ہو کر واپس آئیں۔ اللہ جانتا ہے جب ان کا حال سوچتی ہوں کہ میدان میں گولیوں کا چھرّا چلتا ہوگا اور وہ اس بوچھار میں لڑ رہے ہوں گے تو کلیجہ لرزنے لگتا ہے۔ مگر حافظ نے تو کئی بار خوشخبری سنائی۔ ایک دفعہ فال دیکھی تو ایسی اچھی غزل نکلی کہ میں کیا عرض کروں جیسے ہی فال کھولی یہ اشعار نکلے۔

شہنشاہ مظفر فر شجاع ملک و دیں منصور — کہ جود بے دریغش خندہ برابر بہاراں زد
ازاں ساعت کہ جام مے بدست او مشرف شد — زمانہ ساغر شادی بہار مے گساراں زد
ز شمشیر سر افشانش ظفر آں روز بدرخشید — کہ چوں خورشید انجم سوز تنہا کہ ہزاراں زد
دوام ملک و عمر او دلخواں از لطف حق حافظ — کہ گردوں سکہ دولت بنام شہسواراں زد

اور اس غزل کا مطلع سب سے بڑھ کر تھا۔

سحر چوں خسرو خاور علم بر کوہساراں زد
بدست مرحمت یارم در امیدواراں زد

زینت النسا: اللہ کرے کہ میدان سے اپنے ملک کو ہنسی خوشی آئیں۔ ہم کو اپنی صورت دکھائیں اور حسن آرا بیگم کو

اپنے عقد نکاح میں لائیں۔ خدا کرے ہماری دعا قبول ہو۔

سپہر آرا: اے بہن کئی اخباروں میں تعریف چھپی ہے سنوگی تو خوش ہو جاؤ گی۔

حضرات ناظرین یہ اس زمانہ کی گفتگو ہے جب مرزا ہمایوں فر بہادر کے نکاح کی رائے اچھی طرح قرار نہیں پائی تھی۔ اور گفتگو طے نہیں ہو چکی تھی۔

الغرض زینت النسا اور حسن آرا اور سپہر آرا میں باہم ملاقات ہوئی، ادھر یہ خوش ہوئیں ادھر وہ کہ آزاد پاشا کی نسبت باتیں کیا کریں گے۔ اس روز زینت النسا رخصت ہوئیں۔ مگر پھر کئی بار آئیں اور آزاد پاشا کے حالات سن کر کمال مسرور ہوئیں۔

مس میڈا: آزاد پاشا کی روانگی کے دوسرے دن، پولینڈ کی شہزادی کے کل عمارات کو سوار ان روس نے گھیر لیا۔ ہر عمارت کے پھاٹک پر پہرا بٹھادیا گیا کہ کوئی اندر سے باہر اور باہر سے اندر نہ آنے پائے۔ شہزادی اور مس کلیرسا اور مس میڈا کی روح لرزتی تھی کہ یا خدا اب کیا کریں۔ سمجھ گئیں کہ راز سربستہ افشا ہو گیا۔

سواروں نے آن کر دریافت کیا کہ مس کلیرسا کہاں ہیں۔ جنرل فوج کا ایک خط ان کے نام ہمارے پاس ہے۔ پہلے رائے قرار پائی کہ صاف انکار کیا جائے۔ کون کلیرسا؟ یہاں تو کوئی کلیرسا نہیں آئیں۔ مگر مس میڈا نے صلاح دی کہ اس انکار سے رہی سہی اور بھی قلعی کھل جائے گی لہٰذا اب مقتضائے مصلحت یہی ہے کہ چاہے جو کچھ ہو، مس کلیرسا فوراً سواروں کے افسروں سے ملیں۔ مس کلیرسا نے بعد غور منظور کر لیا اور اپنی پوشاک جنگی پہن کر باہر آئیں۔ مس میڈا بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سواروں نے ان کو دیکھ کر ٹوپی اتار دی اور ادب کے ساتھ عرض کیا کہ جنرل فوج نے ایک خط خاص آپ کے نام بھیجا ہے اور ہم کو حکم ہے کہ شہزادی کی کل عمارات کو فوراً محصور کر لیں اور پہاڑ پر کسی کو نہ آنے دیں۔ مس کلیرسا کے حواس باختہ تھے مگر خط لیا، اور پڑھا عبارت ذیل درج تھی۔

مس کلیرسا! ہم نے معتبر آدمیوں کی زبانی یہ خبر پائی ہے کہ آپ نے بمقتضائے حمیت کہسار میں آزاد پاشا مفرور کی تلاش میں بہت بڑی کوشش کی ہے۔ اکثر معتبر آدمیوں نے یہ بھی مشورہ کیا ہے کہ آپ نے آزاد کے ڈھونڈ نکالنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ آفریں! مگر اب ہم جانتے ہیں کہ آزاد پاشا کو پولینڈ کی شہزادی نے اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ لہٰذا آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کامل تحقیقات کیجیے، اگر وہاں آزاد پاشا نہ بھی ہوں تاہم شہزادی قید سے رہا نہ کی جائے۔ اس تحریر کے پہنچتے ہی ان کو قید کر لیجیے۔

یہ خط پڑھ کر مس کلیرسا اور سواروں سے یوں گفتگو ہوئی۔

مس کلیرسا: آزاد پاشا اس کوہسار میں ہیں؟ تعجب کی بات ہے۔

سوار : حضور مشہور تو ایسا ہی ہوا ہے۔ خدا جانے ہیں یا نہیں۔

مس کلیرسا : اچھا ہم اسی دم سے تحقیقات شروع کر دیں گے۔ پولینڈ کی شہزادی کو اطلاع دی جائے کہ گو اب تک میں ان کی مہمان تھی۔ تاہم اب ان کو سمجھنا چاہیے کہ وہ قیدی ہیں، دل میں تو سوچی تھیں کہ کسی تدبیر سے خود بھی بھاگ جائیں، اور مس میڈا اور شہزادی کو بھی بھگا لے جائیں۔ مگر ظاہر میں سواروں کا جنبہ کیا شہزادی کو خبر ہوئی تو انھوں نے کہا۔ میں حاضر ہوں آپ تحقیقات کیجیے۔ لیکن خوب یاد رکھیے کہ یہ خبر محض بالکل جھوٹ اور بہتان ہے۔ کسی دشمن نے تہمت تراشی ہے۔ مس کلیرسا نے دو روز تک کامل تحقیقات کی۔ ایک ایک خادمہ کے اظہارات لیے۔ یہ سب گھٹی ہوئی تھیں۔ شہزادی کی مفید مطلب گواہی دی۔ تیسرے روز مس کلیرسا بعد تحقیقات وہاں سے روانہ ہوئیں، اور مس میڈا کو بھی ساتھ لیا۔ پولینڈ کی شہزادی سے وقت رخصت کہہ گئیں کہ تم گھبرانا نہیں میں تمھاری بڑی سفارش کروں گی۔

وہاں سے رخصت ہو کر مس کلیرسا اور مس میڈا کئی روز کی مسافت اور مشقت کے بعد داخل قسطنطنیہ ہوئیں۔ مس میڈا ہرمزجی بھائی کی کوٹھی میں گئیں تو سب سے پہلے خوجی کو دیکھا۔ خواجہ صاحب دوڑ پڑے اور ہنستے ہوئے مس میڈا کے قدم لے کر کہا آزاد پاشا کا حال کہو۔

مس میڈا : آزاد کا حال ہم کو راستے میں معلوم ہوا تھا۔ پلونا کے قریب ایک مقام پر جنگ ہو رہی تھی۔ اب تک تو آزاد پاشا نیک نام رہے ہیں، آئندہ خدا حافظ ہے۔ ہم دونوں بڑی مصیبت میں پڑ گئے تھے۔ مخبروں نے پتے پتے کی خبر پہنچائی، مگر خدا نے بچا لیا :

ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

شکر ہے۔ مگر شہزادی بُری پھنسی ہے۔

خوجی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دوبار آزاد کا نام لیا اور مُنہ ڈھانپ کر خوب روئے۔ مس کلیرسا اور مس میڈا نے سمجھایا۔ ہرمزجی بھائی نے دلاسا دیا۔ مس کلیرسا نے تشفّی دی۔ خواجہ صاحب کو آزاد سے دلی محبّت تھی۔ مصائب سفر اور حالات جنگ سے اُن کو آزاد کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی۔ ہرمزجی بھائی نے ان کی مہمانداری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اور خوجی اس امید پر ان کے ہاں رہے کہ شاید خدا وہ دن بھی دکھائے کہ آزاد پاشا کی زیارت نصیب ہو، اور اُن کے ساتھ مع الخیر ہندوستان جائیں۔

پولینڈ کی شہزادی : پولینڈ کی خوبرو شہزادی سخت مصیبت میں گرفتار ہوئی۔ جس روسی لیڈی نے پیغامبر بن کر آزاد کو دھوکا دیا تھا اور کچا چٹھا دریافت کر لیا تھا اس نے گورنمنٹ کو کل امور کی اطلاع دی، اور اسی پر تحقیقات کا حکم ہوا، پہلے بھی ایک مخبر نے مخبری کی تھی مگر اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ مس کلیرسا بھی

شریک ہیں۔ اب جو یہ خبر معتبر دریافت ہوئی تو دو کرنل اور کئی اور افسر اور فوج بھیجی گئی۔ یہاں سُنا کہ مس کلیریسا اور مس میکنیڈ، چلدیں، صرف شہزادی ہی باقی رہ گئی۔ شہزادی ایک خیمہ میں قید کی گئیں اور ہر وقت پچاس آدمیوں کا پہرا خیمے کے اردگرد مقرر رہا۔ یہ لوگ ننگی تلواریں لیے ہوئے تین تین گھنٹے تک پہرا دیتے تھے اور کہسار میں دس بارہ کوس تک آزاد کی تلاش کے لیے لوگ روانہ کیے گئے۔ وہاں سے مختلف خبریں آئیں۔ جتنی زبانیں اتنی ہی روایتیں۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ صحیح صحیح حالات نہ معلوم ہوئے۔ صحت کے ساتھ کوئی خبر نہ ملی۔

آزاد کی شمشیر جاں گزا کی چمک

ز آسمان و زمیں مژدہ ناگہاں آمد	کہ آفتاب زمیں تاج آسماں آمد
لوائے فوج حکومت بہ قلب گاہ رسید	ہمائے اوج سعادت بآشیاں آمد
سپہر گفت بہل مدح روزگار بگوی	کہ آفتاب سوئے ناف آسماں آمد
جہاں بکفت کہ نی نی بگو کہ جانِ جہاں	بلب رسیدہ دگر در پس جہاں آمد
بیا بیا کہ ز اقبالت اے بہشت ہنم	زمانہ برتر از امید کامراں آمد

فلک عناں تو بوسید وشش جہت راگفت
خوشا ہلال کہ ہمشکل ایں بتاں آمد

بسالت کے نہنگ، بحر آسام، ہر دلعزیز و نیک نام جوان رعنا، ومہ لقائے محمد آزاد پاشا شنبے کے روز جہاں افروز و سعید بہتر کو بارک اللہ لبہ وجمیعہ فوج نصرت موج لے کر اہل پلونا کی اعانت کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ معشوقہ گل رخسار سر قافلہ خوباں فرخار پر جھم حسن آرا بیگم ایک ایک قدم پر یاد آتی تھیں۔ ناظورہ شوخ چشم ناوک نگاہ، رشک مہر، غیرت ماہ، خاتون رنگیں اور مس سیڈا کی دل ربائی اور معشوق پن کی باتیں خوں رلاتی تھیں۔ اللہ رکھی کے رخسار بہار آفریں، صباحت قریں کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچی تھی۔ زینت النسا کی زلفِ مشکِ زیرہ و عنبر بیز کے خیال نے دماغ کو طبلۂ عطار بنا دیا تھا۔

دل میں خیال روئے حسیناں ہے اِن دنوں
پریاں ہیں جمع گرد سلیماں عجب عجب

آزاد پاشا گلگوں آہو شکار، پر یشاں بر نائی سے سوار تھے۔ گھوڑا قدم قدم پر اٹھکھیلیاں کرتا تھا۔ شیر گردوں کو ٹاپیں مارنے کا دم بھرتا تھا۔ سواران آزمودہ کار کے راہوارانِ برق رفتار کی ٹاپوں سے میدان کارزار گونجتا

تھا۔ کبھی دوڑتے تھے، کبھی جمتے تھے۔ کبھی بڑھتے تھے کبھی تھمتے تھے۔ ہرن کی چھل بل، طاؤس کی چال وخرام ناز سے دلِ کبک دری پائمال:

دیکھی نہیں کسی نے یہ نرمی عقاب میں ۔۔۔ ہے جس کے زین صاف پہ مخمل بھی خواب میں
سرعت کا ان کی وصف لکھیں گر کتاب میں ۔۔۔ سطریں رہیں بصورتِ موج اضطراب میں

ان کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر

دونوں لشکر پرے جمائے کھڑے تھے۔ ادھر ترکوں کی توپیں برق بار، ادھر روسیوں کی بندوقیں دوزخ شرار۔ ادھر توپخانۂ سلطانی سے صدائے کوس بلند ہوئی، ادھر روسیوں کی روانی بحر خروش سہ چند ہوئی۔ ادھر ترکوں نے اتواپ رعد آہنگ کے گولے اتارے، اور پھر روسیوں نے تاک تاک کر جگر دوز نشانے مارے۔ وادی نبرد میں آزاد کا سمند دغا بسند آہو کی طرح جست کرتا تھا، اور طرارے بھرتا تھا۔

زیبا ہے گر کہیں فرس بادپا اُسے ۔۔۔ آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اُسے
طائر جہاں کے جانتے ہیں سب ہما اُسے ۔۔۔ مہمیز و تازیانہ کی حاجت ہے کیا اُسے

فتراک گر ہوا سے کبھی اک ذری اڑی
یوں اڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پری اڑی

میدان رزم میں میاں آزاد اس طرح اٹھکھیلیاں کرتے تھے جیسے شیر کچھار میں، آہو مرغزار میں، مور ریلے چمن میں، یا مرغانِ خوش الحان نشیمن میں، عنادل ہجوم گل میں، یا مغبچے سرور مل میں، برق چشمک زن ابر نیساں میں، یا جام بادہ ارغوانی محفل رنداں میں۔ گو آزاد پاشا نے انواع واقسام کی سختیاں سہی تھیں۔ مگر یہ ارمان دل سے مطلق نہیں گیا تھا کہ حسن آرا کے رخسار تاباں اور چہرۂ منور سے آنکھیں سینکیں۔ ہائے عشق بھی کیا بلا ہے۔

ہر چند جسم زار ہوا خاک کوئے دوست
باقی ابھی ہے دل میں مرے آرزوئے دوست

آزاد: یہ فوج روسیہ جو سامنے صف بندی کر کے برسرِ پیکار ہے تو سہی کہ اس کے ایک ایک سپاہی اور سوار کی لاش کو اسی کمیت صرصر تگ کی ٹاپوں سے نہ روندا ہو۔ یا خدا مدد دے! انشاء اللہ (گھوڑے کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں غازی مرد۔

راوی: گھوڑے نے اتفاق سے ہنہنانا شروع کیا۔

آزاد: شاباش ہے شاباش کیوں نہ ہو غازی مرد۔

اب سنیے کہ پلونا اس قدر محکم اور مضبوط حصار ہو گیا کہ ایک سوئی کے برابر بھی دیواروں میں سوراخ نہ تھا۔ پہلے تو یہ قلعہ مشہور تھا، مگر سپہ سالار افواج ترک نے اپنی لیاقت فن انجنیری سے اس کو غیرت روئیں وتر بنا دیا تھا۔ جھلکیوں میں چھوٹے چھوٹے گردے چڑھے تھے اور اتواپ اژدر مہابت جو ارد گرد تھیں ان سے اس قلعہ معلی کی شان اور بھی بڑھ گئی تھی۔ روس کی فوج پلونا اور سپاہ آزاد پاشا کے درمیان میں مُور و ملخ سے بھی زیادہ تھی۔ شب کا وقت زن مہتابیں روشن۔ گولوں کی آواز و ناون۔ ایک سمت ترکوں کی توپیں اژدرہائے دہاں کو مات کرتی تھیں، دوسری جانب روسیوں کا توپخانہ آتش فشاں تھا۔ آزاد پاشا اشہب ختلی خرام و تیز گام پر سوار ہو کر فوج کے ارد گرد دورہ کرتے اور مردان کاری کو ترغیب و تشویق دیتے تھے۔ ہاں بھائیو بڑھے ہوئے۔ ہاں غازیان دین بچے ہوئے۔ غنیم روسیہ سے دب نہ جانا۔ بڑھ بڑھ کر شمشیر شجاعت کے جوہر دکھانا، مجاہدین کو قاعدین پر ہر آئینہ فوق ہے۔ ہاں سوارانِ صف شکن روئیں تن گھوڑوں کی باگیں لیے ہوئے تھم تھم کے اور جم جم کے گولہ اندازوں نے اپنے اپنے ہنر دکھائے۔ کمال کیا۔ تاک تاک کے گولے اتارے، گولہ گرا پھٹا اور بچاسوں کو لے ڈالا۔ کسی ٹکڑے نے دو کو لیا، اور کسی نے دس کی جان کی۔

اس معرکہ دار و گیر میں اپلیٹن پاشا زخمی ہوئے ان کا ویلا گھوڑا آزاد پاشا کے قریب تھا کہ ایک گولی دونوں گھوڑوں کے بیچ سے سن سے نکل گئی۔ پھر دو گولیاں پیاپے آئیں جن میں سے ایک گولی اپلیٹن پاشا کے بازو کی ہڈی توڑ کر سر د ہو گئی۔ ایک افسر اعلیٰ جو فنونِ جنگ کے علاوہ فن انجنیری میں بھی طاق تھا، اس جنگ میں کام آیا۔ اس کی وفات کا آزاد کو سخت رنج ہوا۔ کیونکہ آزاد پاشا فن انجنیری سے بالکل ناواقف تھے، اور اس انجنیر کی مدد کو بہت قیمتی سمجھتے تھے۔ روسیوں کی طرف بھی یہی حال تھا۔

اہل پلونا کی یہ خواہش تھی کہ یہ جنگ حصار فلک نشاں سے اس قدر فاصلے پر ہوتی جہاں آرم اسٹرانگ کی برق آہنگ توپیں اور ہنری مارٹینی رفل کام آتے۔ تو روسی بھاگتے راہ نہ پاتے۔ اپنے کشتوں اور مجروحوں کو آپ روندتے جاتے۔ ادھر آزاد کا لشکر فیروزی اثر یورش کرتا۔ ادھر اہل پلونا گولوں کا مینھ برساتے۔ گو سپہ سالار عساکر روم نے کوشش بلیغ کی کہ ایک کالم کو قلعے سے باہر بھیجے تاکہ روسی فوج دو طرف سے گھر جائے ۔ مگر سعی مشکور نہ ہوئی۔ غنیم نے کہسار کے ہر مقام پر راستے بند کر دیے تھے۔ جب ترکوں نے دیکھا کہ فوج عدو بھی بے شمار ہے۔ اور مستعدی سے اور بسالت کے ساتھ برسر پیکار ہے۔ تو ٹھان لی کہ فوراً حملہ آور ہوں اور شمشیر سے دست بدست لڑیں۔

حکم ہوا کہ کوہی توپیں آگے بڑھیں، اور بڑی سرگرمی سے گولے چلائے جائیں۔ اس وقت میدانِ رستخیز اور معرکہ ستیز کی کیفیت قابل دید تھی۔ طرفین کی سپاہ کے نزدیک جنگ نہ تھی عید تھی۔ دونوں کے حوصلے

بڑھے ہوئے۔ ولولہ و جوش و خروش کی انتہا ہی نہ تھی۔

دو لشکر نہ گویم دو دریائے خوں | بہ بسیاری از آب دریا فزوں
بعرض دو میداں دراں تنگ جائے | فشردند چوں کوہ پولاد پائے
سپہ از دو جانب صف آراستہ | زمین آسماں دار بر خواستہ

نہ پوئندہ را بر زمیں پائے بود
نہ پرندہ را بر ہوا جائے بود

گلولہ ہائے جگر دوز سے میدان کارزار گونج رہا تھا۔ پیادوں سے لے کر افسروں تک سب کو یہی حوصلہ تھا پا ہے جان جائے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ دونوں لشکر خوب لڑے۔

آزاد: (افسروں سے) اب شمشیر زنی کا وقت آن پہنچا۔

افسر: اک ذرا اور تامل کیجیے، انشاء اللہ میدان مار لیا ہے۔

دوسرا: میدان ہمارے ہاتھ ہے۔ لوائے سلطانی کے پھریرے اڑ رہے ہیں۔

تیسرا: اب تلواریں سونت کے بڑھنا چاہیے۔ ہاں غازیانِ دین یہی وقت ہے۔ سنبھلے ہوئے۔ غنیم کے چھکے چھوٹ گئے ہیں۔

چوتھا: اب زیادہ تابِ مقاومت نہیں ہو سکتی۔ فوجِ عدو میں ہل چل مچ گئی۔

آزاد: بسم اللہ۔ الا اللہ۔

یہ کہہ کر آزاد پاشا نے شمشیرِ لنگر دار و خارا شگاف میان سے نکالی:

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں | شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظ جہاں | وحشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں

ثابت ہوا کہ چہرۂ مہتاب کٹ گیا
غل تھا کہ فوجِ روس کا دفتر الٹ گیا

آزاد کی تلوار کے چمکتے ہی ہزاروں تلواریں نیام سے نکل پڑیں۔ آزاد پاشا نے کہا۔ بسم اللہ حملہ آور ہو۔ سپاہیوں اور لشکریوں نے نعرہ بلند کیا اور کہا بسم اللہ ہم بھی جاں بکف حاضر ہیں۔

اگلی کے تیغ کہا روسیوں نے بسم اللہ
بڑھیں حضور بڑھیں خوش غلاف ہم بھی ہیں

ترکوں کے جوانان جرار اور رؤسائے تناور گرانے داڑھیاں منھ میں دبائیں اور اللہ اکبر کہہ کے تیغ محرابی د

براں عدوے جانِ دشمناں لے کر بڑھے ادھر روسی بصد خروش شمشیر برہنہ لیے ہوئے مقابلے کے لیے آئے۔

دلیرانِ شمشیر زن بے شمار   بمردم گزائی چو پیچیدہ مار

نہنگانِ شمشیر جوشش گداز   بہ گردن کشی کرد گردن دراز

اہالیانِ روم کی سیف سر افگن سے فَاقْتُلُوْا فَاقْتُلُوْا کی صدا بلند تھی۔ تو روسیوں کی حسامِ جوہر دار سے بزن بزن کی آواز آتی تھی۔ اور چمک دمک کے مقابل میں چاندنی شرماتی تھی۔ ادھر اس نے جھلکی دکھائی اور عدو کی گردن زمیں پر نظر آئی ادھر وہ چمکی تو سر سے تا بہ کمر آئی، ان کی تلواریں مغفر شگاف، الماس بار، ان کی سرو ہیانِ گلو نواز، جگر دوز۔ یہ زبان آور۔ وہ برق پیکر۔ یہ ہلال سپہرِ فتح و ظفر، وہ برق خرمن سر و مغفر۔

چوں وہم از ہمہ سوئے علوی خرام

چو اندیشہ در تیز رفتن تمام

آزاد پاشا اس ڈانٹ ڈپٹ سے پینترے بدل بدل کر اور ہاتھ تول تول کے ضرب لگاتے تھے کہ فوجِ عدو کے تن سے سروں کی جھڑی لگاتے تھے، ادھر روس کے مردان رزم زن۔ ادھر روم کے دلیران سر افگن۔ یہ دغاجو وہ تند خو۔ یہ ضرغام بیشہ مصاف و کشور کشا، جگر شگاف۔ یہ نہنگ بحرِ بسالت و ہزبر میدانِ شجاعت:

بفر دلیراں بر آمد بہ اوج

ز ہر گوشہ میرفت خوں موج موج

ترکوں کا بحر جوشِ اب اور بھی زیادہ طغیانی پر تھا۔ اور فوج نے اس قطع سے حملہ کیا تھا۔ پہلے دو کمپنیاں بڑھیں۔ پھر کچھ فاصلے پر چھ کمپنیاں اور تھیں۔ ان کے بعد خاص فوج کی چودہ کمپنیاں۔ جو کالم سب سے آگے بڑھے ہوئے تھے وہ خاص فوج سے ڈھائی ہزار کے گز کے فاصلے پر تھے۔ ترکوں نے بڑی دانائی کی تھی کہ صرف ایک حصہ فوج کو بڑھا دیا تھا باقی کالموں کو اس طور پر آڑ میں آراستہ کیا کہ روسیوں کو کل حصہ لشکر نظر نہ آیا یہی مغالطہ کھایا۔ اب نوبت بایں جا رسید کہ کالموں کی قطع اور مقام اور فاصلہ بدل گیا۔ تلوار سے دست بدست جنگ ہونے لگی تو روسیوں نے اپنی غلطی پر افسوس کیا۔ مگر مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد۔ کا نقشہ تھا۔ ہر کالم کے ساتھ انجنیر تھے۔ راہ میں بعض مقامات ایسے بھی ملے جہاں بغیر انجنیروں کی مدد کے کارروائی نہ ہو سکتی۔ انجنیروں کی اعانت کے لیے پیادے ان کے ہمراہ تھے اور ان کو حسب قواعد جرمنی۔ یہ حکم تھا کہ فوج کے آگے مثل ہراول کے چلیں۔ سپاہیوں کو ایک گھنٹے میں ڈھائی میل زمین جانے کا حکم تھا۔ مگر فرطِ جوش سے انھوں نے چار میل فی گھنٹہ کے حساب سے کوچ کیا۔ بڑی خرابی یہ تھی کہ سڑکیں دشوار گزار تھیں۔

خیر یہ سب مصیبتیں جھیل کر تلوار کی لڑائی ہونے لگی جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ خون کے سمندر بہہ رہے تھے۔

تلواروں کی چکا چک سے میدانِ نبرو کا عجب حال تھا۔ شپاشپ کی آواز آتی تھی۔ روسی اب بھاگنے ہی کو تھے، مگر جس طرح چراغ سحری گل ہونے کے قبل بھڑک کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے اسی طرح اس فوج کی بھی کیفیت تھی۔

جب روسیوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے جاتا ہے تو جان پر کھیل گئے۔

ایک نامہ نگار جو دور سے یہ ساری کیفیت دیکھ رہا تھا۔ یوں لکھتا ہے:

"میں قلعۂ فلک شکوہ سے جنگ کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ الامان الامان۔ میں ایک معمّر آدمی ہوں اور پنشن یافتہ تو جو نتیس برس تک فوجی افسر رہا تھا۔ پھر دس برس تک فوج میں کام کیا۔ واٹرلو کی لڑائی اور فرسیہ کی جنگ اور محاربہ پروشیا و فرانس میں شریک تھا۔ جرمنی، روس، فرانس، انگلستان، امریکا، روم کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کے قواعد جنگ سے ہم واقف نہ ہو۔ تلوار کی لڑائیاں صدہا بار دیکھیں، اور ہزارہا مرتبہ اس قسم کی جنگ میں خود بھی شریک ہوا تھا۔ مگر میں نے آج تک ایسی گھمسان لڑائی کبھی نہیں دیکھی تھی، گو شب کا وقت تھا مگر چاندنی بہت صاف چھٹکی تھی، اور میں دوربین سے کل حالات دیکھ رہا تھا۔ آزاد نامی ایک سپہ سالار روم نے جس کا نام مجھے پیچھے معلوم ہوا، وہ کار نمایاں کیا کہ باید و شاید۔ یہ جنرل اپنے وقت کا اسکندر اعظم۔ جولیس سیزر و نہ اور نپولین ہے۔ اس مسلمان کی شجاعت کی تو کیفیت میں زبان ناطقہ لال ہے۔ جس قدر تعریف کیجیے کم ہے۔

ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

بلبل سے کبھی وصف گل تر نہیں ممکن	آئینہ سے اوصاف سکندر نہیں ممکن
ذرّے سے ثنائے شہ خاور نہیں ممکن	جبریلؑ سے تعریف پیمبر نہیں ممکن

روسیوں اور ترکوں میں اس قدر فرق تھا کہ ترک تھک گئے تھے۔ بالکل شل۔ مگر بایں ہمہ ان کا ہاتھ نہیں رکتا تھا۔ اور روسی بھی جاں بکف لڑتے تھے۔ لیکن شل نہ تھے۔ ترک چاہتے تھے کہ روسیوں کو اس مقام سے ہٹا دیں۔ اور روسی صرف اپنے کو بچاتے تھے۔ بس یہی فرق تھا۔ اور ایک نئی بات اس مصاف میں ہم نے یہ دیکھی کہ جو تلوار تھی تیر شکر زخمہ کی طرح کبھی خطا نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک وار میں دو دو کاٹتی تھی

خالی نہ کوئی وار گیا تیغ دو سر کا	ہاتھ اڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سر کا
سینہ جو بچا اس کے کسی بانیِ شر کا	تھی عقدہ کشا کھول دیا بند کمر کا
تیغ اس نے سپر اس نے زرہ اس نے نہ چھوڑی	دس انگلیوں میں ایک گرہ اس نے نہ چھوڑی

روسیوں کا سپہ سالار اعلیٰ پہلے ہی کام آ گیا تھا۔ ایک گولے کے ٹکڑے نے ان کے گھوڑے کو زخمی کر دیا تو گھوڑا بے کسی کے ساتھ گھٹنوں کو ٹیک کر بیٹھ گیا۔ یہ ہنوز سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور گولہ پھٹا۔ جس کے ایک ٹکڑے نے انکے سر کو نشانہ بنایا اور استخوان توڑ کر باہر نکل گیا۔ جنرل کے گرتے ہی فوج ترک میں نعرۂ خوشی بلند ہوا۔ اور روسیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اب دست بدست لڑائی میں اور بہت سے افسر مقتول ہوئے۔

آخر کار روسیوں کو بھاگنے کے سوا کچھ نہ بن پڑی۔ ادھر ترکوں نے تلواروں کو میان میں رکھا اور پشت توسن پر سوار ہو کر تعاقب کیا تو چھ ہزار کئی سو روسی گرفتار کر لیے۔ فوج میں نعرۂ خوشی برابر مارا جاتا تھا۔ آزاد پاشا کی مسرت دلی کا حال ناگفتہ بہ، باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ حسن آرا یاد آتی تھیں۔ فرط نشاط سے سینہ باغ باغ تھا۔ عرش بریں پر دماغ تھا۔ اب ان کو یقین کامل ہو گیا کہ فائز بمرام ہوں گے اور اقصائے روم سے تا ہندوستان نیک نام ہوں گے۔

اہل پلونا کو خبر ہوئی تو کوس فتح بجنے لگا۔

نسیم صبح مشک افشاں زگرد راہ می آید	مگر از مرکب اقبال شاہنشاہ می آید
شبستان سعادت را بہ نقل وی لبالب کن	کہ گل در بوستان وشمع در خرگاہ می آید
مغنی مجرہای ارغواں را قفل بردر نہ	کہ در گوشم صدای کوس شاہنشاہ می آید
بنجم برسعادت ہائے روز افزوں کواکب را	بشارت دہ کہ براوج ثریا ماہ می آید

بعہد سایۂ دولت جہاں کو بادشاہی کن
کہ بال افشاں ہمائے چتر ظل اللہ می آید

جس وقت پلونا میں فوج داخل ہوئی اس وقت کی مسرت شادمانی ناگفتہ بہ۔ بوڑھے اور نوجوان سب کی یہ کیفیت تھی کہ جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ غنچۂ دل کھلا جاتا تھا۔ کس و ناکس سب قہقہے اڑاتے تھے۔ سپہ سالار نے آزاد کو گود میں اٹھا لیا۔

آزاد: اب یہاں تک تو آگئے، آیندہ فہمیدہ خواہد شد۔

جنرل: (بغلگیر ہو کر) شاباش آزاد پاشا شاباش۔

ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

آزاد: ابیلیٹ پاشا زخمی ہو گئے ہیں۔ ان کے اور کل زخمیوں کے لیے کچھ بندوبست فرمائیے۔

جنرل: فوراً یہ قلعہ عجب قلعہ ہے۔ ہر شے یہاں موجود ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ آپ لوگ آج تو آرام

کریں۔ کل جنگ ہو گی۔

آزاد: ضرور بالضرور انشاء اللہ۔

الغرض آزاد پاشا کے سب مدّاح تھے۔ اس روز جنگ کی نسبت تذکرہ رہا۔ آزاد پاشا اور ان کے ساتھیوں کو جو معلوم تھا وہ انھوں نے بیان کیا۔ نئی فوج کے آدمیوں نے اپنی سنی سنائی خبر کہی۔ اہل بلونا نے اپنا کچا چھٹا کہہ سنایا۔ آزاد نے افسروں سے دریافت کیا کہ تم نے ہماری نسبت کیا سُنا تھا۔ انھوں نے کہا ہم کو کل حالات رفتہ رفتہ معلوم ہوتے گئے تھے۔ پہلے ہم نے سُنا کہ ایک مس ان کو بھگالے گئی۔ اس کے حسنِ گلو سوز اور صورتِ زیبا پر حضرت پھسل گئے۔ پھر خبر پائی کہ روس کے کسی سرد مقام پر قید کر دیے گئے۔ پھر سنا کہ کسی شہزادی نے ان کو رہائی دلوائی۔ ان پر ریجھ گئی اور اپنے ملک میں لے جا کر ان کے ساتھ شادی کر لی۔ مگر سُنا تھا کہ کئی مہینے تک قید رہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

آزاد نے کہا سب باتیں پتے کی کہیں۔ بیشک ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک مہوش کا ہم پر دل آیا۔ ایسی خوبصورت عورت کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ بچہ حور۔ اس شکل اور صورت کی نازنیں آج تک ہماری نظروں سے نہیں گزری، اور سچ کہوں میں بھی اس پری کی صورت زیبا پر شیدا ہو گیا۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

افسر: مطلب برآری بھی ہوئی یا نہیں۔ یا خالی خولی ہی چلے آئے۔

آزاد: واہ۔ نوجوان کہیں یوں خالی خولی چلے آتے ہیں۔

کرنل: شادی ہوئی یا نہیں ہوئی۔ ہو قسمت کے دھنی۔

آزاد: مگر بقول شخصے ع "آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ صیاد آیا" کا نقشہ ہوا۔ پہلی ہی شب کو روسیوں نے صورتِ منحوس دکھائی اور سارا لطف کرکرا ہو گیا۔ بھاگتے ہی بن پڑی۔

کرنل: خیر یہ تو کہنے کو ہو گا کہ ترکی افسروں نے روس کی لیڈیوں کو لبھا لیا۔ یہ کیا کم ہے۔ ساتھ نہ لیتے آئے۔

آزاد: ساتھ کا موقع نہ تھا۔ ہم اور وہ دونوں صید مصائب ہوئے۔

کرنل: ایک جنگ ایشیا میں ہوئی تھی جس کا حال سننے کے قابل ہے۔ ایک گھاٹی بہت خوفناک اور قلب مقام۔ کیفیت اس کی یہ ہے۔ اتفاقاً متفرق مقامات و مختلف پہاڑیوں سے جہاں بجز سطح زمین و نقشۂ ارض کے کوئی مکین۔ آدم زاد کی بو تک نہیں پائی جاتی تھی۔ ایک جماعت کثیر و جم غفیر فوج روسیہ کی بڑی شجاعت اور

بہادری سے مسلح اور چست وچالاک، نہایت رعب اور شوکت سے نمودار ہوئی تھی، مگر مقامات اور تمام پہاڑیوں پر فوج مثل سیل امنڈ آئی اور ان کی صدائے بلند وصورت قہر انگیز، ندائے رستخیز سے پہاڑیوں پر قیامت کا نقشہ ظاہر ہوا۔ بعینہٖ حشر کا سامان پیدا ہوگیا۔ تمام پہاڑی تہ و بالا ہوگئی۔ ہر چرند پرند انسان اور درند عزلت نشین خمول ہوا۔ تھوڑے عرصہ میں عساکر سبحیح نے فوج ترک کا جو ابھی تک بااطمینان تمام، بلا دہشت غنیم سے خواب استراحت میں غیر مسلح اور سبکدوش تھی۔ محاصرہ کرلیا۔ مگر حالت روی اور کیفیت نزع اور جان کندنی میں ترکی فوج نہایت مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں اپنی جان کی حفاظت کے واسطے اس مقام سے فرّو ہوگئی حتیٰ کہ کسی کو اس حالت خوف وخطر میں اپنے اسلحہ زرہ بکتر اسباب جنگی کا بھی ہوش نہ رہا۔ فوراً سب کو چھوڑ کر اپنی جان سلامت لے کر بھاگ گئے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ترکوں کے دلوں پر یہ بات بالیقین نقش کالحجر ہوگئی تھی کہ روسی فوج کے لاتعداد وغیر محدود سپاہی حملہ آور ہوئے۔ حالانکہ یہ امر صحیح نہ تھا۔ کیونکہ ترکوں کو سب سراغ اور نشان سے جب یہ معلوم ہوا کہ روسی فوج اس کثرت سے نہیں ہے جیسا کہ ان کا گمان تھا۔ تب فوراً انھوں نے اپنے مقام کی حفاظت اور محاصرہ کی کوشش شروع کی اور نہایت دلیری اور شجاعت سے روسیوں کو روکنے لگے تاکہ وہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ الغرض جس وقت ترکوں نے روسیوں کا تعاقب کیا اس وقت مسلح پیادے جو کہ کمین گاہ میں موقع اور وقت کے منتظر تھے فوراً نکل کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ادھر توپخانہ فوج غنیم کے واسطے نہایت عمدہ موقع سے قائم کیا گیا تھا وہ اسی کمین گاہ میں رہ گیا۔ ترکی فوج نہایت بہادری اور شجاعت سے تھوڑے عرصے تک میدان جدال وقتال میں بڑی سرگرمی اور ثابت قدمی سے قائم رہی۔ اور بڑے جوش وخروش سے دادِ بہادری دی۔ بعدہٗ جو دستہ فوج بروقت تعاقب فوج روسیہ بھاگ گیا تھا وہ بھی جمع ہوگیا۔ اور ترکوں نے نعرہ اللہ اکبر بلند کیا اور باآواز بلند پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ بہ امداد ونصرت غیبی فوج غنیم کو شکست ہوئی۔

ایک بوڑھے سوار نے کہا روس کا غالب آنا قانونِ قدرت اور آئین مشیت کے خلاف ہے کیونکہ روم کا اس جنگ میں اصلا تصور نہیں ہے اور روس بے ایمانی کے سبب سے حملہ آور ہوا ہے۔ لہذا خدا بھی بے ایمان کی مدد نہ کرے گا۔ ہم کو ہرگز یقین نہیں ہے، کہ ٹرکی پر روس کا قبضہ ہو۔ سوائے ازیں اول تو روس مفلس قلاش ہے۔ خزانہ کھکھل۔ دوسرے فوج قواعددان نہیں۔ اور فوج کا قواعددان ہونا مقدم ہے۔ ورنہ چاہے جس قدر کثرت سے فوج ہو بیکار ہے۔ پھر آپ سب کو خوب معلوم ہے کہ کوہِ قاف والے روسیوں کے جانی دشمن ہیں۔ اور وقت جنگ ان لوگوں کے حوصلے اور بھی بڑھ جائیں گے دل شیر ہوگا کہ اس مصیبت میں چرکا دینے کا اچھا موقع ہے۔

اب سنیے کہ پولینڈ والے اور بھی زیادہ خلاف ہیں۔ اگر پولینڈ کے انتظام کے لیے جرمنی سے جرمن فوج نہ جاتی تو بلوا ہو جاتا ہے کہ نہیں۔ جب یہ کیفیت ہے تو فتح کی امید کجا۔

آزاد: یہ نہ کہیے حضرت فوج نہایت قواعد داں ہے۔

کرنل: ہاں ہے مگر ترکوں سے زیادہ تو نہیں۔

آزاد: نہ۔ میں تو کئی جنگوں میں ان کی طاقت آزما چکا ہوں۔ مجھ سے کوئی امر مخفی تو ہے نہیں مگر تاہم

ع دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد

نہ گویم ز جنگ بد اندیش ترس	در آوازۂ صلح ازو بیش ترس
بساکس بروز آیت صلح خواند	چو شب شد سپہ بر سر خفتہ راند
زرہ پوش خسپند مرد افگناں	کہ بستر بود خوابگاہِ زناں
بخیمہ درون مرد شمشیر زن	برہنہ نہ خسپد چو در خانہ زن
بباید نہاں جنگ را ساختن	کہ دشمن نہاں آورد تاختن

حذر کار مرداں کار آگہ است

یزک سد روئیں لشکر گہ است

اس گفتار شیخ سعدی سے روسی خوب واقف ہیں۔

کرنل: اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں بلاشک۔

بوڑھا: خیر۔ پھر اب آپ کی جو رائے ہے صحیح ہے۔

آزاد: یہ سارا فساد جنرل ایلوبوف کا ہے۔

کرنل: ہاں کانٹے تو اسی کے بوئے ہوئے ہیں۔ مگر ٹرکی اخبار الجوائب نے جو نقل لکھی ہے وہ روس کے حسب حال ہے۔ وَھُوَ ھٰذا

آوردہ اند کہ روزی زاہدی در راہ می رفت، داہرمن را تصادف نمودہ پرسید کہ اے نا مہرباں چرا ایں قدر فتنہ و فساد درمیان بنی آدم می اندازی۔ گفت اے مرد دیندار ایں بدیہا را کہ تو می بینی چناں می پنداری کہ از من بر سر می زند نی نی بلکہ ایشاں بعضے خرابی ہا می کنند کہ عقل نیز داں حیران می ماند و اگر باور نداری، بیا تا با یکدگر بجائے نشستہ از احوال ایشاں ترا خبردار سازم، چوں زاہد بدیں رضا داد دیو بد سرشت رفتہ از دکانے دو طرف انگبینے انگشت خود را آلودہ نمودہ۔ بر دیوارے مالیدہ پیش زاہد آمد و گفت اے مرد خدا ترس بطرف ایں دیوار کہ انگشت انگبیں را مالیدہ ام، بدقت نگاہ کن۔ تا چہ چیزہا از بنی آدم بظہور

خواہد پیوست - مشاہدہ خواہی نمود، چونکہ مگسان شہد را دوست دارند پس بدیدن آں شہد ہجوم نمودند دراں اثنا کودکے کہ مگس گیری بر دست داشت از راہ می گزشت۔ مگس گیر مگساں را دیدہ یکبار از دست کودک رہا شدہ بر مگساں افتادہ می گرفت و می خورد و ہم دراں اثنا بزرگ زادہ نیز ازاں رہ می گزشت، و بر دست بازے تیز پرواز داشت چوں نگاہ باز بر مگس گیر افتاد۔ پریدہ مگس گیر را بناخن خونریز از ہم دریدہ منقار را بخون بیچارہ مگس گیر لعل گوں نمود و کودک از شفقتے کہ با مگس گیر داشت۔ سر باز زدہ بر زمین انداخت بزرگ زادہ بمشاہدہ ایں حال خنجر خونریز را از میان کشیدہ بر سینہ کودک زدہ بکشت۔ پدر کودک ایں خبر را شنیدہ زود بشتاب و شمشیرِ خونخوار چناں بر گردن بزرگ زادہ حوالہ نمود کہ در ہماں ساعت جاں بحق تسلیم کرد و پدرش ہم از استماع چنیں خبر در غضب آمدہ، پدر کودک را بہ قتل رسانید۔ پس شیطان رو بسوئے خدا پرست نمودہ گفت کہ اے زاہد۔ ایں بد بیہارا کہ تو مشاہدہ می کنی، آیا از من بوجود می آیند؟ زاہد گفت، اے مکار، حیلہ ساز، ایں قدر بد بیہا تنہا۔ از ما لیدن انگشت انگبیں۔ آلودہ تو بظہور آمد و اگر خود ہم دراں مداخلہ چناں می پندار کہ دنیا را بیکبار برباد می دادی۔

اتنے میں آزاد پاشا اپنے دوست اپلیٹن پاشا کے پاس گئے۔ یہ بیچارے کرب کے سبب سے سخت بے چین تھے۔

آزاد: اوہ بہت بے چین ہو بھئی۔

اپلیٹن: کچھ نہ پوچھو۔ اور ہم سے حماقت ہوئی کہ گولی کھا کے پھر تلوار کی لڑائی میں بھی شریک ہوئے۔ کئی چرکے لگے۔ بھاگتے بن نہ پڑی۔ اب زخم بہت چرّا رہا ہے۔ مگر ڈاکٹروں نے بیان کیا کہ مقامِ خوف نہیں ہے۔

آزاد: تھوڑی سی برانڈی پی لو اور سو رہو۔

ہزار آفریں بر مے سُرخ فام — کہ از روی ما رنگ زردی ببرد
بنازیم دستی کہ انگور چید
مر بزار پای کہ درہم فشرد

اپلیٹن نے تین پیگ برانڈی کے پیے اور سو رہے۔

آزاد بیڑے میں آئے تو ایک شخص نے یہ روایت بیان کی۔

یورپ میں تو کم مگر ایشیائے کوچک میں بڑی گرما گرمی سے جنگ ہو رہی ہے۔ مختلف حالات جنگ کے وہاں سے آئے ہیں۔ گو غلطی اور صحیح کیفیت دریافت نہیں ہوئی۔ مبالغے سے نہ روسی تار برقیاں خالی ہیں اور

نہ ٹرکی۔ ہر ایک کو یہی خیال رہتا ہے کہ ڈینگ کی لیں، باطوم واقع ایشیائے کوچک میں تو بڑی لڑائیاں ہوئی تھیں روسی چاہتے تھے کہ یہاں کی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا، جو باطوم کے روبرو ہے۔ اور ترکوں کا یہ بیان تھا کہ روسیوں کو زک ملی۔ اور چار ہزار آدمی روسیوں کے کام آئے، روسیوں کو اول تو فتح ہوئی، مگر بعد کو ہٹنا پڑا۔ ٹرکی فوج بلیسیانے روسیوں کو زکیں دیں، کیونکہ بموجب قاعدے کے ٹرکی سپاہی بڑی بہادری سے جنگ کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح بلیسیا کی فوج جنگ کرتی رہی تو روسیوں کی ایشیائے کوچک میں بڑی دقت پڑے گی۔ روسیوں کو ایسی مشکلات روز بروز پڑتی جاتی ہیں۔ جو خبریں اب تک آئی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو روسیوں کو بلاشک مستحکم کارروائی کرنی پڑے گی۔

ایک شخص نے کہا جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ دریائے ڈینیوب کے اس پار روس کے ایک لاکھ آدمی عبور کر کے چلے آئے تو کسی کو یقین نہ آیا اور نہ یہ بات قرین قیاس تھی، مگر جب سب کو یقین واثق ہو گیا کہ واقعی کئی ہزار روسی جو قریب ایک لاکھ کے تھے، ایک ہی شب واحد میں اس پار اتر آئے تو کھل بل مچ گئی۔ گمان یہ تھا کہ جب تک لاکھ دو لاکھ آدمی مجروح و مقتول نہ ہوں گے۔ تب تک روسیوں کا عبور کرنا معلوم۔ شاذ آدمی ایسے تھے جن کو اس خبر کی صحت پر اعتماد ہو۔ ورنہ فیصدی نوے کو یقین نہ تھا۔ بلکہ اس خبر کو غلط سمجھتے تھے۔

سوار: اخبار دارالخلافت میرے پاس موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ کس جوش و خروش سے ترک آمادہ جنگ ہیں۔

چوں عثمانیان کہ عبارت از چہل (ملیوں) یعنی چہار کروڑ نفوس اند۔ برائے محافظت وطن و ننگ و ناموس ملت یا برائے در آمدن بہ میدان شجاعت منتظر بودند۔ پس اکنوں ہر کس حاضر گشتہ، بعذاب مال و جان، عیرت نمایند۔ تا ہمگی ساکنان عالم درجات و شجاعت عثمان را سیر نمایند۔ جناب پروردگار در ہر اوقات ظہیر و معین راست گویان و صادقان است۔

ممکن نہیں کہ بے سمجھے بوجھے یہ بات لکھ دی ہو اس سے ہم کو خوش ہونا چاہیے۔

آزاد: خوش تو اسی دن ہوں جب پلونا میں فتح حاصل ہو، اور غنیم کو قرب و جوار سے بھگا دیں۔ ہماری نصرت و فتح کا ڈنکا بجے۔ تب البتہ خوشی حاصل ہو۔ ورنہ ابھی یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کون فتح یاب ہو گا اور کون ہارے گا۔

کرنل: بیشک جنگ دو سر دارد۔

آزاد: کسی نے خوجی کا ذکر بھی کبھی سنا۔ ہمارے ساتھ ایک شخص ہند سے آیا تھا۔ اس نے ایک مقام پر ایسا کار نمایاں کیا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ دل میں ٹھان لی کہ چاہے جو ہو آج بے فتح پائے نہ

جائیں گے، نہ جائیں گے۔

ع ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

یہ کہہ کر حملہ کر دیا اور واقعی فتح پائی۔

آزاد نے کہا آرمینیا کا حال ہم مفصل سننا چاہتے ہیں۔ ہمیں کل امور معلوم نہیں ہوئے۔ ایک شخص نے جو حالات آرمینیا سے بخوبی واقف تھا، یوں بیان کیا۔

آرمینیا تو ترکوں کے ہاتھ سے جاتا رہا اور اب نہیں ان کے ہاتھ میں آسکتا ہے۔ اگر خیال کیا جائے کہ سلطان مہلت جنگ کے خواہاں ہیں۔ تو اس وقت بوجہ کمزوری یا دغابازی خبروں کے پلونا فتح ہو جائے گا۔ اور جنرل یہ چاہیں گے کہ جنرل پلونا پر خرابی آئے۔ فی الحال تو شہنشاہ روس نہیں خیال کرتے ہیں کہ ترکوں کو کامل زک ہوئی ہے۔ اور ان کو مہلت جنگ ہونا چاہیے۔ روسی تو اسی وقت مہلت دیں گے جبکہ سمجھیں گے کہ شرطیں منظور ہو جائیں گی۔ اور شرائط بھی تجویز ہوں گی یہ بھی دھوکہ ہمیشہ رہے گا کہ کہیں مہلتِ جنگ اس واسطے تو نہیں چاہتے ہیں کہ آیندہ جنگ کریں، اور وعدہ کرا لیا جائے گا۔ روسی خواہاں ہوں گے کہ قلعۂ روجہ ہم کو دیا جائے۔ بس کیا ٹر کی ایک زبردست قلعہ دے دے گی۔ مجھ کو تو اس بات کا بڑا ہی افسوس ہے۔ اگر پلونا فتح ہو گیا اور بلقن سے ادھر روسی اتر گئے، اور اسی جانب سے سرویا کے لوگ بڑھے۔ اور اڈریا نوپل کی جانب پہنچے تو اس وقت شاید یہ ممکن ہے۔

آزاد: اور تو خیر مانٹی نیگرو نے البتہ کارنمایاں کیا۔

کرنل: مانٹی نیگرو کے آدمی بہت جری ہیں۔

آزاد: بہت جری! ہمارے نزدیک دنیا میں کوئی قوم ایسی جری نہ ہوگی بڑے لڑنے والے۔ شیر دل مرد۔ بڑے جرار ہیں۔

کرنل: اس میں کیا فرق ہے۔

آزاد: مگر کل مومنوں اور غازیوں کی فوج نے وہ کام کیا کہ روسی تک تعریف کرتے ہوں گے۔ ہائے میر صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے:

مانند اذاں غلغلے ہیں صلِّ علیٰ کے — کہتے ہیں ملک پیش نگہ سر کو جھکا کے
مردم سمِ توسن کے نشاں راہ میں پا کے — عینک کی طرح رکھتے تھے آنکھوں پر اٹھا کے

چلاتی ہے شوکت کہ دُرُود آن پہ پڑھے جاؤ
فرماتی ہے ہیبت کہ بڑھے جاؤ بڑھے جاؤ

ہائے کیا کلام دلکش ہے" فرماتی ہے ہیبت کہ بڑھے جاؤ۔ بڑھے جاؤ" واہ واہ۔ یہ جنگ اس قابل ہے کہ میر صاحب اس کی شان میں کچھ فرمائیں۔ ایسی جنگ بھی کم ہوئی ہوگی۔

کرنل: کوئی شعر اور سنایئے۔ فارسی الفاظ تو ہم سمجھ لیتے ہیں مگر اردو کے لفظ سمجھ میں نہیں آتے۔

آزاد: ہاں کیونکر سمجھ میں آئیں۔

آراستہ ہے جلوۂ صنعت عرش کردگار
پیراستہ ہے گلشن جنت عروس دار
لالے کے دل میں داغ نہ پہنچ کر گل میں خار
پہنا ہے پیر چرخ نے بھی کہکشاں کا ہار

طلعت جہاں جہاں ہے ضیا فوج فوج ہے
خورشید چرخ چرخ ہلال اوج اوج ہے

کرنل: (ہے کے) کیا معنی (کے) کے کیا معنی (میں) چہ معنی دارد (بھی) کے کیا معنی اتنے لفظ نہیں سمجھ میں آئے۔

آزاد نے ان الفاظ کے معنی سمجھائے تو کرنل اور افسران روم نے بڑی تعریف کی اور میر انیس کے کلام کی داد دی اس کے بعد جنگ کا ذکر پھر ہوا۔ آزاد نے کہا، بہت مشکل یہ آن پڑی ہے کہ کل خیر خواہان ترکی نے سلطنت عثمانیہ کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا ہے۔ برِ اعظم یورپ میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ہمارے ملک کا شریک حال نہ ہوا ہو۔ روس گو بلا مدد لڑ رہا ہے مگر آسٹریا اور جرمنی دو بڑی سلطنتیں جن کی تمام دنیا میں دھاک ہے، در پردہ اس کی شریک ہیں۔ گو جرمنی نے کھلم کھلا فوج سے مدد نہیں دی۔ مگر یہ مدد کیا تھوڑی ہے کہ پولینڈ کی حفاظت کے لیے فوج کثیر بھیجی، اور روسیوں کا یہ فائدہ ہوا، جو فوج انھوں نے پولینڈ کی حفاظت کے لیے رکھی تھی وہ میدان جنگ میں بھیج دی۔ جرمنی اور آسٹریا علانیہ روس کی جانب داری کرتی ہے اور کس نمی پرسد۔ جرمنی کی سلطنت بڑی طاقتور سلطنت ہے۔ ترکی کی طرف انگلستان البتہ ہے۔ مگر انگلستان نے بھی فوج سے اصلا مدد نہیں دی۔ ترکی کی تنہائی پر سخت افسوس ہے۔ فرانس کو ان امور سے مطلق واسطہ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر جرمنی نے روس کو مدد دی تو ہم ترکی کے معین ہوں گے اور اس میں اصلا شک نہیں ہے۔ فرانس کو روس سے مطلق ہمدردی نہیں ہے۔ خیر فہمیدہ خواہد شد۔ خدا ترکی کو مصئون رکھے۔

جہاں بکام و فلک یار باد
جہاں آفرینت نگہدار باد

کرنل: آمین آمین ثم آمین رب العالمین۔

آزاد: ایں دعا از من و از جملہ جہان آمین باد۔

کرنل: خدا چاہے گا تو انجام بخیر ہو گا۔

سر پر سوار کبھی تو کبھی وہ بغل میں تھی
گہہ گرد بن سمند پہ گاہے کفل میں تھی
تحت الثریٰ میں تھی کبھی برج حمل میں تھی
دریا میں تھی کبھی تو کبھی وہ جبل میں تھی
عالم میانِ عالم امید و بیم تھا
جوز امثال تیغ دو پیکر دو نیم تھا

نبرد گاہ میں مبارزاں رزم زن اور دلاوراں صف شکن کی تلواروں نے صفوں کی صفیں بچھا دی تھیں۔ دور تک زمین لگر تنگ تھی۔ میدانِ کارزار میں لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ کسی مقام پر دو سپاہی گتھے پڑے تھے۔ کہیں دس دس ایک ایک پر جھکے تھے کوئی سسکتا تھا کوئی کراہتا تھا۔ بیشتر خوابِ ابدی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ یہ سب آزاد پاشا کی شمشیرِ الماس بار کی روانی اور ان کے ہاتھ کی صفائی کا نتیجہ تھا۔ صفِ کارزار میں فرش شیر شکار کی چھل بل، چھلاوے کا لطف دکھاتی تھی۔ چال ایسی کہ مستانہ طاؤس کو شرماتی تھی۔ کنوتیاں بدل بدل کر جھپٹتا تھا۔ روکے نہیں رکتا تھا۔ کبھی بڑھا کبھی سمٹا۔ قدم کا دے ایڑن سب برق تھا۔ ایک نامہ نگار نے جو اس معرکۂ عظیم کی کیفیت دور سے دیکھ رہے تھے یوں حال لکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے کچھ عرصہ تک توپیں طرفین سے چلاکیں، اور دنا دن کی آوازیں برابر آیا کیں یہاں تک کہ کان کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ اس کے بعد ترکوں نے ننگی تلواریں لے کر حملہ کیا تو روسیوں نے بھی تلواریں نکالیں اور گتھ گئے۔ گو شب کا وقت تھا مگر ان ولایتیوں کی چمک دمک سے چکا چوند ہوتی تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ کئی آفتاب زمین پر طلوع ہوئے ہیں۔ الاماں الاماں اور زمین کو بھونچال سا آگیا تھا۔ ہر سپاہی اور ہر پیادے کو اس قدر جوش تھا کہ جان دینے پر جان دیتا تھا۔ ہٹنے کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ آزاد پاشا نے جن کی تصویر میں نے پہلے ہی اتاری تھی کئی سو آدمیوں کو ہلاک کیا۔ یہ شخص تلوار کا بڑا دھنی ہے۔ اس طرح پر تیغ دو زبان تول تول کر ہاتھ لگاتا تھا کہ ایک ایک وار میں چار چار یا پانچ پانچ کو گراتا تھا عقل دنگ تھی اور گو کئی

آدمیوں نے آزاد پر چوٹیں لگائیں مگر اس کی یہ کیفیت تھی کہ بدن کو ذرا سمیٹا اور وار خالی. ذراہٹ گئے، اور تلوار کی چوٹ بیکار گئی۔ اکثر اوقات تلوار پر تلوار رد کی اور معاً ہاتھ گھما کر کسی عضو بدن پر لگا یا تو غنیم ڈھیر ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس شخص نے بڑی جرأت کی. کوئی ساٹھ ستر آدمیوں کے گول میں اکیلا گھس گیا، اور در آتے ہوئے چھ افسروں کو جن پر روس کو بڑا ناز تھا زخمی کر کے کئی آدمیوں کا سر تن سے جدا کیا۔ اور نلوہ بچ آیا. اس غول میں جانے کے وقت انھوں نے عجب طرح سے پینترا بدلا تھا۔ اس فن کا یہ شخص استاد ہے۔ تمام روس میں کوئی ایسا نہیں جو تلوار میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ اس خوبصورتی سے چوٹ لگا کر الگ ہوتے تھے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ جنگ روس و روم کی تاریخ میں یہ لڑائی ابدالآباد تک یادگار رہے گی، ہم کو یقین ہے کہ ہندی رستم سیستان کو بھی اس کے مقابلے میں بھول جائیں گے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ترک ہرگز فتح نہ پا سکتے۔ نہ میدان روسیوں کے ہاتھ میں آتا۔ مگر ایک تو رومی بڑے جری اور جیوٹ، دوسرا افسر اعلیٰ ایسا جنگ آزما اور تلوار یہ ملا۔ پھر کیا پوچھنا تھا۔ سونے پر سہاگہ۔ فوج عدو میں کہرام مچ گیا۔ سر جھڑی کی طرح برس رہے تھے. کسی کو طاقت نہ تھی کہ آزاد کی شمشیر دوزبان کا مقابلہ کرتا، جو بڑھا وہ ڈھیر ہو گیا۔ جو منہ آیا اس نے منہ کی کھائی اور جان گنوائی۔ واہ رے آزاد! بارک اللہ!

ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

تلوار بجلی گراتی تھی۔ یہ چمکی وہ آئی۔ وہ چمکی یہ آئی۔ سر پر آن پہنچی اور معلوم نہ ہوئی۔ گردن کاٹ گئی۔ اور خون سے آلودہ نہیں۔ جب نظر ہی نہ آئے تو کوئی تلوار کیا روکے۔

چمکی جو خود سر پہ تو سر سے نکل گئی
مثل قرار سب کے جگر سے نکل گئی
سینہ میں دل لیا تو کمر سے نکل گئی
حیران تھا خود بدن کہ کدھر سے نکل گئی
اونچی ہوئی تو فرق عدو کو فرو کیا
گر کر اٹھی تو راکب و مرکب کو دو کیا

اس میدان میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اور ہزاروں نوجوانوں اور آزمودہ کار جنرلوں اور مردمانِ تہمتن کی لاشیں بے کفن پڑی تھیں۔ ہزاروں تمناؤں کا خون ہوا تھا۔ ہزارہا نوجوان اور حسینہ، جملہ، عفیفہ عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہزارہا تو معصوم بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں

بوڑھے، بے بس آدمیوں کے فرزند دلبند اُن کو بصد افسوس چھوڑ کر چل بسے۔ ہزاروں نوخیز ہونہار حسرت لے کر عالم فانی کو پدرود کر گئے۔ جو لاش تھی ایک نئی وضع سے زمین پر پڑی تھی۔ ایک جوان کے ہاتھ میں تیغ اصفہانی مگر سر تن سے جدا۔ ایک بوڑھا افسر روس ایک ٹرکی لفٹنٹ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چت پڑا تھا۔ ٹرکی لفٹنٹ کی دونوں ٹانگیں غائب۔ روسی افسر کا کاسۂ سر دو نیم۔ ایک سمت کیا دیکھتے ہیں کچھ آدمی تلے اوپر گرے پڑے ہیں۔ ایک پر ایک تلے اوپر چھ آدمی۔ مگر کسی کا سر نہیں۔ کسی کی کمر نہیں۔ کسی کا دھڑ نہیں۔ کسی کی ٹانگوں کا پتہ نہیں۔ ایک طرف دیکھا کہ سو سوا سو آدمیوں کے قریب ایک صف میں پڑے ہیں۔ ایک سے ایک گتھا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ادھر سے ترکی ادھر سے روسی جھپٹے۔ ان کی تلوار سے وہ گرے۔ اُن کی تلوار سے یہ گرے۔ الغرض رن کا میدان لالہ زار تھا۔ زخمیوں کو ترکوں نے ڈولیوں پر سوار کر کے پلونا کی سمت بھیجا۔ اور روسیوں کی بھی اسی قدر خبرداری کی جس طرح خاص اپنے آدمیوں کی کی۔ روسی زخمیوں سے مختلف امور میں گفتگو کی۔

آزاد: (ایک نوجوان سے) اس جنگ کی نسبت تمھاری کیا رائے ہے۔

زخمی۔ مجھے مطلق خبر نہیں کہ جنگ کیسی ہوئی۔ حسرت ہی رہ گئی کہ دو چار ترکوں کو قتل کرتا۔ مگر پہلے ہی حملے میں ایک رومی نے گرا دیا۔ ہاتھ کٹ کے گر پڑا، اور دل کی دل ہی میں رہی۔

آزاد: (دوسرے زخمی سے) تمھاری کیا رائے ہے۔

زخمی: میں نے تین چار ترکوں کو تہ تیغ کیا۔ جنگ کا حال مجھ سے نہ پوچھیے۔ اس سن میں میں نے ایسی جنگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جس جوش سے طرفین کے جرار لڑتے تھے اس کا ایک شمہ جنگ کریمیا میں نہ تھا۔ اللہ اللہ جس شخص کو دیکھتا تھا بپھر رہا تھا۔ شیر کی طرح ڈکارتا تھا۔ اللہ رے جوش، اور اُف رے ولولے۔ مگر ہم کو جلا ہو گیا۔ ایک آدمی پر ہاتھ لگایا اس نے ہی منتھکی دی، دایاں ہاتھ کٹ کے وہ جا کر گرا۔ بائیں ہاتھ سے کیا کر سکتا۔ تلوار تو ہاتھ کے ساتھ اڑ گئی تھی۔ قہر درویش بر جان درویش گرفتار ہو گیا۔ کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتی۔

تیسرا زخمی: ہم تو آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کو ہم نے فرد پایا، دو دو سو آدمیوں کے غول میں گھس بیٹھ کے ڈراتے ہوئے جانا، اور ایک چرکا تک نہ کھایا۔ یہ آپ کا ہی کام تھا۔ صدہا آدمیوں کی دلی خواہش تھی کہ آزاد کا سر کاٹیں، مگر دل کی دل میں ہی رہی۔ اور آپ کی تلوار نے خرمن جان پر بجلی گرائی۔ آگ لگاتی ہوئی سب کو ٹھنڈا کر کے آئی۔

زخمی پانی پانی کا غل مچاتے تھے۔ ہاتھ جوڑتے تھے، اور پانی کے سوا اور کوئی لفظ زبان پر نہیں لاتے تھے۔ ہر بُن مُو سے العطش العطش کی آواز نکلتی تھی۔ زبان سوکھ کے کانٹا ہو گئی۔ تالو میں کانٹے پڑے جاتے تھے۔ مگر ڈاکٹروں اور طبیبوں کا حکم تھا کہ پانی ہرگز نہ پائیں۔ کوئی ٹانکے لگاتا تھا۔ کوئی پٹی باندھتا تھا۔ کوئی زخموں کو دھوتا تھا۔ کوئی دوا پلاتا تھا۔ اس وقت ترک اور روسی سب یکساں تھے۔ افسر اور پیادے اور سوار کل زخمیوں پر یکساں ترس کھاتے تھے۔ مجروحوں کا تڑپنا اور کراہنا، واویلا اور وامصیبتا! ہائے ہائے کا غل مچانا ستم ڈھاتا تھا۔

آزاد: ذرا صبر کرو۔ ذرا صبر کرو۔ خدا کو یاد کرو۔

زخمی: اس وقت تو جان دوبھر ہے۔ ہائے موت بھی نہیں آتی۔

جب روسیوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے جاتا رہا اور درّوں میں جو فوج تھی اس کو بھی حسب مقتضائے مصلحت بھاگتے ہی بن پڑی، تو پلونا کے جانب شمال اور زیادہ لشکر بھیجا کہ اس طرف قلعے پر یورش کی جائے مگر وزیر جنگ نے اس حال سے اطلاع پاکر فوراً تار کے ذریعے سے جہاں تک ممکن تھا اطلاع دی کہ اس ارادے سے درگزرو، جب تک چاروں طرف سے محاصرہ نہ ہو جائے تب تک ہرگز حملہ نہ کرنا۔ ورنہ کسی نہ کسی جانب سے ترکی فوج نکل بھاگے گی۔ روسی جنرلوں نے جو پلونا کے قریب تھے۔ اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ لہٰذ وزیر جنگ کے نام اس تار کا یوں جواب لکھا:

ہم لوگ ادب کے ساتھ دست بستہ ملتمس ہیں کہ اس تار کے مقاصد سے ہمیں اتفاق نہیں۔ ہماری خواہش بالفعل یہ نہیں ہے کہ پلونا کی فوج ترکی کو گرفتار کر لیں۔ بلکہ یہ خواہش ہے کہ پلونا ہمارے حیطۂ اقتدار میں آجائے۔ یہ نہایت موزوں مقام ہے۔ جب یہ قلعہ ہمارے قبضۂ اقتدار میں ہوگا تو یوروپین ٹرکی میں ترکوں کے قدم نہ ٹھہریں گے۔ اور ہم اوڑیانوپل اور اچاریہ مقامات تک چٹکیوں میں دراتے ہوئے چلے جائیں گے۔ پھر قسطنطنیہ کا قبضہ امر آسان ہوگا۔ ہماری فتح کامل اسی پر منحصر ہے کہ فوراً پلونا پر حملہ کر دیں۔ اگر حضرت وزیر جنگ کو اتفاق نہ ہو تو ہم ادب کے ساتھ عرض پرداز ہیں کہ ہماری عرضی بحضور معلیٰ بھیج دیا جائے۔

اس عرضی پر وزیر جنگ نے غور تامل کیا۔ آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ حضور سلطان روس عرضی

بھیجی جائے۔ وزیر جنگ یہ درخواست لے کر خود گئے اور زار سے مشورہ کیا۔

زار: یہ بات قابل غور ہے اگر حملہ کر دیا اور کامیاب نہ ہوئے تو پھر شبکا گھاٹی کی فوج بھی پیدل ہو جائے گی۔ اور اگر حملہ آور ہو کر فتح پائی تو رومی ایک راستے سے جو کھلا ہوا ہے نکل جائیں گے اور منشا ہمارا یہ ہے کہ ترکوں کو قید کر لیں کیونکہ جب ایک لاکھ آدمی گرفتار ہوگا تو ہم کامل فتح حاصل کر لیں گے۔ لہذا ہماری رائے یہ ہے کہ فوراً حملہ نہ ہو۔ کوشش کی جائے کہ پلونا چوطرفہ سے محصور ہو۔

وزیر: یہی تو میری بھی رائے ہے۔

زار: بلکہ بہتر ہے کہ ایک سمت سے تم جاؤ۔

روم، روس، فرانس، پروشیا، جرمنی، امریکا، عرب، ہندوستان اور فارس ہر ملک کے اخبارات حضرت آزاد پاشا کے مداح تھے۔

ایک روز حسن آرا بیگم نے آزاد کو بڑی حسرت سے یاد کیا۔ روح افزا نے کہا بہن اس وقت اگر آزاد ہوں تو دل کو بڑی تشفی دیں۔ کچھ تو ڈھارس ہو۔ کچھ تو تسکین پائے۔ کئی دن سے اخباروں میں بھی اُن کا حال نہیں پڑھنے میں آیا۔

روح افزا: کیا کہوں حسن آرا۔ ہم پر تو سچ مچ بجلی ہی گر پڑی۔

حسن آرا: کیسی کچھ۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوا۔ ہا۔

بوئے گل تو تو چلی اپنی سبکساری سے
ہم گرانبار رہے اپنی گراں باری سے

وہ تو چل بسے مگر ہم سب کو زندہ درگور کر گئے۔

روح افزا: اماں جان! بیچاری کی حالت پر افسوس کروں کہ پیرانہ سالی میں زخم جگر پر نمک چھڑکا گیا۔ یا سپہر آرا کو دیکھ کر خون روؤں کہ کیا ہو گیا۔ اپنے خاندان کی تباہی پر سر پیٹوں۔ ہائے۔

حسن آرا: کیسے مزے سے زندگی بسر ہوتی تھی۔

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا

ہنسی اچھی طرح ایک دن بھی نہیں کہ رونا عمر بھر کا ہے۔

روح افزا: ہاں (آہ سرد بھر کر) قسمت کے لکھے کو کوئی میٹ سکتا ہے۔؟

اتنے میں ایک مغلانی کئی اخبار اور خط لے کر آئی۔ حسن آرا نے پہلے خط پڑھے۔ پھر ایک اخبار میں یہ سرخی دیکھی آزاد پاشا کی جرات اور جواں مردی دیکھتے ہی پھڑک گئی۔ اخبار کو چوم لیا۔ پڑھا تو نفس مطلب یوں درج تھا۔

جبکہ یہ معاملہ رستخیز واقعۂ قیامت انگیز ظاہر ہوا تو آزاد پاشا روسیوں کے حملات کے دفعیہ وانسداد خوف وخطر میں بکوشش وجانفشانی تمام مستعد ہوئے۔ مگر اس کوشش وسعی سے کوئی نتیجہ مفید اور مستحسن ظہور پذیر نہ ہوا۔ کیونکہ اکثر افسروں اور سپہ سالاروں نے رشوت لے لی تھی۔ اُن کے حکم کی اتباع کل سپاہ کرتی تھی۔ ہر چند آزاد پاشا نے سپاہیوں کو بہادرانہ طور پر حملہ کرنے کی جرأت اور ترغیب دی۔ مگر اس سے بھی کوئی نتیجہ نہ پیدا ہوا، اور نہ سپاہیوں نے حملہ کرنے پر کمر باندھی۔ حالانکہ آزاد پاشا نے سپاہ سے یہ بیان کیا کہ اگر حملہ کر کے پہاڑی کے جانب راست پہنچ جائیں گے تو روسیوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہ کریں گے، بلکہ تعاقب تک میں کامیاب نہ ہوں گے۔ مگر افسر جو کہ بالکل رشوت کے ہاتھ بک گئے تھے، ان کے حق میں اس ترغیب وہدایت نے کوئی عمدہ نتیجہ نہ پیدا کیا۔ نہ انھوں نے حملہ کرنے کی جرأت کی بلکہ اس ترغیب کو بلالحاظ مراتب ایسا خیال کیا کہ گویا سُنا ہی نہیں تھا۔ اور ایسے تہلکہ اور خوف جان میں اپنی حفاظت کے واسطے مقام نصرت میں پھیل گئے۔ قریب تھا کہ آزاد پاشا روسیوں کی گولہ اندازی اور بہادری سے جاں بحق تسلیم ہوں۔ مگر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہ ڈٹے رہے اور آزاد کے ساتھ فیضی پاشا اور اطہر پاشا جو یمین ویسار پر محافظ تھے اپنی شجاعت ودلیری سے میدان جنگ میں ثابت قدم رہے۔ آزاد پاشا نے اس دلیری اور جرأت سے داد جواں مردی دی کہ روسیوں کا حملہ سُست اور ضعیف ہو گیا۔ فوج روس بہ اجازت سپہ سالار ارض روم میں اُسی شب کو داخل ہو گئی۔ اور اس قدر باہم جنگ وجدل ہوئی کہ دارالسلطنت کی سڑک تمام کشتوں سے بھر گئی تھی۔ سہ پہر کے وقت ترکوں کو شکست وہزیمت نصیب ہوئی۔ بہت سامال واسباب اونٹ اور بیل اور اقسام وانواع کی بگھیاں دستیاب ہوئیں۔ باشی بزوق اور سرکیشیا اور بہت سے سوار اور پیادے بندوق بار اور خدام سپہ سالار گرفتار ہو گئے۔ جب گورنر کو یہ خبر پہنچی کہ اس کی فوج کو شکست فاش ملی اس وقت اُس نے اپنے قلعہ کا دروازہ اس غرض سے بند کر لیا کہ مبادا مغلوب اور شکست یافتہ فوج اسی راستے سے گذر کر قلعہ کو جائے اور پناہ لے کیوں کہ اس حالت میں اس پر بھی وہی بلا نازل ہونے

کا خوف تھا۔ غرض کہ جب مغلوب فوج اس قلعہ کے نزدیک پہنچی اور دیکھا کہ قلعہ میں انتظام بخوبی ہوگیا ہے ہر طرف گولہ اور بندوق ہی نظر آتی تھی۔ اس وقت مایوسی اور خوف کے عالم میں مجبور ہوکر باہم لڑائی شروع کردی اور دونوں فریق کی فوج بندوقوں سے اپنی جان سے ہاتھ دھوکر خوب لڑی۔ آدھی رات کے قریب جب معرکہ جنگ وجدال میں گونہ کمی ہوئی، اور دونوں فریق کے جوشش قلب میں کسی قدر تسکین پائی گئی اس وقت قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا اور بحکم قلعہ دار مغلوب فوج قلعہ کے اندر داخل ہوئی۔ قلعہ کے اندر جس قدر مکانات تھے وہ سب بیمار اور زخمی فوج سے ایسے بھر گئے تھے کہ رہنے کے واسطے کوئی مکان نہیں ملتا تھا اتفاقاً ایک دوسری بلائے ناگہانی عذاب آسمانی نازل ہوئی یعنی بارش برف باراں اس شدت سے ہوئی کہ بیچارے تھکے ماندے اور فاقہ کش سپاہی اس کے نیچے دب کر ملک عدم کو روانہ ہوئے۔ اس جنگ میں آزاد پاشا نے بڑی نیک نامی حاصل کی۔

یہ مژدۂ فرح بخش و روح افزا ایسا نہ تھا کہ حسن آرا بیگم باوصف رنج وغم محظوظ ومسرور نہ ہو جاتیں۔ روح افزا کو اخبار کا مضمون سُنایا اور کمال خوش ہوکر خدا سے دُعا مانگی کہ یا باری تعالیٰ بحق رسول و بحق فاطمہ آزاد کو سرخرو واپس لا۔

روح افزا: بڑا نام وہاں جا کے پیدا کیا اب یہیں آویں تو چین آوے۔ اللہ نے چاہا تو تمہارے دل کی آرزو ضرور نکلے گی۔

حسن آرا: یہ کہو بہن خدا جانے ہاتھی چھوٹے کہ گھوڑا چھوٹے۔

راوی: یہی اول مرتبہ تھا کہ حسن آرا بیگم نے اس سنِ شعور میں ضعیفُ الاعتقادی کا کوئی کلمہ زبان سے نکالا ہو۔

روح افزا: آزاد پاشا ہوئے پاشا کے کیا۔ معنے بہن۔

حسن آرا: وہاں روم میں افسروں کا یہی خطاب ہے۔ گو اتنا رنج تھا مگر آزاد کی خیروعافیت دریافت کرکے دل کو گونہ تسکین ہوئی۔

روح افزا: یہ تو قاعدہ ہی ہے۔ بہن۔ کئی اخباروں میں تعریف چھپ چکی ہے۔

یہ روایت اس وجہ سے درج کی گئی کہ ناظرین کو اس امر سے اطلاع ہو جائے کہ حسن آرا بیگم کو آزاد کی جرأت اور مردانہ کارروائی کی خبر ملتی جاتی تھی۔ خیر۔

اب سنئے کہ پلونا کے سپہ سالاروں کو آزاد سے ضد پیدا ہوئی اور باہم مشورہ کرنے لگے کہ

اس شخص کو نیچا دکھائیں۔ ایشیا کا نفاق اور آپس کی پھوٹ ضرب المثل ہے۔ گو یورپین ٹرکی یورپ میں واقع ہے مگر نسل تو ایشیا ہی کی ہے۔ ان لوگوں کے مزاج سے ابھی تک بوے ایشیا نہیں گئی۔ آزاد کی نسبت یہ رائے قرار پائی۔ یا تو اس کو قتل کر ڈالیں یا زہر دے دیں یا رشوت کا جرم قائم کر کے نکلوا دیں۔ قریب قریب کل افسر اُن کے دشمن متصور ہے۔

ایک: اس آزاد کے سبب سے ہم لوگوں کا نقصان متصور ہے۔

دوسرا: بائیں ہاتھ کا کرتب ہے مار ڈالو۔ اور مشہور کر دو کہ مقتول ہوا۔ اس میں فکر کی کیا ضرورت ہے۔

تیسرا: یا مشہور کر دینا کہ علیل تھا۔ بخار آیا۔ مر گیا۔ بس۔

چوتھا: ابھی نہیں۔ جب کوئی اور کارنمایاں سرزد ہوئے تب قتل کر کے لکھ بھیجنا کہ ہم نے فتح پائی ورنہ اس کے سامنے ہماری آپ کی دال نہ گلے گی۔

پانچواں: ان سے مل کے ان کو مارو۔ ع

گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دے

چھٹا: بندوق میں گز ڈالو۔ دل لگی دل لگی میں اس سے کہو کہ بندوق سر کرو۔ پھر دیکھیے کیسی دل لگی ہوتی ہے۔ یہ سب سے آسان ترکیب ہے۔

آزاد بیچارے کو اس تجویز کی خبر ہی نہ تھی۔ یہ سوچتے تھے کہ اب کی جو ہماری شمشیر برق بار چمکے گی تو ہم ہزاروں کو جان سے ماریں گے۔ ممکن کیا کہ کوئی بچ سکے۔ اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے ہاتھ پاؤں ہی ان کے دشمن ہو رہے ہیں۔

فلک بے رحم و عالم دشمن و معشوق بے پروا
مرا بر آرزو ہائے نظیری خندہ مے آید

مگر یہ افسروں سے ہنسی خوشی باتیں کرتے تھے۔

نئی شرمیلی دُلہن

بیا ساقی آن بکر مستور مست   کہ اندر خرابات دارد نشست
بمن وہ کہ بدنام خواہم شدن   مریدی می و جام خواہم شدن

بیا ساقی از خم دوشینہ می　　کہ ماندست باقی نہ کاؤس و کئی

بمن دہ کہ تا کر دم از عیب پاک

خرامم بہ عزت بر پیر مغاک

دن کو تو اس پری خانہ طرب کاشانہ میں چہل پہل رہی۔ آسمان جاہ غیرت مہر و ماہ کے چٹکلے اور ظریفانہ باتیں۔ جانی بیگم کی شوخیاں اور دلربائی کی گھاتیں۔ حشمت بہو معشوقہ ماہرو کی اٹکھیلیاں بیگما بیگم کی خوش فعلیاں۔ مامک دیرینہ روز بی مغلانی کے بوڑھے چونچلے اور اگلے وقتوں کے ذکر و مذکور بیابانی کی نار پستان ڈومنیاں رشک قمر غیرت حور، مکان کیا پرستان تھا یا روضہ رضوان تھا۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی کمسن گلِ رخسار باغ و بہار پریاں ہی پریاں نظر آتی تھیں۔ غضب کرتی تھیں۔ ستم ڈھاتی تھیں۔

فرشتہ در ایشان نہ بیند دلیر　　وگر بیند افتد ز بالا بزیر

نظر طاقتِ آن ندارو بہ نور　　کہ بیند در ایشان ز نزدیک و دور

درخشندہ ہر یک در ایوان و باغ

چو در روز خورشید و در شب چراغ

اوج فلک سے ملائکہ نورانی تک مبارکباد کے لیے آئے تھے۔ اور طشتِ زمرد میں دُر و دینار و درم نثار کے لیے لاتے تھے۔ دُلہن کا باپ مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتا تھا۔ اور یہی شعر زبان پر لاتا تھا۔

سحر ز غیب کشادند بر منِ دلگیر

دری ز دولت بی منتہائے ربّ قدیر

مسرت و عیش کی باد بہاری سے غنچہ دل کھلا جاتا تھا۔ ہر فرد بشر مُنہ مانگی مراد پاتا تھا۔ برگ گل تالیاں بجاتے تھے۔ بلبل دورِ طرب سے چہچہاتے تھے۔ پھول مسکراتے تھے۔ غنچے کھلے جاتے تھے ہر در و دیوار نغمہ ریز۔ ہر برگ و بار خندہ خیز، شادی کیا تمام شہر میں عید تھی۔ دلہن کے صنم خانے کی کیفیت قابل دید تھی۔ بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ چمن میں گل خندان گلگوں پہ عنادل غزل خواں۔ بزمِ طرب میں رقاصہ نوجوان اور مبارکباد شادی وردِ زبان۔

یہ تو دن کا حال تھا اب شب کا ذکر سُنیئے۔

چو سلطان شب چتر بر سر گرفت
سوادِ جہاں راہ عنبر گرفت
ستارہ چناں گنج از زر فشاند
کہ مہد زمین گاو بر گنج راند

شام سے آدھی رات تک یہی کیفیت یہی چہل یہی مذاق رہا۔ نئی دلہن گوری گردن جھکائے پیارا پیارا مکھڑا چھپائے ادب اور حیا کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ چنچل اور شوخ طبع رنگین مزاج ہنسوڑ ٹھٹھول ہمجولیاں چپکے چپکے چھیڑتی جاتی تھیں۔ دلہن بیچاری اور بھی شرماتی تھی۔ مگر کوئی کلمہ فرطِ غیرت سے زبان پر نہیں لاتی تھی۔

آدھی رات کے وقت دلہن کو نہلانے بٹھایا اور بیسن مل کے نہانے کے بعد اٹھایا۔ ڈومنیوں نے نین حرارے دلہن کو حسب قواعد و رسول جھلایا۔ عطر حنا اور سہاگ اور کیوڑا اور گلاب بدن میں ملا۔ جس کی بو باس سے دماغ جون پور اور قنوج پر طعنہ زن تھا۔ اس کے بعد جوڑا پہنایا گیا۔ یعنی ایک عرض کا سبز بافتے کا پائجامہ سوہے کی کرتی۔ سوہے کی اوڑھنی اڑھائی اور زردار کشمیری دوشالہ بسنتی رنگ زیب بر کیا بھاوجوں نے مینڈھیاں گوندھی تھیں۔ اب زیور پہنانے کے لیے بیٹھیں۔

زلعل و ز دُر گردن و گوش پُر
لب از لعل کانی دو دندان زدُر

سونے کی پازیب دلفریب۔ چھاگل اور کڑے۔ بیڑیاں اور چھڑے دسوں پوروں میں تلکڑی کے چھلے پڑے ہوئے۔ ہاتھوں میں چوہے دنتیاں۔ کنگن جڑاو طلائی کڑے الماس خوائی شیر وہاں۔ ہیرے کے جڑاو کڑے۔ بیڑیاں۔ بازو پر سٹھے نورتن نونگے۔ اور مرصع جوشن۔ گلوئے مصفا میں دھکدھکی۔ چمپاکلی تلکڑی کا طوق چاند سورج لگے ہوئے۔ اور ان پر یاقوت و زمرد کی پچی کاری۔ مالائے مروارید دید نہ شنید۔ موتیوں کا ہار۔ جس پر حاصل کان و بحر نثار۔ ایک ایک موتی کے بعد زمرد کی خوشنما مڑیاں۔ گوشِ صفا کوش میں استیاں اور جھالے دراج اور بالے۔ کرن پھول انمول۔ سر پر چھپکا سیس پھول اور جواہرات کا ٹیکا۔ مانگ میں موتیوں کی لڑی۔ جس پر حورانِ بہشتی کی نظر پڑی۔

دل و دین زلف و ونا مانگے ہے
مانگ اب دیکھیے کیا مانگے ہے

پور پور چھلے۔ ہیرے اور یاقوت احمر کی انگوٹھیاں دو ایک میں نیشاپوری فیروزے کے نگ تھے۔ آرسی زیب انگشت ناک میں نتھ ازسر تا پا عالم نور نظر کا پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ جواہرات کی چمک دمک سے گمان ہوتا تھا کہ ایک چاند زمین پر طلوع ہوا۔ دُر خوش آب سے دریا منفعل تھا تو گوہر نایاب سے کان خجل پریوں کو آرزو تھی کہ اس رشک حور و درار قصور کے دامن پر نماز پڑھیں۔ فرشتے وزدیدہ نگاہ سے دیکھتے تو آنکھ جھپک جاتی۔ لیلیٰ و شیریں کی روح شرماتی۔

فریبندہ چشمے جفاجوی تیز
دوا بخش بیمار و بیمار خیز
زبان کوتہ و زلف و گردن دراز
لبش چوں شکر خالی باد و براز

اُدھر ہمجولیوں میں چہل ہوتی جاتی تھی۔

جانی بیگم: چوتھی کے دن اب ٹھاٹھ ہوں گے۔ آج کیا ہے۔

فیضن: آج کچھ ہئی نہیں۔ ایسا مہکوا عطر کبھی نہیں سونگھا۔

اس پر سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور طرح طرح کی دل لگیاں اور چہل کی باتیں ہونے لگیں۔ سب اپنے اپنے طرز پر مذاق کرتی تھیں۔

ایک: مہکوا ناہیں سونگھا۔ یہ مہکوا کہاں کی بولی ہے۔؟

دوسرا: اجاڑ گاؤں بستی ناؤں کی بولی ٹھولی ہوگی شاید۔

تیسری: کیوں بہن فیضن تمہارے دیہات کی سب ایسی ہی زبان بولتی ہیں، یا تم ہی اکیلی۔ سچ سچ بتانا بہن؟ بولو!

فیضن: اونہہ! اب اس سے کیا مطلب۔ اور دیہات کی کون ہے دیہاتن کوئی اور ہوگی۔ ہم تو قصبے کے ہیں۔ گنوارن بنائے دیتی ہو۔

بیگما بیگم: بی فیضن کی باتوں سے دل کی کلی تازہ ہو جاتی ہے (ہنس کر)۔

آسمان جاہ: اے کیسی کچھ۔ اور چنچل کیسی ہیں۔ شوخی ایک ایک رگ میں بھری ہے۔ اور کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔

جانی بیگم: بہن فیضن۔ ہم تمہارے میاں کے ساتھ نکاح پڑھوالیں برا تو نہ مانوگی؟ اصغر میاں ہم پر ریجھے ہیں۔

آسمان جاہ : دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ بس چھٹی ہوئی۔
حشمت بہو : (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) کوئی ایسی بات زبان سے نکالتا ہے۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔
بیگما بیگم : اے ہاں۔ ہنسی بھی تو کتنی۔ نوج کوئی ایسی بیحیا ہو۔
حشمت بہو : آنکھوں کا پانی بالکل ڈھل گیا۔ حیا نگوڑی چھو نہیں گئی۔ مروت بھون کھائی۔ پھیری منہ پر یوئی تو کیا کرے گا کوئی۔
آسمان جاہ : چھیڑ چلی جائے چھیڑ چلی جائے۔ یہ ہنسنے بولنے کے دن ہیں۔ اے آتو جی۔ ذری ایک گلوری ادھر بھجوا دو۔ اے ذری سے پان پر اتنا مان۔ اونہہ اونہہ اچھی ہمارا خاصدان کھولو۔ جب جانیں کہ محلّے بھر میں کہیں ایسی گلوریاں ہوں۔ تم لوگ گھانس کھانا جانو۔ پان کھانا کیا جانو۔
بیگما بیگم : بڑی مُنہ پھٹ ہو بہن۔ جو مُنہ میں آیا واہی تباہی بک دیا زبان کیا لندھن کی قینچی ہے کہ ٹھہرتی ہی نہیں۔
آسمان جاہ : اور قینچی بھی راجس کے ہاتھ کی۔ اصل ولایتی اور باڑھ بھی وہ جو میاں کھیٹے کے گھسیٹی ہے۔ ایسی مقراض ہے۔
مغلانی : (بوڑھی) حضور نام خدا اٹھتی جوانی ہے۔ شباب ہے طبیعت امنگوں پر ہے۔ یہی دن چہل ہنسی مذاق کے ہیں۔ جب ہم ان سنون تھے تو یہی ہماری بھی کیفیت تھی۔ آئے دن جلسے ہوتے تھے۔ دن رات مانگ چوٹی میں گرفتار رہتے تھے۔ ایک جوان کے عشق کی آگ میں پھنک گئے تھے۔ پڑوس میں ایک ستار باز رہتا تھا ایسے خوبصورت ہاتھ پاؤں کہ میں کیا عرض کروں۔ سینہ چوڑا۔ داڑھی ایسی پیاری اور کالی کہ واہ جی واہ۔
حشمت بہو : کسی کی فنس ڈیوڑھی پر ٹھہری ہے۔ دیکھو تو کون آئیں۔؟
مغلانی : آج آنے کی بھلی کہی۔ فنسوں پر فنسیں اور ڈولیوں پر ڈولیاں کھچا کھچ چلی آتی ہیں۔ ایک پر ایک۔
آسمان جاہ : ایں! ادھر دیکھو تو۔ مہریوں کے کاندھے پر فنس ہے اللہ اللہ کوئی بڑی نستعلیق ہیں پردہ نہ کرایا۔ اندر ہی آگئیں۔
حشمت بہو : اے وہ ہوں گی مرزا بہرام سطوت کی بیوی مبارک محل۔

آسمان جاہ: واہ۔ وہ تو کربلا گئی ہیں۔ ابھی آئیں کہاں وہاں سے۔
حشمت بہو: اے لو اور سُنو۔ آج کوئی چودھواں دن ہے کہ ان کی محلدار ملی تھی۔ عجب عجب باتیں بیان کیں۔ خچر پر بھی سوار ہوئے سب۔ وہاں اس کا عیب نہیں۔ اور وہاں کے خچر وہ بیان کرتی تھی کہ یہاں کے گھوڑوں سے بڑے ہوتے ہیں۔
فیضن: خچر کیا کسی جانور کا نام ہے۔ شور ہاتھی گھوڑا بن مانس ہرن پاڑھا اور لوکھڑی تو سُنا ہے خچر نہیں سُنا۔

اس لوکھڑی کے لفظ پر ایک فرمایشی قہقہہ پڑا ایک نے کہا۔ یہ لوکھڑی کن جنگل میں ہوتی ہے۔ دوسری بولی جہاں بی فیضن کی نال گڑی ہے۔ تیسری نے کہا۔ بہن لوکھڑی نہ کہو لومڑی کہا کرو۔ لوکھڑی تو گنواری بولی ہے گوارن کے نام پر تو بہت جِھنکتی ہو۔ مگر باتیں گنوار ہی کرتی ہو۔

فیضن خاموش ہو رہی۔ اپنے نزدیک یہ خاص شہر کی بولی بولتی تھیں۔ مگر شہر والیوں کے مقابل میں کب فروغ پاتیں۔ شہر شہر ہی ہے۔ گاؤں گاؤں ہی ہے۔ کجا شہر کی زبان کجا قصبے کی زبان۔

اتنے میں ایک ہمجولی نے آن کر کہا۔ آسمان جاہ۔ وہ آئی ہیں مبارک محل۔ اُن کے سامنے ذری ایسی باتیں نہ کرنا۔ وہ بڑی نازک مزاج ہیں۔ اتنی بے لحاظی نہیں اچھی ہوتی۔ آخر اور بھی تو سب بیٹھی ہیں۔ تمہاری سی کوئی بھی بے لحاظ ہے۔
آسمان جاہ: یہ بے لحاظی ہے یا چُہل مذاق دل لگی ہے۔
ہمجولی: اے آگ لگے اس چُہل کو بہو بیٹیوں میں یہ دل لگی ہم نے آج تک نہیں سُنی تھی۔ دل لگی کی ایک ہی کہی۔

ہمجولی کا یہ فقرہ کئی بیگموں کو بُرا معلوم ہوا۔ ایک بولیں ہاں ہاں مبارک محل کا لحاظ کرو۔ ادب سے بیٹھو۔ اور سب تو یہاں اکل کھُری کھٹ گنجی لونڈیاں باندیاں بیٹھی ہیں۔ اب ایک بیگم صاحب آتی ہیں۔ مرزا بہرام سطوت کی بیگم نواب مبارک محل۔

دوسری نے ان کی رائے سے اتفاق کر کے دل کا غبار یوں نکالا۔ ہاں ہاں سچ تو کہتی ہیں۔ مبارکِ محل ان سب کا وظیفہ آج سے مقرر کر دیں گی۔ تیسری نے کہا۔ ہونہہ! مبارک محل۔ مبارک محل اُن کے میاں کا وثیقہ تو پانچ ہی سو ہے۔ یہ جو بیٹھی ہیں کیا ان سے کچھ کم ہیں۔

(بیگما بیگم) کی طرف اشارہ کرکے) ان کے میاں کا تو تیرہ سے کا وثیقہ ہے۔

اتنے میں مبارک محل مستانہ چال سے قدم رکھتی ہوئی آئیں۔ اور خواصیں پائجامے کے پائنچے اُٹھائے ہوئے تھیں۔ یہ نازنین مہ جبیں اپنے حسن خدا آفریں کے لیے ضرب المثل تھی۔ بوٹا سا قد بدن گول۔ سانچے کا ڈھلا ہوا، نشیلی آنکھیں چاند سا مکھڑا۔

شب چو در بزم حدیث از رخ خوب تو گذشت

شمع پیش از ہمہ انگشت شہادت برداشت

عارض تاباں رشک قمر، غیرت ماہ منور۔ پوشاک بیش بہا زیب تن۔ زیور سے از سرتاپا آراستہ خورشید رُو نوجوان نوخاستہ عشوہ گری میں طاق، دلربائی میں شہرۂ آفاق۔

کہ ماند کز تو بہ تیغ کرشمہ کشتہ نہ شد

ہمی ستیزۂ حسن تو باخداست کہ نیست

ادب اور تمیز کے ساتھ سب سے ملیں اور دُلہن کے پاس جاکر بیٹھیں۔ ثریا بیگم سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ آسمان جاہ کی طرف مخاطب ہوکر مبارک محل نے کہا۔ اخاہ۔ دماغ ہی نہیں ملتے۔ آسمان جاہ نے مُسکرا کر کہا۔ بجا۔ ثریا بیگم کے دماغ نہ ملیں تو بجا ہے میرے دماغ کیوں نہ ملیں گے۔ ہاں جس دن میں دُلہن بنی تھی اُس دن میرے دماغ بھی ساتویں آسمان پر تھے۔

جانی بیگم: اتنا انکسار نہ کرو بہن۔ تم اب تک ساتویں چھوڑ نویں آسمان پر تھگلی لگانے کا دم داعیہ رکھتی ہو۔

اس پر قہقہہ پڑا مبارک محل زیر لب مُسکرائیں۔ آسمان جاہ بولی ہاں ہاں پھر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ یہ تو یہی سہی۔

مبارک محل: ہم نے ثریا بیگم کو آج ہی دیکھا۔ اللہ مبارک کرے۔

آسمان جاہ: ان کے میاں کو دیکھا ہے یا نہیں بس چندرے آفتاب چندرے مہتاب نہایت قبول صورت ہیں۔ اُن کا نام اصغر میاں ہے۔

راوی: اس لطیفے پر وہ ہنسی ہوئی وہ ہنسی ہوئی کہ دُلہن تک بے اختیار ہنس پڑی۔ اور فیضن کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا — مبارک محل کی سمجھ میں یہ لطیفہ نہیں آیا بیگما بیگم نے کان میں کہا بہن تم نہیں سمجھی ہوگی کہ ہنسی کا ہے پر ہوئی یہ جو سامنے بیٹھی ہیں بی فیضن ان کے میاں

کا نام اصغر میاں ہے جب بیٹھی یہاں آئیں اور آسمان جاہ کو ان کے میاں کا نام معلوم ہوا تو ان کو تو تم جانتی ہی ہو کیسی چنچل شوخ ہیں. سوار کو گھوڑے سے اُتار لیں. اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کہہ اُٹھیں کہ ہمارے میاں کا نام اصغر میاں ہے. اب ثریا بیگم کے میاں کو اصغر میاں بنا دیا. مبارک محل مسکرا کر خاموش ہو رہیں مگر اور ہمجولیاں بڑی دیر تک ہنسا کیں.

بیگما بیگم : حد ہو گئی غضب کی شوخی مزاج میں ہے. اُفوہ.

جانی بیگم : شوخی سی شوخی ہے کسی جگہ پر بند ہوتی ہی نہیں.

آسمان جاہ : ذری اپنی ایڑی دیکھو.

جانی بیگم : اے ہے. نظر لگ گئی. نظر بد کا یہ خوف ہے (ہنس کر) اللہ نظر بد سے تم کو بچائے اس شہر کی تمہیں تو ناک ہو بہن!

آسمان جاہ : اے ثریا بیگم ذری گردن اُونچی کرو. واہ یہ نیا تھمبا نکالا ہے. شرم بھی تو کتنی. گردن اُونچی کرو. اے لو وہ اور جھکی جاتی ہیں. ہم تو سینہ تان کے بیٹھے تھے. کیا کسی کا ڈر پڑا ہے. اوئی یہ انوکھی شرم ہے.

حشمت بہو : تم تو اندھیر کرتی ہو نئی دُلہنیں کہیں اکڑ کے بیٹھا کرتی ہیں. جو بہو بیٹیوں کا دستور ہے. اس طرح بیٹھی ہیں. واہ.

مغلانی : اے ہاں حضور تن کے کہیں دُلہنیں بیٹھی ہیں. کیا کچھ نئی ریت ہے. سرکار بیٹھی ہوں تو تعجب نہیں. (مسکرا کر).

آسمان جاہ : اچھا صاحب یوں ہی سہی. ذری اور جھک جاؤ.

حشمت بہو : بیشک جو دُلہن کا قاعدہ ہے اس طرح بیٹھی ہیں.

اب سُنیئے کہ باجے کی آواز آئی. ثریا بیگم کے بہنوئی نے باہر سے آ کر اپنی ساس سے کہا. دُلہن کا سہرا آتا ہے. دولہا کے ہاں سے یہ سہرا بڑے ٹھاٹھ سے آیا تھا. بی فیضن نے کمال شوق سے جلوس دیکھا اور بہت ہی خوش ہوئیں. جب سہرا اندر آیا تو ثریا بیگم کی ماں نے کہا (اب اس وقت کوئی چھینکے وینکے نہیں. سہرا اندر آتا ہے) بڑی بوڑھیوں نے بھی کم سنوں کو آگاہ کیا کہ خبردار چھینکنا نہیں.

سہرا اندر آیا. کم سن بیگمات جو ثریا بیگم کے بہنوئی کے سامنے نہیں آتی تھیں، پردے میں ہو گئیں. اُنھوں نے سالی کے سر پر سہرا باندھا. ساس سے نیگ کے لیے کہا.

ساس: ہاں ہاں باندھ لو باندھ لو۔ اس وقت تمہارا حق ہے۔
بہنوئی: ان بھپاروں میں نہ آؤں گا۔ لائیے نیگ لائیے۔
حشمت بہو: ہاں بے جھگڑے نہ ماننا دولہا بھائی۔ وجہ؟
بہنوئی: مان چکا۔ توڑوں کے مُنہ کھولیے۔ اب دیر نہ کیجیے۔
ثریا بیگم کی والدہ شریفہ نے پانچ اشرفیاں دیں۔ وہ تو پانچ اشرفیاں لے کر خوش خوش باہر گئے ادھر دولہا کے ہاں کی اوڑھنی دُلہن کو اُڑھائی گئی۔ پائجامے میں ناڑے کی اکیس گرہیں دی گئیں۔
آسمان جاہ: یا میرے اللہ۔ دس پانچ اور ہیں۔
جانی بیگم: (ہنس کر) وہ سو ہوں تو کیا بات ہے۔
آسمان جاہ: (قہقہہ لگا کر) اس میں کیا شک ہے سو چھوڑ چاہے ہزار ہوں۔
پردہ ڈالا گیا۔ ایک پلنگ پر دُلہن متمکن ہوئیں۔ پھول کے طوق پھولوں کی بدھیاں پنہائی گئیں۔ جن میں حسینی کے ہاتھ کی ہڑیں بنی ہوئی تھیں۔ پھولوں کا طرّہ باندھا۔ بیچ میں عروس پری پیکر اور ع۔

عروساں بگردش کمر در کمر

کوئی دُلہن کے رخسار تاباں سے پسینا پونچھتی تھی۔ کوئی کہتی بہن ذری گردن اُونچی کرو۔ برات کے آنے کا انتظار تھا۔
آسمان جاہ: کیوں بہن فیضن سچ کہنا اس وقت دُلہن پر کیسا جوبن ہے۔
فیضن: وہ تو یوہیں خبصورت ہیں۔
خوبصورت کے عوض خبصورت کہنا تھا کہ بے اختیار سب کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں۔ حتیٰ کہ مبارک محل جو بڑی نستعلیق تھیں ان تک سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور دُلہن بھی گردن نیچی کرکے ہنسنے لگی۔ دیہاتی پن کی بُو کہاں جاتے۔ پھر شہر والیوں کے سامنے زبان کھولنا اور بھی ستم ہے۔ دو چار بوڑھیوں نے ان سب کو سمجھایا کہ کسی پر ہنسنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہنسی میں ہرج نہیں مگر وہ ہنسی کیا۔ جس سے کسی کا دل دکھے۔
آسمان جاہ: برات بڑے دھوم سے آئے گی۔ ہم نے چاہا تھا کہ منے میاں کے ہاں سے برات کے ٹھاٹھ دیکھیں۔ کمرے میں دُہری دُہری چقیں پڑی ہیں اور وہاں بھی بیس پچیس بیگمیں ہوں گی۔

اُن کی بھاوج امراؤ خانم بڑی ہنسوڑ عورت ہیں۔ میں تو اُن کو بہن سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں سُنا آج خدا ناکردہ طبیعت کچھ بے لطف ہوگئی ہے۔

تنت بہ نازِ طبیباں نیاز مند مباد
وجود نازکت آزردہ گزند مباد

مغلانی: امراؤ خانم کون؟ وہ ننھے میاں کی بھاوج؟ ہاں۔

حشمت بہو: مہری جاکے دیکھو چقیں سب درست ہیں۔ پہلے اس طرف سے جاکے برات دیکھیں گے۔ پھر اُدھر اُس کمرے سے۔

مہری: حضور سب لیس ہے۔ کئی دن سے سامان ہوگیا ہے۔

آسمان جاہ ناز و ادا کے ساتھ اُٹھیں اور جھومتی ہوئی اس کمرے کی طرف چلیں جہاں سے برات دیکھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کمرے میں گئیں اور نیچے جھانک کے دیکھا تو کہا اُوئی۔ ہے ہے میں سہم گئی۔ ایسی تیسی میں جائے یہ کمرہ۔ اتنا اُونچا اللہ جانتا ہے میں تو مارے ڈر کے گر پڑی ہوتی۔ اُفوہ۔ مہری کا ہاتھ لے کر قلب پر رکھا اور کہا دیکھو میرا قلب اس وقت دھک دھک کر رہا ہے۔ اُفوہ۔

اتنے میں ایک مہری نے یہاں آکر کہا۔ بیگم صاحب وہ جگہ تو اس قابل نہیں ہے کہ وہاں سے تماشا یا برات دیکھیے ابھی آسمان جاہ نے نیچے جھانکا تو گرتے گرتے بچیں۔ بہت بلندی ہے۔ دوسری جگہ بدل دیجیے۔ جانی بیگم بولیں۔ اے ہے۔ کیا ننھی ہیں۔ ایسی ننھی بنی جاتی ہیں۔ ذری بلاؤ تو ادھر بلاؤ۔ گر ہی پڑی ہوتیں۔ اُونھ! اُونھ!۔ آسمان جاہ آئیں تو جانی بیگم نے آڑے ہاتھوں لیا۔

جانی بیگم: ہم نے سُنا آپ اس وقت سہم گئیں۔ شانِ خدا۔

آسمان جاہ: اللہ گواہ ہے۔ دل لگی نہ کرو۔ میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں حواس باختہ ہوگئے ہیں۔ توبہ اتنا اُونچا کمرہ۔

جانی بیگم: چلو بس زیادہ مُنہ نہ کھلواؤ۔

آسمان جاہ: اچھا جاؤ اور جاکے جھانکو تو معلوم ہو۔

جانی بیگم: چلو جھانکیں چل کے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

حشمت بہو: ہم بھی چلتے ہیں۔ ہم بھی جھانکیں گے۔

بیگما بیگم : آخرش اس بحثا بحثی سے کیا فائدہ۔ اس کمرے کو بدل کے نیچے کے کمرے سے دیکھو بیکار کوئی گر پڑے کسی کا ہاتھ پاؤں ٹوٹے۔ اس سے کیا مطلب۔

اکثروں نے جا کے دیکھا تو کمرے کو ناپسند کیا۔ اور بی مغلانی نے اور بھی ڈرا دیا۔ پوپلے مُنہ سے گردن ہلا ہلا کر کہا۔ بیوی ایک دن کا ذکر سنو کہ میں نواب قدسیہ محل کے ساتھ تاج بی بی کا روضہ دیکھنے گئی۔ اللہ ری تیاری۔ روضہ کیا سچ مچ بہشت ہے۔ فرنگی تک جب آتے ہیں تو مارے رعب کے ٹوپی اُتار لیتے ہیں۔ اور سلام کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی کو مانتے وانتے نہیں مگر اُس کو مانتے ہیں۔ بس حضور قدسیہ محل کے ساتھ سیکڑوں خواصیں پیش خدمتیں اُتو ماما اصیلیں مغلانیاں وہ ڈھیری کا ڈھیر اٹھا۔ جب روضے کے پھاٹک پر پہنچے تو مجاور باہر چلے گئے۔ مالیوں کو حکم ہوا کہ پیٹھ پھیر کر اپنا کام کریں۔ اُن موئے گنواروں سے پردہ کیا۔

آسمان جاہ : اونہہ! پردہ! پردہ دل کا۔ اور نہیں کیا۔

حشمت بہو : پھر مجاوروں کو کیوں ہٹایا۔

مغلانی : وہ آدمی ہیں اور مالی جانور۔ موئے گنوار۔

بیگما بیگم : مالی، مزدور، بھتوی، کہار۔ ان سب لوگوں سے کون پردہ کرتا ہے؟ کوئی نہیں۔ پردہ اپنے دل کا۔ ان لوگوں سے پردہ کیا۔

مغلانی : بس حضور سب خواصیں اور بیگمیں اور آتو اور میں پھاٹک میں آتے ہی باغ میں پھیل گئیں۔ میدان جو پایا تو بڑی آزادی سے روشوں میں سیر کرنے لگیں۔ قدسیہ محل کی پوتی نے ایک مالی کی گھٹی کھوپڑی پر زور سے چپت لگائی تو بڑا قہقہہ پڑا۔ اُس دن کی باتیں عمر بھر یاد رہیں گی۔

حشمت بہو : اُن کی پوتی کا سن کیا تھا۔ بچہ ہو گی۔؟

مغلانی : ہاں۔ بچہ تو تھی ہی۔ سترھواں سال تھا۔

آسمان جاہ : وہ ہمارے ڈھب کی تھی۔ ہم ایک ٹیپ نہ جماتے ہم کم سے کم دو تین دھولیں لگاتے۔ اور ہاتھ پھونک کر۔ گھٹی تو تھی ہی۔ نرن ٹیپے کہ کفرستان بلرزد۔

حشمت بہو نے کہا دوسرے کمرے میں جو اس کمرے کے نیچے ہے فرش بچھا ہے۔ آراستہ ہے۔ سب صاف شفاف ہے۔ وہیں بیٹھیں اور وہیں سے برات دیکھیں گے۔ دیکھنے کے واسطے وہ مقام اچھا ہے۔

آسمان جاہ : اور دُلہن کو کہاں سے برات دکھاؤ گی ؟

حشمت بہو : ہمارے ہاں کی دُلہنیں برات نہیں دیکھا کرتیں۔

آسمان جاہ : واہ کیا انوکھی دُلہن ہیں اے واہ!

جانی بیگم : ہاں! انوکھی! اور جس دن تم دُلہن بنی تھیں اُس دن برات دیکھی ہوگی۔

آسمان جاہ : ہاں ہاں۔ نہ دیکھنا کیا معنی۔ ہم نے اماں جان سے کہا کہ ہم کو دولہا دکھا دو۔ ہم بے دیکھے شادی نہ کریں گے۔ حشر تک کبھی شادی نہ ہونے دیں گی۔ اُنھوں نے کہا اچھا جھروکے سے برات دیکھو۔ ہم نے دیکھی۔ ہمارے میاں گھوڑے پر اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ ایک پھول اُن کے سر پر مارا۔

حشمت بہو : کیوں نہیں۔ خوب کیا شاباش۔ کیا کہنا۔

جانی بیگم : (ہنس کر) پھول ناحق مارا۔ ایک جوتا کھینچ مارا ہوتا۔

اُس پر بڑا قہقہہ پڑا۔ جوتے کے لفظ کو جانی بیگم نے بڑی بے تکلفی سے ادا کیا تھا۔ آسمان جاہ بھی کھل کھلا کر ہنسیں۔

آسمان جاہ : خوب یاد دلایا۔ بھول گئی۔ اب سہی اب کسی روز کہوں گی کہ آج تم دولہا بنو بس اسی روز سے پھول کے عوض پاپوش کاری ہونے لگے گی۔

نواب مُبارک محل نے دانتوں کے تلے اُنگلی دبائی اور اُن کے ساتھ کئی ہم سنوں نے اتفاق کیا کہ ایسی باتیں شریف زادیوں کی وضع کے خلاف ہیں۔ میاں کے لیے پاپوش کاری اور یہ باتیں ہم نے آج تک نہیں سُنی تھیں۔

آسمان جاہ : خوب کہی۔ جانی بیگم بہن بڑی طبیعت دار ہیں۔

حشمت بہو : کیا کہنا۔ باتوں ہی سے ثابت ہے۔ ہو نہ ہو!

بیگما بیگم : نواب مبارک محل نے کچھ نہیں کہا۔

مبارک محل : میں کیا عرض کروں میں نے تو یہ باتیں کبھی آج تک سُنی ہی نہ تھیں۔ آج نئی باتیں سننے میں آئیں۔

آسمان جاہ نے ان باتوں پر ذرا بھی لحاظ نہ کیا اور آہستہ آہستہ گانے لگیں۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

اتنے میں حشمت بہو نے کہا۔ اخاہ دواجی آتی ہیں۔ آئیے آئیے! کہاں سے آتی ہو ؟

دواجی بولیں۔ آئی تو بڑے مرزا صاحب کے ہاں سے ہوں مگر راہ میں بھیڑیں ہیں کہ میں کیا کہوں۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ یہاں تک آنا مشکل ہوگیا۔ دو گھنٹے میں اتنی راہ طے ہوئی۔ اونٹ، سانڈنیاں، گھوڑے، ہاتھی، یابو، فنسیں، ڈولیاں، سوار، تلنگے۔ اور ایک نئی بات دیکھنے میں آئی کوئی دو سو گورے گھوڑوں پر سوار ہیں اور انگریزی باجا بج رہا ہے۔ ایسا باجا ہم نے آج تک نہیں سنا تھا۔ ایک ایک گورا دیو کے برابر۔

آسمان جاہ: کس کے برابر دیو کے برابر۔ دیو تم نے دیکھا ہے۔؟

دواجی: اب آپ تو ہنستی ہیں۔ دیو نہیں دیکھا تو کیا سنا تو ہے۔ وہ کیا مثل ہے دولہا نہیں بنے تو براتیں تو دیکھی ہیں۔

آسمان جاہ: اے ہے تم ابھی تک دولہا نہیں بنیں۔

راوی: اس پر اور قہقہہ پڑا۔

دواجی: کہتے ہیں گوروں کو کالا پانی بہت پلا دیا گیا ہے۔ وہ داند چار ہے ہیں کہ الٰہی تیری پناہ۔

حشمت بہو: ایسا نہ ہو کسی کے گھر میں گھس آئیں۔

جانی بیگم: واہ یہ گھس جانا کیا دل لگی ہے۔

حشمت بہو: اخاہ آپ سپاہی بھی ہیں ماشاءاللہ!

جانی بیگم: اے کیوں۔ ہمارے حسن کا رعب کیا کم سپاہی ہے۔

ہم سپاہی ہیں او کمان ابرو
تیغ پکڑے اجل سمجھ لیں گے

بی مغلانی نے کہا۔ ہمارے وقت میں نہ یہ لوگ تھے نہ کچھ حبشیوں کا رسالہ۔ اختری پلٹن۔ خاص بردار۔ بلم بردار۔ جھنڈی بردار ہمارے وقت میں یہ لوگ تھے۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حشمت بہو نے بی مغلانی سے کہا۔ واہ بی مغلانی واہ، کہاں قدسیہ محل کا ذکر چھیڑا تھا تاج بی بی کے روضے کا مذکور تھا کہاں اب مسٹ مار کے بیٹھیں۔

مغلانی: ہاں خوب یاد آیا۔ میں حضور کوئی مولسری کا درخت دیکھتی تھی کوئی الائچی کا درخت ہوتے ہوتے دس پانچ مل کے ایک برج پر گئیں۔ میں کیا کہوں حضور۔ کم سے کم ہوں گے تو کوئی سات آٹھ سو زینے۔

آسمان جاہ: اِس جھوٹ میں کیا سچ۔
حشمت بہو: اُفوہ۔ سات آٹھ سو۔ اللہ تیری پناہ!
مغلانی: بیگم صاحب بلکہ نو ہزار جی۔
حشمت بہو: اچھا پھر کیا ہوا، کہتی جاؤ۔
مغلانی: بس نواب اختر محل بھی ساتھ تھیں۔ سیڑھیوں پر دم لے لے کے اُوپر جاتے تھے۔ سو زینے پر گئے کہ دم پھول گیا۔ ہانپنے لگے خیراب کریں کیا۔ کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑا۔ اور وہ سب بضد ہوئیں کہ برج تک جائیں گے۔ چاہے جو کچھ ہو۔ تریا ہٹ۔ بالک ہٹ۔ راج ہٹ۔ یہ تین ہٹیں مشہور ہیں۔ دم لے لے کے پھر چڑھے۔ جب اُوپر پہنچے تو دم نہیں باقی رہا کہ ذرا ہل بھی سکیں۔ نواب اختر محل کو غش آگیا اور اتنے میں شام ہو گئی۔
حشمت بہو: اللہ اتنی دیر؟ کچھ ٹھکانا ہے۔
مغلانی: بڑے بڑے برج ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہیں کسی شاعر نے ان کی تعریف میں کہا ہے۔

شاہوں کی یہ جا ہے تاجداروں کی ہے
مسکن پسِ مرگ ذی وقاروں کی ہے
دانِ ذہن رسا کا حوصلہ پست رہے
رفعت یہ تاج کے مناروں کی ہے

بس حضور شام کے وقت نواب اختر محل نے برج سے نیچے دیکھا۔ کہا اللہ اللہ۔ یہ بلندی۔ نیچے کے آدمی بھنگے سے بھی چھوٹے نظر آتے ہیں۔ گرمی کے دن تھے۔ ہوا زناٹے کی آرہی تھی۔ ہائے شامت اعمال دوسری دفعہ جو نیچے جھانکا تو دھم سے گریں۔
حشمت بہو: ارے! کون گریں؟
مغلانی: نواب اختر محل۔
حشمت بہو: ہائے ہائے توبہ توبہ۔ مریں کہ بچ گئیں۔
آسمان جاہ: بچ جانے کی ایک ہی کہی۔ ہڈی پسلی چور ہو گئی ہو گی۔ بچنا کیا معنی بچنا کیسا۔
مغلانی: حضور بس ہم سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اب نہ کچھ کہتے بنتی ہے نہ سُنتے

بنتی ہے۔ ایک دفعہ ہائے کی آواز تو آئی۔ بس پھر کسی کی زبان سے آواز نہ نکلی ایک ایک کا منہ تاکتی تھی۔

جانی بیگم: اللہ یہ وقت ساتویں دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

بیگما بیگم: سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

آسمان جاہ: میں نے کہا تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اللہ جانتا ہے اتنے اونچے پر سے جو سڑک دیکھی تو ہوش اُڑ گئے۔

جانی بیگم: جانے دو۔ جانے دو۔ اب اس کا ذکر نہ کرو۔

آسمان جاہ: اللہ جانتا ہے میں سہم گئی تھی۔

حشمت بہو: چلو دلہن کے پاس چل کے بیٹھو۔

مغلانی: اب کچھ اور ذکر چھیڑیے۔

آسمان جاہ نے (نیچے سُروں میں) یہ شعر گانا شروع کیا۔

بیچارہ خسرو خستہ راخوں ریختن فرمودہ است
خلقی بہ منت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

مغلانی: اچھی آواز پائی ہے مگر اصول سے واقف نہیں۔

حشمت بہو: ہاں خوب پیارا گلا ہے۔ اچھا گلا پایا ہے۔

مغلانی: اچھا ہم جس طرح کہیں اُس طرح تم بھی کہو۔

یار بر و خوردہ پان۔ ایں گل دیگر شگفت۔

اتنے میں ایک بیگم آئیں۔ از سرتا پا بسنتی لباس اُن پر سب کی نظر پڑی۔ آنے کی دیر تھی کہ آسمان جاہ نے پھلجھڑی چھوڑ دی اور نسبت کا ضلع بولنے لگیں۔

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی

کیوں بسنتی خانم کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ وہ بیچاری شرمائی کچھ جواب نہیں دیا تو آسمان جاہ نے کہا یکرنگی کے یہ معنی ہیں کہ عقیق اور پکھراج کے سوا اور جواہرات کی انگوٹھی پہنی ہوتی اور اس کمرے کے جھاڑ جھاڑ سب زردی زرد ہونے چاہئیں۔ اور میوہ بھی کھاؤ تو چکوترہ مہتابی زرد آلو پھول بھی سونگھو تو گیندے کے۔ گلے کا ہار ہے۔ گیندے کی بہار ہے۔ ایک تو سنہرہ رنگ

اُس پر بسنتی لباس۔ نوروز خاں بہار خاں بسنت لال ہولی رام آدمیوں کے نام رکھو۔ اور نرگسی پلاؤ زردہ نرگسی کباب کے سوا اور کچھ نہ کھانا۔

ہے لطف حسینوں کی دورنگی کا امانت
دو چار گُلابی ہوں تو دو چار بسنتی

جدھر دیکھو سرسوں پھولی ہے۔ گیندے اور ہزارے سے بھری مالیوں کی جھولی ہے۔ ڈومنیوں سے فرمایش کیجیے کہ بسنت گائیں۔

موسم بدل گیا ہے ہوا خوشگوار ہے
مرغوں میں چہچہے ہیں چمن میں بہار ہے

کھیت کشتِ زعفران بنے ہوئے ہیں اور بی فیضن جان نے برقان سے ابھی نجات پائی ہے۔

فیضن: کاہے سے۔ کاہے کا ہو۔

آسمان جاہ: اے تنکت کاہے کا ہو۔

فیضن: (ہنس کر) جو چاہو کہہ لو۔

آسمان جاہ: ہار سنگار کے پھول منگواؤ۔

جانی بیگم: اب فیضن کچھ کہیں گی تو تمہارے چہرہ کا رنگ زرد ہو جائے گا۔

آسمان جاہ: اب نیا گل کھِلا چاہتا ہے۔

جانی بیگم: ہلدی کی گرہ پاکے تم بھی پنساری بن جاؤ۔

آسمان جاہ: اِس وقت نرگسی کباب کھانے کو جی چاہتا ہے۔

جانی بیگم: ہندو آج بسنت کی پوجا کریں گے۔

آسمان جاہ: مجھ کو تو یہ ٹیسو کی جورو جھنجیا معلوم ہوتی ہے۔

راوی: اِس پر پھر فرمایشی قہقہہ پڑا۔ ان دو کے سوا اور کسی نے زبان نہیں کھولی۔ ضلع جگت کیا جانیں۔ مگر اِن دونوں شوخ و طرار معشوقوں کی زبان نہیں رُکتی تھی اور اُن کی انوکھی باتیں دُنیا بھر سے نرالی تھیں۔

مغلانی: برات چوک پہنچ گئی۔

حشمت بہو: یہ کون خبر لایا۔؟

مغلانی : جو برات دھوم کی ہوگی وہ چکر کھا کے آئے گی۔
حشمت بہو : ہماری برات بڑی دھوم کی تھی۔
جانی بیگم : تمہاری برات یا تمہارے میاں کی۔
آسمان جاہ : ہم اور وہ ایک ہیں۔ حد سے زیادہ اشتیاق ہے۔ اتنی دیر تک نہیں دیکھا تڑپ رہی ہوں۔

دل ہمارا تری نظر ہے
تو تو پیارے بے خبر ہے

مبارک محل : اس وقت بسنت پر خوب کہار
حشمت بہو : ایک بسنت لیے پھرتی ہو۔ ایک بسنت کیا ہے۔
مبارک محل : ہاں ہیں تو طبیعت دار اور بڑی طرار۔

خبریں برابر آنے لگیں کہ برات اس دھوم سے نکلی ہے کہ آج تک اس شہر میں ایسی برات کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ایک نئی بات یہ ہے کہ گوروں کا باجا ہے۔ ہزاروں آدمی باجا سننے کے لیے آئے ہیں اور چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔ ایک ایک کمرا چوک میں آج دو اشرفی کرایہ پر نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ رنڈیوں کے کمرے میں بڑے بڑے ثقہ برات دیکھنے کے لیے گئے کئی شہزادے اور کئی حکام انتظام کرتے آتے ہیں۔

اب سنیے کہ گپیں اڑنے لگیں۔ ایک نے آن کر کہا۔ سنا کہ نئی روشنی برات کے ہمراہ ہے۔ جس کو گاس لیٹ بولتے ہیں۔
آسمان جاہ : کیا گاس لٹ واہ ہے۔
مہری : کیا جانے کیا نگوڑا نام ہے۔
آسمان جاہ : اس روشنی اور اس روشنی میں کیا فرق ہے۔
مہری : اے ہے حضور زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن ہے اور روز روشن ہے۔ رات کیسی۔
مغلانی : واہ وا۔ نئی روشنی ہے۔ اور وہ روشنی کون ہوتی ہے۔ جس سے رات بالکل تاریک نظر آتی ہے۔
مہری : وہ روشنی ؟ اچھا پھر دیکھ لینا۔ ہم کو کیا۔

آسمان جاہ : ہمیں ایک شعر یاد آیا۔

ابلہی کو روز روشن شمع کافوری نہد
زود بینی کش بشب روغن نباشد در چراغ

مہری : آپ یہ شعر یں جو گائیں حضور کے سوا اور کون سمجھ سکتا ہے۔ کوئی پڑھا لکھا ہو تو سمجھے۔

ایک بولی سُنا کہ برات کے ساتھ جھاڑ بھی ہیں۔ اللہ جانے کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے۔ دیکھ ہی لیں گے۔ اب کچھ دیر تو ہے نہیں۔ اب باقی کئے گھنٹے رہے۔

مصاف پلونا

بیا ساقی آن آب ظلمات رنگ — بجوئے دبیار آب حیوان بچنگ
بدان آب روشن بصر کن مرا — دریں زندگی تازہ ترکن مرا

می کو نقبوائی مے خوارگان
کند چارۂ کار بیچارگان

روس کے لشکر جرار نے رفتہ رفتہ ہر طرف سے قلعہ پلونا کو محصور کر لیا۔ یورپین ٹرکی کے قریب کل فوج جو اس طرف خیمہ زن تھی مثل سیلاب اُمڈ آئی اور یکے بعد دیگرے صفیں آراستہ کر کے آمادہ جنگ ہوتے ترکوں کی اور کسی وقت میں اس سے زیادہ نازک حالت نہ تھی۔ غنیم جوق جوق جمع کوچہ گریز بند۔ ہر سمت سے قلعہ محصور اور طرہ یہ کہ سامان رسد ندارد۔ بالکل سناٹا۔ اور گولہ بارود بھی کافی نہیں۔ روسی برق دم۔ فوج نئی نوجوان بھرتی افسر اعلا سے اعلا۔ ہر ایک آزمودہ کار۔ سپاہی جرار۔ سامان لیس کھلا ہوا میدان اونچا مقام۔ شہنشاہ روس تار پر تار بھیجتے تھے کہ جس قدر فوج ہو سب پلونا کی طرف روانہ کی جائے۔ آزاد کی رائے تھی کہ اگر قلعے سے نکلنے کا قصد ہو تو اس زور و شور اور جوش و خروش سے حملہ کیا جائے کہ محاصرہ توڑ کر نکل جائیں اور کل فوج ایک دم سے اس قلعہ کو چھوڑ کر نکلے تاکہ زیادہ حصہ فوج محفوظ رہے۔ بعض کی رائے تھی کہ دو تین جانب سے حملہ کیا جائے جس طرف روسی کم طاقت پائے جائیں اُسی طرف کل فوج حملہ کر دے۔

آزاد پاشا نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ اگر دو یا تین جانب سے حملہ ہوا تو روسی فائدے میں رہیں گے۔ روسی فوج ہماری سپاہ سے دو چند ہے اور جس قدر عرصے تک وہ لڑ سکتے ہیں اس کے نصف عرصے تک بھی ہم میدان میں قدم نہیں جما سکتے۔

آزاد: اب آج کی کارگذاری پر کل جنگ روم و روس منحصر ہے۔

کرنل: اور آج کا حال ظاہر ہے۔ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔

ایپلٹن: خدا خدا کرکے ہم تو اب ذرا اچھے ہیں۔

آزاد: آپ اس کالم کی کمان لیں جس کے افسر نے گولی کھائی ہے۔

اس تقریر کے بعد آزاد نے باآواز بلند اسپیچ دی۔ وھو ہذٰا۔

پس از نام دارندۂ مہر و ماہ　　که اندیشه را سوئی او نیست راہ

خداوند فرمان و فرمان بران　　فرستندۂ وحی پیغمبران

بران بود رایم که عزم آورم　　بگوپال باپیل رزم آورم

تمایم بگنتی یکے دستبرد

که گردوز پولادمن کوه خرد

ایہا السامعین یہ بات مثل مہر نیمروز روشن ہے کہ اس مصاف عظیم میں سلطنت رفعیہ و جلیلہ عثمانیہ ہمہ تن مصروف ہے اور روم کے ہر فرد بشر کے دل سے لگی ہے کہ جس طرح ممکن ہو فوج روسیہ پر غلبہ پائے۔ غازیاں دیں اور حامیاں ترک دامے درمے قدمے سخنے تلے بیٹھے ہیں کہ ترکوں کا ہاتھ بٹائیں۔ دل و جان سے مدد دیں۔ عورتیں تک زیور اور اسباب بیچ کر مدد کرتی ہیں۔ روسیوں کی حالت پر غور کرو۔ مس کلیرسا نامی ایک لیڈی عین میدان جنگ میں آئی سپہ سالاروں کی طرح لڑی۔ پس ہم لوگ مرد ہو کر اگر قدم پیچھے ہٹائیں تو مقام حیف ہے پس یہ سمجھ لو کہ تلوار کے سایہ میں باغ جناں ہے۔ اگر جان گئی تو روضۂ رضوان میں قیام ہوا اور اگر بچ گئے تو دنیا میں نام ہوگا۔ اور ملک سرخرو رہے گا۔ قاعدین پر مجاہدین کو شرف ہے۔

The beat heraldry the pump of Power and all that beauty a that Wealth ever gave. Await alike the inevitable hour. The paths of glory lead but to the grave.

اگر زندہ رہے اور اپنے ملک کے کام نہ آئے تو ایسی زندگی پر تین حرف۔ اس میں تو شک نہیں کہ روسی اب غالب ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن اپنی طرف سے ہم کو سعی بلیغ کرنی چاہیے۔ آئندہ یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

من طریق سعی مے آرم بجا
لیس للانسان الا ما سعیٰ

ہمت مرداں مدد خدا۔ اب ہم کو لازم ہے کہ خدا سے یہ دعا مانگیں کہ جو امر روم کی بہبودی کا باعث ہو وہ ظہور پذیر ہو۔

من بندہ چہ دانم کہ چہ می باید خواست
دانندہ توئی ہر آنچہ دانی آن دہ

بحر روم کے نہنگ، بحر آشام آزاد فرخ نہاد کی ہر سمت دھوم تھی ہر طرف سے نعرۂ خوشی بلند تھا۔ لطف جنگ لطف شادی سے دو چند تھا۔ سپہ سالار فوج روم بیٹھ ٹھوکتے جاتے تھے۔ اور افسران نامی گرامی ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔

سپہ سالار: آزاد تم مارشل بزیں سے بھی بڑھ گئے۔ شاباش۔

کرنل: واہ ری سپاہ ترکی۔ ع

ایں کار از تو آید و مردان

چنیں کنند۔ فاقہ کشی کے بعد اس جوانمردی سے لڑنا کارے دارد۔

کپتان: شکست اور فتح تو قسمتوں سے ہے۔ لیکن یہ جنگ مدت العمر تک یادگار رہے گی۔ فاقہ کرکے لڑنا خالہ جی کا گھر نہیں۔

آزاد: یہ کیا سبب ہے کہ دفعتاً گولہ اندازی غنیم نے موقوف کر دی۔ خدا جانے کس فکر میں ہے آج کی تاریخ (۹ دسمبر) یادگار رہے گی۔

کرنل: ایسے معرکہ جنگ کریمیا کے بعد شاذ ہی ہوئے ہوں گے۔

آزاد: میدان تو غنیم ہی کے ہاتھ رہے گا مگر کوئی فرد بشر دنیا میں ایسا نہیں جو ہمارے سپاہیوں کی نسبت کلمۂ توہین زبان پر لائے۔

یہ سب باتیں ہو ہی رہی تھیں مگر کسی جنرل کو یہ خبر نہ تھی کہ چند ہی روز کے بعد سپہ سالار پلونا اور آزاد پاشا کی جوانمردی اور بسالت ساری خدائی میں ضرب المثل ہوگی اور اخباروں

کے کالم اُن کی توصیف و تعریف سے مملو اور رطب اللسان ہوں گے۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کے ایک مشہور اخبار میں یہ عبارت درج تھی۔

پلونا میں ترکوں کی نہایت آراستہ سپاہ تھی۔ آزاد پاشا کا نام تمام جہاں میں ہمیشہ روشن رہے گا اور سارے عالم کے سپہ سالاران افواج میں بہت معزز اور بڑے درجے کے سپہ سالار شمار ہوں گے۔ اُنھوں نے اپنی فوج قلیل سے روسیوں کی فوج کثیر پر حملہ کیا اور اُن کی جانب نکل جانے کا ارادہ کیا، اور ترکوں کی فوج گو فاقہ کشی سے نہایت مجبور ہو گئی تھی مگر اس نے ایک خونخوار حملہ روسیوں پر کیا اور گارد کے سپاہیوں کو اُن مورچوں میں قریب نیست و نابود کر دیا۔ اُن مورچوں کو فتح کر لیا۔ مگر یہ فتح عاریتاً تھی۔ روسیوں کی باٹری ترکوں کے ہاتھ آ گئی اسی سے اُنھوں نے روسیوں پر گولوں کا مینھہ برسایا۔ روسیوں نے زیادہ فوج سے حلقہ کیا تو پھر خوب سخت جنگ ہوئی اور کئی گھنٹے تک معرکۂ رزم گرم رہا اور بڑا کشت و خون ہوا۔

آزاد پاشا نے روسیوں کے مورچوں پر یورش کی مورچوں کو فتح کیا اور چند توپیں بھی چھین لیں۔

روسیوں کو تین روز قبل معلوم ہو گیا تھا کہ آزاد پاشا کے پاس رسد بالکل نہیں رہی۔ وہ قلعہ سے نکل کر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یکشنبہ کی شام کو روسیوں کو خبر پہنچی کہ آزاد پاشا اپنی فوج دریائے دودھ پر جمع کرتے ہیں۔ اور رات کو جنرل اس کو بلوف نے اس خبر کی تصدیق کی فکر کی۔ چنانچہ صحیح حقیقت دریافت ہوئی کہ ترکوں نے خاموشی سے کرشنا کے تمام دمدموں اور مورچوں کو کوہ گربن ہل پر چھوڑ دیا اور کل سات بجے صبح کو قدیم اور جدید پل دودھ سے ہو کر جس کو اُنھوں نے تیار کر لیا تھا اور جو مورچہ روسیوں کی شمالی جانب تھے اُن پر حملہ کیا اور شہنشاہی گارد کے سپاہیان کریمیا کو تہ تیغ کر دیا۔

یہ حملہ ترکوں کا بڑے جوش و خروش سے ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا روسیوں پر برق یکایک گر پڑی۔ ترکوں نے اپنے اس حملہ میں کامیابی حاصل کی۔ اور ایک کامل توپخانہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں ترک محاصرہ کی دوسری لین اور سو توپوں کے فیر کے نیچے تھے۔ گرینڈولا نے ان توپوں کے پھیر لینے کا مصمم ارادہ کر لیا جو ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ بعد اس کے سنگینوں کی لڑائی شروع ہوئی جو پاؤ گھنٹے تک جاری رہی۔ جس میں بہت سے آدمی مجروح اور مقتول ہوئے گویا ترکوں کو شکست ہوئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر دریائے دودھ کی جانب چلے گئے۔ روسیوں کی فوج

پیدل اور توپخانوں نے اُن کا تعاقب کیا۔ ترکوں نے دریا کے کنارے ایک جائے پناہ قرار دے کر روسیوں کی توپوں کا جواب دیا۔ ساڑھے بارہ بجے تک لڑائی رہی۔ اس کے بعد دونوں طرف سے لڑائی ملتوی ہو گئی۔

اب سُنیئے کہ آزاد پاشا فرس خوش عناں پر سوار ہو کر اس قصد سے چلے کہ کسی نہ کسی راستے سے نکل بھاگیں اور اگر ممکن ہو تو کل فوج کو بھگا لے جائیں۔ اس وقت اِن کی سج دھج قابلِ دید تھی۔

وہ مرصع ہے تیغِ زیبِ کمر
فتح و نصرت ہیں جس کے دو جوہر
ہو یقین دیکھ کر وہ برق جمال
پہلوِ آفتاب میں ہے ہلال

سپہ سالاروں نے ان کو روکا۔ کہا روسیوں کا لشکر ظفر پیکر چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوتے ہے اور اب باڑھ پر باڑھ پڑ رہی ہے۔ دس پندرہ ہزار کیا معنی اگر ایک لاکھ آدمی اس وقت باہر نکلنا چاہے تو بھی یقین نہیں کہ ایک آدمی تک بچ سکے۔ آگ برس رہی ہے۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ ایک گولا آن کر پھٹا۔ اور جس مقام پر یہ لوگ مشورہ کر رہے تھے وہیں پھٹا تو بہتر ٹکڑے۔ آزاد پاشا بھی زخمی ہوئے۔ مگر گھوڑے سے نہ اُترے۔

کرنل: آہ آہ۔ گھوڑے سے اُتر پڑو بھائی۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔

کپتان: ڈاکٹر حاضر ہیں۔ مگر یہ گھوڑے سے تو اُتریں۔

آزاد: اب تو آزاد گھوڑے کو نہ چھوڑے گا۔

یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب
سلطان عشق کی یہی فتح و شکست ہے

حسن آرا بیگم کا حکم ایسا نہیں کہ ہم اس کی تعمیل نہ کریں۔

کرنل: ہم لوگ تو یوں بھی آپ کو صلاح نہ دیتے کہ اس آگ میں پھاند پڑیئے اب تو اور بھی صلاح نہ دیں گے۔ یہ مقتضائے مصلحت نہیں۔

گرچہ کس بی اجل نخواہد مرد
تو مرو در دہان اژدرہا

مانا کہ اب غلبہ روسیوں ہی کا نظر آتا ہے مگر عقل سے اب بھی ہاتھ نہ دھونا چاہیے۔ خدا حافظ و ناصر ہے۔

جنگ کی گرمی بازار تھی۔ گولوں اور گولیوں کی بوچھار تھی۔ سروں کی جھڑی لگی تھی۔ میدان مصاف نمونہ قیامت کبریٰ تھا۔ بلکہ ہنگامہ رستخیز اور معرکہ ستیز قیامت کو بھی شرماتا تھا۔ خبر آئی کہ جنرل گوکر بیڑا اٹھا کر آئے ہیں کہ کل فوج پلونا کو اسی قلعہ میں ذبح کروں گا۔ آزاد اس فقرے پر سخت خشمگیں ہوئے اور مارے غصے کے بدن تھر تھر کانپتا تھا۔ طیش کھا کر یہ اشعار زبان پر لائے۔

چو من سر سوکید گوکر نہم — ازو کینہ وکید یکسو نہم
گر آید بخدمت چو دیگر کسان — نباشم برو جز حمایت رسان
وگر با من او در سر آرد ستیز — من وگردن کید و شمشیر تیز
ز پہلو بہ پہلو بگردان مش — نشیند بجای کہ نبشان مش
چو مرکب سوراہ دور آدرم — سر تیغ بر فرق فور آدرم

چو از فور فوران ربایم کلاہ
سوے خان خاقان گرایم سپاہ

اب یہ ترکیب ہوئی کہ اتواپ رعد آہنگ کی صدا سے زمین کو لرزہ آگیا۔ سچ مچ کا بھونچال۔ دائیں دائیں۔ دھنا دھنا۔ گولہ اندازوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ یہاں تک کہ تصادم اتواب سے دور تک زمین ہلنے لگی۔ یہ شعر حسب حال تھا۔

زیر زمین تو گاؤ زمین کو نہ تھا قرار
تھرا رہا تھا تو رفلک وقت گیر ودار

روسیوں نے کوشش موفور کی کہ جس طرح ممکن ہو۔ قلعہ کے اندر داخل ہو جائیں۔ تین گھنٹے تک پچیس ہزار آدمی دیوار کے ایک حصے پر گولے برسایا کیے۔ تین گھنٹے کے بعد دیوار عنشق ہو گئی۔ دیوار کا شق ہونا تھا کہ سپہ سالار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور مشورہ ہونے لگا کہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ چلیں۔

سپہ سالار : اب ہمارا قدم نہیں ٹھہر سکتا۔ ہمارے نزدیک بھاگ چلنا مناسب ہے۔ ایک دم سے کل فوج دڑاتی ہوئی نکل پڑے۔ ہر چہ بادا باد۔

آزاد : ابھی نہیں ذرا تامل کیجیے۔ جلدی کیا۔

کرنل : اب تامل سے کیا ہوگا یا تو گرفتار ہو جاؤ یا نکل چلو اگر نکل گئے تو فہوالمراد ورنہ اسیر ہو جائیں گے۔ پس مزیدے براں نیست۔

آزاد نے دیوار کے اس حصّے کی طرف کئی توپیں لگا دیں۔ اور گولہ اندازوں کو حکم دیا کہ گولے اُتارنا شروع کرو۔ روسیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سمجھے تھے کہ دیوار کے پھٹنے سے ترکی سپاہ مایوس ہو کر صلح کا پیغام دے گی اور لاکھوں ترک گرفتار ہو جائیں گے۔ مگر قضیہ بالعکس نظر آیا۔

اب سنیے کہ گو اب روسی کسی قدر خود مایوس ہو گئے تھے لیکن سپہ سالار ترک نے قطعی حکم دے دیا کہ سب فوج بھاگنے کے لیے تیار رہے۔ اسی دم روس کے جاسوسوں نے اپنے لشکر میں یہ خبر پہنچائی۔ کہ سپہ سالار فوج نے آخری حکم دیا ہے کہ فوج اور قلعہ روسیوں کے حوالہ کر دیا جائے اور ٹھان لی ہے کہ پناہ مانگیں۔ روسیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے اور حوصلے بڑھ گئے۔ فوج پیادہ آہستہ آہستہ پل کی جانب بڑھی اور پل پر پہنچ کر چند آدمی بطریق سفیر ترکوں کے پاس بھیجے اور منجانب سپہ سالار ایک خط پیش کیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ اب تمہاری قضا تمہارے سر پر کھیل رہی ہے۔ کوچہ گریز سب بند ہیں۔ اگر فوج باہر آئی تو گویا اجل کے پنجے میں پھنس گئی۔ اگر اندر رہی اور قلعہ ہی سے لڑا کی تو تابکے فاقہ کر کر کے مر جائیں گے اور خاک فائدہ نہ ہوگا اس سے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار رکھ دو، اور اطاعت روس قبول کرو۔ اس کے بعد ایک روسی کرنل ستر آدمیوں کو لے کر پلونا میں آیا اور سپہ سالار سے گفتگو کرنے لگا۔ کہا کہ اب بہتر یہی ہے کہ جہالت سے کام نہ لو۔ آخر کار صلح کی یہ شرطیں روسیوں نے قرار دیں۔

اولاً : کل فوج ہتھیار رکھ دے اور روسی سپاہی وہ ہتھیار اُٹھالے جائیں۔ تاکہ پوری پوری طمانیت ہو کہ آئندہ ترکوں کی جانب سے کوئی شخص فساد نہ کرے گا۔

ثانیاً : پلونا خالی کر دیا جائے اور فوج و افسران روس باستثنائے چند اشخاص باغی کے زیر حراست سپاہ روس رہیں۔

دلہای گرکینہ چرم ازروش

درآورد مغز جہاں را بجوش

زشوریدن طبنک ـــــ زخم ریز

دماغ فلک سفہ از زخم تیز

دل ترکتازان درآن دار دگیر

برآورد دہ از نای ترکی نفیر

طرفیں سے گو بڑے جوش کے ساتھ گولہ اندازی ہوتی تھی۔ روسیوں کے دل شیر کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا اور اس مصاف عظیم کے بعد ہمارے نام فتح لکھی جائے گی اور ترک جان پر کھیل گئے تھے ان کو اپنے بچنے کی ذرا امید نہ تھی لہذا ٹھان لی کہ۔ ع

دست بگیر و سرِ شمشیرِ تیز

زدہ لشکر روم رایت بلند

زمین در کمان آسمان در کمند

آزاد پیٹتے جاتے تھے کہ ہاں شیرو۔ خبردار۔ قدم آگے ہی پڑے پیچھے نہ ہٹے در فردوس اس وقت غازیاں دیں کے لیے وا ہیں۔ حوران بہشتی جام شراب لیے منتظر کھڑی ہیں ہاں غلامان ساقی کوثر بڑھے ہوئے گو خود اور زرہ اکثروں نے زیب بر و سر کیا تھا مگر قضا سے کوئی کہاں بھاگ سکتا تھا۔

چہ فائدہ زرزہ باکشاد تیز قضا

چہ منفعت زسپر باتفاق تیغ قدر

اگر زآہن و فولاد سودہ حصن کنی

حوالہ چوں برسد زو داخل بکو بدور

اب سُنیئے کہ روسیوں نے ایک سمت کی فوج تھوڑے فاصلے پر ہٹا کر چاہا کہ ترکی سپاہ اس راستے سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے تو دھوکہ دیکر گرفتار کرلیں کیوں کہ سپاہ روس تھوڑے فاصلے پر کمین گاہ میں غنیم کے یورش کی منتظر تھی۔

کرنل: ہمارے نزدیک اس راہ سے نکل جانے کی کوشش لازم ہے۔

آزاد : ہرگز نہیں۔ خوب غور کریجیے۔ فضول بات ہے۔
سپہ سالار : بے شک اس طرف سے نکل سکتے ہیں۔
آزاد نے اس امر پر بڑی بحث کی اور کہا کہ ایسے نازک وقت میں جبکہ ہماری فوج چوطرفہ سے محصور ہے روسی بلاوجہ اپنے حصّہ لشکر کو جو ایک کونا گھیرے ہوا تھا کیوں ہٹا دیتے اس سے پُر ظاہر ہے کہ وہ کمیں گاہ میں فوج لے گئے ہیں۔ لہٰذا بے سمجھے بوجھے دلیری کرنا دلیل حماقت ہے۔ نشان بالغ خردی نہیں اس پر بہت عرصے تک مشورہ رہا۔
کرنل : اچھا پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل جائیں تو نتیجہ نکلے۔ فوراً دریافت ہو جائے کہ کمیں گاہ میں ہیں یا عمداً کسی سبب سے ہٹ گئے۔
کپتان : ہم جانے کو مستعد ہیں۔ بسم اللہ۔
آزاد : ہم سب کے پہلے جانے کو آمادہ ہیں۔
سپہ سالار : ہم آپ کو نہ جانے دیں گے۔ اوّل تو زخمی دوسرے مقام خطرناک تیسرے جنرل نامدار۔
آزاد : آخر مرنا تو ہے ہی۔ جیسے اب مرے ویسے جب مرے۔

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
زجام دہر می کل من علیہا فان

اپیلٹن : اگر آزاد جائیں گے تو ہم بھی جائیں گے۔
آزاد : ہاں ضرور چلو۔ سپاہی کے لیے معراج یہی ہے۔
سپہ سالار : اچھا تو ایک تدبیر کی جاوے آپ لوگ اس طرف سے نہ جائیں بلکہ دوسرے راستے سے اور بھیس بدل کر۔
آزاد : اب یہ ہماری رائے پر چھوڑ دیجیے۔
کرنل : ہماری صلاح نہیں۔

رزق ہر چند بیگمان برسد
شرطِ عقل ست جستن ازدرہا
گرچہ کس بی اجل نخواہد مرد
تو مرو در دہان اژدرہا

یہ شرط عقل اور مقتضائے انسانیت نہیں کہ جان بوجھ کے جان دے۔ اس راستے سے جاؤ یا اس سے خاک فائدہ نہ ہوگا۔

آزاد: ع

روکے سے نہیں رُکے ہیں آزاد

ایپلٹن: ہم بھی تلے بیٹھے ہیں۔ چلیے!

آزاد اور ایپلٹن اور کئی سواروں نے اس موقع پر بیڑا اٹھالیا کہ دڑاتے ہوئے چلے جائیں گے اور خبر لائیں گے۔

آزاد نے کہا جب سے روس اور ٹرکی میں جنگ شروع ہوئی۔ کبھی ایسا نازک زمانہ نہیں آیا۔ جو کچھ فوجی کارروائیاں چند روز سے ہوئی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ روس کی کامیابی میں اب لوگوں کو شک نہیں رہا۔ اگر اب بھی جنگ رہی تو ٹرکی سلطنت کے حق میں اور بھی بُرا ہوگا۔ تمام فوج اور محمد پاشا کا ارادہ یہ تھا کہ پلونا کو مدد پہنچائے مگر اس فوج کی نسبت ہم نے سُنا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو اضطراب میں بے دیکھے بھالے بھرتی کیے گئے تھے۔ اُن کی تعداد تو بیشک زیادہ تھی مگر یہ لوگ بالکل ناتجربہ کار اور قواعد سے ناواقف تھے۔ مسعود پاشا کی فوج میں سپاہی اچھے تھے۔ محمد پاشا کی فوج گو عمدہ نہ تھی لیکن ہر طرح سے محاصرہ توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ترکوں کے پاس رسد پہنچنا بہت مشکل تھا۔ روسی رسد برابر آ رہی تھی ہر سمت سے۔ یہی صدا آتی تھی کہ ترکی کمزور ہو گئے۔ آدمی نہیں میسر آتے۔ اُن کا انتظام فوجی نہایت خراب ہے دوسری جانب روسیوں کو بہت کچھ سبق حاصل ہو گیا ہوگا۔ اب جو کارروائی کریں گے وہ خوب سمجھ کر احتیاط سے کریں گے۔ اس لیے کہ اُن کو کمال دقت اور ہزاروں مصیبت سے فتح نصیب ہوئی ہے۔ ہاں اتنی بات ہے کہ گو ترکی روسیوں کو نہ روک سکیں مگر روسیوں کو بہت جانیں ضایع کرنی پڑیں گی جب المید فتح کی ہوگی آگے بڑھتے چلے جانا کچھ آسان نہیں جس قدر روسیوں کی فتوحات ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر ان کو فکر لاحق ہوتی جاتی ہے اُن کو دقت یہ پڑے گی کہ کیوں کر از سر نو صوبجات یوروپین ٹرکی کا انتظام کریں۔

پلونا کے کل آدمی سوار اور پیادے اور افسر متفق الرائے تھے کہ اس طرح پر جان کو معرض خطر میں ڈالنا بالکل بعید از عقل ہے مگر آزاد نے ٹھان لی تھی کہ ضرور جائیں گے۔

اب سنیے کہ درویشان بلغارستان کا بھیس بدل کر آزاد پاشا چلے۔ اپلیٹن کو اپنے ہمراہ لیا، ان کو مرید بنایا۔ خود مرشد بنے۔ بلغارستان کے جنوب میں ایک گروہ درویشوں کا ہے۔ یہ لوگ نہ عیسائی ہیں نہ مسلمان۔ ان کو روسی بھی مانتے ہیں اور ترکی بھی ان کے خلاف نہیں ہیں۔ یہ لوگ مسلک صلح کل کے سالک ہیں۔ اس قطع سے حضرت آزاد پاشا چلے اور اپلیٹن کو ساتھ لیا۔

آزاد : عربی کے اشعار گاتے چلو۔

اپلیٹن : اب چپ چاپ چلے چلو ایسا نہ ہو کہ زیادہ بننے میں کھل جائے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے یہ نہیں کہ ایک پہلو پر نظر ڈالی اور خاموش ہو رہے اس میں دھر لیے جاؤ گے۔

ادھر کا حال سنیے کہ عثمان پاشا نے یہ تدبیر کی کہ تین طرف سے خفیف سا حملہ کیا۔ ایک طرف رومانیا کی فوج کی طرف مقام ایولس پر جو شمال و جنوب کے کونے میں تھا حملہ کیا اور دوسری جانب جنرل گرگو کے کالم پر اور خود بہت زبردست سپاہی لے کر مقام سترو بول پر حملہ آور ہونے کے لیے مستعد ہوئے۔ اس مورچے سے ان دو سڑکوں کی کمان ہو سکتی ہے جو ہوفیہ اور دون میں آکر ملی ہیں۔ فوج رومانیا کی طرف حملہ کرنے میں رک گئی اور جنرل گرگو کی طرف بھی ان کو کسی قدر زک ملی۔ مگر نہ ایسی کہ ترکی بالکل ضعیف ہو جائیں۔ سپہ سالار فوج کا دل چھوٹا نہیں پڑا۔

کرنل : دونوں طرف زک ملی۔

سپہ سالار : کچھ پروا نہیں زک بھی بجائے فتح کے ہے۔

کرنل : جہاں خود سپہ سالار کی کمان ہو وہ اچھا مقام ہے۔

علیقو پاشا : جنگ ساڑھے سات بجے سے شروع ہوئی اور اب دو گھنٹے کامل گزر گئے اور فائدہ کی صورت نظر نہیں آتی ؎

ما کار خویش را بخداوند کارساز
بسپردہ ایم تا کرم او چہا کند

جو کچھ ہو وہ ہو۔ اب تو سر پر آن پڑی ہے۔

اس معرکہ دار و گیر کے وقت عطوفت پاشا پینتیس ہزار آدمی لے کر پلونا سے دو میل کے فاصلے پر آن پہنچے اور قصد کیا کہ تھوڑی دیر دم لے کر پلونا کی سمت روانہ ہوں مگر روسیوں نے ان کو دم نہ لینے دیا اور فوراً ادھر بھی میدان رستخیز گرم ہوا۔

عطوفت پاشا : ہم بیڑا اٹھا کر آئے ہیں کہ پلونا کی فوج سے ملیں۔ اگر اس مقام پر رہ گئے تو

آنا نہ آنا یکساں ہو گا۔

افسر: بافعل تو اس جنگ کو ختم ہونے دو۔

اس جنگ کا خاتمہ محال تھا۔ دیر تک گرما گرمی سے جنگ ہوتی رہی اور عرصے تک دونوں فریق برابر رہے۔ معلوم نہیں تھا کہ کس کی فتح ہوگی۔ پہلے ہی دھاوا کر دیا۔ یہ مورچہ دس بجے سے شروع ہوا۔ اس وقت تک بہ نسبت ترکوں کے روسیوں کے سپاہی بہت کام آئے تھے۔ ترک اس خوبصورتی سے لڑتے تھے کہ غنیم زک پر زک پاتا تھا۔ ترکوں کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اور عطوفت پاشا انواع و اقسام کی باتوں اور ترغیب دلانے والی نصیحتوں سے اور بھی ان کا دل بڑھاتے تھے اور ترکی نعرے پر نعرے بلند کرتے تھے۔

ایک: خدا نے چاہا تو اسی ہلّے میں فتح ہے۔

دوسرا: ہم بھی تلے ہوئے ہیں۔ تلوار پکار رہی ہے۔ ؏

بڑھیں حضور بڑھیں خوش غلاف ہم بھی ہیں

عطوفت: روسی فتحیاب نہیں ہو سکتے اور وجہ یہ کہ روسیوں کی زیادتی اور تعصب تواریخ دیکھنے سے بخوبی ثابت ہے۔ علاوہ بریں جنگ حال میں جو کچھ حرکات و افعال اور پست ہمتی ان سے سرزد ہوئی بخوبی ظاہر ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ ترکوں کے دشمن ہیں انھوں نے بھی روس کی زیادتی اور ظلم کو تسلیم کیا۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت کامل اور کیا ہوگا۔

تیسرا: اور اللہ ظالم کا کبھی جنبہ نہیں کرتا۔

چوتھا: ظالم کا تو دشمن ہے خدا۔

پانچواں: پھر ہماری مدد کرے گا۔

چھٹا: ہم اس کے قائل نہیں۔ خدا نے کل امور انسان کے تعلق رکھے ہیں۔ لڑو تم اور ذکر خدا کا کرو۔ یہ فضول امر ہے۔ خدا کسی کا برا نہیں چاہتا۔ ہاں ہم پر فرض ہے کہ ضعیف اور کمزور کو طاقت۔ اور شہ زور ظالم کے پنجہ سے مظلوم کو مصون و محفوظ رکھیں۔

اے زبردست زیردست آزار — گرم تا کے بماند ایں بازار

بچہ کار آیدت جہاں داری — مردنت بہ کہ مردم آزاری

عطوفت: اب اس وقت برابر دھاوا کر دو۔

افسر: ہاں ہماری بھی یہی رائے ہے کہ ایک دم سے یورش کی جائے ورنہ فرض کیجیے کہ ہم بھی غالب ہو گئے تو کیا، ہٹنے والے وہ بھی نہیں ہیں۔ مگر وہ بات کرنی چاہیے کہ کسی ترکیب سے پلونا والوں کی فوج سے ملیں۔ بس

ورنہ اس طرح پر گولہ اندازی ہوا کی تو کیا فائدہ فضول محض۔

اس رائے سے اکثروں نے اتفاق کر لیا اور فکر یہ ہوئی کہ جس طرح ممکن ہو حملہ آور ہو جائیں۔ انشاالله اس دھاوے میں ضرور کامیابی ہوگی اٹھارویں صدی سے سلطنت ترک میں رفتہ رفتہ ضعف آتا گیا سلطنت کا قبضہ کم ہوتا گیا آج اُس کا معاوضہ لیا جائے گا۔

اتنے میں سب نے مل کر دھاوا کر دیا۔ اور میدان جنگ یلان پیلتن کی تلواروں کی چمک سے نمونہ محشر تھا۔ جو تلوار تھی خون آشام۔

گہہ چرخ پہ روشن صفت کاہکشان تھی

کہہ شرق میں شکل مہ نو جلوہ کنان تھی

روسیوں نے ترکوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ اور گو اُن کے آدمی بہت کام آئے مگر مجبور ہو کر ترکوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس پر ترکوں کے دل چھوٹے پڑ گئے۔ اور دوسری بار پھر حملہ کیا۔ اس حملہ میں بھی کئی ہزار روسی کام آئے ترکوں کا اب کی پھر کم نقصان ہوا۔ مگر روسیوں نے اس جرات کے ساتھ مورچہ پکڑا کہ ... یوں پر آدمی گرتے جاتے تھے مگر ترکوں کو آگے نہ بڑھنے دیا اور مجبور ہو کر ان کو پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب اُنھوں نے عزم بالجزم کر لیا کہ تیسرے حملہ میں قدم پیچھے نہ ہٹائیں گے۔ روسیوں کو سخت مشکل پڑی اگر ان آدمیوں میں سے کسی کو بلائیں تو ادھر ضعف ہو جائے گا۔ اور بغیر مدد کے اب کام چلنا محال ہے۔ لہٰذا سپہ سالار افواج روس سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے حکم دیا کہ دس ہزار آدمی اس فوج کی کمک کو جائے مگر یہ معدودے چند اس قابل نہ تھے کہ کافی مدد دے سکتے۔ ترکوں نے اتنی مرتبہ حملہ کر کے ناکامی حاصل کی تو بہت گھبرائے مگر عطوفت پاشا نے ان کو دلاسا دیا اور کہا۔

ہر چیز کہ دل بدان گراید

گر جہد کنی بدست آید

لیس للانسان الاماسعی۔ کوشش منجانب بندہ اور کامیابی فضل خدا پر منحصر ہے۔

اس وقت ہم سب پر فرض ہے کہ جان کو کچھ مال نہ سمجھیں اور اب کی حملے میں غنیم کو ہٹا کر ڈراتے ہوتے چلے آئیں۔

اس اثنا میں روسیوں نے پیغام بھیجا کہ اب جنگ موقوف کر دی جائے روس اور ترک میں صلح ہوگئی اور شرائط صلحنامہ یہ لکھے گئے۔

1۔ بلگیریا کی ریاست علاحدہ کر دی جائے گی اور اس کا حاکم ایک عیسائی ہوگا۔
2۔ اس حاکم کو شہنشاہ روس خود مقرر کریں گے اور یہ ریاست باجگذار ہوگی۔
3۔ رومانیاں اور مانٹی نیگرو اور سرویا کی ریاستیں خود مختار کر دی جائیں گی اور اُن کے ملک بڑھا دیے جائیں گے۔
4۔ باسنیا اور ہرزیگونیا کا نظم و نسق اُنھیں صوبوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔
5۔ خرچہ جنگ کا تصفیہ روس اور ترک باہم کرلیں گے۔

سپہ سالار نے حکم دیا کہ یہ جنگ موقوف رہے اور تا وقتیکہ کوئی رائے قطعی وزیر جنگ کی نہ معلوم ہو تب تک گولہ نہ چلے۔

اب آزاد کا حال سُنیے کہ یہ درویشانہ بھیس میں ابیلٹن پاشا کو ہمراہ لیے ہوئے چلے جاتے تھے کہ ایک رسالہ روس نے ان کو روکا۔ پوچھا تم کون ہو اور کہاں جاتے ہو۔

آزاد: درویش۔ بلغارستان کے شمال میں ایک مقام ہے۔ روپول وہاں کے باشندے ہیں ہم۔

روسی: اور ہم کو شک گذرتا ہے کہ تم جاسوس ہو۔

آزاد: شک گذرتا ہے تو ہم کو گرفتار کرو۔

روسی: اور نہیں کیا چھوڑ بھی دیں گے۔

آزاد: ع

اے بتو ظلم تمہارے نہیں کیا کیا دیکھے
سچ ہے اللہ جو دکھلائے وہ بندا دیکھے
یار ہنستا ہے مری آہ شرر افشاں پر
گھر کسی کا جلے اور کوئی تماشا دیکھے

روسی: یہ کون زبان ہے۔

آزاد: فرشتوں کی زبان ہے۔

روسی: فرشتوں کی زبان تم کیا جانو بیچارے۔

آزاد: واہ ہم حقانی آدمی ہیں۔

روسی: ہم کو جب جھالیے معلوم ہوتے ہو۔

آزاد : اس ٹھائیں ٹھائیں سے کیا مطلب ہے۔ اگر شک ہے تو ہمیں گرفتار کر لے جاؤ اور اگر شک نہیں تو رہا کر دو میں روس جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں لوگوں کو تلقین کروں اگر گرفتار کرو تو مجبوری ہے۔ ع

رہا کر دے مجھے صیاد اب فصل بہاری ہے

روسی : اچھا ہم کو یہ تشفی کر دو کہ تمہارے پاس کوئی کاغذ نہیں ہے تو رہا کروں۔

آزاد : ع

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

اپیلٹن : تلاشی لے لو۔

روسی : تم کون ہو۔ تم ان کے ساتھ کیوں ہو۔

اپیلٹن : یہ میرے مرشد ہیں ان سے علمی باتیں حاصل کرتا ہوں اس پر دو چار شریر روسیوں نے تلوار نکالی اور آزاد پر تلا ہوا ہاتھ لگایا معاً آزاد نے پیترا بدل کر تلوار اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور چھین کر پھینک دی۔ اُس نے جھلا کر دوسری تلوار ایک دوست سے لی اور آزاد کے سر کی طرف جھکا کر اُنھوں نے کیلی کی تو تلوار اچھل کے دس قدم پر گری کل ناظرین نے آزاد کی تعریف کی اور دو چار سپاہیوں نے جو خود انتہائے ظریف تھے ان کی بہت توصیف کی اور گلے لگایا۔

آزاد : ہم فقیروں سے ناحق لڑتے ہو۔

روسی : تم فقیر نہیں تم سپاہی ہو۔ اب تمہاری قلعی کھل گئی تم ہم سب کو جھانسا دیتے ہو۔

آزاد : یوں ہی سہی گرفتار کر لو نہ پھر۔

قسام بہشت دوزخ و عقدہ کشائے
مارا نہ گذارد کہ در آئیم زپائے
تا کے بود ایں گرگ ربائی در خاک
سر پنجۂ شیر افگن اے شیر خدائے

روسی : یہ کون زبان تم بول رہے ہو۔ اس سے ہم کو شک گذرتا ہے کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے ورنہ اس تقریر کی یہاں کیا ضرورت ہے اس زبان میں اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہے ہو۔ شاید کیوں ہے کہ نہیں۔

آزاد : یہ فارسی زبان ہے۔ ہیں عربی، فارسی، ترکی، روسی اتنی زبانیں جانتا ہوں۔

روسیوں نے باہم مشورہ کیا کہ ان کو گرفتار کرلیں یا جانے بھی دیں سب کو شش و پنج تھا۔ آزاد پاشا نے اپنی گفتگو اور بے پروائی سے ثابت کر دیا کہ ترکوں سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ روسیوں کو یقین ہو گیا کہ آزاد درویش ہیں روسیوں کے دشمن نہ ترکوں کے دوست لہٰذا ان کو رہا کر دیا۔ اور ان کے ساتھ ایبلٹن پاشا بھی رہا ہو گئے آزاد کو اس فوج کا حال مطلق نہ معلوم ہوا جو قلعے کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ ہر چند انھوں نے بڑی کوشش کی کہ اس فوج کا حال دریافت کریں مگر بے سود۔ آخر کار مجبور ہو کر ان کو واپس آنا پڑا۔ قلعے میں سب کو پورا پورا یقین تھا کہ آزاد پاشا زندہ نہ بچیں گے روسی ان کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالیں گے یا سیبیریا کے برفستان کو بھیج دیں گے۔ جب اس قدر عرصے کے بعد آزاد پاشا ایبلٹن پاشا کو ہمراہ لے کر قلعے میں مع الخیر داخل ہوئے تو ترکوں نے سخت استعجاب کیا حیرت ہوئی کہ ایسے نازک وقت میں ترکوں کے جاسوس کو روسیوں نے کیوں کر رہا۔ آزاد پاشا نے افسوس کے ساتھ بیان کیا کہ جس کام کے لیے گئے تھے۔ وہ پورا نہ ہوا آرزو نہ بر آئی۔ دل کی دل ہی میں رہی سپہ سالار نے حسرت کے ساتھ کہا کہ اب رسد بالکل نہیں ہے۔ فاقہ سر پر سوار ہے دانے دانے کو ترستے ہیں۔

نہ تو وانہ ہے قفس میں نہ ذرا پانی ہے
کیوں بے صیاد اسیروں کی یہ مہمانی ہے

آزاد : پھر اب تامل کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ روسیوں کی چاندی ہے ہم لوگوں کے ہاتھ سے اب قلعہ جاتا ہے۔

سپہ سالار : اس فوج کا حال بالکل نہیں معلوم ہوا۔ افسوس۔

آزاد : بس اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ ایک ایک چپے پر روسی موجود ہیں ان سے کوئی مقام خالی نہیں۔

سپہ سالار : تو تم نے ہمت ہار دی۔ سپاہی ہو کر ایسی باتیں۔

آزاد : کیا مجال، مرتے دم تک ہمت نہ ہاروں گا۔ اگر ہمت ہارنے والوں میں ہوتا تو ہندوستان سے اس قدر فاصلے پر ہرگز نہ آتا ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ مرد کہیں ہمت ہارا کرتے ہیں۔ کیا طاقت میں مستعد ہوں۔

کچھ دیر کے لیے لڑائی موقوف رہی۔ تو آزاد پاشا کو ایک شخص نے کئی اخبار دیے آزاد

نے پڑھے۔

"اگرچہ روسیوں نے ترک کو ظالم قرار دیا ہے اُن کے ظلم اور زیادتی کا بڑا شور وغل مچایا ہے اور ان پر اس کا اتہام لگایا کہ وہ عیسائی رعایا کے ساتھ بہت سخت گیری کرتے ہیں اور حاکم کو جو اپنے محکوم کی خبر گیری اور خیر اندیشی چاہیے اُس سے سراپا پہلوتہی کرتے ہیں اور اپنے فرض کے ادا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں مگر حالات ماضیہ اور واقعات زمانہ اور حال اُس کے خلاف پر شاہد عادل ہیں ایک مدت سے اس بارہ میں خوب خوب مباحثے ہو چکے ہیں جس سے ترک کا حلم اور انصاف پسند اور رحم دل ہونا کامل طور پر ثابت ہو چکا ہے مباحثات زمانہ ماضیہ کا ذکر کرنا محض بے سود ہے مگر میں اب دو تین باتیں جو بالفعل اخباروں میں نظر سے گذریں اُن کو تمثیلاً لکھتا ہوں۔"

ایک دوست نے ان کو ذیل کا فقرہ سُنایا۔

"اخبار لندن ٹائمز میں لکھا ہے کہ ایک اخبار قسطنطنیہ کا ارمینا نامی اس لیے بند کر دیا گیا کہ اس میں بر خلاف عیسائیوں کے آرٹیکل لکھے تھے اس خبر سے معلوم ہوا کہ ترک جنبہ داری کے عیب سے بالکل پاک ہیں اور عیسائیوں کی رفاہ اور خیر اندیشی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اخبار کے واسطے اس سے بڑھ کر اور کوئی سزا نہیں کہ بند کر دیا جائے اس میں اخبار کی بڑی ہتک اور بے آبروائی ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ حاکم اپنے محکوم پر اس قدر شفقت کرے اور اُس کے ساتھ بکمال نرمی اور رعایت پیش آئے اور رعایا اس درجہ ناحق شناس اور احسان فراموش ہو اور اپنے مُربی اور محسن کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے۔

گورنمنٹ ترک میں جس قدر یہود کو آرام حاصل ہے سوائے ترکستان کی حکومت کے اور کسی سلطنت میں ان کو آسایش حاصل نہیں اگر ترک میں تعصب مذہبی ہوتا تو یہود کو اُن کی سلطنت میں اس قدر آرام کیوں کر حاصل ہوتا جو لوگ دین اسلام سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دین اسلام اور مذہب عیسوی میں بہ نسبت مذہب اسلام اور ملت موسوی کے فرق بہت کم ہے قران مجید میں یہود کے حق میں بہت سے فقرات مذمت مثبت ہیں اہل اسلام اور عیسائیوں میں بہت کچھ ارتباط واتحاد رہا ہے مگر اسلام اور یہود میں ایسا اختلاط کمتر پایا جاتا ہے بایں ہمہ یہودیوں کو ترک کی عملداری میں بخوبی آرام وآسایش حاصل ہے حتی کہ ایک بہت بڑے پیش والے یہود متوطن آرمینیا سلطان کے حضور میں بعد ابتدائے جلسہ کے گئے تھے اور اُن

کی سر سبزی کے واسطے بہت دعائیں کی تھی جس صورت میں یہود کو ترک کی عملداری میں اس قدر
آرام ہو پھر کیوں کر خیال کیا جا سکتا ہے کہ عیسائی رعایائے ترک کو جو بہ نسبت یہود کے بہت
زیادہ اتحاد رکھتے ہیں اُن کی سلطنت میں تکلیف پہنچی ہو۔

۱۵ دسمبر 1827ء کو جنگ عظیم ہوئی اور ایک ایک منٹ میں ہزاروں کا خون ہونے لگا۔
ترکوں کے پاس مصالحہ تھا سب اس جنگ کے نذر کیا۔ تین طرف سے محاصرہ توڑ کر نکلنے
کی کوشش کی دور تک توپوں اور گولوں کی آواز جاتی تھی ایک طرف سے سپہ سالار گئے دوسری
جانب ایک اور پاشا تیسری سمت آزاد فرخ نہاد وہ دونوں تو بعد جنگ گرفتار ہو گئے۔ مگر آزاد
پاشا نے چھ گھنٹہ تک دس ہزار آدمیوں سے اٹھتّر ہزار آدمیوں کا مقابلہ کیا اور اس جوانمردی اور
لیاقت کے ساتھ لڑے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

بر آرم سگان بشیر افگنی — کہ باشیر بازیست گور افگنی
چہ دلہا ہی مرداں پر آرم زہوش — چہ خونہائے شیران در آرم بجوش
نہ پر طاس مانم نہ روسی بجائے — سر ہر دو را بسپرم زیر پائے
برا فرازم از روس اور ننگ را — در آتش نشانم ہمہ سنگ را

دگر گرگ و پر طاس را لشکرم
زپر طاسی و روس روبہ ترم

یہ اشعار آزاد کے حسب حال تھے۔ جب دست بدست لڑائی ہوئی تو آزاد نے اور بھی جوہر دکھائے
اور دو ہزار آدمی لے کر صاف نکل آئے یہاں سے آزاد پاشا مع فوج مارا مار روانہ ہوتے بعد
سخت کمال و خرابی بصرو خدا خدا کر کے قسطنطنیہ میں داخل ہوئے حضرت سلطان المعظم نے ان
کو یاد فرمایا۔ سلام ہوا تلوار دکھائی حضور ظل سبحانی نے اُن کی شمشیر گلو نواز کو چوم لیا اور دیر تک ان
کی تعریف کیا کیے۔

دوسرے روز حکم ہوا کہ آزاد پاشا کو اعلیٰ درجے کا تمغائے مجیدی عطا ہوا اور حضور خلیفۃ
الرحمانی نے اپنے دست مبارک سے ایک چرم پر پروانۂ خوشنودی مزاج لکھ دیا آزاد سے اقرار
کیا کہ مابدولت و اقبال تم کو بہت جلد عہدہ وزارت عطا کریں گے۔ اس خبر سے اور وزراء کے
سینہ میں شعلہ حسد مشتعل ہوا اور اُسی دن سے حضرت ظل سبحانی کو ان کی طرف سے بد دماغ کر دیا۔
جس گلی کوچے سڑک بازار کی طرف آزاد نکل جاتے تھے زن و مرد سب جھک جھک کے آداب

بجا لاتے تھے۔ مختلف اخباروں میں مختلف روایتیں درج ہوئیں اور ہر پرچہ اُن کی توصیف سے مالا مال تھا۔ ایک اخبار روم نے اُن کی نسبت یوں لکھا۔

شجاعتلو آزاد پاشا

جنگ روم روس کا نتیجہ جو کچھ ہو گا ابھی سے ظاہر ہے پلونا کی شکست غضب کی شکست ہے مگر اس معرکۂ عظیم میں آزاد پاشا نے وہ کارنمایاں کیا جو اور کسی جنرل روم یا سپہ سالار روس سے نہ ہو سکا۔ آفریں۔ اوّل تو پلونا پر اس قدر فوج قلیل سے جانا پھر سرخرو ہو کر فوج کو ہٹانا یہی کیا کم تھا مگر صرف اسی پر قناعت نہ کیا زخم کھا کر اس شجاعت سے پلونا کے باہر آئے اور اس بہادری سے محاصرے کو توڑا کہ جس قدر زیادہ تعریف کیجیے کم ہے حضور سلطان عالم و عالمیان نے بھی کمال قدر دانی کی جو شایاں سلاطین ذی جاہ ہے۔

سپہ سالار روس گو گرفتار ہو گئے مگر بہادری کے ساتھ لڑ کر گرفتار ہوئے اس سے یہ امر ظاہر ہے کہ ان کے مزاج میں اطاعت اور فرمانبرداری اپنے شاہ کی اور حب الوطنی بہ نسبت مارشل بزیں کے زیادہ تھی بلا سے کچھ فوج قید ہو گئی مگر جہاں تک ممکن تھا وہ کوشش سے باز نہیں آئے حقیقت میں یہ خیالات سپاہیانہ ہیں اور سپاہ گری کی شان یہی ہے اس لیے کہ صرف زبان سے سپاہ گری نہیں بلکہ دل اور ہتھیار سے ہے جب اُنھوں نے بڑھ کر جنگ کی یا تو اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُنھوں نے بزدلی سے بڑھ کر جنگ کی یا یہ کہ بغیر سوچے سمجھے اندھوں کی طرح جنگ کی کیونکہ موقع اور محل یہی تھا یہ کوئی بیوقوفی کی بات نہیں ہے اگر یہ نہ کرتے تو پھر کیا کرتے اور اس تھوڑے موقع میں اُنھوں نے اپنی ناموری حاصل کرتے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی یہ بات ثابت ہے کہ جب کسی معرکۂ جنگ میں فوج محصور ہو جاتے تو ممکن ہے کہ محاصرہ توڑ کر اور جنگ کر کے فوج نکل سکے بعض کی رائے ہے کہ محصور فوج بحیثیت مجموعی یکجا ہوتی ہے اور اس حالت میں وہ یکبارگی جس طرف قصد کرے محاصرہ توڑ کر نکل سکتی ہے اب قواعد کے بدل جانے سے اس کی بھی صورت دگر گون ہو گئی اب تو احتمال ہے کہ اگر فوج محصور ایک طرف بڑھنے کا قصد کرے تو دو طرف سے اس پر گولہ اندازی ہو سکتی ہے جس کیفیت سے کہ شاہزادہ فریڈرک چارلس نے مارسل بزیں کا مقام میڈس میں محصور ہو جانا بیان کیا

اسی طرح سپہ سالار روم کی فوج گھر گئی مگر آزاد کی شجاعت کے صدقے جب شاہزادہ بیروس نے میڈرس میں مارشل بزین کو گھیر لیا تو لوگ کہتے تھے کہ مارشل بزین کی فوج زیادہ ہے انھوں نے کیوں محاصرہ کیا مگر اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے مگر مارشل بزین کی وہ کیفیت تھی کہ جیسے کوئی شخص غار میں سے سر نکال کر باہر نکلنا چاہتا ہو۔ تو باہر سے اس کے اوپر ڈنڈے مارے چنانچہ مارشل بزین اسی طرح نکلنا چاہتے تھے اور میں باہر سے ڈنڈے مارتا تھا یہی حالت سپہ سالار کی ہو گئی تھی مگر انھوں نے اس نازک حالت میں یہ ترکیب کر لی تھی کہ تین طرف سے حملہ کیا تھا نہ کہ ایک ہی جانب سے۔

خیر اس ذکر کو جانے دیجیے۔ اب سُنیے کہ جس روز آزاد پاشا داخل قسطنطنیہ ہوئے تو سب کے پہلے بخطار است ہرمزجی بھائی کی کوٹھی پر آئے یہاں گھوڑے سے اُترے ہی تھے کہ یہ آواز ان کے کان میں آئی (بھلا گیدی. جاتا کہاں ہے نکالوں قرولی) آواز نے کہا۔ (جانے دینا جانے دینا)، آزاد کی آواز سُن کر خوجی بیقرار ہو گئے کمرے سے باہر آئے۔ اور آتے ہی قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہا۔ خدا گواہ ہے اس وقت جو مانگتا وہ مل جاتا ابھی کہتا تھا کہ خدا کرے آزاد آجائیں۔ خدا نے مُنہ مانگی مراد دی۔

آزاد : مَس میڈا کہاں ہیں۔

خوجی : آگئیں۔ اپنے گھر پر خوش و خرم ہیں۔

آزاد : الحمدللہ۔ الحمدللہ اور بھی کوئی ہے ساتھ۔

خوجی : ہاں مگر اُس پر نظر نہ ڈالیے گا۔ اینجانب کے ڈورے پڑتے ہیں۔

آزاد : واللہ یہ کہیے۔

خوجی : ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے کہ آزاد بھاوج بھی تجویز کر لائے۔

ہوا ہے یار جو سیر چمن میں ساتھ ساتھ اپنے
کبھی گُل کی طرف دیکھا ہے گاہے روئے خنداں کو

آزاد : اوہو ہو۔ مدت کے بعد برجستہ شعر آپ سے سُنا۔

خوجی : اب یہاں سے چلو بھائی۔

آزاد : اس پری کے ساتھ شادی تو کر لو

خوجی : اجی شادی جہاز پر ہو رہے گی۔

آزاد : ہرمزجی بھائی کو اطلاع دو اور بلاؤ۔

خواجہ بدیع دوڑ کر ہرمزجی کو لائے ہرمزجی اور آزاد گلے ملے فوراً ہی آدمی بھیجا گیا کہ مس میڈا اور مس کلیرسا کو اطلاع دی جائے اس خوش کن خبر سے سنتے ہی دونوں پریاں اچھل پڑیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چلیں آزاد کو دیکھا تو ادھر ان کی ادھر ان کی باچھیں کھل گئیں مس کلیرسا سے مصافحہ کیا میڈا کو دیکھ کر فرط طرب سے آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

میڈا : شکر خدا ہزار شکر خدا۔

کلیرسا : یہ کس کو امید تھی کہ آزاد صحیح و سالم آئیں گے۔

میڈا : خدا نے بڑا فضل کیا۔ یہاں تمہاری بڑی دھوم ہے ہر صبح کو اخباروں میں تمہاری تعریف پڑھتی ہوں بڑا نام پیدا کیا۔

ہرمزجی : جنگ کا حال تو مفصل بیان کرو۔

آزاد : ایک طومار ہے دفتر ہے گو تعلی کی لینا میری وضع کے خلاف ہے مگر صحیح عرض کرتا ہوں کہ اتنے افسروں میں آپ کے خادم کا نقطہ مقابل ایک بھی نہ تھا ہاں عطوفت پاشا اور اپیلٹن پاشا البتہ بڑے سپاہی ہیں۔ اور سپہ سالار نے بھی کار نمایاں کیا جس وقت گرفتار ہو کر حضرت زار کے روبرو لوگ ان کو لے گئے اس وقت جتنے افسران فوجی زار کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور نعرہ بلند کیا۔ شاباش پاشا شاباش مرحبا مرحبا۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ہرمزجی : یہ شکست بھی بمنزلۂ فتح ہے۔

آزاد : اس میں کیا فرق ہے۔ مگر اب روسیوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔

ہرمزجی : اب کام تمام ہوگیا۔ صلح ہو جائے گی۔

میڈا : گو ترکوں نے شکست پائی مگر تم تو فتح یاب ہوئے۔

ہرمزجی : انھوں نے ایک چاند سی بیوی پائی، ایک چاند سی بیوی ہندوستان میں ان کی چاندی ہے۔ چین ہی چین لکھتا ہے۔

آزاد : دل لگی نہیں ہے۔ ریاضت کیا ہے۔ جان لڑائی ہے۔

خوجی : ہونہہ۔ ہرمزجی کو ابھی بسنت کی خبر ہی نہیں ہے۔

ہرمزجی : پھر آج تو جلسہ ہو :

شراب سُرخ کا ساغر چلے ساقی لب جو پر
چمن سر سبز ہے باران رحمت کے تفضّل سے

مِلّیڈا: آج ہم تمہارے ساتھ ناچیں گے۔

آزاد: معقول۔ رقص کی تعلیم میں نے نہیں پائی ہے۔

کلیرسا: ہم تو سکھا دیں گے۔

خوجی: ایں چہ گفتگو کردہ شدہ، ایں کہ رسمش میم سین زیر سین و کاف لام رے بے سین الف ہست از شما چرا سخن ہائے التفات می نماید بگوئید و تو روبرو۔

آزاد: لو بھئی اب تو خوب فارسی بولنے لگے۔

خوجی: بولتے آپ ہوں گے اور (اب تو چہ معنی دارد) اچھی کب نہیں بولتے تھے۔

آزاد: تو مس کلیرسا آپ کے پسند آگئیں۔؟

خوجی: واللہ اس قابل ہے کہ ہر صبح کو اس کا سجدہ کرے۔ زلفِ دوتا بسیار مثل مار ست و سیاہ است و بلا ہست۔

خدا محفوظ رکھے دل کو اس اُفعی کا کل سے
نہیں ممکن سلامت چھوٹنا موذی کے جنگل سے

آزاد: یار ہم سے تم سے اب نہ بنے گی۔ بس بگڑ جائے گی، اگر تم دوڑے ڈالو گے تو ہماری دال نہ گلے گی۔

خوجی: تم ایک ہی اُستاد ہو۔

آزاد: مجھے بھی وہ گر یاد ہیں کہ.....

خوجی: (سر پیٹ کر) ارے غضب بھئی کہیں چھپانا نہیں، جس طرح مس روز کے ہاں چھپایا تھا۔

آزاد: بلم بردار اور ہمارا مقابلہ!

خوجی: (پھر سر پیٹ کر) ہائے ستم۔ وائے ستم۔ تمہاری معجز بیانی اور بھی ستم کرے گی۔ بھائی خدارا معاف کرو۔

تو وہ اِعجاز بیان ہے کہ تری محفل میں
شرم سے صورتِ حریم ہے مسیحا خاموش

آزاد: مس کلیرسا۔ خواجہ صاحب سے واقف ہو۔؟

خوجی: (آزاد کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) چُپ چُپ۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

آزاد: اچھا جاؤ چھوڑ دیا کیا یاد کرو گے۔

خوجی: لاحول ولاقوۃ۔ بات پیٹ میں نہیں پچتی۔

مس میڈا اس درجہ محظوظ و مسرور تھیں کہ جامے میں پھولے نہیں سماتی تھیں۔ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ باتیں ہوتے اس کمرے سے دوسرے کمرے میں گئیں اور وہاں آزاد کو بلایا۔ آزاد نے جاتے ہی لب لعل شکر خا کا بوسہ لیا اور مس میڈا نے اس بوسے کا جواب دیا۔ اس کے بعد پھر دیر تک بوس وکنار رہا۔ خوجی ادھر مس کلیرسا سے محبت اور الفت کی باتیں کرتے تھے۔

خوجی: ہمارا قاعدہ ہے کہ خوبصورت عورت دیکھی اور ریجھ گئے۔

مس کلیرسا: یہ قاعدہ ایک دن جوتے کھلوائے گا۔

خوجی: بہت خاصے بس اب رنگ جم گیا۔

مس کلیرسا: تم خدمت گار ہو کے ہم سے مقابلہ کرتے ہو۔

خوجی: جانِ من۔ غلام خدمت گار نہیں۔ آزاد مجھ ہی بدبخت کا لڑکا ہے۔ میرا نام اس لڑکے نے روشن کیا۔

تین دن تک آزاد پاشا قسطنطنیہ میں رہے مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ طور بے طور ہو گیا اور سلطانُ المعظم کا اُن کے ساتھ بکمال اعزاز اور ملاطفت پیش آنا کل اراکین کے دلوں کا نشتر ہو گیا۔ تمام وکمال پاشاؤں نے بمقتضائے رشک وحسد ان کی طرف سے حضرت ظلِّ سبحانی کے سامعۂ مُبارک کچھ ایسی باتوں سے بھر دیے کہ یا تو حضرت ظلِّ سبحانی کے آزاد کی نسبت وہ خیالات تھے کہ خود ان کو طلب کیا تھا۔ اور جب انھوں نے حسبِ معمول تلوار دکھائی تھی تو حضرت ظلِّ سبحانی نے ان کی شمشیر گلونواز کو بوسہ دیا تھا۔ دیر تک بہ نفس نفیس ان کی تعریف اور مدح کے کلمات سے بکمال خوشنودی مزاجِ عالی رطب اللسان رہے تھے۔ یوں حکم عالی نافذ ہوا تھا کہ آزاد پاشا کو اعلا درجہ کا تمغائے مجیدی عطا کیا جائے۔ خود حضرت خلیفتہُ الرحمانی نے اپنے دست مبارک سے ایک چرمی کاغذ پر سجل خوشنودی مزاج عالی اُن کو لکھ کر مرحمت فرمایا تھا۔ مزید بران بالمواجہہ یوں ارشاد ہوا تھا کہ انشا اللہ تعالےٰ مابدولت و اقبال تم کو بہت جلد منصبِ جلیلہ وزارت عطا

فرمائیں گے اور یا بالکل قضیہ بالعکس ہو گیا۔ بمقتضائے کمال حزم و احتیاط اُنھوں نے قسطنطنیہ کے کوچ و مقام کے ہر نیک و بد پہلو کی نسبت نہایت درجہ مدبرانہ فکر و تامل کر کے یہی بہت مناسب جانا کہ اب اعادہ وطن ہی اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ لاکھ کچھ ہو پھر میں اس ملک اور اس ملک والوں کا بیگانہ ہوں اور اگر جس قدر مدت اس ملک میں میرے قیام کو گذر گئی ہے، اس کی دوچند مدت بھی اور قیام کروں تو بھی غیر ملک کا آدمی سمجھا جاؤں گا۔ قطع نظر اس کے جس قدر اعزاز اور اکرام اور توقیر و وقار حضرت ظلِ سُبحانی نے ترکوں کے مقابلہ میں مجھے عطا فرمایا۔ اگر میں بے انصاف اور معیب نہ بنوں تو یہ بھی مافوق میرے مرتبہ کے ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ حاسدوں کی آتش حسد کے بجھانے کی کوشش میں موجودہ اور محفوظ متاع اعزاز و اکرام میں کوئی شعلہ آلگے تو پھر سوا ندامت اور افسوس کے کوئی نتیجہ نہ ہو اور برسوں کی جانفشانی اور جانبازی کے بعد جو اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اُس میں بھی خدانخواستہ کوئی امر خلاف پیش آجاوے تو حاسدوں کی عید ہو جائے اور دوستوں کے لیے روح کا تحفہ بجز افسردگی و پژمردگی کے میں کچھ بھی نہ لے جاسکوں۔

بالجملہ ان سب اُمور کا خیال کر کے ہر مزجی کی صلاح سے آزاد پاشا نے عزم سفر ہندوستان مصمم کر دیا۔ اور چونکہ آزاد پاشا کو محبت روم کی دلی اور سچی تھی۔ بایں ہمہ اندیشہ ناکی بھی چلتے چلتے کئی بار چاہا کہ کسی طرح ایک مرتبہ پھر باریابی دربار سلطان المعظم سے شرف اندوز ہوں۔ مگر رخنہ اندازوں کی رخنہ اندازی کی وجہ سے اپنے اس ارادہ میں اُن کو کامیابی نہ ہوئی۔ آخر 21 دسمبر 1877ء کو مع خواجہ بدیعا اور مس میڈا اور مس کلیرسا جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہندوستان ہوئے۔

فرہنگ فسانۂ آزاد

فسانۂ آزاد، الفاظ و محاورات اور ضرب الامثال کا خزانہ ہے۔ اس میں عربی، فارسی سنسکرت، ترکی، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد ان الفاظ کی ہے جو عربی اور فارسی سے اردو میں شامل ہوئے ہیں۔ ایسے تمام الفاظ مستند لغات میں مل جاتے ہیں۔ یہ مختصر فرہنگ صرف ان الفاظ پر مشتمل ہے جو عام طور پر کم استعمال ہوتے ہیں یا متروک ہو چکے ہیں۔ ایسے الفاظ کو معانی کے ساتھ فرہنگ کی صورت میں شامل کیا جا رہا ہے تاکہ پڑھنے والے اہلِ ذوق حسبِ ضرورت استفادہ کر سکیں، اور ان کو ضخیم لغات کی ورق گردانی کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن ماہرین زبان و ادب کے لیے فرہنگ کی چنداں ضرورت نہیں۔

عربی محاورات اور امثال کے علاوہ مذہبی کتابوں کے کچھ مکمل اور نامکمل جملے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض کئی کئی بار آئے ہیں ان کو بھی فرہنگ کے ساتھ مع معانی شامل کر دیا ہے۔ جن مشہور عالموں، ادیبوں اور شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان کا مختصر تعارف بھی ضروری تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کی جن قدیم عمارتوں اور محلّوں کے نام کتاب میں آئے ہیں ان کے متعلق اختصار کے ساتھ تاریخی کتابوں کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

فرہنگ کی تدوین میں، نور اللغات، جامع اللغات، فرہنگ عامرہ اور مہذب اللغات سے مدد لی گئی ہے۔ اشخاص کے تعارف کے سلسلہ میں اردو فارسی کی مستند ادبی تاریخوں اور تذکروں کو پیش نظر رکھا ہے۔ عمارات کا تعارف، تاریخ سلاطین اودھ (از کمال الدین حسینی) اور تاریخ اودھ (از نجم الغنی) نادر الوجود (از منشی نولکشور) اور تاریخ فرح بخش وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ اور ان کی موجودہ حالت کے متعلق اپنا چشم دید حال لکھا ہے۔ تفصیلات کے لیے مذکورہ کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

امیر حسن نورانی

(الف)

آب بقا۔ وہ پانی جس کو پینے والا ہمیشہ
زندہ رہتا ہے۔
آب حیات۔ مشہور ہے کہ دنیا میں کسی
جگہ ایسا چشمہ ہے۔
آب حیوان۔ سکندر ذوالقرنین
آب خضر۔ اس چشمہ پر حضرت خضر پیغمبر
کے ساتھ گیا تھا لیکن آب حیات
اس لیے نہیں پیا کہ اس کے پینے کے
بعد جسم کی طاقت زائل ہو جاتی اور
پینے والا زندہ رہتا ہے مگر بے حس
و حرکت۔ چاروں لفظ ہم معنی ہیں
آب زلال۔ میٹھا اور ٹھنڈا پانی۔ زلال
سفید رنگ کا کیڑا ہوتا ہے جو برف
میں رہتا ہے اس کو دبا کر نچوڑنے
سے جو پانی نکلتا ہے ٹھنڈا اور
میٹھا ہوتا ہے۔
آب رفتہ۔ وہ پانی جو بہہ گیا ہو۔
آب اسود۔ سیاہ پانی۔ مراد شراب
آب شورہ۔ کھٹا پانی۔ جو، املی، امچور اور
ہڑ کو ملا کر بناتے ہیں بہت
ہاضم ہوتا ہے۔ کچا آم بھون کر بھی بنایا
جاتا ہے۔
آب کاری۔ شراب بنانے کا کاروبار
آبِ رواں۔ ایک قسم کا باریک کپڑا۔ ململ
کی طرح۔ بہتا پانی۔
آب گیر۔ جوہڑ۔ پوکھر۔ تالاب
آب دار۔ چمکدار۔ پانی رکھنے کی جگہ
آب ریز۔ پانی کا برتن۔ لوٹا
آبنوس۔ ایک درخت جس کی لکڑی سیاہ
اور مضبوط ہوتی ہے۔
ابداع۔ پیدا کرنا۔ ظاہر کرنا۔
ابرن۔ زیور۔ گہنا
ابریق۔ صراحی۔ لوٹا۔
آبرہ۔ دوہرے کپڑے کا اوپر والا کپڑا
اُپسنا۔ سڑنا بد ذائقہ ہونا کھٹا ہونا
ابعادِ ثلاثہ۔ تین دوریاں۔ لمبائی۔ گہرائی
بلندی۔
اَبلق۔ دورنگا سیاہ و سفید رنگ کا
گھوڑا۔
اُبہت۔ بزرگی۔ رونق
آپا دھاپی۔ خود غرضی۔ تنہا خوری
اُپجنا۔ ظاہر ہونا۔ اُگنا۔

آتش زیرپا۔ بے قرار۔ بے چین
آتوماما۔ استانی۔ لڑکیوں کی اتالیق
آتش کا پر کالہ۔ انگارا۔ لوکا۔ آگ کا ٹکڑا۔
آتشین رخ۔ سرخ رنگ چہرہ۔ نور کا پتلا
آتما۔ روح۔ دم۔ نفس
آثیم۔ گنہگار
اِثمد۔ سرمہ کا پتھر
آٹھوں گانٹھ کمیت۔ چالاک۔ تیز۔ کمیت گھوڑا تیز اور چالاک ہوتا ہے
آٹھوں کا میلہ۔ ہندوؤں کا مشہور تہوار جو لکھنؤ میں بہت دھوم سے منایا جاتا ہے۔
اٹیرن۔ لکڑی کی چرخی جس پر کاتا ہوا سوت لپیٹا جاتا ہے۔
اٹیرنا۔ سوت لپیٹنا۔
اِجارہ۔ دعویٰ۔ قبضہ اختیار۔
اجتہاد۔ نئی بات نکالنے کی کوشش کرنا
اجاج۔ کڑوا۔ کھاری
آجل۔ دیر کرنے والا
اِجبار۔ زبردستی کرنا جبر کرنا۔
اچھوتی۔ بغیر چھوئی ہوئی بعض شاہان اودھ کے محلوں میں کنواری لڑکیاں نذر و نیاز کرنے کے لیے رکھی جاتی تھیں ان کو اچھوتی کہتے تھے۔
اچپلاہٹ۔ طراری۔ شوخی۔

اَحدی۔ تیر انداز سپاہی جو ملازم ہوتے تھے مگر اپنے گھروں میں رہتے تھے حسب ضرورت بلائے جاتے تھے اکبر بادشاہ نے یہ عہدہ قایم کیا تھا۔
اِحدیّت۔ یکتائی۔ ایک ہونا
اِحتراق۔ سوزش۔ جلا ہوا ہونا
اِحتفال۔ جلسہ۔ محفل۔
احتکار۔ گراں فروشی کے لیے غلہ وغیرہ روکنا
اَحفاد۔ بیٹے۔ پوتے۔ نواسے
اَحیاناً۔ اتفاقاً
اِحتیال۔ حیلہ بازی۔ بہانہ کرنا۔
اِحتضار۔ حاضر ہونا۔ موت کا سامنا کرنا۔
اَخذ۔ لینا۔ پکڑنا
اَخضر۔ بہت سر سبز و شاداب۔ گہرا سبز رنگ۔
اَخگر۔ چنگاری
آخوند۔ معلم۔ استاد
اخلاطِ اربعہ۔ صفرا۔ خون بلغم۔ سودا
آدیس۔ فقیروں اور جوگیوں کا سلام و پیغام
اَدراج۔ جمع دَرج۔ موتی اور زیور رکھنے کی ڈبیہ۔
اَدماتی۔ بیہودہ عورت۔ آوارہ
اَدھی۔ ایک قسم کا باریک قیمتی کپڑا
اَدیوڑی۔ موٹا چمڑا
اَدخنہ۔ دُخان کی جمع دھواں

اَدَوَات ۔ آلات

اَدْھَم ۔ مشکی گھوڑا سیاہی مائل

اَذْوُقَہ ۔ نان نفقہ روٹی کپڑا

اِدّخار ۔ جمع کرنا ذخیرہ کرنا

اَرث ۔ وراثت

آرسی ۔ آئینہ

آرسی مصحف ۔ دولہا اور دلہن کو شادی کے بعد قرآن شریف اور آئینہ دکھانے کی رسم

اَرغنُون ۔ ایک قسم کا باجا جو افلاطون نے ایجاد کیا تھا۔

اَرمَلہ ۔ بے شوہر کی عورت

ارابہ ۔ وہ گاڑی جس میں بھینسا جوتا جاتا ہے

ارگجا ۔ پھول اور عطر وغیرہ جو فاتحہ پڑھنے والے کے پاس رکھے جاتے ہیں۔

اُریب ۔ آڑا، ترچھا

اِرَم ۔ شداد نامی بادشاہ کی بنائی ہوئی بہشت

اَرسطُو ۔ مشہور یونانی عالم و فلسفی کا نام جس کا حضرت عیسیٰ سے ۳۲۲ سال قبل انتقال ہوا تھا

اَرژنگ ۔ چین کا ماہر نقاش جو قدیم زمانہ میں تھا

اَرغَوانی ۔ سرخ یا نارنجی رنگ

اَریب ۔ عقلمند ۔ بڑا فاضل

اِرتعاش ۔ کپکپاہٹ لرزش

اَزرَق ۔ نیلا نیلی آنکھ والا نیل گوں۔

اَزہَر ۔ کلی، روشن

اَرشَد ۔ بہت ہدایت پایا ہوا۔

آڑی مار ۔ دغاباز

آزرم ۔ لڑائی

آسیا ۔ چکّی

اسپند ۔ کالا دانہ ۔ جو نظر اتارنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔

اِستخارہ ۔ بھلائی طلب کرنا ۔ نیک شگون کے لیے خاص طریقہ پر فال دیکھنا۔

اِسترخا ۔ جسم کا ڈھیلا ہونا

اِستفراغ ۔ قے ہونا۔

اِسم بامسمیٰ ۔ جیسا نام ویسا کام

اَسوَار ۔ سوار کی جمع ہے۔

اَشعّہ ۔ شعاعیں ۔ شعا کی جمع ہے۔

اَشہَب ۔ سیاہ و سفید گھوڑا

اِشتباہ ۔ مشابہ ہونا۔

اِنتشار ۔ پراگندہ کرنا

اَشجع ۔ بہت بہادر

اشراقی ۔ قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ تھا جس کے کچھ خاص عقائد تھے۔

اَشعَری ۔ علماء اسلام کے ایک خاص گروہ کا نام ہے۔

اُشلک لگانا ۔ تہمت لگانا

اُشغلہ ۔ طوفان اٹھانا ۔ فتنہ کرنا۔

اشلوک ۔ نظم ۔ بند ۔ قول
اصالتاً ۔ بلا واسطہ ۔ براہ راست
اصغا سننا
اصلاً ۔ قطعی ۔ بالکل قطعی
آصف خانی ۔ ایک قسم کا لباس
آصیل ۔ ماما ۔ وفادار ملازمہ
اضحوکہ ۔ وہ چیز یا شخص جس کو دیکھ کر لوگ ہنسیں
اضطرار ۔ بے اختیار ہونا ۔ عاجز ہونا
اضعاف ۔ دوگنا کرنا ۔ کمزور ہونا
اضحیٰ ۔ قربانی
اصطرلاب ۔ ستاروں کا پتہ لگانے والا آلہ
اطناب ۔ طول دینا ۔ بڑھا کر پیش کرنا
اطلس ۔ صاف آسمان ۔ ایک قسم کا ریشمی کپڑا
اطاق ۔ کمرہ
اطفاء ۔ آگ بجھانا
اطراد ۔ ہانکنا چلانا
اطریفل مشہور یونانی دوا ۔ جو کئی دواؤں سے مرکب ہوتی ہے ۔
اعتاق ۔ غلام کو آزاد کرنا
اعتصام ۔ پکڑنا چنگل مارنا ۔ پرہیز گاری
اعجاز ۔ عاجز کرنا

اعوج ۔ ٹیڑھا
اعور ۔ کانا ۔
اعراب ۔ بدو ۔ عرب کے دیہاتی باشندے
اعقاب ۔ پس ماندگان ۔ مرنے والے کے بعد باقی رہنے والے اعزا و اقربا
اعمیٰ ۔ اندھا ۔
اعیان ۔ جمع عین ۔ چشمے ۔ امراء
اغماض ۔ چشم پوشی کرنا ۔ نظر انداز کرنا
اغوا ۔ ابھارنا ۔ بہکانا
افاضہ ۔ فیض پہنچانا
افتاد ۔ ڈھنگ ۔ عادت ۔ اتفاق ۔
افراسیاب ۔ توران کے مشہور بادشاہ کا نام
افعی ۔ کالا سانپ ۔ زہریلا
افشاندہ ۔ چھڑکا ہوا ۔ جھاڑا ہوا
افشردہ ۔ نچوڑا ہوا
افگار ۔ زخمی ۔ زخم
افلاطون ۔ یونان کا مشہور عالم و فلسفی
اقصیٰ ۔ بہت دور
اقلیدس ۔ علم ہندسہ جیومیٹری
اقبح ۔ بہت برا ۔ بدصورت
اقتران ۔ نزدیک ہونا ۔
اقدس ۔ بہت پاکیزہ
اقلاع ۔ اکھڑنا
اقلیم ۔ کرہ زمین کا ایک حصہ ۔ کل زمین

کو قدیم عالموں نے سات حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان کو ہفت اقلیم کہا جاتا ہے۔

اِکّا تنہا۔ یکّہ (ایک قسم کی سواری) شمع دان

اِکتَارا۔ ایک قسم کا ساز۔ کپڑے کی ایک قسم۔

اَکاسِرہ۔ کسریٰ کی جمع۔ ایران کے مشہور شاہی خاندان کے بادشاہوں کا لقب۔

اِکّل کھرا۔ خود غرض۔ بے مروّت

آکھڑ۔ چوپائوں کے رہنے کی جگہ

اِکلیل۔ تاج۔ جڑاؤ عصا

اَکید۔ مضبوط۔ استوار۔

اَگرئی۔ وہ رنگ جو گہرے شمشی رنگ سے ملتا ہے۔

اُلاَغ۔ وہ گھوڑا جس سے ڈاک لانے اور لے جانے کا کام لیتے ہیں۔

اَلمعیٰ۔ دانش ور۔ بڑا فاضل

اُلوہیّت۔ خدائی

اَلم نَشرَح۔ کھل کر بیان کرنا۔ قرآن کی ایک سورہ کا نام ہے۔

اَلیاکا۔ ایک قسم کا دبیز کپڑا

آلِسی۔ کاہلی۔ سستی

العطش۔ پیاس

الجوع۔ بھوک

اَلوپ انجن۔ وہ سرمہ جس کو لگا کر آدمی دوسروں کو نظر نہ آئے۔

اَلیٹھ۔ جھگڑا۔ روک۔ کام میں بلاوجہ نقص نکالنا۔

اُلش اَلیٹ۔ کسی بزرگ کا جھوٹا کھانا۔ آگے کا اٹھا ہوا کھانا۔

اَمصار۔ جمع مصر۔ شہر۔

امعان۔ گہری نظر ڈالنا۔ گہرا سوچنا۔

اُمّ العوارِض۔ بیماریوں کی جڑ۔ اصل بیماری

اَمارَج۔ نشانہ۔

اَلآن۔ ابھی اس وقت۔

اُلاَہنا۔ گلہ۔ شکایت۔

الا بالا بکواس۔ ٹال مٹول

اِلتِیام۔ زخم بھرنا۔ زخم اچھا ہونا۔

اِنتَما۔ بڑھنا۔ پھولنا

انتاغفیل۔ افیون کے نشے میں بری طرح مدہوش ہو جانا۔

انفعال۔ شرمندہ ہونا۔ ندامت

اُنتیاں۔ کان میں پہننے کا زیور

اَنڈوا۔ ایک قسم کا لباس جو بانس کے حلقے پر لچکا گوٹا لگا کر بناتے ہیں اور مرد اور عورتیں بازو پر باندھتیں ہیں اور سر پر باندھتیں ہیں۔

اَنیق۔ خوب۔ عجیب

انکس۔ لوہے کا چابک جس سے ہاتھی ہانکا جاتا ہے۔

اَنباز ۔ شریک
اَناجیب شعرِی ۔ بال کی جڑیں ۔
اِنفاق ۔ خرچ کرنا ۔
اِنصرام ۔ پورا ہونا ۔ آخر ہونا ۔
اَنوٹھی ۔ انوکھی
آواگون ۔ بار بار جنم لینا
اولوالالباب ۔ عقل مند ۔ بلند دماغ
دانشور
اوگی ۔ لمبا چابک
اُوکھلی ۔ ہاون ۔ وہ گہرا گڑھا یا ظرف
جس میں اناج ڈال کر کوٹتے ہیں
اُوپچی ۔ پانچوں ہتھیاروں سے مسلح سپاہی
اُولاغ ۔ گدھا
اُوقچہ ۔ پلنگ کی عمدہ سفید چادر جس کے
حاشیے پر کارچوبی یا کلابتوں کا کام
بنا ہو یہ چادر پلنگ پوش کے نیچے
بچھائی جاتی ہے اور اس کا کنارا نیچے
لٹکتا ہے ۔
آویزہ دار پازیب ۔ وہ پیر کا زیور جس میں
گھنگرو لگے ہوں ۔
آوَن ۔ شان ۔ دولت مندی ۔ چھب
اودھ اخبار لکھنؤ ۔ اردو کا مشہور اخبار جو
۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے جاری
کیا تھا ۔ اس اخبار میں فسانہ آزاد ۱۸۷۸ء سے
۱۸۸۰ء تک قسط وار شائع ہوا ۔
رتن ناتھ سرشار اخبار کے اڈیٹر بھی تھے یہ اخبار
۱۹۵۰ء میں بند ہو گیا ۔
اَہالیِ مَوالیِ ۔ گھر والے ۔ نوکر چاکر
آہنگ ۔ ارادہ ۔ آواز ۔ راگ
ایاغ ۔ پیالہ
ایزد ۔ خدا تعالیٰ
اِیمن ۔ وہ راگ جو رات کے پہلے پہر گایا
جاتا ہے ۔

ب

باٹ ۔ راستہ
بادلا ۔ بادل ایک قسم کا کپڑا جو ریشم اور
سنہرے روپہلے تاروں سے بنا جاتا
ہے ۔ زربفت
بادِیہ ۔ تانبے کا بڑا پیالہ ۔ جنگل
بابُل ۔ بغداد کے قریب ایک پرانا شہر
جو دریا فرات کے کنارے آباد تھا ۔
اب مٹ چکا
بادپا ۔ ہوا کی رفتار سے دوڑنے والا گھوڑا
باج ۔ زمین کا محصول ۔
باربُد ۔ ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کا
درباری گانے والا ۔
بَدگُہر ۔ بد اصل ۔ جس کے حسب نسب کا
پتہ نہ ہو
بارہ باٹ کرنا ۔ تتر بتر کرنا

بَاقشی بَرُوق۔ ترکی میں ایک قبیلہ کا نام
باگھ۔ شیر
باقرخانی۔ ایک قسم کی روٹی جو میدہ، گھی اور دودھ کی ملاوٹ سے بنائی جاتی ہے۔ یہ عہد شاہ جہاں میں الہ آباد کے حاکم باقر خاں نے ایجاد کی تھی۔
بالا بتانا۔ ٹالنا۔
بَالمیک۔ رامائن کا مصنف۔ مشہور ہندی شاعر
بَالے میاں۔ سید سالار مسعود غازی کا مختصر و مشہور نام جن کا مزار بہرائچ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔
بَانات۔ بغیر بناوٹ کا کپڑا۔ اونی۔ جو ریشم اور اون کو جما کر بنایا جاتا ہے۔
بَانک۔ برُھا۔ ایک جنگی فن جس میں دشمن کا مقابلہ چھریوں سے کیا جاتا ہے۔
بانکا۔ البیلا۔ وضع دار۔ ٹیڑھی ٹوپی لگانے والا۔
بَجرَا۔ چھوٹی، ہلکی کشتی جو تفریح کے لیے ہوتی ہے اور سوار خود چلاتا ہے۔
بَخُورات۔ خوشبو دار چیزیں۔ لوبان۔ عود وغیرہ
بَرزَخ۔ مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ
بَرزن کوچہ۔ گلی۔

بَرُوگ۔ تفرقہ۔ جدائی۔ علیحدگی۔
بَجُوگ۔ جدائی۔ حادثہ
بَرُوگی۔ ہجر کا مارا۔ فراق کا صدمہ اٹھانے والا۔
بُضَاعت۔ پونجی
بُکّل مارنا۔ خاص طریقہ پر چادر یا رضائی جسم پر لپیٹنا جس سے سارا جسم چھپ جائے۔
بُگڑے بَاز۔ نڈر۔ بے باک۔
بھنگر خانہ۔ بھنگ پینے کی جگہ
بانگڑی۔ سنہرے روپہلے تاروں کا بنا ہوا فیتہ جو عورتوں کے لباس میں ٹانکا جاتا ہے۔
بِچھوا۔ ایک خاص طرح کا چھلا جو پاؤں کے انگوٹھے میں پہنا جاتا ہے۔
بِرہا۔ ایک گیت جو دیہاتی محبوب کی جدائی کے غم میں گاتے ہیں۔
بَرِی یا سَاچق۔ شادی سے پہلے دولہا کی طرف سے کپڑے، زیور اور مٹھائی جو دولہن کے گھر بھیجے جاتے ہیں اس رسم کو کہتے ہیں۔
بِساط۔ وہ خاص کپڑا جس پر خانے بنے ہوتے ہیں اور اس پر مہرے رکھ شطرنج کھیلتے ہیں۔
بَطلیموس۔ مشہور یونانی حکیم اور فلسفی کا

نام ہے جس کی کتاب مجطی بہت مشہور ہے

بکاوَلی۔ باورچی

بکاوَلِی۔ ایک قسم کی پلیٹ۔ تشتری

بُقراط۔ مشہور یونانی عالم اور حکیم فنِ طب کی بنیاد اسی نے رکھی تھی۔

بُقچہ۔ کپڑوں گٹھری

بلگرام۔ اتر پردیش کے ضلع ہردوئی میں واقع مشہور قصبہ جہاں متعدد ممتاز عالم، شاعر اور فنکار پیدا ہوئے تھے

بِلّی لُوٹن۔ وہ گھاس جس کی خوشبو سے بلیاں بہت خوش ہوتی ہیں۔ اس کو بال چھڑ بھی کہتے ہیں۔

بنَوٹ۔ لڑائی کا ایک فن۔ جن میں ایک رومال لے کر اس میں تانبے کا پیسہ باندھا جاتا ہے اور اس کو خاص طریقہ پر لہر کر دشمن پر وار کرتے ہیں اور دشمن کی تلوار یا دیگر ہتھیار گرا دیتے ہیں اور اس کو ایسی چوٹ لگتی ہے جو جان لیوا ہوتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا بہت چلن تھا۔

بُوٹی پلانا۔ بھنگ کی پتی گھوٹ کر پلانا۔

بھاٹ۔ ایک قبیلہ جس کے افراد نسب نامے زبانی یاد رکھتے ہیں اور سناتے ہیں۔

بھاگ۔ ایک راگ کا نام ہے جو سات سروں میں گایا جاتا ہے۔

بانڈی۔ لاٹھی۔ ڈنڈا۔ ایک قسم کا لباس بھی ہوتا ہے۔

بھانُ متی۔ راجہ بھان کی بیٹی کا نام ہے جس کو راکشش اٹھا کر لے گئے تھے۔

بھج بند۔ بازو پر باندھنے والا ایک زیور

بہزاد۔ بہت مشہور مصوّر اور نقّاش تھا۔ یہ ایران کے بادشاہ، عبّاس صفوی کے زمانہ میں موجود تھا۔

بہنگی۔ ایک بانس یا لکڑی جس کے دونوں کناروں پر بوجھ اٹھانے کے لیے رسیاں بندھی ہوتی ہیں۔ اور مزدور اس کو شانے پر رکھ کر اٹھاتا ہے۔

بھیرویں۔ ایک راگ کا نام ہے جو صبح کے وقت گایا جاتا ہے۔

بدو فطرت۔ پیدائش کی ابتدا۔

بغلی ڈوبنا کشتی کا ایک داؤں

بزِ اخفش۔ عربی قواعد کا ماہر خفش اپنی بکری کو علم نحو پڑھاتا تھا۔ جب بکری کسی وجہ سے سر ہلاتی تو اخفش سمجھتا تھا کہ اب وہ اس کی بات سمجھ گئی ہے۔ اس موقع پر کہتے ہیں جب کوئی بغیر سوچے سمجھے ہاں یا نہیں کر دے۔

بنتُ العنب۔ انگور کی بیٹی۔ شراب

بُردِ یمانی۔ ملک یمن کی بنی ہوئی چادر

قدیم زمانے میں یمن کی چادریں بہت
مشہور تھیں۔
بُردَہ فروش۔ غلاموں کی خرید و فروخت
کرنے والا۔
بِرہ گِن۔ جدائی کی تکلیف میں مبتلا ہونے
والی۔
بلعم باعور۔ بنی اسرائیل کا ایک عابد جو
خدا کی بارگاہ سے مردود قرار پایا تھا
بنی وَبنا۔ دولہن اور دولہا۔
بُوق۔ جنگی باجا۔
بوڑی برچھی۔ بلم
بہلیا۔ چڑیوں کا شکار کرنے والا۔ پکڑنے
والا۔
بھبوکا۔ نہایت سرخ۔ روشن۔ خوبصورت
بھبوکا ہونا۔ غصہ میں بھر جانا۔ آگ بگولا
ہونا۔
بیرق۔ چھوٹے چھوٹے جھنڈے۔



پاتال۔ زمین کا سب سے نیچے کا حصہ
پاٹھا۔ ہاتھی کا بچہ
پاڑ۔ درخت یا کسی اونچے محفوظ مقام پر
لکڑی سے بنایا ہوا مچان۔ جو شکار
کے لیے عارضی طور پر بنایا جاتا ہے۔

پاڑھا۔ ہرن کے مشابہ ایک جنگلی چوپایہ بارا
سنگھے کی ایک قسم
پالٹ کا ہاتھ۔ لاٹھی یا ڈنڈے سے لڑتے
وقت مخالف کے پاؤں پر چوٹ لگانا
پالی۔ مرغوں اور بیٹروں کی لڑائی کی جگہ۔
پالتو جانوروں کی لڑائی کا اکھاڑا۔
پانسہ۔ چھ پہل ہڈی کا ٹکڑا جس پر نقطے
پڑے ہوتے ہیں اس کو چوسر کے
کھلاڑی باری باری پھینکتے ہیں۔
پاتُر۔ کسبی بیسوا۔
پالان۔ اونٹ اور گدھے کی پیٹھ پر رکھنے
والی کاٹھی۔
پالٹ۔ پٹہ بازی۔ وہ چوٹ جو حریف کے
پاؤں پر لگاتے ہیں۔
پانچ اندری۔ حواس خمسہ۔ چکھنا سونگھنا
دیکھنا۔ سننا۔ چھونا
پلاش۔ ٹاٹ۔
پاکھر۔ لوہے کا لباس۔ تاروں سے بنی
جالی جو جنگ کے وقت گھوڑے کو
پہناتے ہیں۔
پَرند۔ ریشم۔
پکھاوج۔ ایک قسم کی لمبی ڈھولک۔ طبلہ
نما ڈھولک۔
پونگی۔ تونبی کا باجا جو سپیرے بجاتے ہیں
پھاندی۔ گنے کا گٹھا

پکھاوِلی۔ چمڑے کا مشکیزہ

پوکھر۔ تالاب

پتھر کلا۔ توڑے دار بندوق جو چقماق کے ذریعہ آگ لگا کر چلائی جاتی ہے

پٹوا۔ زیورات اور بٹوے میں ڈوری ڈالنے والا ایک پیشہ ہے۔

پدرود کرنا۔ رخصت کرنا۔ رخصت ہونا

پدمِنی۔ عورتوں کی ایک قسم جو سب سے بہتر مانی جاتی ہے۔

پَرتَینچ۔ وہ پرندہ جس کے پر کاٹ دیے جائیں۔ خاص طور پر کبوتر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پکھراج پری۔ امانت لکھنوی کے ڈرامہ اندرسبھا میں شامل ایک کردار

پِنڈا۔ حقہ پینے والے چلم کے اندر شیرا ملا تمباکو رکھتے ہیں۔ اس پر توا رکھتے ہیں اور اوپر آگ رکھی جاتی ہے۔ اس تمباکو کی ٹکیہ کو پنڈا کہتے ہیں۔

پوبارہ۔ چوسر کھیلنے والا جب پانسا پھینکے اور دو پانسے چھ چھ نقطے والے گریں اور ایک پانسہ ایک نقطہ والا آئے تو اس کو پوبارہ کہتے ہیں۔ یہ بڑی جیت ہوتی ہے۔

پَونڈا۔ گنے کی ایک قسم جس کا رنگ سیاہ و سفید ہوتا ہے اور بہت موٹا ہوتا ہے۔

پچھل پائی۔ چڑیل۔ ڈائن۔ جس کے پاؤں الٹے ہوں۔

پیچوان۔ حقہ کی ایک قسم جس کی نئے لمبی اور لوچدار ہوتی ہے، اور لپیٹ کر رکھا جاتا ہے۔

پشواز۔ عورتوں کا ایک گھیر دار لباس

پیرِ فرتوت۔ بوڑھا۔ کھوسٹ۔

پیرِ زال۔ بہت بوڑھی عورت

پیل۔ شطرنج کا ایک مہرہ۔ اس کو پیلہ بھی کہتے ہیں۔

پیزار۔ جوتی۔



تابِش۔ گرمی۔ حرارت۔ چمک

تارُخ۔ سَر

تارکشی۔ سونے چاندی کے تاروں کو کھینچ کر لمبا کرنا۔

تازِی۔ عربی اسپ تازی۔ عربی گھوڑا

تامجھام۔ پالکی۔ ایک خاص قسم کی سواری اس کو تامدان بھی کہتے ہیں۔

تبایُن۔ دو چیزوں کے درمیان فرق

تستو تھمبو۔ روک تھام بیچ بچاؤ

تاتار۔ چینی ترکستان کا ایک علاقہ جہاں چنگیز خاں اور ہلاکو خاں پیدا ہوئے تھے تاتار کا مشکی ہرن بھی مشہور ہے۔

تجرید۔ عریانی۔ علیحدگی

تحریف۔ ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف رکھنا ردوبدل کرنا جس سے مضمون بدل جائے۔
تَصدِیع ۔ دردسر۔ تکلیف۔ دکھ
تَعَب ۔ تکلیف ۔ رنج
تُرّاقے کی۔ چمکدار ۔ بھڑکیلی
تُرہی۔ نفیری کے ساتھ کا ایک ساز جو نفیری کے ساتھ ملانے کے لیے بجاتے ہیں
تَعَدّی ۔ تجاوز کرنا ۔ جبر اور سختی کرنا
تَعلِیق۔ لٹکانا۔ معلق کرنا۔ حاشیہ لگانا
تَعمِیَہ ۔ پوشیدہ رکھنا۔ چھپانا
تَعوِیق۔ ڈھیل ۔ تساہل
تَغار ۔ مٹی کا کونڈا ۔
تَنبُورہ ۔ ایک قسم کا باجا جس میں ستار کی طرح تار لگے ہوتے ہیں
تَنقِیَہ ۔ کسی چیز کو زوائد سے پاک صاف کرنا
تُنکنا۔ بگڑنا۔ ناراض ہونا
تَوْاَم ۔ جڑوان ۔ ایک ساتھ پیدا ہونے والے بچے
تھانگ۔ چوروں کا ٹھکانا۔ مسکن
تہدید ۔ دھمکی دینا
تَقَدُّم بالزّمان۔ وقت اور زمانہ میں آگے ہونا۔
تَقَدُّم بالشّرف ۔ بزرگی اور عزت میں آگے ہونا

تشئید مبانی ۔ بنیادیں مضبوط کرنا۔
تَدَرْو۔ ایک خوبصورت پرندہ جس کو مور کہا جاتا ہے۔
تال ۔ علم موسیقی میں گانے کا ایک وزن
تَبرِید ۔ طبیبوں کی اصطلاح میں ان ٹھنڈی دواؤں کو کہتے ہیں جو جلاب کے بعد طاقت کے لیے دی جاتی ہے
تَپِ مُزمِن۔ وہ بخار جو زیادہ عرصہ تک رہے اور کسی وقت بھی نہ اترے۔
تَختِ رَواں۔ وہ سواری جو تخت کی طرح ہوتی ہے۔ اور بادشاہ اور امیر اس پر بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔
تختِ طاؤس۔ مور کی شکل کا وہ خوبصورت جڑاؤ تخت جو شاہ جہاں بادشاہ نے بنوایا تھا اور اس پر بیٹھ کر دربار کرتا تھا اس کے بنانے میں چھ کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ یہ تخت نادر شاہ درّانی اس وقت اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا جب اس نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں دہلی پر حملہ کیا تھا یہ تخت لال قلعہ میں دربار شاہی کے اندر رہتا تھا۔
تَخرِجہ۔ حروفِ ابجد سے مادۂ تاریخ نکالتے وقت جب کچھ عدد بڑھ رہے ہوں تو اتنے ہی عددوں کے

کسی لفظ یا حرف کو اس میں سے نکال کر مطلوب عدد حاصل کرنا۔
تَسنِیم ۔ جنّت کی ایک نہر کا نام ہے۔
تِکَل ۔ پتنگ کی ایک قسم جس میں دو کانپ اور ایک ٹھڈا ہوتا ہے
تمامی ۔ سنہرے اور روپہلے تاروں سے بنا ہوا ایک قسم کا دھاری دار ریشمی کپڑا۔
تُوڑا ۔ سونے یا چاندی کی زنجیر جو ہاتھ یا پاؤں میں پہنی جاتی ہے۔ ایک قسم کا زیور
تَوَغّل ۔ کمال حاصل کرنا۔ دھن سمانا
تَوقیع ۔ خط پر مہر لگانا نشان لگانا غصہ کا فرمان۔
تُورہ ۔ مختلف کھانوں کا خوان جو امیروں کی شادی کے موقع پر کچھ دن قبل تقسیم کرتے تھے
تورہ پوش ۔ خوان پوش
تَوسَن ۔ گھوڑا
توشہ خانہ ۔ رئیسوں اور بادشاہوں کے مکان کا وہ کمرہ جس میں ان کے لباس اور ہر طرح کے کپڑے رکھے جاتے ہیں۔
تال کٹورا ۔ لکھنؤ میں تعزیئے دفن کرنے کا مقام جو وہاں کا ایک محلہ ہے۔

تُوم ڑالنا ۔ عاجز کرنا ٹکڑے ٹکڑے کرنا
تَنَاسُخ ۔ ایک صورت سے دوسری صورت میں بدل کر آنا جس کو ہندو مذہب میں آواگون کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد کسی دوسری شکل میں دوبارہ جنم لیتا ہے
تَقطِیع ۔ ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ علمِ عروض کے مقررہ وزنوں پر شعر کو تولنا پرکھنا۔ اس کو وزن یا پیمانے بحر کہتے ہیں۔
تُنکی ۔ ایک قسم کی بہت باریک روٹی
تَغار ۔ مٹی کا تھال۔ وہ گڑھا جس میں گارا بناتے ہیں۔
تَعوِیق ۔ باز رکھنا۔ ڈھیل دینا۔ حیلہ کرنا
تَطَاوُل ۔ دست درازی کرنا۔ ظلم کرنا
تَصدِیع۔ تَصدِیعہ ۔ دردِ سر دینا۔ تکلیف دینا۔
تِربینی ۔ تین دریاؤں کے سنگم کی جگہ۔ الہ آباد شہر سے متصل اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں دریا گنگا اور جمنا اور سرسوتی یکجا ہوتے ہیں۔ سرسوتی زیرِ زمین مانا جاتا ہے جو نظر نہیں آتا جیسا کہ ہندوؤں کا مذہبی عقیدہ ہے
تھل ۔ جگہ۔ مقام۔ شہر کے رہنے کی جگہ
تِل شکری ۔ ایک قسم کی مٹھائی جو تل اور شکر ملا کر بناتے ہیں اور اس میں میوے

بھی ملائے جاتے ہیں۔

ٹ

ٹاٹ بافی۔ ایک قسم کا جوتا جس پر کلابتو کا کام
بنا ہوا ہوتا ہے۔
ٹِکُلی۔ پیشانی (ماتھا) کا ایک زیور
ٹِلوا۔ خوشامدی
ٹمّا۔ ٹھگنا۔ چھوٹے قد والا۔
ٹوڑی۔ ایک راگ کا نام ہے۔ ایک قسم کی بیڑ
ٹلنکار۔ کمان چلنے کی جھنکار۔ حیرت
ٹانک۔ چار ماشہ کا وزن
ٹُک۔ ذرا۔
ٹیکا۔ ماتھے کا ایک زیور جس کی ڈوری
یا زنجیر سر پر باندھی جاتی ہے اور ٹیکا
ماتھے پر رہتا ہے ہندی میں کسی کتاب کی
شرح کو بھی ٹیکا کہتے ہیں۔
ٹیمز۔ انگلستان کی راجدھانی لندن میں
بہنے والا مشہور دریا۔
ٹانگھن۔ پہاڑی ٹٹو۔ چھوٹے قد کا ٹٹو۔
پیگو شہر کا ٹانگھن مشہور ہے۔
ٹلپیش۔ وسیلہ۔ سہارا۔ دعوی
ٹپا۔ ایک راگ کا نام۔ دادرا۔ خیال
ٹیان کوڑی۔ زرد رنگ کی چھوٹی کوڑی
ٹیٹوا۔ گردن گلا

ث

ثانیہ۔ پل۔ سکنڈ
ثالث بالخیر۔ انصاف سے فیصلہ کرنے وا
ثَبات۔ قیام۔ مضبوطی۔ ثابت قدمی۔
ثاقِب۔ روشن
ثَرَی۔ نرم مٹی سیلی زمین
ثُریا۔ پروین۔ وہ چھ ستارے جو پاس
پاس ہوتے ہیں
ثُعبان۔ اژدھا
ثُقبہ۔ سوراخ
ثَمین۔ قیمتی۔ انمول
ثَیبہ۔ بیاہی عورت

ج

جانِ عالَم۔ اودھ کے آخری بادشاہ
واجد علی کا عوامی لقب۔
جامِ جہاں نما۔ ایران کے بادشاہ جمشید
جامِ جمشید۔ کو یونان کے حکما نے علم نجوم کی مدد
جامِ جَم۔ اور حساب سے ایک ایسا پیالہ بنا کر دیا
تھا جس کے اندر دیکھنے سے آنے والے
زمانے کے حالات معلوم ہو جاتے
تھے۔ تینوں نام ایک ہی معنی میں

استعمال ہوتے ہیں۔

جالینوس۔ مشہور یونانی فلسفی اور علم طب کا ماہر۔

جاچک۔ جھانج بجانے والا

جادہ۔ پتلا راستہ۔ لیکھ

جاگرن۔ شب بیداری۔ خدائی رات

جاروب۔ جھاڑو

جامہ وار۔ ایک قسم کا پھول دار اونی کپڑا۔ اونی چادر

جائس۔ مشہور قصبہ جو ضلع رائے بریلی اتر پردیش (ہند) میں واقع ہے اور ملک محمد مصنف پدماوت کا وطن ہے۔

جپ جی۔ سکھوں کی مذہبی کتاب۔ جو منظوم مناجات ہے۔

جٹادھاری۔ لمبے بالوں والا۔ گیسو دراز

جدی۔ بکرا۔ ایک آسمانی برج کا نام ہے جسکی شکل بکرے جیسی ہوتی ہے۔

جر ثقیل۔ بھاری وزن اٹھانا۔ اس فن کو بھی کہتے ہیں جس کے ذریعہ بھاری وزن اٹھانے کے آلات بنائے جاتے ہیں

جرس۔ گھنٹہ گھڑیال

جریب۔ ایک پیمانہ جس سے زمین ناپی جاتی ہے۔ چاندی کا خول چڑھا ہوا ڈنڈا جو بادشاہوں اور امیروں کے چوبدار رکھتے تھے۔

جریدہ۔ تن تنہا۔ اکیلا

جرعہ نوش۔ گھونٹ گھونٹ پینے والا۔

جرأت۔ بزرگی۔ مضبوطی۔ فوجی

جزِ لاینفک۔ کسی چیز کا وہ حصہ جو اس سے علحدہ نہ ہو سکے۔

جزرہ۔ سجاٹا۔

جزیہ۔ وہ ٹکس جو اسلامی حکومت میں دوسرے مذہب والوں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے باعث لگاتے ہیں

جعفری۔ ایک قسم کا زرد پھول۔ گیندے کی طرح

جفت۔ جوڑا۔ وہ عدد جو دو پر تقسیم ہو جاتے۔

جگت بازی۔ بذلہ سنجی۔ لطیفہ گوئی۔

جلوت۔ باہر سب کے سامنے

جل ترنگ۔ ایک قسم کا باجا جو پیتل کی دو کٹوریوں یا اور برتنوں میں پانی بھر کر دو لکڑی سے بجایا جاتا ہے۔

جلودار۔ مصاحب۔ ہمراہی

جل بانک۔ پانی کا کھیل۔ پانی میں کھیلنے والا ایک کھیل

جلب کھینچنا حاصل کرنا۔

جنتر منتر۔ بازی گری۔ نظر بندی مکاری

جَوشَن ۔ لوہے کا بنا ہوا خاص لباس جو
بازوؤں پر پہنتے ہیں۔ یہ جنگی لباس
جنگ کے وقت حفاظت کے لیے
پہنا جاتا ہے۔

جَوّ ۔ فضا۔ زمین اور آسمان کا درمیانی
خلا

جُو ۔ ندی ۔ چشمہ

جوئے شیر۔ دودھ کی نہر۔ فرہاد نے
اپنی محبوبہ شیریں کی فرمایش پر پہاڑ
کھود کر نہر نکالنے کی ناکام کوشش
میں اپنی جان دے دی تھی۔ ایک
تیشہ کی اپنی لگائی چوٹ سے ہلاک ہو گیا تھا
دونوں ایران کے باشندے تھے۔

جُوگیا ۔ ایک راگنی کا نام ہے

جَوّاد ۔ سخی ۔ شہسوار

جَودَت ۔ تیزی ۔ ذہانت تیز رفتار

جَوارِش ۔ ایک مرکب دوا۔ ہاضم اور مقوی

جَوف ۔ پیٹ ۔ کھوکھلی

جُوق ۔ گروہ ۔ جُھنڈ

جھکڑا ۔ خوبصورتی ۔ حسین چہرہ کی جھلک

جھپان ۔ ایک قسم کی سواری جو فینس کی
کی طرح ہوتی تھی عموماً عورتوں کے
لیے بنائی گئی تھی

جہانگیریاں ۔ کلائی میں پہننے کا ایک
جڑاؤ زیور جو چوڑیوں کی وضع ہوتا ہے

جیحوں ۔ ملک عراق میں ایک دریا ہے۔

جیغہ ۔ ایک جڑاؤ زیور جو پگڑی میں باندھا جاتا ہے

جیوڑا ۔ یہ جی کی تصغیر ہے۔ دل۔ جان۔
زندگی۔ روح۔ محبوب

جیوڑا نکلنا ۔ دل پریشان ہونا

جیش ۔ لشکر۔ فوج

جیگھڑ ۔ پانی کا گھڑا

جیہڑ ۔ ایک زیور کا نام ہے

جیوٹ ۔ بہادر



چابک خرام ۔ تیز رفتار

چار آئینہ ۔ ایک قسم کی زرہ جو جنگ میں
سینہ کی حفاظت کے لیے پہنتے
ہیں۔

چار دانگ ۔ چاروں سمت

چاہِ ذقن ۔ ٹھوڑی کا گڑھا

چاہِ زنخ ۔ ٹھوڑی کا گڑھا۔

چاکی کا ہاتھ ۔ پٹہ بازی کی اصطلاح میں وہ
چوٹ جو مخالف کے سر پر گتکا گھما کر
لگاتے ہیں۔

چاہِ بابل ۔ زمانہ قدیم میں عراق کا شہر
بابل مشہور تھا جہاں ایک کنویں میں
دو فرشتے الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ جو آزمائش
کے لیے انسانی شکل میں زمین پر آئے
تھے ایک کا نام ہاروت دوسرے

کا ماروت ہے۔
بَاہِ تخشب۔ وہ کنواں جس سے ابن مقنع کا بنایا ہوا مصنوعی چاند نکلتا تھا تخشب ترکستان کے ایک شہر کا نام ہے۔
چار چشم۔ طوطا چشم۔ بے مروت
چِپٹر قناتیا۔ کمینہ۔ خوشامدی
چپقلش۔ لڑائی جھگڑا انکرار
چڈا گل خیرو۔ مسخرہ، احمق ایک قسم کا سرخ پھول جس کا اوپر کا حصہ چڈے کے سر کی شکل کا ہوتا ہے
چَر تر۔ چالاکی
چَرب بانک۔ چالاک عیار
چشم زخم۔ نظر بد
چشم زدن۔ پلک جھپکنا۔ دم بھر بہت جلد۔
چغتائی۔ مغل قوم کے ایک قبیلہ کا نام ہے
چکارا۔ ہرن کی ایک قسم جو بہت خوبصورت اور تیز رفتار ہوتا ہے۔
چک منڈی۔ لکھنؤ میں قریش برادری کا ایک مشہور محلہ جو وسط شہر میں واقع ہے۔
چگل۔ چلم میں رکھنے کی گٹکی
چم خم۔ چمک دمک۔ چلت پھرت
چمپا کلی۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور جس میں چمیلی کی کلیاں سونے یا چاندی کی بنی پر دی ہوئی ہوتی ہیں۔
چَمروخ۔ وہ گول جھلا سا جس کے اندر تکلا گھومتا ہے دبلے پتلے شخص کو بھی کہتے ہیں۔
چک پھیریاں۔ گول دائرہ بنا کر اس میں پھرنا بھرانا
چَل چخے۔ چل دور ہو۔ دور ہٹ
چلیپا۔ سولی۔ صلیب۔ زلف سے تشبیہ دیتے ہیں۔
چکوا چکوئی۔ سرخاب کا جوڑا۔ جب نر دریا کے اس کنارے پر رہتا ہے تو مادہ اس کنارے پر دونوں ایک دوسرے کو آواز دیتے اور پکارتے رہتے ہیں
چندن ہار۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور
چنڈاول۔ سنتری چوکیدار
چنگیر۔ پھول رکھنے کا برتن۔ گل دان
چنڈال۔ کمینہ۔ پنچ۔
چنور۔ مور چھل۔
چونڈا۔ بالوں کا گچھا جو عورتیں سر پر باندھتی ہیں اس کو جوڑا بھی کہتے ہیں
چونچال۔ ہوشیار۔ چالاک۔
چورنگ کرنا۔ تلوار کی ایسی ضرب جس سے شکار کے چاروں پیر کٹ جائیں۔

چھلاّ بیری۔ ایک قسم کا کھیل جس میں ایک
چھلاّ مٹی میں چھپا دیا جاتا ہے اور دو
جگہ مٹی کے ڈھیر لگاتے ہیں۔ پھر
دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ چھلاّ
کس ڈھیر میں ہے۔
چھپکا۔ ایک زیور کا نام ہے جو سر پر لگایا جاتا
ہے
چہرہ شاہی۔ وہ سکّہ جس پر بادشاہ یا ملکہ کی
تصویر ہو۔
چھاگل۔ پاؤں میں پہننے کا ایک زیور
چھٹکا۔ وہ لال کپڑا یا چادر جو فنس یا سکھپال
کے اوپر ڈالی جاتی ہے۔
چہرا پرداز۔ مصوّر۔ نقاش۔
چھلاوا۔ بھوت۔ پریت

ح

حاز۔ حرارت رکھنے والا
حاشا۔ ہرگز نہیں۔ پناہ
حبش۔ افریقہ کا ایک ملک جہاں کے
باشندے سیاہ رنگ ہوتے ہیں اور
حبشی کہلاتے ہیں
حبیب لبیب۔ عقل مند دوست
حجر اسود۔ وہ سیاہ پتھر جو حرم کعبہ میں
نصب ہے اور مسلمانوں میں متبرک
سمجھا جاتا ہے۔
حذر۔ پرہیز۔ بچنا۔ احتیاط کرنا
حرز۔ تعویذ۔
حریف۔ ہم پیشہ۔ مقابل۔ باہم مخالف
حزیں۔ تخلص ہے شیخ علی حزیں کا فارسی
کے بلند پایہ شاعر تھے۔ بنارس میں
سکونت اختیار کی تھی۔
حسنین۔ مراد حضرت امام حسنؓ اور
حضرت امام حسینؓ
حشری۔ وہ گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں
کے ساتھ مل کر نہ رہے۔
حشرات الارض۔ کیڑے مکوڑے
حصیر۔ بوریا۔ چٹائی
حضارت۔ تازگی۔ شادابی۔ سرسبزی
حضیض۔ پستی۔ نشیب
حیص بیص۔ شور غوغا۔ کشمکش۔ بحث
تکرار
حظ۔ حصہ نصیب۔ لطف۔
حفظ ماتقدم۔ پہلے سے حفاظت
کا انتظام کرنا
حلہ۔ زیور۔ پوشاک
حلاوت آگین۔ مٹھاس سے بھرا ہوا۔
حلیف۔ ہم عہد۔ ہم قسم دوست ساتھی
حلاج۔ نداف۔ یہ لقب ہے حضرت
حسین بن منصور کا جن کو انا الحق

(میں خدا ہوں۔) کہنے کے جرم میں سولی پر لٹکایا گیا تھا۔

حَمِیْم ۔ گرم پانی ۔ رشتہ دار ۔ یگانہ

حَنْجَر حَنْجَرہ حلق ۔ گلو ۔ نرخرہ

حَنْظَل ۔ اندرائن ۔ ایک تیز ترش پھل جس کو توڑنے سے اس طرح آنسو نکلتے ہیں جیسے پیاز کاٹتے ہیں۔

حَنِیف ۔ مذہب میں سچا دین ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والا ۔ اسلام کو دین حنیف کہتے ہیں

حنّان ۔ رحمت والا بخشش والا

حِینِ حیات ۔ زندگی کا زمانہ ۔ زندگی بھر۔

حِیْن ۔ وقت زمانہ

خ

خَاتُونِ جنّت ۔ حضرت فاطمہ کا لقب جو حضرت محمد صلّی اللہ عَلَیہِ وسلم کی بیٹی تھیں۔

خَاص بَرْ دار ۔ وہ ملازم یا سپاہی جو بادشاہوں اور امیروں کی سواری کے آگے مسلّح چلتے تھے۔

خَاتَم ۔ انگوٹھی ۔ ختم کرنے والا۔

خَاوَر ۔ مشرق

خَال خَال ۔ کم کم ۔ تھوڑے تھوڑے

خَالِصَہ ۔ جو خالص ہو ۔ کسی سے ملا نہ ہو

خام پارہ ۔ ناتجربہ کار ۔ کچا ٹکڑا

خارا شگاف ۔ پتھر توڑنے والا اوزار

خانہ بر انداز ۔ خانہ بدوش ۔ جس کا کوئی گھر نہ ہو ۔ جگہ جگہ عارضی قیام بنانے اور اٹھانے والا۔

خَبْطِی ۔ احمق ۔ بدحواس ۔ ایک ہی خیال میں محو رہنے والا۔

خُتْلِی خِرام ۔ ختلی گھوڑے کی چال ۔ ختل ایک مقام کا نام جہاں کے گھوڑے بہت اچھے اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔

خَرگاہ ۔ بڑا خیمہ ۔ بادشاہوں اور امیروں کا خیمہ۔

خَرِیْطَہ ۔ تھیلی یا لفافہ جس میں بادشاہوں اور امیروں کا شقہ (مختصر خط) بھیجا جاتا تھا۔

خجستہ ۔ مبارک ۔ باعث برکت

خَجَالَت ۔ شرمندگی ۔ پشیمانی

خَدِیوِ مِصْر ۔ مصر کا بادشاہ ۔ خدیو مصر کا ایک حکمراں خاندان تھا۔

خِرْقَہ ۔ خرقہ وہ لباس جو صوفی اور درویش پہنتے ہیں ۔ اس کو گدڑی کہا جاتا ہے۔

خُرْدَہ گیری ۔ عیب جوئی ۔ نکتہ چینی۔

خُرْطُوم ۔ ہاتھی کی سونڈ ۔ افریقہ کے ملک

سوڈان کے ایک بڑے شہر کا نام
بھی ہے۔
خُسُوف۔ چاند گرہن
خشُوع۔ ڈرنا۔ گڑگڑانا
خِضر۔ ایک پیغمبر کا نام۔ جو حضرت موسیٰ کے
ہم عصر تھے۔ ان کو دائمی زندگی
ملی ہے۔ وہ راہ بھولنے والوں
کو راستہ بتاتے ہیں۔
خضوع۔ عاجزی۔ انکساری
خَطا و خُتن۔ خطا ملکِ چین کا ایک شہر
ہے جو قدیم زمانہ میں اپنی خوبصورتی
اور تجارت کے لیے مشہور تھا۔
ختن شمالی مغربی چین کا وہ مشہور شہر
جہاں کی مشک دنیا بھر میں مشہور
ہے۔ وہاں کے مشکی ہرن کا ذکر شاعروں
نے اپنے اشعار میں بہت کیا ہے۔
خَطیر۔ بہت قیمتی۔ بہت زیادہ
خَلخال۔ جھانجھ۔ پازیب پاؤں کے زیور
خلا ملا۔ خالی اور بھرا ہوا۔ مراد خلوت
اور جلوت کا شریک
خَلجان۔ فکر۔ خلش۔ کھٹکا
خَلوَتی۔ تنہائی پسند
خمُول۔ گمنام ہونا
خَم و چم۔ ناز و ادا۔ چال کی لچک
خنگ۔ سفید گھوڑا

خُنیاگر۔ گانے والا
خواجہ تاش۔ کسی بادشاہ یا امیر کے دو ملازم
آپس میں خواجہ تاش کہلاتے ہیں۔
خَواصی۔ خدمت گزاری۔ بادشاہ کا
خاص ملازم۔ خدمت گزار۔
خونابہ۔ خون کے آنسو۔ پانی ملا ہوا خون
خَیل۔ گروہ۔ خاندان۔ قبیلہ۔ گھوڑوں کا گلہ
خِیوا۔ چینی ترکستان کا ایک قدیم شہر جو
اب روس کے مقبوضہ علاقہ میں شامل ہے
خَیلا۔ احمق۔ لغو۔ بیہودہ۔ وہ عورت جس
کے جسم پر بہت سے تل ہوں۔
خیزران۔ بید۔ چابک
خیّاط۔ درزی
خیط ابیض۔ صبح کی سفیدی
خَیّاطِ ازل۔ اللہ تعالیٰ مراد ہیں۔

د

دارا۔ قدیم ایران کا بادشاہ جس کو یونان
کے حکمراں سکندر بادشاہ نے ایران
پر حملہ کر کے شکست دی تھی۔
داب۔ ڈھنگ۔ طرز
دارُالشِفا۔ اسپتال۔ لکھنؤ کی ایک مشہور
شاہی عمارت جس میں شفاخانہ تھا۔
اب اس کو منہدم کر کے اسمبلی کے
اراکین کی رہائش گاہ تعمیر کی گئی ہے۔

دائنتا کِل کِل ۔ جھگڑا تکرار ۔ قصہ قضیہ
دارُالحرب (لڑائی کا گھر یا ملک) وہ ملک
جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض
انجام دینے کی آزادی حاصل نہ ہو
دارُالضرب ۔ ٹکسال ۔ جہاں سکے
ڈھالے جاتے ہیں
دامنی دمکے ۔ اوڑھنی چمکے
دانگ ۔ سمت ۔ جانب ۔ چھ رتی کا وزن
داد و ستد ۔ لین دین
دائم الخمر ۔ ہمیشہ شراب کے نشہ میں
مست رہنے والا پابندی سے شراب
پینے والا ۔
دائن ۔ قرض دینے والا ۔
داعیہ ۔ دعویٰ کرنے والی عورت ۔ ارادہ
دبیر ۔ منشی ۔ انشا پرداز
دبیرِ فلک ۔ عُطارد ستارہ
دبّاغ ۔ رنگ ساز ۔ رنگنے والا ۔
دجلہ ۔ ملکِ عراق میں مشہور دریا ہے
جو شہر بغداد کے درمیان سے ہوکر
گزرتا ہے ۔
دجل ۔ جھوٹ ۔ فریب
دخل ۔ آمدنی ۔ قبضہ
دُختِ رز ۔ (انگور کی بیٹی) شراب
دُرِّ یتیم ۔ وہ موتی جو سیپ میں تنہا پیدا ہوتا
ہے ۔ وہ بڑا اور بہت چمکدار ہوتا ہے

دُرِ خوش آب ۔ بہت چمکدار موتی
دُرد ۔ تلچھٹ
دُرشنی ہنڈی ۔ جس ہنڈی کا روپیہ اس
کو پیش کرتے ہی مل جائے ۔
دُرک ۔ عقل ۔ تمیز ۔ سمجھ ۔
دِرنگ ۔ دیر ۔ وقفہ
دخترِ تاک ۔ شراب ۔ تاک انگور کی بیل کو
کہتے ہیں ۔
دُرِ عدن ۔ عدن کے سمندر کا موتی جو
بہت اچھا ہوتا ہے ۔ عدن عرب کا
ایک ساحلی شہر ہے ۔
دریوزہ گر ۔ بھکاری ۔ مانگنے والا
درّہ دانیال ۔ جنوبی یورپ اور مغربی
ایشیا کے درمیان سمندری راستہ
جس کو تاریخی حیثیت حاصل ہے ۔
درماندہ ۔ مجبور ۔ عاجز ۔
دریغا ۔ اے افسوس ۔ ہائے افسوس
دِرّہ ۔ چمڑے کا چابک
دُزدیدہ ۔ چرایا ہوا ۔ نظر بچا کر دیکھنا ۔
دِساور ۔ پردیس ۔ دوسرا علاقہ
دستِ برد ۔ خیانت ۔ غلبہ ۔ بیجا تصرف
دغدغہ ۔ خوف ۔ اندیشہ ۔ تشویش
دَف ۔ ڈفلی ۔ ایک قسم کی ڈھولک
ڈکرڈی ۔ ایک قسم کی گاڑی ۔ دو گھوڑوں
کی بگی ۔

دَقیانوسی۔ بہت پرانا۔ زمانہ قدیم میں عرب کے ایک بادشاہ کا نام جس کے عہد میں اس کے ظلم اور خدا بیزاری سے تنگ آکر اللہ کے کچھ نیک بندے پہاڑ کے ایک غار میں روپوش ہو کر سو گئے تھے جو بہت طویل عرصہ کے بعد ایک بار بیدار ہوئے تھے لیکن حالات ناساز گار دیکھ کر دوبارہ غار میں جا سوئے ان کو اصحاب کہف (غار والے ساتھی) کہتے ہیں قرآن مجید میں اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ان کے ساتھ ایک کتا بھی ہے۔

دِل رِیش۔ غم زدہ۔ زخمی دل والا

دَلق۔ گدڑی۔ پشمینہ کا لباس

دُون۔ کمینہ۔ کم ہمت۔

دُودمان۔ خاندان

دُود افگن۔ چمنی۔ دھواں پھینکنے والی نلکی۔

دُوسار۔ آرپار۔

دُہل۔ ڈھول۔

دَھک دَھکی۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور جو سینہ پر لٹکتا رہتا ہے۔

دِیدہ دھوئی۔ بے شرم۔ ڈھیٹ۔

دِیزہ۔ گھوڑا۔ خچر۔

دَیہیم۔ تاج۔

دَیوث۔ بے حیا۔ بے عزت۔

دُگلا۔ روئی دار لبادہ۔ انگرکھا۔

دُلدُل۔ وہ سیاہی مائل سفید گھوڑا جو کسی نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کیا تھا اور آپ نے حضرت علی کو دے دیا تھا۔

دَلک۔ رگڑ۔ تصادم۔ دھمک

دُلکی۔ گھوڑے کی تیز چال جو پویہ سے کم ہوتی ہے۔ دُلکنا دلکی چال چلنا

دُلمہ۔ ایک قسم کا سالن۔ پنیر۔

دَمُ الاخوین۔ سرخ رنگ کا گوند جو کپڑے رنگنے میں، استعمال ہوتا ہے۔

دَم دَھاگا۔ فریب۔ جھانسا۔

دَمادَم۔ پے در پے۔ متواتر

دَمدمہ۔ مصنوعی قلعہ۔ جو اصل قلعہ کے آگے بنایا جاتا ہے۔

دَمڑی کا دَمڑک۔ چمڑے کا گول ٹکڑا جو تکلے میں لگاتے ہیں۔

دَوال۔ رکاب کا تسمہ۔ مشک کا تسمہ۔

دُوت۔ قاصد۔ ایلچی۔

دَھونسا۔ بڑا نقارہ۔

دِھیرَج۔ مضبوطی۔ مستعدی۔

ڈ

ڈانک۔ سنہرہ یا روپہلا کاغذ یا پنی جو نگینہ کے نیچے چمک بڑھانے کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔
ڈاب۔ ایک قسم کی لمبی گھاس جس سے چٹائی بُنی جاتی ہے۔ کچّا ناریل
ڈانگ۔ چھلانگ۔ اونچی پہاڑی
ڈار۔ قطار
ڈاہ۔ جلن۔ عداوت
ڈابر۔ جھیل۔ تالاب
ڈانڈی۔ ایک قسم کی ڈولی جس پر آدمی بیٹھ کر سفر کرتے تھے اور مزدور اس کو اٹھا کر چلتے ہیں۔
ڈب۔ قابو۔ قبضہ
ڈمرو۔ ایک قسم کا باجا۔ ڈگڈگی
ڈھولنا۔ ایک زیور کا نام

ذ

ذاتُ الجنب۔ پہلو کا درد۔ پسلی کا درد
ذَقن۔ ٹھوڑی۔
ذقند۔ چھلانگ
ذکاوت۔ تیز فہمی۔ دانائی۔ زود حسی
ذوالفقار۔ حضرت علی کی تلوار کا نام
ذیل۔ دامن کے نیچے کا حصہ۔
ذِمّی اسلامی حکومت کا غیر مسلم باشندہ
ذَمیم۔ بری چیز۔ قابلِ برائی۔ خرابی۔
ذَنب۔ گناہ۔

ر

رَاتِب۔ روزمرہ کی خوراک
رَاج بنس۔ شاہی خاندان
رَاس لیلا۔ کرشن جی اور گوپیوں کا کھیل
رَاسخ۔ مضبوط۔ پائدار
رَاندہ۔ نکالا ہوا۔ رد کیا ہوا۔
رَاوٹی۔ چھوٹا تنبو۔ چھولداری بالاخانہ
رَاول۔ سردار۔ جوگی۔
رائحہ۔ بو باس۔ خوشبو
رامشگری۔ گانا۔ راگ الاپنا
رَاغ۔ جنگل۔ سبزہ زار۔ پہاڑ کا دامن۔
رُبع مَسکوں۔ دنیا کا چوتھائی حصہ
رَجعتِ قہقری۔ الٹے قدم پھرنا۔
رَجھانا۔ خوش کرنا۔
رِدا۔ چادر۔
رَدِیف۔ جو گھوڑ سوار کے پیچھے سوار ہو غزل میں قافیہ کے بعد جو لفظ بار بار آئے۔ رضاعی بھائی، دودھ شریک بھائی۔
رَطل۔ شراب کا جام۔
رَعنا۔ وضع دار۔ خوبصورت
رِفق۔ نرمی

رقّت۔ نرمی۔ رونا گڑگڑانا
رَکَابْ دار۔ عمدہ باورچی۔ کھانا لگانے والا۔
رَکِیک۔ کمزور حقیر
رُکُوع۔ جھکاؤ۔ جھکنا۔ نماز میں سجدہ سے قبل گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر جھکنا
رَم۔ بھاگنا۔ وحشت جدائی
رَمَل۔ ایک فن کا نام ہے۔ جس میں ہندسوں کے ذریعہ غیب کی باتیں دریافت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ فن حضرت دانیال پیغمبر نے ایجاد کیا تھا۔ عربی میں رَمَل ریت کو کہتے ہیں۔ ابتدا میں ہند سے ریت ہی پر لکھے اور مٹاتے جاتے تھے۔ اس لیے یہ نام پڑ گیا اس علم کا جاننے والا رمّال کہلاتا ہے۔
رَمز۔ اشارہ۔ بھید۔
رَمَق۔ رہی سہی جان۔ بقیہ جان۔
رَمنا۔ جنگل۔ گھومنا پھرنا۔
رَن۔ جنگ۔ صف بندی۔
رُوبکار۔ سامنا کرنا۔ پیش ہونا۔ وہ قبالہ جو حاکم کے سامنے لکھا جائے
رُوحُ اللہ۔ حضرت عیسیٰ پیغمبر کا لقب ہے۔
رُودبار۔ پانی کا وہ حصہ جو دو سمندروں کو ملائے۔
رُوسنا۔ خفا ہونا۔ ناراض ہونا
رَوشن چَوکی۔ چار آدمیوں کا گروہ جو دولہا یا بادشاہ کی سواری کے ساتھ نفیری اور طبلہ وغیرہ بجاتا ہوا چلتا ہے اور وہ چوکی جس پر تاشہ بجانے والے بیٹھتے ہیں۔
رَوتنا۔ ہرکارہ۔ وہ ملازم جو عورتوں کے کام کاج کے لیے ملازم ہوتے ہیں اور ہر وقت دروازے پر حاضر رہتے ہیں
رُودِ نیل۔ ملک مصر کا مشہور دریا۔
رُوئیں تن۔ طاقت ور۔ فولادی جسم والا
روزن۔ سوراخ۔ جھروکہ۔
رُوحُ القُدس۔ لقب حضرت جبرئیل (فرشتہ) کا
رِیش دراز۔ لمبی داڑھی والا
رِیش خند۔ ہنسی ٹھٹھا مسخرہ پن۔
رَیحان۔ ایک خوشبودار پودا۔ بنفشہ
رِیش مُخضَب۔ رنگین ڈاڑھی۔ خضاب لگی ڈاڑھی
رین۔ رات۔

ز

زَادِ بُوم۔ جائے پیدائش۔ وطن
زَاغ۔ کوا
زَال۔ بڑھیا۔ رستم کے باپ کا نام
زَار نالی۔ بے قراری۔ خوب گریہ کرنا
زائچہ۔ جسم پتری
زَائیدہ۔ جنا ہوا۔ پیدا ہوا۔
زَبَرجَد۔ زمرد۔ سبز رنگ کا قیمتی پتھر

زبون ۔ عاجز ۔ ضعیف ۔
زبانہ ۔ شعلہ ۔ آگ کی لپٹ ۔
زحل ۔ ایک ستارہ جو منحوس سمجھا جاتا ہے
اس کو سنیچر کہتے ہیں ۔
زبیب خشک انگور ۔
زجاج ۔ شیشہ ۔ قندیل ۔
زرتشت یا زردشت ۔ ایک ایرانی رہنما
جس نے قدیم زمانہ میں آتش پرستی
کی بنیاد ڈالی تھی ۔ ان کے پیرو آتش
پرست ہیں ۔ اب یہ پارسی کہلاتے
ہیں ۔
زمہریر ۔ سخت سردی ۔ کرۂ ہوا کا سرد حصہ
زنبور ۔ بھڑ ۔ لوہے کا ایک اوزار جس
سے کسی چیز کو پکڑ کر اٹھاتے ہیں جیسے
برتن وغیرہ
زندیق ۔ جو سیدھی راہ سے بھٹک جائے
خدا پر ظاہر میں ایمان لائے مگر
دل سے منکر ہو ۔
زنگی ۔ حبشی
زنخ ۔ ٹھوڑی
زنجبیل ۔ سونٹھ ۔ جنت کی ایک نہر کا نام
ہے ۔
زنبیل ۔ جھولی ۔ جس میں ہر طرح کی بہت
سی چیزیں سما جائیں ۔
زہرہ ۔ پتہ ۔ حوصلہ ۔

زہرہ آب ہونا ۔ ہمت پست ہونا خوفزدہ ہونا
زیر پائی ۔ زنانہ جوتی ۔
زیرکی ۔ دانائی ۔
زیر انداز ۔ نیچے بچھانے کا کپڑا ۔



ژ

ژاژ خا ۔ بکواس کرنے والا
ژرف ۔ گہرا ۔ غور و فکر
ژولیدہ ۔ الجھا ہوا ۔
ژندہ ۔ گدڑی ۔ پیوند لگا کپڑا
ژنگ ۔ مشہور مصور و نقاش مانی کی لکھی ہوئی
کتاب کا نام ہے ۔
ژند ۔ ازدشت کی کتاب کا نام ہے
جس نے مذہب آتش پرستی کا قائم کیا
تھا

"س"

ساعی ۔ چغل خور ۔
ساقن ۔ حقہ پلانے والی
سامی ۔ بلند مرتبہ
سانحہ ۔ حادثہ ۔ غم انگیز واقعہ
سانٹے پر سانٹا لگانا ۔ چابک پر چابک
مارنا ۔ سانٹا ہاتھی کو ہانکنے کی لکڑی
کو کہتے ہیں ۔
سارنگ ۔ ایک قسم کا راگ ۔

سامری۔ حضرت موسٰی کا ہم عصر مشہور
جادوگر جس نے گائے بچھڑا بنا کر
اس میں جان ڈالی تھی۔
ساشلیٹ۔ کپڑے کی ایک قسم۔
سبک پویہ۔ ہلکی چال۔
سبز بخت۔ خوش نصیب
سبزی اڑانا۔ بھنگ پینا۔
سبوکش۔ شراب کا جام پینے والا شرابی
ساچق۔ منہدی لگانے کی رسم۔ وہ
رسم جو دولہا کی جانب سے شادی
کے قبل ادا کی جاتی ہے۔ جس میں
آرائش وغیرہ کا سامان دولہن کے
گھر لے جاتے ہیں۔
سپاٹ ہونا۔ ہموار ہونا۔ صاف ہونا۔ کودنا
پھاندنا۔
سجایہ مرضیہ۔ پسندیدہ عادات۔
سحبان۔ عرب کا مشہور خطیب، مقرر۔
سحاب نوال۔ ابر کی طرح بخشش کرنے
والا بہت سخی۔
سداد۔ مضبوطی۔ نیک کردار۔ سچائی۔
سرکہ جبیں۔ غصہ ور۔ ترش رو۔
سروہی۔ ایک قسم کا خنجر۔ چھوٹی تلوار۔
سرنگ۔ سیاہی مائل رنگ کا گھوڑا۔
سربالٹ کا ہاتھ۔ کشتی لڑنے کا ایک
داؤں۔

سرو چراغاں۔ لکڑی کے ٹکڑوں سے
سرو کے درخت کی شکل بناتے ہیں
اور اس کی شاخوں پر چراغ روشن
کرتے ہیں اس کو سرو چراغاں کہتے ہیں
سراپردہ۔ اونچی قنات۔ خاص قسم کا اونچا
اور قیمتی پردہ۔ جو بادشاہوں اور وزیروں
کے محلوں میں استعمال ہوتا ہے۔
سراچہ۔ چھوٹا خیمہ۔
سرپیچ۔ صافہ۔ پگڑی
(۱) سلسبیل۔ جنت کی ایک نہر کا نام
سلخ۔ کھال کھینچنا۔ چاند کی آخری تاریخ
وہ دن جس کی شام کو چاند دیکھا جائے
سلک گوہر۔ موتیوں کی لڑی۔
سمندِ آہو شکار۔ وہ گھوڑا جو تیز رفتاری
کے باعث ہرن کا شکار کرنے والے
کو کامیاب کرتا ہے۔
سمن اندام۔ چمبیلی جیسا نرم اور گورا بدن۔
سمک۔ مچھلی۔
سمو المکان۔ اونچے مرتبہ والا۔ بلند مقام
والا۔
سنگر۔ چھوٹا نیزہ۔
سنجاب۔ خاکی رنگ کی خوبصورت گلہری۔
(۲) سکھپال۔ ایک قسم کی پالکی جس میں رئیسوں
کی عورتیں سوار ہوتی تھیں۔ جس کی
کھال سے ایک قسم کا قیمتی خوشنما لباس

بنتا ہے۔ کپڑے کی ایک قسم۔

سَنگترِیش۔ میوہ فروخت کرنے والیاں۔

سَنجَر صَولَت۔ سلطان سنجر جیسے دبدبہ والا۔ بہادر

سنبلہ سُنبُل۔ گیہوں اور جو وغیرہ کی بالی جس سے زلفوں کو تشبیہ دیتے ہیں

سَوں۔ قسم۔ جیسے خدا سوں۔ خدا کی قسم

سُورۂ قَدر۔ قرآن شریف کی ایک سورہ کا نام ہے۔ جس میں رمضان شریف کی ایک بہت برکت والی رات کا ذکر ہے جس کو شبِ قدر کہتے ہیں

سُوفار۔ تیر کا پچھلا سرا۔

سُوہا۔ باریک قسم کا ریشمی یا سوتی سرخ رنگ کا کپڑا۔

سُوز خوانی۔ سوز پڑھنا۔ سوز نظم کی ایک قسم ہے۔ جو شہدائے کربلا کے غم میں خاص مقررہ انداز میں پڑھی جاتی ہے۔

سَوسَن۔ چنبیلی۔

سیم۔ چاندی۔

سیم غبغب۔ چاندی جیسی ٹھوڑی خوبصورت گوری ٹھوڑی

سینگڑے۔ سینگ کے بنے ہوئے باجے۔

سیم تن۔ گورا بدن۔

سیم ساق۔ گوری پنڈلی۔

سَیل۔ سیلاب۔

سِیاق۔ علم حساب۔ حساب کتاب

سِیاق سَباق۔ پچھلا، اگلا۔ شروع آخر

سِیٹھیان سنانا۔ گالیاں دینا

سِیلیاں۔ گردن میں پہننے کا ایک زیور

سیس پھول۔ سر کا ایک زیور جو بالوں کی چوٹی میں لگایا جاتا ہے۔

سُیُوف۔ تلواریں۔ سیف کی جمع ہے۔

سیمرغ۔ ایک بہت بڑا پرندہ جس کا ذکر کہانیوں اور پرانی روایتوں میں ملتا ہے مگر اس کے وجود کا پتہ نہیں۔

ش

شامِ اودھ۔ لکھنؤ کی شام جو اپنی رنگا رنگ دلچسپیوں کے باعث مشہور تھی۔ نوابین اور شاہان اودھ کے زمانہ میں شام کو بازاروں کی سجاوٹ اور تفریحات کی رنگا رنگی نہایت دلکش تھی۔ جو آج تک مشہور ہے۔

شاہنامہ۔ ایران کے بلند شاعر فردوسی کی تصنیف، جو قدیم ایران کی منظوم تاریخ ہے۔ فردوسی نے یہ تاریخ سلطان محمود غزنوی کی فرمائش

پر منظوم کی تھی اس میں ساٹھ ہزار
اشعار ہیں۔
شبدیز۔ سیاہ رنگ کا گھوڑا جو مشکی کہلاتا
ہے۔ اور وہ گھوڑا جو خسرو بادشاہ
نے پرویز کو دیا تھا۔
شتت شملہم۔ (خدا کرے) ان کا گروہ
بکھر جائے۔ تتر بتر ہو جائے۔
شجیع۔ بہت بہادر۔
شبیہ۔ ہم شکل۔
شجرِ طوبیٰ۔ بہشت کے ایک درخت کا نام۔
طوبیٰ کے معنی خوش خبری۔
شحنہ۔ کوتوال۔
شدھ۔ پاک خالص (ہندی)
شرغاٹا نکھن۔ وہ گھوڑا جو پورا
بادامی رنگ کا ہو۔
شعار۔ طریقہ۔ طرزِ عمل۔ چلن
شغال۔ گیدڑ
شفتل۔ بدکردار۔ آوارہ
شق القمر۔ چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔
روایت ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت
محمد صلعم کی ایک انگلی کے اشارہ
پر چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے
تھے۔ یہ آپ کا نمایاں معجزہ سمجھا
جاتا ہے۔
شقہ۔ بادشاہی فرمان والی تحریر رقعہ۔

شکرم۔ ایک قسم کی سواری۔ بگھی فٹن جسے
انگریزوں نے رائج کیا۔
شگرف۔ عمدہ۔ اچھا۔ مضبوط۔
شلک۔ بندوق اور توپ داغنے کی آواز۔
شلانگیں بھرنا۔ چھلانگ لگانا۔ اچھلنا
شمس بازغہ۔ روشن سورج۔ علم ہیئت
اور فلسفہ کی ایک عربی کتاب کا نام ہے
جو بہت مشہور ہے قدیم نصابِ تعلیم
میں شامل ہے۔
شمر۔ وہ شخص جس نے میدانِ کربلا کی
جنگ میں حضرت امام حسین رضؓ کا
سر مبارک تن سے جدا کیا تھا۔
شماتت۔ دوسروں کی تکلیف پر خوش
ہونا۔
شنیع۔ بہت برا۔ گالی گلوج۔
شنجرف۔ گہرے سرخ رنگ نرم پتھر
جو دواؤں میں استعمال ہوتا ہے
شیمہ۔ خصلت۔ عادت
شہرِ شملہ۔ اندھیر نگری۔
شہلا۔ سرخ اور سیاہ آنکھ والا۔ نرگس
کی ایک قسم
شیر افگن۔ شیر کو پچھاڑنے والا بادشاہ
جہاں گیر کی بیگم ملکہ نورجہاں کے
پہلے شوہر کا نام ہے۔ جو بہت بہادر
تھا اور اس نے مقابلہ پر ایک شیر

کو مار ڈالا تھا۔

شیخ الرئیس۔ مشہور عالم اور طبیب حکیم بو علی ابن سینا کا لقب ہے۔

شیخ سدو۔ ایک فرضی بزرگ یا جن جس کی عقیدت مند عورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اس کی قبر امروہہ ضلع مراداباد میں زیارت گاہ عام ہے۔ اس کے نام کا بکرا بطور منت ذبح کیا جاتا ہے۔

شیدی لندھور۔ ایک مشہور حبشی کا نام ہے۔

شیون۔ رنج و افسوس

"ص"

صاد کرنا۔ پسند کرنا۔

صاعقہ۔ کڑک بجلی چمکنے کی تیز آواز۔

صارم۔ تیز کاٹنے والی تلوار۔ بہادر آدمی۔

صباغ۔ رنگ ریز۔ کپڑے رنگنے والا۔

صبیہ۔ نابالغ لڑکی۔

صبوحی۔ صبح کو پینے والی شراب۔

صحنک۔ رکابی۔ طباق۔ کسی برتن میں کھانے کی چیزیں رکھ کر حضرت بی بی فاطمہ کی نذر دلاتے ہیں۔ اور پاک دامن عورتیں وہ کھانا کھاتی ہیں۔ بعض جگہ یہ رسم اب بھی جاری ہے۔

صرفہ۔ فائدہ

صخرہ۔ چٹان۔

صرع۔ مرگی کی بیماری۔

صریر۔ قلم چلنے کی آواز

صخوا۔ مولا۔ جو ایک خوبصورت چڑیا ہے

صعود۔ اوپر چڑھنا۔ ابھارنا

صفدر۔ بہادر شیر

صلبی۔ پشتینی۔ حقیقی نسل کا ہونا۔

صلابت۔ ٹھوس ہونا۔ سختی

صلواتیں سنانا۔ برا بھلا کہنا۔ ملامت کرنا۔

صمصام۔ شمشیر

صمیم۔ خالص۔ تہہ دل سے۔ مغز۔

صم۔ بہرہ

صوت۔ آواز

صوف۔ پشمینہ۔ اون

صولت۔ رعب۔ دبدبہ۔ حملہ۔

صہبا۔ شراب۔

صیت۔ شہرت۔

صیغہ۔ سانچہ۔ محکمہ۔ فعل کی مختلف صورتوں کو صیغہ کہتے ہیں۔

صیانت۔ حفاظت۔ دیکھ بھال۔

صیرفی۔ صراف۔ حیلہ گر۔ پرکھنے والا۔

صَیف۔ گرمی کا موسم۔
صَہُونِیت۔ یہودیت۔ یہودیوں کی
عالمی تحریک کا نام۔

"ض"

ضَاحِک۔ ہنسنے والا۔
ضُحیٰ۔ چاشت کا وقت۔
ضِرغام۔ زبردست شیر۔ درندہ
ضَغطہ۔ تنگی۔ سختی۔ دباؤ
ضَرِیح۔ قبر۔
ضَیف۔ مہمان
ضَیغَم۔ پھاڑ کھانے والا شیر
ضِیق۔ تنگ۔
ضِیق النَّفس۔ بیماری کا نام۔ سانس
کا تنگی کے ساتھ آنا جانا۔ جسے دمہ
کہتے ہیں۔

"ط"

طَالِع۔ قسمت۔ نصیب۔ طلوع ہونے
والا۔
طَارَم۔ لکڑی کا مکان۔ بالاخانہ۔
طَاس۔ طشت۔ لگن۔ بڑا تھال۔
طَاغوت۔ شیطان۔

طائفہ۔ گروہ۔ آدمیوں کی ٹولی۔
طَالِع شناس۔ نجومی۔ قسمت کا حال
بتانے والا۔
طَابَ ثَراہُ۔ اس کی قبر کی مٹی نرم و خشگوار
رہے۔
طَاقِ کسریٰ۔ نوشیرواں بادشاہ کا محل
طَبخ۔ پکانا۔
طَبَّاع۔ تیز طبیعت
طِبِّ اکبر۔ طب کی ایک کتاب کا نام ہے
جس کے مصنف حکیم محمد اکبر ارزانی تھے۔
طَبلہ عطار۔ عطر فروش کا وہ ڈبہ یا خاص
ظرف جس میں عطر رکھتا ہے۔
طبل۔ بڑا ڈھول۔
طُرفہ۔ انوکھی بات۔ انوکھی چیز۔
طُرفۃُ العین۔ پلک جھپکنے کا وقفہ۔
طربوش۔ ترکی ٹوپی۔
طُعم۔ لذت۔ ذائقہ۔
طُغیان۔ سرکشی۔ بغاوت۔
طُغرا۔ ایک قسم کا خاص نشان بطور نام
یا عبارت مختصر جگہ لکھنا۔ زیادہ الفاظ
کو کم سے کم حروف میں خوبصورتی
سے لکھنا۔ آرائش کے لیے ایسے
طغرے مکان کے اندر لگائے جاتے
ہیں۔ خطِ طغرا۔ خوشنویسی کی ایک
قسم ہے۔

طِفلَس ۔ ملک قفقاز کا قدیم دارالحکومت
طَلاقت ۔ تیز زبانی ۔
طَلعت ۔ دیدار ۔ روشنی
طَلایہ ۔ فوج کا وہ دستہ جو رات
" کو شہر کی حفاظت کے لیے گشت
کرے ۔
طَنّاز ۔ شوخ ۔ نازو انداز دکھانے
والا
طَنطنہ ۔ نقارہ کی آواز
طَنبورہ ۔ چھ تاروں کا ستار
طُورِی ۔ بٹیر کی ایک قسم جو لڑائی جاتی ہے
طُوبیٰ ۔ بہشت کا ایک پھل دار درخت
طُومار ۔ کاغذ کا گٹھا
طَیران ۔ اڑتا ۔ اڑانا

"ظ"

ظبی ۔ ہرن ۔
ظلمات ۔ اندھیرے ۔ ایک سمندر کا
" نام جس کو بحر اٹلانٹک کہتے ہیں.
" اس مقام کو بھی کہا جاتا ہے
جہاں آبِ حیات کا چشمہ ہے .
ظلُوم ۔ بہت بڑا ظالم ۔
ظن ۔ گمان ۔ خیال ۔
ظِما ۔ پیاس ۔ تشنگی ۔
ظَہرِی ۔ پشت والی چیز ۔
ظَہر ۔ پیٹھ

"ع"

عاج ۔ ہاتھی دانت
عاجِل ۔ جلدی کرنے والا ۔
موجود چیز
عار ۔ شرم ۔ حیا ۔
عارِض ۔ گال ۔ رُخسار ۔
عارِی ۔ ننگا ۔ برہنہ ۔ خالی
عاشُورہ ۔ ماہِ محرم کی دسویں
" تاریخ ۔ حضرت
امام حسین کی شہادت کا دن
عاطِفت ۔ سرپرستی ۔ حمایت ۔
مہربانی ۔
عاق ۔ باپ سے سرکشی کرنے
والا ۔
عالی گہر ۔ معزز خاندان ۔
" اونچی ذات والا
عدُول ۔ نافرمانی ۔ حکم کے
" خلاف کرنا ۔
عدَن ۔ عرب کا ایک مشہور شہر
جو ملک یمن میں شامل ہے
اور ساحل سمندر پر واقع

ہے۔ وہاں کے موتی بہت مشہور
ہیں۔ دُرِ عدن، کو شاعروں
اور نثر نگاروں نے بطور تشبیہہ
استعمال کیا ہے۔

عَدِیمُ والشَّبِیہْ ۔ جس کے مثل کوئی نہ ہو۔
جس کا کوئی ساجھے دار
نہ ہو

عُذُوبَتْ ۔ مٹھاس۔

عَزَازِیْلْ ۔ شیطان۔

عُزْلَتْ ۔ گوشہ نشینی۔

عَزْلْ ۔ ہٹانا۔ جگہ سے اتارنا۔
مرتبہ گھٹانا

عَرُوضْ ۔ وزنِ شعر کا علم۔ یہ فن خلیل
ابن احمد نے ایجاد کیا تھا۔ تاکہ
اشعار کے وزن کی جانچ کی جاسکے
اس کے لئے جو وزن مقرر ہیں
ان کو بحرین کہتے ہیں۔ اصل بحرین
۱۸ ہیں ان کی مدد سے چند اور
بحرین بنائی گئی ہیں۔

عَرْبَدہ جو ۔ لڑاکا۔ لڑائی کے لئے بہانے
ڈھونڈنے والا۔

عَرَق گیر ۔ وہ آلہ یا ظرف جس میں
دواؤں کا عرق کشید کیا جاتا ہے

عَسْکَرْ ۔ فوج۔ لشکر

عُشْر عَشِیْر ۔ دسواں حصہ۔ تھوڑا سا

عِشْقِ پیچاں ۔ ایک بیل دار پودا،
جس کی بیل درختوں اور دیواروں
پر چڑھ جاتی ہے۔

عَصَافِیْر ۔ گوریا چڑیاں۔ عُصفُور کی
جمع ہے۔

عُطَارُدْ ۔ ایک ستارہ جو منشی فلک
کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں علم و فضل
اس کے متعلق ہے۔

عَطَشْ ۔ پیاس۔

عُطَارُد قلم ۔ بہترین لکھنے والا۔

عَظِیْم واللہ فانی حقہ ۔ ایک قسم کا
حقہ جو اپنے موجد کے نام سے
مشہور ہے۔

عِفْرِیْتْ ۔ بھوت۔ پریت۔ دیو

عَفِیْفَہْ ۔ پاک دامن۔

عَقْرَبْ ۔ بچھو۔

عَقِیْمْ ۔ بانجھ۔

عقیقِ یمین ۔ عرب کے ملک یمن کا
یاقوت۔ جو قدیم زمانہ سے مشہور ہے۔

عَلَفْ ۔ گھاس۔ چارہ۔

علم لَدُنّی ۔ خداداد علم

عَلَی التَّوَاتُرْ ۔ مسلسل۔ لگاتار۔

عَلَّامِی ۔ بہت علم والا۔ علامہ بھی
کہتے ہیں۔

عَلَائِمْ ۔ نشان۔ علامتیں (اسباب)

عماری ۔ ہودج ۔ اونٹ پر رکھنے
" کے لئے ایک طرح کی بند ڈول
" سی بنا دیتے ہیں جس میں سواریاں
" بیٹھتی ہیں
عُمق ۔ گہرائی ۔
عُمود ۔ ستون ۔
عَمَّ نوالہٗ ۔ اس کی بخشش عام ہے ۔
عَمرو عیّار ۔ ایک چالاک شخص کا نام
" جو بڑا فریب کار اور جادوگر تھا ۔
" یہ فرضی نام داستان امیر حمزہ
" کے مصنفوں نے خوب استعمال
" کیا ہے ۔ اس کی زنبیل یعنی جھولا
" مشہور تھا جس میں چھوٹی بڑی
" بے شمار چیزیں سما جاتی تھیں
عُمرانیات ۔ قدیم زمانہ کے علوم
عُنصر ۔ جڑ ۔ بنیاد ۔
عُنفوان ۔ آغاز ۔ ابتدائی زمانہ ۔
اٹھتی جوانی ۔
عُنقا ۔ لمبی گردن کا ایک فرضی پرندہ
" جب کسی بے وجود چیز کا ذکر ہو
" تو یہ نام استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ
عَنبر ۔ ایک قسم کی خوشبو ۔ جو ایک بحری
" جانور کے جسم سے حاصل ہوتی ہے ۔
عُود ۔ ایک خوشبودار درخت کی لکڑی
" جس کو جلانے سے خوشبودار دھواں
نکلتا ہے ۔
عَینُ الکمال ۔ نظر بد ۔
عَیاذاً باللہ ۔ خدا کی پناہ ۔

" غ "

غالیہ مو ۔ خوشبودار، سیاہ
" بالوں والا ۔
غاشیہ بردار ۔ فرماں بردار ۔
غازہ ۔ ایک خوشبودار سفوف جو
" چہرہ پر ملا جاتا ہے ۔
غالیہ ریز ۔ خوشبو بکھیرنے والا ۔
" پھیلانے والا ۔
غَبغَب ۔ ٹھوڑی ۔
غَچّا کھانا ۔ دھوکہ کھانا ۔
غَت رَبود ۔ غائب ہونا ۔ ختم ہونا
غُرّہ ۔ چاند کے مہینے کی پہلی تاریخ ۔
غُرفش ۔ بحث تکرار ۔ غصہ کی
" باتیں ۔
غِربال ۔ چھلنی ۔
غُرفہ ۔ کھڑکی ۔ جھروکہ ۔
غِزال ۔ ہرن ۔
غَصب ۔ چھین لینا ۔ دوسرے کی
چیز جبراً لے لینا ۔
غَضنفر ۔ شیر درندہ ۔

غضِّ بصر ۔ چشم پوشی کرنا۔
غِل ۔ غش ۔ کدورت کھوٹ
غمّاز ۔ چغل خور۔
غنّہ ۔ جس کی آواز ناک سے نکلے۔
غوث ۔ فریاد رس۔ بڑا بزرگ۔
اولیاء اللہ کا ایک عہدہ۔
غوامض ۔ گہری قابل غور باتیں۔
" راز کی باتیں۔ مشکل مسائل
غوری ۔ تانبہ کی گہری پلیٹ یا پیالہ
غوّاص ۔ غوطہ لگانے والا۔
غیر ذالک ۔ اس کے سوا۔ علاوہ۔
غیر منقولہ ۔ جس کو منتقل نہ کیا جا سکے۔

"ف"

فاش ۔ ظاہر۔ آشکار۔
فارق ۔ جدائی ڈالنے والا۔ فرق
" کرنے والا۔
فاتر ۔ خراب۔ سست
فاقد ۔ گم کرنے والا۔ کھونے والا۔
فاقع ۔ گہرا پیلا رنگ۔
فائق ۔ بہتر۔ بلند ہونے والا۔
فاسخ ۔ توڑنے والا۔ ختم کرنے والا۔
فانوس ۔ ایک قسم کا شمع دان جو لٹکا
" دیا جاتا ہے۔

فتادگی ۔ گراپن۔ گرا ہوا ہونا۔
" کم ہمت ہونا۔
فتراک ۔ چلاّ شکار بند۔
فدوی ۔ قربان ہونے والا۔
عاجز۔ ناچیز۔
فرزانہ ۔ عقل مند۔ دانشور۔
فرس ۔ گھوڑا۔
فرسخ ۔ تین میل کے برابر فاصلہ۔
فرسنگ ۔ " "
فرسا ۔ پرانا ہونے والا۔ گھٹنے
" والا۔
فرہنگ ۔ عقل۔ بزرگی۔ لغت کی کتاب۔
فراوان ۔ بہت زیادہ۔
فرتوت ۔ بہت بوڑھا۔
فرزین ۔ شطرنج کا ایک مہرہ جو فرزین
" کہلاتا ہے۔
فرات ۔ عراق عرب کے ایک دریا کا
" نام ہے۔
فرید الدہر ۔ زمانہ بھر میں یکتا۔
فریدون ۔ ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔
فری مین ۔ قدیم انگلستان میں ایک
" پراسرار گروہ تھا جس کے ممبر
" کسی کو اپنا مسلک نہیں بتاتے
" تھے۔ اشاروں سے اپنے
" گروہ کے افراد کو پہچانتے تھے۔

" وہ اشارے وہی لوگ سمجھتے
" تھے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں
" میں بھی اس کا کچھ اثر پہونچا۔
" ہندوستان میں بھی اس کی
شہرت ہوئی۔

فَرُّخ نِہاد ۔ مبارک ذات والا۔
عالی نسب

فَرَع ۔ شاخ۔ ڈالی
فِرط ۔ زیادتی
فَخیم ۔ بزرگ۔ بڑی چیز۔
فُسحَت ۔ کشادگی۔ فراغت
فَش ۔ بے نتیجہ بات۔
فضیحت ۔ رسوائی۔ بدنامی۔
فغفور ۔ چین کے ایک قدیم بادشاہی
" خاندان کا لقب۔ اس خاندان
" کا ہر بادشاہ چین کہلاتا تھا
فَق ۔ حیران۔ پریشان۔
فِقدان ۔ گم ہونا۔ کم یاب ہونا۔
فَقید ۔ بے مثل۔ نایاب۔
فُکاہت ۔ خوش طبعی بذلہ سنجی
فلک سَیر ۔ ایک نشیلی دوا۔ افیون
" کو بھی کہتے ہیں۔
فنجان ۔ چھوٹی پیالی، چھوٹا پیالہ
جس میں قہوہ وغیرہ پیا جاتا ہے۔
فُوطہ دار ۔ خزانچی۔ نقد روپیہ رکھنے والا۔

فِیل ۔ مکر و فریب۔
فِیل پا ۔ پاؤں سوجنے کی بیماری۔
فَلکُ الافلاک ۔ سب آسمانوں
" سے بڑا اور بلند آسمان، ساتواں
" آسمان۔

"ق"

قاقُم ۔ ایک جانور کا نام ہے جس
کی کھال بہت قیمتی ہوتی ہے
" اور اس سے عمدہ لباس بنتا ہے۔
" یہ پہاڑی جانور بہت کمیاب
ہوتا ہے

قال و قِیل ۔ باہمی گفتگو جس میں
بحث مباحثہ کی صورت ہو۔
قابُوچی ۔ خودغرض، مطلبی۔ دربان۔
قَبا ۔ امیروں کا خاص لباس جو لمبا
" اور گھیردار ہوتا ہے۔ جس طرح
" عبا۔
قابِیل ۔ حضرت آدم کے دوسرے
بیٹے کا نام۔
قارُون ۔ ایک بہت دولت مند
" بادشاہ تھا مشہور ہے کہ اس کے
" خزانوں کی کنجیاں چالیس اونٹوں
پر لادی جاتی تھیں۔ قارون کا خزانہ

〃 ضرب المثل بن گیا ہے۔
قاہرہ ۔ ملک مصر کا دارالسلطنت
قُبّہ ۔ گول گنبد نما عمارت ۔ بُرج ۔
قدغن ۔ روک ۔ ممانعت ۔
قدّوس ۔ بہت پاکیزہ ۔
قدوہ ۔ رہنما ۔ سرگروہ ۔ منتخب ۔
قرابہ ۔ صراحی ۔ شراب رکھنے کا ظرف ۔
قرابین ۔ ایک قسم کی چھوٹی بندوق ۔
قرمز ۔ قرمزی ۔ سرخ ۔ ارغوانی رنگ ۔
قرن ۔ سو سال ۔ صدی ۔ ستاروں کا ملنا ۔
قرنا ۔ قرنائی ۔ بانسری ۔ نرسنگا
〃 سینگ کا بنا ہوا بگل ۔
قعر ۔ گہرائی ۔ غار ۔ گڑھا ۔
قراول ۔ سنتری ۔ بندوقچی ۔
قرص ۔ ٹکیہ ۔ چٹکی ۔
قرم ساق ۔ کمینہ ۔ بھڑوا ۔
قرۃ العین ۔ آنکھ کی ٹھنڈک ۔ مذہب
〃 بابی کی ایک رہنما خاتون کا نام بھی
ہے ۔
قسطاس ۔ ترازو ۔
قشون ۔ لشکر ۔ فوج کا دستہ ۔
قضا کار ۔ اتفاقاً ۔
قطامہ ۔ کٹنی ۔ حشہ عورت ۔
قطرب ۔ مرگی کا مرض جنوں کی ایک قسم ۔
قطاع الطریق ۔ رہزن ۔ ڈاکو ۔ لیٹرے ۔

قفس عنصری ۔ مراد انسان کا جسم
〃 جس کے اندر روح قید ہے ۔
قلماقنی ۔ وہ عورت جو مسلح ہو کر
〃 بادشاہوں اور امیروں کے
〃 محلوں میں پہرہ دیتی ہے ۔
قلابہ ۔ مچھلی پکڑنے کا کانٹا ۔
قلیان ۔ حقہ ۔
قلب ساز ۔ جعلی سکہ اور سونا چاندی
〃 بنانے والا ۔
قلاچنگ ۔ پہلوانی کا ایک خاص
داؤں ۔
قماش ۔ ڈھنگ ۔ گنجفہ کی ایک
بازی ۔
قم ۔ لفظی معنی " اُٹھ کھڑا ہو ۔
〃 ایران کے ایک مشہور شہر کا
〃 نام ہے جو علماء کا مرکز ہے
قنات ۔ چاروں طرف کا پردہ ۔
قنوج ۔ اودھ کا مشہور مردم خیز
〃 قصبہ جو ضلع ہردوئی (اتر پردیش)
〃 میں واقع ہے زمانہ قدیم میں
〃 علماء اور فنکاروں کا مرکز تھا ۔
قوز ۔ وہ فیتہ جو کپڑوں کے حاشیہ
پر لگاتے ہیں ۔
قوارہ ۔ ٹکڑا ۔ پارچہ ۔
قیراط ۔ ایک وزن کا نام ۔ اونس کا چوبیسواں حصہ

"ک"

کاسک ۔ روس کے مشرقی علاقہ
کی ایک قوم کا نام ہے۔
کاکل ۔ زلف ۔ لمبے بال ۔
کارِچوب ۔ سونے یا چاندی کے
" تاروں سے کپڑوں پر پھول
" اور بیل بوٹے بنانے کی لکڑیاں یا اوزار
کاواک ۔ خالی ۔ کھوکھلی چیز ۔
کالم ۔ فوج کا ایک دستہ ۔ صفحے کے
" دو حصے ۔
کامروپ ۔ آسام کا ایک علاقہ جو
" جادوگروں کا مرکز تھا ۔ یہاں
" کے جادوگر مشہور ہیں ۔
کاوا دینا ۔ گھوڑے کو چکر دینا ۔
کاپَر ۔ بزدل ۔ مغلوب ۔
کایا ۔ شکل جسم ۔ روپ ۔
کاگریزی ۔ سرخی مائل سیاہ رنگ
بینجنی رنگ ۔
کاسد ۔ کھوٹا ناقص ۔ بے قدر
کارِچوبی ۔ زردوزی ۔ سونے
کے تاروں کا کام ۔
کاسِبت ۔ کمانے والا ۔
کاری ۔ گہرا ۔ سخت ۔

کافہ ۔ گروہ ۔ بھیڑ ۔
کانڈ ۔ باب حصہ
کائیاں ۔ دغاباز ۔ چالاک ۔
کالبُد ۔ ڈھانچہ ۔ جسم ۔
کبریت ۔ گندھک ۔
کبک ۔ چکور (ایک پرندہ) ۔
کپوت ۔ نافرمان بیٹا ۔
کتارا ۔ گنے کی ایک قسم ۔ اٹلی کا
" پھل ۔
کتان ۔ باریک ریشمی کپڑا جو بہت
" نازک ہوتا ہے ۔ السی اور سن
" سے بنا جاتا ہے اور چاندنی کی روشنی ۔
" پڑتے ہی پھٹ جاتا ہے ۔ جیساکہ
" مشہور ہے ۔
کتھک ۔ گویا ۔ ناچنے والا ۔ ناچ
کی ایک قسم ۔
کحل الجواہر ۔ وہ سُرمہ جس میں موتی
" شامل ہوں ۔
کڈھب ۔ بے ڈھنگ ۔ بے طور ۔
کرن پھول ۔ کانوں میں پہننے کا
" ایک زیور ۔
کرم پیلہ ۔ ریشم بنانے والا کیڑا ۔
کروبی ۔ فرشتہ ۔
کرمک شب تاب ۔ جگنو ۔
کرگس ۔ گدھ ۔

کژدُم ۔ بچھو ۔
کَستُورِی ۔ مُشک ۔ جو مُشکی ہرن
" کی ناف سے نکلتی ہے ۔
کَسبِی ۔ بیسوا ۔ آوارہ ۔
کُسُم ۔ زعفران ۔
کَسگَرنی ۔ کمہارن ۔
کَشِش اُنابِیبِ شعرِی ۔ وہ کشش
" جس سے رقیق (پتلی) چیز اپنی
" ہموار سطح سے اوپر چڑھ جاتی ہے
کَشف ۔ کھولنا ۔
کَفاف ۔ وظیفہ ۔ روزینہ معاش
کَفشگر ۔ جوتے بنانے والا ۔
کُفرَان ۔ ناشکری ۔
کَفش دُوز ۔ موچی ۔
کَفِیل ۔ ذمہ دار ۔ دوسرے کا کام
خود کرنے والا ۔
کُگڑ والا ۔ بازار میں حقہ پلانے والا
کَلبَدرِ فی النّجُوم ۔ جیسے چودھویں
" تاریخ کا چاند، ستاروں کے
" درمیان نظر آئے ۔
کَلپانا ۔ غمگین کرنا ۔ ستانا ۔
کَلپنا ۔ زور زور سے رونا ۔
کَلتھی ۔ سیاہ رنگ کا ایک اناج ۔
کَلاوَنت ۔ گویا ۔
کَلجُگ ۔ برا زمانہ ۔

کَلَنک ۔ الزام ۔ بدنامی ۔
کُلاغ ۔ کوّا ۔
کُلال ۔ کمہار ۔
کُلُوخ اندازی ۔ پتھر پھینکنا ۔
" ڈھیلے مارنا ۔
کُمپاس ۔ زمین ناپنے کا آلہ ۔
کُمَیت ۔ سُرخ رنگ کا گھوڑا ۔
کماینبغی ۔ جیسا کہ چاہیے ۔
کمانچہ ۔ سارنگی جیسا ایک ساز ۔
کمبری ۔ وہ گھوڑا جو چڑھائی پر نہ
" چڑھ سکے ۔
کُنہ ۔ حقیقت ۔ اصلیت ۔ گہرائی ۔
کَنچنی ۔ رنڈی ۔ کسبی ۔
کَنارِی ۔ چوڑا گوٹا ۔
کنعا ۔ ملک شام کا قدیم شہر جہاں
" حضرت یعقوب پیغمبر رہتے تھے ۔
" ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ
" حسن و جمال میں ممتاز تھے جن کو
" ان کے سوتیلے بھائیوں نے کنویں
" میں ڈال دیا تھا ۔ ان کو ماہِ کنعان
بھی کہتے ہیں ۔
کُورنِش ۔ آداب بجالانا ۔ تعظیم کرنا ۔
کُوس ۔ نقارہ ۔
کُوتَل ۔ وہ گھوڑا جس کو سجا بنا کر
" امراء کی سواری کے ساتھ لیجاتے ہیں

کوکا ۔ دائی کا بیٹا ۔ اتالیق ۔
کوکھ جلی ۔ بانجھ ۔
کوزدہ ۔ چھوٹا گاؤں ۔ پُروا ۔
کونچے ۔ وہ پٹھا جو پاؤں کے پیچھے
" اور ایڑی کے اوپر ہوتا ہے ،
" اگر وہ کٹ جائے تو چلنا مشکل
ہوتا ہے ۔
کوہ کن ۔ پہاڑ کھودنے والا ۔
" مراد فرہاد ہے جو شیریں پر
" عاشق تھا اور اس کے حکم سے
" پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کی کوشش
" میں اپنے ہی تیشہ سے ہلاک ہوگیا
" تفصیل لفظ جوئے شیر کی
تشریح میں لکھی گئی ہے ۔
کوہِ نور ۔ مشہور ہیرا ۔ جو راجہ بکرما
" جیت کو ملا تھا ۔ اُس سے
" مالوہ کے کسی راجہ کے ہاتھ لگا ،
" جس سے ہمایوں بادشاہ کو ملا ۔
" اکبر اور جہاں گیر کے خزانہ میں
" رہا ۔ شاہ جہاں نے اپنے تاج
" میں جڑوا لیا ۔ اسی کے خاندان
" میں رہا ۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ
" میں نادر شاہ درانی نے دہلی پر
" حملہ کیا اور محمد شاہ سے کوہِ نور
چھین لیا اور ساتھ افغانستان لے گیا ۔
" شاہ شجاع کے ذریعہ یہ
" مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ
" آیا اس سے انگریزوں نے
" حاصل کر کے انگلستان پہونچا
" دیا جو وہاں کے شاہی تاج
" میں جڑ اگیا ۔ اب ملکۂ برطانیہ
" کے تاج کی زینت ہے ۔
کوہِ قاف ۔ بحرِ کیسپین اور بحرِ
" اسود کے درمیان ایک پہاڑ
" ہے جس کے شمال میں آرمینیا
" آذر بائیجان اور جارجیا واقع
" ہیں یہاں کی عورتیں بہت
" خوبصورت مشہور ہیں ۔ پرانی
" عوامی کہانیوں میں کوہِ قاف
" کی پریوں کا بہت ذکر آتا ہے
کہرَوا ۔ صبح کا تاج ۔
کہولت ۔ ادھیڑ عمر ہونا ۔ بالوں کا
" کھچڑی ہونا ۔
کیتکی ۔ ایک پھول کا نام ہے
کید ۔ مکر ۔ فریب ۔

"گ"

گاب ۔ گودا ۔ مغز ۔
گات ۔ وضع ۔ ڈھنگ ۔

گاج ۔ غصہ۔ گرج۔
گاج پڑے ۔ آفت آئے۔ مصیبت پڑے۔
گاذر ۔ دھوبی۔
گاؤ زمین ۔ وہ گائے جس کے لئے
" مشہور ہے کہ اس کے سینگوں پر
" زمین کا بوجھ ہے۔
گاؤدی ۔ احمق۔ بیوقوف۔
گٹکری ۔ وہ پیچدار آواز جو گانے
" والوں کے گلے سے نکلتی ہے۔
گٹکا ۔ چھوٹی کتاب۔ بڑی کتاب کا
" خلاصہ۔ ایک طلسمی گولی جس کو منہ
" میں رکھ کر اڑ جاتے ہیں یہ عوامی
روایت ہے
گڑھیاں کرنا۔ تپاک ظاہر کرنا۔
گاڑھی بوٹی چڑھانا۔ زیادہ بھنگ
پی جانا۔
گذری ۔ شام کا بازار۔ وہ بازار
" جو شام کو لگتا ہے۔
گزلک ۔ قلم تراش۔ وہ چاقو جس کی
نوک مڑی ہوئی ہوتی ہے۔
گرگ ۔ بھیڑیا۔
گل کھلانا ۔ فساد کھڑا کرنا۔ انوکھا
کام کرنا۔
گل چلا ۔ بندوق کی گولی نشانے
" پر لگانے والا۔

گل بکاؤلی ۔ ایک پھول کا نام ہے۔
" ایک پری کا نام جس کا قصہ
بہت مشہور ہے
گلزار نسیم ۔ نسیم لکھنوی کی لکھی ہوئی
مثنوی کا نام ہے۔ جس میں
" گل بکاولی کا قصہ نظم کیا ہے۔ اردو
کی مشہور اور مقبول مثنوی ہے
گلخن ۔ انگیٹھی۔
گل سرسبد ۔ ممتاز۔ چنا ہوا پھول
گل بانگ ۔ خوشی کا شور وغل
گل اندام ۔ پھول جیسے نرم و خوبصورت
جسم والا۔
گل دم ۔ بلبل۔ ایک سرخ رنگ
کی چڑیا۔
گل دینا۔ پھانسی دینا۔
گل ڈاب کرنا۔ کسی کا مال چھین لینا۔
گل ڈانگ ۔ خونخوار شکاری کتا
جو بہت قوی ہوتا ہے۔
گلخب ۔ باہمی تکرار۔ رنجش کی
باتیں۔
گوت ۔ خاندان قبیلہ۔
گوگرد ۔ گندھک۔
گوہر شب چراغ ۔ بہت شفاف
اور چمکدار یاقوت جو اندھیرے
میں دھکتے کوئلے کی طرح چمکتا ہے۔

گھُرد - مڑا ہوا گوٹا۔ لچکا۔
گوپامَو - ایک مشہور تاریخی قصبہ جہاں
بڑے بڑے عالم و فاضل
پیدا ہوئے۔ یہاں کے لوگ بدماغ
اور مغرور مشہور تھے یہ قصبہ ضلع
ہردوئی (اتر پردیش) میں واقع ہے
گھُور - گہرا رنگ۔ ڈراونی گرج۔
گیتی - دنیا۔ عالم۔
گیدی - بزدل۔ احمق۔ لالچی۔
گیہان - دنیا۔ جہان۔
گیاہ - گھاس۔
گیانی - عالم۔ عقل مند۔

ل

لآلی - موتی۔
لابُد - ضروری۔
لابہ - خوشامد۔ چاپلوسی۔
لاجرم - ضرور۔ خواہ مخواہ۔
لاجورد - نیلے رنگ کا ایک قیمتی پتھر۔
لاریب - بے شک۔ بلاشبہ۔
لات - ایک بت کا نام جو اسلام
سے پہلے کعبہ کے اندر رکھا جاتا تھا۔
لاطائل - فضول۔ بے فائدہ۔
لامس - چھونے والا۔

لامع - روشن۔ چمکنے والا۔
لاینفک - جدا نہ ہونے والا۔
لامی - ایک دبیز قسم کا ریشمی کپڑا
گھیدن کی طرح۔
لبیب - عقل مند۔
لبیک - حاضر ہوں میں (پکار کا جواب)۔
لترے - چغل خور۔ ادھر کی اُدھر لگانے
والے۔
لٹکن - کان کا ایک زیور۔ کرن پھول۔
لُجّہ - بھنور۔ تھاہ۔
لحم خوک - خنزیر کا گوشت۔
لخلخہ - ایک خوشبودار مرکب جو سونگھنے
کے لئے بنایا جاتا ہے۔ بے ہوشی کی
حالت میں سنگھانے سے
ہوش آجاتا ہے۔
لحیم - موٹا تازہ۔
لعبت - گڑیا۔
لف و نشر - لپٹا ہوا اور کھلا ہوا۔
فن بلاغت کی ایک اصطلاح ہے۔
لگد - لات۔ ٹھوکر
لن ترانی - "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ
سکتے" یہ آیت قرآنی کا ایک جز
ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے کوہ طور
پر اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش
ظاہر کی تو ان کو یہ جواب ملا تھا۔

〃 اردو میں یہ لفظ شیخی بگھارنے
〃 اور ڈینگ ہانکنے کے معنی میں
〃 استعمال ہوتا ہے۔
لَوث ۔ آلودگی ۔
لَوذَعِیْ ۔ سمجھ دار۔ تیز فہم ۔
لَو فَرَضْنَا ۔ اگر ہم فرض کریں۔ مان لیں۔
لَوز ۔ بادام ۔
(۱) لَو نَگنا ۔ چمکنا۔ تیز روشنی یا چمک
〃 ہونا بجلی کا چمک کر اِدھر اُدھر
〃 نظر آنا ۔
لَہِیب ۔ شعلہ ۔
لَہنہ ۔ احمق ۔ گھامڑ ۔
لَیتَ ۔ کاش کہ ۔ تمنا کرنا ۔
لَیلَۃُ البَدر ۔ چاند کی چودھویں رات ۔
لِینَت ۔ نرمی ۔
لَوَّامہ ۔ سخت ملامت کرنے والا ۔
لَوذَعِی ۔ تیز فہم ۔ سمجھدار ۔
لَعِیم ۔ کمینہ ۔

" م "

مَآب ۔ لوٹنے کی جگہ ۔ بازگشت ۔
مَا بَقِیَ ۔ جو باقی رہ گیا ۔
مَا بِہِ الاِحتِیَاج ۔ جس چیز کی
ضرورت ہو ۔

مَاثُوزہ ۔ نقل کیا ہوا ۔ جزادیا ہوا ۔
مَاثُوم ۔ گنہگار ۔
مَاجِد ۔ بزرگ مردِ بزرگوار ۔
مَاخُوذ ۔ گرفتار ۔ پکڑا ہوا ۔
مَارگَزِیدہ ۔ سانپ کا ڈسا ہوا ۔
مَارُوت ۔ ایک فرشتہ کا نام ۔
مَالَا یُطَاق ۔ جس چیز کی طاقت نہ ہو
〃 ناقابل برداشت بوجھ ۔
مَالَا یَنحَل ۔ ناقابلِ حل ۔
مَال زَادِی ۔ کٹنی ۔ طوائف ۔
مَامَضیٰ ۔ جو گزر چکا ۔
مَامَن ۔ امن کی جگہ ۔
مَامُون ۔ محفوظ ۔
مَاوٰی ۔ واپسی کی جگہ ۔ مکان ٹھکانا ۔
مَاہِ نَخشَب ۔ حکیم ابن مقنع کا بنایا ہوا ۔
〃 مصنوعی چاند ۔ تفصیل "ج" کے
〃 تحت لکھی گئی ہے ۔
مَاہِیِ مَرَاتِب ۔ وہ اعزازی نشان
〃 جو بادشاہوں کی سواری کے
〃 آگے ہاتھیوں پر چلا کرتے تھے ۔
مَاجُور ۔ اجرت پایا ہوا ۔ بدلہ پانے
والا ۔
مُبَارِز ۔ فوج میں سے بڑھ کر
〃 لڑنے والا جنگجو ۔
مُبَذِّل ۔ زیادہ خرچ کرنے والا ۔

مُتَخاصِم ۔ باہم دشمنی کرنا۔ آپس میں
لڑنے والے ۔

مُتَخَیَّلہ ۔ خیال میں لایا ہوا۔ خیال کی جگہ ۔

متعہ ۔ کچھ مدت کے لیے کسی عورت
سے نکاح کر لینا۔ یہ طریقہ شیعہ مسلک میں
جائز ہے ۔

مُتَرَشِّح ۔ ٹپکنے والا ۔ ظاہر۔ عیاں

مُتَرَقِّب ۔ انتظار کرنے والا ۔

متصدِّی ۔ آگے آنے والا۔ خدمت
گار۔ پیشکار عربی زبان کا
مشہور شاعر جس نے نبوّت کا
دعویٰ کیا تھا اس نے سنہ ۹۶۰ء میں
وفات پائی۔

مَثَاب ۔ لوٹنے کی جگہ۔ ٹھکانہ ۔

مِثقال ۔ ساڑھے چار ماشہ وزن ۔

مُجاوَرت ۔ ہمسائگی ۔ پڑوسی ہونا۔

مُجْرَئی ۔ سلام کرنے والا۔ تعظیم دینے
والا ۔

محبس ۔ قید خانہ ۔ پنجرہ ۔

مُحاذِی ۔ روبرو ہونے والا ۔

مَحافہ ۔ ڈولی۔ فنس۔ پردہ دار
سواری ۔

مُحْرَم ۔ انگیا جو سینہ پر پہنی جاتی ہے ۔

مخضب ۔ رنگا ہوا۔ خضاب لگا ہوا ۔

مُخَدَّرات ۔ شریف پردہ نشین
خواتین ۔

مُخَنَّث ۔ خواجہ سرا۔ ہجڑا۔

مُخَیَّم ۔ خیمہ لگانے کی جگہ ۔

مَخْمَصَہ ۔ بھوک ۔ اضطراب بڑھانے
والا غم۔

مُداوَمَت ۔ ہمیشگی ۔

مَدخُولہ ۔ گھر ڈالی عورت ۔

مُدَقِّق ۔ باریک بیں۔ گہری نظر
سے جانچنے والا۔ باریک نکتہ پیدا
کرنے والا ۔

مُدَوَّر ۔ گول۔ گرد اگرد پھیرا یا ہوا۔

مُذنِب ۔ گنہگار ۔

مُذَہَّب ۔ سنہرا۔ سونے کا بنا ہوا ۔

مُرچنگ ۔ سہ شاخہ برچھے کی شکل کا
تار والا چھوٹا باجا جس کی آواز
بہت سریلی ہوتی ہے ۔

مُترادِف ۔ ہم معنی الفاظ ۔

مرگ چھالا ۔ ہرن کی بالوں سمیت
کھال۔ جس کو بچھا کر جوگی پوجا
کرتے ہیں ۔

مَرزبُوم ۔ جنم بھومی جائے ولادت

مَرغُولہ ۔ دھوئیں کا چھلا۔ بالوں کا
گھونگر ۔

مَرگِ مفاجات ۔ ناگہانی موت ۔

مرغولہ مو ۔ گھونگریالے بال والے ۔

مَرام ۔ مقصد ۔

مَروی ۔ روایت کیا ہوا۔ بیان کیا ہوا۔

مُرتاض ۔ ریاضت کرنے والا محنت
" کرنے والا ۔
مرّیخ ۔ ایک مشہور ستارہ ہے ۔
مرکوز ۔ جمایا ہوا ۔ گڑا ہوا ۔ ایک
" چیز پر نظر جمانا ۔
مُروّق ۔ صاف کی ہوئی چیز خاص
" طور سے سیال چیزوں کے لیے
" استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے پانی ۔
" شراب ۔ وغیرہ ۔
مُزخرف ۔ چھوٹی بات کو سجا کر دکھانا ۔
مُستاصل ۔ جڑ سے اکھاڑنے والا ۔
مُستدعی ۔ خواہش مند ۔ چاہنے والا ۔
مسٹ مارنا ۔ مکر کرنا ۔ اپنے عیب
" یا غلطی چھپانے کے لیے خاموش
" ہو کر پڑے رہنا ۔
مُستشرق ۔ یورپ کا وہ عالم جو
" مشرقی علوم میں مہارت حاصل
" کرے ۔
مُشتری خصال ۔ اچھی عادتوں
" والا ۔ مشتری ایک مشہور ستارہ
" ہے جس کے اثرات علم نجوم کے
" مطابق اسامی عادات واطوار
" پر اچھے مرتب ہوتے ہیں ۔
مشہد ۔ شہادت کی جگہ ۔ ایران کا
مشہور شہر جہاں امام موسیٰ رضا کا مدفن ہے ۔

مُشک گنج ۔ شہر لکھنؤ کے مرکزی
" حصہ میں ایک محلہ کا نام ہے ۔
" جہاں نوابی عہد میں سقے زیادہ
" آباد تھے ۔
مُشبّک ۔ وہ کھڑکی یا روشن دان
" جس میں باریک سوراخ ہو یا
" جالی لگی ہو ۔
مُصحف ۔ کتاب ۔ آسمانی کتاب کو
" کہتے ہیں قرآن شریف کے لیے
" بھی مستعمل ہے ۔
مصر کے مینار ۔ ان کو اہرام کہا
" جاتا ہے یہ قدیم مصری بادشاہوں
" کے مقبرے ہیں ۔ جن کے اندر ان
" کی لاشیں مالے لگا کر محفوظ
" رکھی گئی ہیں اور ساتھ ہی مال و زر
" بھی ۔ یہ بہت مضبوط پتھر کے اونچے
" میناروں کی شکل کے بنے ہیں ۔
مصئون ۔ محفوظ ۔
مصاف ۔ جنگ
مضراب ۔ لوہے کا وہ تار جو نکونا
" ہوتا ہے ، جس سے ستار بجاتے ہیں ۔
مُضیٰ / ماضی ۔ جو ہوا سو ہوا ۔

مضغہ ۔ ٹکڑا ۔ لوتھڑا ۔ نوالہ بھر چیز ۔
مطروح ۔ حقیر ، ناپسندیدہ ۔ پھینکا ہوا ۔

مَطرُود۔ نکالا ہوا۔
مَطلَعُ الفجر۔ صبح ہونے کا وقت۔
صبح سویرے۔
مُطلَقُ العَنان۔ آزاد۔ بے لگام
کسی کی رائے نہ ماننے والا۔
مَطائبات۔ تفریحات۔ مہذب
تفریح۔
مُعرّا۔ ننگا۔ خالی۔
مَعمُورَہ۔ آباد۔ بھرا ہوا۔
مَعدَن۔ زمین کی کان۔
مَغار۔ غار۔ پہاڑ کی کھوہ۔
مُغبچہ۔ آتش پرست کا بیٹا۔
مَغاک۔ غار۔ گڑھا۔
مُفاوضہ۔ مشورہ کرنا۔ بات کہنا۔
مُقابہ۔ وہ صندوقچہ یا ڈبیہ جس
میں عورتیں سنگار کا سامان
رکھتی ہیں۔
مُقیش۔ سونے یا چاندی کے تاروں
سے بنی بیل۔ چوڑی جھالر۔
جو لباس میں لگائی جاتی ہے۔
مَقعَر۔ گہری جگہ۔ گڑھا۔
مُقارِنَت۔ اکٹھا ہونا۔
مَکتُوم۔ چھپا ہوا پوشیدہ رکھا ہوا۔
مَکائِد۔ مکر و فریب۔
مُکافات۔ پاداش۔ برائی کی سزا

مِلح۔ نمک۔
مَلکُوتی صِفات۔ اچھی عادتوں والا۔
فرشتوں جیسی خصلتوں والا۔
مُنکَر نَکیر۔ دو فرشتے جو مرنے کے بعد
قبر میں سوال و جواب کے لیے
آتے ہیں۔
مَنال۔ جائداد۔ دولت۔
مُندرے۔ کانچ کے حلقے جو کان
پگڑی۔ دستار میں پہنے جاتے ہیں۔
مَنجیرا۔ پیتل کی چوڑے منہ کی
کٹوری کا جوڑا جن کو آپس
میں ٹکرا کر باجے کی طرح بجاتے ہیں۔
مُوباف۔ بالوں کو لپیٹنے کا کپڑا
یا فیتہ۔
مَہزُول۔ لاغر۔ دبلا پتلا۔
مَہزُوم۔ شکست کھایا ہوا۔
مِینُو۔ بہشت۔
مَیمَنہ۔ دایاں حصہ۔ فوج کا دایاں
بازو۔
مَیسَرہ۔ بایاں حصہ۔ فوج کا بایاں
بازو۔
میر بخشی۔ زمانہ شاہی میں تنخواہ
تقسیم کرنے والا۔ عہدہ دار

" ن "

نابکار ۔ بدکردار ۔ بے کار ۔
نابلد ۔ پردیسی ۔ انجان ۔
نالکی ۔ لمبی آرام کرسی کے طرز پر بنی ہوئی تام جھام کی سواری جس کو کہار اٹھاتے تھے ۔
ناہج راہ چلنے والا ۔ کشادہ راہ پیدا کرنے والا ۔
ناشگفتہ ۔ بغیر پیدا ہوا ۔ بغیر پیدا ہوا ہو ۔
ناسوت ۔ دنیا ۔ عالم اجسام ۔
ناشکیب ۔ بے صبر ۔
ناصب ۔ گاڑنے والا ۔ نصب کرنے والا ۔
ناظورہ ۔ نگہبان ۔ مالی ۔
نافرجام ۔ بد انجام
ناقوز ۔ قرنا یا جا ۔ سنکھ
ناقوس ۔ سنکھ عبادت کا گھنٹہ جو صبح کو بجایا جاتا ہے ۔
نامساعدت ۔ ناموافقت ۔
ناوک ۔ چھوٹا تیر ۔
ناہید ۔ زہرہ ستارے کا دوسرا نام ۔ یہ ستارہ حسن و جمال سے منسوب ہے ۔
نبیل ۔ بزرگ ۔ خوبصورت ۔

نجابت ۔ بزرگی ۔ اچھے نسب والا ہونا ۔
نخچیر ۔ شکار ۔
نخل ۔ کھجور کا درخت ۔
نخاس ۔ دلال ۔ لکھنؤ کا مشہور گذری بازار ۔
نرت ۔ بھاؤ ۔ انداز ۔
نردبان ۔ زینہ سیڑھی ۔
نسطور ۔ آتش پرستوں کا رہنما ۔
نسترن ۔ ایک بڑے سفید پھول کا پودا ۔
نسیم عنبر شمیم ۔ عنبر کی مہک لئے ہوئے صبح کی ہوا
نیاً منسیّا ۔ بھولا بسرا ۔
نضارت ۔ تازگی ۔ شادابی ۔
نفخ ۔ پھونکنا ۔ ہوا بھرنا
نفیر ۔ بانسری کی آواز ۔
نقرہ خنگ ۔ گھوڑے کی ایک اعلیٰ قسم
نکیرین ۔ منکر اور نکیر دو فرشتوں کے نام ہیں جو مرنے والے سے قبر میں سوالات کرتے ہیں اور جواب مانگتے ہیں ۔
نمط ۔ روش ۔ طرح ۔
نمیقہ ۔ تحریر ۔ خط ۔ رقعہ ۔
نمّام ۔ چغل خور ۔ غلام ۔

نمش ۔ دودھ کی مصنوعی جھاگ جو سردی
" کے موسم میں دودھ میں مصری ملا کر
" رات کو شبنم میں رکھ دیتے ہیں
" صبح اس کو اچھالتے ہیں تو گاڑھا
" ذائقہ دار جھاگ بن جاتا ہے اس
کو کھاتے ہیں

نہنگ ۔ گھڑیال۔ مگرمچھ ۔

نہلیل ۔ بھاؤ۔ انداز

نورتن ۔ بازو کا جڑاؤ زیور ۔
" نو جواہرات کو بھی کہتے ہیں وہ
" یہ ہیں۔ لعل۔ موتی۔ پکھراج
" مونگا۔ لاجورد۔ نیلم۔ ہیرا
" یعقوت ۔ فیروزہ ۔

نیم روز ۔ دوپہر ۔

نیوشہ ۔ کان میں ڈالی ہوئی بات ۔

نیرنگ باز ۔ مکار۔ فریبی۔ جادوگر ۔

نیرو ۔ طاقت ۔ کس بل ۔

نیستا ۔ ترکل کا جنگل ۔

نیمچہ ۔ چھوٹی تلوار ۔

نی غم دزد نی غم کالا ۔ نہ چور کا ڈر
" نہ سامان کا غم

" و "

واثق ۔ معتبر ۔ مضبوط ۔

واجب الوجود ۔ وجود کے لائق ۔
" جس کا وجود لازمی ہو مراد
خدا تعالیٰ ۔

وارستگی ۔ فارغ البالی۔ آزادی ۔

وارفتگی ۔ پشیمانی۔ بے خبری ۔
" نڈھال پن ۔

وارفتہ ۔ کھویا ہوا۔ مدہوش ۔

واژگوں ۔ اوندھا۔ منحوس ۔

واسوختہ ۔ بیزار۔ کڑھا ہوا ۔

واعیہ ۔ نگہبان۔ حفاظت کرنے والا ۔

وامق ۔ دوست رکھنے والا۔ ایک
" مشہور عاشق کا نام جو عذرا نامی
" خاتون سے محبت کرتا تھا اُن کی
" داستانِ محبت بہت مشہور ہے ۔

وہب ۔ عطا کرنے والا۔ بخشنے والا ۔

ورع ۔ پرہیزگاری ۔

وسیم ۔ خوبصورت۔ نشان لگا ہوا ۔

وش ۔ مانند۔ نظیر ۔

وضوح ۔ آشکارا۔ ثبوت

وقاحت ۔ بے حیائی۔ بے ادبی ۔

وہبی ۔ بخشی ہوئی چیز ۔

واجب الانقیاد ۔ جس کی فرمانبرداری
ضروری ہو ۔

ونیراگی ۔ تارک دنیا ۔
" گوشہ نشین فقیر ۔

"ہ۔ ھ"

ہاتِف۔ آواز دینے والا۔ غیب کی
آواز

ہارُوت۔ ایک فرشتہ کا نام جو
" انسانی شکل میں اپنے دوسرے
" ساتھی ماروت کے ساتھ خدا
" کے حکم سے دنیا میں آزمائش
" کے لیئے آئے تھے تاکہ دیکھیں
" دنیا کی رنگینی کس طرح انسان
" کو گمراہ کرتی ہے۔ مگر وہ خود
" دنیا میں آکر گناہ کے مرتکب
" ہوئے تو ان کو سزا ملی۔

ہالِک۔ قتل کرنے والا۔ ہلاک کرنے
والا۔

ہالہ۔ دائرہ۔ چاند کے گرد روشنی
کا دائرہ۔

ہامُون۔ جنگل۔ ریگستان۔

ہذَیان۔ بیماری کی مدہوشی میں
بڑبڑانا۔

ہَراوَل۔ فوج کا وہ دستہ جو آگے
چلتا ہے۔

ہرج مرج۔ فتنہ فساد۔ گڑبڑ۔
" مصیبتیں۔

ہرزہ گو۔ بکواس کرنے والا۔ بیہودہ
" بکنے والا۔

ہِزبَر۔ چیتا۔ شیر۔

ہرڈونگی۔ جھگڑالو۔ شور غل کرنے والا۔

ہفت خوال۔ رستم پہلوان جب
" کاؤس کی حمایت میں لڑنے کے
" لیئے مازندران جا رہا تھا تو راستہ
میں اس کو سات خطرناک
" حادثات پیش آئے۔ جن سے
" اپنی قوت کے ذریعہ مقابلہ کرکے
" کامیاب رہا تھا۔ ان سات
" مقامات کو ہفت خوان کہا جاتا
" ہے یہ بھی روایت ہے کہ سات
کنوئیں راستہ میں اس کے لیئے
" کھودے گئے تھے ساتوں سے
" بنچ نکلا۔

ہفت اقلیم۔ دنیا کو قدیم علماء
" نے سات حصّوں پر تقسیم کیا
" تھا ہر حصّہ ایک اقلیم کہلاتا ہے
" مراد پوری دنیا۔

ہلاہل۔ قاتل زہر، جس کا علاج
" نہ ہو سکے۔

ہُما۔ ایک پرندہ کا نام۔ کہا جاتا ہے
" کہ وہ جس کے سر پر اتفاق سے
" بیٹھ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے

〃 سایۂ ہما۔ مشہور ہے ہما فرضی
〃 نام ہے جس کا دراصل کوئی
وجود نہیں ہے۔
ہُمایُوں۔ مبارک۔
ہموارہ۔ برابر۔
ہم سنگ۔ ہم پلّہ۔
ہونق۔ حیران۔
ہوادار۔ ڈولی کی طرح ایک
〃 سواری جس کو کہار اٹھاتے
ہیں۔
ہیزم۔ خشک لکڑی۔
ہیکل۔ بڑی عمارت۔ طوق۔
〃 ہار۔ گلے کا زیور۔
ہیہات۔ کلمہ حیرت و افسوس۔
ہیم راج۔ ایک مشہور ہندوستانی
〃 پہلوان کا نام۔
ہبوب۔ ہوا چلنا۔
ہمیانی۔ روپیہ رکھنے کی چھوٹی
تھیلی جو کمر میں باندھی جاتی ہے۔
ہفت قلم۔ سات مشہور خط،
〃 فن خوش نویسی کی اصطلاح۔
〃 سات خط یہ ہیں۔
〃 ثُلث۔ محقق۔ توقیع۔ ریحان
رُقاع۔ نسخ۔ نستعلیق۔

"ی"

یابُو۔ چھوٹا گھوڑا۔ ٹٹو۔
یاجوج ماجوج۔ ایک فسادی
〃 قوم جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے
یارانِ سرِ پل۔ بے تکلف اور
〃 بے فکرے دوست جو
مل بیٹھتے ہیں۔
یاسمن۔ چمیلی۔
یٰسین۔ قرآن شریف کی ایک
〃 سورہ کا نام جو عام طور پر
〃 بیماری اور حالتِ نزع
میں مریض کو سنائی جاتی ہے
یاقوت رقم۔ ایک ماہر خطاط
〃 کا لقب۔ اچھے خوش نویس
〃 کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔
〃 یعقوت مستعصمی بہت مشہور
〃 خطاط تھے۔
یدِ بیضا۔ (سفید چمکدار ہاتھ)
〃 حضرت موسیٰ کا جلا ہوا ہاتھ
〃 جس کو بغل میں ڈالکر نکالتے
〃 تھے تو وہ روشن ہوجاتا تھا
〃 خوبصورتی اور خوبصورت
〃 چیزوں سے تشبیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

یَدِطُوُلیٰ ۔ مہارت ۔ کمال ۔
یَرَاق ۔ سامان ۔ ہتھیار ۔
یَسَار ۔ بائیں سمت ۔ بایاں ۔ بد
" قسمت ۔
یَاوَل ۔ چوبدار ۔ پہرہ دار
یَل ۔ پہلوان ۔
یَلدَا ۔ سال کی سب سے زیادہ
" اندھیری رات ۔
یُوزبَاشی ۔ سو سپاہیوں کا
" سردار ۔ یہ ترکی فوج کا عہدہ
" ہے ۔

یَجُروِید ۔ ہندو مذہب کی چار مستند
" کتابوں میں سے تیسری
" کتاب کا نام ہے ۔
یَابِس ۔ روکھا سوکھا ۔ خشک ۔
یَمِین ۔ دایاں ۔ دائیں طرف ۔
یَبُوسَت ۔ خشکی ۔
یَرغَا ۔ گھوڑا ۔ یلغار ۔
یَدِطُولیٰ ۔ مہارت ۔ کمال حاصل ہونا
یَاقُوتِی ۔ طاقت کی ایک یونانی دوا
" جس میں یاقوت بھی شامل
" ہوتا ہے ۔

عربی ضرب الامثال و محاورات

عربی	اردو ترجمہ
اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْتِ۔	انتظار کرنے کی تکلیف موت کی تکلیف سے زیادہ سخت ہے۔
اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُعِظَ بِغَیْرِہٖ۔	نیک بخت وہ ہے جو غیروں سے نصیحت حاصل کرے۔
اَظْھَرُ مِنَ الشَّمْسِ	آفتاب سے زیادہ روشن۔
اِحْفَظِ النَّاسَ یَحْفَظْکَ اللّٰہُ	لوگوں کی حفاظت کرو۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا
اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ	کوشش کرنا میرا کام ہے اور اس کام کا نتیجہ اللہ کے اختیار میں ہے۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،	بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور یقیناً اسی کی طرف لوٹیں گے۔
اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبِ	حکم کی تعمیل ادب و تعظیم پر مقدم ہے۔
اَلدَّالُ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ،	بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا، بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ،	سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔

عربی	اردو ترجمہ
إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ رِجْسٌ	بیشک شراب اور قمار بازی نجس و ناپاک ہیں۔
إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا	ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔
اَلتَّأْخِيْرُ مِنَ الرَّحْمٰنِ وَالتَّاجِيلُ مِنَ الشَّيْطٰنِ۔	تاخیر کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور جلدی کرنا شیطان کا کام ہے

یعنی اللہ تعالیٰ موقع اور مہلت دیتا ہے اور شیطان جلدی کراتا ہے۔ تاکہ کام خراب ہو۔

عربی	اردو ترجمہ
أَعْدَى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِيْ بَيْنَ جَنْبَيْكَ۔	تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے پہلو میں موجود ہے۔
أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ۔	میں اللہ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں
أَنْتَ شَيْخٌ أَوْ سَيِّدٌ	تم شیخ ہو یا سید ہو
اَلْمَشْهُوْرُ كَالشَّمْسِ فِيْ نِصْفِ النَّهَارِ	(وہ) ایسا مشہور کہ جیسا دوپہر کا سورج۔
اَلْعَاقِلُ تَكْفِيْهِ الْإِشَارَةُ	عقل مند کے لئے اشارہ ہی کافی ہے
بَلَغْنَا الْمُرَادَ۔ وَزَالَ الْعِنَادُ	ہم اپنی مراد پا گئے اور عداوت ختم ہوگئی۔
بَيِّنُوْا وَتُؤْجَرُوْا	بیان کرو اور اجر حاصل کرو
جَعَلَ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ	اس کا ٹھکانا جنت میں بنا دیا
جَعَلْنَا الشَّمْسَ ضِيَاءً	سورج کو ہم نے روشنی کے لئے بنایا۔

عربی	اردو ترجمہ
اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْءَ۔	اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے کہ جب کوئی پریشان حال اس کو پکارتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے اور اس کی تکلیف دور فرماتا ہے۔
لَكَ الْحَمْدُ وَالشُّكْرُ يَا رَبَّنَا	اے ہمارے پروردگار سب تعریف اور شکر تیرے لئے ہے
مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ	ہم نے تجھے نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا۔
لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا	ہم کو کوئی علم نہیں سوا اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا۔
رَاحَةُ الرُّوْحِ فِيْ قِلَّةِ الْمَنَامِ	روح کی آسودگی اور آرام کم سونے میں ہے۔
غَبَّ مَسَا قَبْلِ عِشَا	شام کے بعد عشا (رات) سے پہلے۔
مَا اسْمُكَ؟	تمہارا نام کیا ہے؟
وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا	اور ہم نے دن حصولِ معاش کے لئے بنایا۔
اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ	لڑائی ایک دھوکہ ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الشُّجَاعَ	بیشک اللہ تعالیٰ بہادر شخص کو پسند کرتا ہے۔
اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ	لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقہ پر چلتے ہیں۔

عربی	اردو ترجمہ
حماك الله عن شر النوائب	اللہ تعالیٰ تم کو حادثات کے شر سے محفوظ رکھے۔
جزاك الله فی الدارین خیرًا	اللہ تعالیٰ تم کو دونوں جہاں میں اچھا اجر عطا فرمائے۔
لا حول ولا قوۃ الا باللہ	ساری توانائی و طاقت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے
"لا حول"	بطور کلمۂ نفرت و بیزاری استعمال ہوتا ہے۔
شرف الانسان بالکمال لا بالمال	انسان کی بڑائی اور عزت اس کے علم و ہنر سے ہے نہ مال و دولت سے۔
نعوذ باللہ من الشیطن الرجیم	ہم شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں۔
من اللہ الاعانۃ والتوفیق	اللہ ہی کی طرف سے مدد اور توفیق حاصل ہوتی ہے۔
کل طویل احمق	ہر لمبا آدمی احمق ہے۔
فاعتبروا یا اولوا الابصار	عبرت حاصل کرو اے سوجھ بوجھ رکھنے والو دانشمندو۔
الامر فوق الادب	حکم کا درجہ ادب سے بڑا ہے۔
بر[illegible] الله مفجعه	اللہ تعالیٰ اس کی آخری آرام گاہ کو ٹھنڈا کرے۔
انی لا اقول الا حقًا	میں سچ کے علاوہ کوئی بات نہیں کہتا ہوں۔
التائب من الدنیا کمن لا ذنب له	جو دنیا سے توبہ کرلیتا ہے وہ اس شخص جیسا ہوجاتا ہے جس نے کوئی گناہ

عربی	اردو ترجمہ
أُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ	علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین تک جانا پڑے۔
فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	ہم نے فضیلت دی ہے ان میں سے بعض کو بعض پر
اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ۔	صبر خوش حالی کی کنجی ہے
إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔	بیشک اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔
إِذَا جَاءَ الْقَضَاءُ عَمِيَ الْبَصَرُ	جب شامت آتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔
هَاتِ الصَّبُوْحَ حَيُّوا أَيُّهَا السُّكَارٰى	صبح کو پینے والی شراب لاؤ جیو اے سرمست رہنے والو۔
سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدُّنْيَا وَ سَوَادُ الْقَلْبِ فِي الْعُقْبٰى۔	چہرہ کی سیاہی دنیا میں اور قلب کی سیاہی آخرت میں (بری ہوتی ہے)
عَمَّرَهُ اللّٰهُ إِلٰى يَوْمِ النُّشُوْرِ	اللہ تعالیٰ اس کو قیامت تک زندہ رکھے۔
بَلَغَ الْعُلٰى بِكَمَالِهٖ	وہ اپنے کمالات کی بدولت بلندی پر پہونچا۔ (یہ شیخ سعدی کے ایک عربی قطعہ کا پہلا مص[illegible] [illegible] نلا ہے۔
لَوْ فَرَضْنَا ذَالِكَ	اگر ہم اس بات کو تسلیم کرلیں [illegible] کرلیں۔
اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ	خوش بخت وہ ہے جو اپنے [illegible] سے سبق حاصل کرے۔ [illegible] چلتے ہیں

تعارف اشخاص

(جن کا ذکر فسانہ آزاد میں کیا گیا ہے)

اِبنِ سِینا۔ حکیم بوعلی، ابن سینا مشہور طبیب، عالم اور فلسفی تھے، یونانی طریقہ علاج کو ترقی دی۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فن طب پر ان کی کتاب قانو[illegible] مشہور ہے انھوں نے سنہ ۴۲۸ھ [illegible] وفات پائی۔

ابُوجہل۔ عرب کے قبیلہ قریش کا سردار، اور اسلام کا مخالف تھا۔ قرآن شریف میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

ابوالفضل۔ اکبر بادشاہ کا وزیر اور بلند پایہ عالم تھا اس کے والد شیخ مبارک اپنے زمانہ کے بڑے فاضل تھے۔ انشاء اور مکتوبات ابوالفضل فارسی کی معیاری کتابیں ہیں۔ آئین اکبری اس کی مشہور تصنیف ہے۔ سنہ ۱۰۱۱ ہجری میں جہانگیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔

اَبُوتُراب۔ یہ حضرت علیؓ کی کنیت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کی تھی۔

اَبُوظَفَر۔ کنیت آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ۔ متوفی سنہ ۱۸۶۲ء۔

اَخفَش۔ نام سعید بن سعدہ۔ متوفی سنہ ۲۲۱ ہجری ماہر لغت نویس اور عربی قواعد میں فن نحو کا فاضل تھا۔ اس کو قواعد سے اتنی دلچسپی تھی، کہ گھر میں اپنی بکری کو مخاطب کر کے سمجھاتا تھا۔ اگر کبھی بکری عادتاً سر ہلا دیتی تو وہ خیال کرتا کہ اب سمجھ گئی پھر دوسرا مسئلہ شروع کرتا۔ اس لئے "بُزِ اخفش" بطور مثل مشہور ہے۔ جو حماقت اور سادہ لوحی کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

اَسِیر۔ نواب مظفر علی خان اسیر۔ وزیر نواب واجد علی شاہ۔ مشہور شاعر متوفی سنہ ۱۲۹۸ھ

آغا میر۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین
〃 حیدر کا وزیر اعظم۔ بانی سرائے
〃 آغا میر لکھنؤ۔

آصف الدولہ۔ نواب وزیر
〃 اودھ بانی امام باڑا آصفی
〃 متوفی ۱۷۹۵ء

امانت۔ آغا حسن امانت شاگرد
〃 دبیر مصنف اندر سبھا۔

امیر خسرو۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر
〃 ماہر موسیقی درویش صفت
〃 حضرت نظام الدین اولیا کے
〃 مرید اور ہم نشین خاص متوفی ۱۳۲۵ء

امرؤ القیس۔ زمانہ جاہلیت کا مشہور
〃 شاعر۔ اس کا قصیدہ معلقہ عربی
〃 ادب کا شاہکار ہے اس نے
〃 ۵۳۹ء میں وفات پائی۔

افراسیاب۔ توران کا مشہور
〃 بادشاہ تھا۔

التمش۔ شمس الدین التمش بادشاہ
〃 دہلی متوفی ۱۲۳۵ء

امجد علی شاہ۔ بادشاہ اودھ
〃 بانی امام باڑا حسین آباد لکھنؤ
〃 متوفی ۱۸۴۸ء۔

انیس۔ میر ببر علی۔ انیس بلند پایہ
〃 مرثیہ گو شاعر متوفی ۱۸۷۴ء۔

انشاء۔ انشاء اللہ خان اردو کا
〃 ممتاز شاعر اور ماہر قواعد
〃 متوفی ۱۸۱۷ء۔

انوری۔ اوحد الدین انوری
〃 مشہور فارسی شاعر۔ ماہر قصیدہ
〃 نگار متوفی ۵۴۷ھ ہجری

ایاز۔ سلطان محمود غزنوی کا محبوب
〃 اور فرمانبردار غلام۔

بابر۔ ظہیر الدین بابر۔ ہندوستان
〃 میں مغلیہ حکومت کا بانی۔
〃 متوفی ۱۵۳۰ء

بندہ دین اور کالکا۔ دونوں
〃 درگا پرشاد کھتک کے بیٹے تھے رقص کے
افسانہ میں ماہر۔ ان کا خاندان آج تک رقص میں ممتاز ہے

بلعم باعور۔ بنی اسرائیل ایک بڑا عبادت گزار
〃 عالم تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے جرم میں
〃 مردود قرار دیا گیا تھا۔

بحر۔ [illegible] امداد علی بحر۔
〃 [illegible] ناسخ متوفی ۱۸۸۲ء

بطلیموس۔ یونان کا ممتاز فلسفی عالم
〃 جس کی تصنیف مجسطی
〃 مشہور کتاب ہے۔

بقراط۔ یونان کا مشہور عالم اور
〃 ماہر طب۔ اس نے طب کو
〃 بہ حیثیت روشناس کیا۔

بھان متی۔ راجہ بھان کی بیٹی جس کو

" راکھشش اٹھالے گئے تھے
" اس کا قصہ بہت مشہور ہے۔

بیدلؔ ۔ مرزا عبدالقادر مشہور، بلند
" مرتبہ فارسی شاعر اورنگ زیب
" کے ہم عصر۔ متوفی ۱۷۲۵ء۔

بہزاد ۔ ایران کا ماہر مصوّر و نقاش
" ایران کے بادشاہ اسماعیل
صفوی کا ہم عصر۔

بگاّ بیگم ۔ فن رقص کی ماہر۔ بادشاہ
" اودھ نصیرالدین حیدر کی
" درباری رقّاصہ۔

تاندھ ۔ بالے میاں سید سالار مسعود
" غازی کا عوامی نام جن کا مزار بہرائچ میں
" ہے۔ ان کے نام کی چھڑیں اٹھائی
" جاتی ہیں۔

جالینوس ۔ علم طب کا ماہر مشہور یونانی
فلسفی اور طبیب۔

جلالؔ لکھنوی ۔ حکیم ضامن علی خان جلالؔ
" اردو کے ادیب اور شاعر، فن
" قواعد و لغت نویسی میں مہارت
" رکھتے تھے۔ ۱۳۲۷ ہجری میں
وفات پائی۔

جرأت ۔ شیخ قلندر بخش جرأت
" اردو کے مشہور شاعر متوفی
" سنہ ۱۲۲۴ ہجری۔

حافظ شیرازی ۔ خواجہ شمس الدین
" حافظ فارسی کے سب سے
" زیادہ مقبول غزل گو شاعر۔
" جن کے دیوان سے فال نکالتے
ہیں۔ متوفی سنہ ۱۳۸۹ء مدفن شیراز۔

حسنین ۔ مراد حضرت امام حسنؓ اور
" امام حسینؓ۔

حافظ نوراللہ ۔ بہت مشہور اور ماہر
" خوشنویس تھے۔ ان کے شاگردوں
" کے ذریعہ اس فن کو بہت ترقی
" ہوئی۔ لکھنؤ میں قیام تھا۔

حافظ ابراہیم ۔ ماہر خطّاط۔ شاگرد
" حافظ نوراللہ۔ اودھ کے نوابی
عہد میں تھے۔

حامد علی ۔ ماہر خوشنویس۔ شاگرد
" منشی ہادی علی۔ نولکشور پریس
" سے وابستہ تھے ترجمہ الف لیلیٰ
کے مرتب۔

خاقانی ۔ افضل الدین خاقانی
" شروانی فارسی کے بلند پایہ
قصیدہ نگار شاعر متوفی سنہ ۵۶۵ ہجری

چھجّو خاں ۔ ماہر پٹے باز۔ عہد
" آصف الدولہ میں اس کی بہت
" شہرت تھی۔

دردؔ ۔ خواجہ میر درد مشہور اردو شاعر
متوفی سنہ ۱۷۸۵ء بمقام دہلی

دُھنیا مہری ۔ مشہور کہارن جو
اودھ کے بادشاہ نصیر الدین
حیدر کی منظورِ نظر اور حکومت
کے معاملات میں دخیل تھی ۔
اس کی وجہ سے رسالدار فقیر
محمد خان گویا کو بادشاہ کی
خفگی کے باعث استعفا دینا
پڑا تھا ۔

رَاجہ مہرا ۔ کہاروں کی برادری کا
سردار ۔ عہدِ آصف الدولہ میں
بہت مشہور ناچنے والا اور ایک نئے ناچ کا موجد تھا رابعہ
بصری ایک ممتاز عابدہ و زاہدہ خاتون
جن کا شمار اولیاء میں ہوتا ہے
بصرہ کی رہنے والی تھیں سنہ ۱۳۵ھ
میں وفات پائی ۔ ان کا مزار
کوہِ طور پر ہے ۔

رُودَکی ۔ ابو عبداللہ نام فارسی زبان
کا مشہور و ممتاز شاعر جو فارسی
شاعری کا باوا آدم کہلاتا ہے
متوفی سنہ ۳۲۹ ہجری ۔

زُلالی ۔ حکیم زُلالی خوانساری ۔ فارسی
کا مثنوی گو شاعر متوفی سنہ ۱۰۲۴ ہجری ۔

زال ۔ سام کا بیٹا اور مشہورِ عالم پہلوان رستم کا
باپ تھا ۔ زال بوڑھی عورت کو بھی کہتے ہیں ۔

زرتشت ۔ ایک ایرانی مذہبی رہنما جس نے آتش
پرستی کی بنیاد ڈالی ۔ پارسی مذہب کا
پیغمبر مانا جاتا ہے ۔

سَعدیِ شیرازی ۔ شیخ مُصلح الدین
سعدی زبردست عالم، صوفی
اور شاعر ۔ ان کی تصانیف
گلستاں اور بوستاں عالمگیر
شہرت حاصل کر چکی ہے سنہ ۶۹۲ھ
میں وفات پائی ۔

سلمان ساوجی ۔ فارسی کے
بلند پایہ شاعر متوفی سنہ ۷۷۸ ہجری

سرب سکھ رائے ۔ ایک
باکمال خطاط تھا ۔ حافظ
نور اللہ کا شاگرد تھا ۔

سرُور ۔ مرزا رجب علی بیگ
مصنف فسانہ عجائب متوفی سنہ ۱۸۶۹ء

سُحبان بن زائل ۔ عرب کا خوش
بیان مشہور مقرر ۔ اسلام
سے قبل گزرا ہے ۔

سَودا ۔ مرزا محمد رفیع ۔ اردو کا
بلند پایہ شاعر ۔ متوفی سنہ ۱۷۸۱ء ۔

سعادت علی خاں ۔ اودھ کے
حکمران متوفی سنہ ۱۸۱۴ء ۔

سُندر جان ۔ عہدِ آصف الدولہ
کی ماہر گانے والی ۔

شاہ مینا ۔ ایک بزرگ اور عالم
جن کا مزار لکھنؤ میں مرجعِ عام و
خاص ہے ۔ ان کی مزار پر

نوچندی جمعرات کو میلہ لگتا ہے۔

شجاع الدولہ ۔ اودھ کے دوسرے
نواب وزیر و حکمران متوفی
۱۷۷۴ء۔

شیخ سدّو ۔ ایک بزرگ
شخصیت جو بہت مشہور ہیں۔
امروہہ ضلع مرادآباد میں ان
کا مزار واقع ہے۔ جس پر
لوگ عقیدت مندی کے ساتھ
حاضر ہوتے ہیں منتیں مانتے
ہیں۔ ان کے نام کا بکرا ذبح
کرتے ہیں۔ عورتیں زیادہ
عقیدت مند ہیں۔ مگر ان کے
متعلق کوئی مستند بات معلوم
نہیں۔

شہیدی ۔ کرامت علی۔ خوشگو
شاعر۔ نعت گوئی میں مشہور
شاگرد مصحفی متوفی ۱۲۵۶ھ ہجری

شوری ۔ بادشاہ نصیرالدین حیدر
کے عہد کا گانے والا۔ جو ٹپّہ
گانے میں بہت ماہر تھا۔

شمس الدین ۔ اعجاز رقم خطاب
تھا۔ فن نستعلیق کے ماہر ایک
بلند پایہ خوش نویس۔ شاگرد
ہادی علی اشک۔ مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔

صبا ۔ میر وزیر علی شاگرد آتش
مشہور شاعر متوفی ۱۲۷۱ھ ہجری۔

طالب آملی ۔ محمدؐ طالب نام۔
ایران کے مقام آمل کے رہنے
والے اور فارسی کے بلند پایہ
شاعر تھے۔ جہانگیر بادشاہ
کے عہد میں دربار سے ملک الشعراء
کا خطاب پایا متوفی ۱۶۲۶ء

طوطارام شایان ۔ فارسی
اردو دونوں زبانوں میں ماہر
تھا۔ اس نے منشی نولکشور کی
فرمائش پر الف لیلیٰ کو نظم کیا
تھا جو شائع ہو چکی ہے۔

ظہوری ۔ ملا نورالدین ظہوری
فارسی کے باکمال شاعر اور
نثر نگار، دکن کے رہنے والے
تھے "سہ نثر" انشا اور نورس
فن موسیقی میں ان کی مشہور
تصانیف میں انہوں نے ۱۰۲۵ء
میں وفات پائی۔

ظہیر فاریابی ۔ فارسی کے مشہور
باکمال قصیدہ گو شاعر متوفی ۱۵۹۸ء

عباس ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا نام تھا
اور حضرت علیؓ کے ایک بیٹے کا نام بھی ہے جو
امام حسینؓ کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے تھے

عمر خیام ۔ عمر نام خیام تخلص ۔ باکمال فلسفی ماہر نجوم اور مستانہ رباعی گو شاعر۔

عرفی شیرازی ۔ جمال الدین نام عرفی تخلص وطن شیراز فارسی کا باکمال شاعر۔ جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے سنہ ۱۵۹۲ء میں بمقام لاہور وفات پائی۔

عراقی ۔ فخر الدین نام، وطن ہمدان (ایران) مشہور فارسی شاعر متوفی سنہ ۱۲۸۹ء

عاشورن ۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد کی ایک ماہر ناچنے والی تھی

عیشی ۔ اردو کے خوشگو شاعر متوفی سنہ ۱۲۴۰ ہجری۔

عطار ۔ خواجہ فرید الدین عطار۔ باکمال درویش بلند پایہ فارسی شاعر۔ تذکرۃ الاولیاء کے مصنف متوفی سنہ ۴۲۱ ہجری۔

غازی الدین حیدر ۔ اودھ کے پہلے بادشاہ جنہوں نے دہلی کی مرکزی حکومت کی قیادت ترک کر کے خود مختار بادشاہی کا اعلان کیا۔ انہوں نے سنہ ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔

غالب ۔ مرزا اسد اللہ خاں۔ فارسی اردو کے باکمال شاعر متوفی سنہ ۱۸۶۹ء۔

غنی ۔ غنی کشمیری فارسی کے مشہور شاعر متوفی سنہ ۱۶۶۶ء۔

فردوسی ۔ ابو القاسم نام طوس (ایران) وطن باکمال رزمیہ شاعر شاہنامہ کا مصنف متوفی سنہ ۴۱۱ ہجری

فرعون ۔ قدیم مصر کے بادشاہوں کا ایک خاندان جس کا ہر بادشاہ فرعون کہلاتا تھا۔ مشہور فرعون وہ ہے جس کے عہد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

فقیر محمد خان ۔ گویا تخلص۔ اودھ میں رسالدار تھے۔ اردو کے اچھے شاعر تھے ان کی کتاب بستان الحکمت اردو نثر کی مشہور کتاب ہے متوفی سنہ ۱۸۵۰ء

فیثاغورث ۔ یونان کا مشہور عالم اور فلسفی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے ہیراکی کا فن سیکھا۔

فری میسن ۔ قدیم زمانہ میں انگلستان کا ایک پر اسرار گروہ جس کا الگ ایک مذہب و مسلک تھا جو کسی پر ظاہر نہیں

" کرتے تھے۔ صرف اس گروہ کے
" افراد ہی ایک دوسرے سے
" واقف ہوتے تھے۔

قائمؔ علی خاں۔ لکھنؤ کا مشہور
" بھانڈ (نقّال) تھا۔

عرف کریلا بھانڈ۔ عام طور پر کریلا
" کے نام سے مشہور تھا وہ اودھ
" کے نواب سعادت علی خان کے
" عہد سے نصیر الدین حیدر کے
" زمانہ تک موجود تھا اس کا کمال
" یہ تھا کہ مسلسل سات گھنٹے
" تک طرح طرح سے منھ بناتا
" تھا۔ محرم میں شربت کی سبیل لگاتا تھا۔
ایک بار بادشاہ نصیر الدین حیدر
" مع اپنی بیگم کے اس کی سبیل
" پر آئے تو اس نے برجستہ کہا۔
" خدا حضور کو سلامت اور
" بیگم صاحبہ کو قائم رکھے۔ اس
" فقرہ پر بادشاہ اور مصاحبین
" پھڑک اٹھے اور اس کو انعام
سے نوازا۔

قاضی نعمت اللہ۔ باکمال خوش
" نویس جو مشہور استادِ خطّاطی
" عبد الرشید دیلمی کے شاگرد
رشید تھے۔

قدرؔ بلگرامی۔ غلام حسین نام وطن
بلگرام اردو کے اچھے ادیب وصحافی
" خوش گو شاعر اور مرزا غالب کے
" شاگرد تھے اودھ اخبار کے
" ایڈیٹر رہے ۱۸۸۴ء میں وفات
" پائی ہے۔

قابیل۔ حضرت آدم کے دوسرے
" بیٹے کا نام جس کو پہلے بیٹے ہابیل
" نے قتل کر دیا تھا۔

قارون۔ ایک مشہور دولت مند
" تھا کہا جاتا ہے کہ اس کے
" خزانوں کی کنجیاں چالیس اونٹوں
" پر لادی جاتی تھیں۔ حضرت
" موسیٰ نے اس کو زکوٰۃ دینے
" کی ہدایت کی۔ مگر وہ کسی طرح
" نہ مانا۔ اس کی پاداش میں
" تمام خزانوں سمیت زمین کے
" اندر دھنس گیا۔ قارون کا خزانہ
" اردو میں ضرب المثل کے طور پر
" استعمال ہوتا ہے۔

قطب الدین ایبک۔ ہندوستان
" کا مشہور بادشاہ جس نے
" دہلی میں قطب مینار تعمیر کرایا تھا
" اس نے ۱۲۱۰ء میں بمقام لاہور
" وفات پائی۔

کالی داس۔ سنسکرت کا مشہور

شاعر۔ راجہ بکرماجیت کا
ہم عصر تھا، شکنتلا، اس کا
لکھا ہوا بہترین ناٹک ہے۔
جس کو بڑی شہرت حاصل
ہے۔

مانی۔ ایران کا باکمال مصوّر اور
نقاش اس کی کتاب ارژنگ
مشہور ہے۔ بہرام اوّل
بادشاہ ایران نے اس کو
پیغمبری کا دعویٰ کرنے کی
وجہ سے قتل کرا دیا تھا۔

محقق دوّانی۔ جلال الدین نام
ایران کا مشہور عالم۔ تاتاری
حکمران ہلاکو خان کا وزیر تھا اس
کی کتاب "اخلاقِ جلالی" بہت
مشہور ہے۔ متوفی سنہ ۵۲۸ ہجری۔

مُصحفیؔ۔ غلام ہمدانی نام۔ اردو کے
باکمال شاعر متوفی سنہ ۱۲۴۰ ہجری

میر مُونس۔ میر انیس کے چھوٹے
بھائی۔ مرثیہ گوئی میں ماہر تھے۔

میر ضمیر۔ لکھنؤ کے ممتاز مرثیہ گو شاعر
مرزا دبیر کے استاد تھے۔

منصور۔ حسین بن منصور حلاّج۔
جن کو انا الحق کہنے کے جرم پر
پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔

محمد علی شاہ۔ اودھ کے بادشاہ
جنہوں نے حسین آباد لکھنؤ میں
خوبصورت امام باڑا تعمیر کرایا تھا۔
انہوں نے سنہ ۱۸۴۲ء میں وفات
پائی۔

میر حسنؔ۔ اردو کے باکمال شاعر
ان کی مثنویات اردو نظم کا
شاہکار ہیں۔ مرثیہ گوئی میں
بھی مہارت حاصل تھی۔ متوفی
سنہ ۱۷۸۶ء۔

میر سوزؔ۔ اردو کے مشہور شاعر
غزل گوئی میں ممتاز متوفی سنہ ۱۷۹۸ء۔

میر تقی میرؔ۔ اردو کے سب سے
بڑے غزل گو شاعر مانے جاتے
ہیں تذکرہ نگار بھی تھے غزلیات
کے چھ دیوان اور متعدد
مثنویات یادگار ہیں ۱۸۱۰ء/سنہ ۱۲۲۵ھ
میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔

مرزا علی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد
میں شاہی طبیب تھے۔

مینڈو خان۔ اودھ کی فوج میں
رسالدار تھے لکھنؤ میں ان کی
بنوائی ہوئی خوبصورت سرائے
مشہور تھی جو اب مسمار ہو
چکی ہے۔

ممتاز محل۔ شاہ جہاں بادشاہ کی
" محبوب ملکہ جس کی یادگار میں
" اس نے تاج محل بنوایا تھا جو
" ۱۶۴۸ء میں تیار ہوا۔ ممتاز محل
" نے ۱۶۳۱ء میں وفات پائی۔
منیر۔ اسماعیل حسین منیر مشہور شاعر
" اور ادیب جن کو ۱۸۵۷ء کی
" جنگِ آزادی میں شرکت کے
" جرم میں جزائر انڈمان میں قید
" کر دیا گیا تھا ۱۸۸۱ء میں وفات
پائی۔
مومن۔ حکیم مومن خان دہلوی باکمال
" غزل گو شاعر غالب و ذوق
" کے ہم عصر متوفی ۱۸۵۱ء۔
نوبت رائے نظر۔ ممتاز صحافی
" خوشگو شاعر، خدنگ نظر،
" کے اڈیٹر، لکھنؤ کے ایک معزز
" کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے
" تھے۔ نولکشور پریس سے بھی
" وابستہ رہے۔ متوفی ۱۹۲۲ء
نیپولین۔ مشہور جنرل فرانس کا
" حکمران متوفی ۱۸۲۱ء۔
نور جہاں۔ بادشاہ جہانگیر
" کی ملکہ متوفی ۱۰۵۵ھ۔
نصیر الدین حیدر۔ اودھ کے دوسرے
بادشاہ متوفی ۱۸۲۷ء۔
نادر شاہ درانی۔ افغانستان
" کا بادشاہ جس نے محمد شاہ
" مغل بادشاہ کے عہد میں دہلی
" پر حملہ کیا تھا اور تخت طاؤس
" اور کوہ نور ہیرا اپنے ساتھ لے
" گیا تھا۔
نمرود۔ عرب کا ایک ظالم حکمران
" جس نے حضرت ابراہیم پیغمبر کو
" آگ میں ڈلوا دیا تھا۔ مگر وہ محفوظ
" رہے تھے۔
ناسخ۔ شیخ امام بخش۔ باکمال
" اردو شاعر۔ جنہوں نے
" زبان کی اصلاح کے لیے مفید
" کام کیا۔ ۱۸۳۸ء میں لکھنؤ میں
" وفات پائی۔
نواب مرزا شوق۔ حکیم تصدق
" حسین عرف نواب مرزا مصنف
" مثنویات۔ زہر عشق۔ بہارِ عشق
" اور فریب عشق۔
(۲) وزیر۔ خواجہ وزیر علی شاگرد ناسخ۔
" لکھنؤ کے خوشگو شاعر تھے متوفی ۱۸۵۲ء۔
(۱) نسیم۔ دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد آتش
" نہایت خوش گو شاعر اور ٹکسالی
" زبان کے ماہر مصنف مثنوی گلزارِ نسیم۔

لکھنؤ کی عمارات

(جن کا ذکر فسانۂ آزاد میں آیا ہے)

امام باڑا آصفی ۔ یہ عظیم الشان عمارت قحط سالی کے زمانہ میں نواب آصف الدولہ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کا وسیع ہال چھوٹی اینٹوں اور چونے کی ڈاٹ پر قائم ہے۔ جس میں کوئی ستون نہیں ہے۔ یہ ۱۶۷ فٹ لمبا اور ۵۲ فٹ چوڑا ہے اس کی تعمیر ۱۷۸۴ء میں کفایت اللہ نامی ماہر معمار کی نگرانی میں ہوئی۔ نقشہ بھی اسی کا بنایا ہوا تھا۔ اس میں لکڑی کا استعمال بالکل نہیں کیا گیا ہے اس کی تعمیر پر ۲۲ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس کی چھت پر ایسے پیچ در پیچ حجرہ نما در اس طرح بنائے گئے ہیں کہ اس میں داخل ہونے والا کچھ دور جانے کے بعد راستہ بھول جاتا ہے اور بہت مشکل سے واپسی کا راستہ ملتا ہے۔ اسی لئے یہ بھول بھلیاں کے نام سے مشہور ہے۔

امین آباد ۔ یہ محلہ اور بازار امجد علی شاہ کے زمانہ میں ان کے وزیر امین الدولہ نے آباد کیا تھا۔ اس بازار کے وسط میں دو پارک ہیں۔ ایک کا نام امین الدولہ اور دوسرے کا امین آباد پارک ہے۔

بادشاہ باغ ۔ یہ باغ بادشاہ نصیر الدین حیدر نے دریا گومتی کے کنارے محلہ حسن گنج میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ کام راجہ بختاور سنگھ کی نگرانی میں انجام پایا تھا۔ اس پر ۳۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ باغ کے وسط میں سنگِ مرمر کی خوبصورت بارادری تھی جس میں سنگِ مرمر کے ۳۲ خوشنما ستون نصب تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مہاراجہ راندھیر سنگھ والی کپورتھلہ نے یہ باغ ۳۵ ہزار میں خرید لیا تھا ۱۹۰۵ء میں مہاراجہ مذکور نے

کیننگ کالج کی عمارت کے
لئے بطور عطیہ دے دیا تھا۔
اب اس کے سارے رقبہ میں
لکھنؤ یونیورسٹی اور کالون تعلقدار
کالج کی عمارات ہیں۔

بیلی گارد۔ یہ لکھنؤ کی ریذیڈنسی کا
دوسرا نام ہے۔ یہ شاندار عمارت
نواب سعادت علی خان نے ۱۸۰۰ء
میں انگریز ریذیڈنٹ کے لئے
تعمیر کرائی تھی تحریک جنگ آزادی
۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے
اس کے آس پاس کی عمارتوں
کو ملاکر قلعہ بندی کرلی تھی۔
یہاں مجاہدین تحریک آزادی
اور انگریزی فوجوں میں سخت
معرکے ہوئے تھے۔ اس کا صدر
دروازہ بیلی گارد کے نام سے
مشہور تھا کیوں کہ اس کی حفاظت
کرنل بیلی کے سپرد تھی۔ اب پوری
عمارت اسی نام سے مشہور ہے۔

تحسین کی مسجد۔ یہ بڑی اور
خوبصورت مسجد محلہ چوک میں
اکبری دروازہ کے قریب واقع ہے
اور فرقہ شیعہ کے لئے مخصوص
ہے اس کو تحسین علی خان نے تعمیر
کرایا تھا۔

تالاب ٹکیت رائے۔ یہ تالاب
راجہ ٹکیت رائے وزیر مقدمات
دیوانی نے آصف الدولہ کے
عہد میں تعمیر کرایا تھا۔ آٹھوں کا
مشہور میلہ اسی تالاب کے کنارے
ہوتا ہے۔ اسی نام سے اس نے
ایک محلہ" بھی بسایا تھا۔ جو اب
بھی موجود ہے۔

تارا والی کوٹھی۔ یہ عمارت
نصیر الدین حیدر نے اپنے دربار
کے انگریز نجومی کرنل والکوس
متوفی ۱۸۴۷ء کے مشورہ پر تعمیر
کرائی تھی اس کو رصدگاہ کے طور پر
استعمال کیا جاتا تھا نجوم سے متعلق
بہت سے آلات اس میں نصب
کئے گئے تھے اور ایک قیمتی دوربین
لگائی گئی تھی ۱۸۵۵ء تک ٹھیک
حالت میں تھی اس کے بعد
مسمار ہو گئی۔

چھتر منزل۔ یہ مشہور عمارت
نصیر الدین حیدر نے اپنی بیگمات
کی رہائش کے لئے تعمیر کرائی تھی
اسی کے متصل فرح بخش کے نام
جنرل مارٹن نے ایک کوٹھی پچاس

ہزار روپیہ میں خریدی تھی۔ جس کے اوپر طلائی چھتر لگا تھا۔ یہ عمارت دریا گومتی کے کنارے واقع ہے اور اب بھی اچھی حالت میں ہے اب اس وقت حکومت ہند نے اس کے اندر ڈرگ ریسرچ انسٹیوٹ قائم کر دیا ہے۔

چولکھی۔ اس نام سے عظیم اللہ خان حجام نے ایک وسیع اور خوبصورت عمارت بنوائی تھی۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد واجد علی شاہ اودھ کے آخری حکمران نے چار لاکھ روپیہ دے کر خرید لی۔ اس وقت سے چولکھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بادشاہ کی بیگمات رہتی تھیں۔ بیگم حضرت محل اور شاہزادہ برجیس قدر کا قیام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت اسی عمارت میں تھا۔ اب اس عمارت کا زیادہ حصہ مسمار ہو چکا ہے اور اس کی جگہ بازار اور نئی عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔

حسین آباد کا امام باڑا۔ یہ خوبصورت امام باڑا محلہ حسین آباد میں امجد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا یہ آصف الدولہ کے امام باڑے سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اس سے متصل ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

سوداگر کا امام باڑا۔ یہ مشہور امام باڑا میر باقر نامی تاجر جواہرات نے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا اب تک اچھی حالت میں موجود ہے۔

اکبری دروازہ۔ یہ بلند اور شاندار دروازہ بادشاہ اکبر کے عہد میں اودھ کے نائب حکمراں محمود بلگرامی نے تعمیر کرایا تھا وہ صوبہ دار جواہر خان کا ماتحت تھا۔ یہ لکھنؤ کے چوک بازار کے شمالی سمت آخری سرے پر واقع ہے

بھولا ناتھ کا کنواں۔ نواب وزیر سعادت علی خان کے عہد میں بھولا ناتھ راجہ بخشی کے عہدہ پر فائز تھا۔ اودھ کے معززین میں شمار ہوتا تھا۔ آصف الدولہ اس کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس نے یہ بڑا کنواں رفاہ عام کے لئے تعمیر کرایا تھا جو اب تک موجود ہے۔

سرائے میںڈو خاں۔ امجد علی شاہ
کے عہد میں شاہی فوج کے
رسالدار میںڈو خاں نے تعمیر
کرائی تھی۔ اب مسمار ہو چکی ہے
یہ حضرت گنج سے قریب دار الشفا
کے متصل واقع تھی۔

رومی دروازہ۔ یہ نہایت بلند اور
خوبصورت دروازہ امام باڑا
آصف الدولہ کے قریب نواب
آصف الدولہ نے تعمیر کرایا تھا۔
اس کو ماہر معمار کفایت اللہ نے
اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے
مطابق بنوایا تھا۔ یہ اب بھی اچھی
حالت میں موجود ہے۔

دل کشا باغ۔ نواب سعادت علی
خاں نے شہر سے متصل ایک
شکار گاہ بنوائی تھی جس میں ہر
قسم کے جانور چھوڑے گئے تھے
اور بالکل اصل جنگل کا ماحول تھا
اسی شکار گاہ کے قریب ایک محل
اور باغ تعمیر کرایا تھا جو اب بھی
موجود ہے۔

سکندر باغ۔ یہ خوبصورت
اور کشادہ باغ واجد علی شاہ
نے اپنی بیگم سکندر محل کے لئے تعمیر
کرایا تھا اسی سے متصل وہ مقام تھا جس
کو قدم رسول کہا جاتا ہے۔ سکندر باغ کو
۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں نقصان پہنچا مگر
زیادہ حصہ محفوظ رہا۔ اور یہ باغ اب تک
موجود ہے اور اب حکومتِ ہند
نے اس کو بوٹانیکل گارڈن قرار دے کر
اپنی نگرانی میں لے لیا ہے۔

شاہ نجف۔ اودھ کے بادشاہ
غازی الدین حیدر نے دریا گومتی
کے کنارے یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔
تاکہ مرنے کے بعد اسی میں دفن کیے
جائیں۔ یہ عمارت حضرت علیؓ کے
مزار مبارک واقع نجف اشرف
(عراق) کی نقل ہے جو ۱۸۲۷ء میں
تعمیر ہوئی تھی۔ بادشاہ مذکور
اسی مقبرہ میں دفن کیے گئے۔
یہ لکھنؤ کی خوبصورت عمارتوں میں
شمار ہوتی ہے اور دریا گومتی کے
بالکل کنارے واقع ہے۔

قدم رسول۔ غازی الدین حیدر
نے ایک بہت بلند چبوترہ تعمیر
کرایا تھا اور اس پر ایک حاجی کا
لایا ہوا وہ متبرک پتھر نصب کرایا
جس پر حضرت محمد صلعم کے قدم
مبارک کا نشان بتایا جاتا تھا۔

" اب یہ مقام ختم ہو چکا ہے۔ یہ
" سکندر باغ کے قریب واقع تھی۔

قیصر باغ ۔ یہ عظیم الشان وسیع عمارت
" اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی
" شاہ نے ۱۸۴۸ء میں تعمیر کرائی
" تھی اس کی تعمیر پر ۸۰ لاکھ روپیہ
" صرف ہوا تھا۔ اس میں بادشاہ
" کی بیگمات رہتی تھیں ۱۸۵۷ء کے
" غدر میں اس کو بہت نقصان
" پہنچا۔ تاہم اب بھی یہ عمارات
" معمولی تعمیرات کے ساتھ موجود ہیں

کاظمین ۔ یہ خوبصورت عمارت
" حضرت موسیٰ کاظم رضہ کے مقبرہ
" کی نقل ہے جس کو ایک ہندو
" جگناتھ اگروال نے تعمیر کرایا تھا
" یہ امجد علی شاہ کے عہد حکومت
" میں ۱۸۴۴ء میں تعمیر ہوا جگناتھ
" نے اسلام قبول کر لیا اور اس
" کا نام غلام رضا خان رکھا گیا
" اس کے گنبد پر سونے کے
" پیتر چڑھائے گئے تھے۔

کربلا دیانت الدولہ ۔ یہ بہت
" خوبصورت عمارت حضرت
" امام حسین رضہ کے مقبرے کے طرز
" پر نواب دیانت الدولہ نے
" تعمیر کرائی تھی۔ اور اب تک
" اچھی حالت میں موجود ہے۔

ملکہ زمانیہ کا امام باڑا ۔ یہ وسیع
" اور شاندار امام باڑا ملکۂ زمانیہ
" نے تعمیر کرایا تھا جو محلہ گولا گنج میں
" واقع ہے اور اب اس کا بیشتر حصہ
" مسمار ہو چکا ہے اس سے متصل ایک
" بڑی مسجد بھی تھی جو خستہ حالت
" میں موجود ہے۔

موتی محل ۔ یہ مشہور اور خوبصورت
" امام دریا گومتی کے عین ساحل پر
" نواب سعادت علی خان نے تعمیر
" کرائی تھی۔ اس کے قریب جو پل
" ہے وہ اسی کی نسبت سے
" موتی محل کا پل کہلاتا ہے۔
" غازی الدین حیدر بادشاہ کی
" زندگی کے آخری لمحات اسی عمارت
" میں گزرے۔ اب اس عمارت
" میں ۱۹۴۷ء کے بعد اچاریہ نریندر
" دیو لائبریری قائم کی گئی ہے اور
" حکومت کے چند دفاتر بھی ہیں۔

درگاہ حضرت عباس رضہ ۔ یہ لکھنؤ میں
" فرقہ شیعہ کی بہت مشہور عبادت
" گاہ ہے جس کا ذکر نواب مرزا شوق
" نے اپنی مثنویات میں بھی کیا ہے

اس درگاہ کا بانی مرزا قیصر بیگ
نامی ایک شخص تھا کہا جاتا ہے
کہ حضرت عباسؓ کا اصلی علم کوئی
بزرگ ملک شام سے لکھنؤ
لائے تھے اور اس کو ایک مقام
پر زمین میں دفن کر دیا تھا۔
وہاں ایک غریب آدمی اقامت
گزیں ہوا۔ اس نے خواب میں
دیکھا کہ یہاں حضرت عباس کا
علم دفن ہے۔ اس نے کھود کر
نکال لیا۔ مرزا قیصر بیگ نے یہ
علم محلہ رستم نگر کے ایک مقام پر
نصب کر دیا۔ جب اس کی شہرت
ہوئی تو لوگ جوق در جوق
زیارت کے لیئے آنے لگے
نواب سعادت علی خان نے اس
پر طلائی گنبد تعمیر کرا دیا۔
غازی الدین حیدر کے عہد میں
نقارہ بجانے کا انتظام ہوا۔
اور عمارت کو وسعت دی گئی
اب لوگ یہاں علم لا کر چڑھانے
لگے جس کا سلسلہ اب تک جاری
ہے ہر نوچندی جمعرات کو یہاں
زائرین کا ہجوم ہوتا۔ لوگ حصولِ
مقاصد کے لیئے منتیں مانگتے ہیں۔

حضرت گنج۔ یہ محلہ امجد علی شاہ نے
تعمیر کرایا تھا۔ اس کے قریب ایک
امام باڑا بھی بنوایا تھا اسی میں
وہ مدفون ہیں یہ محلہ اور اس کے
قرب و جوار کا علاقہ اب لکھنؤ کا
سب سے زیادہ خوبصورت اور
پر رونق بازار ہے۔ اس محلہ
میں بڑی بڑی خوبصورت نئے
طرز کی عمارتیں بن گئی ہیں۔ اسی
کے قریب مبارک منزل تھی۔
جس میں نولکشور پریس قائم تھا

مارٹن کی کوٹھی۔ یہ ایک انگریز
جنرل مارٹن نے تعمیر کرائی تھی
جو نواب آصف الدولہ کے عہد
میں مکمل ہوئی۔ مارٹن کی وفات
کے بعد اس کو اسی میں دفن کیا
گیا تھا ۱۸۵۷ء میں مجاہدین
آزادی نے اس کی قبر کھود ڈالی تھی۔ اب اس
عمارت میں لا مارٹینر کالج ہے جو انگریزوں نے
اپنے بچوں اور ہندوستانی رئیسوں کے بچوں کی
تعلیم کے لیئے قائم کیا تھا۔

کوٹھی روشن الدولہ۔ یہ شاندار
عمارت نواب غازی الدین حیدر
کے زمانہ میں وزیر سلطنت
نواب روشن الدولہ نے تعمیر کرائی
تھی اس عمارت میں دو مسجدیں

ہیں ایک قبلہ رُخ اور دوسری
اس کے برعکس محض عمارت کی
خوبصورتی بڑھانے کے لئے بنائی
گئی تھی یہ عمارت اب تک موجود
ہے اور اس میں سرکاری دفاتر
ہیں۔

وزیر باغ۔ یہ باغ لکھنؤ کے مغربی
حصہ میں وزیر اودھ نواب آغا
میر نے تیار کرایا تھا۔ جب اس
کی وزارت کا دور ختم ہوا تو
نواب وزیر نے یہ اپنی ملکہ کو
بخش دیا۔ اس باغ کی کمرکھ
بہت مشہور تھی۔ یہ باغ اور
اس سے ملحق آبادی اسی
نام سے مشہور ہے۔ باغ اپنی
اصلی حالت میں نہیں رہا کچھ
متفرق درخت بطور یادگار
اب بھی باقی ہیں۔

دارالشفا۔ یہ شاہی اسپتال
بادشاہ نصیر الدین حیدر نے
بنوایا تھا۔ اس کی شاندار
عمارت حضرت گنج کے قریب
واقع تھی اس میں عوام کے علاج
معالجہ کا اچھا انتظام تھا۔
محمد علی شاہ نے اس کو یہاں سے
ہٹا کر چوک کے قریب منتقل
کر دیا تھا۔ پرانی عمارت کو
مسمار کر کے ۱۹۴۷ء کے بعد
اس مقام پر یو پی اسمبلی اور
کونسل کے ممبروں کی رہائش
کے لئے کئی عمارتیں تعمیر کی گئی
ہیں۔ اسی کے قریب سرائے
مینڈو خان واقع تھی۔

کمپنی باغ۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء
کے بعد اپنا تسلط قائم کر کے
گول دروازہ اور امام باڑا
حسین آباد کے درمیان میں
واقع گھنی آبادی کو ختم کر کے
اس وسیع رقبہ میں ایک
باغ اور تفریح گاہ بنوائی۔ اس کا
نام ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام
پر رکھا اس میں مختلف اوقات
میں تعمیرات ہوتے رہے
اب اس کے کچھ حصے پر
عمارتیں بن گئی ہیں اور نئے
طرز کا پارک بھی بن گیا ہے۔

30-92

